

تین ۳ گھنٹے میں چمتکار!

آج مجھے اُن کے چپراسی سے اطلاع ملی کہ وہ رات کے کھانے پر اپنے بڑے افسر کو ساتھ لا رہے ہیں۔ میری پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ اُنکے آنے میں صرف تین ۳ گھنٹے ہی رہ گئے تھے! اسی سوچ میں تھی کہ ڈاکیے نے دروازے پر دستک دی اور میری منگائی ہوئی ڈالڈا سے کھانا پکانے کی خوبصورت، باتصویر کتاب میرے سامنے پیش کی۔ ڈالڈا سے کھانا پکانے کی کتاب سے میری یہ مشکل بھی حل ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں مَیں ڈالڈا وناسپتی کا ڈبہ سامنے رکھ کر کام میں محو ہو گئی۔ جب وہ اور اُن کے افسر کھانے کی تعریف کے ساتھ ساتھ انگلیاں تک چاٹنے لگے تو مَیں نے ٹھنڈی سانس لی، آخرکار میری محنت سپھل ہوئی!

ڈالڈا وناسپتی سے کھانا پک کر اپنا اصلی مزا دیتا ہے، روزمرّہ کا کھانا بھی لذیذ اور مزیدار رہتا ہے، یہ بھی نہ بھولئے کہ ڈالڈا وناسپتی کھانا پکانے، تلنے اور بھوننے کیلئے یکساں طور پہ کارآمد ہے، اس سے آپ چھونک دے سکتے ہیں، اور عمدہ مٹھائیاں بنا سکتے ہیں۔ اور پھر اِس میں اب وٹامن اَے اور ڈی بھی شامل ہیں۔

بازار سے کھلے ڈبے سے چکنائی خریدنا اپنی صحت کو خطرے میں ڈالنا ہے، اس پر گرد پڑتی ہے اور مکھیاں بھنبھناتی ہیں جس سے آپ سخت بیماری کے شکار ہو سکتے ہیں۔

ڈالڈا وناسپتی ایسی خالص چکنائی ہے جو تندرستی قائم رکھنے کیلئے ضروری ہے، ڈالڈا وناسپتی ہوا روک، مہر بند ڈبوں میں ملتا ہے، اِسے اپنی ضرورت کے مطابق دس، پانچ، دو، اور ایک پونڈ کے ڈبوں میں خریدیئے، آج سے ہمیشہ ڈالڈا وناسپتی ہی استعمال کیجئے۔

ڈالڈا سے کھانا پکانے کی باتصویر کتاب ہندی، بنگالی، تامل اور انگریزی میں ملتی ہے، اسمیں تین سَو قسم کے کھانے پکانے کی ترکیبیں ہیں، اسمیں باورچی خانے کی دیکھ بھال اور غذائیت وغیرہ پر بھی اشارے ہیں، قیمت فقط دو روپیہ ڈاک خرچ بارہ آنے، اپنی کاپی کے لئے آج ہی اِس پتہ پر لکھئے:-

دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس ۳۵۳، بمبئی ۱



ڈالڈا وناسپتی

کم خرچ — پکانے میں بہتر

HVM. 210-X14 UD


"لکس ٹائلیٹ صابن کا جھاگ
کتنا سفید — کتنا خالص —
کتنا ملایم اور خوشبودار ہے"
— منوّر سلطانہ
LUX
TOILET SOAP
ہندوستان میں بنا ہوا
لکس ٹائلیٹ صابن کے بافراط ملایم جھاگ سے اپنے قدرتی حُسن کو نکھاریئے۔ منوّر سلطانہ کہتی ہیں "اس سفید اور خالص صابن کے روزانہ استعمال سے جِلد نہایت صاف ستھری بن جاتی ہے۔ اسکا جھاگ مساموں میں جذب ہوکر جِلد کو نکھار دیتا ہے اور اسے پنکھڑیوں کی طرح ملایم اور خوبصورت رکھتا ہے"
خاص اطلاع
نیا بڑا سائز
سراپا حُسن کے لئے
اب دستیاب ہے
آج ہی آزمائیے
"... مَیں لکس ٹائلیٹ صابن کے باقاعدہ استعمال سے اپنی جِلد کی رنگت کا خیال رکھتی ہوں"
فلمی ستاروں کا حُسن بخش صابن

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:۔ جوش ملیح آبادی (رخصتی)

ایڈیٹر:۔ بال مکند عرش ملسیانی (قائم مقام)

جلد ۱۲ ——————— نمبر ۱

سالانہ چندہ:۔ ہندوستان میں:۔ چھ روپے
پاکستان میں:۔ چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:۔ نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:۔ ہندوستان میں آٹھ آنے
پاکستان میں۔ آٹھ آنے (پاک)

اگست ۱۹۵۴ء

ترتیب

بچوّں کا آج کل

سرورق:۔ موسم برسات میں راجہ اور رانی جھولا جھول رہے ہیں
راجہ نریندر چند آف ٹیڑھی گڑھوال کے مجموعے کی ایک کانگڑہ پینٹنگ

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

جوش ملیح آبادی

صنم گری

بتوں کے خیمۂ زنّار کی خموشی کو
صدائے بربط و چنگ و ستار دی ہم نے

سیاہ مستیٔ خوبانِ بادہ پیما کو
نویدِ رحمتِ پروردگار دی ہم نے

سہی قدوں کو جو دیکھا تو دل نثار کیا
ملے تو جانِ گرامی بھی وار دی ہم نے

نقاب کو لب و رخسار کی دمک بخشی
سراب کو صفتِ جوئے یار دی ہم نے

صبا کو حرفِ تمنّا کی دل کشی بخشی
فضا کو بوئے خوشِ یار دی ہم نے

سمن بروں کو سکھایا خرامِ سبزہ نواز
چمن کو دولتِ سرو و چنار دی ہم نے

فریبِ وعدۂ خوبانِ سست پیماں کو
ادائے دل کشیٔ اعتبار دی ہم نے

ہزار مرتبہ زلفِ غرورِ جاناں کو
نزاکتِ شکنِ انکسار دی ہم نے

دماغِ ناز کی سنگین بے نیازی کو
شکستگیٔ دلِ بے قرار دی ہم نے

صدائے خندۂ ترکانِ جور پرور کو
ندائے گریۂ بے اختیار دی ہم نے

زمینِ شور کے ذرّاتِ خشک فطرت کو
سرشتِ پرورشِ برگ و بار دی ہم نے

جو رقص و نغمہ و مستی کی طرح ڈالتی ہے
دلِ جمال کی وہ رگ ابھار دی ہم نے

کسی کو جذبۂ سرشار مستقل بخشا
کسی کو جرأتِ مستی ادھار دی ہم نے

کسی کو درس دیا خود ہی صید بننے کا
کسی کو دعوتِ سیر و شکار دی ہم نے

حیا کو ہوش ربا شوخیوں پہ اکسایا
ہوا کو موجِ نسیمِ بہار دی ہم نے

جو زندگی میں تمنّا کا رنگ بھرتی ہے
سبک لبوں کی وہ سرخی نکھار دی ہم نے

جو تھی بحکمِ ادب مانعِ ہم آغوشی
وہ گردنوں کی حمائل اتار دی ہم نے

ہر ایک عارضِ گل گوں میں چاندنی بھر دی
ہر ایک زلفِ معطّر سنوار دی ہم نے

غرض کہ شرح کہاں تک ہو مختصر یہ ہے
صنم گری میں جوانی گزار دی ہم نے

برجموہن دتاتریہ کیفی

داغ خطوط کی روشنی میں

...ید

...خط کی تعریف ریاضی میں یہ کی گئی ہے کہ وہ ایک طول ہے بغیر عرض ...جس خط (یا خطوط) سے ہمیں واسطہ ہے اس کی تعریف حضرت اقلیدس ...برت میں غرق کرنے والی ہے یعنی خط۔ جو آج مرزا داغ کی حیات سے ...لق ہمارا موضوع ہے۔ اس کی تعریف ہے ایک خفیف سا عرض بڑا عمق ...نہ والا بغیر طول کے۔ سچ مچ یہ ظالم ہوتے بھی ایسے ہی ہیں۔

خود نوشت سوانح عمری میں تو بڑے سے بڑا انسان بھی از حد خلوص ...ں اور ادبی دیانت داری کے باوجود ایسا کرتا ہے کہ اصل واقعہ پوست ...ہ لکھ کر بھی کچھ نہ کچھ جزئیات اور تفصیلیں یا عواقب سپردِ قلم نہیں کرتا۔ ...ر اپنے ذہن میں پس انداز رکھ چھوڑتا ہے کبھی یہ فعل ارادے سے ...ا ہے کبھی ارادے کے بغیر۔ اس کی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ وہ سوانح ...ع کے مدت بعد ضبطِ تحریر میں آتے ہیں۔ خطوط میں ایسا نہیں ہوتا۔ ...ہی نہیں سکتا، کیونکہ یہ عین موقعے پر لکھے جاتے ہیں۔ جانچ تول اور ...چ بچار کی مہلت نہیں ملتی۔ خطوط کو مفاجاتی آپ بیتی کہیں تو بجا ہے۔ ...ہ موقع کی اور عینی شہادت وہ نشان انگلیوں کا ہے جس کی نفی کوئی ...ویل کوئی شے نہیں کر سکتی۔ سچے احساسات اور دلی جذبات کی ...بانی جو خط سے ہوتی ہے آپ بیتی سے ممکن نہیں۔ اب کوئی یہ کہتا ہے ...شوق سے کہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
افسوس ان خطوط نے رسوا کیا مجھے

...روری تعارف

نواب مرزا خاں داغ دہلوی شاگرد شیخ ابراہیم ذوق خلف ...شمس الدین خاں والیٔ ریاست فیروز پور جھرکا ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آٹھ برس کے تھے کہ یتیم ہو گئے اور ریاست انگریزوں نے ضبط کر لی۔ اس کی تفصیل مرزا غالب کے حالات میں آتی ہے۔ داغ کی والدہ زیادہ دن بیوہ نہ رہیں۔ جلد ہی حضرت بہادر شاہ کے فرزند ارجمند شاہزادہ فخر الملک عرف مرزا فخرو کے محل کی رونق ہوئیں۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا انتقال ہوا، اور داغ کو قلعہ چھوڑنا پڑا۔ اس وقت اُن کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔ اگلے برس یعنی ۱۸۵۷ء میں وہ سانحہ پیش آیا جسے آج کل اوّلین جنگِ آزادی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مرزا داغ رام پور چلے گئے۔ نواب یوسف علی خاں والیٔ ریاست نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا، اور پچاس روپیہ ماہوار پر اصطبل اور فراش خانہ کا داروغہ مقرر کر دیا۔ نواب موصوف کے بعد نواب کلب علی خاں کے عہد میں بھی داغ اسی خدمت پر برقرار رہے۔ ۱۸۸۷ء میں نواب کلب علی خاں کا انتقال ہوا اور داغ کو ہمیشہ کے لئے رام پور چھوڑنا پڑا۔ اگلے سال یعنی ۱۸۸۸ء میں وہ حیدر آباد دکن گئے۔ لیکن کچھ مدت رہ کر ناکام واپس آ گئے۔ تین چار برس کے بعد پھر حیدر آباد گئے تو رسمی انتظار کے بعد آخر قسمت نے یاوری کی اور میر محبوب علی خاں نظامِ ششم والیٔ دکن کی مصاحبت اور اصلاحِ شعر کی خدمت پر سرفراز ہوئے۔ تنخواہ بڑھتے بڑھتے ایک ہزار تک پہنچ گئی۔ انعام و اکرام کی انتہا نہ تھی۔ مرتے دم تک اسی خدمت پر مامور رہے۔ نظام داغ کو بہت چاہتے تھے۔ یہ خطابات داغ کو نظام کی پیشگاہ سے عطا ہوئے: "سپہ سالار، یارِ وفادار، مقربِ السلطان، بلبلِ ہندوستان، جہانِ استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک"۔

نواب فصیح الملک مرزا داغ نے ۱۹۰۵ء میں حیدر آباد میں

قال کیا، اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

نوٹ:۔ خطوط جن پر یہ مقالہ مبنی ہے حیدرآباد سے لکھے گئے۔ صرف چند ایک ایسے ہیں جو رامپور سے تعلق ہونے کے بعد یا اس سے پہلے دہلی سے لکھے گئے اور انھیں میں سے دو چار خط فارسی میں ہیں۔

خودداری

مرزا نوشہ شاید خودبینی اور خودداری میں امتیاز نہیں کرتے تھے۔ مگر مجھے یہ بہت پیاری لگتی ہے۔ انسان میں آن ضرور ہونی چاہیے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مبالغہ سے کام لو گے تو خودداری خودبینی بن جائے گی۔ مرزا داغ میں یہ بات نہیں تھی۔ ان کی طبیعت اعتدال پسند واقع ہوئی تھی۔ اور ان کا شعور توازن پذیر تھا۔ ایک خط میں جس کی تحریر کی تاریخ ۸ فروری ۱۸۶۶ء ہے نواب کلب علی خاں کو لکھتے ہیں —

"از دفتر شاہی نفط خاں براہیم ۔۔۔ سخن پرمی شد احسنی نواب مرزا خاں تسبیطرمی یافت۔ اگر در دفتر حضور ہم گنجائش دارد بمین آبرو بخشی ست"

مہاراجہ کشن پرشاد کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "ترکی صاحب کی کیفیت نفاق مجھ پر منکشف ہوئی، بہت بہتر کیا سید ظہیرالدین صاحب نے جو اپنی غزل چاک کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ سب چالاکیاں ترکی کی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری غزل جو پڑھی گئی تو ترکی صاحب نے کہا ایک شعر اچھا کہا ہے —— امیر کو تو یہ مجال نہیں ہوئی جلیل کیا داغ کو مٹا سکتے ہیں۔ میری اصلاحی غزل کو خدا کی شان ترکی صاحب سمجھیں، اور نیک و بد بتائیں۔ ضروری گذارش ہے کہ ان کو اصلاحی غزل نہ دکھایا کیجئے، اور میرے پاس بھی ان کو نہ بھیجئے گا۔ میں منافق سے ملنا نہیں چاہتا۔ الٰہی ترقیِ عمر و دولت زیادہ ہو"

تاہل اور کُنبہ پروری

انسان کا کردار ایک عجیب نفسیاتی معمہ ہے۔ ایسا شاذ نہیں ہے کہ ایک شخص کے شعار میں ایسی متضاد بہم صفات دیکھی جاتی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ داغ جیسا جنم کا عیاش طبع شخص بیوی کی عزت آسائش و آرام کا اتنا خیال رکھتا ہے کہ اس سے زیادہ کوئی نیک مرد پارسا کیا رکھتا ہوگا۔

مرزا غالب بھی تمام عمر زاہدِ خشک نہیں رہے۔ مگر اس بارے میں داغ سے اُن کا کیا مقابلہ۔ غالب اخیر وقت تک بیوی کو پھانسی یا طوقِ اسیری ہی کہتے رہے۔ ۱۹ دسمبر ۱۸۵۹ء کو لکھتے ہیں۔

" امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آیا۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔

(نادراتِ غالب ص ۱۲۶)

یعنی نہ بیوی مرتی ہے نہ ہم ہی مرتے ہیں۔ کوسنا اور کسے کہتے ہیں۔ داغ نے بیوی کو ایسا کبھی نہیں سمجھا، آپ حیدرآباد سے عزیز بیگم صاحبہ کو لکھتے ہیں۔

" میرے پاس روپیہ ضرور آئے گا۔ اگر روپیہ آ جاتا تو تمھارے پاس ہزار روپیہ بھجوا دیتا۔ بیوی (اہلیہ داغ) صاحب کو بعد سلام کے معلوم ہو کہ حکیم صاحب سے کہو کہ میرا گھر والا دکن میں ہے وہی میرا گھر ہے، میں دلّی میں مسافر ہوں۔ جلد جلد جلابوں سے فراغ حاصل کرو۔ برخورداری لاڈلی بیگم (داغ کی بیٹی) نے مجھ کو لکھا تھا کہ میرا آنے کو بہت جی چاہتا ہے میں نے فوراً جواب لکھا کہ میری بھی عین تمنا ہے۔"

کنور اعتماد علی خاں رئیس سعد آباد ضلع متھرا مرزا داغ کے بہت پیارے شاگرد تھے۔ اُن کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

" میں تمھاری اُستانی صاحبہ کو بھی روانہ کرتا، مگر اُن کے جانے میں ہزار روپیہ چاہیئے کہ عزیز و احباب کے لئے سوغات لے جا، نیاز و دعوت بھی کرتی تھی۔ اس لئے نہ بھیج سکا۔"

محمد تحسین بیدل بجنوری کو لکھتے ہیں۔

" میری اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اس خانہ ویرانی کے صدمہ نے مجھے مریضِ جاں بلب کر دیا۔ ہوش میں آؤں یہ حواس کہاں، صدہا غزلیں اصلاح طلب ہیں۔ دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ کیجئے، ایک خط میں اولیا بیگم صاحبہ کو لکھتے ہیں: "مجھ کو تخمہ پڑا تھا۔ خدا نے جواب دے دیا تھا۔ اس روز خدا نے زندگی کر دی مگر درد سے جوڑ جوڑ میں درد ہے۔ اور تمھاری آپا کے مرنے سے تنہا ہو

لیف میں ہوں " (یعنی بیگم داغ کے مرنے سے).

مرزا داغ جتنے وسیع المشرب تھے اتنے ہی فراخ دل مہمان نواز
ں تھے ۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی مہمان ان کے ہاں ہوتا ۔ سوال آمدنی اوؔ
ل کا نہیں ہے ۔ مہمان ایک معمولی حیثیت کے آدمی کے گھر آتا ہے ،
ر دال روٹی کھا کر خوش خوش چلا جاتا ہے ۔ جب کہ ایک امیر آدمی کے
ن کے لئے طرح طرح کی نعمتوں کا انتظام کیا جاتا ہے ۔ سیّد بیخود دہلوی
تلاشِ روزگار کے لئے حیدرآباد جانے کی خواہش کی ہوگی داغ
ن کو لکھتے ہیں ۔

" اگرچہ روزگار یہاں عنقا ہے ، مگر اپنا گھر ہے ۔ امید پر آدمی
زندگی ہے شاید تقدیر یاوری کر جائے " (صفحہ ۹)

محمود خاں محمود رام پوری کو لکھتے ہیں ۔

" مگر دو شرطیں ہیں اوّل تو یہ ، اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر کام کرنا
وگا ، دوسرے یہ کہ جلد واپس جانا نہ ہوگا "

اِس ضمن میں ایک دو واقعے نہایت لطیف اور محظوظ کرنے والے
ں ۔ جناب نُوح ناروی حیدرآباد آتے ہیں ۔ مرزا داغ کے پاس
ام کرتے ہیں ۔ یہ معمولی بات تھی ۔ داغ باورچی کو حکم دیتے ہیں کہ ان
ے دریافت کرو کہ کیا کیا کھانے ان کو پسند ہیں تاکہ وہ پکوائے
ئیں ۔ اُس غریب کو مکرر کوشش پر بھی نوح صاحب سے جواب
افی نہیں ملتا ۔ مرزا داغ نوح صاحب سے خود پوچھتے ہیں تو یہی
اب ملتا ہے کہ اُن کی کوئی خاص پسند یا ناپسند نہیں ۔ ۔ ۔ ۔
ترخوان پر جو کچھ ہوتا ہے ٹھیک ہے ۔ داغ کو اطمینان نہیں ہوتا ۔
سمجھتے ہیں کہ نوح تکلف کرتے ہیں ۔ مگر مرزا صاحب ہار ماننے والے
تھے ۔ نوح صاحب کے بیٹے ابوالحسن کو تار میں لکھتے ہیں ۔

" ایک بات سے سخت حیرت ہے کہ وہ اپنی اشتہا وہاں فروخت
ئے ہیں یا گروی کر آئے ہیں یا خیرات ۔ میں نے جو امتحان لیا تو مینا
کم وہ کھاتے ہیں ۔ نہیں معلوم میرے گھر کا کھانا انہیں پسند نہیں آتا
ھوک ہی گھٹ گئی ہے یا تالحہ والے سب اتنا ہی کھاتے ہیں ۔ اگر
تا ہوں کچھ فرمائش کرو تو وہ نہیں سنتے ۔ تم صاف صاف لکھو کہ وہاں
کو کون کون سا کھانا پسند تھا ، کونسی چیز مرغوب تھی کہ یہاں بھی
وہی پکوائی جائے ۔ نمکین کونسا کھانا پسند ہے شیریں کونسا "

یہی حال دوستوں کی فرمائشوں اور عزیزوں کی سوغات کا تھا ۔
مرزا داغ کرزن والے دربار میں نظام کے ہمرکاب دہلی آئے ، واپسی
پر نظام سیدھے بمبئی چلے گئے ۔ دہلی سے احباب کے لئے جو سوغات یا
فرمائش کی چیزیں خریدیں وہ ساتھ رہیں ۔ چنانچہ بمبئی سے میر حسن علی خاں
کو لکھتے ہیں ۔

" آپ نے جو ٹوئیڈ[1] کے واسطے لکھا ہے ایک واقف کار شخص سے
پیدا کیا ہے اس کے ہاتھ نمونے منگواؤں گا ۔ آپ کی حسبِ فرمائش ریوالور
کی کل لے لی ، اور دو دوپٹے بھی ۔ خدا آپ سے جلد ملائے ۔ (صفحہ ۳۵)

انھیں کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں ۔

" آصف الدین کی والدہ کے دوپٹے آپ نے میرے ہاں سے
لئے کہ نہیں ، اور چوڑیوں کا جوڑا بھی آپ کے واسطے ہدیہ ہے یہاں
سے جا کر انشاء اللہ پیش کروں گا "

بوالہوسی

فطرت بڑی حکیم ہے ۔ جُوں جُوں انسان موت کے یعنی تحلیل مادّی
کے قریب تر ہوتا جاتا ہے ۔ حواس عشرہ رفتہ رفتہ کمزور ہوتے جاتے
ہیں ۔ جذبات میں بہ تدریج تعطّل کے آثار نمودار ہوتے جاتے ہیں ۔
حافظہ ضعیف ہو جاتا ہے اور وہ بہت سی پیاری اور مرغوب چیزوں
کو بھولتا جاتا ہے ۔ اگر اس نے صالحانہ زندگی بسر کی ہے اور حادثہ
خارجی و وبا وغیرہ سے محفوظ رہ کر عمرِ طبعی کو پہنچ چکا ہے تو اس کی موت
قریبًا ایسی ہی سہل ہوگی جیسی سینہ بھر کے بچے کی ۔ اب رہی عادت ،
اگر اس کا کردار اندھا دھند رہا ہے تو عادت طبیعت ثانی بن جاتی
ہے اور عمر کے آخری حصّے میں بہت ستاتی ہے ۔ افسوس ہے کہ خدا بخشے
داغ اس طبیعت ثانی کے غلام تھے ۔ عیّاشی کے فطری تقاضے اور
تحرک سے معصوم ہو چکے تھے ، مگر ایک دھت تھی کہ ابھی تک شیطان
کی طرح سر پر سوار تھی ۔ آگے اشارہ ہو چکا ہے کہ متقی یا پارسا نہ تھے ۔

---

[1] ٹوئیڈ سے مراد وہ کپڑا ہے جس کے مردانہ سوٹ بنتے ہیں ، شروانی بھی بنتی ہے ۔

ہوائی میں وہ جو کچھ کرتے رہے ہوں گے اس کے ثبوت کے لئے انھیں کی مثنوی "فریادِ داغ" کافی سے زیادہ ہے۔ لیکن بڑھاپے میں ہوس پرستی بیشک زیادہ معیوب ہے۔ داغ پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ چور چوری سے گیا مگر ہیرا پھیری سے نہیں۔ ابھی فریادِ داغ کا نام آیا ہے اسی کی ستارہ کردار حجاب کو لیجیے۔

مُنّی جان حجاب کلکتہ کی ایک طوائف تھی۔ داغ رام پور میں تھے۔ جب اُس سے روشناسی ہوئی۔ اس کے پیچھے کلکتے گئے۔ غرضیکہ وہ سب کچھ کیا جو فسانے کا عاشق کیا کرتا ہے۔ غزلوں میں بھی کہیں کہیں مرزا نے حجاب کا ذکر کیا ہے۔ مگر یہ مثنوی لکھ کر اسے لافانی بنا دیا۔ خیر زمانہ گزرتا گیا۔ داغ عمر کی آخری منزل حیدرآباد میں طے کر رہے ہیں۔ اکہتر واں سال ختم ہو رہا ہے۔ حجاب مرزا صاحب کو لکھتی ہے کہ میں منہیات سے تائب ہو گئی ہوں اور چاہتی ہوں کہ کسی کے عقد میں آکر پردہ نشین ہو جاؤں۔ حجاب کے دل میں جو تھا اس کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے۔ داغ بھلا چپ رہنے والے کب تھے۔ حیدرآباد بُلا لیا۔ حجاب آئی مگر برقعہ اوڑھے ہوئے۔ معلوم ہوا کہ جب تک نکاح نہ ہو جائے مرزا صاحب سے پردا ہوگا۔ اب تو داغ چکرائے حجاب کو علیحدہ شہر کے ایک مکان میں ٹھہرا دیا گیا، اور ان کی ضروریات کا انتظام کر دیا گیا۔ اب داغ عجیب تذبذب میں ہیں۔ نفس امّارہ تو کہتا ہے کہ آگے آئی تھالی کو لات مارنی نہ چاہیئے اور خاص احباب و بہی خواہ روکتے ہیں کہ پاگل ہوئے ہو۔ یہ تمھاری عمر، بیماریوں کے لتاڑے ہوئے اور چلے ہیں دولھن بیاہنے۔ خود داغ بھی محسوس کرتے تھے کہ سٹھیائے کیا ستر اسئے ہوئے ہیں۔ خاصی مدّت بیچ ہی بیچ میں گزری۔ آخر بی مُنّی جان حجاب کلکتہ بیرنگ واپس چلی گئیں اور یہ ان دونوں کے لئے اچھا ہی ہوا، اور پھر ایک حجاب کی ہی کیا خصوصیت ہے۔ حیدرآباد میں برسرِکار ہوتے ہی خوبصورت ایک طوائف اختر جان کو انھوں نے ملازم رکھا جو خاصی مُدّت تک اُن کے پاس رہی۔

الٰہ آباد کی ایک طوائف بنی جان کو کیا بھولے بن کر لکھتے ہیں۔

"کیوں جی تم سے کیوں کر ملیں۔ تم کو کیوں کر دیکھیں، کیوں کر سُنیں، اور نہ دیکھیں تو کیوں کر جئیں جو شخص ازلی عاشق مزاج ہو خیال کرو اُس کا کیا حال ہوگا"! (ص۱۶)

یہ کہنا صحیح ہے کہ داغ ازلی عاشق مزاج تھے۔ اس ضمن میں ایک بات ضرور یاد رکھنی چاہیئے، کہ ان کی عیّاشی یا عاشق مزاجی اشتہاری "رجسٹرڈ" قسم کی تھی۔ چور بازاری سے وہ بے واسطہ اور بہت دور تھے اور اس وقت سماج کا معاشرہ اور تمدنی شعار بھی ایسا ہی تھا۔ جب داغ نے اس دُنیا میں آنکھ کھولی تھی۔

خدا بخشے مرزا داغ جیسے بھی تھے رندِ بے ریا اور دل کے صاف تھے، اُن کو پھبتا ہے یہ کہنا۔

پندِ واعظ سنتے سنتے کان اپنے بھر گئے
کیا عبادت کو ہمیں تھے سب فرشتے مر گئے

باوجود اس ہانک پکار کے داغ نماز بھی پڑھتے اور روزہ بھی رکھتے۔

اصلاح اور تلامذہ سے برتاؤ

میر محمد تقی میر کا برتاؤ شاگردوں سے نہایت حوصلہ شکن تھا عجب نہیں جو اُن کے تلامذہ کی ایک تعداد نے مایوس ہو کر شعر کہنا ہی چھوڑ دیا ہو۔ اس میں اپنے اپنے مزاج کی افتاد کو بہت دخل ہے۔ مرزا داغ کا برتاؤ اصلاح اور مشورۂ سخن کے بارے میں میر صاحب کے سلوک کی ضد تھا۔ میر صاحب تو کبھی شاگرد کی غزل کی غزل کاٹ دیتے۔ نہ اُنھیں شاگرد کی چون و چرا سُننے کی برداشت تھی۔ داغ سب کچھ سن کر اس طرح سمجھاتے کہ اصلاح شاگرد کے ذہن نشین ہو جاتی۔

سیّد ابوالحسن ناطق گلاؤٹھی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آپ کی غزل درست کر کے واپس کی جاتی ہے۔ جس شعر پر چار صاد کئے گئے ہیں یہ مجھے پسند آیا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ ہر شعر میں کسی محاورے کا استعمال کرتے ہیں اور بیشتر کامیابی کے ساتھ مگر اس کا خیال رکھیے کہ شعر کے لئے محاورہ آ جائے۔ محاورے کے لئے شعر میں سقم نہ آنے پائے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ اس میں تصرّف جائز نہیں اگر آسانی کے ساتھ محاورہ بجنسہ بحر میں آ جائے تو نظم کر دیجئے ورنہ نہیں"۔ (ص۱۲۳)

محاورے کے استعمال کے بارے میں کتنی مشرح اور مفید ہدایت

کی ہے۔ داغ شاگردوں کے ساتھ بُردباری بن کا شکار نہ تھے۔ ناطق ہی کو لکھتے ہیں۔

"بہر حال یہ اچھی بات ہے کہ آپ نے محض میرے لکھ دینے پر اکتفا نہ کرکے تحقیق کی طرف قدم بڑھایا۔ یہ وہ جرأت ہے جو ہر نومشق کو نہیں ہوتی بمشقِ سخن کو بڑھایئے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس فن میں کامیاب ہوں گے۔

سید احسن مارہروی کو لکھتے ہیں۔

"اور شاگردوں کو کارڈ لکھ کر اطلاع دے دیجئے کہ استاد اس بات سے ناراض ہوئے۔ اگر اُستاد کے شاگرد بجائے خود اُستاد بن کر اپنی غزلیں بے اصلاح چھپوا دیتے ہیں اس میں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔" (ص ۱۳۳)

اِس معاملے میں مرزا صاحب کی ناراضی ٹھیک تھی جب اُنھیں اصلاح میں عذر نہیں تو اُن کے شاگرد اُن کے مشورے کے بغیر اپنا کلام گلدستوں میں کیوں چھپوائیں؟ اُوپر لکھا ہو . . . . . تلمیذ فصیح الملک مرزا داغ اور نیچے کلام میں ہو سُقم۔ اس کو کون پسند کرے گا۔

طرز کی تانیث و تذکیر کی بحث میں سب۔ احسن نے آفتابِ داغ میں سے ایک شعر نکال کے استاد کو بھیجا جس میں طرز کو مذکر باندھا گیا تھا۔ داغ نے جواب میں لکھا۔

"میں سفر میں حاضر حضور رہا، مجھ کو بات کرنے کی فرصت نہیں۔ یہ لکھنو والوں نے اصلاح دے کر چھاپا ہوگا۔ میں نے جو اس وقت آفتابِ داغ دیکھا تو اس میں طرز اپنی ہے جُدا لکھا ہے۔ طرز مونث ہے ہرگز مذکر نہیں۔" (ص ۱۳۵)

مرزا داغ کے تعلقات شاگردوں کے ساتھ مشفقانہ اور مخلصانہ تھے۔ کبھی کسی کو اِن کے خلاف بے اعتنائی یا بے توجہی کی شکایت نہیں ہوئی — لاہور کے مشہور اخبار زمیندار کے مالک مولوی ظفر علی خاں حیدر آباد میں ملازم تھے۔ مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ انھوں نے لارڈ کرزن کی کتاب "پرشیا" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اور "خیابانِ فارس" اس کا نام رکھا۔ استاد سے اس پر تقریظ لکھنے کی درخواست کی۔ مرزا داغ نے اس کتاب پر جو کچھ لکھا وہ بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر اس غرض سے کہ یہ تحریر مرزا صاحب کی اُردو نثر کا اکیلا نمونہ ہے۔ اتنی لمبی نثر کی ان کی اور کوئی تحریر موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ تقریظ ان کے اپنے قلم کی لکھی ہوئی ہے۔ لکھوائی ہوئی نہیں ہے۔ داغ اعلیٰ حضرت اور بعض دوسرے عمائد کو تو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اور باقی تمام خط شاگردوں کے نام ہوں یا احباب واقارب کے جواب میں ہوں وہ سب دوسروں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ بولتے جاتے تھے اور لکھنے والا لکھتا جاتا تھا۔ پھر خود اُسے پڑھتے اور دستخط کرتے یا مہر لگا دیتے۔ یہ کمال تھا کہ کبھی وہ دو دو تین تین لکھنے والوں کو مختلف خطوط لکھواتے جاتے تھے اور کسی میں عبارت یا مضمون بے ربط نہ ہوتا۔ وہ تقریظ یہ ہے۔

"مولوی ظفر علی خاں بی اے نے جو ایک لائق اور ہونہار نوجوان میرے دوست اور شاگرد ہیں۔ عالی جناب معلّٰی القاب حضور ہز اکسلینسی جناب نواب لارڈ کرزن وائسرائے بہادر کشورِ ہند کی یادگارِ زمانہ کتاب "پرشیا" کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ جس کا نام "خیابانِ فارس" رکھا ہے۔ اور جس کو بندگانِ عالی متعالی حضور نظامِ دکن دام اقبالہٗ نے اپنے نامِ نامی سے منسوب کئے جانے کی اجازت دے دی ہے۔ میں نے اِس ترجمے کو مختلف مقامات سے دیکھا۔ ترجمے کی مشکلات اور پابندیوں کے لحاظ سے نہایت مشکل ہے کہ مصنّف کا اصلی مقصد بھی فوت نہ ہو اور ساتھ ہی اس کے زبان کا لطف بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ زبانِ غیر کا ترجمہ اپنی زبان میں بجنسہٖ کرنا آسان بات نہیں ہے۔ یہ تو یقین ہے کہ انھوں نے مصنف کے اصلی مقصود کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ہوگا۔ اس لئے کہ نواب عماد الملک بہادر اور شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی نے ان کے اعلیٰ درجے کے انگریزی داں ہونے کی تعریف کی ہے، مگر جس حد تک اس ترجمے کو اردو زبان سے تعلق ہے میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ انھوں نے اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے۔

مولوی ظفر علی خاں کو میں مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ کتاب باعتبار لطفِ زبان بجائے ترجمے کے اصل کتاب معلوم ہوتی ہے۔ سلسلۂ بیان اس قدر باربط اور اتنا سلیس ہے کہ ایک انگریزی خواں نوجوان وہ بھی متوطن پنجاب ہو، اس سے ایسی توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ایسی اعلیٰ درجے کی بامحاورہ اردو میں اتنی ضخیم اور مبسوط کتاب کا ترجمہ بے تکلف کرنے پر قادر ہو سکے گا۔

"کتاب کی ذاتی خوبیوں اور ترجمے کی سلاست سے مجھے امید ہے

کہ نہ صرف اہلِ ملک بلکہ ہماری برٹش گورنمنٹ اور گورنمنٹ نظام اس کو ہاتھوں ہاتھ لے کر قدر افزائی کریں گے اور مترجم کی سعی و کوشش کی دل سے داد دیں گے"

فصیح الملک داغ دہلوی

۳۔ فروری ۱۹۰۲ء

ہدایت نامہ

اصلاح دینے میں مرزا داغ اسلوب کی چُستی اور زبان کی صحت و فصاحت پر زیادہ زور دیتے تھے۔ محاورے اور روزمرّے کا لحاظ سختی سے رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ایک قطعے میں کچھ ہدایتیں کی ہیں۔ اسی سے ان کی اصلاح کا عام معیار قائم کیا جا سکتا ہے۔ تخئیل محاکات وغیرہ کا اس میں ذکر نہیں، جن کا تعلق بڑھیا شاگردوں کی اصلاح سے تھا، جو نیا شاگرد ہوتا اُسے یہ ہدایت نامہ دیا جاتا۔ اس ہدایت نامے کا مطالعہ لُطف سے خالی نہیں۔ اس لئے یہاں دیا جاتا ہے۔

اپنے شاگردوں کو یہ عام ہدایت ہے مری — کہ سمجھ لیں تہِ دل سے وہ بجا و بے جا
شعر گوئی میں رہیں مدِّ نظر یہ باتیں — کہ بغیر ان کے فصاحت نہیں ہوتی پیدا
چست بندش ہو نہ ہو سست یہی خوبی ہے — وہ فصاحت سے گرا شعر میں جو حرف دبا
عربی فارسی الفاظ ہوں اردو میں نہیں — حرفِ علّت کا بُرا ان میں ہے گرنا دبنا
الف وصل اگر آئے تو کچھ عیب نہیں — لیکن الفاظ میں اُردو کے یہ گرنا ہے روا
جس میں گنجلک ہو تھوڑی بھی صراحت ہو وہی — وہ کنایہ ہے جو تصریح سے بھی ہو اولیٰ
عیب و خوبی کا سمجھنا ہے اک امرِ نازک — پہلے کچھ اور تھا اب رنگِ زباں اور ہوا
یہی اردو ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے — اہلِ دہلی نے اسے اور سے اب اور کیا
مستند اہلِ زباں خاص ہیں دِلّی والے — اس میں غیروں کا تصرف نہیں مانا جاتا
جوہری نقدِ سخن کے ہیں پرکھنے والے — ہے وہ ٹکسال سے باہر جو کسوٹی نہ چڑھا
بعض الفاظ جو دو آئے ہیں اک معنی میں — ایک کو ترک کیا، ایک کو قائم رکھا
ترک جو لفظ کیا اب وہ نہیں مستعمل — اگلے لوگوں کی زباں پر وہی آتا تھا مزا
گرچہ تعقید بُری ہے مگر اچھی ہے کہیں — ہو جو بندش میں مناسب تو نہیں عیب ذرا
شعر میں حشو و زوائد بھی بُرے ہوتے ہیں — ایسی بھرتی کو سمجھتے نہیں شاعر اچھا
گر کسی شعر میں ایطائے جلی آتا ہے — وہ بڑا عیب ہے کہتے ہیں اسے بے معنیٰ
استعارہ جو مزے کا ہو مزے کی تشبیہ — اس میں اک لُطف ہے اُس کہنے کا کیا کہنا
اصلاح اچھی مثل اچھی ہو بندش اچھی — روزمرہ بھی ہے صاف فصاحت کی جلا
ہے اضافت بھی ضروری مگر ایسی تو نہ ہو — ایک مصرع میں جو ہو چار جگہ بلکہ سوا
عطف کا بھی ہے یہی حال یہی صورت ہے — وہ بھی آئے متوالی تو نہایت ہے بُرا
لف و نشر آئے مرتّب وہ بہت اچھا ہے — اور ہو غیر مرتّب تو نہیں کچھ بے جا
شعر میں آئے جو ایہام کسی موقع پر — کیفیت اس میں بھی ہو وہ بھی نہایت اچھا
جو نہ مرغوبِ طبیعت ہو بُری ہے وہ ردیف — شعر بے لطف ہے گر قافیہ ہو بے ڈھنگا
ایک مصرع میں ہو تم دوسرے مصرع میں تُو — یہ شتر گُربہ ہوا میں نے اسے ترک کیا
چند بحریں متعارف ہیں فقط اُردو میں — فارسی میں عربی میں ہیں مگر ان سے سوا
شعر میں ہوتی ہے شاعر کو ضرورت اس کی — گر عروض اس نے پڑھا ہو وہ سخنور دانا
مختصر یہ ہے کہ ہوتی ہے طبیعت اُستاد — دین اللہ کی ہے جس کو یہ نعمت ہو عطا
بے اثر کے نہیں ہوتا کبھی مقبول کلام — اور تاثیر وہ شے ہے جسے دیتا ہے خدا
گرچہ دنیا میں ہوئے اور ہیں لاکھوں شاعر — کسبِ فن سے نہیں ہوتی ہے یہ خوبی پیدا

پند نامہ جو کہا داغ نے بے کار نہیں
کام کا قطعہ ہے یہ وقت پہ کام آئے گا

فصیح اللغات

احسن، مرزا صاحب کے خاص شاگردوں میں تھے، بہت قابل اور مستند ادیب اور شاعر تھے۔ مگر اُنھوں نے بہت جوشیلی طبیعت پائی تھی۔ میرا قیاس ہے کہ ادبی دنیا میں جو حسد اور مخالفت مرزا صاحب سے تھی وہ احسن جیسے پرجوش شاگردوں کے مبالغہ آمیز دعووں کی وجہ سے ہوگی۔ خیر۔ جناب احسن نے تجویز کی کہ کل محاورے جمع کئے جائیں اور داغ محاوروں کو مختلف اشعار میں باندھیں، اور اس مجموعے کا نام فصیح اللغات رکھا جائے۔ صاحبِ لغات تو شاعروں اور ادیبوں کے کلام سے محاورے اخذ کرتے ہیں۔ یہاں اُلٹی گنگا بہانے کی تجویز عارضِ دماغ ہوئی۔ عجیب مشورہ تھا، اور تعجب ہوتا ہے کہ داغ نے اس تجویز کو پسند کیا۔ یہی نہیں اس پر عمل ہونے لگا۔ ۳۔ ستمبر ۱۹۰۲ء کو احسن کو لکھتے ہیں۔

"فصیح اللغات کا کیا انتظام کر کے جائیے گا۔ یقین ہے الفاظ میرے پاس آئیں گے۔ جو آئے تھے اُن کے شعر میں نے بھجوا دئے پہلے جو الفاظ تم نے بھیجے تھے وہ میرے پاس سے گم ہو گئے"

اس خط کے نیچے احسن نوٹ میں لکھتے ہیں۔

"راقم الحروف جب حیدرآباد سے چلا آیا تو فصیح اللغات کے اشعار سند کا کچھ دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ میں وطن سے الفاظ لکھ بھیجتا تھا اور مرزا صاحب اس کے جواب میں اشعار لکھ کر بھیج دیتے تھے۔ افسوس کہ یہ سلسلہ جاری نہ رہا"

اور راقم مضمون کو خوشی ہے کہ سلسلہ جاری نہ رہا۔ فصیح اللغات کے لئے بڑے اہتمام کئے گئے تھے۔ احباب سے چندے لئے گئے۔ شاگردوں سے کتاب کی پیشگی قیمت وصول کرنے کے لئے خاص کارڈ چھپوائے گئے۔ معلوم ہوتا ہے شاگرد اور استاد دونوں دماغی توازن کھو چکے تھے۔ غرض کہ وہ بیل منڈھے نہ چڑھنی تھی نہ چڑھی۔ مگر یہ کام ایک اور شخص کے لئے محفوظ تھا۔

۱۹۱۸ء میں صاحب زادہ ولی احمد خاں ایم اے وزیر اعظم ریاست دوجانہ نے ایک ضخیم کتاب بڑی تقطیع کی شائع کی۔ جس میں وہ تمام محاورے جو مرزا داغ کے کلام میں آئے ہیں جمع کئے۔ اس کتاب کا نام محاورات داغ ہے۔ مرتب نے یہ التزام کیا ہے کہ ہر صفحے کے پانچ خانے ہیں۔ پہلے میں محاورہ لکھا ہے۔ دوسرے میں اس کی تشریح کی ہے۔ تیسرے میں مرزا صاحب کا وہ شعر نقل کیا ہے جس میں وہ محاورہ بندھا ہے، اور چوتھے خانے میں مرزا صاحب کی اُس کتاب کا نام ہے جس سے وہ شعر ماخوذ ہے۔ مثلاً مہتاب داغ، فریاد داغ وغیرہ وغیرہ

یہ تھا احسن صاحب کے کرنے کا کام، مگر وہ اُلٹے چل پڑے۔ محاورات داغ میں ۴۴۶۴ محاورے جمع کئے گئے ہیں۔ داغ کے مداحوں کو صاحب زادہ صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے۔

بھارت میں پُرامن اور دُوررس انقلاب

اوٹاکمنڈ میں ترقیاتی کمشنروں کی تیسری کانفرنس، ۲ مئی کو شروع ہوئی۔ پردھان منتری شری جواہرلال نہرو نے اس کانفرنس کو ایک پیغام بھیجا جس میں انھوں نے کہا کہ ہم اجتماعی ترقی کے پروگراموں کے ذریعے بھارت کی بنیادوں کو استوار کرکے نئے بھارت کی تعمیر کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ بڑی مسحور کن" ہم کوئی نہیں ہوسکتی۔ ہماری مساعی کا لازمی مقصد اس وسیع ملک میں پُرامن انقلاب لانا ہے۔ جس کے نتائج بہت دوررس ہوں گے۔" جو لوگ اس کام میں ہاتھ بٹا رہے ہیں اُن کو یہ مسرت اور فخر حاصل ہے کہ وہ ایسے تاریخی کارِ عظیم میں حصہ لے رہے ہیں، ہمیں کئی خطروں اور مشکلات کا سامنا ہے۔ ان میں بڑا خطرہ آسودہ خاطری ہے۔ جو کوئی بھی کسی طرح کی خوش فہمی میں مبتلا ہے وہ گمراہ ہے، اور اپنے راستے سے بھٹک گیا ہے۔ ہمیں اپنی اپنی جگہ پر کام کرنا ہے، اپنے علاقہ، گاؤں یا بلاک یا ریاست میں اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہمارا کام ملک بھر کے وسیع کام کا ایک حصہ ہے۔ ہر مرحلے پر تعاون اور اتحاد کی ضرورت ہے۔ ہمیں ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ ترقی کا راز مشترکہ کوششوں میں مضمر ہے۔ منصوبہ بندی کا مطلب مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے کام کو مربوط کرنا ہے۔ اس عظیم کام میں سرکاری افسروں اور عوام دونوں کو اپنا اپنا کردار سرانجام دینا ہوگا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر لازمی اہمیت رکھتے ہیں۔ سرکاری افسر اپنی تربیت اور منضبط خدمات کا تجربہ اور عوام اپنی اُمنگ اور وہ جوش و خروش اس کام میں شامل کریں۔ جو کسی بھی تحریک میں جان پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اس طرح ہمیں باہمی تعاون سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔

راجندر ناتھ شیدا

پریم چند اور ترقّی پسند نقّاد

اس گراں قدر مضمون سے ایک دل چسپ بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ اس موضوع سے متعلق سنجیدہ مضامین شکریے سے قبول کئے جائیں گے۔ (ادارہ)

پچھلے چند سالوں میں "ترقّی پسند" نقّادوں نے پریم چند پر جو کچھ لکھا ہے اُس سے پریم چند کی قدروں کا صحیح تعین اور خود ان نقّادوں کے نظریۂ تنقید و ترقّی پسندی کو سمجھنا دشوار ہو گیا ہے۔ یہ حضرات اُن کے دو تین ناولوں خصوصاً "گؤدان" سے چند مقامات اور کرداروں کا حوالہ دے کر اور دو چار افسانوں کا ذکرِ خیر کر کے بڑی آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ پریم چند ترقّی پسند تھے۔ یہ نتیجہ جس "اُلجھے ہوئے" "سائنٹیفک" طریقے سے نکالا جاتا ہے اُس سے غیر جانبدار پڑھنے والے کو علمِ کلام کی بُو آتی ہے۔ اور اگر کوئی واقعات اور ان نقّادوں کے دلائل میں ہم آہنگی کا فقدان محسوس کر کے اس فیصلے کی صحت میں شبہ کا اظہار کرتا ہے اور حقائق کا صحیح منطقی اصولوں کی روشنی میں جائزہ لے کر کسی دوسرے نتیجے پر پہنچتا ہے تو اس کے طریقۂ فکر کو میکانکی قرار دیا جاتا ہے، اس کی نیت معرضِ بحث میں آتی ہے، نیز یہ کہ اس کا مقصد پریم چند کی عظمت کو کم کرنا بتایا جاتا ہے — جیسے کہ ان کی عطا فرمودہ ترقّی پسندی کی اس اعزازی ڈگری سے محروم ہو کر پریم چند لامحالہ عظیم فن کاروں کی صف سے خارج ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ بڑا ادیب ہونا ایک بات ہے اور ترقّی پسند ہونا دوسری۔ بڑا ادیب ہونے کے لئے ترقّی پسند ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا ادیب ہونا ضروری ہے۔ اس پر ستم یہ کہ پریم چند کو مارکسی نقطۂ نظر سے ترقّی پسند نہ ماننے والوں کو پریم چند کے پردے میں گاندھی واد کے "باطل فلسفے" کا پرچارک اور سیاسی ذخیرہ اندوز بتاتے ہیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ادبی بحثوں کا یہ طریقہ نہایت نامناسب ہے۔ میں پوچھتا ہوں، اگر ترقّی پسند نقّادوں کے مطعون و معتوب ادیب کہیں کہ حضرات! "سیاسی ذخیرہ اندوزی" کا یہ مقدّس و مرصّع تاج تو آپ ہی کے مبارک سروں پر زیادہ زیب دیتا ہے تو اس بحث سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ میرا ترقّی پسند "دوستوں" کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ پریم چند کی ترقّی پسندی سے متعلق ایک خالص ادبی بحث کو جذباتی نعرہ بازی اور تہمت طرازی کا اکھاڑا نہ بنائیں بلکہ اس موضوع پر سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

پریم چند کو اگر وہ لوگ ترقّی پسند کہتے جو اخلاقیات، روحانیات اور اعلیٰ تر مذہب کی "عالمگیر اور ابدی قدروں" کے معتقد ہیں اور اپنے عقیدے کے مطابق انھیں چیزوں پر انسانی ترقّی کو منحصر تصوّر کرتے ہیں تو مجھے یہ سطریں لکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ اور اگر کچھ لکھا بھی جاتا اور کوئی اعتراض بھی ہوتا تو اس کی نوعیت بالکل مختلف ہوتی۔ لیکن جب پریم چند کو وہ لوگ ترقّی پسند قرار دیتے ہیں جو خود کو مارکسی کہتے ہیں اور مارکسی سمجھے اور بتائے جاتے ہیں تو ان کے ارشادات کا جائزہ لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

میں یہاں زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ فی الحال میرے زیرِ غور تین کتابیں ہیں (۱) احتشام حسین کی "تنقید اور عملی تنقید"۔ اس میں "پریم چند کی ترقّی پسندی" کے عنوان سے ۱۹۴۹ء کا لکھا ہُوا ایک مقالہ شامل ہے۔ (۲) علی سردار کی "ترقّی پسند ادب" (پہلی جلد)۔ یہ ۱۹۵۱ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کے چوتھے باب "حقیقت اور رومانیت" کے تقریباً بیس صفحے پریم چند کی نذر کئے گئے ہیں۔ اور (۳) ہنس راج رہبر کی "پریم چند" مطبوعہ ۱۹۵۰ء۔ اس کے آخری دو ابواب "آرٹ اور شہرت" میں پریم چند کے کام کی قدریں متعین کی گئی ہیں۔

سیّد احتشام حسین کے مقالے میں، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، موضوعِ بحث براہِ راست یہی مسئلہ رہا ہے۔ اس میں واقعات کی پردہ پوشی کی کوشش نسبتاً بہت کم ہے۔ وہ پریم چند کے نظریات کو زیادہ مسخ نہیں کرتے بلکہ خود نظریۂ "ترقّی پسندی" کو پریم چند کے جسم کے مطابق تراشنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے اگرچہ وہ "تاریخ کے مادّی تصوّر" والی

ترقی پسندی کی رُو سے پریم چند کو ترقی پسند نہ ماننے والوں کے اعتراض کو "بہت کچھ صداقت" پر مبنی مانتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس صداقت کو ادھوری بھی بتاتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اصرار ان کا بھی یہی ہے کہ پریم چند کو ترقی پسند تسلیم کیا جائے۔ لہٰذا اُن کے پیش کردہ دلائل پر بھی غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

پریم چند پر بحث کے دوران میں احتشام حسین کچھ ایسے حقائق بھی روشنی میں لے آتے ہیں جو خود اُن کے فیصلے کے خلاف غمازی کرتے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

سیاسی اضطراب اور سماجی کش مکش کے اس عبوری دور میں پریم چند کی شخصیت بھی وفاداریوں میں بٹ گئی تھی۔ وہ سرمایہ داری کے مخالف تھے لیکن انقلاب کی آواز پوری طاقت سے اس لئے نہیں بلند کرتے تھے کہ انقلاب میں عدم تشدد کا باقی رہنا یقینی نہیں۔ وہ مزدوروں اور غریبوں کے ترجمان تھے لیکن اُن کے حقوق حاصل کرنے کے لئے کسی انقلابی جدوجہد کے بجائے سمجھوتے اور صلح پسندی سے کام لینے کے طرفدار تھے۔ یہ طریقہ اسی تصوّرِ انقلاب سے ہم آہنگ تھا جس کی رہنمائی گاندھی جی کر رہے تھے۔ انھیں کسانوں کا درد تھا لیکن جاگیردارانہ نظام کو مٹا کر کسان راج قائم کرنے کا حوصلہ انھوں نے اپنے کرداروں میں نہیں پیدا کیا۔ "گوشۂ عافیت" میں زمیندار کسان کشمکش کی تصویر ہے۔ "چوگانِ ہستی" میں سرمایہ دار اور مزدور کا مسئلہ ہے "گئو دان" میں کسان، مزدور، سرمایہ دار، مہاجن، زمیندار برہمن، حاکم سب ہی آتے ہیں اور بعض جگہ ان کے مفاد کے تصادم کی حیرت انگیز تصویریں ملتی ہیں لیکن ان سب میں اس مستقبل کا واضح نقشہ نہیں ملتا جو کسان اور مزدور اپنی محنت سے بنا سکتے ہیں

زندگی کے داخلی پہلوؤں پر نگاہ ڈالتے ہوئے پریم چند کی حقیقت نگاری ان کے مخصوص اخلاقی عقائد، تصورات اور ذہنی کیفیات کے دھوئیں میں چھپ جاتی ہے۔ ایسے موقع پر وہ روحانیت، تصوّف، وجدان اور تقدیر کے چکر میں پھنس کر حقیقتوں کے سماجی پہلوؤں سے آنکھیں بچا جاتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ فطری واقعات کے غیر فطری یا فوق الفطرت حل تلاش کرنے لگتے ہیں

اور وہ تضاد جس کا ذکر کئی جگہ آ چکا ہے، نمایاں ہو کر انھیں حقیقت پسندی سے دور کر دیتا ہے۔

وہ طبقات کے ختم ہونے سے بہتری کے جو امکانات تھے اُن پر نظر نہ ڈال سکے۔

پریم چند کی تحریروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے باقاعدہ اشتراکیت یا مارکسزم کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔

ان کی گہری واقفیت ہندوستان کے کسانوں ہی کی معلوم ہوتی ہے۔ زیادہ تر کسانوں ہی کے سلسلے میں انھوں نے طبقاتی نظام پر نگاہ ڈالی ہے۔ اپنے آخری زمانہ میں پریم چند نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "مہاجنی تہذیب"۔ یہ مضمون کئی حیثیتوں سے مطالعے اور غور کے لائق ہے۔ کیونکہ اس سے جہاں ان کی ترقی پسندی پر روشنی پڑتی ہے وہیں ان کے ذہنی تضاد کا پتہ بھی چلتا ہے۔ سرمایہ دارانہ تہذیب کا مقابلہ جاگیردارانہ تہذیب سے کرتے ہوئے پریم چند نے سرمایہ داری کے غیر انسانی رویے اور لوٹ کھسوٹ کی پورے جوش کے ساتھ مذمت کی ہے لیکن اس سلسلہ میں وہ جاگیرداری کے مظالم اور عیوب کو نہ دیکھ سکے کیونکہ جاگیردارانہ تمدن میں انھیں قدیم ہندوستان کے راجپوتی دور کی وہ خصوصیتیں نظر آتی تھیں جنھیں وہ عزیز رکھتے تھے اور قومی کردار کی تعمیر کے لئے جنھیں وہ ضروری خیال کرتے تھے۔ سامنتی دور میں رحم دلی، سخاوت، صلہ، خدمت، بہادری، خودداری، شرافت نفس وغیرہ کی جو جگہ تھی پریم چند ان میں زندگی کا وہ بانکپن دیکھتے تھے جو مہاجنی دور میں مفقود ہے۔ مہاجنی دور میں دولت سے محبت کی جاتی ہے، جاگیرداری میں دولت جمع کرنے کی چیز نہیں شان سے خرچ کرنے کی چیز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی یہی اخلاقی قدریں اپنے سماجی رشتے سے الگ ہو کر محض مطلق قدروں کی شکل میں جگہ پا جاتی

ہیں اور پریم چند حقیقت کے پرستار ہوتے ہوئے بھی ثنابیت کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ مہاجنی تہذیب کے ساتھ انھوں نے مغربیت کو اور مغربیت کے ساتھ مادی نظامِ زندگی اور ریجانوی استعمار کو اسی طرح وابستہ کر لیا تھا کہ انھیں مغربی طرزِ فکر اور مغربی تعلیم میں عیوب ہی نظر آتے تھے۔ ذہن کا یہ پیچ در پیچ عمل جس کے لئے اُس وقت ہندستانی سیاسیات اور سماج دونوں میں جگہ تھی؛ پریم چند کو مکمل طور پر وہ معاشی نظام قبول کرنے پر آمادہ نہ کر سکا جسے اشتراکیت پیش کرتی ہے۔

پریم چند مذہب کے مخالف نہیں تھے لیکن وہ فرقہ پرست عناصر کے دشمن ضرور تھے۔ وہ ان مذہبی رسموں اور اداروں کا مذاق اڑاتے تھے جن میں خلوص سچائی اور روحانیت کی جگہ ریاکاری، عوام دشمنی اور نمائش کی نمود تھی۔

ان اقتباسات سے واضح ہے اور احتشام صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ پریم چند جاگیردارانہ تمدن کو عزیز رکھتے تھے اور اس دور کی خصوصیتوں کو قومی کردار کی تعمیر کے لئے ضروری خیال کرتے تھے۔ انھیں مہاجنی تہذیب میں، جسے وہ مادیت اور مغربیت سے تعبیر کرتے تھے، عیوب ہی عیوب نظر آتے تھے۔ وہ مذہب کے مخالف نہیں تھے۔ عینیت، روحانیت، تصوف، وجدان اور تقدیر کے جنجال میں پھنس جاتے تھے۔ ان کی ہمدردی زیادہ تر کسانوں ہی کی تھی۔ زیادہ تر کسانوں ہی کے سلسلے میں انھوں نے طبقاتی نظام پر نگاہ ڈالی تھی۔ نہ انھوں نے اشتراکیت کا باقاعدہ مطالعہ کیا تھا اور نہ وہ پوری طرح اشتراکی نظام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ تھے۔ وہ طبقات کے خاتمے سے حاصل ہونے والے فوائد پر نظر نہ ڈال سکے اور غریبوں کے حقوق حاصل کرنے کے لئے انقلابی جدوجہد کے عوض سمجھوتے اور صلح پسندی سے کام لینے کے طرفدار تھے کیونکہ انقلاب میں عدمِ تشدد کا باقی رہنا یقینی نہیں۔ نیز یہ کہ یہ طریقہ اُس تصورِ انقلاب سے ہم آہنگ تھا جس کی رہنمائی گاندھی جی کر رہے تھے۔

اس کے باوصف احتشام صاحب کا عقیدہ ہے کہ پریم چند ترقی پسند تھے۔ کیوں ـــ؟ اس لئے کہ ان کی نظر میں ترقی پسندی کوئی "ڈھلا ڈھلایا مشینی فلسفہ" نہیں ہے! ان کا ارشاد ہے کہ "مجموعی طور پر" پریم چند کے افسانے اور ناول پڑھنے والے یا ان کے خیالات کا مطالعہ کرنے والے کے دل و دماغ میں رجعت پرستی کے جذبات پیدا نہ ہوں گے بلکہ ظلم کے خلاف نفرت کا طوفان اُٹھے گا اور اُن کی رائے میں یہ ایک ایسی کسوٹی ہے کہ جس پر ہر دَور کے ترقی پذیر یا انحطاط پسند رجحانات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس نظریے کا انطباق پریم چند پر کرنے کے لئے وہ انھیں انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی دَور کا انسان کہتے ہیں اور اپنے دَور کے شعور کے اُن پہلوؤں کا ترجمان بتاتے ہیں جو غلامی پر آزادی کو، قدامت پرستی پر اصلاح کو، تنگ نظری پر بلند نگاہی کو، طبقاتی جبر اور ظلم پر انصاف اور مساوات کو، سامراج یا آمریت پر جمہوریت کو ترجیح دیتے تھے۔ ان باتوں کو جانچنے کے لئے تین چیزوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

(۱) کیا ظلم کے خلاف نفرت کا طوفان، آزادی، اصلاح، بلند نگاہی، انصاف، مساوات اور جمہوریت اضافی قدروں کی حامل نہیں ہیں؟ اگر ہیں تو ہمیں پریم چند کے یہاں ان قدروں کے مفاہیم کو صحیح طور پر سمجھ کر معاصر زندگی پر اُن کے اثرات کا جائزہ لینا ہوگا۔ اور ایسا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پریم چند کے دَور میں مارکس کے نقطۂ نظر سے رجعت اور ترقی کے رجحانات کا پتہ چلایا جائے۔

(۲) یہ کہنا کہ ترقی پسندی کوئی ڈھلا ڈھلایا مشینی فلسفہ نہیں ہے محض ان معنوں میں صحیح ہے کہ ترقی پسندی کی قدریں ابدی نہیں ہیں جنہیں ہر دَور اور ہر ملک کے حالات جانچنے کی کسوٹی قرار دیا جا سکے۔ اسے مختلف حالات میں طریقۂ پیداوار اور طبقاتی روابط کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ وہ ایک موقع پرستانہ تصور ہے جو ارتقائے حیات کے کسی فلسفے کا پابند نہیں۔ اس فلسفے کا ذکر اولاً مارکس کی مشہور تصنیف "سیاسی اقتصادیات کی تنقید" میں آتا ہے اور مارکسی ادب میں رفتہ رفتہ اس کی وضاحت ہوتی جاتی ہے۔ ستالین کی "جدلیاتی اور تاریخی مادیت" اور چینیوں کی "بنیاد اور ابیریل ڈھانچہ" تک پہنچ کر یہ فلسفہ اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے متعلق کسی ابہام کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اسے مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ:-

انسانی شعور (جس میں ادب بھی شامل ہے) مادی زندگی کی پیداوار ہے۔ کسی دَور کے طریقۂ پیداوار اور طبقاتی روابط (بنیاد) اس دَور

شعور (اوپری ڈھانچہ) کا تعین کرتے ہیں۔ جب ذرائع پیداوار میں ترقی ہو کر اس سے طریقۂ پیداوار میں تبدیلی ہونے لگتی ہے تو اس وقت کے طبقاتی روابط سماجی ترقی کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا نئے طریقۂ پیداوار کے علمبردار اور قدیم ذرائع پیداوار کے مالک طبقوں میں کشمکش واقع ہوتی ہے۔ اس میں اول الذکر کامیاب ہو کر نئے طبقاتی روابط کو جنم دیتا ہے۔ شعور (جس میں ادب، سیاست، اخلاق، مذہب، فنونِ لطیفہ اور ان سے متعلق تمام افکار شامل ہیں) عام طور پر تو ذرائع پیداوار کے مالک طبقے کا ساتھ دیتا ہے لیکن جمہوری ادوار میں اس کی وفاداری طبقوں میں بٹ جاتی ہے۔ غرض جو نظریات یا افکار اپنے وقت کے فنا آمادہ طبقے کے مفاد کی نمائندگی کرتے ہیں وہ رجعت پرست، اور جو اُبھرتے ہوئے طبقے کی علمبرداری کرتے ہیں وہ ترقی پسند ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ترقی پسند شعور وہ ہے جو نئی بنیاد (یعنی طریقۂ پیداوار اور طبقاتی روابط) کے قیام میں مدد دے کر سماجی ترقی میں معاون ثابت ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مارکس نے جاگیردارانہ نظام اور گھریلو صنعتوں کے مقابلے میں مشینی عہد اور سرمایہ دارانہ نظام کو ترقی پذیر قرار دیا تھا۔ جیسنوخوف کی مذکورہ تصنیف چونکہ براہ راست اسی مسئلے سے تعلق رکھتی ہے اس لئے اس کا ایک جملہ ملاحظہ ہو۔

"عام ترقی پسند خیالات کی طرح، سماج کو آگے لے جانے والے ترقی پسند نظریات نئی بنیاد کے قیام کے لئے جد و جہد کو تقویت پہنچاتے ہیں جس سے سماجی ترقی کی تحریک کو مدد ملتی ہے۔"

(صفحہ ۲، پیپلز پبلشنگ ہاؤس بمبئی ایڈیشن)

(۳) پریم چند کو انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور کا انسان بتانا سراسر غلط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز موجودہ صدی کے ساتھ ہوتا ہوا نظر آتا ہے لیکن اس کا اہم حصہ پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے سے وفات تک ہے۔ لہٰذا اُن کے ادب کو ترقی پسند قرار دینے کے لئے اسی زمانے میں طریقۂ پیداوار، طبقاتی کشمکش، اور شعور کی بیداری کو سمجھنا اور اس کسوٹی پر ان کے شعور کو پرکھنا ہوگا۔

میں پریم چند کی ادبی زندگی میں ابتدائی بیس سالوں کو جو پچھلی صدی میں گذرے اس لئے کوئی خاص اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں کہ اس عمر میں شعور بہت تیزی سے ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔ پریم چند کے ادب میں اس کے اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بیسویں صدی میں یقیناً ان کا ادبی شعور بننا شروع ہوا جس کی تحریکیں، اداروں اور مہاتما گاندھی سے انھوں نے جاگیردارانہ تمدن کا بانکپن اور اخلاقی قدریں اخذ کیں۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے پہلی جنگِ عظیم کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اُن کا پریم چند پر بہت گہرا اثر ہے مگر ۱۹۲۰ء سے کچھ قبل ان کے شعور کے ارتقا میں ایک طرح کا ٹھہراؤ محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آئندہ بھی ان کے یہاں زندگی کے نئے مسائل اور واقعات کو سمجھنے کی کوشش ملتی ہے لیکن اُن کا نقطۂ نگاہ برابر وہی رہتا ہے جو اب تک بن چکا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں یوں بھی پریم چند پچاس برس کے تھے۔ عمر کی اس منزل پر پہنچ کر انسان کے لئے اپنے فکر و عمل کے بنیادی محرکات میں تبدیلی پیدا کرنا تقریباً غیر ممکن ہوتا ہے۔ پریم چند اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ زندگی برابر آگے بڑھتی جا رہی تھی قوم کے شعور کے تہہ خانے کھلتے جاتے تھے۔ لیکن پریم چند کا ذہن اُن کے اندر داخل نہیں ہوتا وہ ان تہہ خانوں میں محض باہر سے جھانکتے ہیں۔ وہ ان کی تاریکی دیکھ سکتے ہیں، روشنی نہیں۔ وہ بڑی صنعتوں اور ان سے رونما ہونے والے حالات اور تحریکات کے نقصانات سے تو واقف ہیں فائدوں سے نہیں اور نہ ہی وہ معاصر زندگی میں ان کی انقلابی اہمیت کے معترف ہیں۔ مختصر یہ کہ اُن کے نظریات نئی واقتصادی بنیاد کے قیام کی جد و جہد کو تقویت پہنچانے کے عوض سماجی ترقی کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔ پریم چند کی قیمت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ جو چیزیں احتشام صاحب نے ان کا طرۂ امتیاز بتائی ہیں وہ بھی تسلیم۔ مگر ہیں وہ سب ابدی قدریں ہی جنھیں روحانیات اور اخلاقیات کے اصولوں سے نہیں بلکہ عملی زندگی کے تقاضوں سے پرکھنا چاہیئے۔ روس کے تقریباً ایسے ہی حالات میں طالسطائی کے کم و بیش ایسے ہی خیالات کے متعلق لینن نے اپنے مضمون "طالسطائی اور اس کا عصر" میں کہا تھا کہ

"یہ نقطۂ نظر مشرقی قوموں کے جاگیردارانہ نظام کا جس کا تختہ الٹ چکا ہے، محض نظریاتی پرتو ہے"

احتشام صاحب نے "گئودان" کو پریم چند کی ترقی پسندی کی شہادت کے طور پر پیش کیا ہے اور اس کا مزید ثبوت بہم پہنچانے کے لئے لکھا ہے کہ انھوں نے انتقال سے چند مہینے پیشتر ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی صدارت کی۔

"گئودان" کے بارے میں چونکہ سبھی "ترقی پسند" نقاد کم و بیش ایک سی باتیں کہتے ہیں۔ اس لئے اس کا ذکر ذرا تفصیل سے مناسب مقام پر کیا

جائے گا۔ رہی پہلی کانفرنس کی صدارت ۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس ضمن میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ پریم چند نے نوجوان ادیبوں کی وہ دعوت محض یہ سمجھ کر قبول کی تھی کہ یہ لوگ ادب کو روائتی خرافات سے پاک کر کے اس کے ذریعے سے سماج کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ مگر محض اس بات پر اتفاق رائے ہونے کو نظریاتی اور جذباتی ہم آہنگی قرار دینا غلط ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ پریم چند نے اپنے وقت کے دوسرے کانگریسی رہنماؤں کی طرح یا تو اس وقت کے کمیونسٹوں کی ہمت افزائی کے لئے ایسا کیا اور یا اُن کے نظریات اور مقاصد کو بخوبی نہ سمجھ کر۔

سید احتشام حسین نے ایک جگہ پریم چند کے ابدی قدروں سے ناتا توڑ لینے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کو سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پریم چند اواخر حیات تک سادگی و قناعت، ایثار و خدمت، خلوص و محبت، انصاف و مساوات اور خودداری و محنت ایسی "ابدی قدروں" کے معتقد رہے اور ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ اگر ہمارا دل صاف اور عزم راسخ ہے تو ہم ان کے ذریعے سے انسان کے لئے ایک جنت بنا سکتے ہیں۔ اتنی بات البتہ صحیح ہے کہ انھیں جب ریاکاری اور ناانصافی ان ابدی قدروں کا بہروپ بھرے ہوئے نظر آتی تھیں تو وہ بے رحمی کے ساتھ ان کا پردہ چاک کرتے تھے۔ ساتھ ہی وہ سیاسی اقتصادی اور سماجی حالات سے عادتیں بدل جانے کے بھی قائل تھے اور اس لئے اکثر اوقات انھیں سماج کے مظلوم گروہوں سے ہمدردی بھی ہوتی تھی۔ لیکن یہ باتیں نہ پریم چند کے ساتھ مخصوص ہیں اور نہ اُن کے دور کے ساتھ جاگیردارانہ نظاموں کے بہت سے مفکروں نے ایسا ہی سمجھا اور کہا ہے۔ ہاں جو بات پریم چند اپنی پوری زندگی کی کسی منزل پر بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکے تھے وہ یہ ہے کہ مذکورہ ابدی قدریں کسی مخصوص اقتصادی نظام کی پیداوار یا پرتو ہیں اور اپنی بے لوث صورت میں بھی ہمعصر مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتیں کیونکہ یہاں پہنچ کر روحانیت کا مادیت سے تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علی سردار جعفری کو پریم چند کے انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے انسان ہوتے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ انھیں شاید اس طرح پریم چند کے شعور کی خامیوں کے لئے وقت میں ارتقائی جواز تلاش کرنا مناسب یا ممکن نظر نہیں آتا۔ ان کی تحریر کے مطابق، جو یقیناً زیادہ واضح اور صحیح ہے، اگرچہ پریم چند کی ادبی کاوشوں کی ابتدا بیسویں صدی کے آغاز ہی میں ہو گئی تھی لیکن اُن پر شباب پہلی جنگ عظیم کے بعد آیا۔

سردار نے بھی پریم چند کے نظریات میں تضاد تھا کر اُن کے نقائص کی طرف اشارے کئے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ پریم چند اپنے "مل کی نیکی ظالموں کے دلوں میں ڈال کر" بعض اوقات "بڑے کرداروں کو قلب ماہیت کے ذریعے سے اچھا بنا دیتے ہیں۔ جو حقیقت نگاری کے اصول کے خلاف ہے۔ ان کے ناولوں اور کہانیوں کا بنیادی نقطہ کوئی سماجی یا معاشی مسئلہ ہوتا ہے لیکن اس کا حل سماجی یا معاشی نہیں ہوتا بلکہ انفرادی ہوتا ہے۔ وہ انقلاب کی بجائے انفرادی اور روحانی سدھار کی طرف چلے جاتے ہیں اور ایسا آدرش وادی طریقہ پیش کرتے ہیں جو ممکن العمل نہیں۔ یہاں علی سردار کی کتاب سے چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:

> "وہ پریم چند افسانوں کی تباہی اور بربادی، گاؤں کی ویرانی، شہروں میں سرمایہ داری کی لعنت اور موجودہ سماج کی حیوانیت کو اچھی طرح دکھاتے تھے۔ لیکن اس لعنت اور حیوانیت کو کیسے ختم کیا جائے یہ بتانے سے قاصر رہتے تھے لیکن بتانا ضرور چاہتے تھے کیونکہ انھوں نے اپنے فن کے لئے ایک مقصد قرار دیا تھا کہ فن کا کام حقیقت کو تبدیل کرنا ہے۔ اس لئے انھوں نے ایک آسان طریقہ نکال لیا تھا۔ اگر تمام آدمی نیک، راست باز اور پارسا بن جائیں تو سماج کے سارے دکھ درد کا علاج ممکن ہے اور اگر وہ سماج میں نہیں تو کم از کم اپنی کہانیوں اور ناولوں میں تو بُرے کو اچھا اور تاریک کو روشن بنا ہی سکتے تھے۔ یہ راستہ دکھانے میں ٹالسٹائی اور گاندھی جی کے فلسفے کو بھی بڑا دخل تھا جس سے پریم چند بہت متاثر تھے۔"

احتشام حسین نے بھی باتیں تقریباً ایسی ہی کہی ہیں لیکن وہ تمام خامیوں کے باوصف پریم چند کے کام سے بحیثیت مجموعی مطمئن نظر آتے ہیں، وہ حقیقت کو تبدیل کرنے کی بحث میں زیادہ نہ اُلجھ کر اُن کی نیک نیتی، وسیع النظری، انصاف پسندی اور انسان دوستی پر زور دیتے ہیں جبکہ علی سردار پریم چند کے یہاں انقلاب کے "آدرش وادی" طریقے کو سماج کے معاشی مسائل کا انفرادی، غیر ممکن العمل اور غلط حل بتاتے ہیں۔ یہاں یہ بحث خود بخود

پیدا ہوتی ہے کہ اس قسم کے آدرش وادی نظریات کی تلقین مادی زندگی کی ہمعصر جدوجہد میں ترقی کی قوتوں کو ابھارتی ہے یا ان کی راہ میں حارج ہو کر رجعتی رجحانات کو قوت بخشتی ہے۔ علی سردار اس کی تفصیلات میں نہیں پھنستے کیونکہ ایسا کرنے سے کہہ سکے نہیں ترکستان کے راستے کا دروازہ کھل جاتا ہے اور اس کے لیے شاید وہ تیار نہیں۔ اس لئے وہ یہ کہہ کر صبر کر لیتے ہیں کہ پریم چند کے خواب "کچے" اور "ادھورے" تھے۔ نیز یہ کہ "اُس زمانے میں" ان خوابوں کا دیکھنا بھی ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اور یہ حقیقت کہ کسان بجائے خود آزاد نہیں ہو سکتا اور اُسے مزدور طبقے کے اتحاد اور امداد کی ضرورت ہے، پریم چند کی نظر میں تو کجا سیاسی رہنماؤں کی نظر میں بھی نہیں تھی!

سردار نے "اُس زمانہ" کی وضاحت نہیں کی۔ لیکن موضوع بحث کے پیش نظر شاید یہ اندازہ لگانا غلط نہ ہوگا کہ ان کی مراد اُس زمانے سے ہے جس میں پریم چند کی اہم تصنیفات وجود میں آئیں۔ ایسی صورت میں کہنا پڑے گا کہ انھوں نے شاید قوم کے شعور کی بیداری کا اندازہ اپنے شعوری ارتقا سے لگایا ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ پریم چند روسی انقلاب کے انیس برس بعد تک حیات رہے اور آخری وقت تک کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ نہ تو اکتوبر کا روسی انقلاب ہی کوئی ایسا واقعہ تھا جو پوری دنیا کی انقلابی تحریکوں کی فکری فضا پر گہرے اثرات نہ چھوڑتا اور نہ ہی اُس وقت کے ہندوستانی اس قدر غافل تھے کہ وہ تاریخ عالم کے اس بڑے واقعے کو سمجھنے کی کوشش نہ کرتے حقیقت یہ ہے کہ سامراج کی عائد کردہ تمام پابندیوں کے باوجود یہاں رفتہ رفتہ اُس انقلاب، اشتراکیت، روسی زندگی اور خصوصاً وہاں کے پنج سالہ منصوبوں میں دلچسپی بڑھتی گئی اور ۱۹۳۶ء تک ہندوستان میں بہت سے لوگوں کو ان چیزوں کے متعلق اچھی خاصی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ یہ سوال مختلف ہے کہ ان میں کتنے آدمی اشتراکیت کے پیش کردہ اصولوں سے پوری طرح متفق تھے کیونکہ کسی بات کو جاننا ایک بات ہے اور اس کا قائل ہونا دوسری۔ ان حالات میں یہ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں "یہ حقیقت کہ کسان بجائے خود آزاد نہیں ہو سکتا اور اُسے مزدور طبقے کے اتحاد اور امداد کی ضرورت ہے" "سیاسی رہنماؤں" کی نظروں سے بھی پوشیدہ تھا یہ نظریہ تو اشتراکی فکریات میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

* سیاسی رہنماؤں' سے کون سی جماعت کے رہنما مراد ہیں اس کی بھی وضاحت

کی سردار نے نہیں کی۔ ممکن ہے یہ لکھتے وقت ان کے پیش نظر کانگریس، کانگریس سوشلسٹ اور کمیونسٹ سبھی رہے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ بھی حیرت انگیز ہے۔ میں یہاں تینوں جماعتوں کے مقتدر رہنماؤں کے اقوال نقل کرتا ہوں۔

پنڈت جواہر لال نہرو "میری کہانی" میں "ٹریڈ یونین کانگریس" کے عنوان سے ۲۷-۱۹۲۶ء کے قریب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> "ہندوستان میں میں سماج واد کے میدان میں سب سے پہلے نہیں آیا۔ بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ میں کچھ پچھڑا ہوا رہا۔ جہاں بہت سے لوگ ستارے کی طرح چمکتے آگے بڑھ گئے وہاں میں تو بہت کچھ مشکلوں کے ساتھ قدم قدم آگے بڑھا۔ وچار دھارا کی درشٹی سے مزدوروں کا ٹریڈ یونین اندولن نشچت روپ سے سماج وادی تھا اور زیادہ تر یوتھ سنگھوں کی بھی یہی بات تھی ...... ایک سماج وادی کاریہ کرتا کی حیثیت سے میرا مہتو صرف اس بات میں تھا کہ میں ایک مشہور کانگریسی تھا اور کانگریس کے بڑے عہدوں پر تھا۔ میرے علاوہ اور بھی بہت سے کانگریسی تھے جو میری ہی طرح سوچنے لگ گئے تھے۔ یہ پرورتی سب سے زیادہ یکت پرانت کی پرانتیہ کانگریس کمیٹی میں پائی جاتی تھی... انڈیپنڈنس آف انڈیا لیگ کی سیوکت پرانتیہ شاکھا میں صوبے کے خاص خاص کانگریسیوں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ اور یہ شاکھا نشچت روپ سے سماج واد کو ماننے والی تھی اس لئے وہ سامیہ واد کی طرف اور کانگریس کمیٹی سے جس میں سب طرح کے لوگ تھے، کچھ آگے چلی گئی۔"

آچاریہ نریندر دیو نے مئی ۱۹۳۴ء میں آل انڈیا کانگریس سوشلسٹ کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں کہا:-

> "باہمی تنظیم اور مفاہمت پیدا کر سکنے کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے کسان ساری دنیا میں بدنام ہیں۔ اگر انھیں انہی کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ حالات کے ناقابل برداشت ہو جانے کی صورت میں محض یکایک شورشوں کے ذریعے سے احتجاج کر سکتے ہیں۔ آئرلینڈ اور روس میں یہی ہوا اور ہندوستان اس سے مستثنیٰ نہیں...... ہندوستانی مزدور سرمایہ داری کا

تحفظ کے لئے خود کو منظّم کر رہے ہیں۔ انھوں نے سامراجیوں اور سرمایہ داروں کی ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے...... اس ملک میں اشتراکیت کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہیں۔ اس کو روز بروز کانگریس اور ملک دونوں میں قوت اور قبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ کانگریس کے اندر اس نئے مکتبِ خیال کا حامل جمہوریت پسند تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔ کانگریس سے باہر اس کے ماننے والے زیادہ تر مزدوروں کے اور اُن سے بہت کم کسانوں کے نمائندے ہیں۔ یہی دراصل سامراج کے خلاف جدوجہد کے انقلابی عناصر ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ مزدور جدوجہد کا ہراول دستہ ہیں اور کسان اور تعلیم یافتہ لوگ صرف اس کے مددگار۔

ایس، اے ڈانگے ہندوستان میں ٹریڈ یونین تحریک کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۸ء کے درمیان کمیونسٹوں کے پیش رو گروہوں نے مزدوری گھٹانے کے خلاف بڑی بڑی ہڑتالوں کی رہنمائی کی۔ ان میں عظیم الشان فتوحات حاصل کیں اور بڑی بڑی ٹریڈ یونینیں بنائیں یہ سب یونینیں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس ہی سے ملحق تھیں۔ ان میں کوئی بھی طبقاتی مفاہمت کی تلقین نہیں کرتی تھی وہ دلیری کے ساتھ سیاسی آزادی کے مطالبے کی تائید کرتی تھیں، بین الاقوامی تحریک میں شریک ہوتی تھیں۔ وہ صنعتی یونینیں تھیں اور مزدوروں کی قیادت کو آگے بڑھا رہی تھیں۔"

ان شواہد کے ہوتے ہوئے یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے "سیاسی رہنما" "اُس زمانہ میں" اشتراکیت کے موٹے موٹے خطوط سے بھی ناواقف تھے۔ میں سمجھتا ہوں ان حالات میں لوگ یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جعفری کی غلط بیانی نتیجہ ہو سکتی ہے صرف دو چیزوں کا، یا تو انھوں نے قوم کے سیاسی شعور کے ارتقا کا تجزیی مطالعہ نہیں کیا ہے اور یا وہ پریم چند کی "ترقی پسندی" کو اُبھارنے کے لئے ہمعصر واقعات کے پس منظر کو جان بوجھ کر پھیکا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ایک اور مقام پر سلی اسردار لکھتے ہیں:۔

"میں مام پلاس شرما کا ہم خیال ہوں کہ لینن نے طالسطائے کو جس نظر سے دیکھا تھا ہمیں اس نظر سے پریم چند کو دیکھنا اور پرکھنا چاہیئے۔ طالسطائے کے زمانے کے روس اور پریم چند کے زمانے کے ہندوستان کے حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے بھی ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ طالسطائے کی طرح پریم چند نے بھی اپنے ادب میں اس صحت مند نفرت کی ترجمانی کی ہے جو عوام اور خاص طور سے کسانوں کے دل میں سماجی نظام کے خلاف بھری ہوئی تھی...... لیکن ساتھ ہی طالسطائے کی طرح اُن کے خواب ادھورے تھے اور انقلاب کا پیچیدہ عمل اور اس کی راہیں واضح نہیں تھیں۔"

پریم چند کو اُس نظر سے "دیکھنے اور پرکھنے" کا خیال جس سے لینن نے طالسطائے کو دیکھا تھا معقول نظر آتا ہے۔ کیونکہ ایک طرف پریم چند اور طالسطائے اور دوسری طرف ان کے زمانوں کے ہندوستان اور روس میں کچھ باتوں میں فرق ہونے کے باوجود اُن میں ایک بہت بڑی حد تک مطابقت بھی تھی۔ یہ دونوں ادیب سرمایہ داری کے دشمن تھے۔ دونوں نے اپنے زمانوں کے سماجی اور سیاسی نظاموں پر زبردست حملے کئے، عدالتوں پر کڑی تنقیدیں کیں۔ دونوں نے مخصوص ہمعصر شورشوں، خصوصاً کسانوں کی زبوں حالی اور اس سے پیدا ہونے والی بغاوتوں کی بڑی حد تک صحیح اور مخلصانہ تصویریں پیش کیں اور انھیں تقویت پہنچائی۔ دونوں نے حکام کے مظالم کی پردہ دری کی اور مذہبی اداروں اور اُن کے سہارے پلنے والوں کی ریاکاری اور عوام دشمنی کو بے نقاب کیا۔ مذہبی رسوم کا مذاق اڑایا مگر ساتھ ہی دونوں نے سماجی بیماریوں کا علاج روحانیت اور اعلیٰ تر مذہب میں تلاش کیا۔ دونوں صنعتی دَور اور اُس کی تہذیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے خائف تھے اور عوام کو پاکیزہ اور اصلاح شدہ دیہی معاشرت کے فردوس میں لے جانے کی تمنا رکھتے تھے۔ جہاں تک انقلابی طریقِ کار کا تعلق ہے دونوں عدم تشدد کے ذریعے سے نظامِ حیات کو بدلنے کے قائل تھے اور نیکی، خدمت، ایثار اور مخلصانہ عمل کی فطری اور غیر فطری قوّت پر ایمان رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ دونوں نے منظّم مزدوروں کی تحریکوں کو عموماً ہمدردانہ نظر سے دیکھا اور کسانوں کی انقلابی صلاحیت کو مزدوروں کی جدوجہد پر ترجیح دی۔

مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے "ترقی پسند" احباب پریم چند پر تبصرہ فرماتے ہوئے طالسطائے سے متعلق لینن کے خیالات سے بھی استفادہ نہیں کرتے۔

اس میں شک نہیں کہ لینن طالسطائے کی عظمت کا قائل اور معترف ہے۔ کسانوں کی زندگی کے مشاہدہ، ظلم اور ریاکاری کے خلاف علم جہاد بلند کرنے اور غیر معمولی فنکارانہ صلاحیتوں کے باعث لینن نے طالسطائے کو دنیا بھر کے چوٹی کے ادیبوں میں شمار کیا ہے لیکن لینن نے اُسے ہمارے فاضل نقادوں کی طرح "ترقی پسند" کبھی نہیں بنایا۔ طالسطائے کا مزدوروں کی تحریک کو قرار واقعی اہمیت نہ دینا، سماج کے مسائل کا حل مذہب اور روحانیت میں تلاش کرنا اور کسانوں کی شورشوں اور عدم تشدد کے ذریعے سے دیہی معاشرت کے اعادہ کے خواب دیکھنا لینن نے بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ لہٰذا اُس نے طالسطائے کے ادب کو ہم عصر سماجی کشمکش کا ناقص آئینہ قرار دیا ہے۔ میں زیادہ تفصیلات میں نہ جا کر یہاں لینن کے مضمون "طالسطائے اور اس کا عصر" سے صرف ایک جملہ نقل کروں گا جس سے لینن کی نظر میں طالسطائے کے کام کی قدروں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

> <u>طالسطائے کا نظریہ یقیناً ایک طرح کا ہوائی قلعہ ہے جو خیالات</u>
> <u>کے لحاظ سے نہایت صحیح اور واضح معنوں میں رجعت پسندانہ ہے</u>
> لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ نظریہ اشتراکی نہیں ہے
> یا اُن عناصر سے خالی ہے جن سے ترقی یافتہ طبقوں کو اپنی معلومات
> میں اضافہ کرنے کے لئے مفید مواد حاصل ہو سکتا ہے۔

ترقی پسند نقادوں کو اس جملے کا ایک ایک لفظ بہت غور سے پڑھنا چاہئے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے کہ طالسطائے کے ادب میں مفید مواد کا وجود تسلیم کرنے کے باوصف لینن نے اس کے نظریے کو "نہایت صحیح اور واضح معنوں میں رجعت پسندانہ" کیوں کہا ہے۔ ایک جگہ لینن نے طالسطائے کی پاکیزہ مذہب و تلقین کو مظلوم عوام کے حق میں "لطیف تر زہر" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ پریم چند پر غور کرتے وقت اس کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

میں یہاں پھر عرض کروں گا کہ ۱۹۳۰ء میں پریم چند کی عمر پچاس برس کی تھی۔ اُس وقت تک اُن کا شعور پختہ ہو چکا تھا۔ اس کے محرکات قائم اور مستحکم ہو چکے تھے اس لئے انھوں نے اشتراکیت کی "مادیت" اور "مغربیت" کو مشرقی روحانیت کا نعم البدل نہیں سمجھا۔ اس کے علاوہ اگرچہ ہندوستان میں مشینی صنعت اچھی خاصی ترقی کر چکی تھی اور منظم مزدوروں کی تحریک سب اہم مسئلہ پر غور و فکر کی دعوت دے رہی تھی لیکن پریم چند نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی۔ دیہی معیشت اور معاشرت میں انھیں جو دل چسپی تھی اور مجبوری طور پر گاندھی جی کا جادو اُن پر تھا اُس کے پیش نظر بڑے پیمانے پر صنعت کا فروغ اور پرولتاری آمریت کا تصور دونوں ہی اُن کے نظریۂ حیات کے خلاف پڑتے تھے۔ وہ سماج میں طبقوں کے وجود کے قائل تھے اور ایک حد تک طبقاتی نظام کے شعور پر اثر انداز ہونے کے بھی، لیکن وہ سماج کو بدلنے کے لئے کسی ایسی جدوجہد کو غیر ضروری سمجھتے تھے جس میں لوٹ کھسوٹ کا شکار کوئی طبقہ انصاف حاصل کرنے کے لئے اجتماعی طور پر تشدد کا استعمال کرے۔ اشتراکیت میں ان کی دل چسپی زیادہ تر انسان دوستی اور انصاف پسندی ایسے اخلاقی اور روحانی محاسن پر مبنی تھی۔ ایسا شخص شہری زندگی کی بڑھتی ہوئی "بدعتوں" کے دیہات کی سیدھی سادہ اور قانع زندگی پر حملے برداشت نہیں کر سکتا۔ زمین کی آبادی کا بوجھ بڑی صنعتوں کی طرف منتقل کرنے کا نظریہ بھی اس کے لئے اطمینان کا باعث نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے خیال سے محض سطح زندگی کو بلند کرنے کے لئے دیہاتیوں کو شہری زندگی کا سبز باغ دکھایا جاتا ہے جو اگر ایک طرف قناعت کے منافی ہے تو دوسری طرف دیہی معیشت کو جو اُس کی نظر میں مثالی ہو سکتی ہے، برہم کرتا ہے۔

پریم چند کے خواب ادھورے تھے یہ تو مانا جا سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایک مخصوص نظریۂ حیات و انقلاب کا ضروری حصہ تھے۔ اُن کے غلط اور صحیح، مضر اور مفید ہونے سے تو بحث کی جا سکتی ہے لیکن انھیں "کچے" یا ادھورے کہہ کر پریم چند کے نظام فکر میں اُن کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ سماج کا دکھ درد دور کرنے کے لئے انھوں نے جو نسخہ تجویز کیا اور اپنے ادب کے ذریعے سے قوم کے فکر و عمل پر جو اثرات ڈالے اُن کی نوعیت، افادیت اور مضرت کو سمجھنا اور پرکھنا اُن کے ادب میں "صحت مند نفرت" کی تجلیات دیکھنے سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ یہی اثرات آخر کار سماج میں ترقی اور رجعت کی قوتوں کو کمزور اور قوی بناتے ہیں اور انھیں پر "ترقی پسند" کا دار و مدار ہے۔

سردار جعفری نے یہ بھی انکشاف فرمایا ہے کہ آخر عمر میں پریم چند کے ادب کا مقصد "سماجی تبدیلی" تھا! لیکن انھیں یہ افسوس ہے کہ قبل اس کے کہ وہ اپنے لافانی ادب کے ذریعے سے اس عقیدت کو عملی جامہ پہناتے موت کے ظالم ہاتھوں نے انھیں ہم سے چھین لیا! اور یہ کہ اگر وہ زندہ رہتے تو اس عہد کے سب سے بڑے انقلابی ادیب ہوتے!

ان الفاظ میں خوش عقیدگی زیادہ ہے اور حقیقت کم۔ علی سردار صاحب کو مطمئن رہنا چاہیے۔ پریم چند ادب کے ذریعے سے سماج کو تبدیل کرنے کے واقعی قائل تھے اور اس عقیدے کو ایک مدت تک اپنی پسند کا جامہ پہناتے رہے مگر یہ جامہ کس حد تک انقلابی تھا یہ سوال الگ ہے۔ ہاں اگر اُن کا قیاس یہ ہے کہ اگر پریم چند اور زندہ رہتے تو اس جامے کا رنگ تبدیل ہو جاتا تو میں نہایت انکسار کے ساتھ اتنا عرض کروں گا کہ وہ یقیناً غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ میرے خیال سے تو اگر پریم چند کی فراخ دلی اور صلح پسندی کسی طرح ۱۹۴۲ء کی خلیج کو بھی عبور کر جاتی تو وہ بمبئی پہنچ کر یقیناً دم توڑ دیتی اور اس کے بعد نقاد موصوف کو ان محبت آمیز الفاظ میں اظہارِ افسوس کرنے اور قیاس کے گھوڑے دوڑانے کی سعادت سے محروم ہونا پڑتا!

پریم چند کے کام پر رہبر صاحب کا تبصرہ اور بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ پریم چند سے اس لئے ناخوش ہیں کہ انھوں نے ادب کو "تنقیدِ حیات" بتایا ہے۔ اپنے نظریۂ تنقید کی وضاحت کرتے ہوئے رہبر نے ادب کی تین منزلیں قائم کی ہیں۔ تنقیدِ حیات کو ادب کی پہلی منزل قرار دیا گیا ہے، دوسری منزل ترغیبِ عمل ہے جس تک، اُن کا خیال ہے خود پریم چند پہنچ چکے تھے۔ ہنس راج کی نظر میں ادب کی تیسری دشوار گذار منزل، جہاں پہنچ کر ادیب کا اصل امتحان ہوتا ہے، "عمل کو کامیابی کے ساتھ اپنے فطری نتیجہ تک لے جاتا ہے۔ اس کسوٹی پر کسنے سے رہبر کو پریم چند کی ذہنی حدود کا پتہ چل جاتا ہے کیونکہ اُن کے خیال سے جب عمل پریم چند کی متعینہ حدوں سے آگے بڑھنے لگتا ہے تو وہ اسے جھٹ روک دیتے ہیں اور "باطل فلسفہ" کی آڑ لے کر دل کو تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ "باطل فلسفہ" گاندھی واد ہے۔ رہبر صاحب نے لکھا ہے:۔

> پریم چند نے زندگی کو کھلاڑی کی طرح گذارنے کا ذکر کیا ہے۔ یہ کھلاڑی پن کا فلسفہ بھی گاندھی ازم کی ایک شاخ ہے۔ اس نے بہت سے لوگوں کو کھلاڑی بنایا ہے لیکن اُن کے عمل کو زنجیر سے باندھے رکھا ہے۔

۔یہی وجہ ہے کہ رہبر نے پریم چند کے امرکانت، چکردھر اور سورداس ایسے مرغوب کرداروں کو "کھلاڑی" قرار دیا ہے۔ مگر وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے انھوں نے پریم چند کے "باطل فلسفہ" اور "کھلاڑی کردار" کی تخلیق کے اصل محرکات کو اُن کی اقتصادی زندگی اور طبقاتی شعور میں بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے الفاظ ہیں :

> پریم چند بھی درمیانہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی بھی گاؤں میں جدی زمین تھی، موروثی گھر تھا، اور انھیں گھر سے وہی اُنس تھا جو درمیانی طبقے کے لوگوں کو ہوتا ہے۔ اس اُنس کے کارن وہ بار بار دیہات لوٹ جانے کی خواہش کرتے رہے۔ آخر میں وہ دیہات گئے، اور بزرگوں کے "کچے" مکان کی جگہ پکا مکان بنوایا اور یہی وجہ تھی کہ وہ ۱۹۳۰ء کی تحریک میں ہزار خواہش کے باوجود جیل نہیں جا سکے۔ یہی سوچتے رہے کہ شورانی چلی گئیں۔ اگر وہ بھی چلے گئے، تو بچوں کا اور گھر کا خیال کون رکھے گا؟
>
> ستیہ گرہ کی لڑائی اسی طرح لڑی جاتی ہے کہ گھر بھی بسا رہے اور جیل یاترا بھی ہو جائے اور بڑے آدمی جب جیل جاتے ہیں تو اُن کا کاروبار بدستور چلتا رہتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود رہبر کو اس کھلاڑی اور کھلاڑی کردار گھڑنے والے ادیب کے ترقی پسند ہونے میں شبہ نہیں! ان کا عقیدہ پیچیدہ ضرور ہے، مگر لاینحل نہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے خود اُن کا نقل کیا ہوا ایک مکالمہ اور اس کی تمہید ملاحظہ ہو۔

> پریم چند ۱۹۳۵ء میں ہندی ساہتیہ پرشد کی میٹنگ کے سلسلے میں وردھا گئے اور یہاں ان کی گاندھی سے پہلی اور آخری ملاقات ہوئی۔ لوٹ کر آئے تو اس ملاقات کا ذکر شورانی سے کیا وہ گاندھی جی کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ شورانی بولیں اس کا مطلب ہے آپ بھی مہاتما گاندھی کے چیلے ہو گئے۔
>
> پریم چند :۔ چیلا بننے کا مطلب کسی کی پوجا کرنا نہیں اُس کے گنوں کو اپنانا ہوتا ہے۔ میں نے انھیں اپنا کر ہی تو پریم آشرم (گوشۂ عافیت) لکھا جو ۱۹۲۲ء میں چھپا ہے۔
>
> شورانی :۔ وہ تو پہلے ہی سے لکھا جا رہا تھا۔ اس میں مہاتما گاندھی کی کون سی خاص بات ہوگی؟
>
> پریم چند :۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو کام کرنا چاہتے ہیں

اُسے میں پہلے ہی کر رہا ہوں۔

شوربانی:۔ یہ تو کوئی دلیل نہ ہوئی۔

پریم چند نے کہا کہ دلیل کی بات نہیں وہ بھی مزدوروں کسانوں کی بھلائی کے لئے اندولن چلا رہے ہیں اور میں بھی قلم سے یہی کچھ کر رہا ہوں۔

اس کے بعد رہبر صاحب لکھتے ہیں :۔

ہزاروں لاکھوں ہندوستانیوں کی طرح پریم چند نے بھی بھول سے یہ سمجھ لیا کہ گاندھی جو کچھ چاہتے ہیں وہ پہلے ہی سے وہی کچھ کر رہے تھے۔ "گوشۂ عافیت" میں منوہر غوث خاں کو قتل کرتا ہے اور پریم چند نہایت جانب داری سے اس کے فعل کی تائید کرتے ہیں اور اُسے برآتما اور سورما بتاتے ہیں۔ لیکن گاندھی جی نے منوہر کے فعل کی کبھی تائید نہیں کی بلکہ وہ منوہر کو آدھے ہی تما روکنے کیلئے منظرِ عام پر آئے تھے۔ کانگریس کے لیڈر رہے تھے۔

اس اقتباس میں دو باتیں خاص طور پر محلِ نظر ہیں۔ اول تو یہ کہ ۱۹۲۲ء میں م چند "بھول سے" یہ سمجھتے تھے کہ میں پہلے سے وہی کچھ کر رہا تھا جو گاندھی جی چاہتے ، دوسرے دھنی سردار کی تحریر کے مطابق ۱۹۲۲ء میں لکھے گئے "گوشۂ عافیت" کا ہر غوث خاں کو قتل کرنے کے باوجود پریم چند کی نظر میں برآتما تھا اور پریم چند اُس کے فعل کی تائید کی جو گاندھی جی کے نظریۂ عدمِ تشدد کے منافی ہے۔

اگر رہبر کی ان باتوں کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پریم چند حقیقت ۱۹۲۲ء ہی میں "ترقی پسند" بن چکے تھے اگرچہ وہ ۱۹۳۶ء تک اس فہمی میں مبتلا رہے کہ میں ادب کے ذریعے سے وہی خدمت انجام دے رہا ہوں جو ھی جی چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی رہبر اس حیرت انگیز انکشاف کی صحت کا یقین دلانے لئے منوہر کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اس طرح یہ خیال غلط بیانیوں کا ایک عجیب و غریب خیز گلدستہ بن جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس سلسلے میں چند واقعات کو روشنی میں ضروری ہے۔

رہبر کی منطقی تعمیر کی بنیاد محض یہ معلوم ہوتی ہے کہ پریم چند نے ایک شام پر ایک کردار سکھو چودھری کی زبان سے (جو پہلے منوہر کا ساتھی اور بعد میں فقیر ہو گیا) منوہر کے خودکشی کر لینے کے بعد اُسے "برآتما" کہلوایا ۔ میں یہ مانتا ہوں کہ سکھو کے الفاظ میں خود پریم چند کا جذبہ جھلکتا ہے اور یہ ایک طرح کا خراجِ تحسین بھی ہے لیکن اسے منوہر کے فعل کی تائید قرار دینا قطعی غلط ہے۔ برآتما کہنے سے ایک فطرتاً نیک اور مخلص انسان کے کسی دلیرانہ اقدام کا اعتراف مقصود ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسا فعل دانش مندانہ اور سماجی طور پر مفید بھی سمجھا گیا ہو، اس کے خلاف تائید کرنے میں فاعل کے ساتھ پوری طرح جذباتی اور نظریاتی ہم آہنگی کا اظہار ہوتا ہے۔ پریم چند کے منوہر کو برآتما کہلوانے کے سلسلے میں ان حقائق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

یہ ناول کا وہ مقام ہے جہاں گاؤں کی مشترکہ اور موروثی چراگاہ پر زمیندار قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اُس کا سپاہی فیضو منوہر اہیر کی بیوی بلاسی کو اپنے مویشی چراگاہ سے نکالنے کا حکم دیتا ہے اور اس کے احتجاج پر سپاہی زمیندار کے کارندے غوث خاں کے حکم سے اُسے گردن پکڑ کر نیچے گرا دیتا ہے۔ بلاسی زخمی ہو جاتی ہے لہٰذا وہ اپنے خاوند منوہر اور بیٹے بلراج سے شکایت کرنے جاتی ہے اور اس واقعے کا کچھ ایسے الفاظ اور رقت آمیز لہجے میں ذکر کرتی ہے کہ منوہر کچھ کا کچھ سمجھ لیتا ہے۔

پریم چند نے منوہر کا کردار بڑی خوبصورتی سے اُبھارا ہے۔ وہ دیہات پر زمیندار کے عام مظالم کے خمیر سے اُٹھتا ہے۔ وہ بے حد خوددار ہے اس کی خودداری اپنی بیوی کی بے عزتی کے خیال سے زخم خوردہ شیر کی مانند جوش میں آتی ہے لیکن وہ اس جوش کو خوفناک سکون میں تبدیل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اُس میں غیر معمولی قوتِ ارادی موجود ہے اور عمل کے وقت (وہ کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو) پائے استقلال میں جُنبش نہیں آتی۔ چنانچہ وہ غوث خاں کو قتل کر دیتا ہے۔

اب آئندہ واقعات لیجیے۔ غوث خاں کے قتل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گاؤں کے اکثر آدمیوں کی گرفتاری عمل میں آتی ہے اور سیشن جج کی عدالت میں مقدمات چلتے ہیں۔ منوہر بے قصور ساتھیوں کو پھنستا دیکھ کر حیرت انگیز اخلاقی جرأت سے کام لیتا ہے اور اپنے جرم کا اقبال کر لیتا ہے مگر باقی لوگ پھر بھی رہا نہیں ہو پاتے۔ ملزمین میں سے اکثر صبر سے کام لیتے ہیں۔ مگر انھیں میں سے ایک شخص ایسا بھی ہے جو منوہر کو گاؤں کی تباہی کا باعث قرار دیتا ہے۔ منوہر کی خودداری اس زخم کو برداشت نہیں کر پاتی اور وہ خودکشی کر لیتا ہے۔ ان حالات میں اگر پریم چند نے منوہر کو برآتما کہا یا کہلوایا تو کیا غضب کیا؟ کیا گاندھی جی ایسے شخص کو برآتما نہ کہتے؟

ہاں پریم چند نے یہ کہیں نہیں کہا کہ غوث خاں کے قتل نے گاؤں کے مسائل

حل کردئے آئندہ ابواب پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ غوث کے بعد اس کی جگہ فیض اللہ خاں کا تقرر گاؤں والوں پر کس بلائے مبرم کی طرح نازل ہوتا ہے اور فیضو کی کس طرح بن آتی ہے۔ یہاں ایک مقام سے چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:۔

> فیض اللہ خاں کا غوث خاں کی جگہ پر مقرر ہونا گاؤں والوں کے زخم پر نمک چھڑکنا تھا۔ پہلے ہی دن سے گاؤں کے لوگ اُن سے احتراز کرنے لگے اور فیضو نے اس دشمنی کی آگ کو فرد کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی اب وہ مسلّم موضع کے مختارکل تھے۔ اُن کا حکم ہی قانون تھا کسی کو چوں و چرا کی مجال نہ تھی۔ گاؤں کا دودھ، گھی، اپلے، لکڑی، گھاس پیال، کڑو کھٹرے، ہل، بیل سب اُن کے تھے۔ جو اختیارات غوث خاں کو مرتے دم تک نہ حاصل ہو سکے وہ حُسنِ قسمت اور حسنِ اتفاق سے فیض اللہ کو اوّل ہی روز سے حاصل ہو گئے۔ تعرّض و تشدّد کے میدان میں اب اُن کے گھوڑے کو کسی ٹھوکر کا خوف نہ تھا۔
>
> فیض اللہ خاں ہر روز صبح کو ٹانگھن پر سوار ہو کر گاؤں کا گشت کرتے کرتار اور بندا چمار چپراسی ان کے پیچھے پیچھے چلتے۔ جو کچھ نوٹ کھسوٹ سے مل جاتا وہ لے کر واپس آتے تھے۔ یوں تو سارا گاؤں اُن کے ظلم و ستم سے نالاں تھا۔ مگر منوہر کے گھر پر ان کی خاص نوازش تھی۔ نومبر ہی میں بلاسی پر تقاوی لگان کی نالش ہوئی اور اس کے سارے جانور قرق ہو گئے۔ فیضو کو یقینِ کامل تھا کر اب کے جیت میں مال گذاری تو وصول ہو گی نہیں سبھوں پر سیکڑوں نالشیں دائر کروں گا اور ایک ہی وار میں سب کو سمیٹ لوں گا۔ سارے موضع کو بے دخل کر دوں گا۔ آمدنی فوراً دگنی ہو جائے گی۔ مگر اتنے ہی سے انھیں تسکین نہیں ہوتی تھی۔ ڈانٹ، پھٹکار، گالی گلوچ کے بغیر ان کا رُعب جمنا مشکل تھا۔ بس باقاعدگی کے ساتھ کام کیا جانے لگا بلاسی مارے خوف کے گھر سے نکلتی نہ تھی۔ اس کی ربیع کی فصل کھیت میں کھڑی خشک ہو رہی تھی۔ پانی کون دے؟ نہ بیل اپنے تھے اور نہ کسی سے مانگنے کا منہ تھا۔

ایک روز شام کے وقت بلاسی اپنے دروازہ پر بیٹھی رو رہی تھی۔ یہی اس کا معمول تھا۔ منوہر کی خودکشی کی خبر اُسے کئی روز پہلے مل چکی تھی۔ اُسے اپنے خاندان کی بربادی کا اتنا صدمہ نہ تھا جتنا اس بات کا کہ کوئی اس کی بات پوچھنے والا نہ تھا جسے دیکھئے اسے جلی کٹی سناتا تھا۔ کوئی اس کے گھر نہ آتا جاتا تھا اگر وہ بیٹھے بیٹھے اُکتا کر کسی کے گھر چلی جاتی تو وہاں بھی اُسے ذلیل ہونا پڑتا۔ وہ گاؤں کی ناگن سمجھی جاتی تھی جس کے زہر نے سارے گاؤں کو ہلاک کر دیا تھا۔ اور تو اور اس کی بہو بھی اسے طعنے دیتی تھی۔

پریم چند کے بیان کئے ہوئے ان واقعات کے پیشِ نظر غوث خاں کے قتل کے سماجی نتائج سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنا دشوار نہیں ہے وہ اس طرح سماج کو بدلنے اور ستم زدہ عوام کے دکھ درد دور کرنے کے ہرگز قائل نہیں تھے۔ اس کے لئے وہ دلوں کو بدلنا ضروری تصوّر کرتے تھے۔ چنانچہ یہاں بھی انھوں نے یہی کیا۔ بلاسی میں جو ذلّت اور کمتری کا احساس پیدا ہوتا جا رہا تھا اُسے تو پریم چند نے سکھو چودھری سے منوہر کو "پرآتما" کہلوا کر دور کرایا اور گاؤں والوں کو روز افزوں مظالم سے نجات دلوانے کے لئے اسی سکھو سنیاسی سے روپیوں کو ٹھیکروں میں تبدیل کرنے کا معجزہ دکھلوایا جس سے فیض اللہ اور اس کے ساتھیوں کے دل بدل گئے۔

پریم چند کا اسطائے سے موازنہ کرتے وقت رہبر نے پریم چند کو دیدہ دانستہ دغالباً دیدہ و دانستہ) انقلاب کی قوّت کو اُبھارنے والا بتایا ہے اور کہا ہے کہ پریم چند مذہب کے قائل نہیں تھے۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ "کھلاڑی" اور کھلاڑی ہیرو تخلیق کرنے والا ادیب کس طرح دیدہ و دانستہ انقلاب کی قوت کو اُبھار سکا اور ہنس راج کس طرح اس نتیجے پر پہنچے کہ پریم چند مذہب کے قائل نہیں تھے۔ اگر صرف خود غرضی، ریاکاری اور رسم پرستی کی پردہ دری نے انھیں اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ اپنی کتاب کے فاضل دیباچہ نگار سیّد احتشام حسین سے رجوع کر سکتے ہیں۔ جنھوں نے لکھا ہے کہ "پریم چند مذہب کے مخالف نہیں تھے لیکن وہ فرقہ پرست عناصر کے دشمن ضرور تھے وہ ان مذہبی رسموں اور اداروں کا مذاق اڑاتے تھے جن میں خلوص، سچائی اور روحانیت کی جگہ ریاکاری، عوام دشمنی اور نمود کی نمائش تھی۔"

کرشن چندر

آسمان بنانے والے

میرے بچّے نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ آسمان کیسے بنایا گیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے تو معلوم نہیں کیا تم مجھے بتا سکتے ہو؟"

بچّے کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ سوچنے لگا۔ آخر سوچ سوچ کر بولا ایک دفعہ بہت سے آدمی ایک جگہ سگریٹ پی رہے تھے۔ ان سگرٹوں کا دھوآں اوپر اٹھا اور اوپر اُٹھ کر آسمان بن گیا۔"

بچّے کے جواب میں کوئی جدّت نہ تھی۔ اس نے مجھے اکثر سگریٹ پیتے ہوئے میرے دوستوں کو اس شغل میں معروف دھوآں اڑاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس دھوئیں سے اس نے اپنے لئے آسمان بنا لیا، اس بات میں کوئی جدّت نہ تھی۔ لیکن اس بات میں ضرور تھی کہ اس کی نزدیک ایک آدمی کے بیٹے نے آسمان بنایا تھا۔ اس نے اس کام کو خدا پر نہیں چھوڑا تھا۔ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو ہر کام خدا پر چھوڑ دیتے ہیں اور خود کچھ نہیں کرتے۔ پھر یہ بات بھی عجیب تھی کہ آسمان بنتا ہے۔ انسان کی کاوش سے بنایا جاتا ہے۔ میرے ذہن میں تاریخ اپنے اوراق اُلٹنے لگی۔ اور بہت سے آسمان بنانے والوں کی کہانیاں مجھے یاد آنے لگیں۔ میں نے اپنے ننھے بچّے کا ہات اپنے ہات میں لے کر کہا۔ آؤ۔ میں آج تمھیں آسمان بنانے والوں کی کہانیاں سناؤں گا۔

آج سے ہزاروں سال پہلے آسمان یہ آسمان نہیں تھا۔ جس میں سیّارے گھومتے ہیں اور ستارے خلا میں پرواز کرتے ہیں۔ اس وقت آسمان ایک پرستانی دُنیا کی طرح مبہم اور پُراسرار تھا۔ اس وقت زمین ایک چپٹا دائرہ تھی اور آسمان جنت کے اُلٹے پیالے کی طرح اس پر رکھا ہُوا تھا۔ صبح کو سحر کی دیوی اس آسمان کے مشرقی دروازے کھول دیتی اور چار گھوڑوں والے رتھ کی زنجیریں کھول دیتی۔ سورج کا دیوتا اپنا زرّیں تاج پہن کے رتھ پر سوار ہو جاتا اور تیز رفتار رتھ اپنے سفر پر چل دیتا۔ شام کے وقت مغرب میں سمندر کے دریا میں آسمان کے مغربی دروازے کھلتے اور سورج اپنے رتھ کو دوڑاتا ہُوا اس دروازے کے اندر جا کر رات کی رانی کی مملکت میں داخل ہو جاتا۔

پُرانے یونانی ایسا سوچتے تھے۔

لیکن ان سے بھی پہلے پُرانے بابلیوں نے اس سوال کا جواب دینا چاہا تھا

آسمان کیسے بنایا گیا ہے؟

بابلیوں نے کہا۔ پہلے آسمان نہیں تھا کچھ بھی نہیں تھا۔ پہلے صرف ایک خدا تھا اس کا نام عاپسو تھا۔ اس کی ایک بیوی تھی۔ اس کا نام طیامت تھا۔ اس وقت ابھی مندر تعمیر نہیں ہوئے تھے اور دیوتا وجود میں نہیں آئے تھے۔ اس وقت زمین نہیں تھی اور آسمان نہیں تھا اور کسی چیز کا کوئی نام نہیں تھا۔

پھر عاپسو نے طیامت کے بطن سے دیوتا پیدا کئے اور انھیں نام دئے اور قوتیں بخشیں۔ دیوتاؤں نے قوت پا کر اپنے خالق سے جھگڑنا شروع کیا۔ عیّار دیوتا نے عاپسو خدا کو مار ڈالا اور مردوک دیوتا نے طیامت کے ٹکڑے کر دئے جیسے آدمی کسی سیپی کو بیچ میں سے چیر دے۔ سیپی کا نچلا حصّہ گر کر زمین بن گیا اور اُوپر کا حصّہ آسمان کہلایا۔

اس طرح آدمی کے تخیّل نے سب سے پہلے آسمان بنایا اور اُسے ایک پرستانی کہانی کا روپ دیا۔ بابلیوں کے سینکڑوں سال بعد رومن شاعر اووڈ نے سورج دیوتا اور اس کے بیٹے فٹن کی کہانی سنائی۔

ایک دفعہ سورج نے زمین کی ایک لڑکی سے شادی کی اور دونوں کی شادی سے ایک لڑکا پیدا ہُوا اس کا نام فٹن تھا۔ فٹن کا باپ سورج لازوال تھا لیکن فٹن کی ماں ہماری دُنیا کی رہنے والی تھی۔ اس لئے فانی تھی۔ فٹن جب بڑا ہُوا تو اُسے معلوم ہُوا کہ وہ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کا بیٹا نہیں ہے، وہ لازوال سُورج کا بیٹا ہے۔ وہ ہر روز اپنے باپ کو چار گھوڑوں کے زرّیں رتھ پر بیٹھ کر شعلوں کا بھڑکتا ہُوا تاج پہنے مشرق سے مغرب کو جاتے ہوئے دیکھتا اور اس کے دل میں اپنے باپ سے ملنے کی خواہش بڑی شدّت سے

بھاگنے لگتی۔

ایک دفعہ وہ اپنی ماں کے منع کرنے کے باوجود اپنے باپ کے دربار میں چلا گیا۔

دربار سونے کا بنا ہوا تھا اور اس کے ہر کونے سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں سورج اپنے شاندار کرنوں والے جگ مگ جگ مگ کرتے ہوئے تخت پر بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں گھنٹے اور گھڑیاں۔ مہینے اور سال صدیاں اور قرن مؤدب کھڑے تھے۔ بہار کی حسین شہزادی اپنے ماتھے پر پھولوں کا تاج پہنے رقص کر رہی تھی۔ اس کے قریب انگوروں کی بیلوں میں لپٹی ہوئی خزاں تھی۔ اور اس کے قریب زمستاں کی بڈھی دیوی برف کے گالوں کا لباس پہنے چپ چاپ کھڑی تھی اور اس کی ہر سانس طوفان کے تند خو فرزندوں کو جگاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

سورج نے پوچھا "تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو۔"

فٹن بڑی دلیری سے آگے بڑھ گیا۔ اور دربار کے عین بیچ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بآواز بلند سب کے سامنے کہا "میری ماں نے کہا ہے کہ میں تمھارا بیٹا ہوں، کیا یہ سچ ہے؟"

سورج نے فٹن کو آگے اس کے قریب آ جانے کو کہا۔ جب فٹن سورج کے قریب پہنچا تو سورج نے اپنا شعاعوں والا تاج اُتار دیا۔ وہ غور سے اپنے بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ یکایک اس کے چہرے پر مسرت کی لہر پھیل گئی اور اُس نے چلا کر کہا۔ "فٹن تم میرے بچے ہو۔ واقعی تم میرے بیٹے ہو۔"

سورج نے فٹن کو گلے سے لگا لیا اور اُس سے پوچھا "بتاؤ تمھیں کیا چاہیئے۔ میں اسے ضرور پورا کروں گا۔ بتاؤ بیٹے، تمھیں کیا چاہیئے؟"

فٹن نے فوراً جواب دیا۔ "میں ایک دن کے لئے تمھارے زرّیں رتھ کو خود چلانا چاہتا ہوں۔"

"مگر یہ رتھ تو سورج کے سوا کوئی نہیں چلا سکتا۔"

"آپ نے وعدہ کیا ہے۔"

سورج نے اپنے بیٹے کو بہت سمجھایا مگر فٹن نہیں مانا۔ اب بحث کرنے کے لئے زیادہ وقت بھی نہیں تھا کیونکہ حنائی انگلیوں والی سحر نے مشرق کے گلابی دروازے کھولنے شروع کر دیئے تھے اور بے چین پل گھڑیاں اور گھنٹے بیقرار گھوڑوں کو اصطبل سے باہر لا رہے تھے اور انھیں شعاعوں کے رتھ سے باندھ رہے تھے۔

سورج نے اپنے بیٹے فٹن کو دیوتاؤں کی پوشاک اوڑھائی تا کہ وہ اس سفر پر چلنے سے محفوظ رہے۔ اس نے اسے بار بار اس سفر پر جانے سے روکا مگر جواں سال فٹن پہلے ہی سے سورج کے ایک رتھ میں سوار ہو گیا۔ شعلہ سامان گھوڑوں کی طنابیں اس کے ہات میں تھیں۔

"دیکھو بیٹا" سورج نے آخری بار اس سے کہا۔ "زمین کے بہت قریب مت جانا ورنہ زمین جل جائے گی۔ آسمان کے بہت قریب مت جانا ورنہ آسماں جل جائے گا۔ بڑی احتیاط سے زمین اور آسمان دونوں کے بیچ سفر کرنا جیسے میں ہر روز کرتا ہوں۔"

"آپ بالکل فکر نہ کریں" فٹن نے اپنے باپ کو جواب دیا۔ "میں بڑے مزے سے رتھ چلا کے لے جاؤں گا۔"

سمندر کی دیوی نے دروازے کھول دئے اور گھوڑے سرپٹ بھاگنے لگے۔ آج وہ سورج کا وزن محسوس نہیں کر رہے تھے۔ طنابوں میں وہ کھچاؤ نہیں تھا۔ وہ مہمیز جو سورج کی ایڑیوں میں رہتے تھے۔ تازہ دم گھوڑوں نے بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ قطبی ستارے نے انھیں اپنے راستے سے پرے ہٹ کر بھاگتے ہوئے دیکھا اور خوف زدہ ہو گیا۔

فٹن نے گھبرا کر نیچے دیکھا۔ زمین دُور نیچے چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ دریا پہاڑ بر اعظم گھومتے جا رہے تھے فٹن کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ لیکن مشرق کی دیوی نے اپنے دروازے بند کر لئے تھے اور اب وہ پیچھے نہیں جا سکتا تھا۔ آگے کے سفر کا اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ رتھ آسمان میں ایک غیر متوازن کشتی کی طرح کبھی ادھر کبھی ادھر ڈولنے لگا۔ گھوڑے بے قابو ہو کر کبھی آسمان سے باتیں کرنے لگتے اور کبھی زمین کے اس قدر قریب آ جاتے کہ چوٹیوں سے برف پگھلنے لگتی۔ جنگلوں کو آگ لگتی۔ کھیتیاں جل کر صحرا ہونے لگتیں۔ مچھلیوں نے سمندر کے گہرے فرش پر پناہ لی اور دھرتی نے گھبرا کر زیوس کو مدد کے لئے پکارا۔

زیوس دیوتا نے اولمپس سے فٹن کو رتھ میں پریشان حال گھوڑوں کی طنابیں اپنے ہات سے چھوڑتے ہوئے دیکھا۔ اس نے سوچا۔ اگر سورج کا رتھ زمین سے ٹکرا گیا تو یہ زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ اس نے رتھ پر اپنی بجلی کے تیر پھینکے۔ ان تیروں نے رتھ کی زنجیروں کو توڑ دیا گھوڑے آزاد

ہو گئے اور رتھ ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ یکایک فیٹن آسمان سے ایک شہاب ثاقب کی طرح زمین پر گر پڑا۔ دریائے ایری ڈانوس کے پانیوں نے اسے اپنی مہربان آغوش میں لے لیا۔ ناہیدوں نے اس کا منہ دھویا۔ اور اسے ایک چھوٹی سی قبر میں سُلا دیا۔ اور اس کی قبر کے اوپر لکھ دیا۔

"یہاں فیٹن سو رہا ہے"

جس نے اپنے باپ سورج کے رتھ کو چلانے کی کوشش کی۔
اس نے اپنی بساط سے زیادہ دلیری دکھائی۔ اس لئے مارا گیا۔

لیکن کیا یہ کہانی محض اُدوڈ کا تخیل ہے۔ کیا ہم میں سے ہر شخص سورج کا بیٹا نہیں ہے جسے سورج کا رتھ چلانے کی آرزو ہے۔ ہزاروں سال سے انسان آسمان کی سڑک پر اپنا پہیہ چلانے کی سوچ رہا ہے۔ پہلے صرف سوچ تھی اور تخیل تھا۔ اور کائنات مبہم اور پُر اسرار تھی۔ اور آسمان جنت کے اُلٹے پیالے کی طرح اوندھا تھا پھر انسان نے اپنے تخیل کو عمل کے گھوڑوں سے باندھا اور رتھ کو چلانا شروع کیا۔

جس نے سب سے پہلے اس کام کو سرانجام دیا۔ وہ بے نام تھا۔ وہ ایک ملاح تھا یا شاید خشکی پر رات کی تنہائیوں میں سفر کرنے والا اکیلا مسافر تھا۔ وہ فیٹن کی طرح راستے سے بھٹکتا جا رہا تھا۔ زمین پر اپنی منزلِ مقصود کو پانے کے لئے اس نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں ستارے تھے جہاں سیارے تھے، چاند تھا اور کہکشاں کا جھولا تھا۔ یکایک اُس نے قطب شمالی کو دیکھا جو ہمیشہ رات کے وقت شمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ انسان نے ستاروں کے ڈھیر میں سے ایک کنکر چن لیا اور اس طرح اپنے آسمان کی تعمیر کے لئے سنگِ بنیاد رکھا۔ آج ستارے اس کے لئے دیوتا نہیں تھے اس کے ہاتھ میں کمہار کی مٹی کی طرح چکنے اور نرم تھے جن سے وہ اپنا آسمان بنا سکتا تھا۔

اس سنگِ بنیاد کو لے کر بابلیوں نے اپنے آسمان کی تعمیر کی۔ اس آسمان کی سات منزلیں تھیں اور آسمان ایک بلند زینے کی طرح ایک منزل سے اوپر دوسری منزل کو جاتا تھا۔ یہ سات منزلیں سات سیاروں کے محل تھے پھر انھوں نے سات سیاروں کے ناموں پر سات دن بنائے سوموار، منگل، بدھ، برہسپت، شکر، سنیچر اور اتوار۔ انھوں نے ہر گھنٹے کو ساٹھ منٹوں میں تقسیم کیا۔ ہر منٹ کو ساٹھ سیکنڈوں میں تقسیم کیا۔ اور ہر دائرے کو تین سو ساٹھ درجوں میں بانٹا اور ہر لمحہ آسمان کا نقشہ اُبھرتا گیا۔

مصریوں نے بابلیوں کے بعد ایک آسمان بنایا۔ یہ آسمان ہوا کا دیوتا تھا۔ جو اپنے دونوں ہاتھوں سے اوپر بہشت کو تھامے ہوئے تھا۔ ہوا میں ستارے چمکتے تھے۔ اور سورج اور چاند ہوا کی لہروں پر بیٹھے ہوئے گزرتے تھے۔ آسمان اب ایک چھوٹا سا محل نہ رہا۔ سات منزلوں والا۔ اس کی حدیں مصریوں نے ہوا کی طرح وسیع کر دیں۔

پھر طیلس یونان سے مصر گیا۔ نمک لانے کے لئے۔ نمک لانے کے علاوہ اس نے مصریوں سے آسمان سازی کا کام بھی سیکھا۔ وہاں اس نے معلوم کیا کہ سورج کا قطر آسمان کی گولائی کے قطر کا ایک بٹا سات سو بیس (1/720) ہے۔ لیکن جو بات اس نے خود معلوم کی وہ یہ تھی کہ سورج ایک دیوتا نہیں ہے۔ سورج کا خمیر بھی انہیں عناصر سے اُٹھایا گیا ہے جن سے زمین بنی ہے اور جب یہ معلوم ہو گیا تو گویا زمین اور آسمان میں کوئی فرق نہ رہا۔ انسان نے اپنے ہاتھ میں مادے کو پکڑ لیا اور اسے ادھر اُدھر سے ٹٹولنے لگا۔ جانچنے لگا اور سمجھنے لگا۔

طیلس کے شاگرد اناکسی مینڈر نے آسمان اور زمین کو بار بار ٹٹولا۔ اور اپنی کتاب "قدرت کے بارے میں" بتایا کہ زمین ایک گول کشتی کی طرح پانی پر نہیں تیر رہی ہے جیسے کہ طیلس سمجھتا تھا زمین ایک بہت بڑے سلنڈر کا حصہ ہے اور فضا میں معلق ہے۔ اسے نہ کوئی اوپر سہارا دینے والا ہے نہ کوئی نیچے سہارا دینے والا ہے وہ خود بخود ایک لامکاں میں معلق ہے۔

یکایک آسمان کی چھت بھک سے اڑ گئی اور سات منزلوں والا محل زمین پر آ گرا اور اس کے بجائے انسان نے ایک نیا آسمان تعمیر کیا، چاروں طرف پھیلا ہوا لامحدود۔

اور اس لامحدود آسمان میں ستارے چکر لگا رہے تھے۔ پھر کچھ مدت کے بعد اناکسی مینڈر کے شاگردوں نے اناکسی مینڈر کے ہاتھ سے آسمان سازی کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور ہمیں بتایا کہ ستاروں میں کچھ تو سیارے ہیں وہ ہماری زمین کے قریب ہیں۔ دوسرے ایسے ستارے ہیں جو ہم سے بہت دور ہیں اور آسمان میں کیلوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔

ایتھنز کی چاندنی رات

پریکلیز کے گھر میں ایک دعوت پر بہت سے معزز مہمان شریک تھے۔

پریکلیز کی حسین بیوی عیاشیا جو غیر یونانی تھی رفدیاس مشہور بت ساز، یوریپڈیس اور دوسرے مصور، جوہری اور فوج کے کپتان جن کا بہادری میں کوئی ثانی نہ تھا، بہت سے لوگ اس دعوت میں شریک تھے۔

یہ لوگ ایک نیم دائرے کی صورت میں کوچوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے چھوٹی چھوٹی میزوں پر سرخ ارغوانی لبریز جام رکھے تھے۔ طشتریوں میں انگور کے گچھے چمک رہے تھے اور یہ سب معزز مہمان ایتھنز کی سیاسی گفتگو میں شرکت کے لئے اکھٹے نہیں ہوئے تھے۔ ان کے سامنے کرسی پر اناکسی گوراس بیٹھا تھا۔ ایک نیا مفکر ایک نیا آسمان ساز۔ زمین کے رہنے والوں کو ہمیشہ آسمان نے اپنی طرف کھینچا ہے۔ اناکسی گوراس نے بھی ستاروں پر اپنی کمند پھینکی تھی۔ اب وہ اپنے تجربات یونانی دانش وروں کے سامنے بیان کر رہا تھا۔

اور وہ لوگ حیرت سے سن رہے تھے کہ ان کی اس دنیا کے باہر بھی بہت سی دنیائیں ہیں چاند میں پہاڑ ہیں اور وادیاں ہیں اور وہاں درخت ہیں اور جاندار ہیں۔ سورج ایک گرم پتھر ہے بہت بڑا اور وسیع و عریض پتھر جو ہمیشہ گھومتا رہتا ہے اور جس کی ہواؤں میں آگ کے شعلے ہیں۔ اور جب سورج تیز رفتاری سے گھومتا ہے تو اس کے بدن سے چنگاریاں پھوٹتی ہیں۔ تیز رفتاری سے گھومتے گھومتے سورج گرم اور گرم ہو جاتا ہے اور حرکت کی تیز رفتاری سے سورج کے جسم سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے الگ ہو جاتے ہیں۔ اور ان ٹکڑوں میں سے جب کوئی چھوٹا سا ٹکڑا زمین پر آ گرتا ہے تو وہمی لوگ اس کے قریب جانے سے بھی ڈرتے ہیں حالانکہ اگر وہ اسے ہاتھ میں لے کے دیکھیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ ٹکڑا دیوتاؤں کا کوئی جادو نہیں ہے ان کی زمین کی طرح ہی ایک قسم کی چٹان کا ٹکڑا ہے۔

معزز مہمان حیرت اور مسرت سے اناکسی گوراس کی باتیں سنتے رہے۔

یہ آسمان وہ آسمان نہ تھا جو بابلیوں نے تعمیر کیا تھا۔ وہ آسمان نہ تھا جو مصریوں نے بنایا تھا۔ وہ آسمان نہ تھا جو اناکسی مینڈر نے تعمیر کیا تھا۔ ان تمام آسمانوں کی جھلک اس نئے آسمان میں ملتی تھی۔ مگر یہ آسمان ان سب سے بہتر اور سچائی کے کسی قدر قریب تر معلوم ہو رہا تھا۔ اس آسمان میں بہت سے ان جانے ان دیکھے کونے کھدرے تھے۔ جہاں تاریکی تھی۔ جہاں انسان اپنی عقل کی روشنی اور اپنے تجربے کی سچائی نہیں لا پایا تھا۔ جہاں ابھی عمارت بھی نہ اٹھی تھی صرف بنیادیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر بھی آسمان کی یہ نئی عمارت پرانی عمارتوں سے کس قدر خوبصورت، جامع اور افضل تھی۔

دعوت ختم ہو گئی اور اناکسی گوراس ایتھنز کی چاندنی سے دھلی ہوئی گلیوں میں گھومنے لگا۔ اکروپولس کی عظیم عمارت ایتھنز کے شہر کے اوپر اک خوابناک خاموشی میں کھڑی ہو کر سوچ رہی تھی۔ لارل کے پیڑ چاندی کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے اگورا کی مارکیٹ میں مکمل سناٹا تھا۔

یکایک اناکسی گوراس گلی کے فرش پر کھڑا ہو کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بالکل نئی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس آسمان پر اسے کہیں پرانے یونانیوں کی اپسرا اندرا دھیدا سپید گھوڑوں والے رتھ پر سوار ہو کر گزرتی ہوئی دکھائی نہ دی کہیں اسے پرسیس نظر نہ آیا۔ جو اپنا بھالا اٹھائے ڈریگن کا سینہ چیرنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اس آسمان کی پنہائیوں میں لاکھوں دنیائیں آباد تھیں۔ لاکھوں ستارے فضا میں گردش کر رہے تھے۔ کیا ان تمام دنیاؤں میں کہیں پراسرگی کا کوئی وجود نہیں ہے۔

یہی سوچتے سوچتے اسی گلی کے فرش پر کھڑے کھڑے اناکسی گوراس نے ساری رات گزار دی۔ یکایک مرغ نے اذان دی اور آسمان پر سپیدۂ سحر نمودار ہو گیا۔

تھریس کے ایک شہر آبدیرا میں ایک دولت مند آدمی رہتا تھا۔ اس کا نام داراسی پس تھا۔ اس کا ایک لڑکا تھا۔ اس کا نام ڈیموکرٹس تھا۔

ایک دفعہ اس دولت مند یونانی کے گھر میں ایک ایرانی بادشاہ داراکسز مہمان ٹھیرا۔ اس کے ساتھ اس کے اپنے ملک کے بہت سے ایرانی عالم و فاضل تھے۔ جب بادشاہ داماسی پس کے گھر سے رخصت ہوا تو اپنے میزبان کی استدعا پر اپنے کئی ایک عالم داماسی پس کے لڑکوں کو پڑھانے کے لئے چھوڑ گیا۔

یہ ایرانی اپنے ساتھ بہت سے ہندوستانی مفکروں کا علم اور تجربہ لائے تھے۔ ڈیموکرٹس نے ان سے سیکھا کہ دنیا باریک نقطوں سے بنی ہے نقطوں سے تم ایک لکیر بنا سکتے ہو۔ لکیروں سے سطحیں، سطحوں سے مکعب بنتے ہیں۔ ٹھوس مادے سے معمور دنیا۔ ایسی بہت سی دنیائیں آسمان میں ہیں جنھیں ہم لوگ ستارے کہتے ہیں۔ یہ آگ کی مشعلیں نہیں ہیں مادے کی گولائیاں ہیں۔

داماسی پس کی وفات کے بعد اس کی ساری جائداد ڈیموکرٹس کے

حصے میں آئی۔ آبدیرا کے لوگوں نے باتفاق رائے ڈیموکرٹس کو اپنے شہر کا بیف مجسٹریٹ چن لیا۔ ڈیموکرٹس کے سامنے اب ایک فارغ البال چین اور سکون کی زندگی تھی۔

لیکن ڈیموکرٹس چین اور سکون کی زندگی بسر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ علم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اُس نے اپنی ساری جائیداد بیچ دی۔ اور علم حاصل کرنے کے لئے ایران اور مصر کی درس گاہوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

کئی سال کے بعد جب ڈیموکرٹس اپنے گھر لوٹا تو اس کے اپنے باپ کی دولت میں سے ایک کوڑی بھی نہ بچی تھی۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک کتاب تھی۔ "ہمارا عظیم کائناتی نظام"۔

آبدیرا کے لوگ اس سے بے حد خفا ہو گئے۔ وہ اسے پکڑ کے شہر کی سب سے بڑی عدالت کے سامنے لے گئے اور اس پر الزام لگایا کہ ڈیموکرٹس نے اپنے ماں باپ کی ساری دولت کو تباہ و برباد کر دیا ہے اس لئے اسے قرار واقعی سزا ملنی چاہیئے۔

جب عدالت نے اس سے صفائی طلب کی تو ڈیموکرٹس نے اپنی گواہی میں کسی گواہ کو پیش نہ کیا۔ اس نے اپنی کتاب کے اوراق پلٹے اور پڑھنے لگا۔

پہلے پہل تو عدالت نے اور تماشائیوں نے سمجھا شاید ڈیموکرٹس پاگل ہو گیا ہے لیکن جوں جوں ڈیموکرٹس اپنی کتاب کے اوراق اُلٹتا گیا اور پڑھتا گیا۔ ساری عدالت میں ایک سناٹا چھا گیا اور جج اور جیوری اور مدعی اور تماشائی مسحور ہو کر یکا یک نئے آسمان کو اپنے سامنے کھلتا ہوا دیکھنے لگے۔

ڈیموکرٹس نے کہا "یہ دنیا ایک لٹو کی طرح گھوم رہی ہے یہ چپٹی نہیں ہے سلنڈر کا حصہ بھی نہیں ہے۔ دنیا ایک لٹو ہے۔ لٹو کی گردش سے ذرات گرم ہو کر فضا میں اڑتے ہیں اور ایک دوسرے سے مل کے نئی دنیا بناتے ہیں۔ آسمان میں ان گنت دنیائیں ہیں اور کوئی ایک دوسرے سے ملتی نہیں ہے۔ جس طرح دو آدمیوں کے چہرے ایک دوسرے سے نہیں ملتے اسی طرح دو دنیائیں بھی ایک دوسرے سے الگ صورت رکھتی ہیں۔ اس آسمان پر ایک سورج ایک چاند نہیں ہے۔ بہت سے سورج اور بہت سے چاند ہیں۔ کچھ دنیائیں روشن ہیں کچھ دنیائیں تاریک ہیں وہاں کوئی سورج اور کوئی چاند نہیں ہے اور پانی کا ایک قطرہ نہیں ہے۔ وہاں مکمل خاموشی ہے اور موت کا سا سکون ہے۔

یہ گردش کرتی ہوئی دنیائیں کبھی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتی ہیں۔ تو بڑی دنیاؤں کی ہوتی ہے۔ چھوٹی دنیائیں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہیں۔ مگر ان ٹکڑوں سے پھر ایک نئی دنیا تعمیر ہوتی ہے۔ نئے سورج نئی زمینیں پیدا ہوتی ہیں۔ آسمان بے کنار ہے اس کی کوکھ ابھی بانجھ نہیں ہوئی۔ وہ ابھی تک نئے ستاروں کو جنم دیتی ہے۔ اس بے کنار آسمان کا ہر ذرہ ایک چھوٹے ہی مختصر سے مختصر ذرے سے بنا ہے۔ اس ذرے کو کوئی توڑ نہیں سکتا۔ اس ذرے کا نام "ایٹم" ہے۔

جس وقت ڈیموکرٹس عدالت کے سامنے اپنا بیان دے رہا تھا لوگوں کے دلوں میں زمین اور آسمان کا نیا رشتہ اُبھر رہا تھا۔ یہ رشتہ جو پہلے رشتوں سے کہیں خوبصورت تھا۔ اب زمین آسمان کا ایک حصہ تھی ہم زمین والے آسمان والے بن گئے تھے۔ فلک کا گلہ کرنے والے خود ہی ستم کوش تھے۔ چرخ ناہنجار کو گالیاں دینے والے گویا اپنے گھر کو کوس رہے تھے۔ آج زمین اور آسمان نے ہاتھ ملائے تھے۔ یہ زمین اور آسمان جو ایک دوسرے سے کتنے دُور تھے کس طرح ایک دوسرے کے اس قدر نزدیک ہو گئے تھے۔ اس میں ڈیموکرٹس کا ہاتھ تھا اور اناکسی گوراس کا اور ایران کے مفکروں کا اور ہندوستان کے رشیوں کا۔ بابل کے عالموں کا اور مصر کے دانش وروں کا۔ دنیا کے مختلف کونوں سے انسان نے اپنا ہاتھ اُٹھا کے اپنے علم و کاوش سے آسمان کی تعمیر کی تھی۔

لیکن ڈیموکرٹس کی سچائی آخری سچائی نہیں تھی۔ کوئی سچائی آخری نہیں ہوتی۔ جب وہ کہہ رہا تھا۔ ایٹم کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ اس وقت اسے کیا معلوم تھا کہ ایک دن انسان اس ذرے کو بھی توڑ کے رکھ دے گا اور اس وقت انسان کے ہاتھ میں سورج کی توانائی آ جائے گی جس سے وہ اس دنیا پر بہشت بھی بنا سکے گا اور دوزخ بھی۔ اور یہ فیصلہ آسمان نہیں کرے گا اس کی تقدیر نہیں کرے گی۔ یہ اس کی عقل و دانش کا فیصلہ ہوگا کہ وہ اس دنیا پر بہشت بنائے گا کہ دوزخ؟

ڈیموکرٹس نے کتاب ختم کر دی۔ عدالت نے اُسے بری کر دیا اُسے پانسو اشرفیاں انعام میں دیں۔ اس کے اعزاز میں اس کے اپنے شہر میں اس کی اپنی زندگی میں ایک جیتے کا بت نصب کرنے کا حکم دیا۔

ڈیموکرٹس ان پانسو اشرفیوں کو لے کر پھر سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ آسمان ساز تھا۔ وہ ایک جگہ پر کیسے رک سکتا تھا۔ گھومتے گھومتے وہ ایتھنیز پہنچا۔ یہاں اس کی ملاقات اناکسی گوراس سے ہوئی۔ ایک آسمان ساز دوسرے آسمان ساز سے

مگر اناکسی گوراس کو ڈیموکریٹس کے خیالات بہت ہی جسارت آمیز معلوم ہوئے۔ ایتھنز میں اس وقت سقراط بھی تھا۔ مگر سقراط سقراط تھا۔ وہ ڈیموکریٹس کو کیا سمجھتا تھا۔

ارسطو کے ایک سو سال بعد الگزنڈریہ کے عجائب گھر میں.....!

مصریوں، کے اس شہر میں مصری اور یونانی تہذیبیں گنگا جمنا کی طرح آ کے ملی تھیں۔ مصری فرعونوں کو شروع ہی سے علم اور تہذیب سے بہت دل چسپی تھی۔ وہ لوگ شاعروں، فلاسفروں اور سائنس دانوں خاص کر علم ریاضی کے ماہروں اور میکینکس کے جاننے والوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔

ماقبل تیسری صدی عیسوی میں الگزنڈریہ میں یونانی اور مصری علم و فضل کے باہمی اشتراک سے ایک خوبصورت مندر بنایا گیا۔ اس سے پہلے خداؤں کے لئے بنائے جاتے تھے۔ مگر یہ مندر بالکل نیا تھا۔ یہ مندر سائنس کی دیوی کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس مندر میں بتوں کی بجائے لیباریٹریاں نصب کی گئیں اور علم و فن سکھانے کے لئے الگ الگ شعبے مقرر کئے گئے۔ جیومیٹری کا اُستاد یوکلڈ تھا۔ ارشمیدیش میکانکس پڑھاتا تھا۔ بڑے بڑے بادشاہ اس مندر میں پڑھنے کے لئے آتے تھے اور دُور دَراز کے ملکوں سے ہزاروں طالب علم کئی سال کی مسافت کے بعد الگزنڈریہ کے مندر میں علم حاصل کرنے کے لئے پہنچتے تھے۔

الگزنڈریہ کے عجائب گھر کی لائبریری بہت بڑی تھی۔ اس لائبریری میں ڈیموکریٹس کی کتابیں بھی موجود تھیں مگر کوئی انھیں پڑھتا نہ تھا۔ انھیں دیمک چاٹ رہی تھی۔ چوتھی صدی عیسوی میں ارسطو نے لائی سیم قائم کیا۔ لائی سیم کی درس گاہ میں ایک طالب علم تھا۔ تھیو فراسطو۔ ارسطو نے تھیو فراسطو کو پڑھایا تھیو فراسطو نے سطراطو کو۔ سطراطو نے اسطارخس کو۔ اسطارخس لائی سیم سے تعلیم پا کے الگزنڈریہ چلا گیا۔ وہ ڈیموکریٹس کے حامیوں میں سے تھا۔

ارسطارخس نے فلکیات کا مطالعہ شروع کیا۔ آسمان سے اسے بڑی دل چسپی تھی۔ آسمان گویا اس کا گھر تھا۔ وہ دن رات آسمان کا نقشہ بنانے میں مصروف رہتا۔ اس کے اوزار بڑے بھدے اور ناقص تھے مگر انھیں اوزاروں کی مدد سے اس نے انسان کے لئے آسمان کا ایک نیا نقشہ تیار کیا۔ اس نے زمین سے چاند کا فاصلہ ناپا اور تقریباً ٹھیک ناپا۔ اس نے سورج سے چاند کا فاصلہ ناپنے کی کوشش بھی کی۔

جوں جوں وہ آسمان کا مطالعہ کرتا اسے معلوم ہوتا جاتا کہ زمین آسمان کا مرکز نہیں ہے جیسا کہ اب تک بہت سے سائنس داں سمجھتے آئے تھے۔ بلکہ سورج ہے۔ سورج زمین کے گرد گردش نہیں کر رہا ہے بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔

اس دریافت سے یکایک آسمان کے بہت سے تاریک گوشے روشن ہو گئے۔ فلکیات کے حساب کی بہت سی غلط باتیں خود بخود درست ہو گئیں۔ پرانے آسمان کا ایک بوسیدہ کنگرہ ٹوٹ کے گر پڑا۔ اور اس کی جگہ ایک ایسے نظام شمسی نے لے لی جس کا مرکز سورج تھا اور جس کے گرد زمین ایک سیّارے کی طرح رقص کر رہی تھی۔ اس سے پہلے زمین ایک عشوہ طراز محبوب کی طرح اپنے چاروں طرف دیکھتی تھی۔ مگر آج وہ محبوب نہ تھی عاشق بن گئی تھی۔ انسان نے پہلی بار اپنے آپ کو ایک عاشق کی طرح دیکھا اور فخر اور مسرّت اور غرور سے اس کا سینہ تن گیا۔

آج سے کئی صدیاں پہلے جب مغرب نے آسمان سازوں پر اپنے دروازے بند کر لئے تو بغداد نے انھیں پناہ دی۔ بغداد حسین چہروں، حرم سراؤں اور الف لیلوی حکایتوں کا ہی شہر نہیں رہا ہے۔ اس شہر نے اپنے نازک منقّش میناروں سے آسمان کو بھی تاکا ہے اور اس کی پہنائیوں میں اپنے علم و فراست کے نشان چھوڑے ہیں۔

اپنی عظمت کے زمانے میں بغداد کی گلیاں کتابوں کی دوکانوں سے پٹی پڑی تھیں۔ یہاں یونانی مفکّروں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سائنس دانوں کی کتابیں بھی ملتی تھیں۔ شفا خانوں میں ہندوستانی وید اور جراح بھی کام کرتے تھے۔ درسگاہوں میں مصری فنکار علم و فضل کے خزانے لٹاتے تھے۔

گیارھویں صدی عیسوی میں بھی خلافت کے بٹ جانے کے بعد اسلامی دُنیا میں کاردووا سے بخارا تک اور بغداد سے اُرگنج تک سائنس دانوں کی عزت ہوتی تھی اور انھیں خلعتیں پیش کی جاتی تھیں اور قدر جواہر سے ان کی جھولیاں بھر دی جاتی تھیں۔

ایک بار خلیفہ ہارون رشید نے کہا۔ "میں ایک عالم کی سیاہی کی اتنی ہی قدر کرتا ہوں جتنی ایک شہید کے خون کی۔" اسی زمانے نے البیرونی ایسا آسمان ساز پیدا کیا جس نے اپنے علم و فضل کے تجربے کی بنا پر اعداد و شمار سے ثابت

کیا کہ زمین کے سورج کے گرد گھومنے سے ستاروں کی اضافی حرکت میں کوئی غلطی نہیں پیدا ہوتی۔ یہ غلطی جو سائینسدان اب تک اپنے حساب میں دکھاتے آتے تھے۔ البیرونی نے یہ بات کوپرنیکس سے پہلے معلوم کی تھی۔

اسی زمانے میں الحسن نے ثابت کیا کہ جب سورج مغرب میں ڈوب جاتا ہے۔ اس وقت بھی اس کی شعاعیں ہمیں نظر آتی رہتی ہیں۔ جب تک آفتاب مغرب کے وقت افق سے باون ہزار قدم نیچے نہیں چلا جاتا۔ اس وقت تک ہمیں اس کی شعاعیں نظر آتی رہتی ہیں۔

آج بیسویں صدی کے ماہر فلکیات جب اس سلسلے میں حساب لگاتے ہیں تو وہ الحسن کی دریافت سے بہت دور نہیں جا سکتے۔

طیلس، اناکسی مینڈر۔ ڈیموکرٹس۔ البیرونی، الحسن۔ کوپرنیکس گیلیلو۔۔۔
آسمان کی تعمیر کا کام جاری ہے۔

بچے نے بڑے غور سے میری کہانی سُنی۔ کچھ سُنی ہے کچھ نہیں سُنی ہے۔ کچھ سمجھی ہے کچھ نہیں سمجھی ہے۔ یہ کہانی جو بہت سی کتابوں، بہت سی بحثوں، بہت سے تجربوں کے بعد مجھ تک پہنچی ہے۔ وہ بڑے غور سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ کیا وہ فٹن کی طرح سورج کے رتھ پر سوار ہونا چاہتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ وہ آسمان کی طرف جائے گا۔ گلابی انگلیوں والی سحر اسے اپنے ہاں بلا رہی ہے۔ مشرق کے دروازے کھل گئے ہیں اور چار گھوڑوں والا سنہری رتھ اس کی سواری کے لئے کھڑا ہے۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ اب وہ فٹن کی سی غلطی نہیں کرے گا۔ اس کے پاس بہت سے آسمان سازوں کا تجربہ ہے۔ آج انسان نے ایٹم کا جگر چیرا ہے اور بڑے حوصلے سے نظامِ شمسی کی طنابیں اپنے ہاتھ میں لی ہیں۔ آج وہ پھر ایک نیا آسمان بنانے پر تُل گیا ہے۔ کیونکہ جو انسان اپنی زمین سے مطمئن نہیں ہے وہ اپنے آسمان سے کیا مطمئن ہوگا جب تک وہ کہکشاں کی وسعتوں کو پھاند کر آسمان میں ایک نیا تاج محل نہیں بنائے گا اسے چین نہیں آئے گا۔ کیونکہ انسان صرف خاک و باد کا پتلا ہی نہیں وہ سورج کا بیٹا بھی ہے۔

گوبر کی گیس سے کھانا پکایا جائے گا

نئی دہلی کے انڈین ایگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے تجربات سے یہ ثابت کیا ہے کہ گوبر سے حاصل کردہ گیس کے ذریعے کھانے وغیرہ پکائے جا سکتے ہیں، اور ایسے لیمپوں میں جن میں مینٹل لگا ہوا ہو روشنی کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ گوبر کی گیس کے لئے انسٹی ٹیوٹ نے لیمپ کا ایک خاص نمونہ بھی تیار کیا ہے۔ علاوہ ازیں انسٹی ٹیوٹ میں آزمائش کے لئے ایندھن کے طور پر استعمال ہونے والی گیس کی ایک مشین چل رہی ہے جو پرندوں کے لئے باقاعدہ طور پر گیس مہیا کر رہی ہے۔ اس آزمائش کا مقصد یہ ہے کہ دیہی علاقوں میں ایندھن کے طور پر استعمال ہونے والی گیس کے عملی امکانات کا تعین کیا جا سکے۔ چونکہ فی الحال بڑے پیمانے پر کوئی اسکیم جاری کرنے کے امکانات نہیں ہیں، اس لئے ان تجربات سے محض نتائج اخذ کئے جا رہے ہیں۔

کھادی پرتشٹھان سودے پور اور سری رام کرشنن مٹھ بیلور نے جو دو چھوٹی چھوٹی مشینیں تیار کی ہیں ان کی قیمت دو سو روپے سے بھی کم ہے، اور ان کے چلانے کے اخراجات بھی بہت کم ہیں۔ علاوہ ازیں گیس تیار کرنے کے بعد جو کھاد دستیاب ہوتا ہے وہ بہت کارآمد ہوتا ہے۔

بہرکیف بڑی بڑی مشینیں آرے ملک کالونی بمبئی اور رشوگر کین ایسٹ وال چند نگر نے نصب کی ہیں۔ کوآپریٹو بنیادوں پر دیہات میں ایسی مشینیں لگانے کے وسیع امکانات ہیں۔

آل احمد سرور

ماتم کیوں؟

اے دوست یہ افسانۂ بربادیٔ دل کیا
ماتم تو کبھی شیوۂ رنداں نہیں ہوتا
کب صبح کی آمد پہ ستارے نہیں ڈھلتے
کب رات کا ہر خواب پریشاں نہیں ہوتا
تزئینِ گلستان ہے کوئی کھیل نہیں ہے
کس کس کا لہو صرفِ بہاراں نہیں ہوتا
ساحل کا فسوں لاکھ خوش آیند ہے لیکن
ساحل سے تو اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا
جذبات کا انجام پریشاں نظری ہے
افکار کا شیرازہ پریشاں نہیں ہوتا

تو وقت کے اسرار کا محرم نہیں شاید
یہ دورِ تغیر ترا محکوم نہیں ہے
مستوں کے بہکنے میں بھی اک رمزِ جنوں ہے
یہ رمز ابھی تک تجھے معلوم نہیں ہے
یاں کثرتِ نظارہ ہے خود مانعِ غم بھی
مصروف ہے جو آنکھ وہ مغموم نہیں ہے
آنچ آئی جو دامن پہ تو شعلوں سے حذر کیوں
"عذرا دُں" کی تخلیق تو معدوم نہیں ہے
تخریب میں تعمیر ہے، تعمیر میں تخریب
انساں ہے کوئی پیکرِ معصوم نہیں ہے

تہذیب کے فرسودہ تصور پہ ہے نازاں
ہر غمزۂ پیری میں کہاں حُسن کا جادو
رنگین پروں سے کہیں اُڑنا بھی ہے ممکن
گر ہمسرِ افلاک نہ ہو قوتِ بازو
ہے جذبِ عمل پاس تو نقصان نہیں ہے
انصاف کی خوگر ہے زمانے کی ترازو
افکارِ سرافراز ہیں جذبات ہیں پامال
شیروں کے لئے ننگ ہے خوئے رمِ آہو
ہے جن کی جبیں سعیٔ مسلسل سے گہرتاب
زیبا ہے انہیں کے لئے ساقی کا بھی پہلو

اس دور کے سربستہ حقائق نہیں کھلتے
سایہ ہے اگر "گل" کا ترے قلبِ حزیں پر
اشکوں کی گلابی تو چھلکتی ہی رہے گی
کچھ خونِ جگر سے بھی کھلا پھول زمیں پر
یہ گردِ کدورت ابھی ہو جائے گی کافور
محنت کا عرق آئے اگر تیری جبیں پر
ہستی کے یہ آدابِ رم و سوز و تجلی
موقوف نہیں تری چناں اور چنیں پر
مستور تھے جو دیر و حرم میں کبھی اسرار
ہیں فاش وہ اک رندِ خرابات نشیں پر
[illegible]
[illegible]

فضا ابن فیضی

ہمارے شاعر اور مشاعرے

وہ برپا ہوئی ہال میں انجمن　　ہوئے جمع اربابِ شعر و سخن
غزل در غزل گنگنانے لگے　　سماعت کو نشہ پلانے لگے
وہ اک تان کھینچی سماں بندھ گیا　　فضاؤں میں گھونگرو سا بجنے لگا
سُنا تھا کہ ناہید غش کھا گئی　　سرِ چرخ زہرہ بھی چکرا گئی
نہ جدت نہ ندرت کوئی سوچ میں　　مگر لہجہ ڈوبا ہوا لوچ میں
نہیں ان کی محفل میں محوِ سرود　　وہ فن جس سے کارِ جہاں کی کشود
یہ اُلجھے ہیں زلفوں کی پیچاک میں　　یہ گوہر ہیں غلطیدہ کس خاک میں
نگاہوں کے بسمل اداؤں کے صید　　یہ سورج ہیں اپنی ہی کرنوں میں قید
یہ دلدارِ صہبا کے مفلس امیر　　درخشاں ہیں بے روشنیٔ ضمیر
ہر اک راستہ ان سے تاریک تر　　فروزاں نہیں خال و خط میں سحر
کبھی خال اور زلف میں خاک بیز　　کبھی پائے ساقی پہ ہیں سجدہ ریز
کبھی چشم و ابرو پہ مشقِ سخن　　کبھی مدحِ گیسوئے غنچہ دہن
وہ سیمیں جبیں مشکِ کاکل کی بات　　وہ نرگس وہ لالہ وہ سنبل کی بات
لبِ سُرخ پر احمریں تبصرے　　کمر پر بڑے دُور بیں تبصرے
وہ مستیٔ چشمِ غزالیں کی بات　　وہ رخسار و لعلِ نگاریں کی بات
وہ حُسن و مئے ناب کے تذکرے　　وہ ابرو کی محراب کے تذکرے
وہ مست آنکھ کی نافشردہ شراب　　بس اک چاند اور وہ بھی زیرِ نقاب
وہ کھلتے ہوئے سے دہن کے نکات　　وہ گل رنگ چہروں کے رنگیں صفات
وہ آنچل میں عارض کے ہلکے گلاب　　رسیلے لبوں کی وہ میٹھی شراب

وہ روشن فسانہ رُخِ سادہ کا　　وہ اُڑتا فسوں نشۂ بادہ کا
وہ کانٹے گل و لالہ کے روپ میں　　وہ ڈھلتی ہوئی چاندنی دھوپ میں
وہ راتوں کے نالے وہ صبحوں کی آہ　　وہ ناکردہ عشق و ہوس کے گناہ
سیاہی تجلی کو ڈستی ہوئی　　تصوّر پہ تلخی برستی ہوئی
جلو میں خوشی کے غمِ بے پناہ　　جوانی ہی میں موت سے رسم و راہ
چمن کے تعاقب میں بادِ خزاں　　جلو خانہ کی سمت اُٹھتا دھواں
وہ پھولوں کے قالب میں خونی ببول　　وہ صبحوں کے دامن میں کہرے کی دھول
وہ بے مغز اور نارسیدہ شعور　　ادب، زندگی کے تقاضوں سے دور
ہر اک روشنی تیرگی میں اسیر　　تخیل میں پیوست آہوں کے تیر
نظر میں اندھیرا ارادوں پہ زنگ　　دبی سی دلِ مضطرب کی اُمنگ
نگاہوں میں بے چارگی کا خمار　　تفکر پہ چھایا ہوا اک غبار
جبینوں پہ یاس و جہل کی شکن　　اُجالے پہ تیرہ شبی خندہ زن
نہیں فاش ان پر خود اپنا مقام　　بکے ہیں یہ پکھراج کنکر کے دام
نہ شامِ تمنا نہ صبحِ مراد　　خرد بے کرشمہ جنوں کم سواد
نہ طبعِ لطیف و نہ ذوقِ سلیم　　سرِ طور پر بے تجلی کلیم
سوئے جہل و تخریبِ فن کی لگام　　یہ صالح عناصر کا فقدانِ عام
یہ غل ناشناسوں کی تحسین کا　　ہے اک مرحلہ جھوٹی تسکین کا

نہ پوچھو کہ ہیں کن سرابوں میں گم
یہ دریا ہیں اپنے حبابوں میں گم

تنویر احمد علوی

تضاد

ہو گیا چشم و روح کو سکتہ
زیست کو جب قریب سے دیکھا

کتنے چہروں کے شوخ غازوں میں
چھپ رہے ہیں قبیح نقش و نگار
کتنے ہونٹوں کے حرفِ شیریں میں
کپکپاتی ہے تلخیٔ گفتار

کتنی خوش حالیوں کے ماتھے پر
پڑ رہی ہے فلاکتوں سے شکن
کتنی خود داریوں کے ہاتھوں سے
چاک ہوتا ہے غیرتوں کا کفن

کتنے رنگین قہقہوں کا طلسم
توڑ دیتا ہے ماتمِ انفاس
کتنی سرشاریوں کے پہلو میں
تلملاتی ہے شدتِ احساس

کتنے تقووں کی آستینوں میں
پل رہے ہیں گنہ کے خار سیاہ
کتنے عصیان و گمرہی کے سراب
زیست کو دے رہے ہیں درسِ نگاہ

کتنے لہو و لعب کے پس منظر
تجربوں کی طرح ہیں سنجیدہ
کتنے عشق و ہوس کے ہنگامے
تنگیٔ عیش سے ہیں رنجیدہ

کتنے مہر و وفا کے پردوں میں
بغض و نفرت کے جل رہے ہیں چراغ
کتنی خود کامیوں کے شعلوں سے
سینہ ہائے خلوص ہیں پُر داغ

کتنی روحوں کے شعلہ زاروں میں
ہے نہاں زندگی کی خاکستر
کتنے سانسوں کی عطر بیزی میں
تھرتھراتی ہے بوئے زخمِ جگر

کتنے تہذیب و شہریت کے نقاب
ہیں پسِ پردہ جہل و عریانی
کتنے مذہب کے جامہ ہائے فراخ
ہیں تعصب کی تنگ دامانی

کتنی آزادیوں کے شانوں پر
ہیں غلامی کے تختہ و تابوت
کتنی خوشیوں کے عیش خانوں میں
غم کدوں کا سا ہے مہیب سکوت



داروسی ا حقه

ایشیا کے دو بڑے رہنما

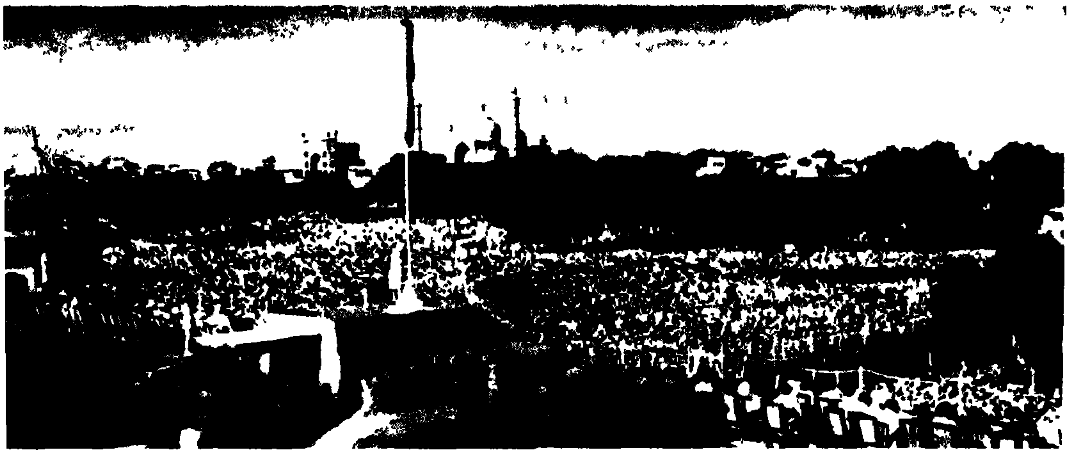
بھارت اور چین کی مجموعی آبادی قریب قریب دنیا کی آبادی کا نصف ہے ۔ ایشیا کے ان دو بڑے ملکوں کے رہنماؤں چاؤ این لائی اور جواہر لال نہرو نے حال ہی میں دہلی میں اس غرض سے ملاقات کی کہ دنیا میں جنگ کے امکانات کو ختم کیا جائے



چاؤ این لائی

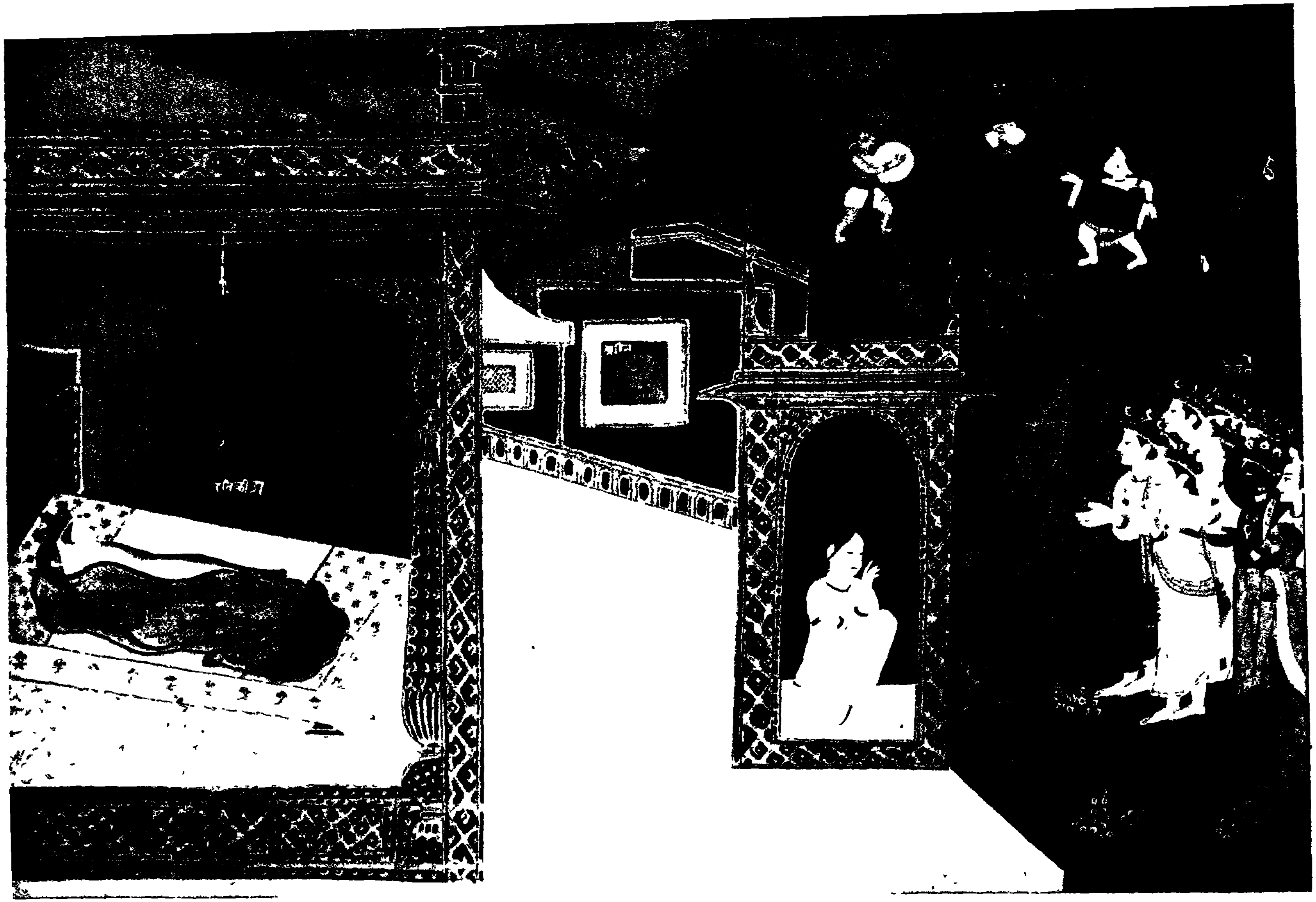


جواہر لال نہرو



دھلی میں یوم آزادی





کام دیو اور رتی

خاموش آواز

جنوری کی ایک چاندنی رات میں صفیہ کے مزار پر

• کتنے دنوں میں آئے ہو ساتھی
میرے سوتے بھاگ جگانے
مجھ سے الگ اس ایک برس میں
کیا کیا بیتی تم پہ نہ جانے

• دیکھو کتنے تھک سے گئے ہو
کتنی تھکن آنکھوں میں گھُلی ہے
آؤ تمھارے واسطے ساتھی
اب بھی مری آغوش کھُلی ہے

• چُپ ہو کیوں کیا سوچ رہے ہو
آؤ سب کچھ آج بھُلا دو
آؤ اپنے پیارے ساتھی
پھر سے مجھے اِک بار جِلا دو

• اتنے دن کے بعد کہیں تم
آئے ہو ساجن میرے دوارے
آج اندھیرے انگنا مورے
ناچ اُٹھے ہیں چاند ستارے

• دیکھو کیسی رات حسیں ہے
جیسے میرا پیار کھِلا ہو
آج تو ایسی جوت ہے جیسے
چاند زمیں سے آن مِلا ہو

• بولو ساتھی کچھ تو بولو
کب تک آخر آہ بھروں گی
تم نے مجھ پر ناز کئے ہیں
آج میں تم سے ناز کروں گی

• آؤ میں تم سے روٹھ سی جاؤں
آؤ مجھے تم ہنس کے منا لو
مجھ میں سچ مچ جان نہیں ہے
آؤ مجھے ہاتھوں پہ اُٹھا لو

• میرے پریتم میرے مالک
مجھ کو میرا جیون دے دو
آج مجھے سینے سے لگا کر
اپنے دل کی دھڑکن دے دو

• تم کو میرا غم ہے ساتھی
کیسے اب اس غم کو بھُلا دوں
اپنا کھویا جیون بولو
آج کہاں سے ڈھونڈ کے لا دوں

• یہ نہ سمجھنا میرے ساتھی
دے نہ سکی میں ساتھ تمہارا
یہ نہ سمجھنا میرے دل کو
آج تمہارا دُکھ ہے گوارا

• یہ نہ سمجھنا میں نے تم سے
جان کے یوں مُنہ موڑ لیا ہے
یہ نہ سمجھنا میں نے تم سے
دل کا ناتا توڑ لیا ہے

• یہ نہ سمجھنا تم سے میں نے
آج کیا ہے کوئی بہانا
دنیا مجھ سے رُوٹھ چکی ہے
ساتھی تم بھی روٹھ نہ جانا

• آج بھی ساجن میں ہوں تمھاری
آج بھی تم ہو میرے اپنے
آج بھی ان آنکھوں میں بسے ہیں
پیار کے اَمِٹ گہرے سپنے

• دل کی دھڑکن ڈُوب بھی جائے
دل کی صدائیں تھک نہ سکیں گی
مِٹ بھی جاؤں پھر بھی تم سے
میری وفائیں تھک نہ سکیں گی

• یہ تو پوچھو مجھ سے چھُٹ کر
تیرے دل پر کیا کیا گزری
تم بن میری ناؤ تو ساجن
ایسی ڈُوبی پھر نہ اُبھری

• ایک تمھارا پیار بچا ہے
ورنہ سب کچھ لُٹ سا گیا ہے
ایک مسلسل رات کہ جس میں
آج مرا دم گھُٹ سا گیا ہے

• آج تمھارا رستہ تکتے
میں نے پورا سال بِتایا
کتنے طوفانوں کی زد پر
میں نے اپنا دیپ جلایا

• تم بن سارے موسم بیتے
آئے جھونکے سرد ہوا کے
نرم گلابی جاڑے گزرے
میرے دل میں آگ لگا کے

• ساون آیا دھوم مچاتا
گھِر گھِر کالے بادل چھائے
جم سے گئے ہیں میرے دل پر
جانے کتنے گہرے سائے

• چاند سے جب بھی بادل گزرا
دل سے گزرا عکس تمھارا
بھُول چُکے میں نے جانا
تم نے شاید مجھ کو پکارا

بہاریں مجھ کو منانے
ہیں تو مُنہ سے نہ بولی
فضا میں گیت سے گونجے
میں نے آنکھ نہ کھولی
نکھری صبحیں گزریں
مہکی شامیں چھائیں
ے دل کو دُور سے تکنے
نے کتنی یادیں آئیں
ی مُدّت بعد تو ہیتم
ج کلی ہردے کی کھلی ہے
تنی راتیں جاگ کے ساجن
ج مجھے یہ رات ملی ہے
ولو ساتھی کچھ تو بولو
مجھ تو دل کی بات بتاؤ
آج بھی مجھ سے دُور رہو گے
آؤ مرے نزدیک تو آؤ
آؤ میں تم کو بہلا لوں گی
بیٹھو تو جاؤ میرے سہارے
آج تمھیں کیوں غم ہے بولو
آج تو میں ہوں پاس تمھارے
• اچھا میرا غم نہ بھلاؤ
میرا غم ہر غم میں سمو لو
اس سے اچھی بات نہ ہو گی
یہ تو تمھیں منظور ہے بولو
• اب سے اپنا دل نہ دُکھانا
میرے لئے فریاد نہ کرنا

مجھ سے کچھ بھی پیار اگر ہے
میرا غم برباد نہ کرنا
• میرے غم کو میرے شاعر
اپنے جواں گیتوں میں رچا لو
میرے غم کو میرے شاعر
سارے جگ کی آگ بنا لو
• میرے غم کی آنچ سے ساتھی
چونک اُٹھے گا عزم تمہارا
بات تو جب ہے لاکھوں دل کو
چھو لے اپنے پیار کا دھارا
• میں جو تمھارے ساتھ نہیں ہوں
دل کو مت مایوس کرو تم
تم ہو تنہا، تم ہو اکیلے
ایسا کیوں محسوس کرو تم
• آج ہمارے لاکھوں ساتھی
ساتھی! ہمت ہار نہ جاؤ
آج کروڑوں ہاتھ بڑھیں گے
ایک ذرا تم ہاتھ بڑھاؤ
• اچھا اب تو ہنس دو ساتھی
ورنہ دیکھو روسی پڑوں گی
بولو ساتھی کچھ تو بولو
آج میں سچ مچ تم سے لڑوں گی
• جاگ اُٹھی لو دنیا میری
آئی ہنسی وہ لب پہ تمھارے
دیکھو دیکھو میری جانب
دوڑ پڑے ہیں چاند ستارے

• جھلمل جھلمل کرنیں آئیں
مجھ کو چندن ہار پہنانے
جگمگ جگمگ تارے آئے
پھر سے میری مانگ سجانے
• آئیں ہوائیں جھانجھ بجاتی
گیتوں مورا انگنا جاگا
مورے ماتھے جھومر دمکا
مورے ہاتھوں کنگنا جاگا
• جاگ اُٹھا ہے سارا عالم
جاگ اُٹھی ہے رات ملن کی
آؤ زمیں کی گود میں ساجن
سیج سجی ہے آج دُلھن کی
• آؤ جاتی رات ہے ساتھی
پیار تمھارا دل میں بھر لوں
آؤ تمھاری گود میں ساجن
تھک کر آنکھیں بند سی کر لوں
• اُٹھو ساتھی! دُور اُفق کا
نرم کنارا کانپ اُٹھا ہے
میرے دل کی دھڑکن بن کر
صبح کا تارا کانپ اُٹھا ہے
• دل کی دھڑکن ڈوب کے رہ جا
جاگی نبضو تھم سی جاؤ
پھر سے میری بے نم آنکھو
پتھر بن کر جسم سی جاؤ
• میرے غم کا غم نہ کرو تم
اچھا اب سے غم نہ کروں گی

میرے ارادوں والے ساتھی
جاؤ میں ہمت کم نہ کروں گی
• تم کو ہنس کر رخصت کر دوں
سب کچھ میں نے ہنس کے سہا ہے
تم بن مجھ میں کچھ نہ رہے گا
یوں بھی اب کیا خاک رہا ہے
• دیکھو کتنے کام پڑے ہیں
اچھا اب مت دیر کرو تم
کیسے جم کر رہ سے گئے ہو
اتنا مت اندھیر کرو تم
• بولو تم کو کیسے روکوں
دُنیا سَو الزام دھرے گی
ایسے پاگل پیار کو ساتھی
ساری خلقت نام دھرے گی
• آؤ میں اُلجھے بال سنواروں
مجھ سے کوئی کام تو لے لو
پھر سے گلے اک بار لگا کر
پیار سے میرا نام تو لے لو
• اچھا ساتھی جاؤ سدھارو
اب کے اتنے دن نہ لگانا
پیاسی آنکھیں راہ تکیں گی
ساجن جلدی لَوٹ کے آنا
• لیکن ٹھہرو ٹھہرو ساتھی
دل کو ذرا تیار تو کر لوں
آؤ مرے پردیسی ساجن
آؤ میں تم کو پیار تو کر لوں

اکبر الہ آبادی

انیسویں صدی میں اُردو شاعری کافی ترقی کر چکی تھی - ہرچند کہ لکھنؤ اس کے اقتدار کے مقابلے کے لئے گاہ گاہ آکھڑا ہوتا تھا - پر دہلی زبان معیاری زبان کی حیثیت سے مانی ہوئی تھی - اس کی نوعمری میں دکن نے اس کی پرورش کی تھی مگر اب وہ چلتا ہوا مرکز نہ رہا تھا - اکثر اہلِ قلم دہلی اور لکھنؤ میں ہی اپنی ترقی کے سامان پا رہے تھے - ان میں سے معدودے چند دربارِ حیدرآباد کی طرف ہجرت کر گئے تھے - اور وہاں کی سرپرستی حاصل کر پائے تھے - لیکن وہاں وہ رس بس نہ سکے اور وہ ہمیشہ اپنی متمنی نگاہیں شمال کی طرف ہی ڈالتے رہے - اردو ایک شستہ و شائستہ زبان بن چکی تھی - اس کا ابتدائی اَن گھڑپن دُور ہو چکا تھا - مگر اس راہ میں اس کی توانائی گھٹ گئی تھی - تازگی اور قوت کھو کر اسے نفاست اور شکوہ حاصل ہوا تھا - اظہار کے اسالیب پُرتکلف اور بندھے ٹکے ہو کر رہ گئے تھے - تشبیہیں اور استعارے بس ایک مخصوص قماش کی پیروی کرتے تھے - ہندوستانی اصل کے الفاظ بڑی سختی سے متروک کئے جا رہے تھے - دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد کے درباروں کی پروردہ شاعری کا بیشتر حصہ باوجود اعلیٰ صنعتی خوبیوں کے سستا اور اوچھا تھا - سادہ اور پُرجوش ہونے کی بجائے جذبات پرستانہ تھا - اس عہد کی زوال پذیر سماجی زندگی پورے طور پر شاعری میں منعکس ہے پھر بھی یہ بڑی قابلِ لحاظ بات ہے کہ میرؔ، سوداؔ، ذوقؔ، غالبؔ، آتشؔ، ناسخؔ، دردؔ، داغؔ اور انیسؔ نے صحیح معنوں میں اعلیٰ شاعری کا کتنا بڑا ذخیرہ پیدا کیا - نغمہ سرا چڑیوں کے اس نشیمن میں اور بھی ممتاز گانے والے تھے - لیکن وقت آگیا تھا کہ جسدِ اردو میں نیا خون داخل کیا جائے حالیؔ اور اکبرؔ دوسروں سے زیادہ اس تبدیلی کے ذمہ دار تھے جو اردو کے معنی و صورت میں رونما ہوئی - جب ۱۸۶۷ء میں حالی نے مندرجہ ذیل اشعار لکھے تو وہ نئی طرز میں نئی بات کہہ رہے تھے -

اے وطن! اے مرے بہشت بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
تری اک مشتِ خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

لیکن یہ اکبر کی تقدیر میں تھا کہ وہ اردو شاعری کے مواد اور مزاج میں ایسی بنیادی تبدیلی پیدا کریں جو گویا انقلابی تھی -

سید اکبر حسین بارا ضلع الٰہ آباد میں ۱۶ / نومبر ۱۸۴۶ء کو پیدا ہوئے ان کے آباء کا ابتدائی وطن نیشاپور، ایران تھا - ان کے پردادا فوج میں صوبے دار تھے - انھوں نے جنگِ پلاسی میں حصّہ لیا تھا - ان کے دادا سید فضل محمد عالم آدمی تھے - انھیں اودھ کے نواب آصف الدولہ سے جاگیر ملی تھی - ان کے والد سید تفضل حسین نے نائب تحصیلداری تک ترقی حاصل کی اور ۱۸۸۸ء میں وفات پائی - ان کی والدہ صوبہ بہار کے ضلع گیا کی رہنے والی تھیں -

اس عہد کے طبقۂ وسطیٰ کے نمائندہ گھرانے کے نوجوانوں کی طرح اکبر نے فارسی اور عربی پڑھی - لیکن وہ انگریزی کی جانب بھی کھنچے - یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جب شروع شروع انگریزی تعلیم ہندوستان میں رواج پانے لگی تو بہ حیثیت الجماعت مسلمانوں نے نئے اسکولوں سے کنارہ کشی اختیار کی تا آنکہ سر سید احمد خاں سامنے آئے اور اُن کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب وہ انگریزی تعلیم کے فائدوں سے متمتع ہوں گے - اکبر کو تمام عمر ایسے نظامِ تعلیم سے گہری بے اعتمادی رہی جس کا مُلکی روایات سے دُور کا تعلق بھی نہیں تھا - یہ بے اعتمادی

اُن کے اشعار سے مستقل طور پر ظاہر ہوتی رہی۔ ۱۸۶۹ء میں وہ نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں اُنھوں نے پلیڈری کا آخری امتحان پاس کیا اور کچھ عرصے تک وکالت کرتے رہے۔ ۱۸۸۱ء میں وہ ملازمت عدلیہ میں منصف کی حیثیت سے لئے گئے۔ وہ ترقی کرکے ضلع جج بنے اور ملازمت سے سبکدوش ہو کر الہ آباد میں بس گئے "عشرت منزل" میں رہتے تھے۔ اُنھوں نے ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو پچھتر سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اُن کے زندہ رہ جانے والے لڑکے سید عشرت حسین جو ضلع کلکٹر کے درجے تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے تھے چند سال قبل انتقال فرما گئے۔ عشرت کے لڑکے عقیل اور مسلم دونوں جو میرے سابق شاگرد تھے پاکستان ہجرت کر گئے۔ اکبر کی تدفین خسرو باغ کے قریب کالا ڈانڈا میں ہوئی تھی۔ اُن کے مقبرے پر مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں۔ سے

قبر میں آئی تجلّی روئے جاناں کی مجھے
زہر سمجھے تھے جسے وہ شربتِ دیدار تھا

کلیاتِ اکبر کی تین جلدیں اُن کی زندگی میں چھپی تھیں۔ چوتھی جلد ۱۹۴۸ء میں کراچی میں چھپی۔ ان کے علاوہ اقبال اور اکبر کے خطوں کا ایک مجموعہ نیز "صورت نامہ" اور "گاندھی نامہ" ہیں۔ اکبر پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سب سے مفصل سید طالب علی کی کتاب ہے۔ علی گڑھ میگزین کے اکبر نمبر میں قیمتی تنقیدی اور سوانحی مواد خاصا مل جاتا ہے۔ چند دلچسپ خطوط اور حکایتیں پدم سنگھ شرما کی "پدما پراگ" میں دستیاب ہوتی ہیں۔ اکبر کے متعلق "تازہ ترین کتاب" "ولود اور وینگیا" ہے۔ یہ لیڈر پریس سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں شری پارس ناتھ سنہا نے اکبر کے سبھی مشہور اشعار کو جمع کر دیا ہے۔ مناسب نوٹ بھی دئے ہیں۔ ترتیب مضامین کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اور ایک باخبر تفصیلی مقدمہ بھی شامل ہے جس میں ہمدردانہ سمجھ بوجھ کی بھلی سی تنقیدِ کلام ہے"۔ نہ صرف اکبر کے پرانے قدردانوں بلکہ اُن تمام ہندی خوانوں کو جو اب تک اس بھرپور خوانِ ادب سے لطف اندوز نہیں ہو سکے ہیں مذکورہ بالا کتاب کا نہایت پُرجوش خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ میں زمانے سے اس خیال کا حامی رہا ہوں کہ اُردو کا بڑا فروغ ہوگا اگر اسے دیوناگری رسم الخط میں لکھا جائے۔ یہ قومی رسم الخط ہے اور اس ذریعے سے اردو بہت بڑی پڑھنے والی جنتا تک پہنچ جائے گی، انہیں متاثر کرے گی اور ان دوسری زبانوں سے خود بھی متاثر ہوگی جو دیوناگری لپی میں لکھی جاتی ہیں۔ اکبر کی طرح کا کوئی اور اردو ادیب پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ کوئی اس جیسا ادیب جو ستم ظریفی، طنز اور مزاح کی صلاحیت سے مالا مال ہو شمالی ہند کی کسی اور زبان ہی میں پیدا ہوا۔

شخصی لحاظ سے اکبر اتنے ہی دلچسپ تھے جتنے وہ شاعر کی حیثیت سے تھے۔ اُن کی صحبت میں بے کیفی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ نہایت دلنواز اور جوش آفریں گفتگو کرنے والے تھے۔ لطیفے پر لطیفے سنائے جاتے۔ اشخاص و واقعات کے متعلق عیارانہ اشارات کئے جاتے یادِ ایام کی باتیں ہوتی تھیں۔ چٹکلے، زندگی بداماں کہاوتیں، اقوال اور فی البدیہہ اشعار پیش کئے جاتے تھے۔ اُن کی گفتگو شراب و کباب کی طرح کی ہوتی تھی، نشہ خیز اور مقوّی۔ مجھے کئی بار اُنھیں دیکھنے کا فخر حاصل ہوا۔ لیکن میں صرف ایک بار دو محترم دوستوں کے ساتھ اُن سے ملنے ان کے گھر پر حاضر ہوا۔ افسوس! یہ دونوں حضرات مسٹر کچلو اور مولوی نصیر انتقال فرما چکے۔ وہ ہم سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ وہ اپنے بیٹے عشرت سے ملنے حال ہی میں پرتاب گڑھ گئے تھے اس ملاقات کا مفصل طور پر ذکر کرتے رہے اور ہم لوگوں کو ایک گھنٹہ تک اپنی باتوں سے مسحور کئے رکھا۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کے آخری سال میں تھے۔ لیکن ان کی گفتگو کی جانداری اور ولولہ سے ان کے آنے والے انجام کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا تھا۔ ہم نے پوچھا کہ پرتاب گڑھ کے لوگوں نے آپ کا دھوم دھام سے خیر مقدم کیا ہوگا۔ جواب ملا۔ ایک دفعہ خدا نے شہر لنڈن کی سیر کی۔ دن بھر وہ سرگرداں رہے۔ گلی گلی کی خاک چھانی۔ در بہ در دستک دیتے پھرے۔ لیکن ہر جگہ وہ دھکے دے کر نکال دئے گئے۔ کسی نے پانی بھی انھیں پینے کو نہ دیا۔ تھکے ہوئے اور بھوکے آخرش وہ ایک مکان پر پہنچے اور لوگوں کو بتلایا کہ وہ خدا ہیں۔ پھر اُنھوں نے ایک گلاس پینے کو پانی مانگا۔ لیکن یہ بات رد کر دی گئی۔ پھر وہ ادھر اُدھر بھٹکنے پر مجبور ہوئے۔ تھکے

ہارے وہ ایک اور مکان میں جا داخل ہوئے۔ انھیں شدت سے پیاس لگی ہوئی تھی۔ فرمایا — مجھے تھوڑا پانی پلاؤ۔ میں یسوع مسیح کا باپ ہوں۔ یہ سُن کر گھر کے مالک نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور خاطر تواضع کی بارش سے انھیں ششدر کر دیا۔ بھائی! پرتاب گڑھ میں کسی نے اکبر کی طرف چھوٹی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھا لیکن ڈپٹی صاحب کے والد کی بڑی قدر ہوتی۔" یہ ہماری اکبر الہ آبادی سے گفتگو کا محض ایک ٹکڑا تھا جو میرے حافظے میں باقی رہ گیا۔ اسی وقت اُنھوں نے ایک شعر کہا اور ہمیں سُنایا۔ ملاحظہ ہو ؎

میں کسی چیز کا نہیں عادی
ایک عادت ہے سانس لینے کی

ایک دفعہ کوئی نوجوان شاعر اُن سے ملنے گئے۔ فرمایا ؎

تحفۂ شب برات کیا بھیجوں؟
تم تو اے جان خود پٹاخہ ہو

مسٹری پارس ناتھ سنہا نے کئی دلچسپ واقعات کا تذکرہ کیا ہے جس سے اکبر کی پُرکشش شخصیت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جب میں پہلے پہل اکبر سے ملا تو میں ان سے متاثر نہیں ہوا۔ مختصر سا قد، بڑا سنجیدہ و پُرشکن چہرہ، خمیدہ قامت، لڑکھڑاتی ہوئی چال مجمع میں اُن پر تو کسی کی نگاہ بھی نہیں اُٹھ سکتی تھی۔ لیکن جب وہ لب کُشا ہوا کرتے تو لوگ اُن کے چہرے کو بھول جاتے۔ اور اُن کی شوخ آنکھوں سے برسنے والے طنز مزاح اور ننھے جن پک کی سی شرارت کا مشاہدہ کرتے اور اُن کے لبوں سے وہ الفاظ سُنتے جنھیں بقائے دوام کے پَر لگے ہوئے ہوتے

اکبر نے روایتی انداز میں بہتیری غزلیں لکھیں جن میں اردو دُنیا کے معروف عشقیہ تجربے پیش کئے گئے ہیں۔ آرزوئے ناکام، گریزِ محبوب، رقیب پر مہربانیاں، پروانے کا شمع سے لگاؤ۔ بہار میں قیدِ قفس کی سختیاں، غمِ دوراں سے نجات کے لیے ساقی کی نوازشیں، حُسن کا فراد، مسجد کی خانہ ویرانی، واعظ کی حماقتیں، وغیرہ وغیرہ غرض یہ کہ یہی گھسے پٹے ہوئے استعارات اور علامتیں، جنھیں ہر پشت میں نئی زندگی مل جاتی ہے، اکبر نے بھی برتی ہیں۔ مثلاً جس نے اکبر کی صرف تفریحی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر کو اکبر کی کاوش کا نتیجہ تسلیم نہیں کرے گا۔

جو ذبح کرنا ہے پر کھول دے مرے صیّاد
کہ رہ نہ جائے تڑپنے کی آرزو باقی

ذیل میں چند اور اشعار درج ہیں جن میں تغزل کا رنگ نمایاں ہے

نگاہِ ناز سے تم نے اگر دیکھا نہیں مجھ کو
تو پھر میں کیوں تڑپتا ہوں نہ زخمی ہوں نہ بسمل ہوں

مریضِ محبت ترا مر گیا
خدا کی طرف سے دوا ہو گئی

اُن کا گھر چھوڑ کر کہاں جاؤں   دل ہی کے ساتھ میں ٹھہرتا ہوں
مجالِ گفتگو کس کو ہے اُن کے حُسن کے آگے
زبانیں بند کر دیں اِن بُتوں نے بے زباں ہو کر

یہ ارشاد آپ کا بالکل بجا ہے حضرتِ واعظ
مگر میں کیا کہوں بن کچھ نہیں پڑتی جواں ہو کر

آئی نسیم باغ میں میرے یہاں نہ آئے تم۔   لالہ و گل بہت کھلے دل نہ کھلا بہار میں
کچھ نہ پوچھو اے ہم نفسو میرا نشیمن تھا کہاں   اب تو یہ کہنا بھی مشکل ہے وہ گلشن تھا کہاں
آتی ہو گی کسی کو ہجر میں موت   مجھ کو تو نیند بھی نہیں آتی
گنہ گاروں نے دیکھا جمالِ رحمت کو   کہاں نصیب یہ ہوتا جو بے خطا ہوتے
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام   وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
کوئی اکبر سا بھی دیوانہ نظر آیا ہے کم   پہروں روتا ہے جو پوچھو تو سبب کچھ بھی نہیں
ترچھی چتون سے خدا جانے وہ دیکھیں مجھے کب   موت کا وقت کسی شخص کو معلوم نہیں
رندوں میں تو ہے لطفِ مئے و ساقی و مطرب   واعظ یہ بتا تو تیری صحبت میں بھی کچھ ہے
حیا سے سر جھکا لینا ادا سے مسکرا دینا   حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا

اک بار نظر آیا خزاں کا جو تصرف
پھر ہم نے کبھی سوئے گلستاں نہیں دیکھا

ہر چند کہ اس طرز کے اشعار روایتی انداز میں لکھے گئے ہیں تاہم ان میں وہ تازگی ہے جو اُن کے اکثر ہم عصروں کے پُر تصنع کلام میں مفقود ہے۔

کلامِ منظوم کی فن کاری میں اکبر نے حیرت ناک کامیابی حاصل کی

ہے۔ وہ غیر ملکی الفاظ اور اسمائے خاص کو بھی قافیہ میں نہایت مکمل طور پر برتتے ہیں۔ میں نے ایک ایسا شعر سُنا ہے جو کسی مجموعے میں نہیں ملتا۔

کسی نے اکبرؔ سے فرمائش کی کہ وہ ایک ایسا شعر لکھیں جس میں مسٹر گچلو کا قافیہ ہو۔ فی البدیہہ مندرجہ ذیل شعر وارد ہوا۔

کوئی جا کے کہہ دو گچلو سے
ہم سب ہو گئے ہیں زچ تُو سے

اس طرز کی طبع آزمائی کے بہتیرے نمونے ملتے ہیں۔

چھکڑے پہ جو چڑھتے تھے، ہیں موٹر پہ سوار آج
کیوں اس کو سمجھتے نہیں تم لوگ سُوا راج

تو نے پڑھا ہے دنیا کو صرف ہسٹری میں — دنیا کو دیکھ غافل قدرت کی مسٹری میں
کیا کہوں اس کو میں بدبختیٔ نیشن کے سوا — اس کو آتا نہیں کچھ ایجیٹیشن کے سوا
پانی پینا پڑا ہے پائپ کا — حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

اکبرؔ کو ہمیشہ یہ دُکھ رہا کہ سماج پہ مذہب کا اثر کم سے کم ہوتا جاتا ہے۔ وہ مادی اور سائنٹفک ترقی کے خلاف نہیں تھے۔ لیکن روحانی اعتقاد کے نہ ہونے پر نفریں کرتے تھے۔ وہ رجعت پسند نہیں تھے۔ گرچہ ان کے بعض اشعار سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے انہیں سائنس کے فوائد تسلیم تھے لیکن وہ ابدی خوبیوں پر زور دیتے تھے۔ وہ اسلام کے معتقد تھے۔ مگر وہ متشدّد نہیں تھے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ دوسرے مذاہب کو بھی قائم رہنے اور پھُولنے پھلنے کا حق ہے۔ اپنے بعض اشعاؔ میں وہ سر سید احمد خاں اور ان کے تعلیمی پروگرام پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ سر اکبر حیدری مرحوم کے دردولت پر ہونے والی ایک گفتگو مجھے اس سلسلے میں یاد آتی ہے۔ اُنھوں نے مجھے اور ڈاکٹر ضیاء الدین کو کھانے پر بُلایا تھا۔ برسبیلِ تذکرہ سر حیدری نے پوچھا "ضیاء الدین! مجھے بتاؤ تو بھلا علی گڑھ تحریک سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلافات بڑھ نہیں گئے"؟ ڈاکٹر ضیاء الدین خاموش رہے مگر وہ نمایاں طور پر پریشان خاطر تھے۔ بہرکیف اکبرؔ طلبائے کالج پہ عموماً اور طلبائے علی گڑھ پر خصوصاً فقرے کسنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے کیونکہ اُنھوں نے اپنی قومی تہذیب کو ترک کیا تھا۔

ڈارون صاحب حقیقت سے نہایت دُور تھے
میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے

صاحبزادے نشے میں ہیں اور بیف کنور جی کی ہے ٹفن
ہیں مولوی صاحب قبلہ بھی چپ اور پنڈت جی مہراج بھی چُپ

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں — فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

یہ میرے سامنے شیخ و برہمن کیا جھگڑتے ہیں
اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہوں دونوں کا قائل ہوں

کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی
عہدوں سے آ رہی ہے صدا دُور دُور کی

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں
جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبرؔ
تم تو کیا ہو؟ خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

شری پارس ناتھ سنہا کی کتاب میں بہت سے اشعار گاندھی جی کے متعلق ہیں اور کئی اردو ہندی جھگڑے کے بارے میں اور بہتیرے ہندو مسلم اتحاد سے وابستہ۔ ذیل میں گاندھی جی اور ترک موالات کی تحریک سے متعلق چند اشعار دئے جاتے ہیں۔ کچھ تو "ونود اور دینگیہ" سے لئے گئے ہیں اور کچھ کلیاتِ اکبر جلد چہارم سے ؎

ہوں مبارک حضور کو گاندھی — ہیسے دشمن نصیب ہوں کس کو
کہ پٹیں خوب اور سر نہ اُٹھائیں — اور کھسک جائیں جب کہو کھسکو
انقلاب آیا، نئی دنیا، نیا ہنگامہ ہے — شاہنامہ ہو چکا اب وقت گاندھی نامہ ہے

کیوں دلِ گاندھی سے صاحب کا ادب جاتا رہا
بولے کیوں صاحب کے دل سے خوفِ رب جاتا رہا

اب میں ہندی اور اردو اور ہندو اور مسلم سے متعلق چند اشعار کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرتا ہوں۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کو ایک

پیام بھیجتے ہوئے اُنھوں نے صحت کی خرابی کی وجہ سے عدم شرکت کی معذرت پیش کی تھی ۔

میری جانب سے ولیکن دل کو رکھئے مطمئن
بُت کا جو مداح ہو ہندی کا حامی کیوں نہ ہو

چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

اے برہمن! ہے میرا اور تیرا ایک عالم   ہم خواب دیکھتے ہیں، تو دیکھتا ہے سپنا
ہم اردو کو عربی کیوں نہ کریں   وہ ہندی کو بھاشا کیوں نہ کریں
جھگڑے کے لئے اخباروں میں   مضمون تراشا کیوں نہ کریں
آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں   لیکن اِک اکھاڑہ قائم ہے
جب اس سے فلک کا دل بہلے   ہم لوگ تماشا کیوں نہ کریں
کہتا ہوں میں ہندو و مسلمان سے یہی   اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ   موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو
ہندو مسلم ایک ہیں دونوں   یعنی یہ دونوں ایشیائی ہیں
ہم وطن، ہم زبان و ہم قسمت   کیوں نہ کہہ دوں کہ بھائی بھائی ہیں

میں نے ختمِ کلام کے لئے اکبر کی شاعری کا وہ حصّہ چھوڑ رکھا تھا جو اس کا بہترین نمایندہ ہے یعنی طنز و ظرافت ۔ یہ تیز اور نُکیلی ہے مگر اس سے زخم نہیں لگتا ۔ اس کی زد پر آیا ہوا شکار تلملا اُٹھتا ہے لیکن اس کا مقصد تربیت و ترقی ہے ۔ نفرت و عداوت کا زہر اس میں نام کو نہیں ۔ مزاحِ لطیف اس زہر کا مداوا بن جاتا ہے مثالیں تو بھری پڑی ہوتی ہیں ۔ لڑکیوں کی تعلیم، تمیز کی گراوٹ، مغرب کی غلامانہ نقّالی، شہرت کی ہوس، کم علمی کا عجب و تکبّر، روایات سے بے خبری وغیرہ اُن کے ہدف ہیں ۔ ان اشعار میں اس دَور کی مصوّری ہے جو اب گزر گیا مثلاً برطانوی افسروں کا رُعب داب ۔ چھاؤنیوں کی زندگی ۔ رستورانوں میں یورپی کھانوں کی طرف رغبت ۔ خطابات کا خبط سرکاری نوازشات کا جنون ۔ یہ نمونے نہایت قیمتی ہیں کیونکہ ان سے ہماری تاریخ کے ایک دور پر روشنی پڑتی ہے ۔ ان میں غور و فکر کے لئے بڑا مواد ہے ؎

کیوں سول سرجن کا آنا روکتا ہے ہمنشیں   اس میں ہے اک بات آنر کی، شفا ہو یا نہ ہو
ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا مُنہ نہ دیکھا   کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر
چور کے بھائی گرہ کٹ تو سُنا کرتے تھے   اب یہ سنتے ہیں اڈیٹر کے برادر لیڈر
کرو آنر کو وِدا پِسِ بھائی جی کی چِٹھی آئی ہے   ارے یہ کیا غضب ہے لاٹ صاحب کی دُہائی ہے
برق کے لیمپ سے آنکھوں کو بچائے اللہ   روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے
قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکّام کے ساتھ   رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ
دیکھ جب وہ پائنیر آفس میں ہے ڈٹا   بہر خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجئے
ہنگامۂ محشر کا تو مقصود ہے معلوم   دلّی میں یہ دربار ہے معلوم نہیں کیوں
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی   کیک کو چکھ کے سوئیوں کا مزا بھول گئے
موم کی پتلیوں پہ ایسی طبیعت پگھلی   چمن ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

اُن سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا   اچھے سُتھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا   حضرت ڈیوک کنٹ کو دیکھا
خیموں کا ایک جنگل دیکھا   اس جنگل میں منگل دیکھا
برہما اور وزنگل دیکھا   عزّت خواہوں کا دنگل دیکھا
اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا   بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
مُنہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا   دل دربار سے اٹکا دیکھا
ڈٹ واٹسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا   ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا
ہیٹ ہی کو کر لیا جب قوم کے سر نے قبول   ذیل انگریزی پہ اردو کی شکایت ہے فضول
تھی بہت ان کو مسلمانوں کی تہذیب کی فکر   پرلے مسجد کے تلے ہٹنے کا بھی سامان ہے
آگے انجن کے دین ہے کیا چیز   بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز

الہ آباد نے بڑے بڑے ماہرین سیاست، جج، قانون دان اور اہلِ تدبر پیدا کئے ہیں ۔ زمانۂ قدیم سے یہ علم کا مرکز رہا ہے ۔ لیکن عصر حاضر کے ہندستانی ادب میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ اکبر ہے ۔ ہمیں ان کی یاد سینے سے لگا کر رکھنی چاہیئے اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ گہری توجّہ کے ساتھ کرنا چاہیئے ۔ لیڈر پریس اور شری پارس ناتھ سنہا نے الہ آباد کے اس تابندہ وجود کا حق کسی حد تک ادا کیا ہے ۔ ہمیں امید ہے کہ اردو اور ہندی کے اسکالر اس گراں قدر کتاب کا خیر مقدم کریں گے ۔

نشاطِ مطالعہ

داستوئیفسکی

حیران = بھوچکا، ہکا بکا

(لغات کشوری صفحہ ۱۶۱ تیرھواں ایڈیشن)

اس لفظ کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب تعجب کی انتہا ہمارے حواس پر چند لمحوں کے لئے ایک سکتے کی سی کیفیت طاری کر دے مثلاً اس حقیقت کا علم کہ ہمارا دل شاعروں اور صوفیوں کا اصطلاحی دل نہیں بلکہ گوشت کا وہ لوتھڑا جو بائیں جانب پانچویں پسلی کے نیچے ایک منٹ میں ۷۰ بار دھڑکا کرتا ہے، دن بھر میں پانچ ہزار گیلن خون اچھالتا ہے یعنی اتنا خون جو ریل گاڑی کے ایک ٹینک کو بھر سکتا ہے۔ اور یہ کہ وہ رگیں اور شریانیں جن کو دل کے ذریعے خون بہم پہنچتا ہے بارہ ہزار میل لمبی ہیں۔

ایک تندرست آدمی کے جسم میں پچیس ٹریلین ۲۵،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ خون کے سرخ ذرے ہوتے ہیں۔ ہر ذرے کا قطر $\frac{۱}{۳۲۰۰}$ انچ اور موٹائی $\frac{۱}{۱۲۴۰۰}$ انچ ہوتی ہے۔ اگر ان تمام ذروں کو کنارے سے کنارہ ملا کر سیدھی قطار میں رکھا جائے تو ان کی لمبائی گیارہ لاکھ چھ ہزار میل ہوگی یعنی چاند تک کے سفر کا آدھا راستہ۔ اور سنئے۔

زمین کا گھیرا درمیان میں ۲۴،۹۰۲ میل ہے اور اس کی عمر کا اندازہ دو بلین ۲،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ سال لگایا جاتا ہے۔ سمندروں کے کل پانی کا حجم ۱،۵۰۰،۰۰۰،۰۰۰ مکعب کیلومیٹر ہے۔ (ایک کیلومیٹر = ۳۲۸۰،۸۹ فٹ)

اولین سمندر کی عمر ڈیڑھ بلین سال کے قریب سمجھی جاتی ہے ابتدا میں سمندر کا پانی میٹھا تھا۔ نمک کی کانوں پر سے بہتے ہوئے دریاؤں اور نالوں نے اس میں مل کر پانی کو کھارا کر دیا ہے۔ یہ دریا تقریباً ۴۰۰،۰۰۰،۰۰۰ ٹن نمک ہر سال سمندروں میں ملاتے رہتے ہیں۔ اس وقت تمام سمندروں کے نمک کا مجموعی وزن ۴۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ ٹن سے زیادہ ہے۔

زمین سے سورج کا فاصلہ تقریباً ۹۳،۰۰۰،۰۰۰ میل ہے اور زمین سورج کے گرد ایک ہزار میل فی منٹ کی رفتار سے گھومتی ہے۔

سورج کے طول و عرض کا اندازہ اس امر سے لگ سکے گا کہ اگر زمین کی جسامت کے سو اجسام ایک قطار میں رکھے جائیں تو یہ قطار سورج کے قطر کے برابر ہوگی اور یہ کہ اگر سورج کھوکھلا ہوتا تو ۱۰،۰۰۰،۰۰۰ زمینیں بآسانی اس کے اندر سما سکتیں اور پھر بھی بہت سی جگہ باقی بچ رہتی۔

آسمان پر نظام کہکشاں کے ستاروں کی کل تعداد کا اندازہ چالیس بلین لگایا گیا ہے۔ اگر ان تمام ستاروں کا نام رکھنے کی کوشش کی جائے اور فی نام ایک سیکنڈ صرف کیا جائے تو ناموں کی یہ فہرست ۱،۲۰۰ سال میں مکمل ہوگی۔

یہ ستارے جتنی جگہ میں بکھرے ہوئے ہیں ان کے قطر کی لمبائی ناپنے کے لئے روشنی کو ایک لاکھ سال تک اور گہرائی ناپنے کے لئے دس ہزار سال تک سفر کرنا پڑے گا۔ روشنی ایک سیکنڈ میں ۱۸۶،۰۰۰ میل کی رفتار سے چلتی ہے اور سال بھر میں ۵۹۰۰ بلین میل کی مسافت طے کرتی ہے۔

سائنس کی یہ معلومات انسانی فکر کی رسائی کے یہ معرکے ہم کو حیرت کی ان منزلوں میں پہنچا دیتے ہیں جہاں جبین نیاز کے لیے تاب سجدے کسی کعبے کی تلاش میں بے خود ہو جاتے ہیں۔ حیرت کی ایسی ہی منزلیں ہمارے سجدوں کے لئے بے خودی کے اسباب فراہم کر دیتی ہیں جب ہم اٹھارویں صدی کے روسی ناول نگار فیودور میخائیلووچ داستوئیفسکی (۱۸۲۱-۸۱ء)

کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں -

یہ کہنا ہرگز بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ داستوئیفسکی کو ناول نویسی کی دُنیا میں وہی درجہ حاصل ہے جو ہومر اور شکسپیر کو شاعری کی دنیا میں ناول نویسی کے فن میں اس کی برتری اتنی ہی بلند ہے جتنی کہ دیگر پہاڑوں کے مقابلے میں ایورسٹ کی چوٹی جتنی یہ بلند ہے اتنی دشوار گزار بھی اور یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات داستوئیفسکی کا مطالعہ گراں بارِ خاطر بھی ہوتا ہے اور ہمارے حواس کو کہرے اور دھندلکے کے سایوں میں ملفوف بھی کر لیتا ہے - لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ایک مرتبہ اس ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھ جانے کے بعد ہمارے حواس میں حسن کو پرکھنے کا وہ شعور جمالیاتی اور فنی تعزیز کے وہ اقدار اور قدر دانی کے وہ جوہر پیدا ہو جاتے ہیں جو ہمارے ذوقِ سلیم پر تفریح اور ترفع کے دروازے کھول دیتے ہیں - گویا ہم ایک عظیم الشان بلندی سے دنیائے حُسن کا تماشہ کر رہے ہیں' جہاں دنیائے ادب کی چھوٹی بڑی پہاڑیاں اور پہاڑیوں کے خمیدہ خطوط' جھیل' سمندر' میدان اور چراگاہیں اور ان کے نشیب و فراز' حسین و جمیل جنگل اور مرغزار اور اُن کی انسانی ہوئی پرسکون فضائیں' حدِ نظر تک ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہیں -

داستوئیفسکی کا مطالعہ ہمارے شعور میں وہ بالیدگی پیدا کرتا ہے کہ اس کے سہارے ہم دوسرے ادیبوں اور فن کاروں کے فن کی چھپی ہوئی خوبیوں اور حسنِ تخلیق کی سحر آفرینیوں سے بھی اپنی بے تابی کو مالا مال کر سکتے ہیں - اس کا تخیل ہمیں بال و پر بخشتا ہے اور طاقتِ پرواز بھی کہ ہم آسمانِ ادب کے دیگر ستاروں کی ضو فشانیوں سے اپنی اڑان کے راستے روشن کر سکیں -

ناول نگاری کی حیثیت سے وہ ایک بہت بڑا آرٹسٹ ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر ایک بہت بڑا ماہرِ نفسیات' ایک جید مفکر اور صاحبِ پیغام و الہام بزرگ - اس کے آرٹ کی وہ طاقت جو ناقابلِ توقع حقیقتوں سے ہمارے حواس کو آگہی بخشتی ہے اس کے مرتبے کو اتنا بلند کر دیتی ہے کہ حقیقت نگار مصنفوں کے جدید و قدیم مشاہیر میں سے کوئی بھی اس بلندی تک نہیں پہنچ سکتا - وہ اپنی ایک جداگانہ دنیا تخلیق کرتا ہے - لیکن اس کی یہ دنیا جداگانہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے احساس کی اس دنیا سے جو ہمارے دن اور راتوں سے گھری ہوئی ہمارے مہینوں اور سالوں کی پابند ہے' جو ہمارے تاثرات' احساسات اور تفکرات سے وابستہ ہے اور جس پر ہمارے روزمرہ کے غموں اور خوشیوں کی مُہر ثبت ہے کہیں زیادہ قریب ہے بہ نسبت ان تمام دنیاؤں کے جو دیگر تخلیق کاروں نے اپنی تصانیف میں پیش کی ہیں - اس کی یہ دنیا ہماری دُنیا ہے ہر زید و بکر کی دنیا ہے' اور اُس کے کردار ہمارے کردار ہیں' ہمارے سماج کے کردار بلکہ ہماری نجی زندگی کے کردار' یعنی ہم خود اپنی مختلف کیفیتوں اور حالتوں میں ہماری شبیہیں -

ایک بار اس کی دنیا میں داخل ہو جائیے پھر یہ ناممکن ہے کہ وہاں کی بے رحم اور بے پناہ حقیقتیں آپ کو اپنی زندگی کی آئینہ داری کرتی ہوئی معلوم نہ ہوں اور آپ ان تمام کمزوریوں' فرومائیگیوں' ریاکاریوں' عیبوں اور بھونڈے پن کو جو آپ کے اور ہر شخص کے دل کی گہرائیوں میں چھپا ہوا ہے' ننگا دیکھ کر خوف زدہ نہ ہو جائیں - اس کی یہ ہیبت ناک پردہ دری بھی ایک وجہ ہے جس سے اس کا مطالعہ اکثر لوگوں کے لئے مشکل' غیر دلچسپ اور ناگوار ثابت ہوتا ہے - اپنی دنیا کی ان تکلیف دہ اور خوف ناک حقیقتوں کا انکشاف' جن سے ہمیں روزمرہ دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن جن کی طرف سے ہم مصلحتاً ہمیشہ اغماز برتتے ہیں' اپنی زندگی کی وہ بھونڈی حقیر اور قابلِ نفرین خواہشیں جنھیں ہم خود اپنے سے بھی پوشیدہ رکھتے ہیں اور اپنی طبیعت کے وہ مجرمانہ اور ملوث جھکاؤ جن پر پڑے ہوئے پردے کی زیارت ہی ہماری شرافت کا معیار رہے' داستوئیفسکی کے صفحوں میں سے پلٹ کر اس بے رحمی کے ساتھ ہمارے حواس سے متصادم ہوتے ہیں کہ ہمارا وجود لرز اٹھتا ہے اور ہم اس مریض کی طرح کراہنے لگتے ہیں جس کے سڑے ہوئے زخموں کو جرّاح کا نشتر کھرچ رہا ہو اور جس کو غشی آور دوا بھی نہ دی گئی ہو - اس کی حقیقت نگاری جو ہمارے مشاہدات اور تجربات کی برق بدوش اور آتش درگرہ زہریلی اور تباہ کن دنیا کے حیرت انگیز تجزیئے اور تزکیئے پر عبارت ہے ایک ایسا معرکہ ہے جس کے مقابلے میں دنیا کے دیگر حقیقت نگار جن کا سرمایہ محض جسمانی جزویات اور جنسی تفصیلات کی شرح لکھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے - نہ صرف یہ کہ غیر دلچسپ' بوجھل' بے سود اور بھونڈے ہی معلوم ہوتے ہیں بلکہ

انسانی تجربے اور فطری مشاہدے سے دور، غیر حقیقی اور اجنبی بھی نظر آتے ہیں -

ہر وہ شخص جو مطالعے کا دلدادہ ہے اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ ہر جلیل القدر اور صاحبِ عظمت مصنف اپنی ایک نئی اور مختلف دنیا تخلیق کرتا ہے لیکن ایسی دنیا جو مختلف ہونے کے باوجود بھی حقیقت کے ان تمام ادھورے، غیر پختہ، بکھرے ہوئے اور ناتمام اجزاء سے تر اور تر بتر ہوتی ہے جن کی لہریں ہماری اپنی دنیا سے دن رات ٹکرایا کرتی ہیں اور جن کے بے رحم تھپیڑے ہماری زندگی کی چھوٹی سی نیا کے ناخدا ہو کر سبک سارانِ ساحل کے لئے کبھی باعثِ مسرت ہوتی ہیں اور کبھی بیم موج کی پیغام رسانی کر کے باعث عبرت -

مثال کے طور پر ہومر کو لیجئے اور پھر اس کا مقابلہ داستوئفسکی کی دنیا سے کیجئے - کتنی مختلف ہیں یہ دونوں دنیائیں! شاید ان سے زیادہ مختلف دنیاؤں کا تصور انسانی شعور کے احاطۂ امکان سے باہر ہے - لیکن صداقت ان دونوں کی مسلّم - دونوں ہی حقیقی دنیائیں ہیں - دونوں زندہ اور جاگتی ہوئی - دونوں کے اندر رزمیہ اور بزمیہ بے کرانیاں، دونوں کے اندر کہساروں کی سی عظمت، صحراؤں کی سی وسعت، جنگلوں کی سی بھیڑ اور سمندروں کی سی بے چینی، گہرائی اور گہما گہمی -

ہومر اور داستوئفسکی کے درمیان عیسائیت کا ظہور ہوا جس نے انسانی جذبات اور تاثرات کے طوفانی سیلاب کو اندر کی طرف دھکیلا اور زندگی کے المیہ ڈرامے کے لئے بعد پس منظر دل کی گہرائیوں میں سٹیج سجایا - یہی سٹیج داستوئفسکی کا دائرہ عمل ہے - اسی لئے جہاں ہومر کی دنیا میں خارجی شان کی عظمت اور سطوت ہے وہاں داستوئفسکی کی دنیا میں داخلی گہرائیوں کی متانت اور سنجیدگی -

داستوئفسکی کو پڑھتے ہوئے کچھ ایسی بشارت کا سا احساس ہوتا ہے گویا انسانی زندگی میں ایک بہت بڑی روحانی تبدیلی ظہور پذیر ہو رہی ہے - ٹھیک ویسا ہی احساس جیسا کہ انجیل کی آخری کتاب، کتابِ وحی کے مطالعے سے ہوا کرتا ہے - وہ روحانی تناؤ اور کشیدگی جو "کتاب مقدس" کے "عہد نامہ جدید" کی خصوصیت ہے اس کا نفسیاتی تجزیہ جس حسن اور خوبی سے داستوئفسکی نے اپنے ناولوں میں کیا ہے اس کو پڑھ کر یہی چاہتا ہے کہ اس کی تصانیف کو "عشائے ربانی" کا پانچواں جز، پانچویں گاسپل تسلیم کر لیا جائے -

حقیقت نگاری کی دنیا میں داستوئفسکی جیسے انتہائی عظیم اور جمیل تخلیقی ادب کی مثال اگر تلاش کرنی منظور ہو تو نثر کی دنیا کو یک قلم خیرباد کہہ کر شکسپیر کی طرف رجوع کرنا ہوگا - وہی روزمرہ کی ادنیٰ حقیر معمولی باتیں جو دن رات ہمارے سامنے آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں - ان خداوندانِ ادب کی جنبشِ قلم سے زندگی کے کسی موڑ پر پہنچ کر موت و حیات کے درمیان ایک فیصلہ کن حقیقت کی شکل اختیار کر کے ابدی اور لافانی بن جاتی ہیں یہ دونوں ہی کسی معمولی سے کنائے کو آس پاس کی دنیا سے علیحدہ کر کے اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں اور پھر اس کو پڑھنے والے کے پردۂ حواس پر سُرخ و تُند شعاعوں میں اس خیرگی کے ساتھ منعکس کرتے ہیں کہ ماسوا کی کل کائنات، زمان و مکاں کی تمام حدیں نیستی کے اندھیرے میں غائب ہو جاتی ہیں اور رہ جاتا ہے بس وہ ایک کنایہ اور اس کا بے پناہ سایہ، لیکن ایسا سایہ جس میں زندگی کی پوری صداقتیں، تلخ بھی اور شیریں بھی تڑپتی ہوئی دیکھی جا سکتی ہیں -

داستوئفسکی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نفسیاتی ناول میں تحت الشعور کی پوری دنیا اٹھا کر رکھ دی ہے اور لاشعور کی ان گہرائیوں تک کو روشنی کی انگلیوں سے ٹٹولا ہے جہاں کی تاریکیوں سے طائرِ فکر کی پرواز تک سہمی ہوئی اور خوف زدہ تھی - علم النفس اس کے ناولوں کا موضوع ضرور ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اس کا موضوع روح کے ان اسرار نہانی اور دل کے ان خفیہ رازوں کی جستجو ہے جو علم النفس کی رسائی سے باہر ہیں اور زندگی کی تاریک گہرائیوں کے اندرونی مجادلے اور کشمکش کا بے خوف تماشائی -

داستوئفسکی روس کا وہ سب سے پہلا ناول نویس ہے جس نے اپنے افسانوں کے پس منظر کے لئے دیہات کی رومانی فضاؤں کو چھوڑ کر شہر کی بے چین، بے ہنگم، غمناک، ایک دوسرے سے نالاں معروف پیکار اور خود سے گریزاں، پریشاں اور معروف جدل آبادیوں کو چنا ہے -

داستوئیفسکی کا ہر کردار اعصابی سطح پر سانس لیتا نظر آتا ہے، جہاں سکون و قرار مفقود ہے اور عجلت، تناؤ اور کشمکش زندگی کی شرط اولیں۔ وہ خود شہری تھا اور شہری زندگی کی جلد بازی، سرعت اور تیز گامی کا عادی تھا۔ چنانچہ اسی زندگی کی بے چینیاں، تضاد، مجادلے، بے ربطیاں اور بے اعتدالیاں اس کے مطالعے کا موضوع ہیں اور اس کے کرداروں کا طُغرائے امتیاز۔ ضبط نفس، اعتدال اور میانہ روی کی حدود سے اس کے کردار آزاد ہیں اور ایک شدید قسم کے اعصابی تناؤ میں مبتلا جو انھیں نت نئی بے قراری اور کبھی نہ مٹنے والی بے چینی میں گرفتار رکھتا ہے۔ داستوئیفسکی کی دنیا ایک متحرک، بے چین اور رواں دواں دُنیا ہے جس میں کہیں کسی کو قرار نہیں۔ ایک لمحے کے لئے بھی کسی کو سکون نہیں یہ مصنف کی نجی زندگی کے فلسفے کی تصویر ہے جو معصیت کو اس کائنات کا ایک ابدی جزو تسلیم کرتا ہے اور مافوق الفطری رتبہ بخشتا ہے۔ اس معصیت کا وہ تجزیہ کرتا ہے اور تجزیے کے دوران میں جوں جوں وہ "ماورائے خیر و شر" کے نظریے کا شیدا ہوتا جاتا ہے اس کے فطرت کی گہری روحانیت اور بے کراں دین داری اس کے خلاف احتجاج کرتی ہے اور برسرپیکار آتی ہے۔ اس کی زندگی کی یہ جد و جہد اور بھی شدت اختیار کر جاتی ہے جب اس کے نظریے کی تشکیکیت اس کے افتادِ طبع کی مذہبیت سے ٹکراتی ہے۔ ایسے لمحوں میں اس کی زندگی کراہ اُٹھتی ہے اور روحانی تشنگی کی ہولناکیاں اسے مزید تلاش اور جستجو کے میدانوں میں سرگرداں کر ڈالتی ہے۔ اس تلاش میں وہ عجیب عجیب تجربے کرتا ہے۔ طبعی اور غیر طبعی استدلالی و غیر استدلالی، عقلیت و لاعقلیت کی تمام حدیں اور تفرقے مٹا دیتا ہے۔ اس کی تجربہ گاہ اس کے کردار ہیں اور کرداروں کی زندگیاں خصوصاً روحانی زندگیاں۔ اپنے کرداروں کے لئے وہ دانستہ انتہائی دشوار، نازک اور غیر معمولی حالات پیدا کرتا ہے یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کا ان پر کیا ردِ عمل ہوتا ہے؟ کس طرح وہ ان پر قابو پاتے ہیں اور ان کی قوت برداشت کہاں تک سختیوں اور مصیبتوں کے درد کا بار جھیل سکتی ہے؟ اس کا یہ تجربہ گویا ایک سوال ہے جس کے جواب میں اس کے نزدیک انسان اور انسانی زندگی کا راز مضمر ہے۔

اس کی تصانیف کا مرکزی نقطہ جس کے گرد اس کے تمام کردار گھومتے ہیں، صحیح معنوں میں فلسفہ ہے، آفاقی حُزن کا ایک دقیق، بے رحم اور بے پناہ فلسفہ۔ یہ ایک عالمگیر درد کی فلک شگاف چیخ ہے جو کسی غیر معلوم اور غیر مشہود حقیقت کی تلاش میں آفاق کے خلاؤں سے ٹکراتی ہے، ٹھیک ویسی ہی چیخ جیسی کہ سولی پر چڑھ کر حضرت مسیح نے ماری تھی اور جس کی بازگشت آج بھی کسی جواب کی تلاش میں صدیوں اور قرنوں کو پار کرتی ہوئی ہماری فضاؤں کی خاموشیوں سے سر ٹکراتی بھٹکتی پھر رہی ہے۔

داستوئیفسکی کی اپنی زندگی اس کے ناولوں کی نسبت کچھ کم حیرت انگیز، ہنگامی اور شورش پذیر نہ تھی۔ ماسکو کے ایک خیراتی ہسپتال میں جہاں اس کے والد ڈاکٹر تھے، ۱۸۲۱ء میں اس کی پیدائش ہوئی اور یوں آنکھ کھلتے ہی غربت، افلاس، دکھ اور امراض سے کچھ اس طرح اس کی شناسائی ہوئی کہ پھر عمر بھر ان سے چھٹکارہ نصیب نہ ہوا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں یہ پیٹرز برگ کے فوجی انجینرنگ کالج میں داخل ہوا اور فارغ التحصیل ہو کر کمیشن حاصل کیا۔ لیکن جلد ہی اس نے فوجی ملازمت کے طرحدار اور سہل انگار پیشے پر تصنیف و تالیف کے پیشے کی جفاکشی، افلاس اور ہلکے پن کو ترجیح دی۔ اس زمانے میں اس نے یورپ کے قدیم اور جدید ادب کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ بالزیک، جارج سینڈ، ہاف من اور گوگول کی تصانیف نے اس کی طبیعت پر نمایاں اثر چھوڑا۔ بالزیک کی مشہور ناول پیرے گوریؔ یو کا تو اس نے ترجمہ بھی کیا اور اس ترجمے سے ہی اس کی ادبی زندگی کی ابتدا بھی ہوئی۔ جنوری ۱۸۴۶ء میں اس کا سب سے پہلا طبع زاد ناول "غریب لوگ" شائع ہوا۔ اگرچہ یہ ناول خطوں کی شکل میں ایک پُرانے، متروک اور فرسودہ اسلوب میں لکھا گیا تھا اور گوگول کی کتاب "اوورکوٹ" کے تتبع میں ایک مظلوم اور مطعون کا افسانہ تھا، لیکن اس کے زورِ بیان نے داستوئیفسکی کو فوراً ہی صفِ اول کے مصنفوں میں لا کھڑا کیا۔ اور بے لنکی جیسے بصیرت افروز اور صاحب کمال تنقید نگار کو اس کا حامی اور گرویدہ بنا ڈالا۔ کچھ ہی عرصے بعد اس کا دوسرا ناول "دوہری شخصیت" شائع ہوا جس میں

نوگول کے افسانے "پاگل کی ڈائری" کی نمایاں جھلک موجود ہے وستوئیفسکی کی ان دونوں کتابوں میں وہ تمام اجزاء موجود ہیں جو ترقی پا کر اس کی بعد کی کتابوں میں ظاہر ہوئے اور جنھوں نے اس کی تصانیف کو امتیازی شان بخشی۔ انسانی روح کی اُلجھی ہوئی پہیلیاں، انسان کی دوہری شخصیتیں، اور شخصیتوں کے متضاد اور دست بگریباں عناصر ان ابتدائی کتابوں میں بھی دستوئیفسکی کا اسی طرح موضوع مطالعہ بنی ہوئی ہیں جس طرح کہ بعد کے ان شاہکاروں میں جہاں اس کا بے پناہ تجسس انسانی روح کی چیر پھاڑ میں اور انسانی جذبات کی موشگافیوں میں اس کی چابکدستی کو انتہائے کمال کی منزلوں تک پہنچا دیتی ہے۔

ان دو ناولوں کے بعد دستوئیفسکی کا تصنیف و تالیف کا سلسلہ یک قلم منقطع ہو جاتا ہے اور وہ قلم جو اس نے اپنے دل کے خون میں ڈبویا تھا کہ وہاں کے راز صفحۂ قرطاس پر افشا کرے ایک لمبے عرصے کے لئے اس کے ہاتھ سے چھن گیا۔ یہ زارشاہی کے استبداد کا زمانہ تھا جہاں انسانی آزادی اور انسانی جان کی قیمت ارزانیوں کے بازار میں دن دہاڑے لٹتی پھرتی تھی اور کوئی پرسان حال نہ تھا جہاں جیل کی دیواروں کا سایہ اور پھانسی کی رسیوں کا پھندا ہر حسن اور نیکی کے لئے سفر کی پہلی اور آخری منزل بنا ہوا تھا۔

دستوئیفسکی کی شہرت اور ذہانت نے زارشاہی کی پولیس کو اس کی طرف متوجہ کیا اور کچھ ہی عرصے بعد انقلابی جماعت کا رکن ہونے کے الزام میں اُسے گرفتار کیا گیا اور موت کا حکم سُنایا گیا۔ آگے جو کچھ گزرا خود اس کی زبانی سنئے۔ وہ اپنے بھائی کو ایک خط میں لکھتا ہے۔

آج ۲۲ دسمبر ۱۸۴۹ء کا دن ہے۔ ہم سب کو (جنھیں موت کی سزا ملی تھی) صبح ہی سوم نیوسکی کے میدان میں لے جایا گیا تاکہ گولی سے اُڑا دیا جائے۔ وہاں ہم سب کو پہلے وہ حکم نامہ پڑھ کر سنایا گیا جس میں موت کی سزا دی گئی تھی اور پھر سب کے سامنے بوسہ دینے کے لئے باری باری سے صلیب پیش کی گئی۔ ہمارے سروں پر خنجر توڑنے کی رسم ادا ہوئی اور سب کو سفید کفنیاں پہنا دی گئیں۔ ہم سہ رویہ قطار میں کھڑے کئے گئے۔ پھر تین آدمیوں کو لکڑی کے اس ستون کے پاس بلا کر کھڑا کیا گیا جس سے باندھ کر ہم سب کو تین تین کے گروہ میں قتل کیا جانے والا تھا۔ میرا نمبر ساتواں تھا اس لئے دوسرے گروہ کے ساتھ میری باری آنے والی تھی۔ چنانچہ اب صرف ایک منٹ میری زندگی کا باقی تھا۔ میرے پاس بمشکل اب اتنا وقت بچا تھا کہ میں اپنے دونوں جانب کھڑے دو ساتھیوں پلشچیف اور دیورُوف سے آخری بار بغلگیر ہو کر رخصت مانگ لوں اور بس۔ میں ان ساتھیوں سے رخصت ہو ہی رہا تھا کہ یکایک مراجعت کا بگل بجا اور وہ تینوں بھی جو کہ ستون سے باندھے جا چکے تھے کھول دئے گئے اور واپس قطار میں لا کر کھڑے کر دئے گئے۔ ہم حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے کہ ایک نووارد گھوڑسوار نے بآواز بلند شہنشاہِ عالم پناہ کا تازہ حکم نامہ پڑھ کر سنایا جس کے مطابق ہماری جانیں بخش دی گئی تھیں۔

اس کے بعد جلد ہی یہ سب ملزم سائبیریا کے دور دراز علاقوں میں جلاوطنی کے لئے بھیج دئے گئے۔ دستوئیفسکی کو اومسک مقام کے جیل خانے میں بھیجا گیا جہاں بدترین قسم کے مجرموں کے درمیان اسے چار سال گزارنے پڑے۔ اس کے بعد مزید چار سال اُسے فوجی بارکوں میں رہنا پڑا اور اس طرح زندگی کے آٹھ سال برباد ہوئے۔

جلاوطنی کی یہ لمبی میعاد ختم کرنے کے بعد ۱۸۵۹ء میں یہ واپس آیا اور پھر سے تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہو گیا۔ رہائی کے بعد ادبی رسالوں میں یکے بعد دیگرے اس کی تین کتابیں سلسلے وار شائع ہوئیں۔ پہلے "شہر خموشاں"۔ اس کے بعد اس کا پہلا بڑا ناول "مظلوم اور مطعون" اور پھر ۱۸۶۱ء میں "عالم اسفل کی سرگزشت"۔

"شہر خموشاں" میں دستوئیفسکی کی آپ بیتی ہے اور زنداں کے مجرم ساتھیوں کی درد بھری کہانی۔ یہ کتاب دنیا کا عظیم ترین انسانی صحیفہ اور انسانی اخلاص اور ہمدردی کی بے نظیر دستاویز قرار دی گئی ہے۔ جیل کے بدترین مجرموں میں دستوئیفسکی کی حقیقت بین اور دوررس نظروں نے قابل نفرت انسانی چیتھڑے نہیں پائے بلکہ ان کے اندر ایک ایسا غیر معمولی جاندار اور اوسط درجے سے اونچا انسانی جوہر پایا جس کی بے پناہ پروانہ پر سماج کے راستے مسدود تھے اور

جس کی فطری بالیدگی پر رخنے اور رکاوٹیں عاید تھیں - ان لوگوں کی کجی داستو لفیسکی کی نظروں میں اس امر کی ضامن ہے کہ بالیدگی کا جوہر ان کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھا - سماج کی بندشیں اور رکاوٹیں جب اس جوہر کے سیدھا بڑھنے میں حارج ہوئیں تو یہ ٹیڑھا ہو کر بڑھا لیکن بڑھا ضرور - سماج کی پوری طاقت ان کو بڑھنے سے نہ روک سکی البتہ اپنی مزاحمت سے انھیں ٹیڑھا ضرور کر دیا - داستو لفیسکی کتاب کے آخر میں لکھتا ہے -

"کس قدر مسرت لٹی جوانی ' اور بے پناہ قوت ان دیواروں کے اندر دفن پڑی ہے - وہ جوانی اور قوت جس سے سماج کا دامن مالا مال ہو سکتا تھا - مجھے یہ کہتے ہوئے قطعاً بھی دریغ نہیں کہ یہ بدنصیب انسان جنھیں ہم مجرم کہتے ہیں - ایسی بے نظیر ہستیاں ہیں کہ ان کی خداداد قابلیت ذہانت اور قوت عمل و فکر پر ہماری قوم بجا طور پر فخر و ناز کر سکتی تھی - جسم و دماغ کی یہ بے پناہ قوت کس طرح برباد ہو رہی ہے ! کون ہے اس بربادی کا ذمہ دار ! قوم کے اس روحانی اور جسمانی افلاس کا ذمہ دار کون ہے !! . . . .

یہ کتاب ادبی شاہکار ہونے کے علاوہ (Criminology) پر ایک بے نظیر اور عدیم المثال کتاب ہے - ایسی کتاب جس کو پڑھ کر نطشے نے لکھا ہے -

"داستو لفیسکی ہی علم النفس کا وہ تنہا ماہر ہے جس کے گلشنِ علم کی خوشہ چینیوں سے میں نے اپنا دامن مالا مال کیا ہے . . . "

"دیوتاؤں کی آخری گھڑیاں"

دوسرا ناول "مظلوم و مطعون" فنی نقطۂ نظر سے بہت کامیاب ناول نہیں ہے - اس کا مرکزی کردار ایک کمزور ' دبی اور بے مصرف انسان ہے جس کو حالات کے تھپیڑے جہاں چاہتے ہیں لے جاتے ہیں اس پوری کتاب میں انسانی رنج و الم ' یاس اور محرومی کا رونا رویا گیا ہے - اس میں تجزیے کی جگہ جذباتیت کو زیادہ دخل ہے اور وہ بھی تجاوز کی حد تک - شاید اس دور میں مصنف کے لئے یہ ناگزیر بھی تھا - کیونکہ وہ شخص جو سائبیریا کے جیل خانوں کی انتہائی صعوبتیں اور ذلتیں جھیل کر ابھی ابھی باہر آیا ہو اس کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ کچلی ہوئی شخصیت کے مسئلے پر غور کرتے ہوئے توازن کو قائم رکھ سکتا یا انسانی برداشت کی حدوں کو نلپتے ہوئے آخری نقطے سے تجاوز نہ کر جاتا -

"عالم اسفل کی سرگزشت" زیادہ گٹھا ہوا ناول ہے جس میں مصنف اپنی نوکِ قلم سے کچلی ہوئی انانیت اور ٹھکرائی ہوئی خودی کی انتہائی گہرائیوں کے گھاؤ چھوتا ہے اور نہایت قریبی بازوؤں کو کریدتا ہے - زندگی کا ٹھکرایا ہوا اس کا ہیرو - انتقام میں خود بھی زندگی کو ٹھوکریں مارتا ہے اور زندگی کی تمام قدروں کو بے قدری کی خاک میں پٹک کر اپنے پیروں تلے کچلتا ہے - ایک بے رحم تمسخر کے ساتھ وہ ہمارے نصب العین ' ہماری نیکی ' ہمارے دھرم ' ہمارے فرائض اور ہمارے رسوم کی حقیقتوں کا پردہ فاش کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ یہ سب چند ایک آلودہ ' ملوث اور بوسیدہ رنگ برنگے چیتھڑوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں جن سے ہم اپنی انانیت ' خود غرضی ' خواہش اقتدار اور ریاکاری کے سڑے گلے گھاؤ ڈھانپتے ہیں اور اپنی برہنگی کی ستر پوشی کرتے ہیں - اس ہیرو کو خود اپنی انانیت اور خواہشِ اقتدار سے بھی انکار نہیں - اس کا وہ صاف الفاظ میں اعتراف کرتا ہے - لیکن ان کی پرداخت کے خارجی اسباب نہ پا کر وہ ان کے بہاؤ کی طوفانی بربادیوں کا رُخ داخلی طور پر اپنی زندگی کی طرف موڑ لیتا ہے اور پھر وہاں اس کی تباہ کاریوں سے اپنی دنیا کی بربادیوں سے ایک خوفناک قسم کی مسرت کا احساس کرتا ہے - اس ناول میں داستو لفیسکی نے خودی اور خود ادعائی کے اس مسئلے کو چھیڑا ہے جو اس کے نزدیک ایک اہم ترین اور بنیادی مسئلہ ہے اور جس کا تجزیہ دنیا کے تخلیقی ادب میں اس کی کاوشِ طبع کا مرہونِ احسان ہے - اس کا اگلا ناول "جرم و سزا" اسی مسئلے کے مزید تجزیے پر عبارت ہے جس میں مصنف نے انسانی شعور کی انتہائی متضاد اور بے طرح الجھی ہوئی گتھیوں کا مرقع پیش کیا ہے -

اس ناول کا مرکزی کردار 'راس کولنی کوف' مغرب کے انقلابی اور ترقی پسند خیالات کی پیداوار ہے جس کو روس کے جاگیر شاہی نظام کی مکدر اور زہریلی فضاؤں میں سانس لینے کے لئے مجبور کیا گیا ہے وہ دہریہ ہے - خدا اور خدا کے احکام کی بات کو دھوکا اور تمسخر کی بات سمجھتا ہے - دنیا کے لوگوں کو وہ دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے -

ایک حلقے میں محدود ہے چند وہ لوگ ہیں جن کو "مردِ کامل" کہا جا سکتا ہے۔ جن کو خدا کی ضرورت نہیں اور جو "ماورائے خیر و شر" کے نظریے کی صداقت کو اپنانے کی قوت رکھتے ہیں اور دوسری طرف عام لوگوں کا وہ جمِ غفیر جن کی بزدلی اور کمزوری پرانی قدروں اور فرسودہ عقائد کو زندگی بخشتے ہوئے ہے۔ اس ناول کا یہ ہیرو ایک بدطینت سود خور بڑھیا کو قتل کرتا ہے جو لوگوں کی چیزیں رہن رکھ کر قرض پر روپے دیا کرتی تھی۔ یہ قتل کسی مالی لالچ کے زیر اثر نہیں کیا جاتا بلکہ یہ ثابت کرنے کے لئے کیا جاتا ہے کہ پرانی اخلاقی قدروں کو ٹھکرا سکنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ اس فعل سے وہ اپنی قوت کا اندازہ لگانا چاہتا ہے اور "ماورائے خیر و شر" کے نظریے کو عملی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے یعنی "مردِ کامل" کے لئے آزادئ عمل حاصل کرنا چاہتا ہے اس مردِ کامل کے لئے جو آپ اپنا قانون ہے اور جس کے لئے ہر چیز جائز ہے۔

اس کا یہ فعل اگرچہ اس کی منطق اور اس کے عقیدوں کے عین مطابق ہے لیکن ارتکابِ جرم کے بعد اس کی زندگی کا غیر منطقی پہلو اپنی الگ حقیقت لے کر ردِ عمل کی شکل میں سامنے آتا ہے اور اسے یہاں تک مجبور اور بے چین کر ڈالتا ہے کہ آخر کار وہ خود کو پولس کے حوالے کر دیتا ہے اور رضاکارانہ اپنے جرم کا اقبال کر لیتا ہے۔ اپنے عقیدے اور انتادِ فکر کے خلاف راس کولنی کوف یہ قدم اٹھاتا ہے اور اس کو اپنی کمزوری پر محمول کرتا ہے۔ اس کی منقسم شخصیت میں منطقی اور غیر منطقی صداقتیں، دو متضاد حقیقتیں، بیک وقت بروئے کار آتی ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں ایک دوسرے کی منفی ہیں لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح اور شعور کی ایک ہی اثباتی سطح پر ظہور پذیر ہو کر داخلی جد و جہد اور روحانی بے کلی کی ایک ایسی لافانی تصویر پیش کرتی ہے جس نے واستوئیفسکی کے اس ناول کو آفاقی ادب کا ایک بے نظیر شاہکار بنا دیا ہے۔

راس کولنی کوف کا تضاد واستوئیفسکی نے "احمق" نام کے ناول میں جو کہ سنہ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا، شاہزادہ "میا شکن" ایک غیر منطقی، فوق البشری، ماورائے ادراک کی وجدانی قدروں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی ہے۔ وہ ایک "وجدانی احمق" اور حضرت مسیح کی تقلید میں ایک ایسا ملکوتی دیوانہ ہے جس کے ذہن میں استدلال اور ادراک کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ مجذوب اگرچہ بکارِ خویش ہوشیار نہیں ہے لیکن ایک ایسی غیر ادراکی قوت کا مالک ہے جو اس کی دانائی کو عام عقل و فراست سے بالاتر کر دیتی ہے۔ یہ ملکوتی احمق بھی خود منقسم شخصیت کا حامل ہے اور متضاد جذبات کے خوفناک پیکار کا بے بس تماشائی۔ اس کردار کی شخصیت بھی جو عزم و استدلال سے قطعاً بے بہرہ ہے۔ اندرونی نزاع کی ہولناک معرکہ آرائیوں کا اسی طرح میدانِ جنگ بنی ہوئی ہے جس طرح کہ عزم و استدلال کے مجسمے راس کولنی کوف کی شخصیت کے دونوں کی متضاد شخصیتیں اپنی اپنی متضاد حقیقتوں سے ٹکراتی ہیں اور یہ روحانی کشمکش ان دونوں کی کشتئ حیات کے لئے ایک ایسی چٹان بن جاتی ہے جس سے ٹکرا کر یہ دونوں ہی چکنا چور ہو جاتی ہیں اور شکست و ہزیمت کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہیں۔

"احمق" ناول کی گتھیوں کے مزید تجزیے کے لئے واستوئیفسکی نے سنہ ۱۸۷۱ء میں ایک اور ناول لکھا جس کا نام "مغلوب" ہے۔ اس ناول میں واستوئیفسکی اپنے تجزیوں اور تجربوں کا دائرۂ عمل اور بھی وسیع کر دیتا ہے اور مذہب کے مقابلے میں لادینی اور عیسائیت کے مقابلے میں اخلاقی اور سماجی مزاجیت کو رکھ کر دونوں کو پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ناول کو اگر "جرم و سزا" ناول کی توضیح و توسیع کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے تین مرکزی کردار "ستاوروگن"، "کیریلوف" اور "فرخوفنسکی" گویا وہ تین ممکن سمتیں ہیں جن کی طرف راس کولنی کوف کی شخصیت بڑھ سکتی تھی۔ "ہر چیز جائز ہے" کا نظریہ جو راس کولنی کوف نے مغربی دہریت کے ادھورے مطالعے سے اخذ کیا تھا۔ اس ناول میں اپنے منطقی نتائج تک تکمیل پاتا ہے اور عملی جامہ پہن کر خوف و ہراس کی ہولناک دنیا تعمیر کرتا ہے۔ اس ناول کے کردار انسانیت کے دشمن اور تباہی و بربادی کے شیطانی مجسمے ہیں۔ حصولِ اقتدار ان کا نصب العین ہے اور تباہی و بربادی ذریعۂ حصول۔ اس ناول کا ایک کردار دورانِ گفتگو میں اپنے مسلک کا یوں اظہار کرتا ہے۔

"۔۔۔۔ یہ صحیح ہے کہ ہمیں نئی دنیا تعمیر کرنی ہے۔ لیکن اس کے

لئے سب سے پہلے تخریب کی ضرورت ہے .... مکمل تخریب' بے پناہ اور بے رحم تخریب .... ہم بربادیوں کا اعلان کریں گے .... قتل و غارت کے اسباب ایجاد کریں گے .... نئے نظریے اور نئی روایتیں ایجاد کریں گے آتش زنی کریں گے - جھوٹے افسانوں کی آگ بھڑکائیں گے .... اور بربادی و تباہ کاری کا طوفان بپا کر دیں گے .... روس پر ایسی ہولناک تاریکیاں مسلط کر دیں گے کہ دھرتی اپنے پرانے خداؤں کا نام لے لے کر روئے گی اور سر پیٹے گی .... ہم پہاڑوں کو زمین سے ٹکرا کر ہموار کر دیں گے اور ہر چیز کو خاک کے برابر کر دیں گے - ہم سب کچھ برابر کر دیں گے .... سب کو مساوی اور یکساں بنا دیں گے .... !"

اس ناول کا نقطۂ نظر انتہائی درجے کا رجعت پسندانہ ہے جس میں انقلابی خیالات کی بے طرح تضحیک کی گئی ہے اور نوجوانوں کو مغرب کی ترقی پسندی سے باز رہنے کا سبق سکھایا گیا ہے -

اس کا دوسرا ناول "ایک اہڑ نوجوان" جو کہ اسی سال یعنی سنہ ۱۸۷۱ء میں لکھا گیا زیادہ روادارانہ ہے - اس میں ملک کے انقلاب پسند نوجوانوں کی طرف مصالحت اور ہمدردی کا ہاتھ بڑھایا گیا ہے اور ان کے خیالات پر مشفقانہ بردباری اور بزرگانہ تحمل سے نظر ڈالی گئی ہے - یہ ناول نفسیاتی مطالعے کے نقطۂ نظر سے اگرچہ بہت گہرا اور پُرمغز ہے لیکن افسانے کی حیثیت سے کچھ کمزور اور پھیکا - نہ اس میں وہ شوکت و سطوت ہے اور نہ متانت و سنجیدگی جو کہ اس کے شاہکار کراما زوف بھائی میں پائی جاتی ہے - یہ ناول سنہ ۱۸۷۹-۸۰ء میں لکھا گیا اور دا ستو یفسکی کی تخلیقی قوت کا سب سے بڑا معجزہ سمجھا جاتا ہے -

اس ناول کا ہیرو الیوشا کراما زوف' المانی مفکر شپینگلر کے الفاظ میں دا ستو یفسکی کے روحانی فلسفے کا مکمل ترین مجسمہ ہے - انسانی فضیلت اور نیکی سے متعلق مصنف کے تصور کی وجدانی جھلکیاں اس دلچسپ کردار میں اپنی تکمیل کی اس انتہا تک پہنچی ہوئی ہیں کہ اس سے پیشتر اور اس کے بعد کے کسی بھی کردار کو اس کے کسی بھی ناول میں نصیب نہیں ہوئی دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی روح کے وہ تمام سربستہ راز جو دا ستو یفسکی نے ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب میں اور ایک کردار کے بعد دوسرے کردار کے تجزیۂ نفس سے حیرت انگیز طریقے پر معلوم کئے ہیں ان سب کو الیوشا میں جمع کر دیا گیا ہے - وہ حقیقتیں جو نیکی اور بدی کے تجزیے کے بعد دونوں میں قدر مشترک کے طور پر پائی گئیں اور وہ صداقتیں جن کو خیر و شر کے انتہائی متضاد اور معروف پیکار عناصر کے باہمی ادغام نے ترکیب دی ان سب کی تکمیل الیوشا کے کردار میں ہوئی ہے۔

ازلی نیکی اور ازلی بدی کی روح کی انتہائی گہرائیوں کو ناپنا اور ان گہرائیوں میں جھانک کر دیکھنا دا ستو یفسکی کے اس شہرۂ آفاق ناول کا جرت انگیز موضوع ہیں - اور جب مصنف قارئین کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ روح کی ان گہرائیوں میں لے جاتا ہے تو یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہ جاتی کہ بدی اور نیکی کے یہ دونوں سرچشمے شعور کی تاریکیوں میں ایک دوسرے سے اس قدر قریب بہتے ہیں کہ لبسا اوقات خوفناک طریقے پر یہ ایک دوسرے کو چھو لیتے ہیں اور آپس میں مدغم ہو جاتے ہیں اور تب یہ تفریق ناممکن ہو جاتی ہے کہ ان میں سے کون بدی ہے اور کون نیکی۔

دا ستو یفسکی دنیا کا وہ تنہا مصنف ہے جس کو وہ انسان بھی آسانی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے جو فرط یاس سے خودکشی پر آمادہ ہو اور جس کی نظروں میں دنیا کی تمام ادبی تخلیقیں ایک بے رحم تضحیک اور گھاؤ پر نمک چھڑکنے والا تمسخر معلوم ہوتی ہوں - اس کی تصانیف تخلیقی ادب کا ایک ایسا حیرت انگیز معجزہ ہیں کہ دنیا کا ہر "نقش فریادی" کسی کی "شوخیٔ تحریر" کا شکوہ بھی اور اپنے دل کی کہانی بھی اس کے کرداروں کی زبانی پیش کر سکتا ہے اور اس پر بھی اگر دل کو قرار نہ آئے تو پھر عرفی کا یہ شعر پڑھتے ہوئے خنجر یا زہر کی جگہ اس کی کتابوں کو ہی روح کی خودکشی کا ذریعہ بنا سکتا ہے ؎

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ
گوہرِ ہر سود در جیبِ زیاں انداختہ

ایچ۔ ایس۔ پاٹل

مترجمہ۔ مہدی عباس حسینی

کنڑا ایک ایکٹ کے ڈرامے

کنڑا دیس کے کلچرل اداروں کی کسی تقریب میں شریک ہونے والے کو یہ دیکھ کر دل خوش کن تعجب ہوگا کہ یہاں کے ناظرین کسی ڈرامے کو دیکھنے اور اس سے محظوظ ہونے کے لئے کس درجہ جوش و اشتیاق کے ساتھ توقع لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ریڈیو اخبارات اور فلموں کے عمل دخل کے باوجود جو پبلک کی تعلیم کا آلہ اور تفریح کا ذریعہ ہیں کرناٹک میں یہ اہم خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہاں ڈرامے کی قدیم مقبولیت اور قابلِ فخر حیثیت برقرار ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈرامے نے اپنی فطری خوبیوں کی وجہ سے ہی لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے، اور اس امر پر بھی تعجب نہ کرنا چاہیئے کہ تعلیم و تفریح کے آلے کے طور پر ڈرامے کو نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں باقاعدہ اور صحیح طور پر سماج کی عکاسی ہوتی ہے۔ ڈرامہ اپنے اور ناظرین کے درمیان ایک قریبی تعلق پیدا کر لیتا اور قائم رکھتا ہے۔ وہ اپنی مخصوص تکنیک کے ذریعے واضح اور ذو دار طریقے سے مسائلِ حاضرہ پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کالی داس بلکہ اس سے بھی پہلے زمانے سے لے کر آج تک ڈرامے کو عالمگیر مقبولیت اور قدردانی حاصل رہی ہے۔

کنڑا دیس کے بسنے والے فطری طور پر فن کے پرستار رہیں۔ وہ زندگی کی ادبی یا جذباتی ترجمانی مثلاً دیومالائی قصوں یا تاریخی کہانیوں کی پیش کش میں بدل و جان محو ہو جانے کی کامل صلاحیت رکھتے ہیں۔ چونکہ کنڑا لوگوں کی ذہنی ساخت میں ڈرامے سے ہم آہنگ ہونے کی خاصیت پائی جاتی ہے، اس لئے کرناٹک کے تقریباً ہر دیہی یا شہری علاقے میں ڈرامہ کمپنیوں اور ڈرامہ انجمنوں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے،

ادھر کچھ مدت سے پیشہ ور ڈرامہ کمپنیوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن غیر پیشہ ور کمپنیوں نے اسٹیج کی روایات کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ ترقی بھی دی ہے۔ حال میں ایک ایکٹ کے ڈراموں نے کسی حد تک، طویل ڈراموں کی جگہ لے لی ہے، اس کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ لیکن اس تبدیلی سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ طویل ڈرامے کے فن کی تاثیر جاتی رہی ہے۔ کیونکہ ایک ایکٹ کا ڈرامہ طویل ڈرامے کا خلاصہ نہیں ہوتا۔ بلکہ تکنیک کے لحاظ سے بذاتِ خود فن ڈرامہ کی ایک اہم پیش کش ہوتا ہے۔ ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ایک ایکٹ کے ڈرامے کی ایک خاص تکنیک ہوتی ہے اور ڈرامے کی یہ صنعت ہمارے ملک میں قدیم ترین زمانے سے پیش ہوتی رہی ہے۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھنے اور پیش کرنے کے لئے طباعی، تیز دماغی اور دریا کو کوزے میں بند کرنے والی مہارت درکار ہے۔ طویل ڈرامہ اپنے وسیع کینویس۔ بوقلمونی، کثرت کردار اور طوالت وقت کے باوجود سامعین اور ناظرین کے دماغوں میں محض ایک تاثیر پیدا کرتا ہے۔ لیکن ایک ایکٹ کا ڈرامہ کہانی اور کردار کے اختصار، رفتار کی تیزی اور گفتار کی وضاحت اور صفائی کی وجہ سے لوگوں کے دماغوں میں ایک چوٹ کی طرح جا کر پیوست ہو جاتا ہے۔ طویل ڈرامے سے لطف اٹھانے کے لئے ناظر کو ارادتاً ڈرامہ نویس سے تعاون کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ایک ایکٹ کے ڈرامے سے لطف اُٹھاتے وقت ناظر اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور اپنی ہستی کو مصنف اور ایکٹر کی ہستی میں مدغم کر دیتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ناظرین طویل ڈرامے کو محض دیکھ یا سُن سکتے ہیں۔ لیکن ایک ایکٹ کے ڈرامے میں اسلوب کی یک رنگی اور محدود ذرائع کے مناسب استعمال کی وجہ سے ناظرین کو ڈرامے میں بذاتِ خود حصہ لینے کا احساس

ہوتا ہے۔

کنڑا میں ایک ایکٹ کے ڈراموں کو تنوع اور تاثر کے لحاظ سے بہت ترقی ہوئی ہے۔ امتدادِ زمانہ اور سماجی ترقیوں کے ساتھ ساتھ ان ڈراموں کی ٹکنیک میں کچھ تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں۔ لیکن ان کی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے ان میں اضافے کئے گئے ہیں سنسکرت ڈراموں سے متعلق کتابوں میں ایک ایکٹ کے ڈرامے کی چند اقسام کا ذکر ملتا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اِن ڈراموں کی کیا مخصوص ہئیت اور افادیت ہے۔ لیکن کنڑا کے جدید ایک ایکٹ کے ڈرامے نہ صرف ان سنسکرت ڈراموں سے اسالیب میں مختلف ہیں۔ بلکہ اس جدید ڈرامے نے ابتدا میں مغرب کے ایک ایکٹ کے ڈرامے سے رہنمائی حاصل کرنے کے باوجود مغربی ڈراموں کی بھی روش سے ہٹ کر ترقی کی ہے۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ فنی طور پر یہ ڈرامے سماج اور ادب میں وہی کام سرانجام دیتے ہیں جو کہ مغربی ایک ایکٹ کے ڈرامے۔

کنڑا میں سب سے پہلے ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھنے اور پیش کرنے کا اعزاز جنوبی کنڑا کے سورگباشی شری ایم۔ این کامت کو حاصل ہے۔ ان کے ڈرامے پلاٹ اور کردار، ٹکنیک اور اسلوب میں منفرد، پرجوش اور دل خوش کن ہیں۔ سری کامت نے اس صدی کے پہلے بیس برسوں میں ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے اور تیس سے زیادہ انواع و اقسام کے، پرلطف ڈرامے تصنیف کئے۔ اس لئے اُن کو جدید کنڑا ڈرامے کا امام کہا جا سکتا ہے۔ شری کامت نے تاریخی، دیومالائی اور سماجی ڈرامے لکھے، بچوں، عورتوں اور بالغوں کے لئے ڈرامے تصنیف کئے اور مزاحیہ، طنزیہ اور تعجب خیز ڈرامے پیش کئے۔ انہوں نے نہ صرف ڈراموں بلکہ رہس، نوٹنکیوں اور راس لیلاؤں میں بھی کامیاب تجربے کئے۔ وہ صرف مانولاگ Mono Logue یعنی نٹیہ چٹنا، چھایا نرتیہ اور ریڈیو ناٹک نہیں لکھ پائے ان چیزوں کی ایجاد سے قبل ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ شری کامت نے ایک مخصوص طرز کے ڈرامے لکھے اور پیش کئے۔ جن کی سحر طرازی اور تنوع کا جواب نہیں۔ انھوں نے ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے جن میں شیر، ہاتھی، اور ہرن جیسے جانداروں کو اور درخت بادل، پہاڑ جیسی بے جان چیزوں کو کرداروں کی شکل میں اسٹیج پر پیش کیا گیا ہے۔ شری کامت نہ صرف ایک چابکدست فن کار تھے بلکہ لاجواب فنی ذوق اور پرکھ کے بھی مالک تھے۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے میں ایک ایسی ٹکنیک استعمال کرنا پڑتی ہے جو اس کے لئے مخصوص طور پر موزوں اور مناسب ہوتی ہے۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ منجملہ اور باتوں کے چست مکالمہ اور مختصر پلاٹ ایک ایکٹ کے ڈرامے کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ایک ایکٹ کا ڈرامہ لکھتے وقت ڈرامہ نویس کو کم سے کم کردار اور مختصر ترین پلاٹ کی مدد سے حسب دلخواہ ڈرامائی تاثر پیدا کرنا پڑتا ہے۔ کنڑا ڈرامہ نویسوں میں سب سے زیادہ کامیاب ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھنے والے اور اس کے محدود ذرائع کو ماہرانہ انداز سے استعمال کرنے والے سورگباشی ٹی پی کیلاسم تھے۔ انھوں نے اپنے قابلِ تعریف ایک ایکٹ کے ڈراموں کے ڈھانچے ایک واحد خیال یا موضوع کے گرد کھڑے کئے ہیں اور اس صنعت کو اپنے مشن کے پرچار کے لئے استعمال کیا ہے۔ دراصل ایک ایکٹ کا ڈرامہ کسی واحد مخصوص فضا یا گمبھیر مسئلے کے گرد ہی مرتب کیا جا سکتا ہے۔ شری کیلاسم نے اپنی ماہرانہ فن کاری اور وسیع تجربے کی مدد سے اپنے ڈراموں کو فن کا حسین نمونہ بنا دیا۔ ان کے زندگی کے پیچیدہ مسائل اور خانگی زندگی کے متعلق ڈراموں، طنزیہ اور مذاقیہ ڈراموں میں مزاح کی بہتات ہے اور یہ ڈرامے اپنی صنعت کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

اُسی زمانے میں جبکہ شری کیلاسم اپنے ڈرامے لکھ رہے تھے بعض دوسرے مشہور کنڑا مصنفوں نے بھی اپنے چند بہترین ڈرامے لکھے شری گووند پائی، شری ماستی، شری بندرے، شری کے، وی، پٹاپا جیسے پختہ کاروں نے اپنی ادبی زندگی کے اوایل میں ایک ایکٹ کے ڈراموں کے قابلِ قدر نمونے پیش کئے ہیں۔ شری بندرے نے اپنے ڈراموں میں سماجی مسائل سے بحث کی ہے جبکہ دیگر تینوں مصنفوں نے دیومالاؤں سے متعلق ڈرامے لکھے ہیں۔ شری بندرے نے مزاحیہ اسلوب اختیار کیا ہے جبکہ دیگر تینوں اصحاب نے بلینک ورکس (نظم معرا) استعمال کی ہے شری پائی کا "ہبرالو" Hebberalo یا "ہلک انگلی" شری ماستی کا شانتا اور ساوتری، شری پٹاپا کا "ینا سولو" یا "یم کی ہار" اور "تھارا تری" اور

شری بندرے کا "تیروکا پاپی ڈوگو" اور دیووانا مانے" یا "بھوتوں کا

گھر" ہمارے ادب میں چند بہترین اور مقبول ترین ڈرامے ہیں۔

لیکن جس طرح اِن پرانے استادوں نے اپنے آخری زمانے میں نظم کی دیوی کی طرف مائل ہو کر ڈرامے کی صنف میں خلا پیدا کر دی اسی طرح ان کے بعد کے تین کامیاب ڈرامہ نویسوں نے بھی ناول لکھنا شروع کر دیئے۔ اور اِس طرح معیاری ڈراموں کی زبردست کمی محسوس کی جانے لگی۔ ۱۹۴۰ء کے بعد سے سب سے زیادہ پُر تاثیر اور یادگار ڈرامے شری رنگا، شری اے۔ این کرشنا راؤ اور شری کے ایس کرانٹ نے لکھے ہیں۔ شری رنگا نے اپنے نئی طرز کے سماجی ڈراموں میں بعض دیو مالائی کرداروں کی ایک نئی توضیح پیش کی ہے اور اِس صنف کو پبلک کی تعلیم کے لئے ایک زبردست آلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ شری کرانٹ نے اپنے ہم وطن شری کاست کی طرح جرأت کے ساتھ نئے اور زبردست تجربے کر کے اس صنف میں رہنمائی کا حق ادا کیا ہے۔ ان کے "نئے ڈرامے" اور سنگیت ناٹک جس درجہ دلکش ہیں اتنے ہی پُر اثر بھی ہیں۔ شری اے۔ این کرشنا راؤ نے بعض دیو مالائی اور سماجی موضوعات کو باریک بینی اور خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

شری رنگا نے چالیس سے زیادہ ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے ہیں۔ اگرچہ ادھر کچھ مدت سے وہ ناول لکھنے لگے ہیں۔ لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ ڈرامے کے بارے میں ان کی محبت اور جوش و شوق میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ ان کا ہر ڈرامہ کئی کئی بار اسٹیج ہو چکا ہے اور یہ اِس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ آرٹسٹ کے طور پر مقبول ہیں اور ان کی تخلیقیں اعلیٰ پائے کی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان کی کامیابی کی وجہ صرف یہی نہیں کہ وہ بہت لکھتے ہیں بلکہ اس کامیابی کا باعث زیادہ تر وہ زاویہ نگاہ ہے جس سے وہ زندگی کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں، صرف تکنیک اور اسلوب میں مہارت حاصل کر لینے سے ہی کوئی مصنف بڑا یا مقبول نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے تو سماجی قدروں اور فلسفۂ حیات کے بارے میں مصنف کی اور خاص طور پر ڈرامہ نویس کی ایک واضح اور قطعی رائے ہونا ضروری ہے۔ شری رنگا کی نگاہ روشن اور مقاصد اعلیٰ ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ کرناٹک کے جدید مصنفوں میں سب سے زیادہ معروف اور ممدوح ہیں۔ ان کے مشہور ایک ایکٹ کے ڈراموں "تینا سولو" (بیم کی ہار) "براتُرا آکار" (اہلیہ و دھاما" اور "سمپّد دھرما" میں چند قدیم دیو مالائی کرداروں کو موجودہ سماج کے ماحول میں پیش کیا گیا ہے۔ "اشومیدھ" "پراپنچا پرواہا" "شدّھی سپتاہا" اور "دمپت یداڈھیجے" (خانگی جھگڑا) میں گھریلو زندگی کے بعض مسائل پر باریک بینی کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اُن کے کچھ اور مقبول ڈراموں" دیپ اُتسو" "ہنتو دوارسے" (اسکول کا وقت)" ہوا بیدا ہریش چندرا" (ہریش چندر کی مایوسی) اور" ایکی کرانا پرسنگا" (ایکتا کرانے والا ایک ہو) میں سماج کے اہم ترین اور پیچیدہ ترین مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔

" بھاگیا دا براگلا" (قسمت کا کال) اور بیدیا بھوتا" (راہ کا بھوت) میں شری رنگا نے قحط کی جو تصویریں پیش کی ہیں ہنظلوموں اور تباہ حالوں کے ساتھ جو بے پناہ ہمدردی ظاہر کی ہے، اور جس طرح ہر ہر قدم پر اُن کی وکالت کی ہے اس کی وجہ سے سماج کے دل میں شری رنگا کی بڑی قدر اور محبت پیدا ہو گئی ہے۔ شری اے این کرشنا راؤ ایک ماہر فن کار ہیں۔ موجودہ سماجی مسائل کے بارے میں ان کی نظر بہت گہری ہے، اُن کے ڈرامے" سورن مورتی" "گُبّا چیا بُو دو" (چڑیا کا گھونسلا)" ادا دیٹو" (کیا بات؟) بنّا دار بیانیگے" (تتلیاں) میں ہمیں انواع و اقسام کی تصویریں اور مسائل ملتے ہیں۔ شری اے این کرشنا راؤ کو عجیب و غریب کرداروں کے پیش کرنے کا ملکہ حاصل ہے اور وہ اپنے چست مکالمے اور جدید ترین تکنیک کی وجہ سے اپنے موضوع میں بڑی دلچسپی پیدا کر لیتے ہیں۔ اگرچہ اُن کے ایک ایکٹ کے ڈراموں کی تعداد زیادہ نہیں پھر بھی اُنھوں نے بعض قابل قدر ڈرامے لکھے ہیں۔

جدید ڈرامہ نویسوں میں شری کرانٹ نے سب سے زیادہ قابلیت اور مہارت سے ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے اور پیش کئے۔ اُن کے قابلِ تقلید ڈراموں میں جو تعداد میں بہت زیادہ نایاب حسن اور تنوع پایا جاتا ہے۔ ابتدائی دور میں شری کرانٹ نے "گیّا بڑا انا" (زبردست گپ باز) اور" ہنیا بر یہا" (قسمت) وغیرہ میں سیدھی سادی نثر میں معمولی سماجی مسائل کو پیش کرنے کے تجربے کئے۔ لیکن بعد میں انھوں نے "کیسا گوتمی"" پرتو یا ترا" اور" بدھو دیا" جیسے منظوم ڈرامے لکھے۔ اُن کے نئے ڈرامے "گیدا وارا ستیہ" (جس کی لاٹھی

اس کی کھینیں) "اسپیتو گولاما" (حکم کا غلام) وغیرہ ایسے شاہکار ہیں جنھوں نے نہ صرف اسٹیج پر زبردست اثر ڈالا ہے بلکہ شری کرانٹ کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

ان تین باہمت فن کاروں کے علاوہ بھی متعدد ہم عصروں نے ایک ایکٹ کے ڈراموں میں طبع آزمائی کی ہے اور یادگار چیزیں لکھی ہیں۔ شری راجا رتنم کا "گنڈو گوڈالی" (بہادر کلہاڑی) شری آنندا کا ڈو "بہانا چترا" شری گوپال کرشن راؤ کا "کنیا رتی" شری گوکک کا "وِمار شکا و بدیا" شری مُگالی کا "اتیتینی دیوا" شری کستوری کا "مڈ ڈونے" (وحشی ہاتھی)۔ شری کرشن کمار کا "ہلاگنڈ" (بدبخت بیٹا) مشہور اور مقبول ڈرامے ہیں۔ اگرچہ ان سبھی مصنفوں نے مخصوص طور پر ڈرامے میں نہیں بلکہ ادب کی دوسری اصناف میں شہرت حاصل کی ہے۔ پھر بھی انھوں نے کنڈا کے ایک ایکٹ کے ڈراموں کے ذخیرے میں قابل قدر اضافے کئے اور ان ڈراموں میں اپنے خطّے کے سماجی حالات کی عکاسی کی ہے۔

موجودہ دور کے ڈرامہ نویس انھیں مشہور ادیبوں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ شری بی، کے راما چندرا راؤ، شری این کے کلکارنی، شری ڈی آر ستیا راؤ، شری بندرے لکشمن راؤ۔ شری نرسیدر بابو، شری ننگے گووندا راؤ۔ شری راما نندا، شری کشرا ساگر، شری کئی وار راجا راؤ، شری کے کے شیٹی۔ شری سی واسو دیو اشا۔ شری آر۔ جی۔ جوشی، شری کے واسو دیوشنائی۔ شری پا رو تا وانی، شری پورانک اور بہت سے دوسرے لوگوں نے کنڑا دیں کے ایک ایکٹ کے ڈرامے کے خزینے میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ ان لوگوں کی تصنیفوں نے کنڈا ڈرامے کو ایسا لطف اور ایسی تازگی بخشی ہے جو اب سے پہلے نایاب تھی۔ آج ریڈیو تعلیمی اور کلچرل اداروں اور مختلف سماجی کلبوں کے کثیر تعداد میں پائے جانے کی وجہ سے ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے اور پیش کئے جانے کو جیسا غیر معمولی بڑھاوا مل رہا ہے اس کی مثال پہلے نہیں ملتی۔ کرناٹک میں ایک ایکٹ کے ڈرامے انتہائی عروج و کمال کو پہنچ چکے ہیں۔ اور ان کی تکنیک میں فیڈ آوٹ، فلیش بیک اور اسی قسم کی دوسری جدید ترین ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں۔

آج کل ریڈیو کی وجہ سے ڈرامے کی دو اور اقسام کو ترقی حاصل ہو رہی ہے۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے کی تکنیک میں مناسب تبدیلیاں کرکے ریڈیو ناٹک کی مخصوص صنف بنالی گئی ہے، اور اسی طرح منظوم ڈرامے میں تبدیلیاں کرکے ریڈیو روپک بنالئے گئے ہیں۔ شری بیلاری بجی۔ شری آر، وی، سریندراس، شری ایچ، کے رنگاناتھ، شری پی، ایس وینکٹارام اور دوسرے لوگ ریڈیو ناٹک لکھتے رہے ہیں، اور شری بیت گیری کرشنا شرما اور شری وسنت کوالی وغیرہ ریڈیو روپک میں تجربے کر رہے ہیں، اور پُرانے لکھنے والوں میں شری پی، ٹی نرسمہاچار اور شری کرشنا مورتی پورانک ایسے منظوم ڈرامے لکھ رہے ہیں جو خالصتاً ادبی چیز ہیں۔

ڈرامے کی ایک اور قسم جو آج کل رائج ہوگئی ہے مانولاگ یا "نٹیہ چِھتا" کہلاتی ہے۔ یہ ایک ایسی تقریر ہوتی ہے جس میں کوئی شخص اپنے آپ سے ہمکلام ہوتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی کردار یا واردات کا ڈرامائی یا حسب دلخواہ تاثر پیدا کیا جائے، سورگباشی شری کوجالگی ہنومنتا راؤ اس صنف کے بڑے ماہر تھے۔ اور موجودہ مصنفوں میں شری گداگکر اور کچھ اور لوگ ایسی چیزیں لکھتے رہتے ہیں۔

کنڈا ایک ایکٹ کے ڈراموں کی ابتدا اور ارتقاء کا مختصر جائزہ ختم ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کنڈا ڈرامے کا کارنامہ قطعی طور پر حوصلہ افزا اور قابل قدر ہے۔ کنڈا ایک ایکٹ کے ڈرامے طویل ڈرامے کے ضمیمے کے طور پر شروع ہوئے۔ آج ان ڈراموں کا رجحان مختصر ترین "نٹیہ چِھتا" کی طرف نہیں بلکہ چھوٹے ڈراموں کی طرف ہے۔ یہ ایک ایسی تبدیلی ہے جس سے آنے والے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ شری کوکک، شری بندرے لکشمن راؤ۔ شری پا روتا وانی، شری کرشنا کمار، شری کشیر اساگرا اور شری کے، اے، این راؤ نے اس قسم کے ڈرامے پیش کئے ہیں۔ سامعین کی بڑی تعداد کی تعلیم و تفریح کے لئے چھوٹے ڈرامے مخصوص طور پر مناسب ثابت ہو چکے ہیں اور چونکہ آج کل یہ روز بروز زیادہ ضروری ہوتا جا رہا ہے کہ ڈرامے کو سماجی تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے۔ لہٰذا امید کی جاتی ہے کہ ہمارے تھیئٹروں میں چھوٹے ڈرامے کا قدم جم جائے گا۔ چونکہ ڈرامے کی یہ صنف پبلک کی مانگوں کی بنا پر ہی وجود میں آئی ہے۔ لہٰذا چھوٹے ڈرامے کی ترقی اور ہر دل عزیزی یقینی ہے۔

حامد انصاری غازی

قدیم ہند میں پیداوار کی قدریں

زندگی کس چیز کا نام ہے؟ محنت کا، حرکت کا، گرمی کا، تپش کا، اور چمک کا۔ زندگی کے جہنم کو ہر حال میں جنت بنایا جا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ انسانی جد و جہد کا چراغ روشن رہے اور محنت کے دست و بازو شل نہ ہونے پائیں۔

ہندوستان ایسے قدیم اور متمدن ملک میں انسانی محنت کا سب سے بڑا میدان اس کے جیتے جاگتے کھیت ہیں۔ اور سب سے بڑا مظہر کسان؛ ہندوستان کا کسان زندگی کا بہروپ نہیں بلکہ حقیقی روپ ہے۔ پھر یہ روپ آج سے نہیں بلکہ ہزاروں سال سے ہے۔ ہندوستان اور کسان کے تعلق کا کھوج لگانا انسان کے بس کی بات نہیں۔ تاریخ بھی اس رشتے کے سرچشموں تک اپنا ہاتھ نہیں پہنچا سکتی۔ کیونکہ یہ تعلق تاریخ سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے ایک شاعر نے شہر مکّہ کے متعلق کہا تھا کہ —— "مکّہ زمین پر اس وقت سے ہے کہ زہرہ ستارہ اجاگر بھی نہ ہوا تھا۔ کچھ اسی قسم کی بات ہندوستان اور کسان کے بندھن کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ سنہرا سورج، روپہلا چاند اور نورانی ستارے ہی اس تعلق پر گواہی دے سکتے ہیں۔ جو کام تاریخ نہیں کر سکتی اُسے پراچین ہند کا کلاسیکی ادب کر سکتا ہے یا جغرافیے کی زبان انجام دے سکتی ہے۔ اس دیس کے میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت، کھیتوں کو سیراب کرنے والے دریا۔ شمال میں جہلم، جمنا، گنگا اور برہم پتر۔ درمیان میں نربدا اور تاپتی، دکن میں گوداوری، مہاندی اور کرشنا۔ دریاؤں کے علاوہ چھوٹے بڑے پہاڑ، ہمالہ اور وندھیاچل کے سلسلے۔ ان پہاڑوں کی زرخیز وادیاں۔ میدانوں کے حاصل خیز مویشی، جو ہل جوتتے ہیں اور زمین کی گہرائی سے پانی کے چشمے نکال کر باہر لاتے ہیں اور انھیں کھیتوں کی گود میں بہا دیتے ہیں۔ یہی مویشی کسان کی محنت میں برابر کے ساجھی ہیں۔ اور دودھ گھی کی گنگا جمنا بہاتے ہیں۔

ہمارا ملک ہندوستان پرانی تاریخی قوموں اور ملکوں کے درمیان آباد ہے۔ اس کے تین طرف سمندر ہے۔ یہی سمندر اس کی آزادی کی سرحدوں کو دنیا سے منواتے ہیں۔ شمال کی طرف ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک دیوار چین سے زیادہ پرانی پہاڑوں کی دیوار ہے۔ اس کے اونچے اونچے پہاڑ، برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں، چلتے پھرتے اور آگے بڑھتے ہوئے دریا۔ کسانوں کی محنت کو پکارنے والے لق و دق بنجر ریگستان۔ بڑے بڑے اور دور دور پھیلے ہوئے سونے چاندی سے زیادہ قیمتی مٹی کے میدان۔ سمندر سے اٹھ کر پہاڑوں سے ٹکرا کر برسنے والے بادل اور دیوتاؤں کا حکم ماننے والی موسمی ہوائیں۔ گرما، سرما اور برکھا کے موسموں کی نیرنگی اور آب و ہوا کی رنگا رنگی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس ملک کا ہر کھیت ایک مستقل راجدھانی ہے اور ہر کسان اپنے کھیت میں راجہ کا درجہ رکھتا ہے۔ ہندوستان کی اصل سرحدیں اس کے کسان بناتے ہیں یا اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے کھیت۔

ڈاکٹر کے آر راماسوامی ایم اے ڈی لٹ اپنی تاریخ ہند میں بڑے فخر سے لکھتے ہیں کہ ہمالہ پہاڑ کے دریا اور معاون دریا شمال کے میدانوں میں چکنی مٹی اور پانی بہم پہنچاتے ہیں۔ دیس کے باشندے ان دریاؤں کو دیوتاؤں کے برابر مقدس مانتے ہیں۔ جنوب کے دریا بھی ہرے بھرے کھیتوں کو سونے کی کان بناتے ہیں۔ اس ملک کی انہیں طبعی خصوصیات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدیم سے قدیم زمانے میں جو لوگ زرخیز میدانوں، آبپاشی کرنے والے دریاؤں اور

سال میں دو بار پیداوار اُگلنے والے کھیتوں پر قابض ہو گئے، وہی اس ملک کے حکمران بن سکے۔ قدیم پتھر کے زمانے کے دیسی لوگوں کے متعلق اب تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ آگ پتھر کے علاوہ کسی اور چیز کا استعمال بھی جانتے تھے۔ آج تک یہی کہا جاتا ہے کہ یہ وحشی اور جنگلی سنتھالی کھیتی باڑی اور گلہ بانی سے بالکل ناواقف تھے۔ جدید پتھر کے زمانے میں تاریخی آثار سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ اس دور کے اصلی دیسی باشندے کھیتوں کے مالک تھے۔ کھیتی باڑی کے لئے مویشی پالتے تھے، اور کھیتوں کے کنارے جھونپڑیاں بنا کر کھلی ہوا میں رہتے تھے۔ مٹی کے برتن بنا لیتے تھے اور ان میں اناج کا ذخیرہ رکھتے تھے۔ غذا پکا کر کھاتے تھے۔ ان کے پاس ایسی پیداوار کا بھی انتظام تھا جس سے وہ کپڑا بن سکتے تھے۔ ان کے علاوہ سیاہ فام دراوڑ قوم آج سے ہزارہا سال پہلے ہرے بھرے درختوں کو دیوتا مانتے تھے۔ ان کی پوجا کرتے تھے اور ان پر قسم قسم کی بھینٹ چڑھاتے تھے۔ آج سے پانچ ہزار سال قبل سندھ اور پنجاب میں موہن جو دارو اور ہڑپہ کے متمدن ہندستانی گیہوں اور کھجور کی کاشت کرتے تھے۔ ان کے پاس باربرداری کے لئے چھکڑا گاڑیاں موجود تھیں جو غذائی پیداوار کو ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پہونچانے کا کام کرتی تھیں تاہم جن لوگوں نے سب سے پہلے ہندوستان کی غذائی پیداوار کو بڑھانے میں اپنی فنی صلاحیتوں سے کام لیا وہ آرین تھے۔ ان کا رنگ، روپ کھلتا ہوا سنہری گندمی تھا۔ ان کی پیداوار کا اصلی خزانہ مویشی تھے۔ جو انھیں سفر میں مدد دیتے تھے۔ ان کے لئے دودھ کی نہریں بہاتے تھے، اور روزمرہ کے اخراجات مہیا کرتے تھے۔ یہ لوگ وسطی ایشیا سے بڑھ کر آریانا اور گندھارا کے دروں سے گزر کر ہند پہنچے تو انھیں سندھو کا کنارا ٹھہرنے کے لئے نصیب ہوا۔ جسے انھوں نے سندھو کے نام سے پکارا۔ ایرانی سندھو کی جگہ ہندو کہنے لگے۔ اسکندر نے انڈس نام رکھا، یہی انڈس آگے چل کر انڈیا ہو گیا، اور عرب مورخوں کے قلم پر ہند ہو گیا۔ آرین لوگ باکمال کاشتکار، ماہر معمار، قابل گلہ بان اور اچھے بنکار تھے۔ ان کے پاس اونی اور سوتی دونوں قسم کی پیداوار کا سلسلہ موجود تھا۔ آرین عہد کے آثار قدیمہ اور مقدس ویدوں کے بھجن یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ مادرِ گیتی کی گود میں ہندوستان کے کھیت پہلی بار جاگے۔ اس جاگرتی کے لئے دیوتاؤں کو اپنے چہیتے آرینوں کے لئے بڑا کام کرنا پڑا۔ آکاش کے عناصر آسمان سے زمین پر اُتر آئے۔ اس دھرتی کے مادی عناصر میں ادائے فرض کا طوفان اُمنڈ پڑا۔ کھیت اُگانے، پیداوار بڑھانے کے کام میں آکاش اور دھرتی دونوں جُٹ گئے۔ یہ ہمارے دیش کی افسانوی تاریخ کا پہلا مرحلہ تھا جب انسان اور حیوان میں محنت اور محبت کا بندھن قائم ہوا۔ کائنات کے مادی عناصر نے دیوتاؤں کا روپ اختیار کر کے زمین و آسمان دونوں جگہ کھیتی باڑی کے کام کو پھیلایا۔ ہمیں اس مرحلے پر رگ وید کا وہ نغمہ یاد آ جاتا ہے جس میں انسان جھوم جھوم کر کہتا ہے۔

"اے دیوتاؤ! ہم اپنی ماں کی گود میں بھائی بھائی ہیں،
دیاؤس دیوتا (آسمان) ہمارا باپ ہے اور پرتھوی
(زمین) ہماری ماں ہے اور اگنی (زندگی کی حرارت)
ہماری مورثِ اعلیٰ ہے۔"

پراچین ہند کے لوگوں کو ویدوں سے جو معاشی تخیل ملا تھا وہ صرف زمین اور آسمان ہی تک محدود نہ تھا بلکہ اس کی سرحدیں ایک تیسری اسٹیٹ تک پہنچی تھیں اور یہ زمین و آسمان کے درمیان خلا کی سلطنت تھی جس کا نام انھوں نے انترکش (یعنی کرۂ زمہریر) رکھا تھا۔ یہ الگ جہان تھا جو دو جہانوں کے درمیان آباد تھا۔ یہاں موسمی ہواؤں کی فوجیں جنگ میں مصروف رہتی تھیں، بادلوں کے دل جمع ہوتے تھے اور اِدھر سے اُدھر حرکت میں رہتے تھے۔ یہاں پانی کا خزانہ جمع ہوتا تھا، پھر زمین پر بہتا تھا۔ یہ سلطنت ایک خاص بادشاہ "وارُن" کے ماتحت تھی۔ ویدک عہد کی پانچوں ندیاں شاہ وارُن کی بہنیں تھیں جو اس کے حکم سے بہتی تھیں۔ ایک اشلوک میں فضا کے شہنشاہ وارُن کو سمندر سے تشبیہہ دی گئی ہے جس میں سب ندیاں گرتی ہیں، مگر اُسے بھر نہیں سکتیں۔ جب آسمان پر بادل چھائے ہوں تو اس کے لئے یہ تشبیہہ کتنی دلکش اور عجیب و غریب ہے۔

"وارُن کے حکم سے بادل اور برکھا آتی ہے۔ اُس کے بھیجے ہوئے بادلوں میں پانی اس طرح بھرا ہے جیسے گائے کے تھنوں میں دودھ۔"

فضا اور خلا کے بادشاہ وارن کی تعریف میں ایک رشی کا یہ

بھی گنگنا پھیلا وہ اصلیت سے قریب معلوم ہوتا ہے۔

- ایک گیت گاؤ ایک بھجن اس کی تعریف میں گنگناؤ جس نے دھرتی کو اس طرح پھیلایا جس طرح قصاب چمڑے کو دھوپ میں پھیلاتا ہے۔ وارن جنگلوں میں ٹھنڈی ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ سورج کے گھوڑے کو تیز چلنے کا حکم دیتا ہے اور بادلوں کے خزانوں کو گایوں کے دودھ سے بھر دیتا ہے۔ پانی آگ (بادلوں میں بجلی) کو گرم کرتا ہے۔ اسی نے سوریہ کو آسمان میں جگہ دی۔ سوما (نشیلی اور رسیلی بوٹی) کو پہاڑوں پر اگایا۔ اسی نے بادلوں کے برتن کو الٹ دیا اور اس کا پانی آسمان زمین اور فضا میں بہنے لگا جس سے دھرتی تر ہو گئی اور فصلیں اگ آئیں۔ وہ جیسے ہی گایوں کے دودھ کی طرح برسنے والی بارش کا ارادہ کرتا ہے تو پہاڑ گرجنے لگتے ہیں اور کڑکنے والے بادلوں کے پیچھے چھپ جاتے ہیں۔ (رگ وید پنجم ۸۵)

خدا کا بادشاہ وارن بہت ہی اچھا حکمران ہے۔ خوب حکومت کرنا جانتا ہے۔ جب سورج بادلوں میں راستہ بھول جاتا ہے تو وہ بھولے بھٹکے سورج کو راستہ بتاتا ہے۔ پانی کو سمندر کی طرف بہائے جاتا ہے۔ آسمانی اور ہوائی راستے اسی کے حکم سے مقرر ہوتے ہیں۔ اس کی سانس آندھی ہے جو کرۂ ارض میں دوڑتی رہتی ہے۔ اسی کے ہاتھوں میں مقدس اور بڑے آفتابی گھوڑے کی باگ ہے جس کی ہزاروں برکتیں ہیں۔ ستارے رات کو چھپ جاتے ہیں مگر وارن کی سلطنت کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی وہ پرندوں کی اڑان جانتا ہے۔ سمندروں میں کشتیوں کی آمد و رفت کا خیال رکھتا ہے اور ہوائی بہاؤ سے واقف ہے۔ وہ اپنے محل میں رہتا ہے اور قدرت کے قانون کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ سنہری زرہ پہنے ہوئے ہے۔ اور اس کی چمک دمک خود اس کا لباس ہے۔ اس کے جاسوس (رات کو ستارے اور دن کو سورج کی کرنیں) آس پاس جمع رہتے ہیں۔ وارن ایک اٹل قانون کا نگہبان ہے۔ جس کو وہی وجود میں لایا ہے اور وہی اسے قائم رکھتا ہے یہ قانون رِت ہے جس کا مطلب نظامِ عالم ہے۔ جو سورج، چاند، ستاروں کی حرکتوں، رات اور دن کی تبدیلیوں اور موسموں کے سلسلوں کو درست رکھتا ہے بادلوں سے وقت پر پانی برساتا ہے۔ وارن کا قانونِ فطرت ایک بالادست قانون ہے جس کی پابندی دیوتاؤں (چاند سورج اور ہوا) پر فرض ہے۔ یہ قانون ہر شے سے بالاتر ہے اور برکت دینے والا ہے۔ وہ سچائی خود راستی ہے اور اس کی مادی اور اخلاقی حکومت دونوں جہانوں پر قائم ہے۔ وارن روشنی اور تاریکی دن اور رات کا خالق ہے اس کے پاس موت اور بیماری کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں موجود ہیں جو گنہگاروں اور مجرموں کے لئے مخصوص ہیں۔ قدیم عہد کا انسان جب ان زنجیروں میں جکڑا جاتا تھا تو وہ وارن ہی سے اپنے لئے معافی چاہتا تھا اور وہی فاقہ کشی سے نجات دلاتا تھا۔ پراچین کال کے آرین دیوتاؤں (اندر، سوریہ۔ اگنی اور اُشاس (سپیدۂ صبح) ہر ایک کا کام پیداوار بڑھانا ہے۔ ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مشہور سنسکرت داں عالم میکس مولر کا قول ہے کہ آریہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ یہ لفظ آر سے نکلا ہے۔ جس کے معنی کاشتکاری اور زمین پھاڑنے کے ہیں۔ لہٰذا آر کے معنی کاشتکار اور کسان کے ہوئے۔ آر ہل ہانکنے کی لکڑی کو بھی کہتے ہیں جس کے سر پر نوکدار کیل جڑی ہوتی ہے۔

مورخ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی اپنے مقدمہ تاریخ ہند قدیم میں میکس مولر کے قول کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ہند قدیم کے آرین ہند آنے سے پہلے جو پانی سے ترقی کر کے کھیتی باڑی کے میدان میں قدم رکھ چکے تھے وہ گلہ بان اور کسان کی حیثیت سے ملک میں داخل ہوئے۔ چونکہ آرینوں کے خیال میں ان سے پہلے باشندے ان کے مقابلے میں کاشتکاری کے کام سے ناواقف تھے اور شکار کر کے گذر کرتے تھے، اس لئے نئے آنے والے آریہ کہلائے۔ اور قدیم باشندوں کو اناریہ یعنی غیر آریہ کا خطاب دیا گیا۔ رگ وید، یجر وید اور ویدوں کے آخری مجموعے اتھر وید میں ایسے ایسے بھرپور گیت موجود ہیں جن کے زیر اثر آسمان پر دیوتا اور زمین پر کسان اپنے اپنے کھیتوں میں جھومنے لگتے ہیں۔ بہادر آرینوں کا بہادر جنگجو دیوتا اندر بادل اور بارش کا دیوتا ہے، جو نیلے عفریت ورترا (آسمان) پر بجلی کے کوڑے مار کر پانی کو قید سے چھڑاتا ہے ماروت دیوتا، ساون کی طوفانی ہواؤں کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگنی دیوتا زندگی کی برقی حرارت کا نام ہے یہ دیوتا جو دنیا کو ہزار آنکھوں سے دیکھتا ہے۔

کسان کے خون کی رگوں میں داخل ہو کر پیداوار بڑھانے میں کیا کچھ حصہ دیتا ہوگا۔

ویدی عہد کے آخری دیوتاؤں میں "پُشان" کسانوں اور چرواہوں کا خاص دیوتا ہے۔ دوسرا دیوتا وشنو روپ روزی، رزق کا دیوتا مانا جاتا ہے۔ زمین اور آسمان دونوں جگہ اس کا حکم چلتا ہے۔ اس موقعے پر رگوید کے 'پرجنیہ' (بادل) دیوتا کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ اس کا کام ملک کی پیداوار کے لئے کتنا اہم ہے۔ رگوید کا یہ گیت کتنا دلکش ہے۔

"'پرجنیہ' کی تعریف کرو، اس کے گُن گاؤ، وہی پودے پھل اور بیج پیدا کرتا ہے۔ جانداروں کو روزی پہنچاتا ہے۔ 'پرجنیہ' تو نے خوب پانی برسایا اب بس کرو۔ بنجر زمین زرخیز ہوگئی۔ آکاش۔ دھرتی گھاس پھونس سب تر ہو گئے۔"

قدیم ہندوستان کے دیوتاؤں کا کام صرف پیداوار اُگانا ہی نہیں تھا بلکہ پیداوار بڑھانا بھی تھا۔ اتھروید کے ایک بھجن کا ٹکڑا ہمارے آج کل کے کسانوں کے لئے کتنا سبق آموز ہے۔

"ایک سو ہاتھ والے فصلوں کو جمع کرالے، ہزار ہاتھ والے پانی برسا فصل تیار ہو چکی ہے۔ پیداوار میں بڑھوتی ہوئی ہے۔ ساری پیداوار کو یہاں لا اور اس فصل کو بھی جو ابھی تیار نہیں ہوئی۔ (یعنی جو انسانی جدوجہد اور کسان کی محنت میں پوشیدہ ہے)

یہ تفصیل اس بات کا ثبوت ہے کہ قدیم ہند کے دیوتا کسانوں کے ناخدا تھے اور خود کسان اور انسانوں کے درمیان دیوتا کا درجہ رکھتا تھا۔ ہندوستان پہلے بھی کھیتی باڑی کا ملک تھا۔ آج بھی کھیتی باڑی کا ملک ہے اور آئندہ بھی کھیتی باڑی کا ملک رہے گا۔ ہندوستان کے لوگ انسانی پیداوار بڑھا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ماہرین کے مشورے پر گھر گھر بچاؤ کی دیواریں قائم کرنے کی جو کوشش کی گئی تھی ناکام ہو چکی ہے۔ اگر انسانی پیداوار بڑھتی رہے اور زرعی پیداوار نہ بڑھے تو ملک کی تباہی یقینی ہے۔ ہندوستان کو قدیم بنیادوں کے پتھروں سے گر اور نئے دور کا تعمیری مال مسالہ جمع کر کے زندگی کا نیا محل بنانا ہے وہ قدرتی طاقت جو کل تک دیوتاؤں کا درجہ رکھتی تھی آج بجلی اور ایٹم توانائی کی شکل میں انسانی سائنس کی خادم ہے۔ حکام۔ عوام اور کسانوں کا ایک مشترکہ فرض ہماری زراعتی پیداوار کے معیار کو انسانی پیداوار کے معیار سے اونچا اور آگے لے جا رہا ہے۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانا اور ٹوپی میں سے خرگوش نکال کر دکھا دینا نہ حکمرانوں کا کام ہے نہ کسانوں کا۔ محکمہ اس اس مہم کے سلسلے میں حکام کی شکتی کے استعمال کا ٹھیک ٹھیک انتظام کر رہے ہیں اُن کا فرض پورا ہو جاتا ہے۔ کسان کو قدرت کی طرف سے زمین کی انجینئری کا محکمہ سونپا گیا ہے۔ وہ دماغ لڑاتا ہے، ہل چلاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ دھوپ کا بوجھ اپنی رگوں پر اُٹھاتا ہے۔ جب پڑھے لکھے لوگ شہروں میں شورش برپا کر کے اپنی قسمتوں سے نافرمانی کرتے ہیں تو کسان اس وقت بھی ملک کی قسمت بنانے میں حصہ لیتا ہے۔ اور ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے کھیت اور بڑے بڑے کھلیان اس کی خدمت پر گواہی دیتے ہیں۔ کسان کی جدوجہد کا چراغ صدیوں سے روشن ہے۔ جب زمین ناکارہ انسانوں سے بوجھل ہو جاتی ہے تو کسان کا کام اس کے بوجھ کو ہلکا کر دیتا ہے۔ جب کسان کے ہاتھ پاؤں کام کرتے ہیں تو کوڑے کباڑ کے ڈھیر سے چمن اُبھر آتا ہے۔ ریگستان سے گلستان پیدا ہوتے ہیں۔ بنجر زمینوں پر ہرے بھرے کھیت اُگ آتے ہیں۔ کھلیان اُبل پڑتے ہیں۔ منڈیاں اناج سے بھر جاتی ہیں۔ زندہ اور قحط زدہ انسانوں پر منڈلانے والے گدھ بھاگ جاتے ہیں۔ چور بازار دم توڑ دیتا ہے۔ معاشی برائیوں اور جنسی بدعنوانیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کسان ہندوستان کے بچاؤ کا سب سے زیادہ مضبوط مورچہ ہے۔ اسی مورچے نے پہلے بھی دیس کی زندگی کو بچایا ہے۔ اب بھی کسان ہی ملک کے معیارِ زندگی کو بڑھائے گا۔ خوشحالی لائے گا اور قدرت کے منشا کو پورا کرے گا۔

'آج کل' کی توسیعِ اشاعت ہر بہی خواہِ اردو کا فرض ہے

پہلا پنج سالہ پلان

سوالات اور جوابات

عام سوالات

س ۔ پنج سالہ پلان کے بڑے بڑے مقاصد کیا ہیں اور عام آدمی کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے ؟

ج ۔ پلان کے بڑے بڑے مقاصد یہ ہیں کہ پیداوار کو بڑھا کر اور حاصل شدہ سرمائے کی مساوی تقسیم کر کے کمیونٹی کے لئے زیادہ خوش حالی اور سماجی انصاف حاصل کیا جائے۔ آئین حکومت کو اس بات کی ہدایت دیتا ہے کہ وہ ایک ایسے اقتصادی اور سماجی نظام کے لئے کوشاں رہے جس کی بنیاد مواقع کی مساوات، سماجی انصاف، کام کرنے کے حق اور موزوں تنخواہ پانے کے حق اور سماجی تحفظ پر ہو۔ پلان ان مقاصد کو عملی صورت دیتا ہے ۔ اگر ملک امیر ہو اور اس میں پونجی اور مواقع کی زیادہ مساویانہ تقسیم ہو تو عام آدمی کی حالت بھی بہتر ہو جائے گی ۔

س ۔ کیا پلان کی نگاہ میں " بڑھی ہوئی پیداوار " اور " زیادہ مساویانہ تقسیم " یکساں طور پر اہم ہیں ؟

ج ۔ ہاں، کیونکہ ایک ایسے پروگرام کا جس کے پیش نظر صرف پیداوار کا اضافہ ہو، نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ زیادہ تر بڑھی ہوئی پونجی چند لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جائے اور لوگوں کا موجودہ طبقہ اپنی موجودہ مفلسی کی حالت میں رہے ۔ جب کہ دوسری طرف موجودہ پونجی کی محض نئی تقسیم باقی لوگوں کی حالت بہتر بنائے بغیر سماج کے بعض طبقوں کی خوش حالی کو کم کر دے گی ۔ اس لئے پروگرام کے دو پہلو ہونا چاہئیں ۔ یعنی فوری طور پر پیداوار میں اضافہ بھی کرے اور نابرابریوں کو کم بھی کرے ۔ یہ صحیح ہے کہ بنیادی مرحلوں پر زیادہ زور پیداوار میں اضافے پر دیا جائے گا لیکن پھر بھی انھیں ابتدائی مرحلوں میں سماجی ڈھانچے میں ایسی تبدیلیاں کرنے کے لئے اقدامات کئے گئے ہیں جن سے ایک بہت بڑی حد تک اقتصادی مساوات حاصل کرنے میں بتدریج مدد مل سکتی ہے ۔

س ۔ پلان کے پیش نظر اضافہ شدہ پیداوار حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے ؟

ج ۔ ایک کمیونٹی کی پیداوار کی سطح کا انحصار زیادہ تر اس سرمائے کے ذخیرے پر ہوتا ہے ۔ جو اس کے ہاتھ میں ہو ۔ یعنی قابل کاشت زمین سے فی کس حاصل شدہ مقدار، اور دوسرے حاصل شدہ قدرتی ذرائع اور فیکٹریوں، ریلوے انجنوں، مشینری، آبپاشی کی سہولیات، بجلی کے کارخانے اور رسل و رسائل کی صورت میں پیداوار، ساز و سامان، سرمائے کے ذخیرے میں اضافہ اور اس کے ساتھ یہ علم کہ اسے کس طرح سے بہترین طریقے پر استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ سامان کی پیداوار اور خدمات میں اضافے کا باعث ہوگا ۔ اس لئے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ پلان کی مدت کے دوران میں زیادہ تر خرچ ان اسکیموں پر کیا جائے جو سرمائے کے ذخیرے میں اضافہ کر سکیں ۔ اور وہ اسکیمیں یہ ہیں زمین توڑنے، آبرسانی کی توسیع و ترقی، بجلی اور رسل و رسائل کی اسکیمیں، بڑے پیمانے پر اور بڑے بڑے سامان بنانے والی صنعتوں کا قیام اور دوسرے بڑے پیمانے اور چھوٹے پیمانے کی ان صنعتوں کا قیام جو قدرتی ذرائع اور آبادی کو جن کا آج صحیح طور پر استعمال نہیں ہوتا صحیح مصرف میں لا سکے ۔

س ۔ پلان کے پیش نظر بنیادی تبدیلیاں کرنے کے لئے ایسے کون کون سے اقدامات ہیں جو ایک بڑی حد تک اقتصادی مساوات کا باعث ہوں گے ؟

ج ۔ اس سلسلے میں بڑی بڑی تجویزیں یہ ہیں :-

۱ ۔ زمین کی ملکیت اور انتظام کے سلسلے میں متعدد دور رس تبدیلیوں کی تجویز کی گئی ہے ۔

۲ ۔ پیداوار اور تقسیم کے متعدد شعبوں میں کوآپریٹو اداروں کی ترقی پر زور دیا گیا ہے ۔

۳ ۔ تجارت اور صنعت کے نجی حلقے پر حکومت کی ہدایت اور کنٹرول کی بتدریج وسعت کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ مجوزہ اقتصادیات کی ضروریات پوری ہو سکیں ۔

۴ ۔ پلان میں موت ٹیکس کے اطلاق اور ٹیکسوں کے دوسرے تدریجی اقدامات کی تجویز کی گئی ہے جو ایک مقررہ مدت کے دوران میں بہت بڑی حد تک نابرابریوں کو دور کر سکتا ہے ۔

۵ ۔ پلان میں بعض بنیادی اشیاء پر جن کی کمیونٹی کے غریب طبقوں کے لئے دقت کا باعث بنتی ہے، کنٹرول کے اقدامات کی سفارش کی گئی ہے ۔

بھاکڑا — ننگل پراجیکٹ

پنجاب کا مشرقی حصّہ خشک سالی اور قحط کا شکار رہتا رہتا تھا مگر ۴۷ء کی تقسیم کے بعد سے مشرقی پنجاب پیپسو اور راجستھان کے لئے پانی کی فراہمی نے ایک عظیم قومی مسئلے کی صورت اختیار کر لی اور مشرقی پنجاب کی ضروریات کی وجہ سے خوراک کی قلت زیادہ ہو گئی تھی۔

پنجاب کے اس مسئلے کا ایک مستقل حل دریائے ستلج کے پانی کو کار آمد بنانے کی اسکیم کے ذریعے سے کیا گیا۔ یہ کوئی ابتدائی یا نئی اسکیم نہ تھی۔ غیر منقسم پنجاب کی یہ اسکیم ۱۹۴۸ء تک سیاسی اور مالی اسباب کی بنا پر معرضِ التوا میں پڑی رہی تھی۔

بھاکڑا پروجیکٹ اسکیم کے تحت کوہ ہمالیہ سے بہہ کر آنے والے پانی کو روک کر اسے آب پاشی اور بجلی طیار کرنے کے لئے کام میں لانا مقصود ہے جہاں چھ پہاڑ کی دل فریب گھاٹی میں چھ سو اسی فٹ بلند کنکریٹ کا ایک پشتہ تعمیر کرنا پڑا ہے۔ جس کی بلندی دریائے ستلج کی تہہ سے چوٹی تک ایک ہزار سات سو فٹ ہے۔ اس بلندی کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ بھاکڑا بند کی چوٹی پر پہنچنے کے لئے تین قطب میناروں کے مساوی بلندی طے کرنی پڑے گی۔ اس پشتے کی تہ کی سطح سوا چھ سو فٹ چوڑی ہو گی۔ بھاکڑا ذخیرے سے آب پاشی کے لئے پانی کے نکاس کے دس راستے بنائے جائیں گے جن سے آب پاشی کے لئے ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھ ہزار مکعب فٹ پانی بہہ کر کھیتوں میں چلا جائے گا اور فالتو پانی کا نکاس اور ان راستوں سے مجموعی طور پر دو لاکھ نوے ہزار مکعب فٹ پانی ذخیرۂ آب سے بہہ سکے گا۔ بھاکڑا ذخیرۂ آب میں چوہتر لاکھ ایکڑ فٹ پانی ذخیرہ کیا جا سکے گا جو قابلِ کاشت علاقے کی سال بھر تک آب پاشی کر سکے گا۔ بھاکڑا ذخیرۂ آب سے پانی کا کچھ حصّہ بجلی کی طیاری کے لئے بھی چھوڑا جاتا ہے۔

ننگل کا بند بھاکڑا پشتے کے مقام سے آٹھ میل سے نیچے تعمیر کیا گیا ہے۔ اوّل الذکر بند کی تعمیر پہلے شروع کی گئی تھی جو ۱۹۵۴ء ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ یہ بند نہ صرف بھاکڑا ذخیرہ آب سے ننگل ہائیڈل نہر میں بہہ کر آنے والے پانی میں باقاعدگی کا موجب ہو گا بلکہ ننگل ہائیڈل نہر پر جو بجلی گھر تعمیر ہوں گے اس سے ان کا توازن بھی قائم ہو سکے گا۔

ننگل ہائیڈل نہر آب پاشی اور بجلی پیدا کرنے والی نہر ہے۔ جس کی بدولت بھاکڑا کے آب پاشی کے سلسلے کو اور پانی کی بجلی طیار کرنے کے لئے پانی میسّر آتا ہے۔ یہ دنیا میں ایک بے مثل مصنوعی دریا ہے۔ اس کے پانی کا بہاؤ پہلے نو ہزار سات سو فٹ تک ساڑھے چودہ ہزار مکعب فٹ فی سیکنڈ اور اس کے بعد ساڑھے بارہ ہزار مکعب فٹ فی سیکنڈ ہو گا۔ اس نہر کی تہ پختہ اور گہرائی ۲۰۰،۶ فٹ ہو گی۔ یہ نہر ننگل بند سے اوپر دریائے ستلج کے بائیں کنارے سے نکلتی ہے۔ نہر سے بارھویں اور اٹھارویں میلوں پر دو بجلی گھر تعمیر کئے جائیں گے۔ اور ہر بجلی گھر میں اڑتالیس ہزار کلو واٹ بجلی طیار کرنے کی صلاحیت ہو گی۔ علاوہ ازیں ہر بجلی گھر میں مزید چوبیس ہزار کلو واٹ بجلی طیار کرنے کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے۔

بھاکڑا نہر کے نظام سے چھوٹی چھوٹی نہروں کا جو جال بچھایا جائے گا اس کا مجموعی طول دو ہزار آٹھ سو نوے میل ہو گا اور بھاکڑا کی بڑی نہر کا طول ایک سو آٹھ میل ہو گا۔

بھاکڑا ننگل پروجیکٹ سے جب پورے طور پر آب پاشی ہونے لگے گی۔ تو ہر سال تیس لاکھ ایکڑ رقبہ زمین زیرِ کاشت آ جائے گا۔ اور ایک لاکھ چھیاسی ہزار کلو واٹ بجلی پیدا ہو سکے گی۔ اس پروجیکٹ سے ایک بلا واسطہ فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ آج کل اس کی تعمیر میں سوا لاکھ اشخاص لگے ہوئے ہیں۔ اس پروجیکٹ کی تعمیر کا کام ایک کنٹرول بورڈ

کی نگرانی میں سرانجام پا رہا ہے جس کے صدر پنجاب کے گورنر سری سی۔ پی۔ این سنگھ ہیں اور اس میں مرکز، پنجاب، پیپسو، راجستھان، بلاسپور اور ہماچل پردیش کی حکومتوں کے نمائندے بھی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں بھاکڑا بند کی تعمیر کے سلسلے میں جنرل منیجر کی صدارت میں "ڈیزائنز ڈائرکٹوریٹ" پلانٹ ڈائرکٹوریٹ اور انسپکشن اینڈ کنٹرول ڈائرکٹوریٹ پر مشتمل ایک تنظیم بھی قائم کر دی گئی اور اس تنظیم کی امداد کے لئے ایک کنکریٹ کی لیبارٹری قائم کر دی گئی ہے۔

دریائی وادی کی دیگر اسکیموں کی مانند بھاکڑا، ننگل پروجیکٹ میں رسل و رسائل کی دشواریاں پیش آئیں۔ ننگل بند سے قریب روپڑ کا ریلوے اسٹیشن ہے۔ چنانچہ انڈین ریلویز نے ننگل بند اور روپڑ کے درمیان ریلوں کا سلسلہ قائم کر دیا تھا جو مسافروں اور مال و اسباب کی آمد و رفت کے لئے ۱۹۴۸ء میں کھول دیا گیا تھا اور ریل کے اس سلسلے کو ریاستی حکومت نے آٹھ میل کے فاصلے پر بھاکڑا کے بند پر پہنچا دیا ہے۔ اس کے علاوہ ریلوے کے ساتھ ساتھ ایک پختہ سڑک بھی روپڑ سے ننگل تک بنا دی گئی تھی جس کی توسیع بھاکڑا بند سے بھی آگے تک کر دی گئی ہے۔ پروجیکٹ کی تعمیر کے سلسلے میں عملے کی رہائش کے لئے پہلے ایک کیمپ قائم ہوا پھر وہ بڑھتے بڑھتے ایک قصبہ بن گیا ہے۔ بند کی تعمیر کے لئے دریا کے پانی کا رُخ موڑنا لازمی تھا۔ چناں چہ بھاکڑا کی گھاٹی کی دونوں جانب آدھ آدھ میل لمبی دو سرنگیں بنائی گئیں جن پر ڈھائی کروڑ روپے کی لاگت آئی ہے۔

سلسلۂ آب پاشی کی تعمیر کے لئے ۱۹۵۵ء تک کی میعاد مقرر کی گئی تھی۔ لیکن کام وقت سے پہلے ہی انجام پا رہا ہے۔ اور توقع ہے کہ اس سال موسم گرما میں فصل کی آب پاشی ہو سکے گی۔ ننگل بند کی تعمیر ۱۹۴۶ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۵۱ء میں مکمل ہو گئی تھی اور لوہے کے دروازے مارچ ۱۹۵۴ء میں نصب کئے گئے تھے۔ ننگل کی نہر پر دو بجلی گھر زیر تعمیر ہیں۔ ان میں سے بجلی گھر نمبر ۱ جلد ہی کام شروع کر دے گا۔ اور توقع ہے کہ بجلی گھر نمبر ۲ میں نومبر ۱۹۵۵ء سے کام چالو ہو جائے گا۔ پنجاب کی الیکٹریسٹی برانچ ننگل کے بجلی گھروں سے دہلی اور پیپسو میں بجلی منتقل کرنے کے انتظامات کر رہی ہے۔

بھاکڑا بند کی تعمیری سرگرمیوں سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ کام ۱۹۵۹ء تک مکمل ہو جائے گا۔ بہر کیف بھاکڑا ننگل پروجیکٹ جتنا دیو ہیکل ہے اُتنے ہی کثیر اس سے فائدے بھی حاصل ہوں گے۔

پنچائتوں کے اختیارات

شملے میں ریاستوں کے وزرائے لوکل سیلف گورنمنٹ کی کانفرنس

مرکزی وزارت صحت کی طرف سے شملے میں ریاستوں کے وزرائے لوکل سیلف گورنمنٹ کی ایک کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس کا افتتاح ۲۵ر جون کو لوک سبھا کے اسپیکر شری جی وی ماؤلنکر نے کیا۔ کانفرنس میں ایک ایسا پروگرام مرتب کیا گیا جس کے ذریعے سے گاؤں کی پنچایتوں کو لوکل سیلف گورنمنٹ کے ماتحت مؤثر یونٹوں میں منظم کیا جا سکے۔ دستور ہند کی دفعہ نمبر ۴۰ میں بھی گاؤں کی پنچائتوں کو ایسے اختیارات دینے کی ہدایت کی گئی ہے جن کی بنا پر وہ لوکل سیلف گورنمنٹ کے یونٹوں کے طور پر اپنے فرائض انجام دے سکیں۔

ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں گاؤں کی پنچایت کی نوعیت بھی مختلف ہے بعض ریاستوں میں ہر ایک ہزار افراد یا اس سے زیادہ افراد کے لئے ہر گاؤں میں گرام سبھائیں یا گاؤں سبھائیں قائم کردی گئی ہیں۔ ان سبھاؤں کی تشکیل آبادی اور گاؤں کے درمیانی فاصلوں پر کی گئی ہے۔

اکثر ریاستوں میں درجہ بدرجہ تین نظاموں کے تحت پنچائت راج کا نظم و نسق قائم کیا گیا ہے ان تین نظاموں کے زیریں حصے میں گرام پنچایت کو میونسپلٹی کے فرائض تفویض کئے گئے ہیں۔ چند گرام پنچائتوں کا مجموعہ کیندرا پنچایت کے نام سے موسوم ہے۔ پنچایت نظم و نسق کے فرائض سرانجام دیتی ہے اور چند کیندرا پنچائتوں کے مجموعے سے منڈل پنچایت کی تشکیل کی گئی ہے۔ اسکولوں۔ شفاخانوں اور ہسپتالوں کے انتظامات اس منڈل پنچایت کے سپرد کئے جاتے ہیں۔

بعض ریاستوں میں چند گرام پنچائتوں کو ملا کر "نیائے (انصاف) پنچائتیں" عدالت پنچائتیں یا گاؤں کی عدالتیں قائم کر دی گئی ہیں۔ اور ان سب کے لئے ایک کورٹ قائم کردی گئی ہے بعض ریاستوں میں پنچائتوں پانچ یا چھ وارڈوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور وہ پانچ یا چھ ہزار کی آبادی کے لئے کام کرتی ہیں۔

کانفرنس میں منصوبہ بندی کے لحاظ سے یونٹ کی مناسب وسعت کے متعلق تمام مسائل کی بنیادی تفصیلات پر غور و فکر کیا جائے گا۔ موجودہ پنچائتیں ایک ہزار یا اس سے زیادہ آبادی کے لئے قائم کی گئی ہیں جو مقامی آبادی کے لئے روزمرہ کے کاموں میں زیادہ دلچسپی پیدا کریں گی۔ تاہم نظم و نسق کی سہولیت اور انھیں زیادہ پر اثر بنانے کی غرض سے پچیس مربع میل کے علاقے میں گاؤں کا ایک دیہاتی گروہ قائم کرنا زیادہ کارآمد ہوگا اس گروہ کی پنچایت کا دستور اقتصادی لحاظ سے اور تعلیم، صحت، طبی امداد، علاج الحیوانات وغیرہ کے لئے زیادہ کارآمد رہے گا۔ اس صورت میں پنچائتوں کے لئے اعلےٰ پیمانے کے ہائی اسکول۔ شفاخانے، ہسپتال، زچہ و بچہ کی صحت کے مرکز قائم کرنے کا زیادہ امکان ہوگا۔

سنہ ۱۹۵۱ء کی ہندوستان کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق اس ملک میں پانچ لاکھ اٹھاون ہزار نواسی دیہات اور تین ہزار اٹھارہ قصبات ہیں۔ اور ۳۵۶۹ لاکھ کی آبادی میں سے ۲۹۵۰ لاکھ اشخاص دیہات میں رہتے ہیں اور ۶۱۹ لاکھ افراد قصبات میں آباد ہیں اگر کل ملک کو پچیس پچیس مربع میل کے مربعوں میں تقسیم کر دیا جائے تو پانچ میل طول اور پانچ میل عرض کے سینتالیس ہزار مربعے قائم ہو جائیں گے اور گاؤں کے گروہوں کی تعداد بھی سینتالیس ہزار چوہتر ہوگی اور ہر گروہ میں تقریباً بارہ گاؤں شامل ہوں گے۔ اور ایسے ہر گروہ کی آبادی میں چھ سے سات ہزار تک افراد شامل ہوں گے اور ہر گاؤں میں پنچایت کا ایک وارڈ بھی قائم ہو سکے گا۔ مسرت ہے کہ کانفرنس گاؤں کے گروہ کی تشکیل نو کے مطابق پروگرام مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

ملیریا کی روک تھام اور اجتماعی ترقّی کا پروگرام

دنیا کے ہر ایک ملک میں ملیریا ایک دیہاتی مسئلہ خیال کیا جاتا ہے۔ درحقیقت ملیریا کے انسداد اور دیہاتی ترقی میں بہت گہرا تعلق ہے، اور مندرجہ ذیل دو کہاوتیں اس دلیل کو ثابت کرنے کے لئے کافی اہمیت رکھتی ہیں: "ملیریا سے غریبی پھیلتی ہے اور غریبی سے ملیریا"۔ "ملیریا جہالت کو بڑھاتا ہے اور جہالت سے ملیریا پھیلتا ہے"۔

دیہاتی علاقوں میں ملیریا کی روک تھام کے پروگرام میں نقل و حمل کے ذرائع سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ملیریا کی انسدادی مہموں کو کفایت شعارانہ طور پر چلانے کے لئے ڈی۔ڈی۔ٹی چھڑکنے والے عملے اور دوائیاں چھڑکنے والے ساز و سامان وغیرہ کو ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو لے جانے اور سارے علاقے میں ملیریا سے بچاؤ کے انتظامات بہم پہنچانے کے لئے ذرائع نقل و حمل کا عمدہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انڈو امریکن پروگرام کے ماتحت بھارت میں ملیریا کی روک تھام کے لئے جو امریکی امداد دی جاتی ہے وہ تمام تر جیپ کاروں، دوائی چھڑکنے والے سامان اور ڈی۔ڈی۔ٹی کی سپلائی کی شکل میں ہے۔ چونکہ ملیریا کے ماہرین، ملیریائی حالات کے علم، اور ملیریا کے انسدادی کام کو تنظیم دینے کی ہنرمندی کے لحاظ سے بھارت دنیا بھر کی قوموں میں ایک اعلیٰ درجہ رکھتا ہے۔ اس لئے امریکہ نے اس وقت تک جو اٹھاون لاکھ اڑتالیس ہزار ڈالر کی کل امداد بھارت کو اس سلسلے میں دی ہے وہ تمام کی تمام ملیریا کے انسدادی کام کو انجام دینے کے لئے ضروری اوزار و سامان مہیا کرنے پر صرف کی گئی ہے اور اس سامان کو استعمال میں لانے کے اخراجات بھارت خود برداشت کرتا ہے۔

چونکہ ملیریا سے غریبی پھیلتی ہے اور غریبی سے ملیریا اس لئے دیہاتی بھارت کی صحت کے اولین مسئلے کے ترقی پذیر انسداد کا اجتماعی ترقی کے پروگرام کے تحت دیہات کی حالت سدھارنے کے مقصد کے ساتھ بالواسطہ تعلق ہے۔ اگرچہ عام حالات میں کوئی اجتماعی پروجیکٹ اس مسئلے کے خلاف انسدادی مہم کو چلانے کے لئے مطلوبہ ٹیکنیکل عملہ مہیا نہیں کر سکتا ہے لیکن پھر بھی اجتماعی پروجیکٹ کے انتظامیہ عملے کو ملیریا کے خلاف مہم میں ایک اہم کردار ادا کرنا ہے۔

ملیریا کے متعلق بنیادی حقائق اور اس کے انسداد کی تدابیر کے بارے میں دیہاتیوں کو تعلیم دینا نہایت اہم ہے۔ ایک گاؤں میں اجتماعی پروجیکٹ کے افسروں کو معلوم ہوا کہ وہاں کے لوگوں کو یہ ہرگز معلوم نہ تھا کہ ملیریا مچھروں سے پھیلتا ہے۔ حالانکہ اس گاؤں میں ملیریا عام تھا۔

گرام سیوک اور پروجیکٹ افسر دیہاتیوں کا تعاون حاصل کرکے ملیریا کی انسدادی مہم میں بڑی مدد کر سکتے ہیں۔ وہ گاؤں کے لوگوں کو ہر ایک گھر میں دوائی چھڑکنے کے پروگرام کے بارے میں پہلے سے اطلاع مہیا کرکے ان کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں تاکہ دوائی چھڑکنے والا عملہ سارے گاؤں میں دوائی چھڑکنے کا کام آناً فاناً ختم کرکے دوسرے گاؤں میں جا سکے۔ وہ لوگوں کو بتا دیں گے کہ دیواریں بالکل خالی ہوں یعنی ان پر کوئی چیز لٹکی ہوئی نہ ہو۔ کھانے پینے کی چیزوں اور برتنوں کو ڈھانپ کر رکھا جائے تاکہ دوائی ان پر نہ پڑے۔ اور جب دوائی چھڑکی جا رہی ہو تو گھر کے لوگوں اور خاص کر بچوں کو اس سے دور رہنا چاہیئے۔ نیز جب دوائی چھڑکی جا چکے تو دیواروں وغیرہ کو کسی چیز سے ڈھانپنا نہیں چاہیئے۔ لوگوں کو اپنے مکان، مویشی خانے اور دیگر عمارتیں دوائی چھڑکنے کے لئے کھول دینی لازم ہیں۔

ڈی۔ڈی۔ٹی کے اثر سے جب مچھر گھرائی سے نکل کر باہر جائیں گے

ؤ شاید دیہاتی لوگ دوائی چھڑکنا فضول بات خیال کریں لیکن اگر وہ غور سے مشاہدہ کریں تو وہ دیکھیں گے کہ ڈی ۔ ڈی ۔ ٹی چھڑکنے سے مچھروں کے ساتھ دیگر موذی اور وبائی قسم کے کرم بھی مرجاتے ہیں ، وہ دوائی چھڑکنے والے عملے کو جب وہ دوسری بار ان کے گاؤں میں ڈی ، ڈی ، ٹی چھڑکنے آئیں گے ، زیادہ سرگرمی سے کام کرنے پر زور دیں گے ۔

بعض علاقوں میں جہاں قبل ازیں ایسے جوہڑوں میں جہاں مچھر پیدا ہوتے ہیں دوائی چھڑک کر ان کے انڈوں اور بچوں کو تلف کیا جاتا تھا وہاں کے لوگ شاید گھروں میں مچھر مارنے والی دوائی چھڑکنا زیادہ مفید خیال نہ کریں ، لیکن جب ان کو یہ سمجھا دیا جائے گا کہ مچھروں کو تلف کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کو انسانوں کے رہنے کی جگہوں میں جہاں وہ خوراک حاصل کرنے آتے ہیں مار دیا جائے تو ان کو دوائی چھڑکنے کے طریقے کے نہایت مؤثر ہونے پر یقین آجائے گا ۔

ملیریا سے متعلق ریسرچ کے کام کے لحاظ سے بھارت سب سے پیش پیش رہا ہے ، تربیت یافتہ سائنس داں ملیریا کے مرض سے اعداد و شمار ، مچھروں کی مختلف قسموں کی درجہ بندی اور ان کی عادات کے بارے میں واقفیت ، غرضکہ ملیریا کے انسداد کے متعلق ہر ایک چیز بھارت کے پاس آج موجود ہے ۔ بلکہ جتنے وسیع پیمانے پر بھارت میں ملیریا کی روک تھام کا کام کیا گیا ہے ۔ دنیا کے کسی ملک میں کبھی اتنا کام کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی ۔

بھارت اس لحاظ سے بھی انتہائی خوش قسمت ہے کہ اس وقت جب سارے ملک میں ملیریا کے انسداد کے پروگرام پر عمل شروع کیا گیا ہے تو اسے اس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے اجتماعی ترقی کے پروجکٹوں کے وسیع نظام اور گرام سیوکوں کی امداد بھی شامل ہے ۔



ملیریا کے خلاف جنگ کی تاریخ

۱۸۲۰ء ۔ ہیبر نے ہندوستان میں کونین سلفیٹ کا استعمال رائج کیا ۔
۱۸۸۰ء ۔ لاوارن نے انسانی خون میں ملیریا کے جراثیم کی تشریح کی ۔
۱۸۸۳ء ۔ کنگ نے ملیریائی مچھروں کا نظریہ پیش کیا ۔
۱۸۹۱ء ۔ ملیریا کے جراثیم کو خوردبین کے ذریعے امتحان کرنے کی غرض سے رومن ناؤسکی نے ایک رنگ ایجاد کیا ۔
۱۸۹۷ء ۔ راس نے انسانی ملیریا کے جراثیم مچھروں میں دریافت کئے ۔
۱۸۹۸ء ۔ گراسی ، بگنامی اور بسٹیانیلی نے انسانی ملیریائی جراثیم کی مکمل گردش کا مشاہدہ کیا جنہوں نے مچھروں کے ذریعے انسان کو ملیریا کی بیماری لگ جانے کا بھی تجربہ کیا ۔
۱۹۲۶ء ملیریا کے انسداد کی پہلی کیمیاوی دوا " پلاسموکوئن " تیار کی گئی ۔
۱۹۳۰ء جنوبی افریقہ میں ڈی میلن نے اور ہندوستان میں کوول اور رسل نے انسداد ملیریا کے لئے عاقرقرحا کا استعمال شروع کیا ۔
۱۹۵۳ء ۔ ہندوستان نے انسداد ملیریا کا قومی پروگرام شروع کیا جو دنیا میں اس بیماری کے خلاف سب سے بڑی مہم ہے ۔

رفتارِ زمانہ

گواٹے مالا

ہونڈوراس کی جانب سے گواٹے مالا پر حملہ ایک حیرت ناک خبر تھی۔ مرکزی امریکہ میں صورتِ حال پر اس کا مہلک اثر بھی پڑ سکتا تھا۔ لیکن حالاتِ جنگ نے امن کی صورت اختیار کر لی ہے۔ گواٹے مالا کے پہلے صدر مسٹر اربنیز میکسیکو کے سفارت خانے میں پناہ گزیں ہیں۔ ان کے بعد کرنل کا ریوس ڈایا صدر بنائے گئے۔ لیکن ان کی صدارت دو دن سے زیادہ نہ چل سکی۔ انھیں کی وزارت کے ایک رکن کرنل مونزون نے عنانِ حکومت اب اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ باغیوں سے صلح ہو گئی ہے۔ باغیوں کے لیڈر وزارت میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ نئی حکومت کمیونسٹوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ سینکڑوں گرفتاریاں ہو چکی ہیں۔ ایک سابق جج کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔

نیشنل کانفرنس کشمیر کی ورکنگ کمیٹی کے نئے ممبران

ریاست جموں اور کشمیر کے وزیرِ اعظم اور ریاست کی نمائندہ سیاسی جماعت نیشنل کانفرنس کے صدر بخشی غلام محمد نے نیشنل کانفرنس کی نئی ورکنگ کمیٹی کا اعلان کر دیا ہے۔ نئی ورکنگ کمیٹی میں وزیرِ تعلیم مسٹر غلام صادق۔ وزیرِ مال میر کاظم۔ وزیرِ اقتصادیات مسٹر گردھاری لال ڈوگرہ۔ تعمیر و ترقی کے وزیر مسٹر شام لال صراف۔ آئین ساز اسمبلی کے صدر مسٹر غلام رسول۔ نائب وزیرِ داخلہ مسٹر ڈی۔ پی۔ در کے علاوہ مسٹر عبدالغنی۔ شیخ محمد اکبر۔ موتی رام باگا۔ رام پیارے صراف مسٹر غلام محمد بھی شامل ہیں۔

وزیرِ اعظم چین کی بھارت میں آمد

بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال کی دعوت پر چین کے وزیرِ اعظم چاؤ این لائی تین دن کے لئے بھارت تشریف لائے۔ دہلی میں ان کا جو عظیم الشان استقبال ہوا وہ تاریخ میں ایک یادگار رہے گا۔ چین کے وزیرِ اعظم جس طرف بھی جاتے تھے چاؤ این لائی زندہ باد اور جواہر لال نہرو زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی تھی۔ شری چاؤ این لائی نے اپنی مختلف تقاریر میں بھارت اور چین کے دوستانہ تعلقات اور دنیا میں قیامِ امن کے موضوع پر اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ آپ نے شری نہرو سے دنیا کے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا۔ اپنے ایک مشترکہ بیان میں ہر دو وزرائے اعظم نے تجویز کی ہے کہ ہند چینی میں ایک سیاسی عہد نامے کا مقصد ایسی آزاد جمہوری متحد اور خود مختار ریاستوں کا قیام ہونا چاہیے جنھیں جارحانہ مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا جا سکے اور جن میں غیر ملکی مداخلت کی گنجائش نہ ہو۔ بیان میں مزید کہا گیا ہے کہ اس تجویز پر عمل کرنے سے ان ممالک میں خود اعتمادی بڑھے گی اور اُن کے پڑوسی دیشوں سے دوستانہ تعلقات قائم ہوں گے۔ ہر دو پردھان منتریوں نے اپنے بیان میں اس صدق دلانہ خواہش کا اظہار کیا ہے کہ ہند چینی میں عارضی صلح کے متعلق جنیوا میں بات چیت جلد کامیاب ہو گی۔ دونوں مدبروں نے ان اصولوں کی ایک مرتبہ پھر تصدیق کی ہے جن کی بنا پر تبت کے معاملے پر بھارت اور چین میں سمجھوتہ ہوا تھا۔ یہ اصول ایک دوسرے ملک کی سرحدوں اور خود مختاری کا پاس کرنا، جارحانہ روش اختیار نہ کرنا، ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنا مساوات، باہمی فائدے اور پُر امن طور پر زندہ رہنے اور زندہ رہنے دینے پر مشتمل ہیں۔ انھوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ایشیائی ممالک اور دنیا کے دوسرے باہمی تعلقات پر بھی انھیں اصولوں کا اطلاق ہو گا۔

حضرت امیر خسروؒ کا عرس

دہلی میں حضرت امیر خسرو کا ۶۴۸ واں عرس بڑی شان کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ میں منایا گیا۔ ایک عظیم الشان جلسے کی صدارت بھارت سرکار کے وزیر شری بی ۔ وی ۔ گری نے انجام دی۔ اس موقعے پر بھارت کے وزیر داخلہ ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو نے ایک تقریر کرتے ہوئے کہا کہ حضرت امیر خسروؒ ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔ افغانستان کے سفیر نے اس امر پر فخر کا اظہار کیا کہ حضرت امیر خسروؒ پٹھان قوم کے چشم و چراغ تھے۔ اس اجتماع میں پاکستان سے آئے ہوئے زائرین نے شرکت اختیار کی۔

ہند چینی میں جنگ بندی کے لیے فرانس کی نئی وزارت کی شرط

فرانس کی پچھلی وزارت کو اعتماد کا ووٹ نہ ملنے کے بعد ایم پئیر مندیس فرانس نے نئی وزارت مرتب کر کے اس کی فہرست پریزیڈنٹ کے حوالے کر دی ہے۔ نئی وزارت میں پانچ سیاسی پارٹیوں کے نمائندے شامل ہیں۔ موسیو مندیس نے وزارت مرتب کرنے کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا ہے کہ اگر بیس دنوں تک ہند چینی میں جنگ کو روکا نہ جا سکا تو ان کی وزارت مستعفی ہو جائے گی۔ چنانچہ آپ نے جنیوا جا کر چین کے وزیر اعظم چاؤ این ۔ لائی سے اس سلسلے میں ملاقات بھی کی ہے۔

وزیر اعظم برطانیہ و صدر امریکہ کا مشترکہ اعلان

برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چرچل امریکہ کے صدر آئزن ہاور کی دعوت پر امریکہ گئے اور دنیا کے مختلف مسائل پر اُن سے تبادلۂ خیال کیا ایک مشترکہ بیان میں اعلان کیا گیا ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کے مجموعی ڈیفینس کے مسئلے پر امریکہ اور برطانیہ کا لائحۂ عمل ایک ہی جیسا ہوگا۔ اور جنیوا کانفرنس کی کامیابی یا ناکامی کا اُن کے طریقۂ کار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

جنیوا کانفرنس کی کامیابی کے لیے بھارت کی کوششیں

جنیوا کانفرنس میں ہند چینی کے مسئلے پر ابھی تک کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا ہے۔ کئی دفعہ تو اس سلسلے میں مایوس کن خبریں بھی آ چکی ہیں۔ لیکن شری جواہر لال نہرو کی کوششوں سے یہ امید پیدا ہو چلی ہے کہ شاید جنیوا کانفرنس کی کشتی ڈوبنے سے بچ جائے۔ بھارت سرکار کی طرف سے شری کرشنا مینن نے اس باب میں جو اہم رول ادا کیا ہے اُس کی تمام سیاسی پارٹیوں نے سراہنا کی ہے۔ اگر وہ ایک طرف روسی سفیر سے ملے تو دوسری طرف اُن کا مسٹر ایڈن سے رابطہ رہا اور یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ کئی مرتبہ کانفرنس ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔ اب چین اور فرانس کے وزیر اعظم کی ملاقات اور چین کے وزیر اعظم کا شری نہرو سے ملاقات کرنے کے بعد جنیوا میں جانے کا ارادہ اس امر کے آثار ہیں کہ شاید سمجھوتے کی راہ نکل آئے۔ بہر حال تمام دنیا کی نگاہیں اس وقت جنیوا کانفرنس پر مرکوز ہیں۔

بھارت سے خوراک کی قلت ختم

اب اس امر میں شک اور شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ مسئلہ خوراک کے محاذ پر بھارت سرکار پورے طور پر کامیاب ہو چکی ہے ابھی کچھ عرصہ پیشتر یہ حالت تھی کہ چھ اونس راشن کے علاوہ لوگ گندم کے دانے دانے کو ترستے تھے اور بلیک مارکیٹ زوروں پر تھی لیکن تھوڑے عرصے میں ہی حالات میں ایسی تبدیلی آئی کہ جس طرف نظر اُٹھاؤ آپ کو گندم کے ڈھیر نظر آئیں گے قیمتیں بتدریج گر رہی ہیں اور اب کئی پردیشوں کی سرکاریں تو اس تشویش میں ہیں کہ کس طرح گندم کی قیمتوں کو کم ہونے سے روکا جائے۔ یقیناً بھارت سرکار اور اُس کے وزیر خوراک شری رفیع احمد بھارت کی جنتا کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

شری وی شانتا رام بھارت کے فلمز ڈویژن کے آنریری چیف پروڈیوسر

شری وی شانتا رام نے وزارت اطلاعات و نشریات کے فلمز ڈویژن کے آنریری چیف پروڈیوسر کے فرائض سر انجام دینا منظور کر لیا ہے۔ آپ دیہاتی لوگوں کے لیے پنج سالہ منصوبے پر تیار کی جانے والی فلموں کی تیاری پر خاص توجہ دیں گے۔

نئی ریلوں کی تعمیر

ریلوے بورڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ احمد آباد کے قریب سابرمتی ریلوے لائن کی توسیع کی جائے اور احمد آباد سے دہلی جانے والی درمیانی پٹری والی ریلوے لائن کے احمد آباد کلال سیکشن میں دوہری پٹری بچھائی جائے، اور اس پر تقریباً دو کروڑ چھیالیس لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔ اس کے علاوہ تقریباً ۷۴ لاکھ روپیہ کے خرچ سے بھج سے آدمی پٹ جانے والی چھوٹی پٹری والی لائن کو میٹر لائن میں تبدیل کر دیا جائے۔ یہ لائن تیس میل لمبی ہے۔

قوم سے خطاب

تین سال پہلے مارچ سنہ ۱۹۵۱ء میں ہندوستان کے لوگوں نے خود اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی ابتدا کی۔ ہمارے پہلے پانچ سالہ پلان کا مقصد تھا زیادہ غلہ اُگانا۔ زیادہ سامان تیار کرنا۔ سماجی خدمتوں کو ترقی دینا اور روزگار کے زیادہ طریقے نکالنا۔

تاحال جس قدر ترقی کی جا چکی ہے وہ تسلی بخش ہے۔ ہم نیا ہندوستان بنانے کی اس عظیم الشان مہم پر ایک ہزار کروڑ روپیہ خرچ کر چکے ہیں اب ہم غلہ کے لئے باہر کی امداد کے سہارے نہیں رہے ہیں۔ ہم تلیا جیسے عظیم سد باندھ چکے ہیں۔ بوکارو جیسے تھرمل پاور اسٹیشن "قائم کر چکے ہیں سندری جیسے کارخانے بنا چکے ہیں اور چنڈی گڑھ جیسے شہر تعمیر کر چکے ہیں۔ ہم اپنے ریلوے انجن خود ہی بنا لیتے ہیں اور موٹر کاریں اور ہوائی جہاز خود ہی جوڑ لیتے ہیں۔ کمیونٹی پراجکٹ (جماعتی منصوبہ بندی) اور ترقی دیہات کی سروس کے ذریعہ ہم نے دیہاتوں کی خوشحالی کی بنیادیں رکھ دی ہیں۔

جان توڑ کوشش ضروری ہے۔ اس قدر ترقی کر لینے کے باوجود باقی ماندہ دو برسوں میں جان توڑ کوشش کی ضرورت ہے تاکہ اس نشانِ منزل تک پہنچ جائیں جسے ہم پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس کوشش کے سلسلے میں اخراجات کے لئے ہندوستان کو اب بھی تقریباً ۱۳ سو کروڑ روپیوں کی ضرورت ہے — "نیشنل پلان لون" یا قومی منصوبہ بندی کے قرضہ کے ذریعہ قوم کو آواز دی جا رہی ہے کہ وقت کی پکار پر اٹھ کھڑے ہوں۔ پانچ سالہ پلان خود عوام کا پلان ہے۔ عوام کا فرض ہے کہ اس مہم کی کامیابی کے لئے اپنا حق ادا کریں۔ **یہ آپ کا فرض ہے اور میرا بھی۔**

پلان کی ترقی کا گوشوارہ

		نشانِ منزل پلان کی مدت کے لحاظ سے ۱۹۵۱ تا ۱۹۵۶	حاصل شدہ مقصد ۱۹۵۳-۱۹۵۴
غذا		۷۶ لاکھ ٹن (فی سال مزید پیداوار)	۶۰ سے ۷۰ لاکھ ٹن (فی سال مزید پیداوار)
آب پاشی (بڑے منصوبوں کے ذریعہ)		۸۵۳۲۰۰۰ ایکڑ	۳۵۵۶۰۰۰ ایکڑ
پاور (بجلی)		۱۰۸۷۰۰۰ کلوواٹ	۷۲۴۰۰۰ کلوواٹ
نئے راستے		۸۷۰ میل	۴۴۷ میل
سوتی کپڑے		۹۸۲۰ لاکھ گز (فی سال مزید پیداوار)	۱۱۶۳۰ لاکھ گز (فی سال مزید پیداوار)
کمیونٹی پراجکٹ (جماعتی منصوبہ بندی) اور ترقی دیہات کی سکیم		۱۲۰۰۰۰ گاؤں	۴۸۷۵۰ گاؤں
نئے اسکول		۴۹۶۹۵	۲۹۷۲۳
نئے ہاسپٹل		۹۹۶	۶۰۹

دل کھول کر

قومی منصوبہ بندی

کے قرضہ میں حصہ لیجئے۔

(۳½ فیصدی سالانہ سود جس کی ادائیگی ہر چھ مہینے کے بعد ہوگی)

مزید تفصیلات کے لئے:۔ ریزرو بینک آف انڈیا، امپیریل بینک آف انڈیا، حیدرآباد اسٹیٹ بینک، بینک آف میسور لمیٹڈ کی کسی بھی شاخ یا کسی گورنمنٹ ٹریژری یا سب ٹریژری کو لکھیں۔

نیشنل پلان سرٹیفکیٹ

خریدیئے

(۴½ فیصدی سالانہ سود جس کی ادائیگی اختتام مدت کے بعد ہوگی)

مزید تفصیلات سیونگز بینک کا کام کرنے والے ڈاک خانوں سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

AC 946

ہندوستان کے مستقبل میں روپیہ لگائیے



بچوں کا آج کل



۱۵ راگست

بچو! ۱۵ راگست کا دن ہندوستان کے لئے نہایت ہی مبارک دن ہے۔ تمھیں یاد ہوگا کہ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ہمارا دیش انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا تھا۔ اس آزادی کو حاصل کرنے کے لئے ہم نے بڑی قربانیاں دیں۔ کتنے نوجوان پھانسی کے تختے پر چڑھے۔ کتنی ماؤں نے اپنے بچوں کو ہنسی خوشی دیش کی خاطر قربان ہونے کے لئے گھر سے روانہ کیا۔ دیش پتا باپو کی رہنمائی میں لاکھوں ہندوستانیوں نے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا۔ باپو نے اہنسا کا راستہ اختیار کیا۔ یہ راستہ نیا تو نہیں تھا لیکن دنیا اسے بھول چکی تھی۔ اس راہ پر چلنا آسان نہیں تھا لیکن نہتے ہندوستانیوں کے لئے اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ باپو نے اس اہنسا کو کمزور کا نہیں بلکہ طاقتور کا ہتھیار قرار دیا۔ انگریزوں کی طاقت کو دنیا مانتی تھی۔ لیکن کروڑوں مرد عورتوں کی آواز کے سامنے ان کی طاقت ہیچ ثابت ہوئی۔

آج کے دن ہم خوشی مناتے ہیں۔ دیش دیش میں ہمارے سفارت خانوں میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ جہاں جہاں ہندوستانی بستے ہیں وہ اس دن جشن مناتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ہمارا ملک ہمیشہ آزاد رہے اور ہر روز ترقی کی منزلیں طے کرے۔ آؤ ہم بھی اس دن یہ عہد کریں کہ ہم اپنے ملک کی ترقی اور کامیابی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیں گے۔

جے ہند

سید ظفر حسنین

بہادر کون.....؟



بہت دنوں پہلے ایک بہت بڑا نواب تھا جو کہ شجاعت اور بہادری کا بہت بڑا شائق تھا۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے پہلوان رہا کرتے تھے جن کی وہ بڑی قدر کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس کے دربار میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے کہا کہ میں بہت بڑا پہلوان ہوں مجھے بھی اپنے دربار میں رکھ لیجئے۔ نواب یہ سُن کر بڑا خوش ہوا مگر ساتھ ساتھ وہ ہر پہلوان کی آزمائش بھی کیا کرتا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ پہلوان کا پہلے امتحان لے گا اور پھر اگر وہ واقعی نڈر اور بہادر نکلا تو اسے اپنے دربار میں رکھ لے گا۔

بالآخر یہ طے ہوا کہ کسی خاص رات کو وہ قبرستان میں جائے اور سارے مُردوں کی ہتھیلی پر مہندی لگا کر چلا آئے۔ صبح کو اس کی تصدیق کی جائے گی اور ثبوت ملنے پر اسے دربار میں رکھ لیا جائے گا۔ اب سنیئے، اس زمانے میں اور اس ملک میں جہاں کی یہ کہانی ہے، مُردوں کو نہ دفن کرتے تھے اور نہ انھیں جلاتے تھے بلکہ شہر سے کافی دُور کسی سنسان مقام پر ایک بہت بڑا احاطہ ہوتا تھا جہاں مُردوں کو لے جا کر ڈال آتے تھے۔ مُردے یونہی دھوپ میں سُوکھ سُوکھ کر اور بارش کے موسم میں گل کر مٹی میں مل جاتے یا انھیں ہوائی پرندے آکر کھا لیتے۔ الغرض یہ کام بڑا صبر آزما تھا۔ ایک تو دن دہاڑے کوئی ایسے مقام پر جانے کی ہمت نہیں کرتا تھا دوسرے بھیگی رات میں وہاں جانا اور مُردوں کی ہتھیلی پر مہندی لگانا کس قدر خطرناک عمل ہو سکتا ہے! لیکن مثل مشہور ہے "بندگی بیچارگی"۔ بیچارہ پہلوان کر بھی کیا سکتا تھا، اسے تو اپنی نوکری کی پڑی تھی۔ خیر ایک رات کو وہ قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔

رات بڑی اندھیری اور بھیانک تھی، ہوا سائیں سائیں چل رہی تھی۔ اور بیچارہ پہلوان ٹٹو پر سوار ایک ہاتھ میں نیزہ لئے اور دوسرے میں موم بتی لئے قبرستان کی طرف چلا جا رہا تھا۔ جب وہ قبرستان میں پہنچا تو اسے عجیب خوفناک منظر نظر آیا۔ ہر طرف بھیانک سیاہ فام مُردے، بے پناہ بدبو اور جنگلی جانوروں کی مہیب آوازیں۔ اس کا ایک دم سے دل چاہا کہ وہ بھاگ کھڑا ہو مگر پھر دل مضبوط کرکے اپنی جگہ جما رہا۔ اب اس نے مُردوں کی ہتھیلی میں مہندی بھی لگانی شروع کر دی۔ ایک قطار سے وہ کوئی آٹھ دس مُردوں کی ہتھیلی میں مہندی لگا چکا تھا کہ یک بیک برابر کے مُردے نے جنبش کی اور اس کی ہتھیلی خود بخود دست سوال بن کر اٹھی اور اس کے

سامنے آکر پھیل گئی - جیسے یہ سوال کر رہی ہو "کیا مجھے مہندی نہیں لگاؤ گے"؟

پہلوان غریب بُری طرح سٹپٹایا کیونکہ خلاف امید مُردہ جی اُٹھا تھا - وہ بُری طرح کانپنے لگا اور بھاگنے کے لئے کھڑا ہوا مگر پھر اپنی نوکری کا خیال آتے ہی اپنی جگہ پر جم گیا - تھوڑا سا کام اور باقی تھا جسے اگر وہ ادھورا چھوڑ کر ڈر سے بھاگ کھڑا ہوتا تو ساری محنت اکارت جاتی -

ہاتھ ابھی تک اسی طرح اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا جسے دیکھ کر پہلوان کو بڑا غصّہ آیا - اس نے اپنا کام کرتے ہوئے بڑبڑا کر کہا — "ارے بھائی ٹھہر جا - گھبراتا کیوں ہے تجھے بھی مہندی لگاؤں گا" - مگر ہاتھ اسی طرح ہوا میں لٹکتا رہا - اب کے پہلوان نے نیزہ ہوا میں لہرایا اور ہوا میں اُٹھی ہوئی ہتھیلی میں بیدردی



سے بھونک دیا اور پھر نیزے کو زمین میں پیوست کر دیا - پھر حسب دستور اپنے کام میں لگ گیا - مگر چند ہی منٹ بعد کیا دیکھتا ہے کہ اسی مُردے کا دوسرا ہاتھ اس کے سامنے اُٹھا ہوا ہے اب کے وہ خوف پر قابو نہیں پا سکا - پہلی دفعہ تو اس نے محض اتفاقیہ عمل سمجھا تھا مگر اب کے وہ سمجھ گیا کہ کوئی شیطان یا بھوت ضرور موجود ہے - اور وہ بے تحاشہ قبرستان سے نکل کر بھاگ کھڑا ہوا - دوسری صبح کو اس نے دربار میں جا کر سارا قصّہ بتایا اور اس انوکھے مُردے کا بھی حال بتایا - پھر بہت سے لوگ اس کے کارنامے کو دیکھنے وہاں گئے مگر حیرت انگیز طور پر وہ مُردہ جسے اس نے خنجر بھونکا تھا' وہاں سے غائب تھا - سب لوگ واپس لوٹ آئے اور نواب سے پہلوان کی بہادری اور دلیری کی تعریفیں کرنے لگے - اُس دن خلاف معمول نواب نے دوشالہ اوڑھ رکھا تھا - گرچہ موسم شدید گرمی کا تھا - نواب کے دونوں ہاتھ بھی اندر ہی تھے اور وہ کبھی کبھی ایک ٹھنڈی سی سانس لے لیتا' کبھی اُف اُف کرنے لگتا مگر پھر بھی مسکرا کر سارے لوگوں کی باتیں سُن رہا تھا - سارے درباری یک زبان ہو کر کہہ رہے تھے کہ واقعی پہلوان بہت بڑا بہادر ہے اور اسے دربار کے پہلوانوں کا سردار ہونا چاہئے - ہر درباری یہی کہہ رہا تھا کہ اس پہلوان سے بڑھ کر اور کہیں کوئی بہادر نہیں ہو سکتا - مگر نواب ساری باتیں سُن کر مسکرا رہا تھا - جب درباریوں نے پہلوان اور بھوت کے مقابلے کا قصّہ دُہرانا شروع کیا اور کہا کہ واقعی وہ بھوت تھا اسی لئے نیزہ کھا کر بھی غائب ہو گیا - تو نواب نے مُسکراتے ہوئے دوشالے سے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا اور لوگوں نے دیکھا کہ اس کی ہتھیلی پر تازہ اور گہرا نیزے کا زخم تھا - اور جب نواب نے بتایا کہ وہ شیطان کوئی دوسرا نہیں تھا بلکہ نواب ہی تھا جو شام ہی سے قبرستان میں جا کر سو رہا تھا' تو سارے درباری ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے - پہلوان بھی بہت نادم ہوا - سبھی سوچنے لگے کہ مُردوں کی ہتھیلی میں مہندی لگانے والا بہادر تھا یا سرِشام مُردوں کے ساتھ جا کر سونے والا اور خنجر کھا کر بھی اُف نہ کرنے والا بہادر تھا؟



فیض لودھیانوی

کھلاڑی کوّا

چھا گیا بادل آگئی برکھا   جشن مناتی ہے سب دُنیا   ڈر ہے کوئی چوٹ نہ کھائے   نازک ٹہنی ٹُوٹ نہ جائے
دیکھو ایک عجیب تماشا   نیم کی پتلی ڈال پہ بیٹھا   پھر اس کی آماں پچھتائے   دوڑی آئے شور مچائے
کوّا جھولا جھُول رہا ہے   کوّا جھولا جھُول رہا ہے

بھانپ رہا ہے دائیں بائیں   نیچے ہیں کچھ بھینسیں گائیں   اُڑ جائے گا اینٹ نہ مارو   جلد اس کی تصویر اُتارو
سُن کر اس کی کائیں کائیں   کہتی ہیں ہم صدقے جائیں   کیسے غافل ہو تم یارو   مور کو اس کی دُم پہ وارو
کوّا جھُولا جھُول رہا ہے   کوّا جھُولا جھُول رہا ہے

کھیل دکھاتا ہے یہ کیا کیا   مات ہوا سرکس کا گھوڑا
بچپن ہی میں شوخ ہے کتنا   بے فکری کا فیض ہے سارا
کوّا جھُولا جھُول رہا ہے
جھُول کے جھُولا پھُول رہا ہے

قمر الزماں

خیر سے بدّھو گھر کو آئے



بہت دن پہلے کی بات ہے۔ کسی ملک میں ایک راجہ رہتا تھا۔ اُس نے ایک خدا رسیدہ بزرگ کی بڑی ہی خدمت کی تھی۔ اُس نے خوش ہو کر راجہ کو ایک منتر سکھایا تھا۔ اس منتر کا جاننے والا چیونٹی تک کی بولی اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ راجہ اس منتر کو سیکھ کر بہت ہی خوش ہوا تھا۔ مگر اس منتر کا دستور ہی نرالا اور انوکھا تھا۔ خدا رسیدہ بزرگ نے جاتے وقت راجے کو تاکید کر دی تھی کہ بھولے سے بھی اس راز کو کسی سے نہ کہنا نہیں تو تم فوراً ہی پتھر بن جاؤ گے۔ اس پر راجہ کچھ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ مگر فوراً ہی اس کے چہرے پر خوشی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی تھی۔

اکثر وہ اپنے خوبصورت باغ میں بیٹھا کیڑے مکوڑوں کی گفتگو سنتا رہتا اور کبھی مسکراتا کبھی زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگتا۔ اور کبھی بالکل مغموم اداس ہو جاتا اور پھر دیر تک اُداس ہی بیٹھا کچھ سوچتا رہتا۔

ایک دن کی بات ہے۔ اپنے معمول کے مطابق راجہ اپنے باغ میں آ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اور پھر ایک چیونٹے کو جو درخت کے اوپر آہستہ آہستہ چڑھ رہا تھا۔ غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے مُنہ میں کوئی سفید سی شئے جو اُس کے قد سے زیادہ وزنی نظر آ رہی تھی لئے جا رہا تھا۔

ایک بڑے سر کا چیونٹا ٹھیک اس کے پاس ہی سامنے آ کر رُکا اور بولا۔ کیوں بھائی ایسی کیا آن پڑی ہے جو اتنا وزنی بوجھ لئے جا رہے ہو اپنی تندرستی کا بھی تو خیال کیا ہوتا؟"

"کیا کہوں بھائی صاحب ضرورت ہی کچھ ایسی آن پڑی ہے" — وہ بولا — "کیا کرتا میری گھر والی —"

"ہاں ہاں کیا ہوا اُسے؟ وہ بات کاٹتے ہوئے تعجب سے بولا۔

"وہ ایک عرصے سے بیمار رہے تھیا" — وہ ہانپتے ہوئے بولا — اس کی خواہش ہوئی تھی آج کھانے کی یہی چیز اُسے بہت پسند ہے —"

"اچھا تو اُسی کے لئے لئے جا رہے ہو! وہ مسکراتا ہوا چل دیا۔ راجہ یہ سُن کر زور سے کِھل کِھلا کر ہنس پڑا۔ رانی جو کچھ ہی دیر کے بعد آ گئی تھی۔ راجے کو یوں یک بیک ہنستے ہوئے دیکھ کر بوکھلا سی گئی۔ اور حیرت کے انداز میں بولی —

"کیا بات ہے؟ آپ بڑے زور سے ہنس پڑے —"

"کوئی بات تو نہیں رانی —" اس نے چیونٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا — میں ان دونوں کی گفتگو پر ہنس پڑا تھا۔ وہ اپنی مریض بیوی کی فرمائش کتنی محنت سے پورا کرنے کے لئے جا رہا ہے —"

"مگر آپ نے اُن کی گفتگو کیسے سمجھی۔ مجھے بھی بتلائیے۔ وہ ضد کرتے ہوئے بولی —" آپ کو بتانا ہی پڑے گا —

" راجہ ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ مگر جلد ہی کچھ سوچ کر بولا۔ نہیں اس میں میری جان کا خطرہ ہے —"

مگر رانی نے اس کی ایک نہ مانی - اور محل میں جاکر رُوٹھ گئی اور تین دن تک اس نے کھانا تک نہیں کھایا - راجہ کے لاکھ سمجھانے پر بھی وہ نہ مانی اپنی ضد پر اڑی رہی -

"اگر تمھارا یہی ارادہ ہے کہ میں زندہ نہ رہوں تو پھر میں تیار ہوں" راجہ نے رانی کو پاس بُلا کر کہا --- گنگا کنارے ہی پہنچ کر میں بتاؤں گا - تاکہ مرکر گنگا ماتا کی گود میں چین سے سوؤں ---"

دوسرے روز صبح ہوتے ہی فوج کو کوچ کا حکم ملا - اور سب لوگ خراماں خراماں گنگا ندی کی طرف چل پڑے - راستے ہی میں شام ہوگئی - راستے میں ایک جنگل پڑتا تھا - راجہ کے حکم سے وہیں پڑاؤ ڈال دیا گیا -

راجہ کو صبح کے وقت ٹہلنے کا بہت شوق تھا - دوسرے روز صبح سویرے ہی وہ ٹہلتا ہوا کیمپ سے کچھ دُور نکل گیا - ابھی آفتاب نکلنے میں کافی دیر تھی -

یکایک اس کی نظر ایک مُرغ پر پڑی جو اپنے جوڑے کے ساتھ دانہ چُگ رہا تھا - وہ دونوں آپس میں گفتگو کر رہے تھے - راجہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب ہی ایک درخت کی آڑ میں چُھپ رہا - اور غور سے اُن کی باتیں سننے لگا -

مُرغی بولی - میاں مُرغے سُنا ہے اس جنگل میں کسی راجہ نے پڑاؤ ڈالا ہے

"ہاں ! --- اس نے روکھے پن سے جواب دیا

"چلو چل کر دیکھیں کیسا راجہ ہے ؟ وہ اپنا پر پھیلاتی ہوئی بولی میں نے کبھی کسی راجے کو نہیں دیکھا ہے ---"

"نہیں --- وہ چیخ کر بولا --- میں نہیں جاؤں گا - وہاں جاکر مجھے اپنی جان نہیں گنوانی ہے ---"

اس میں جان گنوانے کا سوال ہی کہاں ہے ؟ --- اُس نے اپنی لمبی سی گردن قدرے اوپر اٹھا دی --- دُور ہی سے دیکھ لیں گے"

میں وہاں ہرگز نہیں جاؤں گا - وہ روکھے پن سے بولا - وہاں راجہ کے لوگ تاک میں بیٹھے ہوں گے اور ہم لوگوں کو دیکھتے ہی جان سے مار ڈالیں گے -"

لیکن مُرغی نے اس کی ایک نہ مانی اور ضد کرنے لگی - اس پر میاں مُرغے کو غصہ آگیا - وہ چلّا کر بولا

"سیدھے گھر کو چل ورنہ مارے چونچوں کے تیرا بھُرکس نکال دوں گا - کیا میں بھی اس راجے کی طرح بیوقوف ہوں جو ذرا سی بات پر اپنی جان گنوانے آیا ہے --- اُسے غصہ آگیا تھا -

اس پر مُرغی سٹ پٹا سی گئی اور مرغے کے ساتھ ساتھ گھونسلے کی طرف لوٹ گئی -

مُرغے کی بات کا راجے پر گہرا اثر پڑا - وہ وہاں سے سیدھا اپنے خیمے میں آیا اور آتے ہی اس نے واپس راجدھانی لوٹ چلنے کا حکم سُنا دیا -

رانی حیرت زدہ ہوکر بولی --- کیوں ؟ خیر تو ہے - کیا گنگا کنارے چلنے کا ارادہ ملتوی کر دیا آپ نے ؟---"

"ہاں" --- اُس نے کہا --- اب میں نے ارادہ بدل دیا ہے ---"

تو پھر آپ نے وعدہ ہی کیوں کیا تھا؟" --- وہ پھر ضد کرنے لگی - آپ کو جانا ہی پڑے گا ---"

راجے پر مُرغے کی بات پوری طرح اثر کر چکی تھی - اس نے طیش میں آکر اپنی تلوار میان سے باہر نکالتے ہوئے کہا -

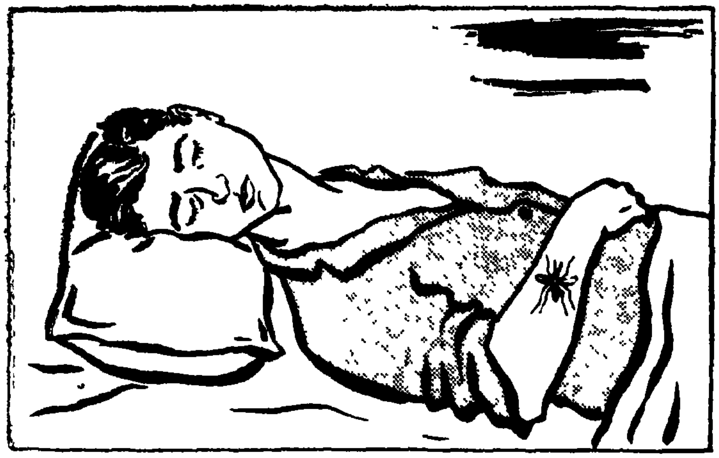
"خبردار اگر پھر دوبارہ تم نے گنگا کنارے جانے کا نام بھی لیا تو تمھاری خیر نہیں - یہ تلوار اور تمھارا سر ہوگا - جب تم کو میری زندگی پیاری نہیں تو پھر میں تمھاری زندگی کی کیوں پروا کرنے لگا ---"

یہ سُن کر رانی کے حواس اُڑ گئے اور وہ مارے خوف کے کانپتی ہوئی بولی --- "معاف کیجئے مہاراج ! میں تو آپ کو آزما رہی تھی --- اور وہ راجہ کے قدموں میں گر گئی -

مُرغے سے نصیحت لے کر راجے نے اپنی جان بچائی اور اپنی راجدھانی کو واپس آگئے -

سلیم مبشر علی

ملیریا اور سر رانلڈ راس



بچو! کیا تمھیں معلوم ہے کہ ملیریا بخار کے جراثیم کون سے ہیں؟ مچھر ـــــ اب سوال یہ ہے کہ مچھر میں کون سے جراثیم ہیں جو ملیریا پھیلاتے ہیں اور ان کو سب سے پہلے کس نے معلوم کیا۔ مچھر کے معدے میں سفید سفید ریشوں کے درمیان کچھ سیاہ سے نقطے نظر آتے ہیں یہی نقطے وہ جراثیم ہیں جو ملیریا پھیلاتے ہیں۔ ان کو سب سے پہلے رانلڈ راس نے معلوم کیا۔

راس کی پیدائش ۱۳ر مئی ۱۸۵۷ء کو المورہ میں ہوئی۔ لندن کے ایک مشہور ہسپتال میں آپ نے ڈاکٹری سیکھی اور ۱۸۸۱ء میں بحیثیت ایک سول سرجن کے انڈین میڈیکل سروس میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں ہندوستان، جنوبی افریقہ، یونان اور اٹلی وغیرہ میں ملیریا کی کثرت تھی۔ سائنس والوں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ جراثیم ملیریا کا باعث ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ اس وقت تک کچھ نہ معلوم ہو سکا تھا۔ ملیریا کے معنی ہیں خراب ہوا کے اور اس وقت لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ بیماری خراب اور مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے پھیلتی ہے۔ فرانس کے مشہور سرجن لیوران نے پہلی مرتبہ معلوم کیا کہ ملیریا مچھروں سے پھیلتا ہے۔ لیکن اس کے آگے وہ کچھ نہ بتا سکا۔ ۱۸۷۷ء میں مینسن نے مچھروں کے پیٹ کے جراثیم معلوم کئے۔ اس نے اس سلسلے میں سر رانلڈ راس سے بھی مشورہ کیا۔ راس نے ۱۸۹۲ء میں اپنے تجربات شروع کئے۔ اس وقت وہ ہندوستانی میڈیکل سروس میں سول سرجن تھا۔ اس کے پاس تجربات کے لئے کوئی سامان نہ تھا۔ اس کے احباب اور افسر اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اُنھوں نے راس کا نام ملیریا رکھا تھا۔ اس کے تبادلے کثرت سے ہوتے رہتے تھے۔

ملیریا کے جراثیم اپنی زندگی میں بہت مختلف ہوتے ہیں۔ جو شکل ان کی انسان کے خُون میں پائی جاتی ہے وہ صرف خُون ہی کے لئے مخصوص ہے۔ اس کے سامنے کٹھنائی یہ تھی کہ وہ مچھروں کے بدن میں ان جراثیم کا ہونا کیسے ثابت کرے۔ مچھروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو عام طور پر گھاس میں ملتی ہے اور (Culex) کہلاتی ہے۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ دیوار پر بیٹھے ہوئے اس کا سر اور جسم دیوار سے برابر فاصلے پر رہتا ہے۔ دوسری قسم کے مچھر (Anophles) کہلاتے ہیں۔ یہ جب بیٹھتے ہیں تو سر اور دُم برابر فاصلے پر رہتی ہے لیکن بدن ذرا دُور رہتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کُبڑے ہوتے ہیں۔ راس نے ابھی تک پہلی قسم کے مچھروں پر تجربے کئے تھے۔ دوسری قسم کے اس کے پاس صرف دو مچھر ایک چھوٹی سی شیشی میں محفوظ

تھے۔ ۱۸۹۷ء میں ۲۰ اگست کو وہ سکندر آباد کے اسپتال میں ایک کمرے میں اسی سلسلے میں کچھ تجربے کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دوسری قسم کے مچھر کے معدے میں سفید سفید ریشوں کے درمیان کچھ سیاہ سے نقطے موجود ہیں۔ یہ نقطے اس کے لئے بالکل نئے تھے۔ اس نے کچھ اور تجربات کر کے یہ ثابت کر دیا کہ یہی وہ جراثیم ہیں جن سے ملیریا پھیلتا ہے۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ یہی جراثیم معلوم کرنا چاہتا تھا۔



۱۸۹۹ء میں اس نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور انگلستان چلا گیا۔ وہاں لورپول کالج میں کچھ دنوں تک لیکچر دیتا رہا اور اس کے بعد لندن میں پروفیسر ہو گیا۔ اس کو راس انسٹیٹیوٹ کا انچارج بنا دیا گیا۔ ۱۹۰۲ء میں اس کو نوبل پرائز دیا گیا۔ اسی سال اس نے گرم ملکوں کا دورہ کیا اور ملیریا کی روک تھام کے لئے تدابیر بتلائیں۔ اس نے ملیریا پر کئی کتابیں لکھیں اور سائنس کے مشہور رسالہ Science Progress کا اڈیٹر بھی رہا۔ اس کو بہت سے خطابات اور ڈگریاں دی گئیں جن کا وہ بجا طور پر مستحق تھا۔ ۱۹۱۱ء میں اس کو "سر" کا خطاب ملا اور جنگ عظیم کے زمانے میں وہ "افسر برائے ملیریا" بنا دیا گیا۔ لیکن اتنی شہرت حاصل کرنے کے بعد بھی افسوس کا مقام ہے کہ اس کی زندگی بہت تنگی میں بسر ہوئی۔ ۱۹۳۱ء میں انگلستان کے چند مشہور آدمیوں نے اس کے لئے چندے کی اپیل شائع کی۔ اور ۱۵۰۰۰ پونڈ کے قریب چندہ جمع ہو گیا۔ اس درمیان میں راس پر فالج گرا اور وہ بہت کمزور ہو گیا۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۲ء کو ملیریا کے جراثیم کے پہلی دفعہ دریافت کرنے والے نے اس دنیا سے کوچ کیا۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ اجتماعی ترقی کے پروجیکٹوں اور زرعی توسیع کے پروگراموں سے کتنے دیہاتی فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

ہر آٹھ دیہاتیوں میں سے ایک

۲۔ ہندوستان کے پانچ سالہ پلان میں مختلف ریاستوں کے لئے آبپاشی کی ایک سو چالیس اور بجلی کی ایک سو اسکیمیں شامل ہیں اُن پر کیا لاگت آئے گی۔

سات ارب پینسٹھ کروڑ روپے

۳۔ سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (تحقیقات عمارت کا مرکزی ادارہ) کہاں واقع ہے؟

رُڑکی

۴۔ گذشتہ سال کے مقابلے میں ۵۳-۱۹۵۲ء میں غلّے کی پیداوار میں کتنے ٹن کا اضافہ ہوا؟

۵۰ لاکھ ٹن

۵۔ ہندوستان میں گرام سیوک کے تربیتی مرکزوں کی تعداد کیا ہے؟

۳۴



۳ ستمبر سے
تمام بڑے بڑے شہروں میں...
بُہت دِن ہوئے
بُہت دِن پہلے کی، بُہت دِنوں تک
یاد رہنے والی عظیم کہانی

ترتیب

بچّوں کا آج کل

سرورق :- "ہم کوزہ و ہم کوزہ گر و ہم گِلِ کوزہ"

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر :- **جوش ملیح آبادی** (رخصتی)

ایڈیٹر :- **بال مکند عرش ملسیانی** (قائم مقام)

جلد ۱۳ ——— نمبر ۲

سالانہ چندہ :-	ہندوستان میں :- چھ روپے پاکستان میں :- چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے :-	نو شلنگ یا ایک ڈالر
فی پرچہ :-	ہندوستان میں :- آٹھ آنے پاکستان میں :- آٹھ آنے (پاک)

ستمبر ۱۹۵۴ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

شمیم کرمانی

شعر

کس طرح دُنیا کو سمجھاؤں سخن کیا چیز ہے
شعر کس احساس کو کہتے ہیں فن کیا چیز ہے
خون کے ہمراہ دل میں شعلہ زن کیا چیز ہے
جو کرے شاعر کو پاگل وہ لگن کیا چیز ہے

کن رگوں میں خونِ دل بن کر رواں ہوتا ہے شعر
کتنے اشکوں کا لہو پی کر جواں ہوتا ہے شعر

دل میں ارمانوں کا پیہم جگمگانا شعر ہے
بے پیے کچھ جھومنا کچھ ڈگمگانا شعر ہے
اجنبی سی آگ سینے میں لگانا شعر ہے
خود نہ سونا شاعری، اُن کو جگانا شعر ہے

عشق جاگے وقتِ تنہائی تو بن جاتا ہے شعر
حُسن اُٹھے لے کے انگڑائی تو بن جاتا ہے شعر

ہر رگ و پے میں طلسمی سرسراہٹ شعر ہے
دل کی بے چینی، لہو کی سنسناہٹ شعر ہے
بن کے آنسو جو گرے وُہ مسکراہٹ شعر ہے
دل دھڑک اُٹھے جس آہٹ پر وُہ آہٹ شعر ہے

شب کا سنّاٹا، ترنّم بن کے ہو جاتا ہے شعر
لمحۂ تسکیں تلاطم بن کے ہو جاتا ہے شعر

پھُولتا ہے آسماں پر جب شفق کا لالہ زار
سیر کو باہر نکلتے ہیں غزالانِ دیار
ڈوب جاتی ہے ہجومِ رنگ و بُو میں رہگزار
اُس گھڑی دو نوجواں آنکھیں جو ہو جاتی ہیں چار

دل دھڑک اُٹھتے ہیں، دل کو گُدگُدا دیتا ہے شعر
کانپ جاتی ہیں نگاہیں، مُسکرا دیتا ہے شعر

اوّلیں صبح جب دوشیزگی بنتی ہے ماں
کرب سے تخلیق کے ہونٹوں پہ آ جاتی ہے جاں
نیل گُوں رُخسار پر اُڑتا ہے زلفوں کا دُھواں
الغرض جب کشمکش سے چھوٹ جاتی ہے کماں

ماں نظر کرتی ہے بچّے پر اُسی انداز سے
نقش کو جیسے مصوّر دیکھتا ہے ناز سے

شعر ہے وہ سینۂ کہسار کا سیمیں لہُو
وادیوں میں جو رواں ہوتا ہے بن کر آبجُو
آبشاروں کے ترنُّم سے جو پاتا ہے نمُو
چشمہ و دشت و شفق دیتے ہیں جس کو رنگ و بُو

کر کے مضطر مہ وشانِ نادنی و دیہات کو
لا کے چشمے پر بٹھاتا ہے جو آدھی رات کو

جنگلوں میں نُور برسانے لگے جب چاندنی
دیدنی ہوتی ہے بن باسی محبت کی خوشی
دُور اک وادی میں بجتی ہے وہ دل کش بانسری
نیند سے گھبرا کے جاگ اُٹھتی ہے دوشیزہ کوئی

شعر یُوں لیتا ہے انگڑائی دلِ سرجوش میں
حُسن رکھ دیتا ہے سر کو عشق کے آغوش میں

صبح کے تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں اک مہ جبیں
رخصتِ عاشق سے ہوتی ہے جو ناشاد و حزیں
عارضِ گلرنگ پر رکھ کر گلابی آستیں
سُرمہ سا آنکھوں سے ٹپکاتی ہے اشکِ آتشیں

دردِ ہجراں میں وہ مُنہ اشکوں سے دھونا شعر ہے
حُسن کا عشقِ سراپا بن کے رونا شعر ہے

عشق میں جب زہر کھا لیتی ہے کوئی نازنین
کانپتے ہیں بازوئے سیمین و ساقِ یاسمین
لوٹنے لگتی ہے خاک و خوں میں زلفِ عنبریں
زرد ہو جاتی ہے گل پیکر حسینہ کی جبیں
وہ ادائے جاں کنی و جاں فشانی شعر ہے
وہ بہارِ حسنِ مرگِ نوجوانی شعر ہے

شعر ہے وہ جذبۂ مستانۂ اہلِ جنوں
دشت و صحرا کو جو دیتا ہے پیامِ لالہ گوں
جس کے تیشے کی دمک میں وہ دلِ سوزاں کا خوں
بن کے جوئے شیر بہہ جاتا ہے کوہ بیستوں
بیستوں اک خواب تیشہ خواب کی تعبیر ہے
کوہکن کا شورِ رنگیں ہے کہ جوئے شیر ہے

تولتا ہے تیشۂ تخلیق جس دم کوہکن
پتھروں میں دوڑنے لگتی ہے روحِ شعر و فن
پھوٹتی ہے سنگِ خارا سے تبسم کی کرن
جاگتے ہیں کروٹیں لے کر بتانِ سیم تن
جلوہ گاہِ نازِ جانانہ بنا دیتا ہے شعر
ڈھال کر تیشے کو بت خانہ بنا دیتا ہے شعر

اور بت خانے میں شمعِ دلبری بنتا ہے شعر
نقشِ مانی و بتانِ آذری بنتا ہے شعر
کافرانہ حسن کی جلوہ گری بنتا ہے شعر
حورِ جنت میں تو دنیا میں پری بنتا ہے شعر
حسن گو پرتو فگن ہے روح پر تو شعر ہے
بت کدہ وہ شمع ہے جس شمع کی لو شعر ہے

شعر بننا چاہتا ہے جب دیار و قصر و باغ
پتھروں میں دل، چٹانوں میں بناتا ہے دماغ
ڈھالتا ہے سنگ کے سینے سے مینا و ایاغ
کوہساروں میں جلاتا ہے اجنتا کا چراغ
شمعِ عشق و مشعلِ ناموس بن جاتا ہے شعر
تاج کا اک مرمریں فانوس بن جاتا ہے شعر

پربتوں کو خوش نما ایل بنا دیتا ہے شعر
کوہ کو تلبیٹ اجر کو جبل بنا دیتا ہے شعر
کنکروں کو پار کر کا جبل بنا دیتا ہے شعر
پتھروں کو ریشمی آنچل بنا دیتا ہے شعر
ڈھال کر ہیئت کو چشم و گیسو و موباف میں
کوہ کو تبدیل کر دیتا ہے کوہِ قاف میں

خار و خس کو گیسو و کاکل بنا دیتا ہے شعر
دشت و در کو بزمِ جام و گل بنا دیتا ہے شعر
جزو کو دیتا ہے وسعت کل بنا دیتا ہے شعر
درمیانِ خاک و انجم پل بنا دیتا ہے شعر
اور اس پل پہ قدم پڑتے ہیں جب تخئیل کے
روحِ شاعر کو ہوا دیتے ہیں پر جبریل کے

اتفاقاً ایسا بھی ہوتا ہے میانِ کائنات
مفلسوں نے [illegible] رکھتی ہے رات
بھوک سے روتی ہے بیوہ ماں کے بچوں کی حیات
پھیرتی ہے مامتا ترستے ہوئے بچوں پہ ہات
بے نوا بچوں کی ناداری کی صدا بنتا ہے شعر
فاقہ مستوں کو غذائے خوش مزہ بنتا ہے شعر

بھوک سے جب روحِ انساں کھا رہی ہو پیچ و تاب
بن چکا ہو سینہ طوفانوں کا اضطراب
شعر بن جاتا ہے لب پہ نعرۂ مستِ شباب
زندہ باد اے انقلاب اے انقلاب اے انقلاب
تنگ پا کر روحِ آدم پر فضائے زندگی
شعر پرچم کو اٹھاتا ہے برائے زندگی

ناخدا و بادبان و کشتی و شب ہائے تار
لالہ زار و آبشار و کوہسار و جوئے بار
ریگ زار و گرد باد و صرصر و دشت و غبار
کاروان و سارباں و ناقہ و ناقہ سوار
قریہ و شہر و دیار و وادی و جیحوں ہے شعر
گیسوئے لیلیٰ و گردِ وحشتِ مجنوں ہے شعر

محمد اجمل خان

ایران کا قومی ترانہ

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے (غالب)

تصوّرات کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ کسی کا نام زبان پر آیا اور ذہن نے اس کی تصویر بنا ڈالی۔ علم النفس کی زبان میں اسے قانونِ تجانستِ افکار Law of Association کہتے ہیں۔ یعنی ایک فکر یا تصور سے دوسرا ہم جنس تصور سامنے آ جاتا ہے۔ اگر گلاب کو دیکھ کر چمن یاد آ جائے تو گویا گل کا ہم جلیس یاد آیا۔ اسے نفسیات والے قانونِ قربت Law of Contiguity یا تجنیس قریب کہتے ہیں۔ ہمارے شعرا نے اس قانون کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ مثلاً ذیل کے خط کشیدہ لفظوں کی تجنیس پر غور فرمائیے۔

۱) سرِ بُرِیدہ مفت نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے — کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا (غالب)
۲) عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا (غالب)
۳) ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا (")
۴) ہمیں کو ملا درہم و داغِ عشق — یہ دولت کسی کو نہ حاصل ہوئی (صبا)
۵) ہاتھوں میں یار کے نہیں ساغرِ شراب کا — دستِ مسیح میں ہے قدح آفتاب کا (آتش)
۶) خود گلا کاٹوں اگر خنجر عنایت کیجئے — دیکھنے دکھ جائے گی نازک کلائی آپ کی (ظفر)
۷) با احتیاط گزر از شکارگاہِ جہاں
گماں مبر کہ ترا از کمیں نمی بینند (کاہی نیشاپوری)
۸) تا نباشد غنچہ در اوّل، گل آخر نشگفد
کلفتِ امروز بہر عشرتِ فردا خوش است (عزت شیرازی)
۹) تا چند دیر و کعبہ بخواں ایں فسانہ را — ہمچوں کماں حلقہ یکے کن دو خانہ را (سلیم)
۱۰) دلم ز وعدہ بر آتش فگندی و رفتی — بیا کہ سوختن ایں کباب نزدیک است (حزیں)
۱۱) اے دلے برا سیرے کز پا درفتہ باشد — در دام ماندہ باشد، صیاد رفتہ باشد (حزیں)
۱۲) آہ تو فاش می کند عشقِ نہفتہ را حزیں — دود دلیل می شود آتشِ ناپدید را (")

اب ذرا اُن شعروں پر نظر ڈالیے جن میں تجنیس بعید یعنی ایک دُور کی مماثلت کی وجہ سے ہے۔ جسے نفسیات والے قانونِ مماثلت Law of Similarity بھی کہتے ہیں۔

(۱) غمِ دنیا سے گر فرصت بھی پائی سر اٹھانے کی
فلک کو دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی (غالب)
(۲) دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا (")
(۳) ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا (")
(۴) غیر لیں محفل میں بوسے جام کے — ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
(۵) میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے (میر)
(۶) سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں (غالب)
(۷) تیری فرصت کے مقابل اے عمر — برق کو پا بحنا باندھتے ہیں (")

بہر حال گل سے بلبل، بلبل سے بہار، بہار سے بادہ و صبا، پھر واعظ و محتسب اور اس کے بعد غالب کا یہ شعر محض تسلسل و تجانستِ افکار کی وجہ سے ذہن میں آ جاتا ہے کہ ؎

سرپائے خم پہ چاہیئے ہنگامِ بیخودی — رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

یا اگر بہار کے تصور سے آپ کے عواطف و امیال، بادہ پیمائی کو بادہ نوشی میں تبدیل نہیں کر سکتے تو آپ "ایران" کا نام لے لیجئے۔ اب آپ کے افکار و تصورات میں ایک ہیجان نہیں، ایک زلزلہ آ جائے گا۔ اور آپ غالب کے ہمنوا ہو کر کہنے لگیں گے۔

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار — رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

ایران کی تاریخ نہ صرف آریوں کے تمدن و معاشرت کی تاریخ ہے، بلکہ یہ اُن تمام قدروں کی تاریخ ہے جو آریہ نسل کے لوگوں نے اپنے پیشروؤں یعنی سامیوں۔ مصریوں۔ بابلیوں۔ فونیقیوں حتیوں۔ آشوریوں سے لیں اور پھر اپنے خیالات کا رنگ چڑھا کر دنیا میں عام کیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسیح سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے آریوں کو گھوڑے اور لوہے کا استعمال معلوم ہو چکا تھا، اور مسیح سے چھ سو سال پہلے میدیوں اور ایرانیوں نے مل کر آشوریوں کا وہ شہر بھی نے وا، فتح کر لیا تھا، جس کو ہدایت کرنے کے لئے یونسؑ نبی کو خدا نے بھیجا تھا۔ کوی روش Cyrus نے (کوی سنسکرت اور اوستا دونوں میں شاعر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے) ۵۳۸ء قبل مسیح میں بابل بھی فتح کر لیا تھا۔ لیکن اس کی رواداری ہے یا عدم توجہی کہ اُس نے بابل کو مختلف لعلوں (دیوتاؤں یا سورج کے مختلف بتوں) کی پرستش پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ یہ فتح پرامن طریقے پر ہوئی، اسی لئے فاتح اور مفتوح دونوں اپنے اپنے رسم و رواج اور دین و مذہب پر قائم رہے۔ یعنی سامی نسل کے میدی اور آرین نسل کے ایرانی مل جل گئے۔ سندھ سے مصر تک آرین صنعت و تجارت و سیاست اپنا سکہ جما چکی تھی اور بڑے بڑے شہر مثلاً پرسے پولس، اکباتا اور سوسا وغیرہ پیدا ہونے لگے تھے۔ یہی زمانہ تھا کہ جنگ اور تجارت کی ضروریات نے ایرانیوں کو اچھی سڑکیں بنانے اور سکہ کو تبادلے کا ذریعہ بنانے پر مجبور کیا۔ سفر اور خبر کی آسانیوں میں گھوڑوں کی ڈاک نے بہت مدد دی اور دور افتادہ آبادیاں بھی شہری تمدن سے بہرہ اندوز ہونے لگیں۔

زینا۔ دین۔ دھما۔ دھرم

سامی اور آرین اقوام کے پرامن امتزاج نے ایک ایسی نسل کی بنیاد ڈالی جو دونوں کی خوبیوں کی حامل تھی۔ کوی روش کی مذہبی رواداری کا یہ اثر ہوا کہ بابلی شمس و کواکب پرستی، آرین عناصر پرستی میں مل جل کر ایک ہو گئی۔ اب مصر کا "را" بابل کا "لعل" اور اوستا کا "خوریہ" (یعنی خورشید) اس ذات کا مظہر بن گیا۔ جو اہورا مزدا یعنی نورِ محض تھا۔ یہی لفظ خوریہ بن کر آریوں کی زبان میں سوریہ (سورج) روی، ربی اور رب بن گیا۔ یہی نہیں بلکہ نورِ محض یعنی ہرمز کی روشنی میں چلنے والوں نے "راستے یا سڑک" کے لئے جو نام تجویز کئے وہ بھی تقریباً ایک ہی تھے۔ سامی زبان میں "دین" کا لفظ "سڑک" کا ہم معنی ہے۔ یہی لفظ اوستا میں "دینا" ہے۔ سنسکرت میں "دھرما" اور پالی میں "دھما" ہے۔ رفتہ رفتہ اسی سڑک صراط یا راستے کے تصور نے، جو آریوں نے تجارتی ضروریات کے لئے بنائے تھے، یہ بات ظاہر کر دی کہ بعض راستے منزلِ مقصود تک بے خرخشے پہنچا دیتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن پر رہزنوں کو اکے دُکے کی خیر منانے کا موقع ملتا ہے۔ اسی تصور نے یہ بات سمجھائی کہ زندگی کی پر پیچ و خم وادیوں سے گزرنے والوں کو چاہیئے کہ حرص و ہوا، کبر و کینہ یعنی کام کرودھ اور لوبھ کو سب سے بڑا رہزن اور ظلمت و تاریکی کا پیامبر یا اہرمن و شیطان کا نمائندہ سمجھیں۔ گویا راستے کے تصور نے رہزن، اور رہزن کے تصور نے اہرمن کا نقشہ بنایا، اور یہ بتایا کہ محفوظ راستے پر چلنے کے لئے روشنی ضروری ہے۔ تاریکی کے دیوؤں سے بچنے کے لئے روشنی کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر بے خوف و خطر زندگی کی دشوار گزار راہ کو محفوظ بنایا جا سکتا ہے۔ زمانہ گزرتا رہا اور دین، یعنی قانونِ حیات بتلانے والوں نے مختلف ہتھیاروں کی خوبیوں کو بیان کرنا شروع کیا۔ کوئی بولا کہ سچائی کا ہتھیار سب سے اُتم ہے۔ کسی نے کہا عدالت (نیائے) پر زندگی کا دار و مدار ہے۔ کسی نے اخوت، ہمدردی، محبت و رحمت کو آرین مارگ (دین قدیم) بتایا اور کہا کہ سب کے بھلے میں اپنا بھلا ہے۔ کوئی یہ سمجھا کہ زندگی بسر کرنے کا سب سے نزدیکی بھید (اُپ نشد) یہ ہے کہ وحدت وجود کے تصور سے مسلح ہو کر رہروی اختیار کرے۔ یہی آشہ۔

آرش۔ آرت۔ ایرتیہ، ریتہ، ریت، ستریت Street

سطراتا Strata صراط، یا "راہ" زندگی ہے۔

لیکن زندگی کی راہ بتانے والوں نے مسافروں کو عجب مخمصے میں ڈال دیا۔ نہ جانے کیوں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو کویوں اور موبدوں (یعنی شاعروں اور پروہتوں) کی لوٹ کھسوٹ سے چھٹنے کے لئے خود سوچ بچار کی آزادی چاہنے لگے۔ دو جماعتیں بن گئیں جو نہ صرف یہ کہ اپنے اپنے راستے کو سچا کہتی تھیں بلکہ دوسرے کے راستے کو غلط بتاتی تھیں۔ حتیٰ کہ وہ زمانہ آ گیا کہ ہر ایک جماعت نے اپنے

اپنے مخصوص دیوتا بنا لئے۔ اور دوسرے کے دیوتاؤں کو شیطان کہنے لگے۔ خود اپنے کو راہِ راست پر چلنے والے، اصحاب الیمین یا دکھن مارگی Rightist بتانے لگے۔ اور مخالفوں کو بدراہ، اصحاب الشمال یا بام مارگی Leftist بتانے لگے۔ ایک اپنے معبود کو دیوتا کہتا تو دوسرے کے معبود کو اسُر (یا آہور) بتاتا تھا۔ حتّٰی کہ یہ لفظ جب یورپ پہنچا تو دیو بمعنی یزداں Dieu بھی کہا جانے لگا، اور اہرمن Devil بھی اسی مادہ سے بن گیا۔ حتّٰی کہ یونان میں لذّت پرستی Hedonism وخود پرستی کا وہ فلسفہ ابھرا جو ہند میں بام مارگیوں نے رائج کیا تھا۔ یعنی نجات کا واحد ذریعہ شہوت رانی۔ بادہ کشی و گوشت خوری ہے اور بہترین طریق Track یا کیش، وہ رسم و راہ مانی گئی جو انسان کو حال میں خوش رکھے اور ماضی و مستقبل کی فکر سے بے نیاز کر دے۔ بقول خیام ؎

روزے کہ زتو گزشتہ شد یاد مکن   فردا کہ نیامداست فریاد مکن
از آمدہ و گذشتہ بنیاد مکن   حالا خوش باش و عمر برباد مکن

یعنی

دریاب کہ از روح جدا خواہی رفت   در پردۂ اسرار خدا خواہی رفت
مے خور کہ ندانی ز کجا آمدۂ   خوش باش ندانی کہ کجا خواہی رفت

مخلوط زبان یا اردو

ہم نے اوپر دیکھا کہ سامی اور ایرین تمدّن کے اختلاط نے نہ صرف ایک مخلوط تمدّن پیدا کر دیا بلکہ ایک مخلوط زبان بھی پیدا کر دی۔ جو وسط ایشیا سے "قدیم ایرین" کے نام سے یورپ اور پنجاب تک جا پہنچی۔ اور مقامی بولیوں سے مل جل کر نئی زندگی اور نیا رنگ ڈھنگ اختیار کرتی رہی۔ ایرین تمدّن مسیح سے ہزار سال پہلے یونان پہنچ چکا تھا۔ اس زمانے میں حضرت سلیمانؑ کی سلطنت عروج پر تھی۔ یونانی ایرین زبان میں وہ رزمنامے ۸۰۰ ق۔م میں لکھے جا چکے تھے۔ جنھوں نے یونانیوں کو ایک قوم بنا کر اُنھیں شجاعت و حماست کے وہ عالمگیر اصول بتائے جو سامی نسل کے چرواہے یعنی عمالقہ مصریوں کو بہت پہلے سکھا چکے تھے، اور جن کی جھلک بائبل کی کہانیوں میں پیدا ہو چکی تھی۔ اس طرح نہ صرف ایک "اردو" تمدّن بن رہا تھا بلکہ ایک مخلوط زبان بھی مشترک معاشی دینی اور جنگی تصوّرات کے لئے پیدا ہو رہی تھی۔

سکندر نے ۳۲۳ ق۔م۔ میں یونان سے ہند تک جو فتوحات کی تھیں اُن کا یہ اثر ہوا کہ یونانی سپاہی ہر ملک میں بس گئے۔ یعنی نئے آریوں نے پُرانے آریوں کے تمدن سے لین دین شروع کر دیا۔ نہ صرف یونانی معمار و سنگتراش اپنا اثر پھیلانے لگے بلکہ فنونِ لطیفہ کی جان، یعنی شعر و شاعری بھی سقراط (ف ۳۹۹ ق۔م)، افلاطون (ف ۳۴۷ ق۔م) اور ارسطو کے فلسفہ کو زردشت و گوتم بدھ کے تصوّرات سے ملا کر رزم و بزم کے ہر پہلو کو نمایاں کرنے لگی۔ اور تجارت کی گرم بازاری نے سکندریہ سے مکّہ اور بلخ سے کاشی تک اُقلیدس کی جیومیٹری (ریکھا گنتی)، ہپارکس کے نجوم و جیوتش اور افلاطونس کے ویدانتی تصوّف سے مل جل کر ایک ایسی زبان پیدا کر دی جسے اُس زمانے کی "اردو" کہا جا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ اُس زمانے میں چندر گپت موریہ کے پوتے اشوک (۲۷۴ ق۔م) کی حکومت کابل سے مدراس تک تھی، اور گوتم بدھ کا آرین مارگ (دین قدیم) بلخ سے سکندریہ تک سفر کر چکا تھا، یعنی ہند کی قدیم آرین زبان سنسکرت بن کر ایک مخصوص جماعت کی زبان بن چکی تھی۔ اور عوامی زبان "پالی" ہو گئی تھی جس میں اشوک کے اکثر کتبات لوہے اور پتھر کی لاٹھوں پر کندہ کئے جاتے تھے۔ اسی طرح ایران میں اوستا سے پاردوی یعنی پہلوی زبان بنی تھی جس میں یونانی و تورانی (یعنی خراسانی یا پاردوی) لفظوں نے اوستا کو پہلوی بنا دیا اور آخر کار چند صدیوں کے اندر پہلوی بھی فارسی بن گئی۔

دارا کے وقت تک پوری متمدن دنیا پر ہنمانشی خاندان کا قبضہ رہا۔ لیڈیہ، بابل، باختر، مصر غرضکہ سندھ سے ڈینیوب تک ۵۲۱ ق م سے ۳۳۱ ق م تک ایک ملا جلا تمدن پھیلتا رہا، اور ایک اردو زبان بنتی رہی۔ پھر ۲۵۰ ق۔م تک پاردیہ (خراسان) کے پہلوی بولنے والوں نے رومن سامراج کے بڑے بڑے جرنیلوں پمپے، جولیس سیزر، ٹراجن وغیرہ کو شکست پر شکست دے کر پہلوی زبان و تمدن کو ہند سے مصر تک محفوظ کر لیا اور مخلوط زبان و تمدّن ترقی کرتا رہا۔

دوسری اُردو

ساسان کے پوتے اردشیر نے ۲۲۶ء میں پاردیہ والے

تورانیوں کو نکال دیا اور ساسانی خاندان کو چار سو سال تک پہلوی کی جگہ فارسی زبان کو بنانے کا موقع دیا۔ اسی زمانے میں مانی پیدا ہوئے، زردشت کا دین پھر زندہ کیا گیا، اور شاپور، بہرام گور، نوشیروان اور خسرو پرویز کے نام تاریخ میں داخل ہو گئے۔ اگرچہ ان کی روما الکبریٰ سے دائمی جنگ جاری رہی لیکن ہند اور چین سے برابر خوشگوار تعلقات قائم رہے۔ پہلوی سے جو فارسی بنی اُس کا عظیم الشان لٹریچر آج تک باقی ہے، اور برابر ترقی کر رہا ہے اور اپنے اثرات چھوڑتا جا رہا ہے۔

این کہنہ رباط را کہ عالم نامست — آرامگہ ابلق صبح و شام است
بزمیست کہ واماندۂ صد جمشید است — گوریست کہ تکیہ گاہ صد بہرام است

'وخشور بزرگ ایران، یعنی جناب زردشت اسپنتمان کے متعلق عہد حاضر کے شاعر ایران عارف قزوینی فرماتے ہیں۔

بنام آنکہ در شانش کتاب است — چراغ راہ دینش آفتاب است
مہین دستور دربار خدائی — شرف بخش نژاد آریائی
دو تا گردیدہ چرخ پیر را پشت — پئے پوزش بہ پیش نام زردشت

یاد رکھئے کہ یہ کلام اس زمانے کا ہے جبکہ ہزار بارہ سو سال سے پورے ایران پر اسلام چھا چکا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زبان و تمدن کی ترقی میں مذہبی تعصبات کارفرما ہوتے ہیں وہ اس کلام کو پڑھ کر اپنے نظریات کی تغلیط کر سکتے ہیں۔ ہر قوم چار و ناچار اُس تمدن کو اپناتی ہے، اور اُس زبان کو اختیار کرتی ہے جو اُس کی زندگی کی قدروں کو زیادہ آسانی سے نمایاں کر سکے اور قدامت پرستی کے بندھن سے نکال کر ترقی کی راہ پر ڈال دے۔

قدیم آریوں نے بھی یہی راستہ ہند میں اختیار کیا اور دراوڑ قوموں سے شیو پرستی سیکھی اور اُنھیں ایرانی خورشید و آتش پرستی سکھائی۔ پھر سنسکرت کو عوام سے محفوظ رکھنے کے لئے ایسی پراکرتیں بولنا شروع کیں جن کی لغت اور گرامر انڈو ایرین زبانوں سے مختلف تھی۔ اس طرح ہند کی بعض پراکرتیں اور فارسی زبان، تذکیر و تانیث، واحد جمع کی پیچیدگیوں سے آزاد ہو گئیں۔ تثنیہ کا صیغہ ہر جگہ سے غائب ہو گیا حتیٰ کہ موجودہ فارسی میں واحد کو جمع کے لئے استعمال کیا جانے لگا، اور بجائے الف نون کے "ہا" سے جمع بننے لگی۔

ساتویں صدی مسیحی میں یزدجرد ساسانی کو قادسیہ کے مقام پر عربوں نے شکست دی، لیکن نہ صرف عہد عباسیہ تک ایرانی تمدن نے عربی سادگی کو ایرانی رنگینی میں بدل ڈالا۔ بلکہ عربوں اور ایرانیوں کے اختلاط نے ۷۵۰ء سے زوالِ بغداد ۱۲۵۸ء تک ایسے شاعر، مورخ، مہندس اور طبیب پیدا کر دئے جنھوں نے ہند اور یونان کے علوم و فنون کو فارسی و عربی کے ذریعے چار چاند لگا دئے اور فردوسی و بیرونی، خیام و ابن سینا کے ناموں کو دنیا میں گھریلو نام بنا دیا۔ حتیٰ کہ ایک ایسی اردو بننے لگی جس میں عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ اور محاورے ایک دوسرے میں اس طرح ضم ہوئے کہ وحدت انسان کے ماننے کے سوا چارہ نہ رہا۔

زبان و تمدن کے اس اختلاط کو عربی میں تلمیع کہتے ہیں یعنی ایک زبان کا دوسری زبان پر ملمع چڑھ جاتا ہے تو وہ اردو بن جاتی ہے۔ عربوں اور ایرانیوں کا خیال ہے کہ نئے نئے الفاظ اور تصورات زبان کو سنوارتے ہیں، بگاڑتے نہیں۔ وہ دو مختلف قوموں کو متحد کرتے ہیں، جدا نہیں کرتے۔ اختلاط السنہ کی کئی زبردست مثالیں ایشیا میں ملتی ہیں۔ ایک تو ایران و ٹرکی، جہاں کثرت سے عربی الفاظ فارسی و ترکی میں داخل ہو گئے، دوسرے ہندوستان جہاں فارسی و عربی نے مقامی بھاشاؤں سے مل جل کر نئی نئی زبانیں پیدا کر دیں، اور کابل و قندھار کے امرا نے تو فارسی بولنے والی خواتین سے شادی کر کے پشتو کو فارسی بنا دیا۔ بہرحال ہم اردو یا صنعت تلمیع کا ایک نمونہ درج ذیل کرتے ہیں۔

"شیخ احمد بن محمد یمنی شروانی کی مشہور تالیف نفحۃ الیمن کے صفحات ۱۰۱ - ۱۰۲ (مطبوعہ دہلی) پر عباس بن علی مکی یمنی کی ایک نظم عربی میں ہے جس میں فارسی و ترکی کے لفظوں کو سمویا گیا ہے۔ ہم نے ان الفاظ کے نیچے خط کھینچ دیا ہے۔

نظم یہ ہے۔

۱ - لی شادنٌ اَضنی الحشا، بالسحر من چشمانہ
اصمی الفؤاد و صادنی، بالتیر من مژگانہ
۲ - بے شک اتی زائرا، من حسن آہوئے الحمیٰ
مذ مرّ مستاھانا، من شرم قتبہ روانہ

۳. شوخٌ یذیبُ حشاشتہ التی لہا برقت نادم
تا کے اقاسی ہجرہ ، فسریا دمن ہجرانہ
۴. دیوانہ گشتم عندما ، شاہدتُ ماہِ جمالہ
ادخے سلاسل زلفہِ المشکی علی اعکانہ
۵. فی الرُّوز واللیل البہیم إذا ذکرتُ صدودہ
اجری علیہ الاشکُ حتّٰی ان اذوب لشانہ
۶. اُشتاقُ تلک الغمزہا اذا بدت من چشمہ
یرمی الفواد یا سہم من ابروان کمانہ
۷. اضحیتُ قسر بانا لہُ ، لمّا بدا فی خلعتہ
کالارغوان یفوح منہا المشکُ من دامانہ
۸. ترکٌ اذا نادیتہٗ ، یَنْ عاشقم سَن رحم کن
خندیدہ بی معجباً و اجابنی بزبانہ
۹. سَن صبر ذَنْ کمی اولُدْ ، بوراہ مشکل کمتہ سن
بوعشق درمحنت اولر ، ما انت مِنْ مردانہ
۱۰. حاز الجمال ویغرق العشّاق فی دریا الہویٰ
دلدار من باغی شدہ ، بیداد من طغیانہ
۱۱. قسما بخوبی خویِہ ، و بحسن روشن رویہ
وبحمرۃ اللبہاتے از تفتتر عن دندانہ
۱۲. اِنّی مقیمٌ لم اصل ، عن راہِ حب جمالہ
تا روزِ محشر دائما ، قسما بہ و بجانہ
۱۳. فلاگُرْیتُ علیہ تا ، معلوم ہر کس میشود
واقولُ ھذا جان من ، قد زاد فی ہجرانہ

فارسی زبان، شعر و تمدن

دنیا کی زندہ زبانوں میں صرف ایرانی (یا فارسی) زبان کو یہ شرف ہے کہ وہ جب سے شروع ہوئی ہے آج تک برابر زور پکڑتی رہی، بڑھتی رہی اور اپنی سادگی کی وجہ سے خوبصورت ہوتی رہی اور اپنی

---

(۸) (نوٹ:- بن ترکی بمعنی میں۔ سَن ترکی بمعنی تو)
(۱۳) اگْرَیتُ = از گریستن۔ گریہ کرنا)

نزاکت، پاکیزگی اور شیرینی سے نئے نئے دلوں میں گھر کرتی رہی۔ زردشت کے زمانے کی نظمیں اب تک موجود ہیں، اور موجودہ زمانے کے شاعروں اور یوگیوں فلسفیوں اور گوئیوں کے دلوں کو اب تک گرم بھی کر سکتی ہیں اور نرم بھی۔

اس سادگی نے ترکوں، افغانوں، قزاقوں، تاجکوں، تاتاریوں، عراقیوں اور ہندیوں حتّٰی کہ عربوں کے دلوں پر اپنا قبضہ کر لیا، اور ان کی زبانوں پر اپنا سکہ جما دیا۔ اس کی گرامر جادی اور ملائی سے بھی آسان ہے۔ اس کے بول فرانسیسی سے زیادہ میٹھے ہیں، اور اس کے قافیے (عربی کے میل جول سے) اتنے زیادہ رسیلے بن گئے ہیں کہ دنیا کی کوئی زبان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اسی لئے اس کی شاعری بھی موسیقی ہے اور اس کی نثر بھی نظم کا مزہ دیتی ہے۔ خود ایران میں تو ہزارہا شاعر ہوئے لیکن ایران سے باہر کی قوموں نے بھی ہزاروں ایرانی زبان کے شاعر پیدا کر دیئے۔ اس قسم کی مثال زبانوں کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

صرف موجودہ زمانے کے ایرانی شاعروں میں عارف قزوینی۔ ادیب پیشاوری، محمود طرزی کابلی۔ ملک الشعراء بہار، میرزادہ عشقی، انگریم تاج خانم۔ طاہرہ قرۃ العین کا کلام دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے شعر و شاعری کی اصلی روح سے جذبات کی جو موجیں پیدا ہوتی ہیں وہ قدرت نے صرف فارسی زبان اور ایرانی شاعروں کو بخشی ہیں۔ موجودہ دور کی وطن پرستی کی شاعری کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں کسی قوم یا جماعت کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات کو بھڑکانے کی بجائے محبت و قربانی، امید اور ترقی کے شریف اور بلند خیالات کی پرورش کی جاتی ہے اور زرتشتی، بدھ، عیسائی اور اسلامی رواداری، میل ملاپ، اور عالمگیر بھائی چارے (مانو دھرم) کی جیتی جاگتی تصویریں نہ صرف ایرانی تمدن کا جزوِ اعظم ہیں بلکہ ان کی پوری شاعری میں رزم و بزم کا ہر پہلو اسی رواداری اور محبت کو نمایاں کرتا ہے۔

یک قصہ بیش نیست غم عشق وین عجب — از ہر کسے کہ می شنوم نامکرر است (حافظ)

ظاہر ہے کہ معمولی بات چیت اور دل پر اثر کرنے والے کلام میں

یہی فرق ہے کہ ایک کا اثر سطحی ہوتا ہے اور دوسرے کا گہرا اور دیرپا۔ ایک صرف صورت کا اظہار کرتا ہے اور دوسرے میں احساس و ادراک کی معنویت الفاظ کے جامے کو پُر نور بنا دیتی ہے ؎

ساغر کو رنگِ بادہ نے پُر نور کر دیا (حسرت)

اس نقطۂ نظر سے جب ہم فارسی شاعری کے جمالیاتی پہلو پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ فارسی شعرا نے فارسی زبان کے لوچ، سلاست اور نہ ختم ہونے والے قافیوں کی مدد سے جو تخلیق جمال کی ہے، وہ اُن زبانوں کو جن میں قوافی کم اور گرامر کی پابندیاں زیادہ ہیں حاصل نہیں ہوئی۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ کوئی چیز فی نفسہٖ جمیل نہیں ہوتی، بلکہ اُس چیز سے جو کیفیت حاصل ہوتی ہے وہ اُسے جمیل یا دلکش بنا دیتی ہے۔ شاعر اپنی فنکاری یا تخلیق جمال کی قدرت سے پیش پا افتادہ تصورات و احساسات میں جان ڈال دیتا ہے۔ یعنی ہمارے روزمرہ کے تجربات کے پریشان اجزا کو منظم اور پُرشکوہ بنا کر نہ ختم ہونے والا کیف و اثر پیدا کر دیتا ہے۔ اور فطرتِ انسانی کے اتار چڑھاؤ سے ایسا تعلق پیدا کر دیتا ہے کہ تلاطم کو سکون اور سکون کو تلاطم بنا دیتا ہے۔ اسی لئے ثنائیؔ کہتا ہے کہ ؎

یک سخن در ہر مذاقے می کند کارِ دگر   از نسیمے گل پریشاں، غنچہ خنداں می شود

اور عُرفیؔ کا خیال ہے کہ ؎

نہ ہر حرفیکہ بر گوش آید از لب دلنشیں گردد   کہ از صد قطرۂ نیساں یکے در ثمیں گردد

یادِ ماضی و اندیشۂ فردا

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یادِ ماضی ہو یا اندیشۂ فردا، زبان و بیان کے ذریعے سے جب بھی ہمارے سامنے آئیں گے اُن میں غم و الم کا شائبہ ضرور ہوگا۔ شاعر گزرے ہوئے زمانے کی مسرتوں کو یاد دلا کر یہ بتاتا ہے کہ اب وہ مسرتیں خواب و خیال ہو گئیں۔ صرف ان کی یاد باقی ہے۔ لیکن اس یاد مسرت میں الم و حسرت کے کانٹے چھپے ہوئے ہیں ؎

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں   لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

اور اگر وہ آنے والی آرزوؤں اور تمناؤں کی دنیا آباد کرے گا تو اُس میں بھی یقین کارفرما نہ ہوگا کہ وہ اُمیدیں پوری ہی ہو جائیں گی ؎

دل میں کیا تھا جو ترا غم اُسے ویراں کرتا   وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہے

محبت و شوق یعنی تصوّف

لذت و الم، مسرت و غم کی کشمکش اور درد و الم کی ہمہ گیری کو اگر کسی شاعری نے ختم کر دیا ہے تو وہ فارسی شاعری ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ تصوف یعنی خدا اور انسان کی محبت کی تعلیم رجعت پسندانہ ہے۔ اس سے مایوسی اور اضمحلال، جمود اور پستی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ محبت، اگر وہ عالمگیر انسانیت کی محبت ہو، تو وہ ایک ڈھنی ہے، اس میں شکست بھی فتح ہے۔ فراق بھی سعی وصال کے لئے ایک تازیانہ ہے۔ اور غم و الم بھی آئندہ کامرانی کا پیش خیمہ ہے۔

غم کے ٹھوکے کچھ بھی ہوں لیکن، آ کے جگا تو جاتے ہیں (فانی)

یا بقول حسرت۔

اربابِ ہوش جتنے ہیں بیمارِ عقل ہیں   ان کے لئے ضرور دوائے عشق ہے

یعنی   ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق
پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

فارسی شعر کے چند نمونے

مضمون طویل ہو گیا۔ بہر حال فارسی شعر کے چند نمونوں کے بغیر یہ مضمون تشنہ رہ جائے گا۔ اس لئے درج ذیل ہیں۔

غلام نرگسِ مستِ تو تاجدارانند   خرابِ بادۂ لعلِ تو ہوشیارانند (حافظ)
بیا بمیکدہ و چہرہ ارغوانی کن   مرو بصومعہ کانجا سیاہ کارانند (〃)

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم   اے بے خبر ز لذتِ شربِ دوامِ ما (〃)
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما (〃)

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ   چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند (〃)
ناصحم گفت کہ جز غم چہ ہنر دارد عشق   گفتم اے خواجۂ عاقل ہنرے بہتر ازیں (〃)
بیا کہ رونقِ ایں کارگاہ کم نشود   ز زہدِ ہمچو توئی و ز فسقِ ہمچو منے (〃)
بر صوفیِ بے دعوہ دیال ست عبادت   بر شیشہ کہ خالیست زمے سجدہ حرام است (نظیری)
بے عشق، عقل راہنمے زمانہ نیست   بہ سوز آں فتیلہ کہ از شعلہ داغ نیستانی (〃)
می گریم و از گریہ چو طفلم خبرے نیست   وہ دل بہ سوے بست ندانم کہ کدام است (〃)
رسوا منم، دگرنہ تو صد بار در دلم   رفتی و آمدی و کسے را خبر نشد (〃)

غیرت نگزارد کہ بگویم، کہ مرا کشت!   تا خلق ندانند کہ معشوق کدام است (〃)
خواہی کہ دگر حیات یابم   یکبار بگو کہ کشتۂ ماست (〃)

شب عاشقانِ بیدل، چہ شب دراز باشد
تو بیا کز اوّلِ شب، در صبح باز باشد

بہ کفے جامِ شریعت، بہ کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

من آں نیم کہ حلال از حرام نشناسم
شراب با تو حلالست و آب بے تو حرام

دلم بپاکئی دامانِ غنچہ می لرزد
کہ بلبلاں ہمہ مستند و باغباں تنہا

مرا بیادِ تو بردو ترا ز دیدۂ من
ستم زمانہ ازیں بیشتر چہ خواہد کرد؟

در بایانہ دگر بر سرِ ناز آمدۂ
از دلِ ما چہ بجا ماند کہ باز آمدۂ

قدِ نہال خم از بارِ منتِ ثمر است
ثمر قبول مکن سرو ایں گلستاں باش

شعار حسن تمکیں، شیوۂ عشقست بیتابی
بپایاں تا رسد یک شمع، صد پروانہ می سوزد

شدیم پیر بعصیان و چشم آں داریم
کہ جرم ما بجوانانِ پارسا بخشند

بآں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند
ز ما سلام رسانید ہر کجا ہستند

اگرچہ دولتِ وصلت بچوں منے نرسد
دریں امید بمیرم کہ خوش تمنائیست

دلم بکوئے تو با صد ہزار نومیدی
بایں خوش است کہ امیدوار می گردد

پری چہرہ بینی ہمہ دشت و کوہ
بہر سو بشادی نشستہ گروہ

ہمہ رخت ترکاں پوشیدہ زرد
ہمہ سرو قد و ہمہ مشک بو

ہمہ رخ پر از گل، ہمہ چشم خواب
ہمہ لب پر از می بہ بوئے گلاب

دو ابرو کماں و دو گیسو کمند
بہ بالا بکردار سرو بلند

دو برگ گلش سوسن می سرشت
دو شمشاد عنبر فروشش بہشت

بنا گوش تابندہ خورشید وار
فروہشتہ او حلقۂ گوشوار

لباں از طبرزد، زباں از شکر
دہانش مکلل بہ دُر و گہر

یکے دخترے داشت خاقاں چو ماہ
کجا ماہ دارد دو چشم سیاہ

ز دنبال چشمش یکے خال بود
کہ چشم خودش ہم بدنبال بود

روز نبرد آں یلِ ارجمند
بشمشیر و خنجر بگرز و کمند

برید و درید و شکست و ببست
یلاں را سر و سینہ و پا و دست

روشد بماہی و برشد بماہ
بن نیزہ و قبہ و بارگاہ

بس گرد میداں کہ برشد ز دشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

بدیں خواری تو بودی عاشقِ من بفرماں
بہ دولت بخشیدے و بوسہ بخشیدے

چہ بر جور و جفائے تو مرا قدرت بدے
یا ز خلقم شرم بودے یا ز حق ترسیدے

اے رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست
بگشائے لب کہ قند فراوانم آرزوست

ادباش اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علتہائے ما

اے تو افلاطون و جالینوس ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما (رومی)

اے خداوند یکے یارِ جفا کارش دہ
دلبرِ عشوہ گر و سرکش و خونخوارش دہ (")

چند روزے ز پئے تجربہ بیمارش کن
با طبیبانِ دغا پیشہ سروکارش دہ (")

تا بداند کہ شب با دگراں میگزرد
دردِ عشقش دہ و عشقش دہ و بسیارش دہ (")

بزیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر (")

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بدم، پختہ شدم، سوختم (")

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست (")

گفتم غمت مرا کشت، گفتا چہ زہرہ دارد
غم ایں قدر نداند، کافر تو با رہائی (")

من از عالم ترا تنہا گزیدم
روا داری کہ من تنہا نشینم؟ (")

مرا گوید چرا چشم از رخ من بر نمیداری
از آں در پیشِ خورشیدِ تو می دارم کہ نم دارد (")

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا (غالب)

اے لذتِ جفائے تو در خاک بعدِ مرگ
با جاں سرشتہ حسرتِ عمرِ دوبارہ را (")

عمریست کہ من میرم و مردن نتوانم
در کشور بیدادِ تو فرمانِ قضا نیست (")

جنت نکند چارۂ افسردگیِ دل
تعمیر باندازۂ ویرانیِ ما نیست (")

بجز در وقتِ ذبح طپیدن گناہِ من
دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہ کیست؟ (")

گیرم کہ رسمِ عشق من آوردہ ام پدید
ظلم آفریدۂ دلِ ناحق شناس کیست؟ (")

اگر بقدرِ دنائتِ جفا حیف است
بمرگِ من، کہ ازیں بیش میتواں کردن (")

گر با تو بوم نخسپم از یاریہا
ور بے تو بوم نخسپم از زاریہا (رومی)

سبحان اللہ ہر دو شب بیدارم
تو فرق نگر میانِ بیداریہا

سرمد غمِ عشق بوالہوس را ندہند
سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند (سرمد)

عمرے باید کہ یار آید بکنار
ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را ندہند

سرمد کہ ز جامِ عشق مستش کردند
بالا بردند و باز پستش کردند (")

میخوار است خدا پرستی و ہشیاری
مستش کردند و بت پرستش کردند

دیروز پئے گلاب می گردیدم
پژمردہ گلے بر سرِ آتش دیدم ([illegible])

گفتم کہ چہ کردۂ کہ می سوزندت
گفتا کہ دریں باغ دمے خندیدم

افسوس کہ گلرخاں کفن پوش شدند
وز خاطرِ یکدگر فراموش شدند ([illegible])

آنانکہ بصد زباں سخن می گفتند
آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند

آموز کہ آتشِ محبت افروخت
عاشق روشِ سوز ز معشوق آموخت (ابوالخیر)

از جانبِ دوست سرزد ایں سوز و گداز
تا در نگرفت شمع پروانہ نسوخت

(۱) جز در رہِ عشق تو نپویم ہرگز   دل ما ز ترا بکس نگویم ہرگز
صحرائے دلم عشق تو شورستان کرد   تا مہر دگر کسے نروید ہرگز

(۲) زان پیش کہ برگشتہ زراہم داری   قادر بودی کہ بے گناہم داری
چون بود بقدرتِ تو، اینہا دانم   کافر نہ چنیں نامہ سیاہم داری

(۳) این چرخ کہ با کسے نمی گوید راز   کشتہ بستم ہزار محمود و ایاز
مے خور کہ کسے عمر دوبارہ ندہند   ہر کس کہ شد از جہاں، نمی آید باز

این کوزہ چو من عاشق زارے بودست   در بند سر زلف نگارے بودست
این دست کہ در گردن او می بینی   دستے ست کہ در گردن یارے بودست

(۴) افتاد مرا عجب شکارے چہ کنم   داند سرم افگند خمارے چہ کنم
سالوسم و زاہدم و لیکن در راہ   گر بوسہ دہد مرا نگارے چہ کنم

مندرجہ بالا محض چند نمونے ہیں۔ ان سے صرف فارسی کے تنوع کلام اور قدرت بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ نمونے بھی قدیم شعرا کے۔ جدید شعرا کا ذکر مضمون کو بہت بڑھا دیتا۔ اس کے علاوہ ہماری ہندستانی اردو پر قدیم فارسی ہی کا اثر باقی ہے، اس لئے صرف قدما کے چند اشعار پر اکتفا کیا گیا۔

سرود شاہنشاہی و ملی ایران

ہم ذیل میں ایرانی ترانہ اور اس کا اردو ترجمہ درج کرتے ہیں۔ اس میں فارسی شاعری کے کمال کو نہ ڈھونڈئے۔ بلکہ یہ دیکھئے کہ اس میں کن سیاسی و ملی اقدار پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھئے کہ ایرانی موسیقی کس قدر یورپین موسیقی سے اثر پذیر ہوئی ہے۔

اس ترانے کے پہلے بند میں شاہنشاہ اور خدا کا پرستش ترانے کی طرح ذکر ہے۔ دوسرے میں ایرانی پرچم و وطن پرستی، اور تیسرے میں حق پرستی کی تعریف ہے جو زردشتی یا مزدیسنائی تصور کو نمایاں کرتی ہے۔

سرود شاہنشاہی و ملی ایران	ایران کا شاہنشاہی و ملی ترانہ
(۱)	(۱) شاہنشاہ اور خدا
شاہنشہ ما زندہ باد	رہے شاد آباد ہمارا شہنشاہ
باید کشور بفرش جاوداں	ہمیشہ رہے آبرو عزت و شان
کز پہلوی شد ملک ایراں	کہ پہلوی ہی سے ہے ملک ایراں
صد رہ بہتر ز عہد باستاں	سو بار پہلے سے زیادہ نمایاں
از دشمناں بودی پریشاں	یہ پہلے تو تھا دشمنوں سے پریشاں
در سایہ اش آسودہ ایراں	ہے اب شہ کے سائے میں آسودہ ایراں
ایرانیاں پیوستہ شاداں	اے ایران والو کیوں کر ہو شاداں
ہموارہ یزداں بود او را نگہباں	کہ جب ہے خدا ہی تمہارا نگہباں
(۲)	(۲) پرچم اور وطن دوستی
اے پرچم خورشید ایراں	مرے شیر و خورشید والے پھریرے
پرتو فگن بر روئے ایں جہاں	تو دنیا کو روشن بنا اور شاداں
یاد آور از آن روزگارے	تری تیغ کی بجلیوں سے سراسر
کہ آسود از برق تیغت ہر کراں	جلے دشمنوں کا ہمیشہ خیاباں
در سایہ ات جاں می فشانیم	سائے میں تیرے جانیں دیں گے ہم
از دشمناں جاں می ستانیم	دشمن ملک کی جانیں لیں ہم
ما وارثِ ملکِ کیانیم	ملکِ کیاں کے وارث ہیں ہم
ہمیشہ خواہیم وطن را از دل و جاں	وطن پر نچھاور رہے اپنا دل و جاں
(۳)	۳۔ حق پرستی
بودیم و ہستیم پیرو حق	حق کے پیرو ہم تھے ہم ہیں
جز حق ہرگز نخواہیم از جہاں	حق ہی اپنا چارہ رہے ہیں
با شہ پرستی مملکت را	شاہ کی پرجا یا رو ہم ہیں
دارم از دستِ دشمن در اماں	اسی مملکت کے ہیں ہم سب نگہباں
ما پیرو کردار نیکیم	کردار ہمارے اچھے ہیں
روشن دل از پندار نیکیم	پندار ہمارے اچھے ہیں
رخشندہ از گفتار نیکیم	گفتار ہمارے اچھے ہیں
شد زیں فضائل بلند آوازِ ایراں	انہیں نیکیوں سے بڑھا ملک ایراں

سکندر علی وجد

غزل

مُسکراؤ خوشی کی بات کرو
رونے والو ہنسی کی بات کرو

خونفشاں تو آئے گی اک دِن
گُلفشاں زِندگی کی بات کرو

اہلِ محفل اُداس بیٹھے ہیں
اب کوئی دل لگی کی بات کرو

یہ اندھیرے کے تذکرے کب تک
دوستو، روشنی کی بات کرو

بات جب ہے کہ دُشمنوں سے بھی
جب کرو، دوستی کی بات کرو

پھول مُرجھا گئے تو کیا غم ہے
کِھلنے والی کلی کی بات کرو

کل کی باتیں کریں گے کل والے
وجد تم آج ہی کی بات کرو

لالہ رُخ

دُنیا کہے دِوانا

ڈگر ڈگر میں پھروں اکیلا نگر نگر انجانا
دُنیا کہے دِوانا

دُور دُور سے اُڑ کر پنچھی اپنے کُنج کو آئیں
میں کِس نگری کا ہوں باسی کون دیس ہے جانا
دُنیا کہے دِوانا

بھور کو مہکیں کومل کلیاں جُھوم جُھوم مُسکائیں
بھنورے جا آتا تو کہہ دے سانجھ بھئے مُرجھانا
دُنیا کہے دِوانا

چندا پہ لٹ جائے چکوری اپنا آپ بھلائے
کون کسی کا بھولے پنچھی مُورکھ یہ نا جانا
دُنیا کہے دِوانا

من کو مارا، تن بسرایا، اپنا چین گنوایا
دُور چلا متوارا راہی اب کاہے پچھتانا
دُنیا کہے دِوانا

ڈگر ڈگر میں پھروں اکیلا نگر نگر انجانا
دُنیا کہے دِوانا

ڈاکٹر مسعود حسین

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو!

فکر اقبال کے تضاد یا تناقض کے مذکورسے تنقیص مقصود نہیں اس لئے کہ فلسفۂ جدید میں تصور تضاد محمود ہے نہ کہ نامحمود، اور فلسفہ کیا، سائنس میں بھی قانونی تضاد کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

فکری اعتبار سے اقبال مجدّد تھے۔ انھوں نے متضاد تصورات سے فکر کا نیا امتزاج تیار کیا۔ ان کے پاس ایک اپنی بنیاد ہے۔ یہ بنیاد تعلیمات اسلامی کی ہے۔ اسی پر انھوں نے اپنا قصر فکر تعمیر کیا ہے جو بیک وقت "سوز و ساز رومی" اور "پیچ و تاب رازی" "دانش برہانی اور دانش نورانی" سے لا اور نشۂ الا اللہ سے مرکب ہے۔ یہ نہ مشرق سے بیزار ہے اور نہ مغرب سے۔ اس میں یورپ کی روشنی علم و ہنر بھی ہے اور حکمائے مشرق کی نظر بھی۔ یہ سائنس، فلسفے اور مذہب کا سمجھوتہ ہے جس کی تشکیل میں نتشے، برگساں، میکٹیگرٹ، مرشد رومی اور جمال الدین افغانی سب کا ہاتھ ہے۔

اقبال کے اس مرکب فلسفہ کی کئی سطحیں ہیں۔ لیکن ہر سطح پر اقبال کا اجتہادی نقطۂ نظر قائم ہے اور بنا بریں وہ اجتماع اضداد بھی جس کی طرف اشارہ کرنا اس مختصر سے مقالہ کا اصل مقصد ہے۔

اگر مابعد الطبعیاتی سطح سے بحث کا آغاز کیا جائے تو اقبال کے تصور خدا ہی سے تضاد فکر آشکار ہے۔ ابتدا میں جب اقبال کیمبرج کے سبزہ زاروں میں اپنے استاد میکٹیگرٹ کے ساتھ لمبی سیر کو جاتے تھے اس وقت وہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ فلسفہ خودی کی تشکیل کے ساتھ ساتھ ان کے ذہن سے جالے صاف ہوتے گئے اور اب ان کا خدا "خودی برتر" کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جو بالارادہ کسی خاص مقصد کے پیش نظر تخلیق کے کام میں مصروف ہے۔ یہ تخلیقی عمل اندھے کی لاٹھی نہیں۔ اس کے پیچھے واضح مقصد اور روشن نظر ہے یہ جو لامحدود ہے اور اسی کے آغوش میں لامحدود خودیاں پرورش پاتی ہیں۔ یہاں قطرے کی عشرت یہ نہیں کہ وہ دریا میں فنا ہو جائے۔ ذرّے کا مقدر یہ نہیں کہ وہ صحرا میں گم ہو جائے یہاں

قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے۔

اور سمٹے تو یہ ذرہ ہے پھیلے تو یہ صحرا ہے

کیونکہ حیات کے امکانات اور اس کی توسیع لامحدود ہے۔ یہاں تک اقبال کی الٰہیات منطقی وحدت کی حامل ہے لیکن اس کے بعد جب وہ ماورا یا محیط کل کے مبحث پر آتے ہیں تو وہ خدا کے ان دو تصوّرات کو ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ محیط کل کا تصوّر عام طور پر وحدت الوجود سے منسوب کیا جاتا ہے اور اقبال کی تشخیص کے مطابق یہ تصوّر اسلام کا مرض کہنہ ہے۔ اقبال کے خیال میں خدا ماورا بھی ہے اور محیط کل بھی لیکن بعض مذہبی وجوہ کے پیش نظر اقبال نے اس کی ماورائیت پر زور دیا ہے۔ اس مرکب تصور خدا کو پس منظر میں رکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اقبال تصوّف پر اعتراض کرتے ہوئے خود صوفی کیوں تھے۔

اقبال کے افکار کی دوسری سطح ان کے تصوّر کائنات سے تعلق رکھتی ہے۔ خدا کے وجود کو بنیادی طور پر تسلیم کرتے ہوئے اقبال کائنات کے ارتقا پر سائنسی نقطۂ نظر سے غور و فکر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنا رشتہ ارتقائی مفکرین سے ملاتے ہیں۔ ان کے خیال وجود بسیط نے اپنے آپ کو دو حصوں میں منقسم کر لیا ہے "خود" اور "غیر خود" انھیں دونوں کی باہمی آویزش اور کشمکش سے حیات ارتقا کے مدارج طے کرتی ہے۔ استعاروں کے پردوں میں یہ داستان ان الفاظ میں دہرائی گئی ہے۔

دما دم رواں ہے یم زندگی — ہر اک سے ہے پیدا رم زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود — کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود
گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل — خوش آئی اسے محنت آب و گل

غرضیکہ اقبال شعلہ و دُود دونوں کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے ثنویت کو اپنے افکار میں جگہ دیتے ہیں اور پھر اس کا عینی حل پیش کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں حفظِ تن اور حفظِ جان دونوں ضروری ہیں۔ وہ جان و تن کے تناقض کو نظری حیثیت سے نہیں بلکہ زندگی کے حوالے سے حل کرتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے شکم پرستوں پر طنز کی ہے اور شکم کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے الہیاتی مفروضات سے قطع نظر وہ حقیقت بین تھے کہ یہی عین اسلام ہے۔

لیکن وہ ارتقا کے قائل ہوتے ہوئے بھی اس کے انجام سے خائف ہیں۔ ان میں نطشے کی جرأت رندانہ اور منطقی نظر نہیں جو ارتقا کی انتہا فوق البشر کی خدائی میں دیکھتی ہے۔ اقبال ارتقائے حیات کو "بجا و سوا صفات" سے آگے نہ لے جاسکے یا اگر کبھی چہرۂ افکار سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی تو بس یہاں تک پہنچے

تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت   تجھے کیا بتاؤں تیری سرنوشت
حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ   حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس   مگر تابِ گفتار رکھتی ہے بس

یہ "بس" کا مقام مذہبی مفکرین کے یہاں ہمیشہ آتا ہے کیوں کہ یہیں سے ایمان و ایقان کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔ اقبال کا عقلی اور سائنسی نقطۂ نظر بھی "بس" پر جاکر ہمیشہ رک جاتا ہے کیوں کہ اس کے آگے نامعلوم کا وہ افق ہے۔ جہاں عقلِ حیلہ جو اور منطقِ خشک پوست دونوں کی کارپردازیاں ختم ہوجاتی ہیں۔ عقلیت پرستوں کے یہاں یہ ایک قسم کا عجز ہے۔

فلسفے میں اقبال کا طریق وجدان ہے جسے وہ عشق یا نظر سے تعبیر کرتے ہیں۔ عینی فلسفے کے لئے اس طریق کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن اقبال نے عقل کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ عقل و عشق کے تلازمہ میں گو انھوں نے عشق کا پلہ ہمیشہ بھاری رکھا لیکن عقل کو اتنا فرومایہ نہیں سمجھا جتنا کہ ہمارے عقل دشمن شعرا تھے اور آخر آخر میں تو عقل کے مفہوم کو اس قدر توسیع دی کہ وجدان کا اس پر اطلاق کرتے ہوئے "دانشِ نورانی" کہا۔ فلسفی کی حیثیت سے اقبال منکرِ عقل ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ اپنے خطبات میں برگساں کے حوالے سے کہتے ہیں کہ درحقیقت وجدان بھی ایک قسم کی عقلِ برتر ہے۔ سفرِ اقبال میں عقل کا مقام اسی نسبت سے ہے جس نسبت سے اقبال سب کو سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے تھے۔

فکرِ اقبال کی تیسری سطح ان کا سماجی فلسفہ ہے۔ جسے انھوں نے بےخودی کا نام دیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا سوال فرد و جماعت کے باہمی ربط کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ یہاں انھوں نے متوازن نقطۂ نظر کا ثبوت دیا ہے۔ اسلام کے معاشرتی نظام میں انھیں وہ حسین توازن نظر آتا ہے۔ جہاں فرد کی نشوونما بےخطر ہوسکتی ہے اور جہاں جماعت کے حقوق کا ہر لحظہ احترام کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں صرف اس قدر اشارہ کرنا ہے کہ اقبال کی بیشتر زمزمہ خوانی خودی کے سلسلے میں ہے نہ کہ بےخودی کے سلسلے میں۔ ان کے افکار میں خودی پر اس قدر زور ملتا ہے کہ اس بارے میں ان کا نظری توازن ختم ہوجاتا ہے۔ یہ فرد ہے جو نپولین کے کردار اور اس کی تگ و تاز، مسولینی کی شجاعِ نظر اور شیطان کے اس ہمہمہ میں نظر آتا ہے۔

کون کرسکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں

بانگِ درا سے لے کر ارمغانِ حجاز تک اقبال کا سارا کلام دیکھ جائیے اور بتائیے کہ ان کی نَے کہاں تیز تر ہوتی ہے۔ ان کے نفس سے لالہ کی آگ کہاں دہکتی ہے۔ یہ وہی مقامات ہیں جہاں انھوں نے خودی کی عظمت کو محسوس کیا ہے اس کے بعد بےخودی کے زمزمے خانہ پُری کی چیز معلوم ہوتے ہیں۔ یہ فلسفہ خودی ہے۔ جہاں جہاں انھوں نے خالص اجتہاد سے کام لیا ہے۔ یہ فلسفۂ بےخودی ہے جہاں وہ اولیت پرست ہیں۔ یہ فلسفہ بےخودی ہے جہاں انھوں نے صرف استعارہ بدلا ہے مفہوم نہیں بدلا۔ ان دونوں آوازوں کو سنئے اور فرق پہچانئے۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا!
یا میرا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

اور اس کے بعد یہ

میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

معاشرتی مسائل پر آکر اقبال کا سارا اجتہادی نقطۂ نظر ختم ہوجاتا ہے اور وہ قدامت پرستی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ عمرانی فکر میں وہ ماضی کو حال پر ترجیح دیتے ہیں اور یہ ان کے محدود سماجی فلسفے کا طفیل ہے کہ وہ یورپی تہذیب پر مسلسل طنز کرتے ہیں اور یورپ اور یورپی سماج کو خیرپاک

وخیالی بلند و ذوقِ لطیف سے محروم بتاتے ہیں - یورپی تمدن کی بنیادیں یونانی فلسفے کی عقلیت پرستی اور فرانسیسی انقلاب کے تصوّرِ حریت اور عدل پر استوار ہیں - سماجی زندگی کی تنظیم کے لئے اس سے زیادہ صالح اصول اور کیا ہو سکتے ہیں - اگر ہم مشرق کی ماورائیت پرستی کے نام پر فاقہ کشوں کی ایک جماعت تیار کر بھی لیں تو اس پر کسی طرح ایک صحت مند سماج کا اطلاق نہیں ہو سکتا -

سماجی افکار میں اقبال کا "مجموعہ اضداد" ہونا اسی وقت اور زیادہ ثابت ہو جاتا ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ "میں اسلام کو ایک قسم کی اشتراکیت ہی سمجھتا ہوں" - یہاں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اردو میں اقبال پہلے شاعر ہیں جنھوں نے انقلاب روس کے مفہوم کو سمجھا اور خضرِ راہ میں دورِ مزدور کو خوش آمدید کہا - اپنے اردو اور فارسی کلام میں انھوں نے اشتراکیت کے مختلف پہلوؤں سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بنیادی طور پر مادیت اور دہریت کے علاوہ انھیں مارکسی اشتراکیت اور اسلام میں کوئی اور فرق نظر نہیں آیا - اسی لئے مارکس کو انھوں نے کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب کے ناموں سے یاد کیا ہے -

نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

اور ان کی مسلسل کوشش یہ رہی ہے کہ اشتراکی کو چہ گردوں کو لا سے الا اللہ کے مقام تک پہنچا دیں - اس کے لئے انھوں نے "اسلامی اشتراکیت" کے فارمولے میں سوچا ہے اور انقلاب روس کی روشنی میں اسلامی مملکت کے تصوّر اور اسلام کے اقتصادی نظام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے - مارکسی اشتراکیت کی طرف اقبال کا جو رویہ رہا ہے اس میں ایک آتش پرست کا سا تذبذب اور جھجک پائی جاتی ہے - ان کے لئے اس کے معاشی تصوّرات کشش رکھتے ہیں لیکن جب اس کی فلسفیانہ مادیت کی طرف نظر جاتی ہے تو کارل مارکس کے حوالے سے کہتے ہیں -

دین آں پیغمبر حق نا شناس
بر مساوات شکم دارد اساس

اور جب وہ ملوکیت اور اشتراکیت کو قوسین میں رکھ کر یہ کہتے ہیں کہ

غرق دیدم ہر دو را در آب و گل
ہر دو را تن روشن و تاریک دل

تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مادیت کے فلسفے پر وہ تن پروری اور شکم پرستی کے روائتی اعتراضات کی بوچھاڑ کر رہے ہیں - حالاں کہ مادیت کے فلسفے کو وہ ایک حربہ بھی سمجھتے ہیں - ایک جگہ لکھتے ہیں - مادیت مذہب کے خلاف ایک بڑا حربہ ہے - لیکن ملّا اور صوفی کے استیصال کے لئے ایک مؤثر حربہ ہے . . . . اسلام کی روح مادے کے قرب سے نہیں ڈرتی -

دراصل جب بھی کوئی مفکر مذہبی عینیت اور مارکسی اشتراکیت کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرے گا تو اُسے ایسے مراحل سے دوچار ہونا پڑے گا - وہ متضاد تصوّرات میں سوچے گا - اس لئے واضح اصطلاحات میں نہیں سوچ سکے گا اور اقبال کی طرح "اسلامی اشتراکیت" کے تصوّرات کی تفصیل پیش نہیں کر سکے گا - زیادہ سے زیادہ اس ضرورت کی طرف اشارہ کر سکے گا کہ "اسلام کے لئے کسی قابل قبول صورت میں اشتراکی جمہوریت کو اختیار کر لینا اور اُسے اسلامی قانون سے ہم آہنگ بنانا کوئی نیا انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی اصل اور اساسی پاکیزگی کو پھر سے حاصل کرنا ہے"-

فکر اقبال کا تضاد ان کے سیاسی نظریات کی سطح پر اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے - اس سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ اقبال واحد شاعر تھے جن کے اشعار ۱۹۴۷ء سے قبل کے پرآشوب دور میں ہر دبستانِ خیال کے لوگوں کی ترجمانی کرتے رہے ہیں - ان کی نظمیں بیک وقت کانگریس مسلم لیگ، جمعیتہ العلماء اور احرار کے پلیٹ فارم سے پڑھی جاتی تھیں بالخصوص مسلم سماج کے مختلف النوع افکار کی گونج ان کے کلام میں ملتی ہے - اگر ہندوستانی مسلمان کے قلب کی اس دو نیم کیفیت کا جو ہندی نغمے اور حجازی لے میں منقسم تھی - اندازہ کرنا ہو تو اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجئے وہ ہماری سیاسی منتشر خیالی کا بہترین آئینہ دار ہے - اس میں "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" بھی ہے اور "چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا" کا جذبہ بھی کارفرما ہے - سیاسی فکر کا یہ تضاد اقبال کے ابتدائی دورِ شاعری تک محدود نہیں - اس دور میں بھی جب وہ حجازی لے میں گا رہے تھے اور پوچھ رہے تھے -

کیا کوئی غزنوی نہیں معرکۂ حیات میں

ان کی دلچسپی خاکِ وطن سے برقرار رہی - اس حجازی لے کے دور میں اس

نغمہ ہندی کو بھی سنیے جو ضرب کلیم کی ایک نظم "شعاع اُمید" میں ملتا ہے ایک شوخ کرن سورج سے کہتی ہے ۔

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ در ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غوّاص معانی
جن کے لئے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب

وطنیت اور اسلامیت کی دو رنگی صرف اقبال کے پیش نظر نہیں تھی اسلامی ہند کا دل عرصے سے اس بارے میں دو نیم رہا ہے۔ یہ بنیادی سوال تقسیم ہند کے بعد بھی مسلمانوں کے سامنے موجود ہے یعنی اپنی ہندیت کو اسلامیت سے کیوں کر ہم آہنگ کریں' عیسائیت پر نشاۃ الثانیہ کے بعد قومیت حاوی ہوتی گئی ۔ اسلامی ممالک میں بھی جدید سیاسی فکر کا رجحان اسی طرف ہے گو اسلامیت کا خواب دیکھنے والوں کی ابھی تک کمی نہیں ۔ اقبال کا عہد اس لحاظ سے اور بھی زیادہ پر آشوب تھا ۔ بیسویں صدی میں قومیت کی تحریک نشو و نما کے ساتھ ساتھ اسلامیت مختلف شکلوں میں ہمارے سماج اور ادب میں کارفرما تھی ۔ اقبال کی شاعری اس کا نقطۂ عروج تھا ۔ لیکن اقبال اپنی عظمت فکر کے باوجود اس تضاد سے کیوں کر بچ سکتے تھے جسے تاریخی عمل نے ہندی مسلمانوں کی تقدیر بنا دیا تھا ۔ ہمارا شاعر اور ہمارا مفکر ہماری ہی آرزوؤں' امنگوں اور جستجوؤں کا ترجمان ہوتا ہے ۔

بنیادی طور پر چونکہ اقبال ہندی قومیت اور اسلامیت کا کوئی قابل قبول سمجھوتہ پیش نہیں کر سکے اس لئے بعض اہم سیاسی مسائل پر انھوں نے جو بیانات دئے ہیں یا جو تجاویز پیش کی ہیں ان میں بھی رخنے موجود ہیں ۔ عملی سیاست کے سلسلے میں میں اس وقت اقبال کی نام نہاد تجویز پاکستان کے تذکرہ پر اکتفا کروں گا ۔ یہ تجویز انھوں نے ۱۹۳۱ء میں مسلم لیگ کے الہ آباد سیشن کی صدارت کرتے ہوئے پیش کی تھی ۔ اس سلسلے میں ان کے الفاظ یہ تھے ۔

" مغربی جمہوریت کا اصول ہندوستان پر فرقہ واری گروہوں کی اہمیت تسلیم کئے بغیر منطبق نہیں کیا جا سکتا ۔ اس لئے مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے بالکل حق بجانب ہے .... میری خواہش ہے کہ پنجاب' صوبہ سرحد' سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے ... خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر .... مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی .... اسلام اس ملک میں بحیثیت ایک تمدنی قوت کے جب ہی زندہ رہ سکتا ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کرے "۔

اس تجویز کا تجزیہ کیجئے تو چند دلچسپ باتیں سامنے آتی ہیں ۔

(۱) اقبال کے ذہن میں تقسیم ہند کا مسئلہ بالکل نہیں تھا ۔ وہ پنجاب' صوبہ سرحد' سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان بنانا چاہتے تھے ۔

(۲) وہ ہندوستان کے اندر صوبائی گروہ بندی فرقہ دارانہ طور پر نہیں بلکہ تہذیبی لحاظ سے کرنا چاہتے تھے ۔ ان کے پورے خطبہ صدارت میں مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے بارے میں ایک بھی اشارہ نہیں ملتا ۔ اس کی وجہ ظاہر ہے ۔ ہندی مسلمانوں کی تہذیب کے امین مشرقی بنگال کے مسلمان نہیں بن سکتے ہیں ۔

اس طرح اقبال اپنی تجویز کے ذریعے سے نہ تو مسلم لیگ کے لاہور ریزولیوشن تک پہنچ سکے اور نہ ہندوستانی قومیت کے ان تقاضوں کو پورا کر سکے جو قوم پرست مسلمانوں کے سامنے تھے ۔ اس سلسلے میں فلسفیانہ نقطہ نظر سے اقبال کے لئے ایک دقت بھی تھی ۔ وہ ۱۹۰۸ء سے جغرافیائی وطن کی مخالفت کرتے آئے تھے ۔ پھر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے وہ جغرافیائی وطن کا مطالبہ کس منہ سے کرتے ۔ لہٰذا وہ اپنے مطالبے میں اس سے آگے نہ بڑھ سکے .... اسلام اس ملک میں بحیثیت ایک تمدنی قوت کے جب ہی زندہ رہ سکتا ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کرے "۔

یہ تھا مجموعہ اضداد اقبال کے افکار کا مختصر سا تجزیہ۔ اقبال کے کلام
ٍ ـدان کے افکار میں ہندی مسلمانوں کی ان تمام الجھنوں کا عکس ملتا ہے
ن سے ہم آج بھی دوچار ہیں۔ یہ الجھن اس تاریخی عمل سے پیدا ہوئی
ں جس نے متضاد تصورات حیات اور افکار کو ہمدگر کر کے ایک نیا تہذیبی
مرکب تیار کر دیا ہے۔ اقبال کے متضاد افکار کا سرچشمہ ہندی مسلمانوں کی یہی
زندگی ہے جو ہندیت اور اسلامیت، مشرقیت اور مغربیت عجم کے حسن طبیعت
اور عرب کے سوز دروں کے عناصر سے بنی ہے۔ ہماری تاریخ کے صرف چند
موڑوں پر ان عناصر میں اعتدال ملتا ہے۔ اقبال کے افکار اس اعتدال سے عاری ہیں

قومی پلان قرضہ کی نفسیاتی اہمیت

پردھان منتری نے قومی پلان قرضے کی نفسیاتی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ انھوں نے اپنی اپیل میں کہا تھا کہ قرضہ لازمی طور پر عوامی ہے ہم میں سے غریب سے غریب شخص کو بھی اس میں روپیہ لگانا چاہئے۔ کیونکہ وہ بھی قومی منصوبے کے کارِ عظیم میں اسی طرح کا حصے دار ہے جس طرح کہ کوئی دوسرا ہو سکتا ہے یہ قرضہ ایک عوامی منصوبے کے لئے روپیہ فراہم کرنے کی غرض سے جاری کیا گیا ہے۔ اس لئے لوگوں کی بچت کی رقوم کے امانت دار اداروں یعنی بنکوں اور بیمہ کمپنیوں کے علاوہ ہر خاص و عام کو اس قرضے میں روپیہ لگانا چاہیئے۔ ریاستی حکومتوں نے قوم کی اقتصادی حالت کو سنوارنے کے لئے اس قرضے کی اہمیت کے بارے میں عوام کو آگاہ کرنے کی غرض سے کئی ایک اہم اقدامات کئے ہیں۔ ریاستوں کے وزرائے اعلےٰ نے خاص طور پر ذاتی اپیلیں کی ہیں۔ قرضے کے متعلق کتابیں اور اشتہار وغیرہ تقسیم کئے گئے ہیں۔ نیز اضلاع اور دیہاتی علاقوں میں وسیع پیمانے پر پراپیگنڈا کیا گیا ہے لیکن اس تحریک کو نہ صرف جاری رکھنا بلکہ اس کو تیز تر کرنا لازم ہے۔

پچھمی بنگال کے وزیر اعلےٰ ڈاکٹر بی۔سی رائے نے اپنی ریاست کے کارخانہ داروں اور تاجروں کے نام ایک چٹھی میں لکھا ہے کہ "قومی قرضے کے لئے روپیہ لگانے کی حمایت کرنا سب سے زیادہ نیک اور قابل فخر کام ہے۔ علاوہ ازیں بھارت کو خوش حال اور طاقتور بنانے کے لئے روپیہ لگانے سے بہتر اور زیادہ محفوظ کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہو سکتا"۔

بمبئی کے وزیر اعلےٰ شری مرارجی ڈیسائی نے سرکاری محکموں کے افسرانِ اعلےٰ کو ایک مراسلے میں لکھا ہے۔ "پنج سالہ منصوبے کے مفاد میں ملک کے لئے تمام تر اندرونی طاقت کو لام بند کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ ہم یہ دکھا دیں کہ ہماری آزادی کہاں تک حقیقی ہے"۔ مدراس کے وزیر اعلےٰ شری کامراج ناڈر نے کہا ہے کہ قوم کی موجودہ ہنگامی حالت میں ہم سب پر لازم آتا ہے کہ ہم خواہ کسی سیاسی پارٹی میں بھی شامل ہوں۔ ہمیں اس قرضے کو کامیاب بنانے کے لئے سرتوڑ کوشش کرنا چاہئے۔ اسی طرح کی اپیلیں دیگر ریاستوں کے وزرائے اعلےٰ نے بھی جاری کی ہیں۔ مختلف اضلاع کے کلکٹروں کو قومی قرضے کا پروپیگنڈا کرنے پر خاص زور دینے کی ہدایت کی گئی ہے پنجاب اور سوراشٹر کی حکومتوں نے اپنے ماتحتوں کو قومی قرضے میں روپیہ لگانے کے قابل بنانے کے لئے تنخواہیں پیشگی لینا منظور کیا ہے۔

لیکن ان تمام اقدامات کو اور زیادہ تیز کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ قومی قرضے میں روپیہ لگانے کی تحریک کو عوامی بنائے بغیر مقصد حاصل نہ ہوگا۔ لوگوں کو احساس ہونا چاہیئے کہ وہ نئے بھارت کی تعمیر میں حصے دار بن رہے ہیں۔

۱۹ راپریل ۱۹۵۴ء سے لے کر ۳۰ رجون ۱۹۵۴ء تک قومی پلان قرضہ میں کل ایک ارب پانچ کروڑ پچپن لاکھ روپے جمع ہوئے ہیں۔

اظہر علی فاروقی

ایڈیٹر اودھ پنچ کے خطوط

اودھ پنچ منشی سجاد حسین کی ادارت میں ۱۸۷۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس وقت تک جرنلزم کا فن ہندوستان میں کم و بیش چالیس سال کے نشیب و فراز دیکھ چکا تھا۔ ۱۸۳۶ء میں شمالی ہندوستان کی دفتری اور سرکاری زبان فارسی سے اردو بنی اور اس کے ایک سال بعد اردو اخبار دلّی سے مولوی محمد باقر نے جاری کیا۔ ۱۸۳۷ء میں سر سیّد کے بڑے بھائی سیّد محمد نے دہلی ہی سے "سیّد الاخبار" نکالا، اور ۱۴ اگست ۱۸۴۲ء تک یہ اخبار جاری رہا۔ ہندوستان کی تمام زبانوں کا کم و بیش یہی حال تھا۔ اخبار نکلتے اور بند ہو جاتے۔ اس وقت اتنا ضرور تھا کہ اخبار نکالنے والا ایک خاص اہمیت کا مالک سمجھا جاتا اور ایڈیٹر کا شمار بڑے جانبازوں میں ہوتا۔

اودھ پنچ کے منظرِ عام پر آنے تک اخبارات کا سرسری خاکہ اس طور پر تھا۔

زبان	شمالی مغربی صوبہ (اتر پردیش)	اودھ	پنجاب	سنٹرل انڈیا (مدھیہ پردیش)	راجپوتانہ	برار	مجموعی تعداد
اردو	۲۴	۱۵	۳۳	۳	۲	۸	۸۵
ہندی	۶	۰	۱	۰	۱	۰	۸
اردو ہندی	۲	۰	۰	۰	۰	۰	۲
اردو انگریزی	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۱
ہندی انگریزی	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۱

اس طرح ان ۹۷ اخباروں اور رسائل میں اخبارِ عام (۱۸۷۱) کوہِ نور (۱۸۵۰ - ۱۹۰۴) لاہور۔ اکمل الاخبار (۱۸۶۶) دلّی۔ اودھ اخبار (۱۸۵۸) لکھنؤ۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۱۸۶۶)۔ لارنس گزٹ میرٹھ۔ کشف الاخبار بمبئی۔ جریدہ روزگار۔ کارنامہ۔ دکن ریویو؛ اردو کے چوٹی کے اخباروں میں سمجھے جاتے تھے۔ ہندی میں ہریش چند میگزین (۱۸۷۳) چندرکا (۱۸۷۴) بنارس۔ پردیپ، بھارت ورش، بھارت مِتر، بھارت ادھار، کی گنتی اچھے اور معیاری اخباروں اور رسائل میں تھی۔ بنگلا میں دنگ باسی، سولبھ سماچار، سنجیونی معیاری اخبار گنے جاتے تھے۔

ان اخباروں کا کینڈا سرسری نظر سے دیکھ لینے کے بعد ہم اودھ پنچ اور اس کے خطوط کی اہمیت کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پیشتر جو اخبارات نکلتے تھے وہ ملکی سیاسیات اور امورِ خارجیہ سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ اس شورش کے بعد ان کے لب و لہجہ کی سختی اور کرختگی نرمی اور مصلحت اندیشی میں تبدیل ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اخبارات خبروں کے بجائے مضامین کے اخبار بن گئے۔ مغربی علوم و فنون کی اشاعت اور انگریزی سے ترجمے۔ مثلاً کیفیت مقناطیس، ڈاک بجلی (ٹیلی گراف) سیر کرۂ زمین، وسعتِ عالم۔ سمندر میں لوہے اور پتھر کا تیرنا۔ باکو کا آتش فشاں پہاڑ۔ ریل گاڑی وغیرہ وغیرہم کے مضمون ہوتے۔ خبروں کا سلسلہ سرکاری سرکلروں، نتائج امتحانات، اعلانات اور سمنوں ہی تک محدود تھا۔

ہمارے ادب میں غالب کے خطوط کے علاوہ مزاح اور ظرافت کے کوئی اچھے نمونے نثر میں موجود نہیں تھے۔ ایسے صحافتی ماحول اور فضا میں اودھ پنچ نے جنم لیا۔ سیاسی فضائیں اگرچہ ہموار تھیں۔ پھر بھی کانگریس کے قیام سے آزادی کے جذبات ابھرتے نظر آرہے تھے۔ ہوم رول اور سوراج کی خواہشیں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ پریس ایکٹ کی جکڑبندیوں کے باوجود اخبار سیاسی پالیسیوں اور نافذ ہونے والے قانونوں پر ناقدانہ نظر ڈالنے لگے تھے جس کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔

اودھ پنچ کے اجرا سے صحافتی دنیا میں نہ صرف لطیف طنز۔ سنجیدہ مطائبات کا ایک نیا باب کھلتا ہے اور کارٹونوں کی ابتدا ہوتی ہے۔

بلکہ اودھ پنچ نے اخباری دنیا کو یہ بھی سکھایا کہ خام سیاست دانوں کی کمزوریوں اور نا عاقبت اندیشیوں کو کس طرح طنز کے اڑنگے پر رکھا جائے اور ان کی عیاریوں کا پردہ فاش کیا جائے۔ اس کے لئے اڈیٹر اودھ پنچ نے چند خطوط لکھے۔ یہ خطوط غالب کے خطوں سے کئی باتوں میں مختلف ہیں۔ غالب نے خط لکھے اپنے دوستوں کو جانے پہچانے انسانوں کو۔ اپنے شاگردوں کو، اپنے کرم فرماؤں اور قدر دانوں کو۔ منشی سجاد حسین نے اپنے خط لکھے کوئن وکٹوریہ کو، حکومت برطانیہ کے وزیروں کو، ہندوستان کے گورنروں اور وائسرائے اور لارڈوں کو، والیان ریاست کو، جن سے اس کی وہ شناسائی تو نہ تھی جو غالب کی اپنے دوستوں سے۔ غالب نے ان کو خط لکھے جو نہ صرف ان کو جواب دیتے تھے بلکہ غالب انھیں جواب ہی کی امید پر بھیجتے تھے اور انھیں جواب ملتے تھے۔ منشی سجاد حسین نے یہ خط اس لیے نہیں لکھے کہ انھیں ان کا جواب ملے۔ اور نہ اس کی کوئی امید تھی۔ غالب اپنے غموں کی داستان اپنے دوستوں کے سامنے اس لئے پیش کرتے تھے کہ ان کا بارِ غم کچھ تو ہلکا ہو۔ مگر سجاد حسین کے سامنے یہ بات نہ تھی کہ وہ خط لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس ہی نکال لے۔ یہ خط وہ ہیں جو ڈاک میں کبھی نہیں ڈالے گئے۔ بلکہ اودھ پنچ کے صفحات پر کھلے خزانے بکھرے پڑے رہتے تھے۔ اور جنھیں ایک مکتوب الیہ ہی نہیں بلکہ ہزاروں انسان پڑھتے تھے۔ ان کی فہرست یہ ہے۔

گلیڈسٹون، وزیر انگلستان	خط نمبر ۱۔۲۔۳
ملکہ وکٹوریہ قیصر ہند	خط نمبر ۴۔۵
مہاراج کشمیر	خط نمبر ۶
نظام دکن	خط نمبر ۷۔۸۔۹۔۱۵
بیگم بھوپال	خط نمبر ۱۲۔۱۳
لارڈ ڈفرن	خط نمبر ۱۴
پیارے کارسپانڈنٹ کا پیارا خط پیارے سالے کے نام	خط نمبر ۱۰
مٹی خراب عشق میں مہر و وفا کی ہے (مضمون)	" ۱۱

غالب کے خطوں میں جگ بیتی کی وہی جھلکیاں ملتی ہیں جو ان کی آپ بیتی سے وابستہ تھیں۔ اڈیٹر اودھ پنچ کے کھلے خط سراسر جگ بیتی کے حامل ہیں اور ان کا آپ بیتی سے وہی رشتہ ہے جو ایک حساس انسان کا عام انسانوں سے۔ اس نے اپنے خطوں کا ڈھانچا نہ تو اپنی شخصیت اور ذاتی زندگی سے بنایا ہے اور نہ اپنے روزانہ معمولات سے۔ بلکہ یہ ڈھانچا اُن لکیروں سے بنایا گیا ہے جو یورپی طاقتیں استعماری حکمت عملیوں کے سلسلے میں لگ بھگ سو سال تک بناتی رہیں۔ اپنے اپنے گھروں میں اور گھروں سے باہر بھی۔ یہ خط خصوصیت سے برطانیہ کی خارجی استعماری عیاریوں کے مرقعے ہیں۔ انسانی آزادی کی ژولیدہ تصویریں، کشورستانی کی دقابتوں حرص و آز اور طمع انگیزی کے بھونڈے خاکے برِسیاہ (افریقہ) پر تسلط جمانے کے سلسلے میں فرانس، جرمنی اور برطانیہ کی رقیبانہ ہوسناکیوں کے نقشے۔ مصر، سوڈان کی کشمکشوں اور اپنی آزادی برقرار رکھنے کی جد و جہد کے نمونے۔ گلیڈسٹون کی لغزشوں پر مضحکہ خیز آوازے۔ جنرل گورڈن کی حکم عدولی اور نا عاقبت اندیشی کی پاداش، جنرل گمس کی مجبوریوں کی جھلکیاں، لارڈ سالسبری، گرین ویل، گگان بتیا کی پالیسیوں کے چربے۔ مہدی سوڈانی، عربی پاشا، حسین عوفی اور مدحت پاشا کے شجاعانہ کارناموں کی فہرست، اسکندریہ کے قتل عام کے مناظر، فری سی لے کی سازباز، سلطان عبدالعزیز کی شتر دلی کی تصویریں۔ ڈزرائیلی وزیرِ اعظم انگلستان کی وسط ایشیا اور افریقہ میں عیارانہ پالیسی۔ تخت و تاج کی ہوس میں بھائی بھائی کا تصادم۔ شیر علی اور افضل خاں کی کشمکش، لارڈ میو، اور لارڈ رپن کی حکمت عملی۔ برما کے راجا تھی تو اور لارڈ ڈفرن کے ٹکراؤ کے خاکے، مانڈلے اور رنگون کے آزاد پرچموں کی غلامی۔ افغانستان۔ تبت اور ایران کی باہمی مفاہمت اور برطانیہ کی "بی جمالو" کے روپ میں اداکاری، ہندوستانی والیان ریاست کی رنگ رلیوں، ہوسناکیوں۔ غلامانہ ذہنیتوں کے بھونڈے چربے۔ آزادی کے لئے ہندوستان کی تگا پو۔ لنکا شائر کو دیسی کھدر کا چیلنج اور کانگریسی تگ و دو کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔ علی گڑھ تحریک اور مغربیت پرستی کے خلاف صدائے احتجاج۔ جدیدیت 'خواہ مخواہ' کے خلاف باغیانہ اقدام کے نقوش ان خطوں میں اُبھرتے نظر آئیں گے۔

ان خطوں کا ہر ہر فقرہ اپنے اندر کوئی نہ کوئی تاریخی انقلاب سموئے ہے۔ گلیڈسٹون کے نام خط میں ان جملوں کا تاریخی پھیلاؤ دیکھیے۔

"... خارن معاملات کیسے پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ تم نے جو کچھ کسی قوم یا معاملے کی نسبت رائے قائم کی وہ اکثر غلط نکلی۔ تم بغاوت کو قومی نہیں شخصی سمجھے۔ ایک عربی گیا۔ مہدی سوڈانی آیا۔۔۔۔"

"واقعہ یہ ہے کہ برطانیہ دراصل مصر کو زیرِ حفاظت ریاست بنانے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ چنانچہ ۲۔ جنوری ۱۸۸۳ء کے ایک سرکاری گشتی مراسلے کی رو سے برطانیہ نے تمام یوروپی طاقتوں سے درخواست کی کہ عربی پاشا کا قلع قمع کرنا ہم سب کا فرض ہے تاکہ خدیو مصر اسمٰعیل کی حالت سنبھل جائے اور اس کا اقتدار بحال رہے۔ رہا نہر سویز کا سوال اس کی حفاظت حکومت برطانیہ خدیو کے حسب منشا اپنے ذمہ لیتی ہے۔ اس طرح تجارتی مفاد کے لئے نہر سویز کا دروازہ سب کے لئے کھلا رہے گا۔

۔۔ نومبر ۱۸۸۳ء کو لارڈ ڈفرن ہائی کمشنر کی حیثیت سے مصر وارد ہوئے۔ اس گشتی مراسلے کی رو سے خدیو مصر اور ارکین دولت سب کے سب انگریزوں کے اشارے پر چل رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اُسے پورا اطمینان ہو گیا اور اس نے فوج میں تخفیف شروع کر دی۔ وادی حلفہ کا علاقہ جو مصری سوڈان سے بالکل متصل ہے، خالی کر دیا۔ خرطوم اور نیل کے ساحلی حلقے میں سنواکین سے مشوبہ اور وادی ابعین تک کچھ فوجیں ٹھہری رہیں۔ اسی اثنا میں انگولا کے شیخ مہدی نے انگریزوں کے خلاف آزادی کا جھنڈا بلند کر دیا ــــ اور خرطوم کے مقام پر انگریزی فوج بری طرح پسپا ہوئی۔ عربی پاشا کا مصر میں باغیانہ اقدام اور اسکندریہ کا قتل عام لارڈ گرین ویل اور گلیڈسٹون محض شخصی سمجھتے رہے اور اس سے نابلد رہے کہ یہ سب کچھ اُن عوامی جذبات کے تحت ہو رہا ہے جن میں یوروپی قوتوں کے لئے نفرت بھری تھی ــــ " اب ایک عربی رہ گیا اور مہدی سوڈانی (سوڈانی) آیا کا طنز کس درجہ بلیغ نظر آتا ہے۔

اسی طرح لارڈ ڈفرن کے نام خط میں یہ جملے آتے ہیں ــــ " بارہ سو افغان کٹ گیا۔ جاڑے پالے کے مارے ٹھنڈے ٹھنڈے ملک عدم کا راستہ ناپنے لگے۔" یہ جملے والیٔ افغانستان امیر دوست محمد کی وفات کے بعد (۱۸۶۳ء) کی خانہ جنگی لارڈ میو لٹن اور ڈفرن کی وائسرائی کے دوران کے سرحدی قبائلیوں اور برطانوی فوجوں کے پیہم تصادم کی داستانوں کا لب لباب ہیں جس میں تاشقند، بخارا اور سب سے زیادہ پنج دہ کے مقام پر روسیوں کے تسلط اور انگریزی حکومت کی سراسیمگی، جنگ افغانستان، لارڈ ناردبروک کی پسپائی اور کامیابی۔ عاشق آباد اور مرخس پر روسیوں کی فوجی چھاونیاں بنا لینا اور روسی افغانی سمجھوتا جیسے واقعات پنہاں ہیں۔ ان خطوں میں یہی اشاریت تاریخ کا سطحی مطالعہ رکھنے والوں کے لئے بھول بھلیاں بن جاتی ہے۔

اودھ پنج کے یہ خطوط صرف اس لئے اہم نہیں ہیں کہ ان کے ذریعے مکتوب نگار نے اردو نثر میں ظریفانہ سخن کو کچھ بلندیاں بخشیں۔ نثری ظریفانہ تحریروں کے کچھ اعلیٰ نمونے پیش کئے۔ ان کے ذریعے ستم سے طنز کا پرچار ہوا۔ ان خطوں کے مطالعے کے بعد اگر ہم صرف اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "ایک ایک پھبتی ظرافت کے ایک ایک دفتر کا جواب ہے۔ ہر فقرہ پکارتا ہے کہ جس جگہ میں ہوں اس کے لئے وضع ہوا ہوں۔ ہر جملہ بتاتا ہے کہ اس رنگ خاص کا میں ہی آغاز ہوں، اور مجھ ہی پر اس رنگ کا اختتام ہے۔" تو ہمارا مطالعہ یقیناً بالکل سطحی اور یہ جملے رسمی تنقید محض سے بھی پست تر ہوں گے۔ بلکہ یہ خطوط سیاسی نقطۂ نظر سے بے پناہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا مطالعہ ہماری آنکھوں سے عوام فریبی کے وہ پردے ہٹا دیتا ہے جو گوری قومیں ڈالتی رہیں اور آج بھی ڈال رہی ہیں۔ یہ خطوط ایک راز بے نقاب کرتے ہیں کہ کس طرح یوروپی طاقتیں افریقہ، افغانستان، وسط ایشیا، ہندوستان، برما وغیرہ کے کمزور اور بھولے فرماں رواؤں کے سامنے چاندی اور سونے کے نوالے ڈالتی رہیں جو ان کے حلق میں اٹک کر رہ گئے اور آخر کار انھوں نے دم توڑ دیا۔ یہ خط اس لئے اہم ہیں کہ ہمیں بتاتے ہیں کس طرح شہنشاہیت، خدیویت اور سامراجیت نے عوامی جذبات اور امنگوں کا خون کیا ہے۔ کس طرح عوام نے اپنی امنگیں ان کی بھینٹ کر دی ہیں۔ یہ خط ہمارے لئے ایک درس ہیں جو ہمیں سفید قوموں کی عیاریوں سے خبردار رہنے کی تاکید کرتے ہیں، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو ان کی عیارانہ پالیسیوں اور خود غرضانہ حکمت عملیوں اور شاطرانہ چالوں کو طنز کی شکنجوں میں کس کر کچھ مز نکال دیتی ہیں۔ ان کی جاسوسی کر کے منظر عام پر لاتی ہیں۔

ان خطوں میں مزاح اور ظرافت سے زیادہ طنز ہے۔ جیسے مکتوب نگار نے محض خیالی تصویروں سے نہیں پیدا کیا، بلکہ عالمی انقلاب اور

حادثات کی اُن حقیقتوں سے پیدا کیا ہے جو آج بھی گونج - ڈلاؤ دن گیر کرومر، رچرڈ گرین کی تاریخوں کے صفحات پر بکھیے پڑے ہیں۔ ان خطوں میں محض الفاظ اور بندشوں کی بھول بھلیاں نہیں ہیں جو عدم واقفیت کی بنا پر نظر آتی ہیں۔ ورنہ تاریخی واقعات کی اصل کمل جاننے پر نہ صرف ان بھول بھلیوں کی راہیں آپ سے کھل جاتی ہیں، بلکہ بڑی دلفریب نظر آتی ہیں۔

مولوی گلیڈسٹون قسم کے عجیب القاب، پیارے کارسیا منڈنشا کا پیارا خط پیارے سالے کے نام۔ انڈے بچے والی چیل جلہار جیسے عنوانات ظریفانہ رنگ پیدا کرنے میں تو مدد دیتے ہی ہیں، ساتھ ہی ساتھ قاری کو بڑی سرعت سے اپنی طرف متوجہ کرلیتے ہیں۔ یہی رنگ آگے چل کر مرزا فرحت اللہ بیگ کے وہاں زیادہ نکھر جاتا ہے۔ جب وہ نواب کتے مارخاں فتوح الکلاب قسم کے نام لے لے کر قاری کو ہنساتے رہتے ہیں۔

ان خطوں میں الفاظ سے زیادہ تاریخی واقعات اور کیفیات سے ظرافت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیگم بھوپال کے نام خط میں یہ جملہ ایک خاص واقعے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا طنز اور ظرافت ایک خاص کیفیت سے وابستہ ہے۔ آپ بیگم بھوپال کی لائف پڑھئے اور جن حالات کے تحت وہ نواب صدیق حسن خاں سے عقد ثانی پر مجبور ہوئیں، پھر دیکھئے اس کا لطف دوبالا ہوتا ہے یا نہیں؟

اگر تمہارے شخصی شوہر کے اتنے دنوں کی قسمت ایک متنفس
کی گردش چشم کے ساتھ اس سے پھر گئی تو کوئی تعجب نہیں"

اس طرح نظام حیدرآباد کے نام خط میں یہ جملے پڑھئے "ہم نے یہ بھی سنا ہے بعض بعض لوگ عہدوں کی سوداگری کرتے ہیں اور غالباً یہی وجہ اور بھی بار بار نظام بدلنے کی ہوگی۔ خیر سردست اور کچھ نہیں اس تجارت پر محصول جنگی تو تم بھی قائم کردو"

ان خطوں کے طنز میں اشاریت سے بہت زیادہ کام لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی یہ چیزیں بھول بھلیاں بن جاتی ہیں، ورنہ اودھ پنچ کے یہ خطوط ظرافت اور طنز کا بڑا ستھرا نمونہ ہیں۔ ہندی جرنلزم کا مصنف بھٹناگر اودھ پنچ کی ظرافت اور طنز کو ہندی کی "چندر کا"، "ہریش چندر میگزین"، "بھارت متر" اور بنگلا کے "شولبہ سماچار" وغیرہ کی ظرافت پر بدرجہا ترجیح ان لفظوں میں دیتا ہے۔

"انیسویں صدی عیسوی کی ظریفانہ تحریروں کا مرکز کاشی رہا ہے، مگر ظرافت کا جولب ولہجہ اردو کا "اودھ پنچ" پیش کرتا تھا، وہ ان میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا اور ہندی کا کوئی پنچ "اودھ پنچ" سے آنکھ نہیں ملا سکتا"

اس فوقیت کا سارا راز منشی سجاد حسین کا دلفریب اسلوب نگارش ہے جو یہ خط اپنے اندر سموئے ہیں۔ یہ اودھ پنچ ہی کا دل گردہ تھا جو ملکہ وکٹوریا قیصر ہند سے اس طرح بات کرتا ہے اور مذہبی پالیسیوں پر طنز کرتا جاتا ہے۔

"تمہارے انگلستان میں مذہب کے خیالی باغ و بوستاں کے ہرے بھرے سبز و شاداب تناور درخت سموم علم نظری و ظاہری کے جھونکوں سے جڑ سے اُکھڑ کر گر رہے ہیں۔ صرف تھوڑے سے لنڈ منڈ تنے اپنی سخت جانی سے بچ رہے، سو وہ بھی امروز و فردا میں کوچ کرتے نظر آتے ہیں۔ مذہب اب صرف ظاہری مراسم اور آرائش و زیبائش کے واسطے رہ گیا ہے۔ اس کے اصلی تقدس و تسکین سے مدت ہوئی کہ نا آشنائی ہو چکی ہے۔ اگر کچھ ہے تو تقدس کی جگہ وضع داری"

اتنے عرصے دبے رہنے کے بعد ان کھلے خطوں کا رنگ ابراہیم جلیس کے "کالا چور" اور سعادت حسن منٹو کے چچا سام کے نام خطوں میں پھر اُبھرتا نظر آ رہا ہے، اور یہ ان کی مقبولیت کا ایک بیّن ثبوت ہے کہ آج بھی یہ خطوط مشعل راہ اور سنگ میل کا کام دے رہے ہیں۔

مضمون نگاروں سے خالص ادبی مضمون زیادہ تعداد میں وصول ہوتے ہیں، اور ان سے بھی زیادہ غزلیں اور نظمیں، ادارے کے لئے بعض اچھے مضامین اور نظموں کا واپس کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے کلچر، تہذیب اور تمدن سے متعلق مضامین کی زیادہ ضرورت ہے۔ لہٰذا علاقائی زبانوں کے ادب، آرٹ، موسیقی، لوک گیت، لوک کتھاؤں اور کھیلوں سے متعلق اچھے مضامین شکریئے کے ساتھ قبول کئے جائیں گے۔ (ادارہ)

مختار الدین احمد آرزو

کتب خانۂ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شعبۂ مخطوطات

جامعۂ علی گڑھ کا کتب خانہ اپنے قدیم مطبوعات اسناد اور مخطوطات کی بنا پر ہندستان ہی نہیں، ہندستان سے باہر بھی مشہور ہے۔ اس کتب خانے کی ابتداء سر سیّد اور سیّد محمود کی ذاتی کتابوں سے ہوئی۔ پھر اُن کے احباب اور مخیّر حضرات کی مدد سے جلد ہی یہ ذاتی ذخیرے کتب خانے کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔

سر سیّد کو فارسی و عربی کی قدیم مؤلفات سے بڑا شغف تھا اور یورپ میں جوں ہی کوئی نئی کتاب اُن کی دل چسپی کی چھپتی وہ فوراً منگوا لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے مطبوعات عربی و فارسی جس قدر زیادہ تعداد میں یہاں موجود ہیں ہندستان میں کسی اور جگہ کم ہوں گے۔ یہاں بیسیوں ایسی کتابیں ہیں جن پر سر سیّد اور شبلی وغیرہ کی تحریریں اور یادداشتیں موجود ہیں۔ سیّد محمود کے کتب خانے کی ایک کتاب "قانونِ ابنِ سینا" قابلِ ذکر ہے جو روما میں ۱۵۹۳ء میں چھپی تھی۔

سر سیّد نے قلمی کتابوں کو جمع کرنے میں بھی بڑی دل چسپی اور گہری توجہ سے کام لیا ہے۔ "تاریخِ گزیدہ" کا وہ نسخہ جس پر فیضی کی تحریریں ہیں سر سیّد ہی کے ذاتی کتب خانے کا نسخہ ہے۔ لٹن لائبریری کی کتابوں کے علاوہ مولوی سبحان اللہ خاں، نوّاب عبدالسّلام خاں، مصطفیٰ خاں شیفتہ، سر شاہ محمد سلیمان، احسن مارہروی، منیر عالم کے ذخیروں میں متعدد نایاب اور بیش بہا مخطوطات ہیں۔

کتابوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے اور لوگ اپنے مخطوطات یہاں بھیج کر جمع کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ جلد ہی مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی بھی اس بنا پر کہ ذخیرۂ حبیب گنج سے دنیا زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکے۔ اپنا کتب خانہ مسلم یونیورسٹی میں منتقل کر دیں گے۔

کتب خانے میں جگہ کی قلت کی وجہ سے قلمی ذخیرے کو اچھی طرح رکھنے اور قارئین کو سہولت پہنچانے میں بڑی دقّت پیش آتی تھی اور اس طرح یہ بے بہا ذخیرہ لوگوں کی نظر سے عام طور پر پوشیدہ تھا اور عام تو عام خاص لوگ بھی نہیں جانتے تھے کہ لائبریری میں نایاب چیزیں محفوظ ہیں۔

اس دقّت کی طرف سب سے پہلے علوم و فنون کے مُربّی اور سرپرست ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے توجہ فرمائی اور حسبِ دستور اس کام کو اچھے پیمانے پر بڑی نفاست اور سلیقے سے شروع کرایا۔ انھوں نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا کانفرنس ہال اور اس کی گیلری حاصل کی اور ڈاکٹر ناشنس سے قدیم فنِ تعمیر میں جدید فنِ تعمیر کا خوبصورت پیوند لگوایا۔ اب قلمی ذخیرے کی منتقلی، اس کی دیکھ بھال، اور ہال اور گیلری کی ترتیب و تنظیم کا کام شروع کیا گیا۔ ہال کے اندر شیشے کے آٹھ خوبصورت شوکیس بنوائے گئے ہیں۔ جن میں نہایت نفیس مطلّا و مرصّع اور منقّش مذہب نسخے، اساتذۂ فن کے ہاتھ کی تصویریں، مشہور خطاطوں کی قیمتی وصلیاں، کمیاب اور نایاب کتابیں اور ہندستان کے مشاہیر شعراء علماء ادباء اور ماہرینِ سیاست کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط نہایت سلیقے سے سجائے گئے ہیں۔

اس علمی نمائش کا افتتاح سر ہومی مودی (سابق گورنر یو۔ پی) کے ہاتھوں انجام پایا۔ سری پرکاش وزیرِ حکومت ہند اور چانسلر صاحب مسلم یونیورسٹی نے بھی اس علمی نمائش کو دیکھا اور بے حد پسند کیا۔

۴ فروری ۱۹۵۴ء کو ہز ایکسی لنسی لودی اسفندیاری سفیرِ ایران اور سفارت ایران کے ثقافتی سکرٹری آقائے سید طباطبائی تشریف لائے فارسی کتابیں اور ایرانی فن کاروں کی وصلیاں بڑی دل چسپی سے دیکھیں۔ انھوں نے ایران کے بیش قیمت مطبوعات اور نقش اور تصویریں بھی کتب خانے کو بھجوائیں۔ ۵ فروری کو سر مرزا اسماعیل کانفرنس ہال آئے اور ان علمی و ادبی یادگاروں کو دیکھ کر محظوظ ہوئے۔ ۱۳ کو ملین

کے مشہور ماہر اور نقاد چارلس فابری تشریف لائے۔ تصاویر اور مرقعوں کو بڑی توجہ سے دیکھا۔ پھر انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کے اراکین آئے۔ انھوں نے اردو کے غیر مطبوعہ مکاتیب بڑی توجہ سے دیکھے اور انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ یہ مکاتیب شائع ہونے چاہئیں۔ ۱۰ مارچ کو ڈاکٹر امرناتھ جھا سابق وائس چانسلر بنارس یونیورسٹی شعبۂ مخطوطات دیکھنے تشریف لائے اور ان نوادر کو دیکھ کر اظہارِ مسرت فرمایا۔ ۱۷ نومبر ۱۹۵۱ء کو چین کے ثقافتی وفد کے اراکین شعبۂ مخطوطات دیکھنے آئے اور وہاں کے نوادر دیکھ کر بے حد محظوظ ہوئے۔ چینی وفد کے دو ممتاز اراکین صدر شعبۂ فلسفہ اور صدر شعبۂ مشرقیات جی پیلینگ نے بتایا کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اتنی خوبصورت اور اس قدر سلیقے سے ترتیب دی ہوئی اور پُرتکلف علمی نمائش گاہ نہیں دیکھی وہ شعبۂ مخطوطات کے نگراں سے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ چین آکر ایسی علمی نمائش گاہ کو ترتیب دینے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں ۱۰ جنوری کو آنریبل راجکماری امرت کور ۱۲-۱۳ مارچ کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ علی گڑھ کے اکثر حاضرین یہاں آئے۔ افضل العلماء ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مشری کے، ایم منشی گورنر یو، پی، مصر کے مشہور فاضل ڈاکٹر محمد حسین ہیکل اور ایران کے آغائے دفتری اور دوسرے بہت سے عمائد یہاں اب تک آچکے ہیں اور ان سبھوں نے اس علمی نمائش کو پسند کیا ہے اور اس کی ترتیب اور نفاست کو سراہا ہے۔

موجودہ وائس چانسلر صاحب اس کتب خانے کو ہندستان کا ایک عظیم الشان کتب خانہ بنانے کے خیال میں سرگرداں ہیں۔ ایک وسیع ترین کتب خانے کی عمارت کی تجویز منظور ہو چکی ہے اور امید ہے حکومت ہند کی مدد سے جلد ہی ایک شاندار عمارت کتب خانے کی طیار ہو جائے گی۔ مخطوطات کے علاوہ، ہندستان کے اہم نسخوں کی نقول اور یورپ کے اوٹوگراف اور مائکرو فلم منگوانے کے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ امید ہے جلد ہی یہ کتب خانہ اپنے لائق لائبریرین جناب سید بشیر الدین صاحب کی سعی و توجہ سے ہندستان ہی نہیں ایشیا میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرے گا۔

بعض مخطوطات کے عکس صفحہ ۲۵ اور ۲۶ پر شائع کئے جا رہے ہیں۔

بھاکڑا ننگل پراجیکٹ

۱۔ بھاکڑا بند بلندی کے لحاظ سے دنیا کے تمام بندوں سے دوسرے درجے پر اور ہموار تعلق کے بندوں میں سب سے زیادہ بلند ہے۔

۲۔ بھاکڑا پروجیکٹ کے لئے جو کنکریٹ، چونا اور اینٹیں وغیرہ درکار ہوں گی ان کا حجم تقریباً پچاس کروڑ مکعب فٹ ہوگا اور جو مصر کے سات بلند ترین میناروں سے دوگنا حجم ہے۔

۳۔ بھاکڑا کی بڑی نہر اور اس کی شاخوں میں تہہ اور کناروں کی استرکاری کے لئے ۵۰ کروڑ ٹائیل درکار ہوں گے اور آب پاشی سے متعلق تعمیرات پر ۲۰ کروڑ اینٹیں صرف ہوں گی۔ اگر ان اینٹوں کو یکے بعد دیگرے رکھا جائے تو خط استوا سے زمین کے گرداگرد تقریباً سات چکر بن جائیں گے۔

۴۔ بھاکڑا ننگل پراجیکٹ کی نہروں کے کل سلسلے کو ایک دن میں مکمل کرنے کے لئے سات کروڑ مزدوروں کی ضرورت ہوگی۔

۵۔ بھاکڑا کی نہروں اور ان کے سلسلہ تقسیم کی تعمیر پر تین ارب چالیس کروڑ مکعب فٹ مٹی خرچ ہوئی ہے اور یہ مٹی دہلی سے نیویارک تک بیس فٹ چوڑی اور تین فٹ اونچی سڑک بنانے کے لئے کافی ہوگی۔ ان دونوں شہروں کا درمیانی فاصلہ تقریباً نو ہزار دو سو میل ہے۔

۶۔ ننگل ہائیڈل نہر بھاکڑا مین لائن (بھاکڑا کی بڑی لائن) اور بھاکڑا مین برانچ (بھاکڑا کی بڑی شاخ) پختہ تہہ والے نہری سلسلے کا ایسا واحد یونٹ ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ طویل ہے۔

۷۔ بھاکڑا ننگل کی نہروں اور ان کی شاخوں کی تہہ کو پختہ بنانے میں جو مسالہ صرف ہوا ہے اس سے نو مربع میل سے زیادہ رقبہ پر چھ انچ موٹا فرش بنایا جا سکتا ہے۔

غزلیں

عبدالمجید حیرت

قسم ہے آپ کی دانش وری کی
نُموش ابھی نہیں ہے خود سری کی

جنوں کے ہاتھ سے دامن دری کی
خرد نے مدّتوں بخیہ گری کی

کوئی جب راستہ ملتا نہ دیکھا
نکل کر آنسوؤں نے رہبری کی

ہمارا دل ہی کم معیار نکلا
نظر ناقص نہیں تھی جوہری کی

جنھیں احساس ہوگا ابتری کا
وہی دیکھیں گے صورت بہتری کی

نہیں ہر ایک سے کہنے کے قابل
کہانی اپنی بے بال و پری کی

ابھی کیا ہے، ابھی تو دیکھنا ہے
نہایت عشق کی غارت گری کی

پسند آئی جفا ہی اُن کو، ورنہ
ادائیں اور بھی تھیں دلبری کی

اسی کے اہل تھے ہم اب جو حیرت
ہمیں خدمت ملی نوحہ گری کی

اعجاز صدیقی

جانِ تسکینِ ذات جاتی ہے
وہ مریٰ کا ثبات جاتی ہے

ہائے بیچارگیٔ فکر و نظر
تا حدِ ممکنات جاتی ہے

آدمی کی درندہ خوئی سے
آدمیّت کی بات جاتی ہے

آج ہر بوالہوس ہے صاحبِ دل
قدرِ ذات و صفات جاتی ہے

کر نہ مجبور مسکرانے پر
عظمتِ غم کی بات جاتی ہے

اب تو دے دو پیامِ خلوتِ شوق
چاند چھپتا ہے رات جاتی ہے

ساقیا صرف اپنے اپنوں پر
نگہِ التفات جاتی ہے!

ہم کہے جائیں چُپ اندھیرا ہے
تم کہے جاؤ رات جاتی ہے

کم نگاہیٔ دوست سے اعجاز
لذّتِ حسیّات جاتی ہے

اختر علی تلہری

وہ بھی یہ کہیں عشق میں ناکام یہی ہے
کیا مہر و وفا کا مرے انعام یہی ہے

آنکھوں سے رواں اشک ہیں اُلجھا کے ہے داماں
دنیا میں ترا عاشقِ بدنام یہی ہے

خنداں ہے کوئی کم دہر میں لالو ہے کوئی نالاں
اب تو ہی بتا کیا طربِ عام یہی ہے

دامانِ محبت نہ ترے ہاتھ سے چھوٹے
مردانِ حق آگاہ کا پیغام یہی ہے

ہے دار کہیں اور کہیں طوق و سلاسل
اربابِ وفا کا مگر انجام یہی ہے

ہے سبحہ و زنار میں اُلجھی ہوئی دُنیا
ژولیدگیٔ فکر کا انجام یہی ہے

ہر وقت ہیں لب پر گلۂ تقدیر کے شکوے
ناعاقبت تدبیر سمجھتے کام یہی ہے

بجلی تھی قریب اور نشیمن کو نہ چھوڑا
بربادِ وفا پر ترے الزام یہی ہے

ہے آج سرِ طور وہ بُت انجمن آرا
اے ذوقِ نظر دید کا ہنگام یہی ہے

ہے خونِ رگِ جاں سے قبا لالہ رنگیں
عاشق کا ترے جامۂ احرام یہی ہے

اختر یہ بھی کچھ لطف و کرم ساقیٔ دوراں
اس محفلِ عشرت میں تہی جام ہمی ہے

صغیر احمد صوفی

کیوں سعیٔ غمِ انجام میں دن رات گذارو
اب جام اُٹھاؤ غمِ ایّام کے مارو

ممکن ہے یہی درد مداوائے الم ہو
کیوں چارہ گرِ دردِ محبت کو پکارو

تم بھی شبِ ہجراں میں کبھی کام نہ آئے
دُنیائے تصوّر کے میرے چاند ستارو

اس منبر و محراب میں اک عمر گنوائی
واعظ کبھی مے خانے میں اک شام گذارو

ساغر نہ چلے، گُل نہ کِھلے، رِند نہ بہکے
کیسے دلِ بیمار کو سمجھاؤں بہارو!

تنہائیٔ غمِ زیست کا انعام ہے صوفی
لازم ہے اُسے خونِ تمنّا سے سنوارو

شعر و سخن

ارشد کاکوی

ہو جفا تو وفا کہیں گے ہم
کچھ نہ ہوگا تو کیا کہیں گے ہم

بے نیازی سی بے نیازی ہے
اب انہیں بھی خدا کہیں گے ہم

ہم کو کیا کچھ نہ ان سے کہنا ہے
واقعی ان سے کیا کہیں گے ہم

ہم میں کیا تھا کہ مر مٹے ہم پر
وہ جو پوچھیں تو کیا کہیں گے ہم

بہر تسکین دل تغافل کو
اقتضائے حیا کہیں گے ہم

زندگی ہے تو اپنے ارشد کو
ایک دن آپ کا کہیں گے ہم

ہو نہ آتی ہے لے کے اُن کی یاد
ہم اسے چاندنی نہیں کہتے

اتنی تحقیر ہے کہ ظلمت کو
ہم کبھی روشنی نہیں کہتے

سانس لینے کو یعنی جینے کو
واقعی زندگی نہیں کہتے

کہتے آئے ہیں زندگی کو موت
موت کو زندگی نہیں کہتے

جو بس اپنی غرض کا بندہ ہو
ہم اسے آدمی نہیں کہتے

اپنے غم کو چھپا رہے ہو تم
اس کو ارشد ہنسی نہیں کہتے

رُباعی

ہر چند مری زیست مصیبت ہوتی
آرام کی کوئی بھی نہ صورت ہوتی
اے کاش میں احساس سے عاری ہوتا
واللہ مجھے کچھ نہ شکایت ہوتی

قطعہ

ہو کے مایوسِ کرم بھی آرزو جاتی نہیں
اضطرابِ شوق کی دُنیا سکوں پاتی نہیں
یوں تو اک اک سانس ہے ہمراہی پیکِ اجل
آہ! لیکن زندگی جینے سے باز آتی نہیں

طرفہ قریشی بھنڈاروی

ہر لمحہ تفسیرِ سوزِ محبت شریعت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
تصوّر ترے طاقِ ابرو کا شب بھر عبادت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

محبت کی دنیا میں تکذیب کیسی؟ محبت تو ہے مہرِ تصدیقِ ہستی
وہ افسانہ، "ہم تم" ہے عنوان جس کا حقیقت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

اداؤں کو اُس کی کسی نے نہ سمجھا ستمگر اُسے کہہ کے منہ سب نے پھیرا
مگر پھر بھی اُس نے کسی کو نہ چھوڑا عنایت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

یہ دُنیا یہ ہر سمت دل کش نظارے کہیں لالہ و گل کہیں چاند تارے
یہاں سے وہاں تک تجلّی کے دھارے یہ جنّت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

بنا کر ہمیں اپنے جلووں کا مظہر کیا ساری مخلوق سے اُس نے برتر
یہ اعزاز یہ وقر اللہ اکبر محبت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

یہ مضمون یہ جدّتِ شعر و نغمہ یہ الہام سامانیٔ فکرِ طرفہ
تغزّل کا معیار اور اِتنا اُونچا یہ رحمت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

اُمیدؔ ڈبائیوی

فکرِ تنقیص مے و جام سے آگے نہ بڑھی
پارسائی رَوِشِ عام سے آگے نہ بڑھی

اُس نے چاہا تو بہت درد کا درماں کرنا
بات لیکن کبھی پیغام سے آگے نہ بڑھی

عشق نے عالمِ بے شام و سحر پا ہی لیا
عقل قیدِ سحر و شام سے آگے نہ بڑھی

یُوں تو اُن پر بھی ہے الزامِ محبت لیکن
یہ کہانی کبھی الزام سے آگے نہ بڑھی

شکوہ تو آپ کا کرنا تھا مگر میری زباں
شکوۂ گردشِ ایّام سے آگے نہ بڑھی

میں نے چاہا تو بہت اُن کو بھلانا لیکن
بات یہ کوششِ ناکام سے آگے نہ بڑھی

میرے اُس خواب سے اربابِ جہاں چونک اُٹھے
جس کی تعبیر ترے نام سے آگے نہ بڑھی

اُس کے صدقے میری کُلِ عمرِ وفا جس کی جفا
ایک میرے دلِ ناکام سے آگے نہ بڑھی

اُن سے مدّت کی ملاقات کے باوصف اُمیدؔ
آرزو نامۂ بے نام سے آگے نہ بڑھی

پرکاش پنڈت

محافظ

برف، برف، برف۔ چاروں طرف برف ہی برف ہے۔ جھیل ڈل کا گہرا نیلا پانی برف کی سفید و شفاف چادر تلے سو گیا ہے۔ سامنے شنکر آچاریہ پہاڑ سر سے پاؤں تک برف کا دبیز لبادہ اوڑھے گم سم کھڑا اونگھ رہا ہے۔ پورا شہر بلکہ پوری کائنات ایک گہرے سناٹے، ایک گہری نیند میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ ڈل روڈ کے بجلی کے قمقمے بھی برف کی نرم نرم تھپکیاں سہتے سہتے بالآخر پلکیں جھپکنے لگتے ہیں، لیکن میں بیٹھا تمھیں خط لکھ رہا ہوں۔

سب سے پہلے تو مجھے تمھارے ان خطوں کا جواب نہ دینے کی معافی مانگنا ہے اور کسی قسم کی تاویلیں پیش کرنے کے بجائے تم سے صرف اتنا کہنا ہے کہ اس بار اگر میری جگہ تم یہاں ہوتے اور یہی موسم ہوتا اور یہی مناظر ہوتے اور سب سے اہم بات یہ کہ میری طرح تم ان حسین مناظر کو کینوس کے پردوں میں محفوظ کرنے کے ارادے سے یہاں آئے ہوتے تو دس تو کیا تم میرے دس ہزار خطوں کا بھی جواب نہ دیتے۔

پھر میں تمھیں کیوں خط لکھ رہا ہوں، شاید میرے پاس اس کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ لیکن ادھر میرے ساتھ ایک ایسا حیران کن حادثہ پیش آیا ہے کہ میں سوچتا ہوں اجب تک کسی سے میں اس کا ذکر نہیں کروں گا، مجھے کسی کل چین نہیں پڑے گا۔

حادثے اور کسی کل چین نہ پڑنے سے خدانخواستہ یہ مت سمجھ لینا کہ عام آرٹسٹوں یا سیاحوں کی طرح میں بھی اس حسین وادی کی کسی حسینہ کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہوں اور اب اپنے عشق میں کامیاب ہونے کے لئے تم سے کسی آسان نسخے کا طالب ہوں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ میری بے خیالی میں کسی نے میری جیب کاٹ لی ہو اور میں تم سے کچھ روپیہ منگوانا چاہتا ہوں بلکہ یہ حادثہ بالکل مختلف نوعیت کا حادثہ ہے۔ کچھ اس قسم کا حادثہ کہ جب تمھیں اس کی تفصیل معلوم ہوگی تو شاید تم مسکرا کر اور "ہونہہ" کہہ کر رہ جاؤ گے۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے میرے دوست کہ جس برف کو پینٹ کرنے کے لئے میں نے سینکڑوں میل کا سفر کیا، جس کے لئے سو سو صعوبتیں برداشت کیں۔ کھلن مرگ اور اس سے بھی اوپر الپسنر ایسی دشوار گزار اور خطرناک گھاٹیوں پر چڑھ گیا کہ جہاں ایک لمحے کی بے احتیاطی اور قدرت کی اک ذرا ستم ظریفی میری موت کا باعث ہو سکتی تھی اور جس برف کو مختلف زاویوں سے پینٹ کر کر کے میں نے ہزاروں روپے اور اتنا بڑا انعام کمایا ہے، آج اسی معصوم و مسکین برف سے مجھے نہایت درجہ خوف آتا ہے۔

یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ آج سے سات آٹھ سال پہلے میں ہر برس کشمیر آیا کرتا تھا اور مجھے یہاں کے مناظر سے دیوانگی کی حد تک عشق تھا اور اسی عشق کے باعث میری بنائی ہوئی تصویریں یورپ اور ایشیا کے بڑے بڑے نگار خانوں کی زینت بنی ہیں۔ تم اسے کسی قسم کے جذباتی لگاؤ کا نام دے سکتے ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی خوبصورت سے خوبصورت وادی بھی یہاں کے سبزہ زاروں، پہاڑوں اور یہاں کی شفق اور یہاں کی برف کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آٹھ سال کی اس مدت میں میں نے دنیا کا کونہ کونہ دیکھ ڈالا ہے اور سوئٹزرلینڈ ایسے خطے میں درجنوں مناظر پینٹ کئے ہیں لیکن نہیں، کسی میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکی کہ فطرت اور فن کار، دونوں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ دونوں کا رشتہ روح اور جسم کا رشتہ معلوم ہو اور یہی وجہ تھی کہ جب پیرس کی عالمی نمائش کے دنوں میں مجھے وادیٔ کشمیر پر قبائلی حملے کی خبر ملی اور مختلف اخباروں میں میں نے اس جنت نظیر کے بعض علاقوں کو ویران و برباد دیکھا تو میں نے کشمیر سے متعلق اپنی تمام تصویروں پر سے ان کی قیمتوں کے لیبل پھاڑ ڈالے اور ان پر Not for Sale کی چیپیاں چسپاں کر دیں۔

لیکن وہ حیران کن حادثہ یہ نہیں ہے پیارے کہ مجھے اپنے پسندیدہ مناظر کو دوبارہ پینٹ کرنے کا موقع ملا ہے اور کشمیر کی وادی از سر نو رنگ و نگار ہو اٹھی

ہے اور اب میں کم سے کم اتنی تصویریں پینٹ کر سکتا ہوں کہ پھر میری پوری زندگی آرام و آسائش میں گزر سکے گی۔ بلکہ حادثہ یہ ہے کہ اس دو ماہ کے زمانے میں کہ جب سے میں یہاں ہوں، میں ایک بھی تصویر نہیں بنا سکا۔ اور یہ برف......

شاید اس برف کو تو اب میں کبھی پینٹ نہ کر سکوں گا۔ کیا تم یقین کر سکتے ہو کہ اب جب بھی میں کسی برف زار کو پینٹ کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو مجھے اس برف میں سے شعلے سے لپکتے دکھائی دیتے ہیں۔ میرے ہاتھ شل ہو جاتے ہیں۔ میرا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے اور میرے سامنے زینو آ کھڑا ہوتا ہے۔

زینو، جس کا اصل نام تو خود اُسے بھی معلوم نہیں لیکن جو اب تک سینکڑوں ناموں سے پکارا جا چکا ہے۔ کبھی "ابے او چھوکرے" اور کبھی "ابے او لڑکے" اور کبھی صرف "ابے او" کے نام سے۔ جس کی عمر صرف سولہ برس کی ہے لیکن جو اپنی نصف عمر سے پہاڑی گائیڈ کا کام کر رہا ہے اور انگریزوں امریکیوں، پارسیوں، یہودیوں، ہر رنگ اور ہر نسل کے لوگوں کے ساتھ بلند سے بلند چوٹیوں پر اور گہری سے گہری گھاٹیوں میں گھوما ہے اور بدلے میں جھوٹا کھانا، چند ٹکے اور گالیاں اور تھپڑ وصول کر چکا ہے۔ جس کے سامنے کے دو دانت اس کے بوڑھے باپ نے توڑ ڈالے تھے جس کی ماں کو کوئی نامعلوم افسر اور جس کی بہن کو کوئی نامعلوم سیاح بہکا لے گیا تھا۔ جس کا دایاں بازو کسی انگریز عورت کو فیروزپور نالے میں گرنے سے بچاتے ہوئے خود نالے میں گر جانے سے ٹوٹ گیا تھا اور مناسب علاج نہ ہونے سے بالآخر کٹوانا پڑا تھا اور وہی زینو جو اپنی عمر کی نسبت سے کہیں زیادہ تجربہ کار اور کہیں زیادہ معمر دکھائی دیتا ہے، اِن دنوں میرا پہاڑی گائیڈ ہے۔

تم ضرور سوچ رہے ہوگے کہ اپنے اس حادثے کا ذکر کرنے کے بجائے میں یہ کیا غیر دلچسپ ذکر لے بیٹھا ہوں اور یہ بھی کیا بات ہوئی کہ جب بھی میں کوئی منظر پینٹ کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو اس میں زینو نام کا کوئی ننھا سا مفلوج لڑکا حائل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں تمھیں کس طرح بتاؤں میرے دوست کہ یہ سولہ سالہ زینو جو اب تک کم از کم سولہ سو ناموں سے ضرور پکارا جا چکا ہے اور اِن دنوں ایک طرح سے میرا زرخرید ہے، میرے لئے اچھے سے اچھا کھانا پکاتا ہے۔ فرصت کے اوقات میں میرے ساتھ تاش کھیلتا ہے۔ طرح طرح کے قصّے کہانیوں سے میرا دل بہلاتا ہے اور میری یا تمھاری نظر میں جس کی کوئی خاص وقعت نہیں ہو سکتی، اس زینو کی آنکھ سے آنکھ ملانے کی میں جرأت نہیں کر سکتا۔ اس کے سامنے آتے ہی ایک عجیب احساسِ ندامت بلکہ احساسِ جرم سے میری نظریں جھک جاتی ہیں۔ اور اگر حالات میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہ ہوئی جو صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ یا تو زینو خود مجھے چھوڑ کر چلا جائے یا پھر میں اسے ملازمت سے برطرف کر دوں لیکن سر دست چونکہ یہ دونوں باتیں ناممکن نظر آتی ہیں لہٰذا مجھے اندیشہ ہے کہ تمھارا یہ فن کار جس کے برش کے کرشمے دیکھنے کے لئے نہ تم ہی نہیں پوری دنیا منتظر ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پینٹنگ بھول جائے گا۔

یہ میرے یہاں آنے کے پندرہ روز بعد کا واقعہ ہے غالباً ہم چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھے اور میں بے حد خوش تھا کیونکہ پندرہ روز کی دوڑ دھوپ اور ناامیدی کے بعد اب اچانک ایک ایسا خوبصورت زاویہ مل گیا تھا اور میرا برش اس تیز رفتاری سے اپنا کام کر رہا تھا کہ خود مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں نے زینو سے کہہ دیا کہ وہ وہیں خیمے گاڑ دے۔ خاکے کے بجائے پوری تصویر مکمّل ہونے تک ہم وہیں قیام کریں گے۔

یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں دن بھر تو برف کے ہلکے ہلکے گالے پڑتے تھے لیکن رات کو شدید برف باری ہوتی تھی۔ پھر بھی موسم کی تمام خلل اندازیوں کے باوجود تصویر بڑی سرعت سے پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی تھی اور چوتھے روز جب میں تصویر میں آخری ٹچ دے رہا تھا اور تصویر کی طرف دیکھ دیکھ کر پھولے نہیں سما رہا تھا کہ اچانک زینو بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور بے طرح ہکلاتے ہوئے اس نے اطلاع دی کہ ہم محفوظ مقام پر نہیں ہیں اور ابھی تھوڑی دیر میں بڑا بھیانک طوفان آنے والا ہے۔ اور سچ مچ ابھی ہم اپنا ساز و سامان سمیٹ بھی نہ پائے تھے اور زینو کی ہدایت کے مطابق پہاڑی ٹٹوؤں کو خیمے کے اندرونی اطراف میں کھڑا نہیں کر سکے تھے کہ ایسا معلوم ہوا جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ بڑی بڑی سنگلاخ چٹانیں لڑھکنے لگیں گویا ہمارے سروں کے اوپر سے گزرنے لگیں۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے پہلے ایک اور پھر دوسرا ٹٹو طوفان کے ریلے میں بہہ گیا اور پھر — چیختا چنگھاڑتا یہ بڑا پتھر گولی کی سی تیزی سے ہمارے خیمے کے باہر جمی ہوئی برف اور خیمے کے کینوس کو چیرتا ہوا آر پار ہو گیا اور مارے دہشت کے زینو کی چیخ نکل گئی۔

ایسے خوفناک طوفان میں اور ایسی بلندی پر کسی انسانی جان کا زندہ

بچ رہنا اور وہ بھی اس طرح کہ اُسے بالکل معمولی خراشیں آئی ہوں کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ دو گھنٹے کے بعد جب طوفان کا زور قدرے ہلکا پڑا اور میں نے اپنے آپ کو ٹٹول ٹٹول کر یقین کر لیا کہ ابھی تک زندہ ہوں تو میں نے مارے خوف سے نیم جاں زینو کو جھنجھوڑا:

"زینو! اُٹھو زینو!!"

زینو بدستور دہشت زدہ تھا۔ اس کی زبان سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ میرے جھنجھوڑنے پر وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ "ابھی نہیں، ابھی نہیں۔"

اور پھر میرے ڈانٹنے پر اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بتایا کہ طوفان ابھی ختم نہیں ہوا۔ کچھ دیر بعد پہلے سے بھی شدید ریلا آئے گا اور اس ریلے میں ہم کسی طرح بچ نہیں سکیں گے اور اس نے دعا کے لئے ہاتھ اوپر اُٹھا دیئے۔ اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"تو پھر ہمیں جلدی سے کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جانا چاہیئے۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "کیا کہیں قریب پناہ مل سکتی ہے؟"

"ہاں" موت کے بھیانک خوف میں سے دبی دبی آواز اُبھری۔ لیکن پھر میں نے دیکھا کہ دوسرے ہی لمحے میں اس کے تیور بدل گئے ہیں۔ اس کا سارا خوف و ہراس جاتا رہا ہے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور عجیب و غریب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"کہاں؟ یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"زیادہ دُور نہیں" اس نے بڑی مضبوطی سے کہا۔ "لیکن میں آپ کو وہاں نہیں لے جاؤں گا۔"

"کیا بکتے ہو۔" مجھے کسی طرح اُس سے اس توہین آمیز جواب کی توقع نہیں تھی جھنجھلا کر میں نے اسے پرے دھکیل دیا۔ "کیا اپنے ساتھ مجھے بھی......"

"کچھ بھی ہو۔" اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے اور میرے اور اپنے رشتے کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔ "وہاں رشیماں رہتی ہے اور اس کا باپ رہتا ہے۔"

"تو اس سے کیا ہُوا؟" میں نے ڈپٹ کر کہا۔

"رشیماں خوبصورت ہے اور اس کا باپ بوڑھا ہے۔"

"میں پوچھتا ہوں اس سے کیا ہُوا" میں نے اور بھی ڈپٹ کر کہا۔

"اس لئے میں آپ کو وہاں نہیں لے جا سکتا۔ میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے بڑی دلجمعی اور اطمینان سے جواب دیا اور دعا کے لئے پھر ہاتھ اُٹھا دئے۔

اور اسی لئے میرے پیارے دوست! میں تم سے کہتا ہوں کہ اب جب بھی میں کسی برف زار کو پینٹ کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو صدیوں کی جمی ہوئی اس معصوم و سنگین برف میں سے مجھے شعلے سے لپکتے دکھائی دیتے ہیں۔ میرے ہاتھ شل ہو جاتے ہیں۔ میرا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے اور میرے سامنے زینو آ کھڑا ہوتا ہے۔

زینو جس کا کوئی نام نہیں اور جس کے ہزاروں نام ہیں۔

حبیب احمد

سرزمینِ عشق

تصوّر کیجئے ایک سرسبز و شاداب وادی کا ایک لمبی چوڑی گنجان چراگاہ کا۔ جو ایک ہری بھری پہاڑی کے دامن میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہے پہاڑی سے میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر شفاف و شیریں پانی کا ایک حسین دریا لہریں مار رہا ہے اور اس کی چمکیلی ریت کے ذرّوں کی تابانی مہ و انجم کو شرما رہی ہے ؎

وہ سنسان جنگل وہ نورِ قمر
وہ بُرّاق سا ہر طرف دشت و در
وہ اُجلا سا میداں چمکتی سی ریت
اُگا نور سے چاند تاروں کا کھیت

ندی کے قریب، پہاڑی کے دامن میں ہند قدیم کی قوموں میں سے ایک قدیم قوم اہیر کی بستی ہے۔ چند چھوٹے چھوٹے پتھر پر پتھر رکھ کر مٹّی سے چُنے ہوئے مکانات، اُن کے قریب جانوروں کے باڑے۔ اس چھوٹے سے گاؤں کے گرد نہ سڑکیں ہیں، نہ کشادہ شاہراہیں، نہ دُور دُور کسی اور گاؤں کا پتہ ہے۔ جنگل اور پہاڑ میں تیندؤں اور بھیڑیوں کا مسکن ہے، اور رات کے سناٹے میں اُن کے دہاڑنے کی آواز بھی آجاتی ہے۔ پہاڑی، جنگل اور ندی کے اس نظر فریب مجموعے کو آپ "ڈُونگرا" کہیئے کہ یہی اس کا نام ہے قافلے آتے اور جاتے رہتے ہیں، چراگاہ کی شادابی کی وجہ سے یہاں ٹھیرتے ہیں اور اپنے جانوروں کو چراتے ہیں۔ پانچ میل دور "ڈونگرے" سے ہندوروں کا جنگل ہے، جہاں سلطان محمود غزنوی نے توپ خانے کے بیلوں کو جن کی تعداد سینکڑوں ہے چرائی پر چھوڑ رکھا ہے۔ یہ مقام اجمیر سے ۱۲ کوس کے فاصلے پر ہے۔ اجمیر کے راجہ اجایان پرتھی راج سے اس میدان میں جنگ بھی ہو چکی ہے، مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کے ناول "منصور موہنا" کے ہیرو اور ہیروئن جناب منصور اور شاہزادی "موہنا" "رتسیا" کی پہاڑی کے کنارے آسودۂ خواب ہیں اور زبانِ حال سے گویا ہیں ؎

طمع فاتحہ از خلق نداریم نیاز
عشق آمد پس من فاتحہ خوانم باقی است

سردار منصور کی قبر پختہ بن گئی ہے، اس پر گنبد بھی نظر آرہا ہے۔ اور اہیروں کی بستی کے قریب کچھ نئی قسم کی آبادی دیکھی جانے لگی ہے۔ بولی تو ان لوگوں کی وہی ہے جس کا نمونہ امیر خسرو علیہ الرحمتہ نے دیا ہے ؎

ہندو بچہ ہیں کہ عجب نام دھرے ہیں
بردقتِ سخن گفتن مکھ پھول جھرے ہیں
گفتم زلبِ لعل تو یک بوسہ بگیرم
گفتا کہ ارے رام ترک کاہیں کرے ہیں

لیکن ہیں یہ لوگ مسلمان، عورتوں کی زندگی بھی مردانہ مشقتوں کی حامل ہے، پردے کا رواج نہیں، کپڑے غضا پہنا، جنگل سے لکڑیاں چُن کر لانا، کنویں، باولی سے پانی بھرنا ان عورتوں کے دن رات کے ضروری مشاغل ہیں۔

زمانہ یونہی گزرتا چلا جا رہا ہے، قافلوں کی آمد و رفت جاری ہے، دکن جاتے ہوئے کسی شاہزادی کا راہ میں اس بستی کے قریب انتقال ہو جاتا ہے، اب وہ یہیں دفن ہے، جنگل میں ایک بڑا مزار بن گیا ہے، حفاظ قرآن خوانی کے لئے مقرر کر دئے گئے ہیں۔ ایک باولی پانی کے لئے بنوا دی گئی ہے جو دریا شاہ کی باولی کے نام سے موسوم ہے، اس لئے کہ یہاں پہلے سے ایک بزرگ "دریا شاہ" کا مزار موجود ہے۔ جن کی قبر تو نمایاں ہے۔ لیکن اُن کی شخصیت پر مرورِ ایّام کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ غرض ڈونگرے کی جائے وقوع عجب رومان انگیز ہے۔

اس کے گلستاں پُر فضا، اس کی بہاریں دل نشیں
اس کی زمینیں خوشنما، اس کی فضائیں مرمریں
اس کے نظارے دل کُشا، اس کی ہوائیں عنبریں
مثلِ بہشت گلفشاں
اک سرزمینِ عشق ہے

"منصور اور موہنا" اس کی ابتدائی تعمیر کی بنیاد میں سو رہے ہیں، ساتھ ہی محبت کا مارا ہوا "رسیا" "انچھوتا" دیوی کے فراق میں برسوں نالہ و فغاں کر کے ختم ہو چکا ہے۔ اگرچہ

نہ تھی حائل میانِ حُسن و اُلفت کوئی مجبوری   نہ تھا کچھ فاصلہ ایسا نہ تھی کچھ اس قدر دوری
رہے لیکن جُدا اک دوسرے سے عمر بھر دونوں   فراق و ہجر میں کرتے رہے شام و سحر دونوں

جاننے والوں نے اس وارفتۂ محبت کی خاکستر پر "ٹونکرے" کی سب سے اونچی چوٹی پر ایک چھتری بنا دی ہے -

اور

اسی کے نام سے منسوب ہے یہ ٹیکری اب تک   اُسی کے داستانِ عشق کی ہے آج تک شہرت

گویا "رسیا" اور "اپورنا" ان اطراف کے "سوہنی مہین وال" ہیں -

"رسیا کی یہ ٹیکری" میلوں سے نظر آتی ہے اور ہر باہر سے آنے والے کو دعوتِ نظارہ دیتی ہے -

رسیا کی ٹیکری نظر آئی وہ دُور سے
ہر اک قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہیئے   (اختر شیرانی)

تاریخ کے دُھندلکے میں کچھ معلوم اُجالے دیکھنے کے بعد آیئے اب موجودہ "ٹونک" کی قدیم و جدید عمارتوں کی تفصیلی سیر کریں، اس لئے کہ اب یہ مقام "ٹونکرا" نہیں بلکہ "محمد آباد" کی شاہراہ سے گزرتا ہوا صرف "ٹونک" رہ گیا ہے، اس کے ساکنین نے وسعت اختیار کر لی ہے - کوٹھیاں، حویلیاں، مسجد، مندر اور تالاب بن گئے ہیں، قدیم باشندوں کے کردار و گفتار میں مٹھاس ضرور ہے لیکن زمین کے اثر کی سختی نہیں گئی ہے ٹونک کے لوگ ٹونک کے خربوزوں کی طرح شیریں، مگر کچھ سخت ہوتے ہیں اور "کھرڈوں" (خربوزے کی ایک قسم) کی طرح مزے داری کے ساتھ ان میں کرختگی بھی ہوتی ہے -

بنارس کی صبح پر لوگ سر دُھنتے ہیں، اور گنگا کے کناروں اور گھاٹوں پر پری پیکروں کے علی الصباح تعاون کا تماشہ کشتیوں میں بیٹھ کر بیچ دھار میں چلتے ہوئے دیکھتے ہیں، علی حزیں بنارس کے تقدس پر غش ہیں -

از بنارس نہ روم معبد عام است ایں جا!
ہر برہمن پسرِ لچھمن و رام است ایں جا!

لیکن ٹونک کا شاعر حسینانِ ٹونک پر مٹا ہوا ہے اور کہتا ہے ؎

مپرس از جائیکہ در آدمی است   کہ غولِ بیابان بشکل پری است
زن و مرد ہر دو دراں تندرست   نہ زن چست چوں کاشی و مرد سست
شکم پست و سینہ بلند آورد   (خستہ)   نہ ہم چوں بنارس شکم پرورد

میں حیران ہوں کہ کس مقام سے آپ کو سیر شروع کرائی جائے، آپ چونکہ باہر سے آ رہے ہیں، اس لئے سب سے پہلے "بناس" ندی کے پل سے گزریئے اور اس کی تصویر دیکھئے -

"رود بناس" ہے یا چشمۂ تسنیم کی موج
اسے کوثر کہیں یا آبروئے موجۂ نیل   (سیماب اکبرآبادی)

یا پھر اختر شیرانی مرحوم کی زبان میں

جوں گود میں اپنے من کو لئے ناگن ہو کوئی تھراتے ہوئے
یا نور کی ہنسلی حور کی گردن میں ہو عیاں بل کھاتے ہوئے

سادہ اور خوبصورت، ایک میل کی بخط مستقیم لمبائی جس کو دیکھ کر "پل صراط" کا تصور تو آ جاتا ہے لیکن چلتے چلتے کٹ کر گرنے کا کوئی خوف نہیں ہوتا چوڑا اتنا ہے کہ دو لاریاں بیچ میں بال برابر فرق چھوڑتی ہوئی آر پار گزر جائیں - پتھر اور سیمنٹ کے مستحکم ستون، جو بناس کی طوفانی روانی کے وقت بھی سینہ تانے کھڑے رہتے ہیں - شہر کی سمت پل کی تعمیر ٹھیک ان پہاڑی چٹانوں کی جڑ سے شروع ہوتی ہے جہاں کسی زمانے میں ایک چبوترہ بنا ہوا تھا اور چڑھی ہوئی ندی کو پار کرنے کے لئے برسات کے دنوں میں "نوگزے بابا کی جے" کے نعروں میں "ناد" چھوٹی تھی اور

بڑی دقتوں کا یہاں سامنا تھا   کئی لوگ اکثر ہوئے غرقِ دریا
یہی بیسویں مرتبہ "ناد" اس جا   (ذاکر ٹونکی)   ندی کیا ہے طوفاں ہے گویا سراپا

پُل کی تعمیر پانچویں فرماں روائے ٹونک نواب سعادت علی خاں مرحوم کی رہین منت ہے - ذیل کے شعر سے تاریخ تعمیر ظاہر ہے ؎

ہر کہ می گزرد چنیں طرفہ تماشا بنگرد   آب زیرِ پل رواں ہم مردمان برپل روند
۱۳۵۵ھ   ۱۹۳۶ء

پُل کے نیچے پانی کی دھار صاف اور شفاف بارہ مہینے بہتی رہتی ہے، مچھلی کے شوقین شکاری پانی میں ڈوریں ڈالے ہوئے بالکل بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں، کسی کسی وقت ساحل کے سناٹے میں یہ آواز گونجنے لگتی ہے

چل چل ری ندیا بنسی ڈوبت ناہیں

پل کے ایک سرے پر دامن کوہ میں ایک درگاہ بنی ہوئی ہے، جو "نوگزے" یا "نوغزے" صاحب کی درگاہ کے نام سے مشہور ہے

تاریخ ٹونک میں صاحب مزار کا نام "سید الشہید محمود شاہ" مرقوم ہے۔

اب آپ یہاں سے آگے چلیئے۔ اس مقام سے دو میل کے فاصلے پر ایک پختہ بند "پکے بندے" کے نام سے ہے۔ بند کے کنارے چٹانوں کے بلند ٹیلے پر نواب ابراہیم علی خاں مرحوم کی بنوائی ہوئی ایک خوبصورت کوٹھی ہے۔ نواب صاحب مرحوم ٹونک میں تعمیر کے باب میں اپنے وقت کے شاہجہاں تھے۔ شہر کے اطراف میں ٹھنڈی سڑکیں جو پہاڑوں اور جنگلوں میں سے گزرتی ہیں جن پر دو طرفہ سایہ دار درخت لگے ہوئے ہیں اور ٹونک کی قدیم قابل دید عمارتیں زیادہ تر ان ہی کی تعمیر کردہ ہیں۔

"پکے بندے" کی کوٹھی کے بنانے میں ایک خاص صنعت سے کام لیا گیا ہے اور وہ یہ کہ نیچے سے دو منزلیں صاف نظر آتی ہیں لیکن جب آپ اوپر جائیں تو آپ بالائی منزل پر پہلے پہنچیں گے اور آپ کو یہ محسوس نہ ہوگا کہ اس کے نیچے بھی کوئی عمارت ہے۔ جب تک کہ ایک بغلی دروازہ جو ایک گوشے میں واقع ہے کھول کر نیچے اترنے کا راستہ نہ بتایا جائے۔ نیچے کی منزل اوپر والی منزل سے زیادہ وسیع ہے اور اس میں کمرے بھی زیادہ ہیں۔ نواب صاحب کی بنوائی ہوئی ایسی کوٹھیوں میں انگریزی طرز کے تمام کمرے پائے جاتے ہیں۔ مطالعے کا کمرہ، سونے کا کمرہ، کھانے کا کمرہ اور دوسرے ضروری کمرے موجود ہیں۔ جن میں تمام ضروری سامان اور قیمتی و نادر فرنیچر آراستہ رہتا تھا۔

"بند" کے مغربی سمت سڑک کے کنارے بہت سے بڑ کے درخت ہیں۔ برابر برابر ایک فرلانگ تک پھیلے ہوئے ہیں برسات کے موسم میں ساون بھادوں کے مہینے میں ہر جمعرات کو یہاں میلا ہوا کرتا تھا۔ جس میں شہر کے مسلمانوں کی زیادہ تر بے پردہ برادریاں مع مردوں، عورتوں اور بچوں کے بڑے اہتمام اور شوق کے ساتھ شریک ہوتی تھیں۔ رنگ برنگے کپڑے، طرح طرح کے پکوان، مٹھائی اور نمکین کھانوں کی دوکانیں، بچوں کے کھلونوں کی خرید و فروخت، چار بیت کی ٹولیاں، جھولوں کے مقابلے غرض عجب چہل پہل رہتی تھی۔ اس میلے کو "ڈوگڑے" کا میلہ کہا جاتا تھا اور اس کو دیکھ کر دہلی کے شاہی زمانے کا میلہ "پھول والوں کی سیر" یاد آجاتا تھا، ٹونک کی ریاست کے غربا، امرا، ہندو اور مسلمان یہاں بھی مغلیہ تمدن کی زندہ تصویر تھے۔ اس "میلے" کے موضوع پر مجھے مولانا فضائی مدظلہ کے کچھ اشعار یاد آرہے ہیں۔

میلے میں ڈوگڑے کے حسینوں کا جھولنا ۔۔۔ آواز وہ سہانی وہ گانا ملار کا
بجلی کا اودی اودی گھٹاؤں میں کوندنا ۔۔۔ آنا وہ جھوم جھوم کے ابر بہار کا

اختر شیرانی مرحوم کی مشہور نظم "او دیس سے آنے والے بتا!" کا بھی ایک بند اس سلسلے میں اور سن لیجئے۔

کیا اب بھی وہاں میلوں میں، وہی برسات کا جوبن ہوتا ہے
پھیلے ہوئے بڑ کی شاخوں میں، جھولوں کا نشیمن ہوتا ہے
امڈے ہوئے بادل ہوتے ہیں، چھایا ہوا ساون ہوتا ہے
او دیس سے آنے والے بتا

"پکے بندے" سے شہر آنے والی سڑک پر بڑ کے درختوں سے کچھ دور سڑک کے مغربی سمت "گلاب شاہ" پیر کا مزار ہے، یہ ایک چھوٹی سی درگاہ ہے، نواب ابراہیم علی خاں کے عہد میں "باورچی خانۂ خاص" سے ہر جمعرات کو "پلاؤ" کی دو دیگیں ایک گاڑی میں رکھی ہوئی ایک داروغہ کی نگرانی میں فوجی پہرے کے ساتھ مزار پر آتی تھیں۔ ایک دیگ کا کھانا "گلاب شاہ" کے مزار پر اور دوسری دیگ کا کھانا "ڈوگڑے صاحب" پر مساکین و مستحقین کو تقسیم کیا جاتا تھا۔

نواب ابراہیم علی خاں کا معمول تھا کہ روزمرہ بلا ناغہ وہ اس طرف "ہوا خوری" کو آتے تھے، اور گلاب شاہؒ کے مزار کے بالمقابل سڑک پر بگھی یا موٹر ٹھہرا کر فاتحہ پڑھتے تھے، یہاں ہمیشہ ایک تکیہ دار فقیر رہا کرتا تھا، جو مزار کی چراغ بتی کرتا تھا، عبد الغنی بابا ساکن محلہ کھڑکی دروازہ کو اس مزار کی خدمت کرتے ہوئے بہت لوگوں نے دیکھا ہوگا۔

درگاہ کے سامنے تھوڑے فاصلے پر فردوس مکاں نواب امیر الدولہ کے جرنیل فوج مختار الدولہ محمود خاں کی تعمیر کردہ باؤلی اور مسجد کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔

"گلاب شاہ" سے شہر کی سمت ڈیڑھ میل اور آجائیے تو آپ کو یہاں سب سے پہلا محلہ "چھاؤنی" کے نام سے ملے گا۔ یہ محلہ فوج کی چھاؤنی تھی ۱۲۲۱ھ میں نواب امیر الدولہ کی فوج کا حیدری کیمپ یہاں قائم کیا گیا تھا جرنیل فوج مختار الدولہ اسی کیمپ میں رہتے تھے، فوج کی بیرکیں کچی مٹی اور کویلوں کی بنی ہوئی تھیں۔ جن کا اب نشان بھی نہیں چھاؤنی کے معزز ساکنین میں

صوبے دار حیات محمد خاں، حضرت محمد علی شاہؒ، مولانا عبدالکریم صاحب اور مولانا محمد حسن خاں بہت مشہور ہیں، آخر الذکر علما کی وجہ سے چھاؤنی مرجع خلائق تھی، ۱۳۰۲ھ میں مولانا عبدالکریم صاحب کی تحریک پر نواب فردوس زمانی بیگم نے یہاں ایک خوبصورت پختہ مسجد جس کے صحن میں حوض اور متصل کنواں ہے تعمیر کرائی تھی۔ مسجد کے دالان کی پیشانی پر اشعار ذیل مکتوب ہیں۔

چو فردوس زمانی بیگم از صدق   بنا فرمود مسجد بہر دادار
زر بسیار کردہ صرف تا شد   چنیں پاکیزہ مسجد زود تیار
بشد ایں مسجد بے مثل معمور   بسالِ یک ہزار و سہ صد و چار
ز ناظر گیر تاریخ تمامش   چنیں جامع فردوس است گلزار

۱۳۰۵

چھاؤنی کے مشرقی سمت میں ایک تالاب ہے، اور ایک چھوٹی سی پہاڑی پر "انپورنا دیوی" کا مندر ہے۔ برسات کے موسم میں "ان پورنا" کا میلہ ہوتا ہے اور ٹونک کی ہندو آبادی عورت مرد اس میلے میں شوق سے حصہ لیتے ہیں، صاحبزادہ حامد سعید خاں ساحل نے "انپورنا دیوی کا مندر" عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس کے کچھ اشعار یہ ہیں۔

فضائے کوہِ انپورنا بہار شام ہوتی تھی   یہاں کی شام بھی گویا سحر ہنگام ہوتی تھی
چراغوں سے پہاڑی جگمگا اٹھتی تھی راتوں کو   ضیا تا دور یکسر کیف زا پیغام ہوتی تھی
کھلا رہتا تھا بابِ بتکدہ آٹھوں پہر یونہی   صدا ناقوس کی گویا صلائے عام ہوتی تھی
حوادث کا اثر اتنا ہی ہوتا تھا پہاڑی پر   کہ بعد شب سحر ہوتی سحر سے شام ہوتی تھی

سحر ہوتے ہی مندر کے پجاری جاگ جاتے تھے   پرستش کے ترانے اور بھیرویں راگ گاتے تھے
پرستش کرنے والے جمع رہتے تھے یہاں ہر دم   عقیدت مندیوں کے پھول مندر پر چڑھاتے تھے
بتوں کے سامنے سجدے جبینوں کے قیامت تھے   کہ اپنے ہی پرستاروں سے بت شرماتے جاتے تھے
غضب تھے سیکڑوں پیشانیوں پر احمریں قشقے   فروزاں شام ہو جاتی تھی جب یہ جگمگاتے تھے

چھاؤنی سے سمت جنوب سیدھی سڑک چلی گئی ہے، جو شہر کے جنوبی حصے میں سے گزرتی ہوئی دیلی چھاؤنی چلی جاتی ہے جو یہاں سے ۴۹ میل ہے چھاؤنی سے مغربی سمت جو سڑک جاتی ہے وہ "رسیا" کے دامن سے گزرتی ہوئی شہر میں داخل ہو کر "گھنٹہ گھر" پہنچ جاتی ہے، اس سڑک کے پہلے موڑ پر داہنی سمت پرانی فصیل اور مسدود دروازہ ویران حالت میں نظر آتا ہے "گھنٹہ گھر" نئی عمارت ہے، یہ مینار ۱۹۳۶ء میں بعہد نواب سعادت علی خاں تعمیر ہوا ہے۔ رات کو بارہ بجے جب شہر میں سناٹا ہوتا ہے گھنٹے کی آواز سارے شہر میں سنائی دیتی ہے، آواز دلکش ہے۔ گھنٹہ گھر کے اطراف میں مقامی کچہریوں، سیشن جج، منصفی، مجسٹریٹی، ٹرژری اور میونسپل آفس کی عمارتیں ہیں۔

گھنٹہ گھر سے آگے بڑھ کر سڑک شمالی سمت مڑتی ہے۔ یہاں دربار ہائی اسکول کی قدیم عمارت اور موٹر اسٹینڈ ہے۔ دربار ہائی اسکول کی عمارت میں اب کلکٹری آفس آگیا ہے، اور اسکول "نذر باغ" کے قریب "ناتمام کوٹھی" میں منتقل ہو گیا ہے۔ موٹر اسٹینڈ بھی نو تعمیر جگہ ہے اور عہدِ اسماعیلی و مسٹر منظور عالم ایڈوکیٹ کی چیرمینی کی یادگار ہے۔

اسی سڑک پر مال پورہ دروازہ کے سامنے مولانا حیدر علی مرحوم کی تعمیر کردہ مسجد، اور حکیم الہند مولانا حکیم برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مقبرہ ہے مولانا حیدر علی مرحوم سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ آپ کا شمار مشاہیر علما میں ہوتا تھا، نواب وزیر الدولہ خلد آشیاں نے آپ کو ریاست کا مدار المہام بنا رکھا تھا۔

"گھنٹہ گھر" سے سمت شمال میں شہر ٹونک کی قدیم آبادی ہے جس کو "پرانا ٹونک" کہتے ہیں۔ پرانے ٹونک میں سرادگیوں کے مندر، چھوٹے بڑے تکیے، جامع مسجد اور صاحبزادہ احمد خاں کی حویلی قابل دید عمارات ہیں۔ صاحبزادہ احمد خاں مرحوم کی حویلی نہایت عالی شان اور پر شکوہ ہے حویلی میں کئی مسجدیں اور کنویں ہیں، صدر دروازے پر منجملہ دوسرے اشعار اور قطعوں کے یہ حدیث بھی مرقوم ہے "کن فی الدنیا کانک غریبٌ او کعابر سبیل"، قاضی شہر ٹونک کی تاریخی حویلی جو شاہان مغلیہ کی عطیہ ہے وہ بھی پرانے ٹونک ہی میں ہے۔ پرانے ٹونک کے ایک بازار میں ایک چھوٹی مسجد اور اس سے ملحق ایک چھوٹا مندر ہندو مسلم ایکتا کی یاد دلا رہا ہے۔

"گھنٹہ گھر" سے سمت جنوب میں "نوابین" کے زمانے کا بسایا ہوا شہر اور بازار ہے، گھنٹہ گھر سے متصل "علی گنج" بازار ہے۔ جو ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں بعہدِ نواب محمد علی خاں مرحوم آباد کیا گیا ہے۔ اس سے متصل نواب

وزیر الدولہ کا آباد کردہ بازار "وزیر گنج" ہے۔ پھر "امیر گنج" بانیِ ریاست نواب امیر خاں کے زمانے کا تعمیر کردہ ہے۔ نواب امیر خاں کے میر منشی دربار منشی لبسا دن لال سکسینہ شاداں کے قطعۂ ذیل سے تاریخ تعمیر ظاہر ہے۔

گنجے بنا نمود چو نواب نامدار — از خرمی پرست و سراسر تہی زرنج
تاریخ آں بجست چو شاداں زہاتفے — گفتا ر دلکشا ست زنام امیر گنج
۱۲۴۴ھ

علی گنج بازار میں" والٹر زنانہ ہسپتال"، یونانی شفاخانہ، شفاخانۂ حیوانات کی عمارتیں ہیں۔ اونچی کرسی کی ایک مسجد بھی اسی بازار میں ہے جس کو حکیم سردار شاہ مرحوم نے ۱۲۸۳ھ میں تعمیر کرایا تھا، بزازخانہ میں "دارالعلوم خلیلیہ برکاتیہ" کی تاریخی عمارت ہے، جس پر جلی حرفوں سے دارالعلوم کا نام اور سن قیام ۱۸۹۹ء / ۱۳۱۷ھ مکتوب ہے۔

دارالعلوم خلیلیہ برکاتیہ، حکیم الہند مولانا سید برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ اور نواب ابراہیم علی خاں والیِ ٹونک کی علمی یادگار ہے — نواب ابراہیم علی خاں اپنے آبا و اجداد کی طرح علم دوست رئیس تھے۔ آپ کے عہدِ حکومت میں علماء اور فضلاء کی بڑی عزت تھی۔

دارالعلوم خلیلیہ سے تھوڑے آگے بڑھنے پر ہٹو کی مسجد آجاتی ہے۔ ہٹو کی مسجد کے چوراہے پر دائیں ہاتھ کی جانب "کوچہ حکیم برکات احمد" کا بورڈ آپ کو دعوتِ نظارہ دے گا۔ یہ وہ کوچہ ہے، جہاں علم و عرفاں کی بارش ہوتی تھی، اور علامۃ الہند مولانا حکیم سید برکات احمد صاحب اپنے دولت کدہ "برکات منزل" میں بیٹھ کر تشنگانِ علوم کو سیراب کرتے تھے۔ "برکات منزل" سے متصل" مولانا حکیم سید ظہیر احمد صاحب برکاتی کا دولت کدہ" شفاء منزل" ہے۔ حکیم برکاتی صاحب، مولانا برکات احمد کے نواسے اور ان کے جانشین ہیں۔ دارالعلوم خلیلیہ کا اہتمام و انصرام آپ کے سپرد ہے آپ ہز ہائی نس ٹونک کے طبیبِ خاص بھی ہیں۔

یہاں سے آگے چلیئے تو اہل سادات کی تعمیر کردہ مسجد قافلہ آئے گی اور پھر نائب الریاست سر عبید اللہ خاں مرحوم اور صاحبزادہ عباد اللہ خاں کی عالیشان حویلیاں ملیں گی۔ سب سے آخر میں "بڑا کنواں" اور جامع مسجد کی عمارت ہے۔ جامع مسجد بہت ہی خوبصورت اور حسین عمارت ہے اس کے طویل مینار میلوں دور سے نظر آتے ہیں۔ مسجد کی محرابیں منقش اور طلا کار ہیں، اس کی تعمیر کی ابتدا نواب امیر الدولہ کے عہد میں اور تکمیل نواب ابراہیم علی خاں کے عہد میں ہوئی ہے۔ بیچ کی محراب میں دوسرے تاریخی قطعات اور اشعار کے ساتھ حسب ذیل شعر بھی مرقوم ہے۔

شگفتہ تم بھی اب تاریخ اس کی اس طرح کہہ دو
بنا اک دوسرا کعبہ یہ ابراہیم ثانی کا
۱۲۹۸ھ

جامع مسجد سے جانب مغرب سیدھے چلے جائیے۔ تھوڑے فاصلے پر شاہی محلات آجاتے ہیں جو" نذر باغ" کے دلکش نام سے موسوم ہیں۔ اس باغ میں پانچ کوٹھیاں عظیم الشان طلا کار ہیں اور ایک بھی بھون" ہے۔ وسطِ باغ میں "شیش محل" ہے جو سراپا مطلا و مذہب ہے، اور ہندی معماروں اور دست کاروں کی صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ نذر باغ کے مشرقی سمت فردوس مکان نواب سعادت علی خاں بہادر کی ملکہ" ہز ہائی نس نواب امیر الزمانی بیگم صاحبہ کا محل" امیر منزل" ہے

" نذر باغ" کے سامنے "قلعہ معلی" ہے، جس کے ذرّے ذرّے سے والیانِ عظمت کی جھلک ہویدا ہے اور جو آج بھی اپنی شوکت رفتہ کی داستاں زبانِ حال سے اس طرح سنا رہا ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے
ساقی یہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی — مطرب یہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامان باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

داغ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

قلعے کے اندر ایک اور چھوٹا قلعہ ہے، جس کو بالا قلعہ کہتے ہیں۔ شاہی محلات کے علاوہ توشہ خانہ، نواب خانہ، کتب خانہ، مسجدیں اور دفاتر کی عمارتیں قلعے میں موقع بموقع تعمیر ہیں، دیوان خانہ خاص اور عام لائقِ دید ہے، قلعے کے بارہ برج ہیں۔ ہر زمانۂ ریاست میں ایک سو پچیس

توپیں ہر وقت تیار رہتی تھیں۔

گھنٹہ گھر سے سمتِ مغرب میں سیدھی سڑک چلے جائیے تو کچھ ہی فاصلے پر "سعادت ہسپتال" کی عمارت ملے گی۔ یہ نواب سعادت علی خاں کے دور کی خوشنما یادگار ہے۔

کہ تعمیر شد با ہزاراں نفاست
شفاخانۂ نو بعہدِ سعادت

یہاں سول لائن کے بنگلوں کی عمارتیں بھی ہیں۔ جن میں کلکٹر صاحب ٹونک اور دیگر حکام مقیم ہیں۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک گول کوٹھی ہے جس کو عرف عام میں ایجنٹی بنگلہ کہا جاتا ہے۔ یہ بنگلہ پولٹیکل ایجنٹ اور دوسرے انگریز حکام کے قیام میں کام آتا تھا۔ اب یہ بنگلہ کوٹھی نمبر ۱ کہلاتا ہے اور بعد میں بنی ہوئی کوٹھیاں نمبر ۲، نمبر ۳، نمبر ۴ سے موسوم ہیں۔

ٹونک کی قابل دید عمارتوں میں عیدگاہ باغ کی دو کوٹھیاں بھی تھیں خاص طور پر ان کی آرائش ترکی قالینوں سے لے کر ایک ٹی رسون تک ہر چیز دیکھنے کے قابل تھی، شیروں کے مجسمے اور ان کی کھالیں کوٹھی کے منظر میں ایک طرفگی پیدا کرتی تھیں، باغ کی آبادی اور کوٹھیوں کی آرائش پر پہلے عملہ مقرر تھا اب کچھ نہیں اس لئے بے رونقی ہے۔

ان کوٹھیوں وغیرہ کے دیکھنے کے بعد اگر کوئی شخص ٹونک کی ٹھنڈی سڑک پر سواری میں بیٹھ کر نکل جائے جبکہ برسات کا موسم ہو۔ بادل سایہ افگن ہوں، سبزہ لہلہاتا ہو، مور بولتے ہوں تو اس سڑک کے اطراف کے مرغزار اور گھنے جنگل باہوش سے باہوش آدمی کے جذبات میں تلاطم برپا کر دیں گے۔ اس سڑک پر جنگل کی خاموش موسیقی فوراً اپنی طرف مائل کر لیتی ہے۔ آدمی یہ محسوس کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنہا ہے اس کو دیکھنے والا کوئی نہیں، پھر وہ اپنے ارمانوں اور آرزوؤں کا جائزہ لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کا جی چاہتا ہے کہ اس سڑک پر دور تک رقصندہ دوڑتا ہوا چلا جائے، اُچک کر کسی پیڑ پر چڑھ جائے، پھر دھم سے کود پڑے پھر ہاتھ پھیلا کر چکر کھانے لگے۔ اچانک وہ خوف سا محسوس کرتا ہے تیز تیز چلنے لگتا ہے اب وہ چاہتا ہے کہ کسی آدمی کی صورت نظر آئے۔ کوئی خرگوش جھاڑی میں سے نکل کر بھاگتا ہوا نظر آتا ہے۔ کسی تیتر کی پاٹ دار آواز اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے، اور وہ پھر جنگل کی سبزی میں کھو جاتا ہے۔ اختر شیرانی نے کیا خوب کہا ہے

ہاں یہ بہشتی سرزمیں اک سازِ وجد انگیز ہے
جس کے سنہری پردوں میں ہر نغمہ خواب آمیز ہے
اور "دیوتا کے عشق" کی پرواز سے لبریز ہے
ہم رنگِ خوابِ رائیگاں۔ اک سرزمینِ عشق ہے

یہ رومان انگیز سڑک دربار ہائی اسکول کی سابقہ عمارت سے شروع ہوتی ہے اور سمت شمال پہاڑوں اور جنگلوں میں چلی جاتی ہے۔ اور ہر پھر کر پھر آبادی میں لوٹ آتی ہے، کہاں؟ اور کس مقام پر؟ اس بات کے بتا دینے سے دلچسپی زائل ہوتی ہے۔ اس لئے نامہرہ موسم میں کسی فلسفی کی طرح اس سڑک کے دوسرے سرے کو تلاش کرنا ہی دلچسپ ہے، اس لئے کہ یہ

اک وادیٔ اسرار ہے، اک جلوہ گاہِ ناز ہے
جس کی فضا میں موجزن اک سرمدی آواز ہے
اور جس کا ہر نغمہ گداز روح کی پرواز ہے

یا پھر اسی رومانی شاعر کے الفاظ میں۔ ؎

یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

احمد محی الدین حجازی

پنج سالہ پلان کے تحت ریاست حیدرآباد کی سرگرمیاں

حیدرآباد اسٹیٹ کے پانچ سالہ پلان کے تحت مختلف سرگرمیوں پر ۱۹۵۱-۵۵ء کے سالوں میں ۴۰٫۵۲ کروڑ روپے خرچ کا اندازہ کیا گیا ہے۔ یہ رقم حکومت ہند سے دس کروڑ، ریاست کے محفوظ مدات سے ۳۰٫۵۲ کروڑ اور زائد ٹیکس اور عوامی قرضوں سے چھ کروڑ حاصل کرکے پوری کی جائے گی۔ خرچے کے لحاظ سے ریاست حیدرآباد کو درجہ ب کی ساری ریاستوں پر برتری حاصل ہے۔

نیشنل پلاننگ کمیشن کے منظور کئے ہوئے ڈیولپمنٹ پلان کے لحاظ سے نیچے بتلائے ہوئے طریقے پر اخراجات کی تقسیم کی گئی ہے۔

اخراجات لاکھوں میں بتلائے گئے ہیں۔

	۱۹۵۱-۵۲ء	۱۹۵۲-۵۳ء	۱۹۵۱-۵۵ء
اگریکلچر (زراعت)	۵۳٫۱۴	۹۰٫۸۳	۳۴۶٫۴۱
ویٹرنری (حیوانات)	۹٫۳۶	۷٫۲۱	۴۹٫۵۹
ڈیری فارم اور دودھ کی سپلائی	۱٫۶	۰٫۲	۱٫۷۱
جنگلات	۴٫۰۵	۴٫۳	۲۱٫۴۳
کوآپریٹو سوسائٹیز (امداد باہمی)	۳٫۴۴	۸٫۱۶	۳۵٫۳۱
فشریز (ماہیات)	۱٫۷۲	۱٫۷۱	۸٫۵۶
برساتی پراجکٹس	۹۵٫۰۰	۷۳۷٫۰۰	۲۴۶۳٫۰۰
برقی پراجکٹس	۱۵۰٫۰۰	۷۰٫۰۰	۲۳۴٫۰۰
گھریلو صنعتیں	۷٫۲۹	۵٫۱۳	۲۵٫۷۲
دوسری صنعتیں	۱۹۷٫۱۴	۴۴٫۵۷	۲۴۱٫۷۱
انڈسٹریل ریسرچ (صنعتی تحقیقات)	۶٫۰۰	۱۱٫۰۰	۲۷٫۰۰
سڑکیں (حمل و نقل)	۲۵٫۷۱	۲۵٫۷۱	۱۲۵٫۵۷
تعلیم	۲۵٫۹۴	۴۸٫۱۱	۲۶۴٫۱۱
میڈیکل (طبابت)	۱۴٫۳۶	۱۹٫۵۶	۱۱۷٫۴۶
پبلک ہیلتھ (صحت عامہ)	۵٫۳۵	۲٫۰۷	۸۸٫۰۷
جملہ	۱۱۶۱٫۱	۱۱۰۰٫۳۹	۴۰۵۲٫۸۳

اغذیہ و زراعت

غذا کے معاملے میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا سوال زندگی اور موت کی سی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے ہر سال ۶٫۲۵ لاکھ ٹن غلّائی اجناس اور دوسری پیداوار میں ۲ لاکھ گانٹھ روئی اور ڈیڑھ لاکھ ٹن تیل کے بیج کی پیداوار کے لئے ۴۶۳٫۰۱ لاکھ روپے خرچ کئے جائیں گے۔ زرعی ترقیات کے لئے پانی اور بجلی کی سپلائی لازمی ضرورتیں ہیں اس لئے آب رسانی اور برقی پراجکٹس پر ۲۸ کروڑ روپے محفوظ کئے گئے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ پلان کی تکمیل کے بعد ۶٫۳۵۵ لاکھ ایکڑ زمین سیراب کی جا سکے گی اور ریاست کی برقی طاقت میں تیس ہزار کیلوواٹ پاور کا اضافہ ہو سکے گا۔

اس پلان کے تحت ۳۱٫۵۶ لاکھ ایکڑ زمین ٹریکٹر کے ذریعے کاشت کے قابل بنائی جائے گی اس کے علاوہ ۲۳٫۲۵۵ ٹن گیہوں، ۴۱٫۵ ٹن چاول، ۲۵ ٹن جوار کے اکھٹا کرنے اور تقسیم کرنے کے انتظامات کئے جائیں گے۔ دو لاکھ ٹن کھاد، دو ہزار پانچ سو ہل، نو سو ٹریکٹرز اور چھ ہزار پانچ سو پمپوں کی سپلائی، ۸۵۸ تالابوں کی مرمت جن سے ۶۷٫۸۹۵ ایکڑ زمین سیراب ہو سکے گی۔ ۲۰۴۴ کنوؤں کی کھدائی، تین ہزار کنوؤں کی درستی، جانوروں کی نگرانی اور نسل کشی کے لئے حیوانات کے محکمے کی طرف سے ۹۲ دواخانوں کا قیام، ۹۰ ویٹرنری

ہسٹلش کی تربیت کے انتظامات اور دودھ کی سپلائی میں اضافے کے لئے مزدعہ حمایت ساگر کے لئے زائد مشنری کی فراہمی یہ سب اس منصوبے میں شامل ہیں ۔ اب تک بعض آبپاشی پراجکٹس کی تکمیل ہو چکی ہے

جاپانی کاشت کے طریقے پر دو لاکھ ایکڑ زمین دھان کی کاشت کے لئے استعمال کی گئی ۔ ریاست میں یہ تجربہ بہت ہی کامیاب رہا جس کی بنا پر حکومت اس کو ترقی دے رہی ہے ۔ ریاست حیدرآباد واحد ریاست ہے جہاں سب سے زیادہ رقبے پر اس طریقے سے کاشت کی گئی ہے ۔ اس طریقے کے تحت کاشتکاروں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی گئی ہیں ۔ ان میں ٹریکٹرز، ہل اور کھیتی باڑی کے آلات خریدنے کے لئے قرض دیا گیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر ۳۰ر۴ لاکھ ایکڑ زمین اس سال زیر کاشت لائی گئی ہے اور ۸۱ ماڈل فارم قائم کئے گئے ہیں جو کاشتکاروں کے لئے ایک نمونے کا کام دیتے ہیں ۔ ریاست بھر میں ۱۰۴ مرکزوں پر دس ہزار سے زیادہ کاشتکاروں کو ترقی یافتہ اصولوں پر کاشت کی ٹریننگ دی گئی ہے ۔ اس کے علاوہ کاشت کے ترقی یافتہ طریقوں کی تشہیر کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے ۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ریاست کی دس لاکھ ٹن غذائی اجناس کی کمی کے خلاف صرف تنگ بھدرا پراجکٹ سے چار لاکھ ٹن غذائی اجناس حاصل کئے جا سکیں گے ۔

انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ

امداد باہمی کے منصوبے کے تحت ایک سنٹرل اگریکلچر بنک (مرکزی زرعی بنک) کا قیام اور ۴۳۸ زرعی انجمنوں کا قیام شامل ہے تاکہ کسانوں کو طویل مدتی قرضے دئے جا سکیں اس فنڈ کا سرمایہ دو مقامی صنعتوں میں ۱۱۱ر۳۶ لاکھ روپے کے حصص میں بھی لگایا گیا ہے ۔

انڈسٹری (صنعت)

دیہی علاقوں میں زراعت پیشہ آبادی کے لئے بے کاروں میں ضمنی پیشے کی فراہمی کا مسئلہ ۲۵ر۷۲ لاکھ روپے کے خرچ سے گھریلو صنعتوں کو ترقی دے کر حل کیا جائے گا ۔ جس میں ۱۱ر۴۳ لاکھ روپے مارکٹنگ کے لئے شا[illegible] مرکزی تجربہ خانے کی توسیع کے لئے نوے ہزار روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے جس کی ریسرچ سے صنعتوں میں کافی ترقی ہو رہی ہے اور حیدرآباد کی معدنی دولت کو زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جا رہا ہے ۔

ریاست کی تین بڑی صنعتیں کاغذ، کپڑا اور کوئلے کی پیداوار میں ۱۳ ہزار ٹن کاغذ، ڈیڑھ سو لاکھ گز کپڑا اور پندرہ لاکھ ٹن کوئلے کا اضافہ کیا جائے گا ۔ تنگ بھدرا کے علاقے میں ایک شکر کا کارخانہ، شکر نگر میں گنے کے فضلے سے کاغذ یا مقوہ (کارڈ بورڈ) کی تیاری کا کارخانہ قائم کرنے کی تجویز بھی ہے ۔

محکمہ صنعت و حرفت میں دیہی تربیتی مراکز کی پھر سے تنظیم اور مشاورتی مجلس کا قیام دو قابل ذکر سرگرمیاں ہیں ۔ اضلاع کے مستقروں پر چھ تربیتی مراکز قائم کئے گئے ہیں تاکہ بننے، کاتنے، چرٹے، نجاری اور اسی قسم کی دوسری مفید صنعتوں کی تربیت دی جا سکے ۔ صنعتی مزدوروں کے لئے آئندہ پانچ سالوں میں ہر سال تین ہزار کے حساب سے گھروں کی تعمیر بھی اسی پلان میں شامل ہے ۔

جنگلات

ریاست حیدرآباد میں تقریباً ۱۴ ہزار مربع میل پر جنگلات پھیلے ہوئے ہیں ۔ ان سے ملنے والی آمدنی کا خیال کرتے ہوئے جنگلات کے ڈویژنٹ قائم کئے گئے ہیں اور ہر ڈھائی لاکھ ایکڑ زمین پر جنگل اگانے اور پانی کی سپلائی کا انتظام کرنے کی تحریک ہے ۔

مواصلات

زیر ترقی علاقوں میں ۱۲۸۰۵۷ لاکھ روپے کے خرچ سے ۱۵۲ میل لانبی سڑکیں بنانے کا خیال اس پلان کا ایک جزو ہے ۔

تعلیم

دستور ہند میں تعلیم کی اشاعت کے لئے مقررہ پندرہ سالہ مدت کے لحاظ سے تعلیم کی ریاست میں کافی پیمانے پر ترقی کا انتظام ضروری خیال کیا گیا ہے ۔ پانچ سو سے زیادہ آبادی رکھنے والے دیہات میں ایک (پرائمری اسکول) قائم کیا جائے گا جس میں ایک یا دو ٹیچر ہوں گے اور پانچ سو سے کم آبادی کے گاؤں میں رضاکارانہ امدادی اسکول قائم کئے جائیں گے ۔ اس طرح جملہ ۲۲۷۵ گورنمنٹ پرائمری اسکول اور تین ہزار

رضاکارانہ امدادی پرائمری اسکول کھولے جائیں گے ۔ طلبا رکی تعداد کے لحاظ سے جہاں بھی ضرورت ہو لوئر پرائمری اسکول کو اپر پرائمری اسکول میں بدل دیا جائے گا ۔ ہر تعلقہ اور گاؤں میں جس کی آبادی پانچ یا زیادہ ہزار ہو ایک مڈل اسکول کھولا جائے گا ۔ سکندرآباد میں ایک سنٹرل ٹکنیکل کالج اور چار انڈسٹریل کمرشیل اینڈ اگریکلچرل اسکول کھولے جائیں گے اسکیم یہ ہے کہ مدرسوں کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ کرکے ہر گاؤں کے لیئے اس کا اپنا ایک اسکول بنایا جائے ۔ جہاں تک ٹیچروں کی ٹریننگ کا تعلق ہے ۱۹۵۲ء کے آخر تک دوسو ٹیچروں کو ٹریننگ دی گئی ہے اور اگلے ہر سال ۱۹۵ ٹیچروں کو تربیت دی جاتی رہے گی ۔ سماجی تعلیم کے ڈیڑھ سو سنٹر کھولے جا رہے ہیں ۔

پبلک ہیلتھ

۱۹۵ تعلقوں میں دواخانے، بیس ڈسپینسریز، سوا سو آیورویدک دواخانے اور اضلاع کے لیئے ڈھائی سو نرسوں کی ٹریننگ کے انتظامات کئے جائیں گے ۔ آنکھ کے متحرک دواخانوں کو کھولنے، دیہاتیوں تک طبی امداد کی سہولتوں کو پہنچانے کے لیئے ہر سال کم از کم ۷۶۰ دواؤں کے صندوق کے حساب سے ۳۸۰۰ صندوق کی تقسیم کا انتظام کیا جائے گا ۔ بچوں کی دیکھ بھال کے سولہ سنٹر اور ایک سو ہیلتھ یونٹ کھولے جائیں گے ۔ متعدی بیماریوں کی روک تھام کے لیئے پلان میں متعدی بیماریوں کے دس دواخانوں کے کھولنے اور مومن آباد اور بیڑ کے سینی ٹوریم پر ۳۰۰ سے زیادہ بستروں کے مہیا کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے ۔

کمیونٹی پراجکٹس

کمیونٹی پراجکٹس اسکیم اب پانچ سالہ پلان کا ایک حصّہ بن گئی ہے اس اسکیم کے تحت محدود دیہی رقبوں میں ہر جہتی ترقیاتی کاموں کو پوری کوشش اور سخت محنت سے پورا کیا جائے گا ۔ زرعی اور دیہی ترقیات، گھریلو اور چھوٹے درجے کی صنعتوں کی ترقّی، مکانات کی تعمیر، صحت، تعلیم اور رسل و رسائل اور روزگار کی سہولتوں کی فراہمی وغیرہ اس اسکیم کے اصل اجزا ہیں ۔

ایک کامل دیہی پراجکٹ پر تین سال کے لیئے لاگو ہونے والے خرچے کا تخمینہ ۶۵ لاکھ روپے کیا گیا ہے ۔ ریاست حیدرآباد میں نظام ساگر پراجکٹ، تنگ بھدرا پراجکٹ اور ملک میں واقع ایک ترقیاتی بلاک پر ۲ء۱۵۰ لاکھ روپے کا خرچ ہوگا جو ہند امریکی فنی صنعتی معاہدہ، حکومتِ ہند اور حکومتِ حیدرآباد کی جانب سے پورے کئے جائیں گے ۔

توسیعی تربیتی مرکز ۔ حمایت ساگر

سماجی ترقّی کے پروگرام کے تحت ضروری تربیت پائے ہوئے لوگوں کے لئے حکومت ہند نے "فورڈ فاؤنڈیشن" اور "فنی تعاون کے انتظام" کی مدد سے تربیتی مرکزوں کے کھولنے کے لئے رقم الاٹ کی ہے ۔ حیدرآباد کو الاٹ کئے گئے ایک مرکز کے خرچ کا اندازہ ۱۶۰۰ء۶۵۸ روپے ہے جس میں "فورڈ فاؤنڈیشن" سے ۳۳۳۰۰۰، حکومت ہند سے ۱۰۰۰۰۰ اور حکومت حیدرآباد سے ۳۰۰۰۰ حاصل کئے جائیں گے ۔

حمایت ساگر پر واقع فارم کو ہر قسم کی کاشت اور زمین کی زرخیزی د ترقی کے لیئے استعمال کیا گیا ہے جہاں ٹریننگ پانے والے لوگ ہی پورا کام کرتے ہیں ۔ ان لوگوں کو جانوروں کی دیکھ بھال اور نسل بڑھانے باغبانی، صحت عامہ، صفائی، تعلیم، امداد باہمی اور اس طرح کے دوسرے ایسے مضامین میں تربیت دی جاتی ہے جن کی دیہی زندگی کی مکمل معنوں میں ترقی کے لیئے ضرورت ہوتی ہے ۔ ٹریننگ کا مقصد انھیں کسی مضمون میں ماہر بنانا نہیں ہوتا بلکہ دیہی زندگی کے ہر شعبے میں ایک ہمہ جہتی تربیت دینا ہوتا ہے ۔

پائلٹ ڈولپمنٹ پراجکٹ ۔ کوکٹ پلی

زراعت، صحت عامہ، صفائی، تعلیم اور جانوروں کی دیکھ بھال وغیرہ کے توسیعی کاموں کے سلسلے میں سارے ملک میں پندرہ پائلٹ ڈولپمنٹ پراجکٹس کھولنے کی حکومت ہند کے پیش نظر تجویز ہے ۔ ہر پراجکٹ میں سو گاؤں شامل ہوتے ہیں ۔ ایک پراجکٹ ریاست حیدرآباد کو بھی الاٹ کیا گیا ہے جو کوکٹ پلی (ضلع حیدرآباد) میں واقع ہے پہلی جون ۱۹۵۲ء سے کام شروع کیا گیا ۔ کمیونٹی پراجکٹس کے وسیع کام کی جانب پائلٹ ڈولپمنٹ پراجکٹ ایک ملحقہ قدم ہے اور گرام سیوکوں کے لیئے دیہی رسائی اور زراعت کے توسیعی کام کے

عملی تجربے کے لئے یہ ایک "میدانی تجربہ گاہ" یا "ورکشاپ" بھی ہے

اس پراجکٹ پر ۳۹۸۱۰۰ روپے کے خرچ کا اندازہ ہے جس کو پورا کرنے کے لئے "فورڈ فاؤنڈیشن" سے ۲۶۲۰۰، حکومت ہند سے ۹۵۹۵۰ اور حکومت حیدرآباد سے ۹۵۹۵۰ روپے حاصل کئے جائیں گے۔ یہ رقم ۱۰۶۴ لاکھ ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے ۱۲۰ گاؤں کی وسیع زرعی ترقیات عمدہ بیج اور کھاد کی سپلائی، آلات اور ٹریکٹر کے ذریعے زمین کی ناگرکشتی کی سہولتیں مہیا کرنے پر خرچ کی جائے گی۔ اس کے علاوہ دیہی ضروریات جیسے جانوروں کی دیکھ بھال، صحت، تعلیم، رسل و رسائل، رہائش اور سماجی تنظیم کے کاموں پر پوری پوری توجہ دی جائے گی۔

ضمیمہ پلان

حکومت حیدرآباد نے ترقیاتی نوعیت کے چند اور کاموں کی تکمیل کی بھی ذمے داری سنبھالی ہے جنھیں پلاننگ کمیشن نے سپلیمنٹری پلان کے نئے اجزا کے نام سے منسوب کرنے کے لئے کہا ہے۔

۱۔ نظام ساگر پراجکٹ

نظام ساگر سے آب پاشی کے کام کی ابتدا ۱۹۳۱ء میں ہوئی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ کام ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۰ء کے اقتصادی دباؤ کا شکار ہو گیا۔ آبپاشی کے وسیع کام کے شروع کرتے ہی حالات نے نت نئے مسائل پیدا کر دئے جیسے زمین کی شوریدگی، ملیریا، لیور فلوک (Liver Fluke) کاشت کاروں کی مشکلات وغیرہ ان مشکلات کو دور کرنے کے لئے ایک الگ فنڈ کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ چند ترقیاتی اسکیموں کے تحت ایک مرکزی ایجنسی کے قیام کی طرف توجہ دی گئی جو مختلف حکومتی محکموں میں اشتراک عمل پیدا کرنے کے لئے کافی مقتدر ہو۔ ۱۹۴۲ء میں حکومت نے قدم اٹھایا اور محکمہ کی سفارش پر جو نظام ساگر ایاکٹ کی ترقی کا ذمے دار تھا۔ ترقیاتی گرانٹ اور مرکزی بورڈ کے قیام کی منظوری دی۔ نظام ساگر کے لئے ۵ لاکھ روپے بطور سالانہ خصوصی گرانٹ منظور کئے گئے۔ پانچ سال کے کام کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ ۵ لاکھ کی رقم وسیع مسائل کی تکمیل کے لئے ناکافی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں حکومت نے گرانٹ کو دس لاکھ تک بڑھا دیا جس میں سے آدھی رقم سڑکوں کی تعمیر کے لئے جو ایاکٹ کی ترقی کے لئے ایک انتہائی ضروری امر ہے اور باقی آدھی رقم دوسری قسم کے ترقیاتی کاموں کے لئے مختص کی گئی۔

ڈھائی سال کے وقفے کے بعد ستمبر ۱۹۵۱ء میں محکمہ مال نے دلچسپی لی اور مرکزی بورڈ قائم کر کے ایک ڈویلپمنٹ کمشنر اور ایک سپرنٹنڈنگ انجنیر کا تقرر نظام آباد اور میدک کے اضلاع کے اشتراک سے کیا گیا بعد میں ریاست کی ترقیات۔ پلاننگ کے کمشنر کے تقرر کے بعد نظام ساگر پراجکٹ کے لئے ایک الگ کمشنر کے عہدے کو غیر ضروری جان کر حکومت نے اس دفتر کو ختم کر دیا جس سے ہر سال ایک لاکھ روپے کی بچت ہوتی ہے۔

۲۔ لکھناورم پراجکٹ

ملگ تعلقے کے جنگلات میں بڑی تعداد میں کوبہ خاندانی آباد ہیں جو رضاکارانہ طور پر یا دباؤ کے تحت غیر سماجی عناصر کی غذا وغیرہ سے مدد کرتے ہیں نومبر ۱۹۵۰ء میں حکومت نے یہ طے کیا کہ فوری زمین اور فنڈ مہیا کر کے انھیں الاٹ کئے جائیں اور انھیں ضروری رقمی امداد بھی دی جائے تاکہ وہ غیر سماجی لوگوں کے ہاتھوں محفوظ رہ سکیں۔

مئی ۱۹۵۱ء میں ۵۵۰۰ ایکڑ زاید رقبے کی آبپاشی اور ۷۰۰۰ ایکڑ زمین پر خشکی کی کاشت کے لئے چند اسکیموں کی منظوری دی گئی۔ تالابوں کے زیر کاشت ایاکٹ کی ترقی کے علاوہ غلہ زیادہ اگاؤ مہم کے تحت دور دراز الگ تھلگ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں بسنے والے قبائلیوں کو پھر بسانے اور انھیں کاشت پر لگانے کے لئے قانون اور نظم و ضبط کے نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ضروری اور فوری اقدامات کئے گئے

یہ اسکیمیں دو طرح کی ہیں ایک تو پراجکٹس کی ترقیات اور دوسرے پاکھال اور ملگ میں واقع دیہی بھلائی کے مرکزوں سے متعلق ہیں۔

نیچے بتلائی ہوئی باتوں کا خیال کرتے ہوئے ۱۲۵۰ کوبہ خاندانوں کو پھر بسانے اور ان قبائل کو غیر سماجی لوگوں کے چنگل سے چھڑا کر کھیتی باڑی پر لگانے کے لئے ۴۳ء۲۱ لاکھ روپے کا خرچ ہوتا ہے

(۱) کوبہ اور دوسرے بے زمین افراد کے لئے فوری قابلِ حصول

اراضی اور مستقبل قریب میں حاصل کی جا سکنے والی زمینوں کی سپلائی۔

(۲) حکومت اور پٹے کی زمینوں پر سے جنگلات کا صفایا اور ان کی بے زمین قبائل میں تقسیم

(۳) طبی امداد کے ذریعے سے معیار صحت کی ترقی، زرعی آلات کی سپلائی، امدادی مدرسوں کی توسیع اور قیام، گھریلو صنعتوں کا قیام، رسل و رسائل کے ذریعوں کی ترقی وغیرہ کے انتظامات

۳۔ تنگ بھدرا پراجکٹ

اس وقت ضلع رائچور میں بارش اوسطاً ۲۰" سالانہ سے بھی کم ہوتی ہے۔ اس ضلعے کی گیارہ لاکھ سے بھی زیادہ آبادی جس کے تین چوتھائی حصّے کی معاش کا دارومدار زراعت پر ہے، زرخیز زمینوں کے باوجود بارش کی کمی کے سبب ہر وقت مالی و اقتصادی مشکلات کا شکار رہی ہے۔ جس کے پیش نظر ۱۹۵۲ء کے بجٹ میں اس پراجکٹ کی تعمیر کے لئے اگرچہ ۴۵ لاکھ روپے کی گنجائش رکھی گئی تھی لیکن کوئی رقم حاصل نہ کی جا سکی۔ یہ کام جو پہلے بورڈ آف ریونیو کے تحت تھا اگست ۱۹۵۲ء میں کمشنر ترقیات و زرعی چیف سیکرٹری کے تحت کر دیا گیا۔

۱۹۵۳ء میں اس پراجکٹ کا افتتاح وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کیا تھا اور امید کے مطابق کام مارچ ۱۹۵۴ء میں تقریباً پورا ہو گیا ۱۹۵۳-۵۴ء کے لئے دس لاکھ مالی سکہ (۵ء ۸۵ لاکھ سکہ ہند) اس مقصد کے لئے منظور کئے گئے ہیں جو نیچے بتلائی ہوئی باتوں پر تقسیم کئے گئے ہیں۔

اراضی کا حصول	۹ء ۵	لاکھ سکہ ہند
جانوروں کا علاج	۱ء ۴۳	"
جنگلات	۰ء ۱	"
سڑکیں	۰ء ۳۱	"

چھ لاکھ ایکڑ کے رقبے پر پھیلے ہوئے اس وسیع پراجکٹ کے لئے جس سے ۴½ لاکھ ایکڑ زمین سیراب کی جا سکے گی اور ساتھ ہی ساتھ تنگ بھدرا میں ڈوبنے والے ۳۷ گاؤں کے ساتھ ساتھ سات اور گاؤں کے لوگوں کو پھر بسانے کا کام پورا ہو گیا ہے اور باقی کو پھر بسانے کا کام ترقی پر ہے اس اسکیم کے لئے ۳۲۰۱۲۰۳ روپے منظور کئے گئے ہیں۔ اب تک بارہ ہزار لوگ بسائے جا چکے ہیں ۲۶۷۳ ایکڑ زمین مختلف خاندانوں میں تقسیم کی گئی ہے اور ان کے لئے گیارہ سو مکان تعمیر کئے گئے ہیں۔

۳۶ باولیاں کھدوائی گئی ہیں، تیرہ سو مقامی ترقیاتی کاموں پر ۳۸ ہزار روپے خرچ کئے گئے ہیں جن میں ۴۶ تالابوں کی تعمیر ۱۹۳ باولیوں کی کھدوائی ۲۲۵ اسکول کا قیام، ہریجنوں کے لئے ۳۸ گھروں کی تعمیر اور ۲۴ امیل لانبی سڑکوں کی تعمیر شامل ہے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے شائع کی گئی کتاب تنگ بھدرا پراجکٹ — چند ترقیاتی مسائل میں ڈولپمنٹ کمشنر نے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

۴۔ تنگ بھدرا ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم

اس اسکیم کے تحت چار آبشاروں پر بند باندھ کر ایک لاکھ کیلوواٹ پاور بجلی پیدا کی جائے گی۔ اس اسکیم کو پانچ سالہ پلان میں شامل کرنے کے لئے حکومت ہند سے بات چیت جاری ہے۔

۵۔ روڈ ٹرانسپورٹ

پچھلی لڑائی کے زمانے میں بسوں کی کمی کے سبب اس کام کی حالت غیر اطمینان بخش تھی پھر لڑائی کے بعد کے ہیجانی دور کے باعث کچھ زیادہ بہتر کام نہ ہو سکا لیکن ۱۹۴۹ء کے آخر میں اور پھر ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں بہتر کام کیا جا سکا۔ ورکشاپ اور ڈپو کی تعمیر کام کی توسیع اور پرانی بسوں کے باعث پیدا ہونے والی کمی کو دور کرنے کے لئے سات سو نئی بسوں کی خرید کے لئے ۶۲ء ۲۰۸ لاکھ روپے پلان میں محفوظ کئے گئے ہیں جو ۱۹۵۱-۵۵ء کے درمیانی سالوں میں خرچ کئے جائیں گے۔

۶۔ انڈسٹریل ہاؤزنگ

ریاست کی اہم صنعتوں میں تقریباً ستر ہزار مزدور کام کرتے ہیں جو گندے، غیر صحت مند گھروں اور جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ ان کے معیار زندگی کو اونچا کرنے کے لئے یہ طے کیا گیا ہے کہ دس ہزار گھر نیچے بتلائے ہوئے جگہوں پر حکومت کے خرچ پر بنائے جائیں۔

شہر حیدرآباد و سکندرآباد	۵۰۰۰
ورنگل	۱۲۰۰
اورنگ آباد	۸۰۰
گلبرگہ	۸۰۰

نانڈیڑ	۸۰۰
جالنہ	۲۰۰
رائچور	۲۰۰
نظام آباد	۲۰۰
لاتور	۱۵۰
کھم میٹ	۲۰۰
محفوظ	۴۵۰

جملہ خرچ کا حساب ۲۵۵ لاکھ روپے ہے ۔ اب تک دو کمروں والے تین سو گھر فی گھر چار ہزار کے خرچ سے بنائے جا چکے ہیں جن پر جملہ ۱۲ لاکھ روپے کا خرچ ہوا ہے ۔ یہ طے کیا گیا ہے کہ باقی ۹،۷۰۰ گھر فی گھر ڈھائی ہزار روپے کے خرچ سے جملہ ۲ کروڑ ۴۳ لاکھ ایک کمرے والے بنائے جائیں ۔ مرکزی حکومت کے لیبر منسٹری اور منسٹری آف ورکس، ہاؤزنگ اینڈ سپلائی نے پھر بسانے کی اسکیم کے تحت مالی امداد دی ہے ۔

۷ ۔ پس ماندہ اقوام

سوشل سروس کے محکمہ کے تحت پست اقوام کی ترقی کے لئے دو اسکیمیں ہیں ۔

(۱) بنجارہ ولیفر اسکیم ضلع ورنگل

(۲) لمباڑہ ولیفر اسکیم ضلع نلگنڈہ

ان اسکیموں کو پورا کرنے کے لئے الگ الگ رقم رکھی گئی ہے ان کے علاوہ پانچ سالہ پلان کے تحت ۸ لاکھ روپے پس ماندہ اقوام کی بھلائی کے دوسرے کاموں کے لئے بھی رکھے گئے ہیں ۔ گزشتہ دو سال میں حکومت ہند نے دستور کی دفعہ ۲۷۵ کے تحت دس لاکھ روپے کی منظوری دی ہے اور اس سال اور دو لاکھ روپے منظور کئے ہیں جو ایسے مجرموں کی بھلائی کے لئے صرف کئے جائیں گے جن کو درج فہرس اقوام میں شامل کیا گیا ہے ۔

مالی اور مادی مشکلات کے باعث کام پلان کے لحاظ سے پورا نہیں کیا جا سکا ۔ مارچ ۱۹۵۳ء میں ختم ہونے والے دو سال میں ۴۸ر۸ لاکھ روپے کا نقصان رہا اور حکومت حیدرآباد پورے خرچ کی تکمیل کے قابل نہیں ہے جب تک کہ ۲۶ر۵ کروڑ روپے کی مرکزی امداد حاصل نہ ہو ۔

نوٹ :۔ طوالت کے مد نظر مقامی ترقیاتی کاموں قومی توسیعی بلاک حیدرآباد National Extention Block Hyd اور انتظامی امور کو نظر انداز کیا گیا ۔

(مسٹر ظہیر احمد آئی ۔ اے ۔ ایس ڈیولپمنٹ کمشنر پلاننگ سیکرٹری و سینیر رکن بورڈ آف ریونیو گورنمنٹ آف حیدرآباد کے مضمون اور منسٹرس آف حیدرآباد گورنمنٹ کی نشری تقریروں سے مواد حاصل کیا گیا ۔)

املی کے گودے سے کیمیاوی صنعت قائم کرنے کے امکانات

میسور کے سنٹرل فوڈ ٹیکنالوجیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے حال ہی میں جو تحقیقات کی ہے اس کی بدولت املی کے گودے سے ایک کیمیاوی صنعت قائم کرنے کا امکان پیدا ہو گیا ہے

آج کل املی کا گودا محض غذا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن تحقیقات سے ظاہر ہوا ہے کہ کیمیاوی عمل سے دوا سازی کی صنعت میں کام آنے والا پوٹاسیم بائی ٹارٹریٹ ۔ ٹارٹری کا تیزاب جیلی ۔ مربوں کے لئے پیکٹن اور الکحل حاصل کئے جا سکتے ہیں ۔

آج کل ہندوستان میں ڈھائی سو لچی ٹارٹری کا تیزاب اور کافی مقدار میں پیکٹن پاؤڈر و مرکبات وغیرہ درآمد کئے جاتے ہیں پہلے تحقیقات سے یہ ظاہر ہوا تھا کہ املی کے گودے سے بہت گھٹیا قسم کا پیکٹن نکلتا ہے تازہ تحقیقات سے یہ انکشاف ہوا ہے کہ اس گودے سے جو پیکٹن پوڈر تیار کیا جائے گا اس میں کیلسیم پیکٹیٹ بہت اچھی قسم کا ہو گا ۔

املی کے ایک ہزار پونڈ گودے پر کیمیاوی عمل کی لاگت ایک سو اٹھاسی روپے ہو گی اور اس عمل سے جو کیمیاوی اشیاء تیار کی جائیں گی ان کی قیمت چار سو تریپن روپے ہو گی ۔ چنانچہ ایک ہزار پونڈ املی کے گودے پر دو سو پینسٹھ روپے کی بچت ہو گی ۔

پہلا پنج سالہ پلان

سوالات اور جوابات

(۲)

س۔ کیا پلان کے پیش نظر صرف مادی خوشحالی کا سوال ہے؟

ج۔ پلان نے اپنے اوپر صرف مادی ترقی حاصل کرنے ہی کی پابندی نہیں لگائی۔ اس کے پیش نظر ایسے حالات پیدا کرنا بھی ہے جو سماجی اور تمدنی ترقی اور انسانی استعداد کی پوری توسیع و ترقی کا باعث بنیں۔ لیکن کسی حد تک مالی خوشحالی کے بغیر ایک بڑے متمدن سماج کا قیام ناممکن ہے اور اس لئے پلان میں بنیادی زور اقتصادی ترقی پر دیا گیا ہے۔

س۔ کیا پلان واقعی قومی اور جمہوری ہے؟

ج۔ ایک پلان کے لئے جو قومی اور جمہوری ہو یہ ضروری ہے کہ جہاں تک پالیسی کے مقاصد کا تعلق ہے اس کی بنیاد بڑی حد تک کمیونٹی میں ایک قسم کے باہمی سمجھوتے پر ہو۔ اس لازمی شرط کو پلان ہر اعتبار سے پورا کرتا ہے۔ کیونکہ پلان کے مقاصد آئین سے لئے گئے ہیں، جسے دیش میں سماج کے تمام طبقوں نے قبول کیا ہے۔ پلان پر دیش بھر میں پوری طرح سے بحث ہوئی ہے، اور اس سلسلے میں جو تنقیدیں اور تجویزیں موصول ہوئی ہیں پلاننگ کمیشن نے انھیں پیش نظر رکھا ہے۔ پلان کی تشکیل اس اعتبار سے نہیں ہوئی کہ اس طبقے یا اُس طبقے کے مفاد کو پیش نظر رکھا جائے بلکہ ساری کمیونٹی کے مفاد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس چیز نے پلان کو قومی اہمیت دے دی ہے۔ پلان کی بنیاد مرکز اور ریاستوں اور سرکاری اور نجی حلقے کی باہمی ہم آہنگی پر ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ملک میں سیاسی اور اقتصادی جمہوریت کو مضبوط بنایا جائے۔

س۔ اپنے مقاصد کے اعتبار سے پلان کو "دھیما" کہا گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ایک زیادہ اُمنگ بھرا اور حوصلہ مندانہ پروگرام کیوں نہ بنایا گیا؟

ج۔ محض اس لئے کہ زیادہ امنگ بھرے اور حوصلہ مندانہ پروگرام کے لئے جن ذرائع کی ضرورت ہے انھیں حاصل کرنے کے معقول امکانات نہیں تھے۔ پلان اگرچہ "دھیما" ہے، تاہم حقیقت پر مبنی ہے اور مالی اور مادی حاصل شدہ ذرائع کے پیش نظر اس کے نشانے بڑی احتیاط سے قائم کئے گئے ہیں۔

س۔ پلان ایک عملی پلان ہے اور بعض نشانے ایسے ہیں جو حاصل نہ ہو سکیں گے، اس صورت میں اس کی تکمیل کے لئے کیا ضروری امور پیش نظر رکھے جائیں گے؟

ج۔ (۱) عالمگیر جنگ اور بیرونی بدنظمی سے آزادی۔
(۲) مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے درمیان گہرا تعاون۔
(۳) عوامی تعاون۔
(۴) ایک ایماندارانہ قابل انتظام

س۔ کیا یہ ایک قطعی پلان ہے یا پلاننگ کا یہ سلسلہ جاری رہے گا؟

ج۔ پلاننگ کا یہ سلسلہ جاری رہے گا اور موجودہ پلان کے بعد مستقبل کے لئے طیاری کا ایک پلان ہے اور کئی پلان آئیں گے۔

س۔ ہندوستان میں مکمل طور پر یا محض موسمی طور پر بے کار

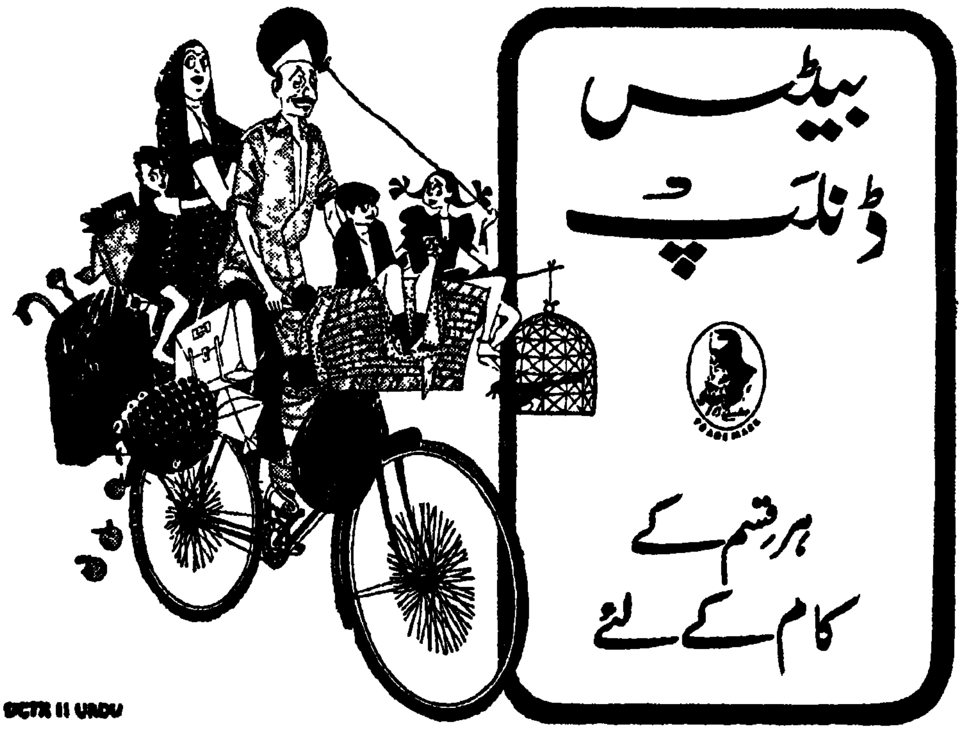
مزدوروں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ اس (۱) دیہاتی (۲) شہری، بیروزگاری کو کم کرنے کے لئے کیا تجاویز کی گئی ہیں؟

✓ ج۔ دیہاتی بے روزگاری کو کم کرنے کے لئے جو اقدامات پلان میں شامل کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔ آب رسانی کے بڑے اور چھوٹے کام، بڑے پیمانے پر زمین توڑنے کی اسکیمیں، بجلی کے کارخانوں کا قیام، سڑکوں کی تعمیر اور دیہاتی صنعتوں اور دستکاریوں کے لئے پندرہ کروڑ روپے کے مالی انتظام اور بڑے پیمانے کی صنعتوں پر مجوزہ ٹیکس عاید کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چھوٹے پیمانے کی اور گھریلو صنعتوں کی مقابلہ کرنے کی پوزیشن مضبوط ہو جائے گی۔ ترقی یافتہ ٹیکنیک اور بہتر تنظیم کے بعد یہ صنعتیں اس قابل ہو جائیں گی کہ ایک بڑی تعداد کو روزگار مہیا کر سکیں۔

بڑے پیمانے کی صنعتوں کی موجودہ وسعت اور نئی صنعتوں کے اجرا سے شہری بے روزگاری کم ہو جائے گی۔ مذکورہ بالا چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی توسیع و ترقی بھی اس سلسلے میں معاون ثابت ہوگی۔

س۔ متوسط طبقے کی بے روزگاری کے متعلق کیا کیا جا رہا ہے؟

ج۔ چونکہ پہلا پنج سالہ پلان اس بات پر زور دیتا ہے کہ زرعی پیداوار میں اضافہ کیا جائے اور مستقبل میں صنعتی وسعت کے لئے بنیادیں قائم کی جائیں۔ اس لئے تعلیم یافتہ بے روزگاروں کے لئے روزگار کے مواقع کی فوری توسیع محدود ہے، جیسا کہ موجودہ پلان میں اہتمام کیا گیا ہے، وسیع ہوتی ہوئی اقتصادیات صنعتی ملازمتوں میں کچھ مزید روزگار پیدا کریں گی۔ لیکن تعلیم یافتہ طبقوں کے لئے ملازمت کے امکانات اسی وقت پیدا ہوں گے جبکہ صنعت میں وسعت پیدا ہوگی۔ کسی حد تک یہ سوال تعلیمی نظام کی اصلاح اور سخت اور ناخوش گوار قسم کے کام کرنے کے متعلق نوجوانوں کے رویے میں تبدیلی کے ساتھ بھی وابستہ ہے۔



نئی کتابیں اور رسالے

شعلۂ ندا

پروفیسر اجتبیٰ حسین رضوی کا مجموعۂ کلام سید حسین احمد ایڈوکیٹ صدر گلی بینڈ سٹی نے بکمالِ اہتمام شائع کیا ہے۔ قیمت قسم اول چار روپے، قسم دوم دو روپے آٹھ آنے۔ ۲۰×۲۷/۸ کے ۲۵۶ صفحوں پر مشتمل یہ حسین و جمیل کتاب حسنِ ظاہر سے مالا مال ہونے کے علاوہ حسنِ معنی کا بھی ایک بے بہا خزانہ ہے۔ رضوی کے کلام میں شدتِ احساس کے تیز بلکہ طوفانی دھارے نظر آئیں گے۔ لطافتِ شعور ان کی دوسری نمایاں خوبی ہے۔ شروع میں سید حسین احمد نے مختصراً رضوی کے خاندانی حالات، تاریخ اور مشاغلِ معاشی تجرّد اور مشاغلِ ذہنی و روحی قلم بند فرمائے ہیں۔ رضوی کی زندگی بہت دل چسپ ہے۔ کلام میں فلسفی رجحان زیادہ ہے۔ آپ غالب، اقبال اور شاد سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ کلام میں ایک تڑپ ہے جو قاری کو تڑپاتی ہے۔ ایک خلوص ہے جو پڑھنے والے کے دل کو موہ لیتا ہے۔ نظموں میں بڑا تنوع ہے۔ تقدیرِ آدم، ترانۂ آدم اور فریادِ آدم کے عنوانوں سے تین نظمیں بہت اچھی ہیں۔ تقدیرِ آدم کے تین شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

نکل رہی ہے عدم کی گھٹی ہوئی یہ ہُوک — فشارِ سینۂ تقدیر کا دھواں ہے وجود
نمودِ کوششِ ناپختۂ مذاقِ حیات — حیاتِ بیخود و وارفتۂ شرابِ نمود
شہیدِ قدرتِ پیچیدہ راہ کیا کہنا — مسافرِ سفرِ بے پناہ کیا کہنا

ترانۂ آدم کے چند شعر بھی دیکھئے۔

آشفتگی کو زیست کا عنواں کریں گے ہم — صبحِ چمن کو شامِ بیاباں کریں گے ہم
سرگشتگی و وسعتِ صحرا کہاں ہے تو — کب تک طوافِ کوچۂ جاناں کریں گے ہم
کب تک رہیں خرابِ تن آسانیٔ نشاط — کب شوقِ مضمحل کو پرافشاں کریں گے ہم
دیکھیں گے ہم اب اپنا جلایا ہوا چراغ — تاریکیوں سے سازشِ پنہاں کریں گے ہم

ایک غزل کے چند شعر دیکھئے۔ کس قدر خلوص اور رچاؤ ہے

جلوؤں سے نہ آنکھ جھپکتی ہے جلوؤں کو نہ آنکھ ترستی ہے
ہم نے وہ پیالہ پی ہی لیا جس میں نہ خمار نہ مستی ہے

ہے رُوح کی حالت کُندن کی جتنا ہی تپے گی نکھرے گی
غم ایک کسوٹی ہے جس پر یہ فطرت ہم کو کستی ہے
حکمت کی بھی کھیتی غرق ہوئی حیرت کا بھی صحرا ڈوب چلا
گھنگھور گھٹا ہے یاد اُن کی کیا ٹوٹ کے دل پر برستی ہے

یہ ایک اتّفاق ہے یا رضوی کی افتادِ طبیعت کہ اس نے بیشتر ایسی بحروں کا انتخاب کیا ہے جن میں موسیقی زیادہ ہے۔ اس سے کلام مزید جذب و اثر کا حامل ہو گیا ہے۔

اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں

مصنّف مولانا عبدالماجد دریا بادی
ناشر ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ

مولانا عبدالماجد دریا بادی کو کون اردو دوست نہیں جانتا۔ اردو ادب پر آپ کے جہاں اور بیش بہا احسانات ہیں وہاں "اکبریات" (غالبیات کے نہج پر) میں آپ نے گراں قدر اضافے فرمائے ہیں۔ اکبر سے آپ کو بہت محبت ہے اور اکبر تھے بھی محبت ہی کرنے کے قابل۔ مصنّف نے اکبر سے متعلق بہت سے مضمون، مقالے اور شذرے تیس بتیس سال کی مدت میں تحریر فرمائے وہ سب اس مجموعے میں یکجا نظر آئیں گے۔ مولانا کی والہانہ طرزِ تحریر میں ایک خاص انفرادیت ہے۔ اکبر کے کلام میں ظرافت ہے، چٹخارہ ہے بذلہ سنجی ہے لیکن ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا، سبحان اللہ۔ کتاب ۲۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت تین روپے فی جلد

نوائے وقت

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر شعبۂ اردو و فارسی سینٹ زیویرس کالج بمبئی۔ پبلشرز رائٹرز امپوریم لمیٹڈ پیلس بلڈنگ۔ سر فیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی ۱۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

پروفیسر گوریکر کی ادبی تقریروں کا یہ مجموعہ حال ہی میں آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ ان تقریروں میں بعض کے عنوانات یہ ہیں، ڈاکٹر اقبال، اقبال اور ہندوستان، مرزا غالب، اکبر اور مغربیت، کیفی کی شاعری۔ گوریکر صاحب کا اندازِ بیان سادہ اور پُر مغز ہے۔ اُمید ہے کہ بمبئی ایسے صوبے میں اُردو کے مخلص خادم گوریکر صاحب کا یہ مجموعۂ تقاریر قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

نئی تحریر مرتب ہری چند چڈھا۔ ناشر، مکتبۂ نئی تحریر ۱ ایلی روڈ نئی دہلی۔ منتخب افسانوں کے اس مجموعے کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ پیش لفظ میں مرتب نے بڑی سنجیدگی سے 'کہانی' پر تنقیدی نظر ڈالی ہے، ان کی تحریر میں جذب و اثر کے ساتھ ساتھ منطقی استدلال بھی موجود ہے۔ ادیب کی پیغمبرانہ حیثیت کو منوانے کے لئے مرتب نے اپنا مخصوص خطیبانہ لہجہ بڑی فراخ دلی سے صرف کیا ہے۔ یہ مجموعہ انیس کہانیوں پر مشتمل ہے۔ 'کہانی کاروں' میں بہت سے نئے لکھنے والے ہیں، ان کے ساتھ ساتھ دیوندر ستیارتھی، وشنو پربھاکر، رام لال، ٹھاکر پونچھی ایسے منجھے ہوئے ادیب و افسانہ نگار بھی ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ مرتب کا یہ مجموعہ مقبول ہوگا، اس لئے کہ اس کے ذریعے سے ایسے نئے لکھنے والوں کو عوام سے روشناس کرایا گیا ہے جن کی تخلیقات میں کوئی نہ کوئی جوہر موجود ہے۔

جھلکیاں عروج زیدی بدایونی کا مجموعہ کلام۔ ضخامت $\frac{20 \times 26}{8}$ ۱۷۶ صفحے۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت فی جلد تین روپے۔ ملنے کا پتہ۔ نظامی پریس بدایوں۔ اساتذۂ معتبر نے عروج کے کلام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ وحشت، نوح، آرزو۔ جوش ملسیانی۔ نیاز فتحپوری نے آپ کے کلام کی تعریف کی ہے۔ کلام زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہے۔ لیکن آخر میں بہت سی نظمیں قطعات و رباعیات بھی ہیں۔

دو شعر ملاحظہ ہوں

جھوم کر اٹھی ہے کعبے سے گھٹا میرے لئے ۔۔۔ لا شراب کہنہ ساقی جلد لا میرے لئے

ترے عروج کو دیر و حرم سے کیا نسبت ۔۔۔ اسے طواف کو تیرا حریم ناز رہے

آگرہ بازار حبیب تنویر اردو کے نوجوان شاعر ہیں۔ ڈرامے سے انہیں گہرا لگاؤ ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے کلام اور اس کی زندگی سے انھوں نے یہ گراں قدر ڈراما مرتب کیا ہے۔ اردو میں اچھے ڈراموں کی کمی ہے۔ بلکہ یوں کہئے اچھے ڈرامے نایاب سے ہیں۔ نظیر اردو کا بہت بڑا عوامی شاعر ہے۔ قلی قطب شاہ کے بعد یہی ایک شاعر ہے جسے عوامی کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے اساتذۂ متقدمین نے اسے مبتذل قرار دیا تھا۔ لیکن ہندوستانی معاشرت کا گہرا مطالعہ کرنے والا شاعر سَو دو سَو سال قصر ادب سے خارج رہنے کے باوجود اب وہیں تخت نشین نظر آتا ہے۔ حبیب تنویر کا یہ ڈراما جامعہ نگر اور نئی دہلی میں کامیابی سے کھیلا بھی جا چکا ہے۔ کتاب بہت اہتمام سے چھپی ہے۔ ضخامت ۱۰۴ صفحے۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ۔ آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل دہلی

رسالے

روحِ ادب سالگرہ نمبر ۱۹۵۴ء۔ اس میں ۱۹۵۳ء کا انتخاب شائع ہوا ہے۔ مرتب ہیں سیّد احتشام حسین اور شوکت صدیقی۔ قیمت چار روپے۔ چندہ سالانہ دس روپے۔ ضخامت ۳۲۸ صفحے۔ بڑی تقطیع۔ ملنے کا پتہ۔ ادارہ فروغ اردو۔ اے، ایم ۵ کراچی۔ سرورق پر چغتائی کا ایک حسین و جمیل عمل شائع ہوا ہے۔ افسانے، طنز و مزاح، ڈراما، سفر نامہ، خاکے نظمیں، غزلیں، طویل نظمیں، گیت دوہے۔ تنقید، فنونِ لطیفہ، تاریخ و سائنس کے تحت اچھے ادب کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ لکھنے والوں میں نئے اور پرانے سبھی شامل ہیں۔

سویرا جنوری تا اپریل ۱۹۵۵ء کا یکجائی شمارہ۔ نذیر چودھری اور حنیف رامے اس کے مرتب ہیں۔ لکھنے والوں میں سبھی اچھا لکھنے والے موجود ہیں۔ مضامین، طنز و تمثیل، غزلیں نظمیں، افسانے سبھی معیاری ہیں۔ آخر میں "میں کیوں لکھتا ہوں" کے عنوان سے ایک بہت دلچسپ سمپوزیم ہے جس میں ابن انشا، ممتاز حسین، ابوالفضل صدیقی، نیاز فتحپوری، منٹو، ممتاز مفتی، مرزا ادیب، مجید امجد، ناصر کاظمی، احتشام حسین اور دیگر ادبا و شعراء شامل ہیں۔ بڑی تقطیع کے ۳۵۰ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ بڑا حسین و جمیل ہے۔ کتابت نہایت عمدہ ہے۔ ظاہری اور معنوی حسن سے مالا مال ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ زرِ سالانہ بارہ روپے

معیار یہ رسالہ میرٹھ سے بڑی باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ زیر تبصرہ نمبر تنقید نمبر ہے۔ اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہے۔ سالانہ چندہ پانچ روپے ہے۔ اس کے مدیر نجم الاسلام صاحب ایک سلجھا ہوا ذوقِ ادب رکھتے ہیں۔ اس شمارے میں بیشتر نئے لکھنے والے ہیں۔ لیکن مضامین اپنی نوعیت کے لحاظ سے سنجیدہ اور دلچسپ ہیں۔

کلیاں بچوں کا رسالہ لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ مدیر۔ سیّد اقتدار حسین، سرپرست، سیّد احتشام حسین۔ قیمت سالانہ چار روپے۔ ملنے کا پتہ۔ کاشانۂ شمیم بشیرت گنج لکھنؤ

رفتارِ زمانہ

بھاکڑا کا افتتاح

جولائی ۱۹۵۴ء کا مہینہ بھارت کی تاریخ میں ایک قابلِ فخر اور بڑا اہم مہینہ ہے اس مہینے کی ۸ تاریخ کو بھارت کے پردھان منتری شری جواہرلال نہرو نے دنیا کی سب سے بڑی نہر بھاکڑا کی رسمِ افتتاح ادا کی۔ اس نہر کے کھلنے سے پنجاب، پیپسو اور راجستھان کی لاکھوں ایکڑ بنجر زمین سرسبز ہو جائے گی اور بھارت خوش حالی کی طرف ایک اہم قدم اُٹھائے گا۔ اس موقعے پر شری نہرو نے کہا کہ آج کا دن ہمارے لئے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں ہمارے سامنے بہت بڑا کام باقی ہے۔ لیکن یہ بات صاف ہے کہ دیش کے ۳۶ کروڑ مرد اور عورتیں ملک کو ترقی کی ایک نئی راہ پر ڈالنے کے لئے پوری کوشش سے سرگرم ہیں۔ اس طرح کے اقدام سے ہمارے دیہات کی شکل بدل جائے گی اور اس سے مفلسی کے خاتمے میں بہت بڑی مدد ملے گی۔ اس سلسلے میں پاکستان کی ایجی ٹیشن کا ذکر کرتے ہوئے شری نہرو نے کہا کہ ہم پاکستان کو کسی قسم کا نقصان پہنچانا نہیں چاہتے کیونکہ اُس کی تکلیف ہماری تکلیف ہے۔ پھر بھی میں ایک بات صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ بھارت ایک لمبے عرصے تک انتظار نہیں کر سکتا۔ وہ نہیں چاہتا کہ قانونی جھگڑے اُس کی ترقی کی راہ میں روڑا بن جائیں۔ نہرو جی نے اس بات کو بھی صاف کر دیا کہ بھاکڑا نہر کے جاری ہونے سے پاکستان کی نہروں میں پانی کی کمی نہیں ہوگی اور ستلج کا پانی بدستور پاکستان کو سپلائی ہوتا رہے گا۔

ماہی کی آزادی

چندر نگر کے بعد فرانس اپنے ایک دوسرے مقبوضہ ہند ماہی سے بھی دست بردار ہو گیا ہے۔ سرکاری اور غیر جانب دار حلقے اس امر پر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں کہ دست برداری اور انتقالِ اختیارات پُرامن طور پر ہو گیا ہے۔ اب اُمید کی جا رہی ہے کہ بھارت میں فرانس کے باقی ماندہ مقبوضات بھی بہت جلد آزاد ہو جائیں گے۔

مصر کا اظہارِ لاتعلقی

مصر کے ایک وزیر میجر صالح سلیم نے پریس کانفرنس میں ایک بیان دیتے ہوئے بتایا کہ مصر کو ترکی اور پاکستان کے فوجی گٹھ جوڑ سے کسی قسم کا کوئی سروکار نہیں آپ نے یہ بھی کہا کہ پاک ترکی معاہدے میں عراق کی شرکت کی خبریں بھی بالکل غلط ہیں۔ میجر سلیم نے یہ بھی بتایا کہ مصر فی الحال عرب حفاظتی پیکیٹ سے مطمئن ہے اور برطانیہ کے ساتھ نہر سویز کے معاملے کا تصفیہ ہو جانے کے بعد یہ پیکیٹ اور بھی مستحکم ہو جائے گا۔

بھارت اور رُوس کے تعلقات میں اضافہ

بھارت میں روس کے سفیر مسٹر منشی کوف نے کان پور میں ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ بھارت اور روس کے دوستانہ تعلقات مضبوط ہو رہے ہیں اور دونوں ممالک قیامِ امن کے لئے مل کر کام کر رہے ہیں۔ آپ نے کہا مجھے اس امر کا یقین ہے کہ جوں جوں دونوں ملکوں میں ڈیلیگیشنوں کا تبادلہ بڑھتا جائے گا دونوں کے تعلقات بڑھتے جائیں گے

کشمیر اور بھارت کا اٹوٹ سمبندھ

ریاست جموں اور کشمیر کی نیشنل کانفرنس نے اپنے ایک ریزولیوشن میں اس امر کو صاف کر دیا ہے کہ بھارت اور کشمیر کا الحاق اٹوٹ ہے۔ اس میں کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اس لئے اب ریاست میں استصوابِ رائے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی

مشرقی پاکستان میں تو کمیونسٹ پارٹی پیشتر ازیں ہی خلافِ قانون قرار دی جا چکی تھی اب بہاول پور اور خیر پور کی ریاستوں کو چھوڑ کر سارے مغربی پاکستان میں بھی پارٹی کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا ہے۔ لاہور، پشاور اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں کمیونسٹ اور اُن کے حمایتی دھڑا دھڑ گرفتار کئے جا رہے ہیں۔

پردھان منتری کی تقریر

اجمیر کانگرس سیشن پر قومی جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کرتے ہوئے آل انڈیا نیشنل کانگرس کے پردھان شری جواہر لال نہرو نے کہا کہ بھارت غنڈہ گردی اور تشدد آمیز حرکتوں سے ترقی کی جانب نہیں بڑھ سکتا بلکہ اس کے لئے متواتر محنت اور سخت کوششوں کی ضرورت ہے۔ فرقہ وارانہ جماعتوں کی شدید مذمت کرتے ہوئے شری نہرو نے کہا کہ یہ جماعتیں ملک میں پھوٹ کا بیج بو رہی ہیں۔ جنتا کو صوبائی تعصب اور تنگدلی کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ باتیں بھارت کی طویل غلامی کی ذمے دار ہیں۔ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے، اور اس میں تمام اشخاص کو ایک سے مواقع میّسر ہیں۔ ہمارا یہ ملک کسی خاص مذہب کے لوگوں کی ملکیت نہیں، اس لئے تمام لوگوں کو پوری کوشش کے ساتھ اپنے ملک کی ترقی کے لئے کمربستہ ہو جانا چاہیئے۔

بھارت میں غذائی خوش حالی کا دور

بھارت سرکار کے ایک اعلان کے مطابق ۱۰ جولائی ۱۹۵۴ء سے چاول کا کنٹرول پورے طور سے ختم کر دیا گیا ہے۔ حکومت نے اب چاول وصول کرنا بھی بند کر دیا ہے، اور ایک پردیش سے دوسرے پردیش میں چاول کے لانے اور لے جانے پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے۔ واضح رہے کہ ۱۹۵۳-۵۴ء میں چاول کی پیداوار کا اندازہ دو کروڑ ستر لاکھ ٹن ہے، اور ابھی حکومت کے پاس ۱۴ لاکھ ٹن چاول کا سٹاک موجود ہے۔ چاول کی اتنی زیادہ پیداوار ہونے کی وجہ سے حکومت نے اس کے کنٹرول کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ بھارت سرکار کی خوراک کے محاذ پر اس شاندار کامیابی سے عوام میں خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

بھارت کا دوسرا شاندار پلان

ایک طرف بھارت سرکار اور اُس کا پلاننگ کمیشن اور دوسری طرف کانگرس ملک کے پانچ لاکھ دیہات کے اقتصادی، انتظامی اور عدالتی نظام میں انقلابی اصلاحات کا ایک پلان طیّار کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں جس پر کانگرس کے اجمیر سشن میں غور و خوض کیا گیا ہے۔ مختلف پردیشوں کے لوکل سیلف گورنمنٹ کے وزراء نے شملہ کانفرنس میں سولہ ارکان پر مشتمل جو کمیٹی قائم کی تھی اُس نے بھی اپنی رپورٹ پلاننگ کمیشن کو پیش کر دی ہے۔ اس سلسلے میں مزید اطلاع ہے کہ دو ہ اپانچ سالہ پلان دیہات سے شروع کیا جائے گا، اور اس کا زیادہ استعمال ملک کے لاکھوں دیہات کی ترقی کے لئے کیا جائے گا۔

ہندی چینی میں جنگ بند ہو جانے کی بھارت کوششیں کامیاب

کوریا کی جنگ ملتوی کرانے میں جو نمایاں پارٹ بھارت نے ادا کیا، اُس سے دنیا بھر کی قوموں پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ بھارت شانتی اور صلح کا صحیح معنوں میں علمبردار ہے، اور اس کے لئے بھارت کو دوست اور دشمن دونوں نے خراج تحسین ادا کیا۔ کوریا کی جنگ بندی کے بعد ہندی چینی کی جنگ ایسی تھی جو ایک طرح سے دنیا کے دو دھڑوں کی جنگ تھی، اور ایسے آثار تھے کہ کہیں یہ جنگ مہیب صورت اختیار کر کے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ اس جنگ کو روکنے کے لئے جنیوا میں کانفرنس شروع ہوئی۔ لیکن دو ماہ کی مسلسل کوششوں کے باوجود اس سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے۔ امریکہ کے وزیر خارجہ مسٹر ڈلس کے جنیوا سے واپس لوٹنے پر تو صاف نظر آنے لگا کہ کانفرنس ٹوٹی پاکل، اور دنیا کے امن پسند عناصر پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ عین اس موقع پر بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے اس مسئلے میں دلچسپی لے کر حالات کا پانسا پلٹ دیا، اور جو بات ناممکن نظر آ رہی تھی اُسے ممکن کر دکھایا۔ شری نہرو کے ذاتی مشیر شری کرشنا مینن اس سلسلے میں کئی بار جنیوا اور لندن گئے اور فرانس کے وزیر اعظم، برطانیہ کے وزیر خارجہ، چین کے وزیر اعظم اور روسی ڈیلیگیٹ سے متعدد ملاقاتیں کیں، اور بالآخر جنگ ختم کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ جنگ بندی کی شرائط پر عمل کرانے اور دیگر تفاصیل طے کرنے کے لئے بھارت، پولینڈ اور کنیڈا پر مشتمل ایک نگران کمیشن مقرر کیا گیا ہے، اس کمیشن کا چیرمین بھارت ہو گا۔ بھارت نے کمیشن میں شامل ہونا منظور کر لیا ہے۔

بھارت کے پرتگیزی علاقے آزاد ہونے لگے

بھارت میں پرتگال کی ایک بستی دادرا نے پرتگال کی غلامی کا جوا اپنے کاندھے سے اُتار پھینکا ہے۔ اس بستی کی گرام پنچائت نے بھارت کے قومی جھنڈے کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھایا اور شری نہرو سے درخواست کی کہ ان کے آزاد دیہات کو انڈین یونین میں شامل کر لیں۔

میرا جی چاہا میں رات بھر ناچتی رہوں . . .



پردہ گرتے ہی جب ہال تالیوں سے گونج اٹھا تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور جب ہر کوئی میرے ناچ کی تعریف کرنے لگا تو میرا جی چاہا کہ میں رات بھر ناچتی رہوں۔ جب ثالثوں نے پہلے انعام کا اعلان میرے حق میں کیا اور میں اپنا سنہری تمغہ لینے سٹیج پر آئی تو وہ گویا میری خوشی کی معراج تھی۔ سب سے پہلے میرے استاد صاحب نے مجھے مبارک دی۔ بڑے فخر سے انھوں نے میری امی سے کہا: "آج اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی دبلی پتلی لڑکی ہے جسے دو برس پہلے میں نے ناچ سکھانا شروع کیا تھا!" امی مارے خوشی کے کچھ کہہ نہ سکیں۔

استاد صاحب کا کہا حرف بحرف درست تھا۔ دو برس پہلے میری حالت یہ تھی کہ اگر پندرہ منٹ بھی ناچتی تو تھکاوٹ سے سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ آخرکار امی کو ڈاکٹر سے مشورہ کرنا پڑا۔ ڈاکٹر نے مکمل معائنے کے بعد کہا: "گھبرانے کی کوئی بات نہیں، البتہ اسکے کھانے پینے کی طرف توجہ لازمی ہے۔ اسکی غذا باقاعدہ اور متوازن ہونا چاہیے، جس میں وٹامن، پروٹین، کاربوہائیڈریٹ، معدنیات کے علاوہ چکنائیوں کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ خالص اور تازہ چکنائی ہماری روزانہ خوراک کا ایک اہم جزو ہے کیونکہ ہمیں روزمرہ کیلئے جو قوت درکار ہے اسے مہیا کرنے میں مدد دیتی ہے۔"

اسی دن امی نے دکان پر جا کر دکاندار سے کہا: "مجھے کھانا پکانے کی وہی چکنائی چاہیے جو اعلیٰ بھی ہو اور مقوی بھی۔" دکاندار ڈالڈا وناسپتی کا ایک ڈبہ اٹھا لایا اور کہنے لگا: "اس سے بہتر تو آپکو ملنے سے رہی۔" جب میں نے ڈالڈا میں پکا کھانا کھانا شروع کیا تو میری بھوک پھر سے جاگنے لگی کیونکہ ڈالڈا وناسپتی ہر قسم کے کھانے کو ازحد ذائقہ دار بنا دیتا ہے۔ چند ہی دنوں کے بعد تھکاوٹ کا وہ ناگوار احساس بھی جاتا رہا اور کچھ ہی عرصے کے بعد میں تین تین گھنٹے ناچ کی مشق کرنے لگی۔ قوت کیلئے ڈالڈا وناسپتی سے بہتر کوئی شے نہیں۔ ڈالڈا وناسپتی میں اب وٹامن 'اے' اور 'ڈی' شامل ہیں۔ اور اس بات کا آپ یقین رکھیئے کہ یہ ہوا روک مہربند ڈبوں میں ہمیشہ خالص، تازہ اور صحت بخش ہوتا ہے اور اسمیں کفایت بھی بہت رہتی ہے۔ آپ بھی اپنے گھر میں ڈالڈا وناسپتی استعمال کرنا شروع کر دیجئے اور آج ہی ایک ڈبہ خرید لائیے۔



یہ درخت دیکھ کر
ڈبہ خریدیے

مقوی غذا کی اہمیت

آج ہی مفت صلاح کیلئے اس پتہ پر لکھئے۔

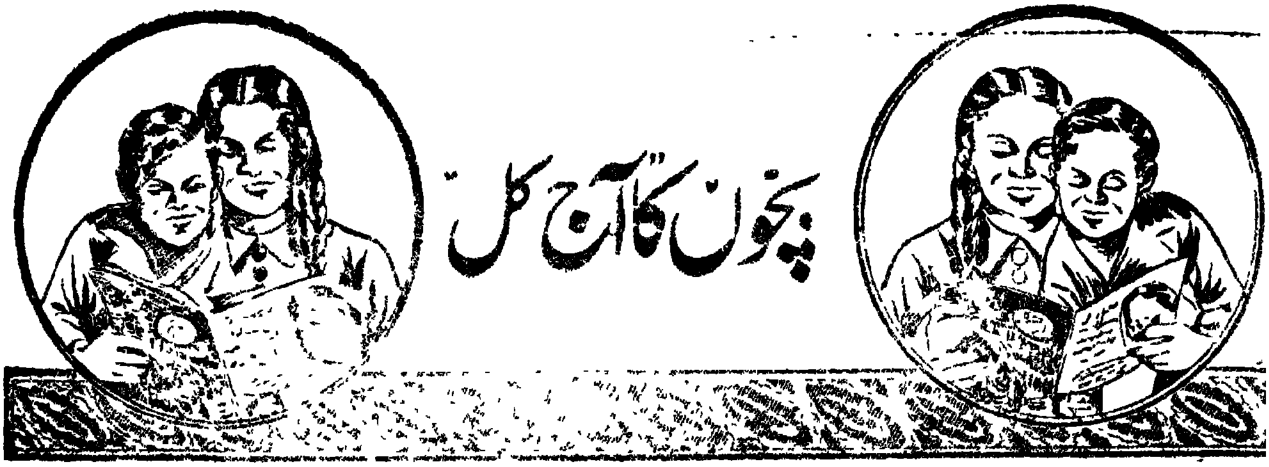
دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳ بمبئی ۱

دس، پانچ، دو اور ایک پونڈ کے ڈبوں میں دستیاب ہے

ڈالڈا وناسپتی

پکانے میں بہتر — کم خرچ

HVM. 216-X56UD



وزیر حسین شاہ

اصغر نے بلی پالی



ابا جان گئے جاپان
لے آئے تھوڑے سے دھان
دودھ منگایا کھانڈ منگائی
ڈال کے چاول کھیر پکائی
منی اور جاوید بشیر
کھا گئے اپنی اپنی کھیر
اصغر کھیلنے جاتا تھا
رات گئے گھر آتا تھا
صبح کو جب اصغر جاگا
الماری کی طرف بھاگا
لیکن پائی نہ کھیر وہاں
کھیر کہاں اب کھیر کہاں
ہنستے تھے جاوید بشیر
چوہے کھا گئے اس کی کھیر

اصغر نے بلی پالی
آنکھیں لال اور دم کالی
اس کو گوشت کھلاتا تھا
لسی دودھ پلاتا تھا
بلی تاک میں رہتی تھی
منہ سے کچھ نہ کہتی تھی
جو چوہا باہر آتا
اس کا لقمہ بن جاتا
چوہا شور مچاتا تھا
اصغر کہتا جاتا تھا
کھالے کھیر اب کھالے کھیر
ہنستے تھے جاوید بشیر

(الحمراء)

انیس خاتون



خوف

انگلستان کے ایک گاؤں میں ایک چھوٹا سا لڑکا رہتا تھا۔ وہ بہت کم عمر ہونے کے باوجود بہت نڈر اور بہادر تھا۔ گاؤں میں اکیلا اپنی نانی کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ لڑکا اپنے گھر سے گھنٹوں غائب رہتا تھا۔ یا تو وہ جنگل اور چشموں کی سیر میں مشغول رہتا تھا یا پھول چنتا اور تتلیوں کے پیچھے دوڑا کرتا تھا۔ اس کے گھنٹوں غائب رہنے سے اس کی نانی سخت پریشان رہتی۔ لیکن روزانہ کی تنبیہہ کے باوجود اس نے اپنی عادت نہ بدلی۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا اور یہ لڑکا صبح سے غائب اپنے معمول کے مطابق جنگل کی سیر کر رہا تھا۔ جب کھانا کھانے کے وقت تک وہ نہ لوٹا تو اس کی نانی کو بہت تشویش ہوئی۔ اُس نے اپنے نوکروں کو اس کی تلاش میں بھیجا۔ اور آخرکار اُن لوگوں نے اُس کو ایک چشمے کے کنارے سوتے ہوئے پایا۔ وہ لوگ اُسے اٹھا لائے۔ اس کی نانی نے غصے ہو کر پوچھا۔

"تم کو اکیلے جنگل میں جاتے ہوئے "خوف" نہیں آیا؟

بچو! کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس ننھے بچے نے کیا جواب دیا ہوگا؟

سُنو!!! اُس نے کہا

"خوف"، میں نے تو آج تک خوف کو نہیں دیکھا۔

اس جواب کو سُن کر سب لوگ ہنس پڑے اور اُس کی بہادری کی داد دینے لگے۔

بچو۔ تم جانتے ہو یہ کون لڑکا تھا۔ یہ انگلستان کا مشہور بحری افسر لارڈ نیلسن تھا جس نے اپنے ملک کو بچانے کی خاطر بہت سی بحری لڑائیاں فتح کیں اس کو اپنے وطن سے اتنی ہی محبت تھی جتنی تم سب کو ہندوستان سے ہے۔

یہ بہادر لڑکا جب بڑا ہوا تو انگریزی بحری فوج کا افسر بنایا گیا۔ اس نے جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں بہت سی لڑائیاں فتح کیں۔ سب سے آخری لڑائی "جنگ ٹرافلگر" تھی۔ اس جنگ میں نیلسن بہت بہادری سے لڑا لیکن آخیر میں وہ اپنے جنگی جہاز "فتح" کے اندر زخمی ہو کر گر پڑا۔ اس کے بہادر ساتھی فوراً اس کو اٹھا لے گئے تاکہ اس کی مرہم پٹی کریں فوجی ڈاکٹر نے بھی سب سے پہلے اس کے زخم دیکھنا چاہے۔ لیکن بہادر نیلسن نے اس کی اجازت نہ دی اور کہا۔

"پہلے ان زخمیوں کو دیکھو جو مجھ سے پہلے آئے ہیں"

بچو نیلسن شیر جیسا بہادر اور بھیڑ جیسا شریف تھا۔

پیارے بچو تم بھی بہادر نیلسن جیسے رحم دل اور نیک بنو کیونکہ آج کل ایسے رحم دل اور نیک بچوں کی سخت ضرورت ہے۔

سعید سہروردی

کنجوس بنیئے کا بیٹا

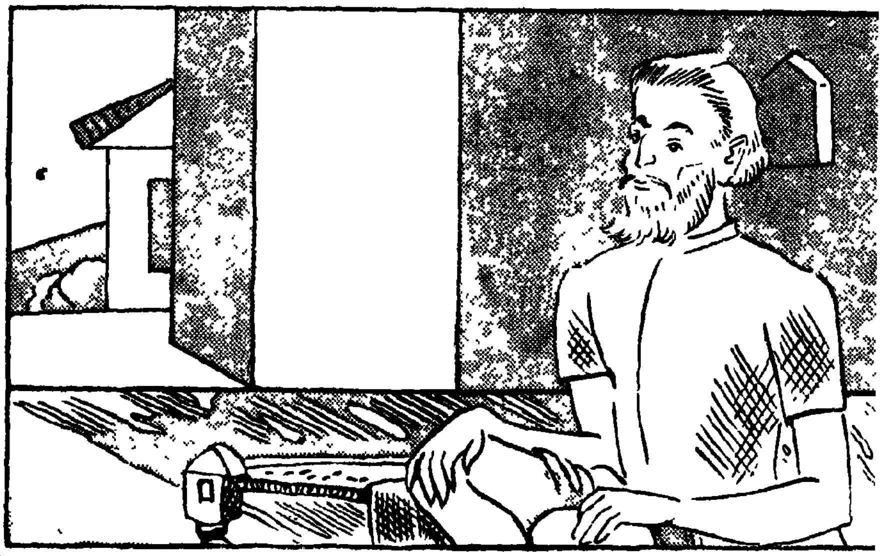
طوطا رام کی گاؤں میں ایک چھوٹی سی دکان تھی - اور وہ گاؤں میں بہت کنجوس مشہور تھا - وہ ایک لنگوٹی باندھے سارا دن دکان پر بیٹھا سودا سلف بیچا کرتا تھا - شاید اس نے ڈاڑھی، مونچھیں اور بال بھی اس لئے بڑھا رکھے تھے کہ نائی کو حجامت کے پیسے نہ دینے پڑیں - اس لئے پہلی نظر میں وہ بالکل سادھو معلوم ہوتا تھا -



حالانکہ اسے پیسہ بھگوان سے بھی زیادہ پیارا تھا - گنیش جی اور لکشمی جی کی مورتیاں بھی اس نے خریدی نہیں تھیں اس کی ماں جب کاشی یاترا کو گئی تھی - تو یہ مورتیاں اپنے ساتھ لے آئی تھی - اور اس وقت سے یہ مورتیاں گھر میں تھیں - وہ صبح دکان کھولتے وقت اور شام کو دیا جلاتے وقت انھیں پرنام تو کر لیتا تھا لیکن کبھی ایک پیسے کا پھول یا اک چراغ جلانے کی ہمت نہ کرسکا.

اس کی بیوی پھٹے کپڑے سی سی کر پہنتی تھی - جب وہ نئی ساری کے لئے کہتی تو طوطا رام سارا گھر سر پر اٹھا لیتا - اور بہت جھگڑے لڑائی کے بعد وہ اس بات کے لئے آمادہ ہوتا - اس کے بعد بھی وہ ٹال مٹول میں کئی دن گزار دیتا - اور جب نوبت یہاں تک پہنچتی کہ اس کی ساری اس درجہ تار تار ہو جاتی - کہ وہ پانی لانے کے لئے باہر جانے سے انکار کر دیتی - تب مجبور ہو کر طوطا رام اس کے لئے کوئی سستی معمولی ساری خرید لیتا - طوطا رام کے گھر سے کوئی کپڑا دھوبی کے یہاں نہیں جاتا تھا - خود طوطا رام تو ایک لنگوٹی اور کچھے کے سوا اور کچھ نہیں پہنتا تھا - اس کے پاس صرف ایک کرتا تھا - جسے اس نے بڑی حفاظت کے ساتھ بکس میں بند کر رکھا تھا جب کبھی اسے شہر سامان لانے کے لئے جانا پڑتا - اسی وقت وہ اسے نکالتا - اور واپس ہونے پر پھر اسی طرح رکھ دیتا - صرف اس نے اپنے لڑکے چھوٹا رام کے لئے دو قمیصیں اور دو نیکر بنوا دئے تھے - کیونکہ وہ اسکول جاتا تھا - اور گندے کپڑوں یا بغیر کپڑوں کے اسکول میں آنے کی اجازت نہیں تھی -

طوطا رام کا بستر بھی بہت معمولی تھا - اس کے پاس دو پرانے کمبل تھے جو اس کے باپ نے خریدے تھے - دری، چادر کی

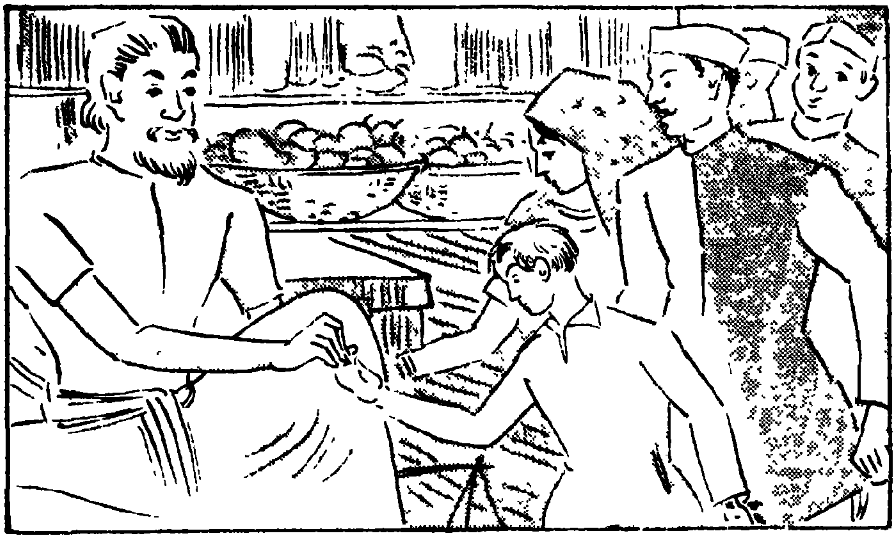


جگہ وہ کھجور کی چٹائیاں استعمال کرتا تھا - یہ چٹائیاں طوطا رام کو ایک نیک کام کے صلے میں ملی تھیں - شاید اس نے زندگی میں یہی ایک نیک کام کیا تھا - اس کے پڑوس میں عبدل نام کا ایک چٹائی بُننے والا رہا کرتا تھا - اس کی ماں جب ایک مہینے کی بیماری کے بعد مر گئی تو اس کے پاس کفن کے لئے پیسے نہیں تھے - اس کے پاس جو کچھ تھا وہ ماں کے علاج میں صرف کر چکا تھا - گاؤں کا مہاجن اسے قرض دینے کو تیار نہیں تھا - عبدل کے باپ دادا جو قرضہ چھوڑ کر مرے تھے - اس کی وجہ سے اس کی زمین اور مکان قرق ہو چکے تھے - اس لئے مہاجن نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا - جب وہ روتا ہوا طوطا رام کے پاس پہنچا - تو اس نے پہلے تو بہت بہانہ کیا لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے عبدل کو روپے قرض دے دئے - عبدل نے دھیرے دھیرے طوطا رام کا قرضہ مع سود ادا کر دیا - لیکن وقت پر کام آنے کے عوض اس نے یہ چٹائیاں طوطا رام کے لئے بنا دی تھیں جو اب تک اس کے پاس چلی آ رہی تھیں - کافی پرانی ہو جانے کی وجہ سے یہ چٹائیاں جگہ جگہ سے بالکل خستہ اور تار تار ہو چکی تھیں لیکن طوطا رام کو اس کی مطلق پروا نہ تھی - تکیے کی جگہ وہ چٹائی کے نیچے کافی پیال بچھا دیتا تھا - اور اس طرح وہ گدّے کی کمی بھی پوری کر لیتا تھا - ایک کمبل میں وہ اور چھوٹا رام اور دوسرے میں چھوٹا رام کی ماں گزر کرتے -

یہ تو جاڑوں کا معمول تھا - گرمیوں کے دوران میں وہ لوگ صرف چٹائیاں بچھا کر اپنے آنگن میں لڑھک جاتے - اور کسی نہ کسی طرح رات گزر ہی جاتی - طوطا رام کے لئے اس زندگی میں کوئی تکلیف وہ بات نہ تھی - وہ اب ان تمام باتوں کا عادی ہو چکا تھا - اور اسی میں اس کے لئے راحت تھی - اور اسی واسطے وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا چھوٹا رام بھی بالکل اسی کی طرح ہو -

چھوٹا رام اپنے باپ سے بھی دو قدم آگے تھا - طوطا رام کنجوس تو تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بیوقوف اور ڈرپوک بھی تھا - چھوٹا رام نڈر اور چالاک تھا - اس کی عمر تو صرف آٹھ سال تھی لیکن وہ بڑے بڑوں کے کان کاٹتا تھا - اور حساب میں تو وہ اتنا تیز تھا کہ جن سوالات کو لے کر دوسرے لڑکے گھنٹوں سلیٹ اور پنسل پر کھٹی مارتے رہتے - انھیں وہ چٹکی بجاتے انگلیوں پر حل کر لیتا تھا -

ایک روز طوطا رام کی دکان پر گاہکوں کی بھیڑ تھی - ان کے



ساتھ لین دین کرنے میں وہ یہ بھول گیا کہ چھوٹا رام کی ماں نے اس سے نمک منگوانے کے لئے کہا تھا ۔ جب گاہک چلے گئے تو اسے یہ بات یاد آئی ۔ لیکن پاس ہی چھوٹا رام کو بیٹھا دیکھ کر اسے اطمینان ہو گیا ۔ اس نے فوراً ایک دھیلا چھوٹا رام کی ہتھیلی پر رکھ دیا ۔ اور کہنے لگا ۔ جا دوڑ کے پنساری کی دکان سے نمک لے کر گھر میں دے دے تیری ماں راہ دیکھ رہی ہوگی ۔

چھوٹا رام نے چونک کر کہا ۔ "دھیلے کا نمک ابھی مہینہ بھر پہلے ہی تو آیا تھا ۔ اتنی جلدی کیسے ختم ہو گیا ۔"

طوطا رام کو لڑکے کی اس بات پر بہت غصہ آیا ۔ اسے یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ کوئی اس کی بات کاٹ دے اس نے بگڑ کر کہا ۔ "بیکار بک بک مت کر ۔ جو میں کہتا ہوں ۔ وہ سُن" ۔

جب چھوٹا رام چلنے لگا تو طوطا رام نے تاکید کر دی دیکھنا دھیلا سنبھال کر رکھنا ۔ اور نمک کہیں گرانا نہیں ۔ اگر دونوں میں سے کسی چیز کا بھی نقصان ہوا تو تیری خیریت نہیں ۔ اور پھر کچھ یاد کرتے ہوئے بولا ۔ آخر تو نمک لائیگا کس چیز میں ۔ کپڑا تو تو نے لیا ہی نہیں ۔ کاغذ اگر پھٹ گیا تو سارا نمک گر جائے گا ۔

یہ سُن کر چھوٹا رام نے نکر کی جیب سے ایک کپڑا نکال کر دکھلایا جیسے وہ پہلے ہی اس بات کے لئے تیار ہو ۔ اور جب اس نے یہ سمجھا دیا کہ وہ نمک اچھی طرح کپڑے میں باندھ کر لائے گا ۔ تو طوطا رام کی تسلی ہو گئی ۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد طوطا رام کے ایک پڑوسی نے آ کر بتایا کہ تمھارے لڑکے نے سارا نمک سڑک پر گرا دیا ۔ اور اسے دھول، کوڑے کرکٹ کے ساتھ کپڑے میں باندھ رہا تھا کہ کہیں کوئی ریزہ رہ نہ جائے ۔ ورنہ شاید تم اسے جیتا نہ چھوڑو ۔ ہم لوگوں نے بہت سمجھایا کہ کیا کر رہے ہو یہ نمک کون کھانے میں ڈالے گا ۔ مگر اس نے سُنی اَن سُنی کر دی ۔ تو ہم نے سوچا کہ تمہیں کو بتا دیں ۔

اپنے بیٹے کی سعادت مندی پر طوطا رام دل میں بہت خوش ہوا لیکن ذرا دیر کے بعد چھوٹا رام منہ بنائے ہانپتا کانپتا آ پہنچا اور بسورتا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہو گیا ۔ طوطا رام نے اس کی طرف غصے سے دیکھا اور پڑوسیوں سے بولا ۔ آپ لوگ جائیے ۔ میں آج اس کی خبر لوں گا کہ یہ بھی یاد کرے گا ۔ اس

کے بعد طوطا رام لڑکے کو ایک اندر کے کمرے میں لے گیا۔ اور پوچھنے لگا۔

"سچ سچ بتا دے آخر کیا بات ہوئی"۔

یہ سوال سُن کر چھوٹا رام نے بسورنا چھوڑ کر ہنسنا شروع کر دیا۔ طوطا رام یہ رنگ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ دوبارہ پوچھنے پر اس نے جواب دیا "پتا جی! یہ سب بڑے بے وقوف ہیں۔ جب میں لوٹ رہا تھا تو میں نے سڑک پر ایک ہیرے کی انگوٹھی پڑی ہوئی دیکھی۔ اسے پانے کی ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آئی۔ میں



نے نمک کی پوٹلی کھول دی۔ اور جان بوجھ کر اس جگہ گرا دی انگوٹھی نمک کے نیچے چھپ گئی۔ اور میں احتیاط کے ساتھ نمک کو انگوٹھی سمیت باندھ کر چلا آیا۔

طوطا رام نے جب انگوٹھی نکال کر غور سے دیکھی تو بیٹے کی چالاکی پر دل ہی دل میں پھولا نہ سمایا کیونکہ انگوٹھی واقعی ہیرے کی تھی۔ اس نے چھوٹا رام کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا — "میں جانتا تھا کہ میرا بیٹا دھن برباد نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر اس نے گانٹھ سے ایک اور دھیلا نکالا اور چھوٹا رام سے کہا "اب جا تھوڑا نمک اور لا دے۔

لطیفے

اُستاد۔ امجد! کل اپنی فیس دو روپے دو آنے اور چار پائی لیتے آنا۔

اُستاد۔ (دوسرے دن) ارے امجد! تم کیا اٹھا لائے؟

امجد۔ فیس ماسٹر جی! یہ لیجئے دو روپے دو آنے اور یہ رہی چار پائی

ایک آدمی نے اپنے پڑوسی سے رسّہ مانگا۔ جواب ملا کہ مجھے خود رسّے کی ضرورت ہے۔

پڑوسی نے پوچھا "تو رسّہ کب تک فارغ ہو جائے گا"۔

جواب ملا "رسّہ جلد فارغ نہیں ہونے کا۔ کیونکہ میں اس سے ریت باندھنا چاہتا ہوں۔

پڑوسی نے کہا "کبھی کسی نے رسّے سے ریت بھی باندھی ہے؟

رسّے کا مالک بولا "بھئی رسہ نہ دینا ہو تو ہر قسم کا بہانہ گھڑا جا سکتا ہے۔

گاہک۔ یہ چائے ہے یا کافی؟ اس کا مزہ تو مٹی کے تیل سا ہے۔

بیرہ۔ اگر اس کا مزہ مٹی کے تیل سا ہے تو یہ یقیناً چائے ہے کیونکہ ہمارے ہاں کی کافی کا مزہ تارپین کے تیل سا ہوتا ہے۔

اُستاد۔ لڑکو! تم جانتے ہو بے موقع بارش کسے کہتے ہیں؟

ایک شاگرد۔ جو سنیچر کی شام کو ہو۔

ایک فلاسفر۔ عورتیں کیسے شوہر پسند کرتی ہیں؟

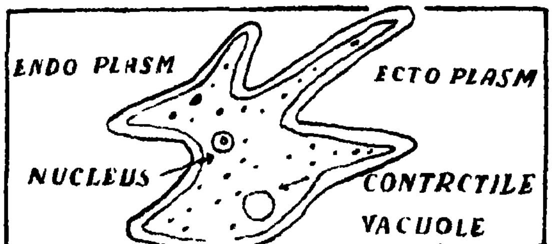
دوسرا۔ جو خاموش رہ کر ان کی ہر بات بلا چون و چرا تسلیم کرلے۔

محمد امتیاز کریم تاج

خوردبین کی آنکھوں سے

خوردبین کی مدد سے ہم ان چھوٹی چھوٹی ذی روح چیزوں کو دیکھتے ہیں جنھیں ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ امیبا بھی ایک خوردبین ذی روح ہے۔ امیبا Amoeba ایک بہت ہی چھوٹی ذی روح شے ہے۔ ناپ میں یہ 0.25 ملی میٹر (ایک انچ کا ۱/۱۰۰ حصہ) ہوتا ہے۔

امیبا عموماً تالاب، گڈھے، موریوں اور جھرنوں کی نچلی سطح میں پایا جاتا ہے۔ خوردبین سے دیکھنے میں یہ جیلی Jelly کے ایک چھوٹے ٹکڑے کی طرح نظر آتا ہے۔

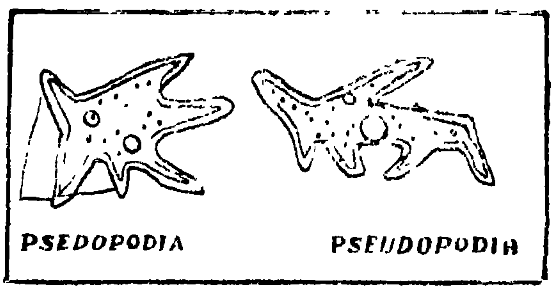


اس کی صورت و شکل مخصوص نہیں ہوتی۔ یہ ضرورت کے مطابق اپنی صورت شکل میں تبدیلی لاتا رہتا ہے۔ اوپر کے نقشے میں اس کے مختلف حصّوں کے نام بتائے گئے ہیں۔ حاشیہ دار حصّہ بالکل شفاف ہوتا ہے، اور اسے Ectoplasm کہتے ہیں۔ اس کے بعد کا اندرونی حصّہ Endoplasm کہا جاتا ہے، اور یہ دانہ دار نظر آتا ہے۔ بیچ میں جو گول سا ایک صاف حصّہ دکھایا گیا ہے خوردبین سے دیکھنے میں یہ بہت ہی خوب صورت معلوم ہوتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہ ٹوٹتا اور اُبھرتا رہتا ہے۔ اس سے پانی اور دوسری غیر ہضم غذائیں خارج ہوتی رہتی ہیں۔ Nucleus ایک بہت ہی چھوٹی سی چیز ہے، جو تمام چیزوں کو کنٹرول کرتی ہے۔

ہم نے جتنی بھی جان دار چیزیں دیکھی ہیں اُن کی ایک مخصوص صورت و شکل ہوتی ہے۔ لیکن اس میں ایسی بات نہیں۔ ہمیں اب یہ دیکھنا ہے کہ اس کے اندر وہ کون کون سی چیزیں ہیں جس کی وجہ سے ہم اُسے جان دار کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

حرکت

یہ دوتین طرح سے چلتا ہے۔ ایک جیلی جیسی شے ہونے کی وجہ سے یہ جسم کے کسی حصّے کو بڑی آسانی سے نکال سکتا ہے۔ یہ اپنے مصنوعی پیروں Pseudopodia کی مدد سے بڑی آسانی سے چلتا ہے۔

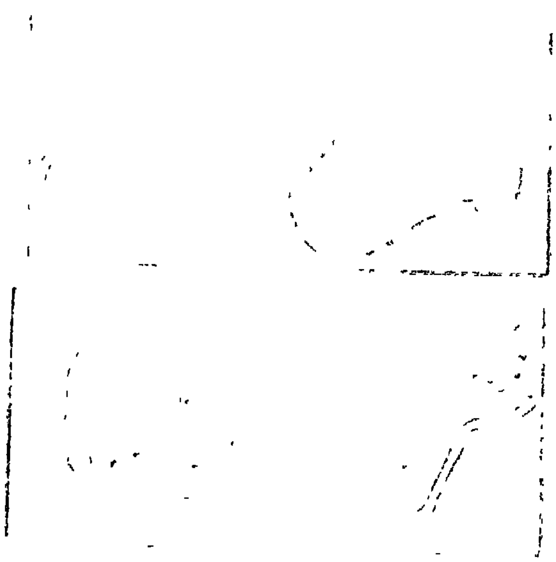


یہ اس کے مصنوعی پر اس کے ہاتھ کا بھی کام دیتے ہیں۔ ان کی مدد سے وہ بڑی آسانی سے غذا حاصل کرلیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لڑھک کر اور رینگ کر بھی چلتا ہے۔

غذا اور اس کے کھانے کا طریقہ

امیبا جس وقت پانی میں ہوتا ہے تو ادھر سے اُدھر آنے جانے میں یہ اپنے کھانے کے لائق غذا سے ٹکرا جاتا ہے، اور پھر اسے اپنے دو مصنوعی پروں کے درمیان گھیر کر اپنے جسم کے اندر عجیب طریقے سے داخل کرلیتا ہے۔

دوران تجربہ میں شیشے کے ریزے اور دوسری ایسی چیزیں جو اس کی غذا میں شامل نہیں اس کے آس پاس رکھ کر دیکھی گئی ہیں، لیکن وہ انھیں چھوتا تک نہیں۔ اپنی غذا وہ اپنے جسم کے اندر کس طرح داخل کرتا ہے، اُسے ہم ذیل کے نقشوں کی مدد سے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔



موت

امیبا میں سب سے زیادہ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس میں قدرتی موت نہیں ہے۔ اس کا ثبوت اس کے نسل بڑھانے کے طریقے سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔

کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی امیبا دو حصوں میں بٹ جاتا ہے، اور پھر وہ دونوں دو مکمل امیبا بن جاتے ہیں، اور پھر دوسرا بٹ کر تیسرے کو جنم دیتا ہے، اور پھر پیدائش کا یہ سلسلہ غیر اختتام ہوتا ہے ـــــ موت عموماً پرانے ہونے پر واقع ہوتی ہے۔ لیکن یہاں ہر بار ہمیں نیا امیبا ملتا ہے۔ قدرتی موت کے نہ ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ امیبا کی موت واقع ہوتی ہی نہیں۔ موت ضرور ہوتی ہے، اور یہ موت ہلکی گرمی، پانی کی کمی، یا امیبا پر تیزابی چیز ڈالنے سے پیدا ہوتی ہے۔ امیبا اپنے جسم کے حصے کی بالیدگی بڑی آسانی سے کرتا ہے۔

بڑا لڑکا

ایک انسپکٹر دیہاتی اسکول کے معائنے پر گیا ہوا تھا کہ برابر کے کمرے سے بہت شور و غل کی آواز آنے لگی، وہ بہت سٹ پٹایا۔

آخر جب بہت تنگ آیا تو دروازہ کھول کر جماعت میں داخل ہوا اور نہ جانے غصے میں کیا کیا کچھ کہہ گیا۔

ایک لڑکے کو جس کا قد باقی لڑکوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ لمبا تھا کان سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آیا، اس کا منہ دیوار کی طرف کرکے کہنے لگا "اب یہاں خاموشی سے کھڑے رہو"

دس منٹ کے بعد ایک چھوٹا لڑکا آیا اور آہستہ سے کہنے لگا کہ "ہمارے ماسٹر جی کب تک یہاں کھڑے رہیں گے۔"

آج کل

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

اجہ غلام السیدین ایڈیشنل سیکرٹری وزارتِ تعلیم حکومت ہند

ین "آج کل" کو ہمیشہ بہت دل چسپی سے پڑھتا ہوں اور اس میں اکثر بل قدر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں ۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات ن قابلِ ذکر ہے کہ بحیثیت مجموعی اس کی لکھائی چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی ثبوت دیتی ہیں ۔ ہمارے بہت سے رسالے تو اس ظاہری حسن سے ی عاری ہیں ۔

اکٹر عبد الستار صدیقی میور روڈ الہ آباد

پچھلے دس گیارہ برس سے رسالہ "آج کل" کو میں برابر پڑھتا رہا ہوں ۔ یں ذرا بھی شک نہیں کہ ملک کے سارے ماہانہ رسالوں میں "آج کل" سب تر اور بالاتر ہے ۔ علاوہ اس کے کہ ظاہری خوبیوں میں یہ اوروں سے اچھا ے اس کے مقالوں کا اور اس کی نظم و نثر کا معیار بہت اونچا ہے اور "آج کل" ن ساری خوبیوں میں برابر ترقی کرتا جاتا ہے ۔ یہی نہیں ۔ ملک کے اور سالوں میں اس کے اعلیٰ معیار کا نہایت صحت مند اثر پڑا ہے ۔

ان امور پر نظر کر کے میری رائے ہے کہ "آج کل" ادب اور ثقافت نوں کے لحاظ سے ملک کی بے بہا خدمت انجام دے رہا ہے اور سارے ملک علمی اور ادبی حلقوں اور اداروں کا فرض ہے کہ وہ اس ترقی کو خود ن ترقی جانیں اور اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں ۔

ناب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کشمیری محلہ لکھنؤ

"آج کل" کا بجا طور پر اُردو کے بہترین رسالوں میں شمار ہے ۔ اس بیشتر مضامین نثر پُر مغز اور دلچسپ معلومات سے لبریز ہوتے ہیں ۔ فسانوں نے بیہودہ افسانوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے ۔ نظم کے حصے میں بھی ایک امتیازی شان ہوتی ہے ۔

بچوں کا آج کل نئی پود میں بہت مقبول ہے ۔ رسالہ آیا نہیں کہ میرے نواسوں اور نواسیوں نے مجھے گھیرا اور کہانیاں سُنانے کی فرمائش ہونے لگی ۔

سید احتشام حسین لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

"آج کل" اردو کا مطالعہ کئی سال سے باقاعدہ کر رہا ہوں ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو رسالہ برسوں سے ایک ملکی زبان کے ذریعے علم و ادب کی خدمت کر رہا ہو وہ ذہن میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے اور پڑھنے والے ہر مہینے اس کا انتظار بے تابی سے کرتے ہیں ۔ "آج کل" کے نئے بھی میں نے لوگوں کو بیتاب پایا ہے ۔ اچھے ادبی اور تنقیدی مضامین تو اس میں شائع ہوتے ہی رہتے ہیں ۔ اکثر ایسے علمی، تہذیبی، فنی اور معلوماتی مضامین بھی نکلتے ہیں جو دوسرے رسائل میں نظر نہیں آتے ۔ اس کا یہ تنوع ہی اسے ہر دلعزیز بناتا ہے ۔ "آج کل" میں مرزا غالب کے متعلق بعض ایسے مضامین عکس اور نوادر شائع ہوتے ہیں جو بلا شبہ غالبیات میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے متعلق وقتاً فوقتاً جو مضامین نکلتے رہے ہیں یا جو ترجمے شائع ہوئے ہیں ان کی اہمیت بھی مسلّم ہے ۔ اسی طرح اس کے خاص نمبر بھی صوری اور معنوی حیثیت سے دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں اور ہر مذاق کی آسودگی کا سامان رکھتے ہیں ۔

کرشن چندر ۔ بمبئی

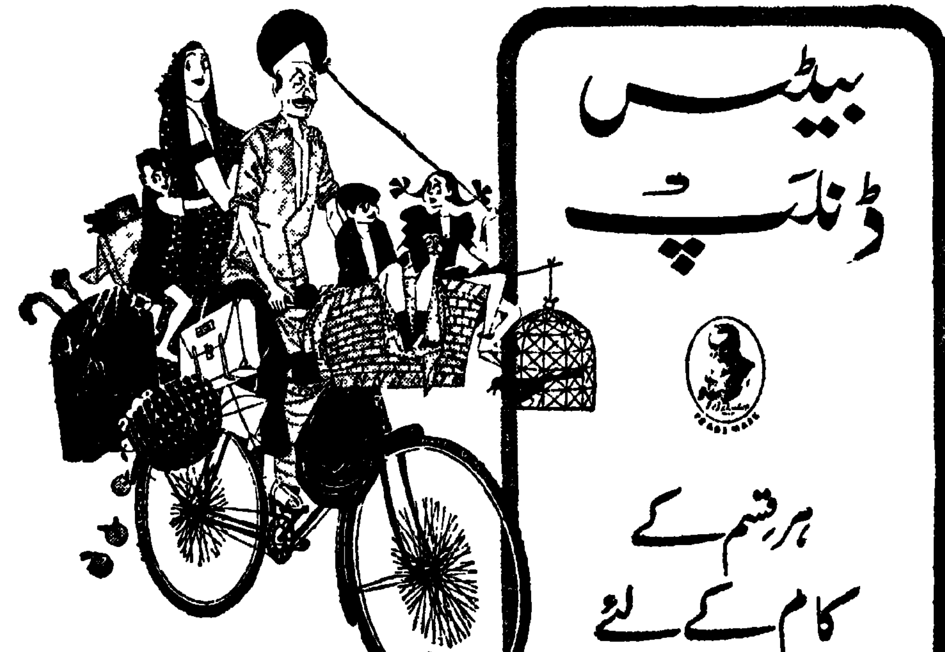
رسالہ "آج کل" ایک عرصے سے اردو ادب کی قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے ۔ اس کے ادارے سے جناب جوش ملیح آبادی ۔ جناب عرش ملسیانی منسلک ہیں ۔ جن کی روشن خیالی اور فنی بلوغت کے سبھی قائل ہیں "آج کل" کے کئی ایک خاص نمبر اردو داں طبقے میں شرفِ قبولیت حاصل کر چکے ہیں ۔ بوجوہ اس پرچے کو زندہ رکھنا اور اس کی اشاعت بڑھانے کے لئے کوشش کرنا اردو زبان سے اپنی محبت کا بھی ثبوت دینا ہوگا ۔

فی پرچہ آٹھ آنے —————— سالانہ چھ روپے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ اولڈ سیکرٹری ایٹ دہلی



دِن بہ دِن
زیادہ ملایم،
زیادہ دِلکش جِلد
کیڈِل آمیز
رکسونا آپ کے لئے بھی
یہ کمال کرے گا
اپنی جلد پر رکسونا کا کیڈِل آمیز جھاگ
نرمی سے مَلیئے، پھر دھو ڈالئے آپ
محسوس کریں گی کہ آپ کی جلد دِن بہ دِن
زیادہ نرم و ملایم ہوتی جا رہی ہے اور
آپ کا حُسن نِکھر رہا ہے۔
رکسونا
کیڈِل* آمیز واحد صابن
* کیڈِل جلد کو ملایم اور مقوّی کرنے والے
تیلوں کے ایک خاص مرکب کا طبعی نام ہے
Rexona
رکسونا پروپرائٹری لمیٹیڈ کیلئے ہندوستان میں بنایا گیا



بیٹس
ڈنلپ
ہر قسم کے
کام کے لئے



لکس
"کتنا سفید - کتنا خالص -
کتنا ملایم اور خوشبودار ہے لکس ٹائلیٹ صابن کا جھاگ"
- منوّر سلطانہ
LUX
TOILET SOAP
ہندوستان میں بنا ہوا
لکس ٹائلیٹ صابن کے بافراط ملایم جھاگ سے اپنے قدرتی حُسن کو نکھاریئے۔ منوّر سلطانہ کہتی ہیں: "اس سفید اور خالص صابن کے روزانہ استعمال سے جِلد نہایت صاف ستھری بن جاتی ہے۔ اسکا جھاگ مساموں میں جذب ہوکر جِلد کو نکھار دیتا ہے اور اسے پنکھڑیوں کی طرح ملایم اور خوبصورت رکھتا ہے"
خاص اطلاع
نیا بڑا سائز
سراپا حُسن کے لئے
اب دستیاب ہے
آج ہی آزمایئے
"... میں لکس ٹائلیٹ صابن کے باقاعدہ استعمال سے اپنی جِلد کی رنگت کا خیال رکھتی ہوں"
فلمی ستاروں کا حُسن بخش صابن

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر :۔ —— جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر :۔ —— بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۳ —— نمبر ۳

سالانہ چندہ :۔ —— ہندوستان میں :۔ چھ روپے
پاکستان میں :۔ چھ روپے (ڈاک)

غیر ممالک سے :۔ —— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ :۔ —— ہندوستان میں :۔ آٹھ آنے
پاکستان میں :۔ آٹھ آنے (ڈاک)

اکتوبر ۱۹۵۴ء

ترتیب

بچوں کا آج کل

سرورق :۔ باپو

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

فراق گورکھپوری

موجِ تغزّل

ہم ایک بات کہیں گے نیاز و ناز سے دور
اگر ہے حسن میں نخوت تو عشق بھی ہے غیور

مخاطب اہلِ طرب سے ہے نرگسِ مخمور
تمام ہوش کی باتیں ہیں اور نشے میں چور

دلِ حزیں میں مرے پھنک رہے ہیں صد ناصور
سکوتِ غم میں نہاں صد ہزار شورِ نشور

یہ کس لئے اٹھے ہنگامہ ہائے دار و رسن
صدا زنِ انا الانساں ہیں آج کے منصور

تمام کرشمۂ ناتمام موسیٰ کو
وہ جام اٹھا کہ جھپک جائے چشمِ شعلۂ طور

دماغ ہی نہیں ملتے ترے فقیروں کے
نظر میں جچتی نہیں سطوتِ کَے و فغفور

مصالحت غمِ دوراں سے ہم نے بھی کر لی
کوئی نہیں ترا دنیا میں لے دلِ رنجور

یہ سانحے دلِ غمگیں ہوا ہی کرتے ہیں
نہ عشق ہی کی خطا ہے نہ حسن ہی کا قصور

تعیّناتِ زمان و مکاں سے قطعِ نظر
یہ تجربے بھی رہے ہیں کوئی قریب نہ دور

کچھ آج زندہ دلوں کا تھا ذکر آپس میں
کہ یاد آ ہی گیا یک بیک دلِ مغفور

یں ہو چکا تھا دو عالم کو چھان کر مایوس
غریب خانۂ دل میں کہاں سے آئے حضور

مشیّتوں کو بدلتے ہیں زورِ بازو سے
بشر جو چاہے قضا و قدر بھی ہوں مجبور

قدم اٹھاتے ہی شکوے رہِ محبت کے
ابھی سے پاؤں میں چھالے، ہنوز دلّی دور

بنا دیا مجھے بازیچہ گاہِ ہجر و وصال
یہ کون ہے مرے دل کے قریں نگاہ سے دور

چمک سی جاتی ہے رہ رہ کے نیم تیرہ فضا
گزر رہا ہے کوئی جھٹپٹے میں بقعۂ نور

ہزار باتوں کی اک بات داستانِ جمال
اب اس میں خواہ زباں بھی کٹے کہیں گے ضرور

یہاں جو حسنِ بیاں ہے وہ بے تکلّف ہے
نگاہِ ناز کو اظہارِ فن نہیں منظور

نہ زعمِ فن نہ اسے دعویِٔ زباں دانی
نہ جانے کر دیا کس نے فراق کو مشہور

راجندر ناتھ شیدا

"گئودان" اور ترقّی پسند نقّاد

اس سے قبل راجندر ناتھ شیدا صاحب کا مضمون بعنوان "پریم چند اور ترقّی پسند نقّاد" شائع ہو چکا ہے۔ ذیل کے مضمون میں فاضل مضمون نگار نے گئودان کی روشنی میں ترقّی پسند نقّادوں کے نظریات کا جائزہ لیا ہے۔ (ادارہ)

اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گئودان پر بھی ایک نظر ڈالی جائے جسے متفقہ طور پر پریم چند کی "ترقّی پسندی" کی ناقابلِ تردید شہادت قرار دیا گیا ہے۔ پہلے ان چیزوں کو لیں جن کا ذکر تینوں نقّادوں نے کیا ہے۔ احتشام صاحب کی ترقّی پسندی چونکہ بہت فراخدل اور بے حد روادار واقع ہوئی ہے اس لئے انھوں نے صرف یہی کہنے پر اکتفا کی ہے کہ گئودان میں کسان، مزدور، سرمایہ دار، مہاجن، زمیندار، برہمن، حاکم سبھی آتے ہیں اور بعض جگہ ان کے تصادم کی حیرت انگیز تصویریں ملتی ہیں" لہٰذا اس پر بحث کرنا تحصیل حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ ترقّی پسندی "کچھ لوگوں کے ذکر یا ان کے تصادم کی حیرت انگیز تصویروں" کا نہیں بلکہ نظریات کے اسی مجموعے کا نام ہے جو متحرک زندگی کو سمجھنے اور خارجی حالات کو بدلنے میں مدد دیتا ہے۔

اب رہے علی سردار اور رہبر۔ ان کے گئودان کے متعلق چند اقوال یہاں نقل کئے جاتے ہیں:۔

"گئودان" کا ہوری اور دھنیا شمالی ہندستان کے بدحال کسان مرد اور عورت ہیں لیکن ان میں سارے ہندستان کے کسان اپنے خدوخال کی جھلک دیکھ سکتے ہیں

پریم چند کا شاہکار ان کا آخری ناول "گئودان" ہے اور ہوری ہمارے ادب کا پہلا عظیم کردار ہے جو لافانی ہے۔

پریم چند کی مثالیت اور تصوریت "چوگانِ ہستی" اور "میدانِ عمل" میں بھی باقی رہتی ہے۔ لیکن "گئودان" اس اعتبار سے ان کی تمام ادبی تخلیقات سے الگ ہے کہ اس ناول میں پریم چند اپنی طلسمات مثالیت اور تصوریت سے مایوس ہو کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس ناول کے شہری حصّہ میں جو مقابلتہً کمزور ہے، بعض مثالی کردار مل جاتے ہیں، لیکن دیہاتی حصّہ جو کتاب کی جان ہے اور ناول کا مرکزی موضوع ہے بے عیب ہے۔ اس میں کسی کی قلب ماہیت نہیں ہوتی۔ کوئی دنیا کو تیاگ کر تیرتھ کرنے نہیں جاتا۔ کوئی زمیندار اپنی زمین کسانوں میں نہیں بانٹتا۔ پریم چند نے بڑی سچّی اور بے رحم حقیقت نگاری سے کام لیا ہے اور ناول کو ہوری کی موت پر اس طرح ختم کیا ہے کہ ایک سنّاٹا چھا جاتا ہے۔

(علی سردار جعفری)

سن انتیس[۲۹] تیس[۳۰] اور پینتیس[۳۵] چھتیس[۳۶] تک مزدور تحریک بہت زور پکڑ گئی تھی۔ انھوں نے کانپور، احمد آباد اور بمبئی میں بڑی بڑی ہڑتالیں لڑی تھیں۔ پریم چند ان کا ذکر نہیں کرتے۔ اپنی تخلیقات کو درمیانہ طبقہ تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ گئودان میں مزدوروں کی ہڑتال کا ضمنی سا ذکر ہے اسے بھی بُری طرح کچل دیا جاتا ہے اور ان کے تشدّد کا انتقام کھنّا کے مل کو اتفاقاً آگ لگا کر جذباتی ڈھنگ سے لیا گیا ہے۔

واقعات کے جھٹکوں نے اُن کے گاندھی ازم میں دراڑیں ہی نہیں شگاف ڈال دئے تھے۔ اُس درخت کی شاخیں جھڑ چکی تھیں صرف جڑ باقی تھی لیکن گئودان میں وہ بھی ٹوٹتی اور سوکھتی

ہوئی نظر آتی ہے کیونکہ ہوری کسان جس زمین پر جان دیتا ہے اور قلاش ہوتے ہوئے بھی سرمایہ دار طبقہ کی روایات سے چپٹا ہوا ہے آخر اُسے کھو کر مزدور بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

درمیانی طبقہ کو ٹوٹ کر مزدور بنتے دکھانا گاندھی ازم کے عقیدے کے فلسفہ کی شکست ہے اور پریم چند کے ترقی پذیر فنی فلسفہ اور ادب کی فتح۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ اس لوٹ کھسوٹ کے نظام میں درمیانی طبقہ کے لئے اپنی ہستی قائم رکھنا ممکن نہیں۔ یہ آئندہ قدم کی واضح سمت ہے۔

(ہنس راج رہبر)

علی سردار کے اقتباسات میں تین باتوں پر زور دیا گیا ہے (۱) ہوری اور دھنیا ہندوستان کے نمائندہ کسان کردار ہیں (۲) ہوری ہمارے ادب کا پہلا عظیم کردار ہے اور (۳) "گئودان" میں پریم چند طاسطائیت، تصوریت اور مثالیت سے مایوس ہو کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ پہلی بات کو میں صحیح سمجھتا ہوں لیکن اس میں مشاہدہ اور کردار نگاری کا کمال ہے اس سے پریم چند کے ترقی پسند اور غیر ترقی پسند ہونے کا پتہ نہیں چلتا۔ دیہات کے نظامِ معیشت میں اکثر کسانوں کے جو مشترکہ مسائل ہیں یا پریم چند کے زمانے میں تھے اُن کا پریم چند نے گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ کسانوں کے جذبات اور کردار پر اُن کا جو اثر پڑتا ہے اُسے بھی وہ بخوبی جانتے تھے اس لئے وہ ہوری اور دھنیا کے کردار میں انسانی کمزوریاں دکھانے کے باوصف انھیں ہماری ہمدردیوں کا مرجع بنانے میں کامیاب ہو سکے ساتھ ہی گھریلو زندگی کے مناظر بیان کرنے پر پریم چند کو جو قدرت تھی اُس نے بھی ان کرداروں کی صناعانہ تخلیق میں مدد دی۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ کردار کسانوں کے مسائل پیش کرتے ہیں اُن کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں دیتے۔ اب دوسری بات پر آئیے۔ ہوری عظیم کردار ہے یا نہیں یہ دراصل منحصر ہے کردار کی عظمت کے تصور پر۔ اس سوال کے دو پہلو ہیں ایک یہ کہ ناول کے کردار میں عظمت خود کردار کی ذہنی، اخلاقی اور عملی صلاحیتوں سے پیدا ہوتی ہے یا ناول نگار کے پیش کرنے کے طریقے سے؟ کیا کوئی بھی کردار، اس کے اعمال و جذبات کچھ بھی کیوں نہ ہوں، محض صحیح عکاسی سے اور نمائندہ حیثیت حاصل کر کے عظیم بن جائے گا؟ میں سمجھتا ہوں عظیم کردار کے لئے دونوں باتیں ضروری ہیں۔ اُس میں زندگی کو سمجھنے اور بدلنے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیئے اور اُسے ہمعصر زندگی کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہونا چاہیئے۔ جن ادوار میں حیات تیزی کے ساتھ انقلابی منازل طے کر رہی ہوتی ہے اُن میں عظیم کردار کے لئے یہ شرطیں اور بھی ضروری ہو جاتی ہیں۔ ہوری بہت خوبصورت تخلیق ہے اور وہ کسانوں کی ایک بڑی تعداد کی نمائندگی بھی کرتا ہے لیکن وہ کرتا ہے اُسی کسان کی نمائندگی جو اپنی معاشرت کی مٹتی ہوئی قدروں کو "مرجاد" تصور کر کے اُسے آخری دم تک سینے سے چپٹائے رکھتا ہے اور اپنے پورے کنبے کے ساتھ رفتہ رفتہ موت کی بے پناہ گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ ہوری اُس کسان کی نمائندگی ہرگز نہیں کرتا جو اپنے طبقہ کی صدیوں کی زنجیرِ غلامی کو توڑنے کے لئے بے قرار ہے۔ ہمیں ہوری سے ہمدردی تو ہو سکتی ہے اس کے ساتھ جذباتی مطابقت نہیں ہو سکتی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان حالات میں علی سردار نے ہوری کو پہلا عظیم کردار کیسے کہا جبکہ خود انھوں نے پانچ ہی سطروں کے بعد یہ بھی کہا ہے کہ "عظیم کردار کے لئے یہ ضروری ہے کہ لوگ اس کے ساتھ "جذباتی مطابقت" پیدا کر سکیں صرف ہمدردی پیدا ہونا کافی نہیں، ہے۔" اسی طرح تیسری بات تصوریت اور مثالیت سے مایوس ہو کر آگے بڑھ جانے کی بھی بے بنیاد معلوم ہوتی ہے۔ اس کا تضاد اور بھی اُبھر آتا ہے جب جعفری صاحب خود ہی یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ "اس ناول کے شہری حصہ میں، جو مقابلتہً کمزور ہے، بعض مثالی کردار مل جاتے ہیں۔" دراصل کرداروں کی مثالیت اور عدم مثالیت کا تعلق زندگی کے بارے میں فن کار کے نظریات سے ہوتا ہے۔ گئودان کے شہری اور دیہاتی کرداروں کے درمیان اس سلسلے میں کوئی خط کھینچنا درست نہیں ہے۔ اس ناول میں پریم چند نے دیہاتی زندگی اور اُس کے کرداروں کو بھی پیش کیا ہے اور شہری زندگی اور اُس کے کرداروں کو بھی۔ دیہات کے کردار قدرتی طور پر شہری کرداروں کے مقابلے میں سیدھے سادہ ہیں اُن کے مسائل بھی زیادہ پیچیدہ نہیں ہیں اس لئے وہ زیادہ فلسفیانہ گہرائیوں میں نہیں اُترتے۔ علی سردار دیہات کے واقعاتی مناظر سے تو متاثر ہوتے ہیں لیکن جس طریقے پر پریم چند شہری زندگی کو پیش کرتے ہیں، شہری کردار تخلیق کرتے ہیں اور اُن کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُس سے وہ مطمئن نہیں ہوتے کیونکہ یہاں سردار اور پریم چند میں نظریاتی ٹکراؤ ہوتا ہے لہٰذا یہ کہہ دیتے ہیں کہ "شہری حصے میں جو مقابلتہً کمزور ہے، بعض مثالی کردار مل جاتے ہیں" واقعہ یہ ہے کہ یہ مثالی کردار (اتفاقاً!) مل نہیں جاتے انھیں پریم چند نے خاص مقاصد کے لئے شعوری طور پر تخلیق کیا ہے اور یہ اُن کے نظریات سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی کے مختلف مسائل کے بارے میں پریم چند کے نظریات پر مثالیت طاری تھی۔

میں یہ بھی ماننے کے لئے تیار نہیں کہ گئودان میں کسی کی "قلب ماہیت" نہیں ہوتی اور کوئی "دنیا کو تیاگ کر کے تیرتھ کرنے نہیں جاتا۔" ہوری کی گائے کو زہر دینے والا ہیرا باقاعدہ فقیر بنتا ہے اور ناول کے آخری باب میں ہوری کی موت سے قبل پچیس تیس برس بعد وارد ہو کر ہوری کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیتا ہے۔ ہیرا کے الفاظ ہیں:

> کہاں بتاؤں دادا! بس یہی سمجھ لو کہ تمہارا درس بڑا تھا سو بچ گیا۔ ہتیا سر پر سوار تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ گؤ میرے سامنے کھڑی ہے۔ ہر دم سوتے جاگتے کبھی آنکھوں کی اوٹ نہ ہوتی تھی۔ میں پاگل ہو گیا اور پانچ سال تک پاگل خانے میں بند رہا۔ آج وہاں سے نکلے چھ مہینے ہوئے۔ مانگتا کھاتا پھرتا ہوں۔ یہاں آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ دنیا کو کون منہ دکھاؤں گا؟ آخر جی نہ مانا۔ کلیجہ کڑا کر کے چلا آیا۔

قلب ماہیت کس طرح ہوتی ہے یہ بھی دیکھئے۔ اپنی چمارن داشتہ اور بچے کی محبت ماتا دین برہمن کو سماجی بندھن توڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس کے سامنے جھوٹے دھرم اور برہمنیت کا ڈھونگ بے نقاب ہو جاتا ہے اور وہ صاف صاف کہتا ہے:

> جب بے دھرم ہی ہو کر رہنا ہے تو پھر جو کچھ کرنا ہے وہ کھل کر کروں گا۔ سماج کے ناتے آدمی کا اگر کچھ دھرم ہے تو آدمی کے ناتے بھی تو اس کا کچھ دھرم ہے۔ سماج کا دھرم رکھنے سے سماج آدر کرتا ہے مگر آدمی کا دھرم رکھنے سے تو ایشور پرسن ہوتا ہے۔

یہ مثالیں اُسی دیہاتی طبقے سے لی گئی ہیں جس میں علی سردار صاحب کے خیال سے مثالی کردار نہیں ملتے۔ شہری حصے میں دل بدل جانے کی عمدہ اور ناقابل تردید مثالیں مہتا اور مالتی فراہم کرتے ہیں۔ مثال پرست مہتا جو عرصہ دراز تک مالتی کی محبت سے متاثر نہیں ہوتا آخر میں اُس پر اپنی جان چھڑکنے لگتا ہے اور مالتی جو شروع ہی سے اُس سے محبت کرتی ہے مہتا کی زندگی اور خیالات سے سبق سیکھ کر خدمت اور ایثار کا مجسمہ بن جاتی ہے۔ یہ ٹھوس واقعات کے زیر اثر کرداروں کا ارتقاء نہیں، ان کے دلوں کا بدل جانا ہے۔ اتنا البتہ صحیح ہے کہ یہ ہر دو پہلو پریم چند نے کچھ فنی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے پیش کیا ہے لیکن یہ ضروریات بھی علیحدہ ہیں۔ وہ دل بدلوانے کے لئے عموماً محبت، بے لوث خدمت اور کسی بڑی مصیبت وغیرہ کے آلات استعمال کرتے ہیں اور اکثر اوقات کرداروں کی فطری نیکی کا پس منظر بھی قائم رہتا ہے۔ اوپر کی مثالوں کے علاوہ بھی متعدد مقامات پر کئی کردار دوسروں کی نیکی سے متاثر ہو کر صحیح راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ خود گوبر جو شہر میں آکر گمراہ ہو جاتا ہے اور جھنیا سے برا برتاؤ کرنے لگتا ہے آخر کار زخمی ہونے کے بعد اس کی خدمات کا اثر قبول کر کے اپنی حرکات پر پشیمان ہوتا ہے۔ اس موقع کا پریم چند نے اس طرح ذکر کیا ہے:

> گوبر اچھا ہوتے جانے پر بھی کچھ اُداس رہتا تھا۔ جب ہم اپنے عزیزوں پر ظلم کرتے ہیں اور جب مصیبت آپڑنے پر ہم میں اتنی طاقت آجاتی ہے کہ اس کی شدید تکلیف کو خود محسوس کر سکیں تو اُس سے ہمارا دل بیدار ہو جاتا ہے اور ہم اس بے جا سلوک کا کفارہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ گوبر اسی کفارے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ اب اس کی زندگی کا رویہ بالکل دوسرا ہوگا جس میں تلخی کی جگہ شیرینی ہوگی اور غرور کے بجائے انکسار۔ اُسے اب معلوم ہوا کہ خدمت کرنے کا موقع بڑی خوش قسمتی سے ملتا ہے اور اب وہ اسے کبھی نہ چھوڑے گا۔

اس سے گوبر کے جذبات میں تبدیلی ہی نہیں بلکہ اس کے متعلق پریم چند کے نظریے کا پتہ چلانا بھی آسان ہے۔

ہوری کی موت پر جعفری اور رہبر دونوں نے خاص طور پر توجہ کی ہے۔ علی سردار نے اسے "بے رحم حقیقت نگاری" قرار دیا ہے اور ہنس راج نے کہا ہے کہ "ہوری کسان جس زمین پر جان دیتا ہے اور افلاس بھگتتے ہوئے بھی سرمایہ دار طبقہ کی روایات سے چمٹا ہوا ہے آخر اُسے کھو کر مزدور بننے پر مجبور ہو جاتا ہے"۔ اسی سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ پریم چند نے "سمجھ لیا تھا کہ اس لوٹ کھسوٹ کے نظام میں درمیانی طبقے کے لئے اپنی ہستی قائم رکھنا ممکن نہیں۔"

اس میں شک نہیں کہ ہوری کی زندگی کا انجام فطری ہے اور اس میں حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے لیکن یہ حقیقت نگاری اگر بے رحم ہے تو ساتھ ہی بہت رحمدل بھی کیونکہ اس کا اصل محرک رحم کا جذبہ ہے اور پڑھنے والوں

کے دلوں میں رحم کے جذبات اُبھارنا ہی اس کا مقصد ہے یہی حقیقت نگاری ہوری کو قلاش اور مزدور بنا دیتی ہے مگر اس کی پشت میں پریم چند کا یہ نظریہ کہیں جھلکتا نظر نہیں آتا کہ موجودہ نظام میں" درمیانی طبقے کے لئے اپنی ہستی قائم رکھنا ممکن نہیں۔" ہوری کی موت اور بربادی کی یہ تعبیر بھی محض قیاسی ہے۔ اس کے ڈانڈے اشتمالی منشور سے نہیں ملائے جا سکتے۔ گاؤں کے دوسرے لوگ بھی درمیانی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انھیں پریم چند نے خوب پھلتے پھولتے دکھایا ہے۔ ناول کو المیہ بنا کر پریم چند نے کسانوں کی زبوں حالی کی طرف قوم کی توجہ مبذول کرائی ہے اور اُن حالات کو دور کرنے کی ترغیب بھی دلائی ہے جو اس طبقے کے لئے باعثِ اذیت ہیں۔ لیکن حالات درست کیسے ہوں اس کے متعلق وہ زیادہ دور تک سوچتے نظر نہیں آتے۔

رہبر گئودان میں مزدوروں کی ہڑتال کے "ضمنی" سے ذکر سے مطمئن نہیں ہیں کیونکہ ان کے خیال سے اسے بُری طرح کچل دیا جاتا ہے" اور "تشدد کا انتقام کھنّا کے مل کو اتفاقاً آگ لگا کر جذباتی ڈھنگ سے" لیا گیا ہے۔ ہنس راج علی سردار کی طرح ہمعصر شعور کو پس ماندہ بتا کر اس کی توجیہہ کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ پریم چند مزدوروں کی تحریک کا جو قوت حاصل کر رہی تھی ذکر نہیں کرتے اس لئے" ان کی بے اطمینانی کی وجہ سمجھ میں آتی ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رہبر صاحب یہ کیوں نہیں سوچتے کہ پریم چند نے کھنّا کے مل میں جذباتی ڈھنگ سے اتفاقاً آگ لگوانے ہی پر کیوں اکتفا کی اور مزدوروں کی ہڑتال کو کچلوا کیوں دیا۔ انھوں نے مزدوروں کو منظم کرا کے اُن کی جدوجہد کو کامیاب کیوں نہیں کرایا۔ اگر پریم چند ایسا کرانا چاہتے تو وہ گوبر سے بہت اچھی طرح کام لے سکتے تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ انھیں مزدوروں کے "ہنگاموں" میں رہبر صاحب والی دلچسپی نہیں تھی اس لئے انھوں نے گوبر کو زخمی کرا کر اس کا "ہردیہ پریورتن" کرا دیا۔ پھر یہ کیسے مان لیا جائے کہ "گئودان" میں گاندھی ازم کی جسے ٹوٹتی اور سوکھتی نظر آتی ہے۔

تینوں فاضل نقادوں نے پریم چند کو "ترقی پسند" ثابت کرنے کے لئے "گئودان" کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا تجزیہ کرنے کے بعد ضرورت اس بات کی ہے کہ "گئودان" کی روشنی میں زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں پریم چند کے واقعی نظریات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

جہاں تک ملک کی اقتصادی زندگی اور اس کے مسائل کا تعلق ہے "گئودان" کئی چیزوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔ ان میں بھی سب سے زیادہ اہمیت کسانوں کی زندگی کو حاصل ہے۔ پریم چند گاؤں کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اودھ میں، جہاں زمینداری تعلقہ داری کی بھیانک شکل میں موجود تھی، کسانوں کو اندوہناک زندگی بسر کرتے دیکھا تھا۔ کسان کا پورا گھر دن بھر محنت کرتا تھا لیکن اس تمام محنت و مشقت کے باوجود اُس کے لئے زندگی کی اُن ضروریات کا مہیا کرنا بھی دشوار تھا جن سے زندگی برقرار رہ سکتی ہے۔ وہ اکثر اوقات صرف ایک وقت روٹی کھا سکتا تھا اور دوسرے وقت چبینے سے پیٹ کی آگ بجھانا پڑتی تھی۔ جسم پر لباس ناکافی ہوتا تھا اور کبھی کبھی تو پورے گھر کو سردی کی راتیں محض ایک پھٹے پرانے کمبل میں گذارنا ہوتی تھیں۔ تعلقہ دار کی زمین جوتتا تھا تو اُس کے لئے لگان ادا کرنا تو ضروری تھا ہی، اس کے یہاں ہر چھوٹی بڑی تقریب پر نذر و نیاز پیش کرنا بھی اسامیوں ہی کا رسمی مگر اہم فرض تھا۔ کسان ناخواندہ تھا جو کچھ حقوق اُسے قانونی طور پر حاصل بھی تھے اُن سے بھی وہ بے خبر تھا۔ زمیندار کے کارندے اور سپاہی اور حکومت کے مقرر کردہ پٹواری بھی اُس کی کمائی میں حصہ دار تھے' نہیں تو وہ حقیر تنخواہوں پر فراغت کی زندگی کیسے بسر کریں! کبھی کبھی لپیٹ میں آ جانے پر پولیس کے عملے کی بھی پوجا کرنا ہی پڑتی تھی اور پھر پروہت تو پیدائش سے موت تک شادی غم کے ہر کام میں شریک ہے اُسے بھی اپنی خدمات کا معاوضہ ملنا ہی چاہیئے۔ اتنے ضرورت مندوں کا بوجھ کسان کس طرح اُٹھائے، اس سوال کا جواب اُسے نہیں سوجھتا تھا۔ اس پر یہ کہ کبھی کبھی خشک سالی بھی آتی تھی اور بچے بھی بلوغ کو پہنچ کر شادی بیاہ کے لائق ہو جاتے تھے۔ وہ کھانے پینے میں ہر ممکن کمی کرنے کے لئے تیار تھا لیکن ان مصیبتوں کو کیسے ٹالے؟ دیہات میں رہ کر اُس کے لئے سماج کے ضابطوں کا پابند رہنا بھی لازمی تھا۔ اگر کبھی اس کی خلاف ورزی ہو گئی تو گاؤں کے پنچ اُس سے کبھی کبھی کی عداوت نکالنے اور ڈانڈ لگانے کے لئے تیار بیٹھے رہتے تھے۔ اگر سماج میں رہنا ہے تو ڈانڈ بھی بھرنا ہی پڑے گا۔ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بغیر قرض لئے کسان کی زندگی گذرنا محال تھی چنانچہ گاؤں کا ہر وہ شخص جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد کچھ پس انداز کر سکتا تھا اُس کا مہاجن بن جاتا تھا (عملی جنت سے)۔ نہ سود کی شرح پر کوئی پابندی تھی نہ صحیح رقم لکھوانے کی قید۔ کسان اس بدیہی لوٹ کھسوٹ کو جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی ضرورت سے تنگ آ کر اس کا شکار بنتا تھا۔ مگر ایک مرتبہ مہاجن کے پھندے میں پھنسنے پر اُس سے

نکلنا اُس کی طاقت سے باہر تھا۔ قرض کا بوجھ سر پر رکھنے کے بعد برابر بڑھتا ہی رہتا تھا۔ "گئودان" میں دیہی معیشت کے یہ حقائق بڑی خوبصورتی سے ابھارے گئے ہیں۔ واقعات ہوری کے گرد کچھ اس طرح گھومتے ہیں کہ اودھ کے کسان کی زندگی کی ایک تصویر ہماری نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ اس تصویر میں واقعیت تو ہے مگر وہ کسان کی پوری زندگی پر حاوی نہیں کیونکہ وہ اس کی فلاکت تو پیش کرتی ہے اجتماعی عزم اور حرکت کو نہیں۔

تعلقہ دارانہ نظام کا دوسرا رُخ پریم چند نے رائے صاحب اگرپال سنگھ کے کردار میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کردار کا مطالعہ بہت گہری نظر سے کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس سے جاگیرداری سے متعلق پریم چند کے نقطۂ نظر کی ایک بڑی حد تک وضاحت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ رائے صاحب کا تعلق جس طبقے سے ہے اُسے زندگی بسر کرنے کے لئے کسی قسم کی جسمانی یا ذہنی محنت کرنے کی ضرورت نہیں تھی یہ طبقہ دولت کمانے کے نہیں اُسے شان سے خرچ کرنے کے لئے تھا کیونکہ زمین کا حقِ ملکیت اُس کو حاصل تھا۔ یہ شان حدود کی پابند نہیں تھی۔ تعلقہ داروں کا زیادہ روپیہ اپنے بڑے پن کی نمائش اور اس کے لوازم پر، حکّامِ اعلیٰ کی خوشنودیٔ مزاج حاصل کرنے پر اور والہانہ عیش و عشرت پر صرف ہوتا تھا۔ اُن کا ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات تھی۔ اب اُن کے گھروں میں قارون کا خزانہ تو گڑا نہیں تھا تو یہ روپیہ آئے کہاں سے؟ یہ آتا تھا ہوری جیسے کسانوں کے گھر سے۔ لیکن بے پروا مصارف آمدنی کے آخری امکانات کی حدود کو بھی پار کر جاتے تھے اس لئے اسامیوں کی طرح تعلقہ داروں کو بھی قرض کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ رفتہ رفتہ تعلقے سکڑتے جاتے تھے اور بنکوں کی عمارات میں بلندی اور رعنائی آتی جاتی تھی۔

رائے صاحب کا کردار تعلقہ داری کے کم و بیش تمام پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔ اُن کے علاقوں میں کسانوں سے وہی کچھ کیا جاتا ہے جو اُن کے طبقہ کے کسی دوسرے فرد کے علاقے میں ہو سکتا تھا۔ مگر اس کردار میں پریم چند نے بہت سے حسین رنگ بھرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ انھیں افسوس ہے کہ جاگیرداری فنا ہو رہی ہے، اس کا ذمہ دار بھی وہ جاگیرداروں ہی کو ٹھہراتے ہیں لیکن وہ اس مٹتے ہوئے طبقے کے کردار میں ایک بانکپن بھی دیکھتے ہیں جس کی اپنے ناظرین کو تجلیاں دکھائے بغیر وہ گذر نہیں سکتے۔ یہ کوشش برابر رہتی ہے کہ پڑھنے والے کو رائے صاحب کے کردار کی کمزوریاں اُن کی "طبقاتی مجبوریوں" کی خارجی صورتیں نظر آئیں اور اس کی ہمدردیاں آخری وقت تک بدستور رائے صاحب کا دامن تھامے رہیں۔

رائے صاحب ایک نیک نفس انسان ہیں جو کسان کو ہوریوں میں منتقل کر دینے کے باوصف نہایت نیک نیتی سے قومی آزادی کی تحریک میں شریک ہوتے ہیں، ستیہ گرہ کی لڑائی میں کونسل کی ممبری چھوڑ کر جیل جاتے ہیں، فنونِ لطیفہ کا ذوق بھی انھیں ہے ہی، وہ خود بھی ایک اچھے مقرر اور مضمون نگار ہیں، اچھے نشانہ باز ہیں، غیر معمولی طور پر دلیر اور خوددار ہیں۔ یوں خلیق اور منکسر المزاج ہیں لیکن وقت پڑنے پر بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار رہتے ہیں، شرفا کی تقلید کرنا اپنا دھرم سمجھتے ہیں، عمر کا ایک حصہ تجرد میں بسر کر سکتے ہیں۔ صنفِ نازک میں ان کی دلچسپی دل بہلاوے تک محدود ہے۔ اپنے طبقہ کے طور طریقوں سے اُن کی جان گھٹتی ہے مگر کریں کیا "حالات سے مجبور" جو ہوئے!

پریم چند کی نظر میں جاگیردارانہ قدروں کی جو وقعت تھی اُس کو سمجھنے کے لئے رائے صاحب ایک عمدہ مثال فراہم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ رائے صاحب اپنے طبقے کے معدودے چند "مہذب" افراد کی تو نمائندگی کر سکتے ہیں لیکن پورے طبقے کی ہرگز نہیں کر سکتے۔ "گئودان" میں جاگیرداری کے ایک اور پہلو پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ "گوشۂ عافیت" اور "میدانِ عمل" کا کسان اپنے پیروں پر کھڑا بھی ہوتا ہے، شورش بھی کرتا ہے لیکن گئودان میں آکر وہ محض مظالم برداشت کرتا ہوا فنا ہو جاتا ہے۔ وہ انقلاب کے عمل میں شریک نہیں ہوتا بلکہ اپنی زبوں حالی دکھا کر دوسروں کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس ناول میں جاگیردار اور کسان کے تضاد میں کوئی بڑا تصادم بھی نہیں ہوتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں پریم چند نے "مجبوریوں" کے ریشمیں پردوں میں سے تعلقہ دار کی "فطری نیکیوں" کی جھلکیاں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس فنا ہوتے ہوئے طبقے سے قطعاً مایوس نظر نہیں آتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ اس طبقے کے حساس اور وطن دوست افراد قومی جدوجہد میں شریک ہو کر انقلابی قوت کو فروغ دے سکتے ہیں۔ رائے صاحب کے کردار کی تخلیق کوئی محض اتفاقی واقعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک خاص مقصد کے پیشِ نظر عمل میں آئی ہے۔ اس پر غور کرتے وقت احتشام صاحب کے وہ الفاظ کہ "پریم چند نے سرمایہ داری کے غیر انسانی رویے اور لوٹ کھسوٹ کی پورے جوش کے ساتھ مذمت کی ہے لیکن اس سلسلہ میں وہ جاگیرداری کے مظالم اور عیوب کو نہ دیکھ سکے کیونکہ جاگیرداری تمدن میں انھیں قدیم ہندستان کے راجپوتی دور کی وہ خصوصیتیں نظر آتی تھیں جنھیں وہ عزیز رکھتے تھے اور قومی کردار کی تعمیر کے لئے جنھیں وہ ضروری خیال کرتے تھے" ذہن میں رکھنے چاہئیں جو انھوں نے پریم چند کے مقالے "مہاجنی تہذیب" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہے ہیں۔ میں اس سلسلے میں اتنا اور عرض کر دوں کہ یہ مقالہ تقریباً اسی زمانے کی تحریر ہے جب "گئودان" لکھا گیا۔ کیونکہ یہ پریم چند نے اپنے

محبوب رسالہ ہنس میں "مہاجنی سبھیتا" کے عنوان سے وفات سے کوئی ایک ماہ پیشتر شائع کیا تھا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جاگیرداری کی کڑی سے کڑی تنقید کے باوجود اس سے متعلق یہ نقطۂ نظر آخر کار طبقاتی سمجھوتے کی طرف لے جاتا ہے۔

گئو دان میں پریم چند کی دیہات پسندی کا جذبہ بھی صاف جھلکتا ہے۔ اگرچہ ناول کا پلاٹ شہری اور دیہاتی دونوں قسم کی زندگی پر مشتمل ہے اور اس میں دونوں کے نمائندہ کردار آتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کرداروں کا انتخاب بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے لیکن ناقابلِ تردید حقیقت یہ ہے کہ ہوری اور اس کا ماحول ناول میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہوری جس سماج میں رہتا ہے وہ آدرش سماج نہیں ہے، اور نہ ہوری ہی کوئی فرشتہ ہے لیکن پریم چند نے جس طرح اس کردار کو پیش کیا ہے اُس سے اس کی فطری نیکیاں اُجاگر ہو کر قارئین کو متاثر کرتی ہیں اور اس کے نقائص اقتصادی اور سماجی مجبوریوں کے پردوں میں پوشیدہ نظر آنے لگتے ہیں۔ جب پڑھنے والا سوچتا ہے کاش اس میں یہ خامیاں نہ ہوتیں تو وہ یہ بھی سوچتا ہے کہ کاش اس کے ماحول میں وہ خرابیاں نہ ہوتیں جن کا وہ شکار ہے! اس سلسلے میں گوبر کا کردار بھی قابلِ غور ہے۔ وہ سماجی اور اقتصادی اسباب سے شہر چلا جاتا ہے۔ اپنی شہری زندگی کے ابتدائی زمانے میں وہ نہایت نیک اور محنتی ہے لیکن رفتہ رفتہ اس پر شہری دیواروں کے سائے پڑتے جاتے ہیں تب وہ ایک حد تک "انقلابی" تو ہو جاتا ہے مگر اس کی اخلاقی خوبیاں بھی ختم ہوتی جاتی ہیں۔ آخر کار وہ شرابی، ہوس پرست اور جفاکار بھی ہو جاتا ہے اور جب تک زخمی ہو کر بیوی کی بے لوث محبت اور خدمت سے فیض یاب نہیں ہوتا اس کے دل کی کالکھ نہیں چھوٹتی۔

پریم چند گاؤں کی زندگی اور اس کی سادگی، قناعت، محنت، خلوص اور ایثار کو کتنی اہمیت دیتے تھے اسے سمجھنے کے لئے "دھنش یگیہ" کے بعد شکار والے باب کو غور سے پڑھنا چاہیئے۔ اس میں پریم چند نے شہریوں کو دیہاتی زندگی کی جھلکیاں دکھانے کا بڑی ہوشیاری سے موقع نکالا ہے اور دیہاتی کرداروں کا ایسے کرداروں سے مقابلہ کیا ہے جن پر اُن کے نقطۂ نظر سے "شہریت" غالب آ چکی ہے۔ یہاں دیہاتی دوشیزہ اور مالتی، مکڑ مارے اور ٹنکھا اور رائے صاحب اور کھنّا کے کرداروں کا تضاد نمایاں کیا گیا ہے۔ دیہاتی لڑکی محنتی ہے، تکلیف کی پروا نہیں کرتی مگر سے خلوص اور ایثار کی تصویر ہے جبکہ مالتی میں تن آسانی، چلبلا پن اور غرور کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ اسی طرح مکڑ مارے کی ہمت، قناعت اور خدمت کے جذبات کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے اس کے مقابلے میں ٹنکھا اپنی دون ہمتی، خود غرضی اور سیاسی جوڑ توڑ کے باعث نہایت گھناؤنا نظر آتا ہے۔ رائے صاحب کی دلیری اور راجپوتی بانکپن کے سامنے کھنّا کی دنیوی فراست کا چاند گہنا جاتا ہے۔ مکڑ مارے کے بال بچوں کی سادہ دلی اور مسرت پریم چند کے سازِ دل کے کن تاروں سے بہہ کر نکلی ہے یہ سنجیدگی سے غور کرنے کی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح محسوس کرنے والا آدمی اُن تمام خوبیوں کو برقرار رکھنا چاہے گا اور اس زندگی کو "شہری زندگی" کے سائے سے بچانے کی حتی الامکان کوشش کرے گا۔ اس کی زندگی کا مقصد دیہاتی زندگی کو شہری رنگ میں رنگنا نہیں بلکہ اس کی خرابیوں اور افلاس کو دُور کرنا ہوگا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس سے اصولی طور پر کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ یہ خرابیاں کیوں ہیں اور دُور کیسے ہوں؟ پریم چند گاندھی جی کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ بڑی صنعت کے فروغ کو روکا جائے جبکہ صنعت کاروں اور اشتراکیوں کی ایک بڑی تعداد صنعتی ترقی کو بُرا نہیں سمجھتی اور اُسے دیہاتی زندگی کی خرابیوں کا بھی علاج سمجھتی ہے۔ کیوں اور کیسے؟ یہاں اس تفصیل میں جانے کا موقع نہیں محض یہ کہنا مقصود ہے کہ پریم چند بڑی صنعت کے بڑھتے ہوئے طوفان کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اُن کی نظر اُس سے حاصل ہونے والے فوائد پر بہت کم پڑتی تھی۔ اُس سے جو موجودہ سماجی ماحول میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ اُن کے ذہنی اُفق پر چھائی رہتی تھیں۔ اس کا ثبوت "گئو دان" میں بھی ملتا ہے۔

کھنّا نے چینی کا جو مل لگایا اس کا سب سے پہلے ذکر شکار والے باب میں کھنّا اور رائے صاحب کی گفتگو کے دوران میں ملتا ہے۔ اس کے بعد جب گوبر شہر جا رہا ہے تو اُسے ایک گاؤں میں گڑ پکنے کی مہک آتی ہے اور وہ پانی پینے جاتا ہے تو ایک کسان کہتا ہے:

اررے بھائی کیا یوں ہی پانی پیو گے۔ تھوڑا سا گڑ کھا لو۔ اب کے دور چالیس کولھو اور بنا لیں کھانڈ، اگلے سال تک مل تیار ہو جائے گی تو ساری اوکھ کھڑی بک جائے گی۔ گڑ اور کھانڈ کے بھاؤ چینی ملے گی تو ہمارا گڑ کون لے گا۔

یہ گویا پیشین گوئی تھی آنے والی مصیبت کی اور ہم دیکھتے ہیں کہ آئندہ دیہاتی شکر سازی کی صنعت کس طرح تباہ ہوتی ہے اور کسانوں کے ایکھ کیسے مل کی نذر ہونے لگتے ہیں۔ پریم چند نے یہ بات بخوبی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس سے کسانوں کی حالت کسی طرح بہتر نہیں ہوتی بلکہ وہ اور طرح طرح کی پریشانیوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ دلالوں اور ساہوکاروں کی نوچ کھسوٹ یہاں بھی ان کا پیچھا

نہیں چھوڑتی۔ ہوری ایک سو بیس روپیہ کا ایکو زیج کر جو خالی ہاتھ گھر پہنچتا ہے اس سے مشینی صنعت کے رواج کے بعد بھی پریم چند کی نظر میں عام کسانوں کی مصیبتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کسانوں سے قطع نظر جب ہم مل کے مزدوروں کی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی شکر پر ٹیکس لگ جانے سے مزدوری میں تخفیف، ہڑتال اور مزدوروں کی آپس کی مار پیٹ نظر آتی ہے۔ اس ہنگامے میں پریم چند کو مزدوروں سے گہری ہمدردی ضرور ہے مگر وہ اس کی افادیت کے زیادہ قائل نظر نہیں آتے۔ اسی لئے شکر مل میں آگ لگوا کر وہ اسے ختم کر دیتے ہیں۔ پریم چند نے اس سے اگر کوئی فائدہ اٹھایا ہے تو یہ کہ اس طرح وہ کھنّا کا دل بدلوانے کے لئے زمین ہموار کر لیتے ہیں۔ گوبندی (مسز کھنّا) اس سلسلے میں ایک سحر آفریں اُپدیش دیتی ہے۔

میں تو خوش ہوں کہ تمہارے سر سے یہ بوجھ ٹلا۔ اب تمہارے لڑکے انسان بنیں گے، خود غرضی اور غرور کے پُتلے نہیں۔ زندگی کا سکھ دوسروں کو سکھی کرنے میں ہے، انھیں لوٹنے میں نہیں۔ بُرا نہ ماننا اب تک تمہاری زندگی کا مقصد تھا خود پروری اور عیش کوشی ایشور نے تمہیں ان ذرائع سے محروم کر کے تمہارے لئے زندہ بلند اور پاک زندگی کا راستہ کھول دیا ہے...... دھن کھو کر اگر ہم اپنی آتما کو پا سکیں تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے....

کھنّا اس کی طرف عقیدت سے تاک رہے تھے۔ سر جھکائے اس کا خدائی الہام سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے اور دل ہی دل میں نادم تھی۔ گوبندی کے خیالات کتنے بلند، اس کا دل کتنا کشادہ اور اس کی زندگی کتنی روشن ہے!

غرض پریم چند کے یہاں بڑی صنعت اقتصادی مسائل حل کرنے نہیں آتی وہ اقتصادی، اخلاقی اور روحانی پیچیدگیاں پیدا کرنے کے لئے آتی ہے۔ اُن کی نظر میں ان پیچیدگیوں کا حل، جیسا کہ اس مثال سے واضح ہے، صنعت کے خاتمہ پر منحصر ہے۔ اس نظریہ پر گاندھی واد کا کتنا اثر ہے شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔

سیاسی نظر سے دیکھا جائے تو "گئودان" کی خصوصیات کا حاصل معلوم ہوتا ہے اوّل تو اس میں گوشۂ عافیت، پوگانِ ہستی یا میدانِ عمل کی سی کوئی بڑی سیاسی شورش ظہور میں نہیں آتی۔ مل میں ایک ہڑتال ضرور ہوتی ہے مگر اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا اس لئے اس ناول میں جدوجہد کی تکنیک اور تشدد یا عدم تشدد سے متعلق پریم چند کے نقطۂ نظر کا عقدہ نہیں کھلتا۔ مگر اسے اس بات پر محمول کرنا کہ وہ اس زمانے میں عدم تشدد کے طریقۂ عمل سے بیزار ہو گئے تھے یقیناً غلط ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ ناول لکھا گیا وہ قومی جذبات میں اُبال آنے کا زمانہ نہیں تھا بلکہ آئندہ کے طریقۂ کار کو سمجھنے کے لئے غور و فکر کرنے کا زمانہ تھا۔ اسی وجہ سے اس ناول میں جگہ جگہ زندگی کے مختلف مسائل سے متعلق غور و فکر کی شہادت ملتی ہے۔ اس لحاظ سے اس میں حیرت انگیز تنوع بھی ہے اور گہرائی بھی مگر مارکسیت کی طرف کوئی واضح قدم اُٹھتا نظر نہیں آتا۔

شہر کے تقریباً سارے اہم کرداروں کے متعلق یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کانگریس سے وابستہ رہے ہیں اور اکثر جیل یاترا کر چکے ہیں۔ ان میں زیادہ متمول گھرانوں کے لوگ ہیں۔ تعلقہ دار بھی ان میں ہے سرمایہ دار بھی پیشہ ور چندہ اُڑانے والا بھی اور اصول فروش صحافی بھی۔ پریم چند وقتاً فوقتاً قومی تحریک میں ان کی شمولیت کے مقاصد کو نمایاں کرتے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ کرداروں کی خود غرضی پر کڑی تنقیدیں بھی کرتے ہیں مگر وہ تنقید طبقاتی نہ ہو کر اخلاقی اور روحانی نقطۂ نظر سے ہوتی ہے۔ مثلاً جاگیردار رائے صاحب کی قومی خدمات کو پریم چند نے دل کھول کر سراہا ہے کیونکہ اس کے خلوص میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ اسی طرح وہ آدرش وادی مگر آزادانہ عیش کوشی کے ذریعے سے روحانی ارتقا کے قائل پروفیسر مہتا کی صلاحیتوں اور خدمات کے بھی مدّاح ہیں۔ کیونکہ اس کے افعال اقوال سے ہم آہنگ ہیں اور یونیورسٹی سے حاصل ہونے والا معقول مشاہرہ اس میں کوئی فرق نہیں ڈالتا۔ وہ کسی قدر لااُبالی طبیعت کے مالک مرزا خورشید سے بھی متاثر ہیں کیونکہ اُسے غریبوں کی زندگی میں گہری دلچسپی ہے اور اس کی سیاست تک میں دروغ بافی اور لالچ کا شائبہ نہیں۔ لیکن کھنّا جیل جانے کے باوجود انھیں نہیں بھاتا کیونکہ وہ ہمیشہ زر اندوزی کی فکر میں رہتا ہے۔ اس کے انسانی محبت کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ اس نے سیاست کو بھی ہوس پرستی کا آلۂ کار بنا رکھا ہے اسی لئے پریم چند نے اُسے مل کی آگ میں گلا کر کُندن بنانا ضروری سمجھا۔ اونکارناتھ (ایڈیٹر بجلی) کی تخلیق ہمعصر سیاسیات اور صحافت کے چند رجحانات کی پردہ دری کے لئے عمل میں آئی ہے۔ اونکارناتھ اس لئے بھی قابلِ غور ہے کہ وہ عیاری سیاست کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے قول و فعل کا تضاد پریم چند نے خاص طور پر نمایاں کیا ہے جس سے اس وقت کے اشتراکیوں کے کم از کم ایک حصّہ کے متعلق اُن کے تاثرات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح زنانہ سیرتوں میں گوبندی کے ایثار اور مالتی کی بے لوث خدمت کو سنہری رنگوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اور ان کے

مقابلے میں زیادہ پُرجوش انقلابی سرد ہے پریم چند کی ہمدردیوں کا مرجع نہیں بنتی۔

ظاہر ہے کہ پریم چند ان تمام کرداروں کی اہمیت اور وقعت کا تعین اُن کے طبقات سے نہیں کرتے بلکہ اُن کی اخلاقی اور روحانی صلاحیتوں سے کرتے ہیں۔ "گئودان" میں اس کی کہیں شہادت نہیں ملتی کہ مصنّف کی نظر میں طبقاتی جدوجہد ہمعصر سماجی مسائل کا حل ہے بلکہ ایثار و محبّت ہی کو انسانی فلاح و بہبود کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے جو اصلاً طبقاتی تفریق سے بے نیاز سمجھی گئی ہے۔

"ترقی پسند" دوستوں کو غلط فہمی غالباً "گئودان" میں بکھرے ہوئے کچھ واقعات اور بیانات سے ہوتی ہے مثلاً کھنّا کھدر پہنتا ہے، دوبار جیل ہو آیا ہے مگر فرانسیسی شراب پیتا ہے اس سے وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ کانگریس کے سرمایہ دارانہ کردار کی پردہ دری اور اس تحریک سے بیزاری کا اظہار ہے۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ چوٹ ہے ہوس پرستی اور ریاکاری پر۔ اسی طرح مرزا خورشید کا یہ کہنا کہ "مجھے ڈیموکریسی پر اعتقاد نہیں رہا۔ میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اب چناؤ کے پاس نہ جاؤں گا۔ میرا پروپیگنڈا اب ڈیموکریسی کے خلاف ہوگا،" محض جمہوریت کے پیچ در پیچ عمل اور اس کے کچھ لوازم سے اکتاہٹ کا اظہار ہے۔ کیونکہ مرزا خورشید کا ذہن ٹکرا کر آگے نہیں بڑھتا پیچھے کو ہٹتا ہے اس میں پرونتاری آمریت کے نہیں جاگیردارانہ نظام کے جراثیم موجود ہیں۔ اس کے متعلق خود پریم چند لکھتے ہیں،

> مرزا نے قرآن کی آیتوں سے ثابت کیا کہ قدیم زمانہ کے بادشاہوں کا معیار کتنا بلند تھا۔ آج تو ہم اُن کی طرف تاک بھی نہیں سکتے۔ ہماری آنکھوں میں چکاچوند آ جائے گی۔ بادشاہ کو خزانے کی ایک کوڑی بھی نجی خرچ میں لانے کا اختیار نہ تھا۔ وہ کتابیں نقل کر کے، کپڑے سی کر، لڑکوں کو پڑھا کر اپنا گذر کرتا تھا۔ مرزا نے ایسے بادشاہوں کی ایک طویل فہرست گنا دی۔ کہاں تو وہ رعایا پرور بادشاہ اور کہاں آجکل کے منسٹر لوگ جنھیں پانچ چھ سات آٹھ ہزار ماہوار ملنا چاہیئے۔ یہ لوٹ ہے یا ڈیموکریسی؟

میں اس بحث کو زیادہ طول دینا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ آخر میں صرف اتنا کہوں گا کہ پریم چند اپنے وقت کے ایک بہت بڑے فنکار تھے۔ وہ ہندستانی افسانہ نگاری کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہمعصر واقعات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا لیکن اُن کا نقطۂ نظر ایک روحانی اور اخلاقی قدروں کے علمبردار انسان دوست کا نقطۂ نظر تھا جو مارکس کے نظریات سے بالکل مختلف اور گاندھی جی کی فکریات سے بہت کچھ مطابقت رکھتا ہے۔ یہ نہیں کہ مارکس کے طریقۂ فکر سے اس وقت کا ہندوستان واقف نہیں تھا۔ پریم چند کے زمانے میں مارکسزم کی بہت سی باتیں لوگ سمجھتے تھے اور سمجھنے کی خواہش روز بروز بڑھ رہی تھی مگر پریم چند ان چیزوں سے بخوبی واقف نہیں تھے اور مارکسزم کی کچھ باتیں یقیناً ان کی طبیعت کے خلاف پڑتی تھیں۔ اس لئے مارکسیوں اور ان کے درمیان نظریاتی مشابہت بہت کچھ سطحی ہے۔ ایسی صورت میں میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ مارکسی نقاد جو تاریخ اور شعور کے ارتقاء کو ایک خاص نظریے کی روشنی میں دیکھتے ہیں، اور جن کے لئے "ترقی پسندی" کے اصول متعین ہونے چاہئیں، انھیں ترقی پسند کیسے بتلاتے ہیں!

شاطر حکیمی

گاندھی جینتی

اندھیرے کو اُجالا مل گیا مفلس کو خوشحالی
گُلوں کو رنگ و بُو، بلبل کو نغمہ، باغ کو مالی
کسانوں کو زمیں، مزدور کو سرمایۂ ہمت
لبوں کو مسکراہٹ دل کو تسکیں روح کو فرحت
غلام آبادِ ارضِ ہند کو پیغامِ آزادی
وطن کو پاسباں، ہر خطۂ ویراں کو آبادی
مناؤ جشن، گاندھی جی کی پیدائش کا دن آیا
سجاؤ محفلیں اپنی کہ آرائش کا دن آیا
اہنسا کا دِیا روشن ہوا منزل نظر آئی
ہمارے رہنما کو سہل ہر مشکل نظر آئی
سفینہ اپنا طوفانوں سے ٹکراتا ہوا آیا!
رگوں میں شانتی کی لہر دوڑاتا ہوا آیا!
پھرا دُنیا کے ہر گوشہ میں حامی امنِ عالم کا
کبھی لندن میں جا بیٹھا کبھی پہنچا وہ افریقہ
محبّت کے اصولوں کو نہ چھوڑا جان تک دے دی
بظاہر کر گئے رحلت مگر زندہ ہیں گاندھی جی

روِش صدّیقی

دُور و نزدِیک

اِن دنوں ہے اک ہجومِ عام میخانوں کے پاس
ہوش فرزانوں کے دامن میں دیوانوں کے پاس

اجنبی کرتے ہیں تیرا ذکر کِس اخلاص سے
دیکھتا ہوں آج تیرا درد بیگانوں کے پاس

یہ کسے معلوم کیا گذرا ہے دل پر سانحہ
برہمن، کیوں سر جھکا لیتا ہے بتخانوں کے پاس

زندگی کی ہر مسرّت، زندگی کو سونپ دی
رہ گیا ہے اک غمِ بے نام دیوانوں کے پاس

کچھ نہ کچھ پابندیٔ آداب ظاہر ہے، ضرور
ورنہ اُڑ کر شمع جاتی اپنے پروانوں کے پاس

عقل کو زندانیٔ مرگِ مسلسل، دیکھ کر
زندگی، دامن فشاں آئی ہے دیوانوں کے پاس

میکدے میں بھی وہی ہے دل کی ویرانی روِش
شیشۂ خالی بھی ہے لبریز پیمانوں کے پاس

بیادِ حسرت

پشیماں ہیں، اثرِ ترکِ محبت کے بعد
بڑھیں اُلجھنیں اور فرصت کے بعد

ابھی تو قیامت کا ہے آسرا
خدا جانے کیا ہو قیامت کے بعد

یہ حُسنِ خلوصِ شکایت بجا
مگر کیا لے ہے گا شکایت کے بعد

محبت سے پہلے یہ عالم نہ تھا
کہاں آ گئے ہم محبت کے بعد

ہے مطلوب کو نین، صورت تری
کسے دیکھئے تیری صورت کے بعد

بہت شوقِ حرف و حکایت رہا
خموشی ہے حرف و حکایت کے بعد

وہ ہر بار ملتے ہیں اس شان سے
ملے جس طرح کوئی مدت کے بعد

کسے کہنے سننے کا کچھ ہوش تھا
کہیں ہم نہ تھے حرفِ رخصت کے بعد

نہ صبحِ قیامت نہ صبحِ وصال
یہاں کچھ نہیں شامِ فرقت کے بعد

ہے ترکِ ستم بھی، ستم آفریں
تغافل ہے، رنگِ مروت کے بعد

روِش! یہ دل آویز طرزِ غزل
خوش آہنگ ہے رنگِ حسرت کے بعد

علی عباس حسینی

دُودوا

لڑکوں نے دو دوا دادا کے نام میں یہ تحریف کی تھی۔ خود فطرت نے بھی ان کے معاملے میں تخفیف ہی سے کام لیا تھا۔ ان کی قامت بلند پانچ فٹ سے بھی کم ہی تھی۔ اس پر دُبلے پتلے اتنے کہ معلوم ہوتا تھا اکہری ہڈی کا چلتا پھرتا ڈھانچہ ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، پتلی سی گردن، بڑا سا سر ایسا دکھائی دیتا کہ جیسے سہری کی چھڑ میں کسی نے مراد آبادی تو بونز کھونس کر کھڑا کر دیا ہے۔ سر کی جسامت کو اُن کے پٹے دار بالوں نے اور بڑھا دیا تھا۔ تعجب ہوتا تھا کہ ان کی نازک گردن پر اتنا بڑا سر کیسے تھما ہے۔ پیشانی چوڑی اور کشادہ، بھویں پتلی، کمان کی طرح جھکی ہوئی۔ آنکھیں چھوٹی مگر چمکتی ہوئی۔ ناک مختصر مگر اس کا سرا کچھ اوپر کو اُٹھا ہوا، ہونٹ پتلے اور پھڑکتے ہوئے۔ آواز میٹھی اور سریلی مگر نتھنوں کا زیر و بم ان میں شریک، لاغر جسم جگہ جگہ سے ٹیڑھا، ریڑھ کی ہڈیاں اُبھری ہوئی، گھٹنے کی چپنی بڑی اور پنڈلیاں بالکل سوکھی ہوئی، چہرے سے بڑی ذہانت ٹپکتی تھی، مگر پورا سراپا یقینی مضحک تھا۔

دودوا ہمیشہ کرتے یا قمیص پر ایک برکا پائجامہ پہنتے۔ کندھے پر ایک رومال ڈالے رہتے اور کان پر ایک پنسل لگائے رہتے تھے۔ وہ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان بولتے تھے۔ اُن کا لب و لہجہ دیہات والوں سے بالکل الگ تھا۔ وہ کسی طرح دیہاتی نہ معلوم ہوتے تھے۔ اسی لیے ان کا گاؤں والوں سے اتنا قریبی رشتہ پیدا کر لینا تعجب خیز تھا۔ ان کا محمد پور کے کس خاندان سے تعلق تھا وہ وہاں کب اور کس لئے آئے۔ شہر چھوڑ کر دیہات میں کیوں بس گئے، بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔ شاید کسی رئیس زادے کی ابتدائی تعلیم کے لئے لکھنؤ سے بلائے گئے یا کسی ہم سن زمیندار کے مصاحب بن کر آئے تھے، اور گاؤں کی کسی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو کر رہ گئے تھے، کوئی بات ٹھیک طور پر نہیں کہی جا سکتی تھی۔ دیکھا گیا تو یہی کہ میر انور حسین کے مردانہ حصۂ مکان کے ایک کمرے میں رہتے تھے اور کھانا کھاتے تھے میر احمد حسین کے ہاں۔ ان دونوں سے ان کے ساتھ یہ مراعات کیوں تھیں، نہیں معلوم۔

دودوا سے اب بھی دو چار لڑکے قرآن پڑھنے اور اردو کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔ مگر یہ لڑکے زمینداروں کے نہ ہوتے تھے۔ ان کے بچوں کو درس دینے کے لئے ان کے گھروں پر الگ الگ مولوی موجود تھے۔ دودوا دھنئے جولاہے، کنجڑے کے بچوں کو پڑھاتے تھے، گاؤں میں طبقات کی حدیں بڑی سختی سے متعین تھیں۔ سادات زمیندار تھے، حاکم تھے۔ باقی سب رعایا پرجا۔ برہمن اور چھتری تو ان کے سامنے ان کی اجازت سے پلنگ اور تخت پر بیٹھ سکتے تھے، مگر باقی اور قومیں، خواہ مسلمان ہوں یا ہندو، سب کو زمین پر اُکڑوں بیٹھنا پڑتا تھا۔ ایسی حالت میں رعایا پرجا سب "چھوٹی قوم" تھی۔ ان کے لڑکوں کے ساتھ گاؤں کے حاکموں کے لڑکے کیسے پڑھ سکتے تھے، اور ایک ہی معلم ان کو کیسے تعلیم دے سکتا تھا۔ اس لئے دودوا کی مدرسی "چھوٹی قوم" ہی تک محدود تھی۔ اور انھیں کے دو چار آنے فی مہینہ سے ان کا جیب خرچ چلتا تھا۔

مگر ان کی آمدنی کا یہی ایک ذریعہ نہ تھا، وہ گاؤں کے سب سے اچھے بڑھئی، لوہار اور صناع تھے۔ ان کا علم فارسی و اردو کی ابتدائی کتابوں تک محدود تھا، لیکن اُن کا ہنر اکثر حدوں کو پار کر گیا تھا۔ نہ تو انھوں نے ریاضی سیکھی تھی نہ سائنس، اور نہ کسی انجینئرنگ یا آرٹ اسکول کا منہ دیکھا تھا۔ مگر نئی نئی مشینوں کا ایجاد کرنا، پُرزوں کا ڈھالنا، ان کے ڈرائنگ بنانا، ان کے سانچے مہیا کرنا، یہ ان کا رات دن کا شغل تھا۔

گاؤں میں لوہے کی گراریاں انھوں نے ایجاد کیں۔ ان سے پہلے کاٹھ کے ڈنڈوں میں کسی ہوئی ریں ریں کرکے ہر کنویں پر چلتی تھیں، اور

سال میں دو تین بار ضرور ٹوٹ جاتی تھیں۔ کسانوں اور زمینداروں دونوں کو یکساں طور پر تکلیف ہوتی تھی۔ دودوا نے اس درد کی دوا سوچی۔ پنسل کاغذ لے کر ڈیزائن بنائی، سانچے تیار کئے اور گاؤں کے لوہار کو بلا کر اُسے ہدایتیں دیں، اس کی بھٹی میں کئی گھنٹے خود بھی صرف کئے، اور تیسرے دن میرا نور کے کنویں پر لوہے کی گراری لوہے کی سلاخ میں پھنسی ہوئی موجود تھی۔ ہر شخص نے اسے چلا کر، اس پر پانی کھینچ کر، ہر طرح آزما کر دیکھا، اور اسی ہفتے کے اندر گاؤں کے دس کنوؤں پر لوہے کی گراریاں لگادی گئیں۔ دودوا کو اس ایجاد سے کیا مالی منفعت ہوئی، اس کا اندازہ زیادہ مشکل نہیں۔ دو ایک نے دو تین روپے نقد دے دئے۔ دو ایک نے پانچ سیر مٹر حاضر کی، کسی نے دو تین سیر گیہوں۔ لیکن وہ اپنی دوسری ایجادوں کی طرح اسے بھی بازار تک نہ پہنچا سکے۔ نہ اسے پیٹنٹ کرا سکے۔ ہندوستان میں نقالوں کی کمی نہیں۔ تقریباً ہر قصبے اور دیہات کے لوہار نے ان کی ایجاد سے فائدہ اٹھایا۔ ضلع بھر میں لوہے کی گراریاں چالو ہوگئیں۔ لیکن سوائے گاؤں والوں کے دودوا کو کسی نے کچھ نہ دیا۔

ایک دفعہ خیال آیا کہ مکان کے صحن میں جو پختہ حوض ہے —— اس کے صاف کرنے اور اس کا پانی نکالنے کے لئے مزدور لگانا پڑتے ہیں، یہ کام بغیر پیسہ خرچ کئے خود اپنے ہاتھوں سے آسانی سے ہو سکتا ہے۔ دودوا نے ٹین کے چند ٹکڑے جمع کئے۔ اُن میں کچھ چھوٹے بڑے پرزے لگائے اور ایک نلی بنا کر حوض میں داخل کردی۔ اب دودوا حوض کے کنارے بیٹھے اُلٹے ہاتھ سے ٹین کی مشین کو دبائے ہیں، اور سیدھے ہاتھ سے ایک دستہ گھما رہے ہیں، اور پانی کی ایک پتلی ٹونٹی حوض سے باہر گر رہی ہے۔

گاؤں بھر میں خبر پھیل گئی کہ دودوا نے ایک کل ایجاد کی ہے، جو پانی باہر پھینک دیتی ہے۔ بوڑھے جوان، بڑے چھوٹے سب تماشا دیکھنے جمع ہو گئے۔ کوئی تعجب کا اظہار کر رہا ہے، کوئی اپنے طور پر تعریف کر رہا ہے۔ کوئی مذاق اڑا رہا ہے۔ جتنے منہ اُتنی باتیں، اور جیسی عقل ویسی باتیں۔ ایک صاحب جو ہم عمر تھے انھوں نے مسکرا کر پوچھا" یہ آپ اس کی دُم کب تک اینٹھتے رہیں گے؟ پانی اگر اسی رفتار سے نکلے گا تو حوض کے خالی ہونے میں کئی دن لگیں گے؟"

دودوا کا وہ چہرا جس پر اس وقت ہلکی ہلکی سرخی جھلک رہی تھی، دفعتہً سیاہ پڑ گیا۔ انھوں نے ذرا تیکھے پن سے جواب دیا: "جناب من! یہ صرف مشین کا چھوٹا نمونہ ہے۔ حوصلہ ہو تو دام لگائیے، پیسے خرچ کیجئے۔ بڑی مشین بنا دوں، گھنٹے بھر میں حوض تو کیا پورا کنواں نہ خالی ہو جائے، جب ہی کہئے گا!"

مگر گاؤں میں حوصلے ہی کی تو کمی تھی، نہ کوئی سرمایہ دار تھا اور نہ کوئی دودوا کی اُپج سے فائدہ اُٹھانے والا۔ نہ انھیں کسی رئیس کی سرپرستی حاصل تھی، اور نہ اپنی حکومت ہی تھی کہ وہ سر پر ہاتھ رکھتی۔ لے دے کر جب کسی کو سوجھتی تو بس یہی کہ اب کے جو ڈپٹی صاحب کا پڑاؤ ہمارے گاؤں میں پڑے گا تو آپ کے یہ کھلونے ان کو ضرور دکھائیں گے۔ دودوا اس "کھلونے" کی لفظ پر تپ جاتے تھے۔ ان کا چہرا تانبے کے رنگ کا ہو جاتا تھا۔ ان کے ہونٹ کانپنے لگتے تھے اور وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھرتے تھے۔ گویا فیضی کی طرح فریادی ہوتے تھے۔

"قدر دانیٔ عالم بالا معلوم شد!"

دودوا نے ایک پنکھا بھی ایجاد کیا تھا۔ گرمیوں کے زمانے میں اکثر زمینداروں کے یہاں کاٹھ کے پنکھے، کپڑے سے منڈھ کر اور جھالریں لگا کر کمروں میں لٹکا دیتے تھے۔ ان کی ڈوریاں دروازوں کے اوپر ایک سوراخ سے نکال دی جاتی تھیں۔ گاؤں کے کہار، چمار، پاسی جو زمینداروں کی زمینوں پر بسے ہونے کی وجہ سے پرجا کہلاتے تھے، ان پنکھوں کو دن دن بھر کھینچتے اور شام کو دو چار پیسے مزدوری پاتے تھے۔ دودوا نے اسی جاگیرداری نظام میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے ان کو اس بیگار میں خاص خرابی نہیں دکھائی دیتی تھی۔ ان کو جو بات کھلتی تھی وہ یہ تھی کہ جو کام مشین سے نکل سکتا ہے وہ انسان سے کیوں لیا جائے! اس لئے انھوں نے پنکھا بھی ایجاد کیا۔ سارے پنکھے گھومتے ہیں ان کا پنکھا کاٹھ والے پنکھوں کی طرح سیدھا سیدھا چلتا تھا۔

ان کو اپنی اس ایجاد پر بڑا فخر تھا۔ چنانچہ اس سال جب موسم سرما میں ضلع کے کلکٹر صاحب دورہ کرتے گاؤں میں آئے تو دودوا اپنی ڈیزائینوں کی کاپی اور اپنا پنکھا لے کر اُن سے ملے۔ صاحب نے مختلف آلات کی ڈیزائنیں دیکھیں۔ ان کے پنکھے کو چلا کر تجربہ کیا ہم شما

کو بلاکر ان کو دکھایا ، دونوں بہت خوش ہوئے انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ ان تمام ڈزائنوں کی نقل کرکے انھیں دے دیں تاکہ وہ اسے انگلستان بھیج دیں ۔ دوددا نے صاحب کے خوف سے ان کے سامنے ہامی بھر لی ، مگر گھر جو پلٹے تو حد درجہ خفا ۔ ایک شخص نے از راہ ہمدردی ان سے اس ملاقات کا حال پوچھا ، کہنے لگے: "جناب ، میں ان کی گٹ پٹ گٹ پٹ تو سمجھتا نہیں ، لیکن وہ چاہتے تھے کہ میں انہیں اپنی ڈزائنوں کی نقلیں اتار کر دے دوں ۔ قاہرہ سے ، بغداد سے ، قرطبہ سے ، قسطنطنیہ سے ، دمشق سے ، دلّی سے ، ڈھاکے سے ، طہران سے ، نہ جانے کیا کیا لوٹ کرلے جا چکے ۔ اب چاہتے ہیں کہ جو بچی کھچی ایجادیں ہمارے دماغوں میں رہ گئی ہیں وہ بھی اڑالے جائیں ۔ مجھ سے میری ڈزائنوں کی نقلیں مانگتے ہیں ! بڑے ہوشیار رہو بہنہ ۔

لوگوں نے سمجھایا اگر انگریزوں کو کوئی ڈزائن پسند آگئی تو ہزاروں ہزار دے نکلیں گے ۔ عمر بھر کے لئے اطمینان ہو جائے گا !

وہ فن کاروں کی استغنا سے کہنے لگے "اُہنہ ! مجھے خدا روکھی سوکھی یوں بھی دے دیتا ہے ۔ ملک والے چاہیں گے میری ایجادوں سے فائدہ اُٹھائیں گے ، نہیں تو سب کچھ میرے ساتھ قبر میں جائے گا "

دوددا کو چند چیزوں سے بڑی محبت تھی ۔ ایک تو پنسل ۔ گویا وہ بغیر اس کے زندہ ہی نہ رہ سکتے تھے ۔ وہ ہر وقت جزو کی طرح ان کے ساتھ رہتی ۔ وہ اس کے موجد کو دعائیں دیتے تھے ۔ "کیا چیز بنا دی ہے اس شخص نے ۔ لکھتے رہو ، خطوط کھینچتے رہو کبھی ہاتھ کالا نہیں ہوتا ۔ پنسل سے تصویر بناؤ ، لکیر کھینچو ، ناپسند ہوئی ، کج ہو گئی فوراً اسے ربر سے مٹا ڈالا ۔ دوسری کھینچ لی ، بنا ڈالی قلم میں یہ بات نہیں ۔ وہ بغیر دوات کے سہارے کے نہیں چل سکتا ۔ یہاں جب تک پنسل ٹوٹ نہ جائے یا گھس کر ختم نہ ہو جائے ایک مستعد سپاہی کی طرح ہر وقت فرض ادا کرنے کے لئے تیار ۔ وہ جوش میں آکر کہتے "۔ اس کے موجد نے خدا کی نعمتوں میں ایک نعمت کا مستقل اضافہ کیا ہے ۔ زندہ ہوتا اور مجھے مل جاتا تو میں اس کے ہاتھ چوم لیتا !"

دوسری چیز افیم تھی ۔ وہ صبح شام اس کی چُسکی ضرور لگاتے ۔ وہ اس کے حاصل کرنے کے لئے شہر جانے والوں کی خوشامد کرتے ۔ خشخاش بونے والے کسانوں کے ہل ، پھاوڑے ، کھرپیاں مفت بنا دیتے اور وہ اس کی قیمت ادا کرنے کے سلئے روپے کا کام آٹھ آنے میں کر دیتے ۔ صبح شام کا وہ منظر بھی قابل دید تھا ، جب وہ اپنی محبوبہ چنیا بیگم کی حضوری کی تیاریاں کرتے تھے ، پہلے وہ حقّہ بھرتے تھے ۔ چلم پر کوئلے کی ٹکیاں تین طرف کھڑی کی جاتیں پھر پھر ایک چھوٹا سا ٹکڑا آگ کا ان پر بیچ میں رکھا جاتا ۔ یہ کام دیہات کے بھدّے اور بڑے بڑے چمٹوں سے ناممکن تھا ۔ اس لئے انھوں نے بڑی سبک ، نوکیلی اور خوبصورت چھوٹی چھوٹی چمٹیاں ایجاد کی تھیں ۔ چمٹی کی نوک سے بڑی صفائی سے آگ کی چنگاری ٹکیوں کے سرے پر رکھ دی جاتی ۔ پھر آہستہ آہستہ ایک چھوٹی سی پنکھیا سے ہوا دے کر انھیں دہکایا جاتا ۔ جب وہ آدھے کے قریب دغ جاتیں تو چلم پر چمپر رکھ دیا جاتا ، اور حقّے کی طرف سے اطمینان ہو جاتا ۔

اب بکس کھولا جاتا ۔ اس کے ایک کونے میں ٹین کی ڈبیا میں کپڑے اور کاغذ کی کئی تہوں میں لپٹی ہوئی افیم ہوتی ۔ اس میں سے چنے برابر چنیا بیگم توڑ لی جاتی ۔ اسے چٹکی بھر روئی میں لپیٹا جاتا اور وہ گولی چائے کی پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈال کر بار بار بھگوئی اور نچوڑی جاتی ۔ تقریباً نصف گھنٹے تک یہ عمل جاری رہتا ۔ جب اس کا یقین ہو جاتا کہ اب اس میں سوائے سفل کے کچھ نہیں رہ گیا ہے تو جوگا الگ رکھ دیا جاتا اور وہ پانی جو زردی مائل رہنے کی جگہ اب سیاہی مائل ہو چکا ہوتا ذرا ذرا سا ہونٹوں سے سُڑکا جاتا ۔ حقّے پر دم لگتا جاتا ۔ پاس والوں سے باتیں ہوتی جاتیں ، اور زہر آلود پانی چٹخاروں کے ساتھ حلق سے اُترتا جاتا ۔

دوددا کی اس وقت کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتیں ۔ زمین آسمان کے قلابے ملانے میں انھیں اس وقت کوئی دقت نہ محسوس ہوتی ۔ وہ کبھی شاعری پر اُتر آتے ، کبھی داستان گوئی پر ۔ ان کو آتش و رند و صبا و وزیر کے ہزاروں شعر یاد تھے ۔ وہ ان کی پوری پوری غزلیں جھوم جھوم کر پڑھتے ہوتے کہ کمبخت پینک آجاتی ۔ حقّہ کی منہ میں لگی ہوئی نہنال اگر لبوں میں ڈھیلی دبی ہوتی تو سر کے جھٹکے سے وہ منہ سے نکل جاتی اور سر گھٹنوں سے جا لگتا ۔ لیکن اگر نہنال دانتوں میں دبی ہوتی تو حقّہ یقینی الٹتا تھا ۔ ارد گرد بیٹھے ہوئے شاگرد چلم کی چنگاریاں جلدی جلدی بجھانے اور اُلٹے ہوئے حقّہ کو پھر سے تازہ کرنے اور بھرنے کی سعادت حاصل کرتے ۔ ایسے موقعوں پر دوددا افیون کو بُری عادت

بھی کہتے اور بچوں کو دعائیں بھی دیتے تھے۔

دودوا کو اکثر داستانیں پوری پوری یاد تھیں۔ جب وہ امیر حمزہ کے کارنامے اور شاہزادۂ ایرج و تورج کی معرکہ آرائیاں بیان کرتے تو اپنے نحیف جُثّے کو بھول جاتے۔ ان کی آواز میں ایک للکار پیدا ہو جاتی اور وہ کبھی کبھی نصف قد سے کھڑے ہو جاتے تھے۔ انھیں عمرو عیاؔر اور ملکۂ بہار سے بڑی محبت تھی۔ وہ جب بھی عمرو عیار کی زنبیل کا ذکر کرتے تو ان کی آواز سے حسرت ٹپکتی تھی کہ کاش انھیں اس کے اندر داخل ہو کر اس کی سیر کا موقع مل جاتا، وہ وہاں کے عجائبات اور طلسم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔ وہ اس زنبیل کے خزانوں کا ذکر جھوم جھوم کر کرتے اور اسی جھومنے میں منحوس پینک آ جاتی اور پھر بیچارے حقّے کی شامت آ جاتی۔

صنفِ نازک کی دو ذاتیں انھیں بڑی محبوب تھیں اور دونوں میں بڑی چشمک و رقابت و حسد تھی۔ ایک تو تھی ان کی اپنی اُپلے والی اور دوسری تھی ان کی اپنی جمنا پاری بکری۔ اُپلے والی خاصی تندرست ہٹی کٹی تھی۔ گو اس کی عمر ڈھل چکی تھی، مگر اس کے انداز بتاتے تھے کہ بزعم خود ابھی تک دیوارِ گلستان پر دھوپ باقی ہے۔ اس کی زبان تیز اور مزاج کھڑتنک تھا۔ دوسرے گھروں میں جب وہ اُپلے بیچنے جاتی تو وہ کھڑی کھڑی سودا کر کے چلی آتی اور نقد پیسے اسی وقت وصول کر لیتی، مگر دودوا کے کمرے کے سامنے وہ ہمیشہ اطمینان سے آ کر بیٹھ جاتی۔ گویا اپنی اصلی منزل پر پہنچ گئی تھی۔ دونوں میں اپلوں کے وزن، قد و حجم کے لحاظ سے ان کے دام اور بھاؤ پر بڑی دیر تک بحث ہوتی، دودوا کہتے "تو اُپلوں کے دام میں اپنے دام بھی شریک کر دیتی ہے!" وہ ذرا اٹھلا کر جواب دیتی "تم تو میاں سدا کے مسکھری باج ہو!" اور کبھی یہ جیتتے کبھی وہ مگر ان کی ضرورت بھر کے اُپلے دئے بغیر وہ نہ ٹلتی؛ لوگ یونہیں کہتے تھے کہ دس برس پہلے جبکہ دونوں نسبتاً جوان تھے، دونوں میں کچھ اس طرح کی باتیں زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ ایک لڑکے کی زبانی ایک چشم دید مگر معصوم واقعہ بھی سنا گیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن جب بارہ بجے حسبِ معمول سب لڑکے تین بجے تک کے لئے چھوٹے تو عظیم اللہ کو گھر پہنچ کر یاد آیا کہ وہ اپنی تختی دودوا کے کمرے ہی میں بھول آیا۔ اب اگر تختی وہیں رہی تو وہ ڈھلے کب اور دودھیا لگا کر سکھائی کب جائیگی۔ پھر سہ پہر کی مشقِ خوشخطی کے سلسلے میں "جاہل، پاجی، نابکار!" کے سے خطابات ہی نہ قبول کرنا پڑیں گے بلکہ دو چار قمچیاں بھی ہاتھ بڑھا بڑھا کر لینا پڑیں گی۔ اس لئے وہ دبے پاؤں کمرے تک پہنچا۔ دل میں سوچا تھا ممکن ہے دودوا سو رہے ہوں تو بس کام بن جائے گا۔ چپکے سے تختی لیکر چلا آؤں گا اور انکو خبر بھی نہ ہوگی۔ کمرے کے قریب جو پہنچا تو دودوا کی آواز میں احتجاج سنی: "اری مار ڈالا، رومال تو چھوڑ! سارے پیسے کھولے لیتی ہے!" ساتھ ہی ایک زنانی ہنسی کی آواز بھی سنائی دی، وہ ٹھٹک کر پھاٹک سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے اُپلے والی کو خالی جھوے سمیت کمرے سے جھپٹ کر نکلتے دیکھا اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بے تحاشا بھاگا۔

یہی بات لڑکوں لڑکوں سے ہوتی ہوئی بڑوں تک پہنچی، اور دودوا پر ہنسوں کے فقروں کا موضوع بنی۔ وہ بیچارے لاکھ صفائی دیتے، ہزاروں قسمیں کھاتے کہ تم لوگوں کے شبہوں میں کوئی اصلیت نہیں۔ وہ دیوانی یقینی اس دن اپنی ساری بقایا وصول کرنے کمرے میں گھس آئی تھی اور اس نے رومال میں بندھے ہوئے پیسوں پر ہاتھ بھی ڈال دیا تھا۔ لیکن اس کے آگے قسم لے لو جو کوئی ایسی ویسی بات ہو

غرض ایک تو تھی ان کی محبوبہ۔ یا منظورِ نظر جو کچھ بھی کہو یہ اُپلے والی، دوسری چہیتی تھی ان کی موہنی بکری، وہ اس کی دیکھ بھال میں بڑا اہتمام کرتے، شاگردوں کو حکم تھا کہ وہ ہر روز گھنٹے دو گھنٹے کے لئے اسے کھیتوں باغوں میں گھما لایا کریں۔ اس کے لئے پیپل، برگد کے پتّے بلا ناغہ فراہم کریں اور مٹر، جو، گیہوں کی بھوسی، چوکر، جو کچھ گھر سے چھپا چرا کر لا سکیں ضرور مہیا کریں۔ وہ ان کے پلنگ کے قریب ہی بندھی رہتی، اور سال میں دو بچے ضرور دیتی۔ جمنا پاری ہونے کی وجہ سے قد آور بھی تھی اور دودھ بھی کافی دیتی۔ لوگ کہتے بکری کا دودھ آدھا منگنی آدھا بال۔ لیکن دودوا کی دونوں وقت کی چا اور رابڑی موہنی ہی کے بل بوتے پر چلتی تھی۔ وہ اس کی تعریف میں پورے پورے نثری قصیدے پڑھ ڈالتے تھے۔ کبھی کبھی اپنی کاٹھ والی پرانی کنگھی سے اس کے بالوں میں کنگھا اور تیسرے چوتھے مہینے جب محبت

کا شدید دورہ پڑتا تو گھنٹوں اس کا سر سہلاتے۔ اس کے تھن سے کھیلتے اور اس کے منہ پر منہ رکھ کر "میری موہنی! میری موہنی!" بڑے پیار سے پکارتے اور وہ بار بار دم اُٹھاتی اور مینگنی کے سیاہ موتی ان کی تپی کے نیچے بکھیرتی۔

موہنی کسی دوسرے کا کیسا ہی نقصان کر ڈالے۔ باغ کے چھپکے پودے کھا ڈالے، یا ہرے دھنیئے کی پوری کیاری صاف کر دے، کسی کے بستر کی چادر کا رومال بنا ڈالے، کسی کے پائجامے کی جھری کو چبا کر کُرتی کی آستین میں تبدیل کر دے مگر دودوا اس پر کسی کی کڑی نظر نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ فوراً پینترے بدل کر موہنی کا تعاقب کرنے والوں کے سامنے آ جاتے۔ ہمیشہ سینہ سپر ہو جاتے۔ جھڑکتے، ڈانٹتے، خوشامد کرتے، سمجھاتے: "اجی جناب، جانور ہی تو ہے۔ اسے بھلے بُرے کی تمیز کہاں؟ اس کو مارنے سے فائدہ؟ سبز سبز کونپلیں دیکھیں جی مچل گیا، ایک آدھ گال کھا لیں۔ وہ اپنی فطرت کہیں بدل سکتی ہے۔ اس کو خالق نے بنایا ہی ایسا ہے۔ وہ ہمارے آپ کی طرح مختار تھوڑے ہے!"

ایک دن دودوا کو صبح سویرے ہی کسی ضرورت سے دوسرے گاؤں جانا تھا۔ چلتے وقت انھوں نے بکری پلنگ کے پاس سے کھولی تو ضرور مگر بے خیالی میں اُسے کمرے سے نہ نکالا۔ جلدی سے بکس میں سے افیم نکال کر جیب میں رکھی اور کمرہ بند کر کے چلے گئے۔ دوپہر کو جب وہ پلٹے تو انھوں نے کمرے کے باہر ہی سے بکری کی "میں، میں" کی آواز سنی۔ اب اپنی بھول پر چونکے۔ کمرہ جو کھولا تو دیکھا کہ بی موہنی بستر پر دراز ہیں، اور پورے میں مینگنی اور پیشاب کی گلکاریاں ہیں۔ اُن کا محبوب پنکھا ٹوٹا پھوٹا پیٹ کے نیچے دبا ہے اور ڈیزائن کی پوری کاپی لقمہ تر بن چکی ہے۔ جگالی سے گرے پڑے کاغذ کے ٹکڑے اس کی شہادت پر گواہی دے رہے ہیں۔

دودوا کی نظروں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ انھوں نے بکری کو بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔ وہ "میں میں" کر کے کمرے سے بھاگی۔ وہ بھی دوڑے، اب وہ دالانوں میں، صحن میں بھاگتی جاتی ہے اور وہ اس کا پیچھا کرتے جاتے ہیں۔ وہ پھاٹک پر سے نکل کر بھاگی۔ دودوا نے قریب پڑا ہوا ایک چیلا اٹھا لیا۔ وہ دو چار گز آگے تھی۔ انھوں نے چیلا کھینچ کر مارا۔ اس کی ایک ٹانگ جھول گئی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگی، کچھ بچے، کچھ بوڑھے شور سن کر دوڑ پڑے۔ دیکھا تو دودوا پھڑکتی ہوئی بکری پر گھٹنے رکھے آدھے دھڑ سے سوار ہیں۔ پٹے کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ منہ سے کف نکل رہا ہے: "اور کھائے گی میری ڈیزائن کی کاپی! اور توڑے گی میرا پنکھا!" اور ایک چھوٹے سے پاتھر سے اس کی گردن دبائے ہوئے ہیں، اور دوسرے سے اسے طمانچے پر طمانچے مار رہے ہیں۔

لوگوں نے انھیں کھینچ کر جب الگ کیا تو وہ اکڑوں زمین پر بیٹھ کر سسکنے لگے: "ہائے میرا پنکھا! ہائے میری ڈیزائن کی کاپی۔ ہائے میری زندگی بھر کی محنت!"

بکری اسی دن سے نکال دی گئی۔ اُپلے والی روزانہ آنے لگی۔ اب وہ اُپلے ہی نہیں دودوا کے لئے آدھ سیر دودھ بھی تو لاتی تھی، اور جب یہ پیسے ادا کرنے میں دیر لگاتے تو وہ اکثر دوپہر میں ان کے کمرے میں گھس کر ان سے پیسے چھین کر وصول کرے جاتی۔ احباب فقرے کستے کہ "اب تم نے بکری کی جگہ بھینس پالی ہے!"

دودوا اُکتائے ہوئے لہجے میں کہتے: "اُونہہ، تم لوگ جو جی چاہے سمجھو، مگر یہ بھینس اُس بکری سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔ نہ مینگنی ہے، نہ بال، دودھ بھی اچھا ہے اور کاپی بھی سلامت!"

معلومات و اعداد و شمار

ہندوستان میں پہلا ہائیڈرو —— الیکٹرک اسٹیشن ۱۹۰۲ء میں میسور میں قایم کیا گیا۔
ہندوستان کے کل رقبۂ آراضی کا پانچواں حصہ جنگلات سے اٹا پڑا ہے۔
بنگلور کی "انڈین ٹیلیفون انڈسٹریز لمیٹڈ" ہر تین منٹ میں ایک نیا ٹیلیفون تیار کر لیتی ہے۔ کالی مرچ کی برآمد سے ہندوستان کو ہر سال ساڑھے اٹھارہ کروڑ روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔

شری رام سرنا

تیل کی پیداوار

انسان کی ترقی کی راہیں پھیلتی ہی جا رہی ہیں۔ وہ آج ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ سمندر عبور کر رہا ہے۔ بجلی اور بے تار برقی کا خداوند ہے۔ ایٹم کی طاقت کا مالک ہے اور سائنس کی وساطت سے ان باتوں کو بھی کر رہا ہے جن کو کل تک جادوگری کہا جاتا تھا، اور مستقبل میں ان باتوں کو احاطۂ عمل میں لانے کا ارادہ کر رکھا ہے جن کو آج کل ناممکن کہا جاتا ہے۔ ان کرشمہ سازیوں میں انسان کی اپنی کاوشوں اور دماغ سوزیوں کا بیشک بہت بڑا ہاتھ ہے۔ لیکن یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ انسان کی ان بلند پروازیوں میں قدرت کی نوازشوں کا سہارا بھی کسی طرح کم نہیں۔ یہ تسلیم کرنے میں تو عار نہیں کہ انسان نے سائنس کی امداد سے مشینری کو ڈھونڈ نکالا۔ اور پھر جو کام اس کے بس سے باہر تھے ان کو کرنے کے لئے کارخانوں کو قایم کیا — اس کی سائنس اور اس کے کارخانے سب اس کی اپنی محنتوں کے مرہون ہیں۔ لیکن اس کے بعد؟ اس مشینی قوت کو لوہے کے بغیر عالم وجود میں لانا غیر ممکن تھا اور کوئلے یا تیل کے بغیر چلانا مشکل۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج کل کا انسان قدرت کے بیش بہا عطیوں کے بغیر آج کل کا انسان نہ بن سکتا۔ اس مضمون میں تیل پر ایک تبصرہ پیش کیا جا رہا ہے۔

آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے تیل دستیاب ہوا تھا جب کہ مسٹر ڈریک نے ۱۸۵۹ء میں تیل کا سب سے پہلا کنواں کھودا تھا۔ پھر جوں جوں تیل کے مزید ذخیرے دستیاب ہوتے گئے تیل کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ شروع شروع میں نباتاتی تیلوں کی طرح مٹی کے تیل کو جلا کر روشنی کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ پھر اسے موٹریں چلانے کے لئے استعمال کیا گیا۔ پچھلے ۵۰ سال میں تیل کے استعمال کو بیشتر فروغ حاصل ہوا۔ آج کل ذرائع آمد و رفت اور صنعتی اداروں کا تو کلیتہً تیل ہی پر انحصار ہے۔ اس لئے تیل کی ضرورت از بس لازم ہو گئی ہے۔ تیل کی روز بروز بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر تیل کی فراہمی ایک طویل جستجو بن چکی ہے اور بن رہی ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی موجب دلچسپی ہوگا کہ سنہ ۱۸۷۰ء میں تیل کی سالانہ پیداوار دنیا بھر میں صرف ۸ لاکھ ٹن تھی تیس سال بعد ۱۹۰۰ء میں یہ پیداوار بڑھ کر ۱۹۹ لاکھ ٹن ہو گئی۔ پھر ۲۰ سال بعد ۱۹۲۰ء میں یہ پیداوار ۸۶۹ لاکھ ٹن ہو گئی۔ اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ ہوا اور ۲۹۴۸۵ لاکھ ٹن ہو گئی۔ ۱۹۵۰ء میں پیداوار ۵۲۴۷ لاکھ ٹن تک پہنچ چکی تھی۔ حال ہی میں اعلان کیا گیا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں تیل کی عالمگیر پیداوار ۶۵۴۰ لاکھ ٹن ہوئی تھی۔

تیل کی موجودگی

یہ نہ سمجھ لیجئے کہ تیل دنیا میں ہر جگہ مل سکتا ہے۔ قدرت کا یہ بیش قیمت عطیہ کچھ خاص علاقوں میں ہی پایا جاتا ہے، اور اس کی موجودگی ان علاقوں کی زمینی بناوٹ پر منحصر ہے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ تیل کے موجودہ ذخیروں کی دستیابی کو دیکھتے ہوئے تیل کے جغرافیائی حدود اربعہ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ زمین کے نیچے بہنے والی تیل کی دھارا ایک مخصوص خط کے اردگرد واقع ہے۔ یہ خط مشرق بعید میں انڈونیشیا سے شروع ہو کر ملایا۔ برما۔ ہندوستان (آسام)۔ پاکستان (ضلع اٹک مغربی پنجاب) سے ہوتی ہوئی گذرتی ہے۔ اور پھر براعظم امریکہ میں جا پہنچتی ہے۔

زیر زمین تیل کی موجودگی کو سائنس نے زمین کی بناوٹ اور علم معدنیات کی وساطت سے تلاش کیا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ زمین کی بناوٹ اس ترتیب سے ہوئی ہے کہ کرۂ ارض کے اندرونی مرکز میں ایک آتشین لاوا ہے۔ اس کے اوپر سخت چٹانوں کا خول ہے اور سب سے اوپر ایک بیرونی خول ہے جو مقابلتاً نرم ہے۔ لاکھوں سال پہلے جب موجودہ دنیا تخلیق کے ابتدائی دور سے گزر رہی تھی تو وقتاً فوقتاً

زلزلے آیا کرتے تھے جن کے باعث کئی جگہ چٹانوں کا سلسلہ اگر اوپر اُٹھ آتا تھا تو کوہستان قایم ہو جاتے تھے اور اگر نیچے دھنس جاتا تھا تو جھیل یا سمندر بن جاتے تھے۔ زیر زمین بناوٹ کے اس تغیر و تبدل نے تیل اور قدرتی گیس کو جمع ہونے کا موقع مہیا کر دیا۔ تیل اکثر ان جگہوں میں پایا جاتا ہے جہاں چٹانیں ہوں۔ خیال رہے کہ کوئلہ اور دیگر معدنیات اور دھاتیں تو زمین کے نیچے اپنی انفرادی شکل یا حیثیت میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے خلاف تیل کی اپنی انفرادی شکل یا حیثیت نہیں ہوتی۔ وہ چونہ اور نرم پتھر کے مساموں میں موجود ہوتا ہے۔

تیل کی تلاش

تیل کی تلاش شروع سے ہی بہت مشکل ثابت ہوتی آرہی ہے لیکن انسان نے مسلسل محنت، تجربے اور سائنس کی امداد سے کام لے کر آج اس تلاش کو مخصوص قاعدوں سے کامیاب کر لیا ہے۔ ان مخصوص قاعدوں کو Petroleum Geology کہا جاتا ہے۔
اس سائنس کے تحت زمین کی بناوٹ کی تشخیص کی جاتی ہے۔

جب تیل کی موجودگی کا با وثوق پتہ لگ جاتا ہے تو پھر ایک کنواں کھودا جاتا ہے۔ ان کنوؤں کی گہرائی اس خطے کی زمینی بناوٹ کے مطابق کم و بیش ہوتی ہے۔ آج کل ایک میل گہرے کنویں معمولی گہرے سمجھے جاتے ہیں۔ ½ میل ۲۶۲۵ فٹ گہرے کنوؤں کو تو بالکل سطحی سمجھا جاتا ہے۔ دو میل یا ۱۰۵۰۰ فٹ گہرے کنوؤں کو صحیح طور پر گہرا سمجھا جاتا ہے، اور تین میل گہرے کنوؤں کو (۱۵۷۵۰ فٹ) انتہائی گہرا سمجھا جاتا ہے۔ ان کنوؤں کو کھودنے میں بھی کافی محنت لگتی ہے۔ کئی مہینے تو صرف کنواں کھودنے کے لئے جگہ منتخب کرنے اور جگہ تیار کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے بعد کئی مہینے کنواں کھودنے میں لگ جاتے ہیں۔ خیال رہے کہ جہاں تیل کی پیداوار ہر روز بڑھتی جا رہی ہے، اسی کے ساتھ ساتھ تیل کی تلاش میں کنوؤں کی گہرائی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ تیل کے کنوؤں کی گہرائی مندرجہ ذیل نقشے سے عیاں ہو جائے گی۔

سال	سب سے گہرا کنواں
۱۸۵۹	۷۰ فٹ
۱۹۲۹	۹۲۲۱ "
۱۹۳۸	۹۲۲۱ فٹ
۱۹۴۸	۱۶۸۲۳ فٹ

کنواں کھودنے کے بعد کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تیل نہیں نکلتا۔ لیکن اگر سروے کے نتائج اس بات کو یقینی طور پر ظاہر کرتے ہوں کہ اس علاقے میں تیل موجود ہے تو پھر کسی اور جگہ کو منتخب کر کے کنواں کھودا جاتا ہے۔ اس کام کو کرنے کے لئے کھودنے والی مخصوص مشینوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طرح جب ایک جگہ تیل نکل آئے تو پھر تیل کو باہر نکالنے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ کئی دفعہ تیل کنویں کی تہ سے سطح زمین تک خود بخود اوپر اٹھتا ہے۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ تیل کے ساتھ قدرتی گیس بھی ہوتی ہے۔ وہ تیل کو بالکل اسی طرح اُبھارتی ہے جس طرح سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے پر سوڈا اُبل کر اوپر اُٹھتا ہے لیکن بعض اوقات تیل میں اتنی قدرتی گیس نہیں ہوتی کہ وہ تیل کو اوپر اُٹھنے میں پوری امداد دے سکے۔ اس حالت میں فالتو گیس کو کنویں کی تہ میں پہنچایا جاتا ہے، تاکہ وہ تیل کو اوپر اُٹھنے میں امداد دے سکے۔ اس ترکیب کو Gas-Lift کہتے ہیں۔ تیسری حالت میں جب گیس بالکل معمولی ہو تو پھر تیل کو پمپ کے ذریعے باہر نکالا جاتا ہے۔ اس ترکیب کو پمپنگ کہتے ہیں۔ یہ پمپ خاص قسم کا ہوتا ہے اور کنویں کی تہ میں کام کرتا ہے۔

اس طرح جب ایک کنواں کامیاب ہو جائے تو تیل نکالنے کا کام یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے بعد تیل نکالنے والوں کو یہ فکر لگ جاتی ہے کہ اس علاقے میں باقی ماندہ تیل بھی باہر نکالا جائے۔ اس لئے سب سے پہلے یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ اس خطے میں تیل کے متعلق رقبہ کا حدود اربعہ کہاں تک ہے۔ پہلے کنویں سے یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ تیل کا خطہ چاروں اطراف میں کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ یا اوپر اور نیچے کی تہوں کے درمیان تیل کی حامل تہ کس قدر ہے۔ یا کہ اس خطے میں تیل نکالنے کے لئے کہاں اور کتنے کنویں کھودے جا سکتے ہیں۔ ان سوالات کا جواب ڈھونڈنے کے لئے شروع میں بہت جگہ کھدائی کرنی پڑتی ہے۔ یہاں یہ سوال بھی غور طلب رہتا ہے کہ ان کنوؤں کا ایک دوسرے سے کتنا فاصلہ رکھا جائے۔ اس مسئلے کا ابھی تک کوئی خاص صحیح جواب تجویز نہیں ہو سکا۔ ہاں یہ بات ہے کہ اس پالیسی کو اس بات کے مدنظر طے کیا جاتا ہے کہ اس علاقے سے جتنا تیل نکل سکتا ہے اس کو تیل ڈھونڈنے اور نکالنے کے خرچ سے مناسبت رکھنی چاہیئے۔ اس سوال کو اس لحاظ سے بھی سوچئے کہ تیل کا کوئی

بھی کنواں گرد و نواح کے اس علاقے میں دستیاب ہونے والے تیل کی ساری مقدار کو باہر نہیں نکال سکتا۔ اس کنویں کا ایک مخصوص رقبہ ہوتا ہے۔ اس لئے جتنے زیادہ کنویں کھودے جائیں گے اتنا ہی تیل زیادہ نکلے گا۔ لیکن تیل نکالنے کا کام کنوؤں کے کھودنے سے ہی حل نہیں ہو جاتا۔ تیل نکالنے میں کئی اڑچنیں بھی وارد ہوتی ہیں۔ خیال رہے کہ تیل کے کنویں میں تیل کشش ثقل کے تحت تو آتا ہی ہے لیکن تیل کے ساتھ موجود ہونے والی گیس بھی اُسے دھکیلتی ہے۔ اس لئے کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تیل تو پیچھے رہ جاتا ہے اور گیس آگے آ جاتی ہے۔ اس لئے تیل نکالنے میں گیس اور تیل کی مناسبت کا بہت خیال رکھنا چاہیئے۔ یہ ساری کارروائیاں بہت محنت طلب ہوتی ہیں اور ان پر کافی سرمایہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ شاید اسی لئے اس کام کو کرنے کے لئے دنیا بھر میں صرف ایک درجن کے قریب کمپنیاں ہی قائم ہو سکی ہیں۔ اس مرحلے پر تیل کی عالمگیر پیداوار کا ایک شمارہ پیش کیا جا رہا ہے۔

علاقہ	پیداوار (۱۹۵۰ء میں)		عالمگیر پیداوار کا حصہ	
شمالی امریکہ	۲۷۵۰	لاکھ ٹن	۵۲	فی صدی
بحرالکاہل کے جزائر	۸۶۰	″	۱۶	″
جنوبی امریکہ	۱۶	″	۳	″
وسط مشرق	۸۹	″	۱۷	″
مشرق بعید	۱۲	″	۲	″
مغربی یورپ	۲	″	۱	″
مشرقی یورپ	۴۵	″	۹	″
	۵۲۵۰	″		

تیل کی یہ پیداوار ان عالمگیر ذخیروں کا عشیر عشیر بھی نہیں جو زمین کے نیچے بہہ رہے ہیں۔ تیل کے عالمگیر ذخیروں سے مراد تیل کی وہ مقدار ہے جو تیل کے معلوم شدہ خطوں سے نکالی جا سکتی ہے۔ اس مقدار کا اندازہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ جب تیل کے نئے کنویں یا خطے دستیاب ہو جاتے ہیں تو یہ اندازہ بڑھ جاتا ہے، اور جب پیداوار کی مقدار گھٹ جاتی ہے تو یہ اندازہ کم ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں یہ بتانا موجب دلچسپی ہوگا کہ تیل کے عالمگیر ذخیروں کے مختلف اوقات پر اندازہ کیا تھا۔

سال	امریکہ میں		دنیا بھر میں	
۱۹۲۵	۵۰۰۰۰	لاکھ ٹن	۰۰	لاکھ بیرل
۱۹۳۵	۱۲۱۷۷۰	″	۲۳۰۰۰۰	″
۱۹۴۵	۱۹۷۸۵۰	″	۶۴۰۰۰۰	″
۱۹۴۹	۲۳۲۸۰۰	″	۷۸۳۲۲۰	″

ایک حالیہ اندازے کے مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۵۰ء کو تیل کے ان عالمگیر ذخیروں کی تعداد ۱۲۲،۸۶۰ لاکھ ٹن تھی۔ (ایک ٹن ۷ بیرل کے برابر ہوتا ہے) ان ذخیروں کا ۴۶ فی صدی حصہ مغربی کرۂ ارض میں واقع ہے۔ ۴۵ فی صدی حصہ وسط مشرق میں، اور باقی ۹ فی صدی حصہ روس مشرق بعید۔ یورپ اور دیگر خطوں میں ہے۔

ان عالمگیر ذخیروں کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ اول معلوم شدہ ذخیرے اور دوم غیر معلوم شدہ ذخیرے۔ معلوم شدہ ذخیروں کے اندازوں میں (۱) جن خطوں سے تیل نکالا جا رہا ہے ان کے معلوم شدہ ذخیروں کو شامل کیا جاتا ہے اور (۲) جن خطوں میں تیل کے کنویں کھودنے کا کام ہو چکا ہے لیکن ابھی تک وہاں تیل نکالنے کا کام شروع نہیں ہوا وہاں کے معلوم شدہ ذخیروں کو شامل کیا جاتا ہے، ان دونوں اندازوں کے حساب میں کفایت سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صحیح واقفیت کی غیر حاضری میں ان خطوں میں کل کتنا تیل ہے اس کا مکمل اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، اور وہاں اندازوں سے زاید تیل ہونا عین اغلب ہے۔ اس لئے ان زاید ذخیروں کو غیر معلوم شدہ یا Possible Reserves کہا جاتا ہے۔ ان غیر معلوم شدہ ذخیروں کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ اس کے تین طریقے ہیں۔ (۱) سطح زمین کے اس علاقے کا رقبہ جس میں تیل کی موجودگی کا امکان ہو سکتا ہے (۲) سائنسدانوں کا مشاہدہ ہے کہ زمین کے نیچے ایک تہ میں نہیں کئی تہوں میں تیل پایا جاتا ہے۔ اس لئے تیل کے کنوؤں کی گہرائی بھی ان اندازوں میں شامل ہونی چاہیئے (۳) آج کل کی جدید تراکیب کو بھی تیل کے ان اندازوں میں بہت دسترس ہے۔

یہاں سطح زمین کے اس حصے کے متعلق بھی کچھ بتانا لازم ہو جاتا ہے جس میں تیل کی موجودگی کا امکان ہے۔ ماہرین نے حساب لگایا ہے کہ سطح زمین کی Sedimentary Basin کا رقبہ ۱۵۰ لاکھ مربع میل ہے۔ اس قیاس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ تیل کے حامل خطے کا رقبہ ۲۰۰ لاکھ مکعب میل ہے۔ موجودہ تجربے کی بنا پر یہ حساب لگایا جاتا ہے کہ ایک مکعب میل میں ۴ ہزار ٹن تیل موجود ہوتا ہے۔ اس لئے کل عالمگیر ذخیرہ ۸۰۰۰ کروڑ

ٹن ہے۔ حال ہی میں برٹش ایسوسی ایشن نے اس اندازے کو ...۴ کروڑ ٹن بتایا ہے۔ ان دونوں اندازوں کی اوسط نکالنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ کھپت کی رفتار کو مدنظر رکھتے ہوئے عالمگیر ذخیرہ آنے والے ۱۰۰ سال کے لئے کافی ہے۔ تیل کے ان ذخیروں میں ان ذخیروں کو شامل نہیں کیا گیا جو Shale (شیل) سے تیل حاصل کرنے کی صورت میں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس صورت میں مزید ۵۰۰ کروڑ ٹن تیل کا ذخیرہ حاصل ہو سکتا ہے۔ دریں اثنا سائنس کی ترقی کے باعث تیل کو کیمیائی عمل کے ذریعے کوئلے اور قدرتی گیس سے حاصل کرنا بھی ممکن ہوتا جا رہا ہے۔ جب یہ عمل پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا تو تیل کے عالمگیر ذخیروں میں اور بھی وسیع اضافہ ہو جائے گا۔

تیل کی صفائی

کچے تیل کو کنوؤں سے نکالنے کے بعد قابل استعمال بنانے کے لئے کئی عمل برتے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے کچے تیل میں سے ان اجزا کو علیحدہ کیا جاتا ہے جو اس میں گھل جاتے ہیں۔ یہ کام کشید کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہ کشید صرف ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ کی جاتی ہے۔ اس کشید کے بعد تین قسم کا تیل حاصل ہوتا ہے۔ سب سے ہلکی قسم کا تیل جو سب سے زیادہ اچھا ہوتا ہے ہوائی جہازوں اور موٹر گاڑیوں میں استعمال کیا جاتا ہے، درمیانہ قسم کے تیل میں مٹی کا تیل ڈیزل آئل Diesel Oil اور مشینوں کے پرزوں میں ڈالنے والا تیل شامل ہوتے ہیں، اور سب سے بھاری قسم کے تیل میں Lubricants اور Dark Oils ہوتے ہیں۔

دنیا بھر میں تیل صاف کرنے کے کارخانوں کی پوزیشن یوں ہے۔

ملک	تیل صاف کرنے والے کارخانوں کی تعداد
ارجنٹائن	۱۷
کنیڈا	۲۹
فرانس	۱۶
جرمنی	۱۷
جاپان	۱۲
ہندوستان	۱
برطانیہ	۲۲
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۳۷۴
دیگر ممالک	۱۱۴
کل	۶۰۵

ان کارخانوں میں روس اور اس کے ساتھی ممالک کے کارخانے شامل نہیں۔ مزید براں حال ہی میں ہندوستان میں دو نئے کارخانے کھولنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایک کارخانہ نیویارک کی سٹینڈرڈ ویکیم کمپنی بمبئی میں کھول رہی ہے، اور ایک برما شیل کمپنی کھول رہی ہے۔ ان دو کارخانوں میں ۲۰۵۰ لاکھ ٹن تیل صاف کیا جائے گا۔ ایک اور کارخانہ کھولنے کے لئے بھی بات چیت ہو رہی ہے۔ دنیا کے دیگر حصوں میں بھی تیل صاف کرنے والے کارخانے کھولنے کے لئے کارروائی ہو رہی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ آسٹریلیا اور وینزویلا میں بھی کارخانے کھولے جا رہے ہیں۔

تیل کی تقسیم

کچے تیل کو صاف کرنے والے کارخانوں Refineries تک پہنچانے کے لئے کئی قسم کے وسایل باربرداری کام میں لائے جاتے لیکن ان میں سب سے اہم اور سب سے مقبول دو طریقے ہیں۔ (۱) تیل کی نالی Pipe Line (پائپ لائن) کے ذریعے (۲) سمندری جہازوں کے ذریعے۔ پہلا طریقہ وہاں اختیار کیا جاتا ہے جہاں تیل کے کنوئیں ملک کے ایک حصے میں ہوں، اور تیل کے کارخانے ملک کے دوسرے حصے میں واقع ہوں یا جہاں تیل کے چشمے ملک کے اندرونی حصوں میں واقع ہوں اور انھیں صاف کرنے کے لئے ملک کے باہر بھیجنا ہو۔ تیل کی نالی زیادہ تر وسط مشرق میں بالخصوص سعودی عرب، شام، عراق وغیرہ میں استعمال کی جاتی ہے۔ تیل کو سمندری جہازوں کے ذریعے ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچایا جاتا ہے۔ ان جہازوں کو آئل ٹینکرز کہتے ہیں، کیونکہ ان میں تیل کو جمع کرنے کے لئے تالابوں کی مانند لکڑی یا لوہے کے ڈھانچے بنائے جاتے ہیں۔ یکم جولائی ۱۹۵۱ء کو دنیا بھر میں تیل کی باربرداری میں مصروف سمندری جہازوں کے بیڑے کا کل وزن ۲۸۲ لاکھ ٹن تھا۔ اگر امریکہ کا ریزرو بیڑہ اس میں شامل کر لیا جائے تو کل وزن ۳۰۰ لاکھ ٹن تھا۔ علاقائی لحاظ سے اس بیڑے کا ۲۵ فی صدی حصہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے پاس تھا۔ ۲۳ فی صدی برٹش کامن ویلتھ کے پاس، ۱۵ فی صدی ناروے کے پاس اور ۱۰ فی صدی پانامہ (وسطی امریکہ) کے پاس تھا۔ مزید براں دنیا کے مختلف حصوں میں ۸۶ لاکھ ٹن کے نئے جہاز بھی تیار ہو رہے ہیں۔



آغا خاں محل پونا

ہاتما گاندھی اس مشہور عمارت میں
ہد رہے اور اسی عمارت میں شری مہادیو
یسائي اور ماتا کستوربا کا ایام اسیری میں
ںتقال ہوا تھا

تر ہشلل سہروائرري کمیشن ایڈوانس
ہشن برائے انڈوچائنا کے لیڈر شري ایس
ب شاہ کمبوڈیا سے مصروف گفتگو ہیں





سردار سورن سنگھ ورکس ، ہاؤسنگ اور سپلائي منست
یورپ اور امریکہ کے دورے کے بعد واپس آئے دو پال
کے ہوائي اڈے پر دوستوں نے آپ کا استقبال کیا

انڈین کلچرل ڈیلیگیشن روس جا رہاہے

دائیں طرف سب سے پہلے نئي دہلي ریڈیو کے
اسٹیشن ڈائرکٹر مسٹر ملک اور تیسرے نمبر پر
وفد کي لیڈر شریمتي چندر شیکھر کھڑي ہیں





مہاتما گاندھی ا



ﺑﮭﺠﻦ کالونی میں مہاتما گاندھی سردار پٹیل کے ساتھ جب آپ واردھا سے کیبنٹ مشن سے ملنے آئے

باپو پشاور میں سرحدو
بائیں طرف جا



باپو کی کٹیا سیواگرام میں







کھیل رہے ھیں

سے گفتگو کر رہے ھیں

عان کھڑے ھیں

رھائي کے بعد باپو ریل ھي میں هريجن فنڈ کے لئے چندہ جمع کر رہے ھیں

مہاتما گاندھي کي بڑي بہن



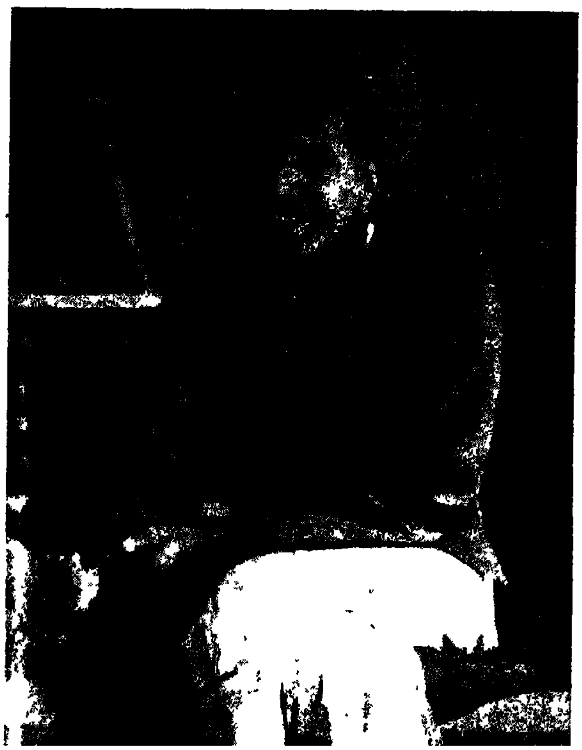


پدم و بهوشن دوسرا ورگ پائے والے
تین سامور شاعر



ولا تهول

میتهلي شرن گپت





جوش مليح آبادي

میرزا یگانہ چنگیزی

انتخاب

حسنِ فطرت بولتا ہے پردۂ اسرار میں
معنیِ بے لفظ پنہاں ہیں زبانِ خار میں
عُمر گھٹنے کے لئے ہے وقت کٹنے کے لئے
مُفت دِن گننے کو ہم پکڑے گئے بیگار میں

شامِ غربت بھی ہے رُوشن واہ ری یادِ وطن
یاد کیا ہے اک اندھیرے کا اُجالا دل میں ہے
کھیل ہے حسنِ نظر کا، شمع کیا پروانہ کیا
دل ہے جبتک دل جبھی تک روشنی محفل میں ہے

برابر بیٹھنے والے بھی کتنے دُور بیٹھے دل سے
مرا ماتھا جبھی ٹھنکا قریبِ رنگِ محفل سے
تمام انساں تو کیا وہ بھی برابر ہو نہیں سکتے
جہاں وہ ہوں گے بڑھ جائے گا ایک اپنے مقابل سے

نظر پڑنے لگی میری بھی اپنے شیشۂ دل پر
جوانی اُن کی آئینے کے قابل ہوتی جاتی ہے
زہے شانِ خداوندی گنہگاروں پہ یہ رحمت!
غضب ہے پارسائی اور مشکل ہوتی جاتی ہے

قِصّہ کتابِ عمر کا کیا مختصر ہُوا!
رُخ داستانِ غم کا اِدھر سے اُدھر ہُوا
دُنیا کے ساتھ دین کی بیگار الاماں
اِنسان آدمی نہ ہُوا جانور ہُوا؟

جگن ناتھ آزاد

غزل

قفس و آشیاں کی بات نہ کر — کرمِ باغباں کی بات نہ کر
اپنی منزل کو ڈھونڈنے والے — جرسِ کارواں کی بات نہ کر
مرا ہر سانس ہے نسیمِ بہار — مجھ سے دَورِ خزاں کی بات نہ کر
اے کہ تقدیر کا یقیں ہے تجھے — یہ گماں ہے گماں کی بات نہ کر
وارداتِ زمیں کو دیکھ ذرا — گردشِ آسماں کی بات نہ کر
جلوۂ خاکیاں کا دَور ہے یہ — نوریا فلاکیاں کی بات نہ کر
دیکھ ذرّوں کی آج تابانی — انجم و کہکشاں کی بات نہ کر
جادۂ دردِ عشق کے راہی — دیکھ سُود و زیاں کی بات نہ کر
فاش ہو رازِ دوستاں نہ کہیں — ستمِ دشمناں کی بات نہ کر
باغباں کا بھرم نہ کھل جائے — قفس و آشیاں کی بات نہ کر
جو مجھے چھوڑ کر روانہ ہُوا — مجھ سے اُس کارواں کی بات نہ کر
وہی میں وہاں مگر بہ بدی — تو مرے گلستاں کی بات نہ کر
جس نے اپنے چمن کو بیچ دیا — مجھ سے اُس باغباں کی بات نہ کر
قسمِ جورِ دشمناں تجھ کو — کرمِ دوستاں کی بات نہ کر
آج سارے چمن کی خیر منا — اک مرے آشیاں کی بات نہ کر
گمرہی بھی تو ایک منزل ہے — شکوۂ گمرہاں کی بات نہ کر
سُستیِ میرِ کارواں کی قسم — تیزیِ کارواں کی بات نہ کر

زندگی اِمتحان ہے آزاد
عشق کے اِمتحاں کی بات نہ کر

محمد مصلح الدین احمد

شریمتی وجے لکشمی پنڈت

بائرن نے کہا تھا کہ "عورت کو دو علم نہ سکھائے جائیں، ایک سیاست اور دوسرے شاعری"۔۔۔۔ اس نے اپنے تجربات و مشاہدات کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔ لیکن مسز وجے لکشمی پنڈت اور مسز سروجنی نائیڈو دونوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت و قابلیت سے ثابت کر دکھایا ہے کہ عورت ایک بلند پایہ سیاستداں و بہترین شاعرہ بن سکتی ہے۔ ان دونوں خواتین نے ملک و قوم کی جو خدمت کی اُسے ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ شریمتی پنڈت نے ملک کی آزادی کے لئے جد و جہد اور عالمی امن کے قیام کے لئے جو کوششیں کیں وہ یقیناً لائق قدر ہیں۔ جنرل اسمبلی کی صدارت پر آپ کا انتخاب ان خدمات کا اعتراف ہے۔ موصوفہ تاریخ عالم میں پہلی خوش نصیب خاتون ہیں جنھیں اس اہم ترین بین الاقوامی تنظیم کا صدر چنا گیا۔ آپ کی صدارت سے نہ صرف ہندوستان کا وقار بلند ہوا بلکہ آپ نے صنف نازک کی تاریخ میں ایک بہترین مثال قایم کی ہے۔ اب خواتین یہ فخر کر سکتی ہیں کہ ان میں نہ صرف میڈم کیوری، مسز نائیڈو، خالدہ ادیب خانم بلکہ وجے لکشمی پنڈت بھی ہیں۔ شریمتی پنڈت نے ۱۵۔ اگست ۴۷ء سے قبل آزادی ملک کے لئے جد و جہد کی اور حصول آزادی کے بعد قیام امن کے لئے کوشاں ہیں۔ گذشتہ نو سال سے انھیں اقوام متحدہ کی خدمت کا موقع ملا۔ اس عالمی تنظیم میں انھوں نے کامیاب طور پر اپنے ملک کی نمائندگی کی۔ نسلی امتیاز کے خاتمے کے لئے پوری کوشش کی۔ اقوام متحدہ میں ایک سے زاید دفعہ مسز پنڈت نے واضح کیا کہ امن باہمی منافرت کے خاتمے اور پُر امن ذرائع سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے بڑی طاقتوں میں سمجھوتہ ضروری ہے۔ جب مسٹر آئزن ہوور نے دسمبر ۵۳ء میں جنرل اسمبلی کو مخاطب فرمایا تو شریمتی پنڈت نے صدر اسمبلی کی حیثیت سے تجویز فرمایا کہ اسمبلی میں مسٹر ویشنسکی اور دیگر صدور ممالک کی تقاریر سے بین الاقوامی کشیدگی کو کم کیا جا سکتا ہے۔ آپ کو قوی توقع ہے کہ امن عالم اقوام متحدہ ہی کے ذریعے قایم کیا جا سکتا ہے۔ شریمتی پنڈت نے صدر کی حیثیت سے اختلافات کی خلیج کو پاٹنے اور مخالف گروہوں کو سمجھوتے کے قریب لانے کے لئے کامیاب کوشش کی۔

حالات

آپ کا اصل نام "سوارو پ کماری" Swarup Kumari ہے۔ جو بعد میں "وجے لکشمی" ہو گیا۔ لیکن آپ کے قریب ترین رشتہ دار اور وزیر اعظم مسٹر نہرو انھیں سوارو پ ہی کے نام سے پکارتے ہیں۔ عموماً بیشتر سیاست داں خواتین خوبصورت نہیں ہوا کرتیں۔ لیکن شریمتی پنڈت اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں۔ مشہور امریکی ناول نگار پرل بک نے آپ کے حسن کی اس طرح تعریف کی ہے: "سیمیں لہراتے ہوئے بال، بڑی تیز سیاہ آنکھیں، ملایم جلد، خوبصورت چہرہ، نازک ہاتھ، چھوٹے پاؤں، ساری اور سنہری سینڈل نے اس کے سڈول جسم کو نقوش مجسم بنا دیا"۔ یہ ہے ان کی جسمانی ہیئت کا خاکہ۔ لیکن عملاً انسانی فلاح و آزادی کے لئے اُن کے ایثار نے انھیں اپنے ملک میں مقتدر بنا دیا۔ اور ان کا دنیا کے مدبروں کی صف اوّل میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ہے اس خوبرو، خوش پوشاک اور خوش بیان شخصیت کا خاکہ۔

ہندوستان کی اس قابل ترین خاتون نے ۱۸۔ اگست سنہ ۱۹۰۰ء کو فارغ البال و بیدار مغز خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ تعجب ہے بغیر کسی جامعہ میں تعلیم پانے کے یہ اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ آپ کے والد پنڈت موتی لال نہرو کا خیال تھا کہ لڑکیوں کے لئے گھر کی اچھی تعلیم و تربیت کالج کی تعلیم سے بہتر ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے فرزند جواہر لال کو انگلستان بھیجا۔ لیکن دونوں

صاحبزادیوں کو گھر پر قابل اساتذہ کے ذریعے تربیت دی۔ بچپن میں انھیں ہر قسم کی آزادی دی گئی تھی، لیکن وہ سینما نہیں دیکھتی تھیں۔ اس مخصوص گھریلو تربیت ہی کے باعث بچپن ہی سے آپ کے دل میں حب الوطنی و قومی خدمت کے جذبات پیدا ہوئے، جو با وجود تین دفعہ جیل جانے کے سرد نہ ہو سکے۔ موتی لال نہرو کی دلی خواہش کو ان کے لائق فرزند جواہر لال نے کانگریس کی صدارت کا عہدہ حاصل کرکے پورا کر دیا لیکن اس وقت شریمتی پنڈت کو کوئی ایسا موقع نہ ملا۔ موتی لال نہرو کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی لائق صاحبزادی ایک دن ترقی کے آسمان پر سورج بن کر چمکے گی۔ اور دنیا کی قابل ترین خاتون سمجھی جائے گی، اور اقوام متحدہ کے سب سے اہم عہدہ صدارت پر فائز ہوگی۔ شریمتی پنڈت کمسنی میں مسز نائیڈو اور ڈاکٹر اینی بیسنٹ سے بہت متاثر ہوئیں۔ آپ فرماتی ہیں کہ "میں وہ لمحات نہیں بھول سکتی جب کہ میں نے مسز بیسنٹ کی تقریر سنی اور مسز سروجنی نائیڈو تو میرے بچپن کی مثالی خاتون تھیں، مجھے فخر ہے کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔ ان دونوں خواتین نے جو ایک دوسرے سے مختلف تھیں، بچپن میں مجھے متاثر کیا۔"

شادی

نومبر ۱۹۲۰ء میں ہونے والے شوہر رنجیت، ایس پنڈت سے پہلی دفعہ ملاقات کی۔ مسٹر رچرڈ نکسن نائب صدر امریکہ کی طرح مسٹر پنڈت نے پہلی ملاقات میں اس مسئلے کو حل کر لیا۔ مس وجے لکشمی سے اس نوجوان نے کہا کہ "آیا آپ مجھ سے شادی کریں گی۔ میں کئی میل کی مسافت طے کرکے کئی پل پار کرکے آیا ہوں، لیکن ہم مستقبل کا راستہ مل کر طے کریں گے۔" نہ معلوم ہو سکا کہ محترمہ نے اس کا کیا جواب دیا۔ لیکن یہ ملاقات جلد رنگ لائی۔ ۲۱ سال کی عمر میں ۹ مئی ۱۹۲۱ء کو مسٹر رنجیت پنڈت سے شادی ہوئی۔ جن کا انتقال ۱۹۴۴ء میں ہوا۔ آپ کی تین صاحبزادیاں ہیں جو شادی شدہ ہیں۔ آپ کی نواسی پانچ سالہ ہے، جو انھیں بہت عزیز ہے۔

جیل کی زندگی

ہندوستان کی تحریک آزادی میں نہ صرف مردوں اور بچوں نے حصہ لیا بلکہ خواتین تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہیں۔ مسز پنڈت بھارت کی اُن مایۂ ناز خواتین میں سے ہیں جنھوں نے آزادی کی خاطر جیل کی ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کیں۔ لیکن کانگریس کی تحریک سول نافرمانی میں حصہ لینے کے باعث تین دفعہ گرفتاری عمل میں آئی۔ پہلی دفعہ انھیں ۲۶ جنوری ۱۹۳۲ء میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس وقت ایک سال تین ماہ کی سزا بھگتنی پڑی۔ اس وقت ان کی چھوٹی لڑکی صرف ۲½ سال کی تھی، اس لئے انھیں سخت پریشانی اٹھانی پڑی۔ ایک طرف اولاد کی محبت اور دوسرے وطن کی محبت تھی۔ مسز پنڈت نے وطن کی محبت کو زیادہ عزیز سمجھا۔ جس کا ثبوت انھوں نے جیل جا کر دیا۔ دوسری دفعہ ۶ ماہ اور پھر آخری مرتبہ ۱۱ ماہ کے لیے جیل گئیں۔ جیل کی زندگی ان کے لئے پریشان کن اور ساتھ ہی ساتھ دلچسپ بھی تھی۔ یہاں انھیں وہ سب کچھ کام کرنا پڑا جو انھیں گھر پر کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ جیل کی زندگی نے آپ کی زندگی پر اثر ڈالا۔ جیل کی زندگی کے تجربات کے متعلق ان کی ایک کتاب ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھی جس کا عنوان ہے Prison Days

سیاسیات میں حصہ

آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جبکہ آپ ۱۹۳۷ء میں یو پی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں، اس وقت انھوں نے بتلا دیا کہ "آپ مجھ سے بخوبی واقف ہیں اور میری پارٹی کے اصولوں سے بھی۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے مفاد میرے ہاتھوں میں محفوظ رہیں گے تو مجھے ووٹ دیجیے۔" اس صاف بیانی کا عوام پر بہت اچھا اثر ہوا، اور انھوں نے بلا تامل انھیں اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ عام انتخابات کے وقت انھیں نئی مصیبت پیش آئی، انھیں دیہی آبادی سے ربط رکھنا پڑا۔ ۱۹۳۵ء میں میونسپل بورڈ آف الہ آباد کی تعلیمی کمیٹی کی دو سال کے لئے صدر منتخب کی گئیں۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء تک انجمن کل ہند خواتین کی صدر رہ چکی ہیں۔ بین الاقوامی لیگ برائے امن و آزادی کی نائب بھی تھیں۔ دسمبر ۱۹۴۴ء میں انٹرنیشنل پیسیفک ریلیشنز کانفرنس میں ہندوستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے شریک رہیں جس کا انعقاد ورجینیا۔ امریکہ میں عمل میں آیا تھا۔ ہندوستانی کونسل برائے عالمی امور (انڈین کونسل آف ورلڈ افیئرس)

کی جانب سے امریکہ کے دورے میں انھوں نے وفد کی قیادت کی۔شریمتی پنڈت سان فرانسسکو کانفرنس میں موجود تھیں جبکہ ۵۰ اقوام کے نمائندوں نے منشور اقوام متحدہ پر دستخط کئے تھے۔آپ نے ہندوستان کے مقدمے کو اقوام عالم، انڈیا لیگ آف امریکہ اور قومی کمیٹی برائے آزادی کے سامنے غیر سرکاری حیثیت سے پیش کیا۔

وزیر صحت و حکومت مقامی یوپی

مسز وجے لکشمی پنڈت پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جنھیں وزیر بنایا گیا۔ ۱۸ر جولائی ۱۹۳۷ء کو وزیر صحت و حکومت مقامی کا چارج لیا۔پنڈت گوبند ولبھ پنڈت نے تار دیا کہ وزارت میں آپ کو شریک کیا گیا ہے۔ آپ وزیر بننا نہیں چاہتی تھیں، لیکن مشکل یہ تھی کہ پارٹی کی مرضی کو ٹھکرا نہ سکتی تھیں۔ وزارت کے لئے انتخاب خود ان کے لئے باعث تعجب تھا۔لیکن آپ کے سوائے کوئی اور خاتون موزوں نہ تھیں۔آپ کے تقرر کا صحافت نے پرجوش خیر مقدم کیا۔شریمتی پنڈت نے اپنے عہدِ وزارت میں یہ ثابت کردکھایا کہ ہندوستانی عورت ایک کامیاب وزیر بھی بن سکتی ہے۔آپ کا دور وزارت کامیاب رہا اور ساتھ ہی ساتھ بہت ہی دلچسپ بھی۔اس کا تفصیلی حال ان کی کتاب So I became A Minister میں ملتا ہے جس کی اشاعت ۱۹۳۹ء میں عمل میں آئی۔آپ یوپی مقننہ کی دوبارہ رکن منتخب ہوئیں۔انھیں وزیر کی حیثیت سے برقرار رکھا گیا۔

ہندوستانی سفیر برائے روس

آزادی کے حصول کے بعد بھارت نے تقریباً ۶۵ ممالک سے سفارتی تعلقات قائم کرلئے۔لیکن امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین سے تعلقات کی استواری کے لئے غیر معمولی قابل افراد کی شدید ضرورت تھی۔ وزیر اعظم نہرو نے روس میں ہندوستان کی پہلی سفیر کی حیثیت سے ان کا تقرر کیا۔آپ دو سال اس خدمت پر فائز رہیں۔آپ کی ماسکو سے واپسی پر ڈاکٹر رادھا کرشنن کو سفیر بنایا گیا۔

امریکہ میں ہندوستانی سفیر کی حیثیت سے

شریمتی وجے لکشمی پنڈت کا امریکہ سے گہرا تعلق رہا ہے۔سابق میں کئی مرتبہ اس ملک کے عوام کے سامنے انھوں نے اپنے ملک کے مقدمے کو واضح طور پر پیش کیا جس کا اچھا اثر پڑا۔آپ نے اپنی تقاریر سے نہ صرف ہندوستان کی جدوجہد کے متعلق شکوک دور کئے، بلکہ امریکہ میں خاص مقام پیدا کرلیا۔اس وقت امریکی عوام پر مسٹر نہرو اور آپ کا سب سے زیادہ اثر ہے۔آپ کا دور سفارت ہند و امریکہ کی تاریخ میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔اس لئے کہ وزیر اعظم نہرو نے صدر ٹرومن کی دعوت پر امریکہ کا سرکاری دورہ کیا، اور اسی سال امریکہ نے ہندوستان میں غذائی قلت کو دور کرنے کے لئے بیس لاکھ ٹن غلہ نصف قرضہ اور نصف تحفے کے طور پر دیا۔آپ کے دور سفارت کے یہ دو اہم واقعات ہیں۔محترمہ نے سفیر کی حیثیت سے کوشش کی کہ کوئی ایسی بات پیدا نہ ہو جس سے دونوں ممالک کے تعلقات خراب ہوں۔اس لئے کہ آپ کا خیال ہے کہ ہند و امریکہ ایک مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کی طرز فکر بھی مشترک ہے۔

مختلف تعلیمی ادارے آپ کے خیالات سے متاثر ہوئے۔چنانچہ ستا امریکی جامعات کی جانب سے اعزازی ڈگریاں عطا کی گئیں۔ان کے علاوہ کئی قومی تنظیموں کی جانب سے عوامی خدمات کے اعتراف میں تمغہ جات پیش کئے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں Women's International Exposition New York نے انھیں غیر معمولی خاتون قرار دیا۔شریمتی پنڈت نے امریکہ میں دو سال میں وہ سب کچھ ممکن کر دکھایا جو مشکل تھا اور اپنے جانشینوں کے لئے اچھے مواقع فراہم کئے۔شریمتی پنڈت کا شمار ہندوستان کے کامیاب سفراء میں کیا جاتا ہے۔جن کی ذاتی قابلیت کے باعث ملک کا وقار بلند ہوا۔شریمتی وجے لکشمی پنڈت ہند کی واحد سفیر ہیں جنھوں نے سفارت جیسی اہم خدمت کو کامیابی سے انجام دے کر یہ ثابت کردکھایا ہے کہ مشرق کی عورت میدانِ سیاست میں مغرب سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہے۔

چین کا دورہ

چینی ثقافتی وفد نے مسٹر ٹی سی لنگ کے زیر قیادت ہندوستان کا دورہ کیا جس سے تعلقات کے استحکام میں مدد ملی۔چینی عوامی جمہوریہ کی حکومت نے حکومت ہند سے درخواست کی کہ وہ اپنا ایک ثقافتی وفد چین بھیجے، تاکہ ثقافتی تعلقات کو اور ترقی دی جاسکے۔اس کام کے لئے

پھر شریمتی پنڈت کی خدمات حاصل کی گئیں۔ وفد کے ارکان کی تعداد ۸ تھی۔

اقوام متحدہ میں نمایندگی

شریمتی وجے لکشمی پنڈت کا شمار اقوام متحدہ کے صف اول کے سیاستدانوں میں کیا جاتا ہے۔ آپ کا اقوام متحدہ سے ۱۹۴۶ء ہی سے تعلق رہا ہے۔ جنرل اسمبلی کے پہلے اجلاس میں ہندوستانی وفد کی قیادت کے فرائض آپ ہی نے انجام دیئے۔ وفد میں کئی قابل ارکان تھے۔ جن میں نواب علی یاور جنگ بہادر، راجہ مہاراج سنگھ، مسٹر سی چھاگلا، مسٹر فرانک انتھونی شامل تھے۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۴۶ء کو اسمبلی کے دوسرے اجلاس کا آغاز ہوا۔ آپ کا ہندوستانی وفد کے قاید کی حیثیت سے انتخاب کیا گیا۔ تیسری دفعہ آپ مجلس عمومی کے تیسرے سالانہ اجلاس منعقدہ پیرس میں ہندوستانی وفد برائے اقوام متحدہ کے قاید کی حیثیت سے شریک ہوئیں۔ اس اجلاس میں شریمتی پنڈت نے جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں سے غیر انسانی سلوک کے خاتمے کے لئے اسمبلی سے رجوع کیا۔ آپ نے کہا کہ یہ جنوبی افریقہ کا داخلی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اس نے اقوام متحدہ کے منشور کی خلاف ورزی کی ہے، اور ساتھ ہی یہ انسانی حقوق کے اعلان نامے کے خلاف بھی ہے۔ محترمہ نے زور دیا کہ اس کے روکنے کے لئے اقوام متحدہ سخت کارروائی کرے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آج تک اقوام متحدہ نے شریمتی پنڈت کے اس حق بجانب و انسانی و قانونی مطالبے کو پورا کرنے کے لئے ٹھوس اقدام نہیں کیا، جس کے باعث لاکھوں ہندوستانیوں کا مستقبل خطرے میں ہے۔

۱۹۵۲ء کے بعد مسٹر بی این راؤ نے اقوام متحدہ میں ہندوستان کی نمایندگی کی، اس لئے آپ اقوام متحدہ سے کچھ مدت کے لئے دور رہیں۔ لیکن جب ہندوستانی مستقل مندوب برائے اقوام متحدہ مسٹر بینگل نرسنگ راؤ کا بین الاقوامی عدالت انصاف کے جج کی حیثیت سے انتخاب کیا گیا تو ہندوستانی وفد کی قیادت کے لئے نئے قاید کا انتخاب ضروری تھا، حکومت نے شریمتی پنڈت ہی سے درخواست کی کہ قیادت کے نئے فرایض سنبھال لیں۔ اس لئے جنرل اسمبلی کے ساتویں اجلاس میں جس کا آغاز نیویارک میں ۱۵ ستمبر ۱۹۵۳ء کو ہوا، تو شریمتی پنڈت نے اپنے ملک کے وفد کی قیادت کی۔ اس وقت کئی مشہور افراد کو ارکان کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا جن میں مسٹر وی کے کرشنا مینن سابق ہندوستانی ہائی کمشنر برائے برطانیہ، مسٹر بی کے چندا نائب وزیر خارجہ، مسٹر راجیشور دیال ہندوستانی مستقل مندوب برائے اقوام متحدہ، اور مسٹر بی شیوا راؤ رکن پارلیمان بھی تھے۔ اس اجلاس میں ہندوستان نے ایک قرارداد کوریائی اسیران جنگ سے متعلق پیش کی، جس کی ۵۴ ممالک نے تائید اور روس اور اس کے ہمنوا ممالک نے مخالفت کی۔ لیکن قرارداد منظور ہو گئی۔ ستمبر ۱۹۵۳ء کے حالیہ اجلاس میں بھی شریمتی وجے لکشمی پنڈت کو قاید مقرر کیا گیا تھا، لیکن جنرل اسمبلی کی صدارت پر انتخاب کے باعث مسٹر کرشنا مینن نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔

مایۂ ناز خاتون

شریمتی پنڈت عہد حاضر کی مایۂ ناز خواتین میں سے ہیں۔ آپ کی ہر دلعزیزی کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جنوری ۱۹۵۴ء کو ڈاکٹر گیلپ ناظم ادارہ رائے عامہ امریکہ نے اعلان کیا کہ ان کا نام ان دس عورتوں میں شامل ہے جنھیں امریکی خواتین بہت زیادہ پسند کرتی ہیں۔ آپ کا نام تیسرے نمبر پر ہے۔ اول مسز روزویلٹ، دوسری مسز آیزن ہوور اور تیسری شریمتی پنڈت (صدر اسمبلی) اور چوتھی ملکہ الزبتھ ہیں۔ جنرل اسمبلی کی آٹھویں صدر نے اپنے ترقی پسندانہ نظریات کے باعث کافی شہرت حاصل کر لی ہے۔

وہ چاہتی ہیں کہ خواتین کو زندگی کے ہر شعبے میں کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ انھیں تعلیمی سہولتیں عطا کی جائیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بوڑھی عورتوں کی مرضی سے ہر کام کرنا چاہیئے، محترمہ اسے سخت ناپسند فرماتی ہیں۔ انھیں شکایت ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ بھی اس خیال کے حامی ہیں۔ کانگریس تحریک کی ابتدا میں خواتین کو سیاسیات سے دلچسپی نہ تھی۔ شریمتی پنڈت نے عملی سیاسیات میں حصہ لیا اور جیل گئیں۔ محترمہ خواتین کی فلاح کے لئے بھی ہمیشہ کام کرتی رہیں، اس لئے کہ انھیں اپنی جنس سے گہری ہمدردی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ محسوس کرتی ہیں کہ خواتین ہر کام نہیں کر سکتیں۔ مثلاً پیشہ صحافت کے لئے قطعاً موزوں نہیں —— لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق آپ کی رائے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا، فرماتی ہیں: "ہم لڑکے اور لڑکی دونوں کو تعلیم دیتے ہیں، فرق یہ ہے کہ

لڑکے کو گھر سے باہر تحصیل علم کا موقع ملتا ہے، اس کے خلاف لڑکی کچھ بھی نہیں پڑھتی۔ اس طرح ہم اپنی لڑکیوں کو بے ایمانی اور ریاکاری سکھاتے ہیں اور وہ تمام ناپسندیدہ حرکات جنھیں نسوانی فریب سے موسوم کیا جاتا ہے، سکھائے جاتے ہیں۔ آپ کی نظر میں ہندوستان کی پستی کا سبب خواتین کی عدم ترقی ہے۔" محترمہ خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لئے ہمیشہ لڑتی رہیں، جو بالکل فطری ہے۔ ہندوستانی عورت گھر کی دیوی ہے۔ یہاں بچے اور خصوصاً لڑکے کو جنم دینا عورت کی زندگی کا اصل مقصد سمجھا جاتا ہے۔" لیکن آپ نے دنیا پر واضح کر دیا کہ "تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے لئے عورت مرد کی طرح ضروری ہے۔"

پہلی خاتون صدر جنرل اسمبلی کی حیثیت سے

جنرل اسمبلی کا آٹھواں اجلاس ۱۵ ستمبر ۱۹۵۳ء کو نیویارک میں شروع ہوا۔ صدارت کے لئے دو امیدوار تھے، ایک ہندوستان کی شریمتی وجے لکشمی پنڈت اور دوسرے سیام کے شہزادہ وان۔ حکومت پاکستان نے حکومت ہند کو مطلع کیا تھا کہ وہ اسمبلی کی صدارت کے لئے محترمہ کی پُر زور تائید کرے گی۔ امریکہ نے جس کا اقوام متحدہ پر سب سے زیادہ اثر ہے شریمتی پنڈت کی تائید کا اعلان کیا تھا۔ یہ تائید متوقع تھی، اس لئے کہ آپ ایک عرصے تک امریکہ میں ہندوستانی سفیر کی خدمت پر فائز رہ چکی ہیں، اور اپنی زندگی کے اہم ترین سال امریکہ میں گزار چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ نے "لکشمی" کی کامل تائید کی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ امریکہ ہندوستان کی مسلسل مخالفت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ انڈونیشیائی وفد برائے اقوام متحدہ کے قائد ڈاکٹر ابوحنیفہ نے فرمایا تھا کہ "انڈونیشیا جنرل اسمبلی کی صدارت کے لئے شریمتی پنڈت کی تائید کرے گا۔" اسلامی ممالک میں افغانستان اور مصر نے پہلے ہی حمایت کا اعلان کیا تھا۔ شریمتی پنڈت پہلی خاتون ہیں جن کے انتخاب کا تمام بڑی طاقتوں نے خیر مقدم کیا، روس امریکہ، برطانیہ، فرانس، دولت عامہ کے ممالک، ایشیائی ممالک وغیرہ نے آپ کے انتخاب پر خوشنودی کا اظہار کیا، جب رائے شماری ہوئی تو شریمتی پنڈت (ہندوستان) کو ۳۷ اور پرنس وان کو ۲۲ آرا ملیں۔ اس طرح انھیں اسمبلی کا آٹھواں صدر منتخب کیا گیا۔ آپ نے مسٹر پیرسن صدر اسمبلی (کنیڈا) سے چارج لیا۔ آپ پہلی خاتون اور ہندوستانی نمائندہ اور تیسری ایشیائی ہیں جنھیں اس عظیم المرتبت عہدے کے لئے منتخب کیا گیا۔ آپ تاریخ عالم میں پہلی مایہ ناز خاتون ہیں جو اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئیں۔ شریمتی پنڈت کا صدر جنرل اسمبلی کی حیثیت سے انتخاب نہ صرف ہندوستان کے ۳۶ کروڑ عوام کے لئے باعث فخر ہے، بلکہ صنف نازک کے لئے یہ سب سے بڑا اعزاز ہے۔ صدارت پر انتخاب کے فوری بعد تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا "مجھے منتخب کر کے آپ نے میرے ملک کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور میری اس خواہش کو تسلیم کر لیا کہ اقوام متحدہ کے مقاصد کو پورا کیا جائے۔ میرا مقصد اقوام متحدہ کو کامیاب بنانا ہے۔" میرے انتخاب کے معنی اس عظیم تنظیم کے کاموں میں خواتین کے حصے کو تسلیم کرنے کے ہیں۔ میری پوری سیاسی تربیت نے مجھے درس دیا ہے کہ اپنے آپ کا ایک فرد کے طور پر جائزہ لوں نہ کہ صرف ایک خاتون کی حیثیت سے۔ اس لئے کہ اقوام متحدہ کا منشور انسانوں کے لئے ہے نہ کہ مردوں اور عورتوں کے لئے۔" اقوام متحدہ کی اس عظیم خاتون کا مقصد زندگی انسانیت کی خدمت ہے۔ صدر اسمبلی ارشاد فرماتی ہیں کہ "سیاسیات میرے ملک میں اپنے آپ کو ترقی دینے کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ ایک قسم کی اعلیٰ قومی خدمت ہے۔ گاندھی جی کے نظریے کے مطابق سیاستدان صحیح عوامی خادم ہیں۔"

جنرل اسمبلی کی صدارت پر شریمتی پنڈت کے انتخاب کا دنیا کے تقریباً ہر اخبار نے خیر مقدم کیا۔ حتیٰ کہ جنوبی افریقہ کے اخبار "جوہنسبرگ ٹائمز" نے بھی۔ امریکہ کے اخبار "دی کرسچین سنچری" نے صدر کی حیثیت سے آپ کے کام کا جائزہ لینے کے بعد لکھا کہ "آپ جنرل اسمبلی کی کارروائی اس قدر آرام و اطمینان و آسانی سے انجام دیتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عورت کے لئے ایسے برگزیدہ عہدے پر فائز ہونا ایک معمولی سی بات ہے۔ اگرچہ اس عہدے پر اس سے پہلے کوئی عورت متمکن نہیں ہوئی ہے اور عورت بھی وہ جو ایشیا سے آ رہی ہے۔ جہاں ابھی پچھلے دنوں تک خواتین عوامی کاموں میں حصہ نہیں لیتی تھیں۔"

صدر جنرل اسمبلی کا اقوام متحدہ پر کامل یقین ہے، وہ فرماتی ہیں کہ "دنیا کو باہمی منافرت اور آنے والی تباہی سے نجات دلائی جا سکے۔ میں یقین رکھتی ہوں کہ ادارہ اقوام متحدہ اس نہایت اہم کام کو پایۂ تکمیل

تک پہنچانے کی امید دلاتا ہے، چونکہ میرا اس ادارے پر اعتقاد ہے۔ اس لئے میں اس کے لئے اپنی تمام قوت، وقت اور قابلیت وقف کئے ہوئے ہوں"

خاتون صدر موجودہ بین الاقوامی کشیدگی کو دور کرنے اور سرد جنگ کے خاتمے کی حامی ہیں۔ آپ فرماتی ہیں کہ "ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ممالک دنیا کے موجودہ کھنچاؤ اور الگ الگ مسلح کیمپوں کو آپس میں ملانے اور مصلحت کرانے میں اہم حصہ لے سکتے ہیں — جمہوریت کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ جو دیواریں لوگوں کے درمیان حائل ہیں انھیں ایک دوسرے سے الگ رکھتی ہیں اور باہمی مفاہمت میں رکاوٹ ڈالتی ہیں انھیں گرا دینا چاہیئے، افراد کی قدر و قیمت اور جمہوریت کے اصولوں پر کاربند رہتے ہیں۔ ہندوستان بلاشبہ مغرب کے ساتھ ہے۔ لیکن ہمیں سچی جمہوریت خود بھی حاصل کرنا چاہیئے"

ایشیائی ممالک کو مسز وجے لکشمی پنڈت کے انتخاب سے جو خوشی حاصل ہوئی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ اس کے اندازے کے لئے یہ بیان کرنا کافی ہے کہ انتخاب کے فوری بعد سیلون، برما، آسٹریلیا و نیوزی لینڈ و انڈونیشیا کے وزرا ءاعظم نے انھیں اپنے ممالک کا دورہ کرنے کی درخواست کی۔ آپ متعدد ممالک کا دورہ فرما بھی چکی ہیں۔ حال ہی میں آپ یوگوسلاویہ تشریف لے گئی تھیں۔ مارشل ٹیٹو سے آپ کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ وہاں آپ کا بڑی فراخ دلی سے خیر مقدم کیا گیا تھا۔ محترمہ ایک نہایت ہی خلیق، ذہین اور مقبولِ خواص و عوام خاتون ہیں۔ ایشیا کو ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں صنفِ نازک کو بالخصوص اور نسلِ آدم کو بالعموم آپ پر فخر کرنا چاہیئے۔

تحریک بھودان کی غرض و غایت

ریاست اڑیسہ کے ایک دور افتادہ گاؤں مانپور کے لوگوں نے زندگی کے ایک نئے دور میں قدم رکھا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ اس گاؤں کے باشندوں میں کوئی زمیندار تھا اور کوئی زمین کی ملکیت سے قطعاً محروم لیکن اب وہاں نقشہ بدل چکا ہے اور گاؤں کے ہر شخص کے پاس اپنی زمین ہے — دوبارہ تقسیم شدہ زمین میں سے ۵۰ ایکڑ زمین امداد باہمی کے طریقے پر کھیتی باڑی کے لئے مخصوص رکھی گئی ہے۔ اس زمین کی آمدنی مالیے کے ادا کرنے اور گاؤں کی ترقی کے پروگرام پر صرف کی جائے گی۔

اس پر امن انقلاب کی تاریخ ۱۹۵۲ء سے شروع ہوئی ہے جبکہ شری ونوبابھاوے نے اس گاؤں کی دھرتی پر قدم رکھا۔ انھوں نے یہ نعرہ بلند کیا کہ "زمین پرماتما کی ملکیت ہے"۔ انھوں نے زمین کے مالکوں کو تلقین کی کہ وہ اپنی زمین کا کچھ حصہ ان لوگوں میں بانٹ دیں جو بے زمین ہیں۔ ایک سو چودہ ہریجن کنبوں پر مشتمل گاؤں کی تمام آبادی نے اس کرم یوگی کی آواز کو لبیک کہا اور چھ سو ایکڑ قابلِ کاشت زمین تحریک بھودان کے لئے بطور دان پیش کر دی۔ حال ہی میں گاؤں کے ہر شخص اور ہر کنبے کی ضروریات کا جائزہ لینے کے بعد یہ زمین انھیں واپس کر دی گئی ہے۔

تحریک بھودان کے ذریعے زیادہ سے زیادہ دیہات میں جس طرح پر امن انقلاب لایا جا رہا ہے یہ اس کی ایک مثال ہے۔ اب نہ صرف زمین بلکہ دیگر قسم کی جائداد بھی لوگوں کی امداد کے لئے بطور دان پیش کی جا رہی ہے۔

ونوبابھاوے اور ان کے ساتھی اتر پردیش، بہار، حیدرآباد، اور اڑیسہ وغیرہ کی ریاستوں میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے تقریباً ۳۳ لاکھ ایکڑ یعنی عرصہ تین سال کے لئے مقررہ حد سے بھی آٹھ لاکھ ایکڑ زیادہ زمین جمع کر چکے ہیں۔ اس تحریک کا آغاز تلنگانہ (حیدرآباد) سے کیا گیا تھا جہاں کچھ لوگوں نے زبردستی زمینداروں سے زمینیں چھین لی تھیں۔ اس علاقے میں پر امن انقلاب لانے کی یہ تحریک بہت مقبول ہوئی اور تقریباً پینتیس ہزار ایکڑ زمین جمع کی گئی۔ یہ زمین حاجتمندوں میں تقسیم کی گئی۔ اس طرح پیار اور محبت کے طریقے نے نفرت و تشدد پر فتح پائی اور اس علاقے میں پھر سے امن و امان قایم ہو گیا — "تحریک بھودان" کے کارکن گھر گھر جا کر یہ پیغام پہنچاتے ہیں کہ "ہم سب ایک ہی کنبے کے افراد ہیں۔ اس لئے ہم سب کو بانٹ کر کھانا چاہیئے"۔ اس طرح وہ لوگوں کو مساوات و مشترکہ زندگی بسر کرنے کے اصولوں سے آگاہ کرتے ہیں اور لوگوں کی طرف سے انھیں زمین یا روپے پیسے کی صورت میں جو کچھ بطور دان دیا جاتا ہے وہ اسے اسی گاؤں کے لوگوں میں بانٹ دیتے ہیں اور اس تقسیم کا ایک بڑا حصہ گاؤں کے بے زمین و غریب مزارعوں کے حصے میں آتا ہے۔

عبدالمجید حیرت

غزل

اِس طرح کون مِلا، ہم سے گنہگاروں سے
جس طرح پھول کو وابستہ رہا خاروں سے

گفتگوئے غمِ دل سنگدلوں سے بیکار
سر کو ٹکرانے سے کیا فائدہ دیواروں سے

ایک دو دن کی علالت ہو تو پوچھے کوئی
باخبر کون رہے روز کے بیماروں سے

سادگی اور حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں
کرم و رحم کی اُمید ستم گاروں سے

جب ہمیں عقل کے پھندوں سے نہیں ہیں آزاد
کیا کہیں رسم و روایت کے پرستاروں سے

سازِ شائستہ سے ہوتا ہے ترنّم پیدا
نغمہ ممکن ہی نہیں ٹوٹے ہوئے تاروں سے

آدمیّت کا تصوّر ہی غلط ہو جائے
کام لیں ہم بھی اگر آپ کے معیاروں سے

کون ہے پیکرِ اخلاص و وفا، کون نہیں
تجربہ یہ تو ہوا نام کے غمخواروں سے

حیرتِ زار کا آزار وُہی سمجھیں گے
کھیلنا جن کو پڑا ہو کبھی انگاروں سے

فیّاض ہریانوی

یادِ عہدِ شباب

رنگ و بو بھی وہی گُل و مُل میں
پیچ و خم بھی وہی ہیں سنبل میں
وہی سوزاں پپیہے کی لَے ہے
وہی آتش نوائے بلبل میں
قہقہے ہیں وہی صراحی کے
وہی مستی بھری ہے قلقل میں
میرا وہ شوق وہ شباب نہیں
میرے شیشے میں وہ شراب نہیں

مہرِ خاور میں آب و تاب وُہی
ماہ کا حسنِ لاجواب وُہی
میکدے میں شرابِ ناب وُہی
تلخی و مستیٔ شراب وُہی
وُہی پُرسوز زمزمے نَے کے
کششِ نغمۂ رباب وُہی
وُہی جلوے ہیں ماہ پاروں کے
مدبھرے جلوے کی شراب وُہی
خضر کی بھی وُہی ہے عمرِ دراز
چشمۂ زندگی میں آب وُہی
وُہی چمکیلے ذرّے صحرا میں
گلکدے میں گلِ گلاب وُہی
نثر کے عرش پہ وُہی تارے
نظم کے شعر پر شباب وُہی
وہ مرا شوق وہ شباب نہیں
میرے شیشے میں وہ شراب نہیں

روزِ روشن، اندھیری رات وُہی
دلرُبا شاہدِ حیات وُہی
وُہی نور و ظہورِ عیدِ سعید
خندہ ہائے شبِ برات وُہی
پالیسی میں وُہی دلآویزی
سحر سازِ سیاسیات وُہی
وُہی لذّت ہے شہدِ خالص میں
لطف و شیرینیٔ نبات وُہی
وہی گنگ و جمن کا آبِ رواں
موجۂ دجلہ و فرات وُہی
وُہی بندوں میں بندگی کا نشاں
وُہی معبود، حق کی ذات وُہی
وُہی بُت ہیں حریمِ ہستی میں
لات و عُزّیٰ وہی، منات وُہی
وُہ مرا شوق، وُہ شباب نہیں
میرے شیشے میں وہ شراب نہیں

نذیر رحمانی

ایک خط

کیوں کس خطا پہ روٹھ گئی چشمِ التفات
یہ کب کا انتقام لیا مجھ غریب سے

یادش بخیر! ایک مدت میں تکلیف فرمائی، نصیبِ دشمناں طبیعت تو ناساز نہیں، کیوں چپ کس لیے ہو گئے ؟

کچھ تو کہو زباں سے ہاں نہ سہی نہیں سہی

مگر جانتی ہوں، اب تم کچھ نہ بولو گے، انسان کی قوتِ گویائی اس وقت سلب ہو جاتی ہے جب اس کا ایمان، اس کا ضمیر، اور اس کا کردار کسی آلودگی سے ملوث ہو، کیوں آنسوؤں کے بجائے پیشانی پر یہ پسینے کے قطرے کیسے ؟ پہلے تو تم گھنٹوں یہاں بیٹھ کر رو دیتے تھے، آج تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ بھی مجھ کو معلوم ہے۔ تم پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہو، رمضان شریف میں تیس دن کے روزے بھی رکھتے ہو۔ مذہبی آدمیوں سے بھی تمھاری راہ رسم ہے، اس لئے مجھے یقین ہے کہ جسم و جان کے مٹ جانے کے بعد بھی روح کے ربط باہمی کو تم ضرور مانتے ہو گے۔ اس لئے کہتی ہوں کہ آج تم اتنی جلد نہ جاؤ اور سنو جو کچھ میں کہتی ہوں۔

تم اِن دنوں جس تگ و دو میں مصروف ہو مجھ سے پوشیدہ نہیں لیکن میں تم کو یقین دلاتی ہوں کہ اس کی مجھے ذرا پروا نہیں، دُکھ صرف اتنا ہے کہ تم جہاں جاتے ہو کہتے ہو کہ یہ بے ماں کا بچّہ ہے۔ اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی، روٹی پانی کی مصیبت سے مجبور ہو کر چاہتا ہوں کہ کوئی اللہ کی بندی راضی ہو جائے۔ ہائے اس درجہ سفید جھوٹ اور اس دیدہ دلیری کے ساتھ۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی کہتی ہوں کہ مطلب کی بات حیلے حوالے سے نہ کہا کرو۔ اظہار مدّعا کے لئے پردوں اور بہانوں کو حائل کرنے سے فائدہ! صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ میں جوان ہوں، تندرست ہوں، رومان پسند ہوں اور اسی کے ساتھ ساتھ صورت شکل کا بھی برا نہیں اور اس سب کو کام میں لانے کے لئے مجھے ایک عورت کی ضرورت ہے۔ آخر اس سیدھی سادی بات کو کیوں چھپاتے ہو کہ برسات کی طویل مگر خوشگوار راتیں تنہائی کی وجہ سے بھیانک و وحشت ناک معلوم ہوتی ہیں، دن کی روشنی عورت کے بغیر تاریک نظر آتی ہے، کیوں، کیا برا مان گئے۔ سچی بات کہنے سے جس طرح تم خوش ہوتے ہو اسی طرح سچی بات سننے میں بھی ہمت جرأت اور بلند نظری کا ثبوت دو، اور اس حقیقت کو تسلیم کرو کہ ایک سال کی معمولی مدت تمھارے لئے ناقابل برداشت ہو گئی ہے، اور اب تم زیادہ صبر نہیں کر سکتے۔ اسی لئے کوشش کر رہے ہو کہ جس طرح ہو، جہاں کہیں ہو اور جس قدر جلد ممکن ہو ایک عورت کا خوبصورت اور حسین جسم تمھارے قبضہ و قدرت میں آ جائے، اور میری موت سے جو کمی پیدا ہو گئی ہے وہ پوری ہو جائے۔ ہاں مجھے معلوم ہے کہ راتوں کو تم بے قرار رہتے ہو اور دن کو پریشان حال پھرتے ہو، لیکن یاد رکھو: مایوسی اور بد دلی کو پاس نہ آنے دینا، اپنے جذبۂ جستجو کو برابر مہمیز کرتے رہنا، جو جتنا زیادہ مصروفِ تلاش رہتا ہے اتنا ہی اچھا سودا اسے ملتا ہے۔ تم نے بحرِ حسن و جمال کے جن جن ساحلوں پر اپنے انتخاب کا جال بچھایا ہے وہ ہر طرح ٹھیک ہے، کہیں نہ کہیں کوئی مچھلی ضرور پھنسے گی اور تمھارے دسترخوان کے لئے ہر طرح بہتر مفید اور مناسب ہو گی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ اس مرتبہ تم ایسی بیوی چاہتے ہو جو تمھاری نظموں کی تعریفیں کرے۔ تمھارے مضمونوں کو پسند کرے اور ذہن و ذکاوت کی داد دے۔ اس جمہوریت و مساوات کے زمانے میں بھی تمھارے احساسات و جذبات کا احترام کرے۔ تمھاری ناز برداری و خدمت گزاری اپنے سے زیادہ مقدّم سمجھے۔ تمھاری ہر بات بلا حیل و حجت تسلیم کرلے تم دن کو کہو رات تو وہ کہے ہاں! آسمان پر تارے بھی دکھائی دے رہے۔ تم گھبراتے

کیوں ہو، کسی کی محنت رائگاں نہیں جاتی۔ تمھیں ایسی بیوی ضرور مل جائے گی، اور پھر تم اسے آسانی و خوشی سے اپنے گھر کی رانی اور دل کی ملکہ بنا سکو گے۔

مجھے پورا بھروسہ ہے کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے لیکن میں کہتی ہوں کہ آخر اس طرح تم کیا تیر مار دو گے؟ زیادہ سے زیادہ دو چار اندھے لنگڑے لولے، بچّے پیدا کر لو گے، اور بس! پھر یہ بچّے، غریب و مفلس ہندوستان کی پیٹھ پر بوجھ بنے سسکتے رہیں گے، کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تمھاری آمدنی اتنی نہیں ہے کہ تم انھیں اعلیٰ تعلیم دلا سکو، اچھی تربیت دلوا کر سوسائٹی میں کوئی بلند مقام عطا کر سکو۔ تم مرد ہو۔ مرد ویسے ہی عقلمند ہوتے ہیں، پھر تم تو عقلمندی کے میدان میں دس سوا دس ہاتھ آگے ہی ہو۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ اتنی سی بات تمھاری سمجھ میں نہ آسکی کہ پہلی بیوی کا بچّہ دوسری بیوی کے لئے کبھی قابلِ التفات اور موجبِ توجہ نہیں بن سکتا۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ ایک شوہر لاکھ اپنی بیوی سے کہے کہ یہ بچّہ مرحومہ کی آخری نشانی ہے، اس کا ہر طرح خیال رکھنا، اس کی دلجوئی کرنا، اسے ہر طرح آرام پہنچانا، لیکن وہ تمھاری کسی ایک بات کو نہیں مان سکتی، اور نہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ دوسرے کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھے۔ میں تو یہاں تک کہتی ہوں کہ اگر کوئی شوہر شادی کی پہلی رات کو ہی سب سے پہلے اپنی بیوی سے کہے کہ مجھ سے زیادہ اس بچّے کا خیال رکھنا جس کی خاطر میں نے تم سے شادی کی ہے، تو صبح ہوتے ہی وہ سب کچھ بھول جائے گی اور وہی طرزِ عمل روا رکھے گی جو سوکن کی اولاد کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ کیوں، کیا اس میں تمھیں کچھ شک ہے۔ اگر دن کی روشنی میں آفتاب کے وجود سے تم انکار کرو تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ ہاں اتنا کہہ سکتی ہوں کہ تم جذبۂ رشک و رقابت سے ابھی واقف نہیں۔ اس آگ سے وہی خوب واقف ہوتے ہیں جو اس میں جلتے ہیں۔ ہائے عورت کا دل۔ میں پھر وہی کہوں گی کہ تم خاک نہیں سمجھ سکے۔ جگر کا شعر کیا تم نے نہیں سنا۔

شیشۂ دل وہ نازک ہستی ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا!
اُس پہ کسی کے ظلم و ستم کی مشقِ سیاست کیا کیجئے

سنو! میرے بچّے کا تمھاری بیوی کے آغوش پرورش میں سکون و یکسوئی پانا، راحت و آرام حاصل کرنا یا سکھ اور چین کی نیند سونا، یہ ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر مل ہی نہیں سکتی۔ تم اسے جیتے جی نفرت و لغاوت، دشمنی و دل آزاری کی گہری و تاریک قبر میں اتار رہے ہو۔ یہ میرا دعویٰ ہے جو کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ میں تمھیں طنز و ملامت نہیں کر رہی بلکہ بتا رہی ہوں کہ تم کیسے غلط راستے پر جا رہے ہو، اور کس طرح میری روح کو خوش و خرم رکھنے کے لئے سامان و اسباب فراہم کر رہے ہو۔ تم نے ایکبار مجھ سے کہا تھا، شاید تمھیں یاد ہو "بیوی! جس دل میں تمھاری محبت سما گئی ہے، اس دل میں اب کسی کے لئے کوئی راہ نہیں۔ تمھاری سیرت، تمھاری صورت اور تمھارا تصوّر میری زندگی ہے۔ تمھارا سراپا میرے جسم و جان میں اس طرح گھل مل گیا ہے جیسے دودھ میں شکر۔ تم میری ٹھوڑی پکڑ کر اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

مجھے دنیا سے غرض کیا، مری دنیا تم ہو
جان دیدوں گا مرے ساتھ اگر تم نہ رہیں

قدرت کو شاید امتحان منظور تھا، میں ختم ہو گئی۔ لیکن تم اپنی جان نہ دے سکے، اور چار چھ روز ہی میں بیوی والے ہو جاؤ گے۔ مجھے جو چیز بےچین کئے ہوئے ہے وہ یہی ہے کہ تم نے میرے سامنے جتنے نظریات پیش کئے وہ سب غلط نکلے، جتنے دعوے کئے وہ سب جھوٹے ثابت ہوئے جتنے تصوّراتی محل تعمیر کئے وہ سب تودۂ خاک نکلے۔ برا نہ ماننا، فلسفۂ دل اور محبت کی منطق نرالی ہے۔ اسے تم کیا جانو۔ ایک واقعہ سنو گے۔ پچھلے زمانے میں ایک بزرگ ہو گزرے ہیں، ابراہیم ادھم، اُن کا نام تھا۔ کچھ روز تخت و تاج کے مالک بھی رہے۔ بعد میں چھوڑ چھاڑ کر جنگل کو جا نکلے اور وہیں درویش و فقیر بن کر بود و باش اختیار کر لی۔ برسوں اپنے اکلوتے بیٹے سے جدا رہے۔ ایک روز بیٹے کو باپ کی محبت نے بُری طرح ستایا اور بیٹے نے راہِ سفر اختیار کی۔ تلاش و جستجو کے بعد باپ کو پالیا، لیکن اس عالم میں کہ باپ سجدۂ الٰہی میں بیہوش و بیخود پڑے ہوئے تھے۔ شدید انتظار اور کافی دیر کے بعد بیٹے نے باپ کو ہوشیار کیا اور دونوں باپ بیٹے بغل گیر ہو گئے لیکن یکایک باپ کے دل میں تھرتھری اور کپکپاہٹ پیدا ہوئی وہ گھبرا گئے، اور آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر کہا "خدایا! مجھے سنبھال کہ میرے قدم ڈگمگائے۔ مجھے بچا کہ میں راستے سے بھٹکا، مجھے سہارا دے کہ میں گرا، بقول سودا کے۔

مسافر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

باپ بیٹے کی یہ حسرت دید پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ بیٹے کے ہاتھ باپ کے گلے سے خود بخود علیحدہ ہوتے ہیں اور باپ زمین پر گر پڑتے ہیں۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آن کی آن میں بیٹے کی روح پرواز کر گئی ——— کچھ سمجھے اس راز و نیاز کو، ویسے تو اللہ کی باتیں اللہ ہی جانے۔ پھر بھی میں ایک نکتہ تمھیں بتاتی ہوں۔ ابراہیم ادھم نے دنیا کو چھوڑا اور اللہ سے ناتا جوڑا، لیکن بیٹے کو دیکھ کر جب رشتۂ پدری نے اپنا اثر دکھایا اور فطری تعلق و ربط دل میں جگہ کرنے لگا تو وہ سمجھ گئے کہ اب یہ شمعِ وحدت بجھی۔ اُن کا شعلۂ غیرت بھڑک اُٹھا، اور جیسے ہی ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ایک دل میں دو محبتیں یکجا نہیں ہو سکتیں ویسے ہی بیٹے نے دم توڑ دیا ——— مگر یہ اللہ اور اس کے خاص مقدس بندوں کی باتیں ہیں۔ ہمارا تمھارا کیا مقابلہ، مگر پھر بھی میں سمجھتی ہوں کہ تمھاری فکر و نظر کے لئے تازیانۂ عبرت ضرور ہے۔ ہاں ٹھیک ہے، چھوڑو اس بحث کو، زمانۂ قدیم کے قصے ہیں یہ۔ اچھا تو جب بات میں بات نکل آئی ہے تو ایک ضروری گذارش اور سن لو۔

تم مجھے جوش ملیح آبادی کی وہ تاریخی نظم اکثر سنایا کرتے تھے جو دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں شہرتِ دوام حاصل کر چکی ہے ۱۹۴۲ء میں کہی گئی تھی، جب خوددار قوم پرست اور وطن کے شیدائی حصولِ آزادی کے جرم میں جیلوں کے اندر بند کئے جا رہے تھے۔ تم مجھ سے کہا کرتے تھے کہ یہ انگریز گورے جب تک ہمارے دیس سے نہیں جائیں گے، خوشحالی ترقی اور آزادی ہمیں نصیب نہیں ہو سکتی۔ تم یہ رونا گھر میں بیٹھ کر رویا کرتے تھے اور انگریزی حکومت کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ لیکن کمر ہمت کسی روز تم نے نہیں کسی۔ میدانِ عمل میں کبھی نہیں کودے۔ ایک روز بھی عوام کو دعوتِ انقلاب نہ دے سکے۔ لیکن زمانہ کسی کا انتظار نہیں کیا کرتا۔ تمھاری کوششوں اور قربانیوں کے بغیر ہی ہندوستان آزاد ہو گیا، اور اس آزاد ہندوستان نے جو فرائض اور ذمہ داریاں تم پر عاید کی ہیں، میں پوچھتی ہوں، ان میں سے کسی ایک کو بھی تم نے پورا کیا، خانماں خراب شرنارتھیوں کا مسئلہ۔ تنگ نظری و فرقہ پرستی کو ختم کرنے کا مسئلہ، معصوم و بے گناہ جوان لڑکیوں کو پنجۂ استبداد سے چھڑانے کا مسئلہ۔ میں کہاں گنتی گناؤں، تم ہی بتاؤ کہ تم نے انھیں ایسے بیسیوں مسئلوں کا حل کبھی سوچا کبھی اس کے لئے عملی قدم اٹھایا۔ مجھے معلوم ہے۔ تم نے کچھ نہیں کیا۔ میں پھر کہوں گی کہ وقت کا دھارا تیزی سے بہتا رہتا ہے اور کسی کا کام کسی کے بغیر رُکا نہیں رہتا۔ تمھاری کوشش و توجہ کے بنا ہی دیس کے یہ ضروری اور عوامی مسائل آہستہ آہستہ پایۂ تکمیل کو پہنچ رہے ہیں ——— گاندھی جی کی تصویر تو تم نے اور زیادہ اہتمام سے اپنے کمرے میں آویزاں کر لی ہوگی۔ لیکن میں دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی بھی توفیق کبھی نصیب ہوئی۔ صرف گاندھی جی کا نام لے لے کر اپنی دیش بھگتی کا جھوٹا ڈھونگ آخر کیوں رچاتے ہو۔ ہاں! میں جانتی ہوں کہ میری یہ باتیں تم کو ناگوار گزر رہی ہوں گی اور قبرستان کی ویرانی و تنہائی اس وقت زیادہ محسوس ہو رہی ہوگی۔ لیکن میں یہ بھی خوب سمجھتی ہوں کہ آج کے بعد پھر کبھی ادھر نہ آسکو گے، اس لئے سب کچھ ہی اس موقعے پر سنا دینا چاہتی ہوں۔ کیوں۔ اب کچھ اور سننے کے لئے تم تیار نہیں۔ اچھا تو میں بھی تمھارا راستہ کھوٹا نہیں کرتی، جاؤ۔ میں تم کو دعا دیتی ہوں کہ خدا خوشی کے قہقہوں اور مسرت کے نقاروں کے سائے میں تمھاری دوسری شادی جلد کرا دے۔ اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں۔ خدا تمھیں سدا سکھی رکھے۔

اگر دل چاہے تو اپنی بیوی کو آگرے کے تاج محل کی تصویر میری جانب سے بطور تحفۂ شادی پیش کر دینا اور کبھی جب غالب کے مزار پر جانا ہو تو میری طرف سے بھی فاتحہ پڑھ لینا جس نے کہا ہے اور خوب کہا ہے۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

آئندہ سال سے دہلی میں بجلی کی افراط ہو جائے گی

دہلی میں آئندہ سال ننگل ہائیڈل چینل پر گنگوال پاور ہاؤس سے بجلی میسر آنے پر بجلی کی سپلائی کی حالت اور بھی بہتر ہو جائے گی۔ حیدرآباد میں راماگنڈم سٹیم اسٹیشن کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ یہ اسٹیشن ۱۹۵۵ء میں مکمل ہو جائے گا۔

ڈونی چند شرما

کانگڑے کے لوک گیت

جب انسانی جذبات و احساسات کو تاثیر کی فراوانی حاصل ہوتی ہے تو وہ شعر کے روپ میں ڈھل جاتے ہیں۔ لوک گیتوں کو بھی اپنے اجرا اور تشکیل کے لئے اسی طرح کے مدارج طے کرنا پڑتے ہیں۔ عوامی ادب کی اس صنف کی نوعیت بلا تغیر مذاقی ہوتی ہے۔ جغرافیائی حدود اور حالات کو ان کے تعین میں بلا شبہ اہم دخل ہے۔ کیوں کہ لوگوں کے رسم و رواج، رہن سہن اور خیالات کی یکسانیت اور غیر یکسانیت کے لئے زیادہ تر یہی حالات ذمے دار ہوتے ہیں۔

دیکھا گیا ہے کہ مقامی بولیاں باوجود اپنی تنگ دامانی اور کم مایگی کے لوگوں کے احساسات اور معاشرت کی آئینہ دار رہی ہیں۔ اس فریضے کے ادا کرنے میں خصوصاً لوک گیت ان بولیوں کا آلۂ کار رہے ہیں۔ اور مقامی بولیوں کی یہ سعی اتنی غیر معمولی حد تک کامیاب رہی ہے کہ بسا اوقات ان کی تنگ دامانی پر بے پناہ وسعتوں کا گمان ہونے لگتا ہے۔

پہاڑ کے دامن میں واقع کانگڑے کا سارا ضلع پہاڑی ہے۔ اس کی آبادی دس لاکھ اور رقبہ لگ بھگ دس ہزار مربع میل پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں ہماچل پردیش کے منڈی اور چمبے کے اضلاع کا بہت سا حصہ بھی یکساں بولی کے قدرتی خطے کی حدود میں کانگڑے کے ساتھ پیوستہ و وابستہ ہے۔

دس ہزار مربع میل میں پھیلے ہوئے اس عریض و بسیط خطۂ ارضی کی بولی اصطلاح عام میں "پہاڑی" کہلاتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ پہاڑی بولی مرکزی یکسانیت رکھنے کے باوجود ہر پندرہ بیس میل کے بعد معمولی طور پر ضرور تبدیل ہو جاتی ہے یہ تبدیلی الفاظ و لہجہ دونوں پر حاوی ہوتی جاتی ہے۔ لاہول اور سپتی کے دور افتادہ علاقے میں بولی جانے والی بولی کو "پہاڑی" کی بجائے "تبتی" کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ پھر بھی ضلع کانگڑہ کے بیشتر حصے اور اضلاع منڈی اور چمبہ کے نواحی علاقہ جات میں ایک ایسی زبان رائج ہے جسے کانگڑے کی مرکزی بولی کہا جا سکتا ہے۔ اور جو اصل "پہاڑی" ہے۔

کانگڑے کے لوگوں کے رسم و رواج، رہن سہن خیالات اور معاشرت کی جھلکیاں ہمیں یہاں کے لوک گیتوں میں ملتی ہیں۔ جنھیں انجانے شاعروں نے ماضی کی انجانی ساعتوں میں ترتیب و تشکیل کیا۔ پہاڑی بولی محض ایک بولی ہے۔ اس کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں لیکن بفرض محال اگر کبھی پہاڑی کا بھی ادب لکھا جائے تو اس میں لوک گیتوں کو امتیاز خصوصی حاصل ہوگا۔ اس مضمون میں کانگڑے کے کچھ لوک گیتوں کا مذکور ہے جن کی حیثیت مُشتے نمونہ از خروارے سمجھی جائے تو صحیح ہوگا۔

پہاڑی کے لوک گیتوں کا پورے غور سے مطالعہ کرنے پر یہ بات آسانی سے قابل یقین ہو جاتی ہے کہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہے اور انھیں بے شمار موضوعات کے لئے ہمہ گیر حیثیت حاصل ہے۔ تھوڑی سی سعی سے ہر موضوع کو آپ لوک گیتوں کے لبادے میں پائیں گے۔ اور اس دریافت کا مول محض آپ کا تجسس ہوگا۔ لوک گیتوں کا یہ دائرہ اکثر و بیشتر ہر ممکن موضوع پر محیط ہے۔ اور پھر بیاہ شادی، پیدائش، موت، جدائی، زندگی کے دکھ، حیات کے ننھے ننھے اندیشے اور زندہ دلی کی چہلیں کیسے مستثنیٰ ہوں۔

بیاہ کے موقعے پر یہ گیت عام طور پر گایا جاتا ہے۔

باہر آیاں میری شام سُندری
کاہن لگنا جو آیا دے

تیں کہیاں آواں میرے کرشن جی
باپو جی تے سُرم آؤندی دے

پتا جی نیرے دان کر دے۔ ہتھ گڑ دی چُلیاں بھر دے
لگنا دیلا جاندی دے

دُولھا کو کاہن یعنی کرشن مانا جاتا ہے اور دُلھن کو شام سُندری یا کرشن کی محبوبہ۔

دُولھا کہتا ہے ۔ اے میری پیاری باہر آؤ ۔ تمھارا کاہن رِدواہ کی رسم (لگن) کے لئے آیا ہے ۔

دُلھن کہتی ہے ۔ اے میرے کرشن جی میں کیسے آؤں ۔ باپ سے شرم محسوس ہوتی ہے ۔

دُولھا کہتا ہے کہ تیرا باپ تو خود پانی کے چھینٹے دے کر کنیادان کر رہا ہے ۔ شرم کیسی ۔ آؤ کہ شادی کی رسم (لگن) کا وقت بیتا جا رہا ہے ۔

اور جس وقت لڑکی کے لئے ور پسند ہو رہا ہے تو وہ اپنے خاندانی پروہت سے یوں التجا کرتی ہے ۔ ؎

جایاں جایاں ٹہاریا پڑھیا پنڈتا
میری ماں دا بھیجیا جایاں
دیکھی آیاں ٹہاریا پڑھیا پنڈتا
بابلے کیہڑا ور ٹولیا وے

اے ہمارے رِدوان خاندانی پنڈت جاؤ ۔ میری ماں کہہ رہی ہے تم جاؤ اور دیکھ آؤ ۔ میرے باپ نے میرے لئے کیسا ور ڈھونڈا ہے ۔

خاندانی پروہت منگیتر کو دیکھ کر آتا ہے تو یوں اس کا حال بیان کرتا ہے ۔ ؎

گلے پاندا رُنڈاں دی مالا
جٹاں دیکھی ڈر آیا وے

وہ تو گلے میں رُنڈوں کی مالا ڈالتا ہے ۔ اس نے بڑی بڑی خوفناک جٹیں (بال) بڑھا رکھی ہیں ۔

خاندانی پروہت کو کہہ یہ کام سنبھالا جاتا ہے ۔ دوسری بار وہ پہلے سے بھی زیادہ مایوس کن اطلاع لاتا ہے ۔ ؎

ہتھاں لیندا جھولی تاں چپٹا گھر گھر الکھ جگاندا
بھاگوں لگاندا کپڑے انگ بھبُوت لگائی وے

اُس کے ہاتھوں میں جھولی اور چپٹا ہے اور وہ گھر گھر بھکشا مانگتا ہے ۔ اس نے بھگوے رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں اور جسم پر سادھوؤں کی طرح راکھ لگائی ہے ۔

اِس گیت میں ہندوستانیوں کی زندگی کی طرف سے روایتی بے سروکاری کی طرف معنی خیز اشارہ ہے ۔

جب لڑکی کو اپنی پسند کا ور نہیں ملتا تو وہ اپنی ماں سے شاکی ہوتی ہے

مُورکھ نی مُورکھ مائے مُورکھڑے دے لڑ لائی
یہ بھیجیا تھا مہندیا جو گُرنے دے پت لیا ئیا
یہ بھیجیا چکان جو ٹوکرو چکی بیسا ئیا
مُورکھ نی مُورکھ ملئے . . . .
یہ سوئے کھاندا سجریاں ستارہ کھاندا باہی
ڈل کھاندا کچا لوآں دی گھڑا پیندا چھاہی

یہ بیوقوف ہے ۔ بالکل بیوقوف ۔ اے ماں تم نے میرا رشتہ ایک بیوقوف سے کر دیا ہے (اس کی عقل کا یہ حال ہے کہ) اِسے مہندی لانے کے لئے بھیجا تھا اور یہ گرنا (ایک خاردار جھاڑی) کے پتّے لے آیا ہے ۔ اسے چک (سر کا گہنا) لانے کے لئے بھیجا تھا اور یہ گاؤدی ٹوکرا ہی اُٹھا لایا ۔

اے ماں یہ بڑا بدھو ہے اور آدل درجے کا بے تمیز جس سے میرا رشتہ ہوا ہے ۔ یہ سولہ تازہ روٹیاں کھاتا ہے اور ستارہ باسی روٹیاں ۔ یہ کچا لو را ۔ دی کی ایک قسم) کا ٹوکرا کھا جاتا ہے اور لسی کا گھڑا پی جاتا ہے ۔

ماں لڑکی کو سمجھانے اور چُپ کرنے کے لئے کہتی ہے ۔ ؎

چُپ کر نی چُپ کر دِھئے گھرے جائی سمجھا ئیاں
سمجھ گا تاں سمجھا ئیاں نہیں تے چھٹیاں نے چپکا ئیاں

اے بیٹی چُپ رہو اپنے گھر جا کر اسے سمجھانا ۔ اگر سیدھی طرح سمجھ جائے تو بہتر ورنہ اسے چھڑی سے سزا دینا (خوب)

نئی بیاہتا لڑکی اپنے خاوند کے گھر جاتی ہے تو اُس کے جیون میں ایک انقلاب آجاتا ہے ۔ نئے ماحول سے مانوس ہونے کے لئے اُس کے نظریہ حیات میں لازمی طور پر ایک بھاری تبدیلی آجاتی ہے ۔ لیکن ماں باپ اور بھائی بہنوں کی جدائی جتنی شاق گزرتی ہے ۔ اسے ماں باپ سے علیحدہ ہونے والی ایک لڑکی ہی محسوس کر سکتی ہے ۔ اس جدائی کے اظہار کے لئے تقریر کی نسبت احساس کی زیادہ ضرورت ہے ۔

ذیل کا لوک گیت ماں باپ سے علیحدہ ہونے والی لڑکی کے دل کی کیفیت کا عکاس ہے پانچویں اور چھٹی سطر میں جدائی کا یہ نوحہ ایک بے قابو بین کے روپ میں پھوٹ نکلتا ہے ۔

مائے باگاں اِچ پھُلی پوہاری

ماسئے ہن میں باہر د باہری
ہُن کجُو کردی دھی اسے میری
میں ہُن نہیں او تیری
ماسئے ہُن ساڈی جو گیاں ادلی چھیری
ہُن ساڈی بُرہیاں چھاپاں دی چھیری
میں ہُن نہیں او تیری

باغوں میں بیگن کے پودوں پر پھول آرہا ہے اور ماں میں اب تیرے گھر سے باہر ہوگئی ہوں۔ اب مجھے اپنی بیٹی کیوں کہتی ہو۔ اب میں تمہاری نہیں رہی۔ اب میں جوگی رساد ھوؤں کی طرح کبھی کبھی تیرے پاس آیا کروں گی اب تو برسوں یا ششماہیوں کے بعد ملنا ہوگا۔ ماں میں اب تیری نہیں رہی۔

بیاہ شادی تو روزمرہ کی زندگی کا جھمیلہ ٹھہرا۔ لیکن گوکل کے نٹ کھٹ گوالے کی شرارتیں بھی بڑے پیارے انداز میں لوک گیتوں کی دسترس میں آگئی ہیں۔ ان میں بیک نفس فلاسفر اعظم کرشن جی کے خلاف شکایت بھی ہے اور عقیدت کا اظہار بھی۔ مندرجہ ذیل لوک گیت ایک سکھی کی شکایت ہے جسے جمنا پر پانی بھرتے وقت کرشن جی اور اُن کے ہمجولی گوالے تنگ کرتے ہیں۔ لڑکی ماں سے شکایت کرتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شکایت کرنے میں اپنی دلجوئی کا سامان بھی مہیا کرلیتی ہے۔ ؎

جمنا کنارے اِک نٹرڈا نی ماں پانی بھرن نہ دیندا
چھوٹے چھوٹے چھوٹو دیبرے مگر لگاندا
نی ماسئے لحاج رکھدا نی ککھ دی
کالی کلٹ اکھیں مرگاں والی
نی ماں لحاج کردا نی ککھ دی   (ککھ معنی گھاس کا تنکا)
جمنا کنارے اک نٹرڈا نی ماں پانی .....

اے ماں جمنا کے کنارے ایک بڑا چالاک آدمی رہتا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے لڑکے میرے پیچھے لگا دیتا ہے اور تنگ کرتا ہے۔ اے ماں وہ ذرا بھی لحاظ نہیں کرتا۔ اس کی گہری کالی آنکھیں ہرن کی آنکھوں جیسی ہیں۔
اے ماں وہ بڑا نٹ کھٹ ہے۔ وہ جمنا سے پانی بھرنے نہیں دیتا۔ وہ ذرہ بھر بھی لحاظ نہیں کرتا اے ماں!

جب لڑکی سُسرال کے گھر رہنے لگتی ہے تو اسے عملی زندگی کا تجربہ ہونا شروع ہوتا ہے۔ زندگی میں آرام اور مزے کے دن بھی ہوتے ہیں لیکن زندگی کی صعوبتیں اور ناقابل فرار حقیقتیں اس سے کم نہیں۔ اور پھر عام یقین کے مطابق سُکھ دُکھ ٹھہرا بھی قسمت کا معاملہ۔ جب لڑکی کو سسرال کے گھر قید و بند اور غمہیات سے دوچار ہونا پڑا ہے تو اُسے ماضی کی آزاد روی اور بچپن کی بے فکری آن ستاتی ہے۔ دُکھی انسان کو ماضی کی بھولی بسری میٹھی یادیں بہت پیاری لگتی ہیں۔ اُس کے لئے اِن کی یاد بیک دم وجہ تسکین اور باعث اشک ریزی بن جاتی ہیں۔

ایک لڑکی اپنے باپ سے یُوں فریاد کناں ہے۔ ؎

اتنے دُکھڑے کٹے میرے باباجی جتنے پیپل دے پتے ہرے
اماں جی دے راج اِچ کھیلی میرے باباجی
سسڑی نہ دیندی کھیلنے

اے پیارے باپ میں نے سُسرال جاکر اتنے دُکھ جھیلے ہیں جتنے پیپل پر سبز پتے ہیں۔ اے باپ میں ماں کے پاس خوب کھیلتی تھی لیکن مجھے ساس کھیلنے نہیں دیتی۔

کانگڑے کے کچھ حصّوں میں گرمی کے موسم میں پانی کی شدید قلت ہو جاتی ہے۔ چشموں کے سوتے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ پانی سُوکھ جاتا ہے۔ پانی بھرنے والیاں تازہ رسنے والے پانی کے انتظار میں پہروں چشموں پر بیٹھی رہتی ہیں۔ کانگڑے کے بعض گھرانوں میں پتھروں اور دھاتوں کے زمانے کی طرح ابھی تک ایک قدر رائج ہے جسے بجا طور پر ساسوں کا زمانہ کہا جا سکتا ہے ایسے گھرانوں میں ساس اور بہو کا روایتی حاکم و محکوم کا رشتہ بدستور قائم ہے۔ ایک ساس زدہ بہو ایک خشک چشمے پر تازہ رسنے والے پانی کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے تنگ آجاتی ہے۔ ؎

ڈُب ڈُب او گھڑو لوا بھرا دے ابیریا
گھڑا بی نی ڈُبا پانی بی نی مُٹدا
سس منی بولدی نو ہیں گھرے آ

اے گھڑے پانی میں ڈوب جاؤ اور بھر جاؤ۔ تم میرے سر کے دشمن ہو لیکن افسوس اتنا پانی بھی نہیں کہ گھڑا اس میں ڈوب جائے اور پانی کا سوتہ بھی خشک ہو رہا ہے۔ ظالم ساس اتنی نردیئی ہے کہ گھر واپس

آنے کو بھی نہیں کہتی -

مرد جانتا ہے گھر کا دھندہ کیسے چلتا ہے - پیسہ کیسے حاصل ہوتا ہے - عورت کو اس سے کیا - کہتی ہے -

جھٹ کھائی لیناں چینیاں کنے
جلی جاؤ تیری نمتا
اساں رہنا سکینیاں کنے

ہم چاول کھانڈ کے ساتھ کھائیں گے - بھاڑ میں جائے تمہاری کنجوسی اور لالچ - ہم تو فیشن (شوقینی) سے رہیں گے -

مرد جانتا ہے چادر سے باہر پاؤں پھیلانا اچھا نہیں ؎

پانی بھری لیناں پتیلیا کنے
لونگ تیرے چھکے لانا
دِن کٹی لینے تیلیا کنے

ہم پتیلی سے پانی بھر لیں گے - لونگ (ناک کا قیمتی زیور) سر میں ڈالو گی - ہم معمولی (تیلی ناک میں ڈال کر ہی گزارہ کر لیں گے -

۱۹۳۶-۳۷ء میں کانگڑے میں دیہات سُدھار کی تحریک زوروں پر تھی تو نئے نئے اصلاحی گیت زندہ ہو گئے - تعلیمی پرچار سے متعلقہ یہ گیت اسکولوں کے بچے خوب گایا کرتے تھے -

باگاں تے کیلے ان پڑھ منڈو رہندے پیلے
باگاں تے بھیھڑے ان پڑھ منڈو کھاندے دھکے
باگاں تے توت ان پڑھ منڈو جاندے اُوت

باغوں میں کیلے ہیں - ان پڑھ لڑکے ڈھیلے اور نکمے رہ جاتے ہیں
باغوں میں بینگن ہیں ان پڑھ لڑکے ہر جگہ دھکے کھاتے ہیں - ان کی قدر کہیں بھی نہیں -

باغوں میں شہتوت ہیں - ان پڑھ لڑکے نہ گھر کے نہ گھاٹ کے

لڑکی شروع شروع میں سسرال کے گھر جا کر ماں باپ کی یاد میں بے قرار ہو جاتی ہے - وہ ہر ممکن ذرائع سے اپنے ماں باپ تک سندیسہ بھیجتی ہے جس میں دعائے خیر بھی شامل ہوتی ہے اور عرضِ حال بھی ؎

محلاں دے تھلے تھلے جاندا سپاہیا جی
اور سکیا بھائیا جی

اماں میریا جو کہنا راجی سدا رہنا
بابے جو کہنا آئی دے جانا

اے محلوں کے نیچے جانے والے پردیسی - اے میرے سگے بھائی میرا ایک سندیسہ لے جانا - میری ماں کو حیاتِ دوامی کی دعا پہنچانا اور باپ کو کہنا کہ مجھے آ کر ضرور مل جائے -

دنیا میں ننھے بچے کی آمد اس بات کی نوید جانفزا لاتی ہے کہ خالق نے اپنی صنعتِ کاملہ سے تخلیق کردہ ایک شاہکار کو تزئینِ عالم کے لئے بھیجا ہے - ایسے میں بچے کے پریوار میں خوشیوں کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے - جس میں ناچ رنگ اور گانا سبھی تو شامل ہیں - بچے کی پیدائش پر گیت گائے جاتے ہیں - ؎

جت دن تیں جنم لیا - مینہ اَو گھنی گھنی دُھپ
تیرے پیو کے اوبدھائیاں - تیرے نانکڑے ہوئی دُب
تیرے بابے دے بھر دُرب - تیرے نانے دے بھر دُوب

ہے بالک لوری لے -

جس دن ننھے نے جنم لیا اس دن بارش ہوئی اور پھر خوب چلچلاتی دھوپ بچے کے گھر مبارک باد کا شور اُٹھا اور اس کے نانا کے گھر خوشیاں منائی گئیں لوگوں نے اس کے باپ اور نانا کو تبرک کے طور پر دُوب گھاس دیا - اے بالک تم لوری لو -

ننھا بچہ اپنی ماں اور آیا سے پوچھتا ہے کہ میرا باپ - دادا - دادی اور نانی کون ہیں - نانا اور نانی کے بارے میں جواب مزاحیہ انداز میں دیا گیا ہے - گیتوں کی اس صنف کو پہاڑی میں "گالی گانا" کہتے ہیں -

کیگا پچھیندا داتی اپنی نوں مائی اپنی نوں
کون دا ہیے میرا بابا نہ

ننھا اپنی ماں اور آیا سے پوچھتا ہے کہ میرا باپ کون ہے -

شوہی شوہی پگڑی کنجاں جیہی کلگی
بنھا کلائی پھر دا سپاہی
اوہی گیگیا تیرا بابا نہ

(باپ کا شناختی حلیہ یہ ہے)

اُس کی پگڑی مرغوب سُرخ رنگ کی ہے - پگڑی کا شملہ مور کی

کلغی یعنی تاج جیسا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے اور وہ چلتا پھرتا ہے تو بڑا سپاہی جان پڑتا ہے۔ اے ننھے وہی تیرا باپ ہے۔

گیگا پوچھدا مائی اپنی نوں کون دا ہیئے میرا دادا نہ

ننھا اپنی آپا سے پوچھتا ہے اے آپا میرا دادا کون ہے ؎

پیراں جو جوڑا چڑھنے جو گھوڑا
او ہی گگیا تیرا دادا نہ

اُس کے پاؤں میں جُوتی ہے۔ اُس کے پاس چڑھنے کو گھوڑا ہے اے ننھے وہی تمھارا دادا ہے۔

ننھا آپا سے پوچھتا ہے کہ میری دادی جان کون ہیں ؎

ہتھا مدھانی ۔ بیٹھی رانی
او گگیا تیری دادی نہ

اُس کے ہاتھ میں دہی بلونے کی مدھانی ہے۔ وہ جو رانی جیسی بیٹھی ہے تمھاری دادی ہے۔

پھر جب ننھا اپنے نانا اور نانی جان کے بارے میں استفسار کرتا ہے تو مندرجہ ذیل مزاحیہ جواب ملتے ہیں ؎

پیراں نہ جُتی چڑھنے جو کُتی
او گگیا تیرا نانو نہ

جس کے پاؤں میں جُوتی بھی نہیں اور جس کے پاس چڑھنے کے لئے کُتیا ہے اے ننھے وہی تیرے نانا صاحب ہیں ؎

سرا پر کھارنا بڑی بچاری
او گگیا تیری نانی

جس کے سر پہ بدنما سا ٹوکرا ہے۔ جو مکروہ شکل ہے۔ اے ننھے وہ تیری نانی جان ہیں۔

بچے اور اُس کے رشتہ داروں کے درمیان تعارف کا یہ سلسلہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ حتےٰ کہ گیت گانے والیوں کے گلے تھک کر رہ جاتے ہیں

نند اور بھاوج کی دشمنی تو ضرب المثل ہو چکی ہے۔ نند کی غماز زبان اور حسُود دل نے سوہنی کو زک پہنچائی۔ اپنے بیگانے ہو گئے۔ کچی مٹی کا گھڑا ایک مٹی کے پتلے (انسان) کا دشمن بن گیا۔ چناب کے پانی میں خوفناک لہریں اُٹھیں اور اس کے ساتھ ہی نند بھاوج کی دشمنی کو بقائے دوام کی شہرت حاصل ہو گئی۔

ایک لڑکی اپنے سُسرال کے گھر بیٹھی اپنے شال کے لئے تاگے کات رہی ہے۔ اُسے اپنی ماں اور نند کی طرف سے تحفے تحائف کی ٹوکریاں علیحدہ علیحدہ موصول ہوئی ہیں۔ وہ چاندنی رات میں اُنھیں کھول کر دیکھتی ہے۔ جانتے ہو اُس کی نند نے اُسے کیا تحفہ بھیجا ہے؟ ؎

میں مہین مہین کتندی تار نی میرا سالوا
میری اماں نے بھیجے پٹار نی میرا سالوا
جناں کھولاں میں چاندنی رات
رجت نکلے سونے دے ہار ۔۔۔۔ نی میرا ۔۔۔۔
میں مہین مہین کتاں تار نی میرا سالوا
میری نند بھیجے پٹار ۔ نی میرا سالوا
جناں کھولاں میں چاندنی رات ۔ نی میرا سالوا
رجت نکلے کالے ناگ ۔۔۔۔ نی میرا ۔۔۔۔

میں اپنے شال کے لئے باریک تاگہ کات رہی ہوں۔ میری ماں نے مجھے تحائف کی ٹوکریاں بھیجیں۔ اُن میں سونے کے ہار نکلے۔ میری نند نے مجھے تحائف کی ٹوکریاں بھیجیں۔ ان میں کالے ناگ (بہت زہریلے سانپ) نکلے۔ میں اپنے شال کے لئے مہین دھاگہ کات رہی ہوں۔

اتر پردیش میں بجلی پھیلانے کی شاندار اسکیم

ریاست اتر پردیش میں کانپور میں پندرہ ہزار کلوواٹ حراری بجلی تیار کرنے کی مشینری نصب کی گئی ہے۔ سارداہائیڈل پروجیکٹ کا کافی حصہ مکمل ہو چکا ہے اور یہ موجودہ مالی سال کے اختتام سے پہلے پہلے کام کرنا شروع کر دیگا۔ یہاں سے بریلی، شاہجہان اور لکھنؤ۔ بلدوائی، پیلی بھیت اور رام نگر کے مقامات کو بجلی سپلائی کی جاسکے گی۔ نہر گنگا پر محمد پور ہائیڈرو اسٹیشن نے ۱۹۵۲ء میں بجلی تیار کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ ریہند پروجیکٹ جس کی ابتدائی صلاحیت پیداوار ایک لاکھ بیس ہزار کلوواٹ تک پہنچ جائے گی۔ پہلے پانچ سالہ پلان شامل کر دیا گیا ہے اور توقع ہے کہ یہ ۱۹۶۰ء تک مکمل ہو جائے گا۔

گُل کدہ

اس عنوان کے تحت ہر ماہ مختلف ہندوستانی زبانوں کا ادب شائع کیا جائے گا —— (ادارہ)

پنجابی — امرتا پریتم

مایا

(مشہور چترکار ونسنٹ وینگاگ کی خیالی محبوبہ مایا کو)

۱- پریئے نی پریئے
حوراں شہزادیئے
گوریئے ونسنٹ دیئے
سچ کیوں بن دی نہیں

اے پری، اے حوروں کی شہزادی
ونسنٹ کی حسینہ۔ تو حقیقت کیوں
نہیں بنتی۔

۲- حُسن کاہدا؟ عشق کاہدا؟
توں کیہی ابھیسارکا ؟
اپنے کسے محبوب دی
آواز توں سُن دی نہیں

حُسن کیسا، عشق کیسا۔ تو کیسی
محبوبہ ہے کہ اپنے کسی محبوب کی
آواز نہیں سُنتی

۳- دل دے اندر چنگ پا کے
ساہ جدوں لیندا کوئی
سُلگدے انگیار کِتنے
توں کدے گن دی نہیں

جب کوئی اپنے سوزِ دل سے مجبور
ہو کر سانس لیتا ہے تو کتنے
شرارے سلگتے ہیں۔ تو کبھی نہیں گنتی

۴- کاہدا ہُنر؟ کاہدی کلا؟
ترلا ہے اک ایہہ جیون دا
ساغر تخیل دا کدے
توں کدے مِن دی نہیں

ہُنر کیسا، آرٹ کیسا۔ یہ سب
جینے کی ایک حقیر کوشش ہے۔ تو
تخیل کے ساغر کو کبھی نہیں ناپتی۔

۵- پریئے نی پریئے
حوراں شہزادیئے
خیال تیرا پار نہ
اُوروار دیندا ہے

اے پری! اے پری! اے حوروں
کی شہزادی تیرے خیال کا آر پار
نہیں۔

۶- روز سورج ڈھونڈدا ہے
مُنہ تیرا دِسدا نہیں
مُنہ تیرا جو رات نوں
اقرار دیندا ہے

سورج روز تلاش کرتا ہے تیرا چہرہ
نظر نہیں آتا۔ وہ چہرہ جو رات کو
وعدے کرتا ہے

۷- تڑپ کس نوں آکھدے نے
توں نہیں ایہہ جان دی
کیوں کسے توں زندگی
کوئی وار دیندا ہے

تو یہ نہیں جانتی تڑپ کسے کہتے ہیں
اور کوئی کسی پر زندگی کیوں قربان
کر دیتا ہے۔

۸- دونویں جہان آپنے
لاندا ہے کوئی کھیڈ تے
ہسدا ہے نامراد
تے پھر ہار دیندا ہے

کوئی دونوں جہان بازی پر لگا دیتا
ہے۔ نامراد ہنستا ہے اور دونوں
جہان ہار جاتا ہے۔

۹- پریئے نی پریئے
حوراں شاہزادیئے
لکھاں خیال اس طراں
آون گے تُر جان گے

اے پری! اے پری! اے حوروں
کی شہزادی اس طرح لاکھوں خیال
آئیں گے اور چلے جائیں گے

۱۰- ارغوانی زہر تیرا
روز کوئی پی لویگا
نقش تیرے روز جادو
اس طراں کر جان گے

تیرا ارغوانی زہر روز کوئی پی لے گا
اور تیرے نقوش اسی طرح روز
جادو کریں گے

۱۱- ہسے گی تیری کلپناں
تڑپے گا کوئی رات بھر
سالاں دے سال اس طراں
اس طراں گُھر جان گے

تیری یاد مسکرائے گی اور کوئی رات
بھر تڑپے گا۔ اس طرح بے شمار
سال ختم ہوتے جائیں گے۔

۱۲- ہُنر جُھکھا روٹیے	ہُنر روٹی کا بھوکا ہے اور پیار
پیار جُھکھا گوریئے	محبوبہ کا ۔ تیرے کتنے عاشق رونگا تکا
بکنے کو تیرے ونگاگ	اس طرح مرجائیں گے
اِس طراں مرجان گے	

۱۳- پریئے نی پریئے	اے پری! اے پری! اے حُوروں
حُوراں شہزادیئے	کی شہزادی حُسن ایک بے فائدہ
حُسن کا ہدی کھیڈ ہے	کھیل ہے جب عشق گوارا نہیں
عشق جدُ پگدے نہیں	
۱۴- رات ہے کالی بڑی	رات بہت کالی ہے ۔ اس میں
عمراں کسے نے بالیاں	کسی نے کتنی عمریں مشعل کی صورت
چن سُورج کیہے دیوے	جلا ڈالی ہیں ۔ چاند اور سورج
اجے وی جگ دے نہیں	کیسے چراغ ہیں کہ آج بھی روشن نہیں ہوتے
۱۵- بُت تیرا سوہنیئے	اے حسینہ تیرا بُت اک خوشۂ گندم
تے اک سِٹہ کنک دا	ہے یہ زمینیں کیسی ہیں کہ وہ خوشے
کاہدیاں ایہہ دھرتیاں	بھی اُگتے نہیں
اجے وی اُگدے نہیں	
۱۶- ہنر جُھکھا روٹیے	ہُنر روٹی کا بھوکا اور پیار
پیار جُھکھا گوریئے	محبوبہ کا
کاہدا ہے روکھ نظام دا	موجودہ نظام کا درخت کیسا ہے کہ
پھُل کوئی لگدے نہیں	اسے کبھی پھل نہیں لگتا ۔

ہندی — سی ۔ بی راؤ

بیت جاتی زندگی سب کی مگر کیا

خود بتائی زندگی اپنی کسی نے

روک پایا کبھی کوئی صبح کو

کیونکہ اس کی نیند پُوری ہو نہ پائی

راہ پر چلتا کسی کو دیکھ کر کیا

شام نے سوچا کبھی جاؤں نہ اس کے

راستے سے روشنی کو دُور کرنے

کیونکہ یہ راہی نڈر چلتا رہے گا

پاؤں میں ہے شکتی من میں حوصلہ ہے؟

کب کڑکتی دھوپ بدلی چاندنی میں

دیکھ کر ہنستا ہمیں کب مند تارے

بڑھ گئے پا کر ہمارے گھر اندھیرا؟

بیت جاتی زندگی یہ سُن چکے ہم

پھر کبھی کوئی سُنے گا یہ کہانی

جو ہوئی پوری ہماری زندگی تھی

بنگالی —— پریندر رمتر

سُورجو شوئی رونگن شندھا میگھے	شام کے شفق آلود بادلوں پر
تاہُ مُوچھے دئے راتیر اندھکار	خورشید عالم تاب اپنے دستخط
تچھو کا گوجے امر کا لیسر شوئی	ثبت کر رہا ہے ۔ لیکن رات
پورو مائو نوبو کو تو ٹکو تار آر	کی تاریکی اس سنہری تحریر کو بھی
	مٹا دیتی ہے ۔ میں نہایت
	معمولی کاغذ پر معمولی روشنائی
	سے لکھ رہا ہوں ۔ یہ تحریر کب
	تک قائم رہے گی ۔ اسے بھی زمانہ
	مٹا دے گا ۔

بنگالی —— بُدھ دیو بوس

آج شوندھا شُراون کو ریچھے پون	آج ساون کے مہینے میں
شدھے دیبے تار بیساکھی نو تو رین	زور سے بارش ہو رہی ہے
	غالباً آسمان بیساکھ کے مہینے
	کا قرض چُکا رہا ہے

لہ کاٹ دوں پھینک کے جڑ نخل تمنا کی امیرؔ — پھُول کمبخت میں آئے نہ کبھی پھل آئے

پنچ سالہ پلان

سوالات و جوابات

(۴)

مالیات

س - پلان پر ۲۰۶۹ کروڑ روپے خرچ آئے گا - یہ ایک بڑی رقم ہے - یہ کیسے جمع ہوگی؟ توسیع و ترقی کے بڑے بڑے شعبوں پر اسے کیوں کر پھیلایا جائے گا؟

ج - سرکاری حلقے میں ۲۰۶۹ کروڑ روپے کے اخراجات کو حاصل کرنے کی جو تجویز ہے وہ سادہ لفظوں میں یہ ہے -

		کروڑ روپوں میں
(۱) مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے موجودہ ریونیو (مع ریلوے) میں سے بچت غیر توسیعی اخراجات پورے کرنے کے بعد	..	۷۳۸
(۲) مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی طرف سے حاصل شدہ اندرونی قرضے اور چھوٹی چھوٹی بچتیں	..	۵۲۰
(۳) سٹرلنگ فاضلات کے مقابلے میں خسارے کی مالیات	..	۲۹۰
(۴) بیرونی امداد جو اس وقت تک حاصل ہوئی ہے	..	۱۵۶
(۵) مزید بیرونی امداد یا اس کے عوض اندرون ملک میں ٹیکس لگانے قرض لینے اور خسارے کو پورا کرنے کے مزید اقدامات	..	۳۶۵
میزان	..	۲۰۶۹

توسیع و ترقی کے بڑے بڑے شعبوں پر یہ روپیہ حسب ذیل طریقے سے تقسیم کیا جائے گا

		کروڑ روپوں میں
(۱) زراعت اور کمیونٹی کی توسیع و ترقی	..	۳۶۱
(۲) آب رسانی	..	۱۶۸
(۳) کثیر المقاصد اور بجلی کے پراجیکٹ	..	۲۶۶
(۴) بجلی	..	۱۲۷
(۵) نقل و حمل اور رسل و رسائل	..	۴۹۷
(۶) صنعت	..	۱۷۳
(۷) سماجی خدمات	..	۳۴۰
(۸) دوبارہ آبادکاری	..	۸۵
(۹) دیگر امور	..	۵۲
میزان	..	۲۰۶۹

س - خسارے کی مالیات سے کیا مراد ہے؟ اگر اس کا مطلب زیادہ کرنسی نوٹ چھاپنا ہے تو کیا اس کا نتیجہ کرنسی کا مصنوعی پھیلاؤ نہیں ہوگا اور کیا کرنسی کا مصنوعی پھیلاؤ ملک کے لئے مضر نہیں ہے -

ج - اگر حکومت کو پبلک سے آمدنی کم ہو اور اس کے اخراجات زیادہ ہوں تو اس کا نتیجہ خسارے کی مالیات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے - حکومت ایسے خسارے اپنے جمع شدہ نقد فاضلات میں سے روپیہ نکال کر یا ریزرو بنک سے قرض لے کر پورے کر سکتی ہے - اس طریقے سے روپے میں "حرکت" یا "اضافہ" ہو سکتا ہے - روپے میں ہر قسم کا اضافہ کرنسی کا مصنوعی پھیلاؤ نہیں ہوتا - مثال کے طور پر اقتصادی مستعدی کی ایک اونچی سطح کو سہارا دینے کے لئے زیادہ روپے کی ضرورت ہوتی ہے - جو چیز زیادہ اہم ہے وہ ہے نتیجہ نہ کہ طریقہ کار -

یہ صحیح ہے کہ زیر استعمال روپے میں اضافہ ہو اور اس کے ساتھ ہی ساتھ گھریلو پیداوار میں اضافہ نہ ہو تو اس کا نتیجہ کرنسی کے مصنوعی پھیلاؤ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے - لیکن اگر گھریلو پیداوار کی کمی اس طرح پوری کر دی جائے کہ باہر سے سامان ملک میں لایا جائے اور اس کے مقابلے میں ملک سے باہر روپیہ چلا جائے تو مالی خسارے کے کرنسی کے مصنوعی پھیلاؤ کے اثرات بڑی حد تک ختم کئے جا سکتے ہیں - اس لئے پلان میں تجویز کیا گیا ہے کہ خسارے کی مالیات کو اس حد تک محدود کر لیا جائے جس حد تک پلان کی مدت کے دوران میں ہندوستان کو سٹرلنگ فاضلات کے واگذار ہونے کی توقع ہے - یعنی ۲۹۰ کروڑ روپے تک - یہ فاضلات کمیونٹی کی گزشتہ بچتوں پر مشتمل ہیں - یعنی یہ وہ روپیہ ہے جو جنگ کے دوران میں سامان اور خدمات بہم پہنچانے کے عوض اس ملک کو واجب الادا ہے - لیکن اس وقت ادا نہیں کیا گیا تھا ان کی واگذاری کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں باہر سے سامان اور خدمات کی درآمد

ہوگی۔ لیکن ہمیں اس کے لئے کچھ ادا نہیں کرنا ہوگا۔ اس لئے اگر خسارے کی مالیات کو ان ناگزیر ایلیوں کی رقوم تک محدود کر لیا جائے تو ایسی کوئی قوتِ خرید پیدا نہیں ہوگی جسے سامان کا سہارا حاصل نہ ہو۔ لیکن پھر بھی توسیع و ترقی کا بڑا پروگرام کرنسی کے مصنوعی پھیلاؤ کے دباؤ کو پیدا کرتا ہے۔ اس سے نپٹنے کے لئے ضروری ہے کہ کنٹرول کی ایک کڑی پالیسی عمل میں لائی جائے۔ آخر میں اس بات کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے کہ خسارے کی مالیات ایک ایسی ٹیکنیک ہے جو مہارت اور قوتِ فیصلہ سے کی جانی چاہئے۔ اگر اس بات کا یقین ہو کہ یہ ٹیکنیک مہارت اور قوتِ فیصلہ سے برتی جاتی ہے تو خسارے کی مالیات توسیع و ترقی میں بڑا رول ادا کر سکتی ہے۔

س۔ کیا ٹھہراؤ کے ساتھ مستحکم قیمتوں کے مقابلے میں یہ صحیح بات تھی کہ اقتصادی توسیع و ترقی کا کام خسارے کے بجٹ سے شروع کیا جاتا۔

ج۔ اگر خسارے کی مالیات کے ساتھ اقتصادی توسیع و ترقی اور مستحکم قیمتوں کے ساتھ ٹھہراؤ میں انتخاب کرنا ہو تو ہمیں کسی حد تک خسارے کی مالیات کا خطرہ قبول کر لینا چاہئے اور توسیع و ترقی کا کام شروع کر دینا چاہئے۔

س۔ چھوٹی چھوٹی بچتوں والا "چھوٹا سا آدمی" خسارے کی مالیات کی وسعت کو کس طرح سے کم کر سکتا ہے؟

ج۔ وہ اپنا بچایا ہوا روپیہ گورنمنٹ کو قرض دے کر مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ گورنمنٹ کو پبلک سے جتنا زیادہ روپیہ حاصل ہوگا (خواہ وہ ٹیکسوں کی صورت میں ہو خواہ وہ قرض کی صورت میں) اتنا ہی خسارے کی مالیات کا سہارا لینے کی کم ضرورت ہوگی۔

س۔ کیا غیر ملکی سرمایہ قبول کرنے سے ہم سیاسی طور پر غلام ہو جائیں گے؟

ج۔ اگر غیر ملکی امداد کے ساتھ کوئی سیاسی شرطیں وابستہ نہ ہوں تو اس سے کوئی ملک سیاسی طور پر غلام نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت تقریباً دنیا کے ہر ایک ترقی یافتہ ملک نے اپنی اقتصادی توسیع و ترقی کے کسی نہ کسی مرحلے پر ضرور غیر ملکی امداد کا سہارا لیا ہے۔ غیر ملکی امداد بذات خود کوئی بُری چیز نہیں کہلائی جا سکتی۔ غیر ملکوں سے جو سرمایہ لینے کا تخمینہ ہے وہ پورے مجوزہ اخراجات کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

س۔ اگر مزید بیرونی امداد نہیں ملتی تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ٹیکسوں کی صورت میں لوگوں کو زیادہ بوجھ برداشت کرنا پڑے گا اور اشیاء کے استعمال میں کمی واقع ہوگی۔

ج۔ ہاں یہ صحیح ہے۔ اگر ہم پلان کی مدت میں وہ مزید غیر ملکی امداد حاصل نہیں کر سکتے جو اس وقت ہمیں حاصل کرنے کا خیال ہے۔ تو زیادہ روپیہ حاصل کرنے کے لئے ملک میں ٹیکسوں قرضہ اور خسارے کی بجٹ کے سوا اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہے گا۔ اور نتیجے کے طور پر ملک میں اشیاء کے استعمال کے معیار کے ساتھ اس کی شکر ناگزیر ہو جائے گی۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ مستقل ترقی کے لئے مضبوط بنیادیں قائم کریں تو پلان کا حجم ہرگز کم نہ کیا جائے۔ آج کی قربانیاں چند سال بعد یقیناً بارآور ہوں گی۔

س۔ اس پلان کے نتیجے کے طور پر ہندوستان کی قومی آمدنی میں کس حد تک اضافے کا امکان ہے۔

ج۔ بنیادی طور پر اس پلان کی نوعیت ایک تمہیدی انداز کی ہے یہ مستقبل کی توسیع و ترقی کی بنیادیں قائم کر رہا ہے۔ لہٰذا اس مدت میں کی ہوئی کوششوں کے نتائج فوری طور پر ظہور پذیر نہیں ہوں گے۔ بلکہ آنے والے برسوں میں کمیونٹی کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔ تاہم اس مدت میں بھی قومی آمدنی میں ایک ایسے اضافے کی توقع ہے جسے محسوس کیا جا سکے گا اندازہ لگایا گیا ہے کہ پانچ سال کی مدت میں قومی ترقی جو اس وقت ایک ہی مقام پر آئی ہوئی ہے ۹۰۰ کروڑ روپے سے ۱۰۰۰ کروڑ روپے تک جائے گی۔ یہ اضافہ ۱۱ سے ۱۲ فیصدی تک ہوگا یہ اضافہ بظاہر متوسط درجے کا نظر آ سکتا ہے لیکن اس موقع پر اس سے زیادہ اضافے کی توقع کرنا حقیقت سے آنکھیں بند کرنا ہوگا۔

رفتار زمانہ

یورپی دفاعی برادری

یورپی دفاعی برادری کے متعلق ۶ یورپی طاقتوں کی طرف سے یہ آخری اعلانیہ جاری ہوگیا کہ یورپی دفاعی برادری (ای۔ ڈی۔ سی) کے منصوبے میں تبدیلیوں کے متعلق ان میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکا۔ اعلانیے میں کہا گیا ہے کہ کانفرنس میں اس بات سے سب نے یہاں تک کہ فرانس نے بھی اتفاق کیا کہ جرمنی کو غیر جانبدار نہیں رہنا چاہیئے۔ مسٹر ڈیوڈ بروس نے جو یورپ میں امریکہ کے گشتی سفیر ہیں ایک آخری کوشش کی کہ فرانس اور یورپی دفاعی برادری کے دوسرے شرکا۔ میں جو خلیج حائل ہوگئی ہو وہ پُر ہوجائے لیکن یہ کوشش بھی ناکام ثابت ہوئی۔

فرانس کے وزیر اعظم مندیس فرانس اس پر اڑے رہے کہ جن جوابی تجاویز سے خود ان کو اتفاق نہیں ہے، انھیں منظور کرکے وہ فرانسیسی پارلیمنٹ کو کیا منہ دکھائیں گے۔ مندیس فرانس کو ان میں تین نکات پر اصرار تھا۔

(۱) اگر امریکہ یا برطانیہ براعظم یورپ سے اپنی فوجیں ہٹائیں یا یا اگر وہ یورپی دفاعی برادری کے باب میں اپنی پالیسی بدل دیں، یا اگر متحدہ جرمنی اس دفاعی برادری میں شامل نہ ہو تو فرانس کو یورپی دفاعی برادری سے الگ ہونے کا اختیار ہونا چاہیئے۔

(۲) برادری کے ہر ممبر ملک کو آٹھ سال تک یہ حق ہونا چاہیئے کہ اگر وہ برادری کے حکام اعلیٰ کے کسی فیصلے کو اپنے قومی مفاد کے لئے خطرناک سمجھے تو وہ اس فیصلے کے خلاف اپیل کرسکتا ہے، اور جب تک اپیل کا کوئی نتیجہ نہ نکلے اس فیصلے پر عملدر آمد نہ ہو۔

(۳) فرانس یہ حق چاہتا ہے کہ اس کی صرف وہ افواج یورپی فوج میں شامل کی جائیں جن کا تقرر جرمنی میں ہو۔

کانفرنس کے پانچ اجلاس ہوئے جن میں مجموعی طور پر ۲۵ گھنٹے بحث ہوئی۔ آخری اجلاس میں دو متقابل فارمولے پیش ہوئے۔ ایک بلجیم کے وزیر اعظم ہنری اسپاک نے پیش کیا، اور دوسرا فرانس کی طرف سے پیش ہوا۔ فرانسیسی تجاویز اس خیال سے مرتب کی گئی تھیں کہ فرانس کی قومی اسمبلی میں یورپی دفاعی معاہدے کی تصدیق ہوسکے۔ دوسری طرف ہنری اسپاک نے اپنی تجاویز میں پرانی تجویز سے زیادہ سے زیادہ قریب پہنچنے کی کوشش کی تھی۔

امریکا کے سکریٹری آف اسٹیٹس مسٹر ڈلس نے فرانس کے وزیر اعظم سے آخری اپیل کی تھی کہ ای۔ ڈی۔ سی کو اپنی موت آپ مرنے سے بچایا جائے۔ لیکن مندیس فرانس بڑی انقلابی ذہنیت کے مالک ہیں۔ ہند چینی میں عارضی صلح کے مسئلے میں کامیابی ان کی پامردی اور استواریٔ عزم کی دلیل ہے۔ انھوں نے فرانس کے مفاد کو قربان کرنے سے انکار کردیا۔

سیاٹو

(ایس ای۔ اے۔ ٹی۔ او) جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کو عملی کی آرگنیزیشن میں منضبط کرنے کا جو ڈھونگ مغربی اقوام کی طرف سے رچایا جانا قرار پایا تھا وہ قریب قریب ختم ہوگیا۔ ہندوستان، برما اور انڈونیشیا نے تو اس کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کر ہی دیا تھا سیلون نے بھی ان ہمسایہ ملکوں کی مرضی کے خلاف اپنی عدم آمادگی ظاہر کردی ہے، اب صرف پاکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے اس آرگنیزیشن میں شمولیت کے لئے آمادگی ظاہر کی ہے۔

ہند چینی

جنیوا کانفرنس کی کامیابی کے لئے جہاں ہندوستان کے نمائندوں کی کوششیں ذمہ دار ہیں وہاں مندس فرانس کا عزم مستقل بھی قابل داد و ستائیش ہے۔ پنڈت جواہرلال نہرو کا یہ تصور کہ ایشیا امن کا سانس لے

پورا ہوگیا۔ ہند چینی میں یوں تو سات سال سے باقاعدہ جنگ جاری تھی۔ لیکن اصل میں اس کا آغاز سنہ ۱۹۴۰ء میں ہوگیا تھا۔ جب یورپ میں شکست خوردہ فرانس نے جاپانیوں کو چین کے خلاف محاذ جنگ کے لیے شمالی ہند چینی کو اڈے کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۵ء میں فرانسیسی عمل دخل ختم ہوگیا اور باؤ دائی کو کٹھ پتلی ریاست کا تاجدار بنا دیا گیا۔ یہاں سے مخالفت کی ابتدا ہوئی اور ویٹ منہہ انقلاب کا علم بلند ہوا۔ انقلابیوں نے ہنوئی پر قبضہ کرکے ہوچی منہہ کو ویٹ نام کا صدر بنا دیا۔ اس کے بعد جنگ اور خونریزی کی ایک مسلسل داستان ہے۔ مقام شکر ہے کہ اب یہ باب ختم ہوچکا ہے۔ نئی دہلی میں طرفین کے نمائندوں کی کانفرنس ہوئی۔ فرانس، لاؤس، کمبوڈیا، ویٹ نام اور ویٹ منہہ کے نمائندوں نے مصالحتی گفتگو میں حصہ لیا۔ قیام امن کا کام سال دو سال میں ختم ہونے کی امید ہے۔

آزادیٔ اقوام

برطانیہ اور مصر کے مابین سویز کے متعلق جو معاہدہ ہوا ہے وہ مشرق وسطیٰ کے مستقبل کے لئے ایک فال نیک ہے۔ اس معاہدے کی رُو سے سویز کے علاقے کو برطانوی فوجیں بیس مہینوں کے اندر اندر خالی کردیں گی، ادھر ٹیونس میں قانونی اصلاحات کا اعلان کردیا گیا ہے۔ ٹیونس کو اندرونی آزادی دے دی جائے گی۔ صرف دفاع اور امور خارجہ فرانس کے ہاتھ میں رہیں گے۔ ٹیونس کے بے اور جلا وطن قومی لیڈر حبیب نے ان اصلاحات کا خیر مقدم کیا ہے۔

ہندوستان میں فرانسیسی مقبوضات کو ہندوستان کے حوالے کرنے کے سلسلے میں گفت و شنید ہو رہی ہے۔ پرتگال حکومت ابھی پرتگالی مقبوضات کو حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں لیکن اس بات کے لئے آمادہ ہے کہ گوا اور دوسرے پرتگالی مقبوضات میں صحیح حالات کا جائزہ لینے کے لئے غیر جانبدار افراد کو بھیجا جائے، جو ان مقبوضات اور مقبوضات کے باہر کے حالات سے دونوں حکومتوں کو مطلع کریں۔ اس سے کم از کم اتنا تو ہوگا کہ گفت و شنید کا دروازہ کھل جائے گا۔ ہندوستان میں غیر ملکی مقبوضات کے سلسلے میں پنڈت جواہر لال نہرو بارہا اعلان کرچکے ہیں کہ مغربی ممالک کی نوآبادیاتی ذہنیت کو اب ختم ہوجانا چاہیئے اور ہمارے ملک کے ان حصوں کو ہمارے ملک میں شامل ہوجانا چاہیئے۔ اس سے کوئی خاص مالی یا ملکی فائدہ مقصود نہیں لیکن یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جو اگر حل ہوجائے تو دونوں ملکوں بلکہ دنیا بھر کے لئے مفید ہے۔ ایسے ہی ایک نفسیاتی مسئلے کا ذکر یہاں ناگزیر ہے۔ ہالینڈ اور انڈونیشیا کی برائے نام یونین ابھی باقی تھی۔ حالانکہ انڈونیشیا کو کامل آزادی مل چکی ہے۔ ہیگ میں دونوں ملکوں کی ایک کانفرنس چھ ہفتے تک جاری رہی۔ آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ اس برائے نام یونین کو بھی ختم کردیا جائے اور دونوں ملکوں میں بین الاقوامی تعلقات قائم کرلئے جائیں۔ ہر صاحب عقل آدمی دونوں ملکوں کے اس فیصلے کی داد دیگا۔

ہائی کورٹ راجستھان کا جاگیرداروں کے خلاف فیصلہ

راجستھان ہائی کورٹ نے راجستھان جاگیرداری خاتمہ ایکٹ کو جائز قرار دے دیا ہے۔ جاگیرداروں نے اپنی درخواستوں میں یہ دلیل پیش کی تھی کہ حکومت کی طرف سے جاگیروں کا حصول ودھان کی دفعہ ۲۲۶ کے تحت جاگیرداروں کے بنیادی حقوق پر چھاپہ مارنے کے مترادف ہے۔ لیکن ہائی کورٹ کے فل بنچ نے اس دلیل کو تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ یہ فیصلہ دیا کہ معاوضہ دے کر حکومت کو جاگیروں پر قبضہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

غذائی محاذ پر غیر معمولی کامیابی

(۱) پانچسالہ پلان کے تحت ۱۹۵۵-۵۶ء کے اختتام تک اناج کی پیداوار میں ۷۶ لاکھ ٹن کا اضافہ کرنے کا پروگرام مرتب کیا گیا تھا لیکن ۱۹۵۳-۵۴ء میں ہی اناج کی پیداوار میں اضافے کا اندازہ پچانوے لاکھ ٹن کے لگ بھگ ہے۔

(۲) پانچسالہ پلان میں چودہ فی صدی اضافے کی حد مقرر کی گئی تھی، لیکن پلان کے تیسرے سال میں ہی پیداوار تقریباً بیس فی صدی بڑھ گئی ہے۔

(۳) پلان پر آغاز عمل سے پہلے سال ۱۹۵۰-۵۱ء کے مقابلے میں ۱۹۵۳-۵۴ء میں اناج کی پیداوار میں ۳۳ فی صدی کا اضافہ ہوا ہے (چاول ۴۳ فی صدی۔ گندم ساڑھے بارہ فی صدی اور دیگر اقسام کے اناج اکتالیس فی صدی)

بھارت میں بجلی کی پیداوار میں اضافہ

آج کل کسی ملک کی نہ صرف صنعتی ترقی بلکہ عوام کی خوش حالی کا راز

بجلی کی پیداوار میں مضمر ہے۔ اگر بجلی ارزاں قیمت پر فراہم ہو سکے تو عوام کو سینکڑوں سہولتیں میسر آ جائیں گی۔ بجلی دو طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے، ایک تو کوئلے وغیرہ سے اور دوسرے آبشاروں سے۔ کوئلہ مہنگا پڑتا ہے، اس لئے ہر ملک کی کوشش یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے پانی سے بجلی پیدا کی جائے۔ چنانچہ اٹلی میں بجلی کو سفید کوئلے کا نام دیا جاتا ہے — ہندوستان میں بھی بجلی پیدا کرنے کے مختلف پروجیکٹ زیر تکمیل ہیں۔ ان میں سے دامودر ویلی پروجیکٹ اور تانگل یا نیڈل چینل قابل ذکر ہیں۔ بجلی کی پیداوار میں اضافے کی رفتار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں اس وقت ۶ ارب ۳۶ کروڑ ۳۷ لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا ہو رہی ہے، جب کہ ۱۹۳۹ء میں اس کی پیداوار ۲ ارب ۴۳ کروڑ ۹۹ لاکھ کلوواٹ تھی۔

شہری ہوابازی اور موسمیات کی ترقی

۱۹۵۳ء میں ہوائی نقل و حمل کو قومیانے کے بعد سے ہندوستان میں شہری ہوابازی روبہ ترقی ہے۔ "ایر انڈیا انٹرنیشنل" اور "انڈین ایرلائینز" کی طرف سے ہوائی سروسوں کا جال بچھانے اور ہوائی سفر کو زیادہ سے زیادہ سستا کرنے کے سلسلے میں مساعی جاری ہیں — "ایرانڈیا انٹرنیشنل" بہترین قسم کے سپر کانسٹیلیشن ہوائی جہاز خرید رہی ہے۔ مشاہدہ گاہیں اور عملے کے لئے مکانات تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ پانچ سالہ پلان کے تحت ہوائی اڈوں کے تعمیری کاموں کے لئے دس کروڑ کی رقم منظور کی گئی ہے۔

بانیہال سرنگ کا پروجیکٹ

وزارت ورکس، ہاؤسنگ اینڈ سپلائی کے ایک پریس نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ حکومت ہند نے ریاست جموں و کشمیر میں بانیہال سرنگ (اوّلین مرحلہ) کی تعمیر کا ٹھیکہ جرمنی کے میسرز بارسیل اینڈ سنز کو دے دیا ہے۔ اس ٹھیکے کی لاگت تخمیناً ۷۳ لاکھ ۳ ہزار روپیہ ہے، معاہدے پر دستخط کر دئے گئے ہیں۔

کالی مرچ کی فصل کا آخری اندازہ

مرکزی وزارت خوراک و زراعت کے شعبہ معاشیات و اعداد و شمار کا ایک پریس نوٹ مظہر ہے کہ ۱۹۵۳-۵۴ء میں کالی مرچ کی فصل کا جو کل ہند آخری اندازہ مرتب کیا گیا ہے اس کے مطابق زیر کاشت رقبہ دو لاکھ آٹھ ہزار پانچ سو ایکڑ اور پیداوار بائیس ہزار تین سو ٹن ہے۔ گذشتہ سال یعنی ۱۹۵۲-۵۳ء میں نظرثانی کردہ اندازے کے مطابق رقبہ زیر کاشت دو لاکھ چار ہزار آٹھ سو ایکڑ اور پیداوار اکیس ہزار چھ سو ٹن تھی۔

ان اعداد و شمار سے رقبہ زیر کاشت میں ۱٫۸ فی صدی اور پیداوار میں ۳٫۲ فی صدی کا جو اضافہ ظاہر ہوتا ہے وہ صرف مدراس میں ہوا ہے۔

ریل گاڑیوں کے مکمل ڈبے تیار کرنے والی فیکٹری

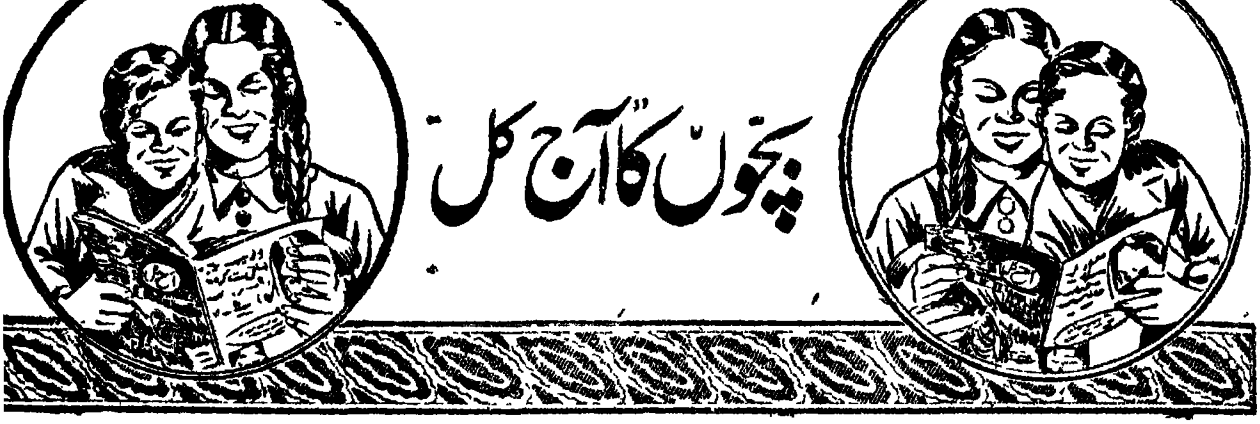
آج کل مدراس کے نواح میں پیرامبور کے مقام پر ہندوستان میں ریل کا مکمل ڈبہ تیار کرنے والی فیکٹری کی اسمبلی شاپ کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہے۔ اور آج سے ایک سال کے بعد اس فیکٹری میں کام کرنے کے ہر چھ گھنٹے کے بعد ریل کا ایک ڈبہ تیار ہو جایا کرے گا۔ اسمبلی شاپ کے ساتھ دیگر نو کارگاہیں بھی تعمیر ہوں گی۔ اور یہ سب مل کر ایک فیکٹری کی صورت اختیار کر لیں گی۔ ان کل کارگاہوں کو ایک ایسی صورت میں تعمیر کیا جائے گا کہ فیکٹری کے ایک راستے سے خام مال داخل ہوگا اور دوسرے راستے سے ریل کا ایک تیار ڈبہ باہر آ جائے گا۔ فیکٹری میں کام کی ایک شفٹ میں چار ہزار سے زائد مزدور کام کریں گے اور ساڑھے تین سو گاڑیاں سالانہ تیار ہوں گی۔

اس "انٹیگرل کوچ فیکٹری آرگنائزیشن" میں عملے کے لئے تربیت کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۵۵ء میں جو اسکول جاری کیا گیا تھا اُس میں ۷۰ امیدوار اپنا نصاب مکمل کر رہے ہیں۔ پہلے چار سال میں ہر سال تقریباً ۶ سو کاریگروں کو تربیت دی جائے گی، اور اس مدت کے بعد ساڑھے تین سال کی مسلسل اسکیم کے تحت ایک سو پچاس امیدواروں کو تربیت دی جائے گی۔ اس فیکٹری میں جو ڈبے تیار کئے جائیں گے اُن کا وزن ۳۵ ٹن یعنی موجودہ ڈبوں سے سات ٹن کے قریب کم ہوگا۔ اور وہ ڈھالے ہوئے فولاد سے تیار کئے جائیں گے۔

ضروری عملے کے لئے فیکٹری کے قریب ہی ۳۲ ایکڑ کا ایک چھوٹا سا قصبہ بھی تعمیر کیا جائے گا جس میں مختلف نمونوں کے چار سو کوارٹرز ہوں گے۔



بچوں کو ہر روز گندگی کے جراثیم سے بیماری کا خطرہ رہتا ہے۔
لائف بوائے سے ان جراثیم کو ان کے جسم سے دھو کر ہر روز ان کی حفاظت کیجئے۔
لائف بوائے کا "محافظ جھاگ" انکی تندرستی کی حفاظت کرتا ہے۔
لائف بوائے صابن
ہر روز کی گندگی کے جراثیم سے آپکی حفاظت کرتا ہے
LIFEBUOY
SOAP
ہندوستان میں بنا ہوا



اشرف النساء اشرف

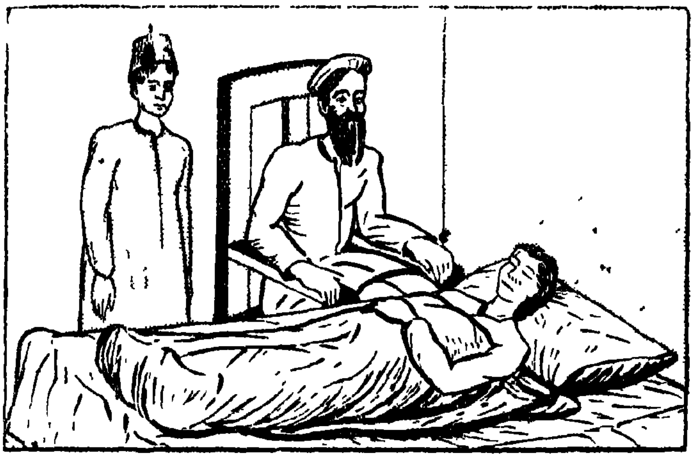
شام

گاتے ہوئے وہ گیت رسیلے
پاؤں اُٹھاتے دھیرے دھیرے
بل کھاتی اِٹھلاتی آئی
آئی شام سُہانی آئی
رات کے اندھیارے سے ڈر کر
دن نے اوڑھ لی کالی چادر
پنچھی اپنے گھر کو بھاگے
چندا چونکا تارے جاگے
سُورج بھاگا رات سے ڈر کر
جا دبکا ہے غار کے اندر
بہتے چشموں نے چُپ سادھی
ٹھٹکیں لہریں سیدھی سادی
چمکے ننھے ننھے تارے
سُندر سُندر پیارے پیارے
بچے رونا دھونا بھولے
نندیا کے جھولے میں جھولے
باغ میں مہکی رات کی رانی
ڈال کے سر پر آنچل دھانی
دُنیا پر تاریکی چھائی
پنکھ پسارے نندیا آئی

سو جا اشرف تو بھی سو جا
سپنوں کی دُنیا میں کھو جا

نکی انور

انمول دولت



افراد

نصر - بارہ چودہ سال کا ایک لڑکا
نصر کی ماں
حکیم صاحب - ایک حکیم صاحب
سردار - ڈاکوؤں کا سردار
رضا، انجم اور بہت سے دوسرے ڈاکو - تاجروں کے قافلے کا سردار اور بہت سے تاجر -

پہلا منظر

وقت - رات کا پہلا پہر　　　　مقام - نصر کے گھر کا ایک کمرہ

(پردہ اُٹھتا ہے تو ایک چھوٹا سا معمولی سا کمرہ نظر آتا ہے - سامنے طاق پر مٹی کا ایک چراغ جل رہا ہے - کمرے کی ایک کھڑکی کھلی ہے اور ہوا کے جھونکے سے چراغ کی لو کانپ رہی ہے - کمرے میں مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی ہے ایک چارپائی پر ادھیڑ عمر کی ایک بیمار عورت (نصر کی ماں) چادر تانے کراہ رہی ہے - دوسری طرف طاق پر دو شیشیاں اور ایک شیشے کا گلاس رکھے ہیں - ایک اور طاق پر مٹی کی صراحی پڑی ہے - دو منٹوں تک نصر کی ماں یوں ہی پڑی کراہتی رہتی ہے - پھر بارہ چودہ سال کا ایک لڑکا (نصر) اور ایک ضعیف سفید ریش بزرگ (حکیم صاحب) کمرے میں داخل ہوتے ہیں - اور پھر ——]

نصر - (روتے ہوئے حکیم صاحب سے) میری ماں کو بچا لیجئے حکیم صاحب میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا - آپ کا غلام بن کر رہوں گا حکیم صاحب - ساری عمر آپ کی خدمت کرتا رہوں گا - میرا کوئی نہیں ہے حضور مجھے کوئی پیار کرنے والا نہیں ہے حکیم صاحب، میری ساری کائنات میری ماں ہے - میری ماں کو بچا لیجئے حکیم صاحب - ہم لوگ بہت غریب ہیں حکیم صاحب - ہم آپ کو دے تو کچھ بھی نہیں سکتے ...؛

(نصر کی ماں ہاتھ کے اشارے سے نصر اور حکیم صاحب کو پاس بلاتی ہے - پھر بہت ہی نحیف آواز میں)

نصر کی ماں - تم نہیں جانتے میرے لال - میرے پاس پچاس اشرفیاں ہیں - حکیم صاحب! ان میں سے جتنا بھی خرچ ہو - آپ خرچ کیجئے لیکن میرے لال کے سر پر اس کی ماں کا سایہ قائم رکھئے - میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی —— (نصر سے) بیٹے آنگن میں انگور کی بیل کے نیچے گلاب کی جڑ کے پاس زمین کھودو - تمھیں مٹی کی ایک ہانڈی ملے گی - اس میں پچاس اشرفیاں ہیں لا کر حکیم صاحب کے حوالے کر دو -

(نصر جانے لگتا ہے - حکیم صاحب اُسے ہاتھ پکڑ کر روک لیتے ہیں)

حکیم صاحب - (نصر کی ماں سے) ابھی اس کی کوئی ضرورت نہیں

معزز خاتون - آپ اطمینان رکھئے - کوشش کرنا میرا کام ہے - میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ صحت یاب ہو جائیں - کسی کو زندگی بخشنا البتہ میرے بس میں نہیں -

(حکیم صاحب نبض دیکھنے لگتے ہیں - نصر چپ چاپ کھڑا ہے نبض دیکھنے کے بعد حکیم صاحب کا چہرہ بالکل اُداس ہو جاتا ہے اور نصر چیخ کر حکیم صاحب سے لپٹ جاتا ہے -

نصر - میری ماں کو کیا ہوا ہے حکیم صاحب ؟ کیا ہوا ہے حضور - آپ میری ماں کو بچا لیجئے حضور ــــ بچا لیجیے میرے آقا . . .

(چراغ کی لو ٹمٹمانے لگتی ہے اور نصر کی ماں نصر کو پاس بلاتی ہے)

نصر کی ماں (اور بھی نحیف آواز میں رُک رُک کر) "میرے بچے میں تمھیں ایک انمول چیز دیتی ہوں اس کی قدر کرنا میرے لال اور اسے بچا کر رکھنا ــــ میرے لال' چاہے جان چلی جائے مگر جھوٹ کبھی نہ بولنا ــ کبھی جھوٹ نہ بولنا -

(نصر اپنی ماں سے لپٹ جاتا ہے - کچھ دیر اُس کی چھاتی میں اپنا چہرہ رگڑتا رہتا ہے - پھر یک لخت دوڑ کر باہر بھاگتا ہے - حکیم صاحب اپنی جیب سے ایک پُڑیا نکال کر کوئی سفوف پانی میں گھول کر نصر کی ماں کو پلا دیتے ہیں اور پھر نبض دیکھنے لگتے ہیں - لیکن اُن کا چہرہ اور بھی اُداس ہو جاتا ہے اور چراغ اور بھی ٹمٹمانے لگتا ہے - پھر نصر اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی تھیلی لیے ہوئے آتا ہے اور پاگلوں کی طرح بڑبڑانے لگتا ہے ــــ)



نصر - آپ یہ سب لے لیجیے حکیم صاحب - پچاس اشرفیاں لے لیجیے حکیم صاحب' جو میری ماں نے محنت مزدوری کر کے جمع کی ہیں - دن رات محنت کر کے جمع کی ہیں حکیم صاحب مگر میری ماں کو بچا لیجیے حضور ــــ بچا لیجیے حضور -

حکیم صاحب (نصر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) میرے بچے - خدا تمھارے سر پر تمھاری ماں کا سایہ سلامت رکھے - اس دُعا کے علاوہ میرے پاس کوئی دوا نہیں میرے بیٹے - زندگی کی قیمت دُنیا کے بڑے بڑے خزانے میں بھی نہیں میرے بچے - موت کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے - اگر ہے تو بس دُعا -

(نصر مُنہ کھولے حکیم صاحب کی طرف دیکھنے لگتا ہے - چراغ کی لو ٹمٹماتے ٹمٹماتے یکایک بجھ جاتی ہے اشرفیوں کی تھیلی جھن جھنا کر نصر کے ہاتھ سے گر جاتی ہے اور وہ زور سے چیخ کر دوڑتا ہے اور ماں سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگتا ہے - پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے

دوسرا منظر

وقت - بھور　　　　مقام - پہاڑی کا دامن

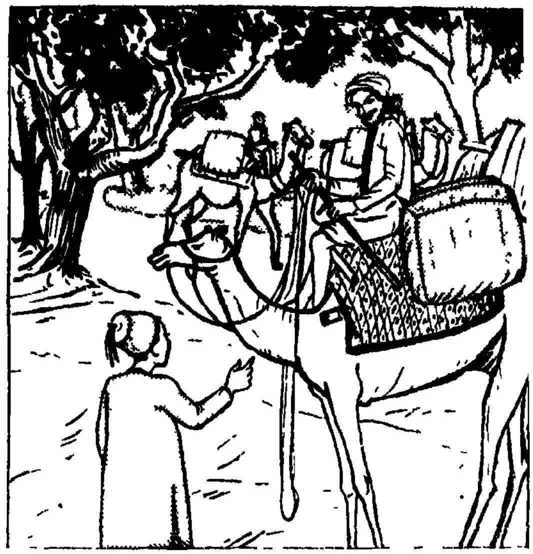
[اونٹوں پر سوار تاجروں کا ایک قافلہ گزر رہا ہے - سب سے آگے کے اونٹ پر بیٹھا ہوا نوجوان تاجر بڑی میٹھی اور سُریلی آواز میں کچھ گا رہا ہے ــ یکایک نصر دوڑتا ہوا آتا ہے اور قافلے کے آگے آکر سلام کر کے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے ــــ]

نوجوان تاجر (گانا روک کر۔ سلام کا جواب دے کر) تم کون
بچے کیا چاہتے ہو؟

نصر۔ میرا نام نصر ہے۔ میں بہت دنوں سے تاجروں کے کسی
ملے کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے آپ کے سردار سے باتیں کرنی ہیں
بانی کر کے مجھے بتائیے کہ آپ کے سردار کون ہیں؟

نوجوان۔ میں ہی اس قافلے کا سردار ہوں بچے۔ بتاؤ تمھیں
کہنا ہے؟

نصر۔ حضور تقریباً ایک ماہ ہوا۔ میری ماں اس دُنیا سے
چ کر گئی۔ میرے پاس پچاس اشرفیاں ہیں۔ میں اکیلا ہوں۔ قبیلے



ے غنڈے میری اشرفیاں مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں ۔ میں
ہاڑیوں میں چھپا پھرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان اشرفیوں سے
ا بھی کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کروں۔ کیا آپ مہربانی کر کے مجھے
پنے ساتھ لے چلیں گے؟ میری کمر میں اشرفیاں بندھی ہیں۔ مگر
برے پاس اونٹ نہیں اگر آپ مجھے قافلے کے کسی اونٹ پر بٹھالیں
ہیں کرایہ ادا کر دوں گا۔

نوجوان۔ اس کی ضرورت نہیں بچے۔ آؤ تم میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔
(نصر کا ہاتھ پکڑ کر نوجوان تاجر اُسے کھینچ لیتا ہے اور
ساتھ بٹھا لیتا ہے ۔۔۔ نوجوان پھر گانا گانے لگتا ہے
اور قافلہ آگے بڑھنے لگتا ہے۔ پردہ آہستہ آہستہ
گرتا ہے ۔۔۔]

تیسرا منظر

وقت۔ آدھی رات   مقام۔ گھنے جنگلوں میں پہاڑ کا ایک گُفا

[پہاڑ کے گُفے میں کچھ بہت ہی بھیانک شکل کے ڈاکو
بیٹھے شراب پی رہے ہیں اور آپس میں کچھ باتیں کر رہے
ہیں۔ اتنے میں پس منظر سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز
سُنائی دیتی ہے اور ڈاکوؤں کا سردار بہت خوش ہو کر
اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے ۔۔۔]

سردار۔ زندہ باد انجم' زندہ باد رضی ۔۔۔ میرے دوستو میرا
دل کہتا ہے انجم اور رضی ضرور کوئی اچھی خبر لے کر آ رہے ہیں۔ درزی
کا وہ لونڈا رضی بہت ہی ہوشیار مخبر نکلا' اور وہ اُلٹی سیدھی تصویریں
بنانے والا انجم' دیکھ لینا میرے دوستو' ایک مشہور لٹیرا نکلے گا۔
پہلے دوسرے مصوّروں کی تصویریں چُرا کر اپنے نام سے بیچتا تھا اب
دوسروں کی دولت لُوٹے گا۔ ہا ہا ہا ہا ۔۔۔

(گھوڑے پر سوار دو ڈاکو (رضی اور انجم) گفے کے سامنے
آ کے گھوڑے سے اُترتے ہیں۔ پھر سردار کے سامنے
جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر رضی کہنے لگتا ہے)

رضی۔ سردار کی شان سلامت رہے! حضور تاجروں کا ایک
بہت بڑا قافلہ نہر نور کے پاس سے گزرتا ہوا ادھر کو آ رہا ہے

انجم۔ سردار کا جاہ قائم رہے! غلام سمجھتا ہے کہ بھور تک
وہ قافلہ یہاں تک پہنچ جائے گا۔

سردار۔ لُٹنے کے لئے ——ہمیں اپنی دولت دینے کے لئے
ہاہاہاہا —— آؤ میرے وفادار غلامو! اس خوش خبری کے لئے کچھ پی
لو۔ پھر ہمیں تیار ہو جانا چاہئے ۔
(رضی اور انجم بھی گُفے میں داخل ہو جاتے ہیں اور
پردہ گرتا ہے)

چوتھا منظر

وقت۔ بھور   مقام۔ کسی پہاڑی کا دامن۔ جس کے جھنڈ میں ڈاکو
چھپے ہیں۔

[تاجروں کا قافلہ آہستہ آہستہ گزر رہا ہے۔ آگے کے
اونٹ پر نوجوان اور نصر سوار ہیں۔ نوجوان کوئی دوسرا
گانا گا رہا ہے۔ اور قافلہ آگے بڑھ رہا ہے۔ یکایک
پیچھے سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی پڑتی ہے
قافلہ رُک جاتا ہے۔ گانا بند ہو جاتا ہے۔ لوگ گھبرا
جاتے ہیں —— جلد ہی بہت سے ڈاکو گھوڑے پر سوار
آتے ہیں اور قافلے کو پہلے گھیر لیتے ہیں پھر لوٹ مار
شروع کر دیتے ہیں۔ قافلے والے بھی لڑتے ہیں۔
گھمسان کی لڑائی ہوتی ہے۔ کچھ قافلے والے مرتے ہیں
کچھ بھاگ جاتے ہیں، کچھ گرفتار ہوتے ہیں۔ ڈاکوؤں
میں سے بھی ایک آدھ مرتے ہیں۔ نصر بھی لڑ رہا ہے پھر
اُسے گرفتار کر کے ایک درخت سے باندھ دیا جاتا ہے
ایک گھنٹے تک لوٹ مار کا بازار گرم رہتا ہے۔ پھر
ایک ڈاکو نصر کے پاس آکر پوچھتا ہے ——]

ڈاکو۔ بتا، تیرے پاس کیا ہے؟
نصر۔ میرے پاس پچاس اشرفیاں ہیں۔
ڈاکو۔ (اپنے ساتھی سے) ہش! کم بخت مذاق کرتا ہے۔
یہ سردار کا حقّہ بردار لونڈا معلوم ہوتا ہے۔ اسے کھول دو۔
(نصر کو کھول دیا جاتا ہے اور وہ بہت ہی اُداس ایک
طرف بڑھنے لگتا ہے اور پردہ گرتا ہے)

پانچواں منظر

وقت۔ سورج نکل رہا ہے۔ مقام۔ پہاڑی کا گُفا۔ ڈاکوؤں کا اڈا

[سارے ڈاکو جمع ہیں اور بیچوں بیچ اشرفیوں کی
ایک ڈھیری پڑی ہے ——]

سردار۔ ہاہاہاہا —— زندہ باد انجم، زندہ باد رضی —— بلکہ
زندہ باد تاجروں کا قافلہ —— کسی کے پاس پھوٹی کوڑی بھی رہ تو



نہیں گئی میرے دوستو؟
ایک ڈاکو۔ تقریباً کسی کے پاس نہیں۔
رضی۔ ہم نے تو بعض کے اچھے کپڑے بھی اُتار لئے۔
سردار۔ شاباش! ہو آخر درزی کے لونڈے۔ سلوا کر
کام میں لے آنا —— ہاہاہاہا
ایک ڈاکو۔ سردار کی آن زندہ رہے! ایک حقّہ بردار

لونڈے سے غلام نے پوچھا کہ تیرے پاس کیا ہے تو اُس نے مذاق سے کہا' پچاس اشرفیاں۔ ہم نے اُسے چھوڑ دیا —

سردار۔ (غصّے سے) اُسے اس مذاق کی سزا ملنی چاہئے جاؤ تلاش کر کے اُسے حاضر کرو۔

(وہ ڈاکو جلدی سے سلام کر کے باہر نکل جاتا ہے۔ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آتی ہے۔ آواز مدھم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے۔ مگر کچھ ہی دیر بعد گھوڑے کی ٹاپوں کی مدھم سی آواز آتی ہے جو آہستہ آہستہ تیز ہوتی جاتی ہے اور پھر وہی ڈاکو اپنے ساتھ نصر کو لئے گپھے میں داخل ہوتا ہے)

ڈاکو۔ یہ ایک پتھر پر بیٹھا رو رہا تھا۔ اسے تلاش کرنے میں ہمیں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی۔

سردار۔ (کڑک کر) حقّہ بردار لڑکے۔ تو نے ہمارے آدمیوں کے ساتھ دِل لگی کی ہے۔

نصر۔ (دلیری سے) نہیں میں نے کوئی دل لگی نہیں کی۔ اور میں حقّہ بردار نہیں ہوں۔ میں ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہوں

سردار۔ تو بتا تیرے پاس کیا ہے ؟

نصر۔ میرے پاس پچاس اشرفیاں ہیں۔

سردار۔ کہاں ہیں وہ اشرفیاں ؟

(نصر اپنی کمر سے اشرفیوں کی چھوٹی سی تھیلی نکال کر جھن جھناتا ہے —)

نصر۔ یہ رہیں وہ اشرفیاں۔ مَیں جھوٹ کبھی نہیں بولتا

سردار۔ ہائیں — اس کے پاس تو سچ مچ اشرفیاں ہیں۔

(سب ڈاکو ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگتے ہیں)

نصر۔ کیا اب مَیں جا سکتا ہوں ؟

سردار۔ بچّے۔ اگر تو بہانہ کر دیتا تو یہ پچاس اشرفیاں تیرے پاس بچ رہتیں۔

نصر (ہنس کر) ان حقیر پچاس اشرفیوں کی کیا حقیقت ہے سردار اگر میری جان بھی جاتی رہے تو مَیں جھوٹ کبھی نہیں بولوں گا۔

سردار۔ کیوں

نصر۔ اس لئے کہ یہ میری ماں کی آخری وصیّت ہے۔ یہ انمول دولت میری ماں نے مجھے بخشی ہے سردار۔

سردار۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) ماں — پیاری ماں! میری بھی ایک ماں تھی' مجھے کتنا پیار کرتی تھی! لیکن میں نے اس کی ہدایتوں پر کبھی عمل نہیں کیا۔ ماں —! اور آج میں ایک خونخوار ڈاکو بن گیا۔ میرے بچّے — کیا تو مجھے اپنے ساتھ لے چلے گا۔ میں بھی محنت مزدوری کروں گا اور اچھّی زندگی بسر کروں گا۔

نصر۔ بشوق چلئے سردار!

رضی۔ سردار کی شان سلامت رہے! سردار یہ کیا کر رہے ہیں

(سردار اُٹھ کھڑا ہوتا ہے —)

انجم۔ سردار کی آن زندہ رہے! حضور یہ کیسا فیصلہ ہے۔ بندہ پرور کیا کر رہے ہیں ؟

سردار۔ افسوس کہ یہ سب کچھ مجھے آج سے بہت پہلے کرنا چاہئے تھا' تاکہ میری ماں کی روح کو چین نصیب ہوتا۔

رضی۔ مگر اشرفیوں کی یہ ڈھیری بندہ پرور ؟

سردار۔ یہ اشرفیاں غریبوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ آج ہی' ابھی میرے سامنے —

(سب کے سب ایک دوسرے کا مُنہ بڑی حیرت سے تکنے لگتے ہیں۔ سردار نصر کو سینے سے لگا لیتا ہے۔ اور پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔ پس منظر میں ایک مدھم موسیقی مدھم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے اور پردہ گر جاتا ہے۔)

اشک امرتسری

عید منائیں



آؤ بچو عید منائیں

راگ الاپیں تال ملائیں
مل جل کر وہ شور مچائیں
ساری دھرتی سر پہ اٹھائیں
کھیلیں کودیں گائیں بجائیں
آؤ بچو عید منائیں

عید کی خوشیاں اللہ اللہ
شاد گلی آباد محلہ
گڑیا گڈا گیند اور بلا
مل مل کھیلیں اور کھلائیں
آؤ بچو عید منائیں

عید ہماری ریت ہے پیارو
ریت ہماری پریت ہے پیارو
پریت کی جگ میں جیت ہے پیارو
پریت کے بندھن میں بندھ جائیں
آؤ بچو عید منائیں

ہم ہیں زمانے میں البیلے
اپنے دم سے ہیں یہ میلے
دنیا میں ہوں لاکھ جھمیلے
یاروں کی ہیں دور بلائیں
آؤ بچو عید منائیں

ہنس ہنس کھیلیں پاپڑ بیلیں
جیون کے دکھ شوق سے جھیلیں
"بوٹا سنگھ" کو چوک سے لے لیں
"رام جنم" کو گھر سے بلائیں
آؤ بچو عید منائیں

اشک سے چل کر عید مل آئیں
اور یہ اپنا گیت سنائیں
داد نہ گر ہم اس کی پائیں
کٹی کر لیں روٹھ ہی جائیں
آؤ بچو عید منائیں

نورالہدیٰ

معلومات

جب ہندوستان میں دن کے بارہ بجتے ہیں تب !

نیویارک (امریکہ)۔ رات کا ڈیڑھ بجتا ہے ۔
لندن (انگلینڈ)۔ صبح کے ساڑھے چھ بجتے ہیں ۔
پیرس (فرانس)۔ صبح کے ساڑھے چھ بجتے ہیں ۔
برلن (جرمنی)۔ صبح کے ساڑھے سات بجتے ہیں ۔
روم (اٹلی)۔ صبح کے ساڑھے سات بجتے ہیں ۔
قاہرہ (مصر)۔ صبح کے ساڑھے آٹھ بجتے ہیں
مکہ معظمہ (حجاز)۔ صبح کے سوا نو بجتے ہیں ۔
ماسکو (روس)۔ دن کے ساڑھے نو بجتے ہیں ۔
مراقش (مغربی افریقہ)۔ دن کے ساڑھے دس بجتے ہیں ۔
کابل (افغانستان)۔ دن کے گیارہ بجتے ہیں ۔
رنگون (برما)۔ دن کا ایک بجتا ہے ۔
سنگاپور (اسٹریٹ سٹلمنٹ)۔ دن کا ڈیڑھ بجتا ہے ۔
ہانگ کانگ (چین)۔ دن کے ڈھائی بجتے ہیں ۔
ٹوکیو (جاپان)۔ دن کے ساڑھے تین بجتے ہیں ۔

لطیفہ

ایک چھوٹی لڑکی اور ایک چھوٹا لڑکا کھیل رہے تھے۔ لڑکی نے کہا "جب میں پیدا ہوئی تو دنیا کو دیکھ کر مجھے اس قدر حیرت ہوئی کہ ڈیڑھ سال تک منہ سے ایک لفظ نہ نکال سکی ۔

ظہور شوپیانی کاشمیری

لطیفے

بائیسکل والا مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میری سائیکل سے چوٹ آئی۔
بابوجی ۔ کوئی بات نہیں۔ میں شفا خانے ہی جا رہا تھا ۔

ماسٹر۔ بدتمیز! تم نے جزدان اور کتابوں پر سیاہی کے دھبے کیوں ڈالے ہیں ؟
لڑکا ۔ جناب اس لئے کہ کہیں گم نہ ہو جائیں ۔

آقا ۔ (اپنے نوکر سے) دیکھو میرے گھر میں کبھی چوری نہ کرنا ۔
نوکر۔ البتہ کہیں اور کروں تو آپ کا کوئی اعتراض نہ ہوگا ۔

ایک بچی نے ٹھیلے والے کے بیل کو کچھ گاجریں کھانے کو دیں ۔ ٹھیلے والا بچی کی اس بات پر بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا ۔
تم تو بڑی پیاری بچی ہو۔ بے زبان جانوروں سے محبت کرتی ہو۔ کہاں سے لائی ہو اس کے لئے یہ گاجریں ؟
بچی نے سر اٹھایا۔ مسکرائی ۔ اور کہا "تمہارے ٹھیلے کے پیچھے جو ٹوکری پڑی ہے اس میں سے" ۔

باپ (بیٹے سے) تم کو دو سال پڑھتے ہوئے ہو گئے ۔ کچھ ترقی بھی کی
بیٹا ۔ جی ہاں بہت زیادہ
باپ ۔ کیا ترقی کی ہے ۔
بیٹا ۔ جب میں داخل ہوا تھا تو میری املا میں دو یا تین غلطیاں ہوا کرتی تھیں۔ مگر اب دس دس بارہ بارہ ہوتی ہیں ۔

BSY-066 URDU

دس لاکھ گھروں کیلئے کھانا

ہندوستان کی سب سے بڑی ریفائنری، برماشیل
کی ریفائنری ٹرامبے (بمبئی کے نزدیک) میں واقع ہے۔ اس
میں مٹی کے تیل کی سالانہ پیداوار اتنی ہوگی کہ
دس لاکھ گھر ہر روز اپنا کھانا کیروسین (مٹی کے تیل)
کے اسٹوو پر تیار کرسکیں گے۔



برماشیل . . .
ہندوستان کی زندگی کا ایک حصہ ہے



اِتنا اچھا کھانا میں نے پہلے کبھی نہیں پکایا تھا
. . . اور میں اِس کی وجہ سے بے خبر تھی!



آج بھی کھانے کا وقت کوئی نرالا نہ تھا حسبِ دستور آج بھی وہ گھور رہے تھے۔ بچے منہ بسورے ہاتھ دھو رہے تھے اور تنہا پھر پہلا کر اُٹھ بیٹھا تھا آخرکار

سبھی کھانے کیلئے بیٹھ گئے اور میں نے کھانا پروس دیا۔ اور تب یہ چمتکار ہوا! منہ میں پہلا نوالہ ڈالنے کے بعد تو کوئی نکتہ چینی نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آج کھانے کی بازی لگی ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ میرا ہی گھر ہے۔ آخرکار مجھ سے ایسی کونسی بات صحیح ہو گئی تھی!

کھانا دیکھتے ہی منّے کے والد ہمیشہ چڑ جاتے تھے اور بچے بھی ان سے یہ عادت سیکھ گئے تھے۔ کھانا ختم ہو چکنے کے بعد میں سوچنے لگی کہ آج صبح میں بازار سے کیا کچھ خرید کر لائی تھی۔ سبزیاں؟... وہی روزمرہ والی۔ گوشت اور پھل؟... انہیں دُکانوں سے۔ اور پھر مجھے یاد ہو آیا کہ نئی بات کیا تھی! اسی صبح میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ڈالڈا وناسپتی کا ایک ڈبہ استعمال کر کے دیکھوں گی۔ دُکاندار نے اسکی سفارش کرتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ کھانا پکانے، تلنے اور مٹھائیاں بنانے کیلئے یہ ایک بالکل موزوں چکنائی ہے۔ ہوا روک مہر بند ڈبہ دیتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا "اس سے کھانا نہایت ذائقہ دار بنتا ہے، جسے آپکے گھر میں سبھی کھا کر بہت ہی خوش ہونگے"۔ ہو رہا تھا کہ مجھے یہ بھی یاد ہو آیا کہ صبح میں نے ڈالڈا میں کھانا کیسے پکایا تھا۔

کھانا پکاتے وقت جو ذائقہ میں نے چکھا تھا وہ اب تک مجھے بھولا نہیں ہے! اب میں سمجھی کہ ڈالڈا وناسپتی کی بدولت ہی یہ کرامت ہوئی۔ آپکے سبھی کھانے پکانے کیلئے یہ بہترین ہے اور ہر کھانے کا قدرتی مزہ اس سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ بازار سے کھانا پکانے کی چکنائی کھلے ڈبوں سے خرید کر آپ اپنی صحت کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں، چونکہ ہنسی سے بیچی کھانا پکانے کی چکنائی میں ملاوٹ ہو سکتی ہے اور مکھیوں



وگرد سے بیماری کے جراثیم بھی ان میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ہوا روک مہر بند ڈبوں میں ڈالڈا وناسپتی ہمیشہ تازہ، خالص اور صحت بخش ہوتا ہے۔ اب جب بھی آپ بازار جائیں تو سب سے پہلے ڈالڈا وناسپتی خریدنا نہ بھولیں۔ یہ نہایت کم خرچ ہے!

دس، پانچ، دو، ایک اور نصف پونڈ کے ڈبوں میں دستیاب ہے۔
ڈالڈا میں اب وٹامن 'اے' اور 'ڈی' شامل ہیں۔

گھر میں ہر ایک کیلئے مقوی پکوان
مفت صلاح کیلئے آج ہی اس پتہ پر لکھئے۔
دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس ۳۵۳، بمبئی ۱



HVM. 218-X85UD

ڈالڈا وناسپتی
پکانے میں بہتر ــ کم خرچ

ترتیب

بچوں کا آج کل

سرورق :- مارشل ٹیٹو

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر :- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۳ —— نمبر ۴

سالانہ چندہ :—— ہندوستان میں :- چھ رُپے / پاکستان میں :- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے :—— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ :—— ہندوستان میں :- آٹھ آنے / پاکستان میں :- آٹھ آنے (پاک)

نومبر ۱۹۵۴ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ممتاز حسین

رمز و کنایہ

صنفِ غزل کی جو تنگ دامنی ہے اس پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے، یہاں اس سے بحث نہیں ہے۔ بات اندازِ بیان کی ہے اور وہ بھی شعری اندازِ بیان کی۔ شاعری اور فلسفہ یہ دو چیزیں ایسی ہیں جو بغیر روایت کے وجود میں نہیں آتی ہیں۔ چنانچہ جب ہم اپنی شاعری کی روایت پر غور کرتے ہیں تو غزل کی روایت غالب صورت میں نظر آتی ہے۔ پچھلے دنوں جبکہ میں نے ایک مضمون "غزل یا شاعری" کے عنوان سے لکھا تھا تو اس میں رمزیہ اندازِ بیان کے بعض کمزور پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی۔ اس سے بعض حلقوں میں مخالفت پیدا ہوئی کیونکہ میں نے صرف اس کے کمزور ہی پہلو کو دھیان میں رکھا اور اس کی بعض خوبیوں کی وضاحت نہیں کی۔ آج میں ان خوبیوں کی طرف خاص طور پر رجوع کر رہا ہوں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ میں پٹڑی بدل رہا ہوں، کیونکہ میرا کام کسی صنف کی حمایت یا مخالفت نہیں ہے بلکہ اس شاعری کی حمایت ہے جس پر حقیقت اور آرٹ دونوں ہی کا اطلاق ہو سکے، جس میں زندگی کی صداقت فن کار کی صداقت میں تبدیل ہو جائے۔ بہرحال جس وقت اچھی غزلوں کا شعری اندازِ بیان ہمارے سامنے آتا ہے تو تشبیہ و استعارہ سے زیادہ، رمز و کنایہ کی تصویر آفرینی اور حقائقِ عالم کی وہ داخلی تصویر ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے جو تخیل اور جذبے کی آمیزش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ غزل کے اندازِ بیان میں تصویر آفرینی کے ساتھ ساتھ جذبہ آفرینی کا جوہر بھی ہے اور یہ دونوں چیزیں شعری اندازِ بیان کا لازمی جزو سمجھی گئی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ غزل کے اندازِ بیان سے ہماری والہانہ الفت اس بات کا بھی نتیجہ ہے کہ ہمارے بیشتر جذبات کی تہذیب اور جمالیاتی جذبے کی تربیت اسی صنفِ سخن سے ہوتی رہی ہے، گو گذشتہ ساٹھ ستر سال کے زمانے میں اور بھی اندازِ بیاں نمایاں طور سے میدان میں آ گئے۔ اور انھوں نے اب اپنے لئے اچھی خاصی زمین تیار کر لی۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ شعری عوام ابھی تک غزل ہی کے اندازِ بیان سے زیادہ مانوس ہیں

یہ ایک تاریخ کی متعین کی ہوئی حقیقت ہے۔ اس پر اسی وقت قابو پایا جا سکتا ہے جبکہ ہم اس حقیقت کو تسلیم کریں۔ اس زمانے کے ادب میں جو سیاست بہت ہی نمایاں طور سے نظر آنے لگی ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ سائنس نے مابعد الطبیعیات کو شکست دے دی ہے۔ آج کی سیاست ننگی ہے براہِ راست طبقات کی، روٹی کپڑے کی بات کرتی ہے، برخلاف اس کے گذشتہ ادوار میں بھی سیاست مختلف قسم کے فلسفیانہ یا مذہبی چولے اختیار کئے رہتی، آج کی سیاست میں سیاسی اقتصادی مطالبہ زیادہ فلسفہ کم ہے، گذشتہ ادوار کی سیاست میں مطالبہ کم فلسفہ زیادہ ہوتا تھا۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ اُن دنوں تشریحی اور توضیحی اندازِ بیان اور زندگی کے مسائل کی سیاسی اور اقتصادی جو نوعیت ہے وہ اگلے وقتوں میں نہ تھی۔ اس زمانے کے شعراء اپنے تجربات کی بنیادوں میں جا کر اُن کا اقتصادی اور سماجی تجزیہ نہ کرتے بلکہ انھیں سالم حیثیت سے دیکھتے اور اس کی شدت پر نگاہ رکھتے۔ غالب کا شعر ہے ؎

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

اس شعر میں جو بہت ہی بھرپور ہے غم کی غیر نوعی کیفیت کی شدت کا اظہار کیا گیا ہے نہ کہ یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ کس قسم کا غم ہے اور کیوں ہے۔ اس لئے یہاں اس کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ ہم اس کی نوعیت پر بھی بحث کر سکیں۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ہماری غزلیہ شاعری میں جذبات کی تجزید اور تفریق پر اتنا زور نہیں دیا گیا ہے جتنا کہ ان کی Arch typicality یا ان کی غیر منفرد حیثیت پر۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شاعری میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹایپ بھی ایک بڑے ٹایپ میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر بڑا ٹایپ تاریخ کے چھوٹے چھوٹے ادوار یا اس کے مختصر سفر کو نظر انداز کر دیتا ہے کیونکہ اس میں تبدیلی کافی طویل زمانے میں پیدا ہوتی ہے

یہی سبب ہے کہ ہمارے قدیم شعراء اپنے جذبات کو ابدیت کے پس منظر میں دیکھتے۔ ان کے خیال میں اشیاء امتدادِ زمانہ سے صورتیں بدلا کرتیں نہ کہ ماہیت، اور چونکہ حقیقت کا اطلاق ماہیت پر کیا جاتا اس لئے وہ اشیاء کے رشتوں اور انسانی رشتوں یعنی اپنے جذبات کو اُن کے محدود متعین اور اضافی تعینات میں نہ دیکھتے بلکہ غیر متعین اور دائمی صورت میں۔ لیکن بدقسمتی سے چونکہ الفاظ علامتیں ہیں متعین چیزوں کی اس لئے الفاظ کے لغوی معنی ان کی رہنمائی کرنے سے قاصر تھے تا وقتیکہ ان میں ذہنی اور جذباتی تلازمات کے باعث کوئی ایسی ایمائیت نہ پیدا ہو جائے جو تجربات کے غیر متعین اور دائمی رشتوں کی طرف اشارہ کر سکے ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس میں شاعر کا اپنا ایک مخصوص متعین تجربہ ہے جو اتنا ہمہ گیر ہے کہ رنجیت فلم نے اسے اپنا لیا ہے۔ لیکن شعر یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ اپنے اس تجربے کو اس قدر تعمیم دیتا ہے کہ بالآخر اس میں انسان اور خارجی فطرت کے رشتوں کا تعین نظر آتا ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ اس شعر کا اطلاق زندگی کے لامحدود مواقع پر کیا جا سکتا ہے اور ہر موقع پر لطف اُٹھایا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں زندہ انسانی تجربے کا تاثر ہے۔ اختیار نہ رکھنے پر اظہارِ غم ہے۔ ممکن ہے ایک کٹر قسم کا "اختیاری" اس فلسفے کو غلط ہی ثابت کر دے لیکن وہ اس تجربے کی سچائی کو کیونکر جھٹلا سکتا ہے جو کہ اس شعر میں ہے۔ اب اس شعر کو الفاظ کی نوعیت سے دیکھئے۔ یہاں کوئی بھی لفظ لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے کیونکہ تخیل نہ تو تیتر بٹیر کی گرفتاری کی طرف اشارہ کرتی ہے اور نہ کسی آدمی ہی کی گرفتاری کی طرف کہ اسے ہم تمثیل ہی کا درجہ دے سکیں، اس کے برعکس یہاں الفاظ تابع ہیں اس تخیل کے جس میں مشابہت یا مماثلت کسی امرِ واقعی سے اتفاقی ہے نہ کہ ارادی۔ رمزیہ شاعری تمثیلی شاعری سے اسی معنی میں مختلف ہے کہ تمثیل میں معنی استنباط کئے جاتے ہیں، الفاظ کو ہٹا کر۔ لیکن رمزیہ اشعار یا شاعری میں معنی استنباط نہیں کئے جا سکتے ہیں، کیونکہ جو رمزیہ علامتیں یا الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ اشیاء کے ناموں کا بدل نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ اس کے برعکس رمزیہ علامتیں اشیاء کے رشتوں کی تعمیم کے نشانات ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ الجبرے میں 'الف' 'ب' اعداد کے لئے نہیں بلکہ اعداد کے رشتوں کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ کسی شعر میں ساقی کا لفظ اس طرح استعمال کیا گیا ہے کہ وہ کسی تخیل کا جزوِ ترکیبی نہیں ہے بلکہ زید و بکر کے لئے آیا ہے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس شعر میں ساقی کی رمزیہ قدر نہیں ہے۔ لغوی ہو مجازی ہو، تمثیلی ہو، رمزیہ نہیں ہے۔ سمبل کے یہ معنی بھی نہیں کہ ہم کسی لفظ کو اس کے مجازی معنی میں استعمال کریں جیسا کہ محاوروں میں ہوتا ہے۔ "اس اخبار کا جنازہ نکل گیا" کیونکہ یہاں مجازی معنی بھی متعین ہے' ایک استعارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ سمبل ہمیشہ غیر متعین مفہوم رکھتا ہے کیونکہ وہ رشتوں کی تعمیم کی تکرار اور کثرت کے لئے استعمال ہوتا ہے نہ کہ اشیاء کے لئے سمبالک یا رمزیہ شعر وہی ہے جس کی مختلف تاویلیں ہو سکیں انفرادی حالتوں میں، نہ کہ تعمیم کے لامحدود رشتوں میں ؎

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

یہاں ساقی کا لفظ پوری تخیل کا ایک جزوِ ترکیبی بن کر آیا ہے نہ کہ علیحدہ صورت میں۔ اب یہ دیکھیے کہ امرِ واقعی میں شاعر محاکات سے کام نہیں لے رہا ہے کہ ہم یہاں کسی بھی لفظ کا کوئی مجازی معنی ڈھونڈھ سکیں، بلکہ تخیل سے جس کا مقصد اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ محسوسات کی سطح پر اس بات کو ظاہر کر سکے کہ ایک مثبت رشتہ خواہ وہ محبت کا ہو یا کسی اور شئے کا، کیونکر ایک منفی رشتے میں بدل جایا کرتا ہے، اس شعر کو اگر ایک طرف محبت اور بدگمانی کے رشتوں میں دیکھا جا سکتا ہے، تو دوسری طرف بے شمار اشیاء کے رشتوں کی روشنی میں جہاں مثبت منفی میں تبدیل ہوتا ہوا نظر آئے۔ سمبالک یا رمزیہ اشعار کی مختلف تاویلیں انفرادی حالتوں اور مواقع پر اطلاق کرنے کی صورت میں کی جاتی ہیں نہ کہ ان کی ریاضیاتی صداقت تک پہونچتے ہیں۔ اور جب کبھی آخر الذکر صورت میں دشواری پیش آئے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ یا تو شعر میں تخیل Image سے کام نہیں لیا گیا ہے یا پھر تخیل ناقص اور مبہم ہے، کسی مخصوص تجربے کے ضدین کو یا تو ایک وحدت میں سمویا نہیں گیا ہے، یا پھر کسی سالم تجربے کو اس کے ضدین کی روشنی میں دیکھا نہیں گیا ہے۔

سمبل کا استعمال شاعری میں صرف اسی لئے نہیں کیا جاتا ہے کہ اس سے اشیاء کے رشتوں کی تعمیم محسوسات کے حوالے سے ریاضیاتی سطح پر کرنے میں آسانی ہوتی ہے یہ بات دوسری ہے کہ اس مشکل کام کو کتنے لوگ انجام دے پاتے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ جذبات کی شدت یا تجربے کی اصلی کیفیت کے اظہار

کے لئے نہ کہ منطقی ترسیل کے لئے۔ بجز اس کے شاعر کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے کہ وہ تشبیہ یا استعارے کے بجائے جو کہ بالواسطہ طریقہ ہے سمبالک تخیل کا راستہ اختیار کرے جو کہ بلاواسطہ طریقہ ہے ۔

بیُو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

شعر کا تیور اور اُس کی ایمایت بتلا رہی ہے کہ وہ اپنے کلام کی طرف اشارہ کر رہا ہے، خوشنمائی چشم اور عطر بیزیٔ خون کی طرف اشارہ کر رہا ہے، لیکن اس میں وہ لطف نہ رہے گا جو تخیل سے براہِ راست متاثر ہونے میں ہے، بار بار پڑھنے اور لطف لینے میں ہے اور خونِ دل کو کسی بھی تخلیقی عمل کا استعارہ یا کنایہ سمجھ لینے میں ہے۔ کیونکہ یہاں تجربے کی شدت پر زور دیا گیا ہے نہ کہ اس کی ہمہ گیر تعمیم پر۔ سمبالک اشعار کا طریقِ اظہار تاثراتی ہوتا ہے، غیر متعین لچکدار ہوتا ہے اور جس حد تک اس میں ہمہ گیریت کے باعث تاویلات کی گنجائش ہوتی ہے وہ مبہم بھی ہوتا ہے۔ اور سمبالک شاعری کے لئے یہ بالکل ناگزیر ہے کیونکہ وہ خارجی دنیا کے عارضی اور اعتباری مظاہر کو چھوڑ کر ان کے ابدی اور دائمی مظاہر کو پیش کرتا ہے جو کہ غیر متعین اور مبہم ہوتے ہیں۔ اور جب وہ خارجی دُنیا کی خارجیت کو رد کر کے اسے اپنے جذبے میں تبدیل کر لیتا ہے تو وہ اس قسم کے سارے الفاظ سے گریز کرتا ہے جو متعین مفہوم کے ہوتے ہیں۔ وہ منطقی زبان کے بجائے جذبات اور احساسات کی زبان اختیار کرتا ہے، الفاظ کی تخیلیت (اُن کے رنگ و بو اور موسیقی) اور اُن کے جذباتی تلازمات سے کام لیتا ہے جو بعض اوقات غیر عقلی بھی ہوتے ہیں۔ خیال کی زبان اور خارجی حقیقت نگاری کے اسلوب سے اس کا سخت ٹکراؤ ہے جس کا اظہار میں اپنے مضمون غزل یا شاعری میں کر چکا ہوں یہاں اس کے دُہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ سوال یہ ہے از رُئے تحسین کہ اگر ہم کسی فن کار کی تخیل سے یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ کن چیزوں سے متاثر ہے اور کس طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے تو کیا وہ اپنا تخلیقی عمل ختم نہیں کر چکا ہے؟

حقیقت تک پہونچنے کی سعی میں تاثر نگاری کا طریقہ یا سمبالک ایمائیت سمبالزم اور امپریشنزم سے مختلف ہے، چیخوف حقیقت نگار تھا لیکن اس کا تخلیقی اسلوب تاثر نگاری کا تھا، اسی طرح لوئی اراگاں اور پال ایلوار کی انقلابی شاعری میں سمبالک تخیلات کے استعمال کافی ہیں۔ میں نے اس چیز کا تذکرہ اس لئے کر دیا کہ اس موضوع پر بحث کرتے وقت ہمیں ان دونوں چیزوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔

اصل چیز یہ ہے کہ حقیقت کو مسخ نہ کیا جائے۔ ورنہ حقیقت تک پہونچنے کے مختلف راستے ہیں، اور ہر فن کار کا تخلیقی اسلوب منفرد ہوتا ہے۔ کوئی بے انتہا تفصیلات مہیا کرتا ہے تو کوئی چند ہی تفصیلات، ایک ہی ادھ لفظ، چند نقوش، تھوڑے ہی سے رنگ کے صرفے سے اپنے مقصد تک پہونچ جاتا ہے۔ کوئی بقول میر آدمی کے لہجے میں گفتگو کرتا ہے تو کوئی واعظ کے لہجے میں، کوئی اپنی آواز چوئے خون کے ذریعے سے پہونچاتا ہے تو کوئی منبر سے آواز دیتا ہے۔ شاعری میں نکتہ حقیقت کو چھونے کا ہے احترامِ صدق کی لرزاں اور ترساں انگلیوں سے نہ کہ اپنی خواہش اور کف گریہ کو صدق پر غالب کرنے کا۔ یقیناً یہاں آرٹ کا تعلیمی پہلو بھی زیرِ بحث آ جاتا ہے، اس صورت میں ہمیں یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ ہم آرٹ سے کس قسم کی تعلیم دینا چاہتے ہیں، اطلاعاتی یا ادراکی۔ اگر اطلاعاتی نہیں ہے اور ادراکی ہے تو پھر اسے ماننا پڑے گا کہ آرٹ میں حقائق کا ادراک تجربات ہی کے ذریعے سے پیش کیا جاتا ہے۔ اور جب بھی تجربات پر زیادہ زور دیا جائے گا تو ایسی کوششیں ہمارے سامنے آئیں گی جن میں تجربات کی نوعیت کو سمجھانے کے بجائے ان کی تڑپ، کرب اور دل کشی پر زور دیا جاتا ہے۔ فن کار کے مختلف مدارج اور رتبے ہیں، بہ لحاظ فن اور بہ لحاظ علوئے فکر، یہ ضروری نہیں کہ ہم سب سے ایک ہی قسم کا مطالبہ کریں۔ تاریخی عمل اور تاریخی محرکات کو سمجھنے کے لئے انسانی عمل اور انسانی محرکات کے سرچشموں کو جاننا بے حد ضروری ہے۔ اگر کوئی شاعر اس پر اکتفا کرتا ہے کہ وہ راحت و غم اور یاس و امید کے دل پر انگلی رکھ دے تو کیا وہ کوئی چھوٹا کام اور چھوٹی تعلیم ہوتی اس سرمایہ دارانہ نظام میں جس نے ہمیں اپنے تمام حواس سے بیگانہ کر رکھا ہے بجز ملکیت کی حس کے اگر کوئی شعری تخلیق ایسی ملتی ہے جس میں ہم اپنے دوسرے حواس سے یگانگی محسوس کرتے ہیں، تو اسے بڑی نعمت سمجھنا چاہیئے۔ بس یوں سمجھیئے کہ کسی بیگانہ خو محبوب نے پھولوں کا ایک گلدستہ بھیج دیا ہو۔ اگر اس طریقِ کار کو ہم اپنے فن میں قائم نہ رکھیں گے تو وہ سماجی جڑوں سے نہ سہی لیکن حواس کی جڑوں سے یقیناً کٹ جائیں گے۔ یہی سبب ہے کہ میں نے اس چیز پر اتنا زور دیا ہے، نقادوں کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ وہ حقیقت اور آئیڈیولوجی ہی کی توضیح کرتے رہیں، انھیں یہ بھی بتانا چاہیئے کہ خارجی حقیقت آرٹ میں کیونکر تبدیل ہوتی ہے اور اس میں تخیل، جذبہ، احساسات، موسیقی، تخلیقی اسلوب، انفرادیت کے کیا مقامات ہیں۔

ہماری بعض اچھی غزلوں میں جو معنوی ایمائیت اور تخیل اور جذبے کی ملی جلی دنیا میں جو رنگ و بو اور گرمیٔ دل کی ایک فضا ہے جس سے ہمارے حواس تھوڑی دیر کے لئے تماشۂ گلگوں اوڑھ کر ترنگ میں آجاتے ہیں وہ ایک بہت بڑی دولت ہے اور اس سے ہمارے شعراء جتنا فایدہ اُٹھائیں وہ کم ہے۔ لیکن اس حُسن کے باوجود ہم دیکھتے رہے ہیں کہ ہماری غزل رہ رہ کر تقلیدی بن گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ جب رمز یہ تخیل رسمی بن چکتی ہے، تو دوسرے درجے کے شعراء رمز یہ تخیل کے منفرد الفاظ کے سہارے جیتے رہتے ہیں، وہ مضمون خود سے نہیں سوچتے ہیں بلکہ قافیہ انھیں مضمون سجھاتا ہے، روایت شاعری کا فارم مہیا کرتی ہے نہ کہ خیال اور تجربے کا بدل بن سکتی ہے۔ شعری تجربہ وہ ہے جو اپنا ردیف و قافیہ خود وضع کرے، نہ کہ قافیہ بزرگوں کا استعمال شدہ دسترخوان لے کر دوڑے، چونکہ فرد فرد اشعار والی غزل میں اس کا خطرہ ہمیشہ رہتا ہے اس لئے ہمارے شعراء سالہا سال سے قافیے والے دسترخوان میں ڈوبتے اُچھلتے ہے۔ وہ تو کہئے یہ پسلی ہی بدل گئی ورنہ ان کا مرنا بھی دشوار ہو چلا تھا۔ اب جبکہ وہ چلے ہیں اور نئی زندگی بند قبا توڑنے لگی ہے تو غزل میں موجِ خوں اُبھر آئی ہے، خوں نابیٔ چشم کی لکیر اور "بردار توان گفتن" کا حوصلہ پیدا ہو چلا ہے۔ یہ تسلیم ہے لیکن یہ تو دیکھئے اس کے سوز و ساز، اس کے لہجے اس کے تیور اور اس کی جذباتی فضا کو بدلنے میں کیا اس شاعری کا دباؤ نہیں رہا ہے جس کا انداز بیانیہ رہا ہے، بیان دینے، مینی فیسٹو نکالنے، مجرم کو موردِ الزام ٹھہرانے، قطعیت کے لہجے میں بات کرنے اور متعین مفہوم کے الفاظ کو استعمال کرنے کا۔

جب مجروح سُلطان پوری کہتے ہیں ؎

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

تو پتہ چلتا ہے کہ یہ غزل ٹھوس مطالبات والی نظم کا دباؤ سہار کر آئی ہے۔ اسی طرح جگر کی یہ غزل ؎

مُطرب وہ کہاں اب بزمِ طرب تکلیفِ رہِ پُرخار اُٹھا
ساقی یہ زمانِ عیش نہیں شیشہ نہ اُٹھا تلوار اُٹھا

اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ تلوار اُٹھا تو بیانیہ انداز کی نظموں کی دی ہوئی چیز ہے۔ ورنہ جام اُٹھا" کی بات تو کئی بار آچکی تھی۔ غزل اور بیانیہ نظم کے اندازِ بیان کے درمیان یہ باہمی اثر پذیری بہت دنوں سے ہے اور بہت دنوں تک رہے گی، غزل کی گہری جذباتیت، اس کے غیر متعین لب و لہجہ کو بیانیہ نظم کی روانی واضح خیالی کی ردشش پر ڈال سکتی ہے اسی طرح غزل کا اندازِ بیان بیانیہ نظموں کی نثریت اور سپاٹ پن کی اصلاح کر سکتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جبکہ ہمارے یہاں آزاد نظمیں، قطع نظر اس بات کے کہ ان کا مواد کتنا مختلف تھا نثر کی زبان میں لکھی جاتی تھیں۔ لیکن اب وہ بات نہ رہی، اب اس میدان میں بھی وہی غنایت، جذبات کی تشکیلی فضا اور معنوی ایمائیت پائی جانے لگی ہے، جو کبھی صرف غزل کا خاصہ تھا۔ فرق یہ ہے کہ یہ نظمیں غزل سے زیادہ بڑی تخلیقات ہیں۔ ان میں سلسلۂ تخیل کو ایک مربوط تعمیر ملتی ہے۔ میراجی اور اُن کے پرستاروں کا وہ زمانہ گزر گیا جن کی نظمیں جذباتی استحکام، حسن خیال اور شعری اندازِ بیان سب سے عاری تھیں اُن کی کوششیں رائیگاں گئیں، وہ مغرب کے انحطاط پسند ادب کی بھونڈی نقالی کر رہے تھے، ان کا سینہ ان جذبات اور خیالات سے خالی تھا جو ملک و قوم کو آگے بڑھاتے ہیں، جو تخلیقی عمل کا سرچشمہ بنتے ہیں۔ ان میں نقالیت تھی نہ کہ تخلیقی جوہر تھا۔ اس دَور کی اُردو شاعری میں زندگی کا خون دوڑانے اور اسے حُسن سے آراستہ کرنے میں ہمارے بہت سے شعراء نے حصہ لیا ہے۔ جو اپنے مختلف اسالیب، لب و لہجہ اور آواز سے پہچانے جاتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ گزشتہ چار پانچ سال کے زمانے میں اس میں تھکا دینے والی یکسانیت اور بے رنگی پیدا ہو گئی تھی، ایک ہی آواز تھی جو مختلف محرابوں کے درمیان سے گونجتی، اس یکرنگی کو توڑتے ہوئے جمود کی بھیانک فضا میں فیض نے جو نہرِ خوں بہائی ہے اس سے ایک نخلستان سا ابھر آیا ہے۔ یوں تو فیض کے یہاں تاثراتی اور ایمائی اندازِ بیان پہلے ہی سے پایا جاتا ہے، جو کہ "تنہائی" اور "آزادی" میں موجود ہے، لیکن انھیں سلسلۂ تخیل کی ایک مربوط تخلیق کے نام سے یاد نہیں کیا جا سکتا ہے، کہیں ایک بڑی ہی پُراسرار فضا میں جذبات کی شیرینی ہے (تنہائی)، تو کہیں جواں لہو کی پُراسرار شاہراہوں پر جاگتے ہوئے خواب کو ملا دینے کی ایک سعیٔ جمیل ہے (صبحِ آزادی) لیکن ان میں سے کسی بھی نظم میں ایک ہی بنیادی تخیل کو ایک چھتنار درخت کی صورت میں بڑھانے اور اس کے برگ و بار اور شاخوں کو اپنے پارۂ دل کے مشعل بکف ستاروں سے آراستہ کرنے کی سعی نہیں ہے۔ یہ تبدیلی اس کے اندازِ بیان میں کیوں اور کن اثرات کے تحت پیدا ہوئی ہے مجھے اس کا علم نہیں، صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ "دستِ صبا" زنداں کے بے وطن اشعار اِدھر کافی عرصے سے اس کے دل پر اپنا نقش و نگار بنانے میں مصروف تھے، اور

اور وہ اک کرب اور دکھ جو عظیم تر رہا ہے۔ ایک دو فرد کے دکھ درد سے، اور جو مشکل سے کسی نغمے میں اتر جاتا تھا، یکایک اس تجربہ سے پھٹ کر، اپنی ساری داستان کہہ گیا۔ نظم یہ ہے:

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھوں مشعل بکف ستاروں
کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب اس کے سائے
میں اپنا سب نور رو گئے ہیں

(۲)

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتے
گرے ہیں اور تیرے گیسوؤں میں
اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی تبسّم سے خامشی کے
یہ چند قطرے تری جبیں پر
برس کے ہیرے پرو گئے ہیں

(۳)

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے
وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
وہ غم جو اس رات کا ثمر ہے
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے

(۴)

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

(۵)

الم نصیبوں جگر فگاروں کی صبح افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

اس پوری نظم کو پیش کرنے کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ آپ محظوظ ہوں، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے سے شعری تخلیق کے جوہر کو سامنے لایا جائے۔ شبِ غم سے متعلق ہماری غزلوں میں ہزاروں اشعار ملیں گے۔ خود فیض نے بھی کہا ہے

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وُہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

لیکن ان میں سے کوئی بھی شعر ایسا نہیں ہے جس پر ایک مکمل المیہ کا اطلاق ہو سکے۔ فیض نے اس غزل کے ایک شعر میں بہت کچھ بھرنے کی کوشش کی ہے، ع

وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

چارلی چیپلن کی تصویروں کا حزن خراماں نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن جب ہم اس شعر کا مقابلہ اس نظم کے تاثر سے کرتے ہیں تو ہمارے جذبات میں زیادہ بالیدگی،

زیادہ تاریخی شعور اور زندگی کی سختی پر قابو پانے کا زیادہ حوصلہ پیدا ہوتا ہے، غزل کے کسی ایک شعر سے پوری نظم کا مقابلہ مناسب نہیں ہے کیونکہ اس میں سمائی اس سے زیادہ ہے ہی نہیں کہ وہ ہمارے جذبات کے کسی ایک پردے کو اٹھا دے، کسی نازک مقام کو چھیڑ دے، مقابلے پر تو دراصل وہ لوگ آمادہ کرتے ہیں جو صرف خردہ کاری کو آرٹ سمجھتے ہیں۔ بہرحال حرفِ مطلب پر نگاہ رکھئے اور اس نوک جھونک کو جانے دیجئے۔ اس نظم کا موضوع وہی ہے جو عام طور پر ہمارے یہاں انقلابی نظموں کا ہوتا ہے۔ اندھیرے اور اُجالے کی جنگ گرانباریٔ شب کا گلہ اور سحر کا یقین، پھر بھی یہ نظم ان ساری نظموں سے مختلف ہے، اپنے موضوع میں نہیں بلکہ اپنی تخلیقی انفرادیت کے سبب سے۔ انسانیت کے مستقبل کو روشن کرنے اور انسان کے دکھ درد کو گھٹانے کی کوشش میں جو لاکھوں کروڑوں انسانوں نے صدیوں سے اذیت اٹھائی ہے، غم جھیلے ہیں، اسے پہلے بند میں پیش کرنا چاہتا ہے، لیکن چونکہ شاعر کی نظر افراد سے زیادہ اس کرب پر ہے جو اس جدوجہد کی طویل مدت میں ہے اس لئے وہ ستاروں اور مہتاب کی تخیل میں سوچتا ہے جس کا سفر لامتناہی وقت کا ہے۔ ان کا مشعل بکف ہونا یا لاکھوں ہزاروں کا ہونا تخیل کی ثانوی صفات ہیں جو اس میں ضم ہوگئی ہیں۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ دوسرے بند میں جب وہ اپنی محبوبہ کے غم کو بیان کرتا ہے تو وہ چند لمحوں کے زرد پتوں سے ابتدا کرتا ہے۔ اگر اتنا طویل وقت اذیت کا اتنے بے شمار افراد کی زندگی سے ہو کر گزر گیا تو یہ چند لمحے اور یہ چند پتے اور یہ چند قطرے بھی بیت سکتے ہیں اور خشک ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ تسلی صرف اسی بات سے دینا نہیں چاہتا بلکہ اس بات سے بھی کہ اس سیاہی کا دامن چاک کیا جا چکا ہے۔ میری پُرخروش آمادہ تری منظر کے حسن سے اور کیا عجب اگر وہ کچھ اور تپ جائیں تیری آہوں کی آنچ میں تو وہ جدائی کا غم جو تری باہوں کے گلستاں میں سُلگ رہا ہے شرار میں تبدیل ہو جائے، عین اس وقت اس میں قوتِ عمل بیدار ہوتی ہے۔

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے،
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

اس کے بعد نظم کا میلان غایتی ہو جاتا ہے لیکن جذباتی فضا کو برقرار رکھتا ہے

یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں

جو چیز دیکھنے کی ہے وہ یہ کہ اس نظم میں تاریخی عمل کا شعور، خود اپنا دکھ درد، محبوب کا غم، انقلابی قوتِ عمل اور ساتھ ہی پیغامِ حیات سبھی کچھ موجود ہے، لیکن شاعر نے اسے اس طرح پیش کیا ہے کہ ساری خارجی حقیقت داخلی حقیقت میں تبدیل ہوگئی ہے۔ حتیٰ کہ غایتی میلان بھی جذبے میں بدل گیا ہے۔ نظم میں اطلاعات بہم پہنچانے کے بجائے اس قوتِ عمل کو بیدار کیا گیا ہے جو دامانِ زخم اور آغوشِ حسن میں پنہاں رہتا ہے، اُردو ادب میں کوئی انقلابی نظم اس انداز کی ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے، یہ بڑی زیادتی ہوگی اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ اور دوسرے انداز کی حسین انقلابی نظمیں نہیں لکھی گئی ہیں، ذہنی تخلیق کو کسی ایک اسلوب کا پابند نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسے کسی فارمولے اور نمونے میں اسیر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اصل چیز تجربات کی تر و تازگی، حسیت اور زندہ پن جو ہو سے تر بہ تر ہو، اور ساتھ ہی ادراک کی وہ گہرائی ہو جو اپنے تجربات کو ساری انسانیت کے تجربات کے پس منظر میں دیکھ سکے، اور ان تجربات کی تخلیق پر شاعر یا ادیب پھر اسی وقت لگاتا ہے جبکہ وہ خارجی حقیقت کو اپنے جذبے میں تحلیل کرکے از سرِنو تخلیق کرے۔ چونکہ اچھی غزل میں خارجی حقیقت کے کچھ عناصر جذبے میں تحلیل ہوتے رہے ہیں اس لئے ہمارے شعراء کو ابھی اس سے کچھ اور سیکھنا ہے، اور ممکن ہے وہ غزل بھی کہیں لیکن جب شاعری جوان ہوتی ہے کسی بھی زبان کی بلند تر جمالیاتی جذبے کی تسکین کے مطالبے کے تحت جیسا کہ اس وقت ہے تو وہ ایسے فارم اختیار نہیں کیا کرتی جس کے قیود کو توڑنے کے امکانات قلیل اور جس کے رسوم میں اسیر ہو جانے کے امکانات زیادہ ہوں۔ فیض کی شاعری جو کہ امید کی شاعری ہے اس نظم میں جوان ہوئی ہے نہ کہ اُن کی غزلوں میں، جن کی صفات کا اتنی بار ذکر کر چکا ہوں ؎

ہے اب بھی وقت زاہد ترمیمِ زہد کر لے   سوئے حرم چلا ہے انبوہِ بادہ خواراں

میں نے اس شعر کو سمبالک قدر کے تحت استعمال کیا ہے۔

بسمل سعیدی

شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

بن کر نشاطِ روحِ محزوں پہ چھا رہا ہے
روحِ طرب کی صورت غم میں سما رہا ہے
اشکوں میں مُسکرا کر آہوں میں گا رہا ہے
شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

تیرے تصوّروں کا مُنہ پر نقاب ڈالے
جیسے کِسی کے پیچھے خود کو کوئی چُھپا لے
اِس طرح تیری صورت اپنی بنا رہا ہے
شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

بے سمت و بے جہت اک عالم ہے اور میں ہوں
اک سحر، اک فضائے مُبہم ہے اور میں ہوں
جیسے بغیر بھُولے کچھ یاد آ رہا ہے
شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

جس طرح دوست گُزرے بیگانہ وار کوئی
اور پھر اُسے پُکارے بے اختیار کوئی
میرے قریب ہو کر اس طرح جا رہا ہے
شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

راتوں کو نیند بن کر چُھپتا ہوا نظر سے
دل میں مرے سمائے آنکھوں کی رہگزر سے
مُجھ کو سُلا سُلا کر خوابوں میں آ رہا ہے
شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

چھیڑا ہے سازِ ماہِ کامل فلک پہ جا کر
مسحور کر رہا ہے کرنوں کی لے میں گا کر
بے صوت و بے صدا اک نغمہ سنا رہا ہے
شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

مجبورِ شرم و شوقِ اُلفت مرے لئے ہے
جُراءت فزائے دستِ حسرت مرے لئے ہے
آنچل سے مُنہ چھپائے دامن بڑھا رہا ہے
شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

بے التفاتیوں پر ہے جس میں طنز پنہاں
جس میں مفارقت کا ہرگز نہیں ہے امکاں
وہ مُژدۂ وصالِ پیہم سنا رہا ہے
شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

نومبر ۱۹۵۲ء

ل احمد

چو یو آن

(ایک قدیم چینی شاعر و مدبّر)

انسانی زندگی سے اگر کلچر کو الگ کر لیا جائے تو وہ انسانی زندگی نہ رہ جائے گی - اور انسان اگر اپنے کلچر سے محبّت اور اس کی حفاظت نہ کرے تو اس کی زندگی بے مقصد ہو گی اس بنا پر انسانی جماعتوں کا اپنے کلچر پر فخر و مباہات کرنا مسرّت حیات کا ہی ایک پہلو ہے - جس کی جستجو ہی زندگی کا مقصد ہے -

چینی قوم اپنے ہزاروں سال پرانے کلچری ورثے پر جس قدر مفتخر ہو بالکل حق بجانب ہے -

چو یو آن چین قدیم کا شاعر تھا اور اس لئے کہ اس سے پہلے کی شاعری کا صرف ایک مجموعہ ملتا ہے جس میں تمام کلام گمنام ہے - چو یو آن چینی شاعری کا بابا آدم کہا جاتا ہے چین کی کلچری تاریخ اس کو مصدّق کر دیتی ہے - یہ ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ یہ اولین چینی شاعر ترقی پسند اور محبوب عوام بھی تھا - اور اس نے صرف شاعری ہی نہیں کی بلکہ چینی شاعری کے لئے نئی راہیں پیدا کیں عروض میں اختراع و ایجاد کئے یعنی اسے ایک منضبط فن کا درجہ دیا

تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ اس سے پہلے چینی شاعری کی بنیاد رکھنے والوں کے نام کیا تھے - البتہ (Shing Hing.) نام کا ایک مجموعۂ اشعار ملتا ہے جس میں کسی شاعر کا نام درج نہیں ہے اور بہت سے لوک گیت بھی شامل ہیں - جو ہر ملک میں بالعموم گمنام ہی رہتے ہیں لیکن حیرت اس پر ہے کہ یہ لوک گیت جو ڈھائی ہزار سال قبل چینی عوام میں مقبول تھے - آج بھی چینی عوام کی زبانوں پر ہیں - ان گیتوں میں بیان کی سادگی اور احساس کی شدّت آج کے پڑھنے والے کو بھی متاثر کرتی ہے - کہا جاتا ہے کہ یہ مجموعہ پانچویں صدی قبل مسیح میں کنفیوسش نے مرتب کیا تھا -

شاعر و مدبّر چو یو آن کا زمانہ کنفیوسش سے ایک صدی بعد کا زمانہ قرار دیا جاتا ہے - اور یہ وہ عہد تھا جب چین غلامی سماج (جس سماج میں غلاموں کی خرید و فروخت رائج تھی) سے نکل کر جاگیرداری سماج بن رہا تھا اور ملک میں خانہ جنگیاں عام تھیں - اس سماج کے اندر ظاہر ہے کہ حکمراں طبقوں کی زندگی کا مقصد عوام الناس کا خون نچوڑنے کے سوا دوسرا نہ ہو سکتا تھا - اور اسی وجہ سے خانہ جنگیاں ہوتی تھیں - عوام الناس سرکار اور آقاؤں کی ہوس ہی کا شکار نہ تھے بلکہ انھیں دیوی دیوتاؤں اور خبیث ارواح بھی اتنی ہی بیرحمی سے لوٹتے رہتے تھے -

Shumachi Ien دوسری صدی عیسوی کا چینی مؤرخ گزرا ہے - اس نے ایک تالیف "ہسٹاریکل رکارڈ" کے نام سے چھوڑی ہے شاعر چو یو آن کی زندگی کے متعلق معلومات کا ماخذ یہی ایک کتاب ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ چو یو آن ایک بلند حوصلہ اور زندگی کو رجائی نقطۂ نظر سے دیکھنے والا انسان تھا - ذہن و ذکاوت کی عطا و بخشش میں فطرت نے اس کے ساتھ بڑی فیاضی ہوتی تھی - وہ ایک شاعر ہونے کے ساتھ اپنے وطن (CH. U) کے حکمراں کا مشیر بھی تھا -

شما چین نے ان الفاظ میں اس کا ذکر کیا ہے :-

"محل کے اندر وہ حکمراں سے ریاستی معاملات پر گفتگو کرتا' قوانین و احکام نافذ کرتا اور محل سے باہر ایلچیوں کا خیر مقدم کرتا جن میں دوسری ریاستوں کے حکمراں بھی ہوتے تھے اور ان کے ساتھ مسائل حاضرہ پر تبادلۂ خیال کرتا تھا"

چو یو آن کا رویہ اور پالیسی ہمیشہ یہ رہی کہ دوسری اور خاص کر ہمسایہ ریاستوں کے درمیان پُرامن مقابلہ و تعاون رہے - اور جب ریاست نے ہمسایہ ریاستوں کو کمزور کر کے زیر کر لینے کے باہم اختلاف پیدا کرنا چاہا تو چو یو آن نے سخت احتجاج کیا تھا -

تاریخ شاہد ہے اور خود اس کے اشعار سے وافر ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ وہ اپنے احکام اور فیصلوں میں عوام کے خیر و بہبود کو ہمیشہ مقدم رکھتا تھا لیکن جاگیرداری سماج کے عام دستور کے مطابق چویوآن کی اس پالیسی کے خلاف درباری سازشیں اور مخالفتیں کرتے تھے، وہ اندازیاں ہوتی تھیں اور اس کے حریف چویوآن کو مردود بارگاہ کرا دینے کی کوئی تدبیر اٹھا نہ رکھتے تھے۔

چنانچہ اس دشمنی اور مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ چویوآن جلا وطن کر دیا گیا۔ لیکن پھر بحال بھی ہو گیا تھا۔ مگر جب دوسرا حکمران تخت نشین ہوا تو اسے دوبارہ جلاوطنی ملی اور وہ غریب الوطن ہی اس دنیا سے رخصت ہوا۔

اس دوسری جلاوطنی کے وقت ریاست چی کی طرف سے اس کو چیر مقدم کی پیشکش آئی لیکن اس کے جذبۂ وطن پرستی نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔ لیکن اس لئے کہ قوم و وطن کی خدمت کے مواقع اس سے چھن گئے تھے اس کی ساری آرزوؤں پر پانی پھر گیا تھا۔ چویوآن نے غرق دریا ہو کر جان دے دی۔

ایک سو سال بعد چینی شاعر Chiai نے چویوآن کی شان میں ایک قصیدہ لکھا اور اپنے ممدوح کی ایسی موت پر اپنے غم اور اس کے اسباب پر غیظ و غضب کا اظہار کیا۔ چینی ادب میں اس قصیدے کا پایہ بہت بلند مانا جاتا ہے۔

مؤرخ شما چیئن لکھتا ہے:-

"لومندی میں چویوآن کے ڈوب مرنے کے سو سال سے بھی زیادہ عرصے بعد Han خاندان کی حکمرانی میں Changsha کی راجدھانی میں ایک شاعر و حکیم چیائی شہزادے کا اتالیق تھا۔ اس نے چویوآن کی شان میں ایک قصیدہ لکھا اور اس مقام پر جہاں چویوآن غرق دریا ہوا تھا۔ اپنا مسودہ ندی میں بہا کر ممدوح کے سامنے پیش کیا۔ یہی مؤرخ آگے چل کر لکھتا ہے کہ میں نے چویوآن کا کلام پڑھا ہے۔ "جلاوطن کا غم" خدا سے میرا سوال" "آہ اے روح!" اور Ying کا مرثیہ" ان لفظوں نے مجھے بہت غمگین کیا۔ میں چنگشا میں لومندی کی یاترا پر بھی گیا اور اس جگہ کو دیکھا جہاں سے چویوآن نے جست لگائی تھی۔ اس کی یاد میں میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس لئے کہ میں اس کی انسانیت پرستی سے بہت متاثر ہوا تھا۔"

چویوآن کو مرے دو ہزار سال سے بھی زیادہ مدت ہو گئی مگر وہ اپنی قوم کے دلوں میں آج بھی زندہ ہے اور مئی کی پانچویں تاریخ کو ہر سال اس کی برسی منائی جاتی ہے۔ چویوآن پر اس مصرعے کا پورا اطلاق ہوتا ہے۔

"ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق"

بلاشبہ چویوآن شاعر عوام تھا اس لئے کہ اس نے قدیم مجموعۂ شعر چنگ شنگ سے اپنے شعر کے لئے الہام حاصل کیا تھا اور اس مجموعے کے اشعار میں عوام الناس کی شدید مشقت اور ان کے غم و مسرت کا اظہار ہوا تھا فرق یہ تھا کہ اس مجموعے کے اشعار میں عوام اپنا دکھ درد اور خوشی و مسرت خود بیان کرتے تھے اور چویوآن کے اشعار میں اس شخص کے محسوسات منعکس ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو عوام کے جزو بہبود کا رازدار سمجھتا ہے۔ اور جس وقت وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تو ان کے لئے اپنا دل دکھاتا ہے۔

اس کی شاعری میں چویوآن کی نظم "جلاوطن کا غم" شہ پارہ اور اختراع فائقہ مانی گئی ہے۔ یہ نظم اس کے آخر ایام زندگی میں لکھی گئی تھی اس لئے اس کو ایک کہنہ مشق صناع کا شہ کار ہونا ہی تھا۔ نظم کا موضوع قوم و وطن کی بدحالی ہے جس میں شاعر نے رنج و غم کا اظہار کیا ہے اس نے عوام کے لئے انصاف کا مطالبہ کیا ہے اور اپنی کم نصیبی کا گلہ کر کے کہتا ہے کہ دس بار مر کے زندہ کیا جاؤں تو اس کام سے باز نہ رہوں گا۔ اس نظم کی بحر چھوٹی ہے اور اس کے اندر جنوبی چین کے سارے رنگ جھلکتے ہیں۔ چویوآن کی دسترس خیال حدود سے نا آشنا تھی۔ وہ زمین کی پہنائی اور آسمان کی بلندیوں میں حسن و صداقت کی تلاش کرتا تھا۔ لیکن ناکام رہنے پر موت کے سوا چارہ کار نہیں دیکھتا۔ کہتا ہے۔

"اپنی قوم کی بدنصیبی پر رونا اور ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہوں"۔

چینی عوامی جمہوریہ کے وزیر تعلیمات ڈاکٹر کو موجو نے چویوآن کی زندگی و صناعت پر ریسرچ کر کے ایک سیر حاصل مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ اور ایک تاریخی ڈرامہ بھی لکھا ہے ڈاکٹر کو موجو اپنے مقالے میں لکھتے ہیں۔

"چویوآن ایک محب وطن انسان تھا اور اس کی تخلیقی شاعری اس کا قاطع ثبوت ہے"۔

ایک دوسرے چینی ادیب نے اپنے مقالے "عوامی

شاعر چو یوآن" میں لکھا ہے کہ:—

"شاعر نے عوام الناس کا غم و غصہ عوامی انداز ہی میں ظاہر کیا ہے اور اس کی نظم" جلا وطنی کا غم" صناعتی مقدر کے ساتھ سیاسی قدر کی بھی حامل ہے"۔

چو یوآن کی نغماتی شاعری میں الم کا پہلو غالب ہے اور تعجب کی بات بھی نہیں۔ عوام الناس کی زندگی اس زمانے میں بھی سرتا پا درد و الم تھی۔ اور خود اس کی زندگی اس سے مختلف ہو سکتی تھی۔ بایں ہمہ اس کی یہ الم پسندی پڑھنے والے کو بے حوصلہ نہیں بناتی بلکہ جد و جہد پر مستعد کر دیتی ہے۔ اور عوام الناس کی زندگی راحت و مسرت اور حق و صداقت کی آرزوؤں سے مالا مال ہوتی ہے۔ یہی اس کی تخلیقی فصاحت کا کمال اور اس کا موضوع اور مسالا تھا۔

خود طبقۂ اشراف کا ایک فرد ہونے ہوتے چو یوآن نے اپنے طبقے کی خرابیوں اور برائیوں کا ہمیشہ پردہ چاک کیا اور ہمیشہ پامال انسانیت کا چیمپین بنا رہا۔

حق گو، پاکیزہ قلب اور الوالعزم چو یوآن اس رنگترے کے درخت کی مثال تھا جس پر خود اس نے قصیدہ لکھا تھا۔ نارنگی کا درخت لوگوں کے لئے رسیلے پھل پیدا کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی جڑیں تو اسی سرزمین کے اندر ہیں جہاں لوگ رہتے ہیں۔

"نو نظموں کا دائرہ" اس کا ایک مجموعۂ منظومات ہے جس میں ایک نظم" مادر وطن کی موت" بھی ہے۔ اس نظم کے اندر یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ ایک معرکے میں قومی فوج بڑی جانبازی اور بہادری سے جنگ کرتی ہے مگر دشمن کی یورش سے پسپا ہو جاتی ہے۔ معرکہ ختم ہوتا ہے تو عرصہ جنگ جاں نثاران وطن کی لاشوں سے پٹا پڑا ہے۔ اس موقعے پر چو یوآن کہتا ہے۔

(وطن کے) یہ سپاہی مردہ پڑے ہیں مگر ان کی روحیں زندہ اور
تازہ دم ہیں۔ وہ اپنے وطن کے لئے پھر لڑیں گے"۔

یہ نظم وطن پرستانہ جذبات کا ایک مرقع کہی جا سکتی ہے۔

اس کی شاعری کی قوم پرستانہ نوعیت اس حقیقت کے اندر ہے کہ چو یوآن کی نظر میں عوام کی مسرت ان کے ساکھوں، لوک گیتوں اور معتقدات اور سرزمین وطن کے فطری مناظر کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں وطنی مناظر فطرت کی حسین و دلکش نقاشی کی بہتات ملتی ہے۔

چو یوآن سے پہلے کی تمام چینی شاعری مجموعے چنگ شنگ کے اندر محفوظ تھی۔ وہ سارا مجموعہ چو حرفی سطروں میں لکھا گیا تھا۔ چو یوآن پہلا شاعر تھا جس نے چو حرفی سطروں کا استعمال ترک کیا اور اپنے زمانے کے لوک گیتوں کی بحریں اختیار کیں۔ اسی طرح اس نے شعری زبان میں عوامی روزمرہ اور استعارے استعمال کر کے اپنی شاعری کو بکلی عوامی شاعری بنا دیا۔ اس بناء پر ڈاکٹر کوموجو نے اس کو انقلابی شاعر کہا ہے۔

چو یوآن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تاریخ اور تحریری زبان میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا چینی شعر کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کیا اور عوامی صناعت کو پروان دے کر ایک نیا ادب تخلیق کیا جس کے اندر زندگی و صناعت پوری طرح ہم آہنگ تھیں۔ الحاصل اس نے امراء و رؤسا کی بے روح شاعری کی جگہ زندہ و ذی قوت شعر کو جنم دیا تھا"۔

اس کی شاعری ایک اور اہم بات یہ ثابت کر دیتی ہے کہ لوک گیتوں کے اندر اعلے شعر کے سوتے موجود ہوتے ہیں اور وہ شاعری بے گنتی آنے والی چینی نسلوں کو شعری تربیت دیتی رہی ہے۔ چو یوآن کی شاعری آنے والی نسلوں کے لئے ایک نمونہ ہی نہیں الہام آفریں بھی تھی۔ بے شمار موقعوں پر جنگ آزادی کے سپاہیوں کی زبان پر بہت کڑی مشکلوں کے وقت چو یوآن کے شعر جاری ہو گئے۔ اور مشکلیں آسان ہو گئیں۔

چو یوآن کے کلام پر کافی تدقیق کی گئی ہے اور ابھی بہت کچھ ہونا ہے لیکن جتنا کچھ ہو چکا ہے اس میں ڈاکٹر کوموجو نے ڈراما "چو یوآن" لکھ کر ایک بے مثال یادگار قائم کر دی ہے۔ یہ ڈراما ۱۹۴۲ء میں لکھا گیا تھا چو یوآن کے سوانح زندگی جن کو تمام چینی مؤرخ نے قلمبند کر کے محفوظ کر دیا تھا۔ ان کی نئی تعبیر کے لئے واقعی کوموجو کا دماغ اور قلم درکار تھا۔ اس لئے کہ چین قدیم کی تاریخ پر کوموجو کا عبور عدیم المثال ہے۔ کوموجو نے اپنے ہیرو کی شخصیت و صناعت کو جس قدر صناعانہ کمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دوسرے کے لئے وہ کمال محال تھا۔ ڈراما میں ایک موقعے پر جب چو یوآن جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ایک شہری پہرے دار کو راضی کر کے چو یوآن سے بھاگ نکلنے کے لئے کہتا ہے تو چو یوآن جواب دیتا ہے۔

"بھاگ جاؤں ؟ لیکن میں چو کو کیسے چھوڑ دوں"

چو یوآن کی نظر میں ترکِ وطن کرنا ذلت کا مترادف تھا - اس لیئے کہ وطن (ریاست چو) حکمراں اور اس کے دربار سے عبارت نہ تھا بلکہ وطن عبارت تھا چو کے عوام سے ! اور عوام کا جزو بہبود چو یوآن کی زندگی کا مقصد تھا !

چو یوآن نے چین کے لوک گیتوں سے الہام شعری حاصل کر کے اپنی شاعری کو بلند کیا اور بدلے میں اپنی شاعری عوام کو دے کر وہ قرضہ ادا کر دیا -

ڈراما میں ڈاکٹر کو مو جو نے چو یوآن کی موت کا حزنیہ پیش نہیں کیا بلکہ اسے اس موقعے پر ختم کر دیا ہے جب جیل کا محافظ اس سے کہتا ہے -

"ماسٹر ! ہماری ریاست چو کو آپ کی ضرورت ہے
سارے چین کو آپ کی ضرورت ہے !"

یہ مختصر روداد ہے چو یوآن کی شخصیت اور اس کی فصاحت شعری کی جسے ڈاکٹر کو مو جو نے اس وقت ڈراما کی صورت دے کر چینی عوام کے سامنے پیش کیا جس وقت کنمنٹانگ گٹ نے چینی کمیونسٹوں کی اس تجویز کو ٹھکرا دیا تھا کہ متحدہ محاذ بنا کر سرزمین وطن کو دشمن سے پاک اور آزاد کرایا جائے

آج جب چین میں انقلاب سرخرو و کامراں ہے - چو یوآن کے شعر نے نیا مفہوم اختیار کر لیا ہے اور چینی عوام کو ان کا کلچری ورثہ مل گیا ہے جس سے حکمران طبقے نے صدیوں تک انھیں محروم کر رکھا تھا - ظالم و غدار وطن حکمرانوں نے شمع وطن کے پروانے شاعر چو یوآن کو دو ہزار برس پہلے موت سے بغلگیر ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا - لیکن وطن کا وہ مفتی آج پھر وطن اور انسانیت کے جاں نثاروں کے دلوں میں زندہ ہو گیا ہے اس کی یاد اور اس کے خیالات زندہ ہو کر چینی قوم کی زندگی کا ثبوت بن گئے ہیں -

---

یعقوب عثمانی

غزل

زندگی کے ناز اُٹھانے کا قرینا آگیا
کشمکش کے فیض سے انساں کو جینا آگیا

مطمئن نظروں کو اپنی زحمتِ گردش نہ دے
میکدے والوں کو ساقی زہر پینا آگیا

یہ تو ایجادات پر تنقید ہے حالات کی
عقل و حکمت کی جبیں پر کیوں پسینا آگیا

آپ کے توڑے ہوئے دل اک معمّہ بن گئے
غمزدوں کے ہاتھ فطرت کا دفینا آگیا

بوند بھر بھی اہلِ محفل کو ملی ہو تو کہو
دَور میں آنے کو یوں سو بار مینا آگیا

بھر چکا ہے شوق جس میں دل کی رگ رگ کا لہو
کیا وہی منظر دوبارا چشمِ بینا آگیا

مرکزِ طوفاں یہی ہے ناخداؤ ہوشیار
دیکھنا آغوشِ ساحل میں سفینا آگیا

دشمنِ احساس ہوں یعقوبؔ ممنونِ کرم
چاک دامانِ سکوں ہم کو بھی سینا آگیا

اسی زمین میں ریاض خیرآبادی کا ایک شعر یاد آگیا ؎

اے جنوں کچھ دھجّیاں میرے گلے میں ڈال دے
جس میں کونپل پھوٹتی ہے وہ مہینا آگیا

میکش اکبرآبادی

غزل

بہ اندازِ نسیم آئے بہ عنوانِ بہار آئے
وہ اپنے وعدۂ فردا کا بن کر اعتبار آئے

چراغِ کشتہ لے کر ہم تری محفل میں کیا آتے
جو دن تھے زندگی کے وہ تو رستے میں گزار آئے

خزاں میں آئے، بیٹھے خاکِ گل پر، سوئے کانٹوں پر
سلام اپنا بھی کہہ دینا جو گلشن میں بہار آئے

یہ جبر و اختیارِ عشق ہے تم اس کو کیا سمجھو
رہے گا دل پہ کب قابو جو تم پر اختیار آئے

نہ دیکھا دیکھنے پر بھی ترے ہم نے تری جانب
تغافل کا ترے اے دوست ہم قرضہ اتار آئے

جہاں گلخن ہے اے گلچیں گلوں کی تاب ہی کتنی
خدا ایسا کرے تجھکو یہ گلشن سازگار آئے

یہ کہنہ جام و ساغر کیسے بدلیں ہاں مگر ساقی
تری محفل میں آئے انقلاب اور بار بار آئے

یہ دنیا میری ہستی ہے یہ ہستی میری دنیا ہے
اگر مجھ کو قرار آئے تو دنیا کو قرار آئے

تری محفل ہے اور میکش یہی دنیا یہی عقبےٰ
یہیں سے بے قرار اٹھے یہیں پھر بے قرار آئے

درگابائی دیش مکھ

مترجمہ: حیدر حسین موسوی

ہندوستان میں عورتوں اور بچّوں کی قانونی حیثیت

ہندوستان کے دستور میں جنسوں (مرد اور عورت) کی مساوات کا اعلان کر دیا گیا ہے اور جنسوں کی بنیاد پر کسی قسم کی تفریق کی ممانعت ہے۔ بنیادی حقوق جن کی دستور نے ذمے داری لی ہے عورتوں اور مردوں دونوں کے لئے مساوی ہیں۔ ہندوستان میں بالغوں کو ووٹ دینے کا عام حق حاصل ہے چنانچہ عورتوں کو بھی ووٹ دینے کا اختیار ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے میونسپلٹیوں۔ لوکل بورڈوں اور قانون ساز اسمبلیوں میں عورتوں کی کافی تعداد ہو گئی ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں عورتوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ مرکزی اور ریاستی دونوں حکومتوں میں وزیر عورتیں بھی ہیں۔ متعدد عورتوں نے پبلک خدمت کے دوسرے میدانوں میں نمایاں حیثیتیں حاصل کی ہیں۔ کارخانوں۔ کانوں اور باغات میں عورتیں عرصہ سے مزدوری کا کام کرتی آ رہی ہیں۔ عورتیں گھریلو کام کے لئے بھی نوکر رکھی جاتی ہیں۔ اکثر پیشوں اور کاروبار میں بھی عورتیں پائی جاتی ہیں۔

سب سے بڑی تعداد

ہندوستان میں ہندو عورتوں کی تعداد سب سے بڑی ہے۔ ہندوستان کے باشندے مدتوں سے اپنے سماجی اور مذہبی معاملات اور جائداد کے حقوق کے سلسلے میں اپنے ذاتی قانونوں کی پابندی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان قانونوں پر اس وقت تک عملدرآمد ہوتا رہا ہے جب تک کہ ملک نے متعدد قوانین سے ان میں ترمیم نہیں کر دی۔ یہیں پر عورت کی کمتری کا اظہار ہوتا ہے۔ اصلی ہندو قانون (ہندو لا) میں ہندو عورت ورثے سے محروم رکھی گئی ہے۔ کچھ مستثنیات بھی ہیں لیکن عام قانون یہی ہے۔ اگر اس کو ورثہ ملتا بھی ہے تو بہت ہی تھوڑا سا اور وہ بھی اپنی زندگی بھر کے لئے اور اسے اپنا حق منتقل کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ ہندو قانون طلاق کے لفظ سے ناآشنا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس معاملے میں بھی ہندوؤں کے بعض فرقوں میں رواج نے طلاق دینے اور دوبارہ شادی کرنے کی اجازت دے دی ہے ہندو عورت اپنے شوہر کی زندگی میں کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی لیکن ہندو مرد جتنی بھی عورتوں سے چاہے شادی کر سکتا ہے۔ بچّوں کی نگرانی کے حق کے معاملے میں باپ کو برتر حق حاصل ہوتا ہے۔ بیچاری ہندو عورت جس کا شوہر اس کی خبر نہ لیتا ہو یا اس کے ساتھ بُرا برتاؤ کرتا ہو کوئی تدارک نہیں کر سکتی تھی۔ ایسی سنگین صورتوں میں جبکہ شوہر اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہو یا اس کو بالکل چھوڑ دیا ہو بیوی کو شوہر سے صرف روٹی کپڑا پانے کا حق حاصل تھا۔ ان تمام لحاظ سے ہندوؤں کے شخصی قانون کے نتیجے میں عورتوں کی ایک کمتر حیثیت بن کر رہ گئی۔ یہ چیز بذاتِ خود اس مساوات کے خلاف ہے جس کا دستور میں اعلان کیا گیا ہے اور ان تمام معاملات میں قوانین از سرِ نو بنانے ہیں۔

قانون سازی کی حالیہ سرگرمی

قانون سازی کی حالیہ سرگرمی کے تحت کوشش شروع کر دی گئی ہے کہ عورتوں کی نابرابری اور کمتری کو ختم کر دیا جائے۔ ۱۸۵۶ء کے ایک قانون نے ہندو بیواؤں کی دوبارہ شادی کی اجازت دے دی تھی اور اس کو قانوناً جائز کر دیا تھا۔ ۱۹۳۷ء کے ایک قانون سے ہندو بیوہ کو بعض ایسے حقوق حاصل ہو گئے ہیں جن کی رو سے لڑکوں کے نہ ہونے کی صورت میں وہ شوہر کی جائداد کی وارث ہو سکتی ہے اور اگر شوہر نے لڑکے چھوڑے ہوں تو اپنی زندگی بھر کے لئے ان کے برابر کا حصّہ پا سکتی ہے۔ ۱۹۴۶ء کے ایک قانون نے یہ اختیار دیا ہے کہ بیوی بعض صورتوں میں شوہر سے الگ رہ سکتی ہے اور روٹی کپڑے اور رہنے سہنے کا خرچہ لے سکتی ہے۔ ان صورتوں میں جن میں بیوی کو الگ رہنے کا حق حاصل ہے چند یہ ہیں۔ شوہر کسی مکروہ مرض میں مبتلا ہو۔ بیوی پر ظلم

کرتا ہو اسے چھوڑ دیا ہو۔ دوسری شادی کرلی ہو۔ کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لیا ہو اور گھر میں کوئی داشتہ رکھلی ہو ۔

شادی کے معاملے میں (ہندو لا) ہندو قانون میں یہ شرط ہے کہ میاں بیوی دونوں ایک ہی ذات کے ہوں ۔ ہندوؤں میں بچوں کی شادی بہت عام تھی ۔ ۱۹۲۹ء کے ایک قانون نے ۱۸ برس سے کم عمر کے لڑکوں اور ۱۵ برس سے کم عمر لڑکیوں کی شادی کی ممانعت کر دی ۔ حال کے قانونوں نے ہندوؤں کی تمام ذاتوں میں آپس میں شادی کرنے کو جائز قرار دے دیا ۔ اور اس قانون میں ذاتوں کی تعریف میں بتایا گیا ہے کہ ان میں بودھ، جین اور سکھ بھی شامل ہیں ۔ "(اسپیشل میرج ایکٹ)" مخصوص شادی کے قانون نے ایک ایسی قسم کی شادی کی اجازت دے دی ہے جس میں کوئی مرد اور عورت آپس میں شادی کرسکتے ہیں چاہے وہ کسی قوم، مذہب یا ذات کے ہوں ۔

بعض ریاستوں کے حال کے قانون نے ہندوؤں پر یہ پابندی عائد کر دی ہے کہ وہ ایک سے زیادہ شادی نہیں کرسکتے اور طلاق دینے اور دوبارہ شادی کرنے کی بھی اجازت ہے ۔ ایک ایسا ہی قانون جو تمام ملک کے لئے ہوگا پاس کرنے کا ارادہ ہے اور ایسے قانون کے مسودے لوک سبھا میں زیر غور ہیں ۔

ملک کے بعض حصوں میں ایک یہ رواج پایا جاتا ہے کہ عورتوں کو ہندو مندروں یا دیوتاؤں کو سونپ دیا جاتا ہے اور انھیں شادی کی اجازت نہیں ہوتی ۔ اس کا نتیجہ یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسی عورتیں بیسوا ہو جاتی ہیں ۔ مدراس اور بمبئی میں ایسے قانون نافذ کر دئے گئے ہیں جن کے تحت ایسے رواجوں کی ممانعت کر دی گئی ہے اور ایسی عورتوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ شادی کرکے گھر بسائیں ۔

مزدور عورتوں کے متعلق قانون

عورتوں کو کارخانوں ۔ کانوں اور باغات میں کام پر لگانے کے لئے قانون مقرر ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ عورتیں کس قسم کا کام کرسکتی ہیں اور کتنے گھنٹے کام کرسکتی ہیں ۔ اس بات کی بھی ہدایت ہے کہ آجر حضرات مرد مزدوروں اور عورت مزدوروں کے لئے علیحدہ علیحدہ آسائشیں مہیا کرنا چاہئیں ۔ جن کارخانوں میں پچاس سے زیادہ عورتیں کام کرتی ہیں انھیں "بچوں کی پرورش گاہیں" مہیا کرنا ہوتی ہیں ۔ بچوں کو دودھ پلانے کے لئے ان کی ماؤں کو تھوڑے تھوڑے وقفے کی مہلت دی جاتی ہے ۔

بہت سی ریاستوں میں ایسے قانون بھی بنائے گئے ہیں جن میں مزدور عورتوں کو زچہ خانہ سے متعلق آسانیاں مہیا کی گئی ہیں ۔ کسی عورت کو اس کے یہاں بچہ ہونے کے بعد چار ہفتے تک کام کرنے کے لئے رکھنے کی ممانعت ہے ۔ جیسا کام ویسی اُجرت والا معیار ابھی تک حاصل نہیں کیا جا سکا ہے ۔ اگرچہ ہندوستان نے اس معاملے میں بین الاقوامی معاہدے کی توثیق نہیں کی ہے لیکن اصولی طور سے ہندوستان اس معاہدے کو مانتا ہے اور اسے دستور کے ہدایتی اصول ان مقاصد میں شمار کرتے ہیں جنھیں حاصل کرنا ہے ۔

بچوں سے مزدوری کرانے کی ممانعت

دستور میں ممانعت ہے کہ پندرہ سال سے کم عمر کے بچوں کو کسی کارخانے یا کان میں یا کسی اور خطرناک دھندے میں کام کرنے کے لئے رکھا جائے ۔ بچوں کو کسی تعلیمی ادارے میں ان کے والدین کی اجازت کے بغیر کسی قسم کی مذہبی تعلیم نہیں دی جاسکتی ۔ دستور کی ہدایت میں یہ بھی ہے کہ بچوں کو بے توجہی نیز ان سے بے جا فائدہ اٹھانے سے محفوظ رکھا جائے اور وہ جب تک پورے ۱۴ سال کے نہ ہو جائیں ان کے لئے عام مفت لازمی تعلیم کا انتظام کیا جائے ۔

۱۸۵۰ء کے ایک قانون میں ایسے غریب اور یتیم بچوں کو جو عوام کی خیرات سے پرورش کئے گئے ہوں دستکاری اور صنعت و حرفت سکھانے اور کام دھندے کا اہتمام کیا گیا ہے ۔

۱۹۳۲ء کے ایک قانون میں بچوں کو محنت مزدوری کرنے کے لئے بھرتی کرانے کی ذمہ داری لینے کی ممانعت ہے اور اس قسم کا کوئی معاہدہ باطل سمجھا جاتا ہے اور معاہدے کے فریقین کو سزا دی جاتی ہے ۔

تعزیرات ہند میں بچوں کو خریدنے اور بیچنے کی ممانعت ہے اور کسی نابالغ کو پیشہ کرانے کے لئے خریدنا یا بیچنا جرم ہے اور خریدنے اور بیچنے والے دونوں کو سخت سزا دی جاتی ہے ۔

۱۹۳۸ء کے ایک قانون میں ۱۵ سال سے کم عمر کے بچوں کو کسی ایسے کام پر لگانے کی ممانعت ہے جس کا تعلق نقل و حمل یا کسی بندرگاہ پر سامان ڈھونے سے ہو اور بارہ برس سے کم عمر کے بچے کسی ایسے کارخانے میں کام نہیں کرسکتے جن میں بعض مخصوص صنعتوں سے متعلق کام ہوتا ہے

جیسے بیڑی بنانے اور دریاں بُننے کے کارخانے۔ سیمنٹ، دیا سلائی اور تڑخنے والے مادوں کے کارخانے اور ابرق، لاکھ، ٹین، صابن وغیرہ وغیرہ کے کارخانے۔

فیکٹریز ایکٹ (کارخانوں کا قانون) کی رو سے کسی کارخانے میں کام کرنے والے بچّوں اور نوجوانوں کے لئے ضروری ہے کہ ڈاکٹر امتحان کر کے ان کو سارٹیفکیٹ دے کہ یہ کام کرنے کے قابل ہیں۔ اس ایکٹ کے تحت ان کے کام کی نوعیت اور کام کرنے کے گھنٹوں کی تعداد بھی مقرر کی جاتی ہے۔

بچّوں کی پرورش اصل میں باپ کا فرض ہے اور بچّوں کو رکھنے کا حق باپ کا ہوتا ہے۔ لیکن چھوٹی عمر کے بچّے کو عدالت عام طور سے ماں کو دلا دیتی ہے۔ جو والدین یا کسی ایسے بچّے کی خبر نہ لیں جس کی عمر بارہ برس سے کم ہو جُرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کسی ناجائز بچّے کی ماں اپنا روٹی کپڑا طلب کر سکتی ہے اور فرضی باپ پر ضابطہ فوجداری کے تحت مقدمہ بھی چلایا جا سکتا ہے۔

قانون نافذ کرنے کا مسئلہ

بعض ریاستوں نے (چلڈرنز ایکٹس) بچّوں سے متعلق قانونوں کی منظوری دے دی ہے۔ لیکن وہ سب کے سب نافذ نہیں کئے گئے ہیں۔ ان قوانین کے پیش نظر دو خاص مقصد ہیں۔ پہلا مقصد یہ ہے کہ ان مجرم بچّوں کی جو قانون کے لحاظ سے جرموں کے مرتکب قرار دئے گئے تربیت اور سدھار کا انتظام کیا جائے۔ ان کے لئے عدالتیں ہوں اور ان عدالتوں کی کارروائی کم رسمی ہو اور ان کا مقصد دراصل بچّے کا جرم تجویز کرنے سے زیادہ اس کی اصلاح کرنا ہو۔

۱۸۹۷ء کے ایک قانون کے تحت پندرہ برس سے کم عمر کے ان بچّوں کے لئے جنھوں نے ایسے جرم کئے ہوں جن کی سزا موت یا کالا پانی نہ ہو بچّوں کی اصلاحی جیلیں قائم کی جا سکتی ہیں۔ یہ ایک گنجائشی قسم کی دفعہ تھی اور تمام مجرم بچّوں پر عائد نہیں ہوتی تھی (چلڈرنز ایکٹس) بچّوں کے قانونوں میں ہے کہ کسی بچّے کو نہ تو موت کی سزا دی جائیں گی نہ کالے پانی کی اور نہ قید کی۔ جب بچّوں پر جرم ثابت ہو جائے تو انھیں "تصدیق شدہ اسکولوں" یا صنعتی اسکولوں میں بھیج دیا جائے تاکہ انھیں کسی کام کی تربیت دی جائے۔ بعض ریاستوں میں ایسے نوجوان مجرموں کے لئے جن کی عمر ۱۵ اور ۲۱ سال کے درمیان ہو بورسٹل انسٹی ٹیوشن Borstal Institutions "مجرموں کے اصلاحی ادارے" ہیں جن میں ان کی اصلاح کی جاتی ہے اور ان کو تربیت دی جاتی ہے۔ بچّوں کے قانون کا دوسرا مقصد یتیم، مفلس اور ایسے بچّوں کی خبرگیری اور حفاظت کرنا ہے جن کا کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ ان قانونوں میں والدین کے فرض بتائے گئے ہیں اور بچّوں کی عدالتوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایسے بچّوں کو ان والدین سے علیحدہ کر لیں جو نکمّے ثابت ہوں۔

حکومت اور رفاہ عام کی خدمت

اس وقت عورتوں اور بچّوں کی بھلائی سے متعلق خدمات کا زیادہ تر کام رضاکار ادارے انجام دے رہے ہیں۔ حکومت نے اب تک بہبود کا کام کرنے والے اداروں کو برقرار رکھنے کا کام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا ہے۔ لیکن اب اس کے متعلق دستور نے متعدد فرائض حکومت پر عائد کر دئے ہیں اور اب حکومت کو بہت جلد اس قسم کی خدمات کرنے والے ادارے ترقی پذیر رفتار سے قائم کرنا پڑیں گے۔ پہلے پنج سالہ پلان کے پیش نظر محسوس کیا جاتا ہے کہ اس کام کو مکمل طور سے اپنے ہاتھ میں لے لینے کے لئے حکومت کو تھوڑا وقت لگے گا۔ حکومت نے رفاہ عام کا کام کرنے والے موجودہ رضاکار اداروں کو مضبوط بنانے اور وسعت دینے کا کام شروع کر دیا ہے تاکہ ان سے زیادہ سے زیادہ بچّوں کو فائدے پہنچیں اور ان کی ضرورتیں پوری ہوں۔ چنانچہ پنج سالہ پلان نے اس مقصد کے لئے چار کروڑ روپے کا فنڈ (سرمایہ) مہیا کر دیا ہے۔ اور مرکزی حکومت نے ایک "سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ" قائم کر دیا ہے جو ایسے غیر سرکاری افراد پر مشتمل ہے جنھیں فلاح و بہبود کی رضاکارانہ سرگرمیوں کو ترقی دینے کا عملی تجربہ ہے۔ اور یہی لوگ متذکرہ فنڈ کو کام میں لانے کا انتظام کریں گے۔ یہ بورڈ ایک سال سے کچھ کم مدت سے کام کر رہا ہے اور سامان اکٹھا کرنے اور فلاح و بہبود کے متعدد اداروں کو مدد دینے میں اب تک اچھا خاصہ کام انجام دے چکا ہے۔ یہ تو صرف ابتدا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اب زیادہ دیر نہیں لگے گی اور ملک کے تمام حصوں میں فلاح و بہبود کے ادارے جال کی طرح پھیل جائیں گے جو ملک بھر میں سوسائٹی کے تمام ضرورت مند شعبوں کی حاجتوں کو پورا کر دیں گے۔

سروش عسکری طباطبائی

عہد و پیماں

ایک دن وہ دلبرِ شیریں ادا و گلبدن — جس کے لعلِ لب کی خاموشی بھی ہے جانِ سخن
نو بہارِ ناز، شامِ بت کدہ، صبحِ حرم — جانِ موسم، جوہرِ مے، عطرِ گل، روحِ ختن
جس کا رنگِ نو دمیدہ، رہزنِ ہوشِ بہار — جس کا حسنِ نو شگفتہ، آفتِ جانِ چمن
قامتِ رنگین و رعنا، فتنۂ صبحِ نشور — حسنِ تاباں و برشتہ، برقِ انوارِ عدن

نازسے کہنے لگی، گردن میں بانہیں ڈال کر
"اے مرے سودائیِ زلفِ شکن اندر شکن!

"اے کہ میرے چشم و ابرو، تجھکو شمشیر و سناں — اے کہ میرے قامت و گیسو، تجھے دار و رسن"
"اے کہ میرے پاؤں کی آہٹ، تجھے سازِ بہار — اے کہ میرے جسم کی خوشبو، تجھے بوئے سمن"
"سچ بتا کیا عشق رہ جائے گا تیرا برقرار؛ — وقت جب کر دے گا برہم حسن کا میرے چمن"
"کیا یونہیں پھر بھی رہے گا تو مرا حلقہ بگوش؛ — جب سپیدی کی مرے بالوں میں پھوٹے گی کرن؛

ہوش اڑا ڈالے مرے بیدرد کی تقریر نے!
ہو گئے احساس سے مجروح ذہن و جان و تن

پھر سنبھل کر عرض کی میں نے کہ "اے جانِ بہار — حشر تک قائم ترے حسنِ جواں کا بانکپن"
"تا قیامت تازہ، تیری دلربائی کا غرور — تا ابد باقی ترے حسن و جوانی کی پھبن"
میں ازل سے ہوں تری زلفِ مسلسل کا اسیر — اور ابد تک دل سے مٹنے کی نہیں تیری لگن"
"لاکھ طوفاں سر اٹھائیں، انقلابِ وقت کے — یاد رکھ اے جانِ من، جانانِ من، ایمانِ من"

"سوزِ بلبل کم نہ گردد، گر رود گل از چمن!"
"حسن بے بنیاد باشد عشق بے بنیاد نیست!"

تاجور سامری

سائیں من من

اُسے ٹرک کے حادثے میں ہلاک ہوئے آج دس برس سے بھی اوپر ہونے ہیں، لیکن اپنی عجیب و غریب شخصیت کے کارن وہ اب بھی میرے ذہن میں اکثر اُبھر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے لوگ اسے بھول گئے ہوں۔ کیونکہ جو چیز سامنے نہ رہے دُنیا اُسے کم ہی یاد رکھتی ہے، اور ان دس برسوں میں تو اتنی بڑی تبدیلی ہو گئی ہے، اور اَن گنت نئے لوگ باہر سے یہاں آ بسے ہیں۔ پُرانے مر گئے یا مسلمان ہونے کے کارن پاکستان چلے گئے، اُس کا چرچا اب بہت ہی کم سننے میں آتا ہے، لیکن مجھے ایسا لگتا ہے وہ اب بھی کہیں موجود ہے، اور ابھی کسی طرف سے نکل آئے گا۔ وہ بھیانک صورت، لمبے چُغے اور اونچے کلاہ اور سُرخ شعلوں کی سی آنکھوں سے گھُورتا ہوا کچھ بے معنی سی منمناہٹ کے ساتھ آندھی کی طرح گزر جائے گا۔ اور عورتیں جلدی جلدی اپنے بچّوں کو چھپا لیں گی، اور دودھیل جانور کو کمبلوں اور موم جاموں سے ڈھاک دیا جائے گا۔ کیونکہ اُس کے متعلق مشہور تھا کہ اُس کی سُرخ آنکھیں اگر کسی بچّے یا دودھیل جانور پر پڑ گئیں تو وہ زندہ نہ بچے گا۔ اتفاق سے ایسے دو ایک حادثے ہو بھی گئے تھے، اور دُکھ کی بات یہ تھی کہ سادہ لوح عورتوں کے ساتھ پڑھے لکھے مرد بھی اس وہم کا شکار تھے، اور کئی مرتبہ اُسے اس بستی میں داخل ہونے سے روکنے کی تجویزیں بھی سوچی گئی تھیں، لیکن عمل میں کوئی نہ آ سکی، کیونکہ کسی میں بھی اُس کے سامنے جانے کی ہمت نہ تھی، وہ کئی کئی دن دکھائی نہ دیتا تھا، اور جب لوگ کچھ مطمئن ہونے لگتے تو اچانک گلیوں میں آ نکلتا، اور گلی میں بیٹھی عورتوں میں بھگدڑ پڑ جاتی۔ کھیلتے اور سوتے اور دودھ پیتے بچّوں کو فوراً چھپا دیا جاتا، اور عورتیں اُسے گالیاں کوسنے اور بددعائیں دیتیں، بند دروازوں کی دراڑوں میں سے جھانکنے لگتیں۔

اُس کے ہر دم منمنانے کے کارن لوگ اُسے سائیں من من کہتے تھے۔ اُس کا چہرا گھنی سفید ڈاڑھی اور مونچھوں سے چھپا رہتا تھا جس سے شعلوں جیسی لال لال آنکھیں بجلی کی طرح کوندتی رہتیں۔ پاؤں تک چغہ اور لمبی کلاہ۔ جو کبھی سبز رنگ کے ہوں گے مگر اب میل کی وجہ سے گہرے سیاہ رنگ کے ہو رہے تھے۔ اُس کی یہ صورت اور پہناوا واقعی ڈراونا تھا، اور پھر اُس کی بھید بھری خاموشی اور طلسمی منمناہٹ، جیسے وہ کوئی افسون پڑھ رہا ہو۔ عورتیں اکثر شریر اور سرکش بچّوں کو ڈراتیں کہ وہ آیا سائیں من من، اور بچّہ سہم کر ماں کے ساتھ چمٹ جاتا۔

ٹرک کے حادثے سے ایک آدھ دن پہلے وہ اچانک گلی کے سرے پر دکھائی دیا تھا، اُس کی چال معمول کے خلاف کچھ آہستہ اور پُرسکون تھی۔ ستمبر کی صبح کے سات بجے کا وقت ہوگا، عورتیں اپنے گھروں میں کام کاج میں لگی تھیں اور چھوٹے چھوٹے بچّے کھیلنے میں مگن تھے۔ میں اپنے دروازے کے باہر چارپائی ڈالے کچھ لکھ رہا تھا۔ میں نے اتفاق سے اُسے آتے دیکھ لیا تھا، اور پہلی مرتبہ اُسے یوں آنکھ بھر کر دیکھا تھا۔ اُس کی سُرخ سُرخ آنکھیں اب بھی اِدھر اُدھر گھور رہی تھیں۔ گلی میں صرف ہماری ایک چھوٹی سی بچھیا بندھی تھی۔ سائیں من من نے چاروں طرف دیکھا۔ میں نے جان بُوجھ کر اپنے کو لکھنے میں مصروف کر لیا، اور کنکھیوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ میں نے حیرت سے دیکھا، اُن کرخت، درشت اور جلتی ہوئی آنکھوں میں ایک عجیب سی نرمی پیدا ہوئی اور اُس نے بڑھ کر چپکے سے بچھیا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بچھیا اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُس کے پیار کو محسوس کر کے اپنی گردن اُس کی طرف بڑھا دی۔ مگر سائیں وہاں زیادہ دیر نہیں رُکا، وہ آگے بڑھا، اور جہاں چھوٹے چھوٹے بچّے کھیل رہے تھے وہاں جا کر رُک گیا، اُس کی آنکھوں میں اب وہ نرمی اور گھلاوٹ اور بھی بڑھ گئی تھی، وہ ایسا مگن تھا جیسے وہ کوئی بہشتی نظارہ دیکھ رہا ہو۔ میں خود اُس کی شخصیت

کے اس رُخ کو دیکھ کر اچنبھے میں تھا، وہ دھیرے دھیرے اس طرح بچوں کے قریب پہنچ گیا جیسے لوہا چمبک کے پاس کھنچ کر چلا جاتا ہے، اور بے اختیار اس کے ہاتھ ایک بچے کے سر کی طرف بڑھے، بچے بھی اُسے حیرت دلچسپی مگر بے خوفی سے دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ اس انوکھے آدمی کو پہلی بار قریب سے اُن کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اچانک سامنے کی چھت سے ایک عورت چلائی، اے بچو! سائیں من من۔ اس کے ساتھ ہی وہ سب بچے سراسیمگی کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس سے سائیں کی آنکھیں بھیجنے لگیں اور وہ غصے میں دانت کٹکٹاتا آندھی کی طرح سنسناتا چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد گلی عورتوں سے بھر گئی۔ مرد بھی دھیرے دھیرے جمع ہو گئے تھے۔ اور طرح طرح کی باتیں ہونے لگی تھیں۔ ایک عورت پکاری، ارے کوئی دوڑ کر جائے، پجاری جی کو بلاؤ۔ بچوں کو جھاڑا تو کرا لو ——— وہ پاپی جانے کیا منتر پڑھ رہا تھا۔

دوسری عورت بولی۔ میری مانو تو اُس کے پاؤں کی مٹی لا کر آگ میں ڈالو۔

رام رام، گوپ اشٹمی کے دن یہ منحوس دکھائی دیا، بھگوان بھلی کرے۔ یہ کہہ کر ایک بوڑھی نے آٹے کا بڑا سا پیڑا ہماری بچھیا کو کھلا دیا۔

اس کی دیکھا دیکھی دھیرے دھیرے عورتیں آنے لگیں اور اُس بچھیا کو آٹا کھلانے لگیں۔ گوپ اشٹمی کے موقعے پر ایسا رواج ہے اور خاص طور سے براہمن کی گائے کو کھلانا بڑے پُن کا کام سمجھا جاتا ہے، اور یہ بچھیا اتفاق سے برہمن کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ مرد اپنی جگہ پریشان تھے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، اتنے میں ایک عورت نے پکار کر کہا۔ مصرانی جی تمہاری بچھیا کو تو سائیں من من بڑا پیار کر رہے تھے۔ تمہارا لڑکا پاس بیٹھا لکھ رہا تھا۔

یہ سن کر میری ماں کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اُس نے خوف زدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا، میں اُس کے اس وہم پر مسکرا دیا۔ وہ بھی میری عادت اور عقیدے کو خوب سمجھتی تھی۔ میری مسکراہٹ پر اپنے ہی میں کھول کر رہ گئی اور جا کر بچھیا کو دیکھنے لگی۔ اچانک وہ چلائی۔

ہائے ہائے دیکھنا میری بچھیا کو کیا ہو گیا۔

دوسری عورت نے بڑھ کر ڈرتے ڈرتے دیکھا، اور کہنے لگی۔ رام ہے، اس کا تو پیٹ پھول رہا ہے۔

اب میں بھی اُٹھا، دیکھا تو واقعی بچھیا اپھراؤ کی تکلیف سے تنی جاتی تھی بچاری تکلیف کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اُس کی آنکھیں دھیرے دھیرے اُبل رہی تھیں۔

ایک عورت بولی، میں جانوں اسے اُسی موئے من من کی نظر لگ گئی ہے۔ ہائے کیسی موہنی سی بچھیا ہے

میری ماں اونچے گلے سے کوسنے لگی۔ ہائے کسی کی آئی لگے من من کو۔ غریب کی بچھیا کا پاپ اُسے دوزخ میں بھی نہ چھوڑے۔

بچھیا اب تڑپنے لگی تھی، اور میری ماں کے آنسو نکل آئے تھے۔ میں نے کہا گھبراؤ نہیں۔ زیادہ گندھا ہوا آٹا کھا جانے سے اس کو بدہضمی ہو گئی ہے۔ میں ابھی اسے ہسپتال لے جاتا ہوں۔

اس پر بوڑھی تنک کر بولی، واہ، کیا انوکھی بات کہی ہے۔ اب بھلا ہم آٹا کوئی نیا کھلانے لگی ہیں۔ آج تک تو ایسا ہوا نہیں، بھگوان جانے یہ نئے زمانے والے کیا کیا گل کھلائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے کھسک گئی

ایک پڑوسی آگے بڑھا اور بولا، اب سوچتے کیا ہو، پنڈت جی، چلو لے چلیں اسے ہسپتال، بچاری تڑپ رہی ہے تکلیف سے۔

نہ نہ رہنے دو، میں نہیں لے جانے دوں گی اسے ہسپتال۔ جانے وہ دشٹ لچے زہر دے دیں گے، مگئو کی جائی..... یہ کہہ کر ماں رونے لگی۔

چنانچہ دوپہر تک بچاری بچھیا مر گئی، اور سائیں من من کے متعلق وہموں پر ایک طرح سے تصدیق لگا دی ....

لیکن اُس کی شخصیت پر اسرار کا یہ کالا پردہ زیادہ دیر تک پڑا نہ رہ سکا۔ دوسرے ہی دن جب وہ ایک ننھی سی بچی کو بچاتے ہوئے خود ایک دیو قامت ٹرک تلے کچلا گیا تو اُس کی شخصیت کے نئے پہلو کو سب نے دیکھا۔ لڑکی دھچکے سے سڑک کی ایک طرف گر گئی تھی، اور اُسے معمولی سی خراش کے سوا کوئی چوٹ نہ پہنچی تھی۔ لیکن سائیں من من بُری طرح کچلا گیا تھا۔ ٹرک اُس کے بازوؤں اور پیٹ سے گزر گیا تھا۔ سڑک پر بہتے ہوئے خون اور تڑپتی ہوئی پھیلی انتڑیوں سے بہت خوفناک منظر پیش تھا لوگوں کی بھیڑ چاروں طرف اُسے رحم سے دیکھ رہی تھی، اب اُن کے سامنے وہ خوفناک اور پُر اسرار چہرے والا سائیں من من نہ تھا، اب ایک نیک انسان دم

توڑ رہا تھا۔ پولس آئی۔ اور جب اُس کو اُٹھا کر ایمبولنس کار میں رکھا جانے لگا تو اُس نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ اب اُس کی آنکھوں میں اس شعلہ رنگ بجلی کی جگہ ایک اُجلی روشنی نے لے لی تھی۔ اُس نے سر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک آدمی نے اپنے پاس کھڑے ایک شخص سے کہا۔ یہ شاید معلوم کرنا چاہتا ہے وہ بچی محفوظ ہے کہ مر گئی۔

دوسرے شخص نے پکار کر کہا، وہ بچی بالکل ٹھیک ہے سائیں بابا۔

یہ سن کر سائیں من من کے چہرے پر ایک شانتی چھا گئی اور خاموش ہو گیا۔ مگر اُس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنے کے لئے اپنی ساری طاقت جمع کر رہا تھا۔ پولس والے بھی اُس کی طرف سوالیہ نظریں لئے تک رہے تھے۔ آخر سب نے حیرت سے سُنا۔ وہ سائیں من من سب کی زندگی میں پہلی بار بول رہا تھا، وہ رُک رُک کر کہہ رہا تھا۔

"اب میں نہیں بچوں گا۔ نہیں ...... بچو ......

پولس افسر نے فوراً اُس کا بیان لکھنا شروع کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"میری ...... سا .. .. ری زندگی بچوں کے قریب جانے کی حسرت میں بیت گئی .... آہ .....

وہ تھک کر رُک گیا، خون ابھی تک دھیرے دھیرے بہہ رہا تھا۔ اُس کی ٹانگیں اور بازو اور دائیں طرف پھیلی ہوئی انتڑیاں اب سرد ہو گئی تھیں، اُس نے پھر اپنی ساری طاقت جمع کر کے کہا۔

"میرے جُھگّے میں روپیہ پیسا ہے .... میں
چاہتا تھا، اس سے ایک ایسا باغ بنواؤں ....
جہاں .... بچے بے خوف ...... کھیل سکیں ......
لیکن ...... آہ ......"

اس کے بعد وہ نہیں بول سکا۔ تھوڑی دیر میں اُس کی لاش پولس والے پوسٹ مارٹم کے لئے لے گئے۔

اب سارے شہر میں اسی حادثے کا چرچا تھا۔ لیکن اب عورتیں اور بچے اُس کا نام لیتے ہوئے ڈرتے نہیں تھے۔

حقائق اور اعداد و شمار

۱ ۔ سال ۵۳ ۔ ۱۹۵۲ء میں ڈیڈ لیٹر آفسوں میں کل ایک کروڑ ستائیس لاکھ اکیاون ہزار خطوط موصول ہوئے۔ جن پر لکھا ہوا پتہ غیر واضح یا نامکمل تھا۔ ان میں سے صرف آٹھ اعشاریہ سات فی صدی خطوط عدم پتہ قرار دئے گئے، باقی سب بھیجنے والوں کو واپس کر دئے گئے۔ یا نئے پتے پر پھر سے ارسال کر دئے گئے۔

۲ ۔ بھارت میں بحری جہازوں کے ذریعے جس قدر مال و اسباب کی آمد و رفت ہوئی ہے، اس میں سے نوّے فی صدی بمبئی، کلکتہ، مدراس، وساکھاپٹم اور کوچین کی بڑی بندرگاہوں میں اُتارا یا لادا جاتا ہے۔ باقی مال اُن دو سو کے قریب چھوٹی بندرگاہوں میں اتارا یا لادا جاتا ہے، جو بھارت کے ساحل کے ساتھ ساتھ بکھری ہوئی ہیں۔

۳ ۔ ۵۴ ۔ ۱۹۵۳ء میں بھارت میں پٹ سن کی فی ایکڑ اوسط پیداوار ۱۰۴۵ پونڈ تھی۔ پچھلے دو برسوں میں یہ اوسط بالترتیب ۹۷۰ پونڈ اور ۱۰۱۵ پونڈ فی ایکڑ تھی۔

۴ ۔ بھارت کی ریلوں کو ہر برس چالیس لاکھ سلیپروں کی ضرورت ہوتی ہے جس میں سے بائیس لاکھ بھارتی فرمیں سپلائی کرتی ہیں۔

۵ ۔ پانچ سالہ منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں تقریباً دس ارب (ایک ہزار کروڑ) روپیہ خرچ ہو چکا ہے منصوبہ کے کل خرچ کا اندازہ بائیس ارب چالیس کروڑ روپے رکھا گیا ہے۔

محمد بشیر الحق دسنوی عظیم آبادی

اُردو کے دو قدیم پروانے

میرے جدِ مادری مولوی ملک اصغر حسین صاحب مرحوم دسنوی کے والد بزرگوار کا اسم گرامی جناب مولوی ملک طفیل علی تھا، جو عدالت امین صدر گیا کے منتخب وکیلوں میں تھے۔ میں ملک طفیل علی صاحب مرحوم کی زیارت سے محروم رہا، کیونکہ میری پیدائش (۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۱ء) سے پہلے ہی اُن کا انتقال ہو چکا تھا۔ ملک اصغر حسین صاحب فرماتے تھے کہ ملک طفیل علی صاحب بہت ہی ذی علم آدمی تھے۔ عربی اچھی اور فارسی بہت ہی اچھی جانتے تھے۔ اُردو کے جن دو قدیم پروانوں کا تذکرہ آئندہ سطور میں آئے گا، وہ دونوں اُن ہی مرحوم کے نام کے ہیں۔

ملک اصغر حسین صاحب مرحوم کو میں نے دیکھا تھا۔ میری پیدائش اُن ہی کے مکان میں ہوئی تھی۔ کہہ سکتا ہوں کہ میری طفلی کا زمانہ اُن ہی کے سایۂ عاطفت میں گذرا۔ میرے نکاح مرقومہ ۱۹۰۱ء میں وہ شریک تھے۔ نکاح کے بعد ہی جب ان کی عمر شریف اسّی سے تجاوز کر گئی تھی، ان کا انتقال ۱۹۰۱ء ہی میں ہوا۔ ملک اصغر حسین صاحب مرحوم فارسی بہت ہی اچھی جانتے تھے اور لکھتے بھی خوب تھے۔ جیسا کہ اُن کے اُس رقعے سے ظاہر ہوگا جو اُنھوں نے میری منسوب کے متعلق مولانا ملک محمد احسن صاحب استھانوی بہاری کو لکھا تھا۔ میرے خسر جناب مولانا ملک محمد احسن صاحب مرحوم کا شمار بہار کے جید علما میں تھا، موصوف جناب مولانا سیّد نذیر حسین عرف میاں صاحب دہلوی، اور جناب مولانا ہدایت اللہ صاحب جون پوری کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب بہاری مرحوم پروفیسر دینیات مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ جناب مولانا ملک محمد احسن صاحب مرحوم ہی کے شاگرد رشید تھے۔

نقل خط ملک اصغر حسین صاحب

مولوی صاحب مجمع حسنات و منبع برکات رفع اللہ درجاتکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ بعد شرح شوقِ مواصلت کہ مقصود بالذات عزیزان ستودہ آیات است مشہود رائے بیضا سے باد کہ چوں رشتۂ ارتباط طرفین طناب کش وہاست، اگر شمع محفل جمہور گردد دور از قرابت قریبہ نخواہد شد کہ نور چشم راحت جانم برخوردار بشیر الحق را بفرزندی آں عزیز اخلاص پرست دادن، آرزو دارم رجا کہ ایں استدعایم را مقرونِ اجابت ساختہ یکے از دو دمانِ محبت ما تمام زداو فرمایند کہ عقد سلسلۂ یگانگی خاطر نشین خواص و عوام گردد، ازیں معنی دست کشیدہ بہ نگارش جواب باصواب پردازند کہ چشم براہ و دیدہ دل بہ نگاہ است۔ زیادہ چہ نویسم، ایام سرور و نشاط مدام باد۔

جن دو پروانوں کا ذکر اوپر آیا ہے اُن میں سے پہلا پروانہ ۲۲، جنوری ۱۸۱۹ء مطابق ۲۲ ماگھ ۱۲۲۶ فصلی کا ہے۔ اِس پروانے کا مضمون درج ذیل ہے۔

مہر عدالت

دستخط سیّد اشرف حسین صدر امین

فضیلت پناہ مولوی طفیل علی وکیل محکمہ امین صدر ضلع بہار بعافیت باشند

عرضی تمھاری باستدعا اجازت رخصت واسطے انجام شادی لڑکے کے ابتدائے بستم ذی قعدہ مطابق بست پنجم جنوری سنہ حال لغایت آخر ماہ ذی الحجہ کے ملاحظہ سے گذری، چنانچہ رخصت تمھاری منظور ہوئی۔ واسطے اطلاع کے رقم پایا۔

فقط تاریخ چوبیس ماہ جنوری ۱۸۳۹ء
چوبیس ماگھ ۱۲۴۶ فصلی
العبد جوالے لال محرر

دوسرا پروانہ ہشتم اپریل ۱۸۴۸ء مطابق بستم چیت ۱۲۵۵ فصلی روز سہ شنبہ کا لکھا ہوا ہے۔ پروانے کی نقل درج ذیل ہے۔

(مہر عدالت) نقل دستخط سید تفضل حسین صدر امین

رفعت پناہ مولوی افضل علی وکیل محکمہ امین صدر ضلع بہار بعافیت باشند۔ آج عرضی تمہاری بدرخواست عنایت رخصت دس روز تاریخ سیزدہم ۱۳ اپریل ۱۸۴۸ء سے ملاحظہ میں گذری اور رخصت تمہاری واسطے عرصہ مذکور کے منظور ہوئی، اس واسطے لکھا جاتا ہے کہ تم برسر میعاد رخصت اپنے کو حضور میں حاضر لاؤ۔

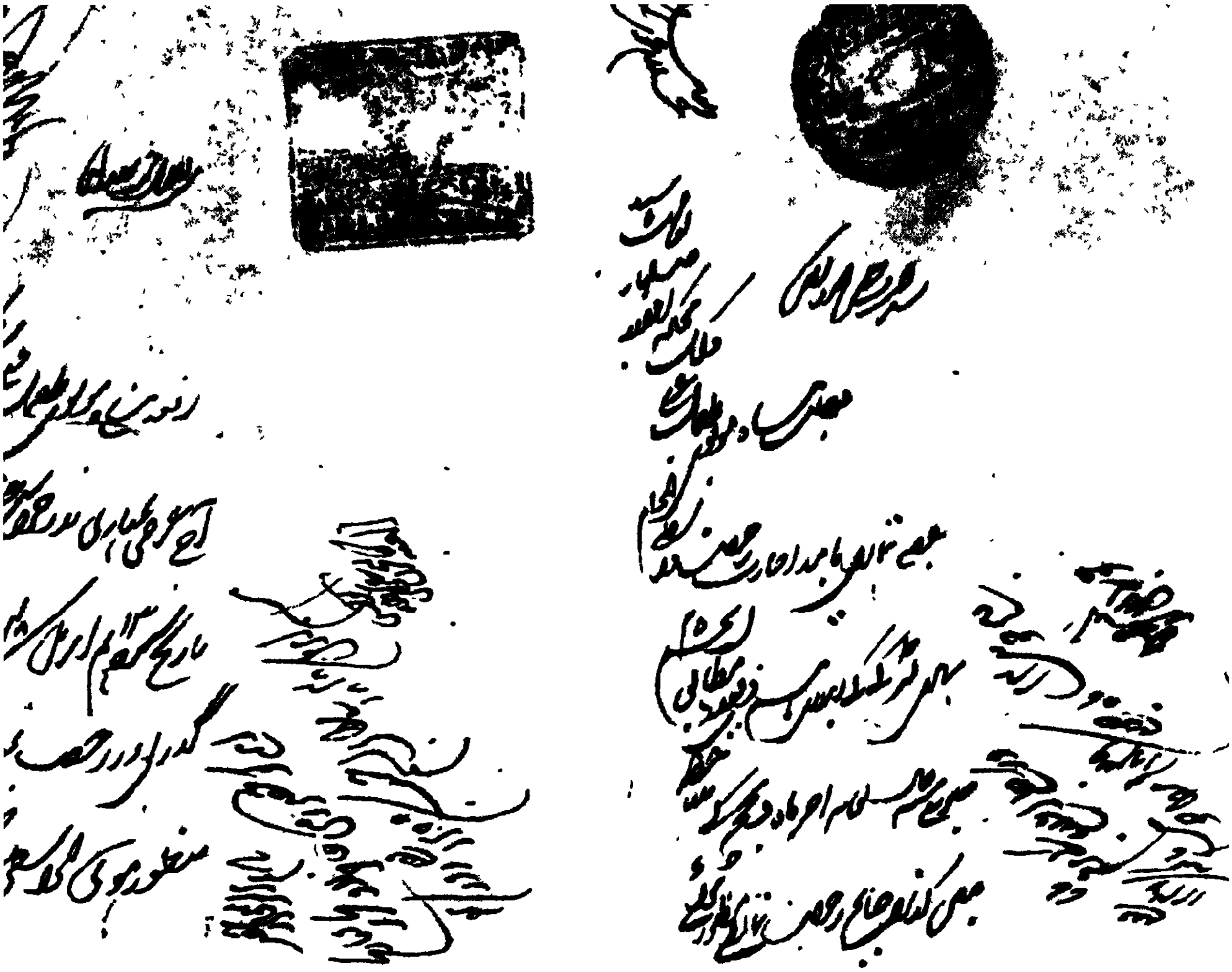
تحریر فقط تاریخ ہشتم اپریل ۱۸۴۸ء
مطابق بستم چیت ۱۲۵۵ فصلی روز سہ شنبہ
العبد کالی چرن عوض پروانہ نویس

جہاں تک معلوم کر سکا ہوں عدالتوں میں اردو کا اجرا ۱۸۳۲ء میں ہوا تھا، مگر اس کا نفاذ ۱۸۳۴ء میں ہوا۔ اس لحاظ سے دونوں پروانے قابل قدر ہیں۔

ملک کی تعمیر نو کی اسکیم

۸ ستمبر کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سیکرٹری ممبر پارلیمنٹ پروفیسر ایس۔ این اگروال نے قومی پلان قرضہ کے موضوع پر آل انڈیا ریڈیو سے ہندی میں تقریر نشر کرتے ہوئے عوام سے قومی پلان قرضہ میں دل کھول کر روپیہ لگانے کی اپیل کی اور کہا کہ اس قرضے کو ملک کی تعمیر نو کے لئے جاری کیا گیا ہے، تاکہ ملک کی تعمیر و ترقی میں عوام کا سرگرم تعاون حاصل کیا جائے۔ اس لئے ہر ہندوستانی شہری کو چاہیئے کہ کچھ نہ کچھ بچت کر کے اس قرضے میں روپیہ ضرور لگائے۔

حصول آزادی کے بعد زندگی کے مختلف شعبوں میں ہمہ گیر ترقی کا ذکر کرتے ہوئے صاحب موصوف نے کہا کہ پہلے پانچ سالہ پلان پر عملدرآمد سے کمیونٹی پروجیکٹوں اور قومی توسیعی سروس سے اس وقت پچپن ہزار دیہات مستفید ہو رہے ہیں، جن کی کل آبادی ساڑھے تین کروڑ ہے، اور توقع ہے کہ آئندہ سات سال میں تمام ملک میں ان پروجیکٹوں کو منظم طور پر جاری کر دیا جائے گا۔ دیہاتوں کی ترقی کی اسکیموں کے علاوہ مختلف صنعتوں کو فروغ دینے اور تعلیم اور طبی سہولتوں کی توسیع کی اسکیموں پر بھی عملدرآمد جاری ہے۔ گھریلو صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ ہوائی جہاز اور انجن سازی وغیرہ کا کام بھی روبہ ترقی ہے اور یہ جہاتما گاندھی کے قول کے عین مطابق ہے۔ سوراج سے مراد سیاسی آزادی ہی نہیں بلکہ سماجی اور اقتصادی آزادی بھی ہے، اور اس مقصد کے حصول کے لئے مساعی جاری ہیں۔ لیکن اس کے لئے سرمایے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں عوام ٹیکسوں کا زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ ان حالات میں حکومت کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ عوام سے قرضہ لے اور عوام کو بھی چاہیئے کہ وہ قومی قرضے میں فراخ دلی سے روپیہ لگائیں۔ اس سے انھیں منافع بھی کافی حاصل ہوگا۔ قومی قرضے کے علاوہ قومی پلان کے سرٹیفکٹ بھی جاری کئے جاتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس نقد روپیہ نہیں وہ اپنے زیورات اور جواہرات پنجاب نیشنل بنک کو دے کر زر نقد میں تبدیل کر سکتے ہیں اور اس طرح قومی قرضے اور قومی منصوبے کے سرٹیفکٹوں میں روپیہ لگا سکتے ہیں۔ غریب عوام بھی اس قرضے میں حصہ لے سکتے ہیں، وہ نیشنل سیونگز اسٹامپ اسکیم کے تحت اسٹامپ خرید سکتے ہیں اور جب ان کی مالیت پچیس روپے ہو جائے تو وہ انھیں نیشنل پلان سرٹیفکٹ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ بھارت سرکار نے اعلان کیا ہے کہ سرکاری ملازمین نہ صرف اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے روپیہ نکلوا سکتے ہیں، بلکہ ایک مقررہ حد تک اپنی تنخواہ بھی پیشگی لے سکتے ہیں۔ قومی پلان قرضہ ایک تجربے کی صورت میں جاری کیا گیا ہے جس میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے، لیکن یہ کافی نہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ پینتیس کروڑ عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے ہمہ تن کوشش کریں، اور جہاں تک ہو سکے اس قرضے میں روپیہ لگائیں۔ اگر اجتماعی طور پر ہم اپنی مدد آپ کریں گے تو پرماتما ہماری مدد ضرور کرے گا۔



اردو کے دو قدیم پروانے

ایک ۱۸۳۹ء کا ہے اور دوسرا ۱۸۴۸ء کا



شریمتی وجے لکشمی پنڈت
انڈونیشیا کے صدر مسٹر سوکارنو
کے ساتھ جکارتا میں ان کے
محل میں مصروف گفتگو ہیں



نیروبی میں ہندوستان کے قائم مقام
کمشنر شری آر- کے ٹنڈن کا ایک
استقبالیہ - تصویر میں بائیں
طرف سے شری ٹنڈن ، آنریبل آرکی
کیسلے (گولڈکوسٹ) ، ارل آف لیوکن
(برطانیہ)، شریمتی ٹنڈن اور آنریبل
اے بی پٹیل وزیر (کینیا) کھڑے ہیں

واشنگٹن میں ہندوستانی سفارت خانے کی طرف
سے سردار سورن سنگھ کا سواگت - سفیر پاکستان
اور بیگم امجد علی بھی تشریف لائے



۲۶ اگست کو جالندھر میں ھائی پار
شری بی وی کیسکر مرکزی





جکارتا (انڈونیشیا) میں
ہندوستانی مصوری کی نمائش



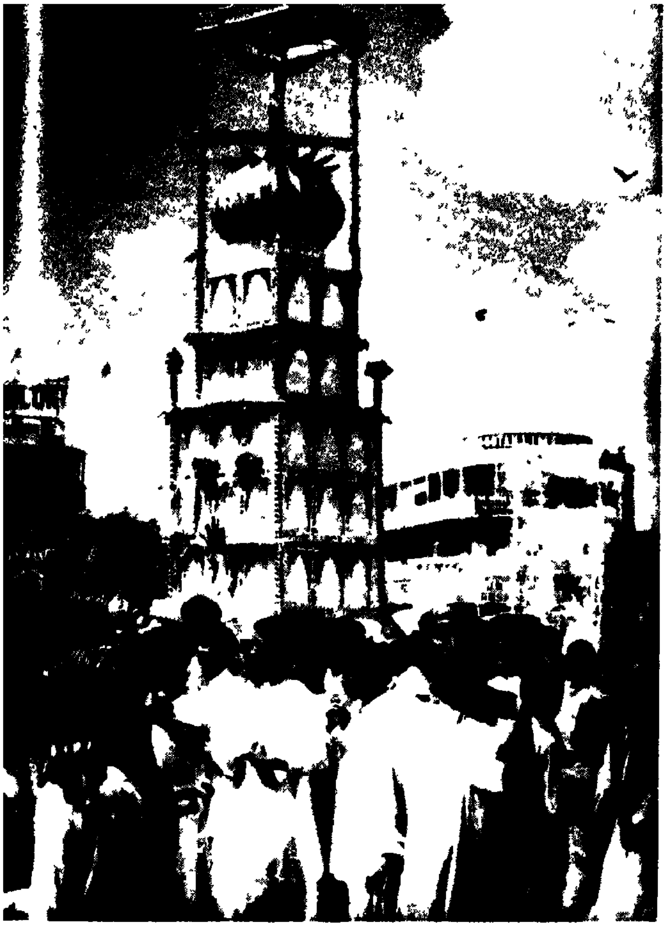
مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیمات
کستوربا نکیتن ،نئی دہلی کے
طلبا اور طالبات کی پریڈ کا
معائنہ کر رہے ہیں

انڈوچائنا جانے والے ایک جے سی او کے کندھے
"انڈیا" بیج لگایا جا رہا ہے



م ریڈیو ٹرانسمٹر کے اجراء کی رسم افتتاح
ریلٹ نے صدارتی ایڈریس پڑھا






دهلی میں محرم

۹ اگست ۱۹۵۴ء




بال مکند مشر

سچدانند واتسائن

ہندی ادب کے موجودہ دور میں جن شخصیتوں کا اپنا ایک خاص مقام ہے اور جن سے ہندی کے نئے ادیب متاثر ہوئے ہیں، اُن میں شری آگیہ کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان کی شخصیت اور ادب دونوں میں ہی ایک عجیب سی سنجیدگی اور گہرائی ہے۔ اُن کے سنجیدہ اور پُرسکون چہرے پر بجلی کی طرح کوندتی ہوئی مسکراہٹ، بات چیت کا محتاط طرز، یہ سبھی ان کی ادبی عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔

ہندی کے اس ادیب کی پیدائش لکھنؤ میں ۱۹۱۱ء میں ہوئی۔ ان کے والد جناب پنڈت ہیرانند شاستری آثارِ قدیمہ کے محکمے کے اعلیٰ افسروں میں سے تھے۔ بہت قابل آدمی تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ بچپن میں آگیہ جی کو والد کے نزدیک رہنے کا زیادہ موقع ملا۔ اسی لئے والد کی طرف اُنھیں زیادہ لگاؤ ہے۔ والد کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومنے کا موقع بھی ملا۔ اسی سے ان کو سیر و سفر کی عادت پڑ گئی، اور یہ عادت آگے چل کر بہت کام آئی۔ کیونکہ 'سفر وسیلۂ ظفر' والا مقولہ ان کے ساتھ پورا اترا، اور سیر و سفر نے نہ صرف ان کو ادب کی تخلیق کے لئے مواد بہم پہنچایا بلکہ ان کے ادبی نقطۂ نظر کو کشادگی اور تنوع بخشا۔

آگیہ جی کی تصانیف کی طرح ان کی زندگی بھی دلچسپ اور نرالی رہی ان کی پہلی ادبی تخلیق کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ لکھنؤ کی بات ہے، اُن کی عمر کوئی چار سال کی ہوگی۔ ان کے یہاں کوئی رشتے دار کچھ کھلونے لے کر آئے۔ کھلونوں میں سے ایک پھرکنی ان کے حصے میں آئی، اس کا نام انھیں "بھمری" بتایا گیا۔ اُسے نچاتے ہوئے انھوں نے تالی بجا کر چلانا شروع کیا،

"ناچت ہے بھومری"

اور تال کی ضرورت کی وجہ سے یکایک "بھمری" کو "بھومری" بنا دیا۔ بات بہت اونچی بن گئی۔ کیونکہ بھمری ہی نہیں، زمین بھی ناچتی ہے۔ ساری دُنیا ناچتی ہے۔ ایک معمولی سے فقرے میں اتنا غیر معمولی مطلب نکل آیا۔ اسی سانحے پر ان کے اپنے الفاظ ہیں۔

'میں تخلیق کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خالق ہوں، میں نے الفاظ کی طاقت کو پہچان لیا۔ پہچان ہی نہیں اس پر قابو بھی پایا اور الفاظ کی طاقت ہی تو سب کچھ ہے۔ کیونکہ

"In the beginning was the word
and the word was God"

(شروع میں لفظ ہی تھا، اور لفظ ہی پرماتما تھا)

بچپن کے دور سے گزرتے ہوئے جہاں ایک طرف ان کی پڑھائی تیز رفتاری کے ساتھ بڑھتی رہی ان کا ادبی مذاق بھی بہتر ہوتا گیا۔ انھوں نے سنسکرت اور ہندی کے ساتھ ساتھ انگریزی پر بھی عبور حاصل کیا۔ چھوٹی عمر ہی میں انھوں نے کچھ تُک بندیاں لوگوں کو چڑھانے کے لئے انگریزی میں بھی کیں۔ انھوں نے انگریزی میں گنگا استو ایک نظم بھی لکھی جو گنگا جی کی بھینٹ ہو گئی۔

فرینہل (ڈلہوزی) میں قدرت کے مناظر سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک قلمی رسالہ "آنند بندو" نکالا جس کے ایڈیٹر، پبلشر سب کچھ آپ ہی تھے۔ 'آنند بندو' کے دوسرے شمارے میں شری شیو پرشاد کے لکھے ہوئے ایک مضمون 'کنیا کی بھینٹ' سے ترغیب پا کر ایک نظم لکھی، یہی نظم اگیہ جی کی سب سے پہلی نظم سمجھی جانی چاہیئے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس نظم پر اُنھیں اپنے والد سے پانچ روپے انعام ملے تھے۔

اسی زمانے میں انھوں نے ہندی نظم کے مختلف طریقوں پر بہت سے تجربے کئے۔ انگریزی میں شروع سے ہی دلچسپی کے باعث انھوں نے

نہ صرف انگریزی پڑھی بلکہ اس زبان میں لکھا بھی بہت کچھ۔ ان کی اس ابتدائی دور کی مختلف نظمیں انھیں دنوں مختلف رسالوں میں چھپیں۔

آگیہ جی کی سب سے پہلی کہانی الہ آباد کے بچوں کے ایک رسالے میں چھپی اور نظم لاہور کے کالج میگزین میں۔ ادبی صلاحیتوں کی ترقی کے ساتھ ہی وہ ملک کی سیاسی حالت سے بھی بے خبر نہ تھے۔ اس کا آپ پر اثر بھی پڑا اور آپ بھی آزادی کی جدوجہد میں کود پڑے۔ ۱۹۳۰ء میں آپ محمد بخش کے نام سے گرفتار ہوئے۔ ایک ماہ لاہور کے قلعے میں اور ۳ سال دہلی اور پنجاب کے جیلوں میں گزارے۔ پھر دو سال تک نظر بند رہے۔

آگیہ جی کا ادبی مذاق بھی صحیح معنوں میں جیل کی دیواروں میں ہی چمکا۔ وہاں شروع شروع میں آپ نے کہانیاں لکھیں جو ان کے کہانیوں کے مجموعے 'وپتھگا' میں چھپی ہیں۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک ناول بھی لکھا جو خفیہ پولس کی مہربانی سے لاپتہ ہو گیا۔ انھیں دنوں اگیہ جی کی کچھ کہانیاں جیل سے غیر قانونی طریق سے باہر آئیں۔ اصلی نام دینا مناسب نہ تھا۔ لہٰذا جینیندر کمار جی نے کچھ سوچ کر 'آگیہ' یعنی گمنام نام دے دیا۔ تبھی سے یہ نام چل رہا ہے۔ حالانکہ آگیہ جی کو یہ نام بہت پسند نہیں ہے۔

جیل سے رہائی کے بعد اپنے تجربات لکھنے کا کام بہت زور شور سے شروع ہو گیا۔ ناول، افسانے، نظمیں، مضمون، سبھی کچھ انھوں نے لکھا، اور جب تخلیقی ادب سے ذرا تھکے تو ترجمے کا کام شروع کر دیا۔ اس دور میں لکھی گئی نظموں میں آپ ورشٹی ہتھ والی نظم کو اپنی سب سے پہلی نظم مانتے ہیں۔

ورشٹی ہتھ سے تم جاتے ہو جب!
تب للاٹ[1] کی کُنچت الکوں[2]
تیرے دھڑکیلے آنچل کو
تیرے پاون[3] چرن کمل کو
چھو کر دھنیہ بھاگ اپنے کو لوگ مناتے ہیں سب کے سب!
میں تو کیول تیرے پتھ سے

میں تو کیول تیرے پتھ سے
اڑتی رج[4] کی ڈھیری بھر کے
چوم چوم کر سنچیہ[5] کر کے
رکھ بھر لیتا ہوں مرکت[6] سا اپنے[7] انتر کے کوشوں[8] میں تب؛
پاگل جھنجھاکے[9] پرہار[10] سا
سانڈھیہ رشمیوں[11] کے ویار[12] سا
سب کچھ ہی یہ چلا جائے گا
اسی دھول میں انتیم آشریہ[12] بھر کر بھی میں پاؤں گا اب!
ورشٹی پتھ سے تم جاتے ہو جب!

اگیہ جی جہاں شاعر ہیں وہاں افسانہ نگار اور ناول نویس بھی ہیں اور ان کی شاعرانہ صلاحیتیں اور رجحانات ان کی نثر میں بھی جھلکتے ہیں۔ مگر اگیہ جی دوسرے شعراء کی طرح اپنے ادب میں بہکتے نہیں ہیں۔ اُن کے بیان میں خوبصورتی اور حسن کے ساتھ ساتھ فنی اصولوں کی پابندی بھی ہے وہ اپنے ادب کی تخلیق بہت ہی پابند اور منظم لائنوں پر کرتے ہیں، وہ کہانی یا ناول کو لکھنے سے پہلے کردار کی زبان، اس کے ماحول اور ساری کہانی کے پلاٹ کے بارے میں بہت احتیاط سے سوچ لیتے ہیں، فیصلہ کر لیتے ہیں اور مختلف چیزوں کے مختصر سے خاکے بھی بنا لیتے ہیں، اور پھر ان ہی نوٹس (خاکوں) کی بنیاد پر وہ اپنے ناول کی عمارت کو کھڑا کرتے ہیں۔ اس طریق سے بہک جانے کا خدشہ نہیں رہتا۔ ان کی ہر تخلیق سے ان کی حقیقت نگاری اور ان کی قوت مشاہدہ اور ماحول کے گہرے مطالعے کا پتہ چلتا ہے۔ اسی وجہ سے آگیہ جی ہندی ادب میں ایک ٹیکنیشیَن Technician کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی زبان کی پختگی اور خیالات کی بلندی ہندی ادب میں بے مثال ہے۔ ان کا مشہور ناول 'شیکھر' اپنی زبان، خیالات اور پلاٹ کی وجہ سے ہندی ادب کی ایک مشہور تصنیف ہے۔

اسی ناول کے بارے میں آگیہ جی ایک جگہ لکھتے ہیں: "ایک ماہ بعد

---

[1] ماتھا [2] زلف بیاں [3] پاک

[4] ڈھول [5] جمع [6] موتی [7] اپنے [8] دل [9] خزانہ [9] آندھی [10] حملہ [11] شام کی کرنوں [12] آخری سہارا۔

جب میں لاہور قلعے سے امرتسر جیل لایا گیا تو یہاں لکھنے کا سامان پاکر میں نے چار پانچ دن میں زندگی کے معنوں اور زندگی کے مسائل کے متعلق اپنے سوچے ہوئے خیالات لکھ ڈالے۔ پنسل سے لکھے ہوئے یہی تین سو صفحے، 'شیکھر ایک جیونی' کی بنیاد تھے۔ اس کے بعد نو سال سے کچھ زیادہ میں نے اس بنیاد پر عمارت کھڑی کرنے میں لگائے۔ شیکھر میری دس سال کی محنت کا نتیجہ ہے۔ دس سال میں کچھ دن باقی ہیں، اور 'جیونی' بھی تو ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ زندگی کی تلخ ترین راتوں میں سے صرف ایک میں دیکھے ہوئے Vision اور زندگی کے سمجھے ہوئے معنوں کو قلمبند کرنے کی اس میں ایک کوشش ہے۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ آگیہ جی کا یہ ناول ہندی ادب کے بہترین ناولوں میں سے ہے۔ مشہور نقاد ڈاکٹر نگیندر کے الفاظ میں "شیکھر ہندی کی اُن مایہ ناز تصانیف میں سے ہے۔ جو ہر صاحبِ تنقید کو چیلنج کرتا ہے کہ آؤ میرے سہارے اپنی قابلیت میں اضافہ کر لو" اس ناول کا سارا کمال اِس کی زبان اور طرزِ بیان میں ہے۔ زبان کی تعریف کے سلسلے میں ترقی پسند نقاد جناب امرت رائے صاحب کی رائے قابلِ ذکر ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"اگیہ جی نے زبان کو تو ایک بُت تراش کی طرح تراشا ہے، پھر دائیں بائیں، آگے پیچھے ہو کر اِدھر اُدھر سے دیکھا ہے، اور پھر چھینی اور ہتھوڑا لیا ہے، اور پھر تراشا ہے۔"

آگیہ جی کو زبان اور طرزِ نگارش دونوں پر ہی پورا عبور حاصل ہے۔ اور یہی بات اُن کے ناول 'ندی کے دویپ' سے صاف ظاہر ہوتی ہے، جو اُنھوں نے 'شیکھر' کے بعد لکھا ہے۔ اس ناول نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ نہ صرف ایک فنکار ہیں بلکہ ایک سادھک بھی۔ اِس ناول کے متعلق بھی سبھی تنقید کرنے والے ایک رائے ہو کر مانتے ہیں، کہ اُن کے قلم میں ذور ہے اور وہ جو چاہتے ہیں خوبصورتی سے لکھتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ کہ انھیں اپنے قلم او خیالات پر ایک سائنسدان کی طرح قدرت حاصل ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ تناسب میں ایک خوبصورتی ہے۔ کسی چیز کے لئے پہلے سے ہی سوچ سمجھ لینا، ایک مناسب خاکے کے تحت کام کرنا ہی خوبصورتی کو قایم رکھنا ہے۔ اس ناول کے شروع میں ہی آگیہ جی نے اِس کا مجموعی مقصد اپنے فقرے "دُکھ سب کو مانجھتا ہے" میں کہہ دیا۔ اسی سلسلے میں وہ فرماتے ہیں

"ادب میں دُکھ اور سُکھ متضاد نہیں ہیں۔ بغیر کسی گہری چوٹ کے ادب کی تخلیق نہیں ہوتی۔ عیش و عشرت انسان کو غور و فکر اور تعمیر کی طرف نہیں لے جاتے۔ دُکھ، تکالیف اور رنج ہی جذبات پیدا کرتے ہیں اور اُنھیں بڑھاتے ہیں۔ آدمی کی شخصیت کو تو سبھی قسم کے تجربات گہرا کرتے ہیں۔ مگر رنج اور غم آدمی کو دوسرے آدمیوں کے نزدیک لاتے ہیں، اور ادب کے تخلیقی جذبات کو فروغ دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ دُکھ آدمی کو توڑ بھی دیتا ہے۔ لیکن جو ٹوٹ جاتا ہے فنکار نہیں ہوتا۔"

واتسایئن جی کے اونچے ادب کا راز شاید اِس بات میں ہے کہ وہ مختلف سماجی و تہذیبی سوالات پر صفائی سے سوچتے ہیں، ادب اور تمدّن کے بارے میں اُن کی رائے ہے کہ "تمدّن نہ تو نئی زندگی ہے نہ تعمیر۔ تمدّن، نئے تجربات کی بنا پر، بنے ہوئے زندگی کے معیاروں اور طریق کو، سُدھارتا ہے۔ زندہ تمدّن ترقی پسند ہوتا ہے۔ پُرانی سماجی قدروں اور معیاروں کے حامی یہ سوچ کر چلتے ہیں کہ ہم اور ہمارا تمدّن ایک جگہ قایم ہیں یا نیچے کی طرف گر رہے ہیں۔ جس تہذیب میں وہ تبدیلی کرنا چاہتے ہیں وہ پچھلی تمام منازل سے گزر کر اپنے آج کے ڈھانچے میں آئی ہے، یہ بات وہ بھول جاتے ہیں۔ ادب تہذیب کا بہت ضروری جزو ہے۔ اسی لیئے ادب اور تہذیب کے اجزا مختلف نہیں ہو سکتے۔ ہماری آج کی دقت یہ ہے کہ ہمارے کچھ ادیب کچھ ایسے معیار استعمال کر رہے ہیں جن کا عکس ہمارے تمدّن میں نہیں ملتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے معیار حقیقی نہیں ہیں اور ایک دوہری ادبی شخصیت کا نتیجہ ہیں۔"

اور پھر اس خیال پر کہ ہندی کے بہت سے موجودہ ادیب ہندوستان کی تہذیب سے دور دور ہیں۔ ان کی صاف رائے یہ ہے کہ "بڑی بڑی سماجی تبدیلیوں کے دور میں پُرانے اخلاقی معیاروں کا اعتبار اُٹھ جاتا ہے، اور ہم پھر سے ان کی جانچ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اِس لیئے اس دور کے فنکار اپنی تہذیب سے ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اِس سے وہ ضروری طور پر دور نہیں چلے جاتے۔ پھر سے وہ ایک نیا توازن ظہور میں لاتے ہیں، اور اس طرح ایک نئی تہذیب کو پیدا

کرتے ہیں، کچھ لوگ بالکل ہی دوسری تہذیبوں سے تعلق پیدا کر لیتے ہیں۔ یعنی اپنی تہذیب کی ندی میں خود ہی ایک جزیرہ بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا ادب بھی سماج کے کچھ کام آسکے گا یا نہیں، یہ تو مستقبل ہی بتائے گا۔ فی الحال تو اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ تہذیبوں کا آپسی لین دین تو چلتا ہی آیا ہے۔ اور دوسری تہذیبوں کے اچھے جزو آہستہ آہستہ تہذیب میں آ ہی جاتے ہیں۔"

کچھ نقادوں کا ان کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ اپنے ادب میں اخلاقیات کا خیال نہیں رکھتے۔ اِس کے بارے میں واتسائن جی خود فرماتے ہیں۔

"میں اخلاقی قدروں کا اپنے ادب میں پورا خیال رکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ میرے ادب میں اگر اخلاقی قدریں نہیں ہیں تو کچھ نہیں ہے۔"

بعض نقادوں کی رائے ہے کہ آگیہ جی موجودہ یورپی ادب کے طرز کو ہندی کے قریب لائے ہیں۔ اِس رائے کے خلاف پربھاکر ماچوے اپنی کتاب "سنکیشا" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "ایسا خیال غلط ہے۔ واتسائن جی جن ترقی پسند قدروں کی ترجمانی کر رہے وہ وقت کا تقاضا ہیں۔ خود آگیہ جی نے بھی اِس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ "مجھے اُس سے جسے آج یورپی طرزِ فکر کہا جاتا ہے کوئی لگاؤ نہیں، اور نہ میں اُسے ہندی کے نزدیک لایا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ حالات کی وجہ سے مجھے دوسرے ہندی مصنفوں کی بہ نسبت انگریزی ادب دیکھنے کا بہتر موقع ملا ہے۔"

صنفِ نازک کی طرف ان کا نظریہ وہی ہے جو قدرت کی عظیم ترین نعمت کی طرف ہونا چاہیئے۔ عزت کا، تحقیق کا اور دلچسپی کا۔ جہاں تک سماجی زندگی کا تعلق ہے وہ انسانیت کو دو حصوں میں منقسم نہیں دیکھتے، اور اسی لئے عورت اور مرد کے لئے الگ الگ نقطۂ نظر رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اُن کے خیال میں دونوں برابر ہیں، ایک دوسرے کے مددگار ہیں، اور زندگی کے مقصد کی منزل کے راہی ہیں۔

ترقی پسند ادب کی نئی تحریکوں کے تحت اگیہ جی نے روایتی قدروں کو توڑ کر ہئیت اور مواد دونوں میں نئے تجربے کئے ہیں۔ نئے نئے محاورے، تشبیہات، استعارے اور اصطلاحات استعمال کئے ہیں، اِسی لئے بعض نقاد انھیں پریوگ وادی (نئے تجربات کرنے والا) کہتے ہیں۔ اور ان تمام ادیبوں کو جو اُن کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں پریوگ واد سے متعلق بتاتے ہیں۔ اس پریوگ واد کے بارے میں جو ادبی حلقوں میں گرم بحث کا موضوع رہا ہے ان کی رائے ہے: "حقیقت میں "پریوگ" لفظ ہی بے معنی ہے۔ کوئی بھی فن کار اگر فن سے سماج کے پُرانے ڈھانچے کو بدلتا ہے تو وہ پریوگ (تجربہ) کرتا ہے۔ جس طرح نیا پن اپنے میں پورا نہیں ہوتا اُسی طرح کوئی نیا ادبی استعمال بھی اپنے آپ میں پورا نہیں ہوتا۔

ایک اور جگہ پریوگ واد کے متعلق ہی آپ فرماتے ہیں: "میں نئے نئے تجربات (پریوگ) کرنا فن کار کا پیدائشی حق سمجھتا ہوں۔ سب نئے تجربات کامیاب نہیں ہوتے اِس میں تجربات کا کوئی قصور نہیں ہے، اور اِس کی بنا پر نئے اِستعمال یا تجربات کو بُرا کہنا غلطی ہوگی۔ پریوگ کے سلسلے میں میرا دعویٰ اتنا ہی ہے کہ ہر فن اپنی بہتری اور ترقی کے لئے نئی سمتیں چاہتا ہے، اور ان کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔ ہندی اور اردو کے کتنے ہی شعراء نے ادب میں نئے نئے راستے اختیار کئے ہیں، اور شاعری کو نت نئی ہیئت عطا کی ہے۔ اپنی بات کہنے کے لئے نئے نئے طریق کی تحقیق یا تخلیق بہت ضروری ہے، اگر کوئی فن کار یہ کہے کہ میں نے زندگی بھر اپنے فن میں کوئی راستہ اختیار نہیں کیا تو میں اس کا یہی مطلب سمجھوں گا کہ اُس نے زندگی کو بہتر بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔"

پریوگ کے ذریعے حق کی تلاش کے سلسلے میں ہی ہندی شاعری کو ان کے قلم سے بہت سی خوبصورت نظمیں حاصل ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک نظم ملاحظہ فرمایئے۔

شرد چاندنی برسی
انجری[1] بھر کر پی لو
اونگھ رہے ہیں تارے
سہری[2] سرسی
اوپریہ[3] کومد[4] تاکتے
انجھپ[5]
چھن میں
تم بھی جی لو

[1] ہتھیلو
[2] تلیّا کا پانی
[3] او پیارے [4] کنول
[5] بغیر آنکھ جھپکے

سینچ رہی ہے اوس
ہمارے گانے
گھنے کوہا[1]سے میں
چھپتے
چہرے پہچانے
کھمبوں پر بتیاں
کھڑی ہیں سیٹھی
ٹھٹھک گئے ہیں مانو
پچھلے دن
ان جانے
اٹھی للک
ہیا امنگا[2]
ان کہنی
السانی[3]
جاگی لالسا[4]
میٹھی
کھڑے رہو ڈھگ[5]
گہو ہاتھ
پاہن من مانے
او پریہ رہو ساتھ
بھر بھر کر انجوری
پی لو
برسی
شرد چاندنی
میرا ؟
انتھیہ سپندن[6]
تم بھی چھن چھن جی لو

[1] دھند۔
[2] دل اُمنڈا
[3] آپس میں ڈوبی ہوئی
[4] خواہش
[5] نزدیک
[6] دل کی دھڑکن

اگیہ جی کا کافی ادب ہندی میں اور کچھ کم انگریزی میں چھپ چکا ہے۔ اور بہت سی اُن کی تخلیقات ابھی چھپنے کے لئے اُن کے پاس پڑی ہیں۔ جو وقت ملتے ہی نزدیک مستقبل میں چھپ جائیں گی۔ اب تک ان کے ناول شیکھر، اور ندی کے دویپ، کہانی کے مجموعے، وپتھگا، پرمپرا، کوٹھری کی بات، اور جے دول، اور نظموں کے مجموعے، بھگن دوت، چنتا، رات ہم، ہری گھاس پر چھن بھر، اور پریزن ڈیز اور دوسری نظمیں (انگریزی) میں چھپ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے ایک تنقیدی کتاب "ترشنکو" بھی لکھی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے کافی عرصے تک کئی اخباروں اور ادبی رسالوں کی ادارت کا کام بھی کیا ہے۔

واتسائن جی پیدائشی فن کار ہیں اور انھوں نے ریاض بھی کافی کیا ہے۔ ادب کے سبھی میدانوں میں اُنھوں نے قلم اُٹھایا ہے، انھوں نے ناٹک کو چھوڑ کر ادب کے سبھی اصناف میں لکھا ہے۔ ان کی تخلیقات میں حُسن اور خوبصورتی تو ہوتی ہی ہے۔ لیکن سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اگیہ جی ادب میں زندگی کی جان دار قدروں کی اور ماحول کی حقیقی عکاسی کرنے کی شعوری اور کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ہندی ادب پر اگیہ کے بڑے احسانات ہیں۔

شعر و سخن

موضوعاتِ سخن

محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء

اس آسماں کی نہ اُس کہکشاں کی بات کریں
گڑے ہے اپنی جہاں ہم وہاں کی بات کریں

ہمارے خونِ جگر سے ہے جس کا جوشِ نمو
اُسی چمن کے بہار و خزاں کی بات کریں

شعورِ فکر و نظر جب ہمیں میسر ہے
یقیں کو چھوڑ کے پھر کیوں گماں کی بات کریں

ابھی تلک تو ہوا ذکرِ جام و بادۂ ناب
اب آدمی سے دلِ خونچکاں کی بات کریں

غمِ حیات کے ماروں پہ رحم کھا کھا کر
حیات کے ستمِ بے اماں کی بات کریں

ذرا ہمارے یہ شام و سحر سنور جائیں
تو ہم بھی زلف و رخِ مہوشاں کی بات کریں

سُنیں تو صرف محبت کے قصۂ ہائے دراز
کریں تو صرف غمِ جاوداں کی بات کریں

وفورِ جوشِ جنوں کی یہی ہے بات کہ ہم
فرازِ دار سے عزمِ جواں کی بات کریں

حیاتِ نو کا تقاضا بھی ہے یہی منشاء
ہم آفتوں میں بھی تاب و تواں کی بات کریں

غزل

سلام جرأت انجگانوی

دلوں میں سوز بے تاثیر کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
حقیقت کی غلط تفسیر کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

مسلّم حسن کی توقیر لیکن واقعہ یہ ہے
جنونِ عشق دامنگیر کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

اگر محدود تھی اُن کی تجلّی چشمِ موسیٰ تک
تو پھر جلووں کی یہ تشہیر کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

محبت کا خدا ہونا یقیناً ہے بجا لیکن
محبت دل کی تفسیر کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

بظاہر تو نہیں ہے کوئی بھی باطل کا شیدائی
گلے پر حق کے پھر شمشیر کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

ہر اک تدبیر ہے آئینہ دارِ رنگِ ناکامی
مسلسل گردشِ تقدیر کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

شکایت صفحۂ قرطاس پر ہم لا نہیں سکتے
ابھی پابندیٔ تحریر کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

زمیں پر بھی سکونِ دل جنھیں ملتا نہیں جرأت
مخالف اُن کا چرخِ پیر کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

غزل

سلام سندیلوی

ظلمت سے ہم کنار ہے شامِ چمن ابھی
پھوٹی نہیں ہے چاند کی پہلی کرن ابھی

بیٹھے ہوئے ہیں شیشہ و ساغر تو کیا ہوا
خم میں بھری ہوئی ہے شرابِ کہن ابھی

افشائے راز کی ہے سزا آج کل بھی موت
جاری وہی ہے قصۂ دار و رسن ابھی

ہر مسئلہ ہے زیست کا اک کوہِ بے ستوں
پیدا ہزار ہوں گے یہاں کوہکن ابھی

غنچوں نے پھر نزاعِ گلستاں اُٹھا دیا
میلا نہیں ہوا تھا گلوں کا کفن ابھی

فصلِ بہار میں بھی وہی قحط سے رہا
تشنہ اسی طرح سے ہیں کام و دہن ابھی

ہموار ہوں حیات کی راہیں اگر سلام
خود راہ بر کا کام کریں راہ زن ابھی

غزل

جیمنی سرشار

بیکار شورِ نالہ و آہ و فغاں سے کیا
چونکا بھی کوئی موت کے خوابِ گراں سے کیا

رہنے دو امتیازِ بہار و خزاں کی بات
اب ہم کو امتیازِ بہار و خزاں سے کیا

اس ڈر سے ہم نہ آپ کی محفل میں آسکے
کیا پوچھیں آپ، نکلے ہماری زباں سے کیا

سارے جہاں میں فکر کسی کو نہیں تری
تو اپنی فکر کر، تجھے سارے جہاں سے کیا

اب بھی تو بے شمار نشیمن ہیں باغ میں
تھا بجلیوں کو بیر مرے آشیاں سے کیا

بے ساختہ چمن کا چمن مسکرا اُٹھا
جانے کہا بہار نے آ کر خزاں سے کیا

کچھ فرق و امتیازِ گل و خار ہی نہیں
انصاف اُٹھ گیا ہے یہاں تک جہاں سے کیا

اس کو وحی سمجھ کے جہاں نے کیا قبول
جانے نکل گیا تھا ہماری زباں سے کیا

ہر سمت جا رہا ہے بہاریں بکھیرتا
پروردۂ بہارِ چمن کو خزاں سے کیا

سرشار اپنا دردِ نہاں تجھ سے کیا کہوں!
نا آشنا ہے تو مرے دردِ نہاں سے کیا

گوپی چند نارنگ

اُردو غزل اور ہندوستانیت

غزل ایرانی تمدن کا وہ ورثہ ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں ہندوستان کو منتقل ہوا۔ اردو چونکہ ایک مخلوط زبان ہے۔ اس میں ان دونوں تہذیبوں کا رنگ جھلکتا ہے جن کے سابقے سے یہ پیدا ہوئی۔ مجموعی طور پر اردو ادب اس مشترک ہند ایرانی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے، جس کی داغ بیل مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد پڑی۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ اردو ادب کے پاس اپنا کوئی سرمایہ نہیں یا اردو شاعری فارسی شاعری کا نقشِ ثانی ہے۔ ایسا کہنا حقیقت کو جھٹلانا ہے، اردو شاعری کا اپنا ایک مخصوص عالم ہے۔ اس کی اپنی شخصی جہت ہے اور اس کے مرقعوں میں ہندوستانی نقش و رنگ کی آمیزش ہے۔

سالہا سال سے ہندوستان مختلف تہذیبوں کا سنگم رہا ہے — اس کے بام و در اجنبی حملہ آوروں کے لئے ہمیشہ آغوش کشادہ رہتے ہیں اجنبیوں کے اس سیلاب کو موٹے طور پر انسانیت کی چار مخصوص[1] نسلوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ جو پھر اپنی جگہ پر سلسلہ در سلسلہ اور شاخ در شاخ گروہوں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی نسل نشادیا ناگ بھیل اور کول لوگوں کی ہے۔ ان کے بعد آنے والے کیرت کہے جاتے ہیں — تیسری نسل کے لوگ دراویدی (داسا، داسیو یا شودر) تھے۔ ان سب سے آخر ہندوستان میں داخل ہونے والے آریہ تھے۔ ان کے اپنے طور طریقے تھے۔ اپنے رسم و رواج، اپنی روایات اور اپنے ضابطہ ہائے اخلاق و عمل تھے جنھوں نے بالترتیب ہندوستان کے تہذیبی مرقعے میں اپنے اپنے نقش و نگار چھوڑے ہیں۔ جذب و تاثیر کے اس پیہم عمل نے ہندوستانی تہذیب کو ایک مخلوط تہذیب بنا دیا ہے۔ مذہبی افراط و تفریط کے باوجود تمام ہندوستانی عوام میں ایک بنیادی وحدت پائی جاتی ہے۔ یہاں ماحول کے اثرات اور زندگی کی ضروریات دونوں کا یہ تقاضا رہا ہے کہ تہذیبی سطح پر نسلی اور مذہبی قسم کے امتیازات کو مٹا دیا جائے۔ اس سلسلے میں پوراک تہذیب اور اسلامی تہذیب کا سابقہ نہایت اہم ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں جتنی بھی حملہ آور قومیں آئیں یا تو وہ ابتدائی تہذیب کی حامل تھیں یا نیم تہذیبی حالت میں تھیں۔ اس لئے ہندوستانی تہذیب میں ضم ہو کر رہ گئیں۔ ان کے مقابلے میں اسلام ایک حد تک مکمل اور ترقی یافتہ قوت تھی۔ دونوں تہذیبوں کے خمیر سے ایک نیا ہیولہ تیار ہوا، اور ایک مشترک کلچر کی داغ بیل پڑی۔ اس اختلاط کے اثرات ہمہ گیر تھے۔ ہندوستان کے مذہب، نظام فکر، فن تعمیر و سنگ تراشی، مصوری اور موسیقی میں ہند ایرانی جذبے نے شعوری یا غیر شعوری طور پر جس طرح بتدریج توانائی حاصل کی ہے، اس کی نشان دہی ہمارے قابل محققین کر چکے ہیں[1]۔ لیکن اس سابقہ کا سب سے بھرپور اثر ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں اور ان کے ادب پر پڑا۔ اس سلسلے میں بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں اردو غزل پر کچھ کہنے کی ضرورت اس لئے زیادہ ہے کہ یہ اردو ادب کی باقی تمام اصناف میں ایرانی شاعری سے نسبتاً قریب ہے۔ بلکہ ایرانی الاصل ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کے تہذیبی تقاضوں کو پورا کرنے کا پورا پورا حوصلہ رکھتی ہے اور "ہندوستانیت" سے تہی داماں نہیں۔

یہاں ایک بات غور طلب ہے کہ ہند ایرانی تہذیب ہندوستانی تہذیب سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کی ایک شاخ ہے، اور بنیادی طور پر اس افتادِ ذہنی اور مزاجِ ملکی کی مظہر ہے جسے "ہندوستانیت" کہتے ہیں۔ یہ طے ہے کہ کثرت آبادی عالم وحدت Unity in Diversity کا جلوہ دیکھنا ہندوستانی ذہن کا منتہا ہے۔ تنگ نظری اور تعصب کے لئے ہندوستانی تہذیب کے یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ اس کا لوچ، اس کی وسیع دامنی اور رواداری ضرب المثل ہے۔

---

[1] Influence of Islam on Indian Culture— Dr. Tara Chand

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو Indo Asian Culture Vol. II, No. 4, P. 340

بوقلمونی میں یک رنگی سے نباہ دینے کا بے پناہ حوصلہ رکھتی ہے۔ اسی ہندوستانی تہذیب کی وسعت اور آفاقیت عبارت ہے، جسے دوسرے لفظوں میں ہندوستانی سبھاؤ یا Indianness کہا جاتا ہے، اور سینیتی کمار چڑجی کے الفاظ میں[1]

"یہ ادراک ہے جو کل انسانی زندگی کو اس قادر مطلق کا، جو سمیع بھی ہے اور بصیر بھی، ظہور قرار دیتا ہے۔ یہ آرزو ہے، جذب و امتزاج کی جو زندگی کے بظاہر الگ الگ بٹے ہوئے اور بے ترتیب ٹکڑوں کو بنیادی طور پر متحد دیکھنا چاہتی ہے۔ ہندوستانی مزاج عامہ کی یہ خاصیت عبارت ہے عقل و فکر کی اس پختگی سے جو فکر و فلسفہ کے ساتھ ساتھ جذبہ، وجدان اور صوفیانہ عرفان کی بلندیوں تک اٹھ سکنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ یہ اقرار ہے اُن تمام آلام و آفات کا جن سے زیست انسانی کو دوچار ہونا پڑتا ہے اور یہ سعی ہے اُن تمام آلام و آفات کے اسباب کو سمجھ کر ان کی جڑوں کو اکھیڑ پھینکنے کی اور بایں ہمہ یہ وہ عظیم قوت برداشت ہے جو دوسرے تمام مذاہب و اعتقادات کا احترام سکھلاتی ہے اور باہمی رواداری، عالمگیر اتحاد پسندی اور وسیع مشربی کا درس دیتی ہے۔"

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے ہر ملک کا ادب اس کی تہذیب و تمدن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی بنیادی خصوصیات پر ایک نظر ڈال لینے کے بعد اب یہ ثابت کرنا زیادہ مشکل نہ ہوگا کہ اردو غزل بھی اوپر بیان کیے گئے کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔

ہندوستان کے جس ماحول میں اردو غزل نے آنکھ کھولی تھی، اس کی فضا تصوّف اور بھگتی کے رس سے چھلک رہی تھی۔ تصوّف اس زمانے کی فکری اور اخلاقی زندگی کا معیار بن چکا تھا اور ہندو مسلمان دونوں قوموں میں وسعت سے رائج تھا۔ حال ہی ڈاکٹر تارا چند، سید سلیمان ندوی اور پروفیسر شوستری نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایرانی تصوّف کے کئی پہلو ایسے بھی تھے جو ویدانت سے متاثر ہوئے۔ گو اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اتنا طے ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک گونہ مناسبت پائی جاتی ہے۔ اور اسلامی فلسفہ اور ما بعد الطبیعیات اشراقیت، مجوسیت اور مسیحیت کے علاوہ ویدانت سے بھی گہرا اثر قبول کرتے رہے ہیں۔

ویدوں کی تعلیم کے مطابق حیات انسانی کا سب سے بڑا مقصد موکش (نجات) ہے، اور اسے حاصل کرنے کے تین راستے ہیں۔ کرم (عمل)، گیان (معرفت) اور بھگتی (عشق)۔ بنیادی طور پر یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ حقیقت کی جستجو قلبی واردات پر منحصر ہے نہ کہ عقل یا غور و فکر پر۔ نجات کے زینے کی پہلی سیڑھی شرون (حقائق کا سننا اور سمجھنا) ہے۔ دوسری اراد ھنا (معرفت)، اس کے بعد منن (مراقبہ) کا مقام ہے اور آخری منزل آنند (عرفانِ حق) ہے۔

شنکر آچاریہ کی تفسیر کے مطابق ویدانت مذہب کے باطنی پہلو کا نام ہے۔ جس میں انسان کی ظاہری تکمیل کی نسبت اس کی روحانی تکمیل پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مختلف مدارج میں سب سے زیادہ اہمیت اس مقام کو حاصل ہے جہاں محدود (بدھ) تعینات کی قید سے آزاد ہو کر مطلق (ایکم) میں محو ہو جاتا ہے۔ یہ مقام بقا ہے جو فنا سے گزرنے کے بعد آتا ہے۔ جہاں مذہب، انفراد اور عقل، سب بے معنی ہو جاتے ہیں صرف خدا کی وحدت باقی رہ جاتی ہے۔ شنکر آچاریہ کے اس فلسفے کو لا ثنویت یا لا دویت کہا جاتا ہے۔ تصوّف میں یہی مسئلہ وحدۃ الوجود یا نظریۂ ہمہ اوست ہے۔

فان کریمر کا قول ہے کہ موجودہ تصوف کی تشکیل میں بیرونی اثرات کو کافی عمل دخل حاصل ہے۔ ان بیرونی اثرات پر پروفیسر براؤن نے بھی کچھ روشنی ڈالی[1] ہے۔ ایرانی تصوّف میں سب سے پہلے عقیدۂ فنا کا درس دینے والے بایزید بسطامی تھے۔ فنا کے متعلق بایزید کے مقالات سے پتہ چلتا ہے کہ صوفیہ کا طریقہ ویدانت سے کسی حد تک ضرور اثر پذیر ہوا تھا۔ دارا شکوہ کا خیال تھا کہ قرآن مجید میں جس "کتاب خفیہ" کا ذکر ملتا ہے وہ شاید اپنشد ہی[2] ہے، ایک اور مقام

---

[1] ملاحظہ ہو صدارتی خطبہ آل انڈیا اورینٹیل کانفرنس احمد آباد ص۱

[1] تاریخ ادبیات ایران۔ جلد ۱، ص ۱۸۴

[2] دارا شکوہ۔ ڈاکٹر تارا چند، اسلامک کلچر ۱۹۴۳ء۔ ص ۳۹۷

پر وہ اپنشدوں کو قرآن مجید کی تفسیر قرار دیتا ہے۔ عبد الکریم جیلی نے بھی چاروں ویدوں کے علاوہ ایک پانچویں کتاب ویدانت کا ذکر کیا ہے، اور اُسے اسلامی نظریات کے مطابق قرار دیا ہے[1]۔ داراشکوہ نے اپنی تصانیف رسالہ حق نما، مکالمہ بابالال اور مجمع البحرین میں بھی ویدانت اور اسلامی تصوّف کی اسی مطابقت کو نمایاں کیا ہے۔

جیساکہ اوپر بیان کیا گیا ہے، ہندوستانی تہذیب کی یہ ایک ممتاز خصوصیت ہے کہ جس بھی نئے نظریے یا تہذیب سے اس کا سابقہ ہوا ہے اس کو اس نے اپنے دامن میں پناہ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ہر جاندار اثر کو قبول کیا ہے اور اس کی ان قوتوں کو زندہ رکھا ہے جو اس کے مزاج کے ساتھ میل کھاتی تھیں۔ ہندوستانی تہذیبی مرقع میں تصوّف کا جگہ پا جانا یا اسلامی تصوف کے اثرات سے ہندوستان میں بھگتی تحریک کا جاری ہونا ہندوستانی تہذیب کی اسی خاصیت کا نتیجہ تھا۔ ہندوستانی تہذیب کی نرمی اور لوچ سے مراد یہی ہے کہ وہ اجنبی عقائد اور نظریات کو اپنی کٹھالی میں ڈھال کے "ہندوستانیت" کا رنگ دے دیتی ہے۔ بالکل یہی عمل ایرانی تصوّف کے ساتھ ہوا۔ سالہا سال کے اخذ و قبول کے بعد ایرانی تصوف ہندوستانی سانچے میں ڈھل گیا۔

اسلامی تہذیب کے سابقے نے ہندوستان کے مذہبی و فکری رجحانات کے لئے ایک آتش انگیز سیال کا کام کیا۔ رسوم کے غبار میں کھوئی ہوئی محبت و عقیدت کی قوتیں پورے طور پر سامنے آگئیں اور ہندوستانی تصوف اور بھگتی کے ایک نئے مسلک کی بنیاد پڑی — ان دونوں میں کچھ اختلافات ضرور ہیں لیکن وہ ضمنی ہیں۔ بنیادی طور پر یہ دونوں راستے "نرگن" سکول سے تعلق رکھتے ہیں، اور ذاتِ خدا کا ادراک سوکشم بشیش اور نراکار یعنی تعینات و تصوّرات سے ماوراہستی کی طرح کرتے ہیں۔ خدا کے جس تصوّر کو انھوں نے پیش کیا ہے وہ ایکاتم (توحید) ہے اور اس کی محبّت کی آنچ میں عابد کا وجود ایسے پگھل جاتا ہے جیسے "ژالہ پانی میں" اس عقیدت و محبت کی پشت پر ایک والہانہ جوش و خروش ملتا ہے۔ پرانی اور بےجان قدروں کو پلٹ دینے کا پرزور احتجاج ہے اور جذبے کی ایک ایسی تندی و تیزی ہے جو بعض اوقات مجنونانہ کیفیت تک پہنچ جاتی ہے۔ محبت کے اس شعلے کی لپٹ اتنی ہمہ گیر ہے کہ اس کی زد میں مذہب و رسم ورواج کی تمام آلائشیں پگھلی ہوئی موم کی طرح بہہ گئی ہیں اور انسانی روح اس بلند مقام کو چھو لیتی ہے جہاں کعبہ، کاشی اور کیلاش بےمعنی نظر آتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں بھگتی کی یہ تحریک ہندوؤں اور مسلمانوں میں اشتراک کی پہلی کوشش تھی۔ اسلام اور ہندوازم دونوں کے ظاہری لوازم کی پرجوش مخالفت کی گئی۔ مذہب کے خارجی پہلو کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا، اور دونوں مذاہب کی مشترک باطنی قدروں کو ایک دوسرے میں سمو کر ایک ایسی مصلحانہ روش اختیار کی گئی جس پر چل کر ہندو و مسلمان دونوں ایک خدا کی عبادت کر سکتے تھے شیخ شاہ اور اولیا ان کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ اگر انھیں کوئی قدر قابل قبول ہے تو وہ عاشقانہ ذوق و شوق ہے عشق کا یہ جذبہ ایک بےپناہ طوفان ہے، جو مذہب و مراتب کے امتیازات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کے لے گیا ہے۔ وہ ایک اچھوتے مستقبل کی اُمید کرتے ہیں جس میں ہندو، ترک، جین اور جوگی کی تمیز نہ ہوگی، گناہ نہ ہوگا، ثواب نہ ہوگا۔ خوبصورتی اور بدصورتی نہ ہوگی بھگتی سکول کے تمام شاعروں کا کلام خصوصاً رام داس، کبیر، نامدیو، تکارام اور نانک اور ان کے علاوہ بھلہ صاحب۔ دھنا، دادو دیال، یاری صاحب، کیشوداس اور بابا فرید کی شاعری اوپر بیان کئے گئے تصورات سے لبریز ملے گی۔

اُردو کی ابتدائی غزل کی ابتدا بھی تصوف و بھگتی کے انھیں رجحانات پر رکھی گئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اردو شاعری کی ابتدا خانقاہوں، حال اور قال کی مجلسوں یا صوفیوں کے تکیوں سے ہوئی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو غزل کا سب سے پہلا مصرف حال و قال کی انھیں مجلسوں میں ہوا ہوگا، اور انھیں مجلسوں میں سب سے پہلے کلچرل سطح پر ہندوستانی اور اسلامی نظریات کا سابقہ ہوا ہے۔ صوفیوں کی ان درگاہوں اور مجلسوں میں ہندو و مسلمان برابر کے شریک ہوتے تھے، اور ہندو بھگتوں یا مسلمان پیروں کی ایک سی عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا بیان[1] ہے کہ ہندوستان کے مسلمان

---

[1] ملاحظہ ہو Influence of Islam on Indian Culture — P. 77

[1] ملاحظہ ہو تاریخ مشائخ چشت۔ ص ۲۹۸

صوفیوں کے مدنظر ہمیشہ یہ اہم اصول رہا ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ شگفتہ تعلقات رکھے جائیں۔ مشائخ چشت کی وسعتِ نظر اور رواداری کا یہ حال تھا کہ ہندوؤں کی کوئی بات پسند آتی تو اس کی بے تکلف تعریف کرتے۔ بابا فرید گنج شکرؒ کی خانقاہ میں جوگی اکثر حاضر ہوتے تھے۔ دو مرتبہ شیخ نظام الدین اولیا کی ان سے گفتگو ہوئی۔[1] ایک بار عالم علوی اور سفلی پر بات چیت چھڑ گئی۔ جوگی نے جب اپنے خیالات کی وضاحت کی تو شیخ نظام الدین اولیا پر بڑا اثر ہوا اور فرمایا: "مرا سخن او خوش آمد۔"[2]

مسلمان صوفیوں کی یہ مجلسیں شمالی ہندوستان کے شیوں اور وشنوں کے کیرتن اور راگ رنگ سے کافی متاثر ہوئیں۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی غزل قول و ترانہ اپنے ہمراہ ایران سے لائی تھی۔ لیکن جب ان مجلسوں میں اس پر ہندوستانی موسیقی کا پیوند لگا تو اس کی جذبات انگیزی اور وجد آفرینی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس میں شک نہیں کہ آل غزالی، ہجویری اور جلال الدین رومی نے عرفان حاصل کرنے کے لئے موسیقی سے مدد لینے کو جائز ٹھہرایا ہے اور ایران میں "پائے بازی" کا رواج بھی تھا۔[3] لیکن تصوف میں موسیقی کو جو اہمیت ہندوستان میں حاصل ہوئی وہ ایران میں نہیں تھی۔ سماع کے مسئلے پر علما اور مشائخ میں بڑا اختلاف رہا ہے۔[4] لیکن اس کے متعلق اتنا طے ہے کہ اس کی تدوین ہندوستان میں آکر ہوئی۔ ہندوستان میں سماع کو باقاعدہ رواج دینے کا سہرا امیر خسرو کے سر باندھا جاتا ہے اور اس نسبت سے انھیں "مفتاح السماع" بھی کہتے ہیں۔

اسلام میں زندگی کے دو پہلو ہیں۔ خارج و باطن، عالم دو ہیں ظاہر و باطن۔ مذہب کے دو پہلو ہیں، ظاہر و باطن۔ قرآن مجید اور حدیث میں ظاہر و باطن کا یہ فرق موجود ہے۔ اور اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے شریعت اور طریقت کے الفاظ استعمال کئے گئے۔ صوفی اور اہلِ حق جو مذہب کے باطنی پہلو کے قائل تھے، اہلِ طریقت کہلائے اور باقی اہلِ شریعت۔ لیکن ایران میں صوفیوں کے لئے بھی شریعت، عبادات اور رسوم کی پابندی لازمی تھی۔ (بیان ابوالقاسم ..... از کتاب تصوف اور اسلام ...... از عبدالماجد)[1]

ہندوستان میں تصوف کی روایت کا بغور مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں پہنچنے کے بعد اسلامی تصوف ہندوستانی رنگ میں رنگ کر نسبتاً زیادہ وسیع اور لوچدار بن گیا تھا اور بہت جلد وہ شریعت کی تمام پابندیوں سے بالکل آزاد ہو گیا۔ ذکر میر کے بغور مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض ہندوستانی صوفی بالکل جوگیوں جیسی زندگی بسر کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اسلامی عقائد سے میل نہیں کھاتا۔ ان مختصر سے بیانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں آنے کے بعد تصوف کی روایت ہندوستانی فضا و ماحول سے اثر پذیر ہو کر ہندوستان کے رنگ میں رنگ چکی تھی۔ ہندوستان میں آنے کے بعد تصوف کو ایک نئی وسعت، ایک نئی کشش جہت عطا ہوئی ہے۔ ہندوستانی تصوف کی فضا اس قدر بسیط ہے کہ کفر و ایمان دونوں کو محیط نظر کرتی ہے — ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں جہاں متضاد آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ جہاں متضاد خیالات کے لوگ بستے ہیں، اور جہاں ہر شے میں تضاد اور اس تضاد کے باوجود یک رنگی پائی جاتی ہے، ایک ایسا ہی نظریہ پنپ سکتا تھا۔

اسلامی تصوف میں عشقِ حقیقی کی بنیاد عشقِ مجازی پر رکھی گئی ہے۔ تصوف کے اس نظریئے سے ہندوستانی ذہن کو ایک فطری مناسبت ہے۔ ہندوستان کی روحانی سرزمین میں خالص قسم کا جنسی عشق بھی زبردست روحانی قوت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف کے اس نظریئے سے ہندوستانی ذہن شدید طور پر متاثر ہوا جس کا ثبوت بھگتوں کے کلام، میرا بائی کے بھجنوں اور وشنوؤں کے لٹریچر اور اردو غزل سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ جس شد و مد اور پرجوش و پرخلوص طریقے سے اس نظریئے کا اظہار ہندوستانی عوامی اور ادبی شعبوں میں ہوا ہے۔ ایران

---

[1] فوائد الفواد ص ۲۴۵ بحوالہ تاریخ مشائخ چشت

[2] فوائد الفواد ص ۹۵ بحوالہ ایضاً

[3] Influence of Islam on Indian Culture — P. 83

[4] تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ مشائخ چشت ص ۳۰۵

---

[1] لفظ صوفی کی تحقیق — ماہِ نو — ۱۹۵۳ء

یا دیگر اسلامی ممالک اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتے۔

اردو کے غزل گو شاعر بھی عشق کی اس صداقت پر زور دیتے ہیں جو سونے کے تار کی طرح انسانی دل کو دل سے ملاتی ہوئی معرفت کی بلندیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔ عشق کی اس آنچ میں تپ کر ہی آئینۂ دل میں کندن کی سی وہ آب پیدا ہو جاتی ہے جس میں جمالِ رُخِ یار کا عکس اُترتا چلا جاتا ہے۔ قلی قطب شاہ عشق کو "سنسار کا کلس" کہتے ہیں۔ وجہی اس کی سلطانی کو مکان و لامکان پر ثبت سمجھتے ہیں۔ ع

محبت کی سلطانی ہے سب جگ میں — کہ اس سم نہیں کوئی گیانی دوانی

علم و عقل رموزِ کائنات و اسرارِ حیات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ صرف عشق ہی ان حقائق کو بے نقاب کر سکتا ہے۔ ؎

حکمتِ عشق بوعلی سوں نہ پوچھ — نئیں وہ قانوں شناس اس فن کا

بحری دکنی کہتے ہیں کہ "میں طریقِ عشق پر ایک مدت سے گامزن ہوں۔ میں نے اپنی تمام عمر عشق کی بیقراریوں میں بسر کی ہے، میرا تن آتشِ عشق میں اس طرح جلتا رہا جس طرح دیگچی میں مسور پکتی ہے"[1]

اردو غزل میں عشق کو ازلی اور ابدی کہا گیا ہے۔ عالم انسانی و روحانی میں وہ سب سے افضل ہے۔ سوائے عشق کے اور کوئی راستہ معرفتِ حق کا نہیں۔ سراج دکنی کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔ ع

سراج یوں مجھے استاد مہرباں نے کہا — کہ علم عشق سے بہتر نہیں ہے کوئی علوم

میر کی تربیت میں صوفیانہ عناصر کا بہت ہاتھ رہا ہے۔ ان کے ہاں عشق و محبت کو جتنی اہمیت حاصل ہے، اردو کے کسی غزل گو کے ہاں نہیں۔ میر کے والد "صوفی صافی و درویش دل ریش" تھے۔ جب کبھی شگفتہ ہوتے تو میر صاحب سے فرماتے[2]

"بیٹا عشق اختیار کرو۔ عشق ہی اس کارخانہ پر مسلط ہے۔ بے عشق زندگانی وبال ہے۔ عشق میں دل کھونا اصل کمال ہے"

میر کے کلام میں قدم قدم پر ان خیالات کی بازگشت موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ع

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو — سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق معشوق عشق عاشق ہے — یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق
کون مقصد کو عشق بن پہنچا — آرزو عشق ، مدعا ہے عشق

موج زنی ہے میر فلک تک ، ہر لجہ ہے طوفاں زا
سرتاسر ہے تلاطم جس کا وہ اعظم دریا ہے عشق

عشق سے نظم کل ہے یعنی عشق کوئی ناظم ہے خوب
ہر شے یاں جو پیدا ہوئی ہے موزوں کر لایا ہے عشق

غالب گو عشق کو "خانہ ویراں ساز" کہتے ہیں۔ لیکن اس بات کے بھی قائل ہیں کہ اگر "رونق ہستی" کسی کے دم قدم سے ہے تو وہ جذبۂ عشق ہے۔ ع

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

فراق بھی اس مسلم حقیقت کو بار بار دوہراتے ہیں اور اس "بزم بے خودی" میں گردشِ نظر کے سہارے مٹ جانے میں ہی حسن و حق کا راز تلاش کرتے ہیں۔ ع

گرد و غبار ہستیِ فانی اُڑا دیا — اے کیمیائے عشق مجھے کیا بنا دیا

تصوف میں عشق کو جو اہمیت حاصل ہے اور اس کا جو اثر اردو غزل پر ہوا ہے اس کا ذکر اوپر کیا گیا لیکن یہ عشق محض عشق ہی نہیں۔ اس کے دو مدارج ہیں، حقیقی اور مجازی۔ عشق حقیقی کی منزل تک پہنچنے کے لئے زینۂ مجاز طے کرنا بہت ضروری ہے۔ بغیر اس کے تہذیب نفس اور تزکیۂ نفس ممکن ہی نہیں۔ حقیقت کا دامن کچھ اس پر اسرار انداز میں مجاز سے گتھا ہوا ہے کہ دونوں کا جدا کرنا ناممکن ہے۔

قلی قطب شاہ نے کہا ہے۔ مجھے جلوۂ رُخِ یار میں نورِ خدا نظر آتا ہے، اور حقیقت کا یہ درس میں نے بھونرے سے لیا ہے جو آتشِ عشق میں جل جل کر سیاہ پڑ گیا ہے۔ ع

تمن مکھ میں خدا کا نور ہے نیناں بھر یا دیکھے — کنن صورت تمن سر بھر نہ ہمراہی کرن سکتا

کائنات کا حُسن ان روحوں سے عبارت ہے جن کی نس نس اور پور پور میں محبت رچ بس گئی ہے، اور جنھوں نے اپنے "ساجن" کے مبارک چرنوں پر اپنے ماتھے تیوڑا دئے ہیں۔ مجاز سے تعلق رکھتے ہوئے حقیقت کے دھیان میں خودی کو ضم کر دینا ہی سب سے کٹھن منزل ہے۔ ع

سدا پیو کی جوت سوں جگ مگاتی — پیا نیہہ کی چھب سوں ہوئی ہوں چھبیلی
(قلی قطب شاہ)

---

[1] مقدمہ کلیات بحری
[2] ذکر میر مطبوعہ انجمن ترقی اردو

دریا کی حقیقت کو سمجھنے سے پہلے قطرۂ آب کو اور شعلے کی بھبھک سے پہلے چنگاری کی نوعیت کو سمجھنا لازمی ہے۔ ع

ولی اس ماہِ کامل کی حقیقت جو نہیں سمجھا وہ ہرگز نہیں سمجھا عالم میں اکمل کے معانی کو

گر حقیقت کی سیر ہے خواہش راہِ عشقِ مجاز لازم ہے (سراج)

میر صاحب بھی عشقِ بتاں سے معنی آفرینی کا درس لیتے تھے۔ ان کے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔ ع

سراپا میں اس کے نظر کرکے تم جہاں دیکھو اللہ ہی اللہ ہے

سچ پوچھو تو کب ہے گا اُس کا سا دہن غنچہ
تسکیں کے لئے ہم نے اک بات بنائی ہے

غالب نے اپنی رنگیں نوائی کا سبب "جلوۂ چمن" کو قرار دیا ہے۔ وہ سکتے ہیں دل کے گھاؤ ہرے رکھنے ہی سے جذبۂ اشتیاق کو قوت پہنچتی ہے غفلت اور لاعلمی کے کئی پردے انسان اور خدا کے درمیان حائل ہیں۔ اچھا ہوا کہ خدا نے حُسن کو خود نما کر دیا، ورنہ انسان کے لئے یہ پردے اُٹھانا آسان نہ تھا۔ ع

پردۂ چشم تھے حجاب بہت حُسن کو خود نما کیا تونے (حالی)

تمھیں سچ سچ بتاؤ کون تھا شیریں کے پیکر میں
کہ مشتِ خاک کی حسرت میں کوئی کوہ کن کیوں ہو (آسی غازیپوری)

جگر حقیقت کو اس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے کہ وہ حسنِ مجاز کا ایک پرتوِ لطیف ہے۔ ع

صوفی نے جس کو شاہدِ مطلق سمجھ لیا اک پرتوِ لطیف تھا حسنِ مجاز کا

زندگی میں اگر رہبرِ عشق نہیں تو بے کار ہے۔ فراق کے الفاظ میں آنکھوں کے مد اور ہونٹوں کے رس میں گہری ابدیت موجود ہے اور جلوۂ محبوب ماسوائے اس کے کہ جلوۂ حق نما ہے اور کچھ نہیں۔ ع

اک جلوۂ حق نما کو دیکھا تم کو دیکھا خدا کو دیکھا

اردو کے غزل گو شاعروں کا محبوب تصوّرات اور خیالات کی دنیا میں رہنے والا فارسی شاعری کا رسمی محبوب نہیں ہے بلکہ گوشت پوست کا جاندار انسان ہے۔ اردو غزل کا عشقِ مجازی خالص انسانی اور زمینی عشق ہے۔ ہمارے نقّادوں نے ہندوستانی تہذیب کی روایات کے خلاف اردو غزل کے مجازی عشق کو "پاک" اور "ناپاک" کی غلط حدوں میں بانٹنے کی بارہا کوشش کی ہے۔ ہندوستانی جمالیاتی آرٹ کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی وجدانیت ہے۔ کائنات گو فریبِ نظر ہے اور بے ثبات ہے۔ لیکن روزمرّہ کے تجربے سے اس کے اعتباری وجود میں وہ حقیقت تلاش کی جاسکتی ہے جو عاشق کے لئے زمینی عشق میں فلسفی کے لئے صداقت میں اور شاعر کے لئے حُسن میں ہے۔ جس طرح عشق اور صداقت کا ادراک مجاز سے وابستہ ہوئے بغیر نہیں ہوسکتا، ایسے حُسن کی تلاش بھی مجاز سے بیگانہ محض ہو جانے میں ممکن نہیں۔ حُسن کی تخلیق کے لئے اس کی صرف خواہش کرتے رہنا کافی نہیں، بلکہ مجاز کے کسی پہلو سے خود کو وابستہ کر دینا بھی شرط ہے۔ بغیر نقطۂ پرواز کے نہ تو پرواز ہوسکتی ہے اور نہ رسائی۔ "انسانِ کامل بننے کے لئے محض متقی اور پرہیزگار بن جانا ناکافی ہے"[1]

حسن تلاش کرنے کا راستہ مجاز سے منہ موڑنے میں نہیں بلکہ اس میں متجسّس نگاہوں سے جھانکنے میں ہے۔ اردو کا غزل گو شاعر خود کو مجاز کے ان اجزا سے وابستہ کر دیتا ہے جن سے اُسے عشق ہے، اور اس وابستگی کے بعد ہی حُسنِ مطلق تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اردو کے غزل گو کے لئے روح اور مادہ، پرش اور پراکرتی کی کائنات الگ الگ نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں اردو غزل کی جڑیں ہندوستان کی تہذیبی زندگی میں دور دور تک پیوست ہیں۔ اردو کا غزل گو عاشق بھی ہے، فلسفی بھی اور آرٹسٹ بھی، گو یہ حسین امتزاج عام نہیں ہے۔

ہندوستانی تہذیب کی طرح غزل میں بھی اصلیت و تخیل کی، مادیت و روحانیت کی ایک حسین آمیزش ملتی ہے۔ یہ نہ تو صرف وجدان ہی وجدان ہے اور نہ صرف جذبات ہی جذبات۔ یہاں سکون بھی ہے اور انتشار بھی، سپردگی بھی ہے اور کوشش بھی۔ ترکِ عمل بھی ہے اور عمل کی تلقین بھی۔ لیکن غزل کا تجزیہ کرتے ہوئے عموماً نقاد غزل کے اس مثبت پہلو کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

---

[1] بھگوت گیتا۔ ۳۔ شلوک ۴۱

دیوندر ستیارتھی

پنجاب کے لوک گیت

ایک چینی شاعر کے قول کے مطابق "زمین میں دفن جواہرات اور موتی اس دن کے انتظار میں رہتے ہیں جبکہ انھیں باہر نکل کر دور دراز تک اپنی چمک دکھانے کا موقعہ ملے گا" یہی مثال لوک گیتوں پر بھی صادق آتی ہے ۔ لوک گیت بھی ایسے ہی دن کے منتظر رہتے ہیں ۔ پنجاب میں مختلف اقسام کے لوک گیت مقبول ہیں ۔ ان لوک گیتوں کا دائرہ بہت وسیع ہے ۔ پنجابی لوک گیتوں کی بعض اقسام کے نام بہت دلچسپ ہیں مثلاً (۱) ہولار (۲) لوری (۳) تھال (۴) ڈھولا (۵) ماہیا (۶) گھوڑی (۷) سہاگ (۸) سٹھنی (۹) جھوک (۱۰) سمی (۱۱) گدّا (۱۲) وین یا الاہنیاں

ان گیتوں کے بعض سُر بالکل امتیازی نوعیت کے ہیں ۔ بالخصوص کانگڑے کے ضلع میں گائے جانے والے گیتوں کے سُر لہرے کی مانند کچھ اس طرح اٹھتے بیٹھتے ہیں کہ انھیں سن کر انسان پر وجد طاری ہو جاتا ہے ۔ ان میں سے غم میں سموئے گیتوں کے لہردار سُروں میں سوز ہمیشہ جاری رہتا ہے اور اگر یہ عشق و محبت کے گیت ہوں تو یہ جذبات سے اتنے بھرپور ہوتے ہیں کہ انھیں گانے والے کی ہر ایک تان گہرے جذباتی تجربے کی آئینہ داری کرتی ہے ۔ ہر گیت کی تال نمایاں ہوتی ہے اور اسے ایک خاص سُر میں گایا جاتا ہے ۔

بچے کو جھولا جھلانے، لاڈ کے پاس بیٹھنے کی مسرت، بکری کے کسی خوبصورت بچے کی پیدائش، شادی کے موقعہ پر زرق، نئے خوبصورت زیور، گاؤں کے کسی میلے یا سارس کی اڑان، غرضیکہ بے شمار موضوعات پر نئے گیت لکھے جاتے ہیں۔ زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جو دیہاتی شاعر کو گیت لکھنے پر نہ ابھارتا ہو ۔ لوگ ان گیتوں میں حسب منشا تبدیلیاں کرتے ہیں اور بالآخر یہ ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس میں یہ بآسانی ایک سے دوسرے شخص کو زبانی منتقل کئے جا سکتے ہیں ۔

بچے کو سلانے کے لیے ماں کی لوری، یا فصل کی فراوانی پر کسان کی مسرت و شادمانی کا گیت خواہ یہ گیت دیومالا سے متعلق ہوں یا لوگوں کی ابتدائی جد و جہد کے آئینہ دار ہر حالت میں یہ گذشتہ یادوں کو تازہ کرتے ہیں ۔ اگر ہم پنجاب کے ایک ضلعے سے دوسرے ضلعے میں جائیں تو وہاں کے لوک گیتوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت ہم پر بخوبی منکشف ہو جاتی ہے ۔

تہواروں اور مختلف رسوم سے متعلقہ مختلف زبانوں میں مروجہ گیتوں میں زیادہ فرق نہیں پایا جاتا اس کے علاوہ گاؤں کی عورتیں جب کبھی مل کر چرخہ کاتنے بیٹھتی ہیں تو اس موقعے پر مختلف گیت گاتی ہیں ۔ یہ گیت بعض دفعہ سنہری چرخہ حاصل کرنے کے خواب اور بعض اوقات چرخے کی 'مال' (وہ دھاگہ جس کے گرد چرخے کا پہیہ گھومتا ہے) کے بارے میں گائے جاتے ہیں ۔ مل کر چرخہ کاتنے کا یہ کام بعض اوقات سارا سارا دن اور ساری ساری رات جاری رہتا ہے ۔ بھارت کے کسی اور حصے میں یہ رواج شاید ہی ہو ۔ اس موقعے پر گائے جانے والے بعض گیت کتنے پیارے ہوتے ہیں مثلاً

(۱) گھوں گھوں چرکھڑا — چرخہ گھوں گھوں چلتا
لال پونی کناں کہ تاں — ہیں لال پونی کاتوں یا نہ
کت بی بی کت — کاتو بی بی کاتو

(۲) دور میرے سوہرے — میری سسرال دور ہے
میں سوہرے گھر وساں کہ نہ — میں سسرال رہوں یا نہ
وس بی بی وس — رہو بی بی رہو

(۳) لماں میرا دکھڑا — میرے دکھوں کی داستان لمبی ہے
میں دساں کہ ناں — اسے بیان کروں یا نہ
دس بی بی دس — بتاؤ بی بی بتاؤ

(۴) نیانڑا میرا کنت — میرا خاوند چھوٹی عمر کا ہے
میں کنت گھر وساں کہ نہ — میں اس کے گھر رہوں یا نہ
دس بی بی دس — رہو بی بی رہو

ان گیتوں کے الفاظ کو ان کے اندرونی ترنم سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چرخے کی ہر مترنم گھوں گھوں کے ساتھ یہ الفاظ بھی نغمے کے "پروں" پر اڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ چند ایک اور مثالیں ملاحظہ فرمایئے

(۱) یار میرا مصری دا کوزا — میرا یار مصری کی مانند میٹھا ہے
مٹھی مٹھی گل کردا — وہ میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے

(۲) یار میرا سرو دا بوٹا — میرا یار سرو کے پودے کی مانند ہے
رب کولوں لے لیا منگ — میں نے اسے خدا سے مانگ کر لیا ہے

(۳) جوگی اترے پہاڑوں — چرخے کی گونج سن کر پہاڑوں سے
چرخے دی گونج سن کے — جوگی بھی نیچے اتر آئے ہیں۔

بھارت میں چرخہ کاتنے کا رواج تاریخی ہے اور آج بھی بھارت کے مختلف حصّوں میں یہ قدیم روایت کسی نہ کسی شکل میں قائم ہے۔ اڑیسہ میں اور بالخصوص ضلع سمبھلپور میں سسرال میں قیام کے پہلے سال کے دوران میں دلھن چرخہ کاتنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کرتی۔ پنجاب کے صوفی شاعر حسین (۱۵۳۹ء سے ۱۵۹۳ء) نے قدرتی طور پر اپنی روح کو ایک ایسی لڑکی سے تشبیہہ دی ہے جو محض اس وجہ سے کنواری بیٹھی رہی کہ وہ قدیم روایت کے مطابق اپنے ہونے والے خاوند کے لئے اپنے ہاتھوں سے سوت کات کر شادی کا جوڑا تیار نہ کر سکی تھی۔ جس طرح خاوند جہیز میں ہاتھ سے کتا ہوا اور ہاتھ سے بُنا ہوا کپڑا لانے والی بیوی سے پیار کرتا تھا اسی طرح خدا کو اس صوفی سے محبت تھی جس نے زندگی میں نیک کاموں کا کپڑا بنا ہو۔

پنجابی کے بعض گیت گھریلو زندگی کا تمام نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے لے آتے ہیں۔ پنجاب کے لوک گیت ہمیں سماجی و تہذیبی امور کے مطالعے کے لئے اہم مواد مہیّا کرتے ہیں۔ یہ گیت تہواروں، مختلف پرانی رسوم، گاؤں کے کسی میلے کی رونق وغیرہ موضوعات غرضیکہ کسی ایسی دیہاتی دوشیزہ کے متعلق بھی ہو سکتے ہیں جسے آرائش کے لئے زیورات تو میسر نہیں آتے لیکن وہ کاجل کے استعمال سے اپنی آنکھوں میں جادو کا اثر پیدا کرنے سے کبھی نہیں چوکتی۔ ان میں سے بعض گیت ناچ کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ دیہات میں عورتیں بیٹے کی پیدائش پر مل کر کئی گیت گاتی ہیں جو "ہولانہ" کے نام سے مشہور ہیں۔ شادی کے گیتوں میں عورت کے بالوں میں سیندور لگائے جانے کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ سیندور کسی عورت کے شادی شدہ ہونے کی علامت ہے۔

علاوہ ازیں پنجاب کے لوک گیت شاعروں کے مطالعے کے لئے اہم مواد مہیّا کرتے ہیں۔ پنجاب کے کئی نوجوان شاعر اب لوک گیتوں کی اصطلاحیں و استعارے استعمال کر رہے ہیں۔ نئے سماجی ڈھانچے میں جدید شاعری کے تقاضوں کی روشنی میں لوک گیتوں میں استعمال کئے گئے استعاروں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے نہ صرف یہ بلکہ لوک گیت ہلکے پھلکے سنگیت کی تجدید میں بھی ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

شہری ہوا بازی

ملک کے آزاد ہونے سے قبل ہماری غیر ملکی سروس صرف برما اور لنکا جیسے ہمسایہ ملک تک ہی محدود تھی۔ بعد ازاں دور دراز ممالک تک بھارت کی فضائی سروس قائم کرنے کے بارے میں بتدریج ترقی کی گئی۔ اب ہمارے جہاز عدن، بنکاک، قاہرہ، ڈسلڈورف، جنیوا، کابل، قندھار، لندن، نیروبی، پیرس، روم، سنگاپور اور ہانگ کانگ کے علاوہ ہمارے ہمسایہ ممالک برما، لنکا، نیپال اور پاکستان تک اڑان کرتے ہیں ان ملکی اور بین الاقوامی ہوائی سروسوں کے تیزی سے ترقی پانے کے باعث ہوائی اڈے مہیا کرنے فضائی آمد و رفت پر کنٹرول رکھنے۔ رسل و رسائل اور تجربہ سروسوں اور موسمیات کا نظام قائم کرنے اور ہوائی جہازوں کی دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کرنے ان کے کارآمد ہونے اور فضا میں اڑان کرنے کی قابلیت معلوم کرنے کے بارے میں کافی بڑی ذمے داریاں حکومت پر آپڑی ہیں۔

ہندی

عرش ملسیانی

اندھا جگ کا نیائے

(سنگیت ناٹک)

(وقت کا راجہ (کال) اپنے دربار میں سنگھاسن پر براجمان ہے۔ پل گھڑی، پہر، دن، مہینہ، سال، صدی، یگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہیں استقلال کی اپسرا ناچ رہی ہے۔ باہر سے شور کی آواز آتی ہے۔ دوارپال اندر آیا)

کال:۔ یہ شور کیسا ہے دوارپال!

دوارپال:۔ فریادی آئے ہیں کچھ، راجن! منش لوک کے فریادی، عرفِ عام میں انسان

کال:۔ اندر آنے دو انہیں (دوارپال جاتا ہے)

(انسانی بستی سے گھبرائے ہوئے نیک بندوں کا ہجوم ڈھولک باجے کے ساتھ گاتا ہوا اندر داخل ہوتا)

اندھا جگ کا نیائے راجن
اندھا جگ کا نیائے

سونے چاندی کی پوجا میں اندھے ہیں دھن وان
ان کی نگری میں ہوتا ہے نردھن کا اپمان
ہم سے سہا نہ جائے راجن
اندھا جگ کا نیائے

کال:۔ (آہ بھر کر نردھن کا اپمان، اس کی ویاکھیا کرو فریادیوں کے نیتا۔

نیتا:۔ ویاکھیا کروں۔ سب کچھ جانتے ہو راجن، پھر بھی پوچھتے ہو۔ اچھا نردھن علم سناؤ اپنا گیت۔

نردھن علم (گاتا ہے) نردھن کا دکھ جانے کون
وہ بھی ہیں سارے سنساری
نردھنتا کا دُکھ ہے بھاری
اِس دُکھ کو پہچانے کون
نردھن کا دُکھ جانے کون

تاریکی سے ہیں اُجیالے
نردھن ہیں تو ہیں دھن والے
لیکن اس کو مانے کون
نردھن کا دُکھ جانے کون

سُکھ کے راگ دھنی گاتے ہیں
دھن کے بدلے سکھ پاتے ہیں
دُکھ کی کتھا بکھانے کون
نردھن کا دکھ جانے کون

سونا سونا دھنی اڑائیں
مٹی مٹی نردھن پائیں
اس مٹی کو چھانے کون
نردھن کا دُکھ جانے کون

(سب گاتے ہیں) اندھا جگ کا نیائے راجن
اندھا جگ کا نیائے

دھرم کے پلّے ہار ہے نسدن پاپ کے پلّے جیت
گُن وانوں کو کوئی نہ پوچھے یش ہو دکھ کا میت
ہم سے سہا نہ جائے راجن
اندھا جگ کا نیائے

کال:۔ کیا مطلب ہے تمہارا اس سے اگُن وانوں کو کوئی نہ پوچھے۔ اس بات کی بھی ویاکھیا ہونی چاہیئے۔

نیتا :- (ہنستے ہوئے) سب کچھ جانتے ہوئے پوچھتے ہو۔ وقت کے راجہ، لیجئے سنیئے۔ گنا دھیش سے اس کی سار۔ گنا دھیش کہو گن وانوں کا دُکھ۔

(گنا دھیش گاتا ہے)

دُنیا میں سُکھی کوئی گُن وان نہیں ہوتا
ہوتا ہے تو کچھ اس کا سمان نہیں ہوتا
سب کے لئے کرتا ہے راحت کی دُعائیں جو
اس کے لئے راحت کا سامان نہیں ہوتا
گن گیان سے کرتا ہے کلیان جو دُنیا کا
افسوس کہ خود اس کا کلیان نہیں ہوتا
سکھ دھام ہے یہ جیون ہر پاپ کے بندے کو
پُورا کوئی دھرمی کا ارمان نہیں ہوتا
جینے میں تو ہوتی ہے ہر سانس پہ دشواری
افسوس کہ مرنا بھی آسان نہیں ہوتا

(سب گاتے ہیں) اندھا جگ کا نیائے راجن
اندھا جگ کا نیائے

سُکھ کے کان نہیں سنتے ہیں دُکھ کا کرن پلاپ
مرنے سے بھی کچھ بڑھ کر ہے جیون کا سنتاپ

ہم سے سہا نہ جائے راجن
اندھا جگ کا نیائے

کال :- تم لوگ گھبرا گئے ہو سب وقت کے اصول یعنی کال نیم کو بھول گئے ہو۔ اچھا تو اب استقلال کی اپسرا ناچے گی اور فنا کی گائیکہ گائے گی۔ سنو!

(رقص کی آواز کے ساتھ گانا)

پرانی باؤرا جیون پہ اترائے
تیز ہوا کے رُخ پہ بیٹھا آشا دیپ جلائے
پرانی باؤرا جیون پہ اترائے

پل بھر کا مسکان کنول کا بھونرا لپٹا جائے
ایک بوند رس کی ترشنا پہ اپنا آپ گنوائے

پرانی باؤرا جیون پہ اترائے

سپنے میں اک موہنی مورت دیکھ جیا للچائے
آنکھ کھلے تو کچھ نہیں دیکھے مورکھ دھوکا کھائے

پرانی باؤرا جیون پہ اترائے

من کلپن دُکھ ریت کے اوپر سکھ ساگر دکھلائے
سکھ کی اک اک لہر انت میں مرگ ترشنا[1] بن جائے

[1] سراب

پرانی باؤرا جیون پہ اترائے

کال :- دیکھا انسان کا جھوٹا غرور، دیکھی انسان کی بھول۔ اب بتاؤ زندگی کے رونے کا فائدہ، اب سمجھاؤ گن وانی کی فریاد کا لابھ ؟

نیتا :- (فریادیوں کی طرف منہ موڑ کر) نیائے کی تلاش میں آئے تھے تم، چلو لوٹ چلو اور گاؤ اندھا سب کا نیائے

(فریادی گاتے ہوئے جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

تامل ــــــــــــــــ ترود وتوور

محبت کا ثمرِ شیریں وہی کھاتے ہیں جو اپنے محبوب کے عزیز ہیں
محبوب کا کرم عاشق کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو دُنیا کے لئے بارش
دونوں جانب سے ہو تو محبت ایک نعمت ہے اور صرف ایک ہی طرف سے ہو تو مصیبت
جنسِ لطیف سے زیادہ مضبوط دل دُنیا میں کوئی نہیں بالخصوص جب وہ اپنے محبوب کا پیغامِ دل نواز پائے بغیر زندہ رہ سکتی ہے۔

کوثر تسنیم

جمہوریۂ ہند میں فلموں کا ماضی اور مستقبل

جمہوریۂ ہند میں فلموں کی اہمیت کا جائزہ دو زاویوں سے لیا جا سکتا ہے ایک فلم بحیثیت 'انڈسٹری' اور دوسرے فلم بحیثیت 'فن'۔

فلم بحیثیت انڈسٹری

آج فلم انڈسٹری کا شمار ملک کی ان بڑی انڈسٹریوں میں ہوتا ہے جو ملک کے لئے گراں قدر رقم فراہم کرتی ہیں اور جس میں قریب قریب ستر اسی ہزار آدمی مختلف حیثیتوں سے کام کر رہے ہیں۔ تقریباً چالیس کروڑ روپے اس انڈسٹری کی پونجی ہے۔ ملک میں دو ہزار پانچ سو سینما ہال اور آٹھ سو پچاس چلتے ہوئے سینما کام کر رہے ہیں۔ فلمیں تیار کرنے کے لئے ساٹھ اسٹوڈیو چل رہے ہیں۔ پروڈکشن کے اعتبار سے ہمارا ملک دنیا کے دوسرے ملکوں کے بہ نسبت ایک اہم اور خصوصی مقام پا چکا ہے اور دنیا کے تمام ملکوں کے فلم پروڈکشن میں ہندوستان کا دوسرا نمبر ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں آواز سینما کی ایجاد کے بعد اسی سال کل ۲۸ فلمیں تیار ہوئی تھیں جن میں 'عالم آرا' پہلی فلم تھی جو مختلف زبانوں میں تیار کی گئی تھی۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں ۲۸۵ فلمیں تیار ہوئیں اور آج تک اسی اوسط سے تیار ہو رہی ہیں۔ اس وقت فلمسازی کا کام ملک کے تین حصوں میں ہو رہا ہے اور یہ تینوں سنٹر یعنی بنگال، بمبئی اور مدراس مختلف زبانوں میں فلمیں تیار کر رہے ہیں۔ بنگال بنگالی اور کچھ ہندی میں، بمبئی ہندی یا ہندستانی میں اور مدراس تامل، تیلیگو، کنڑا اور ملیالم زبانوں میں فلمیں تیار کر رہے ہیں۔

فلم بحیثیت فن

فلم کو فن کی کسوٹی پر جانچنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ فلم ایک ایسا فن ہے جو کتنے ہی فنونِ لطیفہ کا مرکب ہے۔ موسیقی، ناول، ڈراما، شاعری، فوٹوگرافی، مصوّری اور رقص جب انسانی تخیّل سے ہم آہنگ ہوتے ہیں تو فلم بنتی ہے۔ آواز کی مقبولیت نے اس فن میں جان ڈال دی اور یہ فن آواز کی زبان سے بولنے لگا۔ اگر فن کی سب سے بڑی خوبی اور تعریف یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کو فائدہ پہنچائے اور اپنی طرف متوجہ کرے تو فلم یقیناً ایک کامیاب فن ہے جو ہر روز سو دو لاکھ انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اگر فن ملک کے سماجی و معاشرتی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے تو فلم بھی ملک کے سماجی نظریات، رہن سہن کے طریقے اور تہذیب کو پیش کرتی ہے۔ اگر بقول گریرسن فن اپنے آئینے میں انسان کی ذہانت، ذہنیت اور کردار کو نمایاں کرتا ہے تو فلم بھی سوسائٹی کو اور اس کے مختلف طبقوں کو کردار کے ذریعے سے پیش کرتی ہے۔ اور صرف پیش ہی نہیں کرتی بلکہ اُن کے بُرے پہلوؤں کو اُجاگر کر کے ایک مثالی زندگی پیش کرتی ہے۔ بُرے نظریات، رسم و رواج، فرسودہ تصورات اور گندے اصولوں کو دکھا کر اُن کی طرف سے نفرت کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے۔ سوسائٹی اور سماج کے بھدّے چہرے کو پردے پر پیش کر کے یہ حس پیدا کر دیتی ہے کہ انسان اچھے اور بُرے کا امتیاز آسانی سے کر سکتا ہے۔

فلم اور افادیت

فلم کے تشریحی نقطۂ نظر سے ہٹ کر اگر ہم اس کے افادی پہلو پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ فلم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو سب سے زیادہ مؤثر، کارآمد، کارگر اور زیادہ سے زیادہ انسانوں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ملک میں ان پڑھ لوگوں کی تعداد تقریباً تین چوتھائی سے بھی زائد ہے اور اس لئے اخبار اُن کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ ایسے لوگوں کی تعداد بھی ملک میں بہت کم ہے جو ریڈیو رکھتے ہیں یا رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے ریڈیو سے بھی ہر شخص مستفید نہیں ہو سکتا۔ لیکن فلم سے ہر عام شخص یکساں فائدہ اُٹھاتا ہے۔

فلم آزادی سے پہلے

آزادی سے پہلے ہماری فلموں کا شعور نیم پختہ تھا اور پھر ہم پر ماحول اور حکومت کا ایسا دباؤ تھا جس کے بوجھ نے مجبور کر رکھا تھا کہ آواز باہر نہ آئے

اور گلے ہی میں گھونٹ لی جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اگر "روٹی" کی سی فلمیں بنیں بھی تو ان پر سختی سے پابندیاں لگا دی گئیں اور ان کی نمائش ممنوع قرار دے دی گئی، اُس زمانے کی فلموں پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ کہانی کا سارا دارومدار ایک روایتی محبت پر منحصر ہوتا تھا، اور وہ محبت بھی رسمی طور سے "عورت" ہی سے کی جاتی تھی۔ بےمقصد سے محبت کرنا جرم تھا۔ ساری کہانی صرف ایک عورت کے حصول کے محور پر گھومتی تھی اور ہمارے ہیرو کا مقصد اس عورت کو حاصل کرنا رہتا تھا جس کو وہ کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیتا تھا اور فرضی رومانس کی یہ تکمیل کہانی کا نتیجہ بن جاتی تھی۔ لیکن اگر ہم یہ سوال کریں کہ کیا اس وقت ہمارے سامنے ٹھوس حقیقتیں نہ تھیں، کیا ہماری سوسائٹی اس وقت بے داغ تھی، کیا ہمارے ملک میں اَن گنت سماجی اور معاشرتی مسائل نہ تھے، کیا کبھی بھی ہمارا مقصد صرف عورت ہی کو حاصل کرنا تھا، اور کیا وہ فلمیں ہماری زندگی، ہمارے کلچر، ہمارے جذبات اور ہماری سماجی و معاشرتی زندگی کی نمائندگی کرتی تھیں، تو جواب نفی میں ملے گا۔

فلم آزادی کے بعد

آزادی تو ملی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم کو ایسے بہت سے مسائل ملے جن کا حل ہم ہی کو سوچنا تھا۔ آزادی حاصل کر لینا ہی تو کافی نہ تھا، اُس کو قایم رکھنا، ملک کی ترقی اور عام انسان کو خوش حال بنانا ہماری اہم ذمہ داریاں تھیں۔ ہم پر فرض عاید ہوئے تھے کہ ہم سوسائٹی اور سماج کو نکھاریں۔ اور آزادی سے پہلے ملک میں جو زہر پھیل چکا تھا، سوسائٹی اور سماج میں جو زنگ لگ چکا تھا اس کو صاف کریں اور چمکائیں۔ زمیندار اور کسان کے درمیان طبقاتی کشمکش، امیر کا غریب سے نفرت آمیزانہ برتاؤ، مہاجن اور ساہوکار کا غریب انسان سے سخت سے سخت سود لینا، ضرورت مند کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر ناجائز اور غلط دستاویز تحریر کرا لینا، اچھوتوں کو بُری نظر سے دیکھنا، اور اُن کو سماج میں نہ آنے دینا، خود مختار ریاستوں میں رعایا سے بہیمانہ برتاؤ، مغربی تہذیب کا ہمارے اندر بُری طرح سرایت کر جانا، شراب اور جُوے میں گھربار تک گروی کر دینا، مِل مالکوں اور مزدوروں کے درمیان تصادم، ملک میں بڑھتی ہوئی بےکاری، صوبہ واری تعصب، چوربازاری اور رشوت خوری اور ایسے ہی نہ معلوم کتنے سوال اور اُلجھنیں ہمارے سامنے آئیں جن کو سلجھانا ہمارا سب کا فرض تھا۔ یہ وہ بدنما داغ تھے جن کی موجودگی میں آزادی پھیکی معلوم ہوتی تھی۔ یہ سامراجیوں کے دیے ہوئے وہ تحفے تھے جس میں زہر چھپا ہوا تھا کہ اگر قدم کو ذرا بھی لغزش ہو جاتی تو ہماری قومی زندگی یقیناً خطرے میں آ جاتی۔

ہماری فلمیں ماحول کے مطابق اپنے مزاج کو ڈھالتی رہیں، اور انھوں نے وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی ہوئی مشکلات سے منہ نہیں موڑا، بلکہ ان مشکلات کی نمائندگی کرتے ہوئے صفِ اوّل میں آتی رہیں، ایسی تمام فلموں کا تذکرہ کرنا تو مضمون کو طول دینا ہوگا۔ لیکن چند فلموں کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

رمیش سہگل کی "شکست" ایک ایسے زمیندار کی کہانی ہے جو چاہتا تھا کہ کسان جیسی حالت میں ہیں اس سے ترقی نہ کریں۔ اگر کسان گاؤں میں اسکول کھلتا ہے تو وہ زمیندار پوری کوشش کرتا ہے کہ اسکول بند ہو جائے۔ کیونکہ زمیندار کو خطرہ تھا کہ اگر کسانوں نے پڑھ لیا تو بیگار کون کرے گا۔ بمل رائے کی "دو بیگہ زمین" بھی ایک ایسے کسان کی کہانی ہے جو زمین کو ماں سمجھتا تھا، لیکن زمیندار اس زمین کو غلط دستاویز اور فرضی قرض کی مدد سے حاصل کر لیتا ہے۔ اگرچہ کسان نے اس قرض کو محنت کی صورت میں ادا کر دیا تھا، امیا چکرورتی کی "پتنیا" ایک غریب لڑکی کی دردناک کہانی ہے جس کو ساٹھ روپے کرائے کے بقایا ہونے کی وجہ سے سیٹھ صاحب کے در پر جانا پڑتا ہے جہاں اس کی عصمت کے پھول زبردستی مسل ڈالے جاتے ہیں، شاید اس سیٹھ کے لئے ایک عورت کی عصمت کی قیمت صرف ساٹھ روپے تھی۔ محبوب کی "آن" ایک ایسی خود مختار ریاست کی داستان ہے جہاں غریب پرجا کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا، ان کی معصوم لڑکیاں زبردستی محل کے تعیش کے لئے پکڑ لی جاتی تھیں، عمر خیام فلمز کی "ان داتا" بھی ایک مل مالک اور مل مزدوروں کے تصادم کو پیش کرتی ہے، اور مزدوروں کو ایک مشترکہ مل بنانے کا پیغام دیتی ہے۔ وی شانتا رام کی "تین بتی چار راستہ" صوبہ واری تعصب کو دُور کرنے اور آپس میں ملاپ قایم کرنے کا سبق دیتی ہے، ضیا سرحدی کی "فٹ پاتھ" بھی ان لوگوں کی زندگی کو پیش کرتی ہے بلیک مارکٹنگ

جن کا پیشہ ہے، لیکن ظاہرا وہ سماج کے شریف انسان ہیں۔

فلم اور تحریکِ آزادی

حصولِ آزادی میں ہمارے نہ جانے کتنے ہیرو شہید ہوئے۔ اُن کی قربانیاں تاریخِ آزادی میں سنہرے حرفوں سے لکھی گئیں۔ ہماری فلموں نے عام انسانوں کے لئے ان تاریخوں کی ترجمانی آسان الفاظ میں کرکے اس طرح پیش کیا کہ ہم میں جوش، ولولہ اور راہِ آزادی میں جان دے دینے کی اُمنگ اور قوّت پیدا ہو گئی۔ ہماری فلموں نے چندر شیکھر آزاد، شہیدِ اعظم بھگت سنگھ اور سلطنتِ مغلیہ کی آخری شمع بہادر شاہ ظفر کی داستانِ حیات کو پردے پر پیش کیا ہے اور کر رہی ہیں۔ ہماری فلموں نے ۱۸۵۷ء کے غدر سے ۴۲ء کی آزادی کی تحریک اور ایک ہندوستانی عورت جس کو تاریخ جھانسی کی رانی کے نام سے یاد کرتی ہے، کی اولوالعزم ہمّت کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ہماری فلموں نے ہماری سنہری تاریخ کی ورق گردانی کی اور اس تاریخ کو ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید بنا دیا، کیونکہ اگر کوئی چیز ہمارے بہترین احساسات کو بروئے کار لا سکتی ہے تو وہ تاریخی واقعات کی یاد ہے جس نے ہمیں ایک آزاد قوم بننے کا شرف عطا کیا۔

فلم اور موسیقی

ماضی کے دھندلے عہد میں موسیقی صرف محلوں اور مندروں تک محدود تھی۔ اس پر یا تو مذہبی غلاف چڑھا تھا یا شاہانہ خلعت نے اسے ڈھانپ رکھا تھا۔ صدیوں تک یہ انھیں دو راہوں پر چلتی رہی۔ مندر میں بھجن کے روپ میں رہی اور محلوں میں اس نے غزل کی شکل پسند کی۔ یہ عام انسان کی زندگی سے بہت دور رہتی۔ لیکن فلموں نے اسے عام انسان سے اتنا قریب کر دیا کہ آج ہر امیر و غریب اس کی لذت سے فائدہ اُٹھا رہا ہے، اور اکبر کی سرپرستی نے اگر تان سین پیدا کیا تھا تو عوام نے بھی سہگل اور استاد فیاض علی کے سے موسیقار پیدا کئے۔ فلم نے کلاسیکی موسیقی کو تھوڑا نرم اور ملائم لہجہ دیا اور یہ نیم کلاسیکی موسیقی عوام میں بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ یہ بڑا کارنامہ یقیناً فلم ہی کا ہے کہ اس نے موسیقی اور عوام کے درمیان جو خلیج تھی اُس کو پُر کر دیا۔ اب عوام اور موسیقی کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔

فلم صحافت اور تنقید

ملک میں فلموں سے دلچسپی کے پیشِ نظر تقریباً ایک درجن سے زائد فلمی اخبار و رسالے نکل رہے ہیں۔ اس میں فلم انڈیا، فلم فیئر، فلم کریٹک، فلم میل، فلم آرٹ، اسکرین اور موودی ٹائمز قابلِ ذکر ہیں۔ ان اخبارات و رسائل کی لاتعداد اشاعت نے صحافت میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا جس کا عنوان "فلمی صحافت" ہے۔ یہ اخبارات فلمی دنیا کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات سے عوام کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔

آج فلم سازوں سے اگر یہ مطالبہ کیا جائے تو ناجائز نہ ہوگا کہ وہ ملک کی ترقّی، آزادی کو برقرار رکھنے اور قوم کی اجتماعی و انفرادی زندگی کے سدھار کے لئے کوشش کریں، تاکہ ملک اور قوم کے ساتھ ساتھ عام انسانیت کو بھی تقویت پہونچے اور اس مقصد کے مدنظر ہمارے فلم ساز یہ طے کریں کہ وہ آزادی کے نئے سورج کی روشنی میں فلموں کو ایک ایسا بلند اور کارگر آلہ بنا دیں جو سماج کے امراض کو اچھا کر دے۔ فلم کو صرف پیسہ کمانے کا آلۂ کار نہ بنائیں۔ تفریح پہنچانے کے لئے سماج کی کمزوری سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ ان قدروں کو نہ استعمال کریں جو سماج اور قوم میں کمزوری پیدا کر دیتی ہیں۔ سماج اور قوم کے جذبات سے نہ کھیلیں، کیونکہ جذبات کا بیجا استعمال ذہنوں کو نحیف بنا دیتا ہے۔ زندگی کی اور بھی حقیقتیں ہیں جن میں کشش ہے۔ انسان کا ذہن عورت کے محور پر بہت دنوں تک گھوم چکا، اب اس کو ان حدود سے نکلنے دیں۔ نیم عریاں سینے اور پنڈلیاں چلتے ہوئے ناچ اور گانے اب انسان کے غموں کا مداوا نہیں اور نہ آج کا انسان اس سے خوش ہو سکتا ہے۔ یہ زیادہ بہتر ہے کہ وہ سماج اور سوسائٹی کے ساتھ گناہ نہ کریں، بہ نسبت اس کے کہ وہ گناہ بھی کریں اور اس کی لذّت بھی نہ پا سکیں۔

پنج سالہ پلان

سوالات اور جوابات

(۴)

خوراک اور زراعت

س - یہ کہا جاتا ہے کہ بھارت میں کوئی بھی اہم پلاننگ ہو اس کی ابتدا زراعت سے ہونا چاہیئے - خاص کر ہماری خوراک کی سپلائی میں اضافے کی ضرورت کے پیشِ نظر - کیا پلان میں اس کا خیال رکھا گیا ہے؟

ج - پلان میں بڑا زور زراعت ہی پر دیا گیا ہے - ۲۰۶۹ کروڑ روپے کے مجوزہ اخراجات میں سے ۳۶۱ کروڑ روپیہ زراعت ہی کے لئے وقف کیا گیا ہے - ۱۶۸ کروڑ روپے آب رسانی کے لئے اور ۲۶۶ کروڑ روپے آب رسانی اور بجلی کے کثیر المقاصد پراجیکٹوں کے لئے - اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ آخرالذکر روپے کا نصف آب رسانی کے لئے ہے تو زراعت اور آب رسانی پر براہ راست جو کل روپیہ خرچ ہوگا وہ ۶۶۲ کروڑ روپے ہے یعنی وہ مجموعی اخراجات کا ۳۲ فی صدی -

س - لوگوں کی خوراک کی عادات میں تبدیلی کس طرح سے خوراک کی صورت حال کو بہتر بنا سکتی ہے؟

ج - دنیا میں چاول کی کمی اور اس کی درآمد کے بھاری اخراجات کے پیشِ نظر اگر کسی حد تک اس جگہ کی گندم استعمال کرلی جائے تو خوراک کا مسئلہ کچھ آسان ہو جائے گا -

س - زرعی پیداوار میں اضافہ کس طرح سے کیا جا سکتا ہے؟

ج - اضافہ شدہ آب رسانی سے جو آب رسانی کے چھوٹے اور بڑے طریقوں سے حاصل ہو سکتی ہے - زمین توڑنے سے اور کھاد، کیمیاوی کھاد اور بہتر بیجوں کے استعمال سے

س - کیا ہم بلا امتیاز کاشتکاری کے میکانکی طریقے اختیار کر رہے ہیں جو ہندوستانی حالات کے مطابق نہیں ہیں؟

ج - نہیں - میکانکی طریقوں کے خاص فوائد ہیں اور یہ بعض خاص کاموں کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں - مثلاً بنجر اور خس و خاشاک سے پٹی ہوئی زمینوں کو توڑنے کے لئے اور کم آبادی والے علاقوں میں جہاں مزدوری کی کمی ہے زمینوں کی کاشت کے لئے لیکن اور جگہوں پر یہ کسی بڑی حد تک استعمال نہیں کئے جا رہے ہیں - کیونکہ زمینوں کی اصلاح کے اقدامات کے باعث بڑی بڑی اسٹیٹوں کے کئی حصوں میں تقسیم ہونے کے باعث ان کے لئے سازگار نہیں رہے اور اس وقت تک سازگار نہ ہوں گے جب تک کہ کواپریٹو کاشت انتظام کے یونٹ کو وسیع نہ کر دے -

س - مالیات مارکٹنگ اور بہتر مارکٹنگ کے استعمال کے معاملے میں کسان کی کس طرح مدد کی جا سکتی ہے -

ج - کمیونٹی پراجیکٹ آرگنائزیشن کے علاوہ جو پراجیکٹ کے رقبوں میں کئی طرح سے کسان کی امداد کرے گی - یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ایک قومی توسیعی سروس قائم کی جائے جو سارے ملک میں دس سال کی مدت میں پھیل جائے گی - اس توسیعی سروس کے کارکن کاشتکار کو نہ صرف بہتر تکنیک کے علم سے مسلح کریں گے بلکہ کواپریٹو آرگنائزیشن کی توسیع و ترقی میں اور بحیثیت مجموعی ساری دیہاتی زندگی میں بہتری کے لئے بھی امداد دیں گے -

جہاں تک مالیات کا تعلق ہے ریزرو بنک کواپریٹو تحریک کو زیادہ سے زیادہ امداد دے رہا ہے اور چوٹی کے بینکوں کو جو روپیہ دیا گیا ہے وہ ۱۹۴۶-۴۷ء کے ۱½ کے مقابلے میں ۱۹۵۱-۵۲ء میں ساڑھے بارہ کروڑ تک پہنچ چکا تھا - یہ ارادہ کیا گیا کہ پلان کی مدت کے خاتمے تک ریزرو بنک

گورنمنٹ کے ذرائع اور نیز کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ذرائع کی امداد سے کاشتکاروں کو سو کروڑ روپے سالانہ کے تھوڑی مدت کے قرضے دئے جائیں گے۔

ریزرو بنک بھی درمیانی مدت کے قرضوں کے طور پر پانچ کروڑ روپے تک دینے کے لئے آمادہ ہو گیا ہے اور اسی مقصد کے لئے پلان کے جزو کے طور پر مزید پانچ کروڑ روپے کا گورنمنٹ کی طرف سے انتظام کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح سے کوآپریٹو تحریک کے لمبی مدت کے ذرائع کو بڑھانے کے لئے پانچ کروڑ روپیہ اور دیا جا رہا ہے۔

جہاں تک مارکٹنگ کا تعلق ہے پلاننگ کمیشن کی سفارشات یہ ہیں (۱) کوآپریٹو مارکٹنگ سوسائٹیوں کی ترقی جس میں گوداموں کی آسانیاں ہوں اور جو زرعی پیداوار کا صحیح استعمال کر سکیں۔ (۲) باقاعدہ منڈیوں کا قیام (۳) زرعی پیداوار کی درجہ بندی

س۔ توسیع و ترقی کے پروگرام میں کوآپریٹو تحریک کا کیا حصہ ہے؟

ج۔ ایک تیز رفتار سماجی اور اقتصادی ترقی کے لئے (بالخصوص دیہاتی اقتصادیات میں) کوآپریشن (امداد باہمی) کو بنیادی اصول تسلیم کیا گیا ہے۔ زراعت کے لئے روپیہ مہیا کرنے زرعی پیداوار کو منڈیوں میں لانے، بیج، کھاد اور کاشتکار کی دوسری ضروریات مہیا کرنے اور گاؤں کے کوآپریٹو انتظام کے ذریعے سے زراعت کے عمل کا ڈھانچہ تبدیل کرنے کے لئے پلان کوآپریٹو آرگنائزیشنوں کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ کوآپریشن (امداد باہمی) میں تربیت حاصل کرنے اور کوآپریٹو کاشت کے تجربات کے لئے پچاس لاکھ روپیہ الگ رکھ دیا گیا ہے۔

س۔ کلیدی گاؤں کی اسکیم کیا ہے؟

ج۔ کلیدی گاؤں کی ترکیب بالکل واضح ہے۔ کیونکہ اس دیس میں کلیدی گاؤں کے پاس مویشیوں کی بہتری کی کلید ہے۔ ایک کلیدی گاؤں تین یا چار باہم ملے ہوئے دیہات کا ایک مشترکہ رقبہ ہوتا ہے۔ جس میں تین سال سے زیادہ عمر کی پانچ سو کے قریب گائیں ہوتی ہیں۔ اس کلیدی گاؤں میں نسل افزائی کا کام صرف چند چنے ہوئے بیلوں تک محدود ہوتا ہے۔ یہ بیل اعلیٰ اصل و نسل کے ہوتے ہیں اور باقی تمام بیل دور بھیج جاتے ہیں۔ یا انھیں آختہ کر دیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چار یا پانچ نسلوں میں گاؤں کے تمام مویشیوں کی نسل کی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ مصنوعی تخم ریزی کی تکنیک بھی رائج کی جائے گی تاکہ حفاظت سے پالے جانے والے بیلوں کی تعداد محدود کی جا سکے۔ اصل نسل اور دودھ کی پیداوار کا اندراج رکھا جائے گا اور مناسب خوراک اور بیماری کے روک تھام کے لئے اقدامات کئے جائیں گے

پنج سالہ پلان میں چھ سو کلیدی دیہات ایک سو پچاس مصنوعی تخم ریزی کے مرکز اور بیلوں کی پرورش کے دو سو پچیس فارم قائم کرنے کا اندازہ کیا گیا ہے۔

کیا آپ کو معلوم ہے؟

(۱) بھارت کی گیارہ قومی لیبارٹریوں میں سب سے پہلے کونسی لیبارٹری قائم کی گئی تھی۔

(ا) نیشنل فزیکل لیبارٹری نئی دہلی۔ (ب) سنٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ۔ (ج) نیشنل کیمیکل لیبارٹری پونہ

(۲) پہلے پنج سالہ پلان کی باقیماندہ ڈیڑھ سال کی مدت میں مختلف اسکیموں پر مصارف کی رفتار کیا ہوگی۔

(ا) ڈھائی کروڑ روپے فی یوم۔ (ب) ڈھائی کروڑ روپے فی ہفتہ۔ (ج) ڈھائی کروڑ روپے فی ماہ

(۳) جن مقامات پر پنچایتیں یا یونین قائم نہیں کئے گئے وہاں دیہی ترقی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری کس تنظیم کے سپرد کی گئی ہے۔ (ا) گرام وکاس منڈل۔ (ب) گرام منڈل سمتی۔ (ج) گرام سیوا گرام

جوابات:- (۱) ج۔ (۲) ا۔ (۳) تینوں درست ہیں۔ مدھیہ پردیش۔ اڑیسہ اور مدراس میں علی الترتیب ان تنظیموں کے یہ مختلف نام ہیں۔

رفتارِ زمانہ

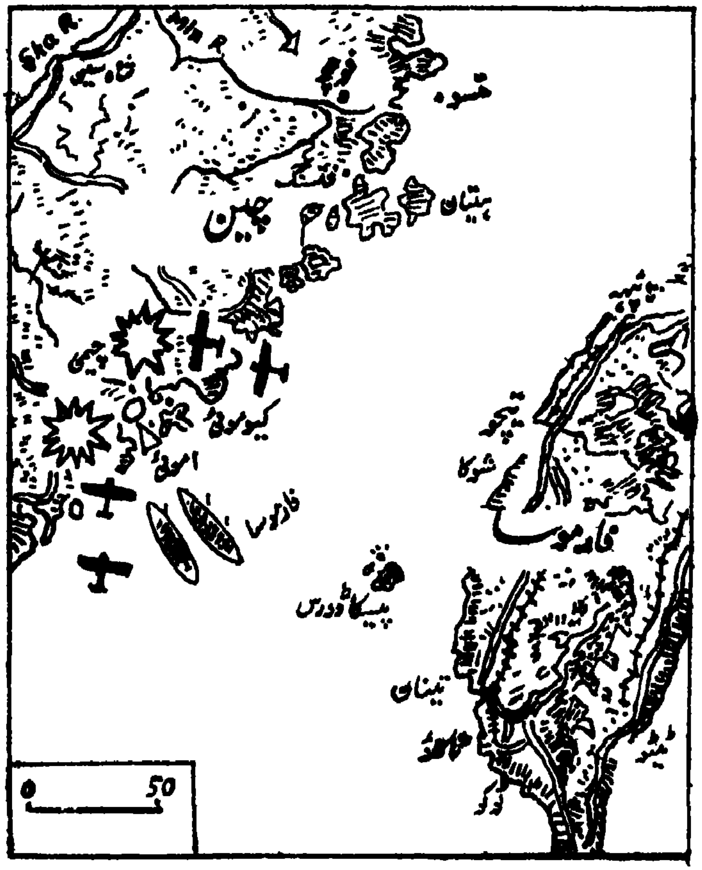
یورپین ڈیفینس

فرانس کی نیشنل اسمبلی نے ای ڈی سی (یورپی دفاعی برادری) کو قطعی طور پر نامنظور کر کے اینگلو امریکی ڈپلومیسی کو بہت بڑی ضرب لگائی ہے۔ اب برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر انتھونی ایڈن ای ڈی سی کا نعم البدل تلاش کرنے میں سرگرمی سے مصروف ہیں۔ فرانس قریب قریب ایک صدی سے جرمنی کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت کا شکار رہا ہے۔ روس اور مغربی یورپ کے درمیان جرمنی ایک حدِ فاصل ہے۔ مغربی یورپ کی طاقتیں اور امریکہ یہ چاہتے ہیں کہ مغربی جرمنی کو ہتھیار بند کر دیا جائے تاکہ کمیونسٹ روس اور مغربی یورپ کے درمیان ایک مسلح طاقت کا کام دے سکے۔ فرانس نے جب ای ڈی سی کی تجاویز کو نامنظور کیا تو مسٹر ڈلس نے یہ اعلان کیا تھا کہ یہ امر نہایت قابلِ افسوس ہے کہ ایک ملک اپنی قومیت کے زیر اثر کمیونسٹوں کی امداد سے اجتماعی دفاع کے منصوبوں کو پنپنے نہ دے۔ مسٹر ایڈن اور مغربی جرمنی کے چانسلر ڈاکٹر ایڈنیاور میں سمجھوتہ ہو گیا ہے دونوں نے ایک مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ انھیں یقین ہو گیا ہے کہ یورپ کے آزاد دیشوں کے اتحاد سے بھی ایسے حالات پیدا کئے جا سکتے ہیں جو مکمل تحفظ اور سلامتی کے ضامن ہوں۔ باخبر حلقوں کے بیان کے مطابق دونوں سیاست دانوں میں جرمنی کی خود مختاری کی بحالی اور اٹلانٹک معاہدے میں جرمنی کی شمولیت پر بات چیت ہوئی اور دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ ان سوالوں کا حل جرمنی اور فرانس کے درمیان مکمل سمجھوتے پر مبنی ہونا چاہئے۔ مسٹر ایڈن نے بلجیم، ہالینڈ لکسمبرگ اور اٹلی کے وزرائے خارجہ سے بھی اس سلسلے میں بات چیت کی ہے۔

فرانس کے وزیر اعظم مسٹر منڈیز فرانس نے یورپ کے ڈیفینس کی ایک اور اسکیم تیار کی ہے۔ مسٹر ایڈن جب پیرس پہنچیں گے تو سنا جاتا ہے مسٹر منڈیز فرانس ان سے اس اسکیم کے متعلق بات چیت کریں گے۔

سیاٹو

جنیوا کانفرنس میں جو معاہدے ہوئے ان سے یہ اُمید بندھ گئی تھی کہ دُنیا اب امن کا سانس لینے کے قابل ہو جائے گی لیکن



مغربی ممالک گٹھ جوڑ اور نوآبادیاتی ذہنیت کو ابھی چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ ۸ ستمبر کو منیلا میں پانچ مغربی اور تین ایشیائی ملکوں نے جس نام نہاد معاہدے پر دستخط کئے ہیں وہ جنوب مشرقی ایشیا میں امن کا ضامن تو کیا ہوگا۔ بدامنی کا علم بردار ہو سکتا ہے۔

چنانچہ مارشل چیانگ کائی شیک نے جزیرۂ کیموائے کے تحفظ کا نعرہ لگا کر چینی ساحل پر گولہ باری شروع کر دی ہے۔ امریکہ نے گو فارموسا کے متعلق کوئی بدیہی اعلان نہیں کیا، لیکن اس کا ساتواں بیڑا اسی جزیرے کے نواح میں محض اسی لئے متعین ہے کہ ضرورت کے وقت کام آسکے یا اور نہیں تو چینی نیشنلسٹوں کے حوصلے ہی بڑھے رہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل کو فارموسا اس معاہدے میں ہی شامل ہو جائے۔ اصل میں سیاٹو مغربی ممالک کا ایک پُر فریب تخیل ہے جس سے وہ اپنے مقبوضات کا تحفظ چاہتے ہیں۔ برطانیہ کو ملایا اور برٹش بورنیو پر قبضہ جمائے رکھنے اور فرانس کو ویٹ نام، لاؤس اور کمبوڈیا میں قدم مضبوط کرنے کی گنجائش اس معاہدے سے ملتی ہے۔ نو آبادیوں کے باشندوں کو حصولِ آزادی کے لئے صرف ایک طاقت سے ہی نہیں بلکہ آٹھ طاقتوں سے عہدہ برآ ہونا ہوگا۔ یہ ہے ایشیائی ممالک کی آزادی کا تحفظ ایشیائی ممالک کے مشورے کے بغیر۔ اس معاہدے سے تو ایشیا کو تقسیم کر دینے اور ایشیائی اقوام کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کر دینے کی گہری سازش دکھائی دیتی ہے۔

سیلاب

آسام، بہار اور اتر پردیش کے مشرقی اضلاع میں سیلاب کی تباہ کاریوں سے نقصانِ عظیم ہوا ہے، اس سال کے نقصانات تو سابقہ سالوں کے نقصانات سے سبقت لے گئے ہیں۔ ۲۵۶۵۰ مربع میل علاقے اور ایک کروڑ آبادی پر ان نقصانات کا اثر ہوا ہے۔ ایک کروڑ ۷۳ لاکھ ایکڑ زمین پر فصل کو نقصان پہنچا ہے۔ اس فصل کی قیمت لگ بھگ چالیس کروڑ روپے ہے۔ ۲۴۷ افراد اور ۷۰۰ جانوروں کی جانیں گئیں۔ بے شمار مکان تباہ و برباد ہو گئے۔ سڑکوں ریلوے لائنوں اور پلوں کو جو نقصان پہنچا ہے اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ حکومت ہند نے اس تباہی و بربادی کے تدارک کے لئے بڑے مؤثر قدم اُٹھائے ہیں۔ پردھان منتری نے لوک سبھا کے ۲۲ ممبروں کے ساتھ سیلاب زدہ علاقے پر اُڑان کی۔ حکومت ہند نے فوری امداد کے لئے تدابیر اختیار کی ہیں اور آئندہ کے لئے اس تباہی سے بچنے کی تدابیر بھی پیشِ نظر ہیں۔

پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے اُتر پردیش، بہار، پچھمی بنگال اور آسام کی ریاستوں کے سیلاب زدہ علاقوں کا دورہ کرنے کے بعد ایک بیان میں کہا ہے کہ اس دورے سے انھیں ان علاقوں کی حالت کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ بہت سے اشخاص ان سیلابوں کے باعث بے گھر اور برباد ہو گئے ہیں۔ انھیں امداد بہم پہنچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

اپنے بیان میں پردھان منتری نے مزید کہا ہے کہ متعدد اشخاص نے مجھے خط لکھے ہیں اور اس سلسلے میں امدادی کام کے لئے ذاتی خدمات پیش کی ہیں۔ لیکن باہر سے لوگوں کے جانے سے اور کئی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے سیلاب زدہ اشخاص کی مدد کا بہترین طریقہ امدادی فنڈ میں چندہ دینا یا کپڑا وغیرہ دے کر مطلوبہ اشیا ارسال کرنا ہے۔

اس سال سیلاب غیر معمولی پیمانے پر آگئے ہیں۔ یورپ اور پچھمی ایشیا کے بعض حصوں میں بھی اس سال سیلاب آئے ہیں۔ لیکن بھارت چین اور بعض دیگر ہمسایہ ملکوں میں اُن کی شدت بہت زیادہ رہی ہے۔ غالباً چین میں سب سے زیادہ شدید سیلاب آئے ہیں۔ بہر حال ہمارا تعلق دریائے گنگا اور برہم پتر کے سیلابوں سے ہے۔ پچھلے سال بھی بہار میں سیلاب آئے تھے، لیکن وہ اس سال کے سیلابوں سے بالکل مختلف تھے۔ پچھلے سال سیلاب کا بڑا سبب مقامی بارشیں تھیں لیکن اس سال خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہ سیلاب ہمالیہ کے پہاڑوں میں زبردست بارشوں کے باعث آئے ہیں، جن کا پانی اچانک گنگا اور برہم پتر کے متعدد معاونوں سے بہتا ہوا میدانوں میں پہنچ جاتا ہے۔

یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سیلابوں کا آنا قدرتی عمل ہے اور بالآخر ان سے فائدہ بھی پہنچتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہار اور آسام وغیرہ ریاستوں کی زرخیز زمین انھیں سیلابوں سے بنی اور یہی سیلاب اسے قوت پہنچاتے رہے۔

بدقسمتی سے ہمیں مقامی مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے، اور لوگوں کو بہت کچھ نقصان بھی ہوا ہے ہمیں نہ صرف سیلاب زدگان کو امداد دینی چاہیئے بلکہ جہاں تک ہو سکے مستقبل میں ایسے واقعات کی روک تھام

بھی کرنی چاہیئے۔ لیکن ہمارا مقصد اس طرح تو حاصل نہیں ہو سکتا کہ ہم قدرت کی قوتوں کے عمل کو ایک دم روک دیں یا دریائی نظام کو مکمل طور پر تبدیل کر دیں۔ اس کے نتائج اچھے نہیں نکل سکتے۔

ان سیلابوں کا ایک ایسا پہلو بھی ہے جو غیر معمولی ہے اور دریائے برہم پتر پر اثر انداز ہوتا ہے۔ چند سال پہلے جو زلزلے آتے تھے ان سے شاید زمین کی سطح ذرا بدل گئی ہے اس طرح اس علاقے کے دریائی نظام پر بھی اثر پڑا ہے جس سے برہم پتر کی تہ میں جھکاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ زلزلوں کی وجہ سے اونچے اونچے پہاڑوں پر سے بہت بڑی مقدار میں مٹی بہ آتی ہو گی اور یہ مٹی طغیانیوں کے مطابق بہہ کر چلی آتی ہے۔ ایک بہت بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ ہمیں اپنی زمینوں کے نشیب و فراز اور ہیئت کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔ اس کا اطلاق نہ صرف آسام پر ہوتا ہے بلکہ بہار، بنگال اور دوسرے علاقوں پر بھی ہوتا ہے۔ پھر ہم نیپال، سکم اور بھوٹان کے دریاؤں کے اونچے خطوں وغیرہ کے سلسلے میں بھی کچھ نہیں جانتے۔

اس سوال کو منظم طور پر حل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مکمل دریائی نظام کے بارے میں بھی ہمیں تھوڑی بہت معلومات ہونی چاہیئے۔

اس لئے بڑی دریائی وادیوں کے لئے دو کمیشن مقرر کرنے کا ارادہ ہے ایک تو دریائے گنگا کے لئے ہو گا اور دوسرا برہم پتر کے لئے اس کے علاوہ ایک مرکزی بورڈ قائم کرنے کی تجویز بھی ہے جو ان دونوں کمیشنوں کے کاموں پر نگرانی رکھے گا۔ یہ کمیشن حال اور ماضی دونوں زمانوں کے بارے میں تمام امکانی معلومات اکٹھا کریں گے۔ اور ان سیلابوں سے متعلق بڑی اسکیمیں بنائیں گے تاکہ آئندہ سیلابوں کی تباہ کاریوں اور نقصان کا انسداد کیا جا سکے۔ اس کے لئے مقابلتاً طویل مدت درکار ہو گی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آئندہ برسات میں جہاں تک ہو سکے بڑا نقصان نہ ہونے پائے یعنی آئندہ آٹھ نو مہینے میں کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔ اس سلسلے میں فوری کارروائی ہو رہی ہے۔

سیلاب اور ملک کی غذائی حالت

وزیر غذا اور زراعت مسٹر رفیع احمد قدوائی نے راجیہ سبھا میں ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ لوک سبھا میں انھوں نے کہا تھا کہ سیلاب سے بہار میں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس سے کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ سیلاب سے کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ اس سال ملک میں جتنا غلہ پیدا ہو گا وہ ملک کی ضرورت سے زیادہ ہو گا۔ انہیں اس خیال سے بالکل اتفاق نہیں کہ ملک کی غذائی حالت سیلاب کی وجہ سے خراب ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر جگن

برٹش گائنا کے سابق وزیر اعظم اور جنگ آزادی کے رہنما ڈاکٹر چھیدی جگن چھ ماہ کی سزائے قید بھگتنے کے بعد رہا ہو گئے ہیں۔

دکن پوربی ایشیائی ڈیلیگیشن

برما، سیلون، انڈونیشیا اور فلپائن کے سرکاری ڈیلیگیشن ان دنوں اجتماعی ترقی کے منصوبوں کا مطالعہ کرنے کے لئے بھارت آئے ہوئے ہیں۔ ان نمائندوں نے نئی دہلی میں اجتماعی ترقی کے منصوبوں کے شعبۂ انتظامیہ کے افسروں سے پہلی بار تبادلۂ خیالات کیا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان ڈیلیگیشنوں کو انجمن اقوام متحدہ کے زیر اہتمام بھارت بھیجا گیا ہے۔ مذکورہ بات چیت کے دوران میں ان ڈیلیگیشنوں کے ارکان نے بھارت میں اجتماعی ترقی کے پروگرام سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ بھارت میں ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں قائم شدہ انتظامیہ مشینری، گھریلو و چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کے خصوصی پروگرام، عوامی تعاون اور ان منصوبوں کی تکمیل کے سلسلے میں مالی ذرائع وغیرہ سے متعلق امور کو زیر بحث لایا گیا۔ اجتماعی ترقی کے منصوبوں کے ایڈمنسٹریٹر مسٹر ایس کے ڈے نے بھارت میں اجتماعی ترقی کے پروگرام پر تبصرہ کرتے ہوئے اس پروگرام سے متعلق اہم امور کی وضاحت کی۔

کشمیر میں ہینڈلوم سلک انڈسٹری

ہینڈلوم سلک انڈسٹری کھڈیوں پر تیار کی جانے والی ملک کی صنعت کو ملکی صنعتوں میں ایک اہم رتبہ حاصل ہے۔ کیونکہ یہ صنعت سینکڑوں بلکہ ہزاروں کاریگروں کے لئے روزگار کا ذریعہ ہے۔ حکومت ہینڈلوم سلک تیار کرنے والے کارخانہ داروں کو مالی امداد دے رہی ہے وہ یوں کہ کشمیر گورنمنٹ سلک فیکٹری میں تیار کیا گیا تار ریشم رعایتی نرخوں پر انھیں مہیا کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے سے حکومت کو تقریباً گیارہ لاکھ روپے کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس نقصان کا متحمل دراصل سلک فیکٹری میں کام کرنے والے مزدوروں کو ہونا پڑتا ہے۔ لیکن حکومت کو ہینڈلوم سلک انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے کاریگروں اور محنت کشوں کا یکساں خیال ہے۔ چنانچہ حکومت اس وقت سالانہ لاکھوں روپے کی مالی امداد دے رہی ہے۔ اس سلسلے میں وزیر ترقیات نے تجویز کیا ہے کہ یہاں کے ہینڈلوم سلک مینوفیکچرس منفعت بخش اقتصادی یونٹ بنائیں۔



بچوں کا آج کل



بھڑ

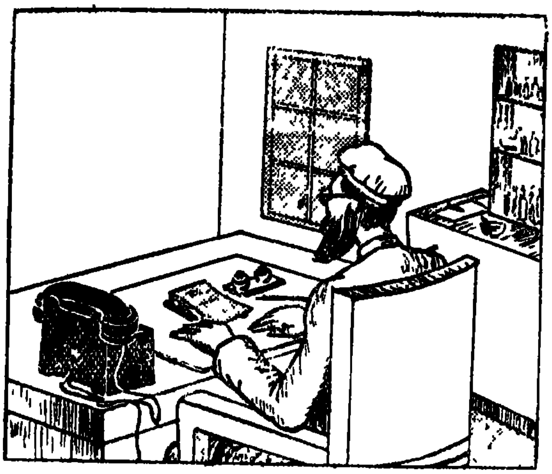
فیض لودھیانوی

شاعروں نے تیتری کی شان میں — کچھ نہ کچھ لکھا ہے ہر دیوان میں
بھڑ سے کوئی جی لگاتا ہی نہیں — اُن کو اس کا رنگ بھاتا ہی نہیں
اس کی فطرت ہے بہادر قوم کی — بزدلوں کو کیوں پسند آنے لگی
ڈنک اس کا تیر سے بھی تیز ہے — جنگ کرنے میں نری چنگیز ہے
اس کے ننھے دل میں وہ جذبات ہیں — جن کے آگے جنگجو بھی مات ہیں
دیکھنے میں مست ہے خاموش ہے — اصل میں باہوش ہے پُرجوش ہے
یہ نہیں ڈرتی کسی ہتھیار سے — توپ سے بندوق سے تلوار سے
بے دھڑک لڑنا اسی کا کام ہے — زُود خطرہ آج اس کا نام ہے
اس کو کچھ پروا نہیں ہے موت کی — جان دے دیگی نہ بھاگے گی کبھی

یہ ذرا سا جانور بے باک ہے — شوخ ہے، ہشیار ہے، چالاک ہے
ہٹ کے پھر بڑھنا اسے مطلوب ہے — وار کرنے کا طریقہ خوب ہے
دربدر غصّے میں آوارہ ہے یہ — بھڑ نہیں بمبار طیّارہ ہے یہ
بے سبب کرنا نہ اس سے چھیڑ چھاڑ — ورنہ یہ حلیہ ابھی دے گی بگاڑ
اس کا سینہ زہر سے بھرپور ہے — اس کا انجیکشن بڑا مشہور ہے
یہ تشدّد کی ہے قائل صاف صاف — اپنے دشمن کو نہیں کرتی مُعاف
صبر ہے اس کے لئے مطلق حرام — جلد لے لیتی ہے اپنا انتقام
آفریں صد آفریں اے بھڑ تجھے — تو سبق دیتی ہے بھڑنے کا مجھے
ڈٹ کے کٹ مرنے سے جس کو عار ہے — فیض اس کی زندگی بے کار ہے

رضوان رضوی

حکیم جوشاندہ



کسی شہر میں ایک حکیم صاحب رہتے تھے۔ نام تو اُن کا کچھ اور تھا لیکن لوگ اُنھیں حکیم جوشاندہ کہہ کر پکارتے تھے اور حکیم صاحب اس حیرت انگیز خطاب سے بہت غصے ہوتے تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ حکیم صاحب ہر بیمار شخص کو تین وقت جوشاندہ پینے کو ضرور بتاتے تھے۔ خواہ کسی کو دق کیوں نہ ہو۔ ملیریا کیوں نہ ہو۔ بخار کیوں نہ ہو یا کھانسی کیوں نہ ہو لیکن وہ جوشاندہ کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ یعنی ہر مرض کی دوا جوشاندہ۔ اور یہی وجہ تھی کہ لوگ اُنھیں حکیم جوشاندہ کہہ کر پکارتے تھے۔

حکیم صاحب کے مطب میں ٹیلیفون بھی تھا۔ وہ ہر وقت ٹیلیفون کے نزدیک بیٹھے حقّہ پیتے رہتے۔ اور جب کہیں سے فون آتا تو ان سے گفتگو بھی کر لیا کرتے تھے۔

ایک دن کی بات ہے کہ وہ ٹیلیفون کے نزدیک بیٹھے حقّہ پی رہے تھے اور دل ہی دل میں کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ کیونکہ صبح سے بارہ بج گئے تھے لیکن ایک مریض بھی نہیں آیا تھا۔ اُنھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سب کے سب مریض انتقال کر گئے ہوں۔ لیکن پھر وہ سوچتے کہ آخر دوسرے لوگ کیوں نہ بیمار پڑ گئے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور حکیم صاحب نے اُچھل کر ریسیور کان سے لگا لیا۔

حکیم صاحب۔ آپ کون صاحب بول رہے ہیں ؟

آواز۔ میں للّن بھائی وصی ہوں۔ لیکن آپ کون ہیں ؟

حکیم صاحب۔ میں حکیم صاحب ہوں۔

آواز۔ اچھا تو سلام علیکم !

حکیم صاحب۔ وعلیکم السّلام۔ کہو کوئی بیمار ہے کیا ؟

آواز۔ نہیں بھئی سب خدا کا فضل ہے۔

حکیم صاحب۔ لاحول بھیجو جی۔ میں نے سمجھا کوئی بیمار ہے تو بُلا آجاؤں۔

آواز۔ غلط سمجھا آپ نے۔ خیر کہئے اچھے تو ہیں آپ ؟

حکیم صاحب۔ (ٹھنڈی آہ بھر کر) ہاں بھئی اچھا ہی ہوں۔

آواز۔ بیگم صاحبہ کیسی ہیں ؟

حکیم صاحب۔ وہ بھی اچھی ہیں۔

آواز۔ وہ آپ کا بڑا لڑکا جھکّی کیا کر رہا ہے ؟

حکیم صاحب۔ آج کل وہ بھاگل پور میں امرود بیچ رہا ہے

آواز۔ اور آپ کا ملازم مجّوا ؟

حکیم صاحب۔ وہ امرود خرید رہا ہے۔

آواز۔ آپ کا چھوٹا بیٹا مدّو کہاں ہے ؟

حکیم صاحب۔ ان دنوں وہ پہلوان مونگ پھلی بیچ رہا ہے

آواز۔ شمیمہ اور نسیمہ کیسی ہیں ؟

حکیم صاحب - اچھّی ہی ہیں ۔

آواز - آپ کا طوطا زندہ ہے نا ؟

حکیم صاحب - اب تک تو خوب مزے میں ہے ۔

آواز - آپ کی شیروانی کا کیا حال ہے ؟

حکیم صاحب - بھئی دو روپے کی شیروانی ہے کوئی معمولی نہیں جو فوراً ردّی ہو جائے ۔

آواز - آپ کی آنکھیں ٹھیک ہیں نا ؟

حکیم صاحب - (چڑھ کر) میری آنکھیں ٹھیک ہیں - میری ناک ٹھیک ہے، میرے کان ٹھیک ہیں - میرے توتے کا حال اچھا ہے - میری نھالی کا حال اچھا ہے لیکن اب میرے جوتے کا حال بگڑا جا رہا ہے ۔

آواز - آپ تو بگڑ گئے حکیم صاحب ۔

حکیم صاحب - بگڑنے کی بات ہی کرتے ہیں آپ - آخر پوچھنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ۔

آواز - اچھا تو ذرا جوشاندہ کی خیریت تو کہئے ۔

حکیم صاحب - (غصّے سے) تیرا باپ پئے گا جوشاندہ - تیری ماں پئے گی جوشاندہ - تو مرے گا، تو اندھا ہو جائے گا ۔

(اور حکیم صاحب غصّے سے رسیور رکھ دیتے ہیں لیکن پھر فوراً ہی گھنٹی بجتی ہے)

گھنٹی کی آواز - ٹرن، ٹرن، ٹرن، ٹرن

حکیم صاحب - (رسیور کان میں لگا کر) رونگ نمبر

آواز - جی نہیں میں آپ ہی سے کہہ رہا ہوں ۔

حکیم صاحب - (چڑ کر) آپ بھی عجیب آدمی ہیں - میں کہہ رہا ہوں یہ جوتے کی دوکان نہیں ہے ۔

آواز - معاف کیجئے گا مجھ سے غلطی ہو گئی ۔

(حکیم صاحب رسیور رکھ دیتے ہیں اور پھر حقّہ پینے لگ جاتے ہیں - اتنے میں پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے - اور وہ غصّے سے رسیور اُٹھا کر کان میں لگا لیتے ہیں)

آواز - فور، نائن، ٹو، تھری، وَن

حکیم صاحب - جی ہاں یہ فور، نائن، ٹو، تھری، ون ہے کہئے کیا بات ہے ۔

آواز - چٹ چٹ چٹاک چٹاک ٹم ٹم اینڈ کو ۔

حکیم صاحب - معاف کیجئے گا یہ ٹم ٹم کمپنی نہیں ہے ۔

آواز - اوہو! آپ تو غلط سمجھے حکیم صاحب - یہ کسی کمپنی کا نام نہیں ہے اور نہ کسی مرض کا نام ہے بلکہ یہ میرا اپنا نام ہے ۔



حکیم صاحب - (سنجیدگی سے) بھئی نام تو بہت شاندار ہے میرا خیال ہے کہ آپ کے باپ کا نام پٹ پٹ پٹاک پٹاک ڈم ڈم اینڈ کو ہوگا ہے نا ؟

آواز - بالکل درست فرمایا آپ نے - میرے باپ کا نام آپ کو

کیسے معلوم ہو گیا ۔ میرا خیال ہے کہ آپ حکیمی کے علاوہ جادو بھی جانتے ہیں جب ہی تو آپ میرے باپ کا نام جان گئے ۔ ورنہ کوئی بھی ماں کا لال میرے باپ کا نام نہیں بتا سکتا ہے

حکیم صاحب ۔ جی ہاں میں کوئی معمولی حکیم نہیں ہوں جناب ۔

آواز ۔ اچھا تو بات دراصل یہ ہے حکیم صاحب کہ میری بیوی سخت بیمار ہے ۔

حکیم صاحب ۔ (خوش ہو کر) آہا کہئے کہئے کون سا مرض ہے انھیں

آواز ۔ مرض بس یہی ہے کہ یہ کھانا بھی کھاتی ہے اور پانی بھی پیتی ہے لیکن میں چاہتا ہوں یہ صرف کھانا کھائے یا صرف پانی پیئے ۔

حکیم صاحب ۔ (مایوس ہو کر) بھئی اس مرض کا میرے پاس کوئی علاج نہیں اور نہ میرے کوئی رشتے دار اس مرض کا علاج کر سکتے ہیں ۔

آواز ۔ تو اب آپ ہی بتائیے کہ میں کس کے پاس جاؤں ؟

حکیم صاحب ۔ حکیم رحیم علی کے پاس جاؤ ۔

آواز ۔ وہ تو آپ کے بھتیجے ہیں ۔

حکیم صاحب ۔ حکیم وزیر علی کے پاس جاؤ ۔

آواز ۔ وہ تو آپ کے چچا ہوتے ہیں ۔

حکیم صاحب ۔ حکیم کریم بخش کے ہاں جاؤ ۔

آواز ۔ وہ تو آپ کے نانا کے بیٹے ہیں یعنی آپ کے ماموں ہیں

حکیم صاحب ۔ تو پھر میں کس کے ہاں بتاؤں

آواز ۔ جس کے ہاں بتائیے ۔

حکیم صاحب ۔ ایک کام کرو ۔ حکیم نصیر کے ہاں چلے جاؤ ۔

آواز ۔ وہ تو آپ کے سمدھی ہیں ۔

حکیم صاحب ۔ حکیم نور حسن صاحب کے پاس چلے جاؤ

آواز ۔ وہ تو آپ کے بھائی کے نانا ہوتے ہیں ۔

حکیم صاحب ۔ (چڑ کر) تو پھر جہنم میں چلے جاؤ ۔

آواز ۔ وہاں تو آپ کے والد بزرگوار موجود ہیں ۔ وہ میری دال کب گلنے دیں گے ۔

حکیم صاحب ۔ تم کمینے ہو، مردود ہو، بیہودے ہو ۔

آواز ۔ اچھا تو ذرا جوشاندہ کی ترکیب تو بتا دیجئے ۔

حکیم صاحب ۔ (غصے سے سرخ ہو کر) حرامزادے ۔ کمینے بدتمیز، نالائق ۔ پاجی ۔ فتنو کے بچے

آواز ۔ (زور سے) حکیم جوشاندہ

حکیم صاحب ۔ تیرا باپ پئے گا جوشاندہ ۔ تیری ماں پئے گی جوشاندہ

(اور حکیم صاحب ریسیور پٹخ دیتے ہیں اور بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل جاتے ہیں ۔

سید ہدایت احمد ہمدانوی

لطیفے

ایک بار کسی مالک نے اپنے نوکر سے نمک مانگا ۔ وہ ہاتھ پر رکھ کر لے گیا ۔ مالک نے غصے میں آکر فرمایا کہ آئندہ جو چیزیں ہم مانگا کریں ۔ رکابی میں رکھ کر لایا کرو ۔ دوسرے روز مالک نے اپنے خدمتگار سے جوتا طلب کیا ۔ تو وہ رکابی میں رکھ کر لے آیا تمام محفل ہنس پڑی ۔

بیوی ۔ میاں میں حیران ہوں ۔ یہ خالی بوتلیں کہاں سے آ گئی ہیں ۔

شرابی خاوند ۔ مجھے بھی معلوم نہیں ۔ میں کبھی اپنی زندگی میں خالی بوتل نہیں لایا ۔

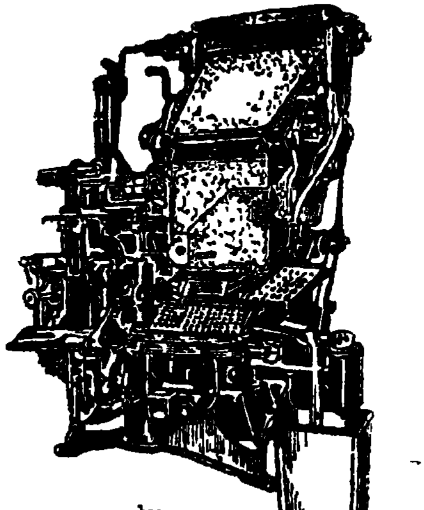
مسافر ملتانی

چھاپے خانے کی ایجاد

بچو! آج ہم تمھیں یہ بتائیں گے کہ کتابیں کس طرح چھاپی جاتی ہیں. چھاپہ خانہ کب ایجاد ہوا اور اسے کس نے ایجاد کیا!

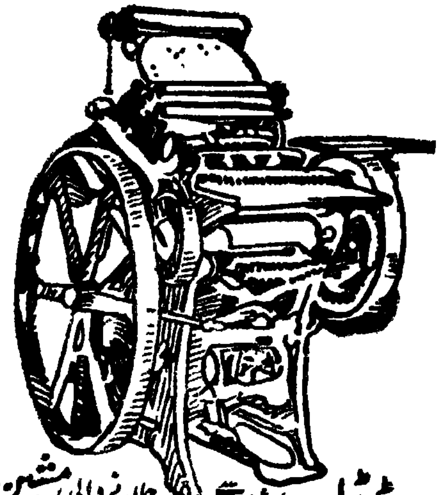
جب تک چھاپنے کی مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی، کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ اس طرح سے کتاب لکھنے میں زیادہ مُدت لگ جاتی تھی، اور محنت بھی زیادہ کرنا پڑتی تھی۔ اسی وجہ سے ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں بہت مہنگی پڑتی تھیں، اور صرف دولت مند ہی اس سے فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ لیکن جب سے چھاپنے کی مشین ایجاد ہوئی ہے، کتابیں زیادہ ملنی شروع ہوگئی ہیں۔ اور اب دولت مند اور غریب سب انھیں خرید سکتے ہیں۔ پڑھنا لکھنا اور تعلیم حاصل کرنا اب پہلے سے بہت آسان ہوگیا ہے۔ اور کتابیں چھاپنے میں نہ تو زیادہ مُدت صرف ہوتی ہے اور نہ ہی زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔

انگلینڈ میں سب سے پہلے کتابیں چھاپنے کا خیال "ولیم کیکسٹن" نام کے ایک انگریز کے دماغ میں آیا۔ اُس نے اس فن کو فرانس میں سیکھا تھا۔ انگریزی زبان کی سب سے پہلی کتاب فرانس ہی میں چھپی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ آرٹ امریکہ اور دوسرے ممالک میں پھیل گیا۔ چھاپنے کے لئے سیسے کے حرف ڈھالے جاتے ہیں، اور ان حرفوں کو جوڑ کر بڑے سے بڑا فقرہ بنا لیا جاتا ہے۔ ہر ایک صفحے کے الگ الگ سانچے بنا کر چیس میں کَس لیتے ہیں۔ اور چیس کو مشین پر چڑھا لیا جاتا ہے۔ سریش کے رُولر اوپر نیچے گھوم کر حرفوں پر سیاہی لگاتے رہتے ہیں مشین کے دوسرے حصّے میں کاغذ لگایا جاتا ہے۔ کاغذ والا حصّہ آگے پیچھے ہو کر حرفوں پر لگتا رہتا ہے۔ ساتھ ہی چھپے ہوئے کاغذ کو نکال لیا جاتا ہے، اور نیا کاغذ لگا لیا جاتا ہے۔



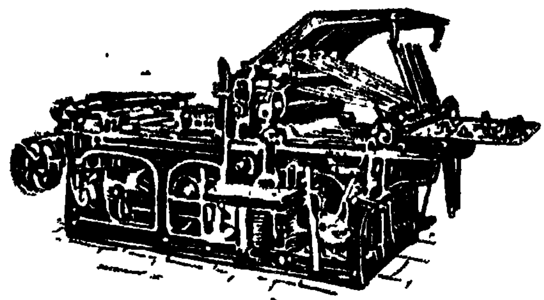
لینو ٹائپ مشین

بہت دِنوں تک حرف جوڑنے کا کام ہاتھوں ہی سے کیا جاتا رہا۔ اس طرح سے کتابیں چھاپنے میں بہت وقت صرف ہوتا تھا۔ ہاتھ سے حرف جوڑنے میں بہت زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔ کچھ مُدت بعد "لینوٹائپ" نام کی مشین ایجاد ہوئی۔ لینو کے حرفوں کو ہاتھ سے نہیں لگایا جاتا۔ حرف مشین پر ٹائپ کئے جاتے ہیں، اور وہ اپنے آپ ڈھلتے جاتے ہیں۔



ٹریڈل (پاؤں سے چلانے والی) مشین

ہندوستان میں چھاپنے کی مشین انگریزوں کے ساتھ آئی۔ اسی زمانے سے کتابیں چھاپنے کا کام شروع ہوا۔ ہندی اور انگریزی کتابیں چھاپنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ انگریزی حرفوں ہی کی طرح ہندی کے بھی سیسے کے حرف ہوتے ہیں۔ لیکن اردو کی کتابیں چھاپنے کا طریقہ ان سے مختلف ہے۔ کتاب کو پہلے ایک خاص قسم کے کاغذ پر ہاتھ سے لکھا جاتا ہے۔ پھر اس کو جست



لیتھو مشین

کی پلیٹ پر مشین سے اُتار لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اُس پلیٹ سے ہزاروں کی تعداد میں کتابیں چھاپی جاسکتی ہیں۔

اُردو کی چھپائی کرنے والی مشین کو لیتھو مشین کہتے ہیں لیتھو مشین کی ایجاد سے قبل دستی پریس ہوتے تھے جنھیں ہاتھ سے چلایا جاتا تھا، اور پلیٹوں کے عوض پتھروں پر چھپائی ہوتی تھی۔ اس میں چھاپنے کی رفتار مشین کی نسبت بہت کم تھی۔

اس کے علاوہ اُردو میں چھاپنے کی ایک نئی طرز کی مشین ایجاد کی گئی ہے۔ اُسے آفسیٹ کہتے ہیں۔ آفسیٹ مشین پر چھپائی لیتھو مشین سے بہت اچھی اور صاف ہوتی ہے۔ لیکن اُس میں چھپوانے سے زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ اُردو میں انگریزی اور ہندی کی طرح ٹائپ میں بھی چھپائی ہوتی ہے۔ مگر ابھی تک یہ رواج ہندوستان میں زیادہ نہیں بڑھا۔

چھاپنے کی مشینیں چھوٹی بڑی کئی سائز کی ہوتی ہیں۔ بڑی مشین پر بڑے اور چھوٹی مشین پر چھوٹے کاغذ چھاپے جاتے ہیں۔ کتابیں بڑی مشین ہی پر چھپتی ہیں۔ اسے سلنڈر مشین کہتے ہیں۔ اخباروں کی چھپائی کے لئے لینو مشین بہتر ہے ہندوستان میں لینو مشین کا رواج اب بڑھتا جا رہا ہے۔ اس مشین کی بدولت، پہلے جو کام ہاتھ سے کئے جاتے تھے اور جن پر زیادہ وقت صرف ہوتا تھا، اب چند لمحوں میں ہی پورے ہوجاتے ہیں۔ اس مشین کا کمال یہ ہے کہ پورے اخبار چھاپنے کے علاوہ پیکٹ بنانا، ٹکٹ لگانا اور اُن پر لیبل چسپاں کرنے کا کام بھی خود ہی کرتی ہے۔

رنگین چھپائی کے لئے وکٹوریہ مشین بہتر ہے۔ جس سائز کی مشین ہوتی ہے اُس پر اُسی سائز کا کاغذ چھپتا ہے۔ چھوٹی مشین رسید بک، بل بُک، ہینڈبل، شادیوں کے کارڈ، لیٹر فارم اور لیبل وغیرہ چھاپنے کے کام میں لائی جاتی ہیں۔

چھاپنے کی مشین کی ایجاد ہونے سے کتابیں سستی ہوگئی ہیں، اور غریب اور دولت مند اس سے برابر فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔ اس ایجاد سے جہاں اور بہت سے فائدے ہمیں حاصل ہوئے ہیں وہاں ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ اس پر اخبارات چھپتے ہیں جن سے ہمیں تمام دنیا کے حالات کا جلد علم ہوجاتا ہے۔

یوگ راج تھانی

کنجوسی کا نتیجہ

بہت پُرانی بات ہے کہ کسی شہر میں ایک آدمی رہتا تھا، جو بہت کنجوس تھا۔ لوگ اُسے راموکنجوس کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ کنجوس کا لفظ سُن کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔ جب لوگ اُس سے پُوچھتے تھے کہ کیوں بھائی تو اتنا کنجوس کیوں ہے، تو وہ جواب دیتا تھا "دوست! پیسہ بڑی مشکل سے کمایا جاتا ہے کیوں نہ اسے زیادہ سے زیادہ اکٹھا کیا جائے۔"

ایک دن اس کی بیوی نے اُسے ایک ناریل لانے کو کہا۔ وہ بے چارہ بیوی کے حکم کو پُورا کرنے کے لئے بازار کو چل پڑا۔ بازار میں اُس نے دوکان دار سے پوچھا: "کیوں بھائی یہ ناریل کتنے کا ہے؟" دوکان دار نے جواب دیا: "دو آنے کا۔" راموکنجوس نے کہا "چھ پیسے لے لو۔" دوکان دار نے کہا "چھ پیسے کا تو ہمیں منڈی سے ملتا ہے۔" رامو نے کہا "اچھا تو پھر میں منڈی سے ہی لے لوں گا۔" منڈی میں جا کر رامو نے ناریل مانگا، وہاں کے دوکان دار نے ناریل دے دیا اور اس سے چھ پیسے مانگے۔ رامو کے دل میں لالچ بڑھتا گیا، اُس نے کہا "میں بڑی دُور سے چل کر آیا ہوں، ایک آنہ لے لو۔" منڈی کے دوکان دار نے جواب دیا: "ایک آنے میں تو ہم باغ سے لاتے ہیں، ہم ایک آنے میں آپ کو کیسے دے سکتے ہیں؟"

رامو نے دل میں سوچا "میں کیوں نہ تھوڑی دُور چل کر مالی سے ایک آنے ہی میں لے لوں۔" رامو باغ میں چلا گیا، ——

اُس نے مالی سے پوچھا: "بھائی ایک ناریل کے کتنے پیسے لوگے؟"

مالی نے جواب دیا "ایک آنہ۔"

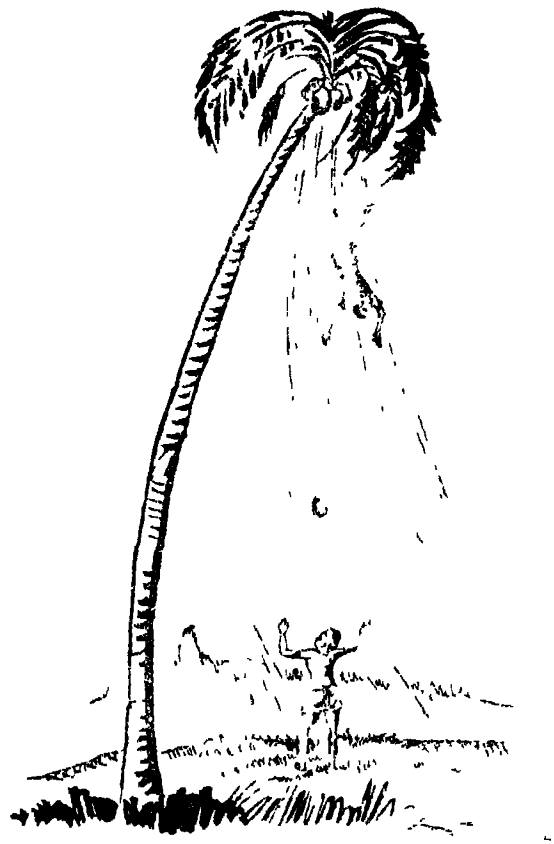
رامو نے کہا: "دو پیسے لوگے؟"

مالی نے جواب دیا: "ہم اتنی محنت کرتے ہیں۔ درخت کے اوپر چڑھتے ہیں، اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہیں تو پھر ہم کہیں جا کر دو پیسے کماتے ہیں۔ اگر تم خود اس درخت پر چڑھو، اور ایک ناریل اُتار لاؤ تو مجھے دو پیسے ہی ادا کر دینا۔" رامو کنجوس نے دو پیسے بچانے کے لئے یہ شرط منظور کر لی، اور درخت پر چڑھنے لگا۔

بچو! تم جانتے ہو کہ ناریل کا درخت اتنا اونچا ہوتا ہے کہ اس پر چڑھنا ناممکن تو نہیں، لیکن مشکل ضرور ہے۔

پس وہی ہوا جو ہونا تھا۔ رامو کو درخت پر چڑھنے کی مشق بالکل نہیں تھی۔ پھر بھی ہمت کر کے وہ اوپر چڑھ ہی گیا، اور ناریل کو توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ عین اُسی وقت بیچارے کا پیر پھسلا۔ اور دھڑام سے نیچے آگرا۔ گرتے ہی بے چارہ بیہوش ہو گیا۔ باغ کے مالیوں نے اُسے اٹھا کر ہسپتال میں پہنچا دیا۔

جب یہ خبر اُس کی بیوی کو ملی تو وہ بیچاری روتی چلاتی ہسپتال میں آپہنچی۔ جب وہ کچھ ہوش میں آیا تو ڈاکٹر نے اُس سے زخمی ہونے کا سبب پوچھا، اس نے ساری بات



سچ سچ بتا دی ۔

اس کے بعد وہ خود اپنی کنجوسی پر پچھتانے لگا ، اور اس نے من میں پکّا ارادہ کرلیا کہ آج سے میں کنجوسی جیسی بُری عادت کو چھوڑ دوں گا ۔

(بال بھارتی)

لطیفہ

ڈاکٹر ۔ یہ لو ایک ٹکیہ سر کے درد کے لئے اور ایک پیٹ کے درد کے لئے ۔

مریض ۔ جناب ! مگر یہ ٹکیاں جب حلق سے نیچے جائیں گی تو انھیں یہ کیسے معلوم ہوگا کہ کس ٹکیہ کو کدھر جانا ہے ۔ (احمد جمال پاشا)

سوم ناتھ سادھو

پانچ دوست

پُرانے زمانے کی بات ہے کہ ایک بار گھنے جنگل میں ایک بہرا، ایک لنگڑا ، ایک اندھا ، ایک بھکاری اور ایک لُولا چلے جا رہے تھے ۔ یہ جنگل چوروں کے لئے مشہور تھا ۔ رات کا وقت تھا ، پانچوں دوست جنگل کے عین وسط سے گزر رہے تھے کہ پتّوں کے ہلنے کی آواز زور زور سے آنے لگی ۔ پانچوں دوست سہم کر کھڑے ہو گئے ۔

بہرے نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا " آواز ایسی آ رہی ہے جیسے چور تیزی کے ساتھ ہماری طرف چلے آ رہے ہوں ۔

اندھے نے ذرا دھیمی آواز سے کہا " دکھائی تو ایسا ہی دیتا ہے "

لنگڑے نے کہا " ہمیں جلدی بھاگنا چاہیئے "

لُولے نے کہا " گھبرانے کی کیا بات ہے ، میں اُن کو مار مار کر بھگا دوں گا "

لیکن بھکاری جو بہت ڈرا ہوا تھا ، اور جس کو حلق سے ایک لفظ نکالنا مشکل ہو رہا تھا ، یک لخت چلّایا " یارو تم سب باتوں ہی باتوں میں مجھے لُٹوا دوگے "

لطیفہ

اُمیدوار ۔ جناب ! میں شراب نہیں پیتا ، میں تمباکو نہیں پیتا ، میں یہ بھی نہیں جانتا کہ جُوا کیا ہے ۔

افسر ۔ تو کیا تم میں کوئی عیب نہیں ہے ؟

اُمیدوار ۔ جناب صرف ایک ، میں ہمیشہ جھُوٹ بولتا ہوں ۔

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر: —— جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: —— بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۳ —— نمبر ۵

سالانہ چندہ: —— ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک —— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ: —— ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

دسمبر ۱۹۵۴ء

ترتیب

بچوں کا آج کل

سرورق:- ونو با بھاوے

پبلیکیشنز ڈویژن، پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

فضا ابن فیضی

عشق

عشق کیا! التہاب فطرت کا
باب ہے یا کتابِ رحمت کا

عشق اک آرزوئے غم اندوز
کعبۂ خستگی، مدینۂ سوز

عشق کانٹوں کی اک حسین جنت
نعمتِ یاس، رونقِ وحشت

عشق خرمن پہ بجلیوں کا نزول
خوبصورت گناہ، دل کش بھول

عشق تیروں کا گیت کانٹوں کا راگ
جو بھڑکتی ہے آنسوؤں سے وہ آگ

عشق کیفیتِ بلا کا شعور
سینۂ کائنات کا ناسور

عشق کفرِ شرابِ بولہبی
آہِ صبح و فغانِ نیم شبی

عشق آہوں کا سایہ نالوں کی دھوپ
عشق آندھی کی چال، آگ کا روپ

عشق شعلہ طراز، شعلہ جگر
برق کا آشیانہ، گنجِ شرر

عشق گرمیٔ نالہ، سوزشِ یاس
اک سلگتی سی چوٹ دل کے پاس

عشق مضمونِ مرگ کی تمہید
نشترِ یاد، ناوکِ امید

عشق تیزیٔ تیشۂ فرہاد
عشق ہے پرنیانِ سنگِ نہاد

عشق دوزخ بہ دامنِ فردوس
آگ باطن میں ہے بظاہر اوس

عشق ناکام آرزو کا کمال
ہجر کے پیرہن میں بوئے وصال

عشق اک آرزو ہے نکھرنے کی
زندگی ہی میں مشق مرنے کی

عشق تلوار کا چمکتا پھل
زندگی کی جبیں پہ موت کا بل

عشق کا ہر معاملہ دو ٹوک
دعوتِ مرگ ہے ذرا سی چوک

عشق ماتم کا نخل، زخم کا پھول
کھا گئے چوٹ کتنے خضر و رسول

عشق زنار و سبحہ سے آزاد
برہمن زاد ہے نہ کعبہ نژاد

عشق اندازہ دانِ عزمِ حسین
عشق سازِ سرودِ شیون و شین

عشق آیاتِ غم کی شانِ نزول
کاوشوں کا خدا، خلش کا رسول

عشق کرتا ہے دو جہاں کا طواف
اس کو انساں کا خون تک ہے معاف

عشق کی بیڑیوں میں سب ہیں اسیر
کیا قدح خوار کیا ہمیسہ دبیر

عشق ویرانۂ بہشت سواد
نغمگی میں رچی ہوئی فریاد

عشق ہے سرخ ہونٹ کی سوگند
ایک فردوسِ آتشیں پیوند

عشق ابرو کی چوٹ دل کا گھاؤ
ہو جو ممکن تو یہ فریب نہ کھاؤ

عشق بستی ہے غم کے ماروں کی
انجمن خوں شدہ ستاروں کی

عشق آہِ سحر گہی کی فصیل
گوہریں آنسوؤں کی "موتی جھیل"

عشق رشحاتِ ابرِ آتش جام
وِرد کا اپنے حافظ و خیام

عشق اور خاکدانِ آب و گل!
عشق بیدار و لامکاں منزل

عشق امید و بیم کی تحریک
ہیں دھندلکے بھی روشنی کے شریک

عشق کا پا سکا ہے کوئی بھید؟
اک طرف رات اک طرف خورشید

عشق کانٹا بھی اور پھول بھی ہے
عشق پانی بھی اور دھول بھی ہے

عشق آذر بھی ہے خلیل بھی ہے
عشق کافر بھی جبرئیل بھی ہے

عشق شیون بھی ہے سرود بھی ہے
روشنی بھی ہے موجِ دود بھی ہے

عشق ناخوش بھی ہے سہانا بھی
عشق افسوں بھی ہے فسانا بھی

عشق آئینہ عشق سنگ بھی ہے
عشق صیقل ہے عشق زنگ بھی ہے

عشق نوحہ بھی ہے نشید بھی ہے
یہ محرم بھی ماہِ عید بھی ہے

عشق اک نشۂ حسن ساغرِ جم
کھا گئی مات مہر سے شبنم

عشق ہے مغز اور حسن ہے پوست
یہ کسی سے مگر نہ کہنا دوست!

مایۂ روحِ کائنات ہے عشق
حاصلِ رونقِ حیات ہے عشق

گوپی چند نارنگ

اُردو غزل اور ہندوستانیت

(۲)

ہندوستانی تہذیب میں فلسفۂ زندگی کو سمجھنے کے لئے حیاتِ انسانی کو ایک قوس سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس قوس میں دو قسم کی گردشیں ہیں۔ ایک بیرونی، ایک اندرونی۔ بیرونی گردش کو پرورتی مارگ کہتے ہیں یہ راہِ خواہشات Path of Pursuit ہے۔ اس کی خصوصیت خودی کی تعمیر Self Assertion ہے۔ دوسرا راستہ نورتی مارگ یا راہِ نجات کہا جاتا ہے۔ اس کی خصوصیت شخصی انا کا مٹا دینا ہے۔ بیرونی گردش پر چلنے والے انسان نظریۂ لامکان، نرگن و دیا میں یقین رکھنے والے سمجھے جاتے ہیں۔

ہندوستانی زندگی کو مجموعی طور پر لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک عجیب تضاد کا مجموعہ ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں جہاں ہر مزاج اور ہر رنگ کے انسان بستے ہیں۔ مذہبی عقائد کا لچک دار ہونا لازمی تھا۔ یہاں حقیقت کے ساتھ مجاز، قوتِ روح کے ساتھ حظِ نفس اور بلندی کے ساتھ پستی کے لئے گنجائش نکالے بغیر چارہ نہ تھا۔ اس لئے اس تضاد کو ودیا اور اودیا (معرفت اور غفلت) کے ناموں سے تعبیر کر کے اس کے تین حصے کر دئے گئے۔ ساتوک، راجسک اور تمس۔ پرورتی مارگ (راہِ خواہشات) پہ چلنے والوں کی تشنگی کا کوئی انجام نہیں۔

ہندوستانی تہذیب خواہشات کے راستے پر چلنے والوں کو برا بھلا کہنے میں احتیاط سے کام لیتی ہے۔ وہ گنہ گار نہیں ہیں۔ غافل ہیں، کیونکہ جس نے تمنا و نشاط میں خود کو گم کر کے نہیں دیکھا۔ وہ خود کو کیسے خودی کے حوالے کیسے کر سکے گا۔ تمنا و آرزو گناہ نہیں ہے بلکہ تقاضائے شباب ہے اور شباب کی تشنگی کو روک لینا دانش مندی نہیں ہے، کیونکہ

Desires Suppressed Breed Pestilence

یہی وجہ ہے کہ کڑے اور سخت مذہبی عقاید میں بھی اتنی لچک پیدا کر دی گئی تاکہ ان میں ہر رنگ کے انسان کے لئے گنجائش نکل سکے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی تہذیب معرفتِ حق کی پرزور تائید کرتی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو جو دنیاوی عیش و نشاط کے متمنی ہیں اپنی خواہشات کے پورا کرنے سے ہرگز نہیں روکتی۔ کیونکہ دنیاوی حسن اور آسائشوں سے لطف اندوز ہونا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ ہندوستانی نظریے کے مطابق وہی لوگ نفسانی خواہشات سے بلند ہو سکتے ہیں جو دنیاوی عیش و نشاط سے پورا پورا حظ اٹھا چکے ہیں۔

معرفت یا سلوک کی منزل تک پہنچنے کے لئے ادنیٰ سے اعلیٰ کئی مدارج طے کرنا پڑتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ تارک الدنیا ہو جانے سے پہلے مہاتما بدھ دنیاوی اور انسانی خوشیوں سے پورا پورا لطف اندوز ہو چکا تھا۔

مہا بھارت میں اخلاقی اور مذہبی حکایتوں کے ساتھ ساتھ رس اور رنگ کے ایسے ایسے عناصر بھی موجود ہیں جنھوں نے ڈانٹے کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ "مہا بھارت چرچ بھی ہے اور پبلک ہاؤس بھی"[۱]

La Chiesa e La Taverna

قدیم سنسکرت شاعروں کے یہاں بھی جو جذبۂ عشق ملتا ہے وہ اتنا اسمانی نہیں جتنا کہ جنسی[۲] ہے۔ ادب میں روحانی عظمت پیدا کرنا ہر شاعر یا ادیب کا کام نہیں ہوتا۔ یہ ایک فطری ملکہ ہے جس کا اکتساب کسی کوشش سے نہیں آتا۔ سنسکرت ادب کی روحانی عظمت سے انکار کرنا کفر ہے۔ لیکن سارا کا سارا سنسکرت ادب بھی روحانیت سے لبریز نہیں سمجھنا چاہیئے، اور ایسا کہنا

The Dance of Shiva—P. 20

۱؎ Meaning of Art : Rabindra Nath Tagore P-8

۲؎ Meghaduta : M. R. Kale P-2

حقیقت سے اتنا ہی بعید ہوگا جتنا اردو غزل کے داخلی پہلو کو سامنے رکھ کر اُسے تصوّراتی یا خیالی قرار دینا۔

غزل کے شاعر بھی اسی عالمِ رنگ و بُو کے انسان ہیں۔ ان کے کلام سے بحث کرتے وقت ان کی بشریت سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا ——— وہ بھی ہماری طرح اسی خاکدانِ دنیا کے باشندے ہیں۔ وہ غلط کار بھی ہو سکتے ہیں اور گنہ گار بھی۔ وہ آسمان سے اُترے ہوئے فرشتے نہیں بلکہ اس جہانِ آرزو کے پروردہ ہیں۔ وہ انسانی محبوب کے شیدائی بھی ہیں اور دنیاوی عیش و طرب کے تمنائی بھی، کیونکہ وہ سب کے سب تارک الدنیا نہیں ہیں۔

اردو کے تمام غزل گو شاعروں کی طویل فہرست کو اگر سرسری طور پہ ایک نظر دیکھ لیا جائے تو یہ معلوم کرتے دیر نہیں لگتی کہ ان میں سے کتنے رندِ شاہد باز تھے، اور کتنے صاحبِ حال صوفی یا کتنے ایسے تھے جو کچھ بھی نہ تھے محض انسان تھے یا پھر شاعر۔ اردو غزل کے تہذیبی ماحول کے بیان میں اوپر یہ ذکر آ چکا ہے کہ اردو غزل نے جب آنکھ کھولی تو ہندوستانی تہذیب میں تصوّف اور بھگتی شائستگی کا معیار بن چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ہر غزل گو نے اس موضوع کو اپنایا۔ اس میں شک نہیں کہ کورانہ تقلید کی وجہ سے اردو غزل میں بے جان قسم کی تصوّریت کا کافی غلبہ رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں زندگی کی علامتیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ غزل تصوّف کی بوسیدہ خانقاہ میں مقید ضرور رہی ہے لیکن اس کی زندگی میں ایسے مواقع بھی تلاش کئے جا سکیں گے جہاں جلوۂ حق کی تاثیرِ جذب نے اُسے روحانیت کی بلندیوں تک اُٹھا لیا ہے، اور یا اس کے برعکس جہاں گوشت پوست کے محبوبِ توبہ شکن کی کشش اسے کوچہ و چمن کی وسعتوں میں دیوانہ وار لئے پھری ہے۔ ان سب حقائق کا جائزہ لینے کے بعد کہا جا سکتا ہے۔ اردو غزل خالص مینی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ اردو غزل میں جہاں نورتی مارگ پر چلنے والے شاعر ہیں وہاں پر ورتی کے راستے کے راہبر بھی ہیں ۔ وہ سب کے سب پیرانِ خرقہ پوش نہیں اور نہ اولیا، پیر یا پیغمبر ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو کائنات کے ایک ایک ذرّے سے اکتسابِ لذّت کرنا چاہتے ہیں۔ اب سب کی اپنی اپنی تمنائیں ہیں، آرزوئیں اُن

حسرتیں ہیں جو غزل کے اشعار سے ٹپکی پڑتی ہیں۔

نکہ سوں تصویر کرنے جوبن پر   کنچلی پھاڑ پھاڑ تار کئے

میر اردو میں تخیلی شاعری Romanticism کا بادشاہ ہے۔ اس کی جگر بستگی اور خود گزاشتگی کے زیرِ سطح ایک بیکراں شورش ملے گی۔

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی   اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

سر مارنا پتھر سے او ٹکڑے سے جگر ہونا   اس عشق کی وادی میں ہر نوع بسر کرنا

میر کے کلام میں مثالیت اور تصوّریت نام کو بھی نہیں۔ وہ بقول قایم "شمعِ انجمنِ عشق بازاں تھے" ان کا عشق خالص انسانی عشق ہے۔ انھوں نے غزلیں نہیں لکھیں، اپنی غم کوشی اور حرماں نصیبی کو اشعار میں ڈھال لیا ہے۔ یہ وہ تمنائیں تھیں جو انھیں کو بہ کو غبارِ ناتواں کی طرح پھراتی رہیں۔

بہار آئی گُل پھول سے سر جوڑ نکلے   رہیں باغ میں کاش اس رنگ ہم تم

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے   پچھتاؤ گے، سنو ہو، یہ بستی اجاڑ کے

چلتے ہیں ناز سے جب چُٹکے ہے دل کو   آتی نہیں سمجھ میں ان دلبروں کی چالیں

پڑتی ہے آنکھ ہر دم جا کر صفائے تن پر   سوجی کئے تھے صدقے اس شوخ کے بدن پر

مصحفی کی شاعری میں رک رک کر چاہنے اور ترسنے کی جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ انھیں اصلیت سے کبھی الگ نہیں ہونے دیتی۔

بن دیکھے جس کے پل میں آنکھیں بھر آتیاں ہوں

کیا قہر ہے کہ اس سے برسوں جدائیاں ہوں

یوں ہے ڈلک بدن کی اس پیرہن کی تہ میں

سُرخی بدن کی جھلکے جیسے بدن کی تہ میں

غالب سراپا رہینِ عشق تھے۔ "لالہ عذارانِ سرو قامت" کا وصل ہی ان کے لئے بہار تماشائے گلستانِ حیات" تھا۔

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی   گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

وہ لطافت سے کثافت کو اور روحانیت سے مادیت کو الگ رکھنے کے حق میں نہ تھے۔

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں   عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

وہ اصل معنوں میں زندگی کا رس نچوڑنے کی خواہش رکھتے تھے اور

بارے چھیڑ جاری رکھنے کے آرزو مند تھے۔

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو   جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

حسرت کا نظریہ حسن و عشق خالص ہندوستانی ہے۔ مجنوں گورکھپوری کے الفاظ میں حسرت فطری صورت حال سے فطری لذّت حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ تمنا کی نظارہ بازی کو انسان کی فطرتِ معصوم کا ایک بہت معمولی تقاضا سمجھتے تھے ...... ان کے لئے جسمانی اور غیر جسمانی محبت کے درمیان کوئی تفاوت نہیں تھا۔ صرف ایک شعر ملاحظہ ہو۔

اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود   رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

اوپر کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو کے غزل گو مجاز کو حقیقت سے الگ کرکے دیکھنے کے عادی نہیں ہیں۔ ان کی یہ وسیع المشربی براہ راست ہندوستانی تہذیب سے اثر پذیر ہوئی ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی طرح اردو کے غزل گو بھی حسن کو معبدِ کائنات ٹھہراتے ہیں۔ عالم رنگ و بو میں سب سے زیادہ حسین شے عورت ہے۔ عورت کی دل کشی اس کی موسیقیت اور موزونیت نے ادب میں ایسے ایسے گل ہائے رنگا رنگ کھلائے ہیں کہ جن کی رنگینی کے بغیر ادب، ادب نہیں، کچھ اور ہوتا۔ غزل کے محبوب پر ہمیشہ حرف گیری کی جاتی ہے اور اُسے صنفِ نازک سے الگ کچھ اور بتلایا جاتا ہے۔ حالانکہ حقائق اس کے خلاف ہیں۔

ہندوستانی تہذیب میں سب سے حسین پرش یعنی آتما کو کہا گیا ہے[2] اصولی طور پر اس کا مظہر مرد ہے، اور عورت اس کا عکسِ جمیل۔ اس لئے ہندوستانی تہذیب میں مرد کے ساتھ عورت کا تصور لازمی ہے۔ سرستی کا تعلق برہما سے، لکشمی کا وشنو سے اور شکتی کا شو سے ہے۔ یہ تینوں بالترتیب علم و حکمت، دولت و حشمت اور قضا و موت کی دیویاں سمجھی جاتی ہیں۔

سنسکرت لٹریچر میں جمالیاتی عنصر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے۔ جلوہ صد ناز کی مظہر اپسراؤں اور گندھروں کا ذکر ملتا ہے۔ نہلانے والی پرسدھکائیں ہیں۔ خدمت گزار یا کشنائیں ہیں۔ رقص کرنے والی کنرائیں اور دیوداسیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستانی مندروں کی تاریخ مرلیوں، بگھاونیوں، بھوانیوں، نائیکنیوں، کلاونتیوں، بساونیوں، جگتیوں اور ماتنگیوں کے ذکر سے اٹی پڑی ہے[3]۔

کالی داس اور بان نے سنسکرت ادب میں جو جمالیت پیدا کی تھی، اس کا جواب آج تک نہیں بن سکا۔ شکنتلا، پاربتی جینتی اور راندمتی کے روپ کو بیان کرنے میں کالی داس نے ایسی ایسی گل کاریاں کی ہیں کہ ان کا حسن لازوال ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ نظریہ صرف کالی داس تک محدود نہیں بلکہ پورے ہندوستانی آرٹ اور ادب پر چھایا ہوا ہے جس کی وجہ سے ادب میں جمالستان کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ عورتیں بہار کے چٹکتے ہوئے پھولوں کی طرح ہر طرف کھلی ہوئی ہیں۔ چاند سے نرمل چہرے، لمبے لمبے گول سر، بالوں کے "الکا" میں مور کے پر لگے ہوئے، سنکھ جیسی گردنیں، کنول کے پتوں جیسے ہونٹ، مرگ جیسے نین، بیل بیل کی طرح لچکتا اور پھیلتا ہوا جسم اور اس کا وہ رس جو بہار کے جھونکے کی طرح انگ انگ سے بہہ نکلا ہے۔

اس مختصر سے پس منظر کو سامنے رکھنے کے بعد اردو غزل میں جمالیات کا جواز تلاش کرنا مشکل نہیں، اور جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ اردو کے غزل گو نہ تو جیون مکت ہیں نہ صوفی کامل۔ وہ انسان ہیں اور بطور انسان رنگ و رامش و بو کی دنیا سے پورا پورا لطف اندوز ہونا ان کا پیدائشی حق ہے۔ ہندوستانی تہذیب انسان کو ان باتوں سے ہرگز نہیں روکتی۔ یہ کائنات روح اور مادے کا، پرش اور پراکرتی کا ایک متوازن امتزاج ہے، دنیا میں سب کچھ نہ تو روح ہے اور نہ جسم۔ پھر جب ہم روح کی تشنگی کو بجھانے کے ہزار سامان کرتے ہیں وہاں جسم کی پکار بھی ہے۔ اردو غزل نے جہاں روح کے تقاضے پورے کرنے کی سعی کی ہے وہاں وہ جسم کی پکار کے تقاضوں سے بھی منہ نہیں موڑتی۔ اس میں شک نہیں کہ ایرانی روایات کے تحت اردو غزل پر امرد پرستی کا اثر بھی رہا ہے، لیکن ایک تو یہ عارضی تھا دوسرے سطحی تھا، اور بہت جلد جاتا رہا۔ اردو غزل کا محبوب صنفِ نازک کے سوا اور کوئی ذات نہیں، اور اس کا سب سے پہلا ثبوت قلی قطب شاہ کے ہاں ملتا ہے۔ اس کا محبوب خالص ہندوستانی آب و گل کی پیداوار ہے جس کا نکھرا

---

[1] نگار، حسرت نمبر ص ۱۰

[2] Ideals of Indian Art—Havell P-33

[3] Modern Religious Movements in India—Farquhar—P.-401

سورج مکھی کا پھول ہے جس کے رخسار کنول ہیں۔ اس کی ساڑی ایک خوبصورت بیل کی طرح اُس کے بدن سے لپٹی ہوئی ہے۔ وہ نخی سی ایک ڈال ہے، جس کو جوبن کے پھل لگتے ہیں۔ لیکن اس کے اُتاؤلے پن میں اس کی کوتپلی پنچ میں، اس کے چرن، اس کے چین، اس کے بن اور ٹولن میں خالص ہندوستانی جمال کا عکس ملے گا۔

دکنی سکول سے بعد کی غزل میں بعض تہذیبی و تواریخی تقاضوں کی بنا پر (جن کی تفصیل کی گنجائش یہاں نہیں) اردو غزل میں محبوب کے یہ نقوش دھندلا گئے ہیں، لیکن بالکل مٹے نہیں۔ شمالی ہندوستان میں غزل نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی، اُس کا تقاضا یہی تھا کہ عورت کو گھر کی چاردیواری میں پردہ دار رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے اسنسکرت لٹریچر کی طرح ابھر کے وہ سطح پر ظاہر نہیں ہوسکا۔ اس کے علاوہ غزل کی رمزیت بھی محبوب کے اس بے نقاب تصور کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے باوجود اردو غزل میں صنفِ نازک کا وجود اور اس کی نسوانیت محسوس کی جاسکتی ہے۔

یہ موضوع چونکہ خود ایک الگ مقالہ کا محتاج ہے۔ یہاں محض چند متفرق اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ر گوندھ کے گویا گُل کی پتّی وہ ترکیب بنائی ہے

رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

الف اس جوششِ بہار میں ہم لوگ مر نہ جائیں — سیمیں بروں کا سینۂ بالیدہ دیکھنا

ب اسدؔ بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ — اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے

ت عشق پردہ نشیں میں مرتے ہیں — زندگی پردہ ور نہ ہو جائے

ث دوقتِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں — اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

ج یہ زندگی کے کڑے کوس یاد آتا ہے — تری نگاہِ کرم کا گھنا گھنا سایہ

ہندوستانی جمالیاتی احساس کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ادراکی نہیں بلکہ وجدانی ہے۔ اور غزل میں اسی مقام کو عرفان کہا گیا ہے۔ اسے عقلیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ نہ صرف عالمِ محسوسات سے بالاتر ہے بلکہ غیر طبعی (آلوکک) بھی ہے۔ اس کی صداقت کا راز صرف ذاتی واردات کے ذریعے ہی کھل سکتا ہے۔

غیر خودی کشش سے خود کو وابستہ کر دینے کے بعد عاشق کی انفرادیت فنا ہو جاتی ہے اور بے خودی کی ان منزلوں سے گزرنے کے بعد وہ مقام آتا ہے جہاں تخیل کی ایڑ لگنے کے بعد جذبۂ وجدان کی تجلیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ یہاں نہ تو نور ہے نہ ظلمات۔ نہ حسن ہے نہ عشق۔ نہ غم ہے نہ نشاط۔ بلکہ ایک دائمی سکون ہے جو زمان و مکان کی ہر وسعت میں سما گیا ہے۔ یہاں پہنچ کر انسانی روح میں ایک بالیدگی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اردو غزل ہو یا ہندو تہذیب ہر دو یہ مقام اس کا منتہا ہے۔

تو میری پاس ہے سکی ہو، تیری پاس میں — پھرتا ہے ڈاواں ڈول کدھر کا کدھر اگر

گلی میں اس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر — میں میرؔ میر کر اُس کو بہت پکار رہا

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی — عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

تصوف میں اس جنون و کیف کا تعلق روحانی قوتوں کی اس معراج سے ہے جسے اصطلاحاً "سعادتِ ابدی" کہا گیا ہے۔ منصورؔ کے ہاں یہ عالمِ "لاہوت" ہے۔ نانک اس مقام کو "سچ کھنڈ" کا رتبہ دیتا ہے۔ کبیر اسے "پاک دھات" کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اور ویدانت میں یہ دھیان (یوگ) کی وہ منزل ہے جہاں "انترِ یامن" "ناسرو یاپک" (لامکان) ہو جاتا ہے۔ یہی مقام غزل کی بھی معراج ہے۔ یہی وہ انتہائی نقطہ ہے جہاں غزل میں جنّت و جہنّم کا سنگم ہو جاتا ہے جہاں نہ کچھ پاک ہے نہ ناپاک بلکہ سب کچھ ایک خلا ہے، لازوال اور مطلق؛

تمام جوشِ جنوں ہے تمام صحرا ہے — کسے وہ جبر کرے کس کو اختیار کرے

ہندوستانی تہذیب میں مسلکِ عشق کے پیروکاروں کو کسبِ حلال کے لئے جد و جہد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ مذہب کے خارجی لوازم سے بالکل بے پروا ہو سکتے ہیں۔ ان کی روح میں اگر ذاتی مشاہدہ کی طاقت ہے تو وہ سبحہ و زنّار اور دیر و حرم کی مصنوعی بندشوں کو یک قلم نظر انداز کر سکتے ہیں۔

گر ہوا ہے طالبِ آزادگی — بند مت ہو سبحہ و زنّار کا

مجھ مست کو کیا نسبت اے میر مسائل سے — صد شیخ کا سجدہ میں، میں رکھ کے سبو ہوں گا

جنیم و رام کی سمرن ہے شیخ و ہندو کو — دل اس کے نام کی رٹنا رٹے ہے کیا کیجے

دیر و کعبہ پہ نہیں ہو توف کچھ اے غافلو — یار کو سجدے سے مطلب ہے کہیں سجدہ کرو

اردو غزل میں مذہب کی روایتی بندشیں موم کی طرح پگھل کر بیجان ہوگئی ہیں اور باہمی اخوت کے اس غلو میں فرقہ وارانہ عناد خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا ہے۔ تجلّے کی تصویر دیر و حرم کے خاکے میں جو بنیادی وحدت ہے، اردو غزل اس کی طرف اشارہ کرتی ہے اور تلاشِ حسن و حق کا یہ وہ فلسفۂ زندگی ہے جو ہندوستان کی وحدت پسند روح سے پوری پوری ہم آہنگی رکھتا ہے۔

کرتار سنگھ دگل

دو مرد اور ایک ماں

(پردہ ایک درمیانہ درجے کے گھر کے ڈرائنگ روم پر اٹھتا ہے

جب پردہ اٹھتا ہے - ۳۰ - ۳۵ برس کی ایک عورت سامعین کی طرف پیٹھ کئے آتشدان کے پاس کھڑی ہے۔ آتشدان میں کوئلے دہک رہے ہیں۔ دہکتے ہوئے کوئلوں کا عکس عورت کے لباس پر پڑ رہا ہے۔ شام ڈھل چکی ہے۔ لیکن ابھی تک کمرے میں بتی روشن نہیں کی گئی -

آتش دان کے قریب کھڑی عورت نے اپنا ایک ہاتھ کارنس پر رکھا ہوا ہے۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک خط ہے جسے وہ پڑھ رہی ہے۔ اور سسکیاں لے رہی ہے۔ یہ عورت اس گھر کے بچے کی ماں ہے۔ انگیٹھی پر رکھی ہوئی مرد کی تصویر اس عورت کے شوہر کی ہے

اس طرح سسکیاں لیتے لیتے ایک دم اس عورت کی سسکی نکل جاتی ہے اور وہ مڑکر سامعین کی طرف دیکھتی ہے۔ اس کی آنکھیں نمناک ہیں۔ اتنے میں باہر سے دروازے پر دستک ہوتی ہے

سلمہ (سنبھل کر اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتی ہے) کون

فرید (باہر سے) امی پروین آنٹی آئی ہیں -

سلمہ - آجاؤ پروین - دروازہ کھلا ہے -

(سلمہ خط کو آتشدان پر رکھ کر بتی جلاتی ہے اور پھر سلائیاں لے کر کچھ بننے لگتی ہے)

پروین - ہیلو سلمہ کیا ہو رہا ہے -

سلمہ - بیٹا تمھیں چھوڑ کر باہر سے ہی لوٹ گیا ہے -

پروین - برآمدے میں کھیل رہا ہے -

سلمہ - ان بچوں کو سردی نہیں لگتی -

(دونوں آتشدان کے پاس بیٹھ جاتی ہیں)

پروین - کیوں تمھیں زکام ہے کیا - تمھاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں

سلمہ - مجھے تو کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے -

پروین - آج کون سی نئی بیماری ہے

سلمہ - نہیں بیماری تو پرانی ہی ہے پروین

پروین - کچھ معلوم تو بھی ہو

سلمہ - عورت کی بیماریاں ہی دو ہوتی ہیں - ایک بچے پیدا کرنے کی بیماری اور دوسری محبت کرنے کی بیماری

پروین - لیکن پہلی بیماری سے تو تم چھٹکارا پا چکی ہو -

سلمہ - (آہ بھرکر) تو محبت کرنے سے کون کسی کو روک سکتا ہے -

پروین - (چھیڑتے ہوئے) اچھا تو اب کون سی نئی محبت آ چمٹی ہے -

سلمہ - محبت پرانی ہی نبھ جائے تو -

پروین - محبت شہد کی طرح جتنی پرانی اتنی ہی میٹھی -

سلمہ - تم بھی یہی کہتی ہو؟

پروین - ہاں تیس برس کی عمر میں کسی کو اتنی سمجھ تو آ ہی جاتی ہے -

سلمہ - (سوچتے ہوئے) محبت شہد کی طرح جتنی پرانی اتنی ہی میٹھی -

پروین - پرانی محبت کا نشہ بھی کتنا پیارا ہوتا ہے -

سلمہ - لیکن کبھی کبھی پتہ ہی نہیں چلتا کہ محبت کس جگہ ختم ہوتی ہے اور نفرت کہاں سے شروع ہوتی ہے -

پروین - مرد کی محبت کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے -

سلمہ - شاید، شاید تم ٹھیک کہتی ہو -

پروین - عورت کے دل کے اتھاہ ساگر میں اس کی ہر محبت مدہوش پڑی رہتی ہے - ہر چھوٹی سی چھوٹی محبت کے لئے ایک عورت لاکھ بار اپنے آپ کو قربان کر سکتی ہے -

سلمہ - شاید، شاید تم ٹھیک کہتی ہو -

(چند لمحوں کے لئے سلمہ اپنے خیالات میں ڈوب جاتی ہے اور پھر ایک سسکی لیتی ہے)

پروین ۔ تمھیں آج کیا ہو گیا ہے؟

سلمہ ۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) پرو مجھ سے کچھ نہ پوچھو ۔ آج میں بہت دکھی ہوں ۔

پروین ۔ لیکن کچھ بتاؤ بھی تو ۔ تم نے تو کبھی اپنا دل اتنا چھوٹا نہیں کیا ۔

سلمہ ۔ ہاں پروین ۔ میں نے ایک مرد کو چھوڑا جس کے لئے میں نے پھول جیسی ایک بیٹی کو جنم دیا اور میری آنکھوں میں ایک آنسو تک نہ آیا ۔

پروین ۔ لطیف کی کیا بات ہے ۔ وہ تو فرشتہ ہے ۔ جس طرح تم دونوں ہنستے ہنستے الگ ہوئے ۔ میں نے جب بھی کسی سے بات کی ہے کوئی مانتا تھوڑی ہے ۔ کسی کو یقین نہیں آتا کہ کوئی مرد بھی اتنا...

سلمہ ۔ لیکن اب اسے کیا ہو گیا ہے؟

(پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے ۔ اور کارنس پر رکھی ہوئی چھٹی پروین کے ہاتھ میں دیتی ہے)

پروین ۔ یہ لطیف کی چھٹی ہے (پڑھتے ہوئے) تم نے بچی پر جیسے کوئی جادو کر دیا ہے ۔ اب یہ میری رتی بھر پروا نہیں کرتی ۔ آخر ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں، بڑے دنوں کی چھٹیاں یہ تمھارے پاس ہی کیوں گزارے ۔ خیر اس بار تو میں اسے بھیج رہا ہوں لیکن جب چھٹیاں ختم ہوں تو اسے سیدھا ہوسٹل بھجوا دینا ۔ میں اس کی صورت تک نہیں دیکھنا چاہتا ۔ تم ایک اور بچے کی ماں بن چکی ہو ۔ پھر تم اس کے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہو ۔

سلمہ ۔ (ایک دم چھٹی چھینتے ہوئے) بس بس پروین پاگل ہو جاؤں گی ۔

پروین ۔ لطیف اور اس طرح کی چھٹی لکھے ۔ میں کہتی ہوں اسے ہو کیا گیا ہے ۔

سلمہ ۔ یہ مرد!

پروین ۔ مرد ذات کا کچھ پتہ نہیں چلتا ۔

سلمہ ۔ پرو! میں تمھیں کہاں تک لطیف کی قربانیوں کی کہانیاں سناؤں..

پروین ۔ وہ لطیف اور یہ لطیف مجھے تو حیرت ہو رہی ہے ۔

سلمہ ۔ پہلی بار جب اسے پتہ چلا کہ میں فاروق کو چاہتی ہوں ۔

پروین ۔ شاید اس نے تمھاری کوئی چھٹی دیکھ لی تھی ۔

سلمہ ۔ نہیں میں اور فاروق ٹیلیفون پر باتیں کر رہے تھے ۔ نہ جانے کیسے اس کا ٹیلیفون ہمارے ٹیلیفون کے ساتھ جڑ گیا ۔ اور اس نے سب کچھ اپنے کانوں سے سن لیا ۔

پروین ۔ پھر

سلمہ ۔ اس دوپہر وہ کھانے کے لئے گھر نہیں آیا ۔ شام کو میں کلب میں تھی کہ دورے کا بہانہ کر کے وہ دس دن کے لئے دیرہ دون چلا گیا اور پھر خطوں کے ذریعے ہم نے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا مجھے ایک بار بھی اس نے برا نہیں کہا ۔ ایک لمحے کے لئے بھی اس نے مجھے شرمندہ نہیں کیا ۔

پروین ۔ اور پھر جس طرح تم دونوں الگ ہوئے ۔

سلمہ ۔ ہائے وہ دن میں کبھی بھول نہیں سکی ۔ پہلی بار لطیف اس صبح مجھ سے پہلے اٹھ گیا ۔ تمام کام جو میں ہر روز کرتی تھی میرے اٹھنے سے پہلے اس نے کر لئے ۔ دروازوں کو کھولنا، نوکروں کو بلانا جھاڑ پونچھ کرنا، ناشتہ کے لئے کہنا، ناشتہ میز پر لگوانا ۔ اور اس دن ناشتہ کرتے ہوئے کبھی وہ میرے ٹوسٹوں پر مکھن لگاتا کبھی بار بار شہد کو میرے آگے کرتا ۔ بچی کے لئے وہ ڈھیر سے کھلونے خرید لایا اور نئے کھلونوں کے چاؤ میں اسے پتہ بھی نہ چلا کہ اس کی ماں اس سے جدا ہو رہی ہے ۔ اور جب میں موٹر میں بیٹھی تو اس نے گلاب کا ایک ادھ کھلا پھول مجھے پیش کیا ۔

پروین ۔ گلاب کا ادھ کھلا پھول تمھارے جوڑے میں کتنا اچھا لگتا ہے ۔

سلمہ ۔ اس نے میرے سب زیور مجھے دیئے ۔ میرے تمام کپڑے اس نے میرے ساتھ کر دئے ۔ گھر کی جو جو چیز مجھے پیاری تھی مجھ سے چوری اس نے موٹر کے پیچھے رکھوا دی ۔

پروین ۔ پچھلے سال مسوری میں لطیف سے میں ملی تھی ۔ کتنی دیر تک تمھاری باتیں ہوتی رہیں ۔ اس کے ماتھے پر بل تک نہیں پڑا ۔ اس کے ہونٹوں پر کوئی شکایت نہیں آئی ۔

میری جس جس سہیلی سے لطیف ان دنوں ملا ۔ ہر کسی سے اس نے

یہی کہا کہ محبت کوئی زبردستی کا سودا نہیں ہے - جب تھی تب تھی اب نہیں رہی تو نہ سہی -

پروین - دل کا دریا سمندر سے بھی گہرا ہوتا ہے - دل کی بات کون جانے -

سلمہ - اور آج کتنے برسوں ہر سال بچی دو بار میرے پاس آتی رہی ہے گرمی کی چھٹیوں میں میرے پاس، بڑے دنوں کی چھٹیوں میں میرے پاس اور پھر بیچ میں بھی اگر کبھی اس کی طبیعت خراب ہوئی تو آٹھ آٹھ دس دس دن میرے پاس گزارتی رہی ہے -

پروین - اور اب اسے کیا ہو گیا ہے -

سلمہ - میں کہتی ہوں پرو یہ مرد، ان مردوں کا کوئی بھروسہ نہیں -

پروین - لیکن لطیف کے معاملے میں مجھے دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے

سلمہ - وہ کیا ؟

پروین - میں سوچتی ہوں یہ سات سال سے ویسے کا ویسا ہے - یہ جو سات سال سے وہ ویران کا ویران ہے - یہ بلا وجہ نہیں -

سلمہ - (اچانک گھبرا کر) تمھارا مطلب ؟

پروین - میرا مطلب یہ ہے کہ لطیف کی آنکھوں میں کبھی کبھی جس محرومی کا عکس نظر آتا جو روکھا پن کبھی کبھی اس کے بالوں میں سے جھانکتا ہے - جو اکھڑ پن کبھی کبھی اس کی آواز میں سنائی دیتا ہے - وہ بلا وجہ نہیں ہے - اس کے گھر کے لان کی گھاس برابر کٹی ہوئی نہ ہوتی - اس کے کپڑوں کے کسی نہ کسی بٹن کا ٹوٹا رہنا - اس کا کبھی داڑھی بڑھا لینا کبھی کٹوا دینا - کبھی مونچھیں رکھ لینا - کبھی منڈوا دینا یہ بلا وجہ نہیں ہے - کئی بار ہنستے ہنستے اس کی ہنسی رک جاتی ہے - اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک دم اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلیں گے -

سلمہ - پروین !

پروین - سوچو تو سہی اگر لطیف چاہتا تو کیا ان سات برسوں میں اپنا دل کہیں اور نہ لگا سکتا تھا - اگر وہ چاہتا تو ان سات برسوں میں . . . .

(سلمہ کی انگلیوں کی طرف دیکھتے ہوئے)

. . . . یہ تمھیں کیا ہو رہا ہے - تمھاری انگلیاں کس تیزی سے سلائیاں چلا رہی ہیں -

سلمہ - تمھارا مطلب ہے -

پروین - پچھلے سال مسوری میں میں نے دیکھا کہ کلب میں جس میز پر وہ ایک بار بیٹھتا تھا - پھر کبھی اس میز کی طرف دیکھتا تک نہ تھا - ایک دن اگر کسی سے بات کرتا تھا - تو اگلے دن یوں خالی خالی نظروں سے اس کی طرف تکتا جیسے اجنبی ہو - آخر یہ سب کیوں -

سلمہ - تمھارا مطلب ہے کہ اس کی ذمے دار میں ہوں ؟

پروین - نہیں میں یہ نہیں کہتی - میں تو بس یہی کہتی ہوں کہ لطیف انسان ہے فرشتہ نہیں ہے -

سلمہ - ہاں وہ انسان ہے فرشتہ نہیں - وہ انسان ہے فرشتہ نہیں ہے کاش وہ فرشتہ ہوتا ! اگر وہ فرشتہ ہوتا کوئی زلیخا ایک بار تو اس کا دامن چاک کر ڈالتی -

پروین - یہ تمھاری انگلیاں سلائیوں کو پھر اس تیزی سے کیوں چلا رہی ہیں ؟

سلمہ - کچھ نہیں پرو، کبھی کبھی نہ جانے مجھے کیا ہوتا ہے -

پروین - یہ کیا بُن رہی ہو جس کی تمھیں اتنی جلدی ہے ؟

سلمہ - بیٹے کا سویٹر ہے -

پروین - تو اس کی جلدی کیا ہے ؟

سلمہ - ہاں جلدی تو کوئی نہیں - میں سوچتی ہوں جو کام ہو جائے وہی اچھا ہے - جس ذمّہ داری سے بھی کوئی سرخ رُو ہو جائے - اتنا ہی بوجھ کم - جن کا سفر لمبا ہوتا ہے وہ زیادہ بوجھ سر پر نہیں اٹھا سکتے .

پروین - آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو ؟

سلمہ - آج میری بچی آئے گی -

پروین - بچہ تو تمھارے پاس ایک پہلے بھی ہے -

سلمہ - (سوچتے ہوئے) ہاں بچہ تو میرے پاس ایک پہلے بھی ہے -

پروین - پھر اس بچے میں اور اس بچے میں کیا فرق ہے -

سلمہ - اس بچے میں مصری ایسا مزا ہے - اس بچے میں شہد جیسی مٹھاس ہے - اس بچے کے لئے میں سانس سانس جیتی ہوں - اس بچے کے لئے میں سانس سانس ترستی ہوں - اس بچے کو دیکھ کر میرے دل کو

ٹھنڈک پہنچتی ہے ۔ اس بچے کے لیئے میں راہ میں آنکھیں بچھائے رہتی ہوں ۔ ہائے میں ماں ہوں ۔ کوئی میرے دل میں جھانک کر دیکھے لاکھ خوشیاں بکھری پڑی ہیں ۔ اس بچے کے لیئے لاکھ دعائیں پھُوٹ پھُوٹ نکلتی ہیں ۔ اس بچے کے لیئے ایک ماں کے دل میں کوئی بچہ کسی دوسرے بچے کی جگہ نہیں لے سکتا ۔ (باہر موٹر کا ہارن بجتا ہے)

پروین ۔ ہیں یہ باہر کون ہے؟ میں دیکھتی ہوں ۔

(جاتی ہے)

(اپنے آپ سے) سچ مچ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ میری انگلیاں کیوں تیزی سے سلائیاں چلا رہی ہیں ۔ آج مجھے یہ کیا ہو رہا ہے؟ (سوچتے ہوئے) جب کوئی تمنا اس طرح تڑپتی ہے جیسے میرے اندر کی ماں سسک رہی ہے ۔ تو خدا کوئی ازحد سنگ دل خدا ہوگا جو نہ پسیجے ۔ آخر میں چاہتی بھی کیا ہوں؟ ایک ماں اپنی بچی کو دیکھنے کے لئے بے چین ہے ۔ ایک ماں اپنی اولاد کو سینے سے لگا کر اپنے دل کی آگ بجھانا چاہتی ہے ۔ یہ خدا اتنا رحمدل سنا جاتا ہے ۔ میری یہ چھوٹی سی آرزو بھی کوئی آرزو ہے

پروین ۔ (باہر سے) سلمہ دیکھ تمھارے لیئے میں کسے لائی ہوں ۔

(پروین سلمہ کی لگ بھگ بارہ برس کی بیٹی کے ساتھ داخل ہوتی ہے)

زینت ۔ آداب امی!

سلمہ ۔ (ایک دم بچی کو گلے سے لگاتے ہوئے) ہائے آج تو ان سے چاہے میں نے کچھ اور مانگا ہوتا ۔

پروین ۔ سلمہ تمھیں معلوم ہے اسے یہاں کون چھوڑ کر گیا ہے؟

سلمہ ۔ تم کس کے ساتھ آئی ہو بیٹی؟

زینت ۔ ڈیڈی کے ساتھ

پروین ۔ لطیف خود اسے یہاں پہنچا کر گیا ہے ۔

سلمہ ۔ یہ ہارن تمھارے ڈیڈی کی کار کا تھا ۔

پروین ۔ وہ تو اس نے واپس جاتے ہوئے کہیں گیٹ میں بجایا تھا ۔ میں بھی تو اس کی کار کو پیچھے ہی سے دیکھ پائی ۔

سلمہ ۔ لیکن تم تو آج رات کی گاڑی سے آ رہی تھیں؟

زینت ۔ ڈیڈی کو یہاں کوئی کام پڑ گیا تھا ۔ اس لیئے مجھے بھی ساتھ لے آئے ۔ امی ڈیڈی نے نئی کار لی ہے ۔

سلمہ ۔ اچھا ۔ کیا رنگ ہے؟

زینت ۔ چاکلیٹ امی ۔

سلمہ ۔ چاکلیٹ؟ (ایک دم جیسے خیالات میں ڈوب جاتی ہے)

پروین ۔ چاکلیٹ تو تمھارا محبوب رنگ ہے ۔

سلمہ ۔ ہاں پرو، چاکلیٹ میرا محبوب رنگ ہے ۔ پچھلی بار زینت کے ڈیڈی نے کار خریدی ۔ میں چاکلیٹ چاکلیٹ کرتی رہی ۔ لیکن اس رنگ کی کوئی کار ملی ہی نہیں ۔

زینت ۔ دو کاریں تھیں امی ایک سبز ایک چاکلیٹ ۔ ڈیڈی نے مجھ سے پوچھا بیٹی تمھیں کون سا رنگ پسند ہے ۔ مجھے چاکلیٹ رنگ پسند تھا ۔ اور ڈیڈی نے وہی کار خرید لی ۔

پروین ۔ سلمہ تمھاری بیٹی ہو بہو تمھاری شکل نکل رہی ہے ۔

سلمہ ۔ (جیسے سوئی ہوئی ہو) اچھا بیٹا سامان اپنے کمرے میں رکھوا کر ہاتھ منہ دھو لو ۔

زینت ۔ اچھا امی (جاتی ہے)

سلمہ ۔ اس گھر میں ایک کمرہ ہمیشہ میری بچی کے لئے خالی رہتا ہے ۔

پروین ۔ میں پوچھتی ہوں، سلمہ لطیف نے یہ کیا کیا ۔ بچی کو باہر اتار کر چُپ چاپ چلا گیا ۔

سلمہ ۔ بالکل کوٹھی کے اندر آ گیا تھا ۔

پروین ۔ برآمدے میں آ کر اس نے سامان اتروایا ۔ بچی کو اتارا اور چلا گیا ۔

سلمہ ۔ تمھارا مطلب ہے اگر آیا تھا تو اندر چلا آتا بنا بتلائے بنا کچھ کہے سنے کسی کے گھر میں گھس آتا ۔

پروین کئی بار ایک کھیت کے جانور ساتھ والے کھیت میں بھی مُنہ مار لیتے ہیں ۔

سلمہ ۔ اور ان جانوروں پر جو گزرتی ہے وہ بھی تو تم جانتی ہو ۔

(دونوں ہنس پڑتی ہیں)

پروین ۔ فرید کہاں گیا ہے ۔ تمھارا بیٹا کہیں نظر نہیں آ رہا ۔

سلمہ ۔ ہائے مجھے تو اس کا خیال ہی نہیں رہا ۔ پڑوسیوں کے ہاں چلا

گیا ہو گا - جس گھر میں بچے کی آیا کو دلچسپی ہو اس گھر میں بچے کو زیادہ
جانا پڑتا ہے -

پروین - (اُٹھتے ہوئے) اچھا سلمہ اب میں چلتی ہوں -

سلمہ - میں تو سوچتی ہوں تم کچھ دیر اور ٹھہرتیں -

پروین - نہیں! تمھاری بچی تیار ہو کر آجائے گی - اور تمھارا دل بہلائے گی

(سلمہ اپنی سہیلی پروین کو کمرے کے دروازے تک چھوڑ کر کچھ دیر
برآمدے کی طرف دیکھتی رہتی ہے)

سلمہ - (اپنے آپ سے) لطیف یہ تم نے کیا کیا؟ برآمدے تک تم اس
گھر میں گھس آئے تم اس دہلیز تک آگئے - جہاں ہر روز کھڑے
ہو کر میں فاروق کا انتظار کرتی ہوں - یہ تم نے کیا کیا؟

زینت - (آتے ہوئے) امّی ڈیڈی نے یہ خط دیا تھا -

(سلمہ خط پڑھتی ہے - پڑھتے پڑھتے اس کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے)

سلمہ - اچھا بیٹی - چلو دیکھیں تمھارا بھائی کہاں ہے -

زینت - امّی اب ڈیڈی مجھے ہوسٹل بھیج دیں گے؟

سلمہ - (دُکھ سے) ہاں بیٹی -

زینت - امّی میں ہوسٹل میں نہیں رہوں گی -

سلمہ - (پُردرد لہجے میں) اچھا بیٹی -

زینت - امّی میں تمھارے پاس رہوں گی

سلمہ - (بچّی کو گلے لگاتی ہے اس کی آنکھیں بھر آتی ہیں) اچھا بیٹی،
اچھا بیٹی، اچھا بیٹی -

فرید - (آتے ہوئے) امّی -

زینت - بھیّا -

فرید - بہن -

(دونوں بچے ملتے ہیں - ماں ان کی طرف پیٹھ کر کے آنسو پونچھتی ہے)

زینت - بھیّا! میں تمھارے لئے بہت سے ٹکٹ لائی ہوں بہت سی
تصویریں لائی ہوں - کنچے لائی ہوں - دو گیند لائی ہوں - اور اپنے
بچا کر رکھے ہوئے سب پیسوں سے ایک ہوائی جہاز لائی ہوں -
اپنے راجہ بھیا کے لئے -

(بانہوں میں بانہہ ڈالے بچے ہنستے ہوئے ساتھ والے کمرے میں
چلے جاتے ہیں - ماں بڑے اشتیاق سے ان کی طرف دیکھتی رہتی ہے)

سلمہ - کیسے بانہوں میں بانہہ ڈالے ہنس رہے ہیں - کھیل رہے ہیں - اور
اسے شاید یہی بُرا لگتا ہے - (پھر سے خط پڑھتے ہوئے) بیٹی
آخری بار تم سے ملنے آ رہی ہے - اس کے بعد میں اسے ہوسٹل
میں بھیج دوں گا - (سسکی بھرتی ہے) ہائے کوئی یہ کیوں نہیں سوچتا
کہ میں ماں ہوں - ایک ماں اپنے ہر بچے میں پھر سے جنم لیتی ہے
اور ہر بچہ اسے ہر دوسرے بچے سے زیادہ پیارا ہوتا ہے -

فرید - (آتے ہوئے) امی دیکھو بہن میرے لئے کیا لائی ہے -
(اس کے ہاتھ میں کھلونے ہیں)

زینت - (دور سے) امّی میں بھیّا کے لئے جرابیں بن رہی ہوں - (اس کے
ہاتھ میں سلائیاں اور اون ہے)

سلیم - اچھا بیٹی تمھیں جرابیں بننا بھی آگیا ہے - کتنا صاف ہاتھ ہے
تمھارا - کس نے سکھایا ہے تمھیں جرابیں بُننا؟

زینت - میری سہیلی نے -

سلمہ - کیا نام ہے تمھاری سہیلی کا

زینت - شہلا امّی -

سلمہ - اور بھی کوئی سہیلیاں بنائی ہیں تم نے

زینت - ہاں امّی - موہنی، رضیہ، روزی، قمر

سلمہ - تمھاری آیا وہی ہے -

زینت - ہاں امّی تمھیں سلام کہتی تھی - امّی تمھاری ایک تصویر آیا نے
اپنے کوارٹر میں چھپا کر رکھی ہوئی ہے - ڈرائنگ روم والی تمھاری
تصویر گر کر ٹوٹ گئی ہے -

سلمہ - اور کھانے کے کمرے والی؟

زینت - وہ تو پتہ نہیں -

فرید - امّی -

سلمہ - جو تصویر ٹوٹ گئی ہے وہ کہاں ہے

زینت - معلوم نہیں امّی -

فرید - امّی -

سلمہ - اس بار امرود کے پیڑوں پہ پھل آیا ہے؟

زینت - ہاں امّی۔
فرید - امّی میری بات بھی سنو تو
سلمہ - پچھلے برآمدے میں صبح دھوپ ویسے ہی آتی ہے
زینت - ہاں امّی -
فرید - میری بات نہیں سنتا کوئی -
سلمہ - ہاں بیٹا بولو تم کیا کہتے ہو -
فرید - اب ہم بہن کو نہیں جانے دیں گے - بس یہیں رہے گی -
زینت - ہاں امّی مجھے اپنے پاس رکھ لو -
فرید - امّی پیاری
زینت - امّی تم مجھے بہت یاد آتی تھیں -
(سلمہ گم سم پلک تک جھپکے بنا بچّوں کی طرف دیکھ رہی ہے)
فرید - امّی
زینت - امّی
سلمہ - (دبے ہوئے لہجے میں) ہاں بچو ہاں (ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں جنھیں چھپانے کے لئے وہ کورنس پر رکھی ہوئی سلائیاں اٹھا لیتی ہے - اور کچھ دیر تک بچّوں کی طرف پیٹھ کئے کھڑی رہتی ہے - باہر برآمدے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)
فرید - میں ٹیلیفون سنوں گا (دوڑ کر باہر جاتا ہے)
زینت - (ماں کے سامنے آکر) امّی تم رو رہی ہو ؟
سلمہ - نہیں تو بیٹی -
(لمحے بھر کا وقفہ)
زینت - امّی کیا یہ بھیّا کا سویٹر بن رہی ہو ؟
سلمہ - ہاں بیٹی -
زینت - میں بھیّا کے لئے اُودے رنگ کی جرابیں بُن رہی ہوں - تم بھیّا کے لئے اُودے رنگ کا سویٹر بن رہی ہو
فرید - (باہر سے) امّی ڈیڈی کا ٹیلیفون ہے دس منٹ میں آرہے ہیں -
زینت - امّی یہ کیسے ہوا اُودا رنگ میں نے بھی چُنا تم نے بھی -
سلمہ - تم میری بیٹی جو ہو جو میری پسند ہے وہی تمھاری پسند ہے -
زینت - امّی ڈیڈی مجھے ہوسٹل کیوں بھیج رہے ہیں ؟

سلمہ - پھر کیا ہوا بیٹی تم ہوسٹل میں رہنا .
زینت - میں ہوسٹل نہیں جانا چاہتی
سلمہ - (بات کو بدلتے ہوئے) بیٹی یہ تو بتا کیا تم نے کبھی وہ لال غرارہ پہنا ہے - میں سوچتی ہوں آج کل تم اسے پہنا کرو نہیں تو چھوٹا ہو جائے گا -
زینت - امّی میں ہوسٹل نہیں جاؤں گی - امّی مجھے اپنے پاس رکھ لو -
سلمہ - (ٹالتے ہوئے) دیکھوں باہر کون ہے -
(اُٹھ کر کھڑکی سے جھانکتی ہے اور بچّی کی طرف پشت کرکے وہیں کھڑی ہو جاتی ہے)
زینت - (ماں کے پاس جاتے ہوئے) امّی میری امّی تم پھر رو رہی ہو -
سلمہ - نہیں تو میری بچّی -
زینت - تو پھر تمھاری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں ؟
سلمہ - نہیں میری بیٹی نہیں (باہر سے موٹر کی آواز آتی ہے)
زینت - باہر کوئی آیا ہے -
سلمہ - (جلدی سے آنکھیں پونچھتی ہے) فرید کے ڈیڈی ہوں گے - انھیں کی کار کی آواز ہے -
زینت - میں دیکھتی ہوں -
(سلمہ اس دوران میں اپنے آپ کو سنبھال لیتی ہے)
فاروق - (داخل ہوتے ہوئے) ہیلو بھئی کون آیا ہے - بیٹا رانی آئی ہے
سلمہ - ہیلو - (فاروق زینت کے گلے میں باہنہ ڈالے ہوئے ہے)
فاروق - تمھیں پھر زکام ہو گیا ہے - تمھاری آنکھیں کیسی لال ہو رہی ہیں ؟
سلمہ - ہاں فاروق
فاروق - بیٹا کہاں ہے ؟
سلمہ - یہیں کہیں ہوگا
زینت - ادھر گیا تھا میں دیکھتی ہوں (زینت جاتی ہے)
فاروق - زینت کس کے ساتھ آئی ہے ؟
سلمہ - اپنے ڈیڈی کے ساتھ
فاروق - (حیرانی سے) لطیف خود آیا تھا !
سلمہ - ہاں -
فاروق - (اور بھی تعجب سے) لطیف خود آیا تھا !

سلمہ - ہاں -

فاروق - کیا مطلب ہے تمھارا ؟

سلمہ - لطیف اپنی کار میں بیٹھ کر خود زینت کو پہنچانے آیا تھا -

فاروق - ہوں - رُکا نہیں -

سلمہ - یہ اس کے دو خط ہیں - ایک ڈاک سے آیا تھا - دوسرا اس نے زینت کے ہاتھ بھجوایا ہے - (کورنس پر رکھے دونوں خطوط اُٹھا کر فاروق کو دیتی ہے اور خود آتش دان کے پاس بیٹھ کر بُننا شروع کر دیتی ہے)

فاروق - (پڑھتے ہوئے) یہ اب اسے کیا ہو گیا ہے ؟

سلمہ - مرد ذات کی بات کون جانے

فاروق - پھر بھی اس طرح کے خط لکھنا کہاں کی شرافت ہے ؟

سلمہ - (بھرّائی ہوئی آواز میں) مجھے یاد ہے جیسے کل کی ہی بات ہو - جب میں چلنے لگی تھی تو اس نے مجھ سے کہا تھا - بچّی تمھاری امانت ہے - جب تمھارا جی چاہے بُلا لیا کرنا -

فاروق - اب کون بلّی چھینک گئی ہے ؟

سلمہ - یہ وہی جانے -

فاروق - اس طرح کسی کی ازدواجی زندگی کو خراب کرنا کہاں کی انسانیت ہے

(باہر سڑک پر آگ بجھانے والے انجن کی آواز آتی ہے)

سلمہ - معلوم ہوتا ہے کہیں آگ لگ گئی ہے -

(اُٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتی ہے - فاروق ابھی تک خطوط پڑھ رہا ہے)

فاروق - (اپنے آپ سے) بے ہودہ

سلمہ - ہائے آگ سامنے سول لائنز میں لگی ہے - شعلے کس طرح آسمان کی طرف لپک رہے ہیں

فاروق - (کھڑکی کے پاس آکر) کسی بے چارے کا گھر جل رہا ہے -

سلمہ - کسی سے کوئی لاپروائی ہوئی ہوگی

فاروق - آج کی رات کتنی سیاہ ہے !

سلمہ - رات اتنی سیاہ نہیں ہے جتنی آگ کے شعلوں کی وجہ سے معلوم ہو رہی ہے -

فاروق - بڑی بھیانک آگ ہے - تپش یہاں محسوس ہو رہی ہے -

سلمہ - پڑوسی کی آگ کا سینک مشہور ہے -

زینت - امّی ہم کھانا کھا لیں ؟

سلمہ - ہاں بیٹی آیا سے کہہ دو تمھیں کھانا دے دے -

زینت - آیا تو کہیں نظر نہیں آ رہی -

سلمہ - پڑوسیوں کے یہاں گئی ہوگی -

فاروق - یہ آیا تمھاری پڑوسیوں کے یہاں بہت جاتی ہے ؟

سلمہ - (زینت سے) اسے بلوا لو بیٹی -

(زینت جاتی ہے)

فاروق - زینت کتنی بڑی ہو گئی ہے -

سلمہ - اب بارھواں سال لگا ہے -

فاروق - لڑکیاں بیل کی طرح بڑھتی ہیں -

سلمہ - (اداس ہو کر) یہی عمر ہے جب بچّی کو ایک ماں کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے

فاروق - (طنزاً) اور اس کا باپ اسے ہوسٹل بھیج رہا ہے -

سلمہ - ایک بار مجھے بھی ہوسٹل بھیجا گیا تھا - میں رات رات بھر روتی رہتی تھی - تیسرے دن اماں آکر مجھے گھر لے گئی -

فاروق - جہاں تک ممکن ہو ایک خاص عمر تک بچّوں کو اپنے ماں باپ پاس ہی رہنا چاہیئے -

سلمہ - جوان ہو رہی لڑکیوں کے لئے ماں کی ضرورت اور بھی زیادہ ہوتی ہے

فاروق - تم ٹھیک کہتی ہو سلمہ !

سلمہ - اب میری بچّی ہوسٹل بھیج دی جائے گی -

فاروق - لیکن میں پوچھتا ہوں ایک مہذّب شخص کے لئے ایسا کرنا کہاں تک مناسب ہے -

سلمہ - اس تہذیب ہی کا تو سارا رونا ہے تہذیب کے راستے پر ہم آگے نکل گئے ہیں لیکن جذبات کے لحاظ سے ہم وہیں کے وہیں رہے -

فاروق - تم تو آج فلسفہ چھانٹ رہی ہو -

سلمہ - جس تن لاگے وہ تن جانے -

فاروق - تمھارا مطلب ہے کہ مجھے تمھارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے !

سلمہ - یہ بات نہیں ہے فاروق - تم تو میری زندگی ہو تمھیں تو میری آخری اُمید

فاروق۔ میں کہتا ہوں کہ اگر تم کہو تو میں لطیف سے بات کر دوں

سلمہ۔ تم اسے کیا کہو گے ؟

فاروق۔ مجھے جو کہنا ہے کہہ دوں گا بس تمہاری اجازت چاہیئے۔

سلمہ۔ نہیں نہیں فاروق، تم لطیف کو نہیں جانتے۔

فاروق۔ میں لطیف کو نہیں جانتا ؟ جس کے ساتھ میں آدھی آدھی رات تک کلب میں بیٹھا شراب پیتا رہا ہوں، تاش کھیلتا رہا ہوں۔

سلمہ۔ تم لطیف کو نہیں جانتے فاروق ! مرد کو مرد شکل ہی سے پہچان سکتا ہے مرد کو سمجھنے کے لئے عورت کی آنکھ چاہیئے۔

فاروق۔ یہ تمہاری اُنگلیاں کس تیزی سے سلائیاں چلا رہی ہیں۔

سلمہ۔ (ایک دم گھبرا کر) اوہ . . . ہاں۔ میں بیٹے کا سوئیٹر بُن رہی ہوں۔

فاروق۔ کیا آج ہی اسے ختم کرنا ہے ؟ یہ تمہاری کیسی عادت ہے سلمہ، جو بات دل میں آ گئی اسے پُورا کر لینا۔ اس وقت اس لمحہ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

سلمہ۔ کاش زندگی میں کوئی آدمی جو اس کے دل میں آ جائے اسے پورا کر سکے۔

فاروق۔ اس وقت تمہارا دل کیا چاہتا ہے ؟

سلمہ۔ میرا دل چاہتا ہے . . . . .   (زور زور سے ہنسنا شروع کر دیتی ہے اور ہنستی ہی جاتی ہے)

فاروق۔ کہو۔ نہ، تمہارا دل کیا چاہتا ہے ؟

سلمہ۔ (ایک دم ہنسی روک کر) میرا دل چاہتا ہے کہ میرے ہاتھ میں ایک چاقو ہو اور اسے میں تمہاری پیٹھ میں گھونپ دوں

(سلمہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے ہیں۔ فاروق ہکا بکا سا اُس کی طرف دیکھتا ہے سلمہ بے ہوش ہو کر گر پڑتی ہے)

فاروق۔ (سلمہ کو سنبھالتے ہوئے) سلمہ سلمہ، میری جان، کیا ہو گیا ہے سلمہ تمہیں۔

سلمہ۔ (ہوش میں آ کر رونے لگتی ہے) معاف کرنا فاروق۔ مجھے معاف کرنا میں بہت بدنصیب ہوں۔

فاروق۔ حوصلہ کرو سلمہ

سلمہ۔ میں بہت دکھی ہوں

فاروق۔ میں تمہیں برانڈی لا کر دیتا ہوں

(ساتھ والے کمرے میں جاتا ہے)

سلمہ۔ (سلائیاں اور سوئیٹر اٹھاتے ہوئے) یہ سوئیٹر مجھے ختم کرنا چاہیئے۔ . . . .

آخر کیوں ؟ جلدی کیا ہے ؟ ؟ میں کیوں یہ سوئیٹر ختم کرنا چاہتی ہوں ؟ کیا میں کہیں جا رہی ہوں ؟ میں تو کہیں بھی نہیں جا رہی ہوں۔ پھر جلدی کیا ہے ؟

فاروق۔ (بوتل اور گلاس لے کر آتے ہوئے) میں آیا سے کہہ آیا ہوں کہ بچوں کو سُلا دے۔ زینت اب بڑی ہو گئی ہے۔ میں نے کہا۔ ادھر آ کر کیا دیکھے گی ؟

(برانڈی میں گرم پانی ملا کر گلاس سلمہ کو دیتا ہے)

سلمہ۔ ہاں، زینت بڑی ہو گئی ہے

فاروق۔ اسے ایک دم پی لو سلمہ۔

سلمہ۔ (پیتے ہوئے) فاروق مجھے اور برانڈی دو۔ آج میں اپنے آپ کو بھول جانا چاہتی ہوں۔

فاروق۔ (برانڈی دیتے ہوئے) ہاں آدمی کو بھول ہی جانا چاہیئے۔ یہ زندگی کی بدمزگیاں . . . . . .

سلمہ۔ لیکن کئی ان سے ٹکرا کر چُور چُور ہو جاتے ہیں۔

فاروق۔ کچھ لہریں ایسی ہوتی ہیں جو ہر چٹان سے ٹکرا کر واپس ہی اوپر اٹھتی ہیں۔

سلمہ۔ اور کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جو خود تو اُوپر اٹھتیں یا نہ چٹان کی جڑیں ہلا دیتی ہیں۔

فاروق۔ مجھے یہ بتاؤ سلمہ کہ آج تمہیں کیا ہو رہا ہے ؟

سلمہ۔ (نشے میں) لمحے آج میں بھول جانا چاہتی ہوں کہ میں ماں ہوں۔

فاروق۔ میں کہتا ہوں، لطیف کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے۔ بڑا اپنے آپ کو نئی روشنی کا انسان کہتا ہے۔

سلمہ۔ یہ اب اِس سے کون پُوچھے ؟

فاروق۔ تم بھی تو اس کی باتیں کرتی نہیں تھکتی تھیں۔

سلمہ۔ جس شرافت کا ثبوت اس نے ہمارے الگ ہوتے ہوئے دیا تھا اس کی کون تعریف نہیں کرتا۔

فاروق۔ لیکن اب کیا ہو گیا ہے ؟

سلمہ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔

فاروق۔ آج کل کی نئی روشنی میں ایک بچّے کو اس کی ماں سے چھین لینا میری نظر میں انتہائی ظلم ہے۔

سلمہ۔ ہائے اس سے جا کر اب یہ کون کہے !

فاروق۔ میں جا کر اس سے پوچھنے کو تیار ہوں۔ یہ کہاں کی شرافت ہے؟ جتنا حق ایک باپ کو اپنے بچے پر ہوتا ہے اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ خود ایک ماں کا اپنے بچے پر ہوتا ہے۔ نئے زمانے میں، نئی روشنی میں چونکہ ایک ماں بچے کے باپ کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی اس لئے اس سے اس کا بچہ چھین لیا جائے۔ ماں کی صحت کا تو کچھ لحاظ ہونا چاہیئے۔ بچے کے معصوم دل کا تو کچھ خیال ہونا چاہیئے۔

سلمہ۔ تم ٹھیک کہتے ہو لیکن وقت کی حکومت اس کی طرف ہے۔ حکومت کا قانون اس کے حق میں ہے۔

فاروق۔ قانون وقت کی ضرورتوں کے مطابق بنائے جاتے ہیں۔ سنگدل انصاف سے اوپر بھی کوئی چیز ہے۔ چونکہ بچے کی ماں کچھ کرتی ہے اس لئے بچے سے ماں کی چھاتیوں کی ٹھنڈک چھین لی جائے، چونکہ بچے کی ماں کچھ کرتی ہے اس لئے بچے کو ماں کے حیات بخش لمس سے الگ کر دیا جائے۔ ماں کی پلکوں تلے چھپے ہوئے لاکھوں ارمان ایک بچے کے خد و خال کو سنوارتے ہیں، سجاتے ہیں۔

سلمہ۔ تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن . . . . .

فاروق۔ میں تو یہاں تک مانتا ہوں کہ ماں میں چاہے لاکھوں برائیاں ہوں اس کے بچے کو اس سے الگ نہیں کرنا چاہیئے، چاہے وہ مکتہ گناہوں کی تاریکی میں گھری ہوئی ہو۔ ایک ماں اپنے دل کے کسی کونے میں روشنی کی کرن چھپائے رکھتی ہے۔ اپنے بچے کے لئے شیرنی جنگل کے تمام جانوروں کو کھاتی ہے۔ لیکن جب اپنے غار میں آتی ہے تو اپنے بچے کے لیے اپنی کوکھ کے جائے کے لئے وہ بچھ بچھ جاتی ہے۔ سو سو جانیں قربان کرنے کو تیار رہتی ہے۔ ایک ماں کو اس کے بچے سے کبھی الگ نہیں کرنا چاہیئے۔

(سنتے سنتے سلمہ کا چہرہ کھل اٹھتا ہے، منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے۔ سوئیٹر اور سلائیاں اٹھا کر وہ پھر سے سوئیٹر کو تیز تیز سے بننے لگتی ہے)

سلمہ۔ فاروق۔ میری جان

فاروق۔ ایک ماں کو اس کے بچے سے کبھی الگ نہیں کرنا چاہیئے۔ آج کل کے نئے زمانے میں، آج کل کی نئی روشنی میں اس طرح کی باتیں کرنا جیسی لطیف کر رہا ہے میں تو حیران ہوں

سلمہ۔ (ایک دم جیسی کھل اٹھتی ہے) فاروق اس کا مطلب ہے کہ . . . . .

فاروق۔ جب تم لوگ الگ ہوئے اس وقت اگر وہ چاہتا، اگر اس کی مرضی ہوتی تو وہ تمھیں روک سکتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے خود دکھ کر اس نے تمھیں دوسری شادی کی اجازت دی۔ اور اب اس طرح واویلا مچانا کوئی شرافت ہے، کوئی انسانیت ہے؟

سلمہ۔ (خوش ہو کر جیسے اسے کوئی منزل دکھائی دے گئی ہو) میں سوچتی ہوں، میری جان . . . .

فاروق۔ میں کہتا ہوں، یہ بے انصافی ہے نہ صرف تمھارے ساتھ بلکہ میرے ساتھ بھی، ہمارے بچے کے ساتھ بھی۔ ایک گھر کی عورت جب پریشان ہوتی ہے تو اس گھر پر گویا غم کی گھٹا چھا جاتی ہے جیسے کسی کمرے کے تمام پردے گرا دئے جائیں۔ اور اس میں کسی کا دم گھٹنے لگے۔ اس نئے زمانے میں، اس نئی روشنی میں . . . . . .

سلمہ۔ (ایک دم آگے بڑھ کر) فاروق فاروق میری بات تو سنو۔

فاروق۔ میں مانتا ہوں ایک ماں کو اپنے بچے پر پورا پورا حق ہے۔ چاہے وہ ماں اس بچے کے پاس رہے چاہے نہ رہے۔

سلمہ۔ (اور بھی تیزی سے) تو پھر میری جان میں . . . . . میں لطیف کے پاس چلی جاتی ہوں۔

فاروق۔ ہاں تمھیں ضرور اس کے پاس جا کر اسے سمجھانا چاہیئے۔

سلمہ۔ نہیں، یہ نہیں فاروق، میں لطیف کے پاس چلی جاتی ہوں۔

فاروق۔ (گھبرا کر) کیا مطلب؟

سلمہ۔ میرا مطلب ہے کہ میں لطیف کے پاس واپس چلی جاتی ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

فاروق (پھٹی ہوئی آواز میں) یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟

سلمہ۔ (بننا چھوڑ کر) میں کہہ رہی ہوں فاروق، میں لطیف کے پاس چلی جاتی ہوں۔ اگر وہ زیادتی کر رہا ہے تم تو سمجھدار ہو۔

فاروق۔ (حیران ہو کر) تم کیا کہہ رہی ہو؟

سلمہ۔ (سمجھاتے ہوئے) میں کہتی ہوں کہ میں لطیف کے پاس واپس چلی جاتی ہوں۔ میرا اب کیا ہے؟ میں اس کے پاس رہ لوں گی اپنی بیٹی کے لئے۔

(ہنستا بکتا) اور ہمارا بیٹا ؟
تم اسے میرے پاس بھیج دیا کرنا گرمی کی چھٹیوں میں، بڑے دنوں کی چھٹیوں میں۔ (آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے)
تمھارا مطلب کیا ہے ؟
میرا مطلب ہے کہ اگر میں لطیف کے پاس چلی جاؤں اپنی بچی کے لئے تو تم تو بیٹے کو میرے پاس بھیج دیا کروگے (سسکی بھر کر) میرا اب کیا ہے۔ کسی طرح میرے دن کٹ جائیں گے۔ ہائے میں ماں ہوں۔ ایک ماں صرف بچوں کے لئے جیتی ہے تم تو نئے زمانے نئی روشنی .....
یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟
ہو تو سکتا ہے۔ کیوں نہیں ہو سکتا ؟ جیسے لطیف بیٹی کو بھیجا کرتا تھا ویسے ہی تم بیٹے کو بھیج دیا کرنا۔

(گھبرا کر اٹھتے ہوئے) یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟
(فریاد کرتے ہوئے) یہ ہو سکتا ہے، لطیف ابھی ویسے کا ویسا ہی ہے میں اسے سمجھاؤں گی، میں اسے مناؤں گی۔ میں اپنی بیٹی کے پاس چلی جاتی ہوں۔ تم بیٹے کو میرے پاس بھیج دینا۔ تم سمجھدار ہو، مہذب ہو نئے زمانے کے
(غصّے سے) یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟
(منّت کرتے ہوئے) یہ ہو سکتا ہے، فاروق، میری جان یہ ہو سکتا ہے کہو۔ تم بیٹے کو تو مجھ سے نہیں چھینو گے۔ تم تو نئی روشنی .....
(چیختی ہوئی آواز میں) یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کیسے........
(پردہ گرتا ہے)

آبپاشی اور بجلی کے پرجیکٹوں کی رفتار ترقی

پلاننگ کمیشن کی رپورٹ

پلاننگ کمیشن نے آبپاشی اور بجلی پیدا کرنے کی اسکیموں کی رفتارِ ترقی کا جائزہ لے کر ۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء تک کے اعداد و شمار شائع کئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنجسالہ منصوبے میں شامل آبپاشی کی بڑی اسکیموں کی تکمیل کے نتیجے کے طور پر ۴۸ لاکھ ایکڑ سے زائد اراضیات کو زیر آبپاشی لایا جا چکا ہے یا لایا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی بجلی کی پیداوار بھی ساڑھے چار لاکھ کلو واٹ تک بڑھائی جا چکی ہے۔ پہلے پنجسالہ منصوبے کے تحت آبپاشی اور بجلی پیدا کرنے کا جو پروگرام بنایا گیا ہے اس کے مطابق طویل المیعاد پروگرام میں پندرہ سے بیس برس کی مدّت کے اندر رقبہ زیر آبپاشی کو دوگنا کر دینے اور ستر لاکھ کلو واٹ بجلی پیدا کرنے کا تہیہ کیا گیا ہے اور فوری پروگرام میں ۸۵ لاکھ ایکڑ نئی اراضیات کو زیر آبپاشی لانے اور بجلی کی پیداوار میں گیارہ لاکھ کا اضافہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔

ہمارا اصول اور پروگرام ایک ہے

بخشی غلام محمد کی تقریر

بخشی غلام محمد وزیر اعظم ریاست جموں و کشمیر نے صراف پارک میں ایک انتخابی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ دشمن چاہے کچھ بھی کرے ہم نے اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لیا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت ہمارے طے شدہ فیصلوں کو مسترد نہیں کر سکتی۔

بخشی صاحب نے کہا کہ کارکنوں کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اُن کی سیاسیات کی بنیاد ایک ہے - ایک ہی اصول اور ایک ہی پروگرام ہے۔ اس لئے انھیں کسی قسم کے سستے نعروں کا شکار نہیں ہونا چاہیئے بلکہ سوچ سمجھ کر اپنی تنظیم کو مضبوط اور مستحکم بنانا چاہیئے۔

آپ نے مزید کہا کہ ریاست کے دشمن کچھ بھی کیوں نہ کریں ہم اپنے اصول سے ہرگز جھکنے والے نہیں۔ ہم نے اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لیا ہے اور ہماری آئین ساز اسمبلی نے الحاق کے مسئلے کو حل کر کے اسے آخری شکل دی ہے۔

تنویر علوی

فطرت سے دریوزۂ کائنات

مری جناب کا نظّارہ شوکتِ انجم
مرے وقار کا آئینہ عظمتِ خاور
سقوط و اوج کا پرتو مرا جلال و جمال
نظامِ زیست مری تیوروں سے زیر و زبر
مری حیات کا آئین زیب و زینت و فر
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے

شاعر:- مرے خیال کی رعنائیوں کا عکسِ جمیل
جنونِ عشق و محبّت فسونِ حسن و شباب
مری نگاہ کی تابانیوں سے نطق آموز
جہانِ لالہ و گُل کائناتِ مَوج و حباب
مری حیات کا رومان ذوقِ شعر و شراب
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے

سپاہی:- مرا جہانِ عمل رزم و تیغ و تیر و تفنگ
جدال و قتل و تاراج و تاخت و دار و گیر
مرے جہاد کی مرہون عظمتِ تاریخ
شکست و فتح کے عقدے مری نگہ کے اسیر
مری حیات کا سامان جوہرِ شمشیر
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے

بربط نواز:- بہارِ رقص و طرب مری جُنبشِ مضراب
فروغِ منظرِ ہستی مری نوائے سرود
مرے رباب کے تاروں میں زندگی مُضطر
مرے لبوں کے ترنّم میں نغمۂ داؤد
مری حیات میں اک ارتعاشِ سازِ وجود
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے

دولت مند:- مرا فسانۂ اقبال ثروتِ قارون
مرا نوشتۂ تقدیر دامِ لعل و گہر
مرے تموّل و دولت کی کوئی حد نہ حساب
مرے نقوشِ قدم سجدہ گاہ نقرہ و زر
مری حیات کا قانون کسبِ دولت و زر
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے

عالم:- مرے شعور کی دُنیا میں وسعتِ افلاک
مرا جہانِ خرد رازدار عالمِ پاک
رموزِ کون و مکاں میرے دل پہ آئینہ
مری نظر پہ سراپردۂ دو عالم چاک
مری حیات کے ذرّوں میں شعلۂ ادراک
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے

مصوّر:- نگار خانۂ ماضی مرے نقوشِ خیال
مری نگاہ کے پردوں میں صنعت آذر
مرے تصوّرِ رنگیں کا عکس دیر و حرم
جمالِ دوست مری چشم و روح میں مضمر
مری حیات رموزِ ازل کی صورت گر
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے

بُت تراش:- اُٹھا دئے مرے ہاتھوں نے پردہ ہائے مجاز
جمالِ شاہدِ معنی کو کر دیا تشکیل
نقوشِ زیست کی گہرائیاں حرارتِ رُوح
جماد و سنگ کی دُنیا میں کر دئے تحلیل
مری حیات کا ہر خواب اک حسیں تمثیل
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے

عروس:- مرے جمال کی دُنیا الوہیت اوصاف
مرے شباب کے دامن پہ سجدہ ہائے سروش
مرادِ جودِ حسیں امتزاجِ اشک و شرر
ملاحتیں بھی اگر ہیں تو ہیں صباحت کوش
مری حیات سے رُمانِ خلد ہم آغوش
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے

رُباعی

محرومِ تجلّیاتِ وافر ہو جائے
اپنے سے بہ میلِ جہل نافر ہو جائے
زاہد نہ کرے سجدہ تو مومن نہ رہے
عارف جو کرے سجدہ تو کافر ہو جائے

جوش ملیح آبادی

حامد علی خاں

غزل

تلوے مرے کانٹوں سے اگر پیار نہ کرتے
ہر دشت کو رشکِ رُخِ گلزار نہ کرتے

ہوتی نہ کبھی ختم شبِ تار ہماری
کیا کرتے، اگر ہم ترا دیدار نہ کرتے

پامالیِ دل کی نہ خبر تھی ہمیں، ورنہ
نظارۂ ہنگامۂ رفتار نہ کرتے

ہستی مری کس خوابِ پریشاں کی ہے تعبیر
سوتے تھے جو خود، وہ مجھے بیدار نہ کرتے

کچھ فرق نہ کھلتا کہ خزف کیا ہے، گہر کیا؟
ہم دل کو جو نذرِ نگہِ یار نہ کرتے

تھا حُسن ترا، دل کے خرابے کا خزانہ
اے کاش، زمانے کو خبردار نہ کرتے

کچھ پردہ دری ہی سے رہا پردہ ہمارا
ظاہر تھا سبھی کچھ، اگر اظہار نہ کرتے

لائیں جگر و دل کی خبر، تیری نگاہیں
مستوں نے کیا کام، جو ہشیار نہ کرتے

یہ رفعتِ تخئیل نہ ملتی ہمیں حامد
گر، وہ ہمیں دنیا میں نگوں سار نہ کرتے

مختار الدین احمد

تذکرۂ یادگارِ ضیغم

یادگارِ ضیغم اردو شعراء کا ایک مطبوعہ لیکن کم یاب تذکرہ ہے جو تیرھویں صدی کے تقریباً اختتام پر لکھا گیا ہے اور جس میں اس صدی کے نصف آخر کے بہت سے مشہور اور ممتاز شعراء کے علاوہ بیشتر ایسے شعراء کے حالات اور اشعار بھی درج ہیں جن کا ذکر دوسرے ماخذ میں نہیں ملتا یا کم ملتا ہے اور جو بعض حیثیتوں سے قابل قدر ہیں۔ شعراء کے تراجم میں بعض مرتبہ کام کی بات مل جاتی ہے اس لئے کہ بیشتر معاصرین سے ان کے تعلقات تھے یا ان کے حالات سے باخبر تھے۔ جو شعراء کم مشہور ہیں ان کی بابت اطلاعیں مشکل سے ملتی ہیں اس لئے یہ تذکرہ اپنی بعض خامیوں کے باوجود قابلِ قدر ہے۔

اب تذکرے کی وجۂ تالیف خود مؤلف سے سنیئے:

"محمد عبداللہ خاں ضیغم[1] بن محمد صلاح خاں مرحوم لکھنوی ... نے ارادہ کیا کہ یہ بہار جداگانہ ہر اک کے کلام کی باضافہ حالات ایک جا مجتمع ہو کر رنگِ ہستی دکھائے . . . کلام شعرائے ماسبق کا جمع کرنا فضول نظر آیا لیکن جس وفات یافتہ کا نام اس کے شاگرد کے بیان میں آگیا ہے تاآں . . . . . اس کا حال بھی لکھ دیا گیا اور حال شعرائے حال یعنی زندوں کا جو ۱۳۰۲ھ تک موجود ہیں مع کلام کے جس طرح مل سکا بہم پہنچایا اور ایک جا جمع کر کے یادگارِ ضیغم نام ٹھہرایا۔ جس نے خود تصویر بھیجی یا کسی اور طرح سے ہاتھ آئی درج کی گئی تا بمقدور لطافتِ بشری اس میں زینتِ ظاہری و باطنی بھر دی گئی۔"

یہ تذکرہ دو حیثیتوں سے اہم ہے، ایک تو یہ کہ اس میں صرف معاصر شعراء کا ذکر ہے اور انھیں کے حالات اور کلام جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، دوسرے یہ کہ بیشتر شعراء کی تصویریں بھی اس میں چھپی ہوئی ملتی ہیں۔ اس زمانے میں تصویروں کا رواج آج کل کی طرح نہیں تھا اور نہ اتنی آسانیاں میسر تھیں۔ پھر بھی مرتب کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے شعراء کی کثیر تعداد کی تصویریں کسی طرح حاصل کر لی تھیں اور انھیں کسی نہ کسی طرح چھاپ دیا ہے۔

یہ تذکرہ ۱۲۹۸ھ میں لکھا جانا شروع ہوا اور ۱۳۰۲ھ میں اختتام پذیر ہوا ہے۔ ۴۲۴ صفحات تک اصل تذکرہ ہے، پھر ۲۳ صفحوں کا ایک خاتمہ ہے جس میں ان شعراء کی فہرست درج کر دی ہے جن کے متعلق پوری اطلاع مرتب کو نہ مل سکی۔ خود لکھتے ہیں:

"مؤلف نے متواتر بجا بجا اطراف و اکنافِ ہند میں خطوط متواتر لکھے اور اشتہار اخبارات میں طبع کرائے اس پر بھی حضرات نے خواہ بوجہ تساہل مزاجی، خواہ بوجہ انکسار، خواہ بوجہ علوِ شانی دریغ کیا اور ان کا کلام مطبوعہ نظر سے گذرا تھا یا ان کے نام یا تخلص کسی طرح پر آگاہی تھی ان کا ترک کرنا مناسب نہ سمجھا گیا اور درصورت عدم دریافت حال یا عدم دستیابی کلام ان حضرات کا درج تذکرہ کرنا بھی احسن نہ سمجھا گیا اس واسطے ضرور ہوا کہ خاتمہ نسخہ ہذا میں ایک فہرست ان کی بہ اضافہ نام استاد اور جائے سکونت درج کی جائے۔"

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کا نام اس فہرست میں درج ہے، لیکن یہ چھپا ہوا نہیں ہے بلکہ دوست یا کسی نے قلم سے اضافہ کیا ہے۔ "آزاد مؤلف آبِ حیات، جائے سکونت لاہور، تخلص استاد کی جگہ چلیپا نشان × یعنی معلوم نہیں۔" یہ بھی بڑی دلچسپ بات ہے کہ آبِ حیات کے مؤلف کا ذکر اصل تذکرے میں نہیں۔ ضمیمہ کی فہرست میں قلم سے بڑھایا گیا ہو اور یہ کہ وہ ذوق

(۱) مؤلف نے اپنے حالات تفصیل سے یادگارِ ضیغم میں لکھے ہیں ملاحظہ ہو ص ۲۰۲-۲۰۴ اس کا خلاصہ آگے آئے گا۔ سنہ ۴۱۔ ان کا ذکر خم خانۂ جاوید میں بھی موجود ہے۔

کے شاگرد ہیں یہ بات بھی عام طور پر لوگوں کو معلوم نہ ہو۔

پھر غلط نامہ درج ہے۔ صفحہ ۱۷۴ پر عرض حال مؤلف کا ہے جس میں اس بات کی استدعا ہے کہ جن حضرات کا کلام یا حال اس میں درج نہیں وہ اپنے حالات اور تصویر بھیج دیں تاکہ طبع ثانی میں درج ہو سکے۔ جن لوگوں نے تالیفِ تذکرہ میں مدد دی ہے ان میں عظیم اللہ انجمی، شوق عظیم آبادی کے نام بھی ملتے ہیں۔ پھر ۲۰ صفحوں میں شعراء کے قطعات تاریخ ہیں جن میں بہادر حسین انجم، بدر آذری، جلال لکھنوی، یاس لکھنوی، صفیر بلگرامی کے قطعات قابلِ ذکر ہیں۔ کچھ قطعات ۱۳۱۰ھ کے ہیں اور کچھ سے ۱۳۱۱ھ کے اعداد مستخرج ہوتے ہیں۔

یہ تذکرہ اب کمیاب ہے، میرے پاس دو نسخے ہیں اور دونوں اس قدر بوسیدہ ہیں کہ اب ان سے کام لینا مشکل ہے۔ نہایت معمولی قسم کے بادامی کاغذ پر کتاب چھپی ہے اور لیتھو ہی پر تصویریں چھاپ دی گئی ہیں۔ تصویریں اچھی شائع نہیں ہوئی ہیں لیکن ایسے کاغذ اور اس زمانے کے لیتھو پر اس سے اچھی تصویریں کیا چھپ سکتی تھیں۔ یہی غنیمت ہے کہ انھوں نے تصویریں شائع کر دیں اور بہت سے شعراء کی تصویریں ہمارے سامنے آگئیں۔

تذکرے کی کمیابی اور مطبوعہ نسخوں کی زبوں حالی اور تصاویر کی اہمیت کی وجہ سے بھی خیال ہوا کہ کسی طرح یہ تصویریں چھاپ کر محفوظ کر دی جاتیں تو بڑا کام ہوتا۔ جناب عرش ملسیانی صاحب سے جو پرانے شعراء کے حالات اور کلام سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں، ذکر آیا تو وہ شائع کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ اب اس تذکرے کے تقریباً سارے شعراء کی تصویریں آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ اس طرح سے یہ قیمتی ورثہ ہمارے پاس پھر ایک مدت کے لئے محفوظ ہو جائے گا۔ بعض مشہور اشخاص کی تصویریں شائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی جیسے داغ، نواب کلب علی خاں، میر محبوب علی خاں، سالار جنگ، واجد علی شاہ اختر و ظفر وغیرہ کی تصویریں عام طور پر ملتی ہیں۔ صفیر بلگرامی کی ایک تصویر بہار کے ایک رسالے میں جناب وصی بلگرامی نے شائع کی ہے۔ وہ تصویر عالمِ ضعیفی کی ہے۔ اس تذکرے کی تصویر آغازِ شباب کی ہے اور قیاس ہے کہ خود صفیر نے انھیں بھیجی ہوگی۔ میری مرتب کردہ کتاب احوالِ غالب میں صفیر بلگرامی کی تصویر وہیں سے لی گئی ہے۔

جن شعراء کی تصویریں شائع کی جا رہی ہیں افادیت کے لئے ان کے حالات بھی تذکرے سے لے کر مختصر طور پر چھاپے جا رہے ہیں۔ عبارتیں اکثر جگہ صاحبِ تذکرہ ہی کی ہیں کہیں کہیں نقطے لگا کر عبارت حذف کر دی گئی ہے۔ بعض مقامات پر اختصار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عبارت کا خلاصہ کر دیا گیا ہے۔ مرتب نے سنینِ ولادت منفیا تشریحاً لازماً ضرور دیئے ہیں۔ استاد کے نام کے اندراج کا بھی التزام ہے۔ یہ بہر حال نقل کیا گیا ہے۔ ش سے مراد شاگرد ہے۔

اب ذیل میں ان شعراء کے ترجمے درج کئے جاتے ہیں جن کی تصویریں دیا ریم میں موجود ہیں۔ ان کے مطالعے کے بعد اب ان کی تصویریں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ **انجم**، بندہ رضا عرف جن صاحب متوطن بلدہ لکھنؤ، میر حسن عسکری عرف میر کلو عرش کے شاگرد ہیں۔ ناسخ کے شاگرد ہونے کا شبہ نسبت ان کے واہیات ہے۔ انھوں نے سوائے عربی فارسی کے کتب طبیہ بھی پڑھی ہیں آدمی ذہین ہیں۔

۲۔ **اصغر**، اصغر علی قوم شیخ تعلقدار گنداره ضلع بہرائچ کے فرزند ہیں۔ ش قدر بلگرامی، مرثیہ گوئی میں میاں فرہاد ش دبیر سے مشورہ ہے۔ عمر قریب چھبیس برس کی ہے۔ اردو و فارسی دونوں کہتے ہیں۔

۳۔ **ارمان**، عبدالعزیز خاں بن امیر خاں تحصیلدار ریاست میسور، عمر قریب ۲۶ برس، ابتدا میں عبدالقادر محمود مدراسی سے اصلاح لی پھر رامپور جا کر داغ کے شاگرد ہو گئے۔ ارمان و مغفور دونوں تخلص کرتے ہیں۔

۴۔ **افسر**، سید احمد مولد و مسکن حیدرآباد عمر قریب ۴۲ برس، ش نواب میر عباس حسین خاں ششدر حیدر آبادی ہم سوخت اور مثنویات غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ ان کے استاد نے باوجود دکنی ہونے کے زبان خوب صاف کی ہے۔ یہ بھی اچھا کہتے ہیں۔

۵۔ **احقر**، محمد بشارت حسین وطن اصلی صوبۂ بہار، رئیس خاندانی ہیں۔ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے ہیں۔ ش ازل لکھنوی، تیز طبیعت ہیں، عمر ۲۶ برس کی ہے مثنوی "محبوب فصاحت" انھیں کی تصنیف ہے۔

۶۔ **امیر**، احمد حسن ولد محمد ظہور علی مشہری، ان کے والد نہایت معزز اور دولت مند تھے۔ سرکار انگریزی میں اچھے اچھے عہدے پائے۔ گورکھپور میں وکیل مشہور و نامور تھے۔ انھوں نے بھی عمدہ تعلیم پائی۔ حافظ ہیں۔ علم عربی و فارسی بقدر ضرورت جانتے ہیں۔ عمر ۲۵ برس کی ہے ش امیر مینائی۔

۷۔ **بیدار**۔ ٹھاکر کشن سنگھ بہادر قوم برہمن، پنجاب کے ایک بڑے رئیس کے پوتے اور ولی عہد ہیں، وہ والی کشن کوٹ ہیں۔ سرکار سے خطاب اے سی ایس آئی، معین الدولہ، اسٹار آف انڈیا کا حاصل کیا ہے۔ فن شعر میں پہلے

منشی بینی رام قامر سے تلمذ تھا۔ اب کچھ تھوڑی مدت سے نواب مرزا خاں داغ دہلوی کو کلام دکھاتے ہیں، شاعری کی طرف بہت توجہ ہے۔ خوش فکر خلیق آدمی ہیں عمر ۲۳ برس کی ہے۔ دیوان مطبوعہ موجود ہے۔

۸۔ **تعمیر**، سید اصغر علی دہلوی وارد حال سیتاپور۔ حکیم محمد علی خاں جو مہاراجا بلونت سنگھ بھرت پور کے استاد ہیں ان کے پوتے ہیں۔

۹۔ **تسلیم**، منشی رام پہلے ڈپٹی کلکٹر بدایوں، با لیاقت خوش فکر ہیں، شاگردی کا حال معلوم نہیں سنا گیا ہے کہ ان کے استاد کا تخلص مہر ہے واللہ اعلم یہ مہر کون ہے ہیں مگر نام روشن ہے۔

۱۰۔ **تسنیم**، محی الدین حسین خاں، والی کرناٹک کے نواسے ہیں۔ مولد و مسکن مدراس، عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی بھی جانتے ہیں شعر پہلے کوثر خیرآبادی سے پھر سید اسمٰعیل حسین منیر سے تلمذ حاصل کیا۔ ان کے انتقال کے بعد لطافت لکھنوی سے اور ان کی رحلت کے بعد سید عباس حسین فصاحت خلف امانت لکھنوی سے اصلاح لینی شروع کی۔ اس قدر ہجوم فیض ہوا کہ مدراسی زبان سے بدل کر لکھنؤ کی زبان میں کہنے لگے۔ دیوان قریب اختتام ہے۔

۱۱۔ **تائب**، محمد عبداللہ ولد شیخ کریم بخش، عمر قریب ۲۵ برس۔ تحصیل علم حافظ مولا بخش وغیرہ سے کی ہے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں، دیوان دیکھ کر تتبع اساتذہ کا کرتے رہے، ذکی الطبع با علم ہیں۔ اکثر آتش اور منشی جمال الدین سے شعر کی صحبتوں میں چلی کٹی ہوتی رہتی ہے۔

۱۲۔ **جوہر**، جواہر سنگھ لکھنوی، ملازم مہاراجا بلرام پور، تصنیف اکثر مطبوعہ موجود ہے۔ فارسی میں ان کو تلمذ محمد خاں ناطق سے اور اردو میں وزیر لکھنوی سے ہے۔ یہ جنگی شاعر ہیں آغا احمد علی بنگالی اور مرزا نوشہ غالب مرحوم کے مناظرہ بابت تصحیح برہان قاطع رہا ہے انھوں نے اس کو نظم کیا ہے۔ اپنی رائے کو بھی دخل دیا ہے خود حکم بن کر غالب کو مغلوب ٹھہرایا ہے۔

۱۳۔ **جادو**، تہور حسین لکھنوی عمر ۱۴ سال۔ فی الحال رام پور میں مقیم ہیں۔ ش جلال لکھنوی۔

۱۴۔ **حسن**۔ سجاد حسن بن سید امداد حسین وطنی اصلی ہنسارہ ضلع محمد آباد۔ کچھ دنوں وکالت ضلع سہارن پور میں کرتے رہے۔ بعدہٗ بجائے اپنے والد کے پیشکار تحصیل ضلع مرزا پور میں رہے۔ اب منصرم جج ضلع مظفر پور ہیں۔ ش غلیم اللہ رشمی سید پوری۔

۱۵۔ **حیدر**، حیدر علی بیگ خلف آغا بندہ علی بیگ مشہدی دہلوی مصنف تصانیف کثیرہ، غالب سے ان کو تلمذ رہا۔ فی الحال اٹاوہ میں امدیبیر ہیں۔ آدمی ہوشیار سب قسم کی شاعری پر قادر ہیں۔

۱۶۔ **حسن**، سید محمد حسن رضوی بن سید محمد علی رئیس مچھلی شہر، قیام فرخ آباد کے زمانے میں شعر کہنا شروع کیا اور صفیر فرخ آبادی سے اصلاح لی۔ ایک غزل منیر کو بھی دکھائی تھی۔

۱۷۔ **خلیل**، میر محمد ابراہیم علی خاں امین الدولہ، وزیر الملک صولت جنگ فرمانروائے ٹونک، نہایت کریم الاخلاق، حمیم الاشفاق، خوش فکر، خوش وضع عمر قریب ۴۰۔

۱۸۔ **خورشید**۔ نواب خورشید احمد خاں خلف شاہ انوار الحق نور ٹوپاموی، دیوان اردو مرتب شاید اپنے والد سے مشق سخن کی ہو۔ فی الحال مدراس میں سکونت پذیر ہیں۔

۱۹۔ **خلش** میر سید علی فرزند حاجی سید محمد مچھلی شہری عمر ۴۰۔ ہاشمیر مچھلی شہری کے برادر عم زاد ہیں۔

۲۰۔ **داغ**، نواب مرزا خاں خلف شمس الدین خاں دہلوی مدت سے داروغہ اصطبل و فراش خانہ نواب صاحب بہادر والی رام پور ہیں۔ ذوق کے عمدہ تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کی حیات تک کم مشہور ہوئے۔ بعد اُن کے انتقال کے اچھا نام پایا۔ چوچلے کی طبیعت ہے۔ گھر کے مضامین میں معاملہ بندی اور بندش صاف پر بہت نظر رہتی ہے اور کیوں نہ ہو شانِ استادی اسی سے معلوم ہوتی ہے۔ ان کے اکثر اطراف و جوانب میں شاگرد ہیں عمر قریب ساٹھ برس کی ہے۔ دہلی میں اب انھیں کے دم سے مذاقِ سخن ہے۔ علم بقدر مناسب ہے۔

۲۱۔ **دارا** خواجہ بہاؤ الدین خان خلف خواجہ لیلی علی خاں شکوہ، اُمرائے حیدرآباد سے ہیں۔ عمر قریب ۳۰، شاعری ان کی موروثی ہے۔ عروض اچھا پڑھا ہے۔ ان کے والد نے اپنے مخبر قادر الدولہ نور الحسن سے اس فن کو سیکھا تھا۔ ان کو مشورہ خواجہ محمد مرتضیٰ خاں بقا لکھنوی سے رہا ہے۔ دیوان دارا بشمول دیوان شکوہ چھپ گیا ہے۔

۲۲۔ **دوست**، سید خواجہ ولد سید حیات حیدرآبادی ش شیخ فدا حسین مشہور لکھنوی عمر قریب ۳۵، دیوان گلزار حیات چھپ چکا ہے۔

۲۲۳۔ **راز**، نواب محمد عبیداللہ خاں قرابت دار والیٔ ٹونک، فی الحال مدارالمہام ریاست بھی ہیں۔ سرکار انگریزی سے سی، ایس آئی فیروز جنگ کا خطاب پایا۔ عمر قریب ۰۳ برس، محمد سلیمان خاں اسد لکھنوی ان کی رفاقت میں رہتے ہیں۔ غالباً انھیں سے مشورہ ہوگا۔

۲۲۴۔ **رؤف**۔ رؤف احمد خاں خلف حاجی حافظ نواب خورشید احمد خاں خورشید نواسے نواب عظیم جاہ بہادر والیٔ سابق مدراس کے ہیں۔ ۴۲ برس کی عمر ہے۔ ش شریف مدراسی۔ دو دیوان غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ کبھی کبھی پرتو بھی تخلص کرتے ہیں۔

۲۲۵۔ **رشید**، محمد شکر اللہ خاں لکھنوی تحصیل دار اورنگ آباد دکن بزرگوار ان کے لکھنؤ میں شرفا معززین سے شمار کئے جاتے ہیں، عمر ان کی قریب پچاس برس کے ہے۔ امامیہ مذہب رکھتے ہیں۔ ش دبیر لکھنوی، مرثیہ و سلام بھی کہتے ہیں۔ اچھی طبیعت پائی ہے۔

۲۲۶۔ **راجی**، عبدالرزاق بن محمد سلطان، ان کے بزرگ نواب حیدر علی خاں میسور کے یہاں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز رہے ہیں۔ ش غلام محمد خاں صفی عمر تینتیس ۳۳ برس۔ میسور میں مدرس ہیں۔

۲۲۷۔ **سحر**، منشی دیبی پرشاد خلف دش چنی لال بدایونی عمر ۲۸ فی الحال ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع بدایوں، دیوان سحر اور تین واسوخت ان کی تصنیف سے موجود ہیں، نظم پروین مراۃ الصفا و خلاصۂ جغرافیہ غیر مطبوعہ ہے۔

۲۲۸۔ **سلیم**، محمد سلیم اللہ عرف محمد عبداللطیف بن مولوی محمد غلیم اللہ زخمی سیدپوری عربی، فارسی، انگریزی حسب ضرورت جانتے ہیں۔ مدرسۃ العلوم میں تعلیم پائی اب مسل خواں درجہ دوم ہیں۔ حکام ان کی لیاقت سے خوش رہتے ہیں۔ عمر ۲۶ برس۔

۲۲۹۔ **شفا**، محمد عمر، مولوی محمد ظہور صدر الصدور ضلع غازی پور کے عزیزوں میں ہیں۔ عمر قریب ۵۰ سال ش نواب محمد حسن خاں الم (ش آتش) کچھ غزلوں پر زخمی سے بھی اصلاح لی ہے۔

۲۳۰۔ **شغل**۔ بنواری لال بن منشی موتی لال اصل وطن فیروز حصار ملک پنجاب، ولادت سہارن پور میں ہوئی۔ اب ۱۴ برس سے علی گڑھ میں وکالت کرتے ہیں۔ عمر قریب ۴۳ سال۔ پہلے منشی بال مکند سے تخلص تھا بعدۂ غالب کے شاگرد ہوگئے۔ ایک دیوان، ایک مثنوی اور ایک رسالہ شطرنج ان کی تصنیف سے ہے۔

۲۳۱۔ **شکر**، دانیال گارڈنر خلف و شاگرد سلیمان شکوہ گارڈنر عرف متاجان تھا۔ رئیس و تعلقدار چھلونی کاس گنج ضلع ایٹہ ہیں۔ اب مرزا عباس حسین ہوش لکھنوی سے مشورہ لیتے ہیں، ان کے والد کی شادی نواب صاحب کھماج کی دختر خاص سے ہوئی۔ انگریزی میں تو فائق ہیں فارسی بھی خوب جانتے ہیں۔

۲۳۲۔ **شوکت**، شوکت علی خلف سید عوض علی ڈپٹی کلکٹر و اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اودھ عمر ۳۵، ہشیر کملی سٹری کے بھانجے ہیں اور انھیں کے شاگرد۔

۲۳۳۔ **شاعر**، فضل حسین خاں خلف سید فضل رسول خاں واسطی آنریری مجسٹریٹ سندیلہ، ان کے والد کو امیر لکھنوی سے اور انھیں ظہور لکھنوی سے مشورہ ہے۔ عمر قریب ۴۳ سال۔

۲۳۴۔ **شریف**۔ محمد شریف عرف محمد حفیظ اللہ فرزند کلاں مولوی محمد عظیم اللہ رغمی عمر ۴۰ سال۔ مہذب و پابند شرع۔ پیشہ لیاقت۔

۲۳۵۔ **شاداں**، زین العابدین ولد مولوی محمد حسین مرحوم۔ رغمی کے بڑے یار غار ہیں۔ عمر ۴۰ سال فی الحال فی الحال ماتحت جج درجہ دوم مراد آباد ہیں۔ اعزا ہمیشہ سے عہدہ ہائے معزز سرکار انگلشیہ میں ملازم رہے۔

۲۳۶۔ **شہیر**، سید محمد نوح خلف سید رحایت علی۔ ان کے والد نے غدر میں بڑی خیر خواہی کی چنانچہ صلے میں تین ہزار روپے کا علاقہ سرکار سے مرحمت ہوا۔ خواجہ بادشاہ شہیر خلف خواجہ وزیر سے چند غزلوں پر اصلاح لی۔ پھر منیر شکوہ آبادی کے شاگرد ہوئے۔

۲۳۷۔ **شیدا**، نبی بخش۔ آبائی وطن ان کا داناپور (بہار) پیدائش شہر میرٹھ میں ہوئی۔ عمر قریب ۴۰ سال دیوان "رموز بلیغ" مطبوعہ ہے دوسرا مرتب ہو رہا ہے۔

۲۳۸۔ **شکیب**۔ نواب مرزا دہلوی۔ وکیل حیدرآباد ش حبیب کنتوری، ہوش بریلوی، کاظم حسین شیفتہ۔

۲۳۹۔ **ضمیر**۔ سید فرزند احمد نام ابن میر سید احمد بلگرامی مولد مارہرہ۔ مگر پانچ برس کی عمر سے اپنے بزرگوں کے ہمراہ آرہ ضلع شاہ آباد میں آئے اور وہیں سکونت اختیار کی، پہلے میر سے اصلاح لی پھر مظفر کے شاگرد ہوئے۔ مرثیہ گوئی میں دبیر سے مشورہ رہا۔ فارسی میں غالب دہلوی کے شاگرد ہوئے۔

۲۴۰۔ **ضمیر**، محمد عبدالصمد خلف مولوی محمد صدیق عدالت غازی پور میں درجۂ اول

کے وکالت کرتے ہیں۔ عمر قریب ۴۰ برس کے ہے۔ بذلہ سنج اور لطیفہ گو ہیں۔
ش عبدالعلیم آسی ۔

۴۱۔ **ضو**۔ افضل علی بن ہادی علی بدایونی عمر قریب ۴۳۔ ش ارشد علی ضیا، ان کا سلسلہ ظہور اللہ خاں نوا (معاصر جرأت) تک پہنچتا ہے۔ تاریخ گوئی سے ان کو نہایت شوق ہے۔

۴۲۔ **ضیغم**، محمد عبداللہ خاں (مؤلف تذکرہ) بن محمد صلاح خاں لکھنوی ۱۲۹۵ھ میں حیدرآباد اپنے خالو آنریبل سر شرف الامرا بہادر محمد صفی اللہ خاں انوار (متوفی ۱۲۹۰ھ) کے یہاں آئے اور ان کی صبیہ کے ساتھ شادی ہوئی۔ آباؤ اجداد مؤلف کے شاہان اودھ کے دربار میں جاگیریں اور انعامات پاتے رہے۔ جس روز سے کمترین نے آنکھ کھولی اب کو قریب پچیس برس کے عمر پہونچی بفراغت تمام بسر ہوئی۔ نواب عباس حسین شفنہ کی صحبت میں شعر و سخن کا شوق ہوا۔ جو کچھ کہتا تھا انھیں سے اس پر اصلاح لیتا تھا پھر نیاز احمد خاں ہوش نبیرۂ حافظ رحمت خاں جو امیر لکھنوی کے مشہور تلامذہ میں ہیں حیدرآباد آ گئے۔ حضرت نے مؤلف کے حال پر شفقت فرما کر اصلاح دی چنانچہ اب تک حضرت سے مشورہ ہے۔

۴۳۔ **طراز**۔ میر محمد ولد سید محمد غفور رضوی مچھلی شہری۔ درسی کتابیں اپنے عزیز بشیر مچھلی شہری سے پڑھیں۔ عمر ۲۵ سال۔

۴۴۔ **عاشق**۔ شنکر دیال لکھنوی، ضلع اناؤ میں نقل نویس ہیں اور حال معلوم نہیں۔ کلام آیا۔ درج تذکرہ کیا گیا۔

۴۵۔ **عاقل**۔ عطاالرحمٰن خاں ابن سید مولوی حبیب اللہ خاں رئیس و تعلقہ دار گورکھپور بزرگوار ان کے ہمیشہ زمانۂ شاہی میں معزز عہدوں پر ممتاز رہے۔ عمر قریب ۵۰ برس۔ پانچ چھ سال سے شعر گوئی کا شوق ہے۔ امیر مینائی کے شاگرد ہیں۔ صاحب دیوان ہیں۔

۴۶۔ **عزیز**۔ امراؤ سنگھ ساکن سونی پت ضلع دہلی۔ تعلیم انگریزی کی مدرسۂ سرکاری میں پائی۔ فارسی و عروض وغیرہ مولوی جعفر علی سے سیکھا۔ فن شعر میں بھی انھیں کے شاگرد ہیں۔ تیس برس کی عمر ہے۔ اردو فارسی دونوں کہتے ہیں

۴۷۔ **عظیم**۔ محمد عظیم الرحمٰن میرٹھی۔ ستائیس برس کی عمر۔ محمد احسان اللہ مختر کے شاگرد ہیں۔

۴۸۔ **عزت**، گورکھ پرشاد، گورکھپوری۔ حکیم سید ساجد علی فطرت گورکھپوری کے شاگرد ہیں لیکن اس کو وہ رسنانہ استفادہ سمجھتے ہیں۔ اس رنگ کی شاعری کو جو مروج زمانہ حال ہے مجبوٹ جان کر بہ ہدایت اپنے استاد فطرت کے چھوڑ کر سچی باتیں انگریزی طور پر کہنے لگے۔ اس کی وجہ خاص یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو انگریزی اچھی طرح حاصل کی اسی زبان کے نظم کے طریقے پر چلنا پسند آیا۔ خیر ہر ایک اپنی رائے کا مختار ہے ہمیں اس میں کیا دخل ہے۔ عمر قریب ۲۰ برس۔ طبیعت تیز ہے۔ مثنوی ’حسن فطرت‘ ان کی تصنیف سے ہے۔ ایک مسدس طبع ہو چکا ہے۔

۴۹ **غشی**، سید وجیہہ الدین (صحیح نام وحید الدین) پیدائش قصبہ مارہرہ ضلع بلند شہر۔ ش میر مومن حسین صفی امروہوی حیدرآباد میں بہ شغل ملازمت مقیم ہیں۔

۵۰۔ **فضل**۔ محمد فضل اللہ بن محمد غلیم اللہ رشمی۔ انھوں نے اپنے برادر عبداللطیف تسلیم کے ساتھ جا کر مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں انگریزی فارسی پڑھی۔ اب میور کالج الہ آباد میں پڑھتے ہیں۔ عمر قریب ۲۶ برس۔ اپنے والد رشمی سے مشورہ رکھتے ہیں۔

۵۱۔ **فہیم**۔ محمد باقر برادر میر صادق حسین منشی محکمہ اجلاس خاص و منتظم سررشتہ عمارت و سڑک بھرت پور۔ داغ کے شاگرد ہیں۔

۵۲۔ **قمر**۔ محمد احمد خلف امیر مینائی۔ ہمیشہ سے ان کے بزرگوار معزز رہے۔ ان کے والد کی رام پور میں بڑی عزت ہے۔ ان کو اپنے والد ہی سے تلمذ ہے۔ عمر قریب ۲۴ برس، تیز طبیعت ہوشیار ہیں۔ علم مناسب ہے فکر صائب ہے۔

۵۳۔ **قاصر**۔ ٹیپو خاں ولد محی الدین خاں مقیم بنگلور۔ علم بقدر ضرورت جانتے ہیں۔ ش خطیب حسن کلیم بنگلوری۔

۵۴۔ **قسیم**۔ محمد ابراہیم متوطن بنگلور۔ ش خطیب حسن کلیم بنگلوری۔

۵۵۔ **کلیم**۔ خطیب حسن خاں مقیم بنگلور۔ عربی و فارسی میں بخوبی استعداد ہے۔ مولوی ہیں۔ مزید براں حافظ ہیں۔

۵۶۔ **گرامی**، سید نور احمد خلف و شاگرد صفیر بلگرامی عمر قریب ۳۰ سال۔ آرہ ضلع شاہ آباد میں مقیم ہیں۔

۵۷۔ **گوہر**۔ منشی گیندن لال بدایونی۔ فی الحال پیشکار کلکٹری شاہ جہاں پور ہیں، عمر قریب پچاس برس۔

۵۸۔ **محمود**۔ محمود الحق دہلوی۔ طب میں اچھی دست گاہ ہے۔ پہلے ضلع پرتاب گڑھ میں تحصیل دار تھے۔ اب سرکار انگریزی سے پنشن پاتے ہیں۔ ش مرزا غالب۔

۵۹۔ **محسن**۔ محمد محسن ولد سید محمد طفیل رضوی مچھلی شہری، ملازم سرکار انگریزی طبیعت موزوں شعر گوئی کی طرف کم توجہ ہے۔ عمر قریب ۲۶ سال۔

۶۰۔ **مظہر**۔ مظہر الاسلام خاں خلف حاجی بشیر احمد خاں بہادر گوپاموی قدیم رئیس ہیں۔ فی الحال مدراس میں سکونت رکھتے ہیں۔ ش امیر مینائی۔ صاحب دیوان

۶۱۔ **مذاق**۔ احمد حسین خاں تعلقدار پریا نواں ضلع پرتاب گڑھ۔ عمر ۲۵۔ ش حیدر علی شاہ مضطر لکھنوی۔ جوان طبع، خوش وضع دیوان چھپ چکا ہے۔

۶۲۔ **منظور**۔ محمد منظور احمد خلف شفاعت اللہ بدایونی شکوہ آباد میں مختار ہیں عمر ۴۲ ش داغ۔

۶۳۔ **مغموم**، سیٹھ اسمٰعیل، اکثر شعراء کو پہلے اپنا یار بناتے ہیں پھر اس سے مباحثہ کرتے ہیں، مقیم مدراس عمر ۵۳۔

۶۴۔ **نواب**۔ کلب علی خاں۔ کچھ دنوں غالب اور کچھ روز دوں امیر سے اس فن میں مشورہ رہا۔ ناظم تخلص فرماتے تھے۔ سنہ ۱۲۸۹ھ میں وفات پائی۔ عمر قریب ۵۰

۶۵۔ **نسیم**۔ محمد حسین علی سلطان متوطن میسور۔ مختلف لوگوں سے مشورہ رکھا ہے۔ اردو میں میر شمس الدین فیض کے شاگرد، عمر ۵۰۔

۶۶۔ **نجم**، نجم الدین ولد و ش مولانا احمد علی چڑیا کوٹی۔

۶۷۔ **ناظم**۔ محمد شفیع خلف منشی نادر علی میرٹھی عمر ۶۳ ش حکیم مومن دہلوی، مرثیہ گوئی میں سجاد حسین عشیر خلف مشیر کے شاگرد ہیں، تلمذ ہے۔

۶۸۔ **نامی**۔ شیو دیال ولد ٹھاکر لال یا گوبند۔ متوطن خیرآباد۔ عمر ۳۵۔

۶۹۔ **نوشہ**۔ ذوالفقار بہادر عرف نواب بہادر۔ باندہ میں سنہ ۱۲۷۲ھ میں پیدا ہوئے۔ عمر ۳۲۔ ش نواب کلب علی خاں

۷۰۔ **نفیس**۔ بھوانی پرشاد ولد چنی لال، پہلے بھولا ناتھ کے شاگرد تھے پھر سرفراز علی وصفی سے اصلاح لی۔ حیدرآباد میں وکالت کرتے ہیں۔

۷۱۔ **ولی**۔ ولی محمد غازی پوری۔ ش۔ عنایت علی بسمل

۷۲۔ **وفا**۔ عزیز الدین بن مولوی احمد علی خاں۔ حیدرآباد کے نامی مولوی ہیں۔ ش نواب خیرات علی خاں سعی حیدرآبادی۔

۷۳۔ **ہوش**۔ نیاز احمد خاں خلف نواب نثار احمد خاں۔ مؤلف کے استاد ہیں۔ حافظ رحمت خاں کے پوتے ہیں۔ عمر ۵۴۔ ش جوش بریلوی و اسیر لکھنوی۔

۷۴۔ **ہوش**۔ محمد اعظم گھٹالا ابن عزیز الدین گھٹالا دید۔ ڈپٹی کلکٹر اکاٹ عمر ۵۴

۷۵۔ **ہیگن**، ہیگن بیگ ولد مرزا محمد علی بیگ مقیم میرٹھ۔ ش جان شور د احسن امروہوی

۷۶۔ **مہر**۔ دیوکی نندن عمر ۶۳۔ ش وحید الہ آبادی و مہدی حسن خاں رفعت لکھنوی

۷۷۔ **یکتا**۔ وزیر چند ولد بخشی داس عمر ۴۰۔ اکثر انگریزی قصوں کا ترجمہ اردو میں منظم کیا ہے۔ ش مولوی برخوردار برخوردار

ان ۷۷ شعراء کے حالات مختصر طور پر آپ جان گئے۔ اب انھیں دیکھنا چاہتے ہوں تو آئندہ صفحات میں تصویریں ملاحظہ فرمائیے اور کلام پڑھنا چاہتے ہوں تو اصل تذکرے کی طرف رجوع کریں۔

مانی جائسی

غزل

اے دل ابھی غم نہ کر زرا بھی — غم کی ہوتی ہے انتہا بھی
رہرو بھی ہے عشق، رہنما بھی — منزل بھی ہے عشق راستا بھی
تکلیفِ کرم نہ کیجئے اب — ہے دل میں ستم کا حوصلا بھی
اپنی خاطر سے رحم فرماؤ — ہاں زینتِ حسن ہے وفا بھی
کیا جنسِ عزیز ہے مرا دل — طالب ہے نگاہِ دل ربا بھی
محرومِ امید ہی نہ کر دو — ہو جاؤ اگر کبھی خفا بھی
دل کی بپتا کہوں تو کس سے — ہیں یوں تو عزیز آشنا بھی
دیکھیں مری ملتجی نگاہیں — میں کہہ چکا، آپ نے سنا بھی

تھی موت رفیقِ زیست مانی
مرتا بھی رہا میں اور جیا بھی

مائل نقوی

بھوپال تال اور رانی کملاپتی

ہندوستان میں یہ کہاوت بہت مشہور ہے کہ

تال تو بھوپال تال اور سب تلیاں
رانی تو کملاپتی اور سب گدھیاں

کہاوتوں کی بابت اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ لوگوں اور قوموں کے سیکڑوں سال کے تجربے ہوتے ہیں جنھیں سادہ اور مختصر الفاظ میں ادا کر دیا جاتا ہے۔ ان کے ذریعے کسی حقیقت کو بیان کیا جاتا ہے، یا فطرت کے کسی پوشیدہ راز پر سے پردہ اُٹھایا جاتا ہے۔ یہ باتیں چونکہ اصلیت کے مطابق ہوتی ہیں اس لئے بہت جلد قبول عام حاصل کرکے زبانوں پر جاری ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ حال بھوپال تال، اور رانی کملاپتی کا بھی ہے۔

بھوپال تال سے گزرنے والے مسافر بھوپال تال دیکھنے کا شوق ضرور اپنے دل میں لئے رہتے ہیں، اور جن کو ذرا دیر کے لئے بھی ٹھیرنے کا موقع مل جاتا ہے وہ یہاں کے قابل دید مقامات میں سب سے پہلے تالاب ہی کا رُخ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس تالاب کو اگرچہ مذہبی اعتبار سے کوئی بڑائی حاصل نہیں پھر بھی اس کے گھاٹوں پر اشنان اور تفریح کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ یہ لوگ جب تالاب کی وسعت اور آس پاس کے شاندار منظر دیکھتے ہیں تو بےساختہ ان کی زبان سے تالاب کے لئے عظمت کے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ لیکن ناظرین کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ بھوپال تال جس کی اتنی کچھ شہرت ہے یہ وہ نہیں ہے۔

اصل بھوپال تال موجودہ شہر بھوپال سے جنوب کی طرف چند میل کے فاصلے سے شروع ہوکر چالیس میل تک چلا جاتا تھا، اور اس کا پانی ڈھائی سو میل مربع سے زیادہ زمین کو اپنے دامن میں لئے ہوئے تھا،

اس تالاب کو مالوے کے مشہور فرماں روا راجہ بھوج نے آج سے چودہ سو سال قبل تعمیر کرایا تھا۔

اتنا بڑا تالاب کیوں تعمیر کیا گیا؟ تاریخ اس کا جواب دینے سے خاموش ہے۔ اُس لئے اصل سبب کا کھوج لگانے کی غرض سے اُن روایتوں کی طرف آنا پڑے گا جو اس علاقے میں نسل در نسل بیان ہوتی چلی آئی ہیں۔ اُن میں سے مندرجہ ذیل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ جب راجہ بھوج کو اپنے جسم میں مرض برص کے کچھ آثار نظر آئے۔ راجہ یہ دیکھ کر بہت گھبرایا، اور سلطنت کے راج ویدوں کو علاج کی طرف متوجہ کیا۔ ان کی جماعت نے آپس میں صلاح مشورے کے بعد یہ علاج تجویز کیا کہ راجہ روزانہ طلوع آفتاب کے وقت چند ایسے نالوں اور ندیوں میں نہایا کرے جن کا پانی خاص قسم کی جھاڑیوں اور درختوں میں سے ہوکر گزرتا ہو۔ یہی تجویز تھی جو تالاب کی صورت میں عمل میں لائی گئی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ راجہ نے ایک رات بڑا ہولناک خواب دیکھا جس میں خود اُس کی جان اور خاندان اور حکومت کی تباہی کی طرف اشارہ پایا گیا۔ راجہ نیند سے چونک پڑا۔ صبح ہوتے ہی دربار کے پنڈتوں کو طلب کرکے اپنا خواب بیان کیا اور آنے والی بلا کو ٹالنے کی تدبیر دریافت کی۔ گنوان پنڈتوں نے بتایا کہ راجہ کو دان پُن کے لئے خزانوں کے منہ فوراً کھول دینا چاہیئے اور ہر روز سات ندیوں اور ستتر نالوں میں اشنان کرنے کے بعد راج پاٹ کے کام سنبھالا کرے۔

تیسری روایت جو سب سے معتبر مانی جاتی ہے یہ ہے کہ راجہ بھوج کے باپ راجہ مامل جتری پتی پنوار چندر بنسی کے محل میں کئی رانیاں تھیں۔ ان میں ایک رانی قوم کراڑ کا اعزاز سب میں بڑھا ہوا تھا۔ جب اس کے

ں ولادت کا وقت قریب آیا تو راجہ نے دربار کے نجومیوں جوتشیوں
ر کر دریافت کیا کہ یہ ساعت ولادت اولاد کے لئے کیسی ہے ۔
ںنے بچار کر دیکھا تو زحل کو تیسرے خانے میں سیدھی نگاہ سے اور
ں کو پانچویں خانے میں ٹیڑھی نگاہ سے دیکھتے ہوئے پایا ۔ عرض کی کہ
راج ! یہ ساعت جو اس وقت گزر رہی ہے ، اس میں جو لڑکا پیدا ہوگا
یت منحوس ہوگا ۔ تمام عمر سخت بیماریوں میں مبتلا رہے گا ۔ اس کو
ں پر حکومت کرنے کا حق نہ ہوگا ۔ بلکہ دوسروں کی تابعداری کرے گا ۔
اس کی نحوست سے راج پاٹ ملیا میٹ ہو جائے گا ۔ اگر اس ساعت
ل دیا جائے تو بچہ نہایت سعید اور صاحب اقبال ہوگا ۔ اس کا
دنیا میں ہمیشہ رہے گا ۔ سب راجاؤں سے خراج لے گا ۔ اور راج
ڑھائے گا ۔ اس لئے کہ ڈھائی گھڑی کے بعد سورج چھٹے خانے
آنے والا ہے ۔ ساعت ٹالنے کی غرض سے رانی کو اُلٹا لٹکا دیا گیا ،
ں ساعت بدل گئی تو بھوج پیدا ہوا ۔ مگر رانی کا انتقال ہو چکا تھا ۔
ں کا قول ہے کہ رانی کے انتقال کے بعد پیٹ چاک کر کے نکالا گیا
۔ جب بھوج کچھ بولنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تو راجہ مال نے محل میں
ں تاکید کر دی کہ راج کمار کے سامنے ہرگز ہرگز یہ واقعہ کسی کی زبان
آنے پائے ۔ اس حکم کی پوری طرح تعمیل کی گئی ۔

باپ کے بعد جب بھوج راجہ ہوا تو ایک مرتبہ درباریوں اور
ؤں کی بہت بڑی جماعت لے کر بمقام منھو تیرتھ کرنے گیا ، وہاں کے
ے برہمن جمع ہو کر راجہ کو اشیرباد دینے اور ناریل پیش کرنے آئے ۔ مگر
ں برہمن لڑکا جو بڑا روشن ضمیر مشہور تھا ، حاضر نہ ہوا ۔ برہمنوں نے واپس
ر راجہ کے سامنے نہ جانے کا سبب دریافت کیا ۔ اُس نے جواب
لہ میں ایسے مہاپاپی راجہ کے نہ سامنے جاؤں نہ ناریل دوں ۔ یہ بات
ہ کے کانوں تک پہونچی ۔ اس نے لڑکے کو بلا کر کہا کہ جہاں تک مجھے یاد
ںسنے تو کوئی ایسا پاپ نہیں کیا ہے ، اس پر لڑکے نے راجہ کی پیدائش
ال بیان کیا ۔ تحقیقات سے لڑکے کا بیان صحیح ثابت ہوا ۔ اب راجہ کو
ں فکر ہوئی ۔ راج دھانی میں آتے ہی اُس نے اپنی حکومت کے جوگی ،
دھو ، پنڈت ، جوتشی سب ہی کو جمع کیا اور پاپ کو ناش کرنے کی ترکیب

پوچھی ۔ سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ راجہ کو کوئی بڑی تپسیا کرنا چاہئے ،
اور وہ یہ ہے کہ راجہ کو ایک مقررہ مدت تک ہر روز سورج نکلنے سے پہلے نو
ندیوں اور ننانوے نالوں میں اشنان کر کے شیو کے مندر میں جا کر پوجا کرنا
پڑے گا ۔

راجہ ہر قربانی دینے کے لئے تیار تھا ۔ مگر اُس زمانے میں جب کہ ذرائع
آمد و رفت کی آسانیاں نہ تھیں ہر روز اتنے نالوں ، ندیوں تک پہونچنا اور
سورج نکلنے سے پہلے پہلے اشنان سے فارغ ہو جانا امر محال تھا ، ہاں یہ
ہو سکتا تھا کہ ہر روز ان نالوں اور ندیوں کا پانی راج محل پر جمع کرنے کا
انتظام کیا جاتا ۔ لیکن دشواری یہ آپڑی کہ گرمی کے موسم میں تمام نالے خشک
ہو جاتے تھے اور ان میں ایک قطرہ پانی کا ملنا ممکن نہ تھا ، ادھر راجہ کی یہ
حالت کہ مارے فکر کے دن کا آرام اور رات کی نیند حرام تھی ۔

آخر دربار کے انجینیروں نے اس کا ایک حل نکال ہی لیا ۔ انھوں نے
وندھیاچل کے دو سلسلوں کے درمیان ایک ایسے علاقے کا پتہ لگایا جو
ننانوے نالوں اور سات ندیوں سے سیراب ہوتا تھا ۔ اب دو ندیوں
کی تلاش باقی رہ گئی ۔ بہت دُور وسط ہند کا مشہور دریا جنوا بہتا تھا ۔
اُس کو بھی انھوں نے اپنی فہرست میں داخل کیا ۔ اب صرف ایک ندی
رہ گئی ۔ مگر وادی میں کوئی اور ندی نہ تھی ۔ باہر چند یاں تھیں ان کے اور
وادی کے درمیان گہری گھاٹیاں اور اونچے پہاڑ تھے ۔ آخر کلیان سنگھ بھنڈاری نے
جو کہ راجا کی طرف سے مالوہ اور گونڈوانہ کا گورنر تھا یہ کام اپنے ذمہ لیا جس
پہاڑی پر اب شہر بھوپال آباد ہے اُس زمانے میں اُس کے قریب سے ہو کر ایک
ندی بہتی تھی ۔ کلیان سنگھ نے اس ندی کا انتخاب کیا اور گھاٹیوں کو پاٹتا
پہاڑوں کو کاٹتا ہوا سولہ میل تک ندی کے لئے راستہ بنا کر وادی تک پہنچا دیا ۔
پہاڑی سلسلے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس طرح واقع ہیں کہ شروع میں ان کے
درمیان دس بارہ کوس کا فاصلہ ہے ۔ مگر جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے ہیں
ایک دوسرے سے قریب ہوتے جاتے ہیں ۔ یہاں تک کہ آخر میں بہت کم فاصلہ
رہ جاتا ہے ۔ اس مقام پر انجینیروں نے ایک بہت بڑا سنگین بند تعمیر کیا ۔
اس کے بعد تمام نالوں ، ندیوں کا رُخ پھیر کر اس وادی میں لا ڈالا ۔
پہلی ہی بارش میں تالاب میں اتنا پانی آگیا کہ راجہ اشنان کر کے شیو مندر

میں پوجا کرنے کے قابل ہوگیا۔ جب راجہ پہلی دفعہ تالاب میں اشنان کرنے اُترا ہے تو اس نے نو سو گائیں دان کیں، نو سو برہمنوں کو بھوجن کرایا اور خلعت دیئے اور نو سو تولہ سونا غریبوں میں تقسیم کیا۔ اس سلسلے میں چونکہ کلیان سنگھ جیتا نے بڑی خدمت انجام دی تھی۔ لہٰذا جو ندی اُس کے اہتمام سے لائی گئی تھی کلیان سوت اُس کا نام رکھا گیا جو کہ اب کلیا سوت کے نام سے مشہور ہے۔ تال کے قریب اُسے ایک بڑی جاگیر دی گئی۔ یہاں اُس نے ایک گاؤں کلیا کھیڑی آباد کیا۔ یہ اب ایک بڑا قصبہ اور ضلع کا صدر مقام ہے، اور کلیا کھیڑی کہلاتا ہے۔ جو گاؤں تالاب کی حد میں آگئے تھے، اُن کے باشندوں کو معقول معاوضہ دیا گیا اور اُن کے لئے نئے گاؤں آباد کئے گئے۔ جن ندیوں کا رُخ پھیر کر وادی میں لایا گیا تھا اُن کے نام یہ ہیں۔

گوڈور۔ باسنہ۔ جاکھلہ۔ پیپلیا۔ سوتیا۔ ڈوڈا۔ کیردان۔

کلیا سوت۔ بیترا۔

پورا تالاب سو سال میں پُر ہوا اور "بھیم ساگر" اس کا نام رکھا گیا۔ کتابوں میں اُس کے نام بھوج ساگر۔ بھوج تال اور اندر تال بھی آتے ہیں۔ مگر بھیم ساگر زیادہ مشہور ہے۔ تاریخ فرشتہ کے مؤلف نے بھی اُسے "حوضِ بھیم" ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔

وہ پہاڑیاں جو تال کے بیچ میں آکر پانی کی سطح کے اوپر نمودار رہ گئی تھیں اس چھوٹے سے سمندر میں جزیروں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ ان پر مندر اور سادھوؤں کے لئے خانقاہیں تھیں۔ آگے چل کر کچھ ماہی گیروں نے سکونت اختیار کی۔ عرصہ دراز تک مالوہ کے راجہ اور بادشاہ انھیں بطور تفریح گاہ کے استعمال کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ آبادی بڑھ گئی۔ اُن کے نام بھی جزیرے کے طور پر رکھے گئے تھے۔ مثلاً دیپ (جزیرہ) یہ ریلوے اسٹیشن اور کاروباری قصبہ ہے۔ دیپڑی (چھوٹا جزیرہ) سانسل دیپ۔ آخری دونوں زرخیز اور آباد گاؤں ہیں۔

عہد قدیم میں یہ تال بھارت کے عجائبات اور طلسمی مقامات میں شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ پوتھی پدم پُران چودھویں ادھیائے اور شیو پُران سترھویں ادھیائے میں جہاں امر کنٹک اور دیول اور باغ وحوض لکاذلی کا ذکر آتا ہے وہاں تال بھوپال کا بھی بیان ہے۔ یہاں یہ بات لکھ دینے کے قابل ہے کہ آج سائنس کی ترقی کے عہد میں جب کہ ہر قسم کی سہولتیں اور ایجادیں انسان کی امداد کے لئے موجود ہیں صرف ایک دریا کا بہاؤ بدل دینے کے لئے کس قدر سرمائے، آدمیوں کی کتنی بڑی فوج، کتنے آلات اور کتنی مدت درکار ہوتی ہے۔ تو کہ اُس زمانے میں جب ان ذرائع کا نام و نشان تک نہ تھا اتنے پہاڑی نالوں، ندیوں کا رُخ پھیر دینا اگر انسانی قوت کا معجزہ نہیں تو اسے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

پانی کا یہ زبردست ذخیرہ پانچسو سال تک پوری شان و شوکت کے ساتھ موجیں مارتا رہا۔ ۱۴۳۲ء میں جب ہوشنگ شاہ حاکم مالوہ نے نربدا کے قریب ہوشنگ آباد آباد کیا اور دھار کے پاس مانڈو پہاڑ پر شادی آباد شہر آباد کرکے اُسے اپنا پایۂ تخت قرار دیا اُس وقت اتنے بڑے رقبۂ زمین کو پانی میں بیکار دیکھ کر تالاب کے بند توڑنے کا حکم دیا۔ مزدوروں کی فوج کی فوج کام پر لگ گئی۔ چھ مہینے کی سخت محنت و مشقت کے بعد بند کا ایک تھوڑا سا حصّہ ٹوٹ سکا۔ پانچ سال تک برابر پانی بہتا رہا، اور تیس سال کے بعد زمین آبادی کے قابل ہو سکی۔ اب یہ علاقہ ایک پوری تحصیل ہے۔ جسے "پرگنہ تال" کہتے ہیں، اور اس میں تین سو ساٹھ گاؤں آباد ہیں۔ تمام جغرافیہ دان متفق ہیں کہ اس واقعہ کے بعد علاقہ کی آب و ہوا بالکل بدل گئی۔ مالوے کی سُہانی اور خوشگوار راتیں جو شبِ مالوہ کے دل کش نام سے مشہور ہیں بہت کچھ اسی تال کا عطیہ تھیں۔

جھیل کو خشک ہوئے اگرچہ ساڑھے پانچسو سال ہو چکے ہیں، مگر اس کے اثرات اب بھی باقی ہیں۔ بارش میں زمین سے اتنا پانی اُبلتا ہے اور اتنی دلدل ہو جاتی ہے کہ سوار و پیادے کا راہ چلنا ممکن نہیں۔ اس موسم میں سیکڑوں قسم اور رنگ کے مینڈک نمودار ہو جاتے ہیں۔ ایک مینڈک سفید رنگ کا ہوتا ہے جو بجائے اُچھلنے کے اُڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچتا ہے، اور کوئی اُڑان آٹھ دس گز سے کم کی نہیں ہوتی بعض وحشتناک دلدلی نشیبوں میں ڈھائی تین سیر کے مینڈک بھی دیکھے گئے ہیں۔ ان کا رنگ گہرا زرد ہوتا ہے۔ سبزی کا کہیں نام نہیں۔ صورت شکل بھی عام مینڈکوں سے کچھ الگ ہوتی ہے۔ شیر کی طرح پنجے، ہرن کی سی بڑی آنکھیں، موٹی گردن اور آواز بالکل گدھے کی طرح۔ قریب سے اُڑنے والے پرندوں کو اُچک کر پکڑ لیتے ہیں کسی موزوں طبع نے ان کا حلیہ ایک شعر میں نظم کر دیا تھا جو یہ ہے۔

برکنارِ حوض دیدم چار رنگی جانورے   شیر پنجہ، چشم آہو، فیل گردن، بانگ خر

پیداوار کے اعتبار سے "تال پرگنہ" مالوے کی جان سمجھا جاتا ہے۔
۱۹۵۶ بکرمی کے عالم گیر قحط میں جب کہ مسلسل دو سال تک آسمان سے ارش کا ایک قطرہ نہیں گرا تھا اور پریشان حال مخلوق نے دو دو روپیوں بن اپنی اولاد کو بیچ ڈالا تھا، اُس زمانے میں بھی یہاں روپیہ میں بارہ آنہ پیداوار ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک قسم کے خود رو چاول اور بڑے بڑے سیرو اس کثرت سے پیدا ہو گئے تھے جو روپیہ کے پانچ سیر فروخت ہوتے تھے۔ یہاں چاول کی ایک خاص قسم "سُکھوان" ہوتی ہے۔ یہ پکنے میں اتنی خوشبو دیتا ہے کہ آس پاس کی گلیاں مہکنے لگتی ہیں۔ مشہور ہے کہ جس دعوت میں سُکھوان پکایا جائے تو اجنبی مہمان کو میزبان کا گھر تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ چاول کی خوشبو اس کی رہنما بن جاتی ہے۔ مگر اب اس کی پیداوار کم ہو گئی ہے۔ کاشتکار اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ جب تک دوسرے دھانوں کی فصل تیار ہو کر بازاروں میں فروخت بھی ہو جاتی ہے اُس وقت یہ کہیں پکنے کا نام لیتا ہے۔ صرف شوقین زمیندار تقریبات میں استعمال کے لیے تھوڑے سے قطعۂ زمین میں اس کی کاشت کر لیتے ہیں۔ دوسرا چاول "ماتھا سُول" (دردِ سر) ہے۔ اس کے کھانے سے سر کا درد دُور ہو جاتا ہے۔

علاقۂ تال کے عجائبات

اس علاقے میں بہت سی عجیب اور قابلِ دید چیزیں ہیں۔ ان میں سے صرف چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

بند

ایک عجیب چیز خود تالاب کا بند ہے۔ یہ دراصل دو بند ہیں۔ بڑا بند پندرہ سو فٹ لمبا، تین سو فٹ چوڑا اور اٹھائیس فٹ اونچا ہے۔ چھوٹے بند کی لمبائی چوڑائی تین تین سو فٹ اور اونچائی چوالیس فٹ ہے۔ پتھر جو بند میں استعمال کئے گئے ہیں وہ تین یا چار فٹ لمبے، دو ڈھائی فٹ چوڑے اور دو فٹ موٹے ہیں، اور ہر طرف سے نہایت سڈول ترشے ہوئے ہیں۔ پوری تعمیر میں چونے سے کہیں کام نہیں لیا گیا۔ بلکہ مٹی کی موٹی تہ بچھا کر اس پر سے پتھر جماتے چلے آئے ہیں۔ پتھروں کے سرے اس ہنرمندی سے بنائے گئے ہیں کہ ایک مرتبہ آپس میں پیوست ہو جانے کے بعد پھر اپنی جگہ سے ہلنا دشوار ہے۔ پختگی کی یہ حالت تھی کہ پانچسو سال تک یہ بند ڈھائی سو میل مربع پانی کی ٹکر لیتا رہا اور ایک بُوند بھی کر دوسری طرف نہیں گئی۔

بھیم بیٹھکا

تال کی آخری جنوبی حد پر ایک اونچا پہاڑ ہے۔ اس پر نصف وجن کے قریب اونچی اونچی چٹانیں ہیں، جو مثل چبوتروں کے معلوم ہوتی ہیں۔ یہ پہاڑ بھیم ٹیکا اور بھیم بیٹھکا دونوں ناموں سے مشہور رہے۔ بھیم ٹیکا کی وجہ تسمیہ تو صاف ہے۔ یعنی اس پہاڑ سے بھیم ساگر کا پانی ٹکراتا تھا اور یہ اُس کے آگے بڑھنے سے روکتا تھی۔ بھیم بیٹھکا کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ قدیم زمانے میں مالوے کے حاکم ان چٹانوں پر بیٹھ کر بھیم ساگر کی سیر کا لطف اُٹھاتے تھے۔ پہاڑ کے قریب ایک بہت پُرانا برگد کا درخت ہے۔ زمین سے پانچ چھ فیٹ کی اونچائی پر تنہ کا ایک حصّہ کو بُرکی طرح آگے بڑھ گیا ہے۔ اس میں ایک سوراخ ہے۔ تنے سے ملا کر ایک مندر اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ درخت کے باہر کا نکلا ہوا حصّہ مندر میں آگیا ہے۔ مندر کے اندر جا کر زور سے بَم بَم کہنے سے سوراخ میں سے پانی کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔ کبھی پانی لوٹے کی ٹونٹی کی طرح جاری ہو جاتا ہے۔ یہاں ہر سال بہت بڑا میلہ بھرتا ہے۔

سٹھین کا تالاب

موضع بتری کے قریب دو پہاڑیوں کے درمیان ایک تالاب سٹھین نامی ہے۔ جس کے پانی کی سطح پر گھاس اس طرح جمی ہوئی ہے کہ آدمی اور مویشی بے تکلّف چلتے پھرتے ہیں۔ گھاس ہٹانے سے صاف شفّاف پانی نکل آتا ہے۔ بارش میں جتنا پانی زیادہ ہوتا ہے گھاس اُسی قدر اونچی ہوتی جاتی ہے۔

ڈگڈگا

تال کے کنارے ایک پہاڑ ڈگ ڈگا نامی ہے، جس کے معنی ہیں ہلنے والا۔ اس پر تقریباً پچاس گز لمبی چوڑی ایک چٹان ہے جو قدم پڑتے ہی اس طرح ہلنے لگتی ہے کہ اگر آدمی اپنے آپ کو سنبھالے نہ رہے تو گر پڑے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد ساکن ہو جاتی ہے۔ خوب چلئے دوڑیئے، کچھ نہیں۔ ہلنے والی چٹانیں پہاڑی علاقوں میں اور جگہ بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً چترکوٹ کی پہاڑیوں میں ایک گنبھا ہے جس کی بابت مشہور ہے

کو شری رام چندر جی نے بن باس کے زمانے میں یہاں کچھ قیام کیا تھا۔ گپھا پر بطور چھت کے ایک چٹان رکھی ہوئی ہے۔ لکڑی کے اشارے سے یہ ہلنے لگتی ہے۔ وہاں کے لوگ اسے گنگنا چور کہتے ہیں۔

ہندوستان کا مرکز

تال کے دوسرے کنارے کے پہاڑ پر ایک بہت بڑا دائرہ کھدا ہوا ہے۔ اس میں بزبان سنسکرت اس مضمون کی عبارت کندہ ہے کہ راجہ بھوج کے زمانے میں بھارت کی پیمائش کی گئی اور یہ مقام نقطۂ وسطی ثابت ہوا۔ اس کے قریب کوئی بڑی عمارت بھی تھی جس کی بنیادوں کے نشان اب بھی دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ اس پہاڑ پر اتنا گھنا جنگل اُگ آیا ہے کہ بجز اس کے کہ کوئی ریسرچ کرنے والا ہی یہاں تک پہونچنے کا ارادہ کرے۔ یہ مقام عام نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ ایسا ہی ایک چکر دھار کے ایک پہاڑ پر بھی ہے جو کہ راجہ بھوج کی راجدھانی تھی اور اس میں بھی سنسکرت میں عبارت کندہ ہے۔

بھوج پور کا مندر

یہ وہی تاریخی مندر ہے جس میں راجہ بھوج کو پوجا کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ مندر آج سے دو ہزار سال قبل کی تعمیر ہونے کے باوجود اپنی حالت میں قایم ہے اور قدیم ہندو طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ تمام تاریخوں اور سیاحوں کے بیانات میں اس کا حوالہ ملتا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ برخلاف سانچی کے اس کے حالات کی تحقیق اور صنعت کاری کو منظر عام پر لانے کی طرف اس وقت تک توجہ نہیں کی گئی۔ سلسلۂ مضمون کے پیش نظر ناظرین کو یہاں نہایت مختصر طور سے اس سے متعارف کرایا جاتا ہے۔

مندر خط استوا سے ۲۳ درجہ ۹ دقیقہ شمالی عرض البلد اور ۷۷ درجہ ۴۸ دقیقہ مشرقی طول البلد پر واقع ہے۔ بھوپال سے اس کا فاصلہ ۹ میل اور اسٹیشن دیپ آٹھ میل ہے۔ اسے ایک نہایت پُر فضا پہاڑ کے دامن میں بنایا گیا ہے۔ سامنے دور تک پہاڑی ڈھال ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تال کا پانی اسی ڈھال کے ذریعے رسائی حاصل کر کے مندر کے زینے چومتا تھا۔

عمارت کا نقشہ مستطیل شکل کا ہے۔ صدر دروازہ زمین سے تقریباً دس فیٹ بلند ہے جس میں زینوں پر چڑھ کر داخل ہوتے ہیں۔ چار زینے اُترنے کے بعد صحن آتا ہے۔ یہاں جدید عہد کی بنی ہوئی چھوٹی بڑی مورتیاں، ہنگانے کے مجسّمے اور کئی چھوٹے چھوٹے مندر ہیں۔ مندر کے تین طرف مسافروں کے ٹھہرنے کے لئے دالان ہیں۔ اصل مندر ۶۶ فٹ مربع اور چار فیٹ اونچے چبوترے پر بنایا گیا ہے۔ صدر دروازہ پر بہت خوبصورت نقش و نگار ہیں۔ اندر کی طرف دو مورتیں خلاف معمول صنعت کی کھڑی ہوئی ہیں۔ مندر کے اندر چار بھاری ستون چالیس فیٹ اونچے، سولہ فیٹ موٹے ایک عمدہ گنبد کو اُٹھائے ہوئے ہیں۔ ہر ستون ایک ڈال پتھر کا ہے۔ ہر ستون کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نیچے کا حصہ ½۲ فیٹ۔ دوسرا ½۲ فیٹ۔ اور اوپر کا حصہ ¾۵ ۳ فیٹ کا ہے۔ پہلے دو حصے ہشت پہل ہیں۔ آخری کا حصہ ۲۴ پہل کا ہے تقسیم اتنی صحیح ہے کہ کسی پہلو میں خشخاش برابر فرق نہیں۔

گنبد اور ستونوں پر بہترین کندہ کاری کی گئی ہے۔ سامنے دو ستونوں پر دو نہایت خوبصورت مورتیں بنی ہوئی ہیں۔ باقی دو ستون بلا نقش ہیں۔ دیواروں پر صنعت کے بے مثل نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

ستونوں کے درمیان ساڑھے اکیس فیٹ مربع اور چار فیٹ اونچا ایک چبوترہ ہے۔ تعمیر کی خوشنمائی کی غرض سے چبوترے کی اونچائی کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے زمین سے قریب کا ایک چوتھائی حصہ تو مضبوط سرخ پتھر کا بنا ہوا ہے۔ اس کے اوپر تین چوتھائی میں ریتلا بھانڈیر پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ حصہ بغیر نقش و نگار کے بجائے خود حسین نظر آتا ہے۔ چبوترے پر جانے کے لئے چھوٹے چھوٹے خوشنما زینے ہیں۔ وسط میں ساڑھے سترہ فیٹ اونچا اور ساڑھے سات فیٹ گول سرخ رنگ کا لنگم نصب ہے۔ یہ بھی ایک ڈال پتھر کا ہے۔ لنگم کے پتھر کو گھس کر یا کسی مسالے کے ذریعے اس قدر چمکدار کر دیا ہے کہ دو ہزار سال گزر جانے پر بھی اتنی چمک باقی ہے کہ دیکھنے والا اپنی شکل دیکھ لے۔

بنانے والوں کے کمال کا جو خاص اثر ایک سیّاح کے دل پر ہوتا ہے یہ ہے کہ اگرچہ اتنے بھاری اور طولانی اور اتنے موٹے پتھر استعمال کئے گئے ہیں مگر ان کی تقسیم اور مناسب اور نقش و نگار بنانے میں اس ہوشیاری سے کام لیا گیا ہے کہ مندر کا ہر حصہ نہایت سُبک معلوم ہوتا ہے۔

مندر کے دروازے کے ایک طرف ایک پتھر پر سنسکرت میں یہ عبارت

کندہ ہے کہ

"سمت ۴۳۰ بکرمی میں اس مندر کی بنا پڑی اور سمت ۱۱۵۹
بکرمی بیساکھ بدی نومی سنیچر کے دن تعمیر ختم ہوئی اور مہاراجہ
شری شبنپ پاج قوم سنھانی نے مہادیا پنست دیو کو
استمپت کیا"

مگر یہ مندر ناتمام رہ گیا۔ تعمیر مندر کے بعد ایک ہزار سال تک اس علاقے پر ہندو راجہ مہاراجہ حکومت کرتے رہے۔ خاص کر راجہ بھوج جیسے اولوالعزم فرماں روا کا مدتوں پوجا کی غرض سے مندر میں آنا ثابت ہے۔ پھر بھی اس کے مکمل کردینے کا خیال کسی کو نہیں ہوا۔ مگر یہ امر عقیدے کا ایک راز تھا۔ قریب کے پہاڑ پر کندہ کئے ہوئے مکمل اور نامکمل پتھر دور تک پھیلے پڑے ہیں۔ اور وہ چڑھاؤ جو مندر پر پتھر اور مسالہ پہونچانے کے واسطے مٹی اور پتھر کا بنایا گیا تھا بدستور باقی ہے۔

مالکم صاحب کی تحقیقات کے مطابق راجہ بھوج نے مندر کے قریب ایک بڑا شہر جو بھوج پور کے نام سے آباد کیا تھا جو رفتہ رفتہ ویران ہو کر ایک گاؤں کی صورت میں رہ گیا ہے قدیم عمارتوں کے آثار جستجو کے بعد مل جاتے ہیں۔

مندر کے گرد کا علاقہ شروع سے مندر کے اخراجات کے لئے وقف تھا۔ راجہ بھوج نے اپنے عہد میں تانبے کے پتر پر سند دی۔ اس وقت سے اس علاقے کا ہر حاکم خاندان سند کی تجدید کرتا رہا۔ مندر کے مہنتوں کے قبضے میں تاریخی لحاظ سے بعض بڑی بیش قیمت تحریریں موجود ہیں۔

مہاراجہ بھوج

مہاراجہ بھوج کی طرف جس کا اس مضمون سے گہرا تعلق ہے اشارہ کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ اشارہ اُس کے حالات کی طرف ملکہ اس جانب کہ مالوے کے قدیم فرماں رواؤں میں اشوک اعظم کے بعد راجہ بکرما جیت اور بھوج ہی کا نام لیا جاتا ہے۔ خاندان اشوک کی ایک یادگار سانچی استوپ کی صورت میں برآمد ہوئی ہے۔ اسے تخییل و صنعت کا ایسا کمال سمجھا گیا ہے کہ ساری مہذب دنیا کی زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ دریافت کسی بھارتی کی رہین منت نہیں۔ راجہ بھوج کی یادگاروں سے مالوے کا دامن بھرا ہوا ہے۔ سکوں، برتنوں، کتبوں اور عمارتوں کے خزانے زمین کے نیچے دفن ہیں، اور اپنے قدردانوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ لیکن یہ کام ایک شخص بلکہ ایک جماعت کا بھی نہیں جب تک کہ حکومت کا ہاتھ اس کی تکمیل میں شامل نہ ہو اس کا احساس کچھ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ صرف انکشافات سانچی کے متعلق جو [illegible] کیا گیا۔ اُس پر ڈھائی لاکھ سے زائد صرف ہوا۔

یہاں بعض نشاندہی کے طور پر لکھا جاتا ہے کہ راجہ بھوج نے جو ۱۰۴ مندر بنوائے تھے اور ۸۰ کتابیں لکھوائی تھیں ان میں سے اب تک صرف ستائیس کا پتہ لگا ہے۔ بعض تحریریں مالوی پنڈتوں کے خاندانوں میں نقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔ مگر یہ حضرات ان کی ہوا تک نہیں دیتے۔ آج سے ساٹھ ستر سال اُدھر ایک تحریر کا ترجمہ مفتیؒ عبادات میں عمدۃ الافضا بھوپال میں شائع ہوا تھا اس کی چند سطریں ذیل میں دی جاتی ہیں۔

"اُس کی (راجہ بھوج) ناموری اور شہرت تمام دنیا میں پھیل رہی ہے۔ بڑے بڑے راجہ اُس کا نام سنتے ہی کانپ اُٹھتے ہیں، اور بڑے بڑے حکمران اُس کے سامنے اپنا سر جھکاتے ہیں۔ فوج اس کی سمندر کی لہروں کا نمونہ اور خزانہ اُس کا سونا چاندی اور رتنوں کی کان سے دونا۔ اس کی خیرات نے راجہ کرن کی خیرات کو لوگوں کے دل سے بھلا دیا، اور اُس کے انصاف نے راجہ وکرم کو شرما دیا۔ کوئی شخص اُس کی راج دھانی میں بھوکا نہیں سوتا ہے اور نہ کوئی بغیر کپڑوں کے ننگا رہتا ہے۔ جو سونا مانگنے آتا ہے اُسے موتی چور ملتا ہے، اور جو گزی گاڑھا چاہتا ہے اُسے ململ دی جاتی ہے"۔

اب کہ ہندوستان پر ہندوستانیوں کی حکومت ہے۔ اگر یہ کام انجام پا گیا تو مالوے جیسے صوبے کی قدیم تاریخ پر سے تاریکی کے پردے اُٹھ جائیں گے، اور ایک روشن باب نگاہوں کے سامنے آجائے گا۔

بھوپال کا موجودہ "تالاب"۔ بھوپال کا موجودہ "تالاب" جس کا کر

شروع مضمون میں ذکر کیا گیا ہے۔ قارئین کرام کو اس سے بھی روشناس کرا دینا ضروری ہے۔ یہ دو تالاب ہیں۔ ایک بڑا تالاب اور دوسرا چھوٹا تالاب کہلاتا ہے۔

بڑا تالاب

شہر بھوپال اسی تالاب کے شمالی جانب آباد ہے۔ اور یہ تالاب بھی راجہ بھوج ہی کا بنوایا ہوا ہے۔ پہلے یہاں کُلانس ندی بہتی تھی۔ مگر یہ گرمیوں میں خشک ہو کر اپنے کنارے بسنے والے دیہات میں پانی کی قلت تکلیف پیدا کر دیتی تھی۔ بھیم تال کی تعمیر کے بعد ایک مرتبہ راجہ بھوج کا اس طرف سے گزر ہوا۔ مخلوق نے اپنی مصیبت بیان کر کے پانی کے انتظام کی درخواست کی۔ راجہ کو رفاہِ عام کے کاموں سے خاص دلچسپی تھی۔ رعایا کی درخواست منظور ہوئی۔ ندی کے بہاؤ کے سامنے دو پہاڑوں کے درمیان جو ایک دوسرے سے بہت قریب واقع ہیں۔ ایک نہایت لمبا چوڑا، بلند اور مضبوط پال باندھ کر قلعہ تعمیر کیا اور بھوج پال اس کا نام رکھا جو کثرتِ استعمال سے بھوپال ہو گیا۔ پال ہندی میں پُل کو کہتے ہیں۔ پال میں بڑی بڑی چٹانیں خدا معلوم کہاں کہاں سے لا کر لگائی ہیں۔ انھیں دیکھ کر اس زمانے کے لوگوں کی قوت اور ہمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھیں مٹی ڈال کر جمایا گیا ہے۔ تالاب کا زائد پانی خارج ہونے کے لئے پال میں مناسب بلندی پر ایک مُہرہ بھی رکھا گیا ہے۔ یہ پُل اُسی زمانے سے عام گزرگاہ ہے۔ اس پر مستقل محلے آباد رہے ہیں اور عالی شان عمارتیں بنتی چلی آئی ہیں۔ مگر اب تک کسی مرمت کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ تالاب کی اوسط گہرائی دس فیٹ ہے۔

چھوٹا تالاب

یہ پال کی دوسری طرف اور بڑے تالاب سے کسی قدر چھوٹا ہے۔ اس کے مشرقی ساحل پر پال سے ملا ہوا ایک پرانا شکستہ محل ہے جس کا شاندار آہنی پھاٹک اور کئی منزلیں پانی میں ڈوبی رہتی ہیں۔ عوام میں مشہور ہے کہ رانی کملاپتی اپنی سہیلیوں کے ساتھ اسی پھاٹک سے تالاب کی سیر کرنے جایا کرتی تھی، اور اسی تالاب میں کہیں اُس کا خزانہ دبا پڑا ہے۔ مگر یہ محض اُن کی خوش خیالی کی پیداوار ہے جس نے تال اور کملاپتی کے افسانے کو مکمل کرنے کی غرض سے تالاب کے کنارے کملاپتی کا محل بھی تعمیر کر دیا۔ ورنہ اس محل کو نہ تو کملاپتی سے کوئی تعلق ہے نہ تعمیرِ محل کے وقت یہاں کوئی تالاب تھا۔ بلکہ چٹیل میدان میں مرگھٹ اور قبرستان تھے۔ ان کی یادگار کچھ چھتریاں اور پختہ قبریں اب بھی باقی ہیں۔ راجہ بھوج کے قلعہ کی مرمت کرا کے نواب فیض محمد خاں بہادر والی بھوپال (ف ۱۷۷۷ء) نے اپنی سکونت اختیار کی تھی۔ ان کے وزیر لالہ کیسری داس نے شاہی محلات کے قریب اپنے لئے یہ محل بنوایا تھا۔

اس تالاب کے معرضِ وجود میں آنے کا سبب یہ ہوا کہ جہاں اب تالاب ہے اس میدان میں سے ہو کر بان گنگا ندی گزرتی تھی۔ برسات میں بان گنگا اور بڑے تالاب کا خارج شدہ پانی اتنی دور تک پھیل جاتا تھا کہ آمد و رفت کے راستے بند ہو جاتے تھے۔ ۱۷۹۵ء میں چھوٹے خاں دیوان ریاست نے تین سو چھ گز لمبا تیس گز چوڑا سنگین پل تعمیر کر دیا جو پختہ پل کہلاتا ہے۔ پانی نے رُک کر تالاب کی شکل اختیار کر لی۔ اس کی اوسط گہرائی چھبیس فیٹ ہے۔ تالاب کا زائد پانی ایک آبشار کے ذریعے نکلتا ہے جو آگے بڑھ کر پاترا ندی کی صورت میں تبدیل ہو گئی ہے۔

یہ تالاب پال کے نیچے ایک جگہ اتنا گہرا ہے کہ پانی کا رنگ سیاہ نظر آتا ہے۔ یہاں غوطہ لگانے والا جان سلامت لے کر نہیں نکلتا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کی تھاہ کسی نے نہیں پائی۔ جس زمانے میں میر ماہی بھوپال آئے تھے اور اپنی تیراکی کے کمال دکھا کر لوگوں کو محوِ حیرت بنا دیا تھا، اس وقت باشندگانِ شہر کی فرمائش پر انھوں نے یہاں بھی غوطہ لگایا تھا اور بڑی دیر کے بعد اُبھرے تھے۔ باہر آ کر انھوں نے بیان کیا کہ تالاب کی تہ پہاڑی ہے اور اس میں قریب قریب گپھائیں ہیں۔ جن پر سائبان کی طرح چٹانیں باہر کی طرف نکلی ہوئی ہیں۔ غوطہ لگانے والا ذرا سی غفلت سے کسی گپھا میں پھنس جاتا ہے۔ جب اُبھرنے کی کوشش کرتا ہے تو سر چٹان سے ٹکراتا ہے۔ اگر ایک سے نجات ملی تو دوسری گپھا کا سامنا ہے۔ اس مصیبت میں گرفتار ہو کر حواس اور دم قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔ میر صاحب نے ایک حدِ خاص کی نشاندہی کر کے لوگوں کو اس حد کے اندر غوطہ لگانے سے منع کر دیا تھا۔ اب بھی اگر کوئی برخود غلط تیراک ہمت کر بیٹھتا ہے تو اکثر و بیشتر حادثے کا شکار ہوتا ہے۔

بھوپال میں انھیں تالابوں سے آب رسانی کی جاتی ہے۔ ان کے

زیب سرسبز و شاداب پہاڑ اور خوش نما عمارتیں نہایت دلکش منظر پیش کرتی ہیں۔

رانی کملاپتی

کہاوت کا دوسرا حصہ رانی کملاپتی سے متعلق ہے۔ اگرچہ اس رانی کا نام رانی پدمنی یا شہزادی گل بکاؤلی کی طرح ابھی تک دنیا کے شاعری میں نہیں آیا ہے۔ لیکن اس کا شمار بھی اُن مخصوص ہستیوں میں ہے جنھیں کسی ملک یا علاقے کے قصے کہانیوں کا مرکز بنا دیا جاتا ہے فلسفۂ تاریخ کا یہ ایک دلچسپ راز ہے کہ جو ہستیاں اور واقعات شہرتِ عام حاصل کئے ہوئے ہیں جب کبھی اُن کے متعلق چھان بین کی گئی تو اتنے مبالغہ آمیز اور ایک دوسرے سے مختلف بیانات سے دوچار ہونا پڑا کہ صحیح حالات کا پتہ لگا لینا دشوار ہوگیا۔ پھر کملاپتی کو تو قدرت نے ایک ایسی قوم میں پیدا کیا تھا جو ہزاروں سال اور بیسیوں تہذیبوں میں سے گزرنے کے بعد بھی ایک حال پر قایم ہے۔ ان میں صحیح تاریخ کا شعور کہاں۔ جب کبھی گونڈوں کی سبھا جُڑتی ہے۔ اور کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد کھلے میدان میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر چلم کے لمبے لمبے کش لیتے ہیں اُس وقت اگر کملاپتی کا ذکر چھڑ جائے تو اس کے دلچسپ قصے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔

اُن کا کہنا ہے کہ کملاپتی بھوپال کی رانی تھی۔ پری سے بڑھ کر سندر، پھول سے زیادہ نازک، بھری چاندنی راتوں میں اپنی پانسو سہیلیوں کے ساتھ کنول کے پھول پر بھوپال تال کی سیر کرتی پھرتی تھی، چاند ستارے قربان ہوتے تھے۔ مچھلیاں موتی مونگا لا لا کر نچھاور کرتی تھیں۔ لڑائی میں جب اس کا پیارا پتی مارا گیا اور کملاپتی نے یہ سناؤنی سنی تو موتی، ہیرے اور خزانوں کی کنجیاں لے کر سہیلیوں سمیت بیچ تال میں جا کر ڈوب گئی۔ یہ خزانے بھوپال تال میں دفن ہیں۔ جب کبھی گونڈوں کی قسمت کا ستارہ چمکے گا تو لہریں کنجیاں نکال کر باہر ڈال دیں گی، اور اُنھیں خزانوں کا پتہ چل جائے گا

یہ اور اسی قسم کے دوسرے قصے زندہ دل لوگوں کی تفریحِ طبع کا بہت کچھ سامان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ ذیل میں تاریخی شواہد کے ساتھ رانی کے حالات لکھے جاتے ہیں۔

رانی کملاپتی کا اصلی نام کنول پتی تھا، جو رفتہ رفتہ کملاپتی ہوگیا۔ عام خیال ہے کہ رانی کو گزرے ہوئے بڑی مدت ہو چکی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ کملاپتی اب سے ڈھائی سو سال پہلے اسی دنیا میں سانس لیتی تھی۔

اس بات کا تو کوئی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس صاحب اقتدار راج گونڈ کی نور نگاہ تھی اور اُس حُسن و جمال میں جو گونڈ قوم میں مقبول ہے دور دور تک اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ اس کی شادی نظام شاہ گونڈ راجہ سے ہوئی تھی۔ یہیں سے اس کا نام تاریخ کے صفحات پر آتا ہے۔ یہاں یہ کہنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ گونڈ راجاؤں کے نام اس قسم کے بھی ہوتے چلے آئے ہیں۔ مثلاً مردان شاہ، دلاور شاہ، کامران شاہ وغیرہ۔

اورنگ زیب کے بعد جب مغل سلطنت میں طوائف الملکی پھیلی، اور ہر طرف بدنظمی کا دور دورہ ہوا اُس وقت جس صوبے کا جو حاکم تھا، اپنے صوبے کا مالک بن بیٹھا۔ چھوٹے چھوٹے زمیندار تک جن کو ذرا بھی قوت حاصل تھی اپنے علاقوں میں خود مختار ہوگئے۔ ہر طرف فساد اور غارتگری کا بازار گرم تھا۔ گونڈوانے کا جنگلی وحشی علاقہ ان شورشوں میں سب سے آگے آگے تھا۔ یہاں بہت سے گونڈوں کو مالوے اور دکن کے صوبیداروں کی طرف سے جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ یہ جاگیردار راجہ کہلاتے تھے۔ ان میں سے بعض کے قبضے میں مضبوط قلعے بھی تھے۔ حکومت کا ہاتھ کمزور پڑتے ہی ہر راجہ کو سِ لمن الملکی بجانے لگا۔

نظام شاہ قلعۂ گنور پر قابض تھا۔ یہ قلعہ اپنے جائے وقوع اور استحکام کے لحاظ سے آس پاس کے قلعوں پر فوقیت رکھتا تھا۔ نظام شاہ کا علاقہ بھی دوسرے جاگیرداروں سے بڑا تھا۔ ان ذرائع سے فائدہ اُٹھا کر نظام شاہ نے قرب و جوار کے گونڈ راجاؤں پر غلبہ حاصل کرلیا۔

اس پُرآشوب زمانے میں گونڈ راجاؤں نے آپس میں بُری طرح لڑنا بھڑنا شروع کردیا۔ نظام شاہ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ کئی بار کئی راجاؤں نے مل کر اس کا زور توڑنا چاہا مگر ناکام رہے۔ آخر انھوں نے اس کے خلاف ایک خطرناک سازش کی۔ نظام شاہ سے دوستانہ مراسم شروع کئے۔ گزشتہ باتوں کی تلافی کی۔ میل ملاپ آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوا۔ کافی عرصہ گزر جانے کے بعد چین پور باڑی کے راجہ نے جو اس کا رشتہ دار

بھی تھا دھوم دھام کی ایک تقریب منائی۔ نظام شاہ بڑے اصرار کے ساتھ مدعو کیا گیا۔ بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال ہوا۔ ناچ رنگ کی محفلیں منعقد کی گئیں۔ پُرتکلف دعوتیں ہوئیں اور آخری روز کھانے میں زہر دے کر نظام شاہ کا کام تمام کر دیا۔

کملاپتی نے جب یہ ناگہانی خبر سنی پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ غم سے اپنا بُرا حال کر ڈالا۔ کئی مرتبہ خودکشی کا ارادہ کیا۔ مگر وہ انتظام رکھا گیا کہ رانی اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ جب ذرا ہوش بجا ہوئے تو سر پر تباہی کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی جس طرف نگاہ اٹھتی تھی دشمن کے سوا دوست نظر نہیں آتا تھا۔ خود بے وارث۔ بچہ کمسن اور عزیز جن سے ایسے آڑے وقت میں مدد کی توقع ہو سکتی تھی خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ اس موقعے پر اگر کوئی دوسری عورت ہوتی ہمت ہار دیتی۔ مگر رانی نے عزم و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، اور وہ کیا جو ایسے نازک موقع پر تاریخ کی نامور عورتیں کرتی آئی ہیں۔

اس زمانے میں سردار دوست محمد خاں بانی ریاست بھوپال (سنہ ۱۷۲۳-۵۴ء) مالوے میں تازہ وارد ہو کر اپنے بعض دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ رانی ان کے کارناموں کا حال سنا کرتی تھی۔ اُس نے ایک طرف تو مخالفوں کی سرگرمیوں کی روک تھام کی، دوسری طرف خفیہ طور سے اپنے ایک معتمد کے ہاتھ سونے کی تھالی میں راکھی رکھ کر سردار موصوف کے پاس بھیجی۔ اس پیغام کے ساتھ کہ وہ اس کے شوہر کے قاتلوں سے انتقام لیں۔ دوست محمد خاں مع اپنی فوج کے میدانِ جنگ سے پلٹ کر قلعۂ گنّور پہونچے۔ کملاپتی نے اخراجاتِ فوج کے لئے ایک لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ دوست محمد خاں نے باڑی کے حاکم پر چڑھائی کر دی۔ نظام شاہ کے قاتل گرفتار ہو کر مارے گئے اور باڑی کا علاقہ ضبط کر لیا گیا۔

کملاپتی سردار صاحب کی بہت ممنون ہوئی۔ چونکہ دشمنوں کا کھٹکا ہر وقت لگا ہوا تھا اس کے علاوہ اس وقت رانی کے پاس ایک لاکھ روپیہ نقد نہیں تھا۔ اس لئے بھوپال جس کی حیثیت اس زمانے میں ایک گاؤں کی سی تھی، گرد و جوار کے دیہات سمیت دوست محمد خاں کو دیدیا اور انتظام جاگیر کے لئے انہیں اپنا مختار بنا دیا۔ اس کے بعد کملاپتی عرصے تک زندہ رہی اور عمر طبعی کو پہونچ کر اس دنیا سے رخصت ہوئی۔ کملاپتی کے بعد اس کا بیٹا نول شاہ ریاست کا مالک ہوا۔ مگر یہ لاولد فوت ہوا اور گنّور کا علاقہ سردار مذکور کے قبضے میں چلا گیا۔

رانی کملاپتی گونڈ قوم میں غیر معمولی فہم و فراست کی مالک تھی۔ قدرت نے اُس کے حصّے میں ایک چھوٹی سی ریاست رکھی تھی۔ اس لئے اُسے اپنے خداداد جوہر دکھلانے کا بہت کم موقع ملا۔ تاہم جن نازک حالات سے اُسے اپنی زندگی میں دوچار ہونا پڑا اور جس خوبی سے اُس نے اُن کا مقابلہ کیا، وہ اس کی ہوشمندی کا کافی ثبوت ہیں۔ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھِر کر اپنی ریاست کو بچا لینا اور تا زندگی قابض رہ کر اپنے جانشین کے لئے پوری ریاست چھوڑ جانا یہ اُسی کی دلیری اور دانائی کا نتیجہ تھا۔

کملاپتی کو سیر و شکار کا بھی شوق تھا۔ تیر و کمان اور بندوق سے شیر کا شکار کرتی تھی۔ گھوڑے پر سوار ہو کر ریاست کا دورہ کرتی تھی۔ طبیعت بھی اچھی پسند واقع ہوئی تھی۔ گنّور کا جنگل طوطوں کے لئے مشہور رہا ہے۔ عام طوطوں سے بڑے۔ گردن میں جوڑا سُرخ کنٹھا اور نہایت خوبصورت۔ سکھانے پر ایسا اچھا پڑھتے ہیں کہ انسان کا دھوکا ہوتا ہے۔ کملاپتی ان کے چھوٹے چھوٹے بچے منگوا لیتی۔ انھیں پالتی۔ اپنے پتی اور اپنے نام کے میٹھے بول سکھاتی اور چھوڑ دیتی۔ ان سے اُن کے بچے سیکھتے۔ تھوڑے ہی عرصے میں گنّور کا سارا جنگل رانی کملاپتی اور راجہ نظام شاہ کے نام کے گیتوں سے گونجنے لگا۔ مرزا غالب کو مندرجہ ذیل شعر میں شاید اسی مضمون کا الہام ہوا تھا۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھُل گیا
بلبلیں سن کر مرے نغمے غزلخواں ہو گئیں (بتصرّف)

اب بھی گنّور کے علاقے میں طوطے کبھی کبھی اس قسم کا کوئی کٹا پٹا بول، بول اُٹھتے ہیں تو سننے والوں کو حیرت ہو جاتی ہے۔

قلعہ گنّور

قلعہ گنّور جہاں کہ کملاپتی کی رومانی زندگی گزری اور جو آخری زندگی تک اس کی سرگرمیوں کا مرکز رہا مناسب ہے کہ اُس پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

یہ قلعہ سطح سمندر سے ۱۹۷۵ فیٹ بلند۔ بندھیاچل کی ایک چوٹی پر واقع ہے۔ اس کا طول ۳۶۹۶ فیٹ عرض ۸۷۴ فیٹ ہے۔ دیواریں ۲۸ فیٹ بلند اور بیس فیٹ چوڑی ہیں۔ پہاڑ کا ڈھال اتنا تیز ہے کہ اوپر تک پہونچنا

دشوار ہے۔ قلعہ کے دروازے تک جانے کے لئے صرف ایک تنگ اور پیچ دار راستہ ہے۔ اس کے دونوں طرف قدم قدم پر گہرے کھڈ ہیں۔ ذرا پاؤں پھسلا اور آدمی موت کے منہ میں چلا گیا۔

قلعہ کے گرد تین دیواریں ہیں۔ پہلی کا نام "مورچہ" ہے، جو اصل قلعہ سے ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر ہے۔ اس کے اندر گھنا جنگل تھا۔ دوسری دیوار ایک کوس کے فاصلے پر ہے۔ اس میں رعایا آباد تھی۔ تیسری دیوار اصل قلعہ کی ہے۔ تمام قلعے میں ایک قسم کا سبزی مائل پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ جس پر کہیں کہیں سیاہ نشان ہیں۔ سارا قلعہ فیروزہ کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ قلعہ کے اندر قدم رکھئے تو بجز دو تین شکستہ محلوں کے جو رنگ محل اور بادل محل کے نام سے مشہور ہیں کسی عمارت کے آثار نظر نہیں آتے۔ مگر مقررہ مقامات پر سے پتھر ہٹائیے تو پہلے ایک غار اور اس کے بعد زینہ نمودار ہو جاتا ہے۔ نیچے جا کر ایلورا کے غاروں کی طرح پہاڑ کاٹ کر بڑے بڑے دالان اور کوٹھڑیاں بنائی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ بعض دالانوں کے رُخ برآمدوں کی طرح جنگل کی طرف کھلے ہوئے ہیں۔ اُس کاری گری کے ساتھ کہ نیچے سے دیکھنے والوں کو چٹانیں معلوم ہوتی ہیں۔ عمارت کا گمان تک نہیں ہو سکتا۔ باوجود اتنی بلندی کے قلعے پر پانی کا معقول انتظام ہے۔ چار تالاب اور پچیس چشمے سرد و شیریں پانی سے ہمیشہ بھرے رہتے ہیں۔

قلعے کی آب و ہوا اتنی خراب ہے کہ چند ہی روز میں آدمی کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے، اور خطرناک امراض میں مبتلا ہو کر نوبت ہلاکت تک پہونچ جاتی ہے۔ مگر گونڈوں کو ایسی جڑی بوٹیاں معلوم ہیں کہ صدہا سال سے یہاں رہتے چلے آئے ہیں، اور صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ جس راجہ یا بادشاہ نے اس قلعے پر قبضہ رکھنے کی کوشش کی آخر کار اسے گونڈوں کے حوالے کر دینا پڑا۔ قلعہ کے نیچے ایک اونچی ٹیکری ہے جسے وہاں کے لوگ اشرفی ٹیکری کہتے ہیں۔ ۱۰۵۰ء میں خان دوراں خاں نصرت جنگ جب فوج کو لے کر قلعہ تک نہ پہونچ سکے تو قلعہ کو توپ کی زد میں لانے کے لئے یہ ٹیکری بنوائی تھی، اور موقع کی نزاکت کے ماتحت مٹی پتھر کی فی ٹوکری ایک اشرفی دینے کا اعلان کیا تھا۔ قلعے میں عمارتوں کے کھنڈروں پر کا سر بوٹی اُگتی ہے جو لقوہ اور اُم الصبیان کا مجرب علاج ہے۔ یہیں چتراول کا روایتی درخت بھی ہے جس کے عرق سے سونا بنایا جاتا تھا۔

گونڈ قوم

مضمون کے آخر میں گونڈ قوم جس کی کہ رانی کملاپتی نام بردار تھی اس کا مختصر سا ذکر نہ کرنا انصاف کے خلاف ہوگا۔ اس قوم کی قدام اور اصلیت کی تحقیق میں انگریز مؤرخوں نے بڑے دعوؤں سے کام لیا مگر جہاں تک دماغی صلاحیتوں اور انسانی خوبیوں کا تعلق ہے اُن ک نام تہذیب و تمدّن کی فہرست میں نہیں آنے دیا۔ لیکن گونڈ قوم میں آ بھی وہ انسانی اوصاف ہیں جن کے لئے دنیا کی مہذب قومیں ترس رہی م گونڈ جھوٹ بولنے پر بڑی مشکل سے آمادہ ہوگا۔ وفا کا پُتلا، احسان کا بن آزادی کا شیدائی۔ ایک مرتبہ جس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا، تما نبھائے گا۔ محبّت کے ساتھ ایک حقیر تحفہ پیش کر کے عمر بھر کے واسطے رہین بنا لیجئے۔ لیکن ہزاروں روپے کا لالچ دے کر جہاں ذرا سا دباؤ ڈالا گونڈ کا ہاتھ آنا ممکن نہیں۔

قومی حکومت کا احترام جیسا کچھ گونڈوں کے پیشِ نظر ہے اس سے زیادہ تصوّر میں نہیں آسکتا۔ ان کے اقتدار کو مٹے ہوئے اگرچہ ہزارہ سال ہو چکے ہیں۔ لیکن جن علاقوں میں یہ لوگ آباد ہیں وہاں ایک گو راجہ کا ہونا ضروری ہے۔ اُن تمام معاملات میں جو دست اندازی سے باہر ہیں گونڈ اسی کے حکم کو سب سے مقدّم سمجھتے ہیں۔ ریاست بھوپا میں گونڈوں کی رانی باڑی میں رہتی ہے۔ ڈیوڑھی پر گھنٹہ گھڑیال ا چوکی پہرے کا انتظام ہے۔ ایک چھوٹا سا دفتر بھی ہے۔ حکومت کی ط سے بعض مراعات حاصل ہیں۔ گونڈوں کے تمام تنازعات اس کی رو میں پیش ہوتے ہیں۔ شادی طلاق وغیرہ کے معاملات رانی کی منظ سے سے ہوتے ہیں۔ تقریبات پر مقررہ رقم نذر لانے کی پیش کرنا پڑ جسے گونڈ بخوشی ادا کرتے ہیں، اور جس کا غذ پر رانی کی مہر ہو جائ اُسے صحیفۂ آسمانی سے کم نہیں سمجھتے۔

جڑی بوٹیوں کی دولت میں بندھیا چل، ہمالہ پہاڑ سے کہ مالا مال ہے اور گونڈ کا سینہ اس علم کا خزینہ ہے۔ مہلک امراض دوائیں ایسی مفید اور زود اثر ثابت ہوتی ہیں کہ تمام طریقۂ علاج رہ جاتے ہیں۔ گونڈوں کے قریبی علاقوں میں رہنے والے مستند وید طبیب ان کی دلجوئی میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن اُن سے پتے کی بات م

کر لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔

عہدِ حاضر میں ہر مرض کی تحقیق اور طریقۂ علاج درجۂ کمال کو پہونچا ہوا ہے۔ مگر انسان کی عمر کا اوسط ہے کہ برابر گھٹتا جا رہا ہے۔ بعض ملکوں میں تو تیس سال تک گر گیا ہے۔ مگر گونڈوں کی عمر کا اوسط آج بھی ایک سال ہے۔ سو سال کی عمر تک اُن کے بال سیاہ رہتے ہیں، اور صورت سے بڑھاپے کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ اس عمر تک یہ لوگ شادیاں کرتے ہیں اور اولادیں ہوتی ہیں۔ ان کے بچوں کے چیچک بہت کم نکلتی ہے اور شاذ و نادر ہی کوئی گونڈ اندھا ہوتا ہے۔

انگریزی حکومت تو ان کی قدردانی اس طرح کرتی رہی کہ جب کبھی کوئی انگریز خطرناک مرض میں مبتلا ہو کر کسی گونڈ کی دوا سے اچھا ہو گیا تو بجائے اس کے کہ انعام دیا جاتا غریب کو قید خانہ بھیج دیا گیا۔ یہ الزام لگا کر کہ غیر مستند ہونے کی وجہ سے اگر اس کی دوا سے مریض کی جان ہلاکت میں پڑ جاتی تو ذمہ وار کون ہوتا۔ مگر اب وقت ہے کہ مناسب طریقوں کے ذریعے ان کے سینوں سے معلومات کے دفینے برآمد کر کے اہلِ ملک کو فائدہ پہونچایا جائے۔ بہر حال رانی کملاپتی کی نسبت سے اس قوم کا ایک مفید پہلو سامنے آگیا۔

افسوس ہے کہ کملاپتی کو کوئی لکھنے والا نہ ملا ورنہ رانی پدمنی، چاند بی بی اور لکشمی بائی کی طرح اس کے کارنامے بھی تاریخ کے صفحات پر نظر آتے۔ پھر بھی کسی مصنّف کا احسان اُٹھائے بغیر رانی کملاپتی کا نام زندہ ہے اور زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد بعشق
ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل حوالوں سے کام لیا گیا ہے۔

پدم پران و شیو پران
تاریخ فرشتہ
تاریخ مالوہ، سرجان مالکم
تاریخ مالوہ، منشی کریم علی میر منشی ریزیڈنسی اندور
تاریخ قدیم تہذیب۔ مسٹر اسمتھ
تمدنِ عتیق۔ ابوظفر
مانڈو۔ غلام یزدانی
تاریخ راجہ ہائے دھار و دیواس وسیندھیا، پنڈت دھرم نرائن۔
قدیم ہندوستان کی تہذیب۔ اے، دی، احمد
گزیٹیر بھوپال
تاج الاقبال، تاریخ بھوپال۔ نواب شاہ جہاں بیگم
تاریخ الکنۂ بھوپال۔ مہدی علی
تاریخ غنچۂ بھوپال۔ ممتاز علی
خلاصۃ الحال من تاریخ بھوپال۔ مولانا ابوالفضل
یادگار ریاست بھوپال۔ رام سہائے تمنّا
تاریخ قلعۂ گل بکاؤلی و گنّور۔ محمد اسمٰعیل مہتمم کتب خانہ بھوپال
عمدۃ الاخبار۔ مولوی احمد علی اشہری
جغرافیہ بھوپال۔ مولوی قدرت علی چیف گزیٹیر بھوپال
جغرافیہ بھوپال۔ پنڈت دیو دت ڈائرکٹر تعلیمات بھوپال
عمارتوں کے کتبے
یادداشت لارڈ حامد، سپرنٹنڈنٹ آثار قدیمہ بھوپال
خاندانی اسناد پنڈت نان بھٹ و گپتا بھٹ
مقامی گیت
اسناد رانی فیروز کنور (گونڈ رانی)

ابو اسماعیل الحسین طغرائیؔ

ترجمہ۔ سید امیر حسن نورانی

گُل کدہ

لامیۃ العجم۔ عربی زبان کا ایک شاہکار قصیدہ

آئے دن ہمارے ادیب اور شاعر دوسری زبانوں کے ادب پاروں کو اردو کا لباس پہنا کر اردو داں اہل ذوق کے تفنّن طبع، وسعت معلومات اور فکر و نظر کے لئے گراں قدر تحفوں کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ تراجم کا یہ سلسلہ زبان و ادب کی ترقی کا اہم جزو سمجھا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے عربی زبان کے قدیم و جدید ادبی جواہر پاروں کے تراجم کے ساتھ اہلِ ذوق کی توجہ کے باوجود عربی داں حضرات نے پوری بے اعتنائی برتی۔ عربی ایک زندہ اور وسیع زبان ہے، اور اس کا دامن رنگا رنگ کے ادبی جواہرات سے بھرا ہوا ہے۔

قصیدہ "لامیۃ العجم" طغرائیؔ کا شاہکار ہے اور عربی ادب میں مشہور و مقبول ہے۔ طغرائیؔ کا نام "ابو اسماعیل الحسین" اور ان کے باپ کا نام "علی" ہے۔ لقب "عمید مؤید الدین" اور خطاب "فخر الکتاب" ہے۔ کسی بڑے نام یا عبارت کو مختصر جگہ میں خوبصورتی سے لکھنا "خطِ طغرا" کہلاتا ہے۔ اور عربی قواعد کی رُو سے اس فن کے ماہر کو طغرائیؔ کہتے ہیں۔ اُن کو اس فن میں بڑی مہارت تھی اسی لئے طغرائیؔ کے نام سے مشہور ہوئے۔ طغرائیؔ ایک بلند پایہ شاعر اور یکتائے روزگار انشا پرداز تھے۔ طبیعت میں بلا کی روانی اور لطافت تھی۔

یہ قصیدہ انھوں نے ۵۰۵ھ میں بغداد کے دورانِ قیام میں لکھا تھا۔ اس میں بیش بہا پند و موعظت کے ساتھ ساتھ گردشِ ایّام اور اپنے ذاتی مصائب کا تذکرہ بڑے مؤثر انداز میں کیا ہے۔ نادر تشبیہیں اور استعارے موقع اور محل کی مناسبت سے استعمال کی ہیں۔

طغرائیؔ بہت کریم النفس اور خوش اخلاق تھے۔ علم ادب اور کیمیا سے خاص شغف تھا۔ اشعار میں صاحب دیوان تھے۔ سلطان مسعود بن محمد سلجوقی کے عہد میں کچھ عرصے منصب وزارت پر بھی متمکن رہے۔ ۵۱۵ھ میں الحاد کے الزام میں قتل کر دئے گئے تھے۔ مگر تاریخی شواہد سے اُن پر الحاد کا الزام ثابت نہیں ہوتا ہے۔

ہم ذیل میں اس قصیدے کا ترجمہ بامحاورہ اردو میں پیش کر رہے ہیں۔ لسانی خوبیوں کا اندازہ تو عربی داں ہی کر سکتے ہیں، لیکن قصیدے میں جن اعلیٰ خیالات و کردار نیز اخلاقی اقدار کا بیان ہے اُس کا بہت کچھ اندازہ ترجمے سے ہو سکتا ہے۔

اصالۃ الرای صانتنی عن الخطل — وحلیۃ الفضل زانتنی لدی العطل

اصابت رائے نے مجھے لغزشوں سے محفوظ رکھا، اور علم و فضل کے زیور نے میری برہنگی کو زینت دی۔ یعنی میری رائے ایسی صائب ہے کہ غلطیوں سے محفوظ رہتا ہوں اور مال و زر پاس نہیں تو کیا ہوا علم و فضل کی دولت تو ہے جس نے مجھے معزز بنا دیا ہے۔

مجدی اخیراً و مجدی اولاً شرع — والشمس رأد الضحیٰ کالشمس فی الطفل

میری عزت و فضیلت، اول سے آخر تک یکساں قائم رہتی ہے جس طرح آفتاب کی روشنی دن چڑھے ایسی ہوتی ہے جیسی دن رہے

فیم الاقامۃ بالزوراء لا سکنی — بہا ولا ناقتی فیہا ولا جملی

وطن (بغداد) میں میرا قیام کیسے ہو سکتا ہے کہ جہاں نہ میری دلبستگی کا کوئی سامان ہے، نہ سواری کے لئے اونٹ اور راونٹنی، یعنی جہاں آسائش اور رہائش کا سامان نہ ہو، وہاں قیام کیوں کر ممکن ہے خواہ وہ اپنا وطن ہی کیوں نہ ہو۔

ناءٍ عن الاھل صفر الکف منفرد — کالسیف عُرّی متناہ عن الخلل

میں اپنے گھر سے دُور، خالی ہاتھ اور تنہا ہوں۔ میری مثال اس

شمشیرِ برہنہ کی ہے جو اپنے نیام سے باہر ہو۔

فلا صدیق الیہ مشتکی حزنی ولا انیسٌ الیہ منتھی جذلی

اس جگہ نہ میرا کوئی دوست ہے جس سے اپنے غموں کا شکوہ کروں اور نہ کوئی ہم نشین ہے جس کی موجودگی سے خوش رہوں۔

وطال اغترابی حتی حنّ راحلتی ورحلھا وقری العسالۃ الذُّبُل

میرا سفر اس قدر دراز ہو گیا ہے کہ کثرتِ سفر کے باعث میری ناقہ اور اس کا کجاوہ، نیز باریک لچکدار نیزوں کی پشت سب ہی گریہ و زاری کر رہے ہیں۔ یعنی سفر کی تکان کا اثر میری ہر چیز سے نمایاں ہے، تاہم میرا عزمِ سفر ویسے ہی تازہ ہے۔

وضجّ من لغب نضوی وعجّ لما القیٰ رکابی ولجّ الرّکب فی عذلی

درازیٔ سفر کے باعث میرے دُبلے اونٹ نے شور کیا اور میری رکاب بھی میرے مصائب پر چیخ اٹھی۔ ہمراہی سوار مجھے ملامت کرنے لگے۔ شاعر نے ان آوازوں کو جو کثرتِ حرکات کے باعث سامانِ سفر سے پیدا ہوتی ہیں، گریہ و زاری سے تشبیہہ دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرا عزمِ سفر ویسا ہی ہے، مگر میری سواری اور سامان کثرتِ سفر سے تنگ آ گئے ہیں۔

ارید بسطۃ کفّ استعین بھا علیٰ قضاء حقوق للعُلیٰ قبلی

کثرتِ سفر سے میرا مقصد یہ ہے کہ مجھے رزق میں اتنی کشائش حاصل ہو جائے کہ میں اس کے سہارے اہل و عیال اور خویش و اقارب کی کفالت کر سکوں اور ان کے واجبی حقوق ادا کر سکوں۔

والدھر یعکس اٰمالی ویقنعنی من الغنیمۃ بعد الکدّ بالقفل

زمانہ میری آرزوؤں کو پامال کرتا ہے اور مجھے سفر سے لوٹنے پر قانع کرتا ہے۔ یعنی زمانہ چاہتا ہے کہ میں اتنے مصائبِ سفر برداشت کر کے بھی ثمرۂ جد و جہد سے محروم رہوں۔

حلو الفکاھۃ مُرُّ الجِدّ قد مزجت بشدۃ الباس منہ رقۃ الغزل

وہ بہادر جوان خوش طبع ہیں، اُن کا حقیقی کلام تلخ ہے، اور ان کی عاشقانہ باتوں کی لطافت ان کی جوانمردی کے ساتھ ملا دی گئی ہے یعنی یہ جوان بزمِ احباب میں تو بڑے خوش طبع ہوتے ہیں، یعنی ان کے عاشقانہ جذبات نے جنگ اور بہادری کے جذبات سے مل کر ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ ان کی گفتگو واقعی تلخی آمیز ہو گئی ہے۔

طردت سرح الکریٰ عن ورد مقلتہ واللیل اغریٰ سوام النوم بالمقل

میں نے اسپِ خواب کو آنکھ کے چشمے پر آنے سے روکا، کیونکہ رات نے چرندۂ خواب کو دونوں آنکھوں کے چشموں سے سیراب ہونے کے لئے ابھارا تھا۔ یعنی نیند رہ رہ کر آنکھوں پر حملہ کر رہی تھی، اور رات نیند کو بھڑکا رہی تھی۔ مگر میں نے اپنے آپ کو اور اپنے رفیقِ سفر کو ان حملوں سے بچایا اور رات آنکھوں میں کاٹی۔

والرکب میل علی الاکوار من طرب صاح واخر من الکریٰ ثمل

اور (میرے رفیقِ سفر) شہسوار خوشی کے مارے کاٹھیوں پر ترچھے ہو گئے ہیں۔ ان میں بعض ہوش مند خوش ہیں اور بعض نیند کے نشہ میں چور ہیں۔

فقلت ادعوک للجلّی لتنصرنی وانت تخذلنی فی حادث الجلل

میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ میں نے تم کو ایک بڑے کام میں مدد لینے کے لئے بلایا تھا اور صورتِ حال یہ ہے کہ تم نے مجھے معمولی حادثے میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے۔ یعنی میں تم سے بڑے معاملے میں کیسے مدد کی اُمید کروں جب معمولی مہم میں یہ حال ہے۔

تنام عینی وعین النجم ساھرۃ وتستحیل وصبغ اللیل لم یحل

(رفیقِ سفر سے خطاب کرتا ہے) ابھی ابتدائے شب ہے، اور تم محوِ خواب ہو، ستاروں کی آنکھیں بیدار ہیں، تمھاری حالت بدل رہی ہے اور رات کا سیاہ رنگ نہیں بدلتا۔ یعنی ہر طرف شب کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ ستارے رہنمائی کے لئے چمک رہے ہیں۔ اس لئے حصولِ مقصد کا عمدہ موقع ہے، مگر تم سو رہے ہو۔

وذی شطاۃ کصدر الرمح معتقل بمثلہ غیر ھیّاب ولا وکل

اور میرے ساتھیوں میں بہت سے میانہ قد جوان ایسے ہیں کہ جیسے نیزے کی بھال، اور وہ جوان اپنی ہی طرح میانہ قد نیزوں سے مسلح ہیں۔ نہ وہ ڈرتے ہیں اور نہ دبتے ہیں۔

فھل تعین علیٰ غیٍّ ھممت بہ والغیُّ یزجر احیاناً من الفشل

کیا تم اس گمراہانہ مقصد میں میری مدد کر سکتے ہو جس کا میں نے قصد کیا ہے؟ کیونکہ بسا اوقات گمراہی انسان کو بزدلی سے بچا لیتی ہے۔

فی اریدطروق الحیّ من اضم   وقد حمتہ رماۃ الحیّ من ثعل

(شاعر اپنے رفیق سے اپنے عزم کا اظہار کرتا ہے) میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ "وادی اضم" کی راہ سے قبیلہ بنو ثعل پر شب خون ماروں، حالانکہ قبیلہ بنی ثعل کے نوجوان نیزہ باز اس کی حفاظت پر کمر بستہ ہیں۔

یحمون بالبیض والسمر اللدان بہ   سود الغدائر حمر الحلی والحلل

قبیلہ بنی ثعل کے وہ بہادر نوجوان اپنی چمکدار تلواروں اور لچکدار نیزوں سے مسلح ہو کر قبیلے کی ان حسین دوشیزاؤں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جو سیاہ زلفوں، سرخ کپڑوں اور سنہرے زیوروں سے آراستہ ہیں۔

فسر بنا فی ذمام اللیل معتسفًا   فنفحۃ الطیب تھدینا الی الحلل

(رفقائے سفر سے کہتا ہے) رات کی پُر سکون تاریکی میں بغیر کسی رہنما کی مدد کے میرے ساتھ چلے آؤ۔ کیونکہ ان حسینوں کی خوشبو کی مہک خود منزلِ مقصود کی طرف ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔

فالحبّ حیث العدیٰ والاسد رابضۃ   حول الکناس لھا غاب من الاسل

حالانکہ محبوب رقیبوں کے جھرمٹ میں اور قبیلہ بنو ثعل کے شیر دل جوان ان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اُس کے گرد نیزوں کا ایک جنگل بنا ہوا ہے۔

نؤم ناشئۃ بالجزع قد سقیت   نصالھا بمیاہ الغنج والکحل

ہمارا ارادہ قبیلۂ بنی ثعل کی اس حسین دوشیزہ کے پاس جانے کا ہے جو اس وادی کے موڑ پر رہتی ہے جس کی حفاظت ان تیروں سے کی جا رہی ہے جن کو اس حسین محبوبہ کی سرگیں آنکھوں سے جلا دی گئی ہے۔

قد زاد طیب احادیث الکرام بھا   ما بالکرائم من جبن ومن بخل

جب شرفا میں اس حسین محبوبہ کے متعلق کچھ گفتگو ہوتی ہے تو شریف عورتوں کا رشک و حسد جو ان کو میری محبوبہ سے ہے۔ شرفا کی گفتگو کی خوشبو کو بڑھا دیتا ہے۔ یعنی اس محبوبہ کے ذکر کے باعث شرفا کی محفل با رونق بن جاتی ہے۔

تبیت نار الھویٰ منھن فی کبد   حرّیٰ ونار القریٰ منھم علی القلل

میں رات اس حالت میں گزارتا ہوں کہ اس حسینہ کی آتشِ محبت میرے تشنہ جگر میں بھڑکتی رہتی ہے، اور ان کے یہاں مہمان نوازی کی آگ پہاڑوں کی چوٹیوں پر جلتی رہتی ہے۔

یقتلن انضاء حبّ لا حراک بھا   وینحرون کرام الخیل والابل

اس قبیلے کی حسین دوشیزائیں اپنی محبت میں لاغر جسم ہونے والے عشاق کو اداؤں کے تیروں سے قتل کرتی ہیں۔ اور اس قبیلہ کے نوجوان ایسے سخی ہیں کہ مسافروں کی مہمان نوازی کے لئے عمدہ عمدہ اونٹ اور گھوڑے ذبح کر دیتے ہیں۔

یشفی لدیغ العوالی فی بیوتھم   بنھلۃ من غدیر الخمر والعسل

وہ عشاق جن کو زلفوں کے کالے ناگوں نے ڈسا ہے اور ابروئے چشم کے تیروں نے گھائل کیا ہے، شہد و شراب کے اس تالاب کا ایک گھونٹ پی کر شفا پا سکتے ہیں۔ یعنی عشاق کی ساری تکلیفوں کا علاج شیریں لبوں کا ایک ایک بوسہ ہے۔

لعلّ المامۃ بالجزع ثانیۃ   یدبّ منھا نسیم البرء فی علل

شاید دوبارہ منزلِ محبوب کی طرف جانے کا اثر ہے کہ میری بیماری میں صحت و شفا کی خوش گوار ہوا چل گئی ہے۔

لا اکرہ الطعنۃ النجلاء قد شفعت   برشقۃ من نبال الاعین النجل

میں بنو ثعل کے نوجوان نیزہ بازوں کے لگائے ہوئے زخموں کی پروا نہیں کرتا بشرطیکہ وہ زخم کشادہ نگاہوں کے لگے ہوئے زخموں میں شریک ہوں۔

ولا اھاب الصفاح البیض تسعفنی   باللمح من خلل الاستار والکلل

میں شمشیر ہائے بُراں کے زخموں سے نہیں ڈرتا ہوں، بشرطیکہ وہ مجھے ان حسین دوشیزاؤں کے مکانوں کے پردوں اور سوراخوں سے ان کا نظارہ کرنے میں مدد دیں۔

ولا اخِلُّ بغزلان اغازلھا   ولو دھتنی اُسودُ الغیل بالغیل

میں اس قبیلہ بنی ثعل کی ماہ وش حسینوں سے بات چیت کرنا ترک نہیں کر سکتا۔ خواہ مجھے اس قبیلے کے بہادر جوان شیر دل اور بلاؤں کی طرح سے گھیر ہی کیوں نہ لیں۔

حُبّ السّلامۃ یثنی ھمّ صاحبہ   عن المعالی ویغری المرء بالکسل

سلامتی اور آسائش کی خواہش انسان کو بلند مراتب کے حصول سے روکتی ہے اور اس میں سستی اور کاہلی پیدا کرتی ہے۔

فان جُنیت فاتخذ نفقـاً   فی الارض اَو سُلّماً فی الجوّ فاعتزل

شاعر اپنے رفیق سفر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ اگر تم کو آسائش و سلامتی کی خواہش ہے تو زمین کوئی سرنگ بنا کر اس میں چلے جاؤ یا کوئی ایسی سیڑھی بنا لو جس کی مدد سے آسمان پر چڑھ جاؤ تو پھر تم کو سلامتی حاصل ہو جائے گی۔ کیونکہ دنیا میں رہ کر سلامتی و آسائش کی خواہش بے سود ہے۔ تا وقتیکہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار نہ کر لو۔

ودع غمار العُلیٰ للمتقدمین علی   رُکوبہا واقنع منہن بالبلل

رفیق سفر کی ہمت بڑھانے کے لئے طنزیہ انداز میں کہتا ہے کہ مراتب اعلیٰ کو ان لوگوں کے لئے چھوڑ دو جو ان کے حصول پر قدرت رکھتے ہیں اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں، اور تم پست ہمتی اور معمولی قوت ہی پر قناعت کر لو۔ یعنی مصائب برداشت کر کے ہی عزت و مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ سو پست ہمت انسان کچھ نہیں کر سکتا ہے۔

رضی الذلیل بخفض العیش مسکنۃ   والعز عند رسیم الانیق الذُلُل

کمینے آدمی کا ذلت خیز زندگی پر راضی ہونا محض اس کی دون ہمتی کے سبب سے ہے۔ درحقیقت عزت تو فرماں بردار اور تیز رفتار اونٹوں کی رفتار میں پوشیدہ ہے۔ یعنی جس کو حصولِ عزت کی خواہش ہوتی ہے وہ ترکِ وطن کرتا ہے۔ مصائب برداشت کرتا ہے اور پست ہمت کچھ کر ہی نہیں سکتا ہے تو اُسے عزت کیا ملے گی؟

فادرأبہا نحور البید جافلۃ   معارضات مثانی اللجم بالجدل

(عزت کی خواہش ہے) تو اپنی تیز رفتار اونٹنیوں کو میدانوں میں دوڑاؤ (یعنی سفر اختیار کرو) اور ان کا مقابلہ صبا رفتار گھوڑوں کے ساتھ کرو۔

ان العُلیٰ حدّثتنی وہی صادقۃ   فیما تحدث ان العزّ فی النقل

بے شک مراتبِ اعلیٰ نے مجھے یہ بتایا ہے اور ان کا بتانا یقیناً درست ہے کہ عزت ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے ہی سے ملتی ہے اور بڑھتی ہے؛ یعنی عزت اس کو ملتی ہے جو ترکِ وطن کرتا ہے۔

لو ان فی شرف الماویٰ بلوغ منیً   لم تبرح الشمس یوماً دارۃ الحمل

اگر اپنے وطن میں قیام کرنے سے تمام آرزوئیں پوری ہو جاتیں تو آفتاب ایک دن بھی برجِ حمل سے (جو اس کا مقام ہے) باہر نہ نکلتا یعنی آفتاب کی عزت اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے وطن سے باہر نکلتا ہے۔ اگر نہ نکلے تو کوئی کیا جانے کہ آفتاب کیا ہے؟ اسی طرح وہی انسان عزت و شہرت پاتا ہے جو ترکِ وطن کرے۔

اھبت بالحظ لو نادیت مستمعا   والحظ عنی بالجہال فی شغل

میں اپنے نصیبے کو پکار رہا ہوں۔ کاش وہ میری آواز سنتا جا لانکہ (میں جانتا ہوں کہ) نصیبہ میری طرف سے غافل ہے، اور نا اہلوں کی طرف متوجہ ہے۔ یعنی خوش نصیبی مجھ سے دُور بھاگتی ہے، اور نا اہلوں کو سرفراز کرتی ہے۔

لعلّہ ان بدا فضلی ونقصہم   بعینہ نام عنہم او تنبّہ لی

میں یہ اُمید لگائے بیٹھا ہوں کہ شاید میرا نصیبہ کسی وقت میری فضیلت سے واقف ہو جائے، اور ان نا اہلوں کو پہچان لے تو میری طرف رُخ کرے، اور ان کی طرف سے آنکھ بند کر لے۔

اعلل النفس بالآمال ارقبہا   ما اضیق الدھر لولا فسحۃ الامل

میں اپنے نفس کو آرزوئیں پوری ہونے کی امید دلا کر خوش کرتا ہوں۔ زندگی کتنی ناخوش گوار ہوتی اگر امیدوں میں کشادگی نہ ہوتی یعنی زندگی امیدوں کے سہارے قایم ہے، اُمیدیں نہ ہوں تو زندگی بے کیف و بے لذت ہے۔

لم ارتض العیش والایام مقبلۃ   فکیف ارضیٰ وقد ولّت علی عجل

میں نے اس وقت بھی عیش و عشرت پسند نہ کیا جب عہدِ شباب تھا اور زمانہ بھی موافق تھا۔ اب کہ عہدِ شباب جوانی رخصت ہو چکا اور قسمت نے مجھ سے منہ موڑ لیا، تو عیش و عشرت کیا پسند کروں گا؟

غالی بنفسی عرفانی بقیمتہا !   فصنتہا عن رخیص القدر مبتذل

میں نے اپنے آپ کی قدر و قیمت بڑھا دی ہے کیونکہ میں اپنے نفس کے فضائل سے خوب واقف ہوں، اور اپنے کو بے قدر اور ذلیل بنانا پسند نہیں کرتا ہوں۔

وعادۃ النصل ان یزھیٰ بجوھرہٖ   ولیس یعمل الا فی یدَی بطل

قاعدہ ہے کہ تلوار اپنے ذاتی جوہروں پر فخر کرتی ہے، لیکن اس کا اصلی جوہر اس کی ضرب ہے، اور وہ جوہر اس وقت چمکتا ہے جب کسی بہادر کے ہاتھ میں ہو۔

ماکنت اوثران یمتد بی زمنی   حتیٰ اریٰ دعلۃ الاوغاد والسفل

مجھے اس کی بھی خواہش نہیں کہ میری عمر دراز ہو جائے اور میں کمینوں اور احمقوں کا دور دورہ دیکھنے کے لئے زندہ رہوں۔

لقد متنی اناس کان شوطہم   ورا وخطوی ولو امشی علی مہل

(شاعر اپنی بدقسمتی کا رونا روتا ہے) جو لوگ زندگی کی جدوجہد میں میری معمولی رفتار کا مقابلہ بھی نہیں کرسکتے تھے (میری بدقسمتی دیکھئے کہ) وہ بھی مجھ سے آگے نکل گئے۔

ہٰذا جزاء امرئ اقرانہ درجوا   من قبلہ فتمنیٰ فسحۃ الاجل

یہ اس شخص کی سزا ہے جس کے دوست احباب پہلے ہی دنیا کو خیرباد کہہ کر چل دئے اور وہ موت کی کشادگی کی تمنا کر رہا ہے۔

وان علانی من دونی فلا عجبٌ   لی اسوۃ بانحطاط الشمس عن زحل

(پھر شاعر اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے) اگر مجھ سے کم مرتبہ لوگ مجھ سے آگے بڑھ گئے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ بلکہ میرے لئے یہ بات باعث تسکین ہے کہ آفتاب زحل ستارے سے نیچے ہے۔

فاصبر لہا غیر محتال ولا ضجر   فی حادثات الدہر ما یغنی عن الحیل

حوادث زمانہ پر صبر اختیار کرو اور تنگ دل ہرگز نہ ہو۔ (خواہ مخواہ) کوئی تدبیر نہ کرو۔ کرو۔ کیونکہ تدبیروں کے ذریعہ حوادث سے چھٹکارا ناممکن ہے۔ مصائب میں تدبیریں بھی کارگر نہیں ہوتی ہیں۔

اعدیٰ عدوک ادنیٰ من وثقت بہ   فحاذر الناس واصحبہم علیٰ دخل

تیرا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جس پر تو سب سے زیادہ اعتماد کرے۔ لوگوں کی مکاریوں سے بچو۔ اور ان سے مکاری کے ساتھ ملو یعنی زمانے کے رخ پر چلو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔

وانما رجل الدنیا وواحدہا   من لا یعوّل فی الدنیا علی رجل

دنیا میں یکتا وہی شخص ہے جو دنیا میں کسی پر بھی بھروسہ نہ کرے۔ کیونکہ دوست دشمن کی پہچان بہت مشکل ہے۔ اس لئے کسی پر اعتماد کرنا اچھا نہیں۔

وحسن ظنک بالایام معجزۃ   فظن شراً وکن منہا علی وجل

اہل زمانہ کے ساتھ تمہارا حسن ظن رکھنا تمہاری پست ہمتی کی دلیل ہے۔ تم ان کو اہل شر سمجھو۔ اور ان سے بچتے رہو۔

غاض الوفاء وفاض الغدر وانفرجت   مسافۃ الخلف بین القول والعمل

وفاداری کا دور ختم ہو چکا، اب بے وفائی کا دور دورہ ہو گیا ہے۔ لوگوں کے قول و فعل میں بہت فاصلہ ظاہر ہونے لگا ہے۔

وشان صدقک عند الناس کذبہم   وہل یطابق معوج بمعتدل

(شاعر اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے) تیری سچائی کو لوگوں نے اپنے کذب کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ بھلا کہیں جھوٹ سچ کا مقابلہ کرسکتا ہے؟

ان کان ینجع شیٔ فی ثباتہم   علی العہود فسبق السیف للعذل

(اہل زمانے کو) اگر کوئی چیز ان کے عہد پر قایم رکھ سکتی ہے تو وہ تلوار ہے۔ جس کو ملامت سے قبل استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یعنی بدعہدوں کو ان کے عہد پر تلوار ہی قایم رکھ سکتی ہے۔

یا وارداً سور عیش کلہ کدر   انفقت صفوک فی ایامک الاول

اے (سرائے فانی کے) مسافر! زندگی کے یہ چھوٹ گھونٹ گندے اور ملگجے ہیں۔ ان کے صاف اور ستھرے حصے کو تم پہلے ہی خرچ کر چکے ہو یعنی گزری ہوئی زندگی مصائب و آلام سے پاک تھی، اب باقی زندگی پریشانیوں سے بھری ہوئی ہے۔

فیم اقتحامک لج البحر ترکبہ   وانت یکفیک منہ مصۃ الوشل

تم کس امید پر اپنے آپ کو زبردست سمندر کی موجوں میں ڈال رہے ہو۔ حالانکہ اس سمندر کا ایک گھونٹ ہی تمہاری پیاس بجھانے کو کافی ہے۔

ملک القناعۃ لا یخشیٰ علیہ ولا   یحتاج فیہ الی الانصار والخول

قناعت کا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں نہ کوئی خوف ہے اور نہ اس میں کسی کو خادموں اور مددگاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

ترجو البقاء بدار لا ثبات لہا   فہل سمعت بظل غیر منتقل

تم ایسے گھر میں ہمیشہ زندہ رہنے کی امید لگائے ہوئے ہو جو فنا ہونے والا ہے۔ کیا تم نے کبھی سایہ کے متعلق سنا کہ وہ باقی رہتا ہے اور منتقل نہیں ہوتا؟

ویا خبیراً علی الاسرار مطلعاً   اصمت ففی الصمت منجاۃ من الزلل

اے واقف اسرار خاموش ہو جا (کیونکہ) لغزشوں سے نجات کا ذریعہ صرف خاموشی ہے۔

قد رشحوک لامر ان فطنت لہٗ   فاربأ بنفسک ان ترعیٰ مع الہمل

اللہ تعالیٰ نے تجھے ایک زبردست کام کے لئے پیدا کیا ہے اور تیری تربیت کی ہے۔ اگر تو اس مقصد کو جانتا ہے تو اپنے لئے کسی رہبر کی تلاش کر، تاکہ حیوانوں کی طرح زندگی نہ بسر کرے۔

ڈاک کے شعبے کی کہانی

چندر گپت کے عہد سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے تک

اگرچہ حال ہی میں بھارت میں ڈاک کے ٹکٹوں کے اجرا کی شتابدی منائی گئی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں ڈاک سروس کے انتظامات قدیم مدت سے موجود رہے ہیں۔ چندر گپت موریا کے وزیر اعلیٰ چانکیہ کے ارتھ شاستر میں اس مطلب کے حوالہ جات موجود ہیں کہ ۲۲۰۰ سال قبل مسیح میں ڈاک سسٹم موجود تھا۔ چندر گپت کی سلطنت فارس سے دکنی ہند تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور راجدھانی پاٹلی پتر (پٹنہ) سے اس کے نظم و نسق کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ اس وسیع سلطنت کی مختلف ریاستوں کی راجدھانیوں اور مرکزی راج دھانی کے درمیان کبوتروں کے ذریعے ڈاک کی آمد و رفت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چندر گپت کے پوتے اشوک کے عہد میں بھی یہ طریقہ جاری رہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تجارت کو فروغ دینے کی غرض سے اندرونی رسل و رسائل کا سسٹم جاری کیا گیا، جس کے مطابق اہم تجارتی مراکز کو ہرکاروں کے ذریعے "بل" بھیجے جاتے تھے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں مہاجن ڈاک کے طریقے کی بنیاد شاید اسی سسٹم پر رکھی گئی تھی۔ اس ملک میں ڈاک سروس کی موجودگی کے بارے میں دوسرا ذکر چودھویں صدی کے مشہور سیاح ابن بطوطہ کی تحریروں میں آتا ہے۔ اس نے اپنی تحریروں میں محمد بن تغلق کے زمانے میں ہرکاروں کے ذریعے ڈاک کی آمد و رفت کے انتظامات کا ذکر کیا ہے — ڈاک کی آمد و رفت کے لئے گھوڑ سواروں اور پیادہ قاصدوں دونوں سے کام لیا جاتا تھا۔

شیر شاہ کا زمانہ

مشہور مورخ فرشتہ نے سولھویں صدی میں شیر شاہ کے عہد میں گھوڑوں کے ذریعے ڈاک کی آمد و رفت کے انتظامات پر روشنی ڈالی ہے۔ شیر شاہ پہلا حکمراں تھا جس نے بنگال سے دریائے سندھ کے کناروں تک دو ہزار میل لمبی شاہراہ تیار کروائی۔ اور ڈاک کی ترسیل کے لئے اس شاہراہ پر ہر دو میل کے فاصلے پر دو گھوڑ سوار ہرکارے متعین کئے۔ تاریخ میں اس بات کا ذکر آتا ہے کہ بعد ازاں اکبر کے زمانے میں سرکاری ڈاک کی آمد و رفت کے لئے ہر دس میل کے فاصلے پر دو گھوڑ سوار اور کچھ پیادہ قاصد متعین کئے گئے۔ یہ ہرکارے دن بھر میں تقریباً سو میل کی مسافت طے کر لیتے تھے اور اس طرح آگرے سے احمد آباد پانچ دنوں میں چٹھی پہنچ جاتی تھی۔ بعض سڑکیں جنگلوں میں سے گذرتی تھیں۔ جن پر نہ صرف جنگلی جانوروں بلکہ ڈاکوؤں کے حملوں کا خطرہ رہتا تھا۔ اس طرح کئی بار ڈاک دیر سے پہنچتی تھی اور بعض اوقات اس کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ بھی رہتا تھا۔

سنہ ۱۶۰۰ء میں برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان تجارت کی غرض سے ایسٹ انڈیا کمپنی وجود میں آئی اور اس نے جلد ہی مدراس، بمبئی اور کلکتہ میں پاؤں جما لئے۔ تجارتی سرگرمیوں میں توسیع کے ساتھ ساتھ کمپنی کو خط و کتابت کے سلسلے میں مختلف شہروں کے درمیان ڈاک کی آمد و رفت کے انتظامات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن ایک سو سال سے زیادہ عرصے تک کمپنی پہلے سے موجود ڈاک سسٹم سے کام چلاتی رہی۔ سنہ ۱۶۸۸ء میں کمپنی

نے اپنے تنخواہ دار ہرکاروں کے ذریعے نئی ڈاک سروس شروع کی۔ اس زمانے میں مہاجن ڈاک کا سلسلہ بھی جاری رہا جس کے تحت ساہوکاروں نے اپنی ڈاک کی آمد و رفت کے نجی انتظامات کر رکھے تھے۔

ڈاک محصول کا اجرا

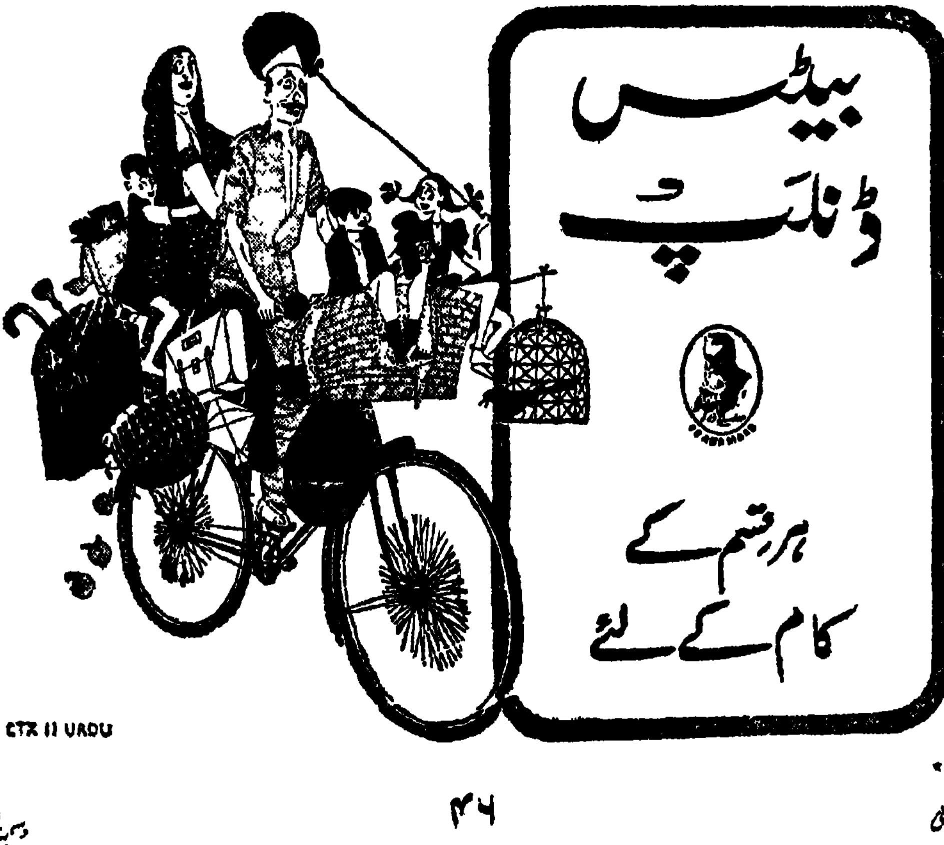
۳۱ مارچ ۱۷۷۴ء کو وارن ہیسٹنگز نے ڈاک کا باقاعدہ سسٹم قایم کیا۔ ایک پوسٹ ماسٹر جنرل مقرر کیا گیا اور ذاتی چٹھیوں پر پہلی بار ڈاک محصول لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن یہ سسٹم ملک کے انہی حصوں تک محدود رہا، جہاں کمپنی کے تجارتی ادارے قائم تھے اور دیگر حصوں میں ڈاک سروس کے نجی انتظامات کا سلسلہ ۱۸۳۷ء تک جاری رہا جب کہ ڈاک کی آمد و رفت کے انتظامات کی ذمہ داری حکومت نے سنبھال لی۔

اٹھارہویں صدی کے آخر تک بنگال میں ڈاک ہرکاروں اور قاصدوں کے ذریعے تقسیم کی جاتی رہی۔ ان میں سے ہر قاصد کے ساتھ ڈھول پیٹنے والا ایک شخص ہوتا تھا جو جنگل میں سے گزرتے ہوئے زور زور سے ڈھول پیٹتا تھا۔ خطرناک علاقوں میں غروب آفتاب کے بعد دو مشعل بردار اور دو تیرانداز بھی ہرکاروں کے ساتھ رہتے تھے۔

چونکہ بہت سے شہر و قصبے امپیریل پوسٹل سروس کے حلقے سے باہر تھے، اس لئے ڈسٹرکٹ پوسٹل سسٹم کا آغاز کیا گیا جس کے ذریعے ہر ضلع کے ہیڈ کوارٹر کو پولیس اور ریونیو اسٹیشنوں سے ملا دیا گیا۔ اس سروس کا کنٹرول ضلع کے حکام کے سپرد کیا گیا، اور اس کے اخراجات پورے کرنے کے لئے زمینداروں اور مقامی باشندوں پر ٹیکس عاید کیا گیا۔

چٹھیوں کی تقسیم کی ذمہ داری پولس اور گاؤں کے چوکیداروں کو سونپی گئی۔ لیکن اس کے نتائج تسلی بخش ثابت نہ ہوئے۔

۱۸۳۷ء میں نجی پوسٹل سروسوں کو بند کر دیا گیا۔ صرف چند ایک لائسنس یافتہ سروسوں کو جاری رکھنے کی اجازت دی گئی۔ حکومت نے ڈاک کی آمد و رفت کے انتظامات کی ذمہ داری خود سنبھال لی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاقوں میں ڈاکخانے قایم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ۱۸۵۰ء میں لوگوں کے آرام اور کارکردگی کے لحاظ سے ڈاک خانے کے انتظامات کو بہتر بنانے کے سلسلے میں تین ممبروں پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ اس کمیشن نے ۱۸۵۱ء میں اپنی رپورٹ پیش کی، اور اس سے ایک سال بعد اسی رپورٹ کی بنیادوں پر شعبۂ ڈاک کی موجودہ تنظیم کا ڈھانچہ معرض وجود میں لایا گیا۔



کتابیں اور رسالے

میر تقی میر، حیات اور شاعری

مصنف ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ضخامت ۴۳۲ صفحے۔ تقطیع ۲۲×۳۶/۱۶، کتاب مجلّد ہے، کتابت، طباعت، کاغذ نہایت عمدہ قیمت بارہ روپے فی جلد۔

میر پر اب تک جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں یہ کتاب ان سب سے جامع اور مکمل ہے اور مصنّف کی کئی سال کی محنت کا نتیجہ ہے۔ ذکرِ میر ایک خود نوشت سوانح حیات ہونے کے علاوہ ایک ایسے عہد کی تاریخ بھی ہے جب ہندوستان طوائف الملوکی کا شکار تھا۔ اس کی روشنی میں فاضل مصنّف نے میر کی سیرت اور عہدِ میر کی سیاسی اور سماجی زوال آمادگی کی مرقع کشی کی ہے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کا تہذیبی نقشہ کیا تھا اسے منظرِ عام پر لانے کے لئے مصنّف نے بڑی کاوش اور تحقیق سے کام لیا ہے۔ اس زمانے کے اُمراء، ابدالی کا حملہ، مرہٹوں کی دست بُرد، دِلّی کی بربادی، شاہِ عالم کی بے بسی، غلام قادر روہیلے کے مظالم، محمد شاہ اور نادر شاہ، اور کتنے ہی موضوعات کے تحت عہدِ میر کے مشہور واقعات اس کتاب میں ملیں گے۔ کتاب کے دوسرے حصّے میں تصانیفِ نظم پر ایک بیدارانہ تبصرہ ہے، جس میں میر کے نظریۂ شاعری سے کر میر کی زبان تک کم و بیش چالیس موضوعات کے تحت میر کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے حصّے میں تصانیفِ نثر کا بیان ہے۔ مآخذ کی طویل فہرست میں مختلف زبانوں کی قریب قریب ۲۰۲ کتابوں کے نام درج ہیں جن میں قلمی مسودے بھی ہیں۔ ہندوستان سے باہر کی لائبریریوں کے نسخے بھی ہیں، حواشی اور حوالہ جات سے کتاب کی افادیت اور اس کا درجۂ استناد بڑھ گیا ہے۔ مصنّف کی جگر کاری اور دیدہ ریزی کا اندازہ کتاب کے مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس مختصر سے تعارف سے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اور بھی قابلِ داد مصنّف کا دل کش اندازِ بیان اور زبان کی شگفتگی ہے۔ ایسی شائستہ اور مرصع نثر جو سراسر آمد ہی آمد ہے، اردو کا حسن ہیں نشان بھی نہیں، آج کل بہت کم دیکھنے میں آتی ہے، بالخصوص تنقید میں۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب پوری قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

کلیّاتِ ولی

مرتبہ ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی نے تیسری بار اس کتاب کو شائع کیا ہے۔ قیمت پانچ روپے۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ مُرتّب نے طبع سوم کے دیباچے میں آنے والے محققین سے یہ امید رکھی ہے کہ کلیّاتِ ولی کا ایک صحیح نسخہ بارھویں صدی ہجری کے تمام مستند نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا جائے۔

بے کراں ۔ جگن ناتھ آزاد کا یہ مجموعہ نظم دوسری بار شائع ہُوا ہے۔ آزادؔ نوجوان شعراء میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ تقسیمِ ملک کے بعد اُفقِ شاعری پر جتنے ستارے اُبھرے ہیں ان میں آزاد اپنی تابناکی سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ اس اشاعت میں مصنّف نے اپنی مشہور مثنوی 'ارحد' بھی شامل کر دی ہے اور وہ کلام بھی اسی میں شامل کر دیا ہے جو طبعِ اوّل کے وقت ان کے پاس موجود نہیں تھا۔ سب کرانؔ کے بارے میں مشاہیرِ ادب نے بہت اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جوشؔ، احتشام حسینؔ، کرشن چندر اور حفیظؔ نے کلامِ آزاد میں تأثّر اور اس کے سلجھے ہوئے اندازِ فکر کو سراہا ہے۔ جوشؔ نے لکھا ہے۔ "آزاد اس عالمِ کون و فساد کا محض ایک بے پروا تماشائی یا ایک غیر ذمہ دار غنائی شاعر کی طرح مطالعہ نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ اشیاء کی رُوح میں ڈوب کر اور انسانی زندگی کا خوردبینی مطالعہ کر کے ایسی نظمیں کہتے ہیں جو دلچسپ بھی ہوتی ہیں، اور نوعِ انسانی کے لئے مفید بھی۔" قیمت چار روپے آٹھ آنے ملنے کا پتہ دِلّی کتاب گھر۔ دہلی۔

شعر و سخن (ہندی) پانچواں حصّہ ۔ ایودھیا پرشاد گوئلیا نے اُردو شاعری کو ہندی ادب سے روشناس کرانے کا جو سلسلہ جاری کیا ہے یہ کتاب اسی سلسلے کی پانچویں کڑی ہے۔ اس میں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۵۴ء تک کی غزل گوئی پر ایک بصیرت افروز مقالہ اور چالیس شعراء کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر تبصرہ درج ہے۔ کتاب قابلِ قدر ہے بہت حسین و جمیل چھپی ہے۔ قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ :۔ بھارتیہ گیان پیٹھ کاشی۔

پیامِ ساوتری

جنابِ جگر بریلوی بڑے کہنہ مشق شاعر اور ادیب ہیں۔ یہ مثنوی لاجواب آپ کی جگرکاوی کا نتیجہ ہے۔ ساوتری ستیہ وان کے مشہور قصے کو آپ نے نظم فرمایا ہے۔ اس مثنوی کی ادبی حیثیت اردو کی مشہور مثنویوں سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ قیمت دو رُپے چار آنے فی جلد۔

نئے ترانے

اظہار ملیح آبادی خلفِ ملیح آبادکے خوش گو شاعر، شاعرِ انقلاب کے حقیقی بھانجے ہیں۔ ان کے کلام میں تاثیر، زبان میں مٹھاس اور بیان میں لوچ ہے۔ یہ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ ساحر نے ان کے باب میں خوب کہا ہے۔ " اظہار پرانی سیاسی اور سماجی اقدار کے باغی ہیں لیکن ان کی بغاوت تخریبی نہیں تعمیری ہے" زیرِ نظر مجموعے میں اظہار نے نظم، غزل، رباعی، ہرسہ اصنافِ سخن میں داد سخن دی ہے۔ کتاب حسین وجمیل چھپی ہے۔ قیمت فی جلد دو روپے آٹھ آنے ملنے کا پتہ کاکل کتاب گھر ۹۶۔ دانکیشور روڈ۔ بمبئی۔

ایک مشرقی کتب خانہ

یہ چھوٹا سا رسالہ کتب خانہ الاصلاح دیسنہ پٹنہ سے متعلق ہے۔ اس کتب خانے میں بہت سی قلمی اور مطبوعہ کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ ملک کے اکابر نے اس لائبریری کو دیکھا اور سراہا ہے ان میں ہمارے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد بھی شامل ہیں۔ دیسنہ صوبہ بہار کا ایک مشہور و معروف گاؤں ہے۔ یہ اہلِ علم و فضل اور اربابِ کمال کا مسکن رہا ہے۔ سید سلیمان ندوی یہیں کے رہنے والے تھے۔ یہ لائبریری بڑا مفید کام کر رہی ہے۔

موصولات

گرمیٔ بازار ۔ تاجور سامری کا مجموعۂ کلام۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ ، دہلی بک سنٹر دہلی۔

اُردو میں تنقید۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی لکھنؤ یونی ورسٹی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ ملنے کا پتہ ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ۔ قیمت دو رُپے چار آنے فی جلد۔

رباعیاتِ الہام۔ ڈاکٹر آر۔ آر سکسینہ الہام کی رباعیات کا مجموعہ ملنے کا پتہ۔ سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن۔ قیمت ایک رُپیہ آٹھ آنے۔

چند نظمیں۔ علامہ کیفی کے تازہ کلام کا انتخاب۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو جامع مسجد دہلی۔ قیمت ایک روپیہ۔

وحید الدّین وحیدی۔ مصنف محمد بن عمر ایم اے۔ دکن کے نامور شاعر وحیدی کی سیرت اور شاعری پر مشتمل یہ کتاب مصنف کی قابلِ قدر ادبی کاوش ہے۔ ملنے کا پتہ :۔ کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد دکن۔ قیمت دو رُپے۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے۔ مصنف محمد بن عمر ایم اے۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

کشتِ خیال۔ جناب رضی احمد رضی (پٹنہ) کا مجموعۂ کلام۔ چھوٹی تقطیع۔ قیمت قسم اوّل ۸/ قسم دوم ۴/۔ ملنے کا پتہ سید نذکی احمد ٹیڑھی گھاٹ پٹنہ سٹی۔

دھندلے خاکے۔ من موہن چتر ویدی کے خاکوں کا مجموعہ۔ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ملنے کا پتہ من موہن چتر ویدی عثمان پورہ۔ اورنگ آباد

جواہراتِ بسمل۔ بسمل کیرانوی کے کلام کا مجموعہ۔ قیمت دو رُپے۔ ملنے کا پتہ لالہ دیوی چند بسمل ایڈیٹر ضرورت کیرانہ (یو۔پی)

دارالعلوم خلیلیہ نظامیہ ٹونک مشاہیر کی نظر میں | شائع کردہ شعبۂ نشر و اشاعت دارالعلوم خلیلیہ ٹونک

رسالے

پاسبان ۔ حکومت پنجاب نے بڑا مستحسن قدم اُٹھایا ہے کہ اپنے زیرِ اہتمام اردو کا ایک مصور ماہنامہ پاسبان کے نام سے جاری کیا ہے۔ اس کے چیف ایڈیٹر مسٹر دیپ چند ورما ہیں اور ایڈیٹر جیا لال صاحب ساتہ۔ دو شمارے اس رسالے کے نکلے ہیں۔ حسنِ ظاہر قابلِ داد ہے۔ ترتیبِ مضامین میں سلیقے سے کام لیا گیا ہے۔ مضمون سب کے سب معیاری ہیں۔ ان میں ابھی اصلاح و ترقی کی گنجائش ہے۔ مضامین کا تنوع، ادب و ثقافت کی نمائندگی، ملکی اور قومی ضروریات پر دلچسپ مضامین اس رسالے کا طرّۂ امتیاز ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ مقبول ہوگا اور ترقی کی منزلیں تیزگامی سے طے کرے گا۔ سالانہ چندہ چھ رُپے، فی پرچہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ منیجر پاسبان پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ چنڈی گڑھ پنجاب

موصولات۔

رسالہ کردار۔ بھوپال سالانہ چندہ ۴ رُپے۔

رسالہ مشرب ۔ کراچی سالانہ چندہ (خاص پرچہ) نو رُپے۔

رسالہ فنکار۔ دہلی قیمت ۲ روپے

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ سالانہ قیمت ایک روپیہ۔

سرفراز محرم نمبر لکھنؤ قیمت ۸/

رفتارِ زمانہ

ہندوستان اور انڈونیشیا کے وزرائے اعظم کا مشترکہ بیان

دہلی میں انڈونیشیا کے وزیر اعظم کی تشریف آوری پر بھارت اور انڈونیشیا کے وزراء اعظم نے مشترکہ دلچسپی کے مختلف امور پر غیر رسمی بات چیت کی کولمبو میں منعقدہ وزرائے اعظم کی کانفرنس میں جو بات چیت ہوئی تھی اس کے تسلسل کے طور پر یہ بات چیت کھلے دل کے ساتھ اور مخلصانہ ماحول میں کی گئی۔ کولمبو کانفرنس کے انعقاد کے بعد کئی اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ بالخصوص دکنی پوربی ایشیا میں اور دونوں وزرائے اعظم کی بات چیت میں ان تبدیلیوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ دونوں وزرائے اعظم عالمی امن کے اور بالخصوص دکنی پوربی ایشیا کے امن کے کاز کو تقویت پہنچانے کے لئے فکرمند ہیں اور ان مسائل سے متعلق نظریہ پر بالعموم متفق الرائے ہیں۔

بات چیت کے دوران میں وزرائے اعظم نے ایشیا اور افریقہ کے نمایندوں کی کانفرنس بلانے کی تجویز پر بھی غور کیا اور اس امر پر اظہار اتفاق کیا کہ اس قسم کی کانفرنس کا انعقاد ایک مناسب امر ہوگا اور اس سے قیام امن کے کاز اور مل جل کر ان مسائل کا حل تلاش کرنے میں مدد ملے گی۔ یہ کانفرنس جلد ہی منعقد کی جانی چاہئے۔

وزرائے اعظم نے اس سوال پر بھی غور و خوض کیا کہ اس قسم کی کانفرنس کے انعقاد سے پیشتر کولمبو کانفرنس میں شامل ہونے والے ملکوں کے وزرائے اعظم کی کانفرنس بلانا مناسب ہوگا اور بہتر ہوگا کہ یہ کانفرنس جگارٹا میں بلائی جائے۔

سیلاب کے کنٹرول کے اقدامات

سیلاب کے کنٹرول کے مرکزی بورڈ نے اتر پردیش، بہار، مغربی بنگال اور آسام کی ریاستوں پر زور دیا ہے کہ وہ اپنے علاقوں میں سیلاب پر قابو پانے کے منصوبوں کے سلسلے میں عوام کا اشتراک عمل حاصل کرنے کی اسکیمیں مرتب کریں اور مرکز کو اپنے کاموں کے تخمینے پیش کریں۔ ۱۵ ستمبر کو نئی دہلی میں شری گلزاری لال نندہ کی صدارت میں بورڈ کا اجلاس اس رائے پر متفق تھا کہ سیلاب کے کنٹرول کے کاموں میں عوام کا اشتراک عمل حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بورڈ نے دریائے گنگا اور دریائے برہم پتر اور ان کے معاون دریاؤں کے لئے دو ماہرین کمیشن مقرر کرنے کا بھی فیصلہ کیا تھا۔ یہ کمیشن سیلاب کے کنٹرول کی اسکیموں کی تشکیل کے لئے تفصیلات جمع کرنے اور جائزے لینے کا ایک مربوط پروگرام مرتب کرینگے اور اس سلسلے میں ریاستوں کی پیش کردہ تجاویز کا مطالعہ کریں گے۔ اس کے علاوہ تفصیلات جمع کرنے اسکیمیں مرتب کرنے اور ان کی تعمیل پر تنقید کریں گے۔ فنی مسائل پر مشورے کے ساتھ ساتھ ہنگامی حالات میں ضروری اقدامات کی سفارش بھی کریں گے۔

بورڈ نے مئی ۱۹۵۵ء تک کے لئے سیلاب کے کنٹرول کا جو پروگرام مرتب کیا ہے اس کے تحت تیس ہزار مربع میل کا فوٹوگرافی کے ذریعے جائزہ لیا جائے گا اور کم از کم دس ہزار مربع میل کے مقامات کو ہموار کیا جائے گا۔ عارضی طور پر سیلاب کے کنٹرول کے تعمیری کاموں کی ذمے داریاں مرکزی اور ریاستی حکومتوں پر متعین کر دی گئی ہیں۔

سنٹرل واٹر اینڈ پاور کمیشن ریاستوں کی فراہم کردہ تفصیلات کی بنیاد پر ہر دریائی وادی کے لئے ایک جامع پروگرام مرتب کرے گا اور پروجیکٹ کے تخمینوں کو سیلاب کے کنٹرول کے مرکزی بورڈ میں پیش ہونے سے پہلے جانچے گا بورڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ وزیر ریلوے بھی اس بورڈ کا ممبر ہوگا۔ بورڈ کا آیندہ اجلاس ابتدائے نومبر میں منعقد ہوگا۔

کانگریس کا سالانہ اجلاس

انڈین نیشنل کانگریس کے ساٹھویں اجلاس میں ۲۸ صوبوں کے منتخب کئے ہوئے تین ہزار سے زیادہ مندوبین شریک ہو رہے ہیں۔ یہ اجلاس آیندہ جنوری میں آودی میں ہونے جا رہا ہے۔ کانگریس کا سب سے بڑا اور تاریخی اجلاس ناگپور میں ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا جس میں ۱۴،۵۸۱ مندوبین شریک تھے۔


Naunehal
بچوں کے لئے مزید طاقت
EXTRA GAINS FOR YOUR BABIES
سالہا سال سے لوگ ہندوستان کے کونے کونے میں اپنے بچوں کو مضبوط اور توانا بنانے کے لئے نونہال کا استعمال کر رہے ہیں۔ اور دن بدن اس کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے۔
اب وٹامن اے۔ بی ۱۔ بی ۲۔ سی۔ ڈی اور کیلسیم وغیرہ کی آمیزش کے ساتھ اس کا اثر کئی گنا بڑھ گیا ہے
نونہال بچوں کو بے حد مضبوط بناتا ہے۔ دانت نکلنے میں مدد دیتا ہے۔ اور بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے!
قیمت فی شیشی ایک روپیہ
رسالہ قوم کے "نونہال" مفت طلب فرمائیے
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی
Hamdard
DAWAKHANA DELHI



ایک ہنس مُکھ کنبے کی تصویر!

ہر مسکراہٹ کی ایک کہانی ہوتی ہے۔ اور یہ مسکراہٹیں جو میرے گھر والوں کے چہروں پر جگمگاتی ہیں انکا بیان بھی ایک داستان سے کم نہیں۔ جن لوگوں کی آج میں تصویر اتار رہی ہوں یہ کچھ عرصہ پہلے ایسے ہنسمکھ اور تندرست نہیں تھے۔ چند مہینے ادھر میرے شوہر ہر دوسرے تیسرے بیمار رہتے تھے جسکے باعث آمدنی کا کچھ بھروسہ نہ تھا۔ اسپر مصیبت یہ ٹوٹ پڑی کہ میرے تینوں بچوں کا وزن کم ہونے لگا اور وہ ہمیشہ مرجھائے سے رہنے لگے۔

ایک دن راہ چلتے، بچوں کی استانی سے جو ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں اس ساری مصیبت کی جڑ کا بھید کھلا۔ میری پریشانیاں سنکر وہ کہنے لگیں "معاف کرنا بہن، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کھانا پکانے کی جو چکنائی استعمال کرتی ہیں سب اسیکا کیا دھرا ہے"۔ میں نے اپنی طرف سے انہیں لاجواب کرتے ہوئے کہا "میں تو ہمیشہ بہترین اور مہنگی سے مہنگی کھانا پکانے کی چکنائی کھلے ڈبوں سے خریدتی ہوں"۔

میرا جواب سنکر وہ جھٹ سے بول اُٹھیں "کھلی چکنائیاں کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں، گندے ہاتھوں اور مکھیوں سے محفوظ نہیں رہتیں اور ان سے بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں"۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں جانے بوجھے ڈالڈا وناسپتی خریدوں، کیونکہ ڈالڈا کی اہم ترین خصوصیت صحت کی حفاظت کرنا ہے۔ اسکے ہر بند ڈبے میں جراثیم داخل نہیں ہو سکتے۔ اور ڈالڈا بنانے والے کسی بھی ایسے ڈبے کو بازار میں نہیں بھیجتے جو ہر اعتبار سے معیار پر پورا نہ اُترے۔

مجھے یقین ہو گیا کہ انکا کہنا صحیح تھا! اور اسی دن سے میرے گھر میں کھانا ڈالڈا میں پکنے لگا۔ ڈالڈا جس طرح کھانے کے اصلی ذائقے کو اُبھارتا ہے میرا گھر بھر اسکا دلدادہ ہے۔ جب آپ ہوا روک مہر بند ڈبوں ڈالڈا وناسپتی خریدیں تو اطمینان رکھئے کہ یہ خالص اور تازہ بھی ہے اور صحت بخش بھی۔

یہ تصویر ہمیشہ میرے پاس اس بات کا زندہ ثبوت بنکر رہیگی کہ میرا گھر بھر ڈالڈا وناسپتی کی بدولت دن بھر ہنستا کھیلتا اور تندرست رہتا ہے۔ آپکو بھی اگر ایک ایسی تصویر کی آرزو ہے تو اپنے تمام کھانوں میں ڈالڈا وناسپتی استعمال کیجیے۔ آج ہی ایک ڈبہ خرید لیجیے۔

دس پونڈ پانچ پونڈ دو پونڈ اور ایک پونڈ کے ڈبوں میں ملتا ہے۔ ڈالڈا میں اب وٹامن اے اور ڈی شامل ہیں۔

کھانا پکانے کی ایک اچھی چکنائی کیسے چنی جائے؟
مفت صلاح کیلئے اس پتہ پر لکھئے۔
دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس ۳۵۳۔ بمبئی ۱



ڈالڈا وناسپتی

پکانے میں بہتر — کم خرچ


دن بہ دن زیادہ صاف
زیادہ دلکش
جلد
کیڈل
آمیز
رکسونا
آپ کے
لئے بھی یہ
کمال کرے گا
اپنی جلد پر رکسونا کا کیڈل آمیز جھاگ نرمی سے ملئے، پھر دھو ڈالئے۔ آپ محسوس کریں گی کہ آپ کی جلد دن بہ دن زیادہ نرم و ملائم ہوتی جارہی ہے اور آپ کا حسن نکھر رہا ہے۔
رکسونا
کیڈل* آمیز واحد صابن
* کیڈل جلد کو ملائم اور مقوی کرنے والے تیلوں کے ایک خاص مرکب کا حکیمی نام ہے
Rexona
رکسونا پروپرائٹری لمیٹیڈ کیلئے ہندوستان میں بنایا گیا

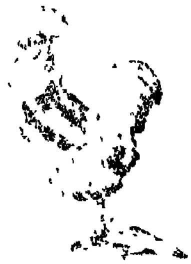


بچوں کا آج کل



غلام احمد فرقت

آوازیں





چڑیا بولے چُوں چُوں چُوں
مُرغا بولے کُکڑُوں کُوں

چرخا بولے چرّخ چُوں
پِلاّ بولے کُوں، کُوں، کُوں

بولیاں سب کی چُوں کی تُوں
بندر بولے خُوں، خُوں، خُوں





طوطا بولے ٹیں ٹیں ٹُوں
چرخی بولے رِیں رِیں رُوں

اُونٹ سڑک پر جاوے یُوں
ٹمک ٹُوں بھئی ٹمک ٹُوں





دادی بولیں پیسے دُوں
امّاں بولیں ہُوں ہُوں ہُوں

سر سے نکلی ایک جو جُوں
بجّو بولیں تھپّڑ دُوں

نیولا بولے سُوں سا سُوں
مُنّا بولے غُوں غا غُوں

احمد جمال پاشا

چچا چھمن

چچا چھمن چھاپے خانے میں چھپائی کا کام کرتے تھے بچپن سے انھیں چوری چکاری کی لت تھی ۔

ایک روز چہار شنبہ کو چار بج کر چوتن منٹ چوابیس سیکنڈ پر چچا چھمن چور بازار سے چرایا ہوا چار خانے کا چوغا اور چار آنے والی ٹوپی اور چار ہی آنے والا چرودھا پہنے چورنگی کے چوراہے پر چوکی والے چائے خانے میں چائے پینے گئے ۔ اور چائے چھوکرے سے چار پیسے والی چائے اور چار مینار سگریٹ منگوایا ۔ چائے آئی مگر چمچا ندارد — چچا نے چیخ کر چھوکرے سے کہا ۔

"او میاں چھبن ! چائے لائے اور چمچا چھوڑ آئے چینی چلائیں تو کیسے ؟

چھبن چمچا لایا — چچا نے چینی چلائی اور چسکیاں لے لے کر چائے پینے کے بعد چمچا چوغے کی لمبی چوڑی جیب میں ڈال ایک کھونٹی چونی تھما چپت ہو جانا چاہتے تھے کہ چھوکرے نے چلانا شروع کر دیا ۔

"چور — چور — چور"

چوراہے پر کھڑے چوکیداروں نے چچا کو پکڑ لیا چھوکرے نے چچا کو چٹا چٹ چار چپت چار چانٹے چپکا چار پیسے کے بدلے چار آنے وصول کر چچا کے چوغے سے چمچا چٹکی سے نکال لیا ۔



چچا چیختے چلاتے چوٹ سہلاتے چپت کھاتے گھر آئے مگر چچا کی چوری کی عادت نہیں چھوٹی ۔ یہاں تک کہ ایک دن موقع پا کر چچا نے اپنی چیزیں بھی چرا لیں ۔

ایک دفعہ چار بجے رات کو چچا چوری کرنے نکلے ۔ لالہ چاول والا سیٹھ چنی چھمن اور چھٹو کے گھر میں چچا چپکے چپکے چوری کرنے کے لئے گئے ۔

چچا چارپائی کی چادر کے نیچے سے چار پانچ چابیاں چھپوان تجوری سے چار ہزار کے نوٹ اور بہت سے چاندی کے زیور نکال کر چند ہی قدم چلے تھے کہ چلو چانس اچھا ہے چپکے سے چپت ہو لیں کہ چاول والے سیٹھ چنی چھمن اور چھٹو کی آنکھ چچا کی چاپ سے کھل گئی اور چاپ سن کر

زور سے چلائے اور ایک لمبا چوڑا تختہ اُٹھا کر چچا کی چھاتی پر چٹاخ سے رسید کیا۔ چوٹ کھا کر چچا کی چیخ نکل گئی اور چچا چبوترے سے چارپائی کے نیچے چٹاخ سے گرے۔

چچا چھاتی پر چوٹ کھا کر چیختے چلاتے ہوئے بھاگے۔ گھر پہنچے تو چپکے سے چارپائی پر چادر اوڑھ کر چت ہو رہے۔

چچی نے صبح جب چچا کو اُٹھایا تو چوٹوں سے چچا کی چھاتی میں چیسں ہی ہو رہی تھی چچا نے چوئے پی کر چپکے سے جمرودھا چڑھا چھاتا



اُٹھا چار باغ کے چینی ڈاکٹر چی چا چوں کے پاس جا کر چوٹوں کی دوا مانگی۔ چی چا چوں نے چچا سے چار آنے پیسے مانگے چچا کے پاس چونی کی چوتھائی بھی نہیں تھی۔ اس لئے چاپلوسی سے کام لے کر دوا لگوا چھاتا اُٹھا چھاپے خانے پہنچے اور وہاں کے چوکیدار سے جو ایک چمار سے چلا چلا کر باتیں کر رہا تھا۔ چچا نے خوب چہک کر کہا۔

"ادماں چوکیدار! آج میں نے چینی ڈاکٹر چی چا چوں کو کیسا چغد بنایا"۔ چوکیدار نے جواب دیا۔

"جاؤ چچا ہم تم سے نہیں بولتے۔ تم بڑے خراب چچا ہو۔ تم چچا کم چور زیادہ ہو"۔ چمار کے سامنے چوکیدار کی یہ بات چچا کو بہت بُری لگی۔

مگر اس دن سے چچا نے چوری چکاری چھوڑ دی۔

کچھ ہی دن میں چچا چھن چینی ڈاکٹر کے علاج سے چنگے ہو گئے۔ اب چچا چھن بہت اچھے چچا ہو گئے ہیں اور اب چچا سے سب بات کرتے ہیں۔

سومناتھ سادھو

لطیفے

باپ۔ میری عمر اسّی برس کی ہونے کو آئی۔ لیکن مجھے یاد نہیں کہ میں نے آج تک جھوٹ بولا ہو

بیٹا۔ اس میں تعجب کی کیا بات۔ اس عمر میں حافظے کا یہی حال ہوتا ہے

باپ۔ موہن! کل تم نے میز پہ رکھا ہوا میرا فونٹن پن کیوں چُرایا؟

بیٹا۔ پتا جی! فونٹن پن پر "پارکر" لکھا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے اسے "پار" کر لیا۔

خاوند۔ "(بیوی سے) میں پاگل تھا کہ میں نے تم سے شادی کی"۔

بیوی۔ اوہو یہ تو آپ نے آج ہی بتایا۔ ورنہ میں خود بھی پاگل سے شادی نہ کرتی۔

چچا۔ (بھتیجے سے) "کیوں رے اگر میں تجھے مورکھوں کا راجا بنا دوں تو تُو کیا کرے گا"؟

بھتیجا۔ "تب میں آپ کو اپنا پردھان منتری بنا دوں گا"۔

محمد امین

چاند کی سطح اور اُس کی فضا

مشہور ہے کہ چاند کے اندر ایک بُڑھیا بیٹھی ہوئی چرخہ کات رہی ہے۔ پہلے زمانے میں جب کہ قصّے کہانیاں بہت سُنتے تھے یہ بات ٹھیک ہوتی تھی لیکن آج سائنس کے دور میں ایسی بات سُنتے ہوئے یقین نہیں آتا۔

چاند کی دنیا ایک بالکل ہی عجیب دُنیا ہے۔ اس کی سطح اور قدرتی ساخت زمین سے مختلف ہے یہ ہموار اور برابر نہیں ہے بلکہ اونچی نیچی کھُردری اور پہاڑی چٹان کی طرح سخت ہے۔ دُوربین سے دیکھو تو اِدھر اُدھر کالے کالے دھبّے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دھبّے کسی زمانے میں لق ودق سمندر تھے جو خشک ہو کر اب بڑے بڑے گڑھے بن گئے ہیں۔ اونچے اونچے پہاڑ بھی ہیں۔ ان میں سے بعض اتنے اونچے ہیں کہ ہمالہ کی ٹکّر کے ہیں۔ ان کی چوٹیاں چار چار میل اُونچی ہیں جو ماؤنٹ ایورسٹ سے صرف ایک میل نیچی ہیں۔ یہاں کے پہاڑ زیادہ تر آگ گندھک اور گرم راکھ برساتے ہیں جن کو جوالا مکھی کہتے ہیں۔ بعض جوالا مکھی ٹھنڈے ہو گئے ہیں اور ان کے اندر گہرے گہرے غار بن گئے ہیں۔

اگر کوئی شخص اُڑ کر چاند میں پہنچ جائے تو بڑی مشکل پیش آئے گی۔ اُس کا دم گھٹنے لگے گا۔ تن سنگھ ایسا بہادر آدمی بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ گویا وہاں ہوا بالکل نہیں ہے۔ پانی بھی نہیں ہے۔ جب پانی اور ہوا دونوں میں سے کوئی چیز بھی نہیں تو بھلا کوئی پودا کیوں کر ہوگا اور تم جانتے ہو کہ پودوں سے آکسیجن بنتی ہے۔ وہ آکسیجن جسے ہم تم سبھی لوگ ہر لمحہ اپنی سانس کے ساتھ پیتے رہتے ہیں۔ اسی پر تمام جاندار چیزوں کا دارومدار ہے۔ چاند پر آکسیجن یا ہوا نہ ہونے کی وجہ سے بھلا کوئی پودا کیوں کر پنپ سکتا ہے۔ جب پودا نہیں ہوگا تو کوئی جاندار چیز بھی نہیں ہوگی۔ اس لئے چاند کی سطح بالکل اُجاڑ چٹیل بیابان ہے۔ بس پہاڑ ہیں اور گھاٹیاں اور بیچ بیچ میں گڑھے اور گہرے گہرے غار۔ یہ غار بہت بڑے بڑے



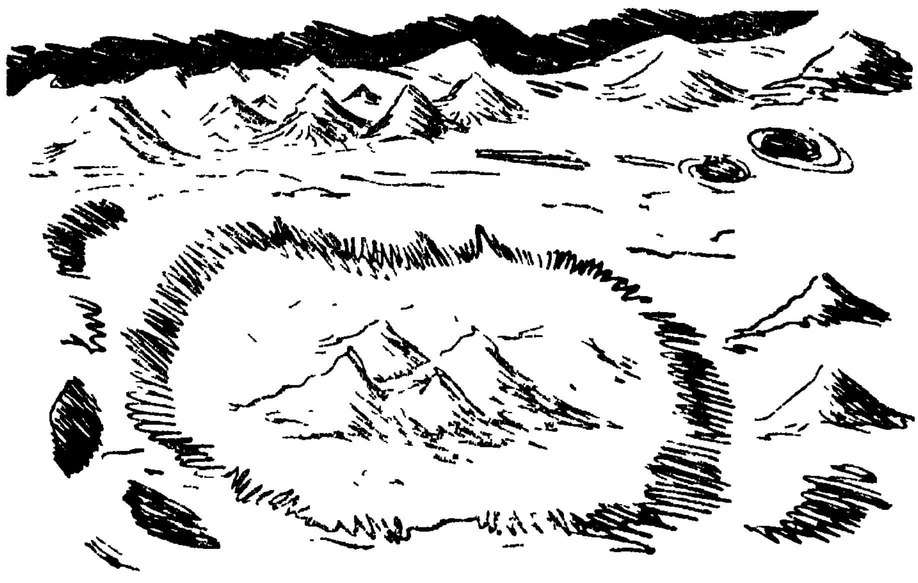
چاند کی اصلی شکل کچھ اس طرح کی ہے۔

ہیں۔ بعض اتنے بڑے ہیں کہ ایک کے اندر زمین کے تمام جوالا مکھی پہاڑ سما سکتے ہیں۔

ابتدائی دَور میں جب کہ چاند وجود میں آیا تھا وہ بہت گرم تھا اور انگارے کے مانند دہکتا تھا۔ دھیرے دھیرے ٹھنڈا ہونا شروع ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹھنڈا ہوتا چلا گیا آج اس کی پوری سطح ٹھنڈی ہو چکی ہے یہاں تک کہ اس کے نچلے حصّے میں بھی گرمی باقی نہیں ہے۔ سائز میں یہ زمین سے بہت چھوٹا ہے اس لئے بہت کم مدّت میں اس کی گرمی ختم ہو گئی۔ اس کے برخلاف زمین کا نچلا حصّہ آج بھی آگ سے زیادہ گرم ہے۔ سائز میں چونکہ یہ بہت بڑی ہے اس لئے اس کے اندر کی گرمی نکل کر غائب نہیں ہو سکی ہے۔

ستاروں کے ماہرین اور جوتشیوں کا خیال ہے کہ کسی زمانے میں چاند پر باقاعدہ ہوا تھی جس کا ثبوت چاند کی گہری گہری گھاٹیوں میں آج بھی ملتا ہے۔ تھوڑی بہت ہوا ابھی شاید وہاں ہے۔ چاند کے اندر اگر قوّتِ کشش کافی ہوتی تو وہ اپنی ہوا کو زیادہ عرصے تک روک سکتا تھا۔ یہ سائز میں بہت چھوٹا ہے اس لئے اس کی قوّتِ کشش بھی کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہوا اس کی فضا میں نہ رُک سکی اور رفتہ رفتہ بہت کم عرصے میں وہ غائب ہو گئی۔ البتہ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ غائب ہو کر گئی کہاں۔

چاند کی سطح ٹھوس ضرور ہے لیکن وہ بالکل ننگی ہے۔ وہاں کسی قسم کا پودا یا گھاس نہیں ہے۔ اس کے اوپر سُورج کی کرنیں سیدھی اور براہِ راست پڑتی ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ حصّہ بہت جلد گرم ہو جاتا ہے۔ چونکہ ہوا ایک سرے سے غائب ہے اس لئے سورج کی تمازت سے بچنے کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ دن میں گرمی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص پہنچ جائے تو بالکل جھُلس کر راکھ ہو جائے گا۔ رات کے وقت وہی حصہ جب سُورج کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے تو بہت جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ہوا تو ہے نہیں جو سُورج کی گرمی کو روک کر محفوظ رکھ سکے اس لئے رات ہوتے ہی



چاند کی سطح (اُونچے اُونچے پہاڑ، گھاٹیاں، غار اور گڑھے دُوربین سے دیکھے جا سکتے ہیں)

غضب کی سردی شروع ہو جاتی ہے اور اگر تم میں سے کسی شخص کو وہاں رات گزارنے کا موقع ملے تو آکسیجن کا آلہ ساتھ ہونے کے باوجود بالکل منجمد ہو جائے گا ۔ تن سنگھ اور ہلاری جیسے بہادر سیاح بھی زندہ نہیں رہ سکیں گے ۔ سمجھو کہ دن میں چاند ایک بھٹی کے مانند ہے اور رات میں ریفریجریٹر ۔

ہمیں یقین ہے کہ انسان وہاں رہ ہی نہیں سکتا ۔ زمین پر زندگی جس روپ میں پھل پھول رہی ہے اس قسم کی زندگی کے آثار چاند پر بالکل نہیں ہیں ۔ اگر چاند پر کسی قسم کے لوگ رہتے ہیں تو اُن کی نسل زمین کی نسل انسانی سے بالکل مختلف ہوگی ۔ زمین پر ہر چیز اپنے ماحول کی پیداوار ہے ۔ یہاں تک کہ ہمارے قد کی اونچائی کا دارومدار سراسر فضا اور ہوا کی ثقل (Density) پر ہے ۔ اگر ہوا کی ثقل گھٹ بڑھ جائے تو اس کا اثر فوراً ہمارے قد پر ظاہر ہوگا ۔ اس وقت فضا کی جو ثقل ہے وہ ہماری جسمانی ساخت اور اس کی نشوونما کے لئے مناسب اور موزوں ہے ۔ خدانخواستہ اگر ثقل بڑھ جائے تو ہمارا قد ٹھگنا ہو جائے گا اور ہم فوراً جھک جائیں گے اور کھڑے ہو کر سیدھی طرح نہیں چل سکیں گے ہلکے سے ہلکا وزن بھی نہیں اُٹھا سکیں گے ۔ اس کے برخلاف اگر ثقل کم ہو جائے تو ہم غیر معمولی اونچائی تک جست کرنے لگیں گے ۔ پہاڑ اور پہاڑیوں پر کودنا ہمارے لئے معمولی بات ہو جائے گی ۔ وزنی سے وزنی چیز بھی ہم بآسانی اُٹھا سکیں گے اور اسے ہوا میں بھی اُچھال سکیں گے ۔

چاند پر جس قسم کے حالات ہیں اُن کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ چاند کے ماحول اور اس کی فضا میں اوّل تو کوئی چیز ہے نہیں اور اگر ہے تو اس کے سانس لینے کا طریقہ ہم سے بالکل جداگانہ ہوگا ۔ نہ تو ان کی ناک ہوگی اور نہ پھیپھڑے ۔ ان کے شہر اور بستیاں بھی عجب ہوں گی ۔

اگر رہائش کے لئے ایک مکان بنا لیا تو بس وہ ہمیشہ کے لئے کافی ہے ۔ ہوا تو ہے نہیں جو اسے کسی قسم کا نقصان پہنچائے اور نہ کبھی بارش کا امکان ہے ۔ نہ ہی بجلی کے کڑکے کا خوف ہے ۔ بس ایسی جگہ ہے کہ نہ تو کسی قسم کے نقصان کا خطرہ ہے اور نہ ہی آندھی طوفان کا ڈر ۔ اسی لئے مکان میں شیشے کی کھڑکیاں بھی لگانے کی ضرورت نہیں ۔ اطمینان ہی اطمینان ہے ۔

تمھیں یہ معلوم ہوگا کہ ہوا اس قدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر آگ بھی نہیں جلتی ۔ یہ بات اپنی جگہ پر دلچسپ ہے کہ چاند پر ایک بار عمارت بن جانے کے بعد کبھی وہ نیست و نابود نہیں ہوگی لیکن اگر اس مکان کے اندر آگ جلانے کی ضرورت پیش آئے تو کیا کیا جائے گا ۔ ماچس بھلا کیوں کر جلے گی ؟ چولھا کیوں کر گرم ہوگا ؟ کھانا اور ناشتہ کیوں کر تیار ہوگا ؟

ہوا کے بغیر ہم ایک دوسرے سے گفتگو نہیں کر سکتے اس لئے چاند پر بسنے والے بالکل گونگے ہوتے ہوں گے ۔ کسی قسم کا شور و غوغا اور ہنگامہ اور تیز سے تیز پیروں کے قدم کی آواز بھی نہیں سُنائی دیتی ہوگی ۔ اگر بڑی سے بڑی توپ کے گولے برسائے جائیں تو اس کی آواز اس قدر برائے نام ہوگی جیسے کہ نرم گدّے پر ایک پن کے گرنے کی آواز ہوتی ہے ۔ اگر پھول ہیں تو ان سے خوشبو بھی نہیں نکلے گی ۔ چڑیاں بھلے ہی ہر شاخ پر چہچہائیں لیکن ان کے گانے کی آواز یک سرے سے سُنائی ہی نہیں دے گی ۔ اگر کبھی کوئی بُرا وقت آ گیا یا کوئی خطرہ درپیش ہوا اور چیخنے اور شور مچانے کی ضرورت پیش آئی تو چیخنا بے سُود ہوگا اس لئے کہ مُنہ سے کوئی آواز ہی نہیں نکلے گی ۔ الغرض چاند پر کسی قسم کا شور نہیں ہے ۔ نہ ہوا ہے نہ پانی ۔ سنّاٹا خاموشی اور سکوت ہے ۔

اختر جمال

نیا خزانہ

عبدل ایک بڑا لالچی آدمی تھا۔ اسے ہر وقت دولت حاصل کرنے کی فکر لگی رہتی۔ وہ ہر وقت دولت مند لوگوں کے بارے میں سوچا کرتا جب اس کے ساتھی کسی امیر آدمی کا ذکر کرتے تو وہ فوراً بول اٹھتا۔

"ارے اسے تو میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں، ہم دونوں کی پرانی دوستی ہے" ــــ لیکن اگر کبھی کسی غریب آدمی کا تذکرہ ہوتا تو وہ جانتے ہوئے بھی انجان بن جاتا اور کہتا۔

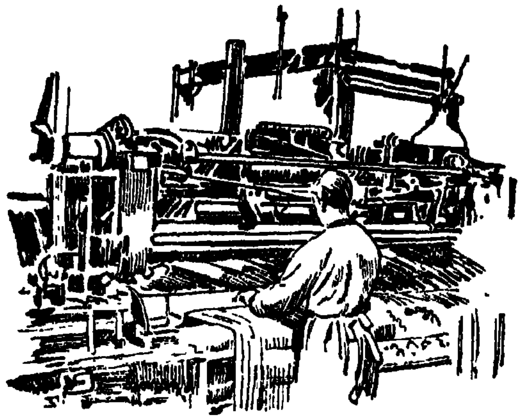
"میں اس سے قطعاً واقف نہیں" وہ اس کے علاوہ اور کچھ جواب نہ دیتا۔

اپنی تمام کوششوں کے باوجود عبدل غریب تھا۔ اس کی آمدنی کا ذریعہ دے کے وہ ایک کرگھا تھا جو پشتہا پشت سے چلا آرہا تھا۔ یہ آمدنی گو زیادہ نہ تھی پھر بھی کچھ نہ کچھ روپے وہ بچا ہی لیتا یہ روپے سب سے چھپا کر کسی جگہ رکھ دیتا اور روزانہ شمار کرتا۔

لیکن اسے ہر وقت زیادہ دولت جمع کرنے کی فکر لگی رہتی۔

ایک دن یونہی باتوں باتوں میں اس کو کسی نے بتایا کہ ایک پڑوسی کو زمین کے اندر سے خزانہ ملا ہے۔ جس کی بشارت اسے دو راتوں سے خواب میں دی جا رہی تھی۔ یہ سُن کر عبدل نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔

ایک میں ہوں جو صبح سے شام تک محنت کرنے کے باوجود غریب ہوں۔ دوسری طرف میرا پڑوسی ہے جسے کچھ کئے دھرے بغیر اتنی دولت مل گئی۔ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگیا



اور پھر اسی اداس لہجے میں بولا۔ کاش کوئی مجھے بھی خواب میں کسی پوشیدہ خزانے کا پتہ بتا دے کہ میرے بھی دن پھر جائیں۔

لیکن ایسے خیالات نے اس کے غموں میں اضافہ کرنے کے علاوہ اور کچھ بھی نہ کیا۔ غم کی وجہ سے کام میں اس کا دل نہ لگتا اور اس کے گاہک بھی روز بروز کم ہونے لگے ــــ ہر رات وہ اسی امید میں سوتا کہ شاید آج رات اسے خواب میں خزانے کا پتہ لگ جائے ــــ آخر قسمت جو طویل عرصے سے اس پر نامہربان تھی ایک رات اس پر مہربان ہو ہی گئی۔

اس نے خواب دیکھا کہ مکان کے ایک حصے میں کرگھے کے نیچے ایک بہت بڑا خزانہ دفن ہے جس میں بے انتہا زر و جواہر ہیں۔ وہ اُٹھا، خدا کا شکر بجا لایا اور اس بات کا کسی سے ذکر نہ کیا اس لئے کہ اس نے سُن رکھا تھا کہ دولت کا بھید کسی کو نہ دینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی سُن رکھا تھا کہ خزانے کے متعلق خواب اسی وقت سچا ہوتا ہے۔ جب دو مسلسل راتوں میں ایک ہی جگہ کا پتہ بتایا جائے۔ اور اس کی یہ آرزو بھی پوری ہوگئی۔ اگلی رات اس نے پھر وہی خواب دیکھا۔



اب خزانے کے بارے میں اسے ذرا بھی شک نہ رہا۔ اس لئے ایک کدال لیا اور دیوار کو اس جگہ سے کھودنا شروع کر دیا جو خواب میں بتائی گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اسے ایک ٹوٹا گھڑا ملا جو دفینے کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد اسے ایک بڑا سا پتھر نظر آیا جو اس سے اکیلے ہٹائے نہ ہٹا۔

"یہی ہے خزانہ" وہ خوشی سے چلایا۔ "خزانہ یقیناً اس بڑے پتھر کے نیچے دفن ہے"۔

پھر اس نے سوچا کہ چونکہ یہ پتھر اکیلے ہٹانا مشکل ہے اس لئے بیوی کو کیوں نہ بلا لیا جائے۔ بیوی کے علاوہ کسی اور پر یہ راز ظاہر کرنا اس نے مناسب نہ سمجھا

یہ خوش خبری سن کر بیوی بھی بے حد خوش ہوئی اور بولی اب ہمارے دن پھر جائیں گے۔ دونوں جلدی جلدی اس مقام تک آئے اور بڑی محنت کے بعد انہوں نے وہ پتھر ہٹایا — لیکن ان کے منہ مارے حیرت کے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اس پتھر کے نیچے ایک گر گھا رکھا ہوا تھا — اور پاس ہی ایک کاغذ پر لکھا تھا۔

"ہاتھ کی محنت ہی سب سے بڑا خزانہ ہے"

اس کے بعد عبدل نے کبھی خزانے کی تمنا نہ کی۔ خوب محنت سے جی لگا کر کام کیا اور جلد ہی اس کا شمار کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔

جانسن

دلچسپ حساب

جمع

۴۵ = ۹ ۸ ۷ ۶ ۵ ۴ ۳ ۲ ۱
۴۵ = ۹ ۸ ۷ ۶ ۵ ۴ ۳ ۲ ۱
۴۵ = ۱۹ ۷ ۵ ۳ ۰ ۸ ۶ ۴ ۲

تفریق

۴۵ = ۹ ۸ ۷ ۶ ۵ ۴ ۳ ۲ ۱
۴۵ = ۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹
۴۵ = ۸ ۶ ۴ ۱ ۹ ۷ ۵ ۳ ۲

مرسلہ:۔ محمد عبید اللہ شریف دکنی

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آجکل

دہلی

ایڈیٹر:۔ —— جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:۔ —— بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۳ —— نمبر ۶

سالانہ چندہ:۔ ہندوستان میں:۔ چھ روپے
پاکستان میں:۔ چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:۔ ہندوستان میں:۔ آٹھ آنے
پاکستان میں:۔ آٹھ آنے (پاک)

جنوری ۱۹۵۵ء

ترتیب

ننھوں کا آجکل

سرورق:۔ شری رفیع احمد قدوائی مرحوم

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

محمد مصلح الدین احمد

رفیع احمد قدوائی مرحوم

ایسے وقت جبکہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں دیوالی کے دیئے جلائے جا رہے تھے افسوس ہے کہ مسٹر رفیع احمد قدوائی کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ آپ کی موت پر ہر فرد نے سخت افسوس کا اظہار کیا اس لئے کہ مسٹر قدوائی کے پیش نظر صرف ہندوستانیوں کا مفاد تھا اس لئے کہ وہ ہر طبقے میں یکساں ہر دل عزیز تھے۔ یو۔پی اور دہلی میں آپ سے عوام کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ بہت سی جگہوں پر دیوالی نہیں منائی گئی۔ رفیع صاحب کی بے وقت موت سے حکومت ایک بہترین وزیر اور ملک ایک سچے محب وطن سے اور کانگریس ایک مثالی قاید کی رہنمائی اور عوام ایک بے لوث خادم سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے ہیں۔ آپ کے انتقال سے ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کا پُر کرنا تقریباً ناممکن ہے اس لئے کہ ان میں اتنی خوبیاں جمع تھیں کہ کسی ایک فرد میں ان تمام چیزوں کا پایا جانا مشکل ہے۔ مسٹر قدوائی کی عظمت و اہمیت کا اصل احساس اس وقت ہوا جبکہ وہ ہم میں نہ رہے لیکن جب تک وہ بقید حیات رہے ہر فرد نے آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ غذائی پالیسی کی حیرت انگیز کامیابی کے بعد آپ کی قابلیت کا سکہ سارے ہندوستان پر بیٹھ گیا۔ ساری دُنیا دنگ رہ گئی کہ روس جیسا ملک غذائی مسئلے کو ۱۵ سال تک حل نہ کر سکا لیکن قدوائی صاحب نے اسے صرف دو سال میں حل کر دیا۔ آپ ایسے وقت اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے جبکہ وہ اپنی ہر دلعزیزی اور شہرت کے معراج پر پہنچ چکے تھے اور قوم کو ان کی قیادت کی شدید ضرورت تھی اس لئے کہ آزاد ہندوستان کو سیاستدانوں سے زیادہ ماہرین نظم و نسق کی ضرورت ہے۔ مرکزی کابینہ میں ان کا مقام ایک عام وزیر کی طرح نہ تھا بلکہ آپ وزیر اعظم نہرو کے داخلی امور میں بہترین مشیر تھے اسی وجہ سے آپ کی جُدائی کا سب سے زیادہ افسوس مسٹر نہرو کو ہوا۔ کانگریس میں مسٹر نہرو کے بعد آپ ہی سب سے زیادہ ہر دل عزیز تھے۔ مسٹر قدوائی ایک اعلیٰ ایڈمنسٹریٹر تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ مرکزی حکومت کے ایک سینیر سیویلین سے جنھوں نے گیارہ وزراء کے تحت کام کیا تھا، جب یہ دریافت کیا گیا کہ بہترین ایڈمنسٹریٹر کون ہے تو انھوں نے بلا تامل جواب دیا کہ "رفیع صاحب"۔

حالات

مسٹر رفیع احمد قدوائی فروری ۱۸۹۴ء میں یو۔پی کے مقام مسولی (بارہ بنکی) کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ سے بی۔اے پاس کیا۔ اور ۱۹۲۰ء میں ایل ایل بی میں زیر تعلیم تھے کہ تحریک ترک موالات شروع ہوئی۔ تحریک سے غیر معمولی دلچسپی نے ترک تعلیم پر مجبور کیا۔ اس تحریک میں حصہ لینے کے باعث آپ جیل بھی گئے۔ رہائی کے بعد آپ مشہور کانگریسی قاید پنڈت موتی لال نہرو کے سکریٹری بنے جن کا آپ پر کامل اعتماد تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو نے مسٹر قدوائی کو ابتدائی سیاسی ٹریننگ دی جو بعد میں اُن کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔

یوپی سیاسیات میں حصّہ

مسٹر قدوائی کو یو۔پی کی سیاسیات سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصّہ اسی صوبے میں گذرا۔ آپ نے اُتر پردیش اُس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک مسٹر نہرو نے مرکزی کابینہ میں شمولیت کے لئے اصرار نہ کیا۔ آپ کی سیاسی قابلیت کا علم پہلی دفعہ ۱۹۲۶ء میں ہوا جب کہ آپ مرکزی مجلس مقننہ کے لئے منتخب ہوئے۔ جہاں آپ نے پہلے سکریٹری اور پھر ۲۹-۱۹۲۷ء تک چیف وہپ کانگریس پارٹی کی حیثیت سے پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں کام کیا۔ ۱۹۲۹ء میں کانگریس کے حکم کی تعمیل میں اسمبلی سے مستعفی ہو گئے لیکن ۱۹۲۶ء میں آپ کو یو۔پی کانگریس کا معتمد عمومی منتخب کیا گیا۔ آپ اس کے چار سال بعد صدر رہنے لگے۔ یو۔پی میں مسلسل

کام کے باعث صوبائی سیاسیات پر عبور حاصل ہوا۔ مسٹر قدوائی کو انتخابات کے لئے موزوں امیدواروں کے انتخاب میں ملکہ حاصل تھا۔ آپ کا بہت جلد کانگریس کے سب سے ہر دلعزیز لوگوں میں شمار ہونے لگا۔ آپ نے اپنے غیر معمولی اثر کو کبھی ذاتی فائدے کے لئے استعمال نہیں کیا بلکہ آپ کی تمام تر کوششیں صرف ملک و قوم کے لئے تھیں۔ ۱۹۳۷ء میں یوپی میں کانگریس نے جو شاندار کامیابی حاصل کی وہ قدوائی کی تنظیمی صلاحیتوں کا کرشمہ تھی۔ صوبہ یوپی میں آج تک کسی نے وہ مقام پیدا نہیں کیا جو رفیع صاحب کو حاصل تھا۔

یوپی میں جب پنڈت گوبند ولبھ پنت نے وزارت کی تشکیل کی تو مسٹر قدوائی کو وزیر مال بنایا گیا۔ کئی دفعہ آپ نے عارضی طور پر وزیر اعظم کی حیثیت سے کام کیا۔ زرعی اصلاحات کے نفاذ کے باعث زیادہ ہر دلعزیز بنے۔ دوبارہ تشکیل وزارت میں آپ وزیر داخلہ و مال بنے۔ ۱۹۴۲ء تک آپ اس خدمت پر فائز رہے۔ "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک کے آغاز پر دیگر کانگریسی قائدین کے ساتھ آپ کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے قبل ۱۹۳۰ء میں تحریک سول نافرمانی میں آپ نے حصہ لیا، اور یوپی کے کسانوں کو مشورہ دیا کہ وہ ٹیکس ادا نہ کریں۔ اس لئے برطانوی حکومت نے آپ کو گرفتار کر کے چھ ماہ کے لئے جیل بھیج دیا۔ مسٹر قدوائی کے صوبائی سیاسیات میں زیادہ حصہ لینے کے یہ معنی نہ تھے کہ مرکزی کانگریس پارٹی پر آپ کا اثر نہ تھا بلکہ جواہر لال نہرو سے تعلقات ایسے ہی تھے جیسے کہ موتی لال نہرو سے قبل تھے۔

وزیر مواصلات حکومت ہند

بدقسمتی سے یو۔پی کابینہ میں اختلافات پیدا ہوئے۔ لیکن یہ ہندوستانی عوام اور مرکزی کابینہ کے لئے مفید ثابت ہوئے۔ مسٹر نہرو نے اس مشہور ماہر نظم و نسق کی خدمات حاصل کیں۔ اگست ۱۹۴۷ء میں آپ کو محکمہ مواصلات تفویض کیا گیا۔ وزیر مواصلات کی حیثیت سے آپ نے چند ایسے اہم کارنامے انجام دئے جسے کوئی ہندوستانی فراموش نہیں کر سکتا۔ آپ نے ہوائی ڈاک کے رات میں پہنچانے کا انتظام کیا جس سے عوام کو بڑی سہولت ہوئی۔ دوسرے یہ کہ ملازمین ڈاک کو اتوار کی تعطیل دی جو ملازمین کی توقع سے باہر تھا۔ مزید یہ کہ آپ نے ٹیلیفون اپنانے کی اسکیم بنائی جس سے حکومت کو کروڑوں روپے کا فائدہ ہوا۔ آپ کی کوششوں کے باعث ٹیلیفون بنانے کا ایک کارخانہ کھولا گیا۔ ۱۰ متحرک ڈاک خانے کا انتظام کیا گیا، جو اس وقت صرف چند ترقی یافتہ ممالک میں مروج ہے اس طرح آپ نے ایسے کام کئے جس سے عوام اور حکومت دونوں کو فائدہ پہنچا۔ مسٹر قدوائی نے اپنے وسیع تجربے، غیر معمولی قابلیت و اختراعی طبیعت کے باعث ایسے کام کئے۔ آپ کے متعلق مشہور ہے کہ اچانک ڈاک خانے جاتے اور عام لوگوں کے ساتھ قطار میں کھڑے ہو جاتے، اور کوئی خیال تک نہ کر سکتا تھا کہ وزیر مواصلات بھی منی آرڈر کرنے والوں میں سے ہے۔ آپ یہ جاننا چاہتے تھے کہ ملازمین اپنے فرائض برابر انجام دیتے ہیں یا نہیں۔ آپ کو سستی شہرت سے سخت نفرت تھی۔ اس لئے آپ نے کوئی نمائشی کام نہیں کیا۔ ہر ایک نے آپ کی جدائی کو ناقابل تلافی تصور کیا۔

وزیر اغذیہ

غذائی صورت حال از حد نازک ہو گئی تھی۔ اس لئے مسٹر نہرو نے مسٹر قدوائی کو اغذیہ کا محکمہ حوالہ کیا، جو آپ وفات سے قبل تک سنبھالے رہے۔ غذائی قلت کو دور کرنے کے لئے مرکزی حکومت کو ہر سال دو ارب روپے کی غیر ملکی کرنسی صرف کرنا پڑتی تھی۔ راشن بندی کے باعث ہر فرد نالاں تھا، چور بازاری حد سے بڑھ گئی تھی اور ملک ایک عجیب غذائی بحران سے دوچار تھا۔ اگر راشن بندی برخاست کی جاتی تو خوف یہ تھا کہ چور بازاریے ذخیرہ کر لیتے اور یہ تمام کوششیں ناکام ہوتیں۔ اس لئے مرکزی کابینہ کے ارکان، ریاستی وزرائے اغذیہ اور خود وزیر اعظم نہرو راشن بندی کے فوری برخاستگی کے خلاف تھے۔ اگر رفیع صاحب کی بجائے کوئی دوسرا ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ وزارت سے ہاتھ دھو بیٹھتا لیکن آپ کی اس تجویز کو وزیر اعظم نے رد نہیں کیا بلکہ خاموش رہے۔ اس لئے کہ انھیں یقین تھا کہ قدوائی ہر کام نتائج پر نظر رکھ کر شروع کرتے ہیں۔ مسٹر قدوائی نے اچانک راشن بندی منسوخ کر دی۔ اس سے چند دن قبل آپ نے اہم و با اثر تاجروں سے تعاون کا وعدہ لے لیا، اور سب سے پہلے مدراس میں اس کا تجربہ کیا گیا جو پورے طور پر کامیاب رہا۔ آپ نے دانشمندی یہ کی کہ پہلے ہی کافی اناج ذخیرہ کروا لیا، تاکہ عوام کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ تعجب اس بات کا ہے کہ آپ نے مدراس جیسے صوبے کا

انتخاب کیا جہاں نہ صرف غذائی قلت زیادہ تھی بلکہ جہاں سخت قحط تھا۔ مدراس میں قدوائی کی غذائی پالیسی کی فتح نے چوربازاریوں کی کمر توڑ دی۔ اور قلیل سے عرصے میں سارے ہندوستان سے راشن بندی اٹھالی گئی۔ آپ نے خلاف توقع شاندار کامیابی حاصل کرکے سارے ہندوستان پر اپنے ماہرانہ نظم و نسق کی دھاک بٹھادی۔ رفیع صاحب کا یہ کارنامہ "غذائی معجزے" سے کم نہیں۔ وزیر اغذیہ بننے کے بعد آپ نے بالکل انوکھے طریقے پر کام شروع کیا۔ یعنی دفتری کام کم کیا اور زیادہ تر وقت مختلف لوگوں خصوصاً تجار و وزرا اغذیہ سے تبادلہ خیال پر صرف کیا، اور ان کے تعاون کا یقین ہونے کے بعد آپ نے فوراً کنٹرول اٹھالیا۔ قدوائی کی غذائی پالیسی کی شاندار فتح کے باعث آج ہندوستان خود مکتفی بن چکا ہے ۱۹۵۱ء میں ہمیں (۴۸۰۰۰۰۰) لاکھ ٹن اناج درآمد کرنا پڑا، لیکن اس وقت مسٹر قدوائی کی کوششوں کے باعث (۲۰۰۰۰۰۰) لاکھ ٹن فاضل غلہ موجود ہے، اور حکومت کا دو ارب روپیہ بچ گیا ہے جو ترقیاتی کاموں پر صرف کرسکتے ہیں۔ آپ کا یہ کارنامہ تاریخ ہند میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ آپ شکر کی قلت کو دور کرنے کے لئے نئے کارخانوں کے قیام میں مصروف تھے۔ آپ ایسے وقت جدا ہوئے ہیں جب کہ قوم کو آپ کی شدید ضرورت تھی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسٹر قدوائی سے قابل وزیر اغذیہ کوئی اور ثابت نہ ہوسکا۔

کسان مزدور پرجا پارٹی میں شرکت

آپ چند اختلافات کے باعث کابینہ و کانگریس دونوں سے مستعفی ہوکر کسان مزدور پرجا پارٹی میں شریک ہوئے۔ جس کے اچاریہ کرپلانی قاید تھے۔ اس وقت کانگریس کی صفوں میں پریشانی پھیل گئی اور مسٹر نہرو خود بہت متفکر رہے۔ کانگریس میں آپ کی دوبارہ شرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرجا سوشلسٹ پارٹی نے بری طرح انتخابات میں شکست کھائی۔

سچے کانگریسی

مسٹر قدوائی بے غرض کانگریسی قاید تھے۔ جن کے مسلمان کم ہندو

دوست زیادہ تھے۔ آپ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ مکان پر ہمیشہ دوست و احباب کا ہجوم رہتا۔ ۱۹۳۵ء گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت عہدے قبول نہ کرنے کے لئے ایجی ٹیشن شروع کیا۔ یو۔پی کانگریس پر سب سے زیادہ اثر آپ ہی کا نمایاں تھا جس کا اعتراف پنڈت گووند ولبھ پنت چیف منسٹر اترپردیش نے کیا۔ پنڈت پنت نے کہا کہ "رفیع صاحب نے غیر معمولی جرأت سخت محنت و انتہائی عقیدت سے آزادی کی جنگ لڑی، اور حصول آزادی کے بعد تمام عوام کی فلاح کے لئے بے لوث خدمت کی۔ وہ ایک بڑے محب وطن تھے، اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک انسان تھے"۔ اترپردیش کی سیاسیات سے آپ کو گہری دلچسپی تھی۔ اس لئے آپ علیحدہ ہونا نہیں چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس کی مرکزی عاملہ کے مسائل پر خصوصی توجہ نہ دے سکے۔ لیکن جب مرکزی کابینہ میں شامل ہوئے تو تمام اہم امور میں آپ کے مشوروں کو خاص دخل حاصل تھا۔ مسٹر قدوائی سنجیدہ فکر اصحاب میں سے تھے۔ آپ کا کہنا تھا کہ "صرف کانگریس ہی ایک ایسی جماعت ہے جس کا پروگرام ہے، اور جس میں قیادت کرنے کی صلاحیت ہے"۔

مسٹر قدوائی کے اچانک انتقال پر ہر فرد نے افسوس کیا۔ مسٹر بی رام کرشنا راؤ سے لے کر مسٹر نہرو تک سبھی کف افسوس ملتے رہے۔ ہر جماعت کے قایدین نے تاسف کیا۔ ہند پارلیمان کے خطیب مسٹر ماولنکر نے فرمایا کہ "رفیع صاحب ذہین اور ماہر نظم و نسق تھے۔ ان میں جلد فیصلہ کرنے کی بلا کی صلاحیت موجود تھی"۔ مسٹر برہم پرکاش نے صحیح فرمایا کہ "اس اعلیٰ درجے کے سیاست داں، بڑے مخلص محب وطن اور صاف دل خلیق انسان کے انتقال سے ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جو ہرگز پورا نہ ہوگا"۔ جن سنگھ کے قائد نے بھی آپ کو صحیح رہنما تسلیم کیا۔ مسٹر دین دیال معتمد عمومی کل ہند جن سنگھ نے آپ کی موت کو ایک عملی انسان کی محرومی قرار دیا — فی الحقیقت یہ ایک عظیم انسان کی محرومی ہے جس کا بدل ناممکن ہے۔

کوثر چاندپوری

راکھی!

سفید لباس پہنے وہ اس طرح نیلے رنگ کی دیواروں والے کمرے میں داخل ہوئی جیسے اساڑھ کے مہینے میں دودھیا بادل کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا آسمان کی نیلگوں سطح پر تیرتا ہوا سامنے آجاتا ہے ان کپڑوں میں اس کا سُرخ و سفید چہرہ یوں دمک رہا تھا جس طرح لٹھے کے تھان پر لال رنگ کی مُورت چپکی ہوئی ہو۔ اس کے ہاتھ میں تھرما میٹر تھا وہ بیڈ کے قریب آکر ہاتھ کو جھٹکنے کے بعد کانچ کے اس پتلے سے آلے میں پارے کی چمکتی لکیر کو دیکھتے ہوئے بولی -

مُنہ کھولو!

گرجیش نے مُنہ کھولنے کی جگہ اپنی دونوں آنکھیں کھول دیں، اس کے سامنے مرمر کا ایک حسین مجسمہ کھڑا تھا، اور پتلی پتلی انگلیوں میں تھرما میٹر دبا ہوا تھا گرجیش کو بخار کی شدت میں بھی ایسا لگا جیسے وہ کوئی رنگین خواب دیکھ رہا ہو اور یہ رنگینی اس کے ذہن پر چھائی جا رہی ہو -

منہ کھولیئے! —— وہ گرجیش کی لال لال انگارہ سی آنکھوں میں شعلے ناچتے دیکھ رہی تھی اور ان شعلوں نے ایک دم اس کے احساس کو چھو دیا تھا - اس نے اپنے جسم میں ایک خفیف سا جھٹکا محسوس کیا اور پھر وہ ایک —— کی حیثیت سے یہ سوچنے لگی کہ اس کے بعد اور جھٹکے بھی آئیں گے اس سے بڑے اور شدید جھٹکے، محبت کی آگ سلگتی ہے تو اس کے نیچے دہکتی ہوئی جوالا بھی نظر آنے لگتی ہے -

گرجیش کی نگاہیں ابر کے درمیان جگمگاتے ہوئے آفتاب پر جمی رہیں اسی حالت میں اس نے منہ کھول دیا اور اس نے اپنی نازک انگلیوں میں دبا ہوا تھرما میٹر گرجیش کے ہونٹوں میں دے دیا پھر کلائی گھما کر رسٹ واچ دیکھی اور یوں ہی وقت گزارنے کے لئے گرجیش کی نبض پر انگلیاں جما دیں اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلنے لگے وہ کچھ گن رہی تھی اور گرجیش کو یوں لگ رہا تھا جیسے بخار کی چنگاریاں سارے بدن سے سمٹ کر اس کی انگلیوں کی ٹھنڈک سے بجھتی جا رہی ہیں -

کتنا ٹمپریچر ہے اس وقت، سسٹر!

اور اس کی زبان سے سسٹر کا لفظ سُن کر وہ چونک گئی وارڈ کے سارے مریض اسے سسٹر ہی کہتے تھے مگر گرجیش کی زبان سے یہ لفظ سُن کر وہ جیسے ایک ہی لمحے کے اندر کسی اور دنیا میں پہنچ گئی ہو اس دنیا میں جہاں صرف دودھ کی لہریں ہوں اور ہر طرف ایسے ہی سفید پھریرے اُڑ رہے ہوں نیلے آکاش پر دھولی جیسی گھٹائیں بھاگ رہی ہوں -

صرف سو ہے! اس نے دھیرے سے کہا اور پین کھول کر چارٹ پر کچھ لکھا اور میز پر رکھی ہوئی بوتل سے اونس میٹر میں ذرا سی دوا انڈیل کر گرجیش کے مُنہ سے لگا دی وہ ایک ہی سانس میں پی گیا -

بہت میٹھی ہے کیا؟ اس نے مُسکراتے ہوئے پوچھا

جی ہاں بہت میٹھی، بہت زیادہ میٹھی!

وہ بدستور مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی گرجیش دیر تک اس کی بابت سوچتا رہا، کتنی حسین ہے وہ، حسین اور معصوم، اس کی عمر نوکری کرنے کی تو نہیں تھی، —— ملتا ہی کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو ملتے ہوں گے، مگر ہوتا ہی کیا ہے اتنی سی رقم میں، —— شاید وہ محض خدمت کے لئے یہ کام کرنے لگی ہو اس کے دماغ میں خیالات کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو گیا، وہ تنہا وارڈ میں پڑا تھا - آسمان کی پھیلی ہوئی نیلگوں سطح پر ابر کا کوئی ٹکڑا دکھائی دے رہا تھا اس کی نیلاہٹ میں دور تک کہیں سفیدی نظر نہ آرہی تھی، اساڑھ، جیٹھ میں بدل گیا تھا - جبھی وہ اتنے کم بخار میں بھی گرمی محسوس کرنے لگا تھا، اسے اپنی جلد پر جگہ جگہ چنگاریاں رکھی معلوم ہو رہی تھیں - چار پانچ گھنٹے کے بعد پھر

ارڈ کا دروازہ کھلا اور باہر کا وہی ٹکڑا کمرے کی نیلی دیواروں کے درمیان ہرنے لگا۔ ذہن پر چھائی ہوئی نیلی سطح پر سیکڑوں ستارے اُبل پڑے س مرتبہ وہ گرجیش کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی اس نے بیمار کی جلتی ہوئی پیشانی پر اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھا پھر ایک ہاتھ میں اس کی کلائی سنبھال کر دوسرے ہاتھ کی مرمریں اُنگلیاں تڑپتی ہوئی رگ پر رکھ دیں۔ گرجیش کے خون کی روانی میں اعتدال پیدا ہونے لگا۔ آنکھوں کی جلن ذرا کم ہوگئی اس کی نگاہیں سنہری رسٹ واچ پر جمی ہوئی تھیں اور گرجیش اس کے چہرے کو دیکھے جا رہا تھا، کتنا دلفریب اور معصوم تھا اس کا چہرہ، رخساروں پر خفیف سی تمتماہٹ تھی۔ جو بار بار زیادہ ہو جاتی تھی جیسے ایک دم بجلی چمک گئی ہو۔ بجلی کی یہ چمک اُبھرتی اور پھر غائب ہو جاتی۔

آپ بالکل اچھے ہیں

نہیں سسٹر میں بالکل اچھا نہیں ہوں۔

سسٹر کے اس لفظ پر وہ پھر چونک گئی، اس نے اپنے جسم میں پھر ایک جھٹکا لگتا محسوس کیا۔

آپ کیسا فیل (Feel) کرتے ہیں اپنے آپ کو ؟

بہت بُرا

وہ ہنس پڑی اور اسی طرح ہنستے ہوئے بولی۔ بُرا تو آپ کو پہلے بھی نہیں کہا جا سکتا تھا اور اس وقت تو آپ سچ مچ بہت اچھے معلوم ہو رہے ہیں۔

شاید! گرجیش عجیب انداز سے اسے دیکھتا رہا۔

اس نے گرجیش کے بازو میں انجکشن لگایا اور چارٹ پر کچھ لکھ کر چلی گئی اس کے بعد وہ نہیں آئی اور اگلے دن جب بڑے ڈاکٹر کے راؤنڈ سے ذرا دیر پہلے آئی تو گرجیش بالکل اچھا تھا اس کا بخار چار روز کے بعد اتر چکا تھا، درد سر بھی باقی نہ رہا تھا بس دل میں ذرا سی کھٹک تھی جو اس کے آتے دُور ہو گئی۔

کہئے مسٹر گرجیش آپ کیسے ہیں ؟

آپ خود ہی دیکھ لیجئے، گرجیش نے اس کے ہاتھ میں تھرمامیٹر دیکھ کر منہ کھول دیا۔

اور اس نے بدستور ہاتھ جھٹک کر پارے کی لکیر کو دیکھا اور تھرمامیٹر گرجیش کے منہ میں دے دیا۔

ٹمپریچر اب نہیں ہے اور بھی کچھ نہیں معلوم ہوتا اس نے اپنی نیلی سی آنکھیں جن میں سفید گھٹائیں دوڑتی نظر آ رہی تھیں گرجیش کے چہرے پر جما دیں۔ گرجیش بھی غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

صاحب آ رہے ہیں راؤنڈ میں

پھر ؟

مجھے اگلے وارڈ میں جانا ہے

وہاں کون ہے

ایک اور بابو ہیں۔

گرجیش نے مضمحل انداز سے تکیے پر سر رکھ دیا اور وہ احتیاط سے کواڑ کھول کر باہر چلی گئی اس کے جاتے ہی بڑا ڈاکٹر آ گیا اس نے گرجیش کو دیکھ کر کہا۔

آپ بالکل فٹ ہیں مسٹر گرجیش! ابھی ویک نس (Weakness) بہت ہے چوتھے دن ڈس چارج کر دیا جائے گا۔

چوتھے دن ؟ — گرجیش نے احتجاج کے انداز میں پوچھا۔

جی ہاں چوتھے دن کیا پہلے جانا چاہتے ہیں آپ ؟

نہیں میں ابھی رہنا چاہتا ہوں۔

چوتھے دن ۹ بجے گرجیش ہسپتال چھوڑ رہا تھا، آبی رنگ کی کار ہارن بجاتی آہنی گیٹ کو پار کر کے وارڈ کے سامنے آ کر ٹھہری تو گرجیش آرام کرسی پر بیٹھا تھا اور وہ اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھی تھی۔

مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ اچھے ہو کر جا رہے ہیں!

نہیں، میں بیمار ہو کر جا رہا ہوں سسٹر! ایک نئی بیماری کا زہر اپنی رگوں میں لے کر۔

وقت آنے پر اس کا بھی علاج ہو جائے گا لیکن مجھے آپ کی اس بات پر بھروسہ نہیں صاحب اچھی طرح آپ کا اگزامینیشن کر چکے ہیں صاحب ساری بیماریوں کو نہیں پہچانتے۔

ایسا مت بولو مسٹر گرجیش وہ ایف، آر، سی، ایس ہیں انگلینڈ کے۔

اور ضروری نہیں کہ ہر ایف، آر، سی، ایس آدمی کے دل کے پردوں میں اُلجھی ہوئی بیماریوں کو دیکھ لیا کرے۔

ڈاکٹر سب کچھ دیکھ لیتا ہے ۔

مجھے یقین نہیں سسٹر دل کی دھڑکنیں تو کان میں آلہ لگا کر سن سکتا ہے مگر ان میں گونجتی ہوئی آوازیں نہیں سن سکتا ۔

وہ آوازیں آپ اپنے منہ سے نکال سکتے ہیں ۔

گرجیش لاجواب ہو کر اسے دیکھنے لگا اور دیر تک دیکھتا رہا، اس کا سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا ادھر وہ بھی دوسرے وارڈ میں جانے والی تھی گرجیش دروازہ کھول کر باہر نکلا اور پھر وہیں کھڑا ہو گیا کمرے کی نیلی دیواریں مسکراتی محسوس ہو رہی تھیں ان پر جگہ جگہ ابر کے ٹکڑے ناچ رہے تھے، ستارے جھلملا رہے تھے وہ اندر آ گیا اور قریب سے دیواروں کو دیکھنے لگا، جیسے وہ ان سے جانے کی اجازت مانگ رہا ہو۔

کیا دیکھ رہے ہیں آپ ؟

کچھ نہیں، ان دیواروں پر ابھی ابھی کچھ گھٹائیں دوڑ رہی تھیں ۔

کیسی گھٹائیں ؟

بالکل سفید، دودھ کی مانند سفید

ایسی باتیں تو بیماری میں بھی نہیں کیں آپ نے

اور میں کہتا ہوں میری بیماری اب شروع ہو رہی ہے' ——

گرجیش وارڈ سے نکل گیا اور موٹر میں جا بیٹھا وہ آپ ہی موٹر ڈرائیو کر کے آہنی گیٹ کے ادھر جا پہنچا پھر اس کی کار سڑک پر دوڑتی دکھائی دی اس کے بعد غائب ہو گئی اور وہ وہیں کھڑی سڑک کو دیکھتی رہی جیسے گرجیش کی موٹر میں اس کی بھی کوئی چیز چلی گئی ہو، تھرمامیٹر —— ٹرے —— سرنج یا ایسی ہی کوئی اور ضروری اور قیمتی چیز، نہ جانے وہ کیا ہوگی، اسی دن سے ہسپتال اجاڑ سا نظر آنے لگا، ہر وقت اس کا جی الجھتا رہا، مریضوں کی باتیں اسے بری معلوم ہوتیں وہ انجکشن لگاتے وقت ان بانہوں میں گرجیش کے بازوؤں کا سا گداز ڈھونڈتی ۔ اسے بار بار یہ آرزو ہوتی کہ گرجیش کے انداز میں کوئی باتیں کرے، باتیں تو دوسرے وارڈ کا بابو بھی کرتا تھا مگر وہ اس کے کانوں میں گرم سیسہ انڈیلنے لگتی تھیں، مریض آتے اور چلے جاتے جب سے وہ یہاں آئی تھی یہی ہوتا آیا تھا لیکن وہ کسی سے اتنی مانوس نہ ہوئی تھی نہ ان میں سے کسی کے جانے پر خالی وارڈ کو دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے زندگی میں ویرانی سی آ بھری ہو، وہ ایک بار کسی عزیز ترین ہستی سے چھوٹ گئی ہو، کمار پھر ایک مرتبہ اس سے جدا ہو گیا ہو، وہ بار بار خالی وارڈ میں گئی اور کرسی پر بیٹھ کر خالی پلنگ کو دیکھا چند سال پہلے کمار کا خالی پلنگ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جس قسم کے گرم گرم آنسو بھر گئے تھے وہ آج بھی چھاتی میں ابلتے اور کھولتے معلوم ہو رہے تھے ان کی سنسناہٹ اس کے کانوں میں گونج رہی تھی، مگر وہ انھیں ٹھنڈا کر کے پی جانا چاہتی تھی —— آنسوؤں کا بہہ جانا اچھا نہیں ہوتا' وہ دل کی آگ کو بھی اپنے ساتھ بہالے جاتے ہیں' وہ ضبط کرتی رہی پھر بھی اس کی دونوں آنکھوں سے دو آبشار چھوٹ نکلے اس نے جلدی سے انھیں رومال میں جذب کر لیا لیکن پتہ چلا کہ وہ سوکھ نہیں سکتے' کبھی نہیں سوکھ سکتے' اس نے تھرمامیٹر نکال لیا اور بالکل اسی انداز سے جھٹکا دے کر بولی ۔

منہ کھولئے !

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی بھی دیکھی اور پھر تھرمامیٹر کو کیس میں رکھ کر چارٹ پر کچھ لکھ بھی دیا اس کے بعد وہ چلی گئی' وارڈ بہت دنوں تک خالی نہیں رہا - وہاں ایک اور بیمار آ گیا' اور اس کو ایسا لگا جیسے اس مریض نے آتے ہی دیواروں کا سارا نیلا رنگ کھرچ دیا ہو اور اس میں ناچتے ہوئے ابر کے ٹکڑے کہیں غائب ہو گئے ہوں'

دو ہفتے کے بعد گرجیش ایک دن موٹر لے کر آیا وہ ڈیوٹی سے واپس جا رہی تھی سڑک پر ہی گرجیش کو روک کر اس نے دو چار باتیں کیں' گرجیش بہت اچھا معلوم ہو رہا تھا بخار کی گرمی نے اس کے رخساروں کی سرخی بالکل چوس لی تھی' لیکن اس کے گالوں پر گلاب کی شاداب پنکھڑیاں لرز رہی تھیں ۔

کہاں جا رہی ہیں آپ ؟

مجھے اپنے گھر تک جانا ہے

میں پہنچائے دیتا ہوں

نہیں میں تو روز ہی پیدل جاتی ہوں ۔

یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں روز ہی اس وقت گاڑی لے آیا کروں اور آپ کو گھر پہنچا دیا کروں

شاید کبھی یہ بات ناممکن بھی ہو جائے ۔

ایسا نہیں ہو سکتا —— گرجیش نے موٹر کی کھڑکی کھول دی اور

وہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔ گاڑی شہر کے باہر کی کھلی سڑک پر دوڑتے دوڑتے اس کے کوارٹر پر جا کھڑی ہوئی۔

بہت اچھی جگہ ہے کیا تنہا رہتی ہیں آپ؟

نہیں میری ماں بھی ساتھ رہتی ہیں

کوئی اور نہیں

ایک بہن ہے

اور کوئی نہیں! —— اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

گرجیش کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی خالی جگہ کو پُر کرنے کی التجا کر رہی ہو وہ پوچھ رہی ہو کیا تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتے تاکہ آئندہ میں پوچھنے والوں سے کہہ دیا کروں گرجیش بھی رہتے ہیں میرے ساتھ اور وہ میرے ..... گرجیش اسے چھوڑ کر جلد ہی چلا گیا اور اگلے دن حسب وعدہ جب وہ آیا تو وہ سفید کپڑوں میں نہ تھی اس نے نیلی ساری باندھ رکھی تھی اس کا چہرہ ٹھیک اس ستارے کی مانند دمک رہا تھا جو سورج ڈوبتے ہی اُفق پر چمکنے لگتا ہے گرجیش نے اسے پہلی مرتبہ ان نیلے کپڑوں میں دیکھا وہ دیر تک بیٹھا رہا گرجیش نے اس سے زیادہ اس کی بوڑھی ماں میں دلچسپی لی جو ہر دو منٹ کے بعد کمار کا ذکر چھیڑ کر رو پڑتی تھی۔

دن بھر اکیلی رہتی ہوں بیٹا! رملا ہسپتال چلی جاتی ہے بملا کو اسکول پہنچا آتی ہوں اور پھر ..... دن گزرتے رہے گرجیش رملا کے یہاں آتا رہا جب وہ آجاتا اس کی ماں اسے گھیر لیتی اور دنیا بھر کی باتیں کرتی' ان باتوں میں سب سے زیادہ باتیں کمار کے بارے میں ہوتیں کبھی کبھی رملا کے بیاہ کا ذکر بھی آجاتا اور تب ماں کا لہجہ دھیما ہو جاتا وہ دھیرے دھیرے گرجیش سے بولنے لگی۔

کتنا دکھ اُٹھایا ہے اس نے بیری اور بملا کی خاطر!

سچ کہتی ہوں گرجیش رملا بڑی اچھی لڑکی ہے۔

گرجیش کی آنکھیں چمک اُٹھیں' اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اس کا جی چاہتا کہ بڑھیا آگے کچھ اور بھی کہہ دے' رملا کو وہ اس سے بھی اچھا سمجھتا تھا وہ چاہتا تھا کسی طرح ماں کو یہ بات بتا دے' ماں کو نہیں تو رملا ہی کو'۔

ساون پر ماں نے بڑے اصرار سے گرجیش کو کھانے پر بلایا وہ طے کر چکی تھی آج سب کچھ اس سے کہہ دیگی' وہ اسے اپنا بنا لینا چاہتی ہے وہ بہت اچھا ہے بڑا خوبصورت ہے رملا بھی بہت پسند کرتی ہے' گرجیش کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمک اُٹھتی ہیں' ایسی چمک بہت دنوں کے بعد اس کی آنکھوں میں آتی تھی۔

رملا نے اپنے ہاتھ سے بہت سی چیزیں پکائی تھیں گرجیش آیا تو ماں نے بڑی محبت سے اسے اپنے پاس بٹھا لیا وہ اس سے رملا ہی کی باتیں کرنے لگی۔

کیا بتاؤں گرجیش رملا کتنی اچھی ہے' آج کل تو ایسی لڑکیاں دیکھنے ہی میں نہیں آتیں' ماں کی باتیں سن کر گرجیش نہ جانے کیا سوچنے لگا کئی بار اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں گیا' اور اس نے جیب میں پڑی ہوئی انگشتری کو انگلیوں سے چھوا' پھر سوچا یہ رملا کی انگلی میں ڈھیلی تو نہ ہوگی آخری بار انگوٹھی کو چھو کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ رملا کی انگلی میں یہ انگشتری پہنانے کا آج سے اچھا موقعہ کبھی نہ آئے گا' اس کا چہرہ ایک دم تمتما اُٹھا' ماں برابر رملا کی تعریفیں کرتی رہی' جب گرجیش کو بیٹھے بہت دیر ہو گئی' اور کھانے کا وقت قریب آ گیا تو وہ کمرے میں داخل ہوئی اور گرجیش کے پاس کھڑے ہو کر بولی'

ہاتھ لائیے اپنا!

کیوں؟

میں آپ کے راکھی باندھ رہی ہوں

راکھی؟ —— ماں کی آنکھیں پھیل گئیں۔

ہاں راکھی' ماں بہت دنوں سے میں "کمار" کو ڈھونڈھ رہی تھی اور اس دن وہ مجھے ہسپتال میں ہاتھ آ گیا جمنا میں ڈوبا ہوا کمار کہاں آکر اُبھرا ہے ماں! ——

—— ہاتھ لاؤ گرجیش تم کئی بار مجھے "بہن" کہہ چکے ہو' آج میں تمہیں بھائی بنا رہی ہوں' میرے بیرن کا خالی پلنگ کتنے دنوں کے بعد آباد ہوگا آج ماں؟

ماں کی آنکھوں سے نیر بہنے لگا اور بھیگی ہوئی آنکھوں نے دیکھا کہ دور جمنا کی لہروں پر بہتا ہوا کمار اس کی طرف آرہا ہے' اس کی چھاتی میں مامتا کی گھٹائیں اُمنڈنے لگیں' اس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر بے اختیار گرجیش کا منہ چوم لیا اور گرجیش نے دیکھا کہ حد نظر تک سفید' دودھ کی مانند سفید بادل چھا گئے ہیں آج سارا آسمان روئی کے ان گالوں میں چھپ گیا تھا۔

شوکت سبزواری

اقبال کا نظریۂ شعر

آج تک شعر کی جامع و مانع تعریف نہ ہوسکی۔ کسی نے شعر کو موزوں اور مقفیٰ کلام بتایا۔ کسی نے کہا کہ مناسب الفاظ، نقوش اور اوزان میں احساس تاثر کو ڈھال دینا شعر ہے۔ کسی نے شعر کو لفظی صنعت گری قرار دیتے ہوئے لکھا۔ جب بہترین لفظوں کو بہترین ترتیب کے ساتھ رکھ دیا جائے تو شعر وجود میں آتا ہے۔ ان میں سے کوئی تعریف بھی جامع نہیں۔ خیال شعر کا ایک اہم جزو ہے جسے سرے سے یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ دراصل شعر کی تعریف اس وقت تک جامع نہیں ہوسکتی۔ جب تک اس کی حقیقت کی پوری پوری نقاب کشائی نہ ہو۔ تعریف کے معنی ہیں کسی چیز کی حقیقت بتانا اس لئے شعر کی تعریف کا مسئلہ شعر کی حقیقت سے وابستہ ہے۔ اصل سوال شعر کی حقیقت کا ہے۔ اس کی ماہیت اور غرض و غایت کا ہے۔ شعر کسے کہتے ہیں؟ اس کی حقیقت کیا ہے۔ اور وہ کن ترکیبی عناصر سے مل کر بنی ہے؟ شعر کی تخلیق کس طرح ہوتی ہے اور کس مقصد سے؟ شعر کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ان تمام سوالات کا واضح اور صاف صاف جواب ہونا چاہئے۔ اقبال نے اپنے کلام نیز مضامین و مکاتیب میں ان کا جواب دیا ہے۔

اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ شعر لفظوں کا آرٹ ہے جس طرح موسیقی آوازوں کا۔ الفاظ بامعنی ہوتے ہیں اس لئے شعر کا تعلق معانی سے بھی ہے۔ ویسے تو ہر لفظ کے ایک معنی ہیں چاہے وہ نثر میں استعمال ہو یا نظم میں یا روزانہ بات چیت میں۔ لیکن شعر میں استعمال ہونے والے الفاظ کا عام اور معمولی مفہوم کے علاوہ ایک اور گہرا ایمائی مفہوم بھی ہوتا ہے۔ یہ ایمائی مفہوم آرٹ کی جان ہے جو آرٹ کی ہر قسم میں پایا جاتا ہے تصویر ہو یا مجسمہ، شعر ہو یا نغمہ۔ لیکن شاعر کا تعلق الفاظ سے ہے اور لفظ کے عام معنی بھی ہوتے ہیں اس لئے یہاں کبھی کبھی عام معنی اور ایمائی مفہوم میں خلط ملط کر دینے کی وجہ سے لفظوں کے اس مجموعے کو بھی شعر کہہ دیا جاتا ہے جو درحقیقت شعر نہیں ہوتا۔ بے جان لفظوں کا ڈھیر ہوتا ہے۔

اقبال کے خیال میں شعر ایمائی مفہوم کا نام ہے جو خیال بھی ہوسکتا ہے اور جذبہ بھی سوچی ہوئی رائے بھی ہوسکتی ہے اور باطن میں محسوس کیا ہوا احساس بھی۔ شعر آرٹ کا ایک شعبہ ہے جس کا روئے سخن دل کی طرف ہے۔ شعر کا تعلق دماغ سے زیادہ دل سے ہے۔ دل کی دنیا میں پیدا ہونے والا ہر جذبہ شعر کا موضوع ہوسکتا ہے۔ ہر نکھرے ہوئے احساس اور وجدانی کیفیت کو شعر کے قالب میں ڈھالا جا سکتا ہے، لیکن خالص دماغی پیداوار کو شعر بنا کر پیش کرنا مشکل ہے جب تک دل کی گرمی سے تپا کر سوزِ دل کی سی کیفیت اس میں پیدا نہ کی جائے۔ ہربرٹ ریڈ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ خیالات یا جذبات شعر کے تعمیری اجزا نہیں ہوتے۔ وہ صرف شعر کے لب و لہجہ کی اصلاح و ترمیم کرتے ہیں[1]۔ اقبال کے نزدیک خیالات و جذبات شعر کے اصلی اجزا ہیں۔ لیکن خیالات میں انھوں نے فرق کیا ہے۔ خیالات محض جو صرف دماغ کی پیداوار اور فکر کے تربیت یافتہ ہیں۔ دل کی بھٹی میں تپائے ہوئے خیالات جو سوزِ دل کی کیفیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک دوسری قسم کے خیالات شعر کی حقیقت میں داخل ہیں۔

حق اگر سوزے ندارد حکمت است — شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

اس لحاظ سے شعر اور حکمت (فلسفہ) میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ دونوں کی حقیقت حق و راستی کا بیان ہے۔ حکمت میں یہ بیان بے رنگ اور سادہ طریقہ سے فکر کی مدد سے ہوتا ہے اور شعر میں جذبات کا رنگ دے کر وجدان کی مدد سے۔ فکر دماغ کا عمل ہے اور وجدان دل کا۔ دماغ فلسفہ

---

[1] "Phases of English poetry" صفحہ ۵۷

کا عمل گاہ ہے اور شعر دل کی۔ اس لئے فلسفے کا خطاب دماغ سے ہے اور شعر کا دل سے۔ علامہ اقبال نے شعر کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے اسرارِ خودی کے دیباچے میں لکھا تھا۔

"ہندو حکماء نے مسئلہ وحدۃ الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریقہ اختیار کیا۔ یعنی انھوں نے دل کو اپنا آماجگاہ بنایا۔"[1]

جدید تنقید کے بہت سے دبستان ہیں جو بعض اہم بنیادی مسئلوں میں باہم اختلاف رکھتے ہیں۔ اقبال جدید نقادوں میں سے کسی کے مقلد نہ تھے۔ انھوں نے شعر کے بعض پہلوؤں پر جس فیصلہ کن انداز سے بحث کی ہے اس سے اس فن میں ان کی مجتہدانہ شان کا اظہار ہوتا ہے۔ مغرب کے جدید نقادوں کی اس رائے سے انھیں اتفاق نہ تھا کہ شعر الفاظ اور طرز ادا کا نام ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ کوئی نیا خیال بھی نہ تھا۔ عرب کے نقادوں میں سے ابن قدامہ اسی خیال کے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ خیال ہر شخص کے ذہن میں آسکتا ہے۔ شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ اسے خوبصورت الفاظ اور انوکھے انداز میں ڈھال کر پیش کرے۔ اقبال نے زبان وبیان سے زیادہ خیال کو اہمیت دی۔ اور تاثراتی نقادوں کے خلاف خیال اور طرز ادا میں فرق کیا۔ امریکہ کا مشہور نقاد اسپنگارن جو اطالوی نقاد کروچے کا مقلد سمجھا جاتا ہے۔ اقبال کا معاصر تھا۔ اس کا مشہور مقالہ "تنقید جدید" ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں اس نے لکھا ہے کہ تاثراتی نقاد خیال اور اظہار میں فرق نہیں کرتے۔ ہر خیال کا ایک خاص اسلوب ہوتا ہے جس میں اسے ادا کیا جاتا ہے[2]۔ اقبال اس کے برعکس ایک خیال کو مختلف طریقوں سے ادا کرنے کے قائل ہیں۔ اظہار خیال کے بعد بھی وہ زبان وبیان کی اصلاح و تہذیب کی فکر میں رہتے تھے اور ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اس کے لئے اچھا اور مناسب اسلوب نکالیں "پیام مشرق" میں "بوئے گل" کے عنوان سے ایک شعر تھا۔

زندانی کہ بند ز پایش کشادہ اند   آہے گزاشت است کہ بو نام دادہ اند

اس پر مولانا اسلم جیراجپوری نے اعتراض کیا کہ "آہے گزاشت است" بعدی ترکیب ہے۔ یہ مطلب کسی اور طرح ادا کرنا چاہئے[1]۔ آخر اقبال نے اس شعر میں اس طرح ترمیم کی۔

زاں نازنیں کہ بند ز پایش کشادہ اند   آہے است یادگار کہ بو نام دادہ اند

اپنے بعض خطوط میں اقبال نے اس خیال کی وضاحت کی ہے۔ ایک خط میں مثنوی "اسرار خودی" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اگر مجھے فرصت ہوتی تو غالباً اس موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی اس کا دوسرا حصہ بھی ہوگا۔ جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حصہ اس حصے سے زیادہ لطیف ہوگا۔ کم از کم مطالب کے اعتبار سے گو زبان اور تخیل کے اعتبار سے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہوگا۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے جو اپنے اختیار کی بات نہیں"[2]

تخیل سے غالباً شاعرانہ طرز اظہار مراد ہے جسے اقبال مطالب سے الگ قرار دے کر لکھتے ہیں کہ یہ طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے۔ اقبال کے کلام اور ان کی تحریروں کے عمیق مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اقبال شعر میں طرز اظہار کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن وہ اسے شعر کا ایک جزو سمجھتے ہیں۔ شعر ان کے نزدیک خیال اور طرز اظہار کے مجموعے کا نام ہے خیال کو اظہار کے مقابلے میں وہی درجہ حاصل ہے جو جان کو جسم کے مقابلے میں ہے۔ ع

ارتباط لفظ و معنی ارتباط جان و تن

اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں طرز اظہار پر زور بھی دیا اور کاوش کر کے خود بھی شاعرانہ انداز کے شعر کہے لیکن یہ ان کی طبیعت کا ابتدائی رنگ تھا اور جیسے جیسے یہ پختہ پڑتا گیا ان کے کلام میں سادگی آتی گئی اور آخر شوخ و شنگ طرز ادا کی جگہ واضح اور عمیق اسلوب نے لے لی۔ خود انھیں اپنے سادہ اور حکیمانہ طرز بیان کا احساس تھا اور شاید اسی لئے وہ اپنے کو شاعر کہتے ہوئے جھجکتے تھے۔

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی   کہ بانگ صور سرافیل دل نواز نہیں

آب و رنگ شاعری از ما مجو

---

[1] مقدمہ اسرار خودی صفحہ م

[2] "The New criticism" صفحہ ۳۰

[1] اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۲۳۶

[2] " " " ۲۳

ذیل کا خط مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ہے۔ اس میں انھوں نے شاعری سے بے تعلقی کا اظہار اسی خیال سے کیا ہے۔

"فن شاعری سے مجھے کوئی دل چسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ ورنہ سے

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست[1]
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

بالکل یہی بات ایک اور خط میں بھی ہے جو عشرت رحمانی کے نام ہے۔ فرماتے ہیں۔

"حقیقت میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی نسبت دنیائے شاعری سے کچھ بھی نہیں اور نہ کبھی میں نے Seriously اس کی طرف توجہ کی ہے[2]"

اقبال نے شاعری سے براءت کا اظہار اس کے جمالیاتی پہلو کو سامنے رکھ کر کیا اور اسے آرٹ کا ایک شعبہ سمجھ کر اس سے بے تعلقی دکھائی اقبال کے یہاں شعر اور شاعری کے بھی جدا جدا مفہوم ہیں۔ شعر اور چیز ہے اور شاعر اور چیز۔ شعر کے متعلق ان کے نقطہ نظر کی وضاحت میں اوپر کر چکا ہوں۔ شاعری سے انھوں نے غالباً اس کے عام اور متعارف معنی مراد لئے۔ ویسے تو اس کے کئی قرینے ہیں لیکن میری نگاہ میں ذیل کے الفاظ زیادہ اہم ہیں جو انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھے ہیں۔

"شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجے کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات میرے حالات میں میرے لئے ممکن نہیں[3]"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک شاعری کی دو حیثیتیں ہیں ایک فنی اور ادبی۔ اس لحاظ سے وہ تخلیق حسن (توازن) ہے۔ اس کے سوا اس کا کوئی مقصد نہیں۔ دوسری افادی اور حکمیاتی۔ اس لحاظ سے وہ حقلی و اخلاقی حقائق کا بیان ہے"۔ مفید اور انقلاب آفریں خیالات و جذبات کی ترجمانی ہے۔ حیات و کائنات کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی ہے۔ اقبال شاعری کے اس دوسرے پہلو کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں تخلیق حسن کم سے کم ان کی شاعری کے آخری دور میں کوئی بڑی چیز نہ تھی۔ یا اس کو وہ درجہ حاصل نہ تھا جو اصلاح، افادہ اور انقلاب کو حاصل ہے۔ اول اول وہ "دیدہ بلبل" سے گل رنگین کا نظارہ کرتے تھے اور "دیدہ حکمت کے الجھڑوں" سے انھیں کچھ سروکار نہ تھا لیکن آخر آخر ان کا نقطہ نگاہ بدلا اور انھیں یہ کہنا پڑا

ع جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

اقبال کے خیال میں حسن زندگی کی قدر نہیں۔ زندگی کی تہذیب زندگی کی قدر ہے۔ وہ اس حسن کو حسن نہیں سمجھتے جس میں زندگی کو سنوارنے اور اس کی الجھنوں کو سلجھانے کی صلاحیت نہ ہو۔ جو چارۂ دل بیمار نہ کر سکے کیٹس نے راستی کو حسن کا معیار قرار دیا تھا۔ اقبال کے یہاں راست بازی حسن کی کسوٹی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حسن حسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں خواہ مضر تو خواجہ (حافظ) دنیا کے بہترین شعراء میں سے ہیں[4]"۔

شعر کی ظاہری شیفتگی اقبال کے پیش رو اردو شعراء کے یہاں بھی تھی اور لکھنؤ میں اس کی لے اتنی بڑھی کہ بقول آتش "بندش الفاظ" نگوں کا جڑنا ہوا اور شاعری مرصع سازی۔ لیکن اس کو کیا کیجئے گا کہ میر تقی میر جیسا شاعر بھی اس کے لئے تیار نہ تھا کہ اس کو شاعر کہا جائے

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے درد دل کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

اس کی دو ہی وجہ ہو سکتی ہیں۔ یا تو میر کے زمانے میں بھی شاعری مینا کاری تھی اور درد دل یا جذب دروں کی اس کے مقابلے میں چنداں اہمیت نہ تھی یا مسائل تصوف اور عارفانہ مضامین شعر کے لوازم میں سے تھے۔ میر عام انسانی جذبات اور ابن آدم کی قلبی کیفیات کے ترجمان تھے اس لئے انھیں اپنے کلام کو شاعری کہنے میں تامل ہوا۔ بہرحال جو وجہ بھی ہو میر اور اقبال

---

[1] اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۱۹۶ [2] اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۴۲۷

[3] " " " ۱۰۸

[4] اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۵۲

میں اس لحاظ سے مشابہت ہے کہ میر کی طرح اقبال نے بھی شعر کی بارگاہ میں باریابی کو سرمایۂ شرف نہ سمجھا اور اپنے کو شاعر کہلانا پسند نہ کیا۔ میر نے درد دل جمع کرکے دیوان ترتیب دیا۔ اقبال نے "رازِ درونِ مے خانہ" بیان کرکے معارف پروری کا حق ادا کیا۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ   کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

اردو میں فارسی شاعری کے زیر اثر شعر کے لئے ظاہری محاسن اور فنی لوازم ضروری قرار دے لئے گئے تھے جو شعر کے لئے معیار کی حیثیت رکھتے تھے۔ جو اس پر پورا اترتا اسے شعر کہا جاتا۔ ذیل کی عبارت میں اقبال نے اس خیال کو بے نقاب کیا ہے۔

"قوالی کے متعلق جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا بالکل بجا ہے۔ مگر چونکہ شاعری اس مثنوی سے مقصود نہ تھی اس واسطے بعض باتوں میں میں نے عمداً تساہل برتا[1]۔"

ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"میرے زیر نظر حقائق اخلاقی و ملی ہیں ۔ ۔ ۔ فن شعر سے بھی میں بحیثیت فن کے نابلد ہوں[2]"

"شعریت" اور "معنویت" اقبال نے دو لفظ استعمال کئے ہیں۔ "شعریت" سے ان کی مراد فن کے اصول و لوازم مثلاً حسن بیان، لطف زبان، وزن، موسیقی، قافیہ وغیرہ کی مراعات ہے۔ اور "معنویت" انھوں نے جذبات انسانی اور کیفیت قلبی کی ترجمانی کو کہا ہے۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں۔

"میں نے آپ کا کلام دیکھا ہے اور تازہ نظمیں بھی۔ مجھے شعریت سے زیادہ معنویت نظر آئی اور میں بے حد متاثر ہوا[3]۔"

لیکن جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا اقبال کے نزدیک شعر کی جان معنویت ہے۔ اس کی تشریح خود انھوں نے اپنے ایک دوست کے خط میں کی ہے۔

"شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں[4]"

---

[1] اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۸۵   [2] اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۲۱۶
[3] " " " ۲۸۲   [4] " " " ۲۸۰

نئی نسل نے شعر کے فنی لوازم اور قدیم عروضی روایات کی خلاف ورزی کو نیا شعری تجربہ قرار دیا۔ اقبال کے خیال میں نئے تجربات کا میدان شعر کے موضوعات یعنی انسانی جذبات ہیں جو ماحول کے تابع ہوتے ہیں۔ جس شاعر کے جذبات ماحول سے اثر پذیر ہیں وہ جدید رنگ کا حامل ہے۔ اصناف نظم ۱
اور فن وعروض کی بابت اقبال کی رائے ہے۔

"نظم کے اصناف کی تقسیم جو قدیم سے ہے ہمیشہ رہے گی․․․․ اگر ہم نے پابندیٔ عروض کی خلاف ورزی کی تو شاعری کا قلعہ ہی منہدم ہو جائے گا اور اس نقطۂ خیال سے یہ کہنا پڑے گا۔ اور یہ کہنا درست ہے کہ موجودہ شعراء کا کام تعمیری ہونا چاہئے نہ کہ تخریبی[1]"

اقبال کو اس کا احساس بھی تھا کہ قدیم عروضی روایات کی خلاف ورزی کسی ذاتی اپج یا طبعی جوش کا نتیجہ نہیں بلکہ انگریزی نظموں کی تقلید کا اثر ہے۔ اس لئے انھوں نے آج سے بیس برس پہلے پیشین گوئی کی تھی۔

"اب کچھ عرصے سے بلا ردیف و قافیہ نظمیں لکھی جاتی ہیں۔ اور یہ انگریزی نظموں کی تقلید ہے ․․․․ اگرچہ پبلک مذاق کچھ ایسا ہو چلا ہے مگر میرے خیال میں یہ روش آیندہ مقبول نہ ہوگی[2]"

اقبال کے نزدیک تخلیق شعر ایک شعوری عمل ہے۔ شاعر پورے احساس ذمہ داری کے بعد شعر کہتا ہے۔ خود لفظ شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لاشعور کی پیداوار نہیں۔ اس نے شعور کی گہرائیوں سے جنم لیا ہے لیکن وہ بچوں کا کھیل بھی نہیں۔ شعر بڑی جانکاہی چاہتا ہے۔ بقول غالب دل گداختہ پیدا کرنے کے بعد ہی "حسن فروغ شمع سخن" کا جلوہ نظر آتا ہے۔ شعر کے لئے خاص صلاحیتوں کی ضرورت ہے جو زیادہ تر فطری ہوتی ہیں۔ اس میں انسان کے کسب و کوشش کو اتنا ہی دخل ہے جتنا ماں کی چھاتی سے دودھ کی دھاریں بہانے میں بچے کی گریہ و زاری کو۔ اقبال نے شعر کے ظاہر و باطن دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ شعر ڈھالا نہیں جاتا ڈھل کر آتا ہے کہا نہیں جاتا نازل ہوتا ہے۔ غالب نے صرف مقیاس کی حد تک شعر کو الہامی کہا تھا۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں   غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

---

[1] اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۲۸۰   [2] اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۲۸۰

اقبال نے شعر کے تانے بانے اور اس کے ورد بست کو کیفیت منجانب اللہ بتایا -

"زبان کی سلاست سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کہہ جاتے ہیں بلا قصد کہہ جاتے ہیں - اسی کا نام آمد ہے - یہ کیفیت منجانب اللہ ہے کوشش سے حاصل نہیں ہوتی"

اور خیالات و جذبات یعنی شعری موضوعات کو خدا کی دین ٹھہرایا -

"جذبات انسانی اور کیفیات قلبی اللہ کی دین ہے"

اردو کے جدید نقاد شاید اس پر ناک بھوں چڑھائیں لیکن مغرب کے نئے نقادوں میں سے ہربرٹ ریڈ نے بھی اپنی تنقیدی کتاب "ورڈسورتھ" میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے اور غیر مبہم الفاظ میں شاعری کو ایک الہامی کیفیت بتایا ہے -

---

وارث کرمانی

رازِ سخن

کیا خبر تجھ کو یونہیں سادہ ملاقات تری
کتنے مشکوک خیالوں کو جگا دیتی ہے
کتنے طوفان مرے سینے میں اٹھا دیتی ہے
کوئی نقطہ ہے جہاں تجھ سے ہراساں ہوں میں
بے دل و بے نظر و بے سر و ساماں ہوں میں
میرے آنے پہ وہ پرکیف تبسم تیرا
جس میں مجھ کو نظر آتے ہیں ہزاروں پہلو
جس میں اخلاق ترحم نظر آتا ہے مجھے
فاتحانہ سا تکلم نظر آتا ہے مجھے
نرم و شیریں سے تقاضائے غزل خوانی پر
میں بہت دور بہت دور پہنچ جاتا ہوں
کہ مرے شعر کا مخزن تجھے معلوم نہ ہو
کہ مری فکر کی الجھن تجھے معلوم نہ ہو
میری بہکی ہوئی آواز نہ غماز بنے
میرا انداز نظر تجھ سے نہ سازش کر لے
تو کہ بس حق سماعت کو ادا کرتی ہے
تجھ سے میں داد سخن پا کے تڑپ جاتا ہوں

ایسے چبھتے ہوئے ہوتے ہیں سوالات ترے
روح تخلیق کے سینے میں لرز جاتی ہے
تیرے بیتاب تجسس کی ضیا پاش کرن
خلوت غم کے قریب آکے گزر جاتی ہے
اور پھر تیرے خیالات بھٹک جاتے ہیں
میری تخئیل کی پرواز میں کھو جاتے ہیں
وجد آتا ہے تجھے ذہن کی نقاشی پر
جھوم جھوم اٹھتی ہے تو میری جگر کاوی پر
تیری آنکھوں کی خطابت ترے لہجے کی مٹھاس
میری آواز کو نغموں میں سمو دیتی ہے
میرے الفاظ ترنم میں پرو دیتی ہے
جوئے تسنیم میں ہر شعر ڈبو دیتی ہے

سالہا سال رہا ربط مسلسل تجھ سے
تو مگر آج تلک راز سخن پا نہ سکی
لاکھ شائستگیٔ نقد و نظر کی تو نے
میرے افکار کے گیسو کبھی سلجھا نہ سکی

مغیث الدّین فریدی

نظیر اکبر آبادی

یہ ارتقِ تاج تجھ پر نازاں ہے اے سخنور
اے بزمِ شاعری کے شیریں نوا قلندر
اے بے نظیر شاعر! تیری نظیر کیا ہے
تو زندگی کی دھڑکن شعروں میں بھر گیا ہے
اپنی زباں میں تو نے اک ایسا گیت گایا
اُردو کے شاعروں کو سچ بولنا سکھایا
جنتا کی سیدھی سادی ستھری زباں میں گا کر
احسان کر گیا ہے اُردو زباں کے اُوپر
ہر زاویے سے تو نے دیکھا ہے زندگی کو
پرکھا ہے زندگی کو، برتا ہے زندگی کو
عنوان زندگی سے نظموں کے لے کے آیا
"انجام" "تندرستی" "زر" "مفلسی" "بڑھاپا"
تو کیفِ آرزو کو درمانِ درد سمجھا
زہرِ حیات پی کر آبِ حیات چکّھا
ظلماتِ زندگی میں پیدا کیا اُجالا
کانٹوں کو جب نچوڑا پھولوں کا رس نکالا
احساسِ زندگی کی تہہ تک پہنچ گیا ہے
رازِ حیات پا کر یہ بات کہہ رہا ہے
من کی خوشی کی خاطر کچھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو "

نشور واحدی

غزل

گناہگار تو رحمت کو مُنہ دکھا نہ سکا
جو بے گناہ تھا وہ بھی نظر ملا نہ سکا
طرب ہے شیوۂ رندانِ عاقبت نشناس
جو گُل نہ تھا وہ گلستاں میں مُسکرا نہ سکا
بہت خفیف ہے کون و مکاں کی جلوہ گری
مری نگاہ کا گوشہ بھی جگمگا نہ سکا
سکونِ غم میں میسّر تھے چار تنکے بھی
جو شاخ چھوٹ گئی آشیاں بنا نہ سکا
گلوں کا کام ہے ایجادِ رنگ و بوئے چمن
یہ دل حجابِ گلستان کی تاب لا نہ سکا
حوالۂ نگہہِ شرمگیں ہوئیں آخر
وہ بجلیاں جو کہیں آسماں گرا نہ سکا
بدیعہ کار ہے ذہنِ خرد پسند مگر
تصوّرات سے تصویرِ غم بنا نہ سکا
عجب نہیں کہ گلستاں میں پا بہ گِل رہ جائے
وہ بدنصیب جو رمزِ خرام پا نہ سکا
جیا وہ پاک جو رکھتا تھا خارِ پیراہن
جو گل بجیب تھا دامن کبھی بچا نہ سکا
نشورؔ نازکیِ طبع شعر کیا کہیے
جہاں میں رہ کے زمانے کے ناز اُٹھا نہ سکا

عرش ملسیانی

فردوسی

(ایک ریڈیائی فیچر)

راوی۔ آج سے قریب قریب ایک ہزار سال پہلے ایران کے قدیم شہر طوس میں وہ نامور شاعر پیدا ہوا جس کی ٹکر کے شاعر دنیا میں بہت کم ملتے ہیں۔ ایران کی قدیم تاریخ کو نظم کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی کا یہ کارنامہ تاریخِ عالم میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ فارسی میں شاعری کے تین پیغمبر مانے گئے ہیں۔ قصیدے کے لئے انوری، غزل کے لئے سعدی اور بیت یا مثنوی کے لئے فردوسی۔ شاہنامے کے باب میں خود فردوسی نے فخریہ انداز میں کہا ہے:۔

فردوسی۔ "میں نے تیس سال کی مدت میں بہت رنج اُٹھائے ہیں لیکن میں نے فارسی شاعری سے ایران کو زندہ کر دیا ہے۔"

راوی۔ شاہنامے کی عظیم تصنیف کا آغاز ایک دلچسپ واقعے سے ہوا۔ ایک بھیانک رات تھی خود اُس کے لفظوں میں

فردوسی "رات نے تاریکی میں اپنا منہ دھو لیا تھا۔ آسمان پر نہ مریخ و عطارد تھے نہ زحل۔ نئے چاند نے انوکھی وضع کی آرائش پیش کی۔ ابتداء شب ہی سے رخصت کی تیاریاں کرنے۔ اس کی کمر باریک تھی اور تاج سنہری لاجوردی ہوا میں گرد کے زنگار چھیل پڑے تھے۔ تاریک رات نے جنگل اور صحرا پر سیاہ فرش بچھا دیا تھا۔ وہم نے کالے ناگ کی طرح منہ کھولے ہوئے شیطان آنکھوں کے روبرو کھڑے کر دئے۔ ہوا کی سنسناہٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ زنگی کوئلوں کی گرد اُچھال رہا ہے۔ آفتاب بے دست و پا اور زمین سیاہ چادر میں منہ چھپائے سرگرمِ خواب تھی۔ دنیا کے دل پر ہراس غالب تھا گھڑیال وقت سے بے خبر، سناٹا اور ہُو کا عالم۔ نہ پرندوں کی چیخ اور نہ درندوں کی للکار۔"

راوی۔ ایسی اندھیری رات میں فردوسی تنہا باغ میں سو رہا تھا۔ کسی نامعلوم وجہ سے اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔

فردوسی۔ (جماہیاں لینے کی آواز) کمبخت نیند کہاں چلی گئی (گھبراہٹ سے اُٹھتا ہے اور بیوی کو آواز دیتا ہے) جانِ من! ذرا اِدھر تو آؤ۔ چراغ لاؤ۔

بیوی۔ (ملحقہ مکان سے آواز دیتی ہے، حاضر ہوتی ہوں (آتی ہے) یہ کیا ہو گیا تمہیں سو کیوں نہیں جاتے۔

فردوسی۔ نیند کہاں سے لاؤں۔ ذرا کوئی ساز ہی چھیڑو۔

بیوی۔ لیجئے۔

(ساز کی آواز ......)

بیوی۔ اگر تمہاری خوشی ہو تو دفترِ پاستان سے میں تم کو ایک ایسی داستان سناؤں جو رزم بزم، فریب اور محبت کے واقعات سے بھری ہوئی ہے جسکے سننے سے تم کو آسمان کی نیرنگیوں پر حیرت ہوگی۔

فردوسی۔ ماہ رو! یہ داستان میں ضرور سنوں گا۔

بیوی۔ لیکن ایک شرط ہے۔ تمہیں اس داستان کو نظم کرنا ہوگا۔

فردوسی۔ مجھے منظور ہے۔

راوی۔ یہ خوش قسمت داستان جو اُس رات فردوسی کو سنائی گئی داستانِ بیژن تھی۔ اس کے واقعات کچھ ایسے ہیں کہ جذبِ لطیف کی پسند کے سامان اس میں بہت ہیں۔ فردوسی کی بیوی نے کہانی شروع کی:۔

بیوی۔ نوجوان بیژن جنگلی سوروں کو ختم کرنے کے لئے کیخسرو کے دربار سے رخصت ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ گرگین ایسا دغاباز اور کینہ پرور ساتھی ہے۔ بیژن اس مہم میں کامیاب ہو کر سوروں کی درانتیاں جمع کر لیتا ہے تو گرگین اس پر حسد کرتا ہے۔ وہ بیژن کی شہرت خاک میں ملانے کے لئے فریب کا جال گانٹھتا ہے اور ایک خوشنما مرغزار میں لے جاتا ہے جہاں

تورانی لڑکیاں سیر و تفریح کے لئے آتی ہیں۔ افراسیاب کی بیٹی منیژہ بیژن پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور اُسے خیمے میں بلاتی ہے۔

فردوسی۔ یہ قصّہ تو بہت دلچسپ ہے۔ اس سے پہلے کبھی مجھے سنایا ہوتا۔ تو پھر کیا انجام ہُوا منیژہ اور بیژن کی محبّت کا۔

بیوی۔ منیژہ بیژن کو اپنے محل میں لے گئی۔ افراسیاب کو خبر ملی تو اس نے بیژن کو ایک کنوئیں میں قید کر دیا اور منیژہ کی جائداد ضبط اور محل لٹا دیا گیا جوگن کے لباس میں شاہی محل سے نکالی گئی۔ وہ زبانِ حال سے کہہ رہی تھی:۔

منیژہ۔ جوگن پھرے اداس پیا بن جوگن پھرے اداس
تن پہ بھبوت گلے میں مالا
انگ انگ یوون متوالا ۔ لوگ کریں اُپہاس
پیا بن جوگن پھرے اُداس

آنسو پی کر گاتی جائے
من کا بھید چھپاتی جائے

بجھے نہ من کی پیاس
پیا بن جوگن پھرے اُداس

بیوی۔ روٹی جو در در بھیک مانگ کر لاتی ہے اس سے اپنا اور قیدی کا پیٹ پالتی ہے۔ رستم سات پہلوانوں کو ساتھ لے کر تاجرانہ بھیس میں توران بغرضِ رہائی بیژن پہنچتا ہے۔ منیژہ رستم کو پہچان کر اُس سے بیژن کی رہائی کی درخواست کرتی ہے۔ رستم اس خیال سے کہ راز فاش نہ ہو جائے اُسے ڈانٹتا ہے۔ اس ڈانٹ کے جواب میں منیژہ رستم سے کہتی ہے:۔

کہوں تجھ سے اپنا میں کیا حالِ زار
کہ روتی ہے خوں چشمِ خونناب بار
سن اے فخرِ ایران و تاجِ کیاں
دکھائی نہیں تیرے شایانِ شاں
یہ زیبا نہیں ہے کہ یوں آئے پیش
مرا دل مصیبت سے ہے ریش ریش
نہیں ہے یہ دستورِ ایرانیاں
کہ ڈانٹو اُسے جو ہو ناشادماں
نہ دھمکا مجھے خیلِ جنگ آوراں
کہ سر پہ ہے وہ داورِ داوراں
منیژہ ہوں میں دُختِ افراسیاب
برہنہ نہ دیکھے جسے آفتاب
پئے اُلفتِ بیژنِ شوربخت
کئے ترک سب میں نے تاج و تخت

بیوی۔ رُستم منیژہ کی نشان دہی کے بعد ایک شب اس کنوئیں سے بیژن کو نکال لیتا ہے۔ رستم افراسیاب کے محل میں داخل ہوتا ہے۔ افراسیاب اُس کی آواز سن کر بھاگ جاتا ہے۔ رستم اور اُس کے ساتھی پہلوان ایران کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ افراسیاب لشکر لے کر آ پہنچتا ہے۔ سخت معرکے کے بعد رستم فتح یاب ہوتا ہے۔ اور منیژہ اور بیژن کو ساتھ لے کر ایران واپس آتا ہے۔

فردوسی۔ سبحان اللہ۔ یہ داستان تو واقعی نظم کرنے کے قابل ہے۔ میں ابھی فکرِ سخن میں ڈوبتا ہوں۔ تم سو جاؤ۔

(بیوی کے جانے کی آواز)

راوی۔ فردوسی نے اس طرح شاہ نامے کی ابتدا کی۔ ابو منصور نے جو طوس کا صوبہ دار تھا اس کی سرپرستی کی۔ ابو منصور کے مرنے کے بعد طوس کا عامل سلطان خاں مقرر ہُوا۔ چونکہ شاہ نامے کا اب چرچا پھیلتا جاتا تھا سلطان محمود کو بھی خبر ہوئی۔ فردوسی کو بلوا بھیجا۔ فردوسی نے غزنین کا عزم کیا۔ ہرات پہنچا تو اسے غزنین جانے سے روکا بھی گیا۔ لیکن اس نے سوچا کہ قسمت آزمائی کرنی ہی چاہیئے۔ غرض ہرات سے چل کر غزنین میں آیا اور ایک باغ کے قریب ٹھہرا۔ وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی شہر میں جن لوگوں سے رسم و راہ تھی ان کو اپنے آنے کی اطلاع کی۔ چلتا پھرتا باغ میں جا نکلا۔ حُسنِ اتفاق سے دربار کے ممتاز شعراء یعنی عنصری، فرخی، عسجدی باغ میں سیر کو آئے تھے اور نائو نوش میں معروف تھے۔

فردوسی بھی ادھر جا نکلا۔ انھوں نے اس کو مخلِ صحبت سمجھا۔ طے پایا کہ تینوں کا ایک ایک مصرع ہم کہیں۔ اگر یہ چوتھا مصرع کہہ دے تو شریکِ صحبت کر لیا جائے۔

راوی۔ عنصری نے کہا

عنصری۔ عارض سا ترے ماہ نہیں ہے روشن

راوی۔ فرّخی نے کہا :۔

فرّخی ۔ خالی ہے گلِ رُخ سے ترے ہر گلشن

راوی ۔ عسجدی نے کہا :۔

عسجدی۔ پلکیں تری کر دیتی ہیں چھلنی جوشن

راوی ۔ فردوسی نے بڑی بے ساختگی سے کہا :۔

فردوسی جس طرح کہ ہو گیو کے نیزے سے پشن

راوی روشن، گلشن اور جوشن کا ہم قافیہ لفظ جو شن اور "ن" پہ ختم ہو، فارسی زبان میں موجود نہیں تھا۔ یہی کمال ان تینوں شاعروں نے کیا کہ اگر شاعر بھی ہوگا تو کیا کرے گا۔ لیکن فردوسی نے شاہ نامہ نظم کرنے کی ٹھانی تھی اور داستانِ پاستان میں گیو اور پشن کی لڑائی کا حال پڑھا تھا۔ عنصری اور اس کے ساتھیوں کے اصرار پر فردوسی نے یہ قصّہ انھیں سنایا۔ اس کے بعد بہت سی روائتیں ہیں۔ فردوسی کو دربار تک پہنچنے میں بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سلطان محمود نے اپنے ایک دوست ماہک کی سفارش پر فردوسی کو دربار میں طلب کیا۔ کلام سُنا اور بہت خوش ہُوا

محمود۔ میں بہت محظوظ ہُوا۔ شاہ نامے کی تصنیف تمہارے سپرد کی جاتی ہے۔

فردوسی بہت شکریہ جہاں پناہ کا۔

محمود ۔ اور دیکھو۔ وزیرِ با تدبیر۔ فردوسی کو ایوانِ شاہی کے قریب ایک مکان دیا جائے جو تمام ضروری ساز و سامان سے آراستہ ہو اور آلاتِ جنگ، اسلحۂ حرب، شاہانِ عجم اور پہلوانوں کی تصویروں سے سجا دیا جائے۔ اور ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی دی جائے۔

راوی۔ فردوسی نے چار سال تک غزنیں میں قیام کیا اور شاہ نامے کی تصنیف میں مصروف رہا۔ پھر وطن گیا اور کئی برس رہ کر واپس آیا۔ اس اثنا میں جو حصّہ تیار ہو چکا تھا محمود کے حضور میں پیش کیا اور تحسین و آفرین کے صلے حاصل کئے۔ علمی تاریخ کا یہ نہایت ناگوار واقع ہے کہ فردوسی کو اس کی اعجاز بیانی کی داد نہیں ملی۔ جب شاہ نامہ تیار ہُوا تو اس کو اشرفیوں کے عوض روپے دلوائے گئے۔

فردوسی حمام میں نہا رہا تھا کہ شاہ نامے کا صلہ پہنچا۔ فردوسی حمام سے نکلا تو ایاز نے روپے کی تھیلیاں پیش کیں۔ فردوسی نے بڑی بیتابی سے دستِ شوق بڑھایا۔ لیکن سونے کے پھل کے بجائے چاندی کے پھول نکلے۔ فردوسی کے دل سے آہ نکلی اور تھیلیاں کھڑے کھڑے لٹا دیں۔ اور ایاز سے کہا کہ بادشاہ سے کہنا کہ میں نے یہ خونِ جگر ان سفید داغوں کے لئے نہیں کھایا تھا۔

فردوسی نے غزنیں کو چھوڑ دیا۔ ایک سر بمہر لفافہ ایاز کو دیا کہ میرے جانے کے بیس دن بعد بادشاہ کو دینا۔ فردوسی ہرات کو روانہ ہُوا۔ لفافے کی مہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے۔

بہت بندگی میں نے کی شہریار — کہ تجھ سے جہاں میں رہے یادگار
بنا نظم سے میری کاخِ بلند — نہ ہو باد و باراں سے جس کو گزند
بسے رنج بُردم دریں سال سی — عجم زندہ کردم بدیں پارسی
بنائی سخن سے یہ سرسبز کشت — سخن سے جہاں کو بنایا بہشت
نہ تھی عقل پر شاہ کو دستگاہ — وگرنہ مجھے بخشتا تخت گاہ
جو ہوں ناپدید ان کو کرنا پدید — اور ان سے بھلائی کی کرنا امید
یہ خود کو مٹانے کی ہے اک روش — یہ ہے جیب میں سانپ کی پرورش
اگر شاہ کا شاہ ہوتا پدر — مرے سر پہ رکھ دیتا وہ تاجِ زر
اگر شاہ بیگم کا ہوتا پسر — میرے زانو تک ہوتے سیم و زر
وہ بوٹا کہ ہو تلخ اس کی سرشت — لگائے اسے گر یہ باغِ بہشت
اسے خلد کی نہر سے دے کے آب — جڑوں تک بھی پہنچائے گر شہدِ ناب
وہی میوۂ تلخ پھل لائے گا — وہ فطرت سے اپنی نہ بچ پائے گا
جو بد ہیں نہ چھوڑیں گے بدگوہری — سیاہی سے رانیں نہ ہونگی بری
نہ ناپاک زادے سے رکھو امید — کہ دھلنے سے زنگی نہ ہوگا سفید
نہیں آتا لونڈی بچہ کوئی کام — اگرچہ پدر ہو شہ نیک نام
کہیں میں نے یہ بیت ہائے بلند — کہ تا شاہ لے ان سے کچھ کار پند
کہ رنجیدہ شاعر کہے گا ہجا — رہے گی ہجا تا قیامت بجا

راوی۔ کلام کی جہاں گیری دیکھئے۔ محمود نے دنیا کی بڑی سلطنتیں مٹا دیں ملک کے ملک غارت کر دئے۔ عالم کو زیر و زبر کر دیا۔ لیکن فردوسی کی زبان سے جو بول نکل گئے آج تک قائم ہیں اور قیامت تک مٹ نہیں سکتے۔ یہ وہی فردوسی جس نے ایک ہزار سال پہلے جدید ایران کی بنیاد رکھی۔ جو اپنی عظمت اور اپنے بزرگوں کی عظمت کا اس قدر شیدائی تھا کہ عربوں کے

خلاف یہاں تک کہہ گیا۔

اونٹ کا دودھ اور گوہ کا گوشت کھانے والے عرب اب یہاں[1] تک آ پہنچے کہ تختِ کیانی کی آرزو کریں۔ اس گھومنے والے آسماں پر لعنت اور ہزار لعنت

یہ وہی فردوسی ہے جس کے متعلق ایک فارسی شاعر کے قول کا ترجمہ یہ ہے۔

پہلی آواز —— قدر شناسی[2] اچھی ہے کہ جب اس جھکے ہوئے آسمان نے حادثے کا تیر چلایا محمود کی شان و شوکت ختم ہو گئی اور زمانے میں اس افسانے کے سوا کچھ نہ رہا کہ اس نے فردوسی کی قدر نہ پہچانی۔

یہ وہی فردوسی ہے جس نے اتنی بڑی تصنیف میں تیس پینتیس سال اپنا خونِ جگر صرف کیا اور فخریہ انداز میں کہا۔

دوسری آواز —— مشہور[3] پہلوان رستم کو میں نے تخلیق کیا ہے ورنہ وہ سیستان کا ایک معمولی پہلوان تھا۔

راوی۔ یورپ کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہومر ہے۔ اس کا کارنامۂ فخر رزمیہ شاعری یا ایپک پوئم ہی ہے۔ مہا بھارت بھی مشہور رزمیہ نظم ہے۔ اگر دونوں کے پہلو میں کسی کو جگہ دی جا سکتی ہے تو وہ شاہ نامہ ہی ہے۔

لڑائی کے ذکر میں فردوسی کا کوئی جواب نہیں۔ آج سے دو ہزار برس کے پرانے ہتھیاروں کا ذکر عام ہے۔ اس زمانے کے باجے یہ تھے۔

بتیرہ، گاؤدم، خرمہرہ، کوس وطبل، نقارہ، کرنائے، سرغنیں۔

آلاتِ جنگ میں گرز، تیغ، سپر، خنجر، زرہ بکتر، ناوک، کمند، سناں نیزہ، پرتاب، مراتب، علم وغیرہ۔

لڑائی کے جتنے طریقے تھے یعنی کشتی لڑنا، تلوار چلانا، تیر مارنا، کمند پھینکنا، برچھی چلانا وغیرہ سب کی تفصیل شاہنامے میں ملتی ہے۔

فردوسی نے پند و نصیحت کے موتی بھی لٹائے ہیں۔ اُن میں سے چند یہ ہیں:۔

پہلی آواز — توانا بود ہر کہ دانا بود یعنی جو شخص عقل رکھتا ہے وہ طاقت رکھتا ہے۔

دوسری آواز — میں نے عاقل سے سنا ہے کہ دنیا میں عقل بہت ہے لیکن کسی ایک شخص کے پاس جمع نہیں بلکہ تھوڑی تھوڑی سب کے پاس ہے۔

پہلی آواز۔ اگر دوست کانٹا ہے تو خود تمھارا بویا ہوا ہے
اور اگر کمخواب ہے تو خود تمھارا بُنا ہُوا ہے

دوسری آواز —— رستم کا قول ہے کہ اگر نام چاہتے ہو تو سخاوت اختیار کرو لیکن نہ اس قدر کہ نادار بن جاؤ۔ دنیا کے لوگ مفلسی سے عار رکھتے ہیں۔

پہلی آواز —— کھاؤ پہنو، دو اور دلاؤ۔ لیکن کل کے لئے بھی کچھ رکھ چھوڑو

دوسری آواز۔ سینکڑوں باتیں آدھے عمل کے برابر نہیں۔

پہلی آواز۔ تم کو جہاں تک زمین ملے۔ دوست بوتے جاؤ۔

دوسری آواز۔ آسمان کے دو دل ہیں۔ ایک دشمنی سے بھرا ہُوا اور ایک محبت سے۔

پہلی آواز۔ عزیز کا عتاب دشمن کی محبت سے اچھا ہے۔

راوی۔ ایشیا کی نسبت عام شکایت ہے کہ یہاں نامور پرستی کا جوش نہیں۔ ان ملکوں میں ہزاروں نامور گزرے لیکن کسی شاعر نے یہ نہیں لکھا کہ قوم نے اس کے کمال کی کیا قدر کی۔ اس کے مرنے کا ملک پر کیا اثر ہُوا۔ لوگوں نے کیونکر اس کا ماتم کیا۔ لیکن فردوسی نے متعدد موقعوں پر مؤثر طریقے سے اس کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً رستم

ع۱ ز شیرِ شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

ع۲ خوش است قدر شناسی کہ چوں خمیدہ سپہر
سہام حادثہ را کرد عاقبت قوسی
گذشت شوکتِ محمود و در زمانہ نماند
جز ایں فسانہ کہ نشناخت قدرِ فردوسی

ع۳ منم ساختم رستمِ داستاں
وگرنہ یلے بود در سیستاں

جب مرگیا اور اس کی لاش لے کر چلے تو کابل سے لے کر زابلستان تک آدمیوں کے ٹھٹ تھے۔ جنازہ تابوت پر آیا اور صرف دو دن اور ایک رات میں یہ مسافت طے ہوئی۔ تمام ملک ماتم کدہ تھا۔ لوگ بے اختیار روتے اور چلّاتے تھے۔ مُشک اور پھول لاش پر نثار کرتے تھے اور کہتے تھے

تُو اب بادشاہی اور لڑائی کیوں نہیں کرتا۔ میدانِ جنگ میں کیوں نہیں جاتا خزانے اور زر و گوہر کیوں نہیں لٹاتا۔ کیا یہ سب چیزیں تیرے نزدیک ہیچ ہو گئیں

راوی۔ غزنین سے نکل کر فردوسی ہرات پہنچا۔ ایک عصا اور چادر کے سوا کچھ بھی پاس نہیں تھا۔ معتوب شاہی سے دوست بھی دُور بھاگتے تھے

طبرستان اور ماژندران ہوتا ہوا آخر طُوس پہنچا۔ سلطان محمود کو ایک دن وزیر نے سفر میں ایک شعر سنایا۔ بادشاہ پھڑک اُٹھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے۔ وزیر نے کہا فردوسی کا جس سے اتنی بے انصافی ہوئی ہے۔ بادشاہ نے غزنین پہنچتے ہی ساٹھ ہزار اشرفی فردوسی کے پاس طُوس بھیجنے کا حکم دیا۔ لیکن جب یہ خزانہ وہاں پہنچا تو فردوسی کا جنازہ شہر سے باہر کی طرف آ رہا تھا۔۔ ۔۔۔

(المیہ تاک موسیقی)

(آل انڈیا ریڈیو الہ آباد کے شکریے کے ساتھ)

کشمیر میں آبپاشی کے ذرائع کی تعمیر

سرینگر کے نزدیک موضع پدگم پورہ کے باشندوں کو گزشتہ سال تک کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ بھی اپنے کھیتوں میں دھان کی فصل لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ اور ان کے باپ دادا صرف مکئی ہی کی فصل کاشت کرتے رہے تھے۔ لیکن آج اسی گاؤں کے کھیت دھان کی فصل سے ہرے بھرے نظر آ رہے ہیں۔ یہ اعجاز کیونکر رونما ہوا؟ اس طرح کہ دریائے جہلم کا جو پانی اب تک گاؤں سے نیچے کی سطح سے بہہ کر آگے گزر جاتا رہا ہے اسے اب اونچی سطح تک کھینچنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس پانی کے کچھ حصے کو پھر ایک چھوٹی سی نہر میں داخل کیا گیا ہے جہاں سے نہر شروع ہوتی ہے وہاں ایک "دروازہ" لگا دیا گیا ہے تاکہ سیلاب کا پانی اس میں داخل نہ ہو سکے۔ اس نہر کا پانی بعد ازاں ایک گڑھے میں جمع ہو جاتا ہے جہاں سے اسے ڈیزل آئل پمپوں کے ذریعے تقریباً ۳۰ فٹ کی بلندی پر گاؤں مذکور کے کھیتوں کی سطح تک پہنچایا جاتا ہے۔

پدگم پورہ میں گزشتہ ماہ مئی سے اس قسم کے پمپ دن رات کام کر رہے ہیں۔ تین پمپ ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے لگائے گئے ہیں۔ توقع ہے کہ آیندہ اپریل میں دھان کی بوائی کا کام شروع ہونے سے پہلے مزید آٹھ پمپ کام کرنا شروع کر دیں گے۔

پمپوں کے ذریعے جو پانی اوپر کھینچا جاتا ہے وہ پہلے ایک تالاب میں جمع ہوتا ہے جہاں سے گیارہ میل لمبی نہر کے ذریعے یہ پانچ ہزار پانچ سو ایکڑ رقبہ زمین کے سرکاری و نجی کھیتوں کو سیراب کرتا ہے۔

چھ سب اسٹیشن

پدگم پورہ کے ہیڈ ورکس کے علاوہ دریائے جہلم کے کنارے چھ اور سب اسٹیشن قائم کئے گئے ہیں جو ڈوگری پورہ، لڈورا، انکھل، بارسو، ملھ پورہ اور جھانا میں واقع ہیں۔ ان مقامات کے پمپ دن رات کام کرتے ہیں اور ان کی مدد سے دریائے جہلم کا پانی زیادہ بلندی پر واقع کھیتوں تک پہنچتا رہتا ہے۔

مزید اسکیمیں مرتب کی جا رہی ہیں

آبپاشی کے لئے دریائے جہلم کے پانی کو بلندی پر واقع مقامات تک پہنچانے کی اس اسکیم اس سال کے آغاز ہی میں عمل شروع کیا گیا تھا۔ اب اس قسم کی اور اسکیمیں مرتب کی جا رہی ہیں تاکہ دریائے جہلم کے پانی کو اوپر کھینچ کر مقابلتاً بلند سطح پر واقع دیگر علاقوں میں آبپاشی کی سہولتیں مہیا کی جا سکیں۔ ریاست کے کسانوں کو ان اسکیموں سے فائدہ پہنچ رہا ہے۔

حسن عباس فطرت

اُردو ڈرامہ نگاری کا ارتقائی و تاریخی پس منظر

آج کل عموماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ اردو ڈرامہ ابھی تک خاطر خواہ ترقی نہ کرسکا۔ گو کہ اس کے دوش بدوش ہمیں چند آوازیں اس کے خلاف بھی سنائی پڑتی ہیں۔ مثلاً پروفیسر مجنوں گورکھپوری کا یہ جملہ کہ "انیس نے اپنی شاعری سے اردو میں ڈرامہ کی کمی کو ایک حد تک پورا کردیا۔" اور اس سے قبل مسٹر عبد اللہ یوسف علی آئی سی ایس نے ایک فاضلانہ مضمون بھی اردو ڈرامے کے مستقبل کے متعلق فرمایا تھا۔ "اردو ڈرامہ بہت زوردار ترقی کے آثار پیدا کرچکا ہے۔ تعلیم یافتہ و ذی وجاہت لوگ یقیناً اس میں ایک زبردست وسیلہ قومی ترقی کا دیکھتے ہیں اور اس کی آئندہ منزل ترقی ہماری رائے میں وہی ہوگی جو ایران ایسے ملک میں ہوئی جہاں صحیح فن ڈرامہ سے کوئی واقف نہ تھا۔ یعنی تاریخی اور سیاسی ڈرامہ نگاری سے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ایسے شاہکار جو شکسپیر نے لکھے ہیں، ان کی تصانیف کے لئے ابھی ایک زمانہ درکار ہے، اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انھیں کی سچی تقلید سے ہندوستان میں صحیح ڈرامہ نگاری کا مادہ پیدا ہوگا اور اس وقت اُردو ڈرامہ دنیا کے بہترین ڈراموں کی صف میں ایک ممتاز جگہ پانے کا مستحق ہوگا۔"

اس کلام کی تنقیح اور انکشافِ حقیقت بہت آسانی سے ہو جاتا ہے۔ جب ہم اپنے ماضی و حاضر کے سرمایۂ ادب و ڈرامے کا تجزیہ کرنے بیٹھتے ہیں اور بہ نظرِ غائر ان تمام ادوار کے سرمایے کو پیشِ نقد و نظر رکھیں جن جن سے ڈرامہ گذر چکا ہے۔ چنانچہ آج جب کہ ہر صنف ادب و سخن کو معراج حاصل ہوئی اور جملہ اصناف میں نمایاں ترقی ہوئی، ڈرامہ نویسی بھی اختیار کی گئی، اور چند افراد نے اس میں اپنے ذہنی کاوشیات کو کافی اجاگر کیا اور غیر ممالک میں بھی شہرت حاصل کی ہے۔ مسٹر امتیاز علی تاج، عبد الماجد، پنڈت کیفی، قاضی عبد الغفار، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر عابد حسین، عصمت، منٹو، کرشن چندر، علی عباس حسینی، سردار جعفری، اشک وغیرہ کافی شہرت یافتہ ہیں اور اچھے ڈرامہ نویسوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن جب ہم اسے اپنے دیگر ادبی اصناف کو مقابلے میں لاتے ہیں تو قطعاً تہی دامن نظر آتے ہیں اور وہ ارتقائی منازل جو ہماری جملہ اصناف ادب و آرٹ نے حاصل کرلئے ہیں، ڈرامہ نگاری کو مطلق حاصل نہیں۔

ماحول و امتداد زمانہ ہی ارتقائی منزل کے ضامن ہیں۔ رجحانات کا تعلق ماحول سے ہوتا ہے اور رفتار کا تعلق اوقات سے۔ اردو ڈرامہ ایک غیر ملکی پودا ہے جو سرزمینِ اردو پر انیسویں صدی کے وسط میں نصب کیا گیا جو اب جڑ پکڑ چکا ہے اور کچھ تندرست و تنومند بھی معلوم ہوتا ہے، چونکہ ہر قوم میں نقالی کا شوق فطری ہے قطع نظر اس سے کہ وہ قوم ترقی کی معراج پر ہو یا بربریت و گمراہی کے غار میں پڑی ہو، نقالی انسانی فطرت میں داخل ہے۔ البتہ بعض جگہ یہ جوش دبایا گیا اور بدعت کہلایا۔ مثلاً اسلام ہی نقالی کو جس میں ڈرامہ، بت تراشی، مصوری، رقص و موسیقی سب داخل ہیں سخت ممنوع قرار دیتا ہے۔ اسی وجہ سے فارسی جو کہ اردو کا منبع تھی اس قسم کا کوئی نمونہ اردو کو نہ دے سکی۔ مگر خود فارسی بھی اس نقالی کے جذبے سے محفوظ نہ رہ سکی۔ وہاں ڈرامہ نے مرثیہ کی صورت اختیار کرلی جس میں میدانِ کربلا میں حضرت امام حسینؑ کی شہادت پر رنج و غم کا اظہار کیا جانے لگا۔ مذہب جو عہدِ ماضی میں عنصر غالب تھا وہ بھی ڈرامہ اور دیگر اصنافِ ادب کو ذریعۂ تبلیغ قرار دینے لگا۔ جیسا کہ اہل یورپ و انگلستان کا یہی نصب العین ہوگیا کہ Miracle . Mystery طریقے سے مذہب کی اشاعت کی جائے۔

ڈرامہ ایک ایسی صنف ہے جو کہ تمام اصناف پر محیط ہے Nature

کی صحیح عکاسی و نقشہ کشی کما حقہٗ اسی سے ممکن ہے۔ ایک قادرانشاپرداز و ماہرِ فن کا راپنے دماغی و ذہنی کاوشوں کے کمالات صرف ڈرامہ ہی میں پیش کرسکتا ہے مگر یا تو ابتدا میں اس صنف نے رواج ہی نہ پایا۔ یا ہمارے اسلاف نے اس پر قلم ہی نہ اٹھایا۔

گو کہ آج قدیم و جدید ڈراموں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، مگر پھر بھی اس میں اصلاح و ترقی کی گنجائش و ضرورت ہے۔ خیالات و زبان دونوں اب بھی بہت کچھ محتاجِ اصلاح ہیں۔ الفاظ کی معنویت و اصلیت کا خیال، عبارت کا تکلف و تصنع سے مبرا ہونا۔ پلاٹ کی ترتیب و تنظیم میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہمارے ڈرامہ نویس اصلی فنِ ڈرامہ نگاری سے ناآشنا ہیں اور یہ اسی وقت حاصل ہوگا جب کہ وہی اس کام کو کریں جو اس کے اہل ہیں، اور جن کا قدرتی میلانِ طبع اس طرف ہے۔ اردو ڈرامہ کی ترقی کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ اس کا میدانِ عمل وسیع کیا جائے۔ قابل اور اہل لوگوں کی ہمت افزائی کی جائے۔ نیز یہ کہ بہترین یورپین اور انگریزی ڈرامے اور سنسکرت ناٹک ترجمے کئے جائیں۔ جن سے ہمارے اہلِ وطن کو اصلی ڈرامے کی حقیقت اور اعلیٰ آئیڈیل کا حال معلوم ہوگا اور وہ دیکھیں گے کہ یہ فن شریف گذشتہ زمانے میں کس عروج کو پہونچ گیا تھا، اور آج کل کی زندہ قوموں اور ملکوں میں اس کی ترقی کی کیا حالت ہے۔ زمانۂ حال کی خرابیوں کی اصلاح کے واسطے دلچسپ اور سوشل تماشے مرتب کئے جائیں اور سوسائٹی ہی سے اس قسم کے مضامین اخذ کئے جائیں اس فن کو بہ نظرِ حقارت نہ دیکھا جائے اور ہمارے علما و فضلا اس کی تضحیک و تذلیل کے درپے نہ ہوں۔

پردۂ اسکرین کی ایجاد سے اردو ڈرامہ کے لئے کچھ امید افزا باب کی کشود کے امکانات ہونے چاہئیں تھے۔ مگر کیا کیا جائے کہ جنسیاتی ہیجانات کی موجوں سے ہم آہنگ ہوکر ایک جانب تو خود اپنے تئیں صرف تفریح طبع و آسودگیٔ نگاہ کا وسیلہ بنے اور دوسری جانب اس اعلیٰ فن کی ترقی میں زنگ بھی لگ گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ جس عنوان سے ڈرامے کی ابتدا ہوئی اور رفتہ رفتہ اس نے یہ ارتقائی جامہ زیب تن کیا۔ اسی کو ہمارے شہرۂ آفاق اداکار پرتھوی راج مہر را جیسے سبھا نے اپنایا ہے۔ ان کی بعض

پیش کش غدار، پٹھان، آہگت پر بلا دو بکرما دتیہ معیاری بھی جاسکتی ہیں۔ گو کہ کہیں کہیں متانت و سنجیدگی ختم ہو جاتی ہے اور جذباتیت آجاتی ہے مگر نقائص سے زیادہ ان کے ڈراموں میں اچھائیاں موجود ہیں۔ کردار کی صحیح تصویر مکالموں کے زور یا ان کی امتیازی حیثیت کو نمایاں کر دیتی ہیں، جو کامیاب ڈرامے کی بنیاد ہیں۔

بلاشبہ ہر تحریک کا اپنے پس منظر سے گہرا تعلق ہے۔ اگر پس منظر میں کہیں دراز یا لوچ ہے تو تحریک اس سے اثر پذیر لابدی ہوگی۔ اگر بتدریج ارتقا کی طرف پرواز کی جائے تو مشق پرواز و حوصلۂ بلندی مدارج ارتقا کو اسیر کر لیتے ہیں۔ تعمیریں اپنے دامن میں یادِ ایام کی بھی بضاعت رکھتی ہیں، یہ کوئی طلسم ہوش ربا یا کرشمۂ چشم سرگیں نہیں بلکہ قوت و حیات و کاوش اور ندرت مدید کی جانکاہیاں مجموعی طور پر تعمیر کا عناصر ترکیبی ہیں جنھیں تکمیل کرتے کرتے تعمیر حاصل ہوتی ہے۔ یہی حال اردو ڈرامہ نگاری کے پس منظر کا ہے۔ نگاہ نکتہ رس اس کے دھندلے نقوش عہد سلطان عالم واجد علی شاہ میں پاتی ہے اور اس کے آگے نگاہ کام نہیں دیتی۔ اس لحاظ سے اردو ڈرامہ کو اگر ہم اردو میں غبار کاروان ادب کا نام دیں تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ جملہ اصناف ادب اردو غزل۔ قصیدہ، مثنوی۔ مرثیہ اس عہد میں اپنے مرتبہ کمال کو پہونچ گئے تھے یا پہونچ رہے تھے جب اس کی بنیاد پڑی ہے۔

ایک بڑا سبب یہ بھی شامل ہے کہ اولاً تو ڈرامے کا شمار نثر میں نہیں تھا اور نہ کوئی صنف نثر ماسوا داستان گوئی کے رونما ہوئی تھی۔ دوسرے اس کے صحیح فوائد اور اہمیت سے لوگ بے بہرہ تھے۔ نثر کا ابتدائی دور جسے حقیقتاً اردو نثر کہا جا سکتا ہے۔ جنگ آزادی کے بعد کا دور ہے تاہم اس عہد میں بھی کسی نے ڈرامے کی ترقی میں نمایاں حصہ نہیں لیا جب کہ افسانوی ادب پر چلا پر چلا ہوتی رہی، اور انگریزی ادب سے متاثر ہو کر ہمارے فن کاروں نے ناول کے میدان ایک حد تک جیت لئے۔

عہد واجد علی شاہ میں سب سے پہلا اردو ڈرامہ "اندر سبھا" امانت لکھنوی نے بادشاہ کے حکم سے تصنیف کیا۔ اس کے قبل عہد فرخ سیر میں شکنتلا ناٹک کا ترجمہ ہوا تھا۔ مگر اس میں ڈرامے کا کوئی عنصر نہیں پایا جاتا۔ کیرکٹر و ایکشن نہ ہونے سے اسے ڈرامہ ہی نہیں کہا جاتا۔ چہ جائیکہ اردو ڈرامہ۔ خیال پیدا ہوتا ہے کہ محمد شاہ رنگیلے

نے جو کہ بھانڈوں اور نقالوں کا دلدادہ تھا، اس صنعت کو ترقی دی ہوگی مگر کتابی صورت میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا گو کہ انگلستان حد کمال کو پہنچ چکی تھی۔ لکھنؤ جو جانِ عالم کے وقت میں فارغ البالی و بے فکری کا آماجگاہ تھا، وہیں اردو ڈرامہ نے بھی جنم لیا۔ چونکہ بادشاہ و امرائے سلطنت اپنے لطف و مسرت کے نت نئے طریقے سوچا کرتے تھے، چنانچہ ایک فرانسیسی نے اوپرا کی تجویز پیش کی جس کا یورپ میں بڑا عروج تھا، اور وہ تجویز فوراً منظور کر لی گئی۔ اس لئے کہ اس میں صدہا گانے والیوں اور حسینوں کے لئے ایک متحدہ مشغلہ نکل آیا، اور امانت کو اسی قسم کا ایک تماشا تیار کرنے کا حکم ہوا۔

۱۸۵۳ء میں اندر سبھا تیار ہوا، جو موسیقی دار کامیڈی ہے ہر سال قیصر باغ میں یہ ڈرامہ اسٹیج کیا جانے لگا۔ اس کا پلاٹ بہت معمولی ہے۔ کہانی راجہ اندر کے دربار سے شروع ہوتی ہے۔ قصہ مشہور رہی ہے پھر بھی اس کی مقبولیت بہت ہوئی۔ ملک کی تمام زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ ۱۸۹۲ء میں اس کا ترجمہ جرمن میں شائع ہوا، اس کے تقریباً چالیس ایڈیشن کتب خانہ انڈیا آفس میں موجود ہیں۔

اردو اسٹیج

اردو ڈرامے کا کثیر سرمایہ اسٹیج ہی میں ہے۔ ۱۸۵۳ء سے بیسویں صدی کے اوائل تک اردو ڈرامہ اسٹیج کے سہارے ہی پروان چڑھتا رہا، اور اسٹیج میں ہمیں پارسیوں کا منت کش ہونا چاہیئے۔ سیٹھ پسٹن جی فرام جی جنھیں اردو اسٹیج کا ابوالآبا کہنا بیجا نہ ہوگا۔ سب سے پہلی کمپنی اوریجنل تھیٹریکل کمپنی کے نام سے قائم کی۔ یہ اردو داں اور شاعر تھے پروین تخلص کرتے تھے۔ چونکہ ابتدا میں ہندو "دیو مالا" کے قبیل کے ناٹک اسٹیج کرتے تھے۔ اس لئے انھیں دیکھ کر پارسیوں نے "رستم و سہراب" وغیرہ کے قصے تیار کئے جو نسبتاً زیادہ مقبول ہوئے اور انگریزی خیال طبقے نے اسے کافی پسند کیا۔

چند تجربہ کار پارسیوں نے ان کی اہمیت و مقبولیت سے اثر پذیر ہو کر دہلی، کلکتہ، بمبئی میں انگریزی تھیٹر کی نقل قائم کی، جس کے ڈرامہ نگار میاں حسینی ظریف و رونق بنارسی تھے، جو ابتدا میں "اندر سبھا" کی تقلید میں نظم کرتے جو سامعین کو خوشگوار معلوم ہوں اور تجارت میں بھی فروغ ہو، رونق نے انگریزی ڈراموں کے بھی ترجمے کئے اور ان کا ایک ڈرامہ "انصاف محمود شاہ" گجراتی زبان میں ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا۔ ظریف کے پنجۂ تعصبیت اور خدا دوست۔ چاند بی بی۔ بلبل بیمار ڈرامے بہت مقبول ہوئے، جو آج تک معمولی تھیٹروں میں رائج -----------

فرام جی کے کمپنی میں منجملہ اور اچھے اداکاروں کے خورشید جی بالی والا اور کاؤس جی بھی تھے۔ فرام جی کے انتقال کے بعد ان دونوں نے علیحدہ علیحدہ کمپنیاں قائم کیں۔ پہلے نے وکٹوریہ ناٹک کمپنی اور آخرالذکر نے الفریڈ کمپنی نام رکھا۔ یہیں سے اصلاحات و جدت کا آغاز ہوا۔ وکٹوریہ کمپنی نے خورشید جی کی کمال اداکاری کے سہارے جلد ترقی حاصل کر لی۔ وہ کامک کے پارٹ میں لاثانی تھے جس میں کسی قسم کے تصنع یا آورد کا نام نہ تھا۔ شرم اور جھجک جس سے شکسپیر بھی مرعوب ہو جاتا تھا ان کے یہاں مطلق نہ تھی۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء میں دربار دہلی کے موقع پر اس کمپنی نے کافی خراج تحسین حاصل کیا۔ یہ کمپنی انگلستان بھی گئی تھی۔ اس نے نمایاں ترقی کی، دوسری وجہ منشی ونایک پرشاد طالب بنارسی تھے۔ انھوں نے فن ڈرامہ کو وسعت دی، زبان و مضامین کو بھی صاف کیا۔ لارڈ لٹن کی کتاب کا ترجمہ "لیل و نہار" نہایت خوبصورتی سے کیا۔ علاوہ ازیں دلیر دل شیر، نازاں، نگاہ غفلت، ہریش چندر، گوپی وغیرہ بھی یادگار چھوڑا۔

کاؤس جی برخلاف خورشید جی ایک مشہور Tragic ایکٹر تھے، اور جذبات درد و غم دکھانے میں اپنی نظیر آپ تھے، ان کو لوگ ہندوستان کا Irving کہتے تھے جو حق بجانب ہے شکسپیر رومیو اور ہیملیٹ کا پارٹ خود کرتے تھے۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گذرا کہ لاہور میں انتقال کر گئے۔ مس زہرا و مس گوہر و گلزار خاں اسی کمپنی کے اداکار تھے۔ ان کے بیٹے نے چار پانچ سال کمپنی کو چلایا۔ مگر پھر کلکتہ کے مشہور تاجر مسٹر میڈن کے ہاتھ فروخت کر دیا، جو خود بھی ۱۹۲۳ء میں انتقال کر گئے۔ حکیم نواب مرزا شوق کے نواسے سید مہدی حسن احسن لکھنوی اس کمپنی کے پہلے ڈرامہ نگار تھے جو ایک کامل ڈرامہ نگار ہوتے ہوئے بہترین شاعر و موسیقار بھی تھے۔ ان کی زبان فصیح و بامحاورہ ہے — ان کی ایک مشہور تصنیف "واقعات ابلیس" ہے۔ اس کے علاوہ بکاولی، بھول بھلیاں، دل فروش، فیروز گلنار، چلتا پرزہ وغیرہ اچھے ڈرامے ہیں۔

ان کے بعد کمپنی نے یہ خدمت بیتاب دہلوی کو جن کا نام نرائن پرشاد تھا، سپرد کی۔ یہ بمبئی سے ایک مستقل رسالہ موسوم بہ "شکسپیر" نکالتے تھے جس میں شکسپیر کے ڈراموں کا ترجمہ ہوتا تھا۔ ان کی تصانیف کافی ہیں جن میں مہابھارت، کرشن سداما، رامائن، گورکھ دھندا وغیرہ مشہور ہیں۔ ان کی وجہ سے اردو ڈرامہ نگاری کی توسیع و ترقی تو ضرور ہوئی لیکن باوجود اس کے ان کے یہاں مقفّٰی نثر کی بہتات ہے جو بعض وقت بُری معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح عربی فارسی الفاظ کے ساتھ دوسری زبانوں کے الفاظ کی آمیزش بہت بُری اور بے ربط اور سنگ برگوش معلوم دیتی ہے۔ اشعار بھی موقع و بے موقع مکالمے میں استعمال ہوتے ہیں اور بعض وقت رنج وغصہ کے موقعے پر بھی شعر ہی پڑھے جاتے ہیں جو بالکل خلاف فطرت چیز ہے۔ لیکن ان کے جذبات عمیق اور ان کے کیرکٹر زبردست ہوتے ہیں، اور وہ اصول ڈرامہ نگاری کو خوب سمجھتے ہیں۔

اب اردو ڈرامہ میں ایک غیر معمولی ترقی کا تذکرہ سمجھنا بے جا نہ ہوگا۔ الفریڈ کمپنی کے خاتمے پر محمد علی ناخدا نامی شخص نے ایک نئی کمپنی نیو الفریڈ کے نام سے قایم کی اشروع شروع میں آغا حشر نے اپنے فن کا آغاز یہیں سے کیا اور بہت سے تماشے اس کمپنی کے واسطے تحریر کئے۔ جن کے پلاٹ زیادہ تر یوروپی ڈراموں سے لئے گئے اور کچھ ان کی ذاتی تصانیف بھی ہیں۔ الفریڈ کمپنی سے قطع تعلق کے بعد انھوں نے اپنی ذاتی کمپنی کھولی جو زیادہ دن نہ چلی اور اس کے بعد حشر نے کلکتے میں میڈن کے یہاں ایک معقول تنخواہ پر ملازمت کرلی۔ ان کی تصانیف شہید ناز، مرید شک، اسیر حرص، ترکی حور، خوبصورت بلا اور سفید خون وغیرہ بہت مشہور و مقبول ہیں۔ انھوں نے کچھ ہندوانہ ڈرامے سورداس، سیتا بن باس، گنگا اترن وغیرہ بھی لکھے ہیں۔

آغا حشر کو کچھ لوگ اردو کا شکسپیر کہتے ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی بات پروفیسر آل احمد سرور نے "تنقیدی اشارے" میں کہی ہے گو کہ مجھے ان کے فرمودات سے کافی حد تک اختلاف ہے، اور اس کے تذکرے سے سوائے طوالت کے کچھ حاصل نہیں۔ تاہم یہ کہنا خود اردو کے معیار کی اپنی کا ڈنکا بجانا ہے، ہاں اگر انھیں اردو کا "مارلو" کہا جائے تو کسی طرح صحیح ہوسکتا ہے۔ کردار میں وہ وفور جذبات دکھاتے ہیں ان کا عشق گہرا اور ان کے جذبات بہت عمیق ہیں، وہ نظم و نثر دونوں کے استاد تھے۔ ان کا انداز بیان اس جگہ خوب واضح ہو جاتا ہے جب کہ وہ کیرکٹروں سے جو باہم متضاد ہوتے ہیں، مکالمہ کراتے ہیں۔ اس قسم کے سین آپ کو اسیر حرص خوبصورت بلا اور سورداس، میں ملیں گے۔ آغا حشر میں وہی عیوب ہیں جو "مارلو" میں ہیں۔ یعنی جذبات کی شدت نہ کہ لطافت، بجائے ہلکے رنگ کے فوق البھڑک رنگ، ایسے سین جس میں قتل و غارت گری دکھائی جاتی ہے، ان چیزوں کا اثر نازک اور حساس دماغ پہ بہت پڑتا ہے۔ آغا حشر پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ایک ہی تماشے میں دو مختلف پلاٹ قائم کرتے ہیں جس سے توجہ منتشر ہو جاتی ہے اور خاتمے میں کمزوری و بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر شعر کو Action پر ترجیح دیتے ہیں یا اشعار کو محض حسنِ بیان کے طور پر لکھتے ہیں، جو اصول ڈرامہ نگاری کے خلاف ہے۔ بعض اوقات بیان واقعات میں عجلت کی جاتی ہے، جس سے Action پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ کبھی کبھی واہیات و سوقیانہ دل لگی اور مذاق سے سین کا اثر جاتا رہتا ہے۔ مگر باوجود ان عیوب کے آغا حشر کی تصانیف اردو ڈرامہ میں بیش قیمت ولازوال سرمایہ ہیں اور ان کی تصانیف اردو ڈرامے میں غیر معمولی اضافہ و ترقی کا باعث ہیں۔ ان کی تصانیف پر اردو ڈرامہ جس قدر ناز کرے بجا ہے۔

مذکورہ بالا کمپنیوں کے علاوہ جو کمپنیاں قایم ہوئیں جنھوں نے کوئی خاص اضافہ ہمارے سرمایے میں نہیں کیا اور کچھ زیادہ عرصے تک قایم بھی نہ رہ سکیں۔ ان کمپنیوں کے علاوہ بعض مشاہیر ادب نے بھی ڈرامے کی ترقی میں قلمی اعانتیں کیں۔ اس گروہ کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں، آخر انیسویں صدی کے ڈرامہ نویس اور شروع بیسویں صدی کے ڈرامہ نویس۔ اوّل الذکر میں غلام حسین ظریف مصنّف انجام سخاوت ۱۸۸۹ء اور محمد عبدالوحید قیس جنھوں نے "انجام نیک و بد" اور "طلسمہ پرستان" لکھا۔ فقیر محمد تیغ مصنّف انجام الفت و بے نظیر و بدر منیر۔ فیروز شاہ خاں مصنّف بھول بھلیاں ترجمہ شکسپیر۔ اردو میں سیاسی ڈرامہ البرٹ بل کے مصنّف امراؤ علی اور مصنّف جہانگیر ترجمہ ہملیٹ وغیرہ۔

شروع بیسویں صدی کے ڈرامہ نویس میں پہلے منشی محمد ابراہیم محشر

شاگردِ حشر کا نام آتا ہے جو آتشین ناگ، نگاہِ ناز، خود پرست وغیرہ کے مصنف ہیں۔ بلشی رحمت علی مصنف دردِ جگر، بار وفا قاتل وغیرہ جو البرٹ و پارسی تھیئٹریکل کمپنیوں کے منیجر رہ چکے ہیں۔ دوارکا پرشاد افق مصنف رام ناٹک جو بہت طویل ڈرامہ ہے۔ مرزا عباس نے تاریخی ڈرامے زیادہ لکھے ہیں۔ جن میں نور جہاں اور شاہی فرمان وغیرہ کافی مشہور رہے۔ خلد آشیاں برادر محترم آغا شاعر قزلباش دہلوی تلمیذ داغ، مصنف حورِ جنت۔ پنجابی حضرات میں لالہ کشن چند زیبا و لالہ نانک چند ناز اکثر ڈراموں کے مصنف ہیں جن میں غیر مانوس الفاظ کی کثرت ہے۔

لالہ کنور سین ایم۔ اے ڈرامے کے مشہور نقاد جن کا ڈرامہ "برہما نند ناٹک" بہت عمدہ ہے۔ اس میں آسمانی ستاروں کے کیرکٹر بہت خوبصورتی سے دکھائے گئے ہیں۔ بشمبر سہائے بیاکل مصنف بڑھ دیو جو مقبول ہوا، اس میں قلبی اطمینان کی بہترین تصویر کھینچی ہے۔ یہ ان عیوب سے پاک ہے جو قرنِ ماضی میں اُردو کے اکثر ڈراموں میں پائے جاتے ہیں۔ بیاکل بھارت، بیاکل کمپنی کے روحِ رواں تھے۔ حکیم احمد شجاع بی۔ اے مصنف باپ کا گناہ، بھارت کا لال جانباز۔ امتیاز علی تاج انار کلی اور دلہن والے۔ حضرت شرر، پریم چند و سدرشن وغیرہ ہوئے ہیں، جن کے ڈرامے اسٹیج بھی ہو چکے ہیں۔

اُردو میں ادبی ڈراموں کی بہت کمی ہے۔ پھر بھی شرر کا شہیدِ وفا شوق قدوائی کا قاسم و زہرہ۔ ظفر علی خاں کا روس و جاپان، برق کے تراجم جو شکسپیئر کے ڈراموں سے کئے ہیں، اور اسی طرح سوشل ڈراموں میں مولانا عبدالماجد کا زود پشیماں، جس میں کمسنی کی شادی کی خرابیاں دکھائی دیتی ہیں اور پنڈت کیفی کی تصانیف راج دُلاری اور مراری دادا قابلِ ذکر ہے، اسی طرح شرر نے میوۂ تلخ' پردے کی سختیوں کی خرابی پر لکھا۔ ساتھ ہی سیاسی صنف میں منشی امراؤ علی کا ڈرامہ البرٹ بل جو ۱۹۴۳ء میں بمقام لاہور شائع ہوا تھا۔ جبکہ البرٹ بل پر سخت مباحثہ ہو رہا تھا اور نیز ایک اور ڈرامہ جس میں انڈین نیشنل کانگرس کے مقاصد کو بیان کیا ہے۔ سیاسی ڈرامے کہے جا سکتے ہیں، مگر یہ کوئی دلچسپ اور قابلِ ذکر نہیں ہیں۔ اسی طرح ترکِ موالات کے عروج کے زمانے میں بہت سے نام نہاد ڈرامے سیاسی مسائل پر لکھے گئے اور ممنوع ہو گئے، ان میں سے کوئی قابلِ ذکر نہیں ہے سوائے اس کے جو کشن چند زیبا نے زخمی پنجاب کے نام سے لکھا تھا۔

جھریا کے میدانوں میں کوئلے کے ذخیرے

بھارت کے محکمہ طبقات الارض (جیولاجیکل سروے آف انڈیا) نے جھریا کے کوئلے کے میدانوں کے ارضیاتی ذرائع کا جائزہ ثانی لیا ہے جس کے مطابق بارا کار (جھریا) کے علاقے میں دو ہزار فٹ کی گہرائی تک تمام اقسام کے کوئلے کی موجودہ مقدار ۱۱۶۷۹۰ لاکھ ٹن ہے۔

پیشتر ازیں اس علاقے کا ارضیاتی جائزہ سنہ ۱۹۲۶-۲۸ء میں سر سی ایس فاکس نے لیا تھا۔ موصوف نے جو اُن دنوں محکمہ طبقات الارض کے قائم مقام سپرنٹنڈنٹ تھے، اپنی رپورٹ میں سارے کوئلے کے میدان کے لئے ۴۵۳۷۰ لاکھ ٹن کا تخمینہ لگایا تھا، اور اس میں ۲۱۵۷۰ لاکھ ٹن اعلیٰ قسم کا کوئلہ بھی شامل ہے۔

دو ہزار فٹ سے زیادہ گہرائی پر کوئلے کے مزید وسیع ذخائر ملنے کی اُمید ہے۔ کان کنی کی جدید تکنیک کی مدد سے اور کوئلے کے میدانوں میں مکمل طور پر بجلی مہیا ہو جانے پر ۲۰۰۰ فٹ سے زیادہ گہرائی تک کھدائی کا کام اقتصادی لحاظ سے بھی ممکن ہو گیا ہے۔ محکمے نے دیسلی (بنجر) علاقوں سے متعلق مزید تفاصیل حاصل کئے جانے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ محکمے کو اُمید ہے کہ مستقبل میں کانوں کی گہرائی میں اضافہ ہو جانے سے اس علاقے کی اہمیت کوئلے کی کان کنی کے نقطۂ نگاہ سے اتنی ہی ہو جائے گی جتنی کہ بارا کار کی۔ چنانچہ محکمۂ مذکور نے اس سلسلے میں گہرے سوراخوں کی مدد سے تجربہ کرنے کی تجویز کی ہے۔

غزلیں

ابو محمد سحر

اک نگاہِ آشنا اور زندگی بھر کا ملال!
دل میں ایسی دھڑکنیں اُٹھیں کہ پیہم ہوگئیں

آپ نے سعیِ کرم کی آپ گھبرائیں نہیں
میری آنکھیں تو وفورِ شوق سے نم ہوگئیں

اُلجھنوں میں مُہلتِ احساسِ بربادی نہ تھی
اُلجھنیں جب کم ہوئیں تمہیدِ ماتم ہوگئیں

دُوریٔ جنت میں تھا جنت کا حسنِ دل فریب
کتنی تصویریں قریب آنے سے مبہم ہوگئیں

کچھ غمِ جاناں کی زُلفیں خود بھی تھیں بکھری ہوئیں
کچھ غمِ دوراں کے ہاتھوں اور برہم ہوگئیں

کارواں بڑھتا گیا ذوقِ سفر میں دمبدم
منزلیں گردِ غبارِ راہِ آدم ہوگئیں

وہ بہارِ صد بہاراں سامنے کیا آگیا
فکر کی رنگینیاں گویا مجسّم ہوگئیں

زندگانی کا مزاج ان شورشوں کے دم سے تھا
وائے ناکامی کہ اب وہ شورشیں کم ہوگئیں

اُن کی یادوں نے بھی کیا کیا کھیل کھیلے دل کے ساتھ
بن گئیں کچھ غم سحرؔ کچھ حاصلِ غم ہوگئیں

ساحر ہوشیارپوری

ہم نے مانا ابتدائے بے رُخی ہم سے ہوئی
آپ بھی مانیں، وفاؤں میں کمی ہم سے ہوئی

دشمنِ دل کو بھی آنکھوں میں جگہ دی شوق سے
دہر میں تکمیلِ رسمِ دوستی ہم سے ہوئی

اذنِ خوش گوئی لبِ خاموش سے ہم کو ملا
رُوحِ افسردہ میں پیدا تازگی ہم سے ہوئی

سادگی کو ہم نے بخشا اک جمالِ دل فروز
حُسن میں رخشندگی، تابندگی ہم سے ہوئی

ہر گماں کو غازۂ حسنِ یقیں ہم نے دیا
سیم تن، زرپوش، گل رخ زندگی ہم سے ہوئی

اک نئی سج دھج ملی رعنائیٔ افکار کو
گلشنِ لفظ و بیاں میں دلکشی ہم سے ہوئی

ہر تصوّر کو عطا حُسنِ نظر ہم نے کیا
غیب کے ظلمت کدوں میں روشنی ہم سے ہوئی

آپ سے ملنے کی خاطر ہم سے سب ملنے لگے
آپ کو بھی کس قدر دلبستگی ہم سے ہوئی

کیا غلط ہے یہ کہ خونِ آرزو تم سے ہوا
اور اس پر بھی نہ اُلفت میں کمی ہم سے ہوئی

صالحہ عابد حسین

کچھ دن المانیہ میں

جرمنی کو عربی و فارسی میں المانیہ کے نام سے پکارا جاتا ہے اور ایک زمانے تک اردو میں بھی اس کو المانیہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا پچھلے سال مجھے اس دیس میں جانے اور رہنے کا موقع ملا جو کئی لحاظ سے دنیا کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے۔

۶ جون ۱۹۵۳ء کو میں اپنے شوہر کے ساتھ اطالوی جہاز "وکٹوریہ" سے جرمنی کے لئے روانہ ہوئی۔ یہ بہت خوبصورت، آرام دہ اور ایرکنڈیشنڈ جہاز ہے جس میں گرمی کی تکلیف بالکل نہیں ہوتی۔ البتہ ہر طرف سے بند۔ کیبنوں میں اور کمروں میں طبیعت ضرور الجھتی ہے۔ ہاں عرشے پر جا کر تازہ ہوا کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ کھانا بہت عمدہ، بہت سادہ اور اطالوی و ہندوستانی "ویجی ٹیرین" اور "نان ویجی ٹیرین" دونوں طرح کا ملتا ہے۔ تین چار دن عدن تک جہاز میں تلاطم رہا اور طبیعت بہت بے کیف رہی مگر عدن کے بعد سے موسم بہت خوشگوار ہو گیا۔ دن کا زیادہ وقت ہم لوگ عرشے پر گزارتے تھے۔ ہمارے عرشے سے ملا ہوا کوئی قدآدم اونچا فرسٹ کلاس کا وسیع و شاندار عرشہ تھا اور یہ اونچے درجے کے لوگ اوپر سے اپنے سے "کمتر" مسافروں کا نظارہ کر سکتے تھے۔ لوگ آپس میں اشارے اور بات چیت بھی کر لیتے۔ جب جہاز کسی مقام پر پہنچتا تو طبقے و درجے کے اس مقفل دروازے کو کھول دیا جاتا تھا اور دونوں طرف سے مسافر ایک دوسرے کے ہاں جا سکتے تھے یا عید کے دن نماز عید کے لئے خاص طور پر یہ مقفل دروازہ کھولا گیا تھا اور فرسٹ کلاس کے سب مسلمان مسافر ہمارے درجے میں آ گئے تھے اور عرشے کے پچھلے حصے میں نماز عید ادا کی تھی۔ ہمارے عرشے پر ایک چھوٹا سا نہانے کا تالاب تھا۔ کسی پورٹ پر پہنچ کر سامان آتارنے کے لئے اس تالاب کے تختے وغیرہ نکال کر سب سے نچلی منزل کے "بیگیج روم" سے سامان نکالنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور پھر تختے لگا کر اور پانی بھر کر تالاب بنا دیا جاتا تھا۔ یہ تالاب تھا تو چھوٹے بچوں کے تیرنے کے لئے جس میں دن بھر پیارے پیارے یورپین اور امریکن بچے مچھلی کی طرح تیرا کرتے تھے مگر پانچ چھ دن بعد بڑوں کو بھی شوق اٹھا۔ اور اکثر امریکن اور یورپین عورتیں برائے نام (تیراکی کا) لباس پہن کر اور بعض من چلے ہندوستانی سر پر اونچا جوڑا باندھ کر اور نیلے پیچھے پہن کر اس ننھے سے تالاب میں کود پڑتے اور ان مہاشیروں کی وجہ سے بچارے بچوں کو اپنی یہ دل پسند تفریح بند کرنی پڑتی۔ مجھے بڑا برا معلوم ہوتا تھا کہ چھوٹے بچوں کی خوشی اور ورزش کا خیال کئے بغیر یہ بڑے حضرات ان کے حق پر کیوں قبضہ جما لیتے ہیں۔ اور بھی انڈور قسم کے دوسرے کھیل مرد اور عورتیں کھیلتے رہتے تھے

ہم عدن، سوئز، پورٹ سعید ہوتے اور ان عربی و مصری بندرگاہوں کی سیر کرتے ہوئے ۱۱ جون کو اٹلی کی بندرگاہ نیپلز پہنچے جس کا اطالوی نام نپولی ہے۔ یہاں آدھے دن جہاز ٹھہرتا تھا۔ چنانچہ ہم سب مسافر بسوں میں بیٹھ کر نیپلز سے کچھ دور پوم کے مشہور تاریخی شہر کے کھنڈرات دیکھنے گئے۔ دو ہزار برس پہلے یہ شہر ۱۲ فٹ اونچی پتھروں کی قبر میں دفن ہو گیا تھا جو ہزاروں برس بعد کھود کر نکالا گیا۔ یہ ایسا خوبصورت، شاندار اور خوبی سے بنا ہوا شہر ہے جس کی پائداری اور ترتیب و خوبصورتی دو ہزار برس بعد تک بڑی حد تک باقی ہے۔ اگلے دن دوپہر کو ہم جنیوا پہنچ گئے۔ اب ہمارا جہاز کا سفر ختم ہوا کسٹم وغیرہ کے جھگڑوں سے نپٹ کر اور جہاز والوں اور قلیوں وغیرہ کی بدانتظامی اور بے پروائی کو جھیل کر آخر شام کو اسٹیشن پہنچے اور آٹھ بجے انٹرنیشنل ٹرین میں بیٹھ کر جرمنی کی طرف روانہ ہوئے۔ صبح بہت

سویرے اٹلی کی سرحد سے گزر کر ہماری گاڑی سوئٹزرلینڈ میں داخل ہو گئی گرمی کا زمانہ تھا جب یورپ میں دن بہت بڑے ہوتے ہیں۔ صبح کے تین بجے سے پو پھٹنے لگتی ہے اور چار بجے ہی سے سورج کے سنہرے درشن ہو سکتے ہیں۔ صبح کے اس سہانے سمے میں ہم نے دنیا کے اس حسین ترین دیس کی جھلک دیکھی اور اس خواب آلود فضا میں واقعی وہ اس دنیا کی کوئی بستی معلوم ہونے کی جگہ سپنوں کا دیس یا پرستان کا کوئی ملک معلوم ہو رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر بے اختیار کشمیر کے مناظر یاد آ رہے تھے اگرچہ یہ اس سے کہیں زیادہ صاف ستھرا باترتیب اور زیادہ شاداب و سرسبز تھا۔

"زیورش" سے جو سوئٹزرلینڈ کا ایک بہت بڑا اور بہت خوبصورت شہر ہے ہم نے جرمنی کے لئے ریل بدلی اور اب بجلی کی صبا رفتار ٹرین کی جگہ کوئلے سے چلنے والے انجن کی معمولی ریل میں جو اسی طرح اٹک اٹک اور جھٹک جھٹک کر چلتی ہے ہم آگے کی طرف روانہ ہوئے۔

جرمنی یورپ کے خاصے بڑے ملکوں میں شمار ہوتا ہے (مگر ہمارے دیس کے ایک بڑے صوبے سے شاید ہی کچھ بڑا ہو) اس کا بڑا حصہ پہاڑی ہے اور جنوبی جرمنی کا یہ علاقہ جس میں سے ہم اب گزر رہے تھے خاص طور پر سرسبز و شاداب اور خوشنما ہے۔ اگرچہ نہ یہاں ہمالیہ یا الپس جیسے فلک بوس پہاڑ ہیں اور نہ گنگا و برہم پتر جیسے وسیع دریا اور نہ ڈل اور زیورش جیسی لمبی چوڑی جھیلیں مگر اس کا حسن بھی اپنی ایک خصوصیت اور شان رکھتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سبزے سے ڈھکی پہاڑیوں کی گود میں بہتی ہوئی ندیاں، لالہ و گلاب کے پھولوں کی بہتات، سفیدے چنار، بید کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ، سیب، چیری، خوبانی، آڑو وغیرہ پھل دار درختوں کے میلوں پھیلے ہوئے باغ، گھاس کے سنہرے اور مکئی کے ہرے ہرے لہراتے ہوئے کھیت، دوب کے مخملی ڈھلوان نیلے آسمان پر چمکتا ہوا سورج اور جگہ جگہ سفید بادل کے بھاگتے ہوئے ٹکڑے چھوٹے چھوٹے رنگین مکان اور ان میں کام کرتے ہوئے محنت کش عورتیں اور مرد اور گلاب کی طرح کھلے ہوئے پھول سے بچے، حسن و رنگینی کا ایسا سندر سین تھا جس پر سے نظر ہٹائے نہ ہٹتی تھی۔

گیارہ بجے ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ یہ جرمنی کا ایک چھوٹا سا شہر ہے جس کو ٹیوبنگن کہتے ہیں۔ یہ اپنی پانچ سو سالہ یونیورسٹی کی وجہ سے بہت مشہور ہے اور یونیورسٹی ٹاؤن کہلاتا ہے۔ اس کی تقریباً پچاس ہزار کی آبادی ہے جس میں یونیورسٹی کے پانچ ہزار طالب علموں، ان کے استادوں اور دوسرے اسٹاف کے علاوہ زیادہ تر کسانوں، کاشتکاروں وغیرہ کی آبادی ہے۔ یہ شہر دریائے نیکار کے کنارے اونچی نیچی پہاڑیوں پر بسا ہوا ہے۔ پرانے شہر کی گلیاں اور سڑکیں اینٹوں اور پتھر کی ہیں۔ جیسی ہمارے ہاں کے قصبوں میں ہوتی ہے۔ یہاں کا شاندار گرجا، ایک بہت پرانا اور وسیع قلعہ اور کچھ اور قدیم زمانے کی عمارتیں ہیں۔ اور اس کے علاوہ یونیورسٹی کی چھوٹی بڑی، نئی پرانی پچاس بلڈنگیں آٹھ دس بڑی بڑی عمارتیں تو مختلف امراض کے اسپتالوں کی ہیں جن میں طبی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور دوا علاج بھی ہوتا ہے۔ اس یونیورسٹی میں دنیا بھر کے علوم کی اور بہت سی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں سنسکرت، فارسی اور عربی بھی شامل ہیں اور حال ہی میں کچھ ہندی پڑھانے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

میں اگرچہ جرمنی میں کئی مہینے رہی لیکن وہاں کی زیادہ سیر نہیں کر سکی۔ دو تین بڑے شہر، دو چار قصبے اور کچھ گاؤں ہی دیکھ پائی۔ البتہ وہاں کے لوگوں کو زیادہ قریب سے دیکھنے، ان کی سیرت اور اخلاق کا مطالعہ کرنے اور ان کی گھریلو زندگی کی ایک جھلک دیکھنے کا موقع ضرور ملا۔

"اشٹٹ گارٹ" پہاڑوں کی گود میں آباد پانچ چھ لاکھ کی آبادی کا بڑا خوبصورت شہر ہے۔ اس کے چاروں طرف پہاڑیوں کا گھیرا ہے جس نے اس شہر کو زمردین پیالے کی صورت بخش دی ہے۔ یہاں اونچی اونچی عمارتیں شاندار گرجا، قدیم زمانے کی عمارتیں، عالی شان دکانیں بھی ہیں اور جگہ جگہ بمباری سے تباہ شدہ عمارتیں بھی نظر آتی ہیں جن کی دوبارہ مرمت کی جا رہی ہے۔ باغوں، پھولوں، سرسبز لانوں، فواروں اور چھوٹے بڑے پارکوں کی ہر جگہ کثرت ہے۔ خوبصورت دریائے نیکر یہاں بھی بہتا ہے اور اس کی خوبصورتی کو بڑھاتا ہے۔ اس شہر میں کارخانے اور فیکٹریاں بھی بہت سی ہیں۔ جن میں کچھ ہندوستانی مزدور بھی کام کرتے ہیں۔ یہاں چالیس کے قریب ہندوستانی طالب علم بھی ہیں۔

فرانک فورٹ وسط جرمنی میں بہت بڑا اور اہم شہر ہے۔ یہ

جرمنی سے دوسرے شہروں کی طرح زیادہ خوبصورت نہیں۔ کالی کالی عمارتیں ہر جگہ نظر آتی ہیں اور چھریم باری کے اثرات بھی ہر جگہ ملتے ہیں (سوائے ٹیوبنگن اور اس جیسے دو چار خوش قسمت قصبوں کے جو اس مصیبت سے اتفاق سے بچ گئے۔ جہاں جائیے وہاں بم باری کے خوفناک اثرات اب برسوں بعد بھی نظر آتے ہیں) یہاں کا دائٹ ہاؤس (ٹاؤن ہال) اور پالمسدم گارٹن (محل باغ) البتہ خوبصورت ہیں۔ یہاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دنیا کے مشہور ترین شاعر گوئٹے کا وطن ہے۔ اس کا آبائی مکان اسٹیشن سے قریب ہی ہے جس میں اس کے گھر کا ساز و سامان، آبائی یادگاری چیزیں، کتابیں ہر چیز نہایت احتیاط اور خوبی سے جوں کی توں سجی ہوئی ہیں۔ بم باری میں یہ گھر بھی مسمار ہو گیا تھا لیکن یہ قوم کی خصوصیت ہے کہ اس نے سب سے پہلے اپنے فخر قوم شاعر کے گھر کو بالکل ویسا ہی دوبارہ تعمیر کرایا۔ اور اس کا سامان (جو پہلے ہی حفاظت کے مقام پہ پہنچا دیا گیا تھا) پھر لا کر اسی طرح سے سجا دیا ہے۔

یہاں بسوں، کاروں، ٹراموں وغیرہ کی اس قدر کثرت ہے کہ شور و غل سے سر چکرانے لگتا ہے۔ جرمنی کی قابل دید مشہور سڑک "او ٹوبان" جو جنگ کے زمانے میں ہٹلر نے جنگی ضروریات کے تحت بڑی تیزی سے بنوائی تھی اس شہر سے بھی گزرتی ہے۔ یہ سڑک اپنی مثال آپ ہی ہے۔ اس قدر چوڑی، ہموار اور شاندار ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ جرمنی کے سب بڑے بڑے شہروں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے۔

فرانک فورٹ سے چند میل کے فاصلے پر باڈہم برگ (Bad Hamburg) کا پر سکون اور حسین قصبہ ہے۔ اس ملک میں جگہ جگہ ایسے قدرتی چشمے موجود ہیں جن میں نہانا صحت کے لئے بڑا مفید سمجھا جاتا ہے۔ ایسے چشموں کے گرد تالاب اور عمارتیں وغیرہ بنا دی گئی ہیں اور یہاں چھوٹے چھوٹے بہت حسین، پر رونق اور دل فضا بستیاں آباد ہو گئی ہیں جن کے نام باڈ (مقام غسل) پر ہیں۔ اسی قسم کا ایک قصبہ باڈہم برگ بھی ہے۔ عیش پرست اور دولت مند لوگ نہانے کے بہانے ان مقاموں پہ رنگ رلیاں منانے اور دادِ عیش دینے کے لئے جمع ہوتے ہیں اور پیرس کی زندگی کی ایک جھلک یہاں آسانی سے نظر آ سکتی ہے۔

یوں تو یورپ کے سب ملکوں نے عموماً اور جرمنی نے خصوصاً بہت سی باتوں میں اس قدر ترقی کی ہے جسے دیکھ کر اچنبھا ہوتا ہے۔ طرح طرح کی چھوٹی بڑی مشینیں جن کے باعث زندگی بہت آسان ہو گئی ہے اور گھریلو استعمال کا لاتعداد سامان جنھوں نے گھرداری کو بڑا آسان، دلکش اور بہت کم وقت لینے والا بنا دیا ہے، ہر ملک میں عام ہے۔ لیکن اس مادی ترقی نے مجھے زیادہ مرعوب نہیں کیا۔ ہم بھی کچھ عرصہ کوشش کریں تو زندگی کی یہ حاجتیں فراہم ہو جائیں گی لیکن جس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا وہ جرمن لوگوں کا اخلاق اور ان کی انتھک محنت کی عادت ہے۔

ان کا ظاہری رکھ رکھاؤ اور اخلاق یورپ کے دوسرے ملکوں کے لوگوں سے کچھ مختلف ہے۔ مذہب اسلام میں ایک حدیث ہے کہ ہر شخص کو دوسرے کو سلام کرنا چاہئے۔ بلکہ ایک ستون سے دوسرے ستون کی طرف آئے تو ملنے والے سے سلام علیک کرے۔ لیکن "ترقی" اور "روشنی" کے اس زمانے میں مذہب کے بڑے بڑے بنیادی احکام کی لوگ پابندی نہیں کرتے تو بھلا چھوٹی چھوٹی باتوں کا کیا ذکر ہے۔ لیکن یورپ کے اس کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب ملک میں سلام کا یہ رواج میں نے عام دیکھا۔ علاوہ صبح، دوپہر، شام اور رات کے سلاموں کے جرمنی والوں کا مخصوص و محبوب سلام "گردس گاٹ" ہے جس کا قریب قریب مطلب ہے السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ بس میں، ریل میں، عمارتوں کے زینوں پر، دکانوں میں ہر جگہ نیا داخل ہونے والا دوسروں سے "گردس گاٹ" ضرور کرتا ہے اور وہ اس کا جواب دیتے ہیں۔ اسی طرح جب کسی جگہ سے رخصت ہوں تو "آؤف ویدرزیہن" (یعنی خدا حافظ یا پھر ملیں گے) کہا جاتا ہے۔ میل ملاقات، جان پہچان کی اس میں کوئی شرط نہیں۔ ہر آدمی کا یہ اخلاقی فرض سمجھا جاتا ہے کہ دوسروں سے وہ اتنا اخلاق ضرور برتے۔ چاہے وہ بالکل اجنبی ہوں یا پردیسی۔

اسٹیشن، کسٹم ہاؤس، ریلوے، دکانوں، اسپتالوں غرض ہر جگہ چھوٹے سے چھوٹے ملازم سے لے کر بڑے سے بڑے افسر تک کام پڑنے والے لوگوں سے انسانیت، اخلاق اور احترام سے پیش آتا ہے۔ ریل میں دو ملکوں کی سرحد پہ جو افسران کسٹم کی دیکھ بھال کرنے، یا پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ چیک کرنے آتے ہیں وہ لوگوں کا سامان دیکھتے وقت نہ ان کے ساتھ بے عزتی سے پیش آتے ہیں نہ شان اور غرور سے۔ اسی طرح لوگ بھی ایمانداری سے جو چیزیں ساتھ ہوتی ہیں ان کو بتا دیتے ہیں (ایک دو دفعہ سفر میں میرا ایسی عورتوں سے سابقہ پڑ

پڑا جنھوں نے سیگرٹ، چوکلیٹ یا اور کچھ قیمتی کسٹم کا سامان چھپا لیا تھا۔ یا اس کا کچھ حصہ چھپا یا کچھ دکھا دیا۔ مگر یہ غیر معمولی بات تھی اور اسی لئے کسٹم والوں کو ہر ایک پر شبہ بھی نہیں ہوتا) یہ لوگ ریل میں داخل ہو کر مسافروں سے سلام علیک کرتے ہیں، پھر سوالات وغیرہ پوچھنے کے بعد جاتے ہوئے "یہ سفر مبارک ہو" کہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ رہبر، طالب علم، پروفیسر، مزدور کسان ہر طبقے کے لوگ انھیں سے ہمدردی کرتے اور مسافر کی مدد کے لئے تیار رہتے ہیں۔ آپ کسی سے راستہ پوچھئے تو آپ سے زیادہ اسے فکر ہو جائے گی اور کوئی تعجب نہیں کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر آپ کو اس مقام پر پہنچا آئے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہمدردی اور اخلاق کا زیادہ مظاہرہ قصبوں اور گاؤں میں ہوتا ہے۔ بڑے شہروں کی مصروف اور گہما گہمی کی زندگی نے ان لوگوں سے اس صفت کو چھینا تو نہیں مگر کچھ کم ضرور کر دیا ہے۔

ہندوستانیوں سے اس قوم کو کچھ خاص لگاؤ اور محبت ہے قدیم ہندو فلسفہ بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اور آزاد ہندوستان کی قدر و قیمت تو بہت بڑھ گئی ہے ہندی عورت ان لوگوں کی دلچسپی اور قدر کی خاص مرکز ہے اور اس سے بے حد اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ ریل اور بس میں عام طور پر یہاں یہ قاعدہ نہیں کہ مرد کھڑے ہو جائیں اور عورتوں کو جگہ دے دیں۔ البتہ بوڑھی یا بیمار عورتوں کے لئے مرد بھی اور جوان عورتیں بھی فوراً جگہ خالی کرتی ہیں۔ لیکن ہندوستانی عورت کے ساتھ یہ اخلاق ضرور کیا جاتا تھا کہ کوئی نہ کوئی شخص کھڑا ہو کر مجھے جگہ دے دیتا۔ ریل کے سفر میں اگر سامان آسانی سے نہ اُٹھ رہا ہو (جس کا مجھے اکثر اتفاق ہوتا تھا۔ اس لئے کہ اپنے ملک میں یہ خراب عادت پڑی ہوئی تھی کہ سامان زیادہ ساتھ لے جاتی تھی اور بوجھ اُٹھانے کی عادت نہ تھی) تو چھوٹے سے چھوٹے ملازم سے لے کر اسٹیشن ماسٹر تک مدد کے لئے آموجود ہوتے تھے۔ ہمدردی اور خصوصیت کے مارے بے جانے بوجھے غلط ڈبوں میں بٹھا دیتے اور غلط گاڑیوں کے نام بتا دیتے تھے مگر مدد کرنا بہر حال اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ہندوستانی عورت کا لباس جرمنی میں بہت دلچسپی، پسندیدگی اور حیرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر عورت غریب ایک تماشہ بن جاتی ہے۔ بڑے شہروں کے رہنے والوں نے تو خیر کبھی شاید کوئی ساڑھی دیکھی بھی ہو لیکن چھوٹے شہروں اور قصبوں میں تو شاید ہاتھی پہنچ جائے تو ایسا عجیب و غریب جانور نہ سمجھا جائے جیسے بچاری ہندوستانی عورت۔ ریل اور بس میں لوگ بس بھول کر اس حصے کی طرف آ آ کر جھانکتے ہیں جہاں وہ بیٹھی ہے۔ سڑک پر چل رہی ہے تو بعض وقت ٹریفک رُک جاتا ہے۔ ننھے ننھے بچے انگلی سے اشارہ کر کے ماؤں سے پوچھتے ہیں کہ یہ کون مخلوق ہے۔ یقین کیجئے یا نہ کیجئے کتے اپنے مالکوں کا ساتھ چھوڑ کر اس کے ساتھ چلتے اور بڑے دوستانہ انداز میں بھونکتے ہیں گویا پوچھ رہے ہوں کہ آخر تم ہو کون؟ لیکن اس تجسس اور حیرت کے باوجود ان کے دیکھنے میں بدتمیزی یا بدتہذیبی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا جس کے مظاہرے ہمارے ملک میں ہر جگہ، ہر وقت اپنے دیس کی عورت کے ساتھ بھی اور دوسرے ملکوں کی عورتوں کو گھورنے میں بھی نظر آتے ہیں۔ مرد دیکھتے ہیں مگر فوراً نظریں پھیر لیتے ہیں گویا سمجھتے ہیں کہ بُری بات ہے۔ ہمارے کچھ جرمن دوست مرد اور عورتیں، اکثر لوگوں کی طرف سے معذرت کرتے رہتے تھے کہ وہ تمھیں دیکھتے ہیں مگر تم اس کا خیال نہ کرنا۔ البتہ عورتیں زیادہ بے تکلفی سے دیکھتیں۔ پاس آکر باتیں کرتیں اور سوالات پوچھتی ہیں۔ بچے سب سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ جہاں جائیے دو چار دس پانچ بچوں کا غول ساتھ ہے۔ اگرچہ وہ دور ہی سے ظاہر کر رہے ہیں کہ تم سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن مقصد اس ہندی عورت کے درشن کرنا ہی ہے۔ بڈھے مرد اور عورتیں تو خیر اپنا حق سمجھتے تھے کہ چلتے چلاؤ زندگی میں یہ نادر چیز دیکھنے کو ملی ہے تو اچھی طرح کیوں نہ دیکھا جائے۔ ایک ترکاری فروش بوڑھی عورت تو مجھے دیکھ کر ایک بار اس قدر حیران و ششدر رہ گئی جیسے تصویر ہو۔ ہوش آیا تو بار بار مجھے اور میرے لباس کو چھو چھو کر دیکھتی تھی۔ شاید یہ معلوم کرنا چاہتی ہو کہ یہ اصلی ہے یا نقلی؟ بعض راہ چلتی عورتیں رُک کر مسکرا کر پوچھتی تھیں "Sind Sie Indisch" کیا تم ہندوستانی ہو؟ اور جواب سُن کر ایسی خوش ہوتیں اور اس محبت سے باتیں کرتیں جیسے پرانی دوست ہوں۔ جرمنوں کا اخلاق اور محبت دیکھ کر کسی طرح یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہٹلر نے ایسی مہذب اور با اخلاق قوم کو کس طرح اس قدر وحشت و بربریت سے بھر دیا تھا جس نے

دورانِ جنگ میں ناقابلِ یقین مظالم ڈھائے اور سچ پوچھئے تو خود اُنھوں نے بھی لڑائی کے دوران میں اور شکست کے بعد کچھ کم دُکھ نہیں سہے۔

جرمنوں کی دوسری اہم صفت ان کی اَن تھک محنت کی عادت ہے یوں تو ہم لوگوں کے مقابلے میں سارے یورپ کے لوگ کہیں زیادہ محنتی ہوتے ہیں لیکن جرمنوں کا جواب تو یورپ میں بھی نہ ملے گا۔ لڑائی کے دوران میں بھی ان کی صنعت و حرفت و زراعت کو سخت نقصان پہنچا اور پھر شکست کے بعد تو ہر لحاظ سے حالت تباہ ہو چکی تھی۔ دُکھ، ذلت اور بحران جھیلنے کے بعد پچھلے دو تین سال سے پھر اس قوم نے کروٹ لی ہے اور اس تھوڑے عرصے میں اپنے ملک کو سنبھالنے اور بنانے کا حیرت انگیز کرشمہ دکھایا ہے۔

صبح مُنہ اندھیرے اُٹھ کر رات گئے تک ہر شخص اپنا کام جس مستعدی، ذمہ داری، دل سوزی اور سلیقے سے کرتے ہیں اُسے دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی۔ وہ اس اصول کے پوری طرح پابند معلوم ہوتے ہیں کہ اگر کوئی کام کرنے کے قابل ہے تو اس قابل بھی ہے کہ اسے خوبی سے کیا جائے۔ کارخانوں میں جا کر دیکھئے تو کاری گر اور مزدور دونوں جی جان سے اس کوشش میں مصروف نظر آئیں گے کہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر سامان بنا کر اپنے ملک اور دوسرے ملکوں کو دیں۔ ہار جانے کے بعد سے چونکہ جرمنی کو سامانِ جنگ بنانے کی اجازت نہیں اس لئے یہاں کے سب کارخانوں میں روزمرہ کے استعمال کی اور معمولی زندگی میں کام آنے والی چھوٹی بڑی ہزاروں قسم کی مشینیں تیار کی جا رہی ہیں۔ موجدوں کے دماغ، کاری گروں کی صنعت، محنت کشوں کی محنت سب اپنے دیس کو اُبھارنے اور مفید کام انجام دینے میں صرف ہو رہی ہے۔ زمین کا ہر ممکن خطہ زیرِ کاشت آ چکا ہے اور کسان اور کاشتکار کم سے کم زمین میں زیادہ سے زیادہ چیزیں سائنٹفک طریقوں سے پیدا کرتے ہیں۔ سبزیاں اور پھل دیکھئے تو ان کا سائز دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اسی طرح دودھ دہی، انڈے، مرغی اور مویشیوں کی خاص طور پر دیکھ بھال کی جاتی ہے اور میں ذاتی تجربے کی بنا پر یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس وقت کھانے پینے کی حد تک جرمنی یورپ کے چند دو تین آسودہ ترین ملکوں میں سے ہے۔ اور ہمارے دیس سے زیادہ چیزیں وہاں فراہم ہوتی ہیں اور مہنگی میں بھی دہلی سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں جا کر دیکھئے تو ایک طرف استاد دل و جان سے اپنے طالب علموں کو تعلیم دینے اور ان کے دماغوں کو علم کی شمع سے روشن کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ہر استاد ذاتی طور پر طالب علموں سے دلچسپی لیتا اور اپنی شخصیت کا اثر بھی ڈالتا ہے اور اپنے وسیع علم سے بھی مستفید کرتا ہے۔ پروفیسر کا درجہ یہاں شاید پرائم منسٹر سے بھی زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے اور اس کی جو قدر و عزت ہے وہ تو کسی طرح اس سے کم نہیں اس عزت کو برقرار رکھنے میں خود پروفیسر حضرات اور استادوں کے اعلےٰ کیرکٹر کا بڑا حصہ ہے۔ کوئی اونچے درجے کا عالم اور استاد آپ کو کسی قسم کی گھٹیا حرکت کرتے ہرگز نظر نہ آئے گا۔ طالب علم استادوں کی سچے دل سے عزت کرتے ہیں اور رسمی تکلفات کے اگرچہ زیادہ پابند نہیں مگر ان کے انداز اور گفتگو سے آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ عام لوگوں کو بھی عالموں اور پروفیسروں سے کم عقیدت نہیں۔ غرض علم اور عالم کی سچی قدر یہاں نظر آتی ہے جس سے بڑی مسرت ہوتی ہے۔

یوں تو اس قوم کے مرد اور عورت دونوں محنتی ہیں لیکن عورت اس معاملے میں مرد سے بھی بازی لے گئی ہے۔ میں نے اکثر لوگوں سے جرمن عورت کی محنت، سلیقے اور صفائی کی تعریف سنی تھی مگر ہمیشہ یہ خیال ہوتا تھا کہ اس میں مبالغہ ہے۔ لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھ کر معلوم ہوا کہ مبالغے کا کیا ذکر ہے حقیقت میں جرمن عورت کے سلیقے صفائی اور ان تھک کام کرنے کی عادت کی پوری پوری تعریف ہو نہیں سکتی۔ جنگ میں لاکھوں آدمیوں کے مرنے سے جرمنی میں مرد اور عورت کا تناسب برابر نہیں رہا اور آج کل عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے اور کچھ بہت بھاری کاموں یا مجرد علمی مسئلوں کی تحقیقات کو چھوڑ کر ہر محکمے میں ہر جگہ عورتیں مردوں سے زیادہ نظر آتی ہیں۔ کھیتوں میں تو ہمارے ہاں کے کسان خاندانوں کی طرح مرد اور عورتیں ساتھ کام کرتے ہی ہیں۔ کارخانوں میں بھی عورتوں کی تعداد مردوں سے کم نہیں۔ اگرچہ ان کو عام طور پر نسبتاً ہلکا کام دیا جاتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں پروفیسر کے درجے کے لوگ زیادہ تر مرد ہیں لیکن کچھ عورتیں بھی پائی جاتی ہیں اور کلارکل اسٹاف میں اور دوسرے کاموں کے لئے تو عورتیں بہت زیادہ ہیں۔ چھوٹے بچوں کی

تعلیم قریب قریب پوری کی پوری عورتوں کے ہاتھ میں ہے میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں بھی عورتیں بہت نظر آتی ہیں - اس کے علاوہ ہوٹلوں، ریستورانوں، دفتروں، بنکوں، ریلوں، دکانوں، بسوں میں ہر جگہ آپ جرمن عورت کو پوری ذمہ داری اور خوبی کے ساتھ کام کرتا ہوا پائیں گے - لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کاموں کی وجہ سے انھوں نے گھریلو زندگی کو خیرباد کہہ دیا ہے - بلکہ اس کے برعکس میں نے تو کم سے کم یورپ کے قصباتی اور دیہاتی لوگوں میں) اپنے ہاں سے کہیں زیادہ شوق، دلچسپی اور ذمے داری کے ساتھ ان لوگوں کو گھریلو کام انجام دیتے دیکھا - جو عورت Hausfraus صرف گھر والی ہے اس کا تو کہنا ہی کیا ہے کہ وہ صبح چھ بجے سے رات کے دس بجے تک ہر قسم کا گھر کا کام (جس میں کپڑے دھونا، زمین صاف کرنا، باغیچے کا کام اور دوسرے چھوٹے بڑے ہزاروں کام شامل ہیں) کرتی رہتی ہے۔ وہ عورتیں بھی جو ملازمت کرتی ہیں اور جن کی تعداد بہت ہے - اپنے گھریلو کام اور خانگی فرائض اس خوبی اور خوش دلی سے پورے کرتی ہیں بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت، شوہر کا خیال، وقت پر اس کو کھانا ناشتہ دینا کون سی چیز ہے جس سے یہ عورتیں غفلت کرتی ہوں - البتہ یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ ان کے بچے اور شوہر بھی گھریلو کاموں میں ان کا پورا پورا ہاتھ بٹاتے ہیں - یہ نہیں کہ میاں تو دفتر سے آکر آرام کرسی پر پیر پھیلا کر اخبار پڑھنے لگے - صاحبزادے کھیلنے نکل گئے اور بیوی بیلی مرتی کھپتی رہے - جی نہیں ان کو بھی پورا پورا تعاون کرنا پڑتا ہے بھی تو بغیر کسی ایک نوکر یا مہتر، دھوبی، مالی کے بغیر ان کی گھریلو زندگی اس قدر پرآسائش، پرمسرت، اس قدر باسلیقہ و باترتیب ہوتی ہے کہ اگر ہندوستانیوں کے گھروں کو وہ سلیقہ اور صفائی، وہ باقاعدگی اور سکون مل جائے تو سمجھئے کہ اس سے بڑھ کر مسرت ملنا محال ہے -

---

جرمنی میں آج کل یہ عام رجحان ہے کہ لوگ ہٹلر سے نفرت کرتے اور جنگ کو بہت برا کہتے ہیں جس کی بدولت آدھی صدی میں انھیں یہ سب مصائب جھیلنے پڑے - ظاہر ہے کہ میں صرف مغربی جرمنی اور وہ بھی اس کے جنوبی حصے میں زیادہ تر رہی اور وہیں کے لوگوں سے میل جول اور گفت و شنید ہو سکی - مشرقی جرمنی کا الگ ہو جانا ان لوگوں کے لئے بڑا سوہان روح ہے اور وہ ہر قیمت پر جرمنی کے دونوں حصّوں کو ایک کرنا چاہتے ہیں - مشرقی جرمنی سے آئے ہوئے لوگ اس قدر بیزار اور تلخ معلوم ہوتے ہیں اور کچھ اس قسم کی کہانیاں سناتے ہیں جیسے ہمارے ہاں بٹوارے کے بعد مشرقی اور مغربی پنجاب کے رفیوجیز سنایا کرتے تھے - خدا جانے اس میں کتنی اصلیت ہوتی ہے اور کتنا تخیل - یہاں کے لوگوں کے اعصاب پر ان جنگوں کا اثر بہت خراب پڑا ہے اور بہت سے لوگ تو اعصابی امراض کا شکار ہیں اور باقی بھی تو اس سے متاثر ہو گئے ہیں - بعض خواتین سے میری گفتگو ہوئی تو وہ جنگ کا نام سن کر لرز اٹھیں اور جنگ کے امکان کے تصوّر سے رونے کے لئے تیار ہو گئیں - مگر ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو یہ کہتے نہیں جھجکتے کہ اگر جرمنی کی تقسیم ختم نہ کی گئی تو جنگ ناگزیر ہے -

چند مہینے جرمنی رہ کر اور وہاں کے لوگوں سے مل جل کر جو اثر مجھ پر پڑا اور ان لوگوں کی سیرت اور خیالات کو جہاں تک میں سمجھ سکی - یہ اس کے چند تاثرات ہیں جو میں نے آپ کے سامنے پیش کئے - ممکن ہے کہ دوسرے لوگوں کو اس کے خلاف کچھ اور تجربہ ہوا ہو - لیکن میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کو ایمان داری سے بیان کیا ہے - میرے نزدیک جرمن قوم بہت سی باتوں میں اس قابل ہے کہ ہم اس سے سبق لیں اور اس کی محنت اور اپنے دیس کو سنبھالنے کی جان توڑ کوشش سے یہ سیکھیں کہ اسی طرح ہمارے ملک کے ہر فرد کو، ہر مرد عورت اور بچے کو اپنے ملک کی حالت سنبھالنے کا اور اسے اخلاقی اور معاشی لحاظ سے اونچے درجے پر پہنچانے کا ایسا ہی احساس ہونا چاہئے اور اسی طرح اسے اپنا سب سے پہلا اور مقدس فرض سمجھنا چاہئے -

---

محمد بشیر الحق دسنوی عظیم آبادی

آبِ رواں

حضرتِ اکبر الہ آبادی نے انگریزی زبان کے مشہور شاعر "رابرٹ سودے" (۱۷۷۴ء - ۱۸۴۳ء) کی ایک نظم کا منظوم ترجمہ پنی ریڈنگ "کے ایک جلسے کے لئے ۱۸۹۹ء میں کیا تھا۔ یہ منظوم ترجمہ "روانیِ آب" کے عنوان سے رسالہ معارف علی گڈھ جلد ۲ شمارہ ۴ بابت اکتوبر ۱۸۹۹ء میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوا تھا۔ اسی زمانے میں حضرتِ شہباز بہاری نے بھی سودے کی اس نظم کا ایک منظوم ترجمہ کیا تھا جو "آبِ رواں" کے عنوان سے کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہوا تھا۔ اور بعد میں مرحوم کی چند نظموں کے مجموعے "خیالاتِ شہباز" میں ۱۹۱۶ء میں چھپا۔ مرحوم شہباز کی اس نظم سے اُردو دانوں کا ذی علم طبقہ بہت کم واقف ہے۔ اسی لئے ناظرینِ "آج کل" کی تفریحِ طبع کے لئے "آبِ رواں" حاضر ہے۔

مولوی سید محمد عبد الغفور شہباز کا مولد سب ڈویژن باڑھ ضلع پٹنہ کی ایک گم نام بستی موضع نرہرا تھا۔ لیکن انھوں نے بدو شعور سے باڑھ کو جہاں اُن کی ننھیال تھی، اپنا وطن کر لیا تھا۔ آپ کے والد کا نام سید طالب علی تھا۔ شہباز نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد سے حاصل کی تھی۔ جب وہ انگریزی پڑھنے کے لئے اسکول میں داخل ہوئے تو اپنے نسبتی بھائی خان بہادر سید عبد العزیز صدر اعلیٰ کے پاس رہنے لگے۔ یہاں شہباز نے فارسی اور عربی کو دل لگا کر پڑھا، اور انگریزی میں انٹرنس کے درجے تک پہنچ کر کچھ عرصے تک تلاشِ معاش میں مشغول رہے۔ مگر جب کوئی معقول صورت نہ نکلی تو صدر اعلیٰ صاحب نے ان کو اپنے پاس بلا لیا اس زمانے میں اردوئے معلّٰی کے فدائی مولوی سید محمد صاحب (جو بعد حصول خطابِ نوابی عہدۂ جلیلہ انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن صوبہ بنگال و بہار سے وظیفہ یاب ہوئے) مظفر پور میں سب رجسٹرار تھے۔ سید محمد عبد الغفور اگرچہ اس زمانے میں کم سن تھے لیکن بہت ہی پیاری اردو لکھتے تھے۔ اسی اردو کی چاشنی نے مولوی سید محمد صاحب اور شہباز کے درمیان رسل و رسائل کی بنیاد ڈالی۔ شہباز کے دل میں شوقِ ملاقات اور حصولِ نیاز کا ذوق پیدا ہوا تو مولوی سید محمد صاحب کے برادر بزرگ بھی مظفر پور میں موجود تھے، یہ دونوں علم دوست بھائی کم سن شہباز کی ذہانت، لیاقت اور بلند پروازیوں سے اس قدر خوش ہوئے کہ دل سے بہی خواہ اور سرپرست بن گئے۔ اسی زمانے میں کلکتے سے "دار السلطنت" نام کا ایک ہفتہ وار اخبار جاری ہونے والا تھا۔ مالکانِ اخبار نے نواب بہادر عبد اللطیف خاں سی۔ آئی۔ ای اور مولوی سید محمد صاحب سے درخواست کی کہ وہ اخبار کے لئے کوئی لائق ایڈیٹر تجویز فرمائیں۔ چنانچہ ان دونوں صاحبوں نے شہباز کو انتخاب کیا۔ چند سال کے بعد جب اخبار بوجوہ بند کر دیا گیا تو شہباز اپنے وطن چلے آئے۔ کچھ عرصے کے بعد نواب بہادر عبد اللطیف خاں نے "مذاکرِ علمیہ" ایک مجلس کے سلسلے میں شہباز کو کلکتے پھر بلا لیا۔ جہاں انھوں نے نہایت عمدہ طرح سے کام کیا۔

۱۸۸۵ء میں جب نواب عبد اللطیف خاں وزیر بھوپال ہوئے تو شہباز کو بطور پرسنل اسسٹنٹ اپنے ساتھ لیتے گئے۔ وہاں انھوں نے نہایت دیانت، قابلیت اور لیاقت کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیا۔ بھوپال کی واپسی کے بعد شہباز مولوی سید محمد صاحب کے ساتھ پٹنے میں رہنے لگے۔ مولوی صاحب ان دنوں یہاں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ شہباز کو اپنی انگریزی تعلیم کی تکمیل کا خیال از سرِ نو پیدا ہوا، اور بہار نیشنل اسکول کے انٹرنس کلاس میں داخل ہو کر تعلیم شروع کر دی اوّل درجے میں انٹرنس پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔ بعد ازاں بہار نیشنل کالج سے دو برس کے بعد ایف، اے پاس کر کے بی، اے میں پڑھنے لگے۔ لیکن عین امتحان کے وقت امراضِ صدر میں مبتلا ہو گئے اور شریکِ امتحان نہ ہو سکے

ڈاکٹروں نے رائے دی کہ آئندہ تعلیم روک دی جائے۔ تعلیم کی طرف سے مایوس ہوگئے تو تلاشِ روزگار کی فکر ریاست حیدرآباد لے گئی، جہاں وہ ہوم ڈیپارٹمنٹ میں مولوی عزیز مرزا کی ماتحتی میں مترجمی وغیرہ کے کام پر مامور ہوگئے۔ کچھ عرصے وہاں کام کرکے اورنگ آباد دکن کالج میں پروفیسری پر بھیج دئے گئے۔ پروفیسری کے بعد ریاست بھوپال کے سررشتۂ تعلیم کے ڈائرکٹر مقرر ہوگئے۔

وہاں ان کی دلّی والی دوسری بی بی کا انتقال ہوگیا۔ وہ من جملہ اور وجوہ کے اس صدمۂ جانکاہ سے بیمار ہوگئے اور نوکری سے مستعفی ہوکر دلی اپنی سسرال چلے گئے۔ نوّاب سیّد محمد صاحب نے ان کی بیماری اور بے کاری کا حال سن کر اپنے پاس کلکتے بلا لیا۔ باوجود باقاعدہ تیمارداری اور علاج معالجے کے شہباز جاں بر نہ ہو سکے۔ یکایک اُن پر فالج گرا اور ۳۰ر نومبر ۱۹۰۸ء کو انھوں نے انتقال کیا، اور کلکتے کے سرکاری قبرستان میں سپرد خاک کر دئے گئے۔

تالیفات و تصنیفات شہباز

(۱) فارسی دیباچہ دیوان فارسی و اردو نوّاب سیّد محمد آزاد
(۲) مقدمہ موعظۂ حسنہ (مجموعۂ خطوط ڈپٹی نذیر احمد صاحب) مرتبۂ شہباز
(۳) مقالاتِ جمالیہ۔ مولانا جمال الدین افغانی کی اسپیچوں اور مضامین کا مجموعہ۔ مرتبۂ شہباز۔
(۴) مقدمہ خیالات آزاد (یعنی مجموعہ مضامین نوّاب سیّد محمد آزاد) مرتبۂ شہباز
(۵) مقدمہ نوابی دربار مصنفۂ نواب سیّد محمد آزاد
(۶) رباعیات شہباز
(۷) سوانح نظیر اکبرآبادی
(۹) خیالاتِ شہباز } کلام کے مجموعے
(۱۰) محبوب القلوب }

شہباز کے مضامین نثر و نظم اگرچہ مختلف اخباروں اور رسالوں میں نکلا کرتے تھے، مگر خصوصیت کے ساتھ وہ اودھ پنچ لکھنؤ اور اپنچ بانکی پور کے نامہ نگاروں میں تھے۔ (تلخیص حالات شہباز نوشتۂ سیّد افتخار عالم صاحب)

آبِ رواں

(۱) سرچشمہ

الہ آباد میں خوبی سے آباد (خدا رکھے ہمیشہ خرم و شاد)

ہیں میر اکبرِ حسین اک دوست میرے   وہ جن کی نظم نے موتی بکھیرے
طبیعت میں بلا کی ہے روانی   غضب جاری ہے اس چشمے کا پانی
رواں ہر چند ہوں یورپ میں نہریں   دکھائیں ہند کی یہ اُن میں لہریں
فرنگی سحر گو آئینے لائیں   یہ ہندی شوخ کے جلوے دکھائیں
سمجھ تو سحر ہے کیسا بیاں میں   لندن آیا چلا ہندوستاں میں
ہوئے سودی کے انگلش زاد الپوں سے   فصاحت آشنا اردو کے پہیے
کہاں ہیں چشمۂ سودی میں موجیں   یہ اُردوئے معلّے کی ہیں فوجیں
لئے ہاتھوں میں تیغ موجِ معانی   جمائے ہیں پرے معدرِ قوافی
مسلسل نظم میں نے جب یہ دیکھی   اٹھیں موجیں طبیعت میں خوشی کی
اُمنگوں پر بڑھیں دل میں امنگیں   ترنگوں پر ہوئیں پیدا ترنگیں
قلم اس پر سخن کا ہاتھ لپکا   قلم سے بوندیں بن کر شعر ٹپکا
کہاں ہیں تشنہ کامانِ معانی   پئیں حاضر ہے آبِ زندگانی

(۲) بہاؤ

اُڑا طرزِ خرامِ البیلیوں سے   چلا آبِ رواں اٹکھیلیوں سے
کھلاتا، کھیلتا، ہنستا، ہنساتا   تھرکتا، ناچتا، گاتا، بجاتا
مٹکتا، جھومتا، تنتا، اکڑتا   گرجتا، گونجتا، بنتا، بگڑتا
چھلکتا، جھلملاتا، جگمگاتا   پھسلتا، لڑکھڑاتا، ڈگمگاتا
دکھاتا زور، غل کرتا، کڑکتا   مچاتا شور، ڈانٹ اٹھتا، جھڑکتا
لپکتا، دوڑتا، پھرتی دکھاتا   اُچھلتا، کودتا، چکر لگاتا
اُچکتا، پھاندتا، گرتا، لڑھکتا   جھجکتا، روٹھتا، بھڑتا، بھڑکتا
مچلتا، پاؤں پھیلاتا، بلکتا   سہمتا، کانپتا، روتا، سسکتا
لرزتا، تھرتھراتا، تلملاتا   بلکتا، بلبلاتا، گڑگڑاتا
سمٹتا، پھیلتا، مڑتا، مڑاتا   اُبھرتا، ڈوبتا، اُڑتا، اُڑاتا
کترتا، چھانٹتا، پرزے اُڑاتا   کچلتا، کوٹتا، چھکے چھڑاتا
الف ہوتا، پڑا کا دے لگاتا   دولتی چھانٹتا، پشتک اُڑاتا
کبھی گھوڑ دوڑ میں کف منہ پہ لاتا   کبھی فوجوں میں گھس کر ہنہناتا
گریباں چاک کرتا، سر پٹکتا   رگڑتا ایڑیاں، دامن جھٹکتا
اُٹھا کر سونڈ فوارہ اُڑاتا   دھوئیں کے زور سے پارہ اڑاتا
تڑپتا، لوٹتا، چڑھتا، اُترتا   جھپٹتا، باولا ہوتا، بپھرتا

تھِرکتا، بھاگتا، رُکتا، ٹھہرتا ۔۔۔ جھجکتا، جھاڑتا، بنتا، سنورتا
پلٹنا، چھیڑتا، چھوتا، چھلاتا ۔۔۔ چھڑکتا، چھینٹتا، دھوتا، دھلاتا
کبھی ڈنڈ پیلتا، جوڑی ہلاتا ۔۔۔ کبھی خم ٹھونکتا، تیوری چڑھاتا
پہاڑوں کا کہیں دامن دباتا ۔۔۔ درختوں کی کہیں شاخیں چباتا
صدف میں گوہر نایاب بھرتا ۔۔۔ گہر کی شیشیوں میں آب بھرتا
مشبک چھاؤں کا چھپر بناتا ۔۔۔ مسلسل موج کا نقشہ بناتا
زمرد پر کہیں پارہ بچھاتا ۔۔۔ کہیں پارے پہ فیروزہ اڑھاتا
ستاری چھیڑتا، ارگن بجاتا ۔۔۔ ادھر چوڑیں، ادھر پریاں نچاتا
الجھتا خار سے گُل سے اٹکتا ۔۔۔ پٹختا، پھوٹتا، روتا، سسکتا
کٹر بھرے کو مرغابی بناتا ۔۔۔ بشر کو مردم آبی بناتا
مُکلف میز پر چادر بچھاتا ۔۔۔ معلق شہر کو دعوت کھلاتا
شگوفہ چھوڑتا غصہ چڑھاتا ۔۔۔ عداوت ڈالتا ہنس ہنس کے لڑاتا
کبھی کھیتوں میں [illegible] لگاتا ۔۔۔ کبھی منڈی میں زر کو پر لگاتا
جھلاتا جھولتا، پینگیں بڑھاتا ۔۔۔ کڑکتا، چیختا، تانیں اڑاتا
بہک پڑتا، سسکتا، سنسناتا ۔۔۔ اچک پڑتا، لپکتا، دوڑتا
بڑھاتا ہر طرف موجوں پہ موجیں ۔۔۔ چڑھاتا جا رہا فوجوں پہ فوجیں
کبھی سیماب سے چاندی بناتا ۔۔۔ کبھی چاندی پہ سونا چڑھاتا
پِنھاتا شمس کو زرتار ساڑی ۔۔۔ بناتا چاند سے دُلدل کی گاڑی
کھلاتا روز و شب سورج کو غوطے ۔۔۔ اڑاتا عقل کے [illegible] طوطے
زمیں کی گود میں گرداب بھرتا ۔۔۔ سمندر کی [illegible] سیماب بھرتا
بناتا مورچے، توپیں چڑھاتا ۔۔۔ سجاتا پلٹنیں، فوجیں بڑھاتا
نکلتا سیپیاں، موتی اگلتا ۔۔۔ بہاتا قافلے، سانپے میں ڈھلتا
گراتا، پھینکتا، ھینتا، اٹھاتا ۔۔۔ جھٹکتا، پٹکتا، ملتا، بہاتا
کبھی اوجوں پہ پھیلاتا تباہی ۔۔۔ کبھی موجوں پہ چھڑکتا سیاہی
کبھی پچکاریوں کا ڈالتا ڈھنگ ۔۔۔ زباں بن کر کسی جا چاٹتا سنگ

کبھی پتھر سے ٹکراتا ہوا سر ۔۔۔ کبھی ذروں پہ چمکاتا ہوا زر
نگینے سنگ ریزوں کے بناتا ۔۔۔ طلسمی سرمہ آنکھوں سے لگاتا

(۳) سمندر اور اس سے ہم آغوشی

غرض آبِ رواں یوں جہد کرتا ۔۔۔ ہر اک کوشش سے سو سو جتن کرتا
ہزاروں تازہ دم چشموں سے ملتا ۔۔۔ کروڑوں پیارے ہم چشموں سے ملتا
جلو میں مدیوں نالوں کو لیتا ۔۔۔ کروڑوں کشتیاں الفت کی کھیتا

سمندر

بڑی ہے اک عظیم الشان شے سے ۔۔۔ پڑے جس میں کروڑوں ابن طے سے
ہزاروں جس میں مخفی گنج شاہی ۔۔۔ کروڑوں جس میں اسرار الٰہی
زیادہ جس کی گہرائی خرد سے ۔۔۔ عیاں جس کی اونچائی شد و مد سے
خیالوں سے بڑا پھیلاؤ جس کا ۔۔۔ سمیٹے خوبیاں سمٹاؤ جس کا
نگاہیں جس کا پایاں پا نہ سکتیں ۔۔۔ حدیں جس کا سرا بتلا نہ سکتیں
فلک جس کے قدم لینے کو جھکتا ۔۔۔ زمانہ جس پہ دم لینے کو رکتا
زمانے سے ہوا خواہ ازل کا ۔۔۔ ہوا اُس عاشقِ سینہ سپر جس کا
ستارے جس پہ شیدا ماہ مفتوں ۔۔۔ بلا گرداں جس کا چرخ گردوں
گھٹا چکی ہوئی جس کی بدولت ۔۔۔ شفق پھولی ہوئی جس کی بدولت
پہاڑوں کو جہاں روڑوں کا رتبہ ۔۔۔ جہاں موروں سے کم گھوڑوں کا رتبہ
جہازوں کو جہاں قطرے سجاتے ۔۔۔ چٹانوں کو جہاں ذرے سجاتے
جہاں ہر لوند بستی بند میاں چل ۔۔۔ جہاں ہر موج جنتی سو ہماچل
جہاں طوفانِ نوح اک موج خیز ۔۔۔ جہاں خود چشم قدرت حیرت آمیز

ہم آغوشی

عبارت مختصر اٹھ کے سنبھل کے ۔۔۔ مطابق فارسی کی اس مثل کے
کند ہم جنس با ہم جنس پرواز ۔۔۔ کبوتر با کبوتر باز با باز
بنا آب رواں اک قلزم جوش
ہوا آخر سمندر سے ہم آغوش

دیہات کے لئے مزید ڈاک خانے ڈاک خانوں اور ڈاک کے ذریعے رسل و رسائل کی آسانیوں میں اضافہ کرنے کی غرض سے پانچ سالہ پلان کے تحت ۸۰ کروڑ روپیہ صرف کیا جائے گا جب کہ پہلے پانچ سالہ پلان کے تحت ۷ کروڑ روپیہ صرف ہونے کی توقع ہے۔ تجویز کیا گیا ہے کہ ایک ہزار افراد یا زیادہ آبادی والے ہر گاؤں میں ایک ڈاک خانہ کھولا جائے گا۔

سید اختر رضوی تپش

تذکرۂ میر حسن سے چند یادداشتیں

میر حسن ان نادرۂ روزگار لوگوں میں ہیں جنہیں قدرت نے شعر گوئی اور شعر فہمی دونوں نعمتوں سے وافر حصہ عطا کیا تھا۔ ان کی سحر بیانی کا ڈنکا "مثنوی سحر البیان" کی وجہ سے تا قیامت بجتا رہے گا۔

ان کی سخن فہمی اور سچی تنقید کے جوہر "تذکرۂ شعرائے اردو" سے کھلتے ہیں۔ یہ بیش بہا تصنیف مدتِ دراز تک گوشۂ گمنامی کی زینت بنی رہی۔ آخر کار ۱۹۲۲ء میں انجمن ترقی اردو کی جد و جہد سے یہ انمول جوہر دکانِ ادب میں جلوہ افروز ہوا۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اس پر ایک مبسوط عالمانہ مقدمہ لکھا ہے۔

میر حسن نے اپنی اس تصنیف میں ۳۰۰ شعراء کی بزم آراستہ کی ہے۔ اس بزم میں میر و سودا اور مظہر و درد جیسے اساتذۂ فن ہیں۔ جرأت، مصحفی اور انشاء جیسے اساطینِ ادب بھی ہیں اور تفریحِ طبع کے لئے ٹکرلس، شوب اور میر جعفر زٹلی بھی مدعو کر لئے گئے ہیں۔ ان لوگوں کی پرسشِ احوال میر حسن کی ظریفانہ خوش مزاجی کی دلیل ہے۔

اس محفل میں ہمیں ہندوستان کے ہر ہر گوشہ کے اہلِ کمال نظر آتے ہیں۔ جہاں دلی کے شعراء اولیت کا تاج پہنے ہوئے موجود ہیں وہیں شاہ جہاں آباد اور لکھنؤ کے سخن ور بھی تکمیل و اصلاحِ زبان کے خلعتِ فاخرہ میں ملبوس بیٹھے ہیں۔ اور جہاں عظیم آباد اور مرشد آباد کے ادب نواز مسندِ عزت و احترام پر متمکن ہیں وہیں دکن و پنجاب کے شعراء بھی بصد افتخار تشریف فرما ہیں۔ یہ مجمع بوقلموں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اردو اپنی ولادت کے لئے چاہے سرزمینِ ہند کے کسی بھی گوشے کی ممنون ہو لیکن نشو و نما اور جلوہ آرائی کے لئے وہ کسی خطے کی پابند نہیں رہی۔

اس مجمع میں ایک اور امر خصوصیت سے قابلِ لحاظ ہے یعنی یہاں مسلمانوں کے دوش بدوش ہندو بھی ہمسرانہ حیثیت سے موجود ہیں اور اس رنگِ محفل کو دیکھ کر نگاہِ اولیں بھی یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ روزِ اول ہی سے ریختہ کی تعمیر میں ہندوؤں کا ہاتھ رہا ہے۔ دیکھو وہ فارسی اور ریختہ کی دوہری خلعتیں پہنے رائے سرب سنگھ دیوانہ بیٹھے ہوئے ہیں جو بڑے استادوں میں سے ہیں۔ میر حسن لکھتے ہیں۔ "شاعر زبردست فارسی است۔ استاد ریختہ گویانِ لکھنؤ۔ چنانچہ میاں حسرت و میر حیدر علی حیران و اکثر دیگران شاگرد او ہستند" ان کے شاگرد میاں حسرت ایسے زبردست استاد تھے کہ کثرت کی وجہ سے اپنے شاگردوں کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ "حسرت شاگرد انش چنان است کہ در صورت شناسی خود ہم حیران است" ان کے پیچھے ٹیک چند بہار اور اسد رام مخلص بشہرتِ دوام اور عزت و احترام کی مسندوں پر متمکن ہیں۔ ان کے بعد سدا رام راقم کو دیکھو۔ ان سے کچھ فاصلہ پر رائے پرتھم ناتھ، سنتوکھ رائے بیتاب، [illegible] سنگھ، گھاسی رام خوشدل، آفتاب رائے رسوا، لالہ الماس زکی، لالہ خوش وقت رائے شاداب، رائے سکھ رام عاقل، فارغ، بدھ سنگھ قلندر، لالہ کانجی ناتھ، راجہ رام نرائن موزوں، عجائب رام عشقی اور لالہ لون رائے وفا اپنے اپنے مرتبہ سے تشریف فرما ہیں۔ ان میں بہت سے شعرا ایسے ہیں جو فارسی اور ریختہ دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔

ان کے مقابل میں ایسے مسلمان شعراء بھی ہیں جو اردو کے ساتھ ساتھ سنسکرت یا دوسری ہندوستانی بھاشاؤں کو گلے سے لگائے ہوئے تھے۔ مثلاً متقدمین میں احمد گجراتی ہیں جن کے بارے میں میر حسن لکھتے ہیں "در زبانِ سنسکرت و بھاکا گویند کہ تصانیف بسیار دارد" اس طرح ایک شاعر میاں سکندر عرف گھسا ہیں علم کتابی سے بے بہرہ۔ قصہ خوانی اور عرق کشی مشغلہ تھا مگر با ایں ہمہ بے علمی کلام میں جائے دم زدن نہیں ہے۔ شاکر ناجی کے شاگرد اور مرثیہ گو تھے۔ اردو کے علاوہ پوربی، پنجابی، بنگالی اور مارواڑی زبانوں میں بھی عمدہ مرثیے کہتے تھے۔ سچ ہے ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ واقعات بتاتے ہیں کہ ہمارے فرنگی آقاؤں سے قبل کم از کم علمی میدان مذہبی تعصب کی جولانگاہ نہ تھا ؎

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اس وقت تک ہندو امراء بھی اردو کی سرپرستی اسی طرح کرتے تھے جیسے مسلمان رؤسا۔

راجہ شتاب رائے صوبہ دار عظیم آباد کا نام محسنین ادب کی فہرست میں ہمیشہ ممتاز رہے گا۔ احمد شاہ کے کوکہ اشرف علی خاں کے متعلق مرقوم ہے کہ "از مدتے بطرف عظیم آباد پیش راجا شتاب رائے بسری برد" خود میر حسن کے استاد ضیا راجہ موصوف کے فرزند کے دربار سے متوسل تھے۔ عظیم آباد اور مرشد آباد کو اسی زمانے میں ادبی اہمیت حاصل ہو چکی تھی اور ان مقامات کے اہل دول شعراء کی سرپرستی لازمۂ ریاست سمجھتے تھے۔ "تذکرہ" میں ایسے پندرہ سولہ شعراء کا ذکر ملتا ہے جو دہلی اور لکھنؤ چھوڑ کر مرشد آباد اور عظیم آباد چلے گئے تھے۔ فدوی دہلی نبگالہ میں محمد سیٹھ کے پاس رہا کرتے تھے۔

بعض بعض مقامات پر بہت ہی دل چسپ ادبی لطائف ملتے ہیں جن کا تذکرہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔

اواخر سلطنت محمد شاہی میں ایک شاعر بے نوا، دہلی آئے۔ مزاج میں ظرافت کا عنصر غالب تھا۔ ایک روز کسی جگہ میاں آبرو سے ملاقات ہوئی۔ آبرو نے چنداں التفات نہ کیا۔ بے نوا نے کہا کہ "میاں آبرو! آخر آپ مجھ سے "تین چشم" کیوں نہیں ہوتے؟" میاں آبرو واحد العین تھے اس لئے "چار چشم" کے بجائے "تین چشم" کا تصرف بہت ہی پُر لطف تھا۔ اہلِ بزم ہنس پڑے اور میاں آبرو کو متوجہ ہونے ہی بن پڑی۔

ضیاء (میر حسن کے استاد) کا ایک قطعہ ہے ؎

تربت ضیا کی دیکھی کل رات دور سے میں — آئے نظر مجھے واں شمع و چراغ کتنے
جا کر جو آج دن کو دیکھا میں کر تفحص — اک دل جلے ہے اس میں حسرت کے داغ کتنے

اس مضمون کو میر ضیا سے سن کر سلام اللہ خاں تسلیم ایک فارسی شاعر نے فارسی میں ترجمہ کر کے اپنے نام سے مشہور کر دیا ؎

دوش رفتم بر مزار کشتۂ تسلیم خویش — می نمود از دور صد شمع و چراغ حسرتے
چوں شدم نزدیک دیدم از تفحص ٹائپے — یک دلے می سوخت با صد چند داغ حسرتے

میر حسن انتہائی خفگی کے عالم میں لکھتے ہیں کہ "ایں نہ دانست کہ در نظر صورت شناسان معانی متبنی و فرزند پوشیدہ نمی ماند۔ مثلِ ہندی مشہور است۔" "ماتھی پھرے گاؤں گاؤں۔ جس کا ماتھی اُس کا ناؤں"

مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کہتے ہیں کہ "میر حسن خفا ہیں (اور خفگی بجا ہے) پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تسلیم کے شعر زبان فارسی کی قوت و صفائی کی بدولت ضیا کے اشعار سے زیادہ تابدار ہیں۔ خصوصاً اس صورت میں کہ ضیا کی زبان بوجہ قدامت ماند پڑ گئی ہے۔ مصرع اوّل میں 'کشتۂ تسلیم' نے جان ڈال دی ہے۔

گویا مولانا اسے "سرقۂ محمود" سمجھتے ہیں۔

چکبست نے دو تین مقامات پر نسیم کی بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ واقعہ لکھا ہے کہ کسی مشاعرے میں ایک بزرگ (غالباً ناسخ) نے سرِ بزم نسیم سے کہا کہ "پنڈت جی! ایک مصرعہ ہو گیا ہے لیکن دوسرا مصرعہ نہیں لگتا۔" نسیم نے کہا کہ "ارشاد ہو!" ناسخ نے یہ مصرعہ پڑھا ع

شیخ نے مسجد بنا، مسمار بت خانہ کیا

ظاہر ہے کہ یہ پنڈت دیا شنکر نسیم پر کھلی ہوئی مذہبی چوٹ تھی مگر نسیم نے فی البدیہہ اتنی خوبصورتی سے شعر کو مکمل کیا کہ وار بالکل الٹ گیا ع

پہلے اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

یہ معرکہ بجائے خود بہت ہی دل چسپ تھا لیکن تذکرہ کے مطالعہ کے اثنا میں "میر اعلیٰ علی دہلوی" کے اشعار کے انتخاب میں یہ شعر نظر سے گذرا ؎

کو رُبت زاہد نے کیوں مسجد یہ بت خانہ کیا
تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

یہ توارد اصل معرکہ سے زیادہ حیرت انگیز ہے کہ ایک شعر کے دو مصرعوں سے علیحدہ علیحدہ دو شاعروں کی دماغی کاوشیں بالترتیب متوارد ہو جائیں۔

راجہ رام نرائن موزوں کا نام اوپر گذر چکا ہے۔ یہ سراج الدولہ کی طرف سے عظیم آباد کے صوبہ دار تھے۔ شیخ علی حزیں کے شاگرد تھے۔ فارسی کہتے تھے اور صاحب دیوان تھے۔ میر حسن کے الفاظ میں "بسیار خوش گو، آشنا پرست، سپاہ دوست" تھے۔ "شعر ریختہ کم گفتہ بلکہ نگفتہ" لیکن صرف ایک شعر کی بدولت ریختہ گویوں کی محفل میں بھی تذکرۂ مدام کی کرسی حاصل کر لی۔ جس وقت سراج الدولہ کے شہید ہونے کی خبر شہر میں پہونچی اسی وقت فی البدیہہ شعر کہہ کر روتے جاتے تھے اور خبر لانے والوں سے حال پوچھتے جاتے تھے ؎

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مر گیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گزری؟

"ہمیں شعر از دے یادگار ماند"

مولانا شروانی مقدمے میں لکھتے ہیں، ذرا اس شعر کو مکرر پڑھو اور اس کے درد کا اندازہ کرو۔ یہ بھی غور کرو کہ ایک "آشنا پرست" کا محبت کے دل کے داردات کا سچا نقشہ ہے۔ کیا اس کے بعد مجھ کو یہ کہنے کی اجازت ملے گی کہ "تاریخ کے سیاہ کار"

ہر خفگی، صحیح نہیں (ادارہ)

بیگ شیوں کے وافدار، سراج الدولہ! تیرے دل میں تو محبت وہمدردی کا چراغ روشن نظر آتا ہے۔"

راقم الحروف کہتا ہے کہ یہ سارا تبصرہ صرف پہلے مصرعہ تک ہی محدود ہے۔ دوسرے مصرعہ کو پڑھو اور دیکھو کہ راجہ رام نرائن کو" دوانے کے مرنے کے بعد" اس کی بھی فکر تھی کہ" ویرانے پہ کیا گزری"۔ محبتِ آقا اور حبِ وطن کا یہ حسین امتزاج ایسے ہی شعر میں ممکن تھا جو پُرخلوص قلب کی گہرائیوں سے بے ساختہ سطح زبان پہ آگیا ہو اور جو جذباتِ دل کا ترجمان ہو۔

میر حسن کا اندازِ تحسین دیکھو

رسیتا مَل شاگرد خواجہ میر درد کے معتقدین میں سے تھے۔ علم تاریخ میں اتنی زبردست مہارت رکھتے تھے کہ قصیدے کے قصیدے ایسے لکھ ڈالے ہیں جن کے ہر مصرعہ سے ممدوح کی تاریخ نکلتی ہے۔ ایک کنوئیں کی تاریخ کہی ہے ع

آب از یں چاہِ بے نظیر بر آر

۱۱۸۱ ۳

" چاہ بے نظیر" کے اعداد میں سے "آب" کے اعداد کا تعمیہ کیا ہے اور اتنے حسین انداز سے کہ میر حسن بے اختیار کہتے ہیں کہ " تعمیہ آب بسیار مناسب افتادہ که بہتر ازیں تعمیہ کردیدہ۔"

لالہ خوش وقت رائے شاداب چاند پور کے رہنے والے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے

دیکھ اس کے منہ پہ زلف سیہ فام کے تئیں
کیا زیب دی ہے کفر نے اسلام کے تئیں

میر حسن کہتے ہیں " واقعی ایں کافر مضمونے خوب یافتہ است کہ کفر اندمی بارد"

اکثر شعراء کے حالات میں عشق و محبت کی چاشنی موجود ہے اور بعض واقعات تو افسانے کا بہترین پلاٹ بن سکتے ہیں۔

فضائل علی خاں بے قید ایک محمد شاہی جوان تھے۔ خوش خوراک و خوش پوشاک، شعبدہ بازی اور صحبت داری میں کامل۔ ایک بت ہندی پر عاشق تھے۔ گردش روزگار سے نواب عمدۃ الملک کی ہمراہی میں الہ آباد جانا پڑا۔ فراقِ محبوب میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے اور آہوئے بے صحرا کی طرح وحشت کھاتے تھے۔ آخر کار نواب عمدۃ الملک کو ان کی دل بستگی کا سامان مہیا کرنا پڑا۔ کچھ اہلِ نشاط بلائے گئے اور ان سے یہ فرمائش کی گئی کہ بے قید کو ناز و ادا سے کسی دکسی زلفِ گرہ گیر میں اسیر کردو تاکہ ان کا دل کچھ قرار پکڑے۔ ایک نازنین نے ان کو بہ ہزار عشوہ و فریب رام کر لیا۔ اس وقت انھوں نے اپنے حسبِ حال ایک مثنوی کہی جو اس زمانے میں مشہور تھی۔ مختصر یہ کہ جب یہ اپنے اس عشق نازنین کا میاب ہوئے تو زانوئے حبیب پہ سر رکھ کر خواب نوشین کے مزے لینے لگے۔ اس وقت کا حال سنیئے ؎

عجب خواب دیکھا میں اس خواب میں ہُوا جس سے میں پیچ و تاب میں
ہُوا تھا جنوں سے میں اوّل جُدا سو کیا دیکھتا ہوں وہی دل ربا
کہ جو چاہتی تھی مجھے دل سیتی جدا بھی ہوا تھا میں مشکل سیتی
سو کہتی ہے یوں میرا دامن پکڑ کہ چھوڑے ترے غم سے میرا جگر
شب و روز رونا مرا کام ہے ترا نام لینے سے آرام ہے
یہاں تو جو چاہے سو کر میرے ساتھ قیامت کو دامن ترا میرے ہاتھ

یہ خواب دیکھ کر نیند سے چونکے تو معلوم ہوا کہ کوئی شخص ان کی تلاش میں آیا ہے باہر نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اسی پیکر محبوبہ کا قاصد ہے۔ اس خط کے بعض مضامین یہ ہیں ؎

لکھا بعد یا جامع الفارقین سلامت رہو قاتل الشاہدین
تمھاری خوشی سے یہاں خیر ہے سدا ہجر کے باغ کی سیر ہے
نہ پوچھی جو تم اب تلک میری سار تو جلتی ہوں میں اپنی قسمت کے مار
کہو کون ہے وہ جواہر مثال بسے کس کے پیکر میں اے میر لال
جو دیکھا تھا تم رنگ سرخ و سفید مرے تلخ سر اب نہ رکھیو امید
وہ بھویں کہ شمشیر جن کی غلام برہ کو نہ ٹکر کریں ہیں سلام
کروں کیا نکلتی نہیں جان ہے کہ یہ میری غفلت کا تاوان ہے

مثنوی میں تقریباً پانچ سو اشعار ہیں بقول میر حسن ابتدا میں، جہاں تک معشوق کے غمزہ و دلال اور حسن و جمال کا تذکرہ ہے، بہت ہی عمدہ ہے۔ مگر آخر میں جہاں اپنی وحشت و دیوانگی کا حال قلم بند کیا ہے وہاں افکار پریشاں کا عنصر غالب ہے

آفتاب رائے رسوا کا نام اور پرگنہ رچکا ہے یہ "منو" نامی ایک لڑکے کو دل دے بیٹھے تھے۔ ہوتے ہوتے عشق کی حد دیوانگی سے مل گئی۔ ایک روز وہ لڑکا ان کی گردن میں رسی باندھ کر کھینچ رہا تھا اتفاقاً ایک اور شخص رستہ میں مل گیا۔ "منو" نے نازِ محبوبانہ سے اس کو بھی گرفتار کر لیا۔ اس موقع پر رسوا نے یہ شعر کہا ؎ دیگرے را در گرفتاری شریکِ ما مکن
مدعا گر شہرتِ حسن ست یک رسوا بس ست

لہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ واقعہ تاریخی اعتبار سے درست نہیں (ادارہ)

یکسر رسوا ہیں است" کتنا معنی خیز اور لطف انگیز ٹکڑا ہے۔ اردو کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے
ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

ان دونوں اشعار میں تخلص سے کتنا فائدہ اٹھایا ہے!

میر ظفر علی آزاد۔ درد مند و عاشق مزاج تھے۔ دہلی کے رہنے والے اور مرشد آباد میں مقیم تھے۔ پنا بیگم کی ایک کنیز، نزاکت نامی، ان پر عاشق ہو گئی۔ ہر چند باہم ملاقات نہیں تھی لیکن عشق کی آتشِ پنہاں نے سینہ کو مثلِ لالہ داغدار کر دیا تھا آخر کار آہِ صبح گاہی نے ان پر بھی اثر کیا۔ جب نزاکت کی حالت بہت نازک ہونے لگی تو پنا بیگم نے استفسارِ حال کیا اور بیتابی کا سبب پوچھا۔ اس نے نڈر ہو کر کہہ دیا کہ "میں فلاں سے محبت کرتی ہوں اب آئندہ آپ مختار ہیں جو چاہیں سو کریں" بیگم صاحبہ نے اسے تختہ بند کر کے قید کر دیا۔ آزاد نے یہ واقعہ سنا تو آتشِ غم کو آنسوؤں سے بجھانے کی کوشش کی اور یہ شعر کہا ؎

معشوق ز رسوائی من پردہ نشین شد — این بود سزائے نگہ بے ادب ما

فارسی زیادہ کہتے تھے۔ اردو کے اشعار میں بھی نزاکت پائی جاتی ہے ؎

وعدۂ وصل تو کرتے ہو مگر سچ کہیو — دل کو اس وعدے سے پیش و کروں یا نہ کروں
خانہ اک دم کے لئے سیل پہ مانندِ حباب — متحیر ہوں کہ بنیاد کروں یا نہ کروں
مرغِ دل تیری جدائی سے پڑا تڑپے ہے — اس کو کیا حکم ہے آزاد کروں یا نہ کروں

میر حسن نے سلک متقدمین میں "سعدی دکنی" کا بھی تذکرہ کیا ہے جن کا "ہم شعر ہے ہم گیت ہے" والا مقطع مشہور ہے اور اس اختلاف کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو شاعر مذکور کی شخصیت کے متعلق پیدا ہو گیا تھا۔ فرماتے ہیں کہ "سعدی دکنی بعضے ایں را سعدی شیرازی قرار دادہ اند و بعضے سعدی دیگر یعنی دکنی۔ واللہ اعلم" اس کے بعد یہ تین شعر درج کئے ہیں ؎

ہم نا محقن کو دل دیا تم نے لیا اور دکھ دیا — تم یہ کیا، ہم وہ کیا، ایسی بھلی یہ ریت ہے
نے تم
دو نین کے کپھر کروں، رودُرا نجوؤں میں ہوں — بیٹھ سنگ کوتِ، دھڑن پیا سادھ نے دیت ہے،
صفال آنسو دوست

سعدی غزل انگیختہ، شیر و شکر آمیختہ
در ریختہ دُر ریختہ۔ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

اشعار کی فارسیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میر حسن شاعر مذکور کو سعدی شیرازی قرار دینے پر مائل نظر آتے ہیں۔ "چوں زبان فارسی دریں شامل است اغلب کہ سعدی شیرازی است"، لیکن اس امر کو مدِ نظر رکھئے کہ یہ اس زمانے کے اشعار ہیں جب فارسی اور بھاشا کی آمیزش سے ایک تیسری زبان عالمِ وجود میں آ رہی تھی اور ابھی یہ آمیزش اتنی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اجزائے ترکیب باہمی تفاعل سے اپنی جداگانہ ہستی کو یکسر فنا کر کے ایک بالکل ہی نئی شکل اختیار کر لیں بلکہ ابھی پانی اور شکر کو الگ الگ پہچانا جا سکتا تھا اور جس طرح ہر ترکیب کے ابتدائی دور میں کچھ اجزاء باہم مل جاتے ہیں اور کچھ اپنی اصلی ہیئت پر باقی رہتے ہیں اسی طرح اگر اس زمانے کے ریختہ کے اشعار میں خالص فارسی ترکیبیں بلکہ بعض صورتوں میں مکمل فارسی جملے نظر آ جائیں تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اسے کسی ایرانی نژاد شاعر نے ہندوستان میں آ کر کہا ہے۔ بہرحال میر حسن کو بھی موردِ الزام قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

اجناس خوراک کی پیداوار میں اضافہ

پنج سالہ پلان کے بنیادی سال ۵۰-۱۹۴۹ء میں غلوں کا رقبہ کاشت انیس کروڑ پچپن لاکھ ایکڑ اور کل اجناس خوراک کا رقبہ چوبیس کروڑ ترپن لاکھ ایکڑ تھا۔ پلان کے تحت ۵۶-۱۹۵۵ء کے آخر تک غلوں کے رقبہ میں پندرہ لاکھ ایکڑ کا اور کل اجناس خوراک کے رقبے میں سات لاکھ ایکڑ کا اضافہ مقرر کیا گیا ہے۔ لیکن ۵۳-۱۹۵۲ء میں ہی اجناس خوراک کا مجموعی رقبہ کاشت پچیس کروڑ بیس لاکھ ایکڑ تک جا پہنچا اور ۵۴-۱۹۵۳ء میں اس رقبۂ کاشت میں نوے لاکھ ایکڑ کا مزید اضافہ ہوا اور سال کا کل رقبہ کاشت چھبیس کروڑ دس لاکھ ایکڑ ہو گیا۔ اس سے پیشتر بھارت یونین میں کبھی اتنے وسیع رقبہ پر کاشت نہیں ہوئی۔ پیداوار میں اس زبردست اضافے کی بدولت غیر ملکوں سے اجناسِ خوراک کم مقدار میں درآمد کئے گئے۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں دو ارب سولہ کروڑ روپے کی مالیت کے سینتالیس لاکھ ٹن۔ ۱۹۵۲ء میں انتالیس لاکھ ٹن۔ ۱۹۵۳ء میں اکیس لاکھ ٹن اور ۱۹۵۴ء میں اب تک اس مقدار کا صرف پانچواں حصہ درآمد کیا گیا ہے۔

خیال فاروقی

گُل کدہ

کشمیری غزل

اصل

۱- تِرہ پرا فسانہ تُہ بُتھ ہوشہرین مستانہ یا رُو لو
لو چارِ سے شوقہ سان اُتھ لود سازس میچھ تارُو لو

۲- اژِ بُتھ سوی زاد جارن منز جایہ وگ رٹان آخر
ژ ماٹن یس پردہ آرا لِکھ مشِتُت یس گو قرارُو لو

۳- طُفانن وُزملن وُنتو فنائی منز شرتھ جل جل
جنُونن سانِ ادمُت سالہ امنکھ نو بہارُو لو

۴- ژُو زُرژامُت چھو از ماگھس نوی سرہ پوش پھُل بلغس
بُھقس گیہ کالہ تیہہ بردس وُزِل گے لالہ زارُو لو

۵- مژِر سونوی چھو مغرُورن وُٹھت گردن پیٹھر پاوان
وُزان اکوی تژ ر ڈشیت کینہ منز آبشارُو لو

۶- وتن گرِ آشتن پانے جِنح پھل پھل پوان برونہہ کُن
قدم چھا سرفروشن ہند کران زانہہ انتظارُو لو

۷- خیالو! بے اثر چھنہ زُلف و مژگانک سخن روزان
مگر وونکِ غزل پرنس چھُ وقتُک نے بکارُو لو

ترجمہ

۱- اے دوست! تو نے اپنا افسانہ سُنا تا کہ متانے ہوش میں آجائیں اور میں شوق و ذوق سے اُلفت کے تاروں کو چھیڑتا جاؤں گا۔

۲- وہ کالا انسان باریکیوں کو سمجھ کر زندگی پر تصرف جماتا ہے جس نے آرام کے پردوں کو چاک کیا اور جو سکون و قرار کو ذہن سے بھول ہی بیٹھا۔

۳- کوئی بجلیوں اور طوفانوں کو آگاہ کر دے کہ بحرِ فنا میں غرق ہو جائیں کیونکہ ہمارے جُنوں نے "امن" کے نوبہار کو مدعو کیا ہے۔

۴- بادہ اور ماگھ کا سینہ چھلنی ہو کر نئے حسن کے ساتھ پھول کھل اُٹھے ہیں اسی لئے خزاں کا چہرہ فق پڑ گیا ہے اور لالہ زار سُرخ ہو کر چمک رہے ہیں۔

۵- ہماری ہی دیوانگی بڑے بڑے سقاکوں کی گردن مروڑ کر انہیں بیبس کر دیتی ہے اور ہمارے ہی جوشِ جنوں کے اثر سے سخت پتھروں کی چھاتیوں سے آبشار پھوٹ پڑتے ہیں۔

۶- اگرچہ راستوں پر مہیب تاریکی بھی مسلط ہو لیکن صبح خود ہی آگے آکر خیر مقدم کرتی ہے کیونکہ سرفروشوں کے قدم کبھی انتظار نہیں کرتے۔

۷- اے خیال! زلف و مژگان کے سخن تو بغیر اثر کئے نہیں رہتے لیکن ایسی غزلیات بیان کرنے کے لئے "وقت کی آواز" درکار ہے۔

پنج سالہ پلان

نمبر ۵

گزشتہ سے پیوستہ

زمینوں کے متعلق پالیسی

س - کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ پلان میں زمین کے متعلق جو پالیسی درج کی گئی ہے اس سے ایک نئے سماجی نظام کی بنیاد پڑے گی ؟

ج - ہاں - ایک طرف تو بڑے بڑے زمینداروں اور درمیانی لوگوں کے ختم ہو جانے سے یہ پالیسی سارے ملک میں زمین کے کسان مالکوں کا ایک ہم آہنگ ڈھانچہ پیدا کرے گی جو اپنی زمین کی خود کاشت کریں گے - دوسری طرف کواپریشن پر زور دینے سے یہ ایک نئے نظام کا رستہ دکھلائے گی جس کی بنیاد دیہات ہی کی سطح پر کسانوں کی زمینوں کے مشترکہ انتظام پر ہوگی - اس قسم کے نظام کا قیام ایک لمبی مدت کی پالیسی پر مبنی ہوگا - لیکن کواپریٹو بنیادوں پر کاشت کے متعدد تجربات کا پلان میں انتظام کر دیا گیا ہے -

س - کواپریٹو دیہاتی انتظام کیا ہے ؟

ج - کواپریٹو دیہاتی انتظام سے مراد ہے ایک گاؤں کی ساری زمین کا دیہاتی سماج کے ذریعے سے انتظام - اس میں ایک ملکیت کے منافع کی گنجائش کے تحت ان لوگوں کے حقوق ملکیت کا خیال رکھا جائے گا جو اپنی زمین اس نظام کے تحت پیش کر دیں گے - اس طریقے سے دیہاتی سماج گاؤں کی ساری زمین کا انتظام اس طرح کرے گا گویا یہ ایک ہی کھیت ہے -

س - کیا زمینداروں کو معاوضہ دیا جا رہا ہے' اور اگر دیا جا رہا ہے تو کس اصول پر ؟

ج - ہاں - زمینداروں' مالگزاروں اور جاگیرداروں کو معاوضہ دیا جا رہا ہے - اگرچہ معاوضے کے سلسلے کی تفصیلات ہر ریاست میں مختلف ہیں' لیکن بنیادی طور پر معاوضے کا فیصلہ زمیندار کی اپنی جاگیر کی ٹھوس آمد کے حاصل ضرب کی بنا پر کیا گیا ہے - لیکن یہ حاصل ضرب تمام حالات میں یکساں نہیں ہے - جاگیر جس قدر چھوٹی ہوگی اس کی آمدنی کا حاصل ضرب اسی تناسب سے زیادہ ہوگا - مثال کے طور پر یو - پی میں اس زمیندار کو جو مالیے کے طور پر ۲۵ روپے یا اس سے کم ادا کرتا ہے ٹھوس آمدنی کا ۲۸ گنا معاوضہ (جس میں دوبارہ آبادکاری کی گرانٹ بھی شامل ہے) ملے گا - جب کہ اس زمیندار کو جو ۵۰۰۰ روپے مالیہ ادا کرتا ہے صرف ۹ گنا معاوضہ ملتا ہے -

بالعموم جہاں تک چھوٹے زمینداروں کا تعلق ہے انھیں معاوضہ نقد روپے کی صورت میں (یک مشت یا قسطوں میں) ملے گا اور دوسروں کو بانڈ کی صورت میں ملے گا جو قابل انتقال ہیں - لیکن سکا رنے رکھنانے کے قابل نہیں ہیں - جو روپیہ ابھی تک زمینداروں کو ادا نہیں کیا گیا - اس پر تمام زمینداروں کو ڈھائی فیصدی سود ادا کیا جائے گا -

س - پلاننگ کمیشن اس بات کے حق میں ہے کہ ایک فرد کی ملکیت میں زمین کے لئے ایک زیادہ اونچی حد کا اصول بنایا جائے اس کا حساب کس طرح لگایا جائے گا -

ج - پلاننگ کمیشن نے متعدد معیاروں کا ذکر کیا ہے جن کے پیش نظر ایک حد مقرر کی جا سکتی ہے - اور اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ کسی دئے ہوئے رقبے میں معیار مقرر کرنے کا انحصار اس حق قبضہ اور مالیے کے انتظام پر ہوگا جو وہاں جاری ہوگا - کمیشن نے تجویز کیا ہے کہ اونچی حد مقرر کرنے کا ایک عملی طریقہ یہ ہوگا کہ اس کا انحصار ایک خاندان کی زمین پر کیا جائے گا جسے مختصر طور پر ایک اوسط سائز کے خاندان کے لئے جو زراعت کے میدان میں ایک مروجہ مدد لے کر کام کر رہا ہے - کاشت کا یونٹ یا کام کا یونٹ کہا

جائے گا۔ اگرچہ ہر ریاست میں کوئی نہ کوئی تبدیلی تو ضرور ہوگی لیکن کمیشن کا خیال ہے کہ عام طور پر خاندان کی زمین کی تین گنا حد ایک مناسب حد ہوگی۔

س۔ کیا زمینوں کے متعلق پالیسی کاشت کاروں (لگان داروں) کے ساتھ بھی انصاف کرتی ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ زمینوں کے متعلق پالیسی حق قبضہ کے تحفظ کا بھی انتظام کرتی ہے اور لگان کی حدود بھی مقرر کرتی ہے۔ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ عام طور پر لگان داری کم سے کم پانچ برس کے لئے ہونا چاہیئے۔ اور کرایہ پیداوار کے ۱/۴ یا ۱/۵ سے نہیں بڑھنا چاہیئے۔ یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ لگان داروں کو اپنی کاشت کی ہوئی زمین خریدنے کا بھی حق ہونا چاہیئے۔ اگر یہ زمین اس رقبے سے زیادہ ہے جو زمین کے مالک کو اپنی ذاتی کاشت کے لئے رکھنے کی اجازت ہے۔ جو روپیہ اس کے لئے ادا کیا جائے گا وہ کرائے (لگان) کی مقدار کا ایک حاصل ضرب ہوگا اور اس بات کا انتظام کیا جائے گا کہ ایک مدت مقرر کر کے اس میں روپیہ قسطوں کے ذریعے سے ادا کر دیا جائے۔

کمیونٹی کی ترقّی

س۔ کمیونٹی کی ترقّی اور کمیونٹی پراجیکٹ سے کیا مراد ہے؟

ج۔ کمیونٹی کی ترقی سے مراد ہے دیہاتی لوگوں کے مفاد کے پیشِ نظر انھیں کا تعاون حاصل کر کے دیہات کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں ایک بتدریج تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش۔ یعنی زیادہ سائنٹفک زراعت، بہتر صفائی، رسل و رسائل اور گھریلو صنعتوں میں ترقّی پیدا کر کے اور دیہاتی کے پاس پہنچ کر، لیکن افسروں کی ایک بڑی مقدار کے ذریعے سے نہیں جن میں سے ہر ایک دیہاتی زندگی کے ایک پہلو سے تعلق رکھتا ہے بلکہ ایک ایجنٹ کے ذریعے سے (جسے گرام سیوک کہا جاتا ہے) جو دیہاتی ترقّی کے کم از کم تمام بڑے بڑے شعبوں کے لئے مشترک حیثیت رکھتا ہو۔ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ دس برس کی مدّت میں ملک بھر میں ایسے کارکنوں کا ایک جال بچھا دیا جائے جو کسان کو اپنے مسائل حل کرنے میں اور دیہاتی زندگی کی بحیثیت مجموعی ترقی کے لئے بھی مدد دیں۔

اس اثنا میں دیہات کی از سرِ نو تعمیر کے مسئلے کے حل کا طریقہ کمیونٹی پراجیکٹ کے علاقوں میں پوری طرح سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس وقت تقریباً ۵۵ ایسے پراجیکٹ ہیں اور سالِ رواں میں مزید ۵۰ ڈیولپمنٹ بلاکوں کا ان میں اضافہ کیا جائے گا۔ پراجیکٹ کے ایک علاقے کو تین ڈیولپمنٹ بلاکوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ ہر بلاک میں تقریباً سو گاؤں ہوں گے۔ جن کی آبادی ۶۰۰۰۰ سے ۷۰۰۰۰ تک ہوگی۔ اس کے بعد ڈیولپمنٹ بلاک کو تقریباً پانچ دیہات کے ایک گروپ میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر گروپ دیہاتی سطح کے کارکن کا میدانِ عمل قرار دے دیا گیا ہے۔ ان کمیونٹی پراجیکٹوں کے علاقوں کے لئے بحیثیت مجموعی ملک بھر کے مقابلے میں زیادہ اسٹاف اور زیادہ مالی ذرائع مہیا کئے جا رہے ہیں۔ لیکن ان علاقوں میں اس شدید ترقی کا جو نتیجہ برآمد ہوگا وہ بعد میں بڑے پیمانے پر لاگو کرنے کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔

س۔ یہ واضح طور پر بتایا جائے کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کیا ہے؟

ج۔ سرگرمیوں کا خاص میدان تو زراعت ہے لیکن رسل و رسائل، تعلیم، صحت، دیہاتی صنعتوں اور کواپریٹو سوسائٹیوں کی ترقی پر بھی بہت زور دیا گیا ہے۔ زراعتی پروگرام حاصل ہونے والی بنجر زمینوں کو توڑنے، آب رسانی کے چھوٹے چھوٹے کاموں، زراعت کے لئے بہتر ٹیکنیک اور بہتر بیجوں، مصنوعی کھاد اور قدرتی کھاد کے استعمال اور اعلیٰ نسل کی بدولت مویشیوں کی نسل میں بہتری پیدا کرنے کے پروگرام پر مشتمل ہے۔

سڑکوں کا پروگرام اس طرح بنایا جائے گا کہ کمیونٹی پراجیکٹ کے علاقے کے ہر گاؤں کو کسی بڑی سڑک سے ملا دیا جائے۔

پرائمری اور سیکنڈری تعلیم کے لئے بہتر انتظام کیا جائے گا اور صنعت گروں کو بہتر ٹیکنیک کی آسانیاں مہیا کی جائیں گی۔

جہاں تک صحت کا تعلق ہے۔ کوششیں پانی کے بچاؤ اور انسانوں اور مویشیوں کے فضلے کو ٹھکانے لگانے اور وباؤں کو قابو میں لانے پر مرکوز کی جائیں گی۔ دیہاتیوں کو عمارتوں کی تعمیر کی بہتر ٹیکنیک کی تربیت دی جائے گی اور ایک گنجان آباد گاؤں میں یہ ضروری ہوگا کہ نئے مکانات بنانے کے لئے جگہ کا انتظام کیا جائے۔

پروگرام کے مقاصد میں ایک یہ بھی ہوگا کہ ہر گاؤں یا دیہات کے ایک گروپ میں ایک کثیر المقاصد کواپریٹو سوسائٹی قائم کی جائے۔

ع م

نئے مطبوعات

نقشہائے رنگ رنگ

پروفیسر رادھے شیام رستوگی احقر کے اُردو اور فارسی کلام کا یہ مجموعہ بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

احقر صاحب لکھنؤ کے ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ انگریزی علم و ادب کے اُستاد ہیں۔ اردو اور فارسی سے موصوف کو والہانہ محبت ہے۔ اسی محبت کا کرشمہ تھا کہ آپ نے دونوں زبانوں کو نوادرِ سخن سے مالا مال کیا ہے۔ آپ کی شاعری بیشتر روایت کی شاعری ہے لیکن اس میں بھی ایک سلیقہ مندی، ایک میانہ روی اور ایک متانت کارفرما ہے۔ قدیم رنگِ تغزّل کی پیروی کے ساتھ ساتھ موصوف نے ملکی اور ملّی مسائل و واقعات کو بھی منظم فرمایا ہے۔ کتاب کا تعارف پروفیسر مسعود حسن رضوی نے لکھا ہے اور "حرفے چند" کے عنوان سے دیباچہ پروفیسر آلِ احمد صاحب سرور نے۔ سرور صاحب کے دیباچے کا ایک اقتباس مصنف کے رنگِ سخن رجحانِ طبعی اور شخصیت کو اچھی طرح نمایاں کر دے گا۔

رستوگی صاحب کے اس 'نقشہائے رنگ رنگ' میں کتنے ہی نقش اپنے حسن و زیبائش کی وجہ سے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس میں ہندی لَے بھی ہے اور کچھ پی سے بھی .... ان کی بعض فارسی نظموں میں بڑی بے ساختگی اور روانی ملتی ہے اور ان سے یہ بات بھی آئینہ ہو جاتی ہے کہ مشرقیت کا یہ فدائی مغربی سامراج کی چیرہ دستیوں سے نالاں ہے .... فقیرِ برہنہ بڑی دلکش نظم ہے ..... اس نظم میں گاندھی جی کے ساتھ عقیدت شعریت کے حسین روپ میں نظر آتی ہے۔ چند اشعار سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

در سیاست انقلابے این چنیں آمد پدید   یک فقیرِ برہنہ، در پیشِ خاقاں می رود
آں فقیرِ تارکِ الدنیا کہ اسمِ پاک او   چوں وظائف بر زبانِ پاکبازاں می رود
صلح جوئے وصلح خوئے وصلح کیش وصلح کوش   از برائے صلح سوئے انگلستاں می رود
یا برائے آبیاریِ نخلِ حرّیت   آرے آرے از ریاضِ خلد رضواں می رود
یا رسولے بر براقِ عزم با جبریلِ ہوش   بہرِ دیدارِ جلالِ خالقِ یزداں می رود
یا ہزارِ خوش نوا بیتاب در فصلِ بہار   در تلاشِ بوئے گل سوئے گلستاں می رود

کئی اور قومی و ملّی نظمیں اس مجموعے کی زینت ہیں۔ چند اشعارِ غزل کے بھی ملاحظہ فرمائیے

پریشاں مجھ کو دیکھ کر لوگ بولے   صد افسوس یہ مبتلا ہے کسی کا
لشکرِ غم کی ہوئی آمد پہ دل سے شکست   فوجِ عشرت نے مجھے گھیر لیا ہر سو سے
تمہاری زلف کے چرچے پریشانوں میں رہتے ہیں   مری دیوانگی کے ذکر دیوانوں میں رہتے ہیں

ادب اور نظریہ

آلِ احمد سرور صاحب کے ۱۳ تنقیدی مضامین کا مجموعہ قیمت ہے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۲۹۶ صفحات۔ کتاب مجلد اور جلد پوش سے مزیّن ہے۔

سرور صاحب کے تنقیدی مضامین کا یہ چوتھا مجموعہ ہے۔ ان تیرہ مضامین میں سے چار غیر مطبوعہ ہیں۔ سرور صاحب اردو کے ممتاز ترین نقّادوں میں سے ہیں۔ ان کے مزاج کا ایک خاص قسم کا توازن، تنقید میں توازن و اعتدال کا ضامن رہا ہے۔ یہی جوہر انھیں دوسرے تنقید نگاروں سے ممتاز بناتا ہے۔ ان تیرہ مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔ نظیر اور عوام، اختر شیرانی، غالب کا ذہنی ارتقاء، اقبال کی عظمت، رشید احمد صدیقی، مولانا سہیل کی شاعری، جوش کا سرود و خروش، ضیائے حیات، روایت اور تجربے اردو شاعری میں، نئے ہندوستان کی تعمیر میں اردو کا حصّہ، ادب اور نظریہ۔

ملنے کا پتہ۔ ادارہ بک ڈپو امین آباد پارک لکھنؤ

ادبی تنقید

ڈاکٹر محمد حسن کے ۹ تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے ان میں سے کم از کم دو مضامین آج کل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن اردو کے نوجوان ادیبوں اور تنقید نگاروں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اس

مجموعے کے مضامین آپ کے شعور کی بیداری اور ناقدانہ بصیرت کو پوری طرح اجاگر کرتے ہیں۔ قیمت فی جلد ہے؎ ملنے کا پتہ۔ انوار بک ڈپو لکھنؤ۔

جوئے رواں

حامد اللہ افسر کے کلام کا مجموعہ ۳۰×۲۰ کے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ افسر صاحب جو کبھی میرٹھی تھے اور اب لکھنوی ہوگئے ہیں۔ گو آج کل گوشہ نشین سے ہیں لیکن کسی زمانے میں بڑے "سرگرم" مشاعر ہوا کرتے تھے۔ باعتبارِ ذہانت و فطانت اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ آپ نے اُردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ بچوں کے لئے آپ کی نظمیں اور کہانیاں ملک بھر میں مشہور رہیں، تنقیدی مضامین، شعر و ادب غرضیکہ ہر آسمان کو آپ نے اپنی جولانگاہ بنایا ہے۔ آپ کا یہ مجموعۂ کلام دلدادگانِ شعر کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔

قیمت ۸ر ملنے کا پتہ انوار بک ڈپو۔ لکھنؤ

مثنوی سرودِ بیخودی

ڈاکٹر عشرت انور مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے استاد ہیں۔ علم و ادب سے آپ کو بڑا شغف ہے۔ قریب قریب چھ سو فارسی اشعار پر مشتمل یہ مثنوی آپ کے پاکیزہ ذوقِ شعر اور بیدار شعور کی مظہر ہے۔ پیش کش سلطان الہند خواجہ غریب نواز خواجۂ اجمیر کے نام ہے۔ بقولِ مصنف یہ مثنوی اقبال کے فلسفۂ خودی کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ موصوف نے دیباچے میں لکھا ہے کہ "خودی کے فلسفے کے تحت ایک ملت بحیثیت ملت فکری اعتبار سے دیگر ملل سے مدرسے تنازعہ اور تضاد ہے۔ چنانچہ ایک قدم آگے بڑھنے کی ضرورت تھی اور اقبال نے شاید مصلحتِ وقت کے تحت آگے بڑھنے سے گریز کیا"۔ مصنف کا اسلوبِ بیان مؤثر اور زبان صاف اور پاکیزہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مثنوی قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

روزِ فردا خویشتن ہمی بینم بپے   غم برد برکس برائے ہر کسے
بہرہ از عشق گر یابد کسے   می برد غم از پئے انساں بسے
روزِ فردا چوں نظام دیگر است   ہر کسے را صبح و شام دیگر است
وا شود فردا کتابِ بیخودی   ہر کسے مستِ شرابِ بے خودی
آنکہ می ورزد خودی محروم شد   "وانکہ خدمت کرد او مخدوم شد"

ملنے کا پتہ۔ ڈاکٹر عشرت انور ہم حالی روڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ قیمت دو روپیہ۔

زیرِ لب

صفیہ اختر کے خطوط جاں نثار اختر کے نام۔ قیمت چار روپیہ۔ ضخامت ۲۱۸ صفحے

تین سال کی مدت میں صفیہ مرحوم نے جو ہمت بڑھانے والے اور پُرحوصلہ خطوط جاں نثار اختر کے نام لکھے وہ اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ایک ہندوستانی خاتون کا عزم اور استقلال ان خطوں سے مترشح ہوتا ہے۔ ملنے کا پتہ ادارۂ ادب و زندگی۔ ۱۲۱ آرکیٹریا بلڈنگ ہاتھیکلہ بمبئی ۸

فنِ شاعری

مصنف علامہ اخلاق دہلوی۔ قیمت مجلد ہے؎ غیر مجلد عہ۔

عروض اور فنِ شعر پر ایک ایسی کتاب کی اشد ضرورت تھی۔ طلبا اور مبتدیوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ عروض کی مبادیات، زحافات، علم قافیہ اور متعلقہ مضامین پر مفید معلومات اس کتاب میں درج ہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو جامع مسجد دہلی۔

ثنائے حبیب

بہزاد لکھنوی کی تازہ نعتوں کا مجموعہ۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ۔ انوار بک ڈپو لکھنؤ۔

جہانِ اردو

داستانِ اُردو منظوم کا مختصر ایڈیشن۔ از کوکب شادانی۔ قیمت دو روپیہ۔ ناشر جنرل پبلشنگ ہاؤس بندر روڈ کراچی۔

پیغمبرِ اسلام غیر مسلموں کی نظر میں

ادارہ نئی راہ ۹۔ بی ہیرجی گوونجی بلاکس بمبئی ۸۔ ایڈیٹر طلبہ عباس عباسی

قیمت عام ایڈیشن عہ

تیرِ نیم کش

ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ شاہراہ اردو بازار دہلی۔ فکر تونسوی کے آٹھ طنزیہ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت دو روپیہ۔

غبارِ کارواں

محشر عابدی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

دارالعلوم خلیلیہ نظامیہ ٹونک

مشاہیرِ ملک کی آرا اس کتابچے میں شامل ہیں۔

بوئے دوست

ندیم مرادآبادی کے کلام کا مجموعہ۔ قیمت ۸ر۔

ملنے کا پتہ:۔ میر حسین نواب سرائے کشن لال پیر غیب مرادآباد یو۔پی۔

رفتارِ زمانہ

فرانسیسی بستیوں کی بھارت میں شمولیت

اس ماہ کا سب سے اہم واقعہ فرانسیسی بستیوں کی بھارت میں شمولیت ہے۔ ۱۹۴۷ء میں بھارت کے آزاد ہونے کے بعد یہ مطالبہ بھی زور پکڑنے لگا کہ بھارت کی پرتگالی اور فرانسیسی بستیوں کو بھی غیر ملکی پنجے سے چھڑایا جائے بھارت سرکار کافی عرصے سے اس سلسلے میں کوشش کر رہی تھی کئی حلقے تو اس بات پر بھی زور دے رہے تھے کہ پولیس ایکشن کے ذریعہ ان بستیوں کو آزاد کرایا جائے لیکن ہمارے پردھان منتری شری نہرو تشدد کو کام میں لانے پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے حکومت فرانس سے گفت و شنید جاری رکھی اور ان کی دور اندیشانہ پالیسی اور تدبر کی بدولت خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر تمام فرانسیسی مقبوضات اب بھارت کا حصہ بن گئے ہیں اور یکم نومبر کو فرانسیسی حکام نے باقاعدہ طور پر بستیوں کا چارج بھارتی افسروں کے حوالے کر دیا ہے۔ حکومت پرتگال ابھی تک اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے اور گوا وغیرہ بستیوں کو بھارت سرکار کے حوالے کرنے سے انکار کر رہی ہے لیکن توقع کی جاتی ہے کہ شری نہرو اپنے ناخنِ تدبیر سے بالآخر اس مسئلے کو حل کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

آندھرا میں نئے انتخابات

راشٹرپتی نے آندھرا کی اسمبلی کو ختم کر کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ واضح رہے کہ برسرِ اقتدار پارٹی اسمبلی میں حزبِ مخالف سے شکست کھا گئی تھی۔ راشٹرپتی نے اس امر کی ہدایات بھی جاری کر دی ہیں کہ آندھرا میں جلد از جلد نئے انتخابات کرائے جانے کے لئے طیاریاں شروع کر دی جائیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ۱۵ فروری تک صوبے میں عام انتخابات عمل میں آ جائیں گے۔

لوک سبھا میں شری قدوائی کو شردھانجلی

لوک سبھا کا اجلاس شروع ہونے پر ہاؤس کے لیڈر شری نہرو اور سپیکر شری ماؤلنکر نے نہایت دکھ بھرے الفاظ میں شری رفیع احمد قدوائی کی وفات حسرت آیات پر اپنے رنج اور غم کا اظہار کیا۔ پردھان منتری نے افسوسناک لہجے میں کہا کہ شری قدوائی کے ہم سے جدا ہو جانے پر ملک میں جو خلیج پیدا ہوئی اس کا پُر ہونا نہایت مشکل ہے۔ ماتمی قرارداد کھڑے ہو کر پاس کی گئی اور اس کے بعد اجلاس اگلے دن پر ملتوی کر دیا گیا۔

مالوٹوف کی مغربی ممالک کو تنبیہہ

روس کے وزیرِ خارجہ موسیو مالوٹوف نے اپنی ایک پریس کانفرنس میں مغربی ممالک کو تنبیہہ کی ہے کہ جرمنی کو یکجا کرنے کے سلسلے میں روس اور مغربی دیشوں کی گفت و شنید کا جبھی کوئی فائدہ ہوگا جب کہ مغربی ممالک مغربی جرمنی کو ازسرِنو مسلح کرنے اور کسی گروہ بندی میں لانے کے خیال کو ترک کر دیں۔ اس کے بغیر کوئی بات چیت کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہنچ سکے گی۔

بھارتی عوام کی علاقائی فوج میں دلچسپی

۲۰ نومبر کو بھارت میں یومِ علاقائی فوج منایا گیا۔ اس موقعے پر ملک کے مختلف حصوں میں علاقائی فوج کے جوانوں نے پریڈ کی اور فوجی کرتب دکھائے۔ وزیرِ دفاع شری مہابیر تیاگی نے ریڈیو پر ایک تقریر کے دوران میں بتایا کہ پچھلے کچھ مہینوں سے عوام نے علاقائی فوج میں شمولیت کے سلسلے میں کافی دلچسپی دکھائی ہے اور یہ ہمارے لئے ایک نیک فال ہے۔ شری تیاگی نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ بھارت امن کا متمنی ہے اور ہم سب کے ساتھ دوستی رکھنا چاہتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ہمیشہ طیار رہنا چاہئے۔ حفاظت کا کام صرف فوج کا ہی نہیں بلکہ ملک کے تمام باشندوں کا ہے اور اس کے علاوہ علاقائی فوج کے ہونے سے ملک پر زیادہ مصارف کا بوجھ بھی نہ پڑے گا۔

ایٹمی کانفرنس میں بھارت کو شامل کیا جائے

متحدہ اقوام کی اسمبلی میں برما کے نمائندے شری جیمز وبرنگٹن نے اس امر پر زور دیا کہ ایٹمی طاقت کے سلسلے میں بات چیت کے لئے جن ممالک کو مدعو کیا جا رہا ہے ان میں بھارت کو بھی شامل کیا جائے شری وبرنگٹن نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ اس بات چیت میں اُنھیں ممالک کو شامل کیا جائے گا جو ایٹمی طاقت کے بارے میں کافی تجربہ رکھنے کے علاوہ خام مال بھی رکھتے ہوں اگر یہی شرط ہے تو کیا اس کا اطلاق صرف آٹھ ممالک یا روس کو شامل کرکے نو ممالک پر ہی ہوتا ہے۔ کیا ایشیا کا کوئی ملک اس قابل نہیں کہ اُس کو اس بات چیت میں شامل کیا جائے۔ بھارت ایک بڑا ملک ہے اور اُس کے پاس ایٹمی طاقت کے سلسلے میں خام اشیا کی بہتات ہے۔ اس لئے اس گفت وشنید میں بھارت کو ضرور شامل کیا جائے۔

امریکہ میں ایٹمی کارخانوں کی تعمیر

امریکہ اپنی ایٹمی طاقت بڑھانے میں اپنے بہترین ذرائع استعمال کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں تازہ خبر ہے کہ اوکرن کے مقام پر ایٹمی طاقت طیار کرنے کے دو کارخانے پایۂ تکمیل تک پہنچ چکے ہیں۔ ان کارخانوں پر کام شروع ہو جانے پر یورینیم کی پیداوار بہت بڑھ جائے گی۔ ہر دو کارخانوں پر ایک ارب ڈالر کی رقم خرچ آئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک تیسرا کارخانہ بھی پورٹ سماؤتھ کے نزدیک تعمیر ہونا شروع ہو گیا ہے۔

ریلوے کے سفر میں سونے کی سہولتیں

سرکاری طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ ۱۵ نومبر سے ریلوے میں تیسرے درجے کے مسافروں کو رات کو سونے کے لئے سیٹیں ریزرو کرنے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ فی الحال جنتا ایکسپریس، ڈیرہ دون ایکسپریس اور دہلی مدراس جنتا ایکسپریس میں سے ہر ایک میں ۴۵ سلیپٹوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ مسافروں کے آرام کی دیکھ بھال کے لئے ہر ایک کوچ میں ایک ایک کنڈکٹر ہوگا جو مسافروں کے سونے کا انتظام کرے گا۔ سونے کے لئے سیٹ ریزرو کرانے کے لئے دو روپے زائد کرایہ لیا جائے گا۔

کشمیر شاہراہ ترقی پر

لداخ کے بڑے لاما اور حکومت کشمیر کے نائب وزیر شری کوشک بکل نے جموں میں اس امر کا اعلان کیا ہے کہ لداخ کی قسمت ہمیشہ کے لئے بھارت کے ساتھ وابستہ ہو چکی ہے۔ لداخ کے باشندوں کا مفاد بھی اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ تبت کے ساتھ ملنے کی بجائے بھارت میں شامل ہوں۔ بڑے لامانے اخبار نویسوں کو بتایا کہ حکومت کشمیر لداخ کی حالت کو سدھارنے کے لئے کوشاں ہے اور حکومت نے ہماری یہ بات بھی مان لی ہے کہ جموں یا کشمیر میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والے نوجوانوں کو حکومت پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ دے گی۔ شری بکل نے یہ بھی بتایا کہ خربا تانگ کے علاقے میں ۱۲ لاکھ روپے کے خرچ سے ۲۰ میل لمبی نہر کھودی جا رہی ہے۔ اس نہر کے ذریعے ۲۵ ہزار ایکڑ زمین میں آب پاشی ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ گیارہ لاکھ روپے کے خرچ سے زراعت تعلیم صحت اور دیہات کی بہتری کی سکیموں پر عمل کیا جا رہا ہے۔ لداخ کے صدر مقام لیہ میں ایک ہسپتال بھی مکمل ہو چکا ہے جس میں بیس بستروں کا انتظام ہے۔

بھارت کے پردھان منتری کی سال گرہ

بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو کا پینسٹھواں جنم دن دیش بھر میں بڑی شان کے ساتھ منایا گیا۔ کم وبیش دنیا کے تمام ممالک سے شری نہرو کو مبارک باد کے پیغامات موصول ہوئے۔ جن میں چین سے چاؤ۔ این لائی، روس سے مالنکوف، ہند چینی سے ڈاکٹر ہوچی منہ۔ برما کے وزیر اعظم اور یورپ کے کئی وزرائے اعظم کے نام قابل ذکر ہیں۔ چین کے وزیر اعظم نے پنڈت نہرو کو ایک نرالی بھینٹ بھجوائی ہے۔ اس بھینٹ میں ایک ہرن، ایک سارس اور ایک صد سنہری مچھلیاں شامل ہیں۔ اس بھینٹ کے ساتھ ایک پیغام بھجواتے ہوئے چین کے پردھان منتری نے کہا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ بھارت کے بچے بھی میری اس بھینٹ کو اسی طرح پسند کریں گے جس طرح آپ کی بھجوائی ہوئی ہتھنی آشا کو چین کے بچوں نے پسند کیا تھا۔

فلسطین کے پناہ گزینوں کو بھارت کی امداد

بھارت سرکار نے فلسطین کے پناہ گزینوں کے لئے ڈھائی سو ٹن تیل اقوام متحدہ کے ریلیف ادارے کو دیا ہے۔

مفتی فلسطین اور عربوں کی اعلیٰ کمیٹی کے صدر الحاج امین الحسینی نے یہ تحفہ قبول کرتے ہوئے قاہرہ میں مقیم بھارتی سفیر کو لکھا ہے کہ فلسطین کے عربوں کی نمائندہ اعلیٰ عرب کمیٹی کی طرف سے میں یور ایکسیلنسی سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ بھارت کے پردھان منتری شری نہرو اور بھارت سرکار کو اس کار خیر اور کرم فرمائی کے لئے ہمارا صدق دلانہ شکریہ پیش کریں۔

پاکستان کی نئی ترتیب

پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر محمد علی نے قوم کے نام اپنی تقریر نشر کرتے ہوئے بتایا کہ پاکستان کی وزارت نے فیصلہ کیا ہے کہ مشرقی بنگال کا نام مشرقی پاکستان کر دیا جائے اور مغربی پاکستان کی تمام اکائیوں کو

ملا کر ایک اکائی بنا دیا جائے۔ مغربی پاکستان کے صوبوں کو ایک اکائی میں شامل کرنے کی تفصیلی سکیم تیار کرنے کے لئے افسران کی ایک چھوٹی کمیٹی قائم کر دی گئی ہے۔

چین سے واپسی پر پردھان منتری کی تقریر

لوک سبھا میں اپنے دورۂ چین پر پہلی بار بولتے ہوئے پردھان منتری شری نہرو نے کہا کہ چینی لیڈروں کے ساتھ میری بات چیت کی بنیاد امن کو قایم رکھنا تھا اور یہ بات چیت دنیا میں کھینچا تانی کم ہونے میں مدد و معاون ثابت ہوئی ہے۔ چینی لیڈروں کے ساتھ جو میری لمبی بات چیت ہوئی ہے اُس میں ہم لوگوں نے کسی عہد نامے کا ذکر نہیں کیا بلکہ ہم نے صرف شانتی کے قیام پر ہی تبادلہ خیالات کیا۔ کیونکہ ہمارا یہ عزم مصمم ہے کہ ویسے تو ساری دنیا میں امن کی ضرورت ہے، لیکن ہمارے اپنے ملک کی از سرِ نو تعمیر کے لئے تو امن بنیادی چیز ہے۔

انجمن اقوام متحدہ کی سالگرہ پر راشٹرپتی کا پیغام

"ہر سال اس تنظیم پر نکتہ چینی اور اس کی تعریف دونوں کی آواز ہمارے کانوں میں پڑتی ہے اور اس کے بارے میں امید و مایوسی کی ملی جلی آرار کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ اس ادارے کی بنیادی مضبوطی کا ثبوت ہے کہ مخالف یا موافق رائے زنی کے باوجود اس کا قدم آگے بڑھتا رہا ہے۔

آج یہ امر تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اقوام متحدہ کی مانند ایک بین الاقوامی تنظیم کے بغیر دنیا کے معاملات کا طے پانا ناممکن ہو گیا ہے۔ خوش قسمتی سے سائنس اور آلاتِ حرب کی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ یہ تصور بھی مستحکم ہوتا جا رہا ہے۔ یہی احساسات ان تمام ممالک کے لوگوں کی ایک کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں جو اقوام متحدہ کے ادارے کی تقویت اور بقا کا باعث ہیں۔ بہرحال میں ذاتی طور پر اس نوعیت کے ادارے پر یقین واثق رکھتا ہوں جو ایک رضا کارانہ فضا میں قایم کیا گیا تھا۔

آج کے قابلِ یادگار دن پر ہمیں یہ عہد کرنا چاہیے کہ جس نصب العین کے لئے ادارۂ اقوام متحدہ کوشاں ہے۔ اس کے حصول میں ہم امداد و تعاون سے کام لیں تاکہ حقیقی معنوں میں دنیا میں انصاف امن اور خوش حالی کی فضا قایم ہو جائے۔



پچھمی بھارت کی تہذیبی نشو و نما

ہمارے دیش کے مغربی حصے کی تاریخ اور معاشیات پر سمندر کے قرب کا بہت اثر رہا ہے۔ بودھوں کی کتابوں میں بھاروکاچا اور سوپار اِنام کی بندرگاہوں کا ذکر آتا ہے جن کے ذریعے وسیع پیمانے پر تجارت کی جاتی تھی اور یہاں سے بھارتی مال سے لدے ہوئے جہاز بحرۂ روم کے ساحل تک پہنچا کرتے تھے۔ اس خطے کے دلیر باشندے سمندروں کو چیرتے ہوئے دکن یوروپ ایشیا کے ساتھ نہ صرف مختلف اقسام کے مال بلکہ خیالات کے تبادلے میں بھی اہم پارٹ ادا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس میدان میں شاندار تاریخی روایات کے حامل اس خطے میں آج دو بڑی بندرگاہیں جن میں سے ایک زیر تعمیر ہے) ۱۰ درمیانہ درجے کی ۵۰ چھوٹی اور ۲۹ بہت چھوٹی قسم کی بندرگاہیں واقع ہیں۔ ملک کی تجارتی درآمد برآمد کا علی الترتیب تقریباً ۴۰ فی صدی اور ۳۳ فی صدی حصہ بمبئی کی بندرگاہ سے گذرتا ہے جہاں کہ تمام جدید سہولتوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس خطے کی تقریباً ایک لاکھ ۵۰ ہزار اشخاص کی آبادی کا پیشہ مچھلیوں کی تجارت ہے

جس طرح فصل کی کٹائی کے موقعے پر گائے جانے والے گیت ہمارے دیش کے اندرونی حصے کے لوک سنگیت کی روایات کا خصوصی حصہ ہیں اسی طرح اس میدان میں پچھمی بھارت کی روایات میں ملاحوں کے گیتوں کو خاص مقام حاصل ہے۔ مثلاً نئی دولہن کو الوداع کہتے ہوئے اُسے اپنے عظیم تہذیبی ورثے کی یاد دلانے کے لئے اس مطلب کا گیت گایا جاتا۔

"گڑیا۔ کھاڑی تمھاری ماں ہے۔ دلدل تمھاری گذرگاہ ہے
اور پیاری گڑیا سمندر تمھارا داد ا ہے"

جب آریہ لوگوں نے پنجاب میں داخل ہونے کے بعد وسط بھارت میں پھیلنا شروع کیا تو اس خطے کا کسی کو علم تک نہ تھا۔ لیکن بعد ازاں نئے نئے لوگ اس علاقے میں وارد ہوتے رہے اور یہاں نئی نئی سلطنتیں وجود میں آئیں۔ موریہ، یونانی، شاکا، ستاواہن، گپتا، میترکا، چلوکیہ، سولنکی، خلجی، تغلق، مغل، پرتگالی اور انگریز حکمراں نوکِ شمشیر سے اس خطے کی سرزمین پر نئی تاریخ کندہ کرتے رہے۔ اس سرزمین نے فوجی میدان میں شیواجی ایسے بہادر پیدا کئے ہیں۔ لیکن جنگوں کی اس ہلچل کے ساتھ ساتھ مذہبی میدان میں نرسی مہتہ، ہنس دیوجی، سائیں بابا اور اپاسنی بابا ایسے رہنما تہذیبی روایات کو نشو و نما دینے میں بھی مصروفِ عمل رہے۔

موجودہ دور میں بھی جبکہ بھارت ترقی کی نئی منازل طے کر رہا ہے۔ پچھمی بھارت کے قدرتی وسائل اور اس علاقے کی ترقی کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا گیا، اور پانچ سالہ پلان کے تحت اس علاقے کے ترقیاتی منصوبوں کے لئے ایک ارب ۹۰ کروڑ ۵۴ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اس طرح پچھمی بھارت میں پانچ سال کے عرصے میں مختلف ترقیاتی منصوبوں پر ۵۱-۱۹۵۰ء کے مقابلے میں آٹھ گنا زیادہ رقم صرف کی جائے گی۔

فن عمارت سازی، مصوری اور موسیقی کے میدانوں میں بھی پچھمی بھارت نے عظیم روایات قایم کی ہیں۔ بمبئی سے ۸۰ میل کے فاصلے کے اندر اندر پونہ روڈ کے ساتھ کارلا اور بھاجا کے مقامات پر غاروں میں قایم شدہ مندروں کے قدیم نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ناسک، اورنگ آباد، سستر کنہری اور ایلیفنٹا میں بھی گپھائیں ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں اجنتا اور ایلورا کے غار سب سے زیادہ مشہور ہیں، اور یہ بمبئی سے ۲۵۰ میل سے کچھ زیادہ فاصلے پر واقع ہیں۔ مصوری کے میدان میں اجنتا کی دیواری تصویروں کی روایات کا اثر جاری رہا جس نے بعد ازاں گجرات کی ہاتھ کی مصوری کو جنم دیا۔ اور مزید کچھ عرصہ گزرنے پر اس فن نے اچھوتوں کی شاندار مصوری کی شکل اختیار کی۔

بھارتی موسیقی کی نشو و نما اور ارتقاء

بھارتی سنگیت کی شاندار روایات کا ڈانڈا زمانۂ قدیم سے ملتا ہے سام وید ایک ایسی کتاب ہے جو غنائیت سے بھرپور ہے۔ موسیقی ہندوستانی زندگی کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکی ہے۔ بچہ جب رحم مادر میں ہوتا ہے تبھی سے اس کے کان گیتوں سے آشنا ہو جاتے ہیں کیونکہ آسیب وغیرہ سے اسے محفوظ رکھنے کے خیال سے گیت گائے جاتے ہیں۔ جوں جوں بچہ بڑا ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف مرحلوں پر موسیقی اس کے قدم بقدم چلتی ہے۔

جیسا کہ ویدوں میں ذکر کیا گیا ہے موسیقی مکتی کے حصول میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ موسیقی میں نہ صرف مذہبی بلکہ غیر مذہبی سنگیت بھی شامل ہے۔ غیر مذہبی موسیقی کی جمالی کیفیت دیرپا قدروں کی حامل ہوتی ہے اور انسان کو اونچا اٹھانے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ بیشتروں کے قول کے مطابق فنون لطیفہ کی ساری تخلیق کا سرچشمہ خدا ہے۔

کمار سوامی نے ناخواندگی اور جہالت میں امتیاز کرنے پر زور دیا ہے۔ عوام کی بہت بڑی تعداد تو ان پڑھ ہو سکتی ہے لیکن اگر وہ مندروں کے آس پاس بستے ہوں تو رامائن اور مہابھارت جیسی عظیم تصانیف سے روشناس ہو سکتے ہیں اور سنتوں۔ رشیوں اور سورماؤں کے بارے میں بہت سے گیت بھی انھیں یاد ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج کے ایسے شہری کی بہ نسبت ان کا ثقافتی معیار و سطح بلند ہو جو گھٹیا ادب، سنسنی خیز فلموں اور اعصاب پر برا اثر ڈالنے والی موسیقی کا دلدادہ ہے۔

بھارت کے ہر خطّے نے بڑے بڑے موسیقی کار پیدا کئے ہیں۔ بنگال میں جے دیو اور گورنگ تھے تو یو۔پی میں کبیر اور سور داس۔ راجستھان نے میرا بائی کو پیدا کیا تو مہاراشٹر نے رام داس، ریکینا تھ، تکارام اور نام دیو کو جنم دیا۔ دکھنی بھارت کو تیاگ راج پر فخر ہے۔ سنگیت نے تمام سماجی رکاوٹوں کو پار کیا ہے۔ کبیر جلاہا تھا، رام داس موچی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ دھنّا ایک کسان کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ سادھنا ایک بوچڑ تھا تو سینا نائی۔ نام دیو خاندانی طور پر درزی تھا جبکہ میرا بائی ایک راجکماری تھی۔

سنگیت دراصل گیت ناچ اور اظہار جذبات کے امتزاج کا نام ہے گیت اور ناچ کی نشو و نما دو الگ الگ شعبوں کی حیثیت سے ہوئی ہے۔ لیکن اظہار جذبات اب بھی موسیقی کی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

بھارتی موسیقی میں آٹھ سُر کے بارہ پردے ہوتے ہیں۔ درحقیقت بھارتی سرگم میں بارہ سے زیادہ ضمنی حصّے ہوتے ہیں۔ مختلف سروں کو ملا کر گمک پیدا کی جا سکتی ہے۔ ۷ سروں کو ملا جلا کر ۷۲ تان بن سکتے ہیں۔

تیرھویں صدی عیسوی تک ہندوستان بھر میں سنگیت کا ایک ہی نظام رائج تھا۔ موسیقی پر سارنگ دیو نے سنسکرت میں "سنگیت رتنا کار" نامی رسالہ لکھا ہے جسے شمالی اور جنوبی ہند کے لوگ مستند مانتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلم اقتدار کے ظہور سے بیرونی ممالک کی موسیقی سے رابطہ پیدا ہوا۔ امیر خسرو نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا ہے۔ اس وقت سے اتری بھارت کی موسیقی کی نشو و نما جدا طریقے پر ہوئی ہے۔ موجودہ دور کی دوسری ربع صدی میں مرحوم پنڈت ڈگمبر پالوسکر اور سورگباشی پنڈت وشنو نارائن بھارت کھانڈے نے موسیقی کی روایتی صفائی اور پاکیزگی دوبارہ حاصل کرنے کی جد و جہد کی۔

بھارت میں کئی قسم کے آلات موسیقی کا رواج ہے جن میں تار، سانس اور ضرب سبھی قسم کے باجے شامل ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ سربہار سرود، بانسری، شہنائی، طبلہ، وینا، ستار، سارنگی اور رباب۔ ضرب کے آلات موسیقی کے بارے میں شاید ہندوستان سب سے آگے ہے۔

کلاسیکل راگ راگنی کے علاوہ ہلکے پھلکے گانوں کا رواج بھی ہندوستان میں رہا ہے مسلم فرمانرواؤں نے اس کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں درت، خیال، ٹھمری، غزل اور قوالی وغیرہ نے ترقی پائی۔ دور جدید میں ایسے ہلکے پھلکے گیتوں کو رواج دینے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں جن میں ادب اور موسیقی دونوں خصوصیات پائی جائیں۔ مہاکوی ٹیگور نے اس سلسلے میں قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ یہ تحریک ہندوستان بھر میں زور پکڑتی جا رہی ہے۔

ہندوستان عوامی سنگیت سے مالامال ہے۔ شاید یہ چیز فنّی موسیقی سے بھی قدیم ہے۔



۱۹۵۵ء

محمود پرویز کاکوی

نئی شان و شوکت دکھانے کو آیا   مسرت کی دولت لٹانے کو آیا
سعادت کا نغمہ سنانے کو آیا   ترقی کی راہیں بتانے کو آیا
صدا ہر طرف سے یہ آنے لگی ہے
نیا سال سب کو مبارک مبارک

گلستاں کے نقشے بدلنے لگے ہیں   وہ شاخوں میں پتے نکلنے لگے ہیں
دلوں میں ارادے مچلنے لگے ہیں   جو مایوس تھے وہ بھی چلنے لگے ہیں
صدا ہر طرف سے یہ آنے لگی ہے
نیا سال سب کو مبارک مبارک

وطن کو خوشی سے سجائیں گے اب ہم   عدو کی نظر سے بچائیں گے اب ہم
جو باطل ہے اس کو مٹائیں گے اب ہم   حقیقت کا رستہ دکھائیں گے اب ہم
صدا ہر طرف سے یہ آنے لگی ہے
نیا سال سب کو مبارک مبارک

غریبوں کے دم کا سہارا بنیں گے   ہم ان کی نگاہوں کا تارا بنیں گے
غم و یاس و حرماں کا چارہ بنیں گے   جہاں میں خدائی اشارہ بنیں گے
صدا ہر طرف سے یہ آنے لگی ہے
نیا سال سب کو مبارک مبارک

کیلنڈر ۱۹۵۵ء

جنوری	فروری	اپریل	مئی	جون	اگست	ستمبر					
اکتوبر	مارچ	جولائی	×	×	×	دسمبر					
×	نومبر	×	×	×	×	×					
سنیچر	منگل	جمعہ	اتوار	بدھ	پیر	جمعرات	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹
اتوار	بدھ	سنیچر	پیر	جمعرات	منگل	جمعہ	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰
پیر	جمعرات	اتوار	منگل	جمعہ	بدھ	سنیچر	۳	۱۰	۱۷	۲۴	۳۱
منگل	جمعہ	پیر	بدھ	سنیچر	جمعرات	اتوار	۴	۱۱	۱۸	۲۵	۰
بدھ	سنیچر	منگل	جمعرات	اتوار	جمعہ	پیر	۵	۱۲	۱۹	۲۶	۰
جمعرات	اتوار	بدھ	جمعہ	پیر	سنیچر	منگل	۶	۱۳	۲۰	۲۷	۰
جمعہ	پیر	جمعرات	سنیچر	منگل	اتوار	بدھ	۷	۱۴	۲۱	۲۸	۰

اوپر کے نقشے سے ہم آسانی کے ساتھ یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ فلاں مہینے میں فلاں دن کون سی تاریخ ہوگی یا فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو کون سا دن ہوگا

طریقہ: - جس مہینے کی تاریخ دیکھنی ہو، اس مہینے کے نیچے خانوں میں وہ دن پہلے دیکھو، پھر اس دن کے سامنے کے خانے میں تاریخ دیکھو۔ تاریخ معلوم ہو جائے گی۔ مثلاً اگر یہ دیکھنا ہو کہ دسمبر میں جمعرات کے دن کون کون سی تاریخیں پڑیں گی، تو پہلے دسمبر کے نیچے کے خانوں میں جمعرات کا دن تلاش کرو۔ پھر اس کے بعد اس کے سامنے کے خانوں میں تاریخیں دیکھ لو۔ معلوم ہوگا کہ جمعرات کو ۱، ۸، ۱۵، ۲۲ اور ۲۹ تاریخیں ہوں گی۔

اسی طرح جب یہ دیکھنا ہو کہ ستمبر کی ۲۳ر تاریخ کو کون سا دن ہوگا تو ۲۳ کے سامنے والے خانوں میں ستمبر کے نیچے دیکھو، معلوم ہوگا ۲۳ کے سامنے اس خانے میں جمعہ لکھا ہے۔ بس تو ۲۳ر ستمبر کو جمعہ کا دن ہوگا۔

مختصر یہ کہ اگر تاریخ معلوم ہو تو دن اور دن معلوم ہو تو تاریخ بڑی آسانی سے معلوم کرسکتے ہیں۔

ایم۔ ایچ۔ معلم بھٹکل

قمر ارماں

موسیقار

کسی گاؤں میں ایک دھوبی رہتا تھا۔ اس کا نام رنگو تھا۔ اس کے پاس ایک گدھا تھا۔ جو اب بوڑھا ہو گیا تھا۔

رنگو نے یہ سوچ کر کہ اب گدھا بوڑھا اور لاغر ہو گیا ہے اور اب اس سے میرے کام نہیں ہو سکتے۔ ایک دوسرا گدھا خرید لیا تھا۔



اور اس نئے گدھے کے آجانے سے بوڑھے گدھے کو کوئی ایک نظر دیکھتا بھی نہیں تھا۔ یہی نہیں۔ نہ اسے اب پہلے کی طرح کھانا ملتا تھا اور نہ اس کی دیکھ بھال ہی ہوتی تھی بلکہ اُلٹا دھوبی کی چڑچڑے مزاج کی بیوی اسے خوب پیٹا کرتی تھی۔ وہ اس کی روز روز کی مار سے جیسے گھبرا سا گیا تھا۔

ایک دن وہ جب مالکن کی مار کھا کے وہاں سے بھاگا تو سیدھا ایک جنگل میں پہنچا اور تنے دار درخت کے سایے میں بیٹھ کر سوچنے لگا۔

میں ایک بہت اچھا موسیقار ہوں۔ میں خوبصورت تو نہیں۔ مگر موسیقی میں میں ساری دُنیا میں مشہور ہوں۔ لوگ گانے بجانے سے پہلے میرا نام لیتے ہیں۔ اگر میں اس دھوبی کے یہاں پڑا رہا تو میں بھوکوں مرجاؤں گا۔ میرے لئے یہی اچھا ہوگا کہ میں کسی بادشاہ کے دربار میں جا کر اپنا گانا سناؤں اور شاہی گویئے کی جگہ حاصل کر کے عیش کی زندگی بسر کروں ——

وہ یہی فیصلہ کر کے وہاں سے اُٹھا اور آگے بڑھا۔

راستے میں اس کی ملاقات ایک کُتّے سے ہوئی۔ اس نے اس سے پوچھا ــ "کہو بھیا! بیکار یوں راستے میں پڑے پڑے کیا کر رہے ہو؟"

کُتّے نے دُکھے دل سے کہا۔

میری حالت بہت ہی خراب ہے بھائی' میری کہانی سنو گے تو رو پڑو گے —— میں اب بوڑھا اور لاغر ہو گیا ہوں۔ اچھی طرح سے شکار بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے میرے مالک نے مجھے میری اتنے برسوں کی خدمت کو جو میں کرتا چلا آیا ہوں بھلا کر مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ اب مجھ میں کچھ طاقت نہیں۔ اب میرے لئے ڈوب کر کسی ندی نالے میں مرجانا ہی بہتر ہے۔

بھیّا! —— گدھے نے اُسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا —— "بس میری کہانی بھی تمھاری ہی طرح ہے۔ میرا مالک بھی خود غرض ہے جب میں کسی کام کا نہ رہ گیا تو اس نے مجھے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا۔ مصیبت

سے گھبرا خودکشی کرنا بزدلی ہے ۔ میں تمھیں ایک صلاح دیتا ہوں۔ غور سے سُنو ۔ میں نے تمھاری درد بھری کہانی سُن لی ہے ۔ اس لئے اب ہمارے لئے یہ ہی بہتر ہوگا کہ ہم کسی بادشاہ کے دربار میں موسیقار کی جگہ حاصل کرنے کی جد و جہد کریں ۔ ہماری موسیقی دُنیا میں مشہور رہے ۔

کُتا راضی ہوگیا ۔۔۔ اور پھر وہ دونوں دوست وہاں سے آگے بڑھے ۔

کچھ دُور اور آگے چلنے کے بعد اُن کی ملاقات ایک بلّی سے ہوئی ۔ وہ رو رہی تھی ۔ گدھے نے اس کے قریب جاکر ہمدردی سے پوچھا ۔



کیوں بلّی موسی ؟ ۔۔ تمھارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں تم رو کیوں رہی ہو؟ آہ ! ۔۔۔ وہ روتی ہوئی بولی " میری حالت بس کچھ نہ پُوچھو ۔ میں دو دن سے بیمار ہوں اور جس کی وجہ سے میں چوہوں کا شکار نہ کر سکی ۔ اس پر غصّے میں آکر میری مالکن نے مجھے خوب پیٹا ، خوب مارا ۔ میں وہاں سے جان بچا کر بھاگ آئی ہوں ۔ دیکھو کم بخت نے مار مار کر میری کمر ٹیڑھی کر دی ہے ۔۔۔ میں اس سے اس کا بدلہ ضرور لوں گی ۔"

گدھے نے ہمدردی سے کہا ۔" موسی یہ قوم ہی خود غرض اور بے رحم ہے ، اُن پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے ۔ ان پر اعتبار کرکے کوئی بھی پھل پھول نہیں سکتا ۔ اسی لئے میں اور کُتا بھیّا نے مل کر شہر جانے کا فیصلہ کیا ہے وہاں جاکر موسیقار کی زندگی گزارنے کا ارادہ ہے ۔ تمھارا گلا بھی بہت سُریلا اور میٹھا ہے تم بھی ساتھ چلو تو بہتر ہوگا ۔"

ٹھیک ہے ، میں چلوں گی ۔۔۔ بلّی نے اپنی رائے ظاہر کردی اور پھر تینوں دوست وہاں سے آگے بڑھے ۔

وہ تیزی سے آگے بڑھے جا رہے تھے کہ ایک مکان کے قریب ایک درخت کے نیچے ایک مُرغے کو کھڑا ہوا دیکھا ۔ وہ سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا ۔

قریب پہنچ کر گدھے نے اس سے بڑی ہمدردی سے پوچھا ۔ " کیوں بھائی مُرغے کس خیال میں ڈوبے ہوئے ہو" ؟

کیا بتاؤں بھائی صاحب ۔۔۔ مُرغے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ۔" آج شام کو میں ذبح کر دیا جاؤں گا ۔ میرے مالک نے اپنے دوستوں کو کھانے کی دعوت دی ہے ، اُس میں میرا گوشت بھی اُنھیں کھلایا جائے گا میں یہاں اپنی زندگی کے آخری لمحے کھڑا گن رہا ہوں "۔ یہ کہتے ہوئے مُرغے کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رونے لگا ۔

گدھے سے اس کا رونا نہیں دیکھا گیا وہ جلدی سے بولا ۔ بھیا تمھارا گلا بہت خوب ہے ۔ جب تم صبح کو گاتے ہو تو دل خوش ہو جاتا ہے اور لوگ خواب سے بیدار ہو جاتے ہیں ۔ تم نے انسانوں کا اتنا کام کیا پھر بھی وہ تمھیں آج رات کو ذبح کرنے پر تلے ہوئے ہیں ۔ سچ سچ یہ قوم بڑی ہی خود غرض ہے ۔ میرے ساتھ چلو ۔۔ یہاں سے دور کسی بادشاہ کے دربار میں جاکر ۔۔۔ وہاں ہم سب مل جل کر مردوں کے جگانے کے گیت گائیں گے ۔۔۔ پھر ہمیں یقیناً شاہی گویّے کی جگہ مل جائے گی ۔

گدھے کی بات سُن کر مُرغا اُچھل پڑا ۔ اور وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا ۔ اور یہ چھوٹا سا قافلہ آگے خراماں خراماں بڑھا ۔

اب رات ہو چکی تھی اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا ہوا

تھا' ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دے رہا تھا ۔

چاروں دوستوں کو کافی بھوک لگی ہوئی تھی ۔ سبھوں کو فکر ہوئی کہ اب ہمیں رات کہاں گزارنی چاہیئے ـــــ

آخر کچھ سوچ کر گدھے نے مرغے کو اپنے پاس بلا کر کہا "تم کسی اونچی جگہ پر چڑھ کر کسی روشنی کی جگہ کا پتہ لگاؤ ۔

مرغا فوراً ایک اونچے درخت پر چڑھ گیا ۔ اسے ایک طرف تھوڑی سی روشنی نظر آئی ۔

وہ نیچے اتر پڑا پھر چاروں دوست جدھر سے روشنی آ رہی تھی اُدھر کو بڑھے ۔

روشنی ایک گپھا سے آ رہی تھی ۔ ڈاکو وہاں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور کھانے کی مہک آ رہی تھی ۔ کھانے کی مہک سے چاروں دوستوں کے منہ میں پانی بھر آیا ۔ وہ کھانا حاصل کرنے کی راہ نکالنے لگے ۔

آخر کافی غور و خوض کے بعد انھیں ایک ترکیب سوجھی ۔ وہ سب ایک جگہ ایک جھاڑی میں چھپ گئے ۔ اور زور زور سے چلا کر گانے لگے ان کے گانے کی آواز ایسی خوفناک لگ رہی تھی ۔ جیسے بھوت پریت گا رہے ہوں ۔ ڈاکو خوف سے کانپنے لگے اور کھانا چھوڑ کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے ۔

اُن لوگوں کے بھاگ جانے کے بعد چاروں دوست گپھا میں داخل ہوئے اور خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا ۔ تھکے تو تھے ہی' سو رہے ۔

کتا دروازے پر' بلی باورچی خانے میں' مرغ گپھا کی چھت پر اور گدھا پچھلے دروازے پر ہری ہری اگی ہوئی گھاس پر مزے سے سو رہے تھے ۔

آدھی رات کا وقت تھا ۔ ڈاکوؤں کا سردار اپنے گروہ کے ساتھ پھر لوٹ آیا ۔ اور گپھا کے باہر ہی رک گیا ۔ اور اس نے اپنے ایک بہادر اور چالاک ساتھی کو اندر جا کر پتہ لگانے کے لئے کہا آیا بھوت اب تک گپھا میں موجود ہیں یا چلے گئے ؟

وہ اپنے سردار کا حکم پاتے ہی اندر داخل ہوا ۔ چراغ جو اُن لوگوں کے بھاگنے سے پہلے روشن تھا وہ کبھی کا بجھ چکا تھا ۔ اندر گپھا میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا ۔

وہ بڑی ہوشیاری سے اندر داخل ہوا اور چراغ روشن کرنے کے لئے وہ باورچی خانے میں گھسا ہی تھا کہ بلی جو وہاں سو رہی تھی اس کے پیروں کی چاپ سن کر جاگ اٹھی اور فوراً ہی اس نے اس پر حملہ



کر دیا ۔ اور اسے اپنے تیز ناخنوں سے لہولہان کر دیا ۔

وہ بلی کے یکایک حملے سے ڈر کر وہاں سے بھاگا ۔ اور دروازے پر جہاں گدھا سو رہا تھا پہنچا تو گدھا بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اسے اپنے مضبوط ٹاپوں سے مارنے لگا ۔ اب اس کی حالت اور بھی خراب ہو گئی اور خوف کے مارے اپنی جان بچانے کے لئے دوسرے دروازے کی طرف بھاگا ۔

کتے نے جو پہلے ہی جاگ چکا تھا اس کے قریب آتے ہی اس پر دھاوا بول دیا ۔ اور تیز دانتوں سے اس کے سارے جسم کو کاٹ کر خراب کر دیا ۔

بے چارہ ڈاکو بہت گھبرا گیا تھا ۔ بڑی مشکلوں سے اس نے

اپنے آپ کو کُتّے کی گرفت سے چھڑایا اور باہر بھاگ گیا ۔

سردار نے اسے اس حالت میں دیکھا تو گھبرا کر پوچھا ۔

تمھاری یہ حالت کس نے بنائی ساتھی ؟ —

سردار ! گپھا کے اندر رہنے والے کوئی معمولی بھوت نہیں دیکھئے ان لوگوں نے میری کیا گت بنادی ہے ۔ اس نے خوف کے مارے کانپتے ہوئے کہا —

یہ سنتے ہی سردار اپنے ڈاکو ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے بھاگ گیا ۔ اور پھر اس نے کبھی ادھر کا رُخ بھی نہیں کیا ۔

اُن کے وہاں سے بھاگ جانے کے بعد چاروں دوستوں نے اطمینان کا سانس لیا ۔ اور بادشاہ کے دربار میں جاکر گوّیے کی جگہ حاصل کرنے کا خیال ان لوگوں نے ترک کر دیا ۔ چونکہ انھیں کھانے پینے کا اتنا کافی سامان اس گپھا میں ملا تھا ۔ کہ وہ اپنی باقی زندگی آرام سے گزار سکتے تھے ۔

اس کے بعد چاروں دوست اسی گپھا میں زندگی کے پیار بھرے گیت گاتے ہوئے رہنے لگے ۔

یہ اُن کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اُن کی مشکلیں آسان ہوگئیں اور اُنھیں زندگی بھر کے لئے آرام اور چین نصیب ہوا —

لطیفے

ماں ۔ بیٹا دیکھو تو ۔ کمرے میں کون جانور گھس کر شور مچا رہا ہے ۔ ذرا بھگا تو دو ۔

بچّہ ۔ امّاں جان کمرے میں تو کوئی جانور نہیں ۔ ابّا جان گا رہے ہیں ۔

ماسٹر ۔ جو لڑکا اسکول میں روزانہ ہنسی خوشی آئے اُسے کیا کہنا چاہئے

طالب علم ۔ پرلے سرے کا احمق یا مکّار ۔

ایس ۔ ایس ۔ آزاد

ہندسوں کے کھیل

لو بچو ! آج تمھیں حساب کے دلچسپ کھیل بتاتے ہیں ۔

۲۰۷۱۷۲۳ ایک ایسا عجیب و غریب ہندسہ ہے ۔ جسے ۵۳۶۳۲۲۲۳۵۷ سے ضرب دیں تو جواب میں سب ایک آئیں گے ۔

۲۰۷۱۷۲۳

۵۳۶۳۲۲۲۳۵۷

ضرب دینے پر حاصل ہوگا

۱۱۱۱۱۱۱۱۱۱۱۱۱۱۱۱۱

۱۲۳۴۵۶۷۹ کو اگر ۹۹۹۹۹۹۹۹۹ سے ضرب دیں تو

۱۲۳۴۵۶۷۹

(ضرب) ۹۹۹۹۹۹۹۹۹

پہلا ۹	۱۱۱۱۱۱۱۱۱
دوسرا ۹	۱۱۱۱۱۱۱۱۱
تیسرا ۹	۱۱۱۱۱۱۱۱۱
چوتھا ۹	۱۱۱۱۱۱۱۱۱
پانچواں ۹	۱۱۱۱۱۱۱۱۱
چھٹا ۹	۱۱۱۱۱۱۱۱۱
ساتواں ۹	۱۱۱۱۱۱۱۱۱
آٹھواں ۹	۱۱۱۱۱۱۱۱۱
نواں ۹	۱۱۱۱۱۱۱۱۱

جمع کرنے پر حاصل ہوگا

۱۲۳۴۵۶۷۸۹۸۷۶۵۴۳۲۱

عشرت صدیقی

پیلا مور



آج سے بہت سال پہلے چین میں ایک طالب علم
ا تھا۔ اس کا نام تھا تی۔ اس کی غریبی کا یہ حال تھا کہ اس
پاس ایک پیالی چائے کی قیمت بھی ادا کرنے کے پیسے
یں تھے۔ لیکن ایک ہوٹل کے مالک نے اس کے حال
ترس کھا کے اسے اپنے ہاں رکھ لیا۔ اور وہ وہیں
ہنے لگا ——— ایک دن تی ہوٹل کے مالک کے پاس گیا۔ اور بولا
جا رہا ہوں۔ جتنا میں نے یہاں کھایا پیا ہے۔ اس کی قیمت ادا
نے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ لیکن میں کسی کا احسان
نا نہیں چاہتا۔ یہ دیکھئے ....." اور اس نے اپنی جیب
ایک پیلے چاک کا ٹکڑا نکالا۔ اور ہوٹل کی دیوار پر ایک مور
صویر کھینچ دی۔ مور ایسا نظر آ رہا تھا جیسے وہ سچ مچ کا مور ہو
ن فرق صرف یہ تھا کہ اس کا رنگ پیلا تھا ——— "جتنا قرض
کا مجھ پر ہے۔ اس سے دس گنی دولت یہ مور آپ کو دے گا۔"
نے کہا "ہر بار جب لوگ جمع ہوں گے اور تین بار تالی بجائیں گے
یہ مور دیوار سے باہر نکل آئے گا۔ اور ناچنے لگے گا۔ لیکن ایک
یاد رکھئے۔ اسے کبھی صرف ایک آدمی کے لئے ناچنے پر
ر نہ کیجئے گا۔ اگر بدقسمتی سے کبھی ایسا ہوا تو یاد رکھئے کہ
دن کا ناچ مور کا آخری ناچ ہو گا۔ اچھا رخصت"۔ اور یہ
کر تی تیزی سے مڑا اور چل دیا۔

ہوٹل کا مالک حیرت سے تی کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اور
اس کے چلے جانے کے بعد اس نے اسے جانچنے کا ارادہ کیا۔ اور
دوسرے دن جب بہت سے گاہک ہوٹل میں جمع ہوئے تو اس نے
ہر ایک سے تین بار تالی بجانے کو کہا۔ تالی بجتے ہی وہ مور دیوار سے
باہر آ گیا۔ اور اس نے ناچنا شروع کیا۔ وہ جھوم جھوم کر ناچا۔ اور
پھر وہ واپس لوٹ گیا۔

گاہک خوش تھے اور ساتھ ہی حیرت زدہ بھی تھے۔ انھیں
اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آتا تھا۔ لیکن ہر بار ایسا ہی ہوا۔ یہ خبر
بجلی کی طرح ہر جگہ پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق ہوٹل میں آنے لگے۔ اور
اس طرح ہوٹل کے مالک نے خوب پیسہ کمایا۔ تی نے جتنے کا وعدہ
کیا تھا۔ اس نے اس سے بھی زیادہ حاصل کیا ——— انھیں دنوں
ایک امیر افسر ہوٹل میں آیا۔ اس نے وہاں ہر طرف کسانوں اور مزدوروں
ہی کو بیٹھے دیکھا۔ یہ دیکھ کر وہ برہم ہو گیا۔ اور اس نے سب کو باہر نکال دینے
کا حکم دیا ——— بڑے آدمی کی بات تھی۔ ہوٹل کے نوکر لاٹھیاں لے لے کر
لوگوں پر پل پڑے۔ یہ دیکھ کر جس کا جس طرف منہ اٹھا، لوگ بھاگ
کھڑے ہوئے۔ اور وہ افسر ہی باقی بچ گیا۔ اس نے ہوٹل کے مالک

ـــ ـــ روپیوں کی ایک تھیلی رکھ دی۔ اور فرمائش کی کہ اسے مور کا ناچ دکھایا جائے۔ جب مالک نے روپیوں سے بھری تھیلی دیکھی تو



وہ اپنا کیا ہوا وعدہ بھی بھول گیا۔ اور اس نے تین بار تالی بجائی۔ بادل ناخواستہ مور دیوار سے باہر آیا۔ آج وہ بالکل بیمار بیمار سا نظر آ رہا تھا۔ اور صرف ایک بار ناچنے کے بعد وہ واپس چلا گیا ـــ افسر بہت چیخا، چلّایا، دھمکیاں دیں۔ لیکن سب بے سود۔ رات گئے ہوٹل کے دروازے پر زور زور سے کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی۔ مالک نے دروازہ کھولا تو وہاں تی خاموش کھڑا تھا۔ تی نے اپنی جیب سے بانسری نکالی۔ اور وہ بجانے لگا۔ پھر وہ پیچھے دیکھے بغیر واپس لوٹ گیا ـــ بانسری کی آواز سن کر مور چونکا۔ اور دیوار سے کود کر وہ تی کے پیچھے پیچھے چل دیا ـــ پھر اس کے بعد کبھی کسی نے طالب علم تی اور اس طلسمی مور کو نہیں دیکھا۔

یہ تھی لالچ کی سزا ـــ"

سدرشن ساد

سادگی کی بے نظیر مثال

ہزاروں سال کی پرانی بات ہے۔ جبکہ پاٹلی پتر سارے ہندوستان کا دارا تھا۔ یہ دور دراز ملکوں تک مشہور تھا۔ ایک چینی سیاح ہندوستان کی سیر کرنے غرض سے آیا۔ اس نے پاٹلی پتر بھی دیکھا۔ اس وقت یہاں سمراٹ چندر گپت حکومت تھی۔ حکومت کا کاروبار اور انتظام دیکھ کر وہ بہت ہی خوش ہو لوگوں کی زبانی سنا کہ اس ملک کا وزیر اعظم چانکیہ بہت ہی عقلمند ہے۔ حکو کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کے ہی بنائے ہوئے قانون پر حکو چل رہی ہے۔ چینی سیاح نے وزیر اعظم سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ وزیر اعظ چانکیہ شہر سے دور دریا کے کنارے پر رہتا تھا۔ چینی سیاح اس سے ملنے کے لئے دریا کی طرف گیا۔ دریا کے کنارے پر عالیشان محل نظر آئے۔ لیکن چانکیہ کا مکان کہیں بھی نظر نہ آیا۔ سیاح آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ مکانوں کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا۔ وہ عجیب الجھن میں پھنس گیا۔ اسی الجھن میں اس کی نظر ایک عمر رسیدہ آدمی پر پڑی۔ وہ نہا دھو کر آ رہا تھا۔ اس کے ایک کندھے پر پانی کا مٹکا تھا اور دوسرے پر گیلا لنگوٹ۔ چینی سیاح نے اسے پوچھا۔ وزیر اعظم چانکیہ کا محل کہاں ہے؟

سیاح کا سوال سن کر بوڑھے نے کہا۔ میرے ساتھ چلئے۔ چینی سیاح اس کے ساتھ چلا۔ آگے ایک جھونپڑی تھی دونوں اس کے اندر داخل ہوئے۔ بوڑھے نے مٹکا نیچے رکھ کر کہا "کہئے کیا کام ہے" چینی مسافر نے پھر وہی الفاظ دہرائے کہ "میں وزیر اعظم چانکیہ سے ملنا چاہتا ہوں"۔

بوڑھے نے جواب دیا "خاکسار ہی کو چانکیہ کہتے ہیں"

"لیکن میں وزیر اعظم چانکیہ سے ملنا چاہتا ہوں" چینی سیاح نے کہا۔ اس پر بوڑھے آدمی نے ہنستے ہوئے کہا "میں ہی وزیر اعظم چانکیہ ہوں"۔ یہ سن کر چینی سیاح حیران و ششدر رہ گیا۔

ترتیب

بچوں کا آج کل

اردو کا مقبولِ عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر —— جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر —— بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۳ —— نمبر ۷

سالانہ چندہ: —— ہندوستان میں - چھ روپے / پاکستان میں - چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے —— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ: —— ہندوستان میں - آٹھ آنے / پاکستان میں - آٹھ آنے (پاک)

فروری ۱۹۵۵ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

امجد حیدرآبادی

کلامِ امجد

غــــزل

دنیا کی فضا بس ایک نظر میں زیر و زبر ہو جاتی ہے
وُہ دیکھتے ہیں اِن نظروں سے نظروں کو نظر ہو جاتی ہے

وُہ دُنیا سے کھو جاتا ہے اور کیا سے کیا ہو جاتا ہے
اُس مست نظر کی جس پر بھی اک خاص نظر ہو جاتی ہے

جب آتی ہے رات، وُہ آتے ہیں ساتھ اپنے اُجالا لاتے ہیں
چھا جاتا ہے اندھیرا آنکھوں میں جب وقت سحر ہو جاتی ہے

ہر وقت گزرتا رہتا ہے، یہ دریا بہتا رہتا ہے
ہو عیــد کا دن، یا شامِ الم ہر حال بسر ہو جاتی ہے

تدبیر کوئی چلتی ہی نہیں، تقــدیر کبھی ٹلتی ہی نہیں
ہر چند بدی سے بچتا ہوں، اس پر بھی مگر ہو جاتی ہے

موجود جو شے ہو جاتی ہے معدوم نہیں پھر ہو سکتی
دُنیائے وجود میں اے امجد تغیرِ صُور ہو جاتی ہے

قطعات و رُباعیات

آنکھوں میں ہے آنسوؤں سے ٹھنڈک   دل جل کے کباب ہو رہا ہے
مرقد پہ پڑی ہے چادرِ گُل   مُردے پہ عذاب ہو رہا ہے

کچھ عجب ہے یہ مادّی دُنیا   دُور تک اس کا دَور جاتا ہے
شمع پروانے کو جلاتی ہے   شمع کو بھی کوئی جلاتا ہے

کچھ کئے جاؤ لے کے نامِ خدا   کچھ نہ کرنا بڑی خرابی ہے
کامیابی کچھ اور چیز نہیں   کام کرنا ہی کامیابی ہے

بُرہان و دلیل سب معطّل ہو جائیں   جتنے جھگڑے ہیں دم میں فیصل ہو جائیں
ہر چند بہت سوال، لاینحل ہیں   تم سامنے آجاؤ تو سب حل ہو جائیں

آسائشِ جسم کے لئے جان نہ بیچ   اور جان بچانے کے لئے آن نہ بیچ
جھوٹے گاہک کو ٹھگنے والے۔ تاجر!   سامان کے ساتھ اپنا ایمان نہ بیچ

مختارالدین احمد آرزو

غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط

اور

چند اصلاحیں

غالب کے قدر دانوں میں کون ہے جس نے غالب کے خطوط پڑھے ہوں اور وہ چودھری عبدالغفور سرور سے واقف نہ ہو، عودِ ہندی کے بیشتر ابتدائی خطوط انھیں کے نام ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ سرور کا کلام عام طور پر نہیں ملتا۔ اسی لئے جب ایک دن مجھے غیر متوقع طور پر سرور کا ایک قصیدہ اور آٹھ نو قطعات خود اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ملے تو بڑی مسرت ہوئی۔ اور یہ مسرت اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب ان اشعار پر غالب کے قلم کی اصلاح اور انھیں صفحات کے ایک گوشے پر غالب کا ایک خط سرور کے نام لکھا ہوا پایا۔

قصیدہ نعتیہ ہے اور اُردو میں تعداد اشعار ۳۰۔ ان میں گیارہ شعر غالب کی اصلاح سے مزیّن ہیں۔ بعض مقامات پر غالب نے مصراع کا مصراع بدل دیا ہے۔ شعر ۱۳ تقریباً پورے کا پورا غالب کا کہا ہُوا ہے۔

بعض مقامات پر منشاءِ حک و اصلاح بھی انھوں نے لکھ دیا ہے۔ سرور نے لکھا تھا 'چشم سر دیکھے' اسے کاٹ کر 'آنکھ سے دیکھوں' بنا دیا ہے اور لکھا ہے: سر کا لفظ زائد اور حشو قبیح تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: دین کا لفظ روزمرّہ اردو میں کہاں مستعمل ہے؟ سرور کے مصراع "کیا حقیقت ہے مری اے شہِ لولاک لما" میں شہِ تحتیِ لولاک کر دیا ہے اور وجہ اصلاح یہ لکھی ہے: صرف لولاک کا لفظ مستعمل ہے اور یہ اشارہ کافی ہے لما لسانہٗ محض اور غیر مستعمل۔

قصیدے کے بعد قطعات کی باری آتی ہے، یہ تعداد میں ۹ ہیں۔ ان میں پہلا قطعہ اُردو میں اور بقیہ آٹھ سرور نے فارسی میں لکھے ہیں۔ ابتدائی قطعات پر غالب نے خاص توجّہ کی ہے۔ دوسرا قطعہ انھیں پسند نہ آیا اور 'سراسر تکلفات بارد' لکھ کر انھوں نے پورا قطعہ قلم زد کر دیا۔ لیکن اپنے دوست اور شاگرد کا دل رکھنے کے لئے ایک اردو قطعہ حبیب خاص سے مرحمت بھی کر دیا ہے۔

یہ قطعات تاریخ سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی کے بیٹے کی ولادت پر سرور نے لکھے ہیں۔ صفیر بلگرامی اور غالب کے تعلّقات کی داستان اور ملاقات کا حال احوالِ غالب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں صرف اس امر کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے کہ ستمبر ۱۸۶۶ء سے صفیر و غالب کی باقاعدہ خط و کتابت کی ابتدا ہوتی ہے، اس سے پہلے ممکن ہے حضرت صاحب عالم یا سرور کے خطوں میں وہ دعا و سلام بھیج دیتے ہوں یا مارہرہ ایک آدھ خط انھوں نے لکھا ہو۔ لیکن اس وقت تک انھیں آرہ میں صفیر کے مکان کا پتا معلوم نہ تھا۔ قیاس غالب ہے کہ سرور نے پتا لکھ دیا ہوگا اور غالب نے تہنیت میں انھیں خط ضرور لکھا ہوگا۔ لیکن یہ خط غالب کے ہزاروں خطوں کی طرح اب تک نامعلوم ہے۔

حضرت صاحب سے مراد صاحب عالم مارہروی ہیں جن کے خطوط کی غالب کو ہمیشہ شکایت رہی کہ اُن سے پڑھے نہیں جاتے اور جو صرف چوم کر اور آنکھوں سے لگا کر رکھ دئے جانے کے قابل تھے۔ صاحب عالم کے خطوط کو دیکھ کر غالب کی کیا کیفیت ہوتی تھی اس کا صحیح اندازہ مجھ کو اس وقت ہُوا جب صاحب عالم کے روزنامچے کے چار ضخیم مجلدات کے مطالعے کا اتّفاق ہُوا۔ اس کا ایک صفحہ صحیح طور پر پڑھنا مشکل ہے۔ اگر اس روزنامچے کی یہ جلدیں جو ہندستان کے مختلف کتب خانوں میں منتشر ہوگئی ہیں کبھی شائع ہو سکیں تو اس میں شبہ نہیں کہ یہ بہت مفید علمی خدمت ہوگی۔

اب سب سے پہلے سرور کا قصیدہ، پھر اور قطعات، پھر غالب کا مکتوب اور ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) قصیدہ

کاوشِ اہلِ وطن سے ہے یہ جی کی حالت　　کہ سبک ہے جگر خانۂ زنبور صفت

کیا زمانہ ہے الٰہی کہ یگانوں کو مرے　　نے سر و برگِ عنایت ہے نہ سازِ الفت

آنکھ سے دیکھوں

یارب آفاتِ زمانہ سے مجھے رکھ محفوظ　　چشمِ سر دیکھے نہ پھر صورتِ اہلِ نخوت

"آنکھ سے دیکھوں" بنا کر غالب نے مصرع کیسا رواں کر دیا ہے۔

غالب : سر کا لفظ زائد اور حشو قبیح تھا۔

سمجھے

وہ جو کل کرتے تھے زانوئے عیسیٰ پہ تزانۃ　　آج وہ آپ کو کہتے ہیں فلاطوں فطنت

غالب : جمع ایک جگہ کافی ہے ۱۲

ورزِ افساد پہ مائل ہے طبیعت اُن کی　　اب سخن چینی سے دیتے ہیں وہ کیا کیا ذلت

—— وجہاں کی وہ خوانان ہیں خدا شاہد ہے　　—— تک جن کو پڑھایا تھا سبق بے اُجرت

جیتے جی میں یہ ارادہ کہ ستا دیں تو بھی　　بعد مردن ہے مگر خستہ کفنی کی نیت

کون استاد پہ یہ ظلم روا رکھتا ہے　　رسم کس شہر کی ہے اور ہے کس کی عادت

عزیزانِ ستمگارِ وطن　　　　ذلت　×

اے عزیزِ دلِ اُستاد فلاں سلمکم　　تا کجے ہو جگر این نشترِ کیں و نعمت

غالب : مخاطب مفرد - صیغہ جمع کا۔ این کا لفظ روزمرۂ اُردو میں کہاں مستعمل ہے ۱۲

جو یہ احباب نہیں یہ خلش گردوں ہے　　خلعتِ بخت نے دکھایا ہے یہ روزِ نکبت

بخت یاور ہو اگر اپنے تو سبھی خویش قریب　　پاؤں سہلائیں ہمارے بہ خلوصِ نیت

اور ہے یاوریٔ بخت تو پھر ظاہر ہے　　باپ بھی سر سے اُٹھا لیتا ہے دستِ شفقت

بخت ہو جس کا مددگار تو اس میں نا جائے　　　　بھی پائیں تو دیں

مددِ بخت اگر ہو تو بہ صد آب و تاب　　عیب کو بھی تو کریں لوگ ہنر سے نسبت

ہو عرق چہرے پہ گر جوں گل شبنم آلود　　—— سے دیکھلائی دے رونقِ صورت

بس میں احباب بھی لاچار ہیں میں بھی مجبور　　بخت بگڑے ہیں کسی نے بھی یہ زر دو قوت

یاوریٔ بخت ہو اے کاش کہ یہ بخت بلند　　دوست دشمن سبھی ٹھہرائیں بعید رفعت

لاکھ تدبیر کریں کچھ بھی نہیں بن آتی　　آگے تقدیر کے کب پیش چلے ہے حکمت

آج کل طالع دوراں ہے دلا گردش میں　　وہ جگہ ڈھونڈھ کے تو بیٹھ بکنجِ خلوت

کہ جہاں نام کو بھی نام نہ ہو انساں کا　　ہم دم و ہم نفس اور کوئی نہ ہو ہم صحبت

نعش پر کوئی نہ رووے بہ جز

عازمِ ملکِ بقا ہو وے اگر طائرِ روح　　نوحہ گر کوئی بھی ہو وے نہ بجز ابرِ رحمت

آج کل دہلی

غالب [ابر　رونے سے] ہے نہ نوحہ سے ۱۲

آب بساں بھی موجود　　　　اپنی

آئینہ کیا کہ نہ ہو آب کی بھی بوند وہاں　　کہ نظر آتی ہے اُس میں بھی تو شکلِ صورت

غالب : پانی میں صورت نظر آتی ہے دریا کی بوند میں ۱۲

پستیٔ بخت تو دیکھو کہ عیاذاً باللہ　　گنجِ قاروں سے مقرون ہوئی اپنی قسمت

الاماں اے شررِ انداز بہ پیراہنِ جمع　　الحذر الحذر اے تفرقہ سازِ صحبت

بسمل تفتہ جگر ہوں —— ہمت کا　　اے سخن چین غلط کوشش خدارا رحمت

دیتے　　　　قاتل کی نہ تمنا نہ تقاضائے دیت

میں شہیدِ ستمِ نیش آتا اب ہوں کہ ہوں　　خوں بہا معاف فراموش بھلا کر دہ دیت

کوئی اتنا بھی نہیں ہے کہ کرے غم خواری　　　　مجھ کو

پائے رفتن یہ لگی وہ رہے ماندن در دل　　اپنی تقدیر پہ آپ آتی ہے کیا کیا حسرت

نوبتِ خفتہ کو تیرے کون جگاتا ہے عطا　　ہاں مگر وہ شہِ ابرار شفیعِ اُمت

نقطۂ مرکزِ ایجاد و رسولِ اکرم　　ہادیٔ راہِ ہدیٰ، حامیٔ دین و ملت

مطلعِ عزت و شرف مقطعِ تمکین و وقار　　منبعِ جود و سخا منہلِ جاہ و مکنت

مظہرِ فیضِ ابد، مصدرِ انوارِ احد　　کاشفِ سرِّ خدا، واقفِ رازِ غیبت

تختِ لولاک

کیا حقیقت ہے مری آشرِ لولاک لما　　غیر واجب نہیں ممکن تری ہرگز مدحت

غالب : صرف لولاک کا لفظ مستعمل ہے اور یہ اشارہ کافی ہے 'لما' زائد محض اور غیر مستعمل ۱۲

ہر دو مہ دونوں مرے کاسہ افگندہ ہیں　　فرش اور عرش پہ ہے تیرا اسمالِ نعمت

لبِ جاں بخش کے ہیں تیرے مسیحا بیمار　　رہ نمائی کی مگر خضر کو بھی ہے حاجت

صدقہ حسنین کے اے بادشہِ ہر دو سرا　　اپنے بیمار کی بھی اب تو روا کر حاجت

یعنی اس کشمکشِ جور و جفا سے چھوٹوں　　رہوں مشغولِ عبادت بہ خلوصِ نیت

نیک اور بد کا کسی کے مجھے کھٹکا نہ رہے　　چند روزہ کی جو ہو زیست تو ہو بے زحمت

تمام شد - اصلاح طلب

غالب : حکم بجا لایا ہوں معاف رکھیے گا۔ منشا حکت واصلاح جا بجا لکھ دیا ہے ۱۲

---

(۲) قطعات

۱۔　　هوالعليم

مرے فرزند احمد کا وہ فرزند　　دعا گو جس کا ہر فرد بشر ہے

فروری ۱۹۰۰ء

الٰہی اس کو تو رکھیو سلامت   کہ باغِ زندگانی کا ثمر ہے
(نخل)
نوید فرحت میلاد مولود   سرور سینہ شے نور نظر ہے
سرورِ خوش دل شاداں نے تاریخ   لکھی فی الفور یہ لختِ جگر ہے

۱۲۸۳ھ

(۲) سرور کے ایک پورے فارسی قطعہ کو غالب نے قلم زد کر کے اردو کا یہ قطعہ لکھ دیا ہے:

پور دہ فرزند احمد کو ملا   رحمت باری کا جو گنجینہ ہے
سال تاریخِ ولادت یوں لکھا   راحتِ جاں ہے' سروِ سینہ ہے

(۳) زمیلادِ پور گشتہ مسرت ظہور   زہے شادمانی خہے تہنیت
ترانہ بتاریخ سنجد سرور   بفرزند احمد زہے تہنیت

غالب نے اس قطعہ میں صرف ایک جگہ معمولی سی اصلاح دی ہے 'پورے' کی "یا" کو قلم زد کر کے 'پورِ مسرت ظہور' بنا دیا ہے

(۴) چوں خدا داد پور فرخ بخت   ماہ رو گفتم و نکو گفتم
ایں گل گلشن تمنا را   گل خوش رنگ و طرفہ بو گفتم
(مشکبو)
سال ایں نو گل مراد سرور   لالۂ باغِ آرزو گفتم

۱۲۸۳

غالب نے 'طرفہ بو' کی جگہ 'مشک بو' بنا کر مصراع چست کر دیا ہے۔

(۵) فرزند احمد سید عالی نسب والا حسب   اورا صفیر آمد تخلص وہ چہ اشعار صفیر
گوہر فروشاں تختہ از خجلت دکانہا ساختند   ہر جا کہ ریختہ کلک گہر بار صفیر
از بس بکلام مستمع بہ بود حلاوت شعر او   دیوان او را می تواں گفتن شکر زار صفیر
حق داد چوں او را پسر شد خلق شاداں بیشتر   نازد کہ بر فرو بشر باشد ہوادار صفیر
بلبل بجو شم زد نوا
رفتم بگل گشت چمن از فکر تاریخش سرور   زد بلبل رنگیں نوا شمشاد گلزار صفیر

۱۲۸۳ھ

'زد بلبل رنگیں نوا' کی جگہ غالب نے 'بلبل بجوشم زد نوا' کر دیا ہے

(۶) عطوفت گستر ما آں نکو گستر   فلک در بزم شورش عود مسند
کشادہ جانب او گوش دلہا   کہ تا طبعش چہ فرماید چہ گوید

غالب: اس طرح کا قافیہ ایک سے زیادہ ممنوع ہے۔

× اگر اوصاف اخلاقش نویسم   بصد طومار و صد دفتر نہ گنجد

غالب نے پورا شعر قلم زد کر دیا ہے۔

بکام دوستاں بادا الٰہی   بہ خیر و دائم و عیش مخلد
کریم بر حق و وہاب مطلق   دلا بخشید نفس از عقد مورد
احبا و تمامی اقربا را   ....
فدا اش دولت و اقبال بخشاد   پس از بخشیدن عمر موبد
بہ ناز و نعمتش پرورش باد   در آغوش بدر ہم جد و فرجد
ہمہ وقت و ہمہ دمش ہمہ جا   محمد حامی و آل محمد
زحسنِ صورت و از حسنِ سیرت   معزز باد در دہر مجدد
تواریخ ولادت بہر ایں طفل   سخن سنجاں زیک گفتند تا صد
سرور مخلص با باشد او ہم   قلم را بہر تاریخش چو قط زد
نوشتہ بادل مہر و رخ ماہ   ضیائے دیدۂ فرزند احمد

۵ ۴۰ = ۴۵   ۱۲۳۸ = ۱۲۸۳

(۷) ایضاً سنہ عیسوی

صد شکر خدائے پاک فرزند   دادہ بہ شفیق قدر دانم
زیں مژدۂ دل فزائے جاں بخش   شاداں شد و روح و ہم روانم
ہر صبح دعائے عمر و جاہش   بر ذروۂ عرش مے رسانم
تاریخش یافتم مسیحی   نور نظر و نشاط عالم

۱۸۶۶

(۸) ایضاً سن فصلی

مظہر مہر و وداد مصدر صدق و صفا   از ولد خوش نژاد گشتہ چو مسرور و شاد
سال ولادت سرور در سن فصلی ز شوق   کردہ رقم در سطور دو حد یہ باغ مراد

۱۲۷۳ف

(۹) سن سمت

ز جنابِ حق عطا شد ولدے شفیق ما را
کہ خطِ ولادتِ او شدہ دفترِ مسرت
بہ سرور گفت ہاتف کہ بجو تو سال سمت
ز دلم ندا بر آمد زہے اخترِ مسرت

۱۹۲۳ بکرمی

(۳) مکتوبِ غالب

جنابِ چودھری صاحب

میں تو خدمت بجا لایا۔ مگر اس کے صلے میں تین باتیں چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ آرہ میں مولوی سید فرزند احمد کے مکان کا پتا مجھے لکھ بھیجو تاکہ میں اُن کو تہنیت لکھوں۔ دوسرے یہ کہ تمہارا خط تم کو واپس بھیجتا ہوں۔ حضرت صاحب کی دستِ خطی عبارت کو حرف بہ حرف اپنے ہاتھ سے لکھو اور مجھ کو بھیجو تاکہ میں اُن کو تہنیت میں خط لکھوں۔ واللہ ہرگز مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔ تشویش و تشویر میں ہوں کہ کیا کروں۔ تم یہ بوجھ مجھ پر سے اُٹھا لو۔ تیسری بات یہ کہ معاملہ حضرت صاحب پر ظاہر نہ ہو اور میرے اس خط کا جواب جلد آئے۔

غالب ۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۶۶ء

یہ تحریریں مجھے خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کی توجہ سے چودھری عبدالغفور سرور کے ایک عزیز حبیب[۱] انور زبیری صاحب متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل ہوئی ہیں۔ میں اس عنایت کے لئے ان دونوں صاحبوں کا ممنون ہوں۔ اصلاحات اور مکتوبِ غالب کی نقل جو میں نے تیار کی تھی وہ اور دوسرے کاغذات آکسفورڈ میں رہ گئے ہیں۔ اس وقت یہ مضمون اس فوٹوگراف کو سامنے رکھ کر لکھ رہا ہوں جو عرش ملسیانی صاحب نے دہلی سے بھجوایا ہے۔ عکس میں بعض الفاظ واضح نہیں ہیں۔ ان کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔

لائیڈن یونیورسٹی ہالینڈ   ۳ دسمبر ۱۹۵۴ء

[۱] اسی مضمون سے متعلق چار عکس اسی شمارے میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ ان کے جملہ حقوق حبیب انور زبیری صاحب کے پاس ہیں۔ انھیں کی اجازت اور شکریے سے یہ عکس شائع کئے جا رہے ہیں۔

(ادارہ)

عبداللہ انتظام
وزیرِ خارجہ ایران

بھارت اور ایران

میرا یہ ہمیشہ سے عقیدہ رہا ہے کہ سائینس اور تکنیک سے پرے اور اقتدار و دولت سے اونچی ایک اور دنیا ہے جسے ہم دل و دماغ اور روح کی دنیا کہتے ہیں۔ دورِ جدید میں ہم اسے حقیر بھی سمجھتے ہیں اور نظر انداز بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ انسان کی حقیقی خوشی کا انحصار قلب و روح کی پاکیزگی اور نزاہت پر ہے۔ اقوامِ عالم کی صحیح روحانی مفاہمت اور ثقافتی ارتباط ہی میں اس دنیا کی نجات مضمر ہے۔ درحقیقت بین الاقوامی کشیدگی، شک اور بے اعتمادی کی موجودہ فضا میں انسان کے لئے صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے ایسے ذرائع اپنانا جس سے اس دنیا میں معقول مفاہمت، حقیقی خیرخواہی اور مستقل یکجہتی پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایران دنیا کے تمام لوگوں سے دوستی رکھنے کا خواہش مند ہے اور کسی کے خلاف معاندانہ جذبہ نہیں رکھتا۔ بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کی خاطر باہمی اعانت اور مختلف اقوام کی آزادی اور اہمیت کے لئے باہمی احترام — یہ دونوں چیزیں ہماری پالیسی کے بنیادی اصول ہیں۔ تاریخِ عالم کے سبھی طلباء بخوبی جانتے ہیں کہ بھارت اور ایران کے درمیان کس قدر قریبی تعلقات رہے ہیں۔ ہماری مشترکہ تاریخ کی داستان بہت طویل ہے اور ہم اس پوری مدت میں مخلص دوست اور شریکِ کار رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ آئندہ بھی ہم باہمی دوستی اور تعاون کا جذبہ بنائے رکھیں گے۔ ایران اور بھارت دنیا کی خیرخواہی اور میل جول کو بڑھاوا دینے میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ دونوں ملک آج اور کل کی دنیا میں اپنا فرض اور صحیح پارٹ ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتیں گے۔

سعیدہ ادیبی

مرزا غالب کی خودنوشت سوانح عمری پر ایک نظر

مرزا غالب کا سالِ وفات ۱۸۶۹ء ہے۔ اُس وقت سے آج تک نہیں معلوم کتنے زاویہ ہائے نگاہ سے مرزا کی زندگی پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ حالی، بجنوری، مہر، اکرام، لطیف، مالک رام جیسے صاحبانِ کمال اپنا اپنا کمال دکھا چکے ہیں۔ رسالہ اُردو کے شاندار تحقیقی مقالے، "نگار" کا غالب نمبر، "آج کل" کے بلند پایہ علمی مضامین اسی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ مولوی مہیش پرشاد، مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، شوکت حسین سبزواری کی مساعی جمیلہ کبھی رائگاں نہیں جا سکتیں، اسی کے ساتھ سید احتشام حسین رضوی، آل احمد سرور، اور ممتاز حسین جیسے ناقدانِ فن کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن باوجود اتنے عظیم کام کے غالب پھر بھی غالب ہیں، اور اس پر تحقیق و تنقید کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ مگر غالب پر کام کی موجودہ رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام اپنی آخری منزل میں ہے۔ اور غالب پر حرفِ آخر لکھنے کے لئے ڈاکٹر مختارالدین آرزو صاحب کا انتخاب ہوا ہے۔ آرزو صاحب کا شاندار کارنامہ علی گڑھ میگزین کا "غالب نمبر" ہے، جو بیرونی دنیا سے خراجِ شہرت حاصل کر چکا ہے۔ مگر یہ اُن کے کام کا نقشِ اوّل تھا، نقشِ ثانی "احوالِ غالب" ہے۔ جسے انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے بڑے اہتمام سے شائع کرایا ہے۔ اس مجموعے کے تمام مضامین غالب کے طالب علموں کے لئے انتہائی مفید ہیں، اور ان کے لکھنے والے بھی مشاہیر علم و فن ہیں، مگر ایک مضمون خاص طور سے توجہ کا مستحق ہے، جو "غالب کے خودنوشت حالات" کے زیرِ عنوان اظہار الحق صاحب ملک کا لکھا ہوا ہے، اس مضمون کے ساتھ مرزا غالب کے "خودنوشت حالات" کے ایک ورق کا عکس بھی ہے۔ جس پر تذکرہ مظہر العجائب میں غالب کے حالات خود غالب کے قلم سے، تحریر ہے۔ غالب کی اس "خودنوشت سوانح عمری" کا سب سے پہلے علم مولانا غلام رسول مہر کی مشہور عالم تصنیف "غالب"[1]

[1] "غالب" مولانا مہر صفحہ ۲ طبع چہارم

سے ہوا، اور اسی کے مطالعے سے یہ پتہ چلا کہ یہ تحریر رسالہ اُردو میں شائع ہو چکی ہے، کب شائع ہوئی اور ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو کہاں سے ملی۔ اس کے لئے "غالب" خاموش ہے، مگر مولانا مہر فرماتے ہیں کہ: یہ تحریر غالباً تذکرہ مظہر العجائب کے لئے لکھی گئی تھی" لیکن تذکرہ مظہر العجائب کا کسی تذکرے میں تذکرہ نہیں ملتا، اور غالب کا کوئی دوسرا سوانح نگار بھی اس پر روشنی نہیں ڈالتا۔ یہ ایک اُلجھن تھی ہی، کہ ایک تحریر کا تذکرہ "غالب" مصنفہ ڈاکٹر سید عبداللطیف مترجمہ سید معین الدین قریشی میں نظر سے گذرا، اس تذکرے میں رسالہ "اردو" کے نمبر اور جلد کا پتہ بھی تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی تحریر تھا کہ "مذکورہ بالا تحریر پر مدیر" رسالہ اردو" اورنگ آباد نے جو رائے ظاہر کی ہے وہ بھی ذیل میں درج کی جاتی ہے"[2]۔ مگر مولانا مہر اور ڈاکٹر عبداللطیف کے اقتباسات مختلف تھے۔ اس لئے اس رائے کے قائم کرنے میں بڑی دشواری ہوئی۔ اور میں یہ خیال کرتی رہی کہ شاید یہ دونوں تحریریں الگ الگ ہیں۔ "رسالہ اردو" کے مطالعے نے اس غلط فہمی کو دُور کر دیا، اور اس نے مجھے بتایا کہ تحریر ایک ہے، البتہ دونوں بزرگوں نے اپنے مفید مطلب حصّوں کو اپنی ضرورتوں کے پیشِ نظر نقل فرمایا ہے، اور تذکرہ مظہر العجائب کا ذکر ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے اس نوٹ میں موجود ہے جس کا حوالہ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے دیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی تحریر ایک واضح تحریر ہے۔ اس تحریر سے اس باب کی تمام غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں، اور غالب کے ایک طالب علم کو جن اُلجھنوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کا بھی علاج یہاں موجود ہے۔ ضرورت تھی کہ غالب کی یہ خودنوشت سوانح عمری ڈاکٹر صاحب کے نوٹ کے ساتھ شائع کر دی جاتی، مگر ملک صاحب نے اس کو غیر ضروری سمجھا، اور یہ مناسب جانا کہ سب سے پہلے یہ بتایا جائے کہ اس تحریر کی شانِ نزول

[2] "غالب" ڈاکٹر عبداللطیف ص ۱۳۰

یا ہے، اور مرزا غالب نے اپنے حالات کیوں تحریر فرمائے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر اظہار الحق صاحب ملک تحریر فرماتے ہیں کہ

" رینگن صاحب جج عدالت خفیفہ دہلی ایک با ذوق انگریز تھے جنھیں فارسی ادبیات اور تاریخ سے دلچسپی تھی۔ قیام ہندوستان کے زمانے میں انھیں فارسی شعرا کا ایک ضخیم تذکرہ مرتب کرنے کا شوق پیدا ہوا۔۔ ۔۔۔۔ رینگن تذکرہ انگریزی زبان میں لکھ رہے تھے۔ اس میں انتخاب اشعار متروک تھا۔ انھوں نے کوئی چھ سو شاعروں کا ترجمہ لکھ ڈالا تھا۔ لیکن تذکرہ نا تمام رہا، مولوی ظہیر حق نے اس میں اضافے کیے۔۔۔۔ ۔۔۔ مولوی انوار الحق، میر منشی ایجنٹی مارواڑ کا بھی اس تذکرے کی ترتیب میں ہاتھ رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔ رینگن صاحب نے تذکرے کا نام کیا رکھا تھا وہ شائع ہوا یا نہیں، اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ بظاہر وہ زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ لیکن بعد میں اضافے کے بعد اس کا نام برقیاس غالب "مظہر العجائب" رکھا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس تذکرے کے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخے کا اب تک پتہ نہیں چلا ہے اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ تذکرہ کس قدر تحقیق اور دقتِ نظر کے ساتھ لکھا گیا تھا، اور اس کی نوعیت کیا تھی اور کن کن شعرا کے ترجمے اس میں درج تھے۔ لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ اس میں مرزا غالب کے حالات بھی درج کئے گئے تھے اور سچ ہے کہ اگر ان کا ترجمہ درج نہ ہوتا تو یہ بات باعثِ حیرت ہوتی۔"[۱]

ملک صاحب کی مندرجہ بالا تحریر کی روشنی میں متعدد سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ان معلومات کا ماخذ کیا ہے۔ میں دوسرے سوالات قایم کرنے کی بجائے یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ ملک صاحب کے اس تحقیقی مضمون میں اس کے ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ رینگن صاحب نے شعرا ہند کا انگریزی میں تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا۔ اس میں مشاہیر شعراء کے حالات تھے۔ لیکن ان حالات کی کیفیت یہ تھی کہ ـــــــ "صرف شاعر اور اس کے استاد کا نام اور شاعر کے مسکن و وطن کا نام مع تخلص درج ہوگا۔"[۲]

---

[۱] "احوالِ غالب" مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین آرزو صاحب ص ۲۲ - ۲۵

[۲] "اردوئے معلٰی" خط بنام تفتہ ص ۷۷ - ۹ - دسمبر ۱۸۶۴ء

مرزا غالب کے اس خط میں لفظ "صرف" قابلِ غور ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر سو ڈیڑھ سو شاعروں کا حال مسٹر رینگن کو لکھ کر بھیج دیا تھا۔ رینگن صاحب نے وہ حالات کیا کئے اور اس تذکرے کا کیا ہوا، اس کے متعلق مرزا غالب مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔

" مرزا تفتہ کیا فرماتے ہو، کیسے رینگن صاحب کہاں رینگن صاحب پنجشنبہ کے دن ۱۹ جنوری سنہ حال کو وہ پنجاب کو گئے۔ ملتان یا پشاور کے ضلعے میں کہیں کے حاکم ہوئے ہیں، میں اپنی ناتوانی کے سبب ان کی ملاقات تو دیکھو نہیں گیا۔"[۳]

تو اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رینگن صاحب نے تذکرے کی تکمیل نہیں فرمائی۔ میں اس حقیقت پر روشنی ڈالنے سے قبل یہ ضروری سمجھتی ہوں کہ یہ بتا دوں کہ رینگن صاحب کون تھے، تو اس کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ملک صاحب نے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے مرزا غالب کے جس خط کا اقتباس پیش فرمایا ہے۔ اسی خط میں مرزا صاحب فرماتے ہیں ـــــــ "ڈکرو ورصاحب ڈپٹی کلکٹر چھ مہینے کی رخصت لے کر پہاڑ پر گئے، ان کی جگہ رینگن صاحب مقرر ہوئے، ان سے ناچار ملنا پڑا۔ وہ تذکرہ شعرا ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں۔"[۴] یہ خط مرزا غالب نے ۹ - دسمبر ۱۸۶۴ء کو تحریر فرمایا۔ اس کے دو مہینے کے بعد ۱۲ - فروری ۱۸۶۵ء کو یہ تحریر فرماتے ہیں کہ ـــــــ "۱۹ - جنوری سنہ حال کو وہ پنجاب کو گئے۔" لیجئے قصہ تمام ہوا، اور اس خط کے اقتباس نے یہ بتا دیا کہ وہ عارضی طور پر ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر مامور ہوئے تھے، اور مرزا غالب کو ناچار ملنا پڑا تھا، مگر اس ملاقات کی مدت اتنی مختصر تھی کہ دسمبر ۱۸۶۴ء میں مرزا تفتہ کو تذکرہ لکھنے کی خوش خبری سناتے ہیں، اور ۱۲ - فروری ۱۸۶۵ء کو ان کی روانگی کی خبر دیدیتے ہیں، اور خود ملاقات تو دیکھو کو بھی نہیں جا سکے۔

اس کے بعد مرزا غالب کے کسی دوسرے خط میں اس تذکرے کا تذکرہ نظر نہیں آتا۔ پھر یہ خود نوشت حالات کیسے ہیں؟ یقیناً یہ سوال اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ مگر جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کر چکی ہوں کہ اس خود نوشت سوانح عمری پر ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی ایک تحریر شائع ہو چکی ہے، وہ

---

[۳] "اردوئے معلٰی" خط بنام تفتہ ص ۷۷ - ۹ - دسمبر ۱۸۶۴ء

[۴] "اردوئے معلٰی" خط بنام تفتہ ص ۷۷ - ۹ - دسمبر ۱۸۶۴ء

تحریر واضح تحریر ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ

"جب بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں مرزا غالب کے قدیم کلام کا نسخہ انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع کیا گیا تھا تو اس کی ترتیب وغیرہ کا کام ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس کے لئے بہت سی نئی نئی چیزیں جمع کی گئی تھیں، منجملہ ان کے ایک عجیب چیز خود مرزا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اپنے حالات تھے جو اُنھوں نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے۔ یہ ورق کہیں سے سیّد افتخار عالم مرحوم کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اور انھوں نے اپنی عنایت سے مرحوم کو بھیج دیا تھا۔ اگرچہ یہ حالات انھوں نے اس طرح لکھے ہیں جیسے کوئی غیر شخص لکھتا ہے۔ لیکن عبارت کا ڈھنگ صاف بتا رہا ہے کہ اس پردے میں خود مرزا نوشہ باتیں کر رہے ہیں۔ دوسرے ایک دو باتیں جو وہ کہہ گئے ہیں وہ مرزا کے دل کی ہیں۔ وہ دوسرا شخص کیسے لکھ سکتا تھا۔ تیسرے خط اُن کا ہے۔ میرے پاس اُن کے قلمی خط ہیں، ملا کر جو دیکھا تو عین وہی شان پائی۔"

ان حالات کے پڑھنے سے کم سے کم ایک بات تو پکّی ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اُن کے کلام اور رقعات میں بھی جا بجا ان کا ذکر آچکا ہے، اور ایک صاحب نے جو مرزا صاحب کے حُبِّ وطن اور حُبِّ قوم کی نسبت (جدید خیالات کی رو سے) جو حُسنِ ظن قایم کیا تھا، اس کی تردید خود مرزا صاحب کے الفاظ سے ہو جاتی ہے۔

سیّد افتخار عالم مرحوم نے ان حالات کے ساتھ 'نیرِ راجستان' جلد ۲ نمبر ۱۵ کا بھی ایک مطبوعہ ورق بھیجا تھا جس میں تذکرہ مظہر العجائب کا اشتہار شائع ہوا تھا، اغلب ہے کہ یہ حالات مرزا صاحب نے اسی تذکرے کے لئے تحریر کئے ہوں"[1]

ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی تحریر سے بہت سے پردے نگاہوں کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں اور چند باتیں خاص طور سے سامنے آتی ہیں۔ اوّل یہ حالات مرزا صاحب نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے، دوسرے یہ ورق سیّد افتخار عالم مارہروی مرحوم کو کہیں سے ہاتھ لگ گیا تھا، انھوں نے وہ بجنوری مرحوم کو بھیج دیا تھا۔ تیسرے اس تحریر کے ساتھ "نیرِ راجستان" جلد ۲ نمبر ۱۵ کا بھی ایک مطبوعہ ورق تھا، جس میں تذکرہ مظہر العجائب کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ کام کی بات جو میرے نقطۂ نظر سے ہے وہ یہ ہے کہ "یہ ورق سیّد افتخار عالم مرحوم نے بجنوری کو بھیج دیا تھا" اگر یہ بات یاد رکھی جائے اور اس کو نظرانداز نہ کیا جائے" تو یہ حالات مرزا غالب نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے" اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ پھر بھی "نیرِ راجستان" کی ضرورت پیش آتی ہے کہ جس میں تذکرہ "مظہر العجائب" کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ بڑی تلاش و جستجو کے بعد یہ نمبر دیکھنے کو ملا۔ یہ اخبار مطبع خاور نور سے پورے شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے صفحہ ۱۱ پر ایک اشتہار زیرِ عنوان اشتہار تذکرہ مظہر العجائب" شائع ہوا ہے جو درج ذیل ہے۔

"اشتہار تذکرہ مظہر العجائب"

"خوش مذاقان مائدہ سخن اور شیریں کامان علم و فن پر واضح و لائح ہو کہ عرصہ چند سال سے ایک تذکرۃ الشعراء فارسی دہلی میں تالیف ہو رہا ہے آج تک ایسا تذکرہ فراہم نہیں ہوا ہے۔ مصنّف اس کتاب کے جس کو ایک دفتر کہنا چاہیئے عالی مرتبت معالی منقبت سند المحققین طراز المدققین بہ جمل جلیل عالم نبیل، شاعر کامل، ثانی سحبان وائل برگزیدہ ایزد مطلق مولوی مظہر حق صاحب خلف الرشید و فرزند سعید یگانہ ہمہ داں، فرزند دوراں، جبین قادر کلامی شیوہ بیانی، زندہ کن انوری خاقانی، گزیدہ خداوند اقلیم دہاندانی مقبول بارگاہ لم یزلی مولوی محمد ظہور علی صاحب ظلہ العالی المتخلص بہ ظہور ہیں۔ اگرچہ یہ تاریخ ۱۲۸۱ھ میں ختم ہو چکی تھی اور تقاریظ و تواریخ جو نجم الدولہ بہادر و مولانائے نظامی و حضرت ظہور وغیرہم نے لکھی ہیں، ان سے بھی ۱۲۸۱ ہجری مفہوم ہوتے ہیں۔ مگر اب یہ تذکرہ دوبارہ ترقیم ہوا اور قریب دو ہزار شاعروں کے ترجمے سے مزیّن ہوا، اور اشعار کی تو کچھ حد ہی نہیں۔ حالات جو اس میں لکھے ہیں بڑی تلاش و تجسس سے بہت ہی صحیح، ایک سو جلد کتب تواریخ سے جمع کی، جن کی فہرست اکثر اخباروں میں چھپ چکی، اور جناب مسٹر ٹیگن صاحب بہادر جج سابق دہلی کے اوّل اس کے بانی ہوئے، اور چھ سو شاعروں کا ترجمہ بزبان انگریزی انھوں نے فرمایا، اور خبر ہے ولایت میں چھپا۔ سوائے ازیں جناب صاحب کمشنر بہادر

[1] رسالہ اردو اورنگ آباد (دکن) ماہ جولائی ۱۹۲۸ء جلد ۸ نمبر ۳۱ ص ۴۲۸

دہلی اور نواب محمد ضیاء الدین خاں بہادر رئیس لوہارو و نواب اسد اللہ خاں بہادر و دیگر روٴسا نے عنایت فرما کر اپنے کتب سے بہت مدد دی، اور نیز فضائل و کمالات دستگاہ، گوہر درج شرافت، اختر برج نجابت مولانا مولوی محمد انوار الحق صاحب میر منشی ایجنٹی ماروا ڑ نے چار سو سے زیادہ شعرا کا حال اضافہ کیا، اور جناب منشی درگا پرشاد صاحب مدرس اوّل ریاضی تعلیم المعلمین دہلی نے بھی ہر ایک طرح کی مدد دی۔ لیکن تا ایں ہمہ جیسا کہ چاہیئے شعرا بمبئی و کلکتہ و ممالک وسط ہند کے کلام فارسی اور حالات سے کچھ آگہی نہ ہوئی۔ لہٰذا یہ اشتہار دیا جاتا ہے کہ جمیع شعراء فارسی اپنا حال مفصل مع تقریظ و تاریخ و اشعار خدمت میں جناب موٴلف صاحب کے بھیج دیں، اور جن صاحبوں کو خریداری منظور ہو تو وہ درخواست اپنی تعدادی تین روپیہ علاوہ محصول ڈاک خدمت میں جناب ممدوح کے دہلی محلہ بیرام خاں میں بذریعہ خط پیڈ ارسال کریں، اور اہل مطابع اس اشتہار کو اپنے اپنے اخبار میں درج فرمائیں۔ الدال علی الخیر کفاعلہ والسلام۔ فقطؔ[1]

اس اشتہار سے اس تذکرے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ملک صاحب کی تحریر کا ماخذ کیا ہے۔ کیونکہ مقالے کی ابتدائی سطریں بتا رہی ہیں کہ اس کے لکھتے وقت "نیرِ راجستان" کا یہ شمارہ سامنے تھا۔ مگر ملک صاحب کو اشتہار سے مضمون اخذ کرتے وقت یہ خیال نہیں رہا کہ "تذکرہ منظہر العجائب" کے اصل مرتب مولانا مظہر حق صاحب تھے۔ لیکن اس کے بانی مسٹر رشگن صاحب بہادر تھے، اور چند شاعروں کا ترجمہ بزبان انگریزی انھوں نے فرمایا، اور خبر ہے کہ ولایت میں چھپا، لیکن اس سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس تذکرے میں مرزا غالب کے جو حالات دیے گئے تھے وہ یہی حالات ہیں کہ جو "احوالِ غالب" میں شائع کیے گئے ہیں۔ پھر بھی ملک صاحب کے اعتماد کا یہ حال ہے کہ —

"تذکرہ منظہر العجائب موجود نہ سہی لیکن اس میں مرزا کا جو ترجمہ درج کیا گیا تھا وہ اتفاق سے ہمارے سامنے موجود ہے اور یقین ہے کہ یہ ترجمہ خود غالب کے قلم کا لکھا ہوا ہے"[2]

مگر ڈاکٹر عبد الحق صاحب کامل احتیاط کے ساتھ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"اغلب ہے کہ یہ حالات مرزا صاحب نے اسی تذکرے کے لئے تحریر کئے ہوں"

اور یہی بات صحیح بھی ہے۔ گمان غالب کو یقین کا درجہ دینے کے لئے جن باتوں کی ضرورت ہے وہ باتیں ملک صاحب کے مقالے میں مفقود ہیں، اور اس مقالے سے "غالب" کے طالب علموں کی معلومات میں کسی قسم کا اضافہ بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس اغلب کو یقین کا درجہ دینے کے بعد "اغلب" کی بھی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ میں اس اغلب کی حیثیت کو ختم نہیں کرنا چاہتی۔ مگر اس یقین کے متعلق میرا یقین ہے کہ اس کی بنیاد غلط فہمی پر ہے، اور اس غلط فہمی کا سبب اردوئے معلّٰی میں تفتہ کے نام غالب کے خطوط میں رشگن کا نام اور مرزا غالب کے خود نوشت حالات کی اشاعت کے موقعے پر ڈاکٹر عبد الحق صاحب کا یہ ارشاد کہ یہ (حالات) کسی تذکرے نویس کی فرمائش پر لکھے تھے، اسی کے ساتھ اس تذکرے میں دربار شاہی میں باریابی اور ذاتی اعزاز کا بھی ذکر ہے، اور یہ باتیں ایسی ہیں کہ جس کی بنیاد پر ہر شخص غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ مگر دربار میں باریابی اور ذاتی اعزاز کے لئے جو انداز اختیار کیا گیا ہے اُس کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مرزا فرماتے ہیں:

"گورنمنٹ میں اس کی بڑی عزّت ہے۔ اشرفیوں کے عوض قصیدہ مدح نذر دیتا ہے، اور سات پارچہ جیغہ سرپیچ موتیوں کے مالے خلعت پاتا ہے۔ اب کے بار جو لاہور میں لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق سابق کے دربار داروں کی فہرست کے صاحب کمشنر بہادر جھانسی کہ در ینولا قایم مقام صاحب کمشنر دہلی بھی ہیں، مثلاً اور رئیسوں کے اور رئیس زادوں کے اس کو بھی خط لکھا۔ بے چارہ بسبب تہی کیسی اور بے مقدرتی کے لاہور نہ جا سکا، مجھ سے کہتا تھا کہ ستر برس کا آدمی کانوں سے بہرا اور اکثر بیمار رہتا ہوں۔ لیکن اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں ان عوارض کو نہ مانتا، اور بے شک لارڈ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا، غرض آخر عمر میں یہ ایک داغ حسرت رہا۔ حق بات کو ظاہر نہ کرنا خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے"[3]

---

[1] نیرِ راجستھان جلد ۳ نمبر ۱۵ ص ۱۱ و ۱۲

[2] احوالِ غالب ص ۳۷

[3] "احوالِ غالب" ص ۴۲

مندرجہ بالا عبارت میں ایک بات خاص طور سے قابلِ غور ہے۔ وہ بات لاہور میں لارڈ صاحب کے دربار کا ذکر اور بسبب بتی دستی اور بے مقدوری نہ شریک ہونے کا افسوس ہے۔ مگر اس تحریر کے خاتمے پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے کہ جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ اس کا زمانۂ تحریر کیا ہے۔ ملک صاحب اس حقیقت کے پیش نظر فرماتے ہیں کہ

"اس تحریر پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ لیکن داخلی شہادت اس بات کی موید ہے کہ اس کا زمانۂ تحریر ۱۸۶۳ء کے لگ بھگ ہوگا۔"[1]

اور وہ داخلی شہادت غالباً تفتہ کے نام مرزا غالب کے خطوط ہیں اسی لئے زمانے کے تعین میں ۱۸۶۳ء کے لگ بھگ تحریر کیا گیا ہے۔ لیکن میرے خیال سے مرزا غالب کی یہ "خودنوشت سوانح عمری" کسی ایسی داخلی شہادت کی محتاج نہیں ہے کہ جس میں شک نمایاں ہو، بلکہ یہ تحریر خود اپنے زمانے کے تعین کے لئے ایک مستقل شہادت ہے اور وہ دربار لاہور کا تذکرہ اور پھر اس کے ساتھ اپنی عمر کی قید۔ تاریخ کے طالبعلم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہ دربار اکتوبر ۱۸۶۴ء میں لارڈ لارنس کے زمانے میں ہوا تھا[2]۔ (اس دربار کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ لارڈ لارنس نے دربار کے شرکا کو ہندستانی زبان میں خطاب کیا تھا[3]۔ اس خبر کو سن کر غالب کے دل پر کیا گذری ہوگی۔ یقیناً یہ ایک ایسا داغِ حسرت ہوگا کہ جس پر جس قدر بھی تاسف کیا جائے وہ کم ہے) اور یہ تحریر اس دربار کے بعد کی ہے، اور عمر کے تعین سے پتہ چلتا ہے ۱۸۶۵ء میں لکھی گئی ہے اور قمری حساب سے مرزا کی عمر ۱۸۶۵ء میں ستر سال کی ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر میں اس "خودنوشت حالات" کو "تذکرہ منظہر العجائب" کے لئے تسلیم نہیں کرتی، دوسرے میرے سامنے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی تحریر کا وہ حصہ بھی ہے کہ "یہ ورق کہیں سے سید افتخار عالم مرحوم کے ہاتھ لگ گیا تھا اور انھوں نے اپنی عنایت سے بجنوری مرحوم کو بھیج دیا تھا" اس کی روشنی میں بھی میرا خیال یہی ہے کہ یہ تحریر "تذکرہ منظہر العجائب" کے علاوہ کوئی دوسری تحریر ہے۔ تاویلات کی دنیا میں جانے والے ان باتوں کو قیاسی باتیں کہہ کر تاویلات میں پھنس جائیں گے تو اس باب میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور میں بقول مرزا غالب حق بات کو نہ ظاہر کرنا خداپرستی اور حق پرستی کے خلاف سمجھتی ہوں۔ اس لئے جو دلائل ہیں اُن کو بھی پیش کر دینا ضروری سمجھتی ہوں۔

وہ دلائل کیا ہیں؟

تو میں کسی منطقیانہ یا فلسفیانہ بحث میں نہیں جانا چاہتی، بلکہ ایک ایسا صاف اور واضح ثبوت پیش کرنا چاہتی ہوں جو اس باب کو بند کرنے کے لئے کافی ہے۔ وہ ثبوت مولانا احتشام الدین صاحب دہلوی کی ایک تحریر ہے، اس تحریر میں میرے مدعا کے علاوہ دوسرے اور بھی اہم مباحث ہیں مگر اس کی اشاعت بھی دلچسپی سے خالی نہیں، اس لئے وہ پوری تحریر حاضر خدمت ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"یہ غلط ہے کہ بجنوری نے یہ دیباچہ غالب کے نسخے دیوان معدوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا۔ نہیں بلکہ دستیاب ہونے پر اُن کو مکمل کلام غالب کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور یہ مقدمہ اس ارادہ کی پیش میں لکھا گیا۔ اس کے لکھنے کے بعد وہ ایک بار علی گڈھ آئے اور راقم کے پاس دو ایک روز مہمان رہے۔ یہ مقدمہ پنسل سے لکھا ہوا کٹا پھٹا ان کے پاس موجود تھا، اور انھوں نے خود اپنی زبان سے اس کو مجھے پڑھ کر سنایا۔ اور طباعت کے متعلق مشورے کئے، ارادہ ظاہر کیا کہ اس کے ساتھ غالب کا ایک فوٹو اور اُن کے خط خاص کا نمونہ بھی دینا چاہئے۔ مگر اس کی بہم رسانی کے لئے متردد تھے۔ میرے پاس وہ مختصر تذکرہ خود غالب کے قلم کا لکھا ہوا موجود تھا، جو ان سے مسٹر ہیملٹن[1] ڈپٹی کمشنر دہلی کے تذکرہ شعراء فارسی کے لئے میرے والد ماجد[2] مرحوم نے لکھوایا تھا۔ وہ میں نے بجنوری مرحوم کو دیا مگر ان کے انتقال کے بعد جب یہ نسخہ بالآخر شائع ہوا تو نہ اس کے ساتھ مرزا کی تصویر تھی اور نہ اُن کے خط کا وہ نمونہ۔ مسٹر شعیب قریشی کی وساطت سے

---

[1] "احوالِ غالب" ص ۲۷

[2] ملاحظہ فرمائیے "لارڈ لارنس" باسورتھ اسمتھ جلد ۲ ص ۲۱۴

[3] ملاحظہ فرمائیے "انڈیا انڈر گراونڈ" کے۔ پی۔ باسو۔ حالی دربار لاہور

[1] نام کے تحریر کرنے میں مولانا احتشام الدین صاحب کو سہو ہو گیا ہے۔ تذکرہ منظہر العجائب کے اشتہار میں اور تفتہ کے نام مرزا غالب کے خطوط میں مسٹر ہیملٹن نہیں بلکہ مسٹر ٹیلنگن ہے، اس لئے مسٹر ٹیلنگن ہی صحیح ہے۔ غالباً یہ سہو دتی سوسائٹی میں مسٹر ہیملٹن صاحب کی دلچسپیوں اور مرزا غالب سے حسن عقیدت کے پیش نظر ہو گیا ہو۔ [2] یعنی مولانا انوار الحق صاحب میر منشی ایجنسی ماروار جنھوں نے تذکرہ منظہر العجائب میں چار سو سے زیادہ شعرا کے حال کا اضافہ فرمایا۔

اس کو بہت تلاش بھی کیا کہ وہ مرحوم کے ورثاء کے واقف اور بر وقت وفات بھوپال میں موجود بھی تھے، مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر حیدرآباد آکر معلوم ہوا کہ مولوی عبدالحق صاحب (انجمن ترقی اردو) کے پاس وہ "احوال غالبؔ" خود اُن کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے۔ الحمدللہ کہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ مگر انتظار ہے کہ کب شائع ہوتا ہے"! ؁ ۱۱ محمد احتشام الدین دہلوی[1]

مولانا احتشام الدین صاحب دہلوی کے اس بیان سے خود نوشت احوال غالب پر پوری روشنی پڑ جاتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ۱۱ مئی ۱۹۳۱ء تک وہ حالات شائع نہیں ہوئے تھے۔ پھر یہ حالات خود مولانا احتشام الدین صاحب نے ڈاکٹر بجنوری کو دئے تھے۔ اور جو خود نوشت حالات ماہ جولائی ۱۹۲۸ء کے "رسالہ اردو" (اورنگ آباد دکن) میں شائع ہوئے تھے وہ اختر عالم صاحب مارہروی مرحوم کے دئے ہوئے تھے۔ احوالِ غالب میں اسی کا عکس ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر اس خود نوشت سوانح عمری کو "تذکرہ مظہر العجائب" کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ اُمید ہے کہ اظہار الحق صاحب ملک ان گذارشات پر غور فرمائیں گے۔

اس مقالے کی تیاری کے لئے اپنے مخدوم سیّد احتشام حسین صاحب (لکھنؤ یونی ورسٹی) کی شکرگذار ہوں جن کی شفقتِ بزرگانہ کی بدولت اس نسخۂ حمیدیہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا جس پر مولوی احتشام الدین دہلوی نے خود اپنے قلم سے متذکرہ بالا عبارت لکھی ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری طالب علمانہ معلومات کیا۔

[1] مقدمۂ نسخۂ حمیدیہ ص ۔ ۲، تحریر قلمی ۔ مملوکہ سیّد احتشام حسین صاحب رضوی

درۂ بانہال میں نئی سُرنگ

موسم سرما کے تین مہینے برف باری کے باعث درہ بانہال کے راستے پر لاریوں اور موٹروں وغیرہ کے ذریعے آمد و رفت کا جاری رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ پنجال کے کوہستانی سلسلے میں ۹ ہزار فٹ کی بلندی پر تعمیر شدہ موجودہ سرنگ کے ذریعے بھی سال میں لگ بھگ نو مہینے آمد و رفت جاری رہ سکتی ہے، اور باقی کے تین مہینے پیادہ آمد و رفت کے لئے بھی بالکل غیر یقینی ثابت ہوتے ہیں۔ ان مشکلات پر قابو پانے کے لئے ہی مقابلتاً کم بلندی پر ایک اور سرنگ تعمیر کرنے کے منصوبے پر عمل شروع کیا گیا ہے۔ اس سرنگ کا کام گذشتہ دو ماہ سے جاری ہے۔ اور تقریباً تین سو کشمیری برف باری کا مقابلہ کرتے ہوئے بیلچے اور کلہاڑے اُٹھائے ہوئے مصروف عمل ہیں۔ چٹانوں کو گرانے کے لئے مشینیں بھی استعمال کی جا رہی ہیں۔ توقع ہے کہ چٹانوں کی صفائی کا کام مکمل ہونے کے بعد زمین میں سوراخ کرنے کا کام دکن کی طرف ماہ دسمبر کے آخر میں اور اُتر کی طرف وسط دسمبر میں شروع ہو جائے گا۔ اگرچہ اس وقت اس منصوبے کی تکمیل کے لئے صرف تین سو مزدور کام کر رہے ہیں لیکن جب پوری تعداد میں مشینیں سُرنگ کھودنے کے کام میں لگ جائیں گی تو مزدوروں کی تعداد تقریباً پانچ سو پہنچ جائے گی۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لئے درکار تمام بھاری مشینیں نومبر کے آخر تک جرمنی سے چل پڑی ہیں۔ بہت سی مطلوبہ بھاری مشینری پہلے بندرگاہ میں پہونچ چکی ہے۔

اس اسکیم کے سلسلے میں آزمائشی سُرنگ کو ۲۔ اگست ۱۹۵۱ء سے ڈیڑھ سال کے اندر اندر پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا پروگرام مُرتّب کیا گیا ہے۔ یہ ابتدائی منزل طے ہونے کے بعد زیادہ بڑی سُرنگ تیار کی جائے گی۔ ہمارے ملک میں اب تک کبھی بھی اتنی لمبی سُرنگ تعمیر کرنے کے منصوبے پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس سرنگ کا شمار دنیا کی بارہ طویل سرنگوں میں ہوگا۔ زیر تعمیر سرنگ موجودہ سرنگ سے چودہ گنا زیادہ لمبی ہوگی۔ اور اس سے سفر کے دشوار گذار پہاڑی راستے میں لگ بھگ ۱۰ میل کی کمی واقع ہوگی۔ نئی سرنگ ۷۲۰۰ فٹ کی بلندی پر کھودی جا رہی ہے۔ جبکہ موجودہ سرنگ جو سردیوں میں برف سے اٹ جاتی ہے۔ ۸۹۸۵ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

جرمنی کی جس انجینئرنگ فرم کو بھارت کی ایک کمپنی سے ملاکر اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اُسے اس میدان میں ۷۰ سال کا تجربہ ہے۔ جرمنی میں بویرین ایلپس کے پہاڑی علاقے میں اسی فرم نے تقریباً چار میل لمبی سرنگ تیار کی ہے۔ ابتدائی نوعیت کی موجودہ سرنگ کی تعمیر کا ٹھیکہ ۲۷ لاکھ تیس ہزار روپے پر دیا گیا ہے۔ لیکن تمام اسکیم کی تکمیل پر تقریباً تین کروڑ روپے صرف ہوں گے۔

مِرزا غالِب کا ایک گُمنام شاگرد

اُردو ئے معلّٰی کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسے
.و اصحاب تھے جن کا مرزا غالب سے کافی ربط و ضبط تھا منجملہ ان کے ایک
ہرگوبند سہائے صاحب المتخلص بہ نشاط تھے جن کو غالب کے شاگرد ہونے
ی شرف حاصل تھا۔ ان کے حالات و کلام سے بہت کم اشخاص واقف ہیں،
بکہ آپ نہایت بارسوخ لوگوں میں سے ایک تھے جیسا خود مرزا کے خطوط
جو بابو صاحب موصوف کے نام تحریر ہیں ظاہر ہے۔ جناب نشاط کے
ب مرحوم کے شاگرد ہونے کا اقرار خود ان کی زبانی موجود ہے ۱۸۶۹ء
ایک مشاعرہ بمقام آگرہ منعقد ہوا تھا۔ اُس میں التزام یہ تھا کہ ہر شاعر
مختصر حالات، تعداد تصانیف وغیرہ لکھ کر منتظم مشاعرہ جناب محمد
علی پریشاں کو روانہ کرے۔ جیسا کہ ۱۹۵۸ء کے مشاعرۂ نمائش علی گڑھ
یا گیا۔ آگرے کا مشاعرہ، علی گڑھ کے مشاعرے کی طرح ایک کتابی صورت
شائع ہوا جس کا نام تذکرۂ شعر و سخن رکھا گیا۔

حضرت نشاط ایک نغز گو اور بلند خیال شاعر تھے فصاحت آپ کے
کا خاص جوہر ہے، جو شروع سے آخر تک آپ کے کلام میں پائی جاتی
۔ آپ کی ایک کتاب نشاط الحیا سبین کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کو
ر آپ کی قادر الکلامی اور حسابی واقفیت پر انگشت بدنداں ہونا
ہے۔ اس میں نام و اقسام اعداد، اشکالِ اعداد، پیمانے، گُر، قاعدہ
جمع، تفریق، ضرب و تقسیم مفرد و مرکّب سے لے کر قاعدۂ راس المال
Stoc تک نظم کر ڈالا ہے۔ اس کے علاوہ بیانِ مربع و مکعب
Squares & Cu تناسب سلسلہ جمع، تفریق، ضرب و تقسیم
Arithmetical & Geometrical Progressions
Permutations & Combination - بدلی ترتیب و اجتماع
کے قاعدے سب کے سب منظوم درج ہیں۔ انیسویں صدی کے

وسط میں جب کہ برٹش گورنمنٹ کو علی گڑھ میں قدم رکھے ہوئے تقریباً ۵۰ سال ہو ئے تھے، وہاں کے کسی باشندے کا اتنی واقفیت رکھنا اس غیر تسلط زمانے میں Ph.D کی ڈگری سے کسی طرح کم نہ سمجھنا چاہیئے۔

دوسرا منظوم کلام آپ کا دیوان ہے جس کا نام دیوانِ نشاط الاحباب" رکھا تھا یہ ۸۸ اُردو و فارسی غزلوں کا ردیف وار مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ ۴۵ رُباعیات بھی ردیف وار درج ہیں، اور ۸ دیگر نظمیں ہیں جو شکریہ و تواریخ بحساب ابجد پر مشتمل ہیں۔ اس دیوان میں دو قصیدے بھی ہیں جس میں ایک فارسی کا ہے۔ آپ نے ان دونوں کی سُرخیوں میں خوشامدانہ الفاظ کا استعمال بالکل نہیں کیا ہے۔ ایک میں "قصیدہ در مدح جناب ڈیوک آف ایڈنبرا" وغیرہ لکھا ہے اور دوسرے میں "بمخاطب بودن جناب فلاں کے سی۔ ایس۔ آئی" استعمال کیا ہے۔ فارسی قصیدہ ۱۳۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے نمونتہً شروع کے دو اشعار پیش کرتا ہوں۔

اے برتر از قیاسِ ملائک مکانِ تو	تو سایۂ خدا و فلک سائبانِ تو
بخت جوان چنیں بکہ بخشید حق بتو	سوگند پیر چرخ بہ بختِ جوانِ تو

اس میں سوگند کا لفظ قابلِ ملاحظہ ہے۔ مرزا غالب نے بھی ہندی اور انگریزی الفاظ اپنے اُردو نیز فارسی اشعار میں استعمال کئے ہیں۔

سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے — غالب

آرے نہ چک بود نہ تمسک نہ پر کہ ہست	لے دستخط نہ مہر نہ نام و نشانِ اوست	
مضمونِ شعر نوٹ بود فی زمانِنا	یعنی بدست ہر کہ بیفتاد از آن اوست	غالب

آپ کے دیوان کی پہلی غزل کا مطلع اور زیبِ مطلع ملاحظہ ہو۔

---

۱ Cheque

شرک سے دل جب کہ جدا ہو گیا   سنگ سے بُت ، بُت سے خدا ہو گیا
پردۂ تحقیق جو وا ہو گیا   دل ہی مرا نورِ خدا ہو گیا

تیسری غزل کی بحر دیکھئے۔

ذکرِ خیر اوروں کا اور ہے گلا اپنا   بات پا گئے ، ہم بھی گم ہے مدعا اپنا
ماتیِ صحت ہوں مرگ ہے شفا اپنی   چارہ ساز بے پروا اور دلا دوا اپنا

اور دیکھیے۔

شب بعالم رویا جب میں ناتواں رویا   صبح خوئے خجلت سے منہ رقیب نے دھویا

آپ کی نویں غزل کا قافیہ تُو ، آبجو ، کُو بکُو ہے اس میں آپ نے دکھیو ، بھی باندھا ہے جس کا استعمال اس وقت جائز تھا۔

میں بہ غفلت ہمیشہ دور رہا   اور وہ پاس سے کبھو نہ گیا

اس کے ساتھ ہی مومن کے مشہور شعر کا مقابلہ کیجیے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ایک مسلسل غزل میں ۳۴ اشعار ہیں۔ اس میں پہلے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا ہیچ نہیں ہے۔ اس غزل کا پہلا شعر ہے۔

تم کہتے ہو دنیا کو یہ ہے دارِ فنا ہیچ   تسلیم نہیں ہم کو ، نہیں اس کی بقا ہیچ

۱۹ اشعار ختم کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

سچے نے بنایا ہے اسے جھوٹ ہو کیسے   تم کہتے رہو یہ کہ یہ ہے دارِ فنا ہیچ

اس کے بعد ۲۳ اشعار کی غزل اسی ردیف و قافیہ میں ہے۔ جس میں ہر شے کی بے ثباتی ظاہر کی ہے۔

جب حشر کا دن آئے گا ہو جائے گا ظاہر   جو خلق ہوا ہیچ ہے اور خود ہے قضا ہیچ

ایک غزل طرحی ۴۵ اشعار کی رقم ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشاعرہ ہر پندرھویں روز ہوتا تھا ، اور اس میں حضرت تفتہ بھی شریک ہوتے تھے۔

لطف تازہ مشاعرے میں آج   حضرتِ تفتہ کی بدولت ہے
پندرہ دن کے بعد ہے یہ دید   اتنی صحبت ہی بس غنیمت ہے

ہندو تھے ، بسنت اور ہولی پر بھی طبع آزمائی کیوں نہ کرتے۔

دعا یہی ہے ہماری کہ دہر میں جب تک   شگونِ سالِ نوی پر ہے شمارِ بسنت
نشاط مند رہو تم جہاں میں ہر گوبند   نشاط سے رہے جب تک کہ یادگارِ بسنت

زیب رنگ رُخِ خوباں ہے گلال   بحث اس رنگ پہ
اب کے ہولی میں نہیں گے مئے ناب   یہ قسم بہ لبِ ساغر

آپ کی منکسر المزاجی اس رباعی سے کما حقہ ظاہر ہے۔

میں سلسلۂ خرد کا پابند نہیں   فی الواقع ہوں نادان خ
پر آپ نہ لکھئے مجھ کو ایسے الفاظ   میں بندۂ عاصی ہوں خدا

دبیر کی یہ رباعی زبان زدِ خاص و عام ہے۔

دنیا عجب سرائے فانی دیکھی   ہر چیز یہاں کی آنی جانی د
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا   جو جاکے نہ آئے وہ جوانی د

حضرت نشاط کا چلبلا پن دیکھیے۔

گر چاہِ ذقن کی تہ میں پانی آجائے   اور اس میں ذرا ذرا د
پھر سیر ہو اس سے کثرت موہائے سپید   ممکن ہے گئی ہوئی جوانی

ریاست کوٹہ جہاں آپ نے بعہدۂ دیوانِ ریاست اور ا
یعنی آگرہ جہاں بطور وکیل عدالت دیوانی کام کیا ، نیز جے پور ، ا
مقامات کی تعریف میں ۸ رباعیاں حضرت نشاط کے دیوان میں ۸
فارسی غزل کے صرف دو اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

بہ کلیم شکوہ دارم کہ زچشم سرگمینش   چہ بلا بجاں رسید و چہ بیدل تب
بہ نشاط خاطر من چہ سخن زنند اغیار   کہ بہ پیش آں ستمگر پئے عذر

حضرت نشاط کی طبیعت کچھ مشکل پسند بھی واقع ہوئی تھی۔ با
حادث کے قافیے باندھتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

ہر اک قطرہ ہے آنسو کا ہماری آنکھ میں طوفاں
حباب بحر وش ہیں اپنے آگے نوح اور
مئے عرفاں خم وحدت میں اب مجھ کو پلا ساقی
حریف بادہ پیما جام جم کے ہو گئے
رقیبوں کو الم مجھ کو نشاطِ دہر حاصل ہے
یہ اپنی اپنی قسمت ہے عبث اس میں ہو تم
میں دل سے کیوں نہ کہوں تجھ کو چشم تر ، شاباش
بہایا اشک سے تُو نے عدو کا گھر ، نشا
فدا ہوں بے خبری کا کہ دردِ دل کی مرے
خبر جہاں میں ہے اور تم ہو بے خبر ، نشا

۲۳ اشعار کی غزل کے صرف دو اشعار

ی اشعار میں نرگس بھی ایسی چشم بر رہ   کہ جس طرح ہو نظر باز سارق حرّاف
و قہر جس سے نمایاں تھے حشر کے اثار   وہ چہرہ جس سے ہویدا اتھی صورت الطاف

انگریزی الفاظ کا حسن و خوبی استعمال

فکر تو بہ خاطر خرّم سے ستم کرے   بھرلے تو ساقیا مرے ساغر میں اولڈ ٹام
ندی نہ شہد ی اور نہ برانڈی نہ اولڈ ٹام   ساقی وہ مئے جو نکلی ہے از قعر خم شراب

مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو نشاط صاحب کو لکھا ہے، اس میں ولڈ ٹام Old Tom کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر اولڈ ٹام کی بجائے اود لٹام تحریر کیا ہے۔

روزمرّہ آپ کے کلام میں خصوصیت کا حامل ہے۔

اُن لبوں سے مرا گلہ نکلا   مُنہ کو تکتا ہوں میں یہ کیا نکلا
غیر سے مذکور ہمارا کیا   خوب کیا آپ نے اچھا کیا
آج وہ ترک وفا کرتے ہیں   ایسا کیوں کرتے ہیں، کیا کرتے ہیں
مجھ پہ یہ خشم نا روا کیا ہے   کچھ تو کہئے مری خطا کیا ہے
بے وفاؤں سے چاہتا ہے وفا   دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

چلبلا پن

شیشۂ مے نہاں بغل میں نشاط   اور دعویٰ ہے پارسائی کا
نشاط انگیز ہے یہ طرز گفتار   پیر مے، اب بنو گے پارسا کیا
پیری میں بھی نشاط جوانی نظر پڑی   ممنون ہوں میں دیدۂ معشوقِ باز کا
برچھی بھی، سِناں بھی، تیرِ مژہ بھی   سب کچھ سہی، جگر پہ مگر آزمائے کون
ہو میسر مئے دو سالہ اگر   اور پھر رحمتِ خدا کیا ہے؟

محاورات

بے سبب کیوں مریضِ عشق بنوں   تندرستی ہزار نعمت ہے
امید سے کہہ رہے ہیں اگر آئے ہیں نشاط   پانی پئیں گے آج ترے سر پہ وار کے
کیوں روکوں میں طبع کی روانی   بُو دیتا ہے بند ہو کے پانی
وہ آچکے سر تربت پہ فاتحہ کے لئے   جو میری خاک سے دامن بچائے جاتے ہیں
ہاتھ کی کب لکیر مٹتی ہے   دستِ حجّام اور تمھارا خط

عربی فقرات کا بہ خوش اسلوبی استعمال

لایا ایّہا السّاقی اٹھا ہے ابر ستانہ   ادر کا ساً و ناولہا صدا دیتا ہے مینا

دنیا کا نام مزرعۃ الآخرۃ بھی ہے   یاں بے پئے نہ پائیں گے جنّت میں ہم شراب
تبسم پر اگر چین جبیں کا فیصلہ ٹھیرے   ادائے معنیٔ دع ما کدر خذ ما صفا ٹھیرے

متفرقات

اس پہ مرتے ہیں جس کا دامن شرم   دستِ وہم و خیال چھو نہ گیا
تبسّم گُل کا ہے یا خندۂ برق   وجود عشرتِ اہل فنا کیا
ہم نے سجدے کو سر جھکایا تھا   یار سے واں اُن کا نقشِ پا نکلا
خواہشوں کا چھوٹ جانا ہے نشاط   روتے ہیں نا داں کو دانا دیکھ کر
یہ دلِ دیوانہ بس مسرور ہے   اپنے گھر میں شکلِ صحرا دیکھ کر
خصوصاً جمع ہم نے ہی کیا ہے دولتِ غم کو   عموماً جس کا جی چاہے وہ آلے شادمانی کر
ہیں جو محسوسات کے تارک وہ ہیں غم مدام   کاغذِ تصویر کی ملتی ہے بے باکانہ شمع
وعدوں ہی کو تمھارے نہ سمجھے ہیں ہم دروغ   تم جھوٹے، عہد جھوٹے، تمھاری قسم دروغ
آئینہ رونمائے سکندر رہی گرچہ ہو   ہستی باعتبارِ وجود عدم دروغ
دشمن کے مرگ کی بھی نہ ہم آرزو کریں   کس طرح لوحِ زیست پہ کھینچیں قلم دروغ
زُلفِ سنبل ہو نقابِ رُخِ گُل   غنچہ وا بندِ قبا کرتے ہیں
نشاط دل پہنچے تا درِ کعبہ وہے واں بھی   نشانِ پا رگم پایا پڑا تھا صحنِ ویرانہ
بے صبر ہم پا نمال عدو کو نہ کیجیو   اتنا خیال بس مرے سر کی قسم رہے
طائف ہو شیخ سا جبہ سنگِ حرم ہے   ہم سنگ دیکھ زائرِ بیت الصنم رہے
نہ پہنچے بال برابر بھی واں نگاہِ خیال   نظر کا چاہئے گنڈا تری کمر کے لئے
شفق تو بھی دعا کیجو مرے خوں کی قسم تجھ کو   نہ اس پاپئے نگاریں پر کہیں رنگِ حنا ٹھیرے
چھپنے گو نہ دیں گے کاکلِ مشکینِ یار کے   ٹانکے اُدھیڑ دوں جگر زخمدار کے
نشاط نام بھی تبدیل کیجئے صاحب   قدم جو دشتِ مصیبت میں تم کو دھرنا ہے

حضرت نشاط پٹنہ (بہار) کے مشہور کائستھ ماتھر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد منشی خوب لال صاحب کسی کلکٹر کے ہمراہ پٹنے سے علی گڑھ تشریف لائے اور یہیں آباد ہو گئے۔ منشی صاحب پیشۂ وکالت کرتے تھے، اور علی گڑھ میں کافی جائیداد اور زمینداری حاصل کی۔ یہیں ۸۔ دسمبر ۱۸۳۲ء کو نشاط صاحب پیدا ہوئے۔ رواج کے مطابق آپ کو اُردو و فارسی کی تعلیم دی گئی۔ مگر ذاتی لیاقت کی وجہ سے آپ نے عربی میں بھی کافی مہارت حاصل کی، اور عمر کے آخری حصّے میں سنسکرت سے

بھی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ شاعری سے آپ کو اوائل عمری سے ہی شوق تھا۔

خوش قسمتی سے آپ ۱۸۵۰ء میں بمقام دہلی نظارت صدر امینی کے عہدے پر ممتاز ہوگئے، اور مرزا ہرگوپال تفتہ سکندرآبادی کے توسل سے مرزا غالب دہلوی سے تلمذ حاصل کیا۔ میر پنجہ کش، بہاری لال مشتاق وغیرہم کے ہم صحبت و ہم جلیس رہے۔ آپ نے ایک اچھی قیمتی قلمی اور طبع شدہ کتابوں کی لائبریری چھوڑی، جو بعدہٗ دھرم سماج کالج علی گڑھ کی نذر کر دی گئی۔ چار سال بعد آپ نے استعفا دے کر گوالیار میں میر منشی کا عہدہ سنبھالا۔ مگر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے باعث آپ پھر علی گڑھ تشریف لے آئے اور ۱۸۵۸ء میں سررشتہ دار عدالت دیوانی مقرر ہوئے۔ سر جون شور ڈسٹرکٹ وسشن جج کی مہربانی سے آپ نے وکالت کا امتحان بھی پاس کر لیا اور آگرے میں ۱۸۶۲ء سے وکالت شروع کر دی۔ اس میں کافی رسوخ حاصل کیا۔ میونسپل کمشنر بھی ہوگئے، اور درباریوں کی فہرست میں نام نامی بھی درج ہوگیا۔ آگرے میں رہنے کے لئے آپ نے جون ہیسٹیس کی کوٹھی و باغ خرید کیا جو ۱۸۷۲ء میں میونسپل آفس اور ہیسٹنگز گنج میں تبدیل ہوگیا۔ کسی زمانے میں یہ جگہ جمنا باغ کے نام سے موسوم تھی، جہاں دارا شکوہ پسر شاہجہاں بادشاہ دہلی کا مسکن تھا، اور جس کو اٹھارھویں صدی کے آغاز میں سندھیا گورنمنٹ نے کرنل فلوز کے خاندان کی رہائش کے لئے خرید کیا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں آپ ریاست کوٹہ کے جج مقرر ہوئے۔ مگر وہاں صرف ایک سال ہی رہ سکے، کیونکہ تندرستی نے ساتھ نہ دیا۔ ۱۸۸۷ء میں بڑی عزت کے ساتھ آپ کو دربار قیصری میں بمقام دہلی مدعو کیا گیا۔

آپ ایک زبردست سوشل ریفارمر تھے۔ قوم کی شادیوں میں اسرافِ کثیر اور بیجا خرچ دیکھ کر آپ نے ایک مسودہ تیار کیا جس کا نام "ضوابطِ شادی" رکھا۔ گورنمنٹ نے بھی اس کی کاپیاں خاص خاص اضلاع میں گشت کرائیں۔ یہ "ضوابط" بکثرت آرائے قوم پاس ہوا، اور اس کی پہلی جلد ۱۸۷۵ء میں طبع ہوئی۔ نویں بار ۱۹۲۴ء میں چھپی جو حسب معمول اصحاب قوم کو مفت تقسیم ہوتی رہتی ہے۔

۱۸۷۰ء میں آپ نے درستی اخلاق کے متعلق ایک کتاب "تالیف ہرگوبند" کے نام سے تحریر کی۔ یہ کتاب نہایت مقبول ہوئی، اور بذریعہ چٹھی نمبری ۱۰۵۳ مورخہ ۱۹۔ اگست ۱۸۷۱ء محررہ گورنمنٹ گزٹ آپ کو مبلغ ایک سو پچاس روپے بطور انعام عطا ہوئے۔

پانچویں کتاب آپ کی "الہام ضمیر" ہے جس میں ازدواج ثانی بیوگان کے خلاف مستند ثبوت و دلائل پیش کئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کتاب نے اس وقت کے لئے اس مسئلہ کو بالکل خاموش کر دیا۔ یہ بات موجودہ زمانہ کے خیالات کے مطابق نہ ہو مگر اس سے نشاط صاحب کے زورِ قلم اور استحکامِ مزاجی کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ اس کتاب کا سال طبع ۱۸۸۹ء ہے۔

مذہبی خیالات وغیرہ

۱۸۸۲ء میں وکالت سے علیحدگی اختیار کرنے پر آپ نے مذہبی کاموں کی طرف رجوع کیا۔ اسی سال کنور وزیر علی خاں رئیس و زمیندار دان پور ضلع بلند شہر سے زمین حاصل کر کے برلب گنگ بمقام راج گھاٹ پندرہ ہزار روپیہ لگا کر وسیع اور کشادہ دھرم شالہ تعمیر کی۔ اس کے سامان مہیا کرنے میں مسٹر گروس نے بہت مدد کی۔ آپ نے اسی مقام پر ۱۸۸۷ء میں ایک بڑا گیہ کیا جس میں دور و نزدیک کے پنڈت شریک ہوئے۔ اس موقعے کے لئے آپ نے ایک کتاب موسومہ "کاشتہ"؟ مکتا ولی وستہ میو پاس تحریر کی جو کافی پسند کی گئی۔

حضرت نشاط ایک نہایت خوش خلق اور باوضع شخص تھے۔ خوش خوراکی کی وجہ سے راجہ صاحب مرسان سے (جو مشہور رئیس بھگت راجہ مہندر پرتاپ والی دہرہ دون کے چچا تھے) آپ کے تعلقات نہایت گہرے تھے۔ یہ راجہ صاحب مرسان وہی ہیں جن کے لئے مشہور رہے کہ تیل کی بو خاص طور پر محسوس کر لیتے تھے، ہیں کہ ایک دعوت میں راجہ صاحب کے لئے خاص طور پر تیل کا بچاؤ کیا گیا تھا، خس کی ٹٹیاں مشکوں کے ذریعے عطر سے چھڑکی گئی تھیں۔ قضا را ایک سقے کی مشک نئی تھی اور اس میں تیل لگایا گیا تھا، راجہ صاحب نے باوجود اس تمام احتیاط کے تیل کی بو محسوس کر لی۔

تقریباً دھرم شالہ کی تعمیر کے ساتھ ہی حضرت نشاط نے اپنا وقت شعر و شاعری و دیگر علمی مشاغل میں صرف کرنا شروع کر دیا تھا۔ آپ کی درستی اخلاق کے متعلق کتاب بنام "تالیف ہرگوبند" ۱۸۷۴ء میں آپ کا دیوان موسومہ "نشاط الاحباب" مکتا ولی وستہ میو پاس ۱۸۸۵ء میں اور کتاب "الہام ضمیر" ۱۸۸۹ء میں طبع ہوئیں۔ آپ کی زندگی سبق آموز زندگی تھی جس کا نقش تا ریخ ۳۔ ماہ مئی ۱۸۹۱ء کو آپ آنے والی نسلوں کے لئے کتابی اور دھرم شالہ کی صورت میں چھوڑ کر اس دنیائے ناپائیدار سے ہمیشہ کے لئے ایسی جگہ چل دئے جہاں سوائے آرام دائمی کے اور کچھ نہیں۔

قدیر لکھنوی

غزل

تری محفل سے ساقی رِندِ مستانے کہاں جائیں
جُدا ہو کر مئے و مینا سے پیمانے کہاں جائیں

سنانے سوز و سازِ غم کے افسانے کہاں جائیں
تمہیں جب شمعِ محفل ہو تو پروانے کہاں جائیں

ابھی تو اہلِ حُسن و عشق ہی تک بات پہنچی ہے
ابھی کیا جانے میرے تیرے افسانے کہاں جائیں

چمن کے پھول ہنستے ہیں بیاباں خار کھاتا ہے
مجھے اب یہ بتا دے تیرے دیوانے کہاں جائیں

خدا رکھے بتوں کو یاد ہیں فن قتل و غارت کے
یہ میرا خون بھی کر دیں تو پہچانے کہاں جائیں

سزا دے یا جزا، جو حشر ہو دنیا میں، ہو یا رب
ہم اپنی داستاں محشر میں دُہرانے کہاں جائیں

جنابِ شیخ سے اِتنا خدا را پُوچھ لے کوئی
حرم میں سب کریں سجدے تو بتخانے کہاں جائیں

جنابِ شیخ کے ماتھے پہ مُہرِ پارسائی ہے
جو یہ بالفعل پی بھی لیں تو پہچانے کہاں جائیں

ستمگر تو قیامت تک نہ ہم کو ڈھونڈھ پائیگا
تری محفل سے اُٹھ کر ہم خدا جانے کہاں جائیں

جو دینا ہے ہمیں وہ دینے والا خود بخود دے گا
قدیر اِک اِک کے آگے ہاتھ پھیلانے کہاں جائیں

رضیہ سجاد ظہیر

نیچ

شالی کو دیکھ کر سلطانہ کو لکڑی کے اُن بے ڈھنگے ٹکڑوں کا خیال آجاتا تھا جن کو الگ الگ دیکھو تو آڑے ترچھے اور بے ڈول لیکن ٹھیک سے ملا کر بناؤ تو طرح طرح کی ایسی خوبصورت شکلیں اور تصویریں بن جائیں کہ کیا کہنا۔

اس کے نقشے میں کوئی خاص چیز اچھی نہیں تھی، رنگ بھی گہرا سانولا تھا لیکن پہلے ہی دن جب سلطانہ رکشے سے اُتر کر اپنے دروازے میں داخل ہو رہی تھی اور اس نے باہر کے ایک شاگرد پیشے کی کوٹھڑی کے سامنے شالی کو بیٹھے دیکھا تھا تو اسے یہ احساس ہوا کہ یہ چیز بار بار دیکھنے کے لائق ہے۔ شالی نے بھی سلطانہ کو دیکھا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر نمستے کرنے کے بجائے وہ نظریں اُٹھا کر ذرا مسکرا دی تھی اور پھر سر جھکا کر چلتی ہوئی پیتل کی تھالی میں چاول بیننے لگی تھی۔ اس کی یہ ادا سلطانہ کو بھا گئی کیونکہ اگرچہ وہ خود امیر متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی لیکن اُسے خیال تھا کہ وہ عوام سے محبت کرتی ہے۔ اور اسی لئے جب وہ کسی غریب محنت کش کو کسی بڑے آدمی کے سامنے ہاتھ جوڑتے دیکھتی یا اسے مائی باپ کہتے سنتی تو اسے نہ صرف اس امیر پر بلکہ اس غریب پر بھی غصہ آنے لگتا ۔۔ جبھی تو اُسے شالی پر پیار آیا!

باہری دروازے سے اپنے کمرے تک آتے آتے سلطانہ کو بہت سی چیزیں یاد آنے لگیں، بچپن میں ہر وقت کی سنی ہوئی باتیں کہ نیچ ذات کی عورتوں کا کچھ ٹھیک نہیں ہوتا، روٹی کپڑے کے لئے ایک سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا مرد کر لینا ان کے لئے کوئی بات نہیں ہوتی۔ اس کی دادی اماں اور نانی جان اکثر ان لونڈیوں کا ذکر کیا کرتی تھیں جو کال میں خریدی گئیں لیکن روٹیاں جڑنے کے بعد اُن کی آنکھوں پر چربی چھا گئی اور پھر وہ گھر میں سے کسی نہ کسی نوکر کے ساتھ بھاگ گئیں! بھاگ جانا تو ان کے لئے جیسے کوئی بات ہی نہ تھی ۔ بے غیرت کہیں کی، کم ذات! یکایک اسے شالی کا خیال آنے لگا۔ نہ جانے وہ کون تھی اور کیسے یہاں کوارٹر میں آئی، نہ جانے اس کا شوہر کہاں ہے ۔۔ ہے بھی کہ نہیں۔ پھر اسے اپنی بڑی بوڑھیوں پر غصہ آنے لگا۔ آخر وہ لونڈیاں بھاگ نہ جاتیں تو کرتیں بھی کیا... لیکن بھاگ جانا ہے بُری بات ... لیکن پھر کیا کرتیں ..... ان لوگوں کو لڑنا چاہیئے تھا .... لیکن کیسے؟ کس سے کیونکر .... کسی سے شادی کر لیتیں ان سے کون شادی کرتا، مگر شادی کئے بغیر تو ..... اونہہ ... اس نے جلدی جلدی کالج کے کپڑے تبدیل کئے۔ گھڑی دیکھی پونے چار بجے تھے، بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت تھا۔ اس نے گھڑی اُتاری غسل خانے میں جا کر پانی کا نل کھولا تو پانی ندارد ۔۔ کسی نے باہر نل کھول رکھا تھا جھنجھلا کر اس نے آواز دی "اُفوہ ۔۔۔ ارے بھئی نل بند کرو" پانی پھر بھی نہیں آیا۔ جھنجھلا کر اس نے کھڑکی کھولی۔ نل پر شالی کھڑی چاول دھو رہی تھی، کھڑکی کھلنے کی آواز سُن کر مڑی سلطانہ کو دیکھ کر جیسے اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا، فوراً نل بند کیا اور بولی "بی بی جی ۔ ہم آج ہی یہاں آئے ہیں، ہم کو خبر نہیں تھی کہ باہر نل کھولنے سے اندر پانی بند ہو جاتا ہے"۔

"کوئی بات نہیں" سلطانہ کا سارا غصہ رفو چکر ہو گیا تھا شالی کی آواز اسے بہت اچھی لگی تھی بات کرنے کا انداز پسند آیا تھا۔ دوسرے ہی دن بڑی کوٹھی میں حکومت کا ایک دفتر کرائے پر آگیا، بیچ کا بڑا ہال دفتر کو ملا ۔ اِدھر اُدھر کے کمروں میں اسی دفتر سے متعلق حکام اُترے اور شاگرد پیشے کی تین چار کوٹھڑیوں کے علاوہ سب اردلیوں اور چپڑاسیوں سے بھر گئیں۔

سلطانہ اس شام کو کالج سے آکر ڈاک دیکھ رہی تھی کہ اُس نے

باہر سے ہنسنے کی آواز سنی — آواز شالی کی سی لگتی تھی۔ اس نے غسل خانے کی کھڑکی دھیرے سے ذرا کھولی۔ اس کی بچی شالی کو دوڑا رہی تھی۔ کئی اردلی چپراسی وغیرہ چاروں طرف کھڑے ہنس رہے تھے۔ دوڑتے دوڑتے شالی اپنی کوٹھڑی میں گھس گئی اور اندر سے چیخ چیخ کر بولی "بس بھئی۔ ہم نے ہار مان لی۔ ہم کو کھانا پکانا ہے۔ اب کل کھیلیں گے" بچی ٹھنکنے لگی "واہ — اوں ہم نہیں جانتے۔ ہمارا داؤں دو" — شالی نے کواڑ کھولے، ہنستی ہوئی نکلی اور دوسری چال چلی "آؤ آگ جلائیں گے۔ آٹا لو گی چڑیا بنانے کے لئے" بچی وہیں بیٹھ گئی اور شالی نے اوپلے چولھے میں ٹھونس کر پھونکیں مارنا شروع کیا۔ سلطانہ نے کھڑکی بند کر لی۔ اسے شالی کا اس طرح دل کھول کے اس معصومیت سے ہنسنا کھیلنا بہت اچھا لگا تھا لیکن اگر وہ چپراسی اور چوکی دار وہاں نہ کھڑے ہوتے تو اچھا ہوتا... مردوں کے بیچ میں اس طرح سے .... لیکن شالی نے تو ان میں سے کسی کی طرف دیکھا تک نہ تھا.. پھر بھی ایک بے غیرتی ہی ہے۔ لیکن بے غیرتی کیوں ہے ... اس نے یکایک نظر اٹھا کر دیکھا تو شالی سامنے کھڑی تھی، سلطانہ کو دیکھ کر ایسا شرمائی کہ سلطانہ بوکھلا گئی۔ کیا یہ وہی شالی تھی جو ابھی ابھی اتنے زور زور سے دوڑ رہی تھی، ایسا ہنس رہی تھی جیسا اس کا سارا وجود پنکھڑیاں بن کے بکھر جائے گا۔ کیا سلطانہ کے سامنے وہ ہنسنا نہیں چاہتی تھی — ایک نظر اس نے سلطانہ کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی "بی بی جی ایک دو مرچ چاہئیں۔ اندھیرا ہو گیا ہے دوکان جاتے .... نہیں نہیں — دوکان جانے کی کیا ضرورت — بیٹھ میں ابھی منگائے دیتی ہوں" اس نے خانساماں کو آواز دی شالی بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ اس نے سلطانہ کے سوال کے جواب میں بتایا کہ اس کا شوہر مر چکا ہے اور وہ پاس ہی والی پیلی کوٹھی میں میجر صاحب کے بچے کو کھلانے پر نوکر ہے۔ پھر وہ بچے کے بارے میں بتانے لگی۔ اور بیچ بیچ میں ایک آدھ دفعہ ہنسی بھی۔ ایسا لگتا تھا اسے اس بچے سے بہت پیار ہے۔ خانساماں مرچیں لے کے آیا تو اس نے غور سے شالی کی طرف دیکھا لیکن شالی نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں، مرچیں لیں اور چپ چاپ چلی گئی! جب وہ چلی گئی تو خانساماں بولا۔ بیگم صاحب اس عورت کو گھر میں نہ آنے دیا کیجئے۔

"اُنہہ — جاؤ اپنا کام کرو" سلطانہ نے پھر اپنی ڈاک اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن بڈھے خانساماں نے برسوں اس گھر میں کام کر کے اپنی جو حیثیت قائم کی تھی وہ اسے آسانی سے چھوڑنے پر طیار نہ تھا۔ بولا یہ اپنے میاں کو چھوڑ کر آئی ہے۔ گھر سے بھاگ کے — اور یہاں رام اوتار سے تعلق ہے۔ ٹھیک نہیں ہے یہ عورت" سلطانہ کو جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا "کون رام اوتار؟ وہ کرایہ داروں کا چوکی دار؟" اور رام اوتار جیسے اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ خاکی وردی پہنے جو اسے سرکار کی طرف سے ملی تھی، ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا اور ٹارچ اور پاؤں میں بڑے بڑے جوتے۔ کبھی کبھی جب اسے رات میں رام اوتار کی کھانسی کی، بوٹوں کی آواز آتی "اُہنک اُہنک — ہا — ہا — ہوشیار — ہا — ہا" تو وہ اسے آواز بھی دے لیا کرتی تھی — "رام اوتار" —

دیوار کے ادھر سے وہ جواب دیتا "گھبرائیے نہیں سرکار۔ ہم جاگ رہے ہیں" وہ اس کا چوکیدار نہیں تھا پھر بھی وہ کتنا اچھا تھا کہ اسے ہمیشہ اس طرح اطمینان دلا دیتا تھا! — پھر یکایک وہ جیسے جاگ پڑی خانساماں کہہ رہا تھا "یہ اپنے میاں کو چھوڑ کر آئی ہے۔ رام اوتار بے چارہ راجپوت ہے اور یہ نیچ ذات کی۔ مگر اس نے اسے کچھ کھلا دیا ہے۔

"خواہ مخواہ بکواس کرتے ہو" وہ چڑھ گئی" سچ دیکھو نہ جھوٹ بس تم لوگوں کو تو بات کہنے سے مطلب جاؤ یہاں سے! خانساماں مرچ کا ڈبہ لئے بڑبڑاتا ہوا باورچی خانے کی طرف کھسک لیا۔

سلطانہ نے خانساماں کو تو چلے جانے کا حکم دے دیا لیکن اس کے اپنے دماغ میں جو لگاتار خیالات چلے آ رہے تھے ان کو نکل جانے کا حکم دینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اسے یہ بات تسلیم کرنا پڑ رہی تھی کہ خانساماں کی باتوں سے اسے دھکا سا لگا تھا — شالی نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے اپنے شوہر کو چھوڑا، یہاں رام اوتار سے تعلق کئے تھی اور وہ تو جو تھا سو تھا اس نے سلطانہ سے جھوٹ بولا کہ اس کا میاں مر چکا ہے — آخر جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی، اسے سلطانہ پر بھروسہ کرنا چاہئے تھا کہ وہ سمجھ جائے گی.... شاید یہ نیچ ذات کی عورتیں — ارے نہیں نیچ اور اونچ ذات.... افوہ —

دوسرے دن شام کو مغرب کے وقت وہ عورتوں کے کسی جلسے

سے لوٹی، اندھیرا تقریباً چھا گیا تھا، دونوں وقت ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے، شالی کی کوٹھڑی سے دھواں نکل رہا تھا لیکن چراغ نہیں ملا تھا، چولھے کے سامنے آگ کی سرخ روشنی میں شالی کے روٹی پکاتے ولے ہاتھ دکھائی دے رہے تھے۔ سر پر اوڑھی ہوئی پیلی ساری میں سے س کی ذرا سی ناک بھی دکھائی دے رہی تھی۔ روٹی پکاتے پکاتے وہ بار بار دسے آنسو پونچھتی جاتی تھی، پاس ہی دو تین اینٹیں ایک کے اوپر ایک رکھے رام اوتار بیٹھا تھا! اس وقت وہ خاکی وردی کے بجائے سفید موتی اور سفید کرتا پہنے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اور سلطانہ کو ایکدم خیال ہوا کہ رام اوتار اور شالی کی جوڑی بہت ہی اچھی رہے گی؟ رام ار اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور سلام کرکے دوسری طرف چلا گیا۔ سلطانہ رے دھیرے چلتی ہوئی شالی کے نزدیک آکے کھڑی ہو گئی، ایک منٹ خاموشی سے دیکھتی رہی پھر دھیمے سے بولی شالی — ہمارا خانساماں ہے تیرا آدمی زندہ ہے — تو تو کہتی تھی وہ مر گیا — اسے پوری رتھی کہ شالی کہے گی نہیں بی بی جی۔ خانساماں کو کیا پتہ، وہ تو مر چکا وہ اندر جا کے خانساماں کو خوب ڈانٹے گی کہ خواہ مخواہ تم لوگ ایک دم پر الزام لگاتے ہو وغیرہ وغیرہ — لیکن شالی نے نظریں اٹھا لطانہ کو غور سے دیکھا اور آہستہ سے بولی "میرے لئے وہ مر ا" — سلطانہ کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ اپنے شوہر رے میں ایسی بات! اسے چپ دیکھ کر شالی مسکرائی "وہ سمجھتا وٹی کپڑا دے گا اور حکم چلائے گا۔ ہم کیا کوئی پتریا ہیں کہ روپے سے کوئی مول لے لے۔ اس جیسے دس کو کھلانے کی ہمت رکھتے ہیں" لے کے برتن میں پانی لے کر زور زور سے ہاتھ دھونے لگی۔ سلطانہ ی سے اپنے دروازے کی طرف بڑھ گئی لیکن اس کے ذہن میں ایک برپا تھا — شالی بڑی ہمت ور تھی جو اس نے ایسا کیا لیکن ہائے ہر کے بارے میں کس دل سے اس نے یہ بات کہی، آخر اپنی روا نتوں گے بڑھا نہیں جا سکتا — شوہر! کتنی پیاری کتنی محبوب رت کی دنیا، اس کا سہاگ، یہ نیچ ذات .... اس نے اپنے سر جھٹکا دیا — پھر اسے نیچ ذات کا خیال آیا؟ وہ اس بات کو حیثیت سے مان چکی تھی نہ کہ ہمارے سماج میں شادی قانونی طوائفیت ہے اور کچھ نہیں — لیکن آج جب اس نے اس کا مظاہرہ دیکھا تو کیا ڈر گئی؟ تو کیا اصول اس نے صرف دوسروں کو قائل کرنے کے لئے یاد کئے تھے، ہاں — رٹ لئے تھے؟ لیکن دادی اماں تو کہتی تھیں... لیکن یہاں تو روٹی کپڑے کو ٹھکرا دینے والا معاملہ تھا.... لیکن شوہر.... لیکن محبت .... لیکن .... لیکن .... اس نے گھبرا کے خانساماں کو چائے لانے کا حکم دیا —

تیسرے دن ہولی تھی، اس کی بچیاں نوکروں کے بچوں سے رنگ کھیلنے نکل گئیں، خانساماں بازار چلا گیا۔ وہ اکیلی بیٹھی خطوط لکھ رہی تھی کہ پچھلے گیلری میں قدموں کی آہٹ ہوئی چھاگلوں کی موسیقی سنائی دی۔ پھر شالی کا سایہ دروازے میں دکھائی دیا۔ اس نے بڑے بڑے پیلے اور سرخ پھولوں کی ریشمی ساری پہن رکھی تھی۔ زرد چمکدار ساٹن کا بلاؤز، منہ میں پان اور مستی بھی، آنکھوں میں گہرا کاجل اور گھنی بھوؤں کے بیچوں بیچ ایک بڑی سی سنہری ٹکلی جو رہ رہ کر یوں تڑپتی تھی جیسے سرمئی بادلوں میں کبھی کبھی کوندا لپک جاتے! ہاتھ میں پیتل کی ایک چھوٹی سی تھالی لئے وہ اس طرح سلطانہ کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی جیسے اجنتا کی سانولی شہزادی میں جان پڑ گئی ہو۔ تھالی میں رنگ تھا، طرح طرح کا رنگ ایک میں ملا ہوا اور اس میں ابرک کے ننھے ننھے بے شمار ذرّے دمکتے ہوئے! اس نے بغیر کوئی نوٹس دیئے ایک چٹکی بھری اور گھبرا کے پیچھے ہٹتی ہوئی سلطانہ کے ماتھے پر رنگ مل دیا۔ پھر اس نے تھالی کے دوسری طرف رکھی ہوئی مٹھائی میں سے ایک ڈلی اٹھائی اور سلطانہ کے منہ میں دینے لگی۔ سلطانہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ گلے میں جیسے کچھ اٹک گیا، دھیرے سے بولی "شالی میں مٹھائی نہیں کھاؤں گی — میں نے — میں نے — میں ابھی نہیں کھاؤں گی مٹھائی" — شالی جیسے سب کچھ یک لخت سمجھ گئی، — اس نے تھالی زمین پر رکھ دی اور آہستہ سے بولی "بی بی جی — دل تھوڑا نہ کرو بھگوان نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا" — پھر وہ ہنس پڑی — "اور ہم سب آکے آپ کو مٹھائی کھلائیں گے مگر...." اور اس کی آنکھوں میں محبت اور شرارت کے ملے جلے جذبات چمکنے لگے۔ "مگر پھر آپ ہمارے ہاتھ سے کیوں کھائیں گی" — سلطانہ جھینپ گئی۔ بات ٹالنے کو اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا، چاندی کے دو روپے اس کی ہتھیلی میں دب گئے اور باہر نکلنے ہی والے تھے کہ شالی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "دیکھئے ہم کو کچھ

دیجئے گا نہیں" — جب شالی نے جانے کے لئے پیٹھ موڑی تو سلطانہ آہستہ سے بولی "شالی" — شالی مُڑی اور رُک گئی! سلطانہ نے گلا صاف کیا، اٹکتے ہوئے لہجے میں بولی "شالی — تو — تو اتنی اچھی ہے .... مگر ... مگر .... تو نے اپنے شوہر کو کیوں چھوڑ دیا؟" شالی نے نظریں نیچی کر لیں اور پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔ چاندی کی چمکدار چھاگلوں میں اُس کے پاؤں میں لگا ہوا سُرخ سُرخ مہادر پرچھائیاں بن کے ڈولنے لگا۔ دوسرے لمحے اُس نے نظریں اٹھائیں، ان میں کچھ مایوسی اور کچھ طنز تھا، دھیمے سے بولی "جانے دیجئے بی بی جی — آپ نہیں سمجھیں گی" — اور باہر چلی گئی! سلطانہ دم بخود رہ گئی! اسے جیسے بجلی کے تار نے چھو لیا تھا۔ شالی کے جاتے ہی خانساماں بازار سے آ گیا۔ سلطانہ کھوئی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آکر کرسی پر گر سی پڑی! خانساماں گوشت اور سبزی وغیرہ کی سینی وغیرہ زمین پر رکھتا ہوا بولا "بڑے صاحب کا چپڑاسی کہتا تھا، رام اوتار کو نوکری سے جواب ملنے والا ہے"

"ارے — کیوں"؟ وہ اُچھل پڑی۔

"جمعدار اور خانساماں نے شکایت کی ہے کہ یہاں کوارٹروں میں بڑی گڑبڑ رہتی ہے۔ ہم لوگ بال بچے دار لوگ ہیں اور یہ عورت بدمعاش ہے۔ چھوٹے بابو بھی کہتے تھے رام اوتار کی حرکتیں ٹھیک نہیں ہیں۔ کل شام کو ...." "ہاں ہاں کل شام کو ہم نے بھی کچھ جھگڑے کی آوازیں سُنی تھیں کیا قصہ تھا"۔ اسے یاد آیا کہ کل جھٹ پٹے کے وقت اس نے کچھ شور کی آواز سُن کر کھڑکی کھولی تھی تو اندھیرے میں اتنا دکھائی دے سکا تھا کہ پلنگ پر دو تین آدمی بیٹھے زور زور سے اتنی جلدی جلدی باتیں کر رہے تھے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ رام اوتار کھڑا تھا، اس کے پاس ایک آدمی بائیسکل پر ٹکا ہوا جھکا تھا۔ ایک اور آدمی کوٹ پہنے ہوئے دھمکی دینے کے انداز میں کچھ کہہ رہا تھا — شالی کہیں نہیں تھی، پھر سلطانہ نے کھڑکی بند کر لی تھی۔

وہ رام اوتار کی برادری کے لوگ تھے، بیگم صاحب وہ اچھی ذات کا دی ہے، ماں باپ نے برادری میں اس کی بات چیت پکی کر دی ہے اور وہ ہاں ..... خانساماں کہتے کہتے رُک گیا کیونکہ سلطانہ اس کی بات سُن ہی نہیں رہی تھی۔ کھسیا کے بولا "گوشت میں لوکی پڑے گی بیگم صاحبہ؟ ہیں"

سلطانہ جیسے خواب سے چونکی "ہاں"

خانساماں نے سینی اُٹھائی اور چُپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔ سلطانہ نے ایک نظر اس کو جاتے ہوئے دیکھا، پھر اپنے کاغذ اکٹھے کر رہی تھی کہ دستک ہوئی — اس نے دروازہ کھولا اور رام اوتار کو دیکھ کے ذرا جھجک گئی، پہلے بھی کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ سلطانہ کے خطوط بڑی کوٹھی میں چلے جاتے تھے تو رام اوتار دینے آتا تھا لیکن اس وقت اسے عجیب سا لگا! یہ رام اوتار تھا۔ شالی کا محبوب، شالی جو سلطانہ سے کہہ گئی تھی "آپ نہیں سمجھیں گی" اس نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر خط لے لیا اور ذرا رُک رُک کے بولی "رام اوتار" — یہ — یہ تمہاری نوکری کے بارے میں کیا سننے میں آ رہا ہے رام اوتار نے نظریں نیچی کر لیں، چُپ رہا۔ سلطانہ اس کی اس خاموشی پر رو ہانسی ہو گئی۔ اس کا دل چاہا چیخ چیخ کر رام اوتار سے کہے خدا کے لئے مجھے اپنا دوست سمجھو۔ یہ دیوار جو تمہارے ہمارے بیچ میں کھڑی ہے اسے گرا دو رام اوتار شالی سے کہو مجھے سمجھنے کا موقعہ بھی تو دے۔ مجھ سے اتنی دُور نہ ہٹے۔ تم دونوں شاگرد پیشے میں پیدا ہوئے اور میں کوٹھی میں تو کیا یہ میرا قصور ہے؟ — آنسو پی کر بولی "کیا شالی کی وجہ سے .... کیا کسی نے تمہاری شکایت کی" — رام اوتار نے دھیرے سے بس اتنا ہی کہا۔ "کچھ نہیں سرکار — اب آپ سے کیا کہوں" — اور سلام کر کے روانہ ہو گیا۔

جیسے اس کا بھی یہی خیال ہو کہ آپ سے کیا کہوں — آپ نہیں سمجھیں گی"۔ سلطانہ کا خون کھولنے لگا، غصے سے نہیں، ارادے کی شدت سے! اس نے رام اوتار اور شالی کا چیلنج قبول کر لیا تھا! کل وہ بڑے صاحب سے جا کر لڑے گی اور ان کو بتلائے گی کہ دو معصوم انسانوں کی محبت میں روڑا اٹکانے کا ان کو کوئی حق نہیں تھا، اگر رام اوتار کی نوکری چلی جائے گی تو وہ ان دونوں کو اپنے گھر میں پناہ دے گی، برادری والے بڑے آئے مار پیٹ کرنے والے، دیکھیں گے — کتنی ہی دیر تک وہ بڑے صاحب اور رام اوتار کی برادری والوں سے کہنے کے لئے اچھے اچھے جملے دل ہی دل میں بناتی اور ان کا ریہرسل کرتی رہی — وہ رام اوتار اور شالی پر یہ بات ثابت کر کے رہے گی کہ وہ ان کی دوست ہے، کہ وہ سب کچھ سمجھتی ہے! صبح وہ جلدی تیار ہو گئی اور کالج کے وقت سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے اپنے بڑے دروازے سے باہر نکلی، اُسے اُمید تھی کہ روز

کی طرح شالی اپنی کوٹھڑی کے آگے ہیڈ صاحب کے بچے کو کھلاتی ملے گی کیونکہ وہ اکثر بچے کو اپنے یہاں لے آتی اور اُسے گھنٹوں کھلایا کرتی تھی — اور اسے یہ سوچ کر بڑی پُراسرار سی خوشی بھی ہوئی کہ شالی کو گمان بھی نہ ہوگا کہ وہ اس کی خاطر بڑے صاحب سے لڑنے جا رہی ہے۔ دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی اس نے شالی کی کوٹھڑی کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا دیکھا، نہ وہاں اس کے برتن تھے نہ بستر، نہ اور کوئی سامان، چولہا بجھا ہوا تھا اور طاق میں رکھا ہوا چراغ اوندھا پڑا تھا — وہ سناٹے میں آ گئی! جمعدارن نے جو وہیں اپنی کھاٹ بچھائے اپنی لڑکی کی جوئیں دیکھ رہی تھی اُسے فوراً اطلاع دی "سرکار — شالی بھاگ گئی" — سلطانہ کے مُنہ پر جیسے کسی نے تڑاق سے طمانچہ مارا۔ ایک دم سے اس کے مُنہ سے نکلا "اور رام اوتار؟" "رام اوتار ہیں گے"۔ جمعدارن نے ہنس کے کہا "رو رہے ہیں اپنے لکھے کو — ایسے بدمعاشوں کا کیا ٹھکانہ۔ آج ایک کیا، کل دوسرا، پرسوں تیسرا۔ نیچ کہیں کی" اور اس نے زور سے ایک جُوں ماری جیسے شالی کو دھر کے پیس دیا ہو — سلطانہ کے قدم ڈگمگانے لگے — اب بڑے صاحب کے پاس جانا بے کار تھا، دھیرے دھیرے چلتی ہوئی صدر پھاٹک کی طرف بڑھی۔ پھاٹک کے پاس اسٹول پر رام اوتار بیٹھا تھا۔ اس نے روز کی طرح سلطانہ کو مسکرا کے سلام نہیں کیا، پہلے پھاٹک آدھا کھلا ہوتا تھا تو دوڑ کے پورا کھول دیتا تھا لیکن آج وہ اسی طرح اسٹول پہ بیٹھا رہا۔ گُم سُم اکیلا! سلطانہ نے بھی سر جھکا لیا اور آگے بڑھ گئی۔ دراصل اُسے خود رام اوتار سے شرم آ رہی تھی، وہ بھی تو آخر عورت تھی اور ایک عورت ہی آج رام اوتار کو دغا دے کے بھاگ گئی، البتہ اس نے اتنا ضرور محسوس کیا کہ جمعدار، چپڑاسی اردلی وغیرہ جو پہلے رام اوتار سے الگ الگ سے رہتے تھے آج اس سے بالکل قریب بیٹھے تھے اور جیسے اُسے بہلانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ سڑک کے ناکے تک پہنچتے پہنچتے سلطانہ کو شالی سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ بے چارہ رام اوتار — تو یہ ٹھیک ہی تھا کہ نیچ ذات ..... افوہ پھر اسے نیچ ذات کا خیال آیا — چلتے چلتے رستے میں اسے جتنی عورتیں ملیں سب کے بارے میں وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی کہ کیا یہ بھی نیچ ذات ہیں اور اگر ہیں تو کیا یہ بھی اپنے چاہنے والوں کو دغا دے کر بھاگی ہیں — ناحق اس نے شالی کو اتنا پیار کیا، ناحق اُسے اتنا مُنہ لگایا — سچ مچ کم اوقات نکلی — نیچ — اس نے زور سے زمین پر تھوکا اور آگے بڑھ گئی — بھلا اتنے دن بعد اور اتنی دور سے وہ شالی کو کیسے پہچان لیتی — لیکن شک اُسے پہلی ہی نظر میں ہو گیا تھا کہ سر پر امرود کی چھابڑی رکھے پیلی ساری پہنے یہ جو عورت سکندر باغ کے پھاٹک میں مُڑی ہے یہ شالی ہی ہے۔ اس نے اپنے رکشا والے سے کہا کہ اس کا پیچھا کرے، اور برابر سے رکشا نکالے تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ سکے — اپنے بالکل پیچھے رکشے کی کھڑکھڑاہٹ سُن کر عورت نے مُڑ کر دیکھا اور ایک مرتبہ پھر سرمئی بادلوں میں کوندا سا لپک گیا

سلطانہ نے سوچا تھا کہ اگر وہ شالی نکلی تو اس کی ایسی خبر لے گی کہ وہ یاد کرے۔ چنانچہ اس نے فوراً اس کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا "شالی تو بڑی بُری ہے، تو بھاگ کیوں آئی، بے چارہ رام اوتار اتنا رو رہا تھا، سب اس کی ہنسی اڑاتے ہیں، تو نے بہت بُرا کیا شالی۔" سلطانہ کے اس طوفان کا جواب شالی نے صرف ایک جملے سے دیا لیکن وہ نوکری سے الگ تو نہیں ہوا نہ" "نہیں" سلطانہ نے جواب دیا — "تو پھر ٹھیک ہے" کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگی "مگر شالی ....." سلطانہ حیران رہ گئی۔

شالی نے امرود کی ٹوکری سر سے اُتار کے رکھ دی جیسے اس نے سلطانہ کا چیلنج قبول کر لیا ہو اور غصّے سے بولی "مگر کیا بی بی جی۔ مگر یہ کہ وہ بار بار مجھ سے کہتا تھا کہ تیرے کارن میں نوکری بھی چھوڑنے کو تیار ہوں — مجھ پر احسان دھرتا تھا۔ آپ بتلائیے کیا میں نے اس سے کہا تھا میرے کارن نوکری چھوڑ — وہ مجھے پاتا، میں اس کو پاتی۔ اس میں نہ میرا احسان اس پر تھا نہ اس کا مجھ پر — ہونہہ — کیا سمجھتا تھا اپنے آپ کو — عمر بھر طعنے دیتا کہ تیرے کارن میری سرکاری نوکری چھوٹی۔ اس جیسے دس کو کھلانے کی ہمّت رکھتے ہیں ہم"۔ کہہ کے اس نے ٹوکری اُٹھا کے سر پر رکھی، ایک پل خاموش رہی پھر دھیرے سے بولی "اس سے میرا ..... اس سے میرا" —

"اچھا" سلطانہ نے کہا "کہہ دوں گی — ضرور کہہ دوں گی" — شالی مُسکرائی جیسے کہتی ہو "ہاں ٹھیک ہے۔ اس بار آپ سمجھ گئیں"۔

بال مکند مشر

گُل کدہ

بسنت ۔ہندی کویوں کی نظر میں

کوی ورچھیبیں ــــــــــــــــ برج بھاشا

پر اسوں نہیں میری لبھائے کچھو
پرسوں کے قرار گئے گھر سوں
گھر سوں اُن سوں کچھو بیر پر لیو
اب یا ہی بچار ہیئے ترسوں
ترسوں کب آوہی وہ پرسوں
کرسوں جب پاؤں پیا پرسوں
پرسوں پر آئی نہیں سجنی!
پرسوں کے بتائے دئے برسوں

اپنے در (پیا) سے میرا کچھ بس نہیں چلتا
گھر سے تو وہ پرسوں آجانے کا اقرار کر کے گئے تھے
گھر میں اور اُن میں نہ جانے کیا ان بن ہو گئی ہے؟
اسی فکر میں دل گھلا جا رہا ہے۔
جی اُسی پرسوں کے انتظار میں ترس رہا ہے نہ جانے وہ پرسوں کب آئے گی۔
جب اپنے ہاتھوں سے پیا کے پاؤں چھو لوں گی
پیاری سکھی! موسم بہار گذرا جا رہا ہے
اور برسوں گذر گئے پر وہ پرسوں آج تک نہیں آئی

جے شنکر پرشاد ــــــــــــــــ ہندی

آج اس یووَن کے مادھوی کنج میں کوکل بول رہا
مدھو پی کر پاگل ہوا کرتا پریم پرلاپ
شتھل ہوا جاتا ہردیہ جیسے اپنے آپ
لاج کے بندھن کھول رہا
بچھل رہی ہے چاندنی چھوی متوالی رات
کہتی کمپت ادھر سے بہکانے کی بات
کون مدھو مدرا گھول رہا

جوانی کے چمن میں آج من کی کوئل کوک رہی ہے
بسنتی شراب کو پی کر من بہک رہا ہے
محبت سے مدہوش دل بے خود سا ہوا جا رہا ہے
شرم و حیا کے بندھن آج خود بخود کھلے جا رہے ہیں
چاندنی پھیلی ہوئی ہے اور رات اپنی خوبصورتی پر خود مست ہے
اور لرزتے ہوئے لبوں سے وہ کچھ بہکاوے کی بات کہہ رہی ہے
زندگی میں مدہوشی کی یہ مٹھاس چپکے سے کون بھرے جا رہا ہے۔

سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا ــــــــــــــــ ہندی

سکھی بسنت آیا!
بھرا ہرش ون کے من
نووتکرش چھایا!
کسلیہ وسنا نو وَیہ لتکا
ملی مدھر پریہ اُر ترو پتکا
مدھوپ ورند بندی

پک نور نبھ سے برسایا

تا مُکُل ہار گندھ بہار بھر

بھاپوں مند مند مند تر

جاگی نینوں میں وہی

یوون کی مایا

آ ورت سرسی اُر سرسج اُٹھے

کیسر کے کیش کلی سے چھوٹے

سودن ششیہ اپچل

پرتھوی کا لہرایا

اے سکھی! بسنت آگیا

ہم کے من میں نئی اُمنگیں جھومنے لگیں،

اور نئے جذبات اُبھرنے لگے

سبز ریشمی لباس سے سجی دوشیزہ نرم و نازک بیلوں کو۔

چمن میں لہلہاتے اُن کے ہم شریک درختوں سے محبت کا پیغام ملا ہے

متوالے بھنورے کنول کی محبت میں قیدی ہو گئے

اور کوئل کی رسیلی تان فضائے آسمانی میں پھیل گئی

بیل اور پھول کی خوشبو سے دبی ہوئی

ہوا ہلکے جھونکوں کے ساتھ بڑی مستی سے چل رہی ہے

آنکھوں میں بو ستندی کا جادو بھرا۔

حسن و جمال سمایا جا رہا ہے

کل سے میری تکیا کا من مُسکا اُٹھا ہے

کیسر کے ریشے پھولوں سے

الگ ہو گئے ہیں

دھرتی کا ہلا جرا۔

اور سنہری آنچل بسنتی جھونکوں میں لہرا رہا ہے۔

شمبھوناتھ شیش ــــــــــ ہندی

آنکھ اُپ ون میں کھلی ہو

ہونٹوں مدھو ماس چھایا

روپ رنجیت کنج کایا

ورشٹی مگدھا مادھوری کے ریشمی جھولے جھلی ہو

رشمیاں نبھ سے اُتر کر

لا رہی ہوں سورگ بھو پر

وشو درشن ہو کلی میں ہر کلی کرنوں ڈھلی ہو

جب میری آنکھیں کھلیں سامنے پھلواری لہرا رہی ہو

بسنت آچکا ہو

چمن کی کایا روپ میں ڈوبی ہوئی ہو

اور نظر دل فریب جمال کے ریشمی جھولے میں جھول رہی ہو

بسنت کی کرنیں آسمان سے نیچے اُتر کر

دھرتی پر اپنے ساتھ بہشت لا رہی ہوں

کلی میں کل عالم دکھائی پڑے

اور ہر کلی کرنوں سے ڈھل کر نکھر گئی ہو

اعداد و شمار

۱۔ پہلی پنجسالہ پلان کے تحت اب تک پندرہ لاکھ اٹھاون ہزار روپیہ نئے ہوائی اڈے اور ہوائی میدان تیار کرنے پر صرف ہو چکا ہے

۲۔ سال ۵۴-۱۹۵۳ء میں بھارت میں چاول کی پیداوار دو کروڑ بہتر لاکھ ٹن اور رقبہ زیر کاشت سات کروڑ چھیاسٹھ لاکھ ایکڑ تھا۔ واضح رہے کہ پنجسالہ منصوبے کے تحت ۵۶-۱۹۵۵ء میں اس فصل کی پیداوار دو کروڑ بہتر لاکھ ٹن اور رقبہ زیر کاشت آٹھ کروڑ ایکڑ کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

۳۔ اگست ۱۹۵۴ء میں بھارت میں بجلی پیدا کرنے کے سرکاری انتظام کے تحت بجلی گھروں میں ترپیسٹھ کروڑ اٹھائیس لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا کی گئی۔ اس کے مقابلے میں اگست ۱۹۵۳ء میں یہ پیداوار ستاون کروڑ بیاسی لاکھ کلوواٹ تھی۔



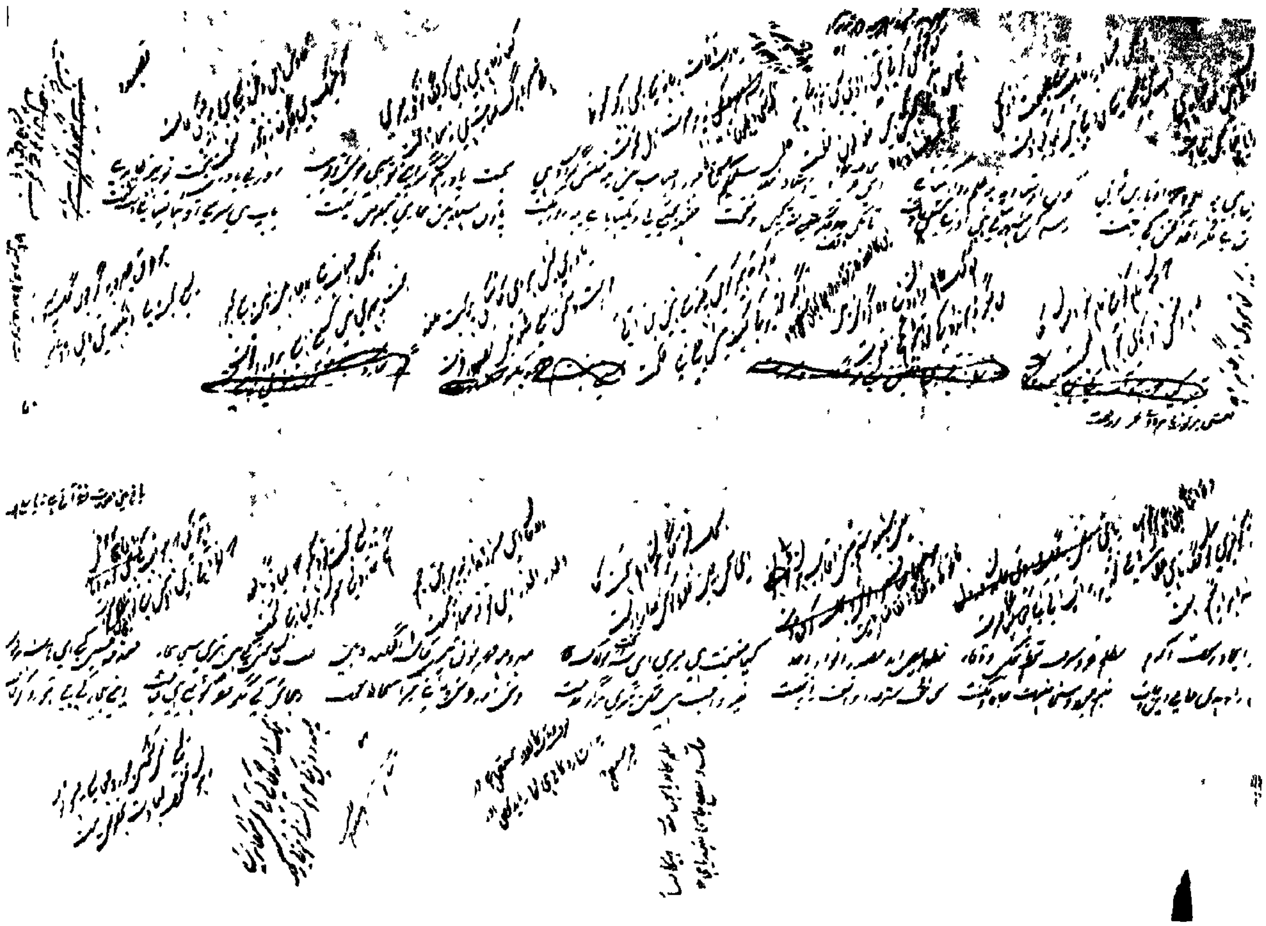
۱۷ دسمبر ۱۹۵۴ء کو نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد
مارشل ٹیٹو صدر جمہوریۂ یوگوسلاویہ کا
استقبال فرما رہے ہیں



شریمتی وجے لکشمی پنڈت حال ہی میں یوگوسلاویہ
تشریف لے گئی تھیں۔ مارشل ٹیٹو آپ کو
خوش آمدید کہہ رہے ہیں

مارشل ٹیٹو ۲۰ دسمبر ۱۹۵۴ء کو دہلی یونیورسٹی میں تشریف لے گئے
نیشنل کیڈٹ کور کے طلبا نے آپ کو گارڈ آف آنر پیش کیا

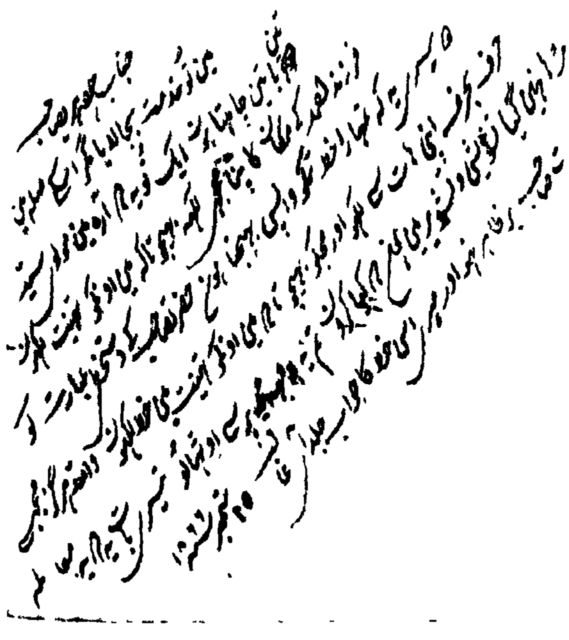




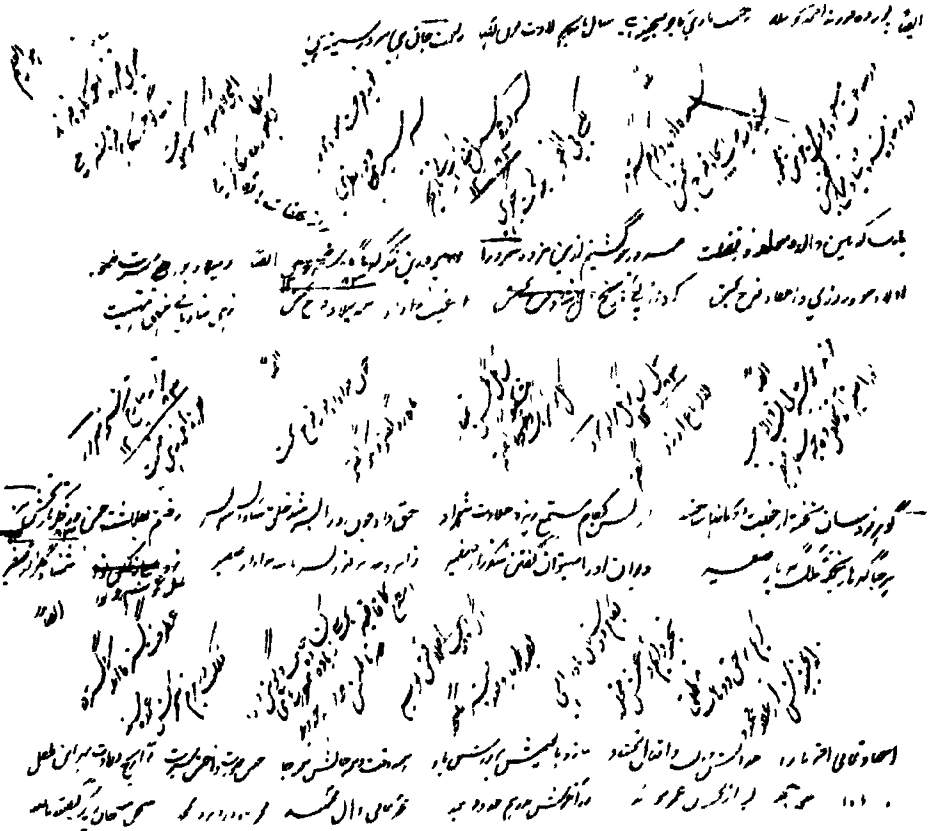
چودھری عبدالغفور کا قصیدہ جس پر غالب کی اصلاحیں خود غالب کے قلم سے موجود ہیں



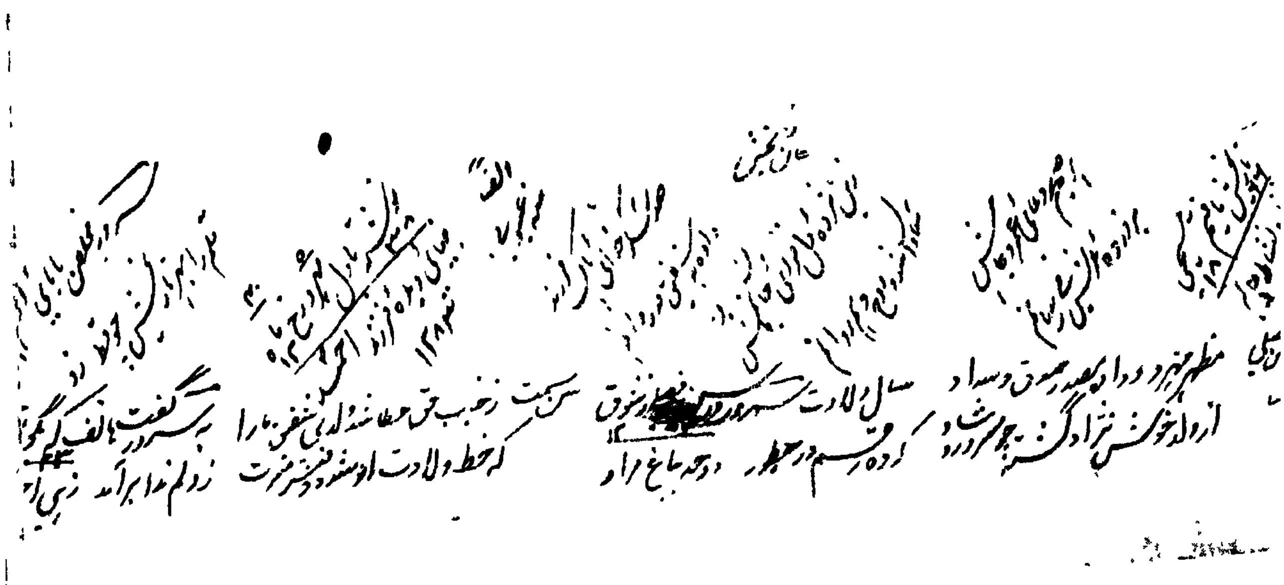
غالب نام آورم نام و نشانم مپرس



غالب کا خط چودھری عبدالغفور سرور کے نام



سرور کے قطعات اور اُن پر غالب کی اصلاحیں







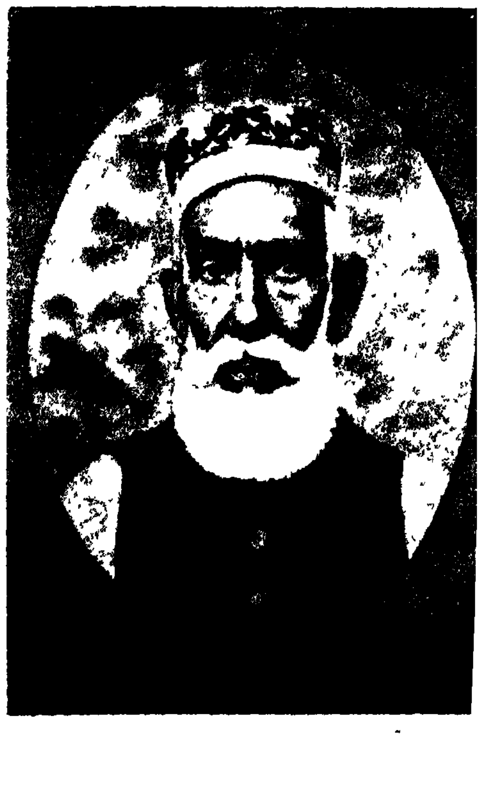
مُعظّم زمانی بیگم عُرف بگّا بیگم

۱۸۵۲ - ۱۹۴۵ء

آپ نواب ضیاء الدّین احمدؔ خاں نیرّ رخشاں کی صاحبزادی اور میرزا باقر علی خاں کامل (خلف مرزا زین العابدین عارف) کی بیوی تھیں ۱۹۴۵ء میں وفات پائی۔ صندل خانہ مرزا بابر (قطب صاحب) میں دفن ہوئیں۔

اُوپر دائیں طرف :۔ جناب بگّا بیگم کی سب سے بڑی صاحبزادی محمّد سلطان بیگم عرف جند دبیگم دائیں طرف بیٹھی ہیں۔ یہ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی نیرّ رخشاں کے پوتے اور مرزا شہاب الدّین احمدؔ خاں ثاقب کے صاحبزادے مرزا شجاع الدّین احمدؔ خاں تاباں مرحوم سے ہوئی تھی ۱۹۵۴ء میں انتقال فرما گئیں۔

(بائیں طرف) جناب بگّا بیگم کی دوسری صاحبزادی رقیہ سلطان بیگم عرف مچھن بیگم ہیں۔ ان کا سالِ ولادت ۱۸۶۷ء ہے۔ ان کا نکاح کرنیل ذوالنورعلی احمدؔ مرحوم (آئی ، ایم ، ایس) سے ہوا تھا۔



بابو ہرگوبند سہائے نشاط شاگرد مرزا غالب (۱۸۲۸ء — ۱۸۹۱ء)

ہربنس سنگھ دوست

ہولی

اندر عورتیں گا رہی تھیں -

چُھپ چُھپ چھم چھم چلی سانوری
گھیر لیئو گھنشیام . . . . .
آں ں ں . . . . گھیر لیئو گھنشام

اور باہر جیسے دنیا بھر کے رنگ آ گئے تھے - تمام لوگ ہولی کھیل رہے تھے' اور ایک دوسرے کو بُری طرح رنگ رہے تھے - جب کسی پر رنگ گرتا تو ایک عجیب سا شور چاروں طرف سے اُٹھتا اور کچھ چلا اُٹھتے --- ہولی ہے -"

نوجوانوں کے انگ انگ میں آج مستی بھری پڑی تھی' اور آنکھیں بھنگ پی پی کر سُرخ ہو رہی تھیں - چہرے بھی بالکل انوکھے لگ رہے تھے - کسی کا ہرا' کسی کا سفید' کسی کا لال . . . . اور کسی کا بالکل سیاہ - دفعتاً نوجوان ایک سفید پوش بڑھیا کو اندر سے کھینچ لائے - واہ --- کس ٹھاٹھ سے سفید کپڑے رکھ چھوڑے تھے اب تک اس نے - تمام بے چین تھے کہ میری پچکاری کا رنگ بڑھیا کے کپڑوں پر پڑے اور بڑھیا منت سماجت کر رہی تھی کہ نہیں بھائی - نہیں بیٹا گلال' عبیر سے آگے نہ بڑھو - لیکن وہ کس نے کسی کی سنی تھی جو اب سُنتا لے۔

فیصلہ ہوا کہ صرف ایک پچکاری رنگ ڈالا جائے اور بوڑھی ماں کو چھوڑ دیا جائے - لیکن ایک پچکاری کا پڑنا تھا کہ چاروں طرف جیسے رنگوں کا طوفان آ گیا - بڑھیا کے کپڑے رنگ برنگے ہو گئے' اور بڑھیا کانپتی' بڑبڑاتی اندر عورتوں میں چلی گئی - نئے نئے رنگوں کا امتزاج بڑا اچھا لگ رہا تھا -

اندر عورتیں گا رہی تھیں -

ہاں دھر لینی' اچانک دوڑی . . . .

باہر قہقہے پر قہقہہ چھوٹتا تھا - عورتیں اور مرد آج گھل مل سے گئے تھے دو چار عورتیں جو باہر تھیں' ہر طرح مردوں کا ہاتھ بٹا رہی تھیں -

راموا اندر اُداس بیٹھا تھا' اور اپنے پاؤں کی ان انگلیوں کو دیکھ رہا تھا' جن میں کوڑھ اچھی طرح پھوٹ چکا تھا - کوڑھ آج کوئی نیا نہیں تھا - قریب قریب سال پورا ہو گیا تھا اسے ظاہر ہوئے' لیکن آج جتنا اُسے احساس ہو رہا تھا کبھی نہیں ہوا تھا - وہ نظریں نیچی جھکائے' خاموش آزردہ سا سوچ رہا تھا -

پچھلے برس وہ بھی ہولی میں شریک تھا' اور ان دوسرے نوجوانوں کی طرح پھولا نہ سماتا تھا - چاروں طرف رنگ ہی رنگ دکھائی دیتے تھے - اور رنگوں میں کس قدر مسرت اور تفریح نہاں تھی' آج تو جیسے ہر رنگ پھیکا تھا یا بالکل خراب' گدلا . . . . .

اُس نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا - آج اسے یوں ہی لگ رہا تھا . . . . کسی رنگ میں بھی تو جان نہیں تھی اور لوگوں کی ہنسی بھی کتنی پھیکی پھیکی لگ رہی تھی جیسے ہنسنے پر مجبور ہوں - کھوکھلے ہوں . . . .

وہ اپنی انگلیوں کی پوروں کو دیکھنے لگا جو بالکل سُرخ ہو رہی تھیں' اور سوزش سے پُر تھیں - ناخنوں کے چاروں طرف نیلاہٹ اور ایک عجیب سی کھجلی سی ہو رہی تھی -

. . . . پچھلے برس انھیں ہاتھوں سے اس نے آشا کے مُنہ پر عبیر ملا تھا گلال ملا تھا وہ شرم سے دوہری ہوئی جا رہی تھی اور اس بل کھا رہی تھی جیسے ہاتھوں میں سے نکل جانا چاہتی ہو - اور آخر اس نے کہا تھا' بس بھی کرو' اب کیا ملے ہی جاؤ گے -

اور آج تو وہ صبح سے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہولی کھیل رہی تھی چہرہ گلال سے بالکل سُرخ ہو رہا تھا' اور آنکھوں کی نیلاہٹ یوں معلوم پڑتی تھی جیسے کسی پچکاری کا نیلا رنگ اندر جا بسا ہو - کتنی خوبصورت لگ رہی تھی وہ . . . لیکن کیا خوبصورت لگتی ہے - راموا نے خیال کیا - بالکل بندر ہی تو معلوم پڑتی ہے . . . . کاش ! وہ اس کے پاس جا سکتا - اس کے ساتھ ہولی کھیل سکتا - . . . . پچھلے برس جب وہ دونوں بہت دیر تک بھنگ پیتے رہے تھے

تو واقعی نشے میں آگئے تھے ۔ وہ اُسے بولا تھا۔

آشا — جی چاہتا ہے یہ ہولی کبھی ختم نہ ہو۔ یہ نشہ کبھی نہ اترے۔ ہم بھنگ کے نشے میں یوں ہی باتیں کرتے رہیں ...،"

آشا نشے میں تھی، اسی لئے تو اس نے رامو کی ران پر ہاتھ مارا اور مسکرا کر بولی تھی۔

"تو تم کیا سوچتے ہو — یہ رنگ ختم ہو جائے گا"۔

"تو اور کیا رہ جائے گا" رامو نے نشے میں کہا تھا۔

"ذرا غور سے دیکھو" یہ کہہ کر اس نے پھر رامو کی ران پر ہاتھ مارا تھا اور ران پر کی دھوتی کو ہاتھ میں پکڑ کر بولی تھی — "یہ رنگ نہیں اترے گا رامو — بالکل پکا رنگ ہے"۔

اور رامو ران پر پڑے ہوئے سیاہ رنگ کو دیکھنے لگا تھا، اور ہنس پڑا تھا ...،"

اس نے کھڑکی کھولی۔ آشا شیامو کے منہ پر عبیر مل رہی تھی۔ شیامو کے ہاتھ میں بھی عبیر تھا۔ رامو کا دل بیٹھنے لگا۔ پچھلے برس کی ہولی اس کی آنکھوں کے سامنے تھی، اور وہ دونوں برسوں کا موازنہ کرکے دیکھ رہا تھا کہ کتنی بڑی تبدیلی آگئی ہے ..... آشا شیامو کے عبیر مل چکی تو شیامو نے اپنا ہاتھ اٹھایا لیکن آشا اُچھلی اور یہ جا وہ جا — اندر عورتوں میں جا شامل ہوئی۔ اندر گیت گایا جا رہا تھا۔

.... ادچھوڑ تو دو میری بَنیاں

رامو سوچ رہا تھا۔ کاش! وہ ٹھیک ہو سکتا۔ اُسے تندرستی نصیب ہوتی۔ گاؤں کے لوگ اس کے قریب آتے ہوئے بار بار تھوکتے نہ لیکن یہ اتنی جلدی بھلا کیوں کر ممکن ہو سکتا تھا۔ نو دس ماہ ہو گئے تھے اُسے جا بجا علاج کراتے۔ لیکن ابھی تک کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا اب پاس کے شہر کے ایک ڈاکٹر کی دوا کھا رہا تھا۔ اس سے بیماری بڑھنا بند ہو گئی تھی۔ اور یہی کیا کم بات تھی۔ اگر یہ بھی نہ ہوتا تو یقیناً دو ایک ماہ بعد اس کے سارے جسم پر پِلپِلی سی پٹیاں دکھائی دیتیں۔

یہ خیال آتے ہی اُسے کچھ تسلی ہوئی کیونکہ اگر ڈاکٹر کی دوا سے بیماری کی ترقی رک سکتی ہے تو ڈاکٹر کی دوا اسے ختم بھی کر سکتی ہے اور ڈاکٹر نے اُسے کہا بھی تو تھا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ دی ہوئی حیاتین کی گولیاں کھاتے جاؤ، اور دن میں دو بار دئے ہوئے صابن سے دھو کر دوا لگا لیا کرو اور ہفتے کے بعد آکر انجکشن لگوا جایا کرو تو کوئی عجب نہیں کہ دو ہی تین ماہ میں دوسرے لوگوں کی طرح کے ہو جاؤ۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اچھا ہو رہا ہے۔

وہ سوچنے لگا۔ آشا کس قدر پیاری لڑکی ہے۔ کس قدر معصوم اور خوبصورت لیکن اب تو جب سے بیماری پھوٹی ہے کبھی اچھی طرح نہیں بولی۔ دو چار بار اگر بولی بھی ہے تو دُور ہی سے، کہ کیسے کچھ آرام ہے پہلے سے؟

لیکن اس نے بھی تو کبھی اُسے بات کرنے کا موقع نہیں دیا۔ جب بھی وہ سامنے آئی، اپنے زخموں کو چھپاتا ہوا اندر آگیا..... آخر اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے۔ اُسے موقع تو ملنا چاہئے ورنہ وہ کس طرح بات کر پائے گی بھلا .... لیکن کیا اُسے اور کوئی نہیں ملتا جو وہ ایک کوڑھی سے پیار کرے گی، آخر اس کا بھی تو دل ہے۔ اس کی بھی تو کوئی پسند ہے۔ پیار کوئی کھیل تو ہے نہیں کہ جس کے ساتھ چاہا کھیل لیا ....

وہ پریشان سا ہو گیا۔ ماتھے پر جیسے پسینہ آگیا۔ اس نے قمیص کے دامن سے ماتھا پونچھا لیکن پسینہ کہاں — پسینہ آئے تو نو دس ماہ بلکہ سال گزر گیا تھا .... لیکن ان دنوں وہ اس بات پر پورا یقین لا رہا تھا کہ پیار صورت و شکل یا جسم سے نہیں، بلکہ دل و روح سے ہوتا ہے۔

اسے ایک دفعہ کا واقعہ یاد آنے لگا۔ اس نے آشا کو کہا تھا۔ آشا! اگر تیری شادی مرے ساتھ ہو تو تم خوش ہو گی یا ناخوش،

اور وہ شرما گئی تھی۔ لیکن وہ سب کچھ سمجھ گیا تھا۔

"لیکن فرض کرو کہ میں کانا یا اندھا ہو جاؤں —" اس نے پوچھا تھا

"چپ رہو جی ...،" آشا نے اس کے منہ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

پھر اُسے یاد آیا کہ اس "چپ رہو جی ...،" میں ایک ہلکی سی چیخ بھی شامل تھی، اور پھر دیر تک پیار اور محبت کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ وہ دیر تک ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے باتیں کرتے رہے تھے اور چاروں طرف جیسے فضا معطر تھی — عجیب دن تھے وہ بھی ....

واقعی کتنی عجیب بات تھی کہ وہی آشا جو پہلے اتنے بڑے بڑے وعدے کیا کرتی تھی اور ہر وعدے میں یقین دلاتی تھی کہ وہ رامو کو پیار کرتی ہے اور کرتی رہے گی، آج اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ اور اس پر اس کی نظر پڑ

بھی جاتی تھی تو عجیب طنزیہ سی مسکراہٹ بکھیرتی آگے بڑھ جاتی تھی ۔

وہ من ہی من میں بل کھانے لگا ۔

وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا ۔ اس کے کپڑے ابھی تک سفید تھے باہر نوجوانوں اور عورتوں نے پچکاریاں کس لیں اور مطلع کرتے ہوئے چلائے "ہوشیار رامو' ہوشیار"۔

اور اس نے دیکھا کہ آشا بھی ایک ہاتھ میں پچکاری لئے کھڑی ہے اسے کچھ تسکین سی ہوئی' اور ایک لمحے کے لئے آشا کے متعلق بالکل صاف ہو گیا ۔ جیسے اُسے اُس سے کوئی شکوہ نہ ہو' کوئی شکایت نہ ہو ۔

لیکن رنگوں سے اس کے کپڑے بھیگ جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ آشا شرمائی سی اندر چلی گئی ۔ باقی بھی اپنے اپنے کام میں مصروف ہوگئے ۔ کچھ ایک طرف جا کر بیٹھ گئے' کچھ ٹھمریں گنگنانے لگے ۔ اندر عورتیں گا رہی تھیں ۔

اُدی میں بھیگ گئی' مو پہ نہ مارو پچکاری

وہ باہر کے دروازے کی دہلیز پر بیٹھ گیا ۔

اسے ماضی کو یاد کرکے اپنی قسمت پر اور قسمت سے زیادہ آشا پر غصہ آرہا تھا ۔ اس کے دماغ میں ایک طوفان آشا کے خلاف طیار ہو رہا تھا ۔ وہ بار بار اپنے آپ کو کسی دوسری طرف منہمک کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ طوفان گھٹنے کا نام نہیں لیتا تھا' اور بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا ۔ عورت ذات بھی کس قدر کم ذات ہوتی ہے ۔ جب تک صحت ہے' خوبصورتی ہے محبت کا دم بھرتی رہی اور جیسے ہی ذرا سی خامی پیدا ہوئی' کنارہ کش ہوگئی ۔

کون کہتا ہے محبت دل سے ہوتی ہے ۔ محبت تو ایک سودا ہے ۔ جس طرح بازار میں ہم سودا دیکھ کر کرتے ہیں ۔ چیز کو ہر طرح خوبصورت' پائیدار اور موزوں پاتے ہیں ۔ تب خریدتے ہیں' اسی طرح محبت بھی تو ایسی ہی ایک چیز ہے ۔ اگر محبت خوبصورتی' صحت اور چال ڈھال نہیں دیکھتی تو کیوں نہیں ہمیں کسی پتھر سے محبت ہو جاتی ۔ کیوں نہیں ہمیں کسی بھک منگی یا کوڑھی عورت سے محبت ہو جاتی ۔

کوڑھی عورت کا خیال آتے ہی وہ کانپ اُٹھا ۔ اس کا رنگ بالکل زرد سا ہوگیا ۔ آنکھیں پہلے سے کچھ گہری معلوم ہونے لگیں ۔ قسمت نے اُسے کہیں کا بھی نہ رکھا تھا ۔ ایسی خطرناک بیماری اُسے لگی تھی کہ تمام

اس سے نفرت کرنے تھے ۔ اور جب سبھی اس سے نفرت کرتے تھے تو پھر آشا سے کس طرح محبت کی امید رکھی جا سکتی تھی ۔

منگو تیلی کے یہاں کام کرنے والی اس کے لئے بھنگ کے شربت کا ایک گلاس لے آئی ۔ گلاس کانچ کا تھا ۔

اس کا دل جل گیا ۔ تمام لوگوں کو کانسے کے گلاس اور اس کے لئے کانچ کا گلاس ۔ پہلے تو اس کا دل چاہا کہ وہ گلاس واپس کر دے لیکن نہ جانے کیوں وہ انکار نہ کر سکا ۔ اس نے آہستہ سے گلاس اُٹھایا اور اپنے ہونٹوں سے لگا لیا ۔

ایک ہی سانس میں ساری بھنگ پی جانے کے بعد اُسے منگو تیلی کی نوکرانی کے ہاتھ میں گلاس پکڑا دیا ۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کانچ کے گلاس میں بھنگ کا شربت نہیں پیا ۔ شارع عام چوٹ کھائی ہے ۔

وہ پریشان ہو اٹھا

غصے میں پھر اضافہ ہوا اور وہ دوبارہ انجانے طور پر آشا ہی کے پاس چلا گیا ۔ دل ہی دل میں اسے عجیب عجیب طرح کوسنے لگا ۔ ہرجائی کہیں کی !

اُسے اس بات کا رتی بھر بھی احساس نہیں تھا کہ زیادتی کر رہا ہے ۔ ایسا معلوم پڑتا تھا کہ اگر آشا ابھی اس کے پاس آجائے تو یہ اُسے گالیاں دینے لگے گا اور ممکن ہے دو چار ہاتھ بھی جما دے ۔

دو بج رہے تھے اور ہولی کی دھوم دھام اب قدرے کم ہوگئی تھی عورتیں سب اندر تھیں اور گانے میں مصروف تھیں ۔ مرد آہستہ آہستہ سب چوپال پر جا بیٹھے تھے ۔

رامو کے غصے میں کچھ بھی کمی نہیں ہوئی تھی ۔ اور وہ بیٹھا عجیب سی باتیں سوچ رہا تھا ۔

اچانک آشا اپنے گھر سے باہر نکلی ۔

اس کا دل چاہا اُسے بلائے اور پھر کھری کھری سُنائے ۔

آشا نے گلی میں چاروں طرف دیکھا ۔ کوئی بھی تو نہیں تھا ۔ اور پھر رامو کو دیکھ کر ٹھٹھک سی گئی' اور واپس اندر چلی گئی ۔

رامو کو جیسے آگ لگ گئی ۔ اس قدر نفرت کہ سامنے کھڑی بھی نہیں

ہو سکتی۔ سال بھر پہلے یہی دنیا بھر کے وعدے کرتی تھی اور اپنی محبت اور جذبے کا ثبوت دیتی تھی' اور آج وہ سامنے کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ سوچنے لگا کہ جب وہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق دو تین ماہ کے بعد ٹھیک ہو جائے گا تو آشا سے بات نہیں کرے گا اور اگر اس نے ابتدا کی تو وہ اُسے کھری کھری سنائے گا۔

اس سے اُس کے غصّے کو اور ہوا ملی' اور آشا سے انتقام لینے کے لئے عجیب و غریب پلان بنانے لگا۔

یکایک اس نے مُڑ کر دیکھا تو آشا اس کے پاس سے گزر رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ یہ ڈانٹ کر آشا کو بُلائے لیکن مُنہ میں جیسے زبان نہ تھی۔ ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

آشا نے جیسے اس کی آنکھوں میں سے کچھ پڑھا اور اس کے پاس آگئی اور پھر اُس کے چہرے کی طرف لپکی اور مٹھی میں چھپایا ہوا گلال اس کے چہرے پر مل دیا۔ جو اب تک بے رنگ تھا۔

رامو کا سارا غصّہ جیسے ہوا ہو گیا۔ وہ چلّایا "مجھ سے دور رہو آشا مجھ سے دور رہو"۔

لیکن گلال ملا جا چکا تھا۔ آشا نے تھالی میں گلال لگوانے کے لئے دوسری مُٹھی کا گلال اس کے ہاتھ پر ڈال دیا اور انتظار کرنے لگی۔

"نہیں نہیں آشا ...." رامو صرف نہ نہ کہے جا رہا تھا۔

آشا نے خود اس کا ہاتھ اپنے چہرے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا "چھی چھی۔ اتنا بھرم کرتے ہو۔ اگر مجھے ہو جاتا تو کیا ہاتھ نہ لگاتے"۔

اور گلال کا رنگ چہرے پر چڑھنے لگا۔

اندر عورتیں گا رہی تھیں

سجھ سیتاں آئے نہ

کہ گلال ملے یا تو گال ....

آں ں ں گلال ملے یا تو گال

ڈاکٹر ایس۔ ایس پوریوال

قومی زندگی میں سبزیوں کی اہمیت

موجودہ زمانے کی انسانی خوراک میں سبزیوں کی شمولیت از بس لازمی ہے کیونکہ ساگ پات حیاتین' معدنی عناصر' نمک اور خام ریشے مہیا کرنے کی وجہ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ عمدہ اور اچھی طرح پکائی ہوئی سبزیاں خوراک کے ذائقے' رنگ اور خوشبو میں اضافے کا باعث بنتی ہیں اور کھانے کی رغبت بڑھاتی ہیں۔ جسم انسانی کے لئے ضروری تیزابی مادے کی موجودگی کی وجہ سے سبزیاں نہ صرف بہت لذیذ ہوتی ہیں بلکہ وہ جسم کے اندرونی عمل میں بھی معاون بنتی ہیں۔

حیاتین - انسانی جسم کی نشو و نما' صحت اور افعال کے لئے حیاتین بہت ضروری ہیں۔ حیاتین الف سردی' زکام' انفلوئنزا' امراض سوزش چشم اور شب کوری' پائیریا اور دیگر بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ گاجر' پالک' شلغم' کرم کلہ' پودینہ' کوتھمیر' چولائی' ٹماٹر' کاہو اور شکر قندی جسم کو حیاتین الف مہیا کرتے ہیں۔ آدھ پاؤ سبز پتوں والی سبزیاں کھانے سے ایک بالغ انسان کے لئے درکار حیاتین الف جسم کو بآسانی حاصل ہو جاتے ہیں۔

حیاتین ب - لوگوں کی صحت مندی' افعالِ ہاضمہ کی درستگی اور استسقا کی قسم کی بیماریوں سے بچاؤ کے لئے بے حد مفید ہوتے ہیں۔ یہ حیاتین سبزیوں میں کم مقدار میں پائے جاتے ہیں لیکن سیم اور لوبیا کی پھلیوں' شکر قندی' سبز مٹر' خشک اور ہرے پیاز' کرم کلہ اور ٹماٹر میں یہ حیاتین کافی مقدار میں موجود ہوتے ہیں اور سالم دالوں اور گری دار اشیا خاص کر مونگ پھلی میں یہ حیاتین سب سے زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں۔

حیاتین ج - فسادِ خون اور خارش کی بیماریوں سے بچاتے ہیں' خون اور خون کی نالیوں نیز جوڑوں کو درست حالت میں رکھتے ہیں۔ یہ حیاتین پالک' کرم' کرم کلا' آبی سلاد' ماٹر اور پھول گوبھی میں بکثرت ملتے ہیں۔ آملہ میں حیاتین ج بہت زیادہ موجود ہوتے ہیں۔ ایک آملہ میں اتنے حیاتین ج ہوتے ہیں جتنے دو سنگتروں میں ہو سکتے ہیں۔

معدنی عناصر - ہڈیوں اور دانتوں کی ساخت میں خون اور جسمانی مائع کی بناوٹ اور جسم کے نظام کے افعال میں معدنی عناصر اور نمک استعمال ہوتے ہیں۔ پھلوں اور سبزیوں اور معدنی عناصر اور نمک بہتات سے موجود ہوتے ہیں۔ چولائی' میتھی اور پالک وغیرہ کے ساگ اور پتے دار سبزیوں میں کیلسیم بکثرت ہوتا ہے۔ گاجر' پیاز' ٹماٹر میں لوہا شامل ہوتا ہے

جے شنکر پرشاد

اپنا وقار

جے شنکر پرشاد ہندی کے ایک مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں۔ آپ کاشی کے ایک مشہور تجارتی خاندان میں پیدا ہوئے اور گھر ہی پر ہندی، اردو، فارسی، سنسکرت کی تعلیم حاصل کی۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن اور سنسکرت زبان کے دلدادہ تھے۔ آپ کا نقطۂ نظر ادب کی دو خاص صنفوں' تمثیل نگاری اور شاعری' پر مرکوز تھا۔ چنانچہ اس میں کمال حاصل کیا۔ آپ کے ڈراموں میں چندر گپت، راج شری اسکند گپت، ننکھا، جنمیجے کا ناگ یگیہ، کا منا، ایک گھونٹ بہت مشہور اور مقبول ہیں۔ آپ نئے دور کی ہندی شاعری کے موجد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آپ کی نظموں کے بھی مختلف مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً لہرا جھرنا، آنسو اور کویتا کانن وغیرہ ــــ آپ کی کامائنی نظم پر آپ کو ایک انعام بھی ملا تھا۔ آپ کے ناولوں میں کنکال اور تتلی بہت مشہور ہیں ــــ زیر نظر مضمون آپ کے ایک ہندی ڈرامے کا اردو قالب ہے جو چندر گپت ناٹک سے لیا گیا ہے۔ (کلیم اللہ فاروقی کلیم مترجم)

(۱)

مقام:۔ تکشلا کے گورو کل کا مٹھ

اشخاص:۔ چانکیہ اور سنگھرن

چانکیہ:۔ (سنگھرن سے) عالی ہمت! اب تمہارا وقت پورا ہو چکا ہے۔ اور ناظم علی نے مجھے گھریلو زندگی میں داخل ہونے کی اجازت دے دی ہے۔ اب تک مجھے محض تمہیں لوگوں کو علم اقتصادیات کا درس دینے کے لئے ٹھہرایا تھا، کیونکہ سالِ رواں کے تمام ہونے والے گریجوئیٹوں کو اقتصادیات کا درس دے کر مجھ حقیر کو گورو دکشنا کے فرض سے سبکدوش ہو جانا ہے۔

سنگھرن:۔ صاحب جاہ و جلال! مالووں کو علم اقتصادیات کی اتنی ضرورت نہیں جتنی علم حرب کی۔ یہی سبب ہے کہ میں ہمیشہ اپنے ہم سبقوں سے پیچھے رہا۔ لہٰذا معافی کا خواستگار ہوں۔

چانکیہ:۔ اچھا! تم اب مالوہ جا کر کیا کرو گے؟

سنگھرن:۔ مجھے تو تکشلا کی سیاسیات پر نظر رکھنے کا حکم ملا ہے۔ فی الحال مالوہ جانے کا کوئی عزم نہیں ہے۔

چانکیہ:۔ مجھے خوشی ہے کہ علم اقتصادیات کی تعلیم تمہارے لئے سود مند ہوگی۔ کیا تم جانتے ہو کہ یونوں (یونانیوں اور مسلمانوں) کے سفیر یہاں کیوں آئے ہیں؟

سنگھرن:۔ میں خود اس بات کا پتہ لگانے کی فکر میں ہوں۔ آریہ ورت کا مستقبل لکھنے کے لئے بغاوت اور سازش کا قلم اور سیاہی تیار ہو رہی ہے۔ اور شمالی راستے کی ریاستیں آپس کی منافرت اور خانہ جنگی سے کمزور اور مضمحل ہو چکی ہیں۔ جلد ہی خطرناک دسفوٹ ہوگا!

(یکایک آمبھیک اور الکا داخل ہوتے ہیں)

آمبھیک:۔ دسفوٹ؟ ؟ کیسا دسفوٹ؟ اور تم کون ہو جوان؟

سنگھرن:۔ ایک مالو (مالوہ کا رہنے والا)

آمبھیک:۔ صرف نام کی ضرورت نہیں، خاص تعارف کی ضرورت ہے۔

سنگھرن:۔ تکشلا گورو کل کا ایک متعلم۔

آمبھیک:۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم شریر بھی ہو!

سنگھرن:۔ کبھی نہیں شہزادے! عاجزی کے ساتھ نڈر رہنا مالووں کا خاندانی وقار ہے اور مجھے تکشلا کی تعلیم کا بھی غرور ہے۔

آمبھیک:۔ لیکن ابھی تم تو کسی دسفوٹ[1] کی باتیں کر رہے تھے! اور چانکیہ! تمہارا بھی اس میں کچھ ہاتھ ہے؟

(چانکیہ خاموش رہتا ہے)

آمبھیک:۔ (غصے میں) برہمن! تیری یہ مجال! میری حکومت میں رہ کر اور میرے ٹکڑوں سے

---

[1] کسی چیز کا اندر سے پھٹنا

پرورش پانے کے باوجود میرے ہی خلاف بغاوت کی سازشیں !

چاڑک :- شاہزادے ! برہمن نہ تو کسی کی قلمرو میں رہتا ہے اور نہ کسی کے ٹکڑے سے پرورش پاتا ہے - برہمن تو اپنی ہی حکومت میں گھومتا پھرتا اور آبِ حیات ہو کر زندۂ جاوید رہتا ہے - یہ تمہارا جھوٹا غرور ہے - برہمن اپنی تمام طاقتوں کے باوجود بھی اپنی ہی خواہش سے ان مٹی کے مانند ادہام کو ٹھکرا دیتا ہے اور خلق کی بھلائی کے لئے اپنے علم کی خیرات کرتا ہے -

آمبھیک :- یہ فرضی بڑائی محض دھوکے کا جال ہے - کھلے طریقوں سے ذلیل کاموں پر پردہ نہیں ڈال سکتے -

چاڑک :- لیکن وہ کیسے ہوگا ؟ یقین نہ لانے والے چھتری ! یہی سبب ہے کہ ڈاکو اور دوسرے فرقے کے لوگ اپنی اپنی سلطنت کا سنگِ بنیاد رکھ رہے ہیں - اور آریہ قوم زوال کے کنارے پر کھڑی ہوئی صرف ایک دھکے کی منتظر ہے - اور تم دھکا دینے کی سازشیں طلباء کو سکھا رہے ہو ؟

سنگھو :- طلباء اور سازش ؟ یہ تو غیر ممکن ہے - یہ تو وہی لوگ کر سکتے ہیں - جن کے ہاتھوں میں کچھ حقوق ہوں - جن کی خواہشات سمندر سے بھی بڑی اور کوہ شیر سے بھی بلند ہوں - جوہریوں کی دوستی کے لئے خود داہیک تک

. . . .

آمبھیک :- بس بس ! مشریر نوجوان ! بتا تیرا مقصد کیا ہے ؟

سنگھو :- کچھ بھی نہیں !

آمبھیک :- نہیں مجھے بتانا ہی ہوگا ، یہ میرا حکم ہے !

سنگھو :- گورو کل میں صرف ناظمِ اعلیٰ ہی کا حکم سر آنکھوں پر رکھا جاتا ہے ، اور ان کے علاوہ دوسروں کا حکم نافرمانی کے کان سے سُنا جاتا ہے شہزادے !

السکا :- میرے بھائی ! جنگل میں جھرنے والے صاف و شفاف آبشار کے مانند اس کے دل میں دیکھو کتنی روانی ہے ؟ یہ نافرمانی بھی لائقِ محبت ہے ، خیر ! جانے بھی دو !

آمبھیک :- خاموش رہو السکا ! یہ کوئی ایسی باتیں نہیں ہیں جو یوں ہی اڑا دی جائیں اس میں ضرور کچھ راز ہے -

(چاڑک خاموشی سے مسکراتا ہے)

سنگھو :- ہاں ہاں ضرور راز ہے ، راز ! یونانی حملہ آوروں کے دکھانے کے لئے سنہرے خوابوں سے اثر اندوز ہوکر آریہ ورت کی سکون سے بھری ہوئی خاموش رات کی غفلت بھری نیند میں شمالی راستے کا دروازہ آہستہ سے کھول دینے کا راز ہے ، کیوں شہزادے ! ممکن ہے شہنشاہ تکشلا داہیک تک اسی سازش کے لئے گئے ہوں -

آمبھیک :- (پیر ٹپک کر) اُف ، نوجوان ! تو قیدی ہے !

سنگھو :- کبھی نہیں ! ماں کبھی قیدی نہیں ہو سکتا -

(آمبھیک تلوار کھینچ لیتا ہے ، اتنے میں چندرگپت داخل ہوتا ہے)

چندرگپت :- ٹھیک ہے ! ہر آریہ جس کا کوئی قصور نہیں آزاد ہے آزاد ، اسے کوئی قیدی نہیں بنا سکتا - یہ کیا ہے شاہزادے ! تلوار کی کوش (تلوار کی میان ، خزانہ) میں جگہ نہیں ہے کیا ؟

سنگھو :- (مزاحیہ طرز سے) وہ تو سونے سے بھر گیا ہے !

آمبھیک :- ہوشیار ! تم سب سازش سے بھرے ہوئے ہو ! اور اس بے ادبی کو تو میری بے عزتی کا ثمرہ ضرور جھیلنا پڑے گا - یعنی سزائے موت !

چندرگپت :- کیوں ! کیا وہ ایک بے سہارا طالب علم تمہاری قلمرو میں تعلیم حاصل کرتا ہے ، اور تم ایک شہزادے ہو ، کیا اسی لئے ؟

[آمبھیک تلوار چلاتا ہے اور چندرگپت اپنی تلوار پر اسے روک لیتا ہے - آمبھیک کی تلوار چھوٹ جاتی ہے - وہ بے سہارا ہو کر چندرگپت کے حملے کا انتظار کرتا ہے - بیچ میں السکا آ جاتی ہے]

سنگھو :- بہادر چندرگپت ! بس جاؤ شہزادے ! یہاں کوئی سازش نہیں ہے اپنی سازشوں سے خود اپنی حفاظت کرو -

چاڑک :- شاہزادی ! میں گورو کل کا سردار ہوں - میں حکم دیتا ہوں کہ تم غصے سے لال پیلے شاہزادے کو اپنے ساتھ لے جاؤ - گورو کل میں حربوں کا استعمال صرف تعلیم کے لئے ہوتا ہے ، باہمی خانہ جنگی کے لئے نہیں ، یقین رکھنا کہ اس بدسلوکی کی خبر شہنشاہ کے کانوں تک نہ پہونچ پائے گی -

السکا :- ایسا ہی تو بہتر ہے ! بھائی چلو !

(غصے کی حالت میں آمبھیک بھی اس کے ساتھ جاتا ہے)

چاڑک :- (چندرگپت سے) تمہارا سبق ختم ہو چکا ہے اور آج کا یہ حادثہ غیر معمولی ہے - میری رائے ہے کہ تم جلد از جلد تکشلا چھوڑ دو ، اور سنگھو ہرن تم بھی !

چندرگپت :- صاحبِ جاہ و جلال ! ہم ماگدھ (مگدھ کا باشندہ) ہیں اور یہ مانو ، بہتر تو یہ ہوتا کہ اسی گورو کل میں جب ہم لوگ آلاتِ حرب کا بھی امتحان

دیتے۔

چانڑک :- کیا یہی میری تعلیم ہے؟ بچوں کی سی شوخی دکھانے کی یہ جگہ نہیں۔ تم لوگوں کو وقت آنے پر آلاتِ حرب کا استعمال کرنا پڑے گا۔ لیکن بلاوجہ خون خرابہ سیاسی شعور کے خلاف ہے۔

چندر گپت :- لائق صد تعظیم و تکریم! دُنیا بھر کی سیاست اور تعلیم کا مطلب میں نے یہی سمجھا ہے کہ اپنے وقار کی حفاظت کے لئے مرمٹنا ہی سنہری زندگی ہے۔ سنگھو میری روح کا حصّہ اور میرا دوست ہے اور اس کی عزّت میری اپنی عزت ہے۔

چانڑک :- میں دیکھوں گا کہ تم اپنے وقار کے لئے مستقبل کے امتحان میں کس درجہ کامیابی حاصل کرتے ہو۔

سنگھو :- آپ کی دعاؤں سے ہم لوگ ضرور کامیاب ہوں گے!

چانڑک :- اپنے وقار کے تحفظ سے پہلے اسے پہچاننا ہوگا۔ شخصی وقار کے لئے تو تم تیار ہو کیونکہ تم مالوی ہو اور یہ مگدھی۔ یہی تمہارے وقار کی حد ہے لیکن اپنا وقار اتنے ہی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ مالوی اور مگدھی کو بھول کر جب تم آریہ ورت کا نام لوگے جبھی وہ حاصل ہوگا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ مستقبل میں آریہ ورت کی تمام آزاد حکومتیں ایک ایک کرکے بیرونی فاتح کے پیروں تلے روندی جائیں گی۔ آج جس مذاق کو لے کر اتنا بڑا حادثہ ہوا، اس کا حق اب یہیں تک نہیں رہا۔ مستقبل قریب میں ہونے والے شہنشاہ گاندھار آمبھیک کے دل میں وہ باتیں تیر کی طرح چبھ گئی ہیں۔ پنچ ندنریش پروتیشور کی مخالفت کے سبب یہ ذلیل دل والا آمبھیک یونانیوں کو خوش آمدید کہے گا اور آریہ ورت کو خاک میں ملائے گا۔

چندر گپت :- اُستادِ معظّم، یقین رکھیں۔ یہ سب کچھ بھی نہیں ہونے پائے گا۔ یہ چندر گپت آپ کے قدموں کی قسم کھا کر عہد کرتا ہے کہ یَون (یونانی) یہاں کچھ نہ کر سکیں گے۔

چانڑک :- ذی حوصلہ عالی ہمت! تمہارا عہد مصمم ہو۔ لیکن اس سے پہلے مگدھ جا کر تم تمام ذرائع سے مطمئن ہو۔ یہاں کا گذارنا ہے سو ہے۔ میں بھی پنچ ندنریش سے ملاقات کرتا ہوا مگدھ آؤں گا۔ کیونکہ مجھے ذریعۂ معاش کی تلاش ہے اور سنگھو بہرحال تم بھی ہوشیار رہنا۔

سنگھو :- صاحب بہادر! آپ کی دعائیں ہی میری حفاظت کریں گی۔

(چندر گپت اور چانک رخصت ہوتے ہیں)

سنگھو :- ایک آگ سے بھرا ہوا گندھک کا فتیلہ آریہ ورت کے آہنی ذخیرۂ حرب میں گھس کر وسفوٹ (دھماکہ) کرے گا جس میں جنگ کی دیوی قوس و قزح سا رخ کا مارنا تھوں میں لئے نیلگوں جنگ کے بادل میں گھومے گی اور بہادروں کے دلوں کے طاؤس ناچیں گے۔ دیوی! آؤ تم کو مبارک ہو۔ (النکا داخل ہوتی ہے)

النکا :- مالوی بہادر۔ ابھی تک تم نے تکشلا نہیں چھوڑا!

سنگھو :- یہ کیوں دیوی! کیا میں یہاں رہنے کے قابل نہیں!

النکا :- نہیں! میں تمہارے آرام اور چین کے لئے فکر مند ہوں۔ بھائی نے گو کہ تمہارا قصور کیا ہے لیکن وہ بےسبب نہ تھا جس کا جو راستہ ہے وہ چلے گا۔ اس پر غور و فکر کرنے کا سب کو حق نہیں حاصل۔ تم نے بنا حقوق اس پر غور کیا تھا۔ میں دیکھتی ہوں کہ کبھی کبھی انسان دوسروں کو اپنی راہ پر چلانے کے لئے رک بھی جاتا ہے اور اپنا چلنا بھی ترک کر دیتا ہے۔

سنگھو :- لیکن شریف دیوی! ایام زندگی میں مختلف راستوں پر چل کر انتہا تک جو ٹھہرتا ہوا چلتا ہے وہ دوسروں کو فائدہ ہی پہنچاتا ہے یہ تکلیف دہ تو ہے لیکن بیکار نہیں۔

النکا :- لیکن انسان کو اپنی زندگی اور آرام و آسائش کا بھی خیال رکھنا ہی چاہیئے۔

سنگھو :- انسان کب کشش سے بھی خطرناک، جانور سے بھی ڈراؤنا اور پتھر سے بھی سخت، بے رحم اور بے مروّت اور سخت دل والا ہوگا، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ماضی اور مستقبل کے لئے تو فکر ہی کیوں اور حال کو میں اپنے مطابق ہی بناؤں گا۔ پھر غور و فکر کا سوال ہی کیا۔

النکا :- تمہارے ملک کے لئے تمہاری زندگی بیش قیمت ہے، لیکن وہی یہاں مصیبت میں ہے۔

سنگھو :- شہزادی! میں تمہاری اس مہربانی کا شکرگزار ہوں لیکن میرا ملک مالوہ ہی نہیں گاندھار بھی ہے۔ یہی کیا بلکہ سارا آریہ ورت ہے، اس لئے میں ....

النکا :- (تعجب سے) یہ کیا کہہ رہے ہو؟

سنگھو :- گاندھار آریہ ورت سے مختلف نہیں۔ اسی لئے اس کے زوال کو میں اپنی بے عزتی سمجھتا ہوں

النکا :- (سانس لیتے ہوئے) میں اسے محسوس کر رہی ہوں لیکن جس ملک میں ایسے شجاع نوجوان ہوں، اس کا زوال غیر ممکن ہے۔ مالوی بہادر! تمہارے دل کی طاقت میں آزادی کا منتر اور تمہارے مضبوط بازوؤں میں آریہ ورت کے تحفظ کی طاقت بھری ہے۔ تمہیں محفوظ ہی رہنا چاہئے۔ میں بھی آریہ ورت کی دوشیزہ ہوں۔ اسی رشتے سے میں تم سے گذارش کر رہی ہوں کہ تم جلد از جلد گاندھار سے ہجرت کر دو۔ میں آمبھیک کو اپنی طاقت بھر سمجھاؤں گی اور زوال سے بچانے کی کوشش کروں گی۔ اگر وہ نہ مانا تو تمہاری ضرورت ہوگی، جاؤ بہادر!

سنگھو :- اچھا شہزادی! تمہاری ہمدردانہ مخالفت سے میں جانے کے لئے تیار ہو رہا ہوں۔ جلد ہی چلا جاؤں گا، دیوی! لیکن کاش کہ کسی طرح سندھ ندی کی تیز دھار کو یہ کشتیاں پار نہ کر سکیں۔۔۔

النکا :- میں کوشش کروں گی بہادر! ہاں تمہارا نام؟؟

سنگھو :- مالوگڈھ کے راشٹرپتی کا فرزند سنگھو ہوں!

النکا :- پھر کبھی کمار! ہوشیار!

(دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں) (پردہ گرتا ہے)

شعر و سخن

غزل

ارشد کاکوی

دور کس بیکسی کا آیا ہے
کل جو اپنا تھا اب پرایا ہے

حسن اور مائلِ کرم؟ کیا خوب
عشق نے پھر فریب کھایا ہے

چاند تاروں کی چھاؤں سے پیارا
آپ کے گیسوؤں کا سایا ہے

زندگی اور ہوگئی پیاری
موت کا دن قریب آیا ہے

جس کو دنیا نشاط کہتی ہے
درحقیقت وہ غم کا سایا ہے

اس کو اللہ صرف راحت دے
جس نے مجھ کو فقط رُلایا ہے

سو گئی چشمِ انتظار آخر
کون آئے گا کون آیا ہے

جب بھی جاگا ہوں نیند سے ارشد
غم نے آکر مجھے جگایا ہے

غزل

شفا گوالیاری

بڑھے گم گشتگی آسودگی ایسی بھی ہوتی ہے
نظر رہ جائے کھو کر روشنی ایسی بھی ہوتی ہے

جو منزل بخش دے وارفتگی ایسی بھی ہوتی ہے
خودی کو تھگیا شعورِ بیخودی ایسی بھی ہوتی ہے

جو کر دیتی ہے ساری عمر کی تاریخ کو روشن
حیاتِ مختصر میں اک گھڑی ایسی بھی ہوتی ہے

ہنسی میں اشک اشکوں میں ہنسی بھی ہو تو ہم سمجھے
الم ایسا بھی ہوتا ہے خوشی ایسی بھی ہوتی ہے

پناہیں مانگتی ہے دشمنی کی مصلحت جس سے
خدا محفوظ رکھے دوستی ایسی بھی ہوتی ہے

ہماری مسکراہٹ میں اداسی دیکھنے والے
غموں سے جو سنورتی ہے خوشی ایسی بھی ہوتی ہے

نہ ہر اک سرپھرے پر مسکراؤ تم حقارت سے
خرد افروز ہو دیوانگی ایسی بھی ہوتی ہے

عزائم میں جوانی ہے نہ قدموں میں روانی ہے
شفا یہ کھیل کیا ہے، زندگی ایسی بھی ہوتی ہے؟

عرفانِ حیات

افسر سیمابی احمد نگری

زمیں اُسی کے لئے آسماں اُسی کے لئے
بسے جو خاک میں ناموسِ زندگی کے لئے

جو بدنصیب ہے فیضانِ عشق سے محروم
نہ موت کے لئے موزوں نہ زندگی کے لئے

یہ کیا نظام ہے یارب تری خدائی کا
خوشی کسی کے لئے فکر و غم کسی کے لئے

وہ ظلمتیں ہیں سوادِ حیات پر طاری
کہ مہر و ماہ ترستے ہیں روشنی کے لئے

سمومِ جور ہے یا آپ کی نسیمِ کرم
کہ ایک موجِ تبسم نہیں کسی کے لئے

خرابِ کفر و دینیں کو نگاہ دے یارب
کہ زندگی ہے گریزاں ہے زندگی کے لئے

حریمِ عرش بھی اس کا طواف کرتا ہے
جو اپنے دل کو جلاتا ہے روشنی کے لئے

میں ترجمانِ رموزِ حیات ہوں افسر
مرا کلام ہے عرفانِ زندگی کے لئے

غزل

جلیل عرشی

بات جب دل کی زباں پر آگئی
بن کے افسانہ جہاں پر چھا گئی

جس قدر چاہا نکالیں پیچ و خم
زلفِ گیتی اور کچھ بل کھا گئی

میں تو دیوانہ تھا دنیا تو نہ تھی
کیوں فریبِ آرزو میں آگئی

ہوش ننگِ عاشقی کا نام ہے
بیخودی آکر مجھے سمجھا گئی

سیکڑوں تھے حسن کے حائل حجاب
بیخودی کیوں درمیاں میں آگئی

دل سے جب احساسِ غم جاتا رہا
نیند کانٹوں پر بھی اکثر آگئی

اب خیالِ عیش اے عرشی کہاں
ناامیدی حسرتوں پر چھا گئی

حبیب تنویر

ڈراما اور تعلیم

"انھیں اپنی محبت دو۔ لیکن اپنے خیالات ان پر مسلط نہ کرو۔ کیونکہ ان کے پاس ان کے اپنے خیالات ہیں"۔

ان کا جسم تو تم اپنا سکتے ہو۔ مگر روح اور دل میں گھر نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی روح کا گھر مستقبل کا وہ محل ہے۔ جہاں تم کبھی نہیں پہنچ سکتے خواب میں بھی نہیں ۔

تم ان کی طرح بننے کی کوشش تو ضرور کرو۔ لیکن انھیں کسی طرح بنانے کی کوشش ہرگز نہ کرنا"۔

خلیل جبران نے اپنی کتاب "پیغمبر" میں بچوں کے بارے میں یہ لکھا ہے بچوں کے ڈرامے صحیح معنوں میں اسی قول کی بنیاد پر لکھے اور کھیلے جا سکتے ہیں۔ اور اگر غور کیا جائے تو شاید لکھنے کا بھی سوال پیدا نہ ہو۔ بچے خود اپنے ڈرامے بنا لیتے ہیں۔

انسان کی زندگی بذات خود ایک ڈراما ہے۔ بچپن میں اس ڈرامے کو آدمی خوب سمجھتا ہے۔ پیدا ہوتے ہی آواز کے ساتھ تجربہ کرتا ہے۔ بولنا سیکھتا ہے۔ چلنا سیکھتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی مشکل اس کے لئے ایک زبردست مرحلے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور اس کا حل کر لینا اس کے لئے ایک مہم سر کر لینے کے برابر ہے۔ ایک بہت بڑا کارنامہ ایک زبردست ڈراما ہے۔ اپنے آس پاس کی دنیا ہر نامانوس چیز۔ اپنے جسم کا ہر عضو اور ہر راز اس کے لئے ڈرامے کا ایک مستقل عنوان ہے۔

یہ تو ہوا بچے کی زندگی کا داخلی ڈراما۔ ڈرامے کا احساس اسی جذبے کو جب خارجی ڈرامے کی شکل میں دکھانا ہے تو بچے راجا رانی کے کھیل کھیلتے ہیں۔ ماں باپ بزرگوں اور اپنی ہم عمروں کی نقلیں اتارتے ہیں۔ گڈے گڑیا کا بیاہ رچاتے ہیں۔ اور طرح طرح کے کھیل ایجاد کرتے ہیں۔ انھیں کھیلوں میں آپ کو بچوں کے اصلی ڈرامے مل جائیں گے۔

ان ڈراموں کو اگر ہم دیکھیں اور سمجھ سکیں۔ تو بچوں کے ڈرامے اور تعلیم کا بہت بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بچوں کے ڈراموں کا مسئلہ یہ ہے کہ ڈھب کے ڈرامے ان کے لئے لکھے جائیں۔ اوّل تو بچوں کے ادب ہی کی طرف ملک میں توجہ کم ہے۔ ڈراما تو پھر بھی دور کی بات ہے۔ پھر یہ کہ اگر کوئی بچوں کے لئے کچھ لکھتا بھی ہے۔ تو وہ ان کے سر پر اپنی بات تھوپنے کی کوشش بچوں کے اپنے کھیلوں اور من گھڑت ناٹکوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد انداز کے ڈرامے لکھے جا سکتے ہیں۔ جن کو بچے پسند کریں گے ۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لکھنے والے کو اپنے معیار سے نیچے اتر کے لئے ڈراما لکھنا ہوگا۔ بچوں کا معیار بہت اونچا ہوتا ہے۔ اس معیار کے لکھنے کا مطلب ہے بہت بلند معیار کا ادب پیدا کرنا۔ ان کا اندازہ تو بچوں کی باتیں سننے اور ان کی لکھی ہوئی کہانیاں اور مضامین پڑھنے جاتا ہے ۔

یہی بات اسٹیج کی ٹکنیک کے سلسلے میں بھی صحیح ہے ۔ بچے اپنے ساختہ ڈرامے کھیلتے وقت جس ٹکنیک کا استعمال کرتے ہیں وہ ہماری سے کہیں بہتر ہوتی ہے، انھیں عام طور سے اسٹیج کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا طور پر ان کی ٹکنیک ایک ہوتی ہے وہ ڈراما ایک دائرے کی شکل میں چا طرف گھوم گھوم کر کھیلتے ہیں۔ اور چلنے پھرنے میں کسی قسم کی پابندی اپنے عائد نہیں کرتے۔ اسٹیج کی کوئی حد مقرر نہیں کرتے۔ اسٹیج ان کے ذہن میں ہی نہیں۔ بلکہ ان کے ذہن میں تو دیکھنے والے بھی نہیں ہوتے۔ دیکھنے والوں کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ہم تو اپنا جی خوش کرنے کے لئے ڈراما کھیل رہے ہیں۔ میں کسی اور کو کیا دخل —— یہ احساس ان میں دکھاوے کا جذبہ نہیں پیدا ہونے دیتا۔ جو اچھے آرٹ کا دشمن ہے ۔

اگر دیکھنے والے موجود بھی ہوں تو بچے ان کے اور اسٹیج کے درمیان

نہیں کرتے - بلکہ دیکھنے والے بھی اگر بچے ہی ہوں تو ان کی خواہش یہ ہوگی کہ وہ بھی ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہو جائیں -

مختلف ملکوں کے قدیم تھیئٹروں میں بھی یہی ٹکنیک رائج تھی - اور یہی ٹکنیک یورپی تھیئٹر کی نئی نئی ایجادات اور جدت طرازیوں کی بھی بنیاد بن گئی ہے -

مشرقی ممالک خصوصاً چین، جاپان اور ہندوستان کی تھیئٹر کی قدیم روایتیں بھی یہی ہیں کہ اکثر ڈراما کھیلنے والوں اور ڈراما دیکھنے والوں کے فرق کو مٹا دیا جاتا تھا، رنگ منچ اور تماشا گاہ میں یگانگی قائم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

مصر میں تین ہزار برس قبل مسیح اوساٹرس (Osyrus) نامی ایک دیوتا گزرا ہے جس کا پیشن پلے (Passion Play) مذہبی ڈراما بہت مشہور ہے - اس کے ڈراموں میں ہزاروں آرٹسٹ بیک وقت شریک ہوتے تھے - اور حقیقت نگاری کے اصول کی پابندی مضحکہ خیز حد تک کی جاتی تھی حقیقت نگاری کیا ہوتی تھی - نیچرلزم یعنی ایک قسم کا فطرت کا تتبع تھا - اس کے اسٹیج کی وسعتیں محض اپنے شہر آبی ڈوس (Abydos) ہی تک محدود نہ تھیں، بلکہ ڈراما کھیلنے والے آس پاس کے علاقوں اور بستیوں تک نکل جاتے تھے - سیکڑوں آدمی کشت و خون کا شکار ہوتے تھے اور ہزاروں اُجڑ جاتے تھے -

چین کے شہنشاہ منگ ہوانگ نے ایک باغ بنوایا تھا جو دراصل بچوں اور نوجوانوں کا ایک اسکول تھا - یہاں کے طالب علموں اور استادوں کا بنیادی کام یہ تھا کہ وہ ڈرامے کے سلسلے میں نئی نئی ٹکنیک تلاش کریں اور ان کے ساتھ ہی ان میں تماشہ دیکھنے والے اسٹیج ہی کا ایک جزو بن گئے تھے -

جاپان کے مشہور ڈرامے "نوپلے" کی ٹکنیک بھی بال ناٹک کی ٹکنیک سے ملتی جلتی ہے اور قرون وسطیٰ کے یورپی انقلاب کے زمانے میں اٹلی کی مشہور کمیڈی جسے (Commedia dell Arte) کہتے ہیں، اسی ٹکنیک کی ممنون منت تھی -

دوسرے ملکوں کے بچے اپنے ڈراموں کے لئے جس ڈھنگ کے "ماسک (مصنوعی چہرے) بناتے ہیں - اس میں آپ کو ہماری قدیم روایتوں اور ہندوستانی ماسکوں کی واضح جھلک نظر آئے گی -

"دائرہ" جس پر اسٹانسلاوسکی - اسٹیج اور ریہرسلوں کے سلسلے میں بہت زور دیتا ہے اور جسے وہ (Circle of attention) "توجہ کا دائرہ" کہتا ہے - ایشیا اور افریقہ کے عوامی ناچوں کی خاص چیز ہوتی ہے - یہی ترتیب آپ کو ہر ملک کے بچوں کے بے ساختہ کھیلوں اور ناچوں میں نظر آئے گی - طبعاً ان کے ذہن میں ڈراما کھیلتے وقت ایک دائرے ہی کا تصور ہوتا ہے -

جہاں تک اسٹیج پر آواز کے ذریعے اثر پیدا کرنے اور ہر قسم کے اثر کے لئے اسی ڈھب کی آواز کے استعمال کا تعلق ہے - اس میں بھی بچوں کی ٹکنیک افریقہ کی کلچرل روایتوں سے ملتی جلتی ہے - یہی ٹکنیک حبشی گانوں میں جنھیں بلوز (Blues) یعنی موز کہتے ہیں - بلکہ امریکہ کے مخصوص میوزک یعنی جاز (Jazz) میں بھی پائی جاتی ہے -

یورپ کے جدید ڈراموں اور تھیئٹروں میں جہاں فنکار اور ناظرین کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے - بچوں ہی کی ٹکنیک کا تتبع ملے گا - خاص کر ڈراموں کی اس ٹکنیک میں جس میں نصف دائرے والا اسٹیج استعمال کیا جاتا ہے - اسے ہارس شو ارینا پروڈکشن (Horse-shoe Arena production) کہتے ہیں اور اس میں لوگ اسٹیج کے تین طرف سے کھیل دیکھ سکتے ہیں - اگر بچوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو آپ دیکھئے کہ ذرا بڑی عمر کے بچے ڈراما کھیلتے وقت اسٹیج پر اسی قاعدے کو برتیں گے -

اس سے اندازہ ہوگا کہ بچوں کے اندر ڈرامے کی فطری صلاحیت پائی جاتی ہے اور ان کا تخلیقی معیار اپنی بے ساختگی کی وجہ سے فنی نقطۂ نظر سے بھی بہت بلند ہوتا ہے - یہی بات بچوں کی کہانیوں اور تصویروں کے بارے میں بھی صحیح ہے - بڑی تحقیق کے بعد پروفیسر سریک نے توجہ دلائی ہے کہ انسان کے قدیم ترین فن مصوری کی کڑیاں بچوں کے آرٹ سے ملتی ہیں -

اگر یہ سب صحیح ہے تو پھر کیا ضروری ہے کہ ہم بچوں پر اپنے خیالات تھوپیں - ان کے لئے اپنے مذاق کے من مانی ڈرامے لکھیں اور اپنی فرسودہ ٹکنیک ان کے متھے مڑھیں - بلکہ ان سے تو ہم اپنے کام کی بہت سی باتیں سیکھ سکتے ہیں - اس بات کے نہ سمجھنے سے بچوں کے تھیئٹر کے سلسلے میں اکثر لوگوں کے ذہن میں بہت الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے - طرح طرح کے

تصورات ہیں - اور چونکہ اس سلسلے میں باتیں بہت ہو رہی ہیں اور کام کم۔ اس لئے صفائی کی کوئی صورت نہیں -

(۱) کوئی تو یہ سمجھتا ہے کہ بچوں کا تھیئٹر نام ہے ایک بڑی اور حسین عمارت کا جو بچوں کے نام سے مشہور ہو جائے اور جسے دیکھنے کے لئے دور دور کے فنکار اور سیاح آئیں -

(۲) کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بچوں کا تھیئٹر وہ ہے جس میں بڑی عمر کے لوگ بچوں کے لئے ڈرامے کھیلیں اور بچے صرف دیکھیں اور خوش ہوں -

(۳) مغربی ملکوں میں ایک یہ تصور بھی عام ہے کہ بڑی عمر کے لوگ بچوں کے لئے اتنے قریب سے اور اس انداز سے ڈراما کھیلیں کہ بچے یہ بھول جائیں کہ وہ محض دیکھنے والے ہیں بلکہ ڈراما کھیلنے والوں میں گھل مل جائیں - ان کے اندر بے ساختہ طور پر ایک احساس شرکت پیدا ہو اور وہ بھی ایک حد تک کھیل میں بے اختیار شامل ہو جائیں -

(۴) ایک خیال یہ ہے بڑوں کے لکھے ہوئے ڈرامے بچے کھیلیں اور بڑے چھوٹے سب دیکھیں -

(۵) ایک صورت یہ بھی ہے کہ بچے اپنے ڈرامے خود ہی لکھیں تیار کریں - کھیلیں اور دیکھیں -

ان میں کچھ صورتیں ایسی ہیں جن پر عمل کرنا غالباً ایک حد تک مفید ہوگا - لیکن ان میں سے کوئی بھی طریقہ ایسا نہیں جو بچوں کے ڈرامے اور تعلیم کے سلسلے میں بنیادی مسئلے کا حل پیش کرتا ہو -

جس ڈھنگ سے بچوں کے ڈرامے ایک زمانے میں پیٹس کچن (Pete's Kitchen) میں کھیلے جاتے تھے اس میں شاید اس مسئلے کا حل مل جائے -

"پیٹس کچن" پیٹر سلیڈ (Peter Slade) کا قائم کیا ہوا بچوں کے ڈرامے کا ایک مرکز تھا جس نے انگلینڈ میں بہت شہرت حاصل کی - اس مرکز میں پیٹر سلیڈ نے بچوں کے ڈرامے کے سلسلے میں بڑے بڑے تجربے کئے اور آج وہی اصول یورپ اور امریکہ کے اکثر اسکولوں اور تھیئٹروں میں رائج ہیں -

اس مرکز میں کچھ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر، تھوڑے سے بہت کھلونے اور بچوں کے کھیلنے کے لئے بہت سی الٹی سیدھی چیزیں تھیں - بچے اپنے کھیل پیٹر سلیڈ کی مدد سے تیار کرتے اور یہیں کھیلتے اور انھیں میز، کھلونوں اور الٹی سیدھی چیزوں کو ہزار ڈھنگ سے استعمال کرتے اور اسٹیج کے سامان کے سلسلے میں بچوں کے تخیل کا مقابلہ کون کر سکتا ہے - وہ اپنی ضرورت کے مطابق انھیں بدحال اشیاء کو ہر بار اک رنگ اور نیا کردار بخش دیتے - اسٹیج کی کوئی حد مقرر نہ تھی تماشہ والوں کی صف بہت کم علیحدہ ہوتی تھی - اکثر اوقات دیکھنے والے ہوتے ہی سب کھیل میں شریک رہتے تھے - زیادہ تر بے لکھے اور بے ساختہ ڈرامے تھے اور مختلف عمر کے بچے جس ڈھنگ سے چاہتے تھے کھیلتے تھے - ان کھیلوں میں پیٹر سلیڈ کی حیثیت ایک ڈائرکٹر کی نہ تھی بلکہ ایک ہمدم، مشفق اور ساتھ کے کھیلنے والے کی تھی - وہ بچوں میں مل کر انھیں کی طرح ان کھیلوں میں شریک ہوتا - نہ صرف ڈراموں میں ان کی مدد کرتا اور انھیں کھیلنا سکھاتا بلکہ خود بھی ان سے نئے نئے خیالات حاصل کرتا اور بہت کچھ سیکھتا -

ہمیں بچوں کے لئے بڑی بڑی حسین عمارتوں سے زیادہ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے ڈرامے کے مرکزوں کی ضرورت ہے جنھیں بچے اپنا گھر سمجھیں اور جہاں وہ ڈراموں کے ذریعے اپنی شخصیت بنائیں اور سنواریں اور صحیح معنوں میں زندگی کی تعلیم حاصل کریں -

ڈراموں کے ذریعے نہ صرف بچوں کی ذہانت بڑھتی ہے اور ہر مضمون، ہر موضوع کا درس آسانی سے ان کے ذہن نشین ہو جاتا ہے بلکہ ہر قسم کے کردار میں اپنی شخصیت کو ڈھال کر بچے اپنے مذاق اور مزاج کی تربیت کرنا سیکھ جاتے ہیں - اپنے ان خطرناک رجحانات کا علاج کرتے ہیں جو ناپسند ہیں - مگر جنھیں وہ اکثر اپنے کردار سے نہیں بلکہ دوسروں کی ذات سے وابستہ کرنے کے عادی رہتے ہیں -

یہ سچ ہے کہ اس قسم کے ڈرامے کے مرکزوں کے لئے بڑے سرمائے کی ضرورت ہوگی لیکن بچوں کی تعلیم و تربیت میں ان کی زندگی کا تفریحی پہلو سب سے زیادہ اہم ہے - ان کی اہمیت کو مدنظر رکھ کر انگلینڈ کے معلموں اور سماجی کام کرنے والوں نے ایک تحریک شروع کی تھی جس کا نام تھا بچوں کو بچاؤ فنڈ (Save the Children Fund) بچوں کے کھیل کود اور تعلیم و تفریح کے سلسلے میں اس تحریک نے بڑے بڑے کام انجام دئے ہیں -

یورپ کے بعض ملکوں میں اور چین میں بچوں کے مدرسوں اور تفریح کے لئے سرکاری بجٹ میں خاصی رقم رکھی جاتی ہے۔ اسکول اور کالجوں ما اور تھیٹر نصاب میں شامل ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ یہی چیز ہم اپنے ں نہیں کر سکتے۔

اس بات کی وضاحت کی مطلق ضرورت نہیں کہ طوطے کی طرح رٹ یاد کرنے کا طریقہ ذہن کو کُند اور شخصیت کو مسخ کر دیتا ہے۔ ں کے سکھلائے ہوئے امتحانات کے مروّجہ دستور نے بچوں کی نگاہ میں ی تعلیم کو ایک ہوّا بنا دیا ہے۔ کالجوں میں تعلیم تو کیا ہوتی ہے "کلرک کا کام ہوتا ہے۔ لڑکے کالج سے سرٹی فیکٹ اور ڈگریاں حاصل پنے آپ کو تعلیم سے فارغ البال سمجھتے ہیں اور دفتروں میں بالداہ جاتے ہیں۔ یا زندگی سے بیزار سڑکوں پر جتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ امتحانات کا یہ خطرناک تعلیمی دستور ہم نے مغربی ممالک سے سیکھا ہے۔ لیکن خود مغربی ممالک کے روشن دماغ مدرسین اب اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ بچوں کی بہترین تعلیم تخلیقی آرٹ کے ذریعے ہوتی ہے۔ ڈراما تھیٹر آرٹ کا ایسا شعبہ ہے جس میں سارے فنونِ لطیفہ کا امتزاج پایا جاتا ہے جو تعلیم کے سلسلے میں ہر فن پر حاوی ہے۔

ہربرٹ ریڈ کہتا ہے۔ تعلیم کی ہر منزل میں ڈرامے کو قطعی طور پر ایک لازمی حیثیت دینا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آرٹ کے ذریعے تعلیم دینے کے جتنے بھی طریقے ہیں۔ میرے نزدیک ڈراما ہی وہ ایک واحد طریقہ ہے جو ان تمام وسائل اور طریقوں کو اپنے اندر پورے پورے طور پر سمو لیتا ہے۔ چونکہ میرا یہ نظریہ ہے کہ تعلیم خواہ وہ کسی بھی چیز کی ہو بنیادی طور پر آرٹ کے ذریعے دینا چاہیئے۔ اس لئے اب یہ بات صاف ہے کہ بچوں کے ڈرامے پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے۔

مارشل ٹیٹو کا بیان

بھارت کا دورہ بھارت ہمارے ملک سے بہت دُور واقع ہے اور بہت سے لوگوں کی طرف سے یہ دریافت کیا جا رہا ہے کہ مجھے اتنی دور جانے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔ میں کھلے طور پر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے مشکلات کا احساس ہے۔ لیکن میرا وہاں جانا ہمارے ملک اور امنِ عالم کے مفاد میں ہے اور یہ دورہ بہت اہم ثابت ہوگا۔ بھارت کے ساتھ ہمارے تعلقات بہت ہی خوشگوار ہیں۔ بھارت نے تھوڑا عرصہ پیشتر آزادی حاصل کی ہے اور اسے بھی پسماندگی سے باہر نکلنے کے لئے بہت حد تک انہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جن کا سامنا ہمیں کرنا پڑا تھا۔ بھارت کے لوگ بہت امن پسند واقع ہوئے ہیں اور پردھان منتری نہرو کی ذات میں انھیں ایک بہت دانشمند رہنما کی قیادت حاصل ہے۔ ملکی مسائل کو حل کرنے کے لئے بھارت کے لوگ اپنی تمام تر قوت سے کام کر رہے ہیں اور بین الاقوامی میدان میں وہ بقائے امن کی جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لئے امکانی حد تک اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں۔ میں اس عظیم ملک کا قریب سے مطالعہ کرنا چاہتا ہوں اور ممکن ہے کہ میرے ذریعے بھارت کے لوگوں کو بھی ہمارے ملک کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے کا موقعہ ملے۔ مختصر یہ کہ بین الاقوامی میدان میں امنِ عالم کو قائم رکھنے کے لئے ہمارے سامنے ایک مشترکہ کام ہے اور بنی نوعِ انسان کے لئے اس کی بڑی اہمیت ہے تاکہ ہم پُرامن طریقے سے ایک بہتر دنیا کی تعمیر کر سکیں۔

یوگوسلاویہ اور بھارت کے درمیان تعاون بھارت اور یوگوسلاویہ کے درمیان تعاون کے متعدد امکانات ہیں اور میں ان میں سے چند ایک اہم ترین امکانات کا ذکر کروں گا۔ خارجہ پالیسی میں دونوں ملکوں کے لئے تعاون کا وسیع میدان موجود ہے۔ ان امور پر دونوں ملکوں کے تعاون کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے جن سے امنِ عالم کو برقرار رکھنے اور مستحکم بنانے میں مدد مل سکے۔ کیونکہ اس مسئلے پر ہمارے خیالات ایک ہیں لہذا اس سلسلے میں تعاون کو عملی شکل دینا زیادہ آسان ہے اور یہ امر اور بھی زیادہ اہم ہے کہ بھارت اور یوگوسلاویہ کے صرف مدبر ہی یہ خیالات نہیں رکھتے بلکہ ان سے دونوں ملکوں کے عوام کی زبردست امنگوں کی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔

رالف ڈبلیو فلپس

بھارت میں دودھ کی پیداوار اور موسمی مشکلات

دودھ دنیا کے اکثر ممالک میں انسانی خوراک کی اہم شے ہے۔ لیکن بھارت کے لئے تو یہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ دنیا کے بہت سے ملک اپنی غذا میں حیواناتی پروٹین کے اجزا گوشت سے حاصل کرتے ہیں۔ لیکن متعدد وجوہ کی بنا پر بھارت میں گوشت کی کھپت بہت محدود ہے۔ اس لئے حیواناتی پروٹین حاصل کرنے کے لئے دودھ ہی ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اگر حیواناتی ذرائع سے پروٹین کی معقول مقدار کو بھارت کی روزمرہ خوراک میں شامل کیا جانا ہے اور خاص کر اس ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے مدنظر یہ لازمی ہے کہ زیادہ مقدار میں دودھ مہیا کرنے پر خاص توجہ دی جائے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہو جاتا ہے کہ بھارت کے اکثر حصوں کے گرم موسمی حالات میں دودھ کی پیداوار سے متعلقہ مسائل پر زیادہ توجہ کی جائے۔

دنیا کے مختلف ملکوں میں حیواناتی پروٹین کی فی کس روزمرہ کھپت کے نقشے پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بھارت میں یہ کھپت بہت محدود ہے۔ اگرچہ غذائیت کے ماہرین کسی ایسے عام قاعدے پر متفق نہیں ہو سکے ہیں کہ انسانی جسم کے لئے حیواناتی پروٹین کی کتنی زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم مقدار فی کس فی یوم لازمی ہے۔ پھر بھی مسٹر موریس نے ۱۹۴۵ء میں ۷۰ گرین کل پروٹین اور ۲ر۳۴ گرین حیواناتی پروٹین فی کس روزمرہ ایک مناسب غذا تجویز کی ہے۔ اگر ۳۰ گرین فی کس روزانہ حیواناتی پروٹین غذا کے لئے معقول مقدار فرض کرلی جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے مندرجہ ذیل ملکوں میں سے صرف اٹھارہ ملکوں میں یہ مقدار یا اس سے زیادہ روزمرہ کی غذا میں شامل کی جا رہی ہے۔

نام ملک یا خطہ	حیواناتی پروٹین کی روزانہ کھپت فی کس
آئس لینڈ	۸۰ سے ۹ر۸۸ گرین
ارجنٹائن۔ نیوزی لینڈ۔ آسٹریلیا۔ اروگوے	۶۰ سے تقریباً ۷۰ گرین
سویڈن۔ امریکہ۔ ڈنمارک۔ کینیڈا۔ ناروے	۵۰ 〃 〃 ۶۰ 〃
سوئیٹزرلینڈ۔ آئرلینڈ۔ برطانیہ۔ فن لینڈ	۴۰ 〃 〃 ۵۰ 〃
نیدرلینڈ۔ فرانس۔ بیلجیم و لکسمبرگ۔ چیکوسلواکیہ	۳۰ 〃 〃 ۴۰ 〃
برما۔ کولمبیا۔ کیوبا۔ برازیل۔ آسٹریا۔ مڈغاسکر۔ چلی۔ ایل سلویڈور۔ ہانڈورس۔ مراکو۔ پولینڈ۔ حبشہ۔ سپین	۲۰ 〃 〃 ۳۰ 〃
اٹلی۔ فلپائن۔ پرتگال۔ میکسیکو۔ ہنگری، یونان۔ جرمنی (روسی علاقہ) تھائی لینڈ، ترکی۔ سائپرس۔ پاکستان۔ ٹانگانیکا، ماریشش۔ یوگوسلاویہ۔ مصر۔ سیلون	۱۰ 〃 〃 ۲۰ 〃
الجیریا۔ پیرو۔ نیو نیشیا۔ ہندچینی، جاپان، بھارت۔ شام اور لبنان۔ چین۔ انڈونیشیا	صفر 〃 〃 ۱۰ 〃

مویشیوں اور خاص کر دودھ دینے والے مویشیوں پر موسمی اثرات کے بارے میں تحقیقات پچھلے چند برسوں میں کی گئی ہے۔ جو طلبا منطقہ معتدلہ میں واقع ممالک کی انسٹی ٹیوشنوں میں تربیت حاصل کرنے کی غرض سے جاتے رہے، وہ مویشیوں پر موسمی اثرات کی اہمیت کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ اس لئے وہ اپنی تربیت کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہ کرسکے۔

خوش قسمتی سے بھارت میں صدیوں سے دودھ دینے والے مویشیوں کی کئی عمدہ نسلیں موجود ہیں۔ جو بھارت میں دودھ کی پیداوار بڑھانے کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اقوام متحدہ کے ادارۂ خوراک و زراعت نے بھارت اور پاکستان کے مویشیوں کے متعلق ایک کتاب شائع کی ہے جس میں بھارت کے دودھ دینے والے مویشیوں کی اہمیت کو

بیان کیا گیا ہے۔ بھارت کی زرعی تحقیقاتی کونسل نے دودھ اور گرمی کے بارے میں ضروری اعداد و شمار ایک اسکیم کے تحت فراہم کئے ہیں — دودھ کی پیداوار پر موسمی ماحول کے اثرات کے مطالعے اور تجربات سے یہ واضح ہوا ہے کہ ۴۰ سے ۷۰ ڈگری تک درجۂ حرارت کی فضا میں دودھ کی پیداوار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس حد سے نیچے کے درجۂ حرارت میں پیداوار کم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس حالت میں گایوں کو زیادہ غذا دینے سے یہ کمی صرف برائے نام ہی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اس حد سے اوپر کے درجۂ حرارت میں ۸۰ درجے تک دودھ کی پیداوار بتدریج کم ہو جاتی ہے۔ لیکن ۸۰ درجے سے اونچے درجۂ حرارت کی فضا میں دودھ کی پیداوار یکلخت کم ہو جاتی ہے۔ مگر اس میں گرمی کی مناسبت بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ نتائج یورپی نسل کے مویشیوں پر تجربات سے حاصل کئے گئے ہیں۔ لیکن بھارت کی ساہیوال اور سرخ سندھی نسلوں کی گایوں پر موسمی اثرات معلوم کرنے کے لئے مزید تجربات کرنے پڑیں گے۔

فضا کا درجۂ حرارت، بارش وغیرہ کئی ایسے ماحولی عناصر ہیں جو انسان کے اختیار میں نہیں ہیں۔ لیکن ان عناصر کے اثرات کو مویشیوں کی پرورش اور غذا دینے کے ڈھنگ میں تبدیلیوں کے ذریعے بدلا جا سکتا ہے بھارت میں مویشیوں کی پرورش کے لئے ان کو مناسب اور کافی مقدار میں غذا مہیا کرنا ایک اہم مسئلہ ہے جس پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ مویشیوں کی پرورش اور ان کی نسلی افزائی کے لئے سائنسدانوں کا بین الاقوامی تعاون نہایت ضروری ہے۔ تاکہ مختلف ملکوں کے تجربات سے دنیا کے سب ملک فائدہ اٹھا سکیں۔ متحدہ اقوام کے ادارۂ خوراک و زراعت نے ۱۹۵۰ء میں ایشیا اور دور پورب کی ایک علاقائی کانفرنس منعقد کر کے اس جانب پیش قدمی کی تھی۔ یہ میٹنگ لکھنؤ میں منعقد ہوئی تھی۔ بھارت کے نمائندہ سردار داتار سنگھ صدر منتخب کئے گئے تھے۔ اس کانفرنس کی کارروائی اور بحث مباحثے ایک کتاب کی صورت میں شائع کئے گئے ہیں۔ منصوبے کے مطابق مستقبل میں اس قسم کے اور اجلاس بھی منعقد کئے جائیں گے۔

سُورگباشی گرجاشنکر باجپائی

۵۔ دسمبر ۱۹۵۴ء کو اتوار کی رات کے ڈھائی بجے گورنر بمبئی شری گرجاشنکر باجپائی انتقال فرما گئے۔ شری باجپائی کی موت سے ہندوستان ایک قابل اور پر اعتماد شخصیت سے محروم ہو گیا جس نے بین الاقوامی حلقے میں اپنے ملک کی ممتاز خدمات انجام دی تھیں۔

شری گرجاشنکر باجپائی ۳۔ اپریل ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۵ء میں انڈین سول سروس میں داخل ہوئے تھے۔ اور اپنی اعلیٰ دماغی قابلیت کی بدولت سرعت سے ترقی کی۔ ۲۲-۱۹۲۱ء میں لندن کی امپیریل کانفرنس اور تخفیف اسلحہ جات کے متعلق واشنگٹن کانفرنس کے دوران مرحوم نے ہندوستان کی طرف سے سکریٹری کی حیثیت سے خدمت سرانجام دی تھی۔ بہت سی ممتاز خدمات انجام دینے کے بعد مرحوم ۳۶ سال کی عمر میں ۱۹۲۷ء میں حکومت ہند کے سکریٹری کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے۔

بین الاقوامی معاملات میں مرحوم کی خدمات کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔ چنانچہ آپ نے اپریل کانفرنس میں مسلسل بین الاقوامی انجمن کی جنرل اسمبلی کے نظم و نسق اور ہندوستان کی اصلاحات کے متعلق راؤنڈ ٹیبل کانفرنسوں میں بھی شرکت کی تھی۔ گورنر جنرل کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد شری گرجاشنکر باجپائی کو امریکہ میں ہندوستان کا ایجنٹ جنرل مقرر کر دیا گیا تھا۔ از اں بعد مرحوم نے کئی بین الاقوامی اداروں اور کانفرنسوں میں ہندوستان کی نمائندگی کی تھی۔

آزادی کے بعد شری باجپائی نے "انڈین فارن سروس" کو منظم کیا اور دوسرے ممالک کے ساتھ ہندوستان کے سفارتی تعلقات قائم کرنے میں مدد دی۔ وزارت امور خارجہ کے جنرل سکریٹری کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۹۵۲ء میں مرحوم گورنر بمبئی کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے۔

ہندوستانی ڈرامہ

تامل ڈرامہ

تامل کی پرانی کتابوں میں جب "سوانگ" یا تماشہ اور ادبی ناٹکوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ لیکن ایک بھی پرانا ڈرامہ زمانے کے دست برد سے بچ کر ہم تک نہیں پہنچا۔ غالباً تفریحات کے ان دونوں ڈھانچوں پر بھارت نیتم اور کتھا کلاک شیپم چھا گئے۔ بھارت نیتم خالص ناچ ہوتا تھا جس میں ابتدائی ایکٹنگ کے امکانات کا امتزاج بھی پایا جاتا کتھا کلاک شیپم قصہ گوئی کو کہتے تھے جس کے ساتھ سنگیت اور ایکٹنگ کی چاشنی بھی ہوتی تھی۔

ساتویں صدی عیسوی میں ایک راجہ مصنّف راجہ مہندر ورمن نے جو سنت اپار کا چیلا تھا ایک دلچسپ ڈرامہ لکھا۔ یہ بالکل جدید معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں شراب نوشی اور مذہبی تعصّب کے خلاف طنز کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن یہ ڈرامہ جس کا عنوان ہے بھگت ولاس پرواسنم' سنسکرت اور پراکرت کی ایک ملی جلی زبان میں لکھا گیا ہے۔ گیارھویں صدی میں "راجا راجا چولا جس نے تنجور کا مشہور مندر تعمیر کیا' اس نے اسی مندر میں ناٹک کی سالانہ تقریب کا افتتاح کیا۔ لیکن یہ سالانہ تقریب اس کے موجد کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔ پھر یہ صحیح معنوں میں ڈرامہ بھی نہیں تھا۔ جس چیز کو ہم ڈرامے کا روپ کہہ سکتے ہیں وہ سڑکوں کے جلوس نما رقص میں پایا جاتا تھا۔ اس میں گاؤں کے عام دستکار (خصوصاً دھوبی جن کے پاس ہر قسم کے کپڑے ہوتے تھے) عموماً پرانوں کے ناٹک کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی نلا تھنگال" جیسے بڑے بڑے ڈرامے بھی کھیلے جاتے تھے۔ ان کے پاس سٹیج کی کچھ ملکیت بھی ہوتی تھی۔ اور ان ناٹکوں میں زیادہ تر مقبول عام قصبات اور پرانے گیت ہوتے تھے۔ اس کا نام دیہی "تیرو کوتو" تھا یہ چیز اب بھی بعض مقامات پر پائی جاتی ہے۔

جب تنجور کے مرہٹہ راجوں خصوصاً سرابوجی مہاراجہ کے عہدِ حکومت میں تامل ادب اور ثقافت تخلیقی عروج کی طرف مائل پرواز تھے اس وقت ڈرامے کی ایک نئی قسم "کوراونجی" (خانہ بدوشوں کے ناٹک) نے رواج پایا اس ناٹک کی نمایاں خصوصیات لوک گیت اور غنائیت (بھانگو ماں دی چندو اور تھیلانا) ہیں۔ اس ناٹک کی ایک قسم "کترالا کوراونجی" بہت مشہور ہے "کوراونجی" میں فن رقص کھپت بھی آسانی سے ہو جاتی ہے۔ اس ناٹک کے موضوع تو دیوتا ہوا کرتے تھے لیکن پھر بھی اس میں انسانی جذبات کے سلسلے میں موسیقی اور تماشہ گری کے معاملات خصوصاً محبت، ہجر اور وصال کی کیفیتوں کا اظہار ہوتا تھا۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصّے میں عوامی ناٹک کی تجدید ہوئی۔ ۱۸۶۶ء میں پانڈیچری کے مقام پر "سارنگ کو اسٹیج کیا گیا۔ یہ ڈرامہ ہندی کے پورن بھگت ناٹک سے مشابہت رکھتا تھا اور اس کی کہانی بھی بعینہ وہی تھی جو بنگالی ڈرامہ نویس گریش چندر کے ناٹک "پورن چندر" کی ہے۔ اس طرح ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ خصوصاً ضلع تنجور میں عوامی اسٹیج مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گیا جبکہ ناٹک کھیلنے والوں کے گروہ گاؤں گاؤں گھومتے اور معمولی تھیٹروں میں ڈرامے کیا کرتے۔ "ولّی" "کرلین" اور ہریش چندر کا شمار مقبول عام ڈراموں میں ہوتا تھا۔ ان میں اور دوسرے ناٹکوں میں زیادہ تر صوتی موسیقی پر زور دیا جاتا جس کا اکثر ڈرامے سے کم ہی تعلق رہتا۔

پھر مغرب کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ سندرم پلّے کا ڈرامہ "مانون مینم" نظم میں لکھا گیا ہے اور ناٹک کے درمیانی وقفہ میں مزاحیہ نقل بھی ہے۔ اور یہ چیز ایک جوگی کے کیریکٹر کی شکل پیش کی گئی ہے۔ لکشمن پلّے کا ناٹک "ستیہ وتی" شکسپیر کے ڈرامہ "سمبیلائن" کی طرز پر لکھا گیا ہے اس دور کے دوسرے ڈرامے وی۔ جی سوریہ نارائن شاستری کے ناٹک

رو پادلی اور کلادلی" ہیں۔

شہر مدراس کے ارباب ذوق نے اس صدی کے ابتدائی سالوں میں "سگن ولاس سبھا" قائم کی جو تامل ناڈ میں جدید تھئیٹر کے آغاز کی نشاندہی کرتی ہے۔ سبھا کے ایک کرتا دھرتا مٹری پی سمبندا مدالیار نے جو اب مدراس ہی میں بود و باش رکھتے ہیں متعدد ایسے ڈرامے لکھے جن کے غیر مذہبی پلاٹ جدید یوروپ کے طرز کے ہیں۔ انھوں نے اور ان کے دوستوں نے اسٹیج میں کئی اصلاحات بھی کیں ان کی کامیابیوں کی بدولت ڈرامے کے پیشے کو نئے سرے سے احترام کی جگہ نصیب ہوئی۔ ازاں بعد متعدد اداروں نے ان کی تقلید کی جس میں مدراس سیکریٹریٹ ایسوسی ایشن (ڈرامیٹک کلب) سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اور کوپنیہ کمپنی نے اسٹیج کے فن کو چلا دیا۔ اس طرح عوامی روایات میں نئی جان آگئی۔ آج اس سلسلے میں نواب راجا منگم کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ان کے ناٹکوں میں جا بجا گیت ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے اسٹیج کا فن اعلیٰ ترین ہوتا ہے۔ مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان ڈراموں کو دیکھنے کے لئے لوگ بھاری تعداد میں کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ اعلےٰ ادبی ڈراموں میں "سوکا مٹی سپا تھم جیسے ناٹک میں اس ناٹک کے نیشنل ڈرامہ فیسٹول" میں تامل روایات کی نمایندگی کی اور نئی دہلی میں اسٹیج کیا گیا۔ یہ ڈرامہ پلاوادی اور چالوکیوں کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ عصر جدید کی زندگی اور مسائل سے بحث کرنے والے سماجی ڈرامے بھی لکھے جا رہے ہیں۔ اس کی ایک حالیہ مثال "رتھ پاسم" ہے۔ تامل اسٹیج نے ٹی کے۔ ایس برادرس جیسے ذہین ایکٹروں کو بھی جنم دیا ہے جو اس کا معیار بلند کرنے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں۔

مراٹھی ڈرامہ

اگرچہ جدید اصطلاح کے لحاظ سے مراٹھی ڈرامہ لگ بھگ ۱۱۵ سال پہلے عالم وجود میں آیا، تاہم تنجور لائبریری میں مرہٹی ڈراموں کے پرانے مسودات کا جو ذخیرہ موجود ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سترھویں صدی عیسوی میں بھی ڈرامہ مہاراشٹر میں مقبول تھا۔ جدید طرز کا پہلا مرہٹی ڈرامہ "سیتا سوئمبر" ۱۸۴۳ء میں لکھا گیا جسے وشنو داس بھاوے نے سانگلی کے مقام پر اسٹیج کیا۔

مرہٹی ڈرامے کا آغاز 'للت' اور 'تماشہ' کی قسم کی تفریحات سے ہوتا ہے۔ 'للت' دھارمک تہواروں پر اسٹیج کیا جاتا تھا۔ اس کا موضوع مہابھارت اور پورانوں کے واقعات سے لیا جاتا۔ 'للت' میں بھگتی کے گیت بھی شامل کر لئے جاتے۔ روایاتی شخصیتوں کے علاوہ برہمن، سادھو اور درزی وغیرہ کے کیریکٹر بھی ان میں جگہ پاتے۔ پیشواؤں کے آخری دور میں تماشے بہت مقبول تھے۔ دراصل تماشے 'للت' اور جدید ڈرامے کی درمیانی کڑی ہیں۔ تماشوں میں نثر کا حصہ برائے نام ہوتا تھا۔ اصل کہانی شاعری کی ایک قسم 'لاونی' کے ذریعے بیان کی جاتی۔

۱۸۴۳ء میں وشنو داس بھاوے کے ڈرامہ 'سیتا سوئمبر' کی بدولت مرہٹی ناٹک کی روایاتی ہئیت اور روپ میں خوشگوار تبدیلی عمل میں آگئی۔ بھاوے نے 'ودوشک' اور 'سوتر دھار' کو رواج دیا۔ ناٹک کے کیریکٹروں کا مکالمہ نثر میں ہوتا تھا لیکن 'سوتر دھار' کے ذریعے سنگیت کا وقفہ کیریکٹروں کے جذبات کے اظہار کا کام دیتا۔

سنگیت کے ڈرامے کی روایات کی مضبوط نیو اس وقت پڑی جب انا صاحب کرلوسکر نے 'شکنتلا' کو اسٹیج کیا۔ متعدد ڈرامہ کمپنیاں عالم وجود میں آئیں جنہوں نے آرٹ کے اس شعبے کو وسیع پیمانے پر مقبول بنانے میں مدد دی۔ کرلوسکر ناٹک منڈلی کے بعد گندھرو ناٹک منڈلی قائم ہوئی جس کے موسس بال گندھرو تھے۔ بال گندھرو گانے اور زنانہ پارٹ ادا کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ازاں بعد سودیش ہت چنتک منڈلی نے جنم لیا۔ اس کے بعد 'للت کلا آدرش منڈلی' معرض وجود میں آئی۔

اگرچہ ڈرامہ اس دور میں زیادہ تر سنگیت کی تفریحات کا ایک شعبہ تھا پھر بھی اس میں سماجی خیالات جذب ہونے لگے۔ اس مقصد کے لئے نثر کا ڈرامہ بہترین وسیلہ ثابت ہوا۔ چنانچہ گڈکری کے ڈرامہ "پریم سنیاس" نے بڑے مؤثر پیرائے میں بیوہ کی شادی کا مسئلہ پیش کیا۔ گووند بلال دیول نے بھی سماجی تنقید کی اس روایت کا ساتھ دیا۔ گووند بلال نے سدرا کا کے ناٹک "مرچ کٹک" کا ترجمہ کیا اور اس طرح ڈرامے کی دنیا میں قدم رکھا۔ اس کے بعد انھوں نے "شاردا" جیسے سماجی ڈرامے بھی لکھے۔ "شاردا" کا انتخاب نیشنل ڈرامہ فیسٹول کے لئے کیا گیا۔ اس ناٹک کا پلاٹ ایک دولت مند بوڑھے آدمی کے اردگرد گھومتا ہے جو

کسی غریب گھرانے کی نوخیز دوشیزہ سے بیاہ رچانا چاہتا ہے۔

کرشناجی پربھاکر کی تصانیف کی بدولت تاریخی ناٹکوں کی داغ بیل پڑی۔ پربھاکر کا دوسرا نام کاکا صاحب کھاڈیلکر ہے۔ ان کے نثر کے ڈراموں میں شیواجی اور تاریخ مہاراشٹر کے دوسرے سورماؤں وغیرہ کے حالاتِ زندگی قلمبند کئے گئے ہیں۔ ان ڈراموں میں جہاں حب الوطنی کا جذبہ کارفرما تھا وہیں ان میں انقلابی مواد بھی کافی موجود تھا گو کہ یہ چیز روایاتی کہانیوں کی شکل میں پیش کی گئی تھی۔ مثال کے طور پر کھاڈیلکر کے ڈرامہ "کیچک ودھ" میں لارڈ کرزن کی پالیسیوں پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی۔ بعدازاں اس پر پابندی لگا دی گئی۔ نیشنل فیسٹول میں مہاراشٹر کے تواریخی ناٹکوں کی روایات کی نمایندگی کے لئے کھاڈیلکر کا ڈرامہ "بھاؤ بندکی" چنا گیا ہے اس ناٹک میں مرہٹہ تاریخ کا ایک دردناک باب یعنی نارائن راؤ پیشوا کے قتل کا واقعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں بھی ایک واضح اپیل ہے کیونکہ رام شاستری کا کیریکٹر لوکمانیہ تلک کی شخصیت کے رنگ ڈھالا گیا تھا۔ ایکٹر رام شاستری کا پارٹ ادا کرتے وقت لوکمانیہ تلک کا لباس پہنتا اور وہی الفاظ استعمال کرتا جو مؤخرالذکر نے اپنے مقدمے کے دوران میں کہے تھے۔

سماجی ڈرامے کا رواج کولہاٹکر نے شروع کیا۔ انھوں نے پکے گانوں اور ہلکے پھلکے گانوں کو مقبول بنایا جو اردو غزلیات کے نمونے پر لکھے گئے تھے۔ کولہاٹکر نے ذومعنی الفاظ کا استعمال بڑی ہوشیاری سے کیا آج سماجی ڈرامے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جہاں تک ناٹکوں کو اسٹیج کرنے کا تعلق ہے۔ کولہاپور کے مرحوم کیشو راؤ بھونسلے نے بہت عمدہ کام کیا ہے۔ انھیں آرٹ ڈائرکٹر مرحوم آنند راؤ پینٹر کا تعاون حاصل تھا۔ اس قسم کے جدید ڈراموں میں ماما وارینکر کا ڈرامہ "ستاپچے غلام" بھی تھا جسے ۱۹۲۲ء میں للت کلا آدرش نے اسٹیج کیا تھا۔ سٹوس بلاکوں کے مناظر جدید فلیٹ جن میں نئے دور کے فرنیچر لگ رہے تھے اور بجلی کے قمقمے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے اور مکانات کے اندر کا وسیع اور شاندار حصہ۔ یہ ساری چیزیں اسٹیج پر مرہٹی ڈرامہ دیکھنے والوں کے لئے نئی تھیں۔ ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی نے قومی آزادی کی جد و جہد کی تحریک شروع کی تھی۔ ماما وارینکر کا یہ ڈرامہ "ستاپچے غلام" جس کے معنی ہیں "حق کی رو سے غلام" اس تحریک سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔

جن تمثیل نگاروں نے نئے ذرائع کا استعمال کیا۔ ان میں پی کے اترے اور ایم جی رانگنیکر بھی ہیں۔ اترے کے ڈراموں میں طنز و مزاح کا عنصر غالب رہتا ہے جبکہ رانگنیکر میں سنجیدگی زیادہ پائی جاتی ہے اور ان کے ناٹک متوسط طبقہ کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ماما وارینکر پہلے ڈرامہ نگار ہیں جنھوں نے ایک ایکٹ کے ڈرامے کو رواج دیا جس سماجی مسائل سے سنجیدگی سے بحث کی جاتی۔ ان کا پہلا ایک ایکٹ کا ڈرامہ "ترنگا چیادا رانت" (جیل کے پھاٹک پر) ۱۹۲۳ء میں لکھا گیا تھا۔ اس میں چھوت چھات کے مسئلے کو چھیڑا گیا تھا۔ آج سماجی روایات کے حامل مرہٹی ڈرامے اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لئے سینما کی صنعت سے دست و گریباں ہیں۔

گجراتی ڈرامہ

بارھویں صدی عیسوی میں گجرات میں سنسکرت کے نامور عالم رام چندر نے جنم لیا جنھوں نے لگ بھگ دس ڈرامے لکھے۔ انھوں نے ڈرامے کے فن پر بھی ایک رسالہ لکھا جس کا عنوان تھا "ناٹیہ درپن" رام چندر کے تمام کے تمام ڈرامے سنسکرت میں تھے۔

اگرچہ اس کلاسیکی روایت نے گہری جڑ نہیں پکڑی تھی۔ پھر بھی ڈرامے کی عوامی روایات کو 'راسوں' کے ذریعے زندہ رکھا گیا۔ یہ راس زیادہ تر کرشن جی کی زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد میں بھاوائیوں کا بھی رواج ہوا۔ بھاوائیوں میں بیشتر سنگیت کا حصہ تھا اور مکالمے فی البدیہہ ہوتے بھاوائی میں ناپختہ کامیڈی کے عناصر چھپے ہوئے تھے کیونکہ ان کے کیریکٹر غیر سماجی افراد کا مذاق اڑایا کرتے ان میں گجرات کا گربا ناچ بھی شامل کر لیا جاتا تھا۔

سترھویں صدی میں پریم آنند نے گجراتی ڈرامے کی روایات کا معیار بلند کرنے کی جد و جہد کی تھی۔ ان کے 'اکھیان' کا تانا بانا پورانوں کی کہانیوں کی بنیاد پر بنا جاتا۔ لیکن جدید اصطلاح میں جس چیز کو ڈرامہ کہتے ہیں اس کا وجود رنچھوڈ بھائی اودیارام (۱۹۲۳ - ۱۸۳۸ء) کا مرہون منت ہے۔ ان کا ناٹک کملت وکھ درشنک جو ۱۸۶۵ء میں اسٹیج کیا گیا تھا موثر سماجی ڈرامہ تھا۔ اس میں بچپن کی شادی کا المیہ بیان کیا گیا ہے۔ ایک اسکول ماسٹر

بردتم مہتاجی نے اس ناٹک کو اسٹیج کرنے کے لئے ایک ڈرامہ کمپنی قائم کی یہ راہ پارسیوں وغیرہ کی روایات سے بالکل جدا تھی جنھوں نے ڈرامے کی قدر و قیمت کی بجائے پرشکوہ مناظر اور سنگیت کی بھرمار پر زیادہ زور دیا۔ داہیا بھائی ڈھول ساجی (۱۹۰۶-۱۸۶۷) اور ناما لال نے گجراتی ڈرامے کو مزید اونچی سطح پر اٹھانے کی کوشش کی۔ پہلے پہل تو انھوں نے اسٹیج پر توجہ دی۔ اس کے بعد انھوں نے ڈرامے کے ادبی پہلو پر بھی دھیان دیا گو ان کے بہت سے ڈراموں میں ڈرامے کی بجائے شاعری کا عنصر غالب رہا۔

تاریخی ڈراموں کا رواج بھی فروغ پا رہا تھا۔ اس سلسلے میں کنھیا لال منشی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے پروفیسر بی۔ کے ٹھاکر نے گجراتی اسٹیج کی اصلاح کے لئے سماجی روایات کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا چندر اودن مہتا نے ناٹکوں میں حقیقت پسندی کا رنگ بھر دیا۔ برجھودیاں دویدی جنھوں نے "سرودیہ" لکھا اور پدول دلیسائی ان دونوں تمثیل نگاروں نے انھیں روایات کو اپنایا۔

نیشنل ڈرامہ فیسٹول کے لئے چندر اودن کا ڈرامہ "نرام رات" منتخب کیا گیا۔ یہ ایک متوسط طبقے کے گھرانے کے بحران اور اصلاح سے بحث کرتا ہے۔

چین کے ڈرامے

چینی ڈرامے میں ناچ اور گانے کی بھی وہی اہمیت ہے جو ایکٹنگ کی ہے حضرت عیسےٰ سے قبل کے زمانے میں چاؤ خاندان کے مذہبی رسوم کا ناچ غالباً چینی ڈرامے کا منبع ہے۔ آٹھویں صدی میں شہنشاہ منگ ہوانگ نے "ناشپاتی کے باغ کے نوجوان لوگ" نام سے زنانہ اور مردانہ ایکٹروں کی ایک کمپنی قائم کر کے خالص ڈرامے کی ترقی کو فروغ دیا تھا۔ لیکن اس کو ایک اہم ادب کی شکل میں استقلال اس وقت حاصل ہوا جب کانفیوشس کی اولاد میں سے کنگ تاؤ خو ایک سفیر کی حیثیت سے منگولیا گیا اور اس کے بعد عنانِ اختیار کبلائی خان کے ہاتھ میں آئی منگولوں کے عہد میں پچاس برس کے عرصے میں پانچ سو سے زائد ڈرامے لکھے گئے جن میں سے ایک سو تو ڈراماتی لٹریچر کے مستند نمونوں کے طور پر منتخب کئے گئے۔ "مغربی ایوان کا رومان" کا شمار بہترین ڈراموں میں ہوتا ہے۔ یہ سولہ مناظر کا ڈرامہ وانگ تھا فو کی تصنیف ہے۔ اس کی زبان کو باران برف کی طرح خوبصورت اور چاندنی کی طرح ملائم مانا جاتا ہے۔ اس میں ایک نوجوان اسکالر اور ایک خوبصورت لڑکی کی محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔

عوامی جمہوریہ چین کا ایک ثقافتی وفد حال ہی میں ہندوستان آیا تھا۔ یہ لوگ چین کے کلاسیکی اور عوامی سنگیت ناٹکوں میں سے منتخبہ نمونے بھارت کے لوگوں کے سامنے پیش کریں گے کلاسیکی نمونوں میں "مغرب کا سفر" نامی ایک بلند پایہ کلاسیکی ناول کے واقعات پر مبنی ایک ڈراما بھی شامل ہے۔ اس ناول میں ہوان چانگ کی بھارت یاترا سے متعلق اس وقت کی زیادہ تر مقبول عام کہانیاں بیان کی گئی ہیں جو تانگ خاندان کے دورِ آخر سے لے کر منگ خاندان کے زمانے میں زبان زدِ عام تھیں۔ اس کتاب کا ہیرو بندروں کا بادشاہ سن وو کنگ ہے جسے ایک ہر دلعزیز ہیرو تصور کیا گیا ہے۔ دیگر کلاسیکی انتخاب میں سودما راجہ ہیانگ یو کی وہ المناک کہانی بیان کی گئی ہے جب اس کی سپاہ نے اس سے دغا کی اور وہ دشمنوں سے گھر گیا تھا۔ اس کلاسیکی سنگیت ناٹک میں "سبز نیلے پتھر کی ہیر پن" کے مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ یہ سونگ خاندان سے متعلق ایک دلکش داستانِ محبت ہے جس میں قوم کے جنگ آزما بہادروں کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

عوامی اوپرا کے انتخابات میں دوشیزہ ایمزان جیسی مقبول کہانیاں شامل ہیں۔ ایک دو بدو لڑائی میں ایک حسینہ اپنے مدمقابل بہادر سردار کو مغلوب کر لیتی ہے اور پھر اس کا دل موہ لینے کے بعد اسے مکمل طور پر جیت لیتی ہے۔ ایک اور ناٹک میں ایک ایسے بزدل ظالم کا کردار پیش کیا گیا ہے جسے سماج کی بیوا کے لئے مغلوب کر لیا جاتا ہے۔

گرجا شنکر باجپائی

انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ

انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ کے قیام کو پچیس سال پورے ہونے والے ہیں۔ چونکہ گزشتہ زمانے میں میرا اس ادارے سے تعلق بھی رہا ہے، اس لئے مجھ سے زرعی تحقیق کی رفتار ترقی کے بارے میں مضمون قلم بند کرنے کو کہا گیا ہے۔

زراعت سے متعلق رائل کمیشن نے، جس کے چیئرمین لارڈ لنلتھگو تھے، اپنی رپورٹ ۱۹۲۹ء میں پیش کی تھی۔ اس کمیشن کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ زراعت میں ترقی اور اصلاح کے اقدامات کی بدولت ہندوستان کی دیہی آبادی کو مطمئن کرنے میں دور رس نتائج برآمد ہوں گے۔ اس طرح قومی آزادی کا مطالبہ کمزور پڑ جائے گا۔ لیکن آئینی اصلاحات کے سائمن کمیشن کی طرح یہ کمیشن بھی لوگوں کو مطمئن نہ کر سکا۔

بہرحال کمیشن نے اپنے محدود دائرۂ عمل میں ہندوستان کی زراعت میں مربوط تحقیق و تدقیق کی غرض سے ایک مفید نظام اور متعدد طریقے ضرور تجویز کر دئے تھے کیونکہ تحقیقات کے کاموں میں ارتباط کا فقدان ملک کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ لہذا رائل کمیشن نے زرعی تحقیقات کی ایک ایسی کونسل کے قیام کو کافی خیال کیا جو زراعت کے ماہرین اور مویشیوں کے ماہر ڈاکٹروں پر مشتمل ہو۔ اگرچہ اس تجویز نے صوبوں کے وزراء کو مایوس کر دیا تھا اور سرکاری ماہرین پر مشتمل ادارے سے خاطر خواہ نتائج کی امیدیں بھی ٹوٹ گئی تھیں لیکن رائل کمیشن کے ارکان اور وزیر ہند کو اس نوعیت کے ادارے سے بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں۔

سر محمد حبیب اللہ مرحوم اس وقت گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن برائے زراعت تھے اور میں محکمہ زراعت کا سیکریٹری تھا۔ رائل کمیشن نے مذکورہ کونسل کی مالی امداد کے لئے یہ بھی سفارش کی تھی کہ مرکزی حکومت کی آمدنی میں سے پچاس لاکھ روپے کی امداد سے "ایک ایگریکلچرل ریسرچ فنڈ" قائم کیا جائے اور وقتاً فوقتاً اس فنڈ کو مزید مالی امداد بھی دی جائے۔ قانون سازی کی بنا پر اس سفارش میں کچھ نقائص بھی تھے جن کو اس وقت کے وائسرائے لارڈ ارون کے سامنے مدلل طریقے سے پیش کیا گیا اور مجھے ایک متبادل اسکیم مرتب کرنے کا حکم دیا گیا۔ لہذا میں نے ایک ایسی تنظیم مرتب کی جس کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ نگران مجلس کا ہو جس میں وزرائے زراعت شامل ہوں اور دوسرا حصہ مشاورتی بورڈ کا ہو جس میں زیادہ تر ڈائرکٹران زراعت اور علاج الحیوانات کی محکموں کے افسر شامل ہوں۔

اس سلسلے میں ایک متبادل اسکیم تیار کرنا ہی کافی نہ تھا بلکہ مجلس قانون ساز کے ارکان کی حمایت بھی حاصل کرنا ضروری تھا کیونکہ اس وقت انڈیا آفس میں لارڈ برکن ہیڈ جیسی شخصیت وزیر ہند تھی اور اسمبلی میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ اور مسٹر محمد علی جناح جیسی با اثر شخصیتیں موجود تھیں۔ الغرض رائل کمیشن کی اصل تجاویز کے پہلو بہ پہلو متبادل اسکیم کے متعلق مذکورہ بالا اشخاص سے تبادلۂ خیالات کر کے ان کی تائید حاصل کی گئی اور اس متبادل اسکیم کو وزیر ہند کے سامنے پیش کر دیا گیا جو بہت پس و پیش کے بعد منظور کر لی گئی۔

محکمہ تعلیم صحت و اراضی سے علیحدہ ہونے کے دو سال بعد پریذیڈنٹ فرینکلین ڈی روزویلٹ کی طرف سے منعقد کردہ خوراک و زراعت کی بین الاقوامی کانفرنس میں مجھے ہندوستان کی نمائندگی کرنے کی خدمت سپرد کی گئی تھی۔ میرے ہمراہ اس کونسل کے دوسرے چیئرمین سر پی فیروز کھارسے گھاٹ بھی تھے۔ ہم نے ہندوستان میں جو تجربات حاصل کئے تھے وہ اس موقع پر بیش بہا ثابت ہوئے۔ اس کانفرنس کے بعد مجھے اس کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا تھا جس نے اقوام متحدہ کے ادارۂ خوراک و زراعت کا دستور مرتب کیا تھا۔ اس دستور میں انھیں امور کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ ہندوستان میں کامیابی سے سرانجام دے چکی تھی۔ بہرکیف ہندوستان کی زرعی تحقیق کونسل کو بھی بنی نوع انسان کی سودمندی اور بہبود کے سلسلے میں ایک اہم خدمت سرانجام دیتی ہے۔ اس کونسل کے پہلے پچیس سالہ دور کی کامیابیاں نہ صرف ہندستان بلکہ دنیا کے مستقبل کے لئے ایک نیک فال ہے۔

نئی کتابیں اور رسالے

کیفِ سرمدی

مصنّف ایس، پی نگم ناشاد کانپوری ایم اے ۔ مجموعۂ کلام ۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات ۔ قیمت دو روپے ۔ کتاب مجلّد ہے ۔ کتابت طباعت وغیرہ عمدہ ۔ ملنے کا پتہ ۔ دوارکا بھون ۔ کاشی ڈیرہ لکھنؤ ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی پروفیسر ضیا احمد ضیا اور منشی شیام موہن لال جگر بریلوی نے شروع میں کلامِ ناشاد پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے ، اور حق یہ ہے کہ بڑی حق گوئی سے کام لیا ہے ۔ ایسے باکمال شاعر کا کلام اتنی مدّت تک زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوا ۔ اس کے لئے ناشاد صاحب کی متانت اور انکسار ہی ذمہ دار ٹھہرائے جا سکتے ہیں ۔ یہ کلام جب پڑھ کر واقعی کیف سرمدی حاصل ہوتا ہے آپ نے عمر کے سینتالیسویں سال میں شائع فرمایا ہے ۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا دامن سستی شہرت کی ہوس سے آلودہ نہیں ۔ صنفِ غزل کی باریکیوں کو آپ نے خوب سمجھا ہے اور غزل کے مزاج کو خوب پایا ہے ۔ چھوٹی بحر کی غزلوں میں بالخصوص آپ نے بہت اچھے شعر نکالے ہیں ۔

تم سچے تو میں ہی جھوٹا ۔۔۔ کون بڑھائے تم سے بات
عشق کا بھی کیا کھیل ہے پیارے ۔۔۔ پیچھے بازی پہلے مات

صدیقی صاحب نے خوب فرمایا ہے ۔

"غزل میں حُسن و محبت کا ذکر ہوتا ہے اور حُسن و محبت کے کاروبار میں ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے "جس شامت یا شادمانی سے دوچار ہوتے ہیں اس کا اظہار کرتے ہیں ۔ کبھی لیاقت سے کبھی حماقت سے ۔ کہیں شرافت سے کہیں شہدپن سے ۔ لیکن ان مدارج سے گزر کر غزل اب وہاں پہنچ گئی ہے جہاں ممکن ہے آپ سب کو دھوکا دے سکتے ہیں ، غزل کو نہیں دے سکتے ۔"

ناشاد صاحب نے فی الحقیقت غزل کے ساتھ انصاف کیا ہے ۔ اسے دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی ۔ ان کے مجموعے میں اچھے اشعار کی تعداد بہت ہے ۔ اوسط درجے کے اشعار کم اور گھٹیا اشعار شاذ و نادر ہیں ۔ یہی اچھے کلام کی دلیل اور معیار ہے ۔

زبان کی بے ساختگی اور اسلوبِ بیان کی ندرت ناشاد صاحب کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے ۔ پیچیدہ بیانی اور دقّت کہیں نہیں ۔

تذکرہ تھا گردشِ ایّام کا ۔۔۔ آپ کیوں تیور بدل کر رہ گئے

سیدھے سادے الفاظ ہیں مضمون میں بڑی وسعت ہے ، اور دونوں مصرعے یک جان و دو قالب ہیں ۔ محاکات کا کیا کہنا ۔ کچھ اور شعر ملاحظہ فرمائیے ۔

ترکِ محبت کر دیں لیکن ! ۔۔۔ اس پر بھی جب وہ یاد آئیں
وقت کی خوبیاں معاذ اللہ ۔۔۔ ہم بھی اپنے نظر نہیں آئے
بھا گئی ہیں دہر کی نیرنگیاں ۔۔۔ ہو گیا ذوقِ نظر برباد کیا
یہ دل میں کون چھپتا جا رہا ہے ۔۔۔ ستارے جھانکتے ہیں آسماں سے
بیل محبّت کی جب بوئی ۔۔۔ پھول ہنسے اور شبنم روئی
کوئی دُکھ کا مارا رویا ۔۔۔ دنیا چادر تان کے سوئی
بُرا ہو بے خودیٔ عشق کا خبر نہ ہوئی ۔۔۔ ہزار بار گلے سے لگا لیا تو نے

کتنے اشعار ہیں کہ ضرب المثل بن جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔

کوئی ہنستا ہے کوئی روتا ہے ۔۔۔ یہی دنیا میں روز ہوتا ہے
دل کا ایمان اور ہی کچھ ہے ۔۔۔ عاشقی ذات پات کیا جانے
ایک دل کی کلی نہ کھل پائی ۔۔۔ پھول لاکھوں کھلے بہار آئی
جب تصوّر میں اُن کو لاتا ہوں ۔۔۔ دونوں عالم کو بھول جاتا ہوں
یہی کیا کم ہے تم نے پوچھ لیا ۔۔۔ اور اس سے زیادہ کیا کرتے

بعض سالم غزلیں ایسی ہیں کہ سحرِ حلال کا درجہ رکھتی ہیں ۔ موسیقی او رگھلاوٹ کے ساتھ معنی آفرینی کا کمال بھی ہے ۔ مثلاً

۱۔ پریم کہانی کون سُنائے ۔۔۔ درد کی دولت کون لُٹائے

۲۔ جھوٹی دنیا جھوٹی مایا — کون ہے اپنا کون پرایا
۳۔ وہ کس سے کرتے ہیں بات — اُن کا دن ہے اُن کی رات
۴۔ دنیا ہے آئینہ خانہ — ہم جیسے تھے ویسا دیکھا

چند نظمیں، گیت اور قطعات بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ لیکن ناشاد کا مزاج خالص غزل کا مزاج ہے۔ وہ دوسرے اصنافِ سخن میں بھی نمایاں ہے۔ یہ مجموعہ ہرچند مختصر اور بہ قامت کہتر ہے لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے بہتر ہے۔ ع

پس از مدت گزار افتاد بر ما کاروانے را

مزاحیہ افسانے

کرشن چندر کے ایک درجن مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ۔ ناشر آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل دہلی۔ قیمت تین روپے۔ ضخامت ۱۴۴ صفحے۔ کتاب مجلّد اور جلد پوش کی حامل ہے۔

کرشن چندر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کی طبیعت اور مزاج میں مزاح کے صحت مند عناصر پوری آب و تاب سے جلوہ نما ہیں۔ اُردو میں اچھا مزاحیہ ادب کم یاب ہے۔ یہ مجموعہ اس کمی کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

اپنی موج میں

پبلشر ادارۂ فروغِ اردو، امین آباد پارک لکھنؤ۔ حضرت آوارہ اپنی موج میں بہنے والے لوگوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ یہ تصنیف انھیں کے قلم کی خلاقی کی مظہر ہے۔ ان چھتیس لفظی خاکوں میں آوارہ صاحب نے ایسے کرداروں کی جیتی جاگتی تصویریں بھر دی ہیں جو قوم کی تمدنی زندگی کا جزو اعلیٰ رہے ہیں، اور اب مٹتے جا رہے ہیں۔ ان کرداروں کی بول چال اور اُن کے فن کے کمالات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں، اور وہ بھی خالص "آوارگی" کے رنگ میں۔ فسانۂ آزاد کے کردار اب تک ہمارے ادب کا دلچسپ سرمایہ بنے ہوئے ہیں۔ یقیناً آوارہ کے بٹیرباز، مرغ باز، پتنگ باز، کبوترباز اور نہ جانے کیا کیا باز زندہ و پائندہ کردار ہیں۔ ان کا مشاہدہ، اصطلاحات پر عبور اور زبان پر قدرت، اس کتاب کی اہمیت میں اضافے کا موجب ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ ا۔ ہندوستان میں۔ انوار بک ڈپو۔ امین آباد پارک لکھنؤ
پاکستان میں۔ مبارک بکڈپو بندر روڈ مقابل ڈینسو ہال کراچی ۲

نادر روزنامچہ

مُرتّب ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھنؤ یونی ورسٹی۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔
پبلشر ادارۂ فروغِ اُردو ۲/۳۔ امین آباد پارک لکھنؤ
ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ کتاب مجلّد اور جلد پوش کی حامل ہے۔

مولوی مظہر علی سندیلوی نے ۱۸۶۶ء میں اپنا روزنامچہ لکھنا شروع کیا تھا اور پورے ۵۴ سال تک لکھتے رہے۔ یہ روزنامچہ ۸ ہزار فل سکیپ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ایک عہد کی داستان اور تاریخ ہے۔ اس میں ہندوستانی ریاستوں، تعلقوں اور بیرونِ ہند کے حالات کے ساتھ ساتھ مقامی اور ذاتی کوائف و معلومات درج ہیں۔ اس روزنامچے کا خلاصہ مرتّب نے رسالہ اُردو شمارہ بابت جنوری ۱۹۳۹ء تا جنوری ۱۹۴۴ء میں بالاقساط شائع فرمایا تھا، اب بہ ترمیم و اضافے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ یہ صنف ادب اُردو میں قریب قریب نایاب ہے۔ امید ہے یہ کتاب قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی

اُردو تنقید کی تاریخ (پہلی جلد)

مصنف مسیح الزماں صاحب لکچرار الہ آباد یونی ورسٹی

ملنے کا پتہ۔ خیابان ۱۱۰ سبزی منڈی الہ آباد ۳۔ قیمت تین روپے

مصنّف کا ارادہ اس کتاب کو تین جلدوں میں ختم کرنے کا ہے پہلی جلد میں ابتدا سے تقریباً ۱۸۵۷ء تک کی تنقیدی تحریروں کا جائزہ ہے۔ دوسری میں ۱۸۵۷ء کے نتائج اور جدید تنقید کا ذکر ہوگا۔ اور تیسری میں ترقی پسند مصنفین کی تنظیم اور اس کے بعد کا بیان۔ مواد کی فراہمی بڑی محنت سے کی گئی ہے۔ پُرانے تذکروں اور دوسری تحریروں میں نقد و نظر کے جو آثار ملتے ہیں اُن کا ذکر اختصار اور سلیقے سے اس جلد میں ملے گا۔ عربی اور فارسی کے اصول نقد، اُردو تنقید کا پہلا دور فائز سے باغ و بہار تک، دوسرا دور میر سے مصحفی تک، تیسرا دور گلزارِ ابراہیم اور گلشنِ ہند سے طبقات شعرا تک۔ اور آخر میں غدر کے بعد پُرانا اسکول کے جلی عنوانات کے تحت اردو تنقید کی تاریخ بیان کی گئی ہے، مصنّف نے ان اقوال کو کہ اُردو میں تنقید کا وجود فرضی ہے، اور حالی سے پہلے اُردو میں تنقید نہیں تھی غلط ثابت کر دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مصنف کی اس قدر حوصلہ افزائی ضرور ہوگی کہ بقایا دونوں جلدیں جلد منظرِ عام پر آجائیں۔

ساحل اور سمندر

مصنف سید احتشام حسین۔ ضخامت ۳۶۸ صفحات۔ کتابت طباعت عمدہ۔ ملنے کا پتہ:۔ سید وجاہت حسین سرفراز قومی پریس لکھنؤ

اردو میں سفرنامہ اور ڈائری بہت کم لکھا گیا ہے۔ احتشام صاحب نے اپنے امریکہ اور انگلستان کے سفر سے متعلق تاثرات کو اس کتاب میں درج فرمایا ہے۔ خود ان کے قول کے مطابق یہ سفرنامہ اور ڈائری ادبی فلسفیانہ یا علمی مباحث سے گراں بار نہیں۔ اس میں تاریخی، سیاسی، جغرافیائی معلومات یا مختلف قسم کے اعداد و شمار کو بھی یکجا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ جہاں کہیں یہ آگئے ہیں ان کا ذکر کر دیا ہے۔ سفرنامے کے حالات بہت دلچسپ ہیں۔ احتشام حسین اردو کے مستند نقاد بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ نقادوں کے قافلے کے سالاروں میں سے ہیں۔ آپ سے یہی امید کی جا سکتی ہے کہ آپ تصویر کا ہر رُخ پیش کریں۔ سفر کے حالات یا ڈائری میں خاص دیانت داری جھلک رہی ہے۔ دس مہینے کی مُدت میں آپ نے جو دیکھا یا محسوس کیا اُسے اختصار آمیز وضاحت سے آپ نے بیان فرما دیا ہے۔ آپ نے مغرب کی ہماہمی کا نظارہ کیا۔ علمی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں۔ ادبی اور صنعتی اداروں کو دیکھا۔ سیاست دانوں سے ملے۔ اقتصادی اور سماجی مسائل پر گفتگو کی۔ سائنس کے کرشموں سے ترقی یافتہ دنیا کی سیر کی۔ ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد جو اثر آپ پر ہوا اس کا نچوڑ آپ نے سخن ہائے گفتنی کے عنوان سے کتاب کے آخر میں درج کر دیا ہے۔ یہ صفحات احتشام صاحب کے نقطۂ نظر کی وضاحت کما حقہ کرتے ہیں۔ سفر سے پہلے اور سفر کے بعد کے احتشام میں کوئی نظریاتی فرق نظر نہیں آتا۔ معلومات اور مشاہدے کی خیرہ کُن روشنی میں بھی انھیں ہر چیز اپنے اصلی رنگ میں نظر آتی دکھائی دیتی ہے۔

رسالے

فکر و نظر۔ ادارۂ ادب علی گڑھ کا چار ماہی رسالہ آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ چار آنے۔ ادارت کی عمارت ادب کے نو ستونوں پر کھڑی ہے۔ قاضی عبدالغفار، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عبدالعلیم، اختر انصاری، جذبی، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر منیب الرحمٰن، خلیل الرحمٰن اعظمی اور ڈاکٹر مسعود حسین کے اسمائے گرامی رسالے کے اسم بامسمّٰی ہونے کی ضمانت ہیں۔ زیر نظر شمارہ اچھی اور معیاری تخلیقات کا حامل ہے۔ جدید غزل پر رشید احمد صدیقی کا مقالہ ایک قابل قدر مضمون ہی نہیں بلکہ شمع ہدایت ہے۔

کردار۔ مفتی صدیقی کی ادارت اور علامہ نحوی صدیقی لکھنوی کی سرپرستی میں یہ رسالہ بھوپال سے شائع ہو رہا ہے۔ سالانہ چندہ چار روپے اور کئے نامور ادیبوں کے نگارشات اس میں شائع ہوتے ہیں۔ رسالے کا ادبی معیار اچھا ہے۔ بھوپال جیسے مقام سے ایک اچھے رسالے کا اجراء اور اس کا زندہ رہنا فال نیک ہے۔

کُنگ پوش۔ کشمیر سٹیٹ کلچرل کانفرنس کا یہ دوماہی رسالہ سری نگر سے شائع ہوتا ہے۔ زرسالانہ چھ روپے۔ کشمیر اور کشمیری ادب سے متعلق مضامین اس میں شائع ہوتے ہیں۔ لکھائی چھپائی مزید توجہ کی محتاج ہے۔ غالباً کشمیر میں بہتر ذرائع طباعت کے میسّر نہیں۔

برگِ گل۔ اردو کالج کراچی کا شائع کردہ منتخب مضامین کا یہ مجموعۂ حسین و جمیل بڑے اہتمام سے ٹائپ میں چھپا ہے۔ بڑی تقطیع کے ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ مضامین دلچسپ اور معیاری ہیں۔ تصاویر بھی شامل ہیں۔ قیمت درج نہیں۔

کرنیں۔ شفیقہ فطرت کی ادارت میں بچّوں کا یہ رسالہ ناگپور سے شائع ہوتا ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ "کرنیں نیو کالونی ناگپور"۔ چندہ سالانہ چار روپے۔ رسالہ خوبصورت ہے۔ تصاویر سے آراستہ ہے۔ بچّوں کے لئے بہت دلچسپ نظمیں اور مضمون اس رسالے میں شامل ہیں۔

چاند۔ فیض انصاری کی ادارت میں بچّوں کا یہ رسالہ بھی ناگپور سے شائع ہوتا ہے۔ قیمت فی پرچہ پانچ آنے، سالانہ تین روپے آٹھ آنے۔ بچّوں کے لئے مفید ادب اس رسالے کا طرۂ امتیاز ہے۔ تصاویر بھی ہیں نظمیں بھی اور دلچسپ کہانیاں بھی۔

ریویو کے لئے دو جلدوں کا آنا نہایت ضروری ہے۔

رفتارِ زمانہ

بے روزگاری کے خلاف بھارت سرکار کا عظیم الشان منصوبہ

بھارت میں بے روزگاری کو ختم کرنے کے لئے بھارت سرکار اپنے تمام ذرائع استعمال میں لا رہی ہے۔ اس سلسلے میں لوک سبھا میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے پلاننگ کے ڈپٹی منسٹر شری ایس این مشرا نے ہاؤس کو بتایا کہ بے روزگاری ختم کرنے کی مہم کو تیزی کے ساتھ کامیاب بنانے کے لئے پانچ سالہ پلان میں دو ارب سولہ کروڑ روپے کی مالیت کی مزید اسکیموں کی منظوری دے دی گئی ہے جس میں سے زراعت اور دیہاتی ترقی ۱۴ کروڑ ۵۳ لاکھ روپے، آبپاشی ۴۲ کروڑ ۲۷ لاکھ روپے۔ انڈسٹری ۹۱ کروڑ ۵۳ لاکھ روپے۔ سڑکیں اور سڑکوں کی آمد و رفت ۲۶ کروڑ ۴۳ لاکھ روپے، تعلیم ۷ کروڑ ۹۸ لاکھ روپے صحت اور پانی کی بہم رسانی ۱۹ کروڑ ۵۱ لاکھ روپے اور رہائش کے لئے مکان مہیا کرنے پر ۵۹ کروڑ ۳۹ لاکھ روپیہ خرچ کیا جائےگا۔ اور ان پروگراموں میں ایسی اسکیموں کو ترجیح دی جائے گی جن سے عوام کو روزگار مہیا کیا جا سکے۔

بھارت اور ایران میں تجارتی معاہدہ

بھارت اور ایران کے مابین ایک اہم تجارتی اور جہازرانی کے معاہدے پر دستخط ہو گئے ہیں جس کے مطابق ہر دو ممالک کے باشندوں کو ایک دوسرے کے علاقے میں داخل ہو کر تجارت کرنے کا حق حاصل ہو گیا ہے، اور کئی طرح کی مزید رعایتیں بھی اس سلسلے میں دی گئی ہیں۔ بھارت اور ایران کے باہمی تعلقات بہت پرانے ہیں۔ ہزاروں برس پیشتر بھی ان دونوں دیشوں کے درمیان تجارت اور جہازرانی کا سلسلہ جاری تھا۔ نئے تجارتی معاہدے کے ذریعے دونوں ممالک ایک بار پھر دوستی اور بھائی چارے کے رشتے میں منسلک ہو گئے ہیں۔

پاکستان اور ترکی کے فوجی معاہدے میں عراق کی شمولیت

عراق کے وزیر خارجہ نے پاکستان اور ترکی کے فوجی معاہدے میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ آپ نے ایک انٹرویو میں کہا کہ جنگ کی صورت میں مغربی طاقتوں کو عراق کے اڈے استعمال کرنے کا اختیار ہوگا۔ عرا ب اور مشرق بعید کے دوسرے ممالک کو بھی اس معاہدے میں شامل ہونے ترغیب دی جا رہی ہے، اور شاہ ایران سے بھی جو ان دنوں واشنگٹن ہیں اس سلسلے میں بات چیت کی توقع ہے۔

جرمنی کا نیا دور

اُدھر مغربی جرمنی کو مسلح کرنے کا اعلان ہو گیا ہے، اِدھر اس کی اطلاع موصول ہوئی ہے کہ مشرقی جرمنی کی حکومت نے آئندہ موسم میں فوجی بھرتی کے لئے ۱۸ سال سے ۲۲ سال تک کی عمر کے تمام نوجوانوں کے نام رجسٹر کرنے کے فوری احکام جاری کر دئے ہیں۔ اس سلسلے میں معلوم ہوا کہ ساڑھے تین لاکھ نوجوانوں پر مشتمل ایک فوج طیار کی جائے گی اور اس میں ہٹلر کے وقت کے بڑے بڑے نازی جرنیلوں کو بھی شامل کیا جائے گا۔

وزیر اعظم کشمیر کی تقریر

ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے سری نگر سے کچھ میل دور ایک مقام شوپیان کے ایک بھاری پبلک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کشمیر کے تخریب پسند عناصر کو تنبیہ کی کہ وہ اپنی ناجائز حرکتوں سے باز آئیں۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم نے مظلوم عوام کی خدمت کے لئے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تھی، اور تھوڑے عرصے میں میری گورنمنٹ نے عوام کی جو سیوا کی ہے وہ سب پر بخوبی روشن ہے، اور اسی لئے ہمیں عوام کا اعتماد حاصل ہے۔ ریاست کے وزیر مال میر قاسم نے بھی اسی جلسے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر بھی بھارت کا ویسا ہی ایک حصہ ہے جیسے کہ دوسرے صوبے۔ اس لئے ہم مرکز سے امداد لینے کے حقدار ہیں۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم بھارت کی امداد پر زیادہ انحصار رکھتے ہیں۔ بھارت ہمارا ہے اور ہم بھارت کے ہیں۔ اس لئے جو بھی امداد بھارت سے حاصل ہوگی اُسے عوام کی بہبود کے لئے استعمال کریں گے جلسے کے بعد۔

وزیر اعظم اور وزیر مال کا شہر میں شاندار جلوس نکالا گیا۔

پردھان منتری کی جنتا سے اپیل

اتر پردیش کی ایک سیاسی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے بھارت واسیوں سے اپیل کی کہ وہ اگلے پانچ برس دیش کو آگے لے جانے کی انتھک کوشش کریں تاکہ بھارت صحیح معنوں میں ایک خوش حال دیش بن جائے۔ شری نہرو نے کہا کہ اب تک ہمارے دیش نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ بھی کچھ کم نہیں ہیں، اور اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم نے جو کام بھی کیا نہایت پُر امن طریقے سے کیا۔ دیش کی آزادی حاصل کرنے میں پُر امن جدوجہد کی گئی اور اب اقتصادی خوش حالی بھی پُر امن طریقوں سے ہی حاصل کی جائے گی، اور میرا یہ یقین ہے کہ ہماری خوش حالی اسی صورت میں پائدار اور مستحکم ہو سکتی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ سوراج کا حقیقی مقصد افلاس، جہالت، بیماری اور ناقص غذا کا خاتمہ کرنا ہے۔ لیکن یہ کام محض امیٹیشن کرنے اور دوسرے ممالک کی نقل کرنے سے نہیں ہو سکتے۔ بلکہ تمام کمزوریوں کا خاتمہ کرنے سے ہی ہوگا۔ ہم نے اپنی ایک یکجہتی کی وجہ سے چھ ماہ کے اندر چھ سو ریاستوں کو ختم کر دیا، اور پھر زمینداری اور جاگیرداری کے صدیوں پُرانے نظام پر خطِ تنسیخ پھیرا۔ کیا یہ کوئی معمولی کام تھا، اور پھر ہمارے اس کام کی اہمیت میں مزید اضافہ اُس وقت ہو جاتا ہے جب آپ دیکھتے ہیں کہ یہ سارے مسائل ہم نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر انجام دئے۔ دراصل ہماری سرزمین ایسی ہے کہ یہاں جو چیز پُر امن طور طریقوں سے نہیں بدلی جائے گی وہ ہرگز جڑ نہیں پکڑے گی۔ اس لئے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم روس یا کسی دوسرے ملک کی نقل کر کے ترقی کریں گے وہ سراسر غلطی پر ہیں۔ ہمیں اپنے آپ پر بھروسہ رکھنا چاہیئے، اور مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر آگے بڑھتے جانا چاہیئے۔

وزیر اقتصادیات بھارت کی تقریر

بھارت کے وزیر اقتصادیات شری چنتامن دیش مکھ نے ایسوسی ایٹڈ چیمبر آف کامرس کلکتہ کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ دوسرے پنج سالہ پلان میں سرکاری اور نجی دونوں طرح کی صنعتوں کا دائرہ زیادہ وسیع ہوگا۔ اور میرا خیال ہے کہ دیش کی قومی آمدنی کا دس بارہ فی صدی سرمایہ ہر سال صنعتی ترقی کے لئے لگانا پڑے گا۔ وزیر خزانہ نے آگے چل کر بتایا کہ بھارت سرکار کی یہ تجویز ہے کہ ایسے ذرائع استعمال کئے جائیں جس سے دس سال کے اندر ملک سے بیکاری کا خاتمہ ہو جائے اور قریباً ایک نسل میں ہر ایک شخص کی آمدنی دُگنی ہو جائے۔ یہ سارا کام ۲۵ سال کے اندر انجام پا جائے گا۔

مارشل ٹیٹو صدر یوگوسلاویہ کی دہلی میں آمد

یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو کا بھارت کی راجدھانی دہلی میں شاہانہ استقبال کیا گیا۔ آپ بذریعہ اسپیشل ٹرین بمبئی سے دہلی چار بجے پہنچے۔ ریلوے سٹیشن پر راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد، پردھان منتری شری جواہر لال نہرو، اُپ راشٹرپتی ڈاکٹر رادھا کرشنن، بھارت سرکار کے دیگر وزراء، بحری، برّی اور ہوائی افواج کے کمانڈر انچیف، غیر ملکی سفیر اور پارلیمنٹ کے ممبر موجود تھے۔ ٹرین کے پلیٹ فارم پر رُکتے ہی مارشل ٹیٹو مُسکراتے ہوئے باہر آئے۔ اور اُترتے ہی نہایت گرمجوشی سے راشٹرپتی سے ہاتھ ملائے۔ راشٹرپتی نے اس کے بعد پردھان منتری، اُپ راشٹرپتی اور دیگر وزراء اور سفیروں سے اُن کا تعارف کرایا۔ اسی دوران میں اُن کے اعزاز میں ۲۱ توپوں کی سلامی دی گئی۔ پلیٹ فارم سے باہر آنے پر اُن کو گارڈ آف آنر دیا گیا، اور یوگوسلاویہ اور بھارت کے قومی ترانے بجائے گئے۔ بعد ازاں وہ راشٹرپتی کی کھُلی کار میں سوار ہو کر راشٹرپتی بھون تک گئے۔ راستے میں لاکھوں اشخاص نے پرجوش نعروں اور تالیوں سے اپنے معزز مہمان کا سواگت کیا۔ ریلوے سٹیشن سے روانہ ہونے سے قبل مارشل ٹیٹو نے بھارت کے لوگوں کے نام اپنا پیغام پڑھا جس میں آپ نے بھارت کے گزشتہ تاریخ و تمدن کی دل کھول کر تعریف کرتے ہوئے اس امر کی پختہ اُمید ظاہر کی کہ اُن کی راشٹرپتی، پردھان منتری اور دوسرے لیڈروں سے بات چیت دُور رس اور مفید نتائج کی حامل ہوگی، اور اس سے دُنیا میں امن کو بھی تقویت ملے گی۔ دوسرے دن آپ نے مہاتما گاندھی کی سمادھ پر پھولوں کا گلدستہ چڑھایا، اور جامع مسجد، لال قلعہ، قطب مینار اور دیگر تاریخی مقامات کی سیر کی۔ دہلی میونسپلٹی کے زیر اہتمام لال قلعے میں اُن کو دہلی کے شہریوں نے ایڈریس پیش کیا۔ آپ نے سونی پت (پنجاب) بھی گئے۔ جہاں آپ نے کمیونٹی پراجیکٹ کے کام کو دیکھا۔ آپ نے دہلی یونیورسٹی کا بھی معائنہ کیا۔ حیدرآباد ہاؤس میں ہندوستانی لیڈروں کے اعزاز میں آپ نے ایک دعوت دی جس میں صدر جمہوریہ، پنڈت نہرو، دیگر وزراء، اور دیگر ممالک کے سفراء بھی شریک تھے۔



اُڑتا جائے غبارا



پل میں ہے گرمی، پل میں ہے جاڑا، پل پل بدلے پارا
کبھی اِدھر کا کبھی اُدھر کا، دل کو ہُوا اشارا
ابھی تو کچھ تھا، ابھی ہُوا کچھ اور خیال ہمارا
اُڑتا جائے غبارا



کبھی زمیں کا، کبھی فلک کا، نقشہ دل نے اُتارا
کبھی ہے پھول اور کبھی ہے تارا اپنی آنکھ کا تارا
ابھی تو کچھ تھا، ابھی ہُوا کچھ اور خیال ہمارا
اُڑتا جائے غبارا



کبھی ہے گیند اور کبھی غبارا اپنے جی کا سہارا
کبھی قلاقند اور کبھی برفی اور کبھی شکر پارا
ابھی تو کچھ تھا، ابھی ہُوا کچھ اور خیال ہمارا
اُڑتا جائے غبارا



اب یہ کہانی ہوئی پُرانی، بج گئے پونے گیارا
یا اب کوئی نیا لطیفہ، یا وہی گیت دوبارا
ابھی تو کچھ تھا، ابھی ہُوا کچھ اور خیال ہمارا
اُڑتا جائے غبارا

(المراء)

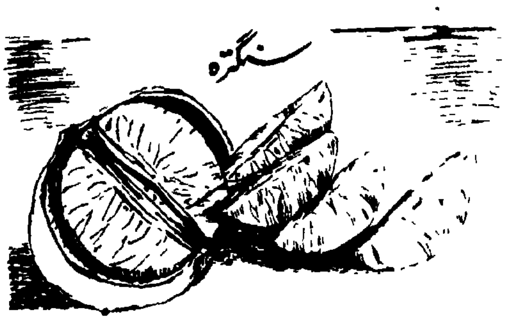
فیض لدھیانوی



پہیلیاں



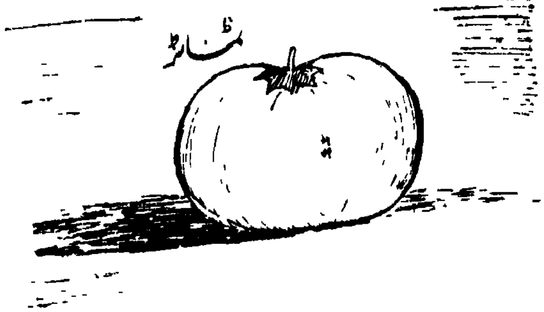
ہزاروں سال کا ثابت قدم بوڑھا جواں ہمّت
اسے دیکھو تو کہہ اٹھّو کہ اونچی شان ہے رب کی
بہت سے قیمتی ہیرے ہیں اس کی جیب میں لیکن
پہیلی بوجھ لو تو عقل پر پتھّر پڑیں سب کی



سنہری رنگ کے بقچے میں ہیں کچھ بوتلیں ایسی
خدائے پاک نے جن میں بھرا ہے زندگی کا رس
بہت ارزاں بہت عمدہ ذرا کھٹّی ذرا میٹھی
بتائیں اور کیا تعداد ہوگی اُن کی نَو یا دس



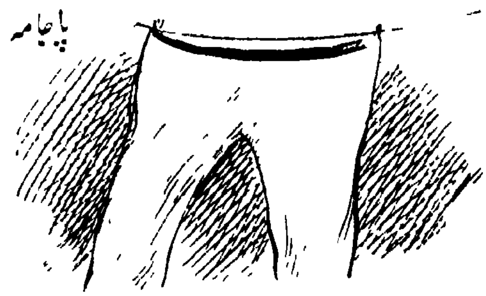
نہیں آپس میں یکساں اس کی دو ٹانگیں مگر پھر بھی
خوشی سے ہر گھڑی چلتے ہی رہنا کام ہے اس کا
وہ طے کرتی ہے بارہ منزلوں کو وقت پر اپنے
پہیلی خود بتا دے گی تمھیں کیا نام ہے اس کا



نہ پوچھو کس قدر طاقت ہے دیسی لال انڈے میں
جو کھاتا ہے جواں دل سُرخ رُو ہو کر مُسکاتا ہے
سفیدی اور زردی کی جگہ کچھ بیج ہیں اس میں
اسے مرغی نہیں دیتی یہ پودے سے ٹپکتا ہے



یہ دو ساتھی ہیں جن کی شکل بالکل ایک جیسی ہے
سُنو تم غور سے دلچسپ حال ان کا ادھر آؤ
انھیں ہے شوق پھرنے کا ہمیں جانا ہو جب باہر
ہمارے پاؤں پڑتے ہیں کہ ہم کو ساتھ لے جاؤ



اُگایا اس کو دہقاں نے بنایا اس کو درزی نے
یہ سب کو ڈھانپتا ہے کوئی جاہل ہو کہ علاّمہ
حقیقت ایک ہے اس کی نظر آتا ہے دو بن کر
اگر تم بُوجھ لو تو آدمی ہو - ورنہ پاجامہ



زمیں لوہے کی ہے تو چار دیواری ہے لکڑی کی
نرالا باغ ہے کھِلتی ہیں کلیاں بے حساب اس میں
جو پتھّر کی چھڑی لے کر وہاں تم گھومنے نکلو
سجھائی دے گا ہر ڈھب کے سوالوں کا جواب اس میں

محمد سعید الرّب صدّیقی

یک نہ شُد دو شُد



کسی زمانے میں ایک بوڑھی جادوگرنی رہتی تھی۔ اسے ایک ایسا منتر آتا تھا جس کے پڑھنے سے مردہ قبر سے نکل کر اپنا کفن پیش کرتا تھا وہ کفن کو مردے سے لے کر پھر ایک منتر پڑھتی جس سے وہ مُردہ اپنی قبر میں واپس چلا جاتا۔ اس طرح کفنوں کو بیچ کر بوڑھی جادوگرنی اپنی زندگی کی گاڑی کھینچ رہی تھی۔ بڑھیا کا ایک عزیز دوست اُس کے یہ کرتوت جانتا تھا اس لئے وہ ہمیشہ اُس کی خدمت میں رہتا تاکہ بڑھیا اُسے وہ جادو بتا دے جس کے زور سے وہ مُردے کو قبر سے باہر نکال لیتی ہے اور مردہ قبر سے نکل کر اپنا کفن پیش کر دیتا ہے۔ مگر بڑھیا بہت عقلمند تھی اور اپنا منتر کسی طرح نہیں بتاتی تھی۔ اس کا عزیز بہت باہمّت تھا۔ وہ ثابت قدمی کے ساتھ اس کی خدمت کرتا رہا۔ آخر کار اس کی ہمّت رنگ لائی۔ ایک دن بڑھیا کی حالت یک بیک خراب ہوگئی اور اُسے یقین ہو گیا کہ اب وہ نہیں بچ سکتی۔ اُس نے حسرت سے اپنے عزیز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے ایک منتر کو جسے تم مجھ سے جاننا چاہتے تھے۔ ایک زمانے تک چھپائے رکھا۔ مگر اب میں مر رہی ہوں۔ اس لئے وہ منتر تمہیں بتا رہی ہوں۔ خبردار! کسی دوسرے کو نہ بتانا۔"

منتر بتا کر بڑھیا مر گئی۔ بڑھیا کی تجہیز و تکفین کے بعد اُس شخص نے بڑھیا کے بتائے ہوئے منتر کو آزمانا چاہا۔ قبرستان میں جا کر اُس نے وہ منتر پڑھا۔ منتر کے پڑھتے ہی وہ مردہ کفن لے کر حاضر ہوگیا۔ اُس نے کفن لے لیا۔ بڑھیا نے اس آدمی کو صرف مردہ نکالنے کا منتر بتایا تھا اُس کے واپس کرنے کا منتر نہیں بتایا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مردہ اُس آدمی کے ساتھ سایے کی طرح رہنے لگا۔ وہ آدمی بہت گھبرایا۔ آخر اُسے ایک ترکیب سُوجھی کہ کیوں نہ بڑھیا کو قبر سے باہر نکال کر دوسرا منتر بھی سیکھ لے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ خوشی سے اُچھل پڑا اور بھاگ کر بڑھیا کی قبر پر پہنچا۔ منتر پڑھا۔ منتر پڑھتے ہی بڑھیا قبر سے باہر نکل آئی اور اپنا کفن پیش کر دیا۔ کفن لے کر اُس آدمی نے بڑھیا سے دوسرا منتر پوچھا جس سے وہ مردے کو واپس قبر میں بھیج دیتی تھی۔ مگر بڑھیا خاموش رہی۔ کیونکہ وہ مر چکی تھی۔ اب بڑھیا کا سایہ بھی اُس آدمی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ پہلے تو صرف ایک سایہ تھا۔ اب دو سایے ہوگئے۔ یہ دیکھ کر وہ آدمی برجستہ بول اُٹھا۔

یک نہ شُد دو شُد

یوگ راج تھانی

انمول جسم

دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ کی لپٹیں جسم کو پگھلا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ درختوں کے پتے بھی چپ چاپ گرمی کے مارے تڑپ رہے تھے۔

ایک بھکاری جو نہایت ہی غریب تھا، اس گرمی کو برداشت نہ کر سکا۔ بھوک سے لاچار ہو کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے محل کے سامنے جا کر اس نے چلّانا شروع کیا ——— "ایشور کتنا بے رحم ہے۔ کئی آدمیوں کو تو اتنا دھن دیتا ہے کہ محل بھی انھیں اچھے نہیں لگتے۔ اور کئی آدمیوں کو میرے جیسا بھکاری بنا دیتا ہے جنھیں کئی کئی دن تو کیا ہفتوں پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ کتنا بے رحم اور ظالم ہے بھگوان۔"

بھکاری کی آواز سن کر مہاراجہ رنجیت سنگھ محل سے باہر نکلے۔ انھوں نے بھکاری سے کہا۔ "بھائی! جس نے تمھیں اتنا کچھ دیا ہے اس کا تمھیں شکر کرنا چاہیئے لیکن تو اس مقدّس اور پوتّر نام کو گالیاں دے رہا ہے۔"

بھکاری نے جواب دیا۔ "اس بھگوان نے مجھے کچھ بھی نہیں دیا۔ میں اس کا شکریہ کیوں ادا کروں۔"

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کہا۔ "اچھا ایک بات سنو۔ مجھے رنجیت سنگھ کانا کہتے ہیں۔ تم مجھے اپنی ایک آنکھ دے دو۔ اس کے عوض میں تمھیں عمر بھر روٹی اور کپڑا دیتا رہوں گا۔"

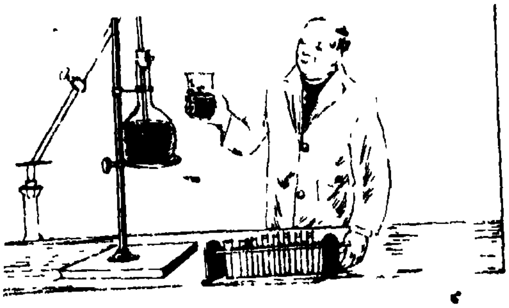
بھکاری نے آنکھ دینے سے انکار کر دیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ آنکھ کی قیمت بڑھاتے گئے۔ جتنا مول بڑھتا گیا اتنا ہی بھکاری انکار کرتا گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کہتے گئے۔ "ایک آنکھ کے لئے ایک ہزار روپے



——— دو ہزار روپے ——— دس ہزار روپے ——— بیس ہزار روپے، ساتھ میں دو گاؤں ——— دس گاؤں ——— اپنے راج کا چوتھا حصّہ ——— آدھا حصّہ!" لیکن بھکاری پھر بھی نہ مانا۔

آخر مہاراجہ رنجیت سنگھ بولے۔ "مورکھ! اگر تیری ایک آنکھ کی قیمت میرا آدھا راج بھی نہیں تو اپنے جسم کی قیمت تو لگا کہ اس انمول جسم کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔"

بھکاری نے شرم کے مارے گردن جھکالی اور وعدہ کیا کہ اس انمول جسم کے دینے والے بھگوان کی ہمیشہ عبادت کیا کروں گا!



علیم اللہ حالی

ریڈیم

یہ ایک کم یاب اور بیش قیمت دھات ہے۔ تحقیقات کے بعد معلوم ہوا ہے کہ پوری دنیا میں اصلی "ریڈیم" صرف تین چھٹانک ہے البتہ کیمیاوی طریقوں سے اس کو بنایا بھی جانے لگا ہے لیکن اس کا بنانا آسان کام نہیں۔ بہت سی ادویہ کی ملاوٹ کے بعد اسے تیار کیا جاتا ہے اور اس کو کم و بیش پانچ ہزار حالتوں سے گزرنا پڑتا ہے جس میں تقریباً چھ ماہ کی مدّت لگ جاتی ہے۔ اس کی قیمت سونے سے کئی ہزار گنا زیادہ ہے۔

پیارے بچو! تم نے ایسی گھڑیاں بھی دیکھی ہوں گی جن کے ڈائل تاریکی میں چمکتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی یہ بھی غور کیا کہ یہ کیوں چمکتے ہیں اور اس کے ہندسے تاریکی میں کس طرح معلوم ہوتے ہیں ــ؟؟ یہ چمک "ریڈیم" کی ہے۔

قدرت کی یہ حکمت ہے کہ جو چیز کم یاب اور بیش قیمت ہوتی ہے وہ نقصان دہ بھی ہوتی ہے۔ یہی ریڈیم ـــــ ایک طرف تو اس میں بہت سی اچھائیاں اور خوبیاں ہیں لیکن دوسری طرف یہ ستم "قاتل" بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ زیادہ ریڈیم کی کوشش اور جستجو میں نہیں رہتے اور اگر کسی کے پاس زیادہ ریڈیم آجاتی ہے تو وہ اس کی جان و مال کے خطرے کا سبب بن جاتی ہے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک سائینس داں نے ریڈیم پر تقریر کرنے اور اس کے تجربات پیش کرنے کے لئے ریڈیم کی تھوڑی مقدار اپنی جیب میں رکھی۔ کچھ دنوں کے بعد جیب کے نیچے کی جلد گل گئی اور وہاں پر خطرناک قسم کا زخم ہو گیا۔ ایک اور واقعہ ریڈیم کے متعلق کافی مشہور ہے جس سے اس کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔

ایک انگریز گھڑیوں کے ڈائل پر وہ مسالہ لگانے کا کام کرتا تھا جس میں ریڈیم ملی رہتی ہے حالاں کہ یہ کام بہت احتیاط سے کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی اس انگریز سے غلطی یہ ہوتی تھی کہ جس سوئی سے وہ ڈائل پر مسالہ لگاتا تھا اسی سوئی کو کبھی کبھی منہ میں بھی دبا ڈالتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے یہ کام چھوڑ دیا ـــ کام چھوڑنے کے تقریباً تین ماہ بعد اس انگریز کا جسم تاریکی میں چمکنے لگا اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد وہ مرگیا۔ اس کے مرنے کے بعد بھی بہت زمانے تک لوگوں نے اس کی قبر کو رات میں چمکتے دیکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سوئی کے ذریعے اس کے جسم میں "ریڈیم" کا کچھ حصہ چلا گیا اور زہر پھیل گیا اور اسی وجہ سے اس کی موت بھی ہو گئی۔ اسی واقعے سے "ریڈیم" کے مہلک ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

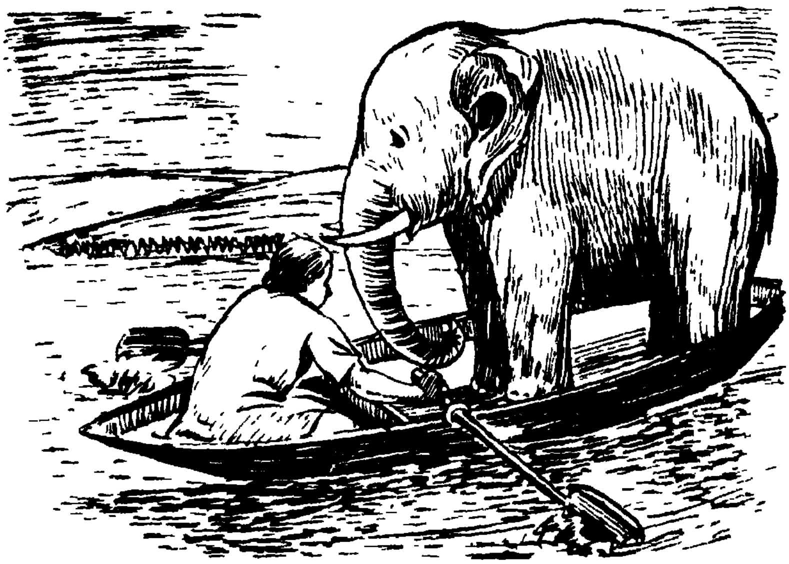
ریڈیم یا اسی قسم کی چیز کا کچھ نہ کچھ حصہ انسان کے جسم میں ضرور ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگوں نے قبرستانوں اور مرگھٹوں پر رات کو روشنی سی دیکھی ہے۔ جسے جاہل لوگ بھوت وغیرہ کہتے ہیں۔ ریڈیم کی روشنی اور حرارت ۱۶۰۰ برس تک بدستور قائم رہتی ہے اس کے بعد اس کی قوّت نصف کے برابر رہ جاتی ہے۔ ۱۶۰۰ برس کے دوسرے دور کے خاتمے پر اس کی قوّت $\frac{1}{4}$ رہ جاتی ہے اس طرح تقریباً ۲۰۰۰۰ برس تک کم ہوتے ہوتے یہ معمولی جست میں تبدیل ہو جائے گی۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر زمین میں ایک جگہ ریڈیم تین پونڈ ہو جائے تو اس میں اتنی قوّت ہو جائے گی کہ وہ زمین کی چال کو بدل دے گی۔ لیکن تین پونڈ ریڈیم اب تک زمین میں ایک جگہ نہیں ہے اور نہ آئندہ ہونے کی امید کی جاتی ہے۔

محمد عبداللہ شریف

ہاتھی کا وزن

یہ اس زمانے کی بات ہے جب لوگوں میں اتنی عقل نہیں تھی کہ ترازُو بنائیں۔ ایک بار بادشاہ بیمار ہُوا۔ سیکڑوں حکیموں اور وَیدوں نے علاج کیا لیکن بادشاہ اچھا نہ ہُوا۔ بادشاہ کی طرف سے بڑے بڑے انعاموں کا اعلان ہُوا۔ دُور دُور سے معالج آئے لیکن مرض دُور نہ ہُوا۔ بادشاہ بیماری سے تنگ آ گیا۔



ایک روز وزیر نے رائے دی کہ آخری بار ایک اَور کوشش کی جائے۔ چنانچہ اعلان کیا گیا کہ جو شخص بادشاہ کو اچھا کر دے گا اس کو ایک ہاتھی کے برابر روپیہ دیا جائے گا۔ اعلان ہونے کی دیر تھی کئی معالج آئے مگر کوئی فائدہ نہ ہُوا۔ اعلان ہوئے ایک ماہ ہی کی مدّت گزری تھی کہ ایک دیہاتی پھٹے پرانے کپڑے پہنے بہت دُور کے گاؤں سے پیدل سفر کرتا بادشاہ کے دربار تک پہنچا۔

یہ دیہاتی ایک کشتی بان تھا اور کچھ علاج معالجہ بھی جانتا تھا۔ چنانچہ علاج شروع کیا گیا اور بادشاہ رفتہ رفتہ اچھا ہونے لگا۔ ایک ہفتے میں کامل صحت ہو گئی۔ اب اعلان کے مطابق انعام دینا تھا۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ کوئی ایسی ترکیب معلوم کی جائے جس سے ہاتھی کو تولا جا سکے۔ لیکن کسی نے کوئی ترکیب نہ بتائی۔ آخر بادشاہ جھلّا کر وزیر سے بولا۔ "تم وزیر ہو اور تمھاری عقل سب سے زیادہ ہے۔ تم ہی کوئی ترکیب بتاؤ۔" وزیر نے بہت سوچ بچار کی لیکن اُن سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

آخر دیہاتی نے کہا۔ "سرکار! مہاوت کو حکم دیا جائے کہ وہ ہاتھی میرے ساتھ لے کر چلے اور حضور بھی ساتھ تشریف لے چلیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

دیہاتی مہاوت کے ساتھ ہاتھی کو لے کر دریا کے کنارے پہنچا اور مہاوت سے بولا کہ ہاتھی کو کشتی میں سوار کر کے دریا کے بیچ میں لے جاؤ۔ وہاں پانی کی سطح کے برابر کشتی میں ایک نشان لگایا گیا۔ اس کے بعد ہاتھی کو کنارے پر اُتار کر کشتی کو پھر پانی میں لے جایا گیا اور اس میں اتنا روپیہ بھر دیا گیا کہ کشتی پر لگایا ہُوا نشان پانی کی سطح کو چھونے لگا۔ اب کشتی کو کنارے پر لایا گیا۔ دیہاتی نے بادشاہ سے کہا۔ "سرکار! یہ رُوپیہ ہاتھی کے وزن کے برابر ہے۔"

بادشاہ بہت خوش ہُوا اور اس کشتی بان کو اپنے نورتنوں میں شامل کر لیا۔

ایم۔ ایل مہتہ

وفادار باز

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک راجہ اپنے وزیروں کے ساتھ شکار کو نکلا۔ اُس کے پاس ایک باز بھی تھا جسے وہ بہت پیار کرتا تھا۔ وہ ہر وقت اُس باز کو اپنے بائیں ہاتھ پر بٹھلائے رکھتا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا اسے اپنے ساتھ لے جاتا۔ شکار کرتے کرتے وہ شہر سے بہت دُور ایک جنگل میں پہنچ گئے تھے اور دن غروب ہونے لگا۔ جونہی راجہ ایک درخت کے نیچے سے گزرا ایک ہرن اس کے سامنے ایک جھاڑی میں سے نکلا۔ راجہ نے اپنا گھوڑا فوراً اُس کے پیچھے ڈال دیا یہاں تک کہ وہ اپنے وزیروں سے بہت دُور نکل گیا اور ہرن بھی اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا راجہ کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ وہ پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر گیا۔ اچانک اُس کی نگاہ ایک پہاڑی جھرنے پر پڑی جس سے پانی رِس رِس کر نیچے کی طرف آ رہا تھا۔ اس جھرنے کو دیکھ کر راجہ کی جان میں جان آئی۔ اُس نے بڑی مشکل سے ایک پتھر پر بیٹھ کر پیالہ پانی کے نیچے رکھا۔ بائیں ہاتھ پر اُس کا پیارا باز بیٹھا ہوا تھا۔ پانی تھوڑا تھوڑا اس پیالے میں گرنے لگا۔ ابھی پیالہ پانی سے بھرا بھی نہیں تھا کہ راجہ نے اُسے اُٹھا لیا۔ کیونکہ اس کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی اور وہ زیادہ دیر صبر نہیں کر سکتا تھا۔ جونہی اُس نے پیالہ مُنہ سے لگایا باز نے جھپٹا مار کر نیچے گرا دیا۔ راجہ کو بہت غصّہ آیا اور اس نے باز کو زور سے جھڑکا مارا اور پیالہ اُٹھا کر پھر پانی کے نیچے رکھ دیا۔ ابھی پیالے میں تھوڑا سا پانی بھرا تھا کہ اس نے اُٹھا کر مُنہ سے لگانا چاہا کہ باز نے نیچے سے اُڑ کر ایسا جھپٹا مارا کہ پیالہ گر کر دُور جا پڑا۔ اب راجہ کے غصّے کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے باز کو اُٹھا کر اس زور سے ایک پتھر پر مارا کہ



اس کی جان نکل گئی۔ راجہ نے نگاہ اوپر اُٹھا کر جو دیکھا تو اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ ایک مرا ہوا سانپ اس میں پڑا تھا اور اس کا زہر پانی میں مل کر نیچے آ رہا تھا۔ راجہ کو اب تمام بات سمجھ میں آ گئی۔ وہ باز کے مرنے پر بہت پچھتایا۔ اتنے میں اُس کے وزیر بھی اُسے ڈھونڈتے ہوئے آ نکلے۔ راجہ نے انھیں تمام واقعہ سنایا۔ باز کو وہیں زمین میں دفنا کر ایک مقبرہ تیار کروایا گیا جس پر یہ عبارت کندہ کرائی گئی۔

'وفادار باز — جس نے اپنے مالک کی جان بچانے کے لئے اپنی جان قربان کر دی'۔

سوم ناتھ سدھو

لطیفے

موہن :۔ سوہن! بتاؤ۔ پھل توڑنے کا بہترین وقت کون سا ہے؟

سوہن :۔ سیدھی بات ہے جب مالی باغ میں نہ ہو۔

اُستاد :۔ بندرگاہ کسے کہتے ہیں؟

شاگرد :۔ جہاں بندروں کو رکھا جاتا ہے۔

اُستاد :۔ کان پور کیوں مشہور ہے؟

شاگرد :۔ کیونکہ وہاں بہت سی کانیں پائی جاتی ہیں

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۳ —— نمبر ۸

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

مارچ سنہ ۱۹۵۵ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ترتیب

بچوں کا آج کل

سرورق:- سوشیل سرکار کی ایک تخلیق

سکندر علی وجد

شاعر کے کھیل

کبھی صبحِ گُل بار سے کھیلتا ہوں
کبھی شامِ خوں خوار سے کھیلتا ہوں

کبھی چھیڑ دیتا ہوں سازِ خموشی
کبھی حُسنِ گفتار سے کھیلتا ہوں

کبھی مُسکراتا ہوں تقدیرِ گُل پر
کبھی قسمتِ خار سے کھیلتا ہوں

کبھی چشمکیں ہیں مہ و کہکشاں سے
کبھی زُلف و رُخسار سے کھیلتا ہوں

کبھی برقِ شب تاب کی روشنی میں
سُبک سایۂ دار سے کھیلتا ہوں

قوانینِ زنداں ڈراتے ہیں لیکن
سَلاسل کی جھنکار سے کھیلتا ہوں

یہی رقصِ مستی یہی رقصِ ہستی
ستم گر کی تلوار سے کھیلتا ہوں

کمندِ جُنوں کی بدولت مُسلسل
فلک بوس افکار سے کھیلتا ہوں

تکلّف سے کچھ دُور ہمراہ چل کر
زمانے کی رفتار سے کھیلتا ہوں

متاعِ سخن کے جواہر دکھا کر
نگاہِ خریدار سے کھیلتا ہوں

بلونت سنگھ

آبشار

اگر کبھی دہرہ دون جانے کا اتفاق ہو تو آپ کا میزبان آپ کو سنسل دھارا نامی مقام دیکھنے کی دعوت ضرور دے گا .... اور آپ انکار ہرگز نہ کیجئے گا۔

سُنا ہے کہ اب وہاں بسیں جانے لگی ہیں لیکن پہلے دہرہ دون سے راجپور قصبے تک کوئی آٹھ میل کا سفر لاری میں طے کرنا پڑتا تھا اور سنسل دھارا تک پہنچنے کے لئے راجپور سے بھی آگے چند پہاڑیوں کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا تھا۔ منزل کے آخری حصّے میں چند جھونپڑیوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں واقع ہے۔ دائیں بائیں اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں۔ ان کے بیچوں بیچ ایک ندی بہتی ہے۔ ندی کے کنارے کنارے آگے بڑھئے تو گاؤں سے ڈیڑھ دو فرلانگ پرے وہ مقام ہے جسے سنسل دھارا کہتے ہیں۔

ندی کے کنارے پر ایک چھوٹا سا مسافرخانہ بنا ہُوا ہے۔ قریب ہی گندھک کے پانی کا چشمہ ہے جس کا پانی پینے اور اس میں اشنان کرنے کے لئے لوگ دُور دُور سے آیا کرتے ہیں۔ ندی پار دائیں ہاتھ کو ایک گپھا دکھائی دیتی ہے جس کے اندر پہاڑ کی چھت سے ہر وقت پانی ٹپکتا رہتا ہے اور بائیں ہاتھ کو ایک چھوٹا سا قدیم مندر دکھائی دیتا ہے۔ مندر تک جانے کے لئے ایک اونچا سا لوہے کا پُل بھی بندھا ہے۔ ہر چہار جانب ہریالی ہی ہریالی، پانی ہی پانی، خنکی ہی خنکی ہے۔ الغرض ان صفات کے باعث یہ تفریح کا مقام بن گیا ہے جہاں بچّے، بوڑھے مرد اور عورتیں اکٹھا ہوتے ہیں سب گندھک کے چشمے یا ندی میں نہاتے ہیں یا گپھاؤں میں آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے ہیں۔

اس پار پل کے قریب کھڑے ہو کر سامنے کی جانب نگاہ دوڑائیں تو مندر کے بائیں طرف پہاڑی کے اوپر سے نیچے تک آپ کو ایک طویل و عریض لکیر دکھائی دے گی۔ بہت اوپر پہنچ کر یہ لکیر جھاڑیوں میں گھل مل جاتی ہے....

پہلے اس جگہ ایک آبشار تھا۔ جیتا جاگتا، بے تاب و بے چین، تڑپتا اور کف اڑاتا ہُوا آبشار ...... لیکن اب اسی مقام پر نشان باقی رہ گیا ہے ایک بہت بڑے گھاؤ کے مانند۔

یہ آبشار ختم کیوں کیا گیا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ جن دنوں آبشار موجود تھا اُن دنوں پہاڑی کی بلندی پر آبشار کے قریب ہی ایک بنگلہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ پہاڑی کی چوٹی ہر جگہ کم و بیش ہموار تھی جو چوڑی کم لیکن لمبی کافی تھی۔ اس کے چاروں طرف چھوٹی بڑی پہاڑیوں کا جمگھٹا تھا دُور اونچے پہاڑ پر بسا ہوا شہر مسوری۔ اور پرے کوہ ہمالیہ اور کوہ شوالک کے سلسلے میلوں دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس جگہ کھڑے ہو کر دیکھئے تو قدرت کے بیسیوں مناظر دل کو موہ لیتے تھے۔ یہ مناظر شب و روز کے مختلف حصّوں میں نت نئی کیفیتیں پیش کرتے تھے۔

جہاں تک بنگلے کا تعلق ہے وہ پرانی طرز کی ہلکی پھلکی چھوٹی سی دو منزلہ عمارت تھی۔ چند کمرے نیچے اور چند اوپر والی منزل پر تھے۔ کسی زمانے میں بنگلہ خوبصورت رہا ہوگا لیکن اب تو اس کی حالت خستہ تھی۔ اس سے سرائے یا ہوٹل کا کام لیا جا رہا تھا۔ وہاں تک پہنچنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی لیکن بعض منچلے تفریح کی خاطر وہاں جا پہنچتے تھے۔ کھانے پلانے کا معقول انتظام تھا۔ گرمیوں کے موسم میں بعض اوقات خاصی چہل پہل ہو جاتی تھی۔ ایک ہی آدمی تھا وہاں جو مالک، منیجر، باورچی اور بیرا وغیرہ سبھی کچھ تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے دو تین پہاڑی لونڈے رکھ چھوڑے تھے اس کا نام تھا کالے۔ اس کی عمر پینسٹھ سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ اکہرے سے بدن کا قدرے کبڑا سا شخص تھا۔ اس کے چہرے پر گہرے خطوط کا جال سا بُنا ہوا تھا جب وہ ہنستا تھا تو اگلے دو ٹوٹے ہوئے دانتوں کے باعث اس کی صورت مضحکہ خیز دکھائی دینے

لگتی تھی۔

تقسیم ہند سے بہت پہلے موسم سرما کی ایک خوش گوار شام کو ادھیڑ عمر کا ایک مسافر وہاں وارد ہوا۔

اس کا قد چھوٹا، بدن اکہرا، ڈاڑھی خشخشی، لباس انگریزی، صورت متین — آنکھوں پہ چشمہ، سرمئی رنگ کا سویٹر — پاؤں میں گم بوٹ جو اس کے گھٹنوں تک پہنچتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ راجپور سے پیدل آرہا تھا اور راستے کی ندی نالوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا آیا تھا۔ اس کے پیچھے ایک پہاڑی قلی سامان اٹھائے تھا۔ بستر اور چمڑے کا بڑا سا سوٹ کیس جس پر انگریزی حروف میں اسے احمدؔ لکھا تھا۔

بنگلے کے سامنے بے تحاشہ اگی ہوئی گھاس کے لان پر وہ ٹانگیں قدرے پھیلا کر کھڑا ہو گیا اور خوابناک نظروں سے بنگلے کا جائزہ لینے لگا۔ . . . . اس کے دانتوں میں پائپ دبا ہوا تھا۔ اس کی مونچھوں کے بال دھواں کھا کھا کر بھورے رنگ کے ہو گئے تھے۔

کچھ دیر تک وہ بنگلے کو دیکھتا رہا پھر اس نے شانوں کو حرکت دے کر ارد گرد دور دور تک نگاہ دوڑائی۔ اس کی نظریں گھوم پھر کر بنگلے کے قریب دانہ دنکا چگنے والی مرغیوں پر رک گئیں۔

اس وقت کالے بنگلے کے ایک سرے پر بنے ہوئے باورچی خانے میں بڑے پتیلے میں کڑچھی گھما رہا تھا۔ پینے کی عادت پرانی تھی چناں چہ وہ سرور کے عالم میں انگریزی طرز پر "لا لا" کی دھن اڑا رہا تھا اور ساتھ ہی بھونڈے پن سے کمر کو بھی ہلائے جا رہا تھا۔

جب اس کی نگاہ اجنبی پر پڑی تو فوراً کڑچھی ایک لونڈے کے ہاتھ میں تھما دی اور خود جھاڑن سے ہاتھ پونچھتا ہوا نو وارد کی جانب بڑھا اور فخر یہ لہجے میں پیروں کی سی انگریزی میں دریافت کیا۔

"گڈ ایوننگ سر! یو وانٹ روم سر!"

اجنبی نے کالے کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور اسے انگریزی میں بات کرتے دیکھ کر مسکرایا۔ "یس"

نو وارد نے احمدؔ کو بنگلے کے اوپر والی منزل کا ایک کمرہ پسند آیا۔ سامان وہاں رکھوا کر اس نے سب سے پہلے گرم گرم چائے کے پیالے کی خواہش کا اظہار کیا . . . . . . کالے سرپٹ بھاگا۔

مسافر نے کمر کی پیٹی ڈھیلی کی، بوٹ اتار کر الگ رکھے اور پاؤں کسلمندانہ انداز سے پھیلا دئے۔

وہ اس کمرے کی فضا سے مانوس رہ چکا تھا لیکن اس طویل مدت میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کمرہ بھی بوڑھا ہو گیا ہو۔ صاف ستھرا لیکن پرانا فرنیچر۔ فرش پر بوسیدہ کوئیر میٹنگ۔ صوفوں کے پھول سرخے اڑ چکے تھے۔ دیواروں پر "یا اللہ۔ یا اللہ" لکھا ہوا۔ کچھ دیوی دیوتاؤں کی تصویریں۔ ایک تصویر ایڈورڈ ہشتم کی بھی تھی جو ان کی نوجوانی کی تھی جبکہ وہ پرنس آف ویلز کہلاتے تھے۔ کھڑکیوں پر بندروں سے بچاؤ کے لئے لگی ہوئی جالی بھی برائے نام رہ گئی تھی۔

اس کھڑکی سے قریب ڈھائی فرلانگ پرے آبشار نیچے گرتا دکھائی دیتا تھا اس وقت وہ یوں نظر آرہا تھا جیسے کوئی عظیم الجثہ سفید اژدہا پہاڑیوں کی گود میں پھنکار رہا ہو۔ ہزاروں من پانی تیزی و تندی کے ساتھ کف اور چھینٹے اڑاتا سینکڑوں فٹ نیچے گر رہا تھا۔ اس گھاٹی میں گھومنے پھرنے والے انسان کیڑوں مکوڑوں کے مانند دکھائی دیتے تھے۔

احمدؔ نے آبشار پر چند ثانیوں تک نگاہ جمائے رکھی اور سوچا کہ انسان کے جذبات کو بھی تو اس آبشار سے کس قدر مشابہت ہے . . . . . . اس خیال کے آتے ہی اس کے ذہن میں ایک دلربا صورت کے لطیف اور نرم و نازک خطوط ابھرے اور اس کا دل زخم خوردہ پرندے کی طرح پھڑکنے لگا۔

اسی اثنا میں کالے سرور کے باعث قدرے لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہوا اور چائے کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے بولا

"سر! پیالے کو منھ ذرا سنبھل کر لگائیے گا۔"

"کیوں . . . . آخر ماجرا کیا ہے!"

"ماجرا کچھ نہیں . . . . گرم ہے . . . . کالے کی بنائی ہوئی چائے ہے"

یہ کہہ کر اس نے داد طلب نگاہوں سے مہمان کی جانب دیکھا۔

اس پر احمدؔ نے خوش دلی سے جواب دیا "بھئی! قائل ہو گئے تمھاری استادی کے . . . . کیوں نہ ہوں۔ آخر بڑا سنے گھاگ ہو تم۔"

کالے سر تسلیم خم کر کے جانے کو تھا کہ احمدؔ نے دریافت کیا۔ "بھئی کالے! ایک حسین لڑکی تھی یہاں۔ بے حد حسین لڑکی . . . . . . اس کے بارے میں جانتے ہو؟"

کالے نے رک کر تامل کیا۔ بولا۔ "کچھ یاد نہیں آتا . . . . ایک قسم

چل کر بولا۔ "آپ کا مطلب میم صاحب کی لڑکی سے تو نہیں ؟"

"میم صاحب کون ؟"

انھیں کا یہ بنگلہ ہے۔ جب وہ جوان تھیں تو بہت خوبصورت تھیں۔ کانسرو والے چائے کے باغ کے مالک مسٹر مارٹن ٹلل انھیں ولایت سے لائے۔ انڈیا میں ہی ان کی شادی ہوئی لیکن۔ بچارے زیادہ جئے نہیں۔ یہ بنگلہ انھوں نے اپنی بیوی کے لئے بنوایا تھا۔ لیکن ان کے مرنے پر میم صاحب کا دل اتنا کھٹا ہوا کہ انھوں نے اس جگہ کی طرف رُخ تک نہیں کیا۔ وہ چائے کے باغوں میں رہتی ہیں۔ اب تو وہ سوچ رہی ہیں کہ باغ بیچ باچ کر ولایت چلی جائیں۔ انھیں کی لڑکی پچھلے مہینے ادھر آئی تھیں۔ میں سمجھا آپ کا اشارہ وسی کی طرف ہے۔

"اوہ نہیں .... اچھا تو یہ بنگلہ تمھارے سپرد ہے۔

"جی ہاں میں ہی اس کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ ان کی اجازت سے آپ ایسے صاحب لوگوں سے بیٹھ پا لینے کر کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے ..... "

"لیکن یہاں بہت کم لوگ آتے ہوں گے۔"

"جی ہاں ..... گرمی کے موسم میں رونق بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت آپ سمیت تین مسافر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک تو نیا بیاہا جوڑا ہے۔ وہ تو اوپر والے سرے کے کمرے میں بند رہتے ہیں۔ دین و دنیا سے انھیں کچھ غرض نہیں .... اگر آپ کو گپ اڑانی ہو تو وہ دیکھئے سامنے کھڑکی میں سے بڑے صاحب! ہم انھیں بڑا صاحب کہتے ہیں۔ ارے بہت بڑا ڈیل ڈول ہے ان کا۔ آپ ہم ایسے آدھ درجن شخص ملائے جائیں تب جا کے ایک بڑا صاحب ۱۰
بنے۔ لیکن جی بڑے خاندانی آدمی ہیں۔ بہت بڑے افسر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی سبھی چیزیں بڑی ہیں .... رات کا کھانا اگر نیچے کھائیے تو آپ کی ان سے ملاقات ہو جائے۔ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔"

احمد نے کھڑکی میں سے پہاڑ کی ڈھلان پر کھڑے ہوئے بڑے صاحب دیکھا سو واقعی بہت بھاری آدمی تھے۔ پورے جن دکھائی دیتے تھے۔ "اچھا تو کالے، نیچے ہال ہی میں کھانا کھائیں گے۔ تمھارا کہنا نہ موڑیں گے ہم۔ پھر تو بڑے صاحب سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔"

"یس سر! ضرور۔ اور پھر اب تو پرسوں تک وہ واپس جانے والے ہیں۔ دو ہفتے سے ٹکے ہوئے ہیں۔"

کالے چلا گیا۔

احمد نے منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے تبدیل کئے اور بستر پر نیم دراز ہو کر ریلوے بک اسٹال سے خریدے ہوئے ایک انگریزی رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ جوں جوں وقت گزرنے لگا اس کے خوابوں کی لڑکی کی یاد تازہ ہونے لگی جو حسن کی تمام روائتی خوبیوں سے مالا مال تھی۔ کیسی عجیب لڑکی تھی وہ! کس قدر والہانہ تھا اس کا عشق۔ کس قدر حدت تھی اس کے سینے میں۔ کیسی شدت تھی اس کے جذبات میں! کس قدر تیز و تند تھے اس کے احساسات .....

..... بالکل اس آبشار کی طرح .... بے چین، وحشی، طوفانی۔

لیکن اس واقعہ پر اب لگ بھگ چوتھائی صدی کی گرد جم چکی تھی۔ بیچاری حسین لڑکی کے بارے میں کس قدر احمقانہ سوال کیا تھا اس نے کالے سے۔ جیسے کل کی بات ہو۔ اب تو اس کی یاد کی حیثیت ایک بھولے بسرے خواب سے بہتر نہیں کہی جا سکتی .... اس وقت وہ جہاں کہیں بھی ہوگی۔ بوڑھی ہو چکی ہوگی۔

اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ حسن و شباب اور لطافت و تازگی کا مجسمہ اس ناپائیدار دنیا میں کس قدر جلد ساری خوبیاں کھو بیٹھتا ہے۔

وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ خود اس کی حالت قابلِ دید تھی۔ کبھی وہ یہیں ایک نوعمر طالب علم کی حیثیت سے آیا تھا۔ چہرے کی تازگی اور ہمواری کی جگہ خشکی اور گہرے خطوط نے لے لی تھی۔ بال پک گئے تھے۔ صورت سے خشونت کا اظہار ہونے لگا ....

رات کے آٹھ بجے کالے آیا اور کہا کہ کھانا نیچے لگ رہا ہے۔ جب وہ نیچے آیا تو بڑے صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ جُثّے کے لحاظ سے جن دکھائی دیتا تھا لیکن صورت کے اعتبار سے وہ خاصہ حسین انسان تھا۔ رنگ سرخ سپید۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ ناک اونچی۔ ہونٹ بھرے بھرے۔ یہ بڑے بڑے ہاتھ، موٹی اور لمبی انگلیاں بڑی بڑی نیچے کو لٹکتی ہوئی مونچھیں جنھوں نے اس کے اوپر والے ہونٹ کا بیشتر حصہ چھپا رکھا تھا۔

اس کی گفتگو سے شگفتگی اور سنجیدگی، حرکات و سکنات سے متانت اور وقار دونوں کا اظہار ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی جلا وطن تاجدار ہو۔

احمد نے سوچا اچھا ہوا جو میں کھانا کھانے کے لئے نیچے چلا آیا کیونکہ علیک سلیک کے فوراً بعد ان کے مابین قہقہوں اور خوش گپیوں کا دور چلا۔ اور یہ صحبت اس قدر کامیاب رہی کہ دوسرے دن صبح کا ناشتہ بھی انھوں نے ایک ساتھ ہی کیا۔

دوسرے دن شام کو دفعتاً ہر طرف دُھند سی چھا گئی۔ آسمان میں بادلوں کے غول کے غول جمع ہو رہے تھے۔ برآمدے کے ایک گوشے میں احمدؔ بید کی کُرسی پر بیٹھا چائے کا انتظار کر رہا تھا۔ سامنے لان پر کالے پیلا نے گرم کپڑے پہنے مفلر لپیٹے اپنے ٹٹوؔ پر کاٹھی کسنے کی فکر میں تھا۔ پھر وہ چلّا کر پکارا اُٹھا

" ابے لونڈے جلدی سے چائے لے آ صاحب کے لئے۔۔۔"

احمدؔ نے کہا۔ " کوئی مضائقہ نہیں ۔۔۔۔۔۔ ابھی تمھارے بڑے صاحب بھی تو لباس تبدیل کرکے نہیں آئے۔ ان کے بغیر چائے کا کیا لُطف بھلا؟۔۔۔ اس وقت کہاں کی تیاری ہے؟"

" راجپور تک جا رہا ہوں۔"

" گھومنے یا کسی کام سے؟"

" صاحب دونوں باتیں ہیں۔ چینی، بسکٹ، بیڑی، انڈے سبھی کچھ لانا ہے۔ اور ـــــ" یہ کہہ کر اُس نے صاحب کی طرف پُرمعنی نظروں سے دیکھا۔" ۔۔۔۔۔ اور ممکن ہے کچھ اور بھی ہو جائے۔"

" وہ کیا؟" احمدؔ نے دل چسپی کا اظہار کیا۔

اس پر کالے نے جھکی ہوئی کمر کو دفعتاً سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

" کیوں صاحب اگر میں شادی کر والوں تو کیسی رہے۔"

اس کی مضحکہ خیز صورت اور شادی اور پھر وہ بھی اس عمر میں! احمدؔ نے ہنسی دباتے ہوئے پائپ میں تمبا کو بھرنا شروع کیا۔

جواب نہ پاکر بھی کالے نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

" کیا بتاؤں صاحب ایک بیوہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہے۔ کبھی سوچتا ہوں ثواب کا کام ہے کر ڈالو۔۔۔۔۔۔" پھر اُس نے کھٹ سے پُتلیاں چڑھا کر آسمان کی جانب دیکھا اور مسکین لہجے میں کہا۔

" اچھا جو اللہ کو منظور ہے سو ہی ہوگا۔

پھر کالے نے دوسرا پورا ٹٹو کے آرپار پھینکا اور اس کی لگام کھینچ کر رکاب پر رکھتے رکھتے دفعتاً رُک گیا۔ " ہاں صاحب خوب یاد آیا۔ آپ کل کس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ارے آپ فیروزہ کے بارے میں تو نہیں دریافت کر رہے تھے۔ لیکن وہ تو بہت پُرانی بات ہے آپ اس لڑکی کو تو نہیں جانتے ہوں گے۔۔۔۔۔۔"

" نہیں، نہیں میں جانتا نہیں۔ یونہیں سنا سا تھا کچھ۔"

" ہاں ہاں کیوں نہیں، ضرور سنا ہوگا۔ اتنے سال بیت گئے پھر بھی اس لڑکی کے بارے میں بڑے بوڑھے باتیں کیا کرتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ کل میں کچھ نہیں سمجھا۔ اس لڑکی کے بارے میں کچھ خیال ہی نہیں آیا۔ بھلا میں یہ بات کیسے سمجھ سکتا تھا کہ اتنے برس پہلے والی لڑکی سے آپ کو کوئی دل چسپی ہو سکتی ہے ۔۔۔۔۔۔"

" نہیں نہیں دل چسپی نہیں ۔۔۔۔۔ وہ تو میں ۔۔۔۔۔۔"

" ٹھیک ہے آپ کو ضرور کسی نے کچھ بتایا ہوگا۔ لیکن جو باتیں میں بتاؤں گا وہ سولہ آنے سچ ہوں گی۔ ۔۔۔۔ بہت پہلے کی بات ہے۔ بائیس چوبیس برس پہلے کی بات۔ ہمارے صاحب کو مرے زیادہ مدّت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے یہی دھندا اس بنگلے میں شروع کر دیا تھا۔ انھیں دنوں ایک نوجوان پٹھان ادھر آ نکلا۔ اس کے ہمراہ ایک بے حد حسین لڑکی تھی۔۔۔۔۔۔ فیروزہ اس کا نام تھا۔ اس نوخیز لڑکی کے حُسن کو کیوں کر بیان کروں۔ لفظوں میں تو ایسا کرنا ممکن نہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ تو صاحب! الف لیلیٰ کی دنیا کی کوئی شہزادی معلوم ہوتی تھی۔"

اتنے میں چائے آگئی۔ احمدؔ نے چمچہ اُٹھایا اور کالے نے اپنی کہانی جاری رکھی۔

وہ دونوں میرے اللہ واسطے کے مہمان بن گئے۔ یہ بات تو ظاہر تھی کہ وہ گھر سے بھاگے ہوئے تھے۔ ایک ہی رات رہنے کے بعد وہ جوان میرے پاس آیا اور میری ہتھیلی پر دس روپے رکھ کر بولا۔ ' اس لڑکی کو اپنی بیٹی سمجھ کر اس کا خیال رکھو۔ میں جا رہا ہوں لیکن دو تین دن تک لوٹ آؤں گا۔ تمھیں انعام دوں گا اور اسے لے جاؤں گا ـــــــــــــ ـ ـــــ!

میرے خیال میں وہ روپے کا بندوبست کرنے گیا تھا۔ لیکن دو ہفتے بیت گئے نہ وہ خود آیا نہ کوئی خط لکھا۔ لڑکی آگ پر رکھی ہوئی کلی کے مانند اندر ہی اندر جلتی رہی۔ شب و روز رونے دھونے میں مصروف رہتی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا تعلق کسی بھلے گھر سے ہے۔ میں نے اسے اس کے گھر واپس بھیجنے پر آمادگی ظاہر کی لیکن اس نے تھرّا کر انکار کر دیا۔ اسے اپنے ساتھی کی بے وفائی کا بے حد رنج تھا۔"

احمدؔ نے چمچے سے چائے میں شکر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

" اچھا تو پھر۔"

"اسی اثنا میں ہمارے یہاں کالج کا ایک لڑکا آکر ٹھہرا ..... اور صاحب دوسرے ہی دن سے اس لڑکی کی حالت میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ میں فکر مند ہو رہا تھا لیکن معاملے کو اس طرح سلجھتے دیکھ کر میں نے بھی دخل نہیں دیا۔ وہ دونوں شب و روز ایک ساتھ رہتے لیکن آٹھ دس دن کے بعد وہ لڑکا بھی دفعتاً غائب ہو گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد جو حالت اس لڑکی کی ہوئی اسے بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں ...... میں نے ہر ممکن طریقے سے اس کی ڈھارس بندھانے اور اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی لیکن اس لڑکی کی فطرت کچھ ایسی تیز و تند تھی کہ اس نے ایک نہ سنی۔ وہ نیم پاگل ہو گئی ......"

اتنے میں بنگلے کے باندو والے کمرے کی کھڑکی کھلی اور نئے شادی شدہ نوجوان نے آواز دی۔

"کالے! کسی لڑکے سے کہو ہمارے کمرے میں چائے لے آئے اور پھر اس کی نوخیز حسین بیوی کا مکھڑا لمحہ بھر کو دکھائی دیا اور معاً کھڑکی بند ہو گئی۔

احمدؔ اور کالے دونوں پر کچھ دیر کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ تب کالے نے لونڈے کو چائے لے جانے کے لئے کہا۔ احمدؔ کہانی سننے کے لئے بے چین تھا چنانچہ کالے نے پھر کہنا شروع کیا :-

ایسی ہی ایک شام تھی۔ ہر طرف کہرا اور دھند۔ دور سے کالی گھٹاؤں میں بادل کی گرج سنائی دے رہی تھی۔ اسی روز نیچے گھاٹی کے گاؤں والوں کو آبشار کے شور میں نسوانی چیخوں کی آواز سنائی دی۔"

احمدؔ کا ہاتھ رک گیا اور چائے کا پیالہ وہیں کا وہیں رہ گیا۔ "تمہارا مطلب ہے وہ مر گئی۔"

"برسات کا موسم تھا۔ نالہ چڑھا ہوا تھا۔ اس لئے اس کے جسم کا کوئی سراغ نہیں ملا۔"

اتنے میں بڑے صاحب بھی آ گئے۔ اپنے لمبے نیوی بلیو رنگ کے اوورکوٹ میں وہ بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ چھ فٹ اونچے دروازے سے بھی انھیں جھک کر گزرنا پڑا۔

کالے نے بیڑی جلا کر دانتوں میں داب لی۔ احمدؔ نے پوچھا۔ "اچھا ' پہلے عاشق صاحب کا پتہ بھی چلا۔"

"لڑکی کے مرنے کے دو دن بعد وہ بھی آ گیا۔ بڑا خوش تھا۔ اس نے بتایا کہ حالات نے مجبور کر دیا اس لئے نہ وہ خود آ سکا اور نہ خط لکھ سکا۔ .... جب اسے لڑکی کی موت کا پتہ چلا تو وہ میرے سامنے نڈھال سا ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ دو تین روز تک وہ آبشار کی جانب ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ مجھ سے کالج کے لونڈے کا حلیہ پوچھا اور غصہ اپنا بغل میں دبا کر اس کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔ سارا ہندوستان چھان ماروں گا۔"

احمدؔ بہت متاثر ہوا۔ کالے نے ٹٹو پر سوار ہوتے ہوئے کہا "صاحب یہ تو مشہور کہانی ہے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اب تک یہ کہانی خوب مسالے لگا کر بیان کرتے ہیں۔"

"لیکن جو مسالے تم لگاتے ہو وہ شاید ہی کوئی اور لگاتا ہو۔" بڑے صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"لیجئے انھیں بھی یہ قصہ سنا چکا ہوں۔"

"جب سے میں آیا ہوں میں نے دیکھا ہے کہ تم ہر مسافر کو یہ داستان سناتے ہو۔"

اس پر کالے نے ہنس کر ٹٹو کو ایڑ لگائی اور دیر تک اس کے ٹخ ٹخ کرنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔

بڑے صاحب نے چائے کا پیالہ ختم بھی کر لیا لیکن احمدؔ اپنے خیالات میں ڈوب سا گیا۔ بڑے صاحب نے پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دے کر کہا :-

"سیر کو نہیں چلیں گے ؟"

"چلئے۔"

دھند بڑھتی جا رہی تھی۔ پہاڑیوں، چٹانوں اور جھاڑیوں کے خطوط بالکل مدھم ہو گئے تھے۔

دونوں چپ تھے۔ بالآخر احمدؔ نے مہرِ سکوت توڑ دی۔ "کس قدر دردناک سانحہ تھا۔"

"جی ہاں"۔

احمدؔ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "واقعی وہ لڑکی یکتا تھی اپنے حسن کے لحاظ سے اور اپنے تیز و تند جذبات کے اعتبار سے۔ اس مقام کے ایک ایک پتھر بلکہ ایک ایک ذرّے سے اس کی یادیں وابستہ ہیں۔ اس کے تابناک حسن کی دعوت سے کوئی انسان منہ نہیں موڑ سکتا تھا اور نہ اُس کے جذبات کی گرمی کا

محمل ہو سکتا تھا .... اور پھر اس وقت میں ایک معمولی لڑکا ہی تو تھا...... بس گھبرا گیا...."

"آپ ؟" بڑے صاحب نے رُک کر پوچھا۔

اس پر احمدؔ نے مردانہ حسن کے اس مجسمے کے دو برو ذرا تن کر کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "جی ہاں آپ کے اس معمولی غلام ہی سے اس ماہ پارہ کو اس قدر والہانہ محبت ہوئی اور غلام ہی کی محبت کھو کر اس نے جان دے دی ...... مگر چوتھائی صدی گزرنے کو آئی کالے مجھے پہچانتا بھی تو کیوں کر.. ..... میں اس لڑکی کو بھول سا گیا لیکن نہ جانے کون سی کشش مجھے یہاں کھینچ لائی۔

وہ پھر آگے بڑھنے لگے، آبشار کی جانب۔ وہ چپ تھے۔

رفتہ رفتہ جنگل کی مرغیوں اور بطخوں کا شور مدھم ہوتا گیا اور آبشار کا شور بڑھتا گیا۔

آبشار کے قریب پہنچ کر وہ رُک گئے۔ نیچے گھاٹی میں دُھند ہی دُھند تھی آبشار کا پانی کچھ دور تک گرتا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بعد پانی کی سفیدی دُھند میں گھل مل جاتی تھی۔

"اگر آپ کو اُٹھا کر یہیں سے آبشار میں پھینک دیا جائے، تو ؟"

احمدؔ نے یہ الفاظ سن کر سر اوپر اُٹھایا اور ساتھی کی طرف دیکھا۔ صاحب کے ماتھے پر ایک گہرا بل دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی خوبصور آنکھوں میں آبشار کی سی تیزی و تندی دکھائی دے رہی تھی۔ احمدؔ کو اپ کانوں پہ یقین نہ آیا اس نے مریل سا قہقہہ لگا کر دوستانہ انداز میں سا کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا........ تو ساتھی نے اپنے مضبوط ہاتھ میں اس کمزور ہاتھ مضبوطی سے دبوچ لیا۔

احمدؔ کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ نکلیں۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "آج کس قدر سردی ہے۔ میرا خیال ہے کہ واپس جا کر بستر میں گھس جاؤں۔"

اس کی بات کے جواب میں اس کے ساتھی کی گرفت اور مضبوط ہو گئی..

..... چند لمحوں کے لئے نہایت بھدی خاموشی طاری رہی پھر بڑے صاحب کی بھاری آواز سنائی دی :۔

" اتنی لمبی مدّت کے بعد کالے نے مجھے بھی نہیں پہچانا۔"

ہنس راج رہبر

پریم چند اور ترقی پسندی

"آج کل" کی گزشتہ دو اشاعتوں اگست ۱۹۵۵ء/اکتوبر ۱۹۵۵ء میں راجندر ناتھ شیدا صاحب کے دو مضمون اسی موضوع پر شائع ہو چکے ہیں۔ رہبر صاحب کا یہ مضمون اُن مضمونوں کے جواب میں ہے۔ (ادارہ)

"آج کل" کے سالنامہ اگست ۱۹۵۵ء میں "پریم چند اور ترقی پسند نقاد" کے عنوان سے راجندر ناتھ شیدا کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں انھیں شکایت ہے کہ "پچھلے چند سالوں میں "ترقی پسند" نقادوں نے پریم چند پر جو کچھ لکھا ہے اس سے پریم چند کی قدروں کا صحیح تعیّن اور خود ان ادیبوں کے نظریۂ تنقید و ترقی پسندی کو سمجھنا دشوار ہو گیا ہے۔"

اور پھر ترقی پسندوں کو نعرہ بازی کا مرتکب ٹھہرا کر خود پریم چند کی ترقی پسندی کے متعلق خالص ادبی بحث کا آغاز کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پریم چند کو اگر وہ لوگ ترقی پسند کہتے جو اخلاقیات، روحانیات اور اعلیٰ تر مذہب کی" عالمگیر اور ابدی قدروں" کے معتقد نہیں، اور اپنے عقیدے کے مطابق انھیں چیزوں پر انسانی ترقی کو منحصر تصور کرتے ہیں تو مجھے یہ سطریں لکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور اگر کچھ لکھا بھی جاتا اور کوئی اعتراض بھی ہوتا تو اس کی نوعیت مختلف ہوتی۔ لیکن جب پریم چند کو وہ لوگ ترقی پسند قرار دیتے ہیں جو خود کو مارکسی کہتے ہیں اور مارکسی سمجھے اور بتائے جاتے ہیں تو اُن کے ارشادات کا جائزہ لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ دشواری یہ نہیں کہ پریم چند کی صحیح قدروں کا تعین کیسے ہو۔ کیونکہ شیدا صاحب کے خیال میں اگر "اعلیٰ تر مذہب کی" عالمگیر اور ابدی قدروں" کے معتقد لوگ پریم چند کو ترقی پسند کہیں تو کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ پریم چند "اعلیٰ مذہب کی" عالمگیر اور ابدی قدروں" کے قائل تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ شیدا صاحب کی نظر میں" عالمگیر اور ابدی قدروں" کا عقیدہ مشکوک ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اعتراض کی گنجائش اس لئے پیدا نہیں ہوتی کہ ان لوگوں نے پریم چند کو ترقی پسند ثابت کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی اس لئے ان سے اپنے اختلاف کی نوعیت کو واضح کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

اسی اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ "ترقی پسند" نقادوں کا نظریۂ تنقید و ترقی پسندی مارکسی ہے یا کم از کم وہ خود کو مارکسی کہتے ہیں، اور مارکسی سمجھے اور بتائے جاتے ہیں۔ لیکن شیدا صاحب کے خیال میں وہ مارکسی ہیں نہیں بنتے ہیں، اس لئے ان کی "ترقی پسندی" مشکوک ہے، اور اسی لئے اُن کے ارشادات کا جائزہ لینے اور یہ مضمون لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

جائزہ اُنھوں نے تین چیزوں کا لیا ہے۔ احتشام حسین کا مضمون "پریم چند کی ترقی پسندی"، سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" کا ایک باب "حقیقت اور رومانیت" اور میری کتاب "پریم چند" کے دو ابواب "آرٹ اور شہرت" اور اس جائزے کی ابتدا یوں کی ہے۔

"سید احتشام حسین کے مقالے میں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے موضوع بحث براہِ راست یہی مسئلہ رہا ہے۔ اس میں واقعات کی پردہ پوشی کی کوشش نسبتاً بہت کم ہے۔ وہ پریم چند کے نظریات کو زیادہ مسخ نہیں کرتے بلکہ خود نظریۂ "ترقی پسندی" کو پریم چند کے جسم کے مطابق تراشنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لئے اگرچہ وہ "تاریخ کے مادّی تصور" والی ترقی پسندی کی رو سے پریم چند کو ترقی پسند نہ ماننے والوں کے اعتراض کو "بہت کچھ صداقت" پر مبنی مانتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس صداقت کو ادھوری بھی بتاتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اصرار ان کا بھی یہی ہے کہ پریم چند کو ترقی پسند تسلیم کیا جائے۔"

یعنی یہ "مارکسی" نقاد پریم چند کو ترقی پسند ثابت کرنے کی دھن میں یا تو واقعات کی ردہ پوشی کرتے ہیں اور پریم چند کے نظریات کو مسخ کرتے ہیں اور یا پھر خود "نظریۂ ترقی پسندی" کو پریم چند کے جسم کے مطابق تراشنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوششیں ان کے سیاسی مقاصد کی غماز ہیں اور شیدا صاحب نے ایک غیر جانبدار اور صداقت کے علمبردار نقاد کی حیثیت سے اپنا یہ فرض سمجھا کہ وہ ان مقاصد کو بے نقاب کریں اور شاید اسی لئے وہ خالص ادبی بحث کو ۱۹۳۶ء سے کھینچ کھانچ کر کمبرج کانفرنس ۱۹۴۹ء تک لے گئے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ان کے اس جائزے پر مزید بحث کی جائے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ خود شیدا صاحب کا نظریۂ تنقید کیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے اس مضمون میں پریم چند کو تو اعلیٰ تر مذہب کی "عالم گیر اور ابدی قدروں" کا قائل یعنی عینیت پرست اور آدرش وادی بتایا ہے، اور اس لئے "تاریخ کے مادی تصور" کے قایل یعنی مارکسی سمجھے جانے والوں سے کہا ہے کہ وہ انھیں رجعت پرست کہیں۔ لیکن ان دونوں مدرسۂ فکر میں سے وہ خود کس سے تعلق رکھتے ہیں اس کی وضاحت کہیں نہیں ہوتی۔ بلکہ جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں انھوں نے غیر جانبداری کا رویہ اختیار کیا ہے۔

مگر غیر جانبداری محض رویہ ہے، کوئی فلسفۂ حیات یا نظریہ نہیں۔ نظریے کے اعتبار سے دنیا میں یہی دو مدرسۂ فکر ہیں، تیسرا کوئی ابھی تک دریافت یا ایجاد نہیں ہوا۔ اور دنیا میں ہر شخص کا جانے ان جانے ایک فلسفہ ہوتا ہے اور جانے ان جانے وہ ان دونوں میں سے کسی ایک مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ شیدا صاحب باشعور آدمی ہیں۔ دانشور ہیں اور "ترقی پسند" نقادوں کے نظریۂ تنقید و ترقی پسندی کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کا اپنا بھی کوئی واضح نظریہ ہونا ضروری ہے جس کا پتہ اس مضمون سے نہیں چلتا۔ اس لئے میں قارئین کی توجہ ان کی کتاب "جائزے اور مطالعے" کے دیباچے یعنی "احوالِ واقعی" کی طرف دلانا چاہتا ہوں جس میں وہ رقمطراز ہیں۔

"ادیب اور شاعر کی طرح نقاد کی بھی انفرادیت ہوتی ہے۔ زندگی کی طرف ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ اس انفرادیت اور نقطۂ نظر سے وہ مختلف ادیبوں اور ادب پاروں کو دیکھتا ہے اور ان پر تبصرہ کرتا ہے۔ اتنی بات البتہ ہے کہ اصولی طور پر ایک مخصوص نظر رکھتے ہوئے بھی نقاد کی کامیابی کا انحصار منفرد ادیبوں پر رائے زنی کرتے وقت بالکل غیر جانبدار رہنے پر ہوگا۔"

اور پھر لکھا ہے۔

"فرد کا شعور بہت کچھ اس کے انفرادی اور سماجی گوناگوں اثرات کا نتیجہ ہے۔ اس لئے نقاد کے لئے ادیب کے پورے انفرادی ماحول اور ادیب پر اس کے اثرات کا مطالعہ بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان سب چیزوں کے صحیح علم کے بغیر شعور کا تعین نہیں ہو سکتا۔"

"انفرادی طور پر ادیب کے شعور کو سمجھنے اور اس کے احساسات کو ترتیب میں رکھنے کے بعد نقاد کا دوسرا بڑا کام اس کے ادب کی قدروں کا تعین ہے۔ ظاہر ہے کہ ادب زندگی پر دوررس اثر ڈالتا ہے۔ اس لئے نقاد کے اہم فرائض میں ادب کی سماجی قدروں کا اندازہ لگانا بھی شامل ہے۔ اس مقصد کے لئے اسے زندگی اور خصوصاً ادیب کے دور کے اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی رجحانات اور تحریکات کو بخوبی جاننا ہوگا، اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ان رجحانات میں کونسے جاندار اور زندگی کو آگے لے چلنے والے ہیں۔ اور کون سے کمزور اور روبہ زوال۔ یہ سمجھنا تو بہرحال ضروری ہے ہی کہ ان تحریکات میں سے کون کون سی اور کس حد تک ادیب پر اثر انداز ہوئی ہیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ "تاریخ کے مادی تصور" کا نظریہ ہے اور اس کتاب میں درج اپنے ایک مضمون "اقبال اور اشتراکیت" میں اقبال کے فلسفۂ حیات کو مارکس کے فلسفۂ حیات سے مختلف بتاتے ہوئے لکھا ہے۔

"انسانی حیات کا محل اقتصادی زندگی کی ٹھوس چٹانوں پر قائم ہے۔ ہمارے خیالات، احساسات، جذبات اور ذوقِ جمالیات سب اس اقتصادی زندگی کی آبیاری سے سرسبز ہوتے ہیں۔ اس لئے زندگی اور خصوصاً موجودہ زندگی کے مسائل سمجھنے کے لئے اقتصادی مسائل کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ان مسائل سے چشم پوشی کرنا زندگی کے حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ ایسا فلسفہ جو اقتصادی بصیرت کا نتیجہ نہ ہو زندگی سے اپنا تعلق قائم نہیں رکھ سکتا۔"

یہ اندازِ فکر مارکسی ہے اور اس میں جو انفرادیت ہے وہ شیدا صاحب کی اپنی ہے اور میں نے اُن کے اقتباس شدہ بیانات میں خط کشید کرکے اس سے اپنا اختلاف ظاہر کیا ہے اور اسی اختلاف کی بنا پر شیدا صاحب کا نظریہ خود کو مارکسی کہنے اور سمجھے جانے والے نقّادوں سے مختلف ہو جاتا ہے جسے ریاضی کی زبان میں یوں بھی لکھا جا سکتا ہے۔

شیدا صاحب کا نظریۂ تنقید ۔ تاریخ کا مادّی تصوّر ۔ غیر جانبداری۔

اور انھوں نے اپنے اس نظریے کا اطلاق کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"پریم چند کو اس نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کا خیال جس سے لینن نے طالسطائی کو دیکھا تھا معقول نظر آتا ہے"۔۔۔۔۔۔

مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے "ترقی پسند" احباب پریم چند پر تبصرہ فرماتے ہوئے طالسطائی سے متعلق لینن کے خیالات سے بھی استفادہ نہیں کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ لینن طالسطائی کی عظمت کا قائل اور معترف ہے۔ کسانوں کی زندگی کے مشاہدے، ظلم اور ریاکاری کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنے اور غیر معمولی فن کارانہ صلاحیتوں کے باعث لینن نے طالسطائی کو دنیا بھر کے چوٹی کے ادیبوں میں شمار کیا لیکن لینن نے اُسے ہمارے فاضل نقّادوں کی طرح "ترقی پسند" کبھی نہیں بتایا۔۔۔۔۔۔"

یعنی انھیں اگر کوئی اختلاف ہے تو صرف پریم چند کو "ترقی پسند" کہنے میں اور اپنے اس اختلاف کو انھوں نے پہلے بھی نہایت تلخ اور طنزیہ انداز میں یوں بیان کیا ہے: "جیسے کہ ان کی عطا فرمودہ ترقی پسندی کی اس اعزازی ڈاکٹریٹ سے محروم ہو کر پریم چند لا محالہ عظیم فن کاروں کی صف سے خارج ہو جاتے ہیں وہ یہ نہیں سوچتے کہ بڑا ادیب ہونا ایک بات ہے اور ترقی پسند ہونا دوسری"۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جس ترقی پسندی سے وہ اس قدر ناراض ہیں اس پر چڑھے ہوئے ہیں اس سے اُن کا مفہوم کیا ہے؟ اس کے لئے میں قارئین کی توجہ ایک بار پھر ان کی مذکورہ بالا کتاب میں درج ایک مضمون "احتشام حسین اور ترقی پسندی" کی طرف دلانا چاہتا ہوں جس میں ہندوستانی تاریخ کے مختلف ادوار کے بارے میں احتشام صاحب کی رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔

"احتشام حسین کی نظر میں جن لوگوں نے بہاؤ کا ساتھ دیا وہ ترقی پسند ہیں، اور جو ساتھ نہ دے سکے یا جنھوں نے اس میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی وہ رجعت پسند۔ ترقی پسندی کا یہ تصوّر بہت معصوم ہے، جس کی وسعتوں میں سرسید، حالی، نذیر احمد اور چکبست بھی آ جاتے ہیں اور سیاسی اعتبار سے شاید اکبر الہ آبادی بھی۔ ترقی پسند حلقوں کے باہر بہت سے ترقی پسند۔ ان میں بھی عموماً ترقی پسندی سے جو رجحانات اور ان کی علمبردار تحریک مراد لی جاتی ہے وہ وہ ہے جو "انگارے" کی اشاعت اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے باقاعدہ قیام کے بعد رونما ہوئی۔۔۔۔"

یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے ملک میں ترقی پسند تحریک کی جو منظم شکل ہے وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد وجود میں آئی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ مارکس کے نظریۂ حیات کا اس تحریک یا انجمن سے کیا تعلق ہے۔ اسے تو مارکس نے بہت پہلے دریافت کر لیا تھا، اور بقول شیدا صاحب یہ فلسفہ "مادّی دنیا کو حقیقت مان کر زندگی کا ہمہ گیر مطالعہ پیش کرتا ہے"۔ اس نظریے کے مطابق تمام انسانی تحریک کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے، اور ہر دور کا وہ خیال اور تحریک ترقی پسند ہے جو تاریخ کے ارتقا میں مدد ثابت ہوئی ہے جس نے اپنے وقت کی حیات افروز قوّتوں کا ساتھ دیا ہے۔ اس نظریے کے مطابق خود عینیت پرستی اور مذہبی اعتقادات کا ترقی پسند رول رہا ہے۔ کیونکہ انھوں نے قدرت کی اندھی طاقتوں کے خلاف لڑنے اور زندگی کو آگے بڑھانے میں انسان کی مدد کی ہے، اور اگر آج بھی کوئی شخص یا ادیب جو نظریے کے اعتبار سے عینیت پرست یا آدرش وادی ہے، لیکن محنت کش اور مظلوم کا ساتھ دیتا ہے اور ظلم اور جبر کے خلاف لڑتا ہے تو ہم اسے ترقی پسند کہیں گے۔ اس کے برعکس مذہب کا مخالف اور مارکسی نظریے کا حامی شخص یا ادیب جو جانے ان جانے ظلم اور جبر کی حمایت کرتا ہے اور دوسروں کی محنت پر پلنے والے طبقے کا ساتھ دیتا ہے وہ رجعت پرست کہلائے گا۔

یوں ہر ملک اور ہر دور کی ترقی پسند روایات ہوتی ہیں جو ادب میں منعکس ہو کر ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا مقصد انھیں روایات کو شعوری طور پر آگے بڑھانا تھا، اور اس میں وہ سب مارکسی اور غیر مارکسی ادیب شامل تھے، جو ادب کے ذریعے اس دور کی سماجی اور سیاسی ترقی پسند تحریکوں کو آگے بڑھانا چاہتے تھے، مگر

شیدا صاحب کا خیال ہے کہ "ترقی پسند" کا جنم انجمن کے ساتھ ہوا، اور اس کا مقصد خاص قسم کے خیالات کی اشاعت ہے۔ چنانچہ وہ اپنے "احتشام حسین اور ترقی پسندی" والے مضمون میں لکھتے ہیں۔

"ہمیں اس وقت یہ یاد نہیں کہ ۱۹۳۵ء میں تحریک کا مطمع نظر اشتراکیت قرار دیا گیا تھا یا نہیں مگر اتنا خیال ضرور ہے کہ جب انجمن کا سرکاری پرچہ "نیا ادب" لکھنؤ سے جاری ہوا تو اس کے حلقۂ ادارت میں تین نام چھپتے تھے۔ علی سردار، اسرار الحق مجاز اور سبط حسن۔ بعد میں کلیم بند ہوتے پر جوش کا نام بھی چھپنے لگا، اور جوش کا ایک بیان بھی شائع ہوا کہ اس پرچے سے میرا تعاون مکمل نظریاتی ہم آہنگی کے سبب ہے۔ کیا یہ سب اشتراکیت نہیں چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہیئے۔ پرچے میں جو مضامین چھپتے تھے اُن میں ہمیشہ اشتراکیت کی حمایت ہوتی تھی۔ ایسی صورت میں رسمی طور پر انجمن کے مقاصد میں اشتراکیت کا شامل ہونا یا نہ ہونا کوئی فرق پیدا نہیں کرتا۔"

یعنی انجمن کے مقاصد خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اس کے ذریعے ہمیشہ اشتراکیت کا پرچار ہوتا رہا ہے، اور لکھتے ہیں۔

"ہماری رائے میں اشتراکیت ہی موجودہ زندگی کے مسائل کا واحد حل ہے، اور اگر انجمن اس کے لئے کوشاں تھی تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں۔ مگر......" (مطالعے اور جائزے)

مگر احتشام صاحب اور اُن کے ساتھی اس بات کو چھپاتے کیوں ہیں؟ اور زیر نظر مضمون میں اس "مگر" کا اطلاق پریم چند پر یوں ہوتا ہے کہ جب وہ بقول احتشام صاحب طبقات کے ختم ہونے سے بہتری کے جو امکانات تھے ان پر نظر نہ ڈال سکے" اور "جب پریم چند کی تحریروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اشتراکیت یا مارکسزم کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا تھا" تو پھر انھیں ترقی پسند کیوں کہا جاتا ہے؟ شیدا صاحب فرماتے ہیں۔

"..... رہی پہلی کانفرنس کی صدارت تو میں سمجھتا ہوں کہ اس ضمن میں صرف اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ پریم چند نے نوجوان ادیبوں کی وہ دعوت محض یہ سمجھ کر قبول کی تھی کہ یہ لوگ ادب کو روایتی خرافات سے پاک کرکے اس کے ذریعے سے سماج کی خدمت کرنا چاہتے ہیں مگر محض اس بات پر اتفاق رائے ہونے کو نظریاتی اور جذباتی ہم آہنگی قرار دینا غلط ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ پریم چند نے اپنے وقت کے دوسرے کانگرسی رہنماؤں کی طرح یا تو اس وقت کے کانگرسیوں کی ہمت افزائی کے لئے ایسا کیا اور یا ان کے نظریات اور مقاصد کو بخوبی دیکھ کر۔"

چونکہ شیدا صاحب کے خیال میں ادب کو خرافات سے پاک کرکے اس کے ذریعے سماج کی خدمت کرنا ترقی پسند ہونے کی کافی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ ترقی پسند کہلانے کے لئے مارکسی نظریۂ حیات اور اشتراکیت کا حامی ہونا ضروری ہے۔ اس لئے یہاں بھی وہی "مگر" نمودار ہوتی ہے، اور اس کے بعد وہ "یا" کے چکر میں کچھ ایسا اُلجھ جاتے ہیں کہ انھیں اپنے منطق کی معقولیت اور غیر معقولیت کا بھی دھیان نہیں رہتا۔ ہزار سوچنے پر بھی یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ یہ "یا" تاریخ کے مادی تصور سے پیدا ہوتی ہے یا غیر جانبداری کے رویے سے۔

در اصل یہ بے دلیل منطق ہی ان کی پریشانی کا باعث ہے حالانکہ کسی نے بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ پریم چند آدرش وادی نہیں تھے۔ لیکن انھیں شکایت ہے کہ ترقی پسند نقاد پریم چند کے نظریات کو مسخ کرتے ہیں" اور "واقعات کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ اور انھیں یہ شکایت سردار جعفری اور مجھ سے ہی نہیں سید احتشام صاحب سے بھی ہے۔ جنھیں وہ بقول خود اردو کا سب سے بڑا نقاد مانتے ہیں اور جن کے ہمہ گیر علم اور ادبی مسائل میں بصیرت اور سوچنے سمجھنے کے سلجھے ہوئے طریقے سے وہ متاثر بھی ہیں اور جن کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے "زندگی اور ادب کے جتنے گوناگوں مسائل اور اُن کے باہمی رشتوں کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے، اس وسعتِ نظر سے کسی اور نے ان مسائل کا جائزہ نہیں لیا" (مطالعے اور جائزے)

احتشام صاحب نے اپنے مضمون "پریم چند کی ترقی پسندی" میں اس وسعتِ نظر سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے۔

"پریم چند کو بیسویں صدی کے ابتدائی اور انیسویں صدی کے آخری دور کا انسان سمجھنا چاہیئے۔ ان کے شعور کی تشکیل میں ان اصلاحی تحریکوں کا ہاتھ تھا۔ جن کی ابتدا غدر کے کچھ دن پہلے ہو چکی تھی اور

جو بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں پھل پھول رہی تھیں۔ وہ ایک دیہات کے رہنے والے تھے۔ نچلے طبقے کا ایک خاندان ان کا گہوارہ تھا۔ تحصیلِ علم کی وہ آسانیاں جو انسانی شعور کو خاص سانچوں میں ڈھالتی ہیں پریم چند کو میسر نہ تھیں۔ انھیں خود اپنا راستہ ڈھونڈنا اور فضا کے تیور پہچاننا، مصیبتوں کا مقابلہ کرنا اور ہواؤں کے رُخ کو سمجھنا تھا۔ انھیں کشتیِ حیات کے بپھرے سمندر میں کودنا اور زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرنا تھا۔ خود اُن کی خانگی زندگی کی دشواریاں، انفرادی اور خاندانی زندگی کے متعلق اُن کا نقطۂ نظر خاص قسم کا بنا رہی تھیں۔"

اسی ماحول اور انھیں واقعات نے پریم چند کو حقیقت پسند بنایا۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ رشیدا صاحب بتاتے کہ کم یا زیادہ احتشام صاحب نے کہاں واقعات کی پردہ پوشی کی ہے اور کہاں اپنے نظریہ ترقی پسند کو پریم چند کے جسم کے مطابق تراشنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے برعکس آپ جوش میں آکر فرماتے ہیں۔

"پریم چند کو انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور کا انسان بنانا سراسر غلط ہے۔۔۔۔۔۔"

پھر وہی اُلجھی ہوئی اور پُرتضاد منطق شروع ہو جاتی ہے اور رشیدا صاحب گھما پھرا کر یہ بات منوانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پریم چند کا اصل شعور یعنی نظریۂ حیات پہلی جنگ عظیم کے بعد جو واقعات رونما ہوئے ان سے بنا اور ۱۹۳۰ء کے بعد اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کیونکہ اس وقت تک ان کا شعور پختہ بن چکا تھا، اور یوں بھی اس وقت پریم چند کی عمر پچاس برس تھی، اور پچاس برس کے بعد انسان میں کوئی بڑی تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ اس لئے پریم چند گاندھی وادی یعنی مثالیت پرست ہونے کے علاوہ کچھ نہیں تھے۔ لہٰذا جس طرح لینن نے طالسطائی کے نظریے کو باطل ہوائی اور رجعت پرست کہا ہے اسی طرح ترقی پسند نقاد پریم چند کو رجعت پرست قرار دیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ جب گاندھی واد کو رجعت پرست اور باطل فلسفہ کہا جاتا ہے تو بھی رشیدا صاحب خوش نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر میں نے پریم چند کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"پریم چند نے زندگی کو کھلاڑی کی طرح گذارنے کا اکثر ذکر کیا ہے۔ یہ کھلاڑی پن کا فلسفہ بھی گاندھی ازم کی ایک شاخ ہے۔ اُس نے بہتیرے لوگوں کو کھلاڑی بنا یا ہے۔ لیکن اُن کے عمل کو چرخے سے باندھے رکھا

اور پھر پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں سے ثبوت فراہم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کے یہ کھلاڑی اور گاندھی وادی کردار عوام کے انقلابی عمل کو راہ میں روک دیتے ہیں اور باطل فلسفے کی آڑ لے کر دل کو تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس پر رشیدا صاحب کو اعتراض ہے کہ گاندھی واد کو "باطل فلسفہ" اور پریم چند کے مرغوب کرداروں (امرکانت، چکردھر اور سورداس کو) کھلاڑی کیوں قرار دیا۔ لیکن اسی فلسفے اور ان کرداروں کے بارے میں ان کی اپنی رائے ملاحظہ ہو۔

"جہاں تک نظریاتی پس منظر کا تعلق ہے ہمیں پریم چند کے ناولوں میں یہ نقص جگہ جگہ کھٹکتا ہے۔ مثلاً "پردۂ مجاز" جیسے طویل ناول کا پلاٹ تناسخ اور دوسرے مشتبہ روحانی فلسفوں پر قایم ہے۔ "روٹھی رانی" کی تمام فضا جاگیردارانہ ہے۔ "چوگانِ ہستی" کا سورداس اپنی تمام خوبیوں کے باوصف جس طرح بنارس کی گلیوں میں قیامت برپا کرا دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ ایک بڑی حد تک غیر عملی اور پلاٹ کو ایک خاص منتہا تک پہنچانے کی مصنوعی کوشش محسوس ہوتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت "میدانِ عمل" میں ہوتی ہے جب ہم سلیم، سکھدا، پٹھانی، سکینہ اور شانتی کمار کے ساتھ امرکانت جیسے زر پرست اور رانا بائی جیسی عشرت پسند عورت کو شورش کے دہکتے ہوئے شعلوں میں کودتے دیکھتے ہیں۔

(مطالعے اور جائزے صفحہ ۱۲۰)

ظاہر ہے کہ پریم چند کی عظمت کا انحصار مشتبہ روحانی فلسفے اور غیر عملی اور مصنوعی کوشش پر نہیں ہو سکتا بلکہ کسی اور چیز پر ہے جس کا اعتراف خود رشیدا صاحب نے دوسرے ہی پیرے میں یوں کیا ہے:

"لیکن ساتھ ہی ان ناولوں کے صفحوں میں اس عہد کی تقریباً پوری غلامانہ ہوئی تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی ہے جس میں ہر طبقے کے مرد اور عورتیں، بچے اور بوڑھے اپنے مخصوص قول و فعل سے دیہاتی اور شہری زندگی کے جیتے جاگتے مناظر پیش کرتے ہیں۔"

(جائزے اور مطالعے)

[illegible] سماجی تضاد ہے۔ ہاں بانکپن، خاندانی اور سماجی رشتوں میں محبت اور فیاضی جاگیرداری کی خوبیاں جو سرمایہ داری میں مفقود ہیں۔ اس اعتبار سے پریم چند نے امرپال سنگھ کو بجا طور پر سرمایہ داری کے نمائندہ پرکاش چند کھنہ سے بہتر دکھایا ہے۔ یہ کوئی عیب نہیں ہے، اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ جاگیرداری دور کے نمائندے تھے اور اس کے مٹنے کا انھیں افسوس ہے۔ یہ سیدھی سادی تاریخی حقیقت ہے۔ سرمایہ داری میں انسانی سماج نے مجموعی طور پر ترقی کی۔ لیکن سرمایہ داری ہر پہلو میں جاگیرداری سے بہتر نہیں ہے، خود مارکس نے اپنے مضمون "ہندوستان میں برٹش رول" میں لکھا ہے کہ پرانے ہندوستانی سماج میں جو خوبیاں تھیں وہ برٹش سامراج نے تباہ کر دیں، اور نئی مشینی تہذیب کے جو لوازم تھے ان سے اُسے محروم رکھا۔ امرپال سنگھ بھی اسی پرانے سماج کا نمائندہ ہے۔ یہ طبقہ مٹ رہا ہے۔ لیکن اپنی ان خوبیوں کے باوجود مٹ رہا ہے۔ پریم چند اگر ان خوبیوں کو نظر انداز نہیں کرتے تو یہ فن کارانہ خلوص اور حقیقت پسندی کے باعث گئو دان میں حیرت انگیز تنوع اور گہرائی پیدا ہوئی ہے، اور اسی وجہ سے ترقی پسند اور غیر ترقی پسند ادیبوں نے گئو دان کو ان کی بہترین تخلیق تسلیم کیا ہے۔ پنڈت کشن پرشاد کول نے انھیں بحیثیت ناول نگار کے ناکام بتلاتے ہوئے حال ہی میں اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

"البتہ ان کا ناول گئو دان جس میں انھوں نے ہماری دیہاتی زندگی کا مکمل مرقع بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے اور جس کے کردار جیتے جاگتے ہیں باوجود اپنی خامیوں کے اعلیٰ پائے کے ناولوں میں شمار کیا جائے گا، اور وہ اردو ادب میں ایک نیا تجربہ اور نیا اضافہ ہے۔"

(سب رس کانفرنس نمبر)

ظاہر ہے کہ نیا تجربہ اور نیا اضافہ نمایاں تبدیلی کے بنا نہیں ہوتا۔ اور گئو دان کی فنی عظمت کا راز حقیقت نگاری ہے نہ کہ مشتبہ روحانی فلسفہ۔

مگر جب اسی حقیقت نگاری کی بنا پر پریم چند کو گاندھی وادی آدرش اور تکنیک سے مختلف ثابت کیا جاتا ہے تو شیدا صاحب اُسے بھی ناراضی اور تلخی کا لہجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً میں نے پریم چند کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی کتاب کے "آرٹ" باب میں لکھا ہے۔

"ہزاروں لاکھوں ہندوستانیوں کی طرح پریم چند نے بھی بھول سے یہ سمجھ لیا کہ گاندھی جو کچھ چاہتے ہیں وہ پہلے ہی سے وہی کچھ کر رہے تھے: "گوشۂ عافیت" میں منوہر غوث خاں کو قتل کرتا ہے۔ اور پریم چند نہایت جانبداری سے اس کے فعل کی تائید کرتے ہیں اور اسے ہیرو اور سورما بناتے ہیں۔ لیکن گاندھی جی نے منوہر کے فعل کی کبھی تائید نہیں کی، بلکہ وہ منوہر کے عمل کو آدھے ہی میں روکنے کے لئے منظرِ عام پر آئے تھے۔ کانگریس کے لیڈر بنے تھے۔"

شیدا صاحب میرے اس خیال کو "غلط بیانیوں کا عجیب و غریب کاغذی گلدستہ" بناتے ہیں۔ کیونکہ پریم چند نے کہیں نہیں کہا کہ غوث خاں کے قتل نے گاؤں کے مسائل حل کر دئے بلکہ اس کے بعد گاؤں پر زمیندار کے مظالم اور بڑھ گئے۔ نیا کارندہ فیض اللہ خاں انھیں پہلے سے بھی زیادہ تنگ کرنے لگا۔

شیدا صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ گو "گوشۂ عافیت" ناول ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا، لیکن انھوں نے اسے ۱۹۱۸ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ جب ان پر جنگ کے بعد کے واقعات اور روسی انقلاب کا اثر تھا، جب ہمارے عوام میں طبقاتی جد و جہد اور انقلاب کا جذبہ اُبھار رہا تھا۔ منوہر اسی جذبے کا نمائندہ کردار ہے، اور خود شیدا جی کے الفاظ میں "پریم چند نے منوہر کا کردار بڑی خوبصورتی سے ابھارا ہے، وہ دیہات پر زمیندار کے عام مظالم کے خمیر سے اُٹھتا ہے ------ اس میں غیر معمولی قوتِ ارادی موجود ہے، اور عمل کے وقت (وہ کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو) پائے استقلال میں جنبش نہیں آتی۔"

ظاہر ہے کہ منوہر کے کردار کی یہ تعمیر پریم چند کی جانب داری کا نتیجہ ہے۔ انقلاب کا مخالف ادیب کبھی ایک انقلابی کردار کو اس خوبصورتی سے نہیں اُبھار سکتا۔ یہی منوہر زمیندار کے بے رحم اور ظالم کارندے غوث خاں کو قتل کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ گاؤں پر زمیندار اور اس کی حمایتی سرکار اور فوج کے مظالم اور بڑھ جاتے ہیں۔ منوہر اُس کے بیٹے اور گاؤں کے تمام کسانوں کو پکڑ کر جیل میں بند کر دیا جاتا ہے۔ گرفتار شدہ کسان منوہر کو اپنی مصیبتوں کا باعث سمجھ کر

اُسے لعنت ملامت کرتے ہیں تب ان میں سب سے زیادہ دانشور اور نرم دل کسان قادر ان سے کہتا ہے۔

"یا دو ایسی باتیں مت کرو۔ بے چارے نے تم لوگوں کے لئے تمہارے حقوق کی حفاظت کے لئے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اس کے جیوٹ اور بہادری کی تعریف تو نہیں کرتے الٹا اس کی برائی کرتے ہو۔ ہم سب کے سب ڈرپوک ہیں وہ ایک مرد ہے۔"

بلا شبہ قادر کی یہ آواز پریم چند کی آواز ہے۔ یہی آواز آگے چل کر باعمل ہو جاتی ہے۔ گاؤں کی عورتیں منوہر کی بیوی بلاسی کو طعنے دیتی ہیں کہ تم نے یہ ستیاناس کرایا۔ گاؤں پر یہ تباہی تمہارے کارن آئی۔ بلاسی بے چاری بے دل ہو کر سوچتی ہے کہ شاید واقعی بُرا ہوا۔ لیکن اس موقعے پر سکھو چودھری جواب ستیاسی بنا ہوا ہے وہاں آپہنچتا ہے اور وہ بلاسی کو ڈھارس بندھاتے ہوئے کہتا ہے کہ تیرا منوہر سورما ہے۔ اس نے گاؤں کی مریادا بچائی ہے۔ میں یہاں ایک مندر بنواؤں گا جس میں منوہر کی مورتی لگائی جائے گی۔ اس سے بلاسی کو منوہر کے فعل کی صداقت اور عظمت کا یقین ہو جاتا ہے، اور وہ فخر سے گردن بلند کر لیتی ہے۔

شیدا صاحب بتائیں کہ اس میں کیا غلط بیانی ہے۔ کیا ہم اسے منوہر کے فعل کی تائید نہیں کہیں گے؟ یہ صریحاً جانبداری کا رویہ ہے، جس کی مزید وضاحت فیض اللہ خاں والے واقعے سے ہوتی ہے جسے شیدا صاحب نے ادھورا اور توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ نیا کارندہ فیض اللہ لگان وصولی کی قرقی لے آیا ہے اور سب کچھ قرق کر رہا ہے۔ سکھو چودھری اسے لگان کا ڈبیہ دے کر ظلم بند کرانا چاہتا ہے تو وہ عدالت کے خرچے کے نام پر بڑی رقم طلب کرتا ہے۔ اب پریم چند لکھتے ہیں۔

"دفعتاً چودھری نے اپنا چمٹا اُٹھایا، اور اتنے زور سے فیض اللہ کے سر پر مارا کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ پھر بولے۔ یہی عدالت کا خرچہ ہے۔ جی چاہے تو اور لے لو۔ بے ایمان، پاپی کہیں کا۔ کارندہ بنا پھرتا ہے۔"

شیدا صاحب چاہیں تو ان حقائق کی روشنی میں خود اپنے بیان کی تصحیح کر سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ سکھو چودھری نے فیض اللہ سے نپٹ لینے کے بعد اس کے ساتھ کرتار سنگھ کو روپوں کے ٹھیکروں میں بدلنے کا معجزہ بھی دکھایا۔ لیکن اس سے نہ تو منوہر کے فعل کی تردید ہوتی ہے اور نہ گاندھی وادی ستیہ اور اہنسا کی تائید بلکہ پریم چند نے واضح الفاظ میں لکھا ہے۔

"ستیہ گرہ میں تشدد کو مغلوب کرنے کی طاقت ہے۔ یہ خیال غلط ثابت ہوا۔"

عدم تشدد گاندھی جی کی طرح پریم چند کا مذہبی عقیدہ نہیں تھا۔ گاندھی جی تو کہتے تھے کہ تشدد سے سوراج بھی ملے تو میں نہیں لوں گا۔ لیکن پریم چند اندر ناتھ مدان کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اگر مجھے یقین ہو جاتا اور میں جان لیتا کہ خوں ریزی سے ہمیں آزادی مل جائے گی تو میں نے خوں ریزی کی فکر نہ کی ہوتی......"

اس لئے وہ گاندھی وادی تکنیک سے ہٹ کر کئی بار مظلوم عوام کے تشدد پر مبنی جذبے کی بھی حمایت کر دیتے ہیں بلکہ خود ان میں یہ جذبہ اُبھارتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً "استعفےٰ" کہانی میں گالی دینے پر ایک ہندوستانی کلرک سے انگریز افسر کو خوب پٹوایا ہے۔

اب آخر میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مذہب اور اعلیٰ تر مذہب کی "عالمگیر اور ابدی" قدروں کے بارے میں پریم چند کا رویہ کیا تھا، کیا بقول شیدا وہ مذہب کے قائل تھے اور اس سلسلے میں خالصتاً گاندھی وادی تھے؟ یا پھر ان کا عقیدہ کچھ مختلف تھا!

انھوں نے اندر ناتھ مدان کو اپنے ایک خط میں لکھا تھا۔

"شروع میں فکر کے نتیجے کے طور پر نہیں بلکہ روایتی عقیدے کے طور پر میں ایک عظیم غیبی طاقت میں یقین رکھتا تھا، مگر اب وہ عقیدہ ٹوٹ رہا ہے......"

دیا نرائن نگم اور بنارسی داس چترویدی کے نام لکھے گئے خطوط میں بھی اس بات کا واضح ذکر ہے کہ خدا کی ہستی اور موت کے بعد کی دنیا میں اُن کا یقین نہیں تھا، اور آخری دور کی اپنی ایک کہانی "قہرِ خدا" میں ہیرو کی زبان سے کہلوایا ہے۔

"جب تک دنیا کا یہ نظام قائم ہے۔ مجھے ایشور پر وشواس نہیں آئے گا۔ اگر میرے جھوٹ بولنے سے کسی کی جان بچتی ہے تو مجھے مطلق تامل

نہ ہوگا۔ میں ہر ایک فعل کو اس کے اسباب و تحریک کے اعتبار سے دیکھتا ہوں جس سے دوسروں کا بھلا ہو وہی سچ ہے جس سے دوسروں کو نقصان ہو وہی جھوٹ ہے۔"

ظاہر ہے کہ سچ اور جھوٹ کے اس فلسفہ کا گاندھی وادی آدرش سے کوئی تال میل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی ایسے شخص کو اعلیٰ تر مذہب کی ابدی قدروں کا قائل کہا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں ہے کہ وہ خدا کی ہستی اور مذہب سے منحرف ہو کر مادیت پرست بن گئے تھے یا مارکسی نظریۂ حیات پر یقین لے آئے تھے، بلکہ بات یوں تھی کہ پریم چند کو عوام سے بے حد محبت اور عقیدت تھی، اور وہ ان کے مذہبی عقاید و معصیت میں بھروسہ دینے والے توہمات کا احترام کرتے تھے۔ لیکن وہ دیکھتے تھے کہ یہی معصوم اور سادہ دل لوگ افلاس، ظلم اور بے انصافی کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اگر دنیا کا خدا واقعی رحیم اور منصف ہے تو پھر یہ نابرابری، یہ دکھ یا آہیں کیوں ہیں؟ اور اگر مذہب کے ذریعے آج تک دنیا کے مسائل کا حل نہیں ہوا تو آگے بھی نہیں ہوگا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"اخوت اور مساوات، تہذیب اور معاشرت ابتدا سے ہی آئیڈیلسٹوں کا زریں خواب رہی ہے۔ پیشوایانِ دین نے مذہبی، اخلاقی اور روحانی بندشوں سے اس خواب کو حقیقت بنانے کی متواتر ناکام کوششیں کی ہیں۔ مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمدؐ سبھی نبیوں نے اخلاقی بنیادوں پر مساوات کی یہ عمارت کھڑی کرنی چاہی۔ مگر کسی کو پوری کامیابی نہ ہوئی۔ اور رتبۂ اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفاوت جتنی بے دردی سے نمایاں ہو رہی ہے شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔

آزمودہ را آزمودن جہل است کے مصداق اب بھی دھرم اور اخلاق کا دامن پکڑ کر ہم اس منزل پر پہنچنا چاہیں تو ہمیں ناکامی ہوگی۔" (خطبۂ صدارت)

اس کے باوجود ہم شیدا صاحب کی اس بات سے متفق ہیں کہ پریم چند میں آخری وقت تک اصلاح پسندی کے عناصر موجود تھے، اور "گئو دان" یا کسی بھی مارکسیت کی طرف کوئی واضح قدم اٹھتا نظر نہیں آتا۔ لیکن کسی نے انھیں مارکسی وادی ثابت کرنے کی کوشش بھی نہیں۔ شیدا صاحب کی یہ بات بھی درست ہے کہ ہوری کو جیتا جاگتا اور مظلوم کسانوں کا نمائندہ کردار تو کہا جا سکتا ہے ولیکن عظیم کردار کہنا درست نہیں۔ شیدا صاحب کی یہ شکایت بھی بجا ہے کہ کچھ لوگ پریم چند کو بنا پڑھے ہی ان پر تنقید لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ بات صرف ترقی پسندوں تک ہی محدود نہیں۔ دوسرے لوگ بھی ایسا کرتے ہیں۔

اگر پریم چند کو شروع سے آخر تک سلسلے وار پڑھا جائے تو یہ بھید کھلتا ہے کہ ان سے پہلے رومانی اور جاسوسی چیزیں لکھی جاتی تھیں۔ انھوں نے حقیقت نگاری کی بنا ڈالی، سماجی اور سیاسی مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ اور بقول احتشام حسین "ان کی بڑائی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ادبی سفر میں کسی ایسی جگہ قیام نہیں کیا جہاں سے ترقی کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔" وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی صدارت کرنے یا گئودان لکھنے کے باعث ترقی پسند نہیں بنے بلکہ ان کی ترقی پسندی نے یہ کام ان سے کروائے۔ آدرش وادانھیں وراثت میں ملا تھا، اور "گئودان" اور "مہاجنی تہذیب" مضمون میں بھی اس کے اثرات باقی ہیں۔ لیکن ایک ادیب کے معاملے میں نظریہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے دور کی حقیقتوں کو کس کامیابی سے پیش کیا ہے، اور تاریخ کی کن طاقتوں کا ساتھ دیا ہے۔ ٹالسٹائی کے فلسفے کو رجعت پرست بتانے کے باوجود لینن نے اسے روسی انقلاب کا آئینہ کہا ہے اور لکھا ہے۔

"ٹالسٹائی کے افسانوی ادب کا مطالعہ کرنے سے روسی مزدور طبقے میں اپنے دشمنوں کو سمجھنے کا بہتر شعور پیدا ہوگا اور ٹالسٹائی کے نظریۂ حیات کے مطالعے سے روسی جنتا کو سیکھنا چاہیئے کہ ان کی اپنی کمزوری کا سبب کیا ہے اور انھیں اپنی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے سے کونسی بات مانع ہے۔ ترقی کے لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے۔"

اگر شیدا صاحب اس بات سے متفق ہوں کہ پریم چند کا مطالعہ بھی انھیں معنوں میں ترقی کے لئے ضروری ہے تو وہ انھیں بڑا ادیب اور عظیم فن کار کہیں۔ ہم ترقی پسند کہلانے پر مصر نہیں ہیں۔

نازش پرتاپگڑھی

سامعین نے کہا

عرش و سدرہ کی بلندی سے ہٹا کر نظریں
چھوڑ کر اپنے تخیّل کا فلک بوس محل
چُور ہو جائیں گے سب آپ کے نازک سپنے
ہم میں احساسِ غم و درد زیادہ ہوگا
ہاتھ میلے بھی ہیں گستاخ بھی ہم لوگوں کے
کس قدر گندے ہیں ہم لوگوں کے ننگے تلوے
آپ چھیڑیں نہ یہاں خلدِ بریں کی باتیں
دھجیاں جیب و گریباں کی اڑائیں نہ حضور
دیکھیے زندوں کی فریاد و فغاں میں آ کر
ہم سے پوچھیے کہ پسینے میں ہمارے جل کر
تیز ہے آنچ یہاں سینوں میں سوزِ غم کی
شعلے بھڑکے ہیں حوادث کے ہمارے دل میں
بات آرائشِ محفل کی نہ چھیڑیں حضرت
ہیں یہاں جاڑے کی شدّت سے ٹھٹھرتے ہوئے لوگ
زہر بھی ہم کو میسّر نہیں، کیا ذکرِ دوا
کوئی تہذیب نہ احساسِ لطافت ہم میں
جرم ہوتا ہے اگر اشک بہائیں ہم لوگ
جس جگہ ہم ہیں وہاں حکم تڑپنے کا نہیں
پیچ و خم درد کے ہیں، بھوک کی اندھیاری ہے
دیکھیے کتنا گراں بار ہے ماحولِ حیات
یہ چھلکتے ہوئے سپنے یہ لہکتی تانیں
ہم جنھیں پا بھی سکیں اور جنھیں چکھ بھی سکیں

آپ پستی کے مکینوں میں کہاں آ پہنچے
—— آپ ہم خاک نشینوں میں کہاں آ پہنچے
تلخیٔ زیست کے طوفاں سے جو ٹکرائیں گے
—— آپ رنگین غزل گا کے چلے جائیں گے
قصۂ دامنِ جانانہ کہاں لائے ہیں آپ
—— فرشِ مخمل کا یہ افسانہ کہاں لائے ہیں آپ
ہم گنہ گار بھی سُن لیں گے تو پھر کیا ہوگا
—— بچے ننگے ہیں جو چُن لیں گے تو پھر کیا ہوگا
آپ کے مُردوں کا محشر نہ کہیں سو جائے
—— آپ کی بوئے گُلِ تر نہ کہیں کھو جائے
شمعِ محفل کو بجھنے سے بچائے رکھیے
—— پیکرِ تخئیل کو جلنے سے بچائے رکھیے
ہم کہ ہیں مفلس و نادار کہیں لُوٹ نہ لیں
—— قصۂ گرمیٔ رخسار کہیں لُوٹ نہ لیں
دیدۂ نرگسِ بیمار کو واپس لے جائیں
—— آپ اس یارِ طرحدار کو واپس لے جائیں
ذکرِ شبنم جو چھڑے گا تو قیامت ہوگی
—— مُرغِ بسمل نہ بنیں آپ، عنایت ہوگی
لیلیٔ فکرِ رسا راہ بھٹک جائے گی
—— شاعری آپ کی نازک ہے بہک جائے گی
دل کے بہلانے کو بے شک یہ خیال اچھا ہے
جامِ جمشید سے وہ جامِ سفال اچھا ہے

گھنشیام سیٹھی

غواصی — دکن کا ملک الشعراء

"ملا غواصی قطب شاہی دور کا دوسرا اہم ترین شاعر گزرا ہے۔ وہ ہندی کے مشہور شاعر گوسوامی تلسی داس کا ہم عصر تھا۔ غواصی کی صرف دو تخلیقات ہی منظرِ عام پر آئی ہیں:-

۱- مثنوی سیف الملوک اور بدیع الجمال

۲- طوطی نامہ

اوّل الذکر کی تخلیق ۱۶۲۵ء میں ہوئی اور خالصتاً شاعرانہ خصوصیات کی بنا پر اس کا اسلوب "طوطی نامہ" پر فوقیت رکھتا ہے۔ "طوطی نامہ" "سیف الملوک" سے چودہ سال بعد کی تخلیق ہے اور نسبتاً سلیس اور دل کش پیرائیہ انداز میں ادا کی گئی ہے۔ کیونکہ تب (۱۶۳۹ء) شمالی ہند کے اثرات نے دکن کے ادبی اور شمالی ماحول کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ "طوطی نامہ" میں فارسی الفاظ اور ترکیبیں جا بجا ملتی ہیں اور نظم کے حسن اور دل کشی میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ ۱۶۳۹ء میں غواصی ملک الشعراء کے رتبے پر پہنچ چکا تھا اور گولکنڈہ کے شاہی دربار میں اس نے خاصہ اثر و رسوخ قائم کر لیا تھا۔

قطب شاہی عہد کی تاریخیں اور تذکرے اس عظیم شاعر کے تفصیلی حالات سے بالکل خالی ہیں۔ حالانکہ اس نے سلطان محمد قلی قطب کے عہد ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا، لیکن اس کی قدر ۱۶۲۶ء کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے عہد (۱۶۲۶ء تا ۱۶۷۲ء) میں ہی ہوئی۔ غواصی کی ابتدائی زندگی نہایت عسرت میں بسر ہوئی اور ۱۶۲۶ء سے قبل وہ بالکل گمنامی کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا۔ غواصی سے پہلے لبعی اور ابنِ نشاطی کا سکہ شاہی دربار میں بیٹھا ہوا تھا۔ غواصی کے یہ دونوں ہم عصر شاہی دربار میں اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان قلی قطب شاہ جیسا عظیم شاعر بھی جسے اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے، غواصی کی قدر نہ کر سکا۔ قلی قطب کا وارث (داماد) سلطان محمد قطب شاہ شعر و شاعری سے لگاؤ نہ رکھتا تھا اور نہ ہی اپنے مخصوص حلقے سے باہر نکل کر ربط ضبط بڑھانا اُسے پسند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے "سیف الملوک" کے منظرِ عام پر آ جانے کے باوجود بھی شاعر کی کوئی قدر نہ کی۔ غواصی ناامید ہو چلا تھا جبکہ اُس نے تیسرے سلطان عبداللہ قطب شاہ سے انصاف کی توقع رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار لکھے اور رفتہ رفتہ اُس کی قسمت موافق ہوتی گئی۔

"جو سلطان عبداللہ انصاف کر	
میرے جوہراں پوتے دل صاف کر	پر سے
دیوے داد میرا بہت مان پاؤں	عزّت
اُس دور تے تا گریبان پاؤں	دور سے
کرے شاہ میرا خسر بیدار ہوئے	یہ بادشاہ
کہ تازہ میرا تب یہ گلزار ہوئے	
کہ غمگین ہوں سخت سنسار تے	دنیا سے
دھروں دغدغے لاکھ اس آزار تے	مصیبت سے
پریشانگی میں عجیب خیال میں	
نے آیا ہوں ایسے رتن ڈھال میں"	

(سیف الملوک و بدیع الجمال)

۱۶۳۵ء میں اسے بحیثیت شاہی سفیر محمد عادل شاہ کے دربار میں بیجاپور بھیج دیا گیا۔ بیجاپور کے سلطان نے غواصی کی بڑی عزّت کی اور بڑے بڑے انعام و اکرام سے اُسے نوازا گیا۔ اس عزّت کو، جو اُسے اپنی غیر معمولی قابلیت اور اپنے آقا سلطان عبداللہ قطب شاہ کی بدولت حاصل ہوئی تھی، قائم رکھنے کے لیے اس نے دوسرے درباری شاعروں کی تقلید کرتے ہوئے سلطان کی جھوٹی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ "طوطی نامہ" میں ایک جگہ وہ لکھتا ہے:-

"مہاراج سلطان عبداللہ ناؤں	نام
ثریا کے تارک پر اس کا ہے پاؤں	

مکھ جوت نور آوُ طالع اس راج کے — نصیب
منگلدار روشن دلاں آج کے — روشن دل والے
کہیں وہ بہبک کے علی ولی
کہ پھر جگ میں آیا محمد قلی
سچے آج اے خسرو نیک نام — پیچ پیچ
ہیں اُس کے کہ آثار تجھ میں تمام

. . . .

سچا توں مالک ہے بشر زرع توں
خداوند بروئے زمین ہوئے توں
توں وہ آج جوگی جوان مرد ہے
جو دیو بنید را ایسا جہاں گرد ہے — فرشتہ اندر جیسا
فلک سو ہے تابع تیرے عزم کا
مرگ دل سو سایا تیرے بزم کا

. . . .

تجھے دیکھنے واٹ اگر پاوتے — راستہ
تو آسمان والے اُتر آوتے
کہ بے مثل ربّا تو ایسا چہے
غلط نیں میری بات یو سچ ہے — ہی
کیا مجھ غواصی کو تونے نہال — یہ
کروں کیوں نہ میں شکر لے جگ اجال — دنیا کو روشن کرنے والے

(طوطی نامہ)

غواصی نے اپنی شاعری میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کو دنیا کا سب سے بڑا اور آزاد بادشاہ گردانا ہے۔ لیکن حقیقت اس سے اُلٹی ہے بلکہ ۱۶۳۹ء میں شکست کھا کر اس نے شاہجہان کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اسی برس غواصی کا طوطی نامہ بھی منظرِ عام پر آیا اور اسی برس گولکنڈہ کی آزادی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی لیکن اس وقت کے سبھی درباری شاعروں میں یہی بات دیکھی جاتی ہے، اس لئے ہم غواصی کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔

شاعری کے میدان میں غواصی نہ صرف دکن بلکہ ہندوستان بھر میں کسی کو اپنا مدمقابل نہیں گردانتا تھا۔ اس کی اس تعلی کے ثبوت میں اس وقت تک صرف دو ہی کتابیں دریافت ہوئی ہیں جن کا ذکر اُوپر آ چکا ہے۔ یہ دونوں کتابیں فارسی سے ترجمہ ہیں۔ اس لئے غواصی کی قوتِ تخیل، اور تصرفِ الفاظ کا صحیح اندازہ ان دونوں کتابوں سے نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن اس کی قادر الکلامی کا یہ ثبوت ہے کہ ان ترجموں میں بھی اس نے اصل کیفیت پیدا کر دی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار "سیف الملوک" سے اخذ ہیں۔ ان میں غواصی کا زورِ قلم دیکھئے۔

۱۔ خوبصورت عورت

"چلیا سیر کرنے کوں سپے چمن
سو وہ شہر پری ناز چندر بدن
بڑی تھی سو دیکھا نجک جا اُسے — نزدیک
بدیع الجمال ہے سمجھا اُسے
اگرچہ نہ دیکھا تھا اس سے اول — اس سے قبل
چلے اس کی بے مثل صورت چھل — معصوم
چُھبی اس کے نیناں میں بے اختیار
پڑیا دیں زمین کے اوپر بے قرار
جو دیدار کا شوق اُبلیا ادھیک — تہیں / زیادہ
درس دیکھنے تیں آیا نجیک — نزدیک
بھرا نور اس کا اتھاہ نور بیل
اُبلتے تھے آسماں کے سمدور بیل — سمندر
سمن پٹ ہری ہے ادھک نازکی — زیادہ
سہیلی کنول سوں ہے نازک ملی — سے
دو رخسار روشن امولک ہے لال
سو ہے نادں جس کا بدیع الجمال — نام
جو دستے اچھے لوگ پاتال کے — تھے
کہ جیوں موتیاں ڈھال بچ تھال کے
دیکھیا جو چندر اس کو مونڈھے کاڈ کر — چاند۔ منہ نکال کر
سٹیاں پدھن آسماں کے پھاڑ کر — پھینک دیا
ستارے دیکھ اس کا نچل ور سب
لئے ہاتھ شرمندہ ہو چور سب

۲۔ بدصورت عورت

مکھیاں ڈو نگیاں جیو کھڑی سار کے	جیسے
وو دیدہ بھیتر جو پتھر غار کے	اندر
چڑھیاں ہونٹ اُپرال کا ناک پر	بالائی ہونٹ
ٹھڈی پر پڑیا ہے مِس کا اثر	ٹھوڈی - نیچے والا
تمام انگ گونی کیرا ٹھاٹ جیوں	
چُھپیاں دو سینے پر ہیں دو واٹ جیوں	ٹکیاں
نکل پیٹ اَنگے تک جیوں آکھڑا	آگے جھکا ہوا
تھا پیٹ سے سخت پیڈو بڑا	

. . . .

. . . .

ٹھکتی جو یہ چھوٹی دسے	
سو جیوں جھاڑ کی پیڈ موٹی دسے	
سوئے سار پنڈلیاں اوپر تیز بال	سوئے جیسی
نہ تھی جگ میں ڈاٹن کوئی اس مثال	
مڑی تو بغلاں ستے یوں جھڑے	
بچھنے باس اس کی سُنگھے سو مرے	جو - سونگھے

۳- شرابیوں کی محفل

عجب رات نرمل تھی اس دن کی رات	
چمکتے تھے نوراں میں لکھ دھات دھات	لاکھ طرح
نکل آئیکہ چاند تاریاں سیتی	ساتھ
جھمکتا اتھا جکمگاریاں سیتی	چمکتا تھا
وتے دن پون مکمکاتی اٹھی	ہوا
چمن در چمن لکلکاتی اٹھی	
خوش ایسی نچھل چندنی دیکھ رات	چاندنی
لے ساتھ کوں سیف الملوک اپ سنگات	
صراحی و پیالے کی مجلس جو آپ	
لگے ذوق سوں پینے بھر بھر شراب	
نچھل گا کا نہاری سو گانے لگی	مغنیہ
رجھانے کے باجے بجانے لگی	

اڈھی رات گُھٹتے ہوئی ایسی بات	جاتے
دہے ماندے قید کرے سنگات	
ہوتے لوگ یکدھرتے سب تھار تھار	ایک طرف سے
یک شاہزادہ سو تھا ہوشیار	اکیلا

طوطی نامہ" سیف الملوک" سے لگ بھگ دُگنے صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور چار ہزار ایک سو پچپن شعروں پر مشتمل ہے۔ "سیف الملوک" لکھتے وقت وہ ایک غریب بے سہارا اور گمنام شاعر تھا لیکن طوطی نامہ لکھتے وقت وہ دولت و عزت کا چہیتا مصاحب بن چکا تھا اور تب تارک الدنیا ہونے کا ارادہ کر رہا تھا۔ "طوطی نامہ" سنسکرت کی عظیم اور قدیم تخلیق "شکا سپ تتی" کا ترجمہ ہے۔ شکا سپ تتی کے معنی ہیں طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں۔ غواصی نے ستر کہانیوں میں سے صرف ۵۲ کو ہی اپنی زبان میں منتقل کیا ہے۔ طوطی نامہ کو مولانا سید محمد قادری نے ۱۶۸۲ء میں اور ابوالفضل نے ۱۵۳۹ء میں سنسکرت سے فارسی میں منتقل کیا تھا۔ یہ ترجمے نثر میں تھے۔ "شکا سپ تتی" آج ادب العالیہ کی ایک عظیم کڑی سمجھی جاتی ہے اور دنیا کی شاید کوئی ہی ایسی زبان ہو جس میں اس کا ترجمہ موجود نہ ہو۔ "طوطی نامہ" کی مقبولیت اور افادیت کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ کتاب برسوں تک ہندوستان اور بیرونی ممالک میں صرف تفریح طبع کے لئے ہی نہیں بلکہ حقائق و معارف کی تعلیم کے لئے بھی پڑھائی جاتی رہی ہے۔

طوطی نامہ میں ایک تاجر کی داستان ہے جسے تجارت کے سلسلے میں دور دراز کا سفر کرنا پڑا اور وہ وقت پر گھر نہ پہنچ سکا۔ اس کی بیوی پر یہ جدائی نہایت شاق گزری اور طرح طرح کے بُرے بُرے خیالات نے اس کے نازک دل کو اپنا مسکن بنا لیا۔ فارغ البال تاجر جدا ہوتے وقت اپنی بیوی کو طوطا اور مینا کا ایک جوڑا دے گیا تھا۔ جو بلا تکلف انسانی لہجے میں بات چیت کرنا جانتے تھے۔ ایک دن وہ اپنے بالاخانے پر بیٹھی تھی کہ اس کی آنکھیں ایک خوبرو نوجوان سے لڑ گئیں۔ محبت کی پینگیں بڑھنے لگیں۔ نوجوان نے ایک بڑھیا کے ذریعے خفیہ ملاقات کا پیغام بھیجا۔ تاجر کی بیوی ہوا و ہوس کے ریلے میں بہہ رہی تھی۔ راضی ہو گئی۔ اُس نے مینا کو اپنا ہمراز بنانا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا، اور اسے اس گناہ سے باز رکھنا چاہا۔ بیوی کو اس پر بہت غصہ آیا اور اس نے مینا کو بڑی

بے دردی سے ہلاک کر دیا۔ پھر وہ طوطے کے پاس صلاح لینے کے لئے آئی۔ طوطے نے سیدھا منع کر دینا خلافِ مصلحت سمجھا کیونکہ مینا کا حشر وہ دیکھ ہی چکا تھا۔ اُس نے بیوی کو ایسا کرنے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی ایک شرط بھی رکھ دی کہ وہ اپنے دِل کا بھید کسی کے آگے نہ کھولے گی ورنہ اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس سے پہلے ایک رانی کا ہوا تھا۔ اس نے طوطے سے رانی کا قصّہ سُننے کی خواہش ظاہر کی۔ طوطے نے نہایت دلکش اور دلچسپ انداز میں اسے بیان کیا۔ صبح ہو گئی لیکن قصّہ ختم نہ ہوا اور بات اگلی رات پر ٹل گئی اور اس طرح طوطے نے لمبی لمبی اور سبق آموز پینتالیس کہانیاں اٹھیس راتوں میں بیان کیں حتیٰ کہ تاجر سفر سے لوٹ آیا اور اس کی بیوی من مانی نہ کر سکی۔ ہر کہانی کے شروع میں کالی رات کو بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

"کہ دن عاشقاں کا سو ہے پردہ دار
پیا ہو لئے تو آ وِگی اُس کے دھار
غواصی اُتم رین کالی دراز — بہترین
یقین جان ہے عین عاشق نواز
رین تے تو ہے دوس روشن صبح
ولے کال سو عاشقاں کا یہی — لیکن

ذیل میں غواصی کے کچھ شعر طوطی نامہ سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ان کی بہار دیکھئے۔

۱۔ جگا جوت سورج اُتم جات کا
جو کر سیر سب دن سماوات کا — آسمان
ڈُبیا جاکے مغرب کے ظلمات میں — ڈوبا
لگے دیونے جیوں دِیوے رات میں — جلنے ۔ چراغ
۲۔ گگن بن تے جھڑ جیوں گل آفتاب — آسمان، جنگل
لیا آپ سے لوں میں مغرب کی داب
کنول چاند کا نرملا بے بدل — بے مثال
چمن تے جو مشرق کا آیا نکل
۳۔ جہاں گرد خورشید جیوں وقت شام
کیا غرب کے گھر سِنے جا مقام — گھر میں
نکل چاند مشرق کے باڑے تے باہر
جوں آیا سو اُو دلرُبا بے قرار
۴۔ سونے کا پنکھی سورج جیوں سر کر
چلیا غرب کے آشیانے بھیتر — اندر
بگلا روپ سار کھا صاف چاند
کیا دیکھ پرواز آنچل سر کو باندھ
۵۔ غواصی اگر نار گھاتک پر آئے — عورت، دشمن
تو سچ بات کوں جھوٹ کر دیوے ہر آئے
جو پھٹ جا سچاں کا سینہ چِیر ہوئے — سچ
بُری ذات ہے یو اگر مرد ہوئے
۶۔ سورج چوتھے آسماں کا دیدبان — پہرے دار
گیا دید بانی کوں مغرب کے میان
نکل چاند جاسوس مشرق سے باہر
جو آیا سو پھر غمزدی ہو وہ نار — عورت
۷۔ جو سلطان خورشید کا شام کوں
چلیا غرب کے گھر میں آرام کوں
نکل گشت کوں چاند کا کوتوال
جوں آیا سو وہ نار صاحب جمال
۸۔ شکر تے اگرچہ ہے عورت میٹھی
ولے سر بسر زہر کی ہے گُھٹی
میٹھیاں اگرچہ مسیاں ہر جیوں شکر آج
ولے دل میں پرکھ نیں کڑوائی باج
۹۔ ڈُبیا دیکھ دن شام مالی کے سا
لیا سود کے آنکھوں جو آثار
نکل شرق کے ڈالتے چاند سیب
گگن کے چمن کوں دیا دیکھ زیب — آسمان، شوبھا
۱۰۔ فرشتے جو شمشیر کوں جان کے
دئے ڈال بیچ غرب کی میان کے
فلک شرق کا کھول رنگیں غلاف
لیا ہات میں چاند کا سیف صاف — ہاتھ

۱۱ - نہ جا اُن کی ظاہر کی خوبی پہ بھول
کہ کانٹے تے ہے تیز یو گرچہ پھول
غواصی جو ناریاں کیرا مکر کوئے — عورتوں کا
لکھے سو کتاباں تو پورا نہ ہوئے — کتابیں

اوپر دی گئی چند مثالوں میں شام، ستاروں سورج اور چاند کا ذکر غواصی نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ سورج کو سونا، گلاب، پہرے، از فرعون، ہاروت، شمشیر اور سونے کے ٹکے سے اور چاند کو روپا، کنول، جاسوس، سامری، سیف اور تیغ سے تشبیہ دی ہے۔

غواصی نے سترھویں صدی میں جو شہرت اور عزت حاصل کی ہے وہ اس کے ہم عصر یا بعد کے شعراء میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ غواصی نے طوطی نامہ کے اختتام میں تارک الدنیا ہونے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، معلوم ہوتا ہے اس نے اس پر عمل بھی کیا، کیونکہ اس کی زندگی کا آخری حصہ بھی ابتدائی حصے کی طرح بظاہر گمنامی میں گزرا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی تاریخ وفات اور جائے وفات کے متعلق بھی کوئی تذکرہ معلومات بہم نہیں پہنچ سکا

ہیروں کا دیش

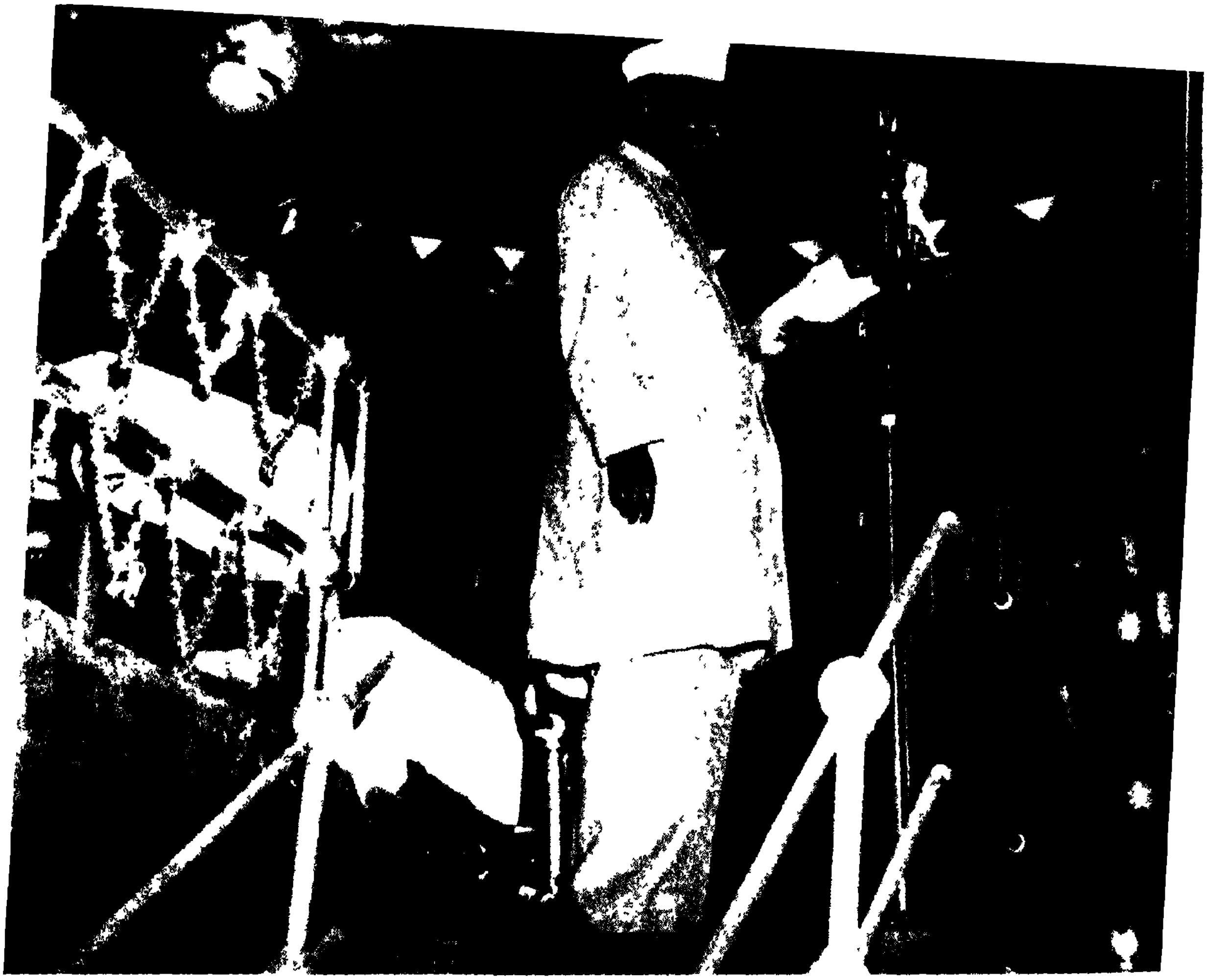
ریاست وندھیا پردیش کا علاقہ "پنّا" گزشتہ کئی صدیوں سے ہیروں کی پیداوار کا مرکز چلا آرہا ہے۔ اکبر کے عہد میں بھی اس علاقے کے ہیرے مشہور تھے۔ ہیروں کی پیداوار کا یہ خطہ بندھیل کھنڈ کے میدان سے اوپر کی طرف بلندی پر واقع ہے اور دکھن پچھم میں کیرا یا سے لے کر اتر پورب میں اتوڈنڈیلا تک ۵۰ میل لمبے اور پانچ سے دس میل تک چوڑے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ بھارت کے ارضیاتی سروے کے شعبے کے تحت جنوری اور مئی ۱۹۵۲ء کے درمیانی عرصے میں اس خطے کا جائزہ لیا گیا۔

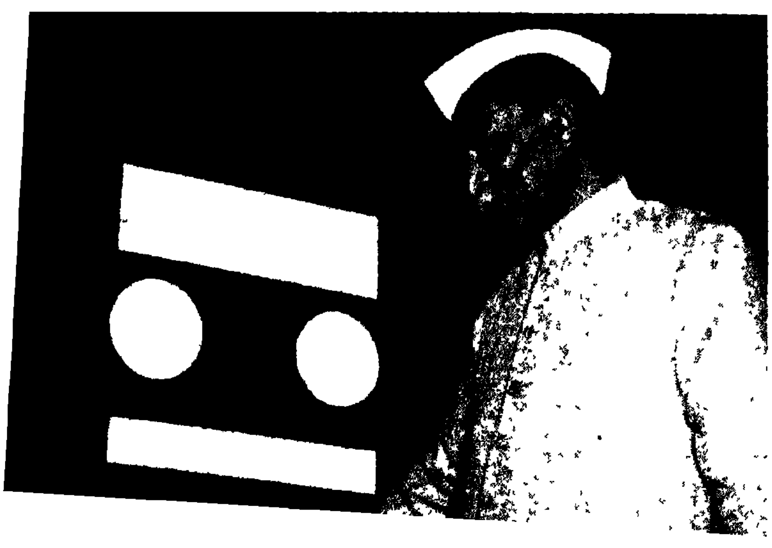
یورپی سیاحوں نے بہت عرصہ پیشتر ہیروں کی ان کانوں کے حالات سپرد قلم کئے، جنھیں ہیروں کی چمک بھارت کے اس حصے کی طرف کھینچ لائی تھی ۱۸۱۹ء میں فرانکس بکینن ہیملٹن نے اس علاقے کے حالات سپرد قلم کئے اور اس کے بعد ۱۸۳۲ء اور ۱۸۴۲ء میں جے آدم نے اس موضوع پر لکھا۔ اسی طرح جے فرنکلین اور دی مال وغیرہ نے بھی اس بارے میں اپنے تاثرات تحریر کئے اور ان مصنفین نے کانوں سے ہیرے برآمد کرنے کے طریقوں اور زیر زمین الماس خیز مادہ کی ساخت کا بھی ذکر کیا ہے۔

ارضیاتی سروے کے شعبے کے ای وریڈن برگ نے بیسویں صدی کے آغاز میں پنّا کے علاقے کا دورہ کیا اور ۱۹۰۸ء میں انھوں نے دو مضامین شائع کئے جن میں اس زمانے میں ہیروں کی کانکنی کے مختلف طریقوں اور ریاست مذکور میں چٹانوں کی ساخت وغیرہ کے بارے میں ضروری واقفیت درج کی گئی ہے۔

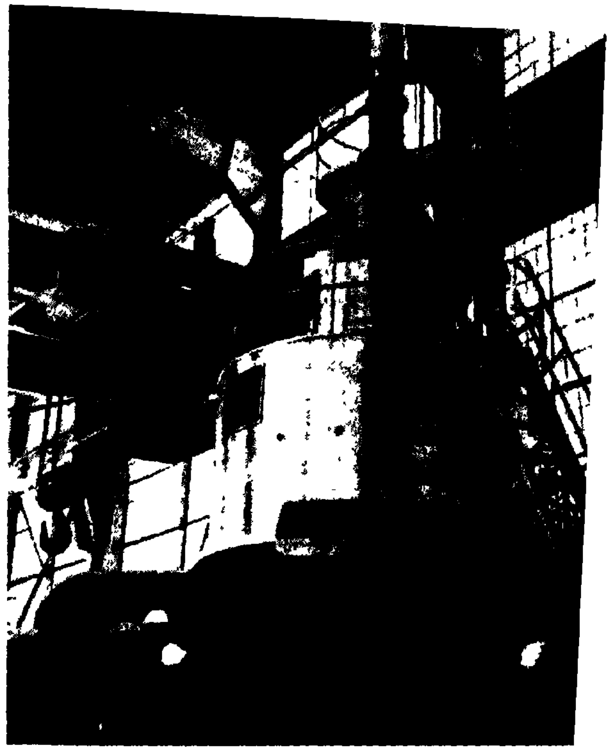
۱۹۳۰ء میں کے۔ پی سمور نے اس علاقے کا جامع سروے کیا اور اس کی بنا پر ایک مقالہ شائع کیا۔ ۱۹۳۵ء میں شری کالی۔ سی۔ گپتا نے اس بارے میں تحقیق کی اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مذکورہ علاقے میں ہیروں کی ساخت کے لئے ضروری مواد براہ راست بجاوار کی چٹانوں کی بجائے کانمور کے زیریں حصے میں جمع شدہ مادے سے فراہم ہوتا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں شری دی ایس ڈیوے اور ایس مرہ نے ماجھگوں کے علاقے میں الماس خیز مادے کا ذخیرہ دریافت کیا اور ان کا اندازہ ہے کہ اس علاقے کے تین ہزار فٹ کے بالائی پتھریلے رقبے میں تقریباً ۸ لاکھ قیراط (سونا و جواہرات تولنے کا وزن) وزن کے ہیرے موجود ہیں۔

بھارت کے ارضیاتی سروے کے شعبے نے وندھیا پردیش کے اضلاع پنّا اور ستنا میں ہیروں کی پیداوار کے علاقے کا جائزہ لینے کے بعد اب یہ رپورٹ پیش کی ہے کہ اگرچہ ابھی تک صرف ماجھگوں کے رقبے میں ہی ایسے مادے کی موجودگی کا علم ہوا ہے جس سے ہیروں کی ساخت عمل میں آتی ہے لیکن چٹانوں اور سیلابوں سے جمع شدہ مٹی اور ریت کے ڈھیروں کے نیچے اس قسم کے مزید مادے کی موجودگی ممکنات میں سے ہے۔ کیونکہ اس امر پر یقین کرنا مشکل ہے کہ اس علاقے کی وسیع کانوں میں کثیر تعداد میں جو ہیرے پائے جاتے ہیں اُن کی ساخت کے لئے صرف ماجھگوں سے فراہم ہونے والا خام مادہ ہی کافی ہے۔

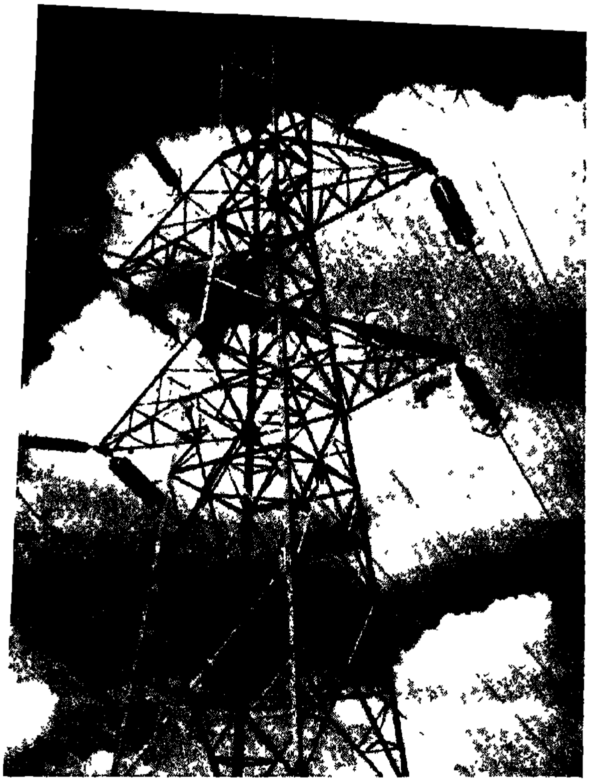




بھاکڑا ننگل پراجیکٹ کی تعمیر میں
گنگووال پاور ھاؤس پہلا برقابی پاور ھاؤس
ہے جو مکمل ہوا ہے - ۲ جنوری ۱۹۵۵ کو
صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اس کا
افتتاح فرمایا - اوپر کی تصویر میں وہ
اپنا افتتاحی ایڈریس پڑھ رہے ھیں اور
بائیں طرف کی تصویر میں بٹن دبا کر
پاور ھاؤس کا افتتاح فرما رہے ھیں



گنگووال پاور ھاؤس کا جنریٹر جو ۲۴۰۰۰ کلوواٹ
بجلي پیدا کرے گا



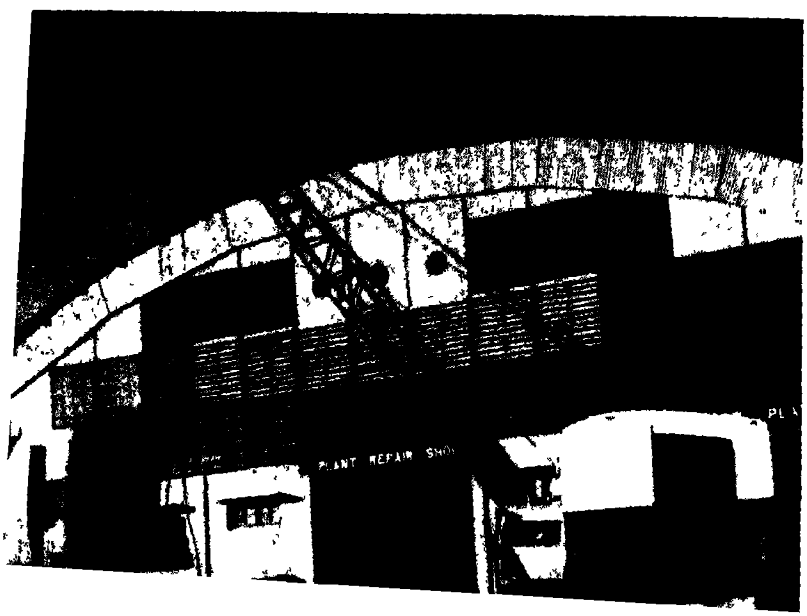
بجلی پہنچانے والے تاروں پر ۸٫۹۷ کروڑ روپیہ خرچ آیا ھے
یہ تصویر ننگال دھلي ڈبل سرکٹ لائن کے
ایک اینگل تاور کي ھے

رسم افتتاح ادا کرنے کے بعد صدر
جمہوریہ گنگووال پاور ھاؤس کا
معائنہ فرما رھے ھیں - پیپسو کے
راج پرمکھ ھزھائي نس مہاراجہ
پٹیالہ اور پنجاب کے وزیر اعظم
شري بھیم سین سچر موصوف کے
ھمراہ ھیں

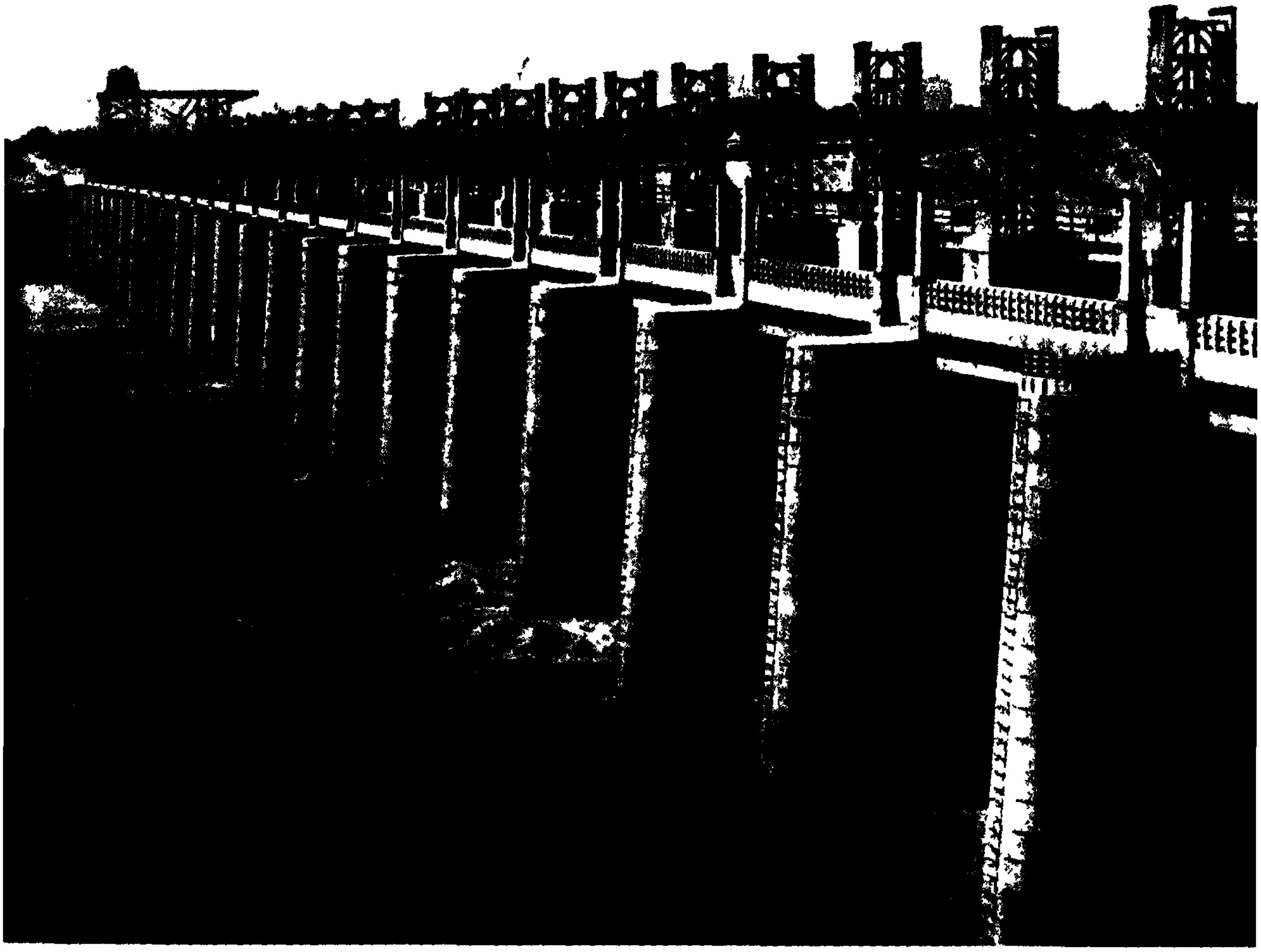




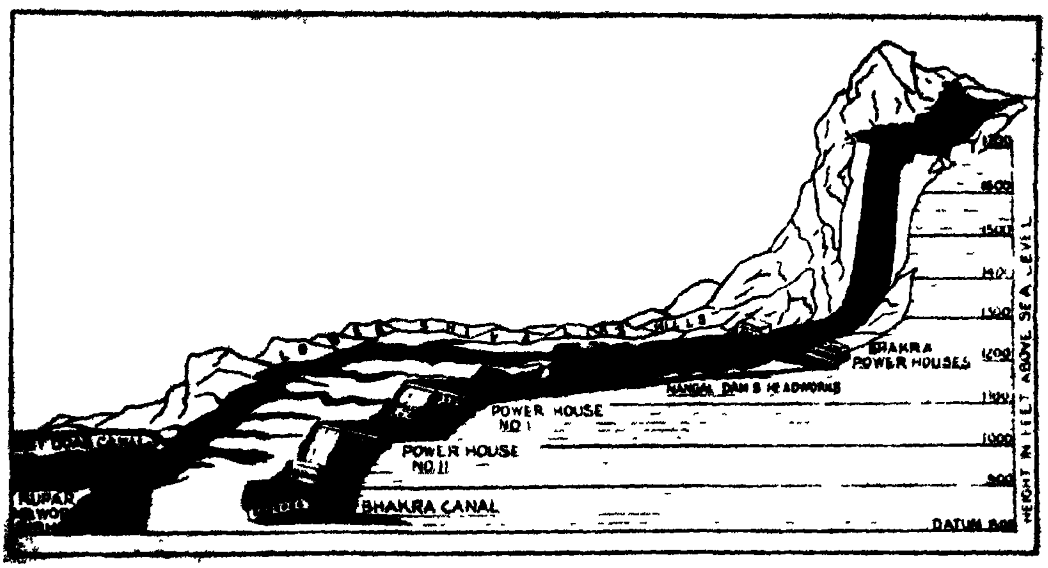
۲۵ فٹ چوڑی ننگل بھاکڑا روڈ بھاکڑا ڈیم کی جائے تعمیر تک بھاری مشینیں لے جانے کے لئے بنائی
گئی تھی - تصویر کے درمیان میں اولندا پل دریائے ستلج پر صرف سات مہینے
کی مدت میں بنایا گیا تھا



ننگل ورکشاپ



ننگل ڈیم



ڈیم اور ننگل
نہر کا نقشہ جس
تلف پاور ہاؤسوں
سطح بحر سے
ظاہر ہوتی ہے

مالک رام

باغِ دودر

غالب کے فارسی کلام کا کچھ حصّہ ابھی تک غیر مطبوعہ پڑا ہے۔ اگرچہ اس کی ترتیب ان کی زندگی میں شروع ہو گئی تھی، لیکن اس کے مکمّل ہونے سے پہلے ہی ان کی وفات ہو گئی۔ اسے وہ سبدِ چین کی طبعِ ثانی کے طور پر باغِ دودر کے نام سے چھاپنا چاہتے تھے۔ اس مجموعے میں مطبوعہ سبدِ چین کے علاوہ جو نیا کلام ہے اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ قطعات ۱۰ عدد (۳۸ شعر)
۲۔ مثنوی ایک (۲۵ شعر)
۳۔ قصیدہ ایک (۳۱ شعر)
۴۔ غزل ایک (۷ شعر)
۵۔ مخمس ۷ بند (۱۴ شعر)
۶۔ فردیات ایک (۱ شعر)
۷۔ رباعیات ۲ عدد (۴ شعر)

گویا ان تمام اصناف میں (۱۲۰) نئے شعر ہیں۔

اس کے علاوہ اس مجموعے میں غالب کے کچھ غیر مطبوعہ فارسی خط بھی ہیں یہ تعداد میں (۱۳) ہیں اور سب کے سب منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام ہیں۔ جوہر، غالب کے عزیز دوست رائے چھج مل کھتری کے بڑے بیٹے تھے اور سرکاری ملازمت کے سلسلے میں پنجاب اور یو، پی کے مختلف مقامات پر تعینات رہے تھے۔ ان خطوط سے غالب کی زندگی سے متعلق بعض نئی باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔

ہم آج کی صحبت میں اس مجموعے سے غالب کے دو نئے تاریخی قطعے ناظرین کے پیش کرتے ہیں۔ جوہر کے والد رائے چھج مل کی تاریخ وفات لکھی ہے ؎

گوییند: رائے چھج ملِ شیریں کلام مرد
دیرینہ دوست رفت، ازیں تنگنا دریغ
گفتم: کسے ز سالِ وفاتش نشاں دہد
غالب شنید وگفت، چہ گویم "بیا دریغ"

رائے چھج مل کی وفات کا سال پہلی مرتبہ اس قطعہ سے معلوم ہوا، یعنی وہ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ - ۱۸۶۲ء) میں فوت ہوگئے۔

سبدِ چین میں شیخ محمد ابراہیم ذوق کی تاریخ وفات کا حسبِ ذیل قطعہ موجود ہے ؎

تاریخ وفاتِ ذوق، غالب
با خاطرِ دردمندِ مایوس
خوں شد دلِ زار تا نوشتم
"خاقانیِ ہند مرد"، افسوس

"باغِ دودر" سے معلوم ہوا کہ غالب نے ان کی وفات پر مندرجۂ ذیل قطعہ بھی کہا تھا ؎

گویند، رفت ذوق ز دنیا، ستم بود
کاں گوہرِ گراں، بہ تہِ خشت و گل نہند
تاریخِ فوتِ شیخ بود، "ذوق جنّتی"
بہ قولِ من، رواست، کہ احباب دل نہند

اس میں مادۂ تاریخ "ذوق جنّتی" سے ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) برآمد ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ غالب نے دونوں قطعے ذوق کی وفات کے بعد بیک وقت کہے ہوں گے۔ ان میں سے صرف ایک کی سبدِ چین میں شمولیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں یہ دوسرا قطعہ پسند نہیں تھا۔ اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ باغِ دودر میں بھی جہاں یہ قطعہ لکھا ہے اس پر نشان بنا دیا ہے کہ اسے شاملِ اشاعت نہ کیا جائے۔

غلام ربانی تاباں

تابانیاں

مانندِ جام دَور میں تاباں رہے ہیں ہم
یعنی حریفِ گردشِ دَوراں رہے ہیں ہم

کس کس چمن میں گونجی ہماری نوائے شوق
پھولوں کی انجمن میں غزل خواں رہے ہیں ہم

نکلا ہے جب جلوسِ بہاراں چمن چمن
سروِ رواں کے ساتھ خراماں رہے ہیں ہم

دَورِ خزاں میں، موسمِ برق و شرار میں
ناموسِ گلستاں کے نگہباں رہے ہیں ہم

نکلے ہیں گھر کو چھوڑ کے جس دم جنوں کے پاؤں
مہمانِ دشت و خارِ مغیلاں رہے ہیں ہم

کیا پوچھتے ہو آبلہ پائی کی لذتیں
کانٹوں پہ فرطِ شوق سے رقصاں رہے ہیں ہم

اکثر کیا ہے راہِ طریقت سے انحراف
اکثر شریکِ محفلِ رنداں رہے ہیں ہم

شاہوں کو بھی نگاہ میں لاتے نہیں مگر
خدمت گزارِ بادہ فروشاں رہے ہیں ہم

جس شب ہوا ہے چشمۂ تسنیم پر گزر
اُس رات ایک حور کے مہماں رہے ہیں ہم

یہ حسنِ اتفاق کہ بیمار جب پڑے
زیرِ علاجِ عیسیٔ دوراں رہے ہیں ہم

اُس چشمِ حیلہ ساز و لبِ حیلہ جو کی خیر
آوارۂ تتار و بدخشاں رہے ہیں ہم

دیر و حرم کی راہ سے گزرے تو بار بار
تنگیٔ رہگزر سے پریشاں رہے ہیں ہم

مقصودِ کفر و حاصلِ ایماں ہے زندگی
کافر رہے ہیں ہم نہ مسلماں رہے ہیں ہم

علم و یقیں پہ تنگ تھا جب عرصۂ وجود
وہم و گماں سے دست و گریباں رہے ہیں ہم

ہر تازہ واردات سے نسبت ہمیں بھی ہے
ہر تازہ انقلاب کے عنواں رہے ہیں ہم

روشن ہیں بزمِ دہر میں مثلِ چراغِ طور
یہ اور بات ہے تہِ داماں رہے ہیں ہم

رتن پنڈوروی

ہندوستان قدیم اور فنونِ جنگ

زمانہ شجاعت کی حیرت انگیز جنگی ایجادات اور فنونِ حرب کے خوارقِ عادت اور فوق العقل کرشمے آج تک ایک عالم کو مبہوت کئے ہوئے ہیں۔ بلکہ بعض مغرب زدہ اور پست ہمت نوجوان تو ان قدیم آلاتِ جدال و قتال کے سحرکار اثرات سے قطعاً منکر بن چکے ہیں۔ لیکن صدیاں گزر جانے کے بعد پھر زمانے نے کروٹ لی اور مشرق کی گم شدہ سائنس کو مغرب نے انتہائی تحقیق و تفحص کے ساتھ اس مرتبہ عروج تک پہنچایا کہ منکر بھی احسنت و مرحبا پکار اٹھے اور سائنس کی ایجادی ارتقا کے ساتھ ساتھ موجودہ طرزِ جنگ و حالاتِ ضرب و حرب کی دہشت انگیز و قیامت خیز تباہ کاریوں نے زمانہ قدیم کی جادو اثر ایجادات کا لوہا منوا دیا۔ بالخصوص پرمانو بم کے وجود نے تو رامائن اور مہابھارت میں مذکورہ ہتھیاروں کی کامل طور پر تصدیق کر دی۔ اس لئے ناظرین کی ضیافتِ طبع اور واقفیت کے لئے زمانہ قدیم کی جنگی ایجادات کا مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔ تاکہ قدیم ہندوستانی تہذیب اور آرین تمدن پر پھبتی کسنے والے حضرات کا منہ بند ہو سکے۔ اور ساتھ ہی قدیم آریوں کی جنگی قابلیت کا صحیح طور پر پتہ چل جائے۔

اہل ہند اپنے بزرگوں کی عظمت و شان کے شاندار کارنامے ویدوں اور اس کے بعد کے ویدک ساہتیہ رامائن، مہابھارت اور پرانوں میں پڑھتے رہے ہیں لیکن پڑھتے وقت بعض حضرات ان کارناموں کو فرضی یا قیاسی کہہ کر خاموش ہو جاتے رہے ہیں۔ ایسے حضرات کی شکست خوردہ ذہنیت کو دور کرنے کے لئے جناب دیوان بہادر ہربلاس شاردا اجمیری نے ۱۹۱۷ء میں "ہندو سپیریاریٹی" کے نام سے ایک معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کی جس میں بے شمار حوالوں سے ثابت کیا کہ قدیم ہندی آریوں نے تہذیب و تمدن کے دیگر حیرت خیز ارتقائی مدارج کے علاوہ فنونِ جنگ میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ مذکورہ کتاب کے صفحہ ۲۹۵ پر مرقوم ہے۔ کہ "ہندوؤں کی یدھ ودیا چین گرنتھ "دھنتروید" چونکہ آج کل کہیں نہیں ملتا۔ اس لئے اس ودیا کا تذکرہ مہابھارت، اگنی پران، شیو پران، کلک پران، رامائن اور ایسے ہی دوسرے گرنتھوں میں جو تھوڑا بہت ملتا ہے وہی ہماری معلومات کا ذریعہ رہ گیا ہے۔ ایک اور مشہور مؤرخ ڈاکٹر سر ڈبلیو ہنٹر نے "انڈین گزیٹر" میں "انڈیا" کے زیرِ عنوان صفحہ ۲۲۳ پر لکھا ہے کہ "فوجوں کی باقاعدہ نقل و حرکت، ان کے کوچ اور قیام کے انتظامات صف بندی، خیمہ زنی۔ سامانِ حرب و رسد کی بہم رسانی کے اصولوں سے قدیم آرین کماحقہٗ واقف تھے۔

"مسٹر وارڈ" نے ۱۸۸۱ء میں رسالہ "تھیوسافسٹ" کے مارچ نمبر صفحہ ۱۲۴ پر ایک مقالہ کے ذریعے منکشف کیا ہے کہ ہندوؤں نے فنِ جنگ کو بھی نظر انداز نہیں کیا"۔ یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندو راجا خود اپنی فوجوں کو میدانِ جنگ میں لے جایا کرتے تھے اور وہ اس اہم خدمت پر مامور ہونے سے پہلے باقاعدہ فوجی و جنگی تعلیم میں مہارت تامہ و قابلیت کاملہ حاصل کرتے تھے چنانچہ بہت سے راجاؤں نے میدانِ جنگ میں اپنی بے نظیر جرأت و عدیم المثال فوجی قابلیت کے لئے نام وری اور شہرت پائی تھی۔ علاوہ ازیں رامائن اور مہابھارت اس امر کے شاہد ہیں کہ عوام الناس کے علاوہ راجا لوگ بھی اپنے لڑکوں کو ایسے استادوں کے سپرد کرتے تھے جو علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہونے کے علاوہ فنونِ سپاہ گری میں بھی شہرۂ آفاق اور نبرد آزمائی میں طاق ہوں۔ چنانچہ بھگوان رام چندر جی کو وشوامتر ایسے گورو کے سپرد کیا گیا۔ اسی طرح راجہ "شن تن نو" نے بھیشم پتامہ جی کو پرس رام کے سپرد کیا۔ اور پھر بھیشم پتامہ نے کورو اور پانڈوں کو درون اچاریہ جو اس وقت فنونِ جنگ میں یگانۂ زمانہ اور وحیدِ عصر تھا سپرد کیا۔ یہ وہی درون اچاریہ ہیں جنھوں نے کرپا اچاریہ کے ساتھ مل کر جنگ مہابھارت میں ایسی ایسی فوجی قلعہ بندی تیار کی جس کو دیکھ کر بھیم سین جیسے شیر افگن پہلوان بھی کانپ اٹھے۔ یہ سب کرتب دیکھنے کے لئے ہمیں "برہسپتی رشی" کی لکھی ہوئی کتاب "یدھ رچنا"

لی طرف توجہ کرنی چاہیئے - مگر افسوس ہے کہ اس وقت اس پستک کا تو کیا
رشی جی کی لکھی ہوئی اسی قسم کی دوسری پستکوں کا بھی کہیں نشان نہیں ملتا -
ان بعض پراچین پستکوں میں رشی جی کے تصنیف کردہ گرنتھوں کے حوالوں
سے پتا چلتا ہے کہ پراچین "یدھ ودیا" کے مطابق فوجوں کو میدانِ جنگ
ں صف آرائی کے موقع پر سات حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا - ان میں سے
ہلا حصہ "مرکزی" ہوتا تھا جو میدان کی چھاتی سمجھا جاتا تھا - دوسرا
صہ "پہلو" جسے سنسکرت میں "ککشا" کہتے تھے - تیسرا حصہ "بانو یا پر
"پکش" کہلاتا تھا - چوتھا حصہ "پرتی گرہا" اس میں محفوظ دستے
ال تھے - پانچویں حصے میں ہراول دستے تھے جن کو "کوٹی" کہا جاتا تھا
ٹھا حصہ "مدھیہ" کہلاتا تھا - جن کو درمیانی دستے سمجھنا چاہیئے - یہ
ستے چھاتی کے دستوں سے پیچھے رہتے تھے - ساتویں حصے کا نام
رشٹھ" یعنی پیٹھ تھا - یہ عقبی دستے تھے جو درمیانی دستوں سے بھی
چھے رہتے تھے - اسی طرح فوجوں کو غنیم کے مقابلے میں میدانِ جنگ میں
ینے کے لئے بھی صف آرائی اور قلعہ بندی کے کمال دکھلائے جاتے تھے
نہ مہا بھارت یدھ میں گورو درونا اچاریہ نے چکر دیوہ کی جو رچنا کی تھی - رہتی
تک دنیا کو دہشت زدہ و مبہوت رکھے گی - پھر لطف یہ کہ ارجن کے سوا
اکوئی شخص اس قلعہ بندی کو توڑنا ہی نہیں جانتا تھا - اس دیوہ میں
ں کا بیٹا ابھمنیو کام آیا - پانڈوؤں کے سب سورما ہیکڑی بھول
- آخر ارجن کسی دوسرے محاذ سے خبر پا کر آیا اور قلعہ شکنی کی نوبت
اسی طرح راون کے سورمیر بیٹے اندرجیت نے بھی ایسی ایسی قلعہ
ں تیار کی تھیں کہ لچھمن ایسے یودھا اور ہنومان، جامونت ایسے
ما ان میں گھر جاتے تھے - ان کے نام "ناگ پھانس" "برہم پھانس"
پھانس" وغیرہ تھے - رامائن، مہا بھارت اور اگنی پران میں اس
ے سینکڑوں ویوہوں کا ذکر آتا ہے - قلعہ بندی - تقسیم فوج اور
انی رسد کے علاوہ ہتھیاروں کا بیان بھی کوئی کم دلچسپ نہیں
ی ہیں صرف "شنکھ چوڑ راکشس" اور بھگوان شنکر کی جنگ ہی میں
ذیل ہتھیاروں کا ذکر آیا ہے -

ل کال استر، ۲ - مہانل استر، ۳ - ہیبشور استر، ۴ - پاپ ڈنڈ استر
نہین استر، ۶ - ودیہ سمرتھ استر، ۷ - سوسے ودیہ استر، ۸ - رشٹی،
۹ - بھشنڈھی، ۱۰ - نارائن استر، ۱۱ - مگدر، ۱۲ - گندھرب استر، ۱۳ - برہم
استر، ۱۴ - گروڑ استر، ۱۵ - پارجنیہ استر، ۱۶ - پاشوپت استر، ۱۷ - جھمبھن
استر، ۱۸ - پاروت استر، ۱۹ - مہادیو استر، ۲۰ - پٹش، ۲۱ - پراشش مگدر،
۲۲ - کھٹ وانگ، ۲۳ - ترشکھا، ۲۴ - شول، ۲۵ - تومر، ۲۶ - مشٹی، ۲۷ - پٹش،
۲۸ - کنٹھورا استر، ۲۹ - گدا، ۳۰ - برہم استر، ۳۱ - ناگ پھانس، ۳۲ - اگن بان -
۳۳ - موسل، ۳۴ - کھڑگ، ۳۵ - پرسا، ۳۶ - شکتی، ۳۷ - سدرشن چکر، ۳۸ - بجر
۳۹ - سارنگ دھنش، ۴۰ - گانڈیو دھنش، ۴۱ - اگنی ترشول، ۴۲ - وشنو دھنش
۴۳ - نندک ترشول، ۴۴ - رودر دھنش، ۴۵ - باہو یدھ استر، ۴۶ - مل یدھ استر
۴۷ - پاش، ۴۸ - نش ترش پھل، ۴۹ - پربت ورشا استر، ۵۰ - ناگ ورشا استر
۵۱ - برکش ورشا استر، ۵۲ - وایو استر، ۵۳ - ورشا استر، ۵۴ - ودیہ استر
۵۵ - میگھ استر، ۵۶ - اگنی استر، ۵۷ - وشنو استر، ۵۸ - بھو مکھ استر

بالمیکی رامائن بال کانڈ میں اندر دھنش، نندک کھڑگ اور سارنگ دھنش کا ذکر آیا ہے لکھا ہے کہ یہ اندر دھنش وہ دھنش نہیں جو راجہ اندر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ سارنگ دھنش تھا جو شری وشنو جی نے پرس رام جی کو دیا تھا - اور پرس رام جی نے نندک نام تلوار کے ساتھ شری رام چندر جی کی خدمت میں پیش کیا - رام چندر جی نے برن جی کو دے دئے - برن جی نے اندر کے حوالے کر دئے - اور کہا کہ یہ رام چندر جی کی امانت ہیں - جب رام چندر جی بن میں تشریف لائیں - تو اُن کے حوالے کر دینا -

بھیشم پاتن جی کے "دھنر وید" میں لکھا ہے کہ لڑائی کے دھنش دو قسم کے ہوتے ہیں -

۱ - سارنگ دھنش - جس کو جانوروں کے سینگ گلا کر بناتے ہیں -

۲ - بانس کی کمان - بانس سے بنتی ہے -

یہاں پر یہ بھی خیال رہے کہ جانوروں کے سینگ گلا کر دھنش بنانا حیرت انگیز نہیں - ولایت میں جس کانچ کا نام "بون گلاس" ہے وہ بھی اسی ترکیب سے بنائی جاتی ہے -

سارنگ دھنش ساڑھے تین ہاتھ کا ہوتا تھا - اس کو گھوڑے یا ہاتھی پر سوار ہو کر چلاتے تھے - رتھ سوار اور پیادہ کے لئے بانس کا دھنش تھا -

دھنش ودیا میں اہلِ ہند نے کمال کر دکھایا تھا - ہاتھی یا گھوڑے

کر دوڑتے ہوئے تیر چلا سکتے تھے - ایک ہی بان سے متعدد جانیں لے سکتے تھے -
دروپدی کے سوئمبر میں ارجن کا مچھلی کے عکس پر دھیان رکھ کر مچھلی کی آنکھ
میں تیر مارنا - مہا بھارت یدھ میں ارجن کا بانوں کی سیج بنا کر بھیشم پتامہ جی کو
اُس پر لٹانا - زمین میں بان مار کر پانی نکالنا اور خشک کوئیں میں گری ہوئی
گیند کا تیروں کے ذریعے باہر کھینچنا - راجہ بیر باہن کا ایک ہی بان سے درخت
کے سارے پتے چھید ڈالنا حیرت انگیز نہیں تو اور کیا ہے -

تیر بھی کئی قسم کے ہوتے تھے - آگ برسانے والے - پانی برسانے والے مثلاً
اگن بان، برہم استر، برہم شکتی وغیرہ - چنانچہ کھر دوکھن اور ترسرا کی چودہ ہزار فوج
کے مقابلے میں بھگوان رام چندر جی نے جو تیر چلائے وہ تین قسم کے تھے -

۱ - تانک بان - (وہ تیر جن کی کاٹھی (انی) لوہے کی تھی -

۲ - نارا کش بان - جو بالکل آہنی تھے

۳ - بکر لی - جن سے دو زخم لگتے تھے - اور جسم سے نکالو تو تیسرا زخم اور بھی
گہرا ہوتا تھا -

بعض تیر ایسے بھی تھے جو نشانے پر نہ بیٹھنے کی صورت میں واپس ترکش میں
جاتے تھے - اس امر کے ثبوت کے لئے پروفیسر "ولسن" لکھتے ہیں کہ "ان امور
خلاف قیاس سمجھنے والے لوگ آسٹریلیا کے باشندوں کو اپنا "بومرنگ" استعمال
تے ہوئے دیکھیں -

رامائن اور مہا بھارت میں عجیب و غریب ہتھیاروں کے علاوہ ومانوں
ائی جہازوں) کا بھی ذکر ہے - جو بغیر آواز کے چلتے تھے - راجہ بھوج کے
نے میں پارے سے چلنے والا ہوائی جہاز استعمال میں آتا تھا جس کی شکل
بے سے ملتی تھی - اس لئے اس کا نام ہی اشو مکھی تھا - اس قسم کی
ں حیرت انگیز چیزیں پُرانی کتابوں میں موجود ہیں - لیکن قدیم کتب کے
د تباہ ہو جانے کے باعث یہ سب کچھ طاقِ نسیاں کی زینت ہو چکا ہے -
روشنی کے نوجوان یا موجودہ سائنس کے دل دادگان پرانوں میں مذکور فنونِ
تال کو محض افسانہ سمجھتے ہیں -

"تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان جنت نشان شروع ہی سے غیر ممالک کے
روں کی جولان گاہ رہا ہے - ترک نادانِ حوادث کی لکد کوبی کا صریحی د
یہ ہوا کہ ہمارے علمی و فنی خزانے جو مخطوطاتِ نادرہ میں لباس الفاظ
ں تھے - یا تو جلا دئے گئے یا ضائع کر دئے گئے - چنانچہ تکشلا (ٹیکسلا)

نالندہ - پاٹلی پتر (پٹنہ) کی لائبریریوں کی کتابیں کئی مہینوں تک حملہ آوروں کے باورچی
خانوں میں ایندھن کا کام دیتی رہیں - کہتے ہیں پاٹلی پتر کے نزدیک ایک بہت بڑی
لائبریری متواتر چھ مہینے تک جلتی رہی - حملہ آوروں کی دست بُرد کے علاوہ ہماری
قدامت پسندی اور دقیانوسی ذہنیت بھی اس علمی تباہی کی بہت کچھ ذمہ دار
ہے - کیونکہ ہم اپنی نایاب و نادر کتابوں کو دوسرے کی تحویل میں دینے کی بجائے
ضائع کر دینا بہتر سمجھتے تھے - چنانچہ جنوبی ہند کے ایک عالم و فاضل برہمن
کے پاس "لوہ سار" نامی کتاب تھی - جس میں لوہے کا سفوف بنا کر دوسری
دھاتوں میں ملانے کے طریقے درج تھے - جن لوگوں نے دہلی میں پرتھوی راج کا
مندر دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کے عین وسط میں وشنو کی لاٹھ اسی طریق
سے پانچ دھاتوں کو ملا کر بنائی گئی ہے - دورِ حاضرہ کے سائنس دان اس کی طرزِ
ساخت پر حیران ہیں - کہتے ہیں ایک انگریز سائنس دان نے اس کتاب کے عوض
زر کثیر کی پیش کش کی - لیکن پنڈت صاحب موصوف نے کتاب مذکور کو بھاڑ گنڈ
میں ڈال کر جلانے کو فروخت کرنے پر ترجیح دی - اسی طرح سونا چاندی وغیرہ
بنانے کے قلمی نسخے یوگیوں اور سنیاسیوں کے پاس سینہ بسینہ چلے آتے ہیں
لیکن ان سے عوام کو ذرّہ بھر بھی فائدہ نہیں پہنچ سکا -

حال ہی میں "مہرشی بھاردواج" کا ایک قدیم ترین قلمی نسخہ موسومہ بہ "ینتر
سروسو" دستیاب ہوا ہے - جس کے چوتھے ادھیائے کا نام ہی "ومان شاستر"
ہے - اس میں ہوائی جہازوں کی تیاری - پرزوں کی تفصیل - ایندھن کی جگہ
استعمال میں آنے والے تیل اور رس، ہوائی حادثات کے اسباب اور ان کا تدارک
درج ہے - بھاردواج جی لکھتے ہیں کہ اس ادھیائے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے
میں پرانی چھ کتابوں سے مدد لی گئی ہے - ۱ - ومان چندرکا مصنف نارائن رشی
۲ - ویوبان تنتر مصنف شونک رشی - ۳ - ینتر کو مصنف مہرشی گرگ، ۴ -
بان بندھو مصنف واچسپتی، ۵ - کھیت بان پردیپکا مصنف چکرائنی، ۶ -
ویوم یا نارک پرکاش مصنف ڈھونڈی ناتھ - اسی ضمن میں زمانۂ قدیم کے ہوائی
جہازوں کے ماہروں اور انجینیروں کے نام بھی درج ہیں - اس کتاب پر "تیشور
بودھانند" کا لکھا ہوا ایک بھاشیہ (شرح) بھی ملا ہے -

کتاب مذکور میں مرقوم ہے کہ ہوائی رستے پانچ قسم کے ہوتے ہیں اور
ومانوں کو دورانِ پرواز میں پانچ ہی قسم کے خطرے پیش آ سکتے ہیں - خطرے کو
سنسکرت میں آورن یا آورت کہتے ہیں - ۱ - شکتی آورت - جب کہ انجن میں

خرابی پیدا ہو جائے۔

۲۔ ماتاورت۔ جب طوفانِ باد و باراں سے دمان کی رفتار رک جائے۔

۳۔ کرناورت۔ جب ریڈیائی لہروں سے ہوائی جہاز کی لہروں میں رکاوٹ پیدا ہو جائے۔

۴۔ شیت ورت۔ جب ہوا باز کے ہاتھ پاؤں سردی سے ٹھٹھر کر ناکارہ ہو جائیں یا تیل جم جانے کا خطرہ لاحق ہو۔

۵۔ گھرشن آورت۔ جب پُرزوں کے گھِس جانے یا ناکارہ ہو جانے سے جہاز میں کوئی خلل آ جائے۔

خطرات کی پانچ قسمیں بیان کر کے بتایا گیا ہے۔ کہ فضائے آسمانی میں ایسی کون سی طاقتیں ہیں جن کے اثر انداز ہونے سے جہاز بے قابو ہو جاتا ہے یا ٹوٹ پھوٹ کر نیچے گر پڑتا ہے۔ اور کون سی برقی لہریں ہیں جو ریڈیائی لہروں کو بے اثر کر دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پندرہ قسم کے زہروں کا ذکر ہے جو ہوا باز اور مسافروں کے حق میں مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ مزید برآں ہر زہر سے بچنے کا طریقہ بھی ساتھ دیا گیا ہے۔

اس نادر کتاب میں مہرشی نے دمان شاستر کے علاوہ ریڈیو گرافی، دائرلیس ٹیلی گرافی، فوٹو گرافی کا ذکر بھی کیا ہے۔ کتاب کے پچیسویں ادھیائے میں آواز کے ذریعے چلنے والے ایک دمان کا ذکر ہے۔ نیز سب سے زیادہ دلچسپ دل کش اور حیرت خیز بات یہ بھی درج ہے کہ انتہائی بلندی پر اُڑنے والے ہوائی جہازوں میں بیٹھے ہوئے آدمی ایک دوسرے سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ ایک ہوائی جہاز کے مسافر دوسرے ہوائی جہاز میں بیٹھے مسافروں اور اُن کے سامان کی تصویریں دیکھ سکتے ہیں۔ بٹن دبانے سے ایک دروازہ کھولا جا سکتا ہے۔ جس سے دریا، پہاڑ، شہر اور دیگر نظارے بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ کتاب کے اس حصے کا نام "اپکا دیتر" ہے۔ اسی کتاب میں "دشا پال یتر" نامی ایک باب ہے جس میں ایسے طریق مندرج ہیں کہ اُن پر عمل کرنے سے دھند یا کُہر کی صورت میں بھی سمت اچھی طرح نظر آتی ہے۔ الغرض یہی ایک نسخہ موجودہ سائنس دانوں کو انگشت بدنداں کرنے کے لئے کافی ہے۔ میسور سنسکرت پریشد کے ودوان مغربی سکالروں کی مدد سے اس کتاب کی مزید ریسرچ کر رہے ہیں۔ امید ہے اگر اسی طرح تجسس و تفحص کے میدان میں جولانیاں جاری رہیں تو بہت کچھ گوہر ہائے آب دار اور دُرہائے نادرہ سے دامن ملک و قوم مالا مال ہو گا۔

ہند وید وسیا گرنتھوں میں سب ہتھیاروں کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ "ینتر مکتا"۔ جو کسی آلے یا کسی انجن سے پھینکے جائیں۔ مثلاً تیر، بم، توپ، بندوق وغیرہ۔

۲۔ "ہست مکتا"۔ جو صرف ہاتھ سے پھینکے جائیں۔ مثلاً پتھر، برکش، چکر، کمند، موسل وغیرہ

۳۔ جو پھینکنے کے بغیر ہی ہاتھ میں رکھ کر وار کیا جائے۔ مثلاً ترشول، تلوار، سنگین، گدا

۴۔ قدرتی ہتھیار۔ گھونسہ، لات، تھپڑ، ٹھوکر

۵۔ خوفناک ہتھیار جیسے جھنڈی پال، فنکتی، تومر، نراچ، پرسا، بھشنڈی، کشیمنی وغیرہ

ان پانچ قسموں کے علاوہ آتش بار آلات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ آگ اور بجلی کی مدد سے چلنے والے ہتھیار موجودہ دور کی خاص ایجاد سمجھے جاتے ہیں مگر ہمارے یہاں پُرانے گرنتھوں بلکہ ویدوں میں بھی اُن کا مفصل حال درج ہے۔ یجروید میں ان ہتھیاروں کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔ پراچین گرنتھوں کا ذکر تو در کنار پرتھوی راج راسا تک میں ان کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ دربار اودھ کے مؤرخ راجہ کندن لال لکھتے ہیں۔ کہ شاہان اودھ کے ہاں "پچھما" نام کی ایک توپ تھی جو مہاراجہ پرتھوی راج کے توپ خانے کی کہی جاتی تھی۔

کتاب "ایشیا پر جو گیا" کی پہلی جلد کے دوسرے حصے اور پانچویں باب میں "ماریا سوزا" نے سنہ ۱۵۰۰ء میں گجرات کے ایک جہاز پر سے پرتگیزوں پر کئی توپوں سے گولے برسائے جانے کا ذکر کیا ہے۔ اور ساتویں باب میں لکھا ہے کہ سنہ ۱۵۰۳ء میں زمورن کے بیڑے میں ۸۰۳ توپیں تھیں۔

پروفیسر ولسن لکھتے ہیں کہ پراچین بھارت کے ہتھیاروں میں "وجر" یعنی بجلی کا ذکر بہت آتا ہے۔ جو کوئی دھماکا پیدا کرنے والا ہتھیار تھا۔ ہندوؤں کی طبّی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ گندھک لکڑی کے کوئلے اور شورے کے استعمال سے بخوبی واقف تھے جو بارود کی تیاری میں کام آتے ہیں۔ مسٹر ڈیوٹی اپنی کتاب "زمانہ حال کی ایجادات" کے صفحہ ۱۹۷ پر لکھتے ہیں "سکندر نے ارسطو کو لکھا تھا کہ ہندوستان میں اپنی فوجوں پر میں نے آگ کے خوفناک شعلے

برستے ہوئے دیکھے"۔ راماین میں مذکور ہے کہ رشی وشوامتر جی نے شری رام چندر جی کو جو ہتھیار دئے تھے ان میں سے ایک ہتھیار کا نام "اگنے یہ" اور دوسرے کا نام "تنکھرا" تھا۔

مسٹر کیری اور مارش مین نے تنکھرا کو چمک سے اُڑ جانے والا ہتھیار بتایا ہے۔

مہاراجہ دشرتھ سے کئی پشت پہلے مہاراجہ سگر نے بھارگو رشی سے آتشیں ہتھیار حاصل کئے۔ اور اُن سے "تال جنگ" اور "ہے ہے" نسل کے راجاؤں کا خاتمہ کیا۔

"ایم سی انگ لاٹس نے لکھا ہے کہ یہ ہتھیار بھارگو رشی کے خاندان میں ایک عرصے سے موجود تھے۔ مندرجہ بالا خونخوار اوزاروں کے علاوہ مہابھارت میں "ماہیندر دھنش' بام دیو دھنش' گانڈیو دھنش' اشونی کمار دھنش' وشنو دھنش' ردّیہ دھنش' جرارج دھنش' رُدر دھنش' اگنی دھنش بلدیو دھنش کا بھی ذکر ملتا ہے۔

مہابھارت' بھاگوت پران کے مطالعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ قدیم ہند میں فوج کے اعداد و شمار اکشونی کے حساب سے تھے۔ اکشونی کا پیمانہ گرنتھوں میں حسب ذیل طریق سے ملتا ہے۔

ایک اکشونی کا پرمان	ہاتھی	=	۲۱۸۷۰
	رتھ	=	۲۱۸۷۰
	گھوڑ سوار	=	۶۰۰۰۰
	پیدل	=	۱۰۹۳۵۰

والمیکی راماین ایودھیا کانڈ میں ایودھیا کی قلعہ بندی کا ذکر کرتے ہوئے والمیک جی لکھتے ہیں کہ جس طرح ایک عورت بیش قیمت زیوروں سے سجی ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایودھیا کے مینار بڑی بڑی تباہ کن مشینوں سے آراستہ تھے۔ سنسکرت گرنتھوں میں "شت گھنی" اور "سہسر گھنی" کا بار بار ذکر آتا ہے اول الذکر کے لغوی معنے ہیں ایک ہی وار میں سو جانوں کو نابود کر دینے والی۔ اور دوسرے ہتھیار کے معنی ہیں ایک ہی وار میں ہزار جانوں کو تلف کر دینے والی۔ پورانوں میں وشوامتر جی کو شت گھنی اور سہسر گھنی کا موجد بتایا گیا ہے "امرکوش" اور "شبد کلپدرم" میں جہاں اگنی استر کا ذکر ہے وہاں یہ بھی درج ہے کہ اگنی استر چھوٹتے ہی دشمنوں کی فوج میں پہنچ کر کئی کئی آتشیں نالیوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور کسی طرح بھی نہیں بجھایا جا سکتا۔

پروفیسر ولسن کا بیان ہے کہ یورپینوں کے ہندوستان میں آنے سے صدیوں پہلے ہندوستانی لوگ جنگی ہوائیاں ایجاد کر چکے تھے اور یورپ میں ان کا استعمال بالکل حال ہی میں ہونے لگا ہے۔ چنانچہ یورپ میں راکٹ کا استعمال سب سے پہلے سنہ ۱۸۰۷ء میں ڈنمارک کی راجدھانی کوپن ہیگن کے محاصرے میں کیا گیا ہے۔

یونانی مصنفوں نے ہندوستانیوں کے تیار کردہ ایک عجیب و غریب تیل کا ذکر کیا ہے۔ جو شہروں کی فصیلوں اور قلعوں کی دیواروں کو گرانے میں کام دیتا تھا۔ اور اس تیل سے لگی ہوئی آگ بجھائی نہیں جا سکتی تھی۔

راماین مہابھارت میں دیگر ہتھیاروں کے علاوہ وایو استر' ورن استر' میگھ استر اور موہنی استر کا ذکر آتا ہے۔ پہلے دونوں ہتھیاروں کے چلتے ہی آندھی کا طوفان بپا ہو جاتا تھا۔ چوتھے کے چلتے ہی دشمن کے آدمی بے ہوش ہو جاتے تھے۔ تیسرے ہتھیار سے میدان میں پانی ہی پانی ہو جاتا تھا۔ زمانہ حال میں اس ہتھیار کو اشک آور گیس یا دیگر نو ایجاد گیسوں سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ ان استروں کے چلائے جانے پر دشمن اپنے آپ کو آگ کے زبردست شعلوں' بجلی کی لہروں' پانی کے سیلاب یا گہرے اندھیرے زہریلے اور دم گھٹنے والے دھوئیں سے گھرا ہوا پاتے تھے۔ یا آنکھوں کے سامنے سانپ' بچھو' شیر' چیتے وغیرہ خوف ناک جانور آ آ کر انھیں خوف زدہ کرتے تھے۔ اس وقت ان کے جوابی استر چھوڑ کر اپنی حفاظت کی جا سکتی تھی۔

مشہور امریکی فلیوسوفسٹ کرنیل اسکاٹ لکھتے ہیں۔ کہ اس استر ودیا کی ہمارے موجودہ زمانے کے پروفیسروں اور اسکالروں کو ہوا تک بھی نہیں لگی۔ جس کا ایک ایک ماہر ایک بڑی حملہ آور فوج کو چند منٹوں میں ہی بھاگنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ غرض اس طرح ہزاروں حیرت انگیز' ہیبت ناک اور خوف ناک ہتھیاروں کا ذکر قدیم گرنتھوں میں ملتا ہے۔

آج کل لوگ پرمانو بم یا ہیڈروجن بم ہی کو سب سے آخری ترقی یافتہ ایجاد کہہ رہے ہیں۔ ذرا غور کریں تو زمانہ قدیم کی ادنےٰ ترین ایجاد کے سامنے یہ پرمانو شکتی ہیچ ہے۔

شہناز ہاشمی

ناشپاتی کا درخت

(کیتھرین منیسفیلڈ کی ایک کہانی سے ماخوذ)

اگرچہ برتھا تیس سال کی ہو چکی تھی، پھر بھی کبھی کبھی ایسے لمحے آئے جب اُس کا جی چاہتا تھا کہ بچوں کی طرح دوڑنے بھاگنے لگے۔ سڑک پر ناچ ناچ کر قدم رکھے، ہوا میں کوئی چیز اُچھالے، یا پھر آپ ہی آپ خوب ہنسے —— بلا وجہ —— بلا مقصد ——!

کوئی کیا کرے جب اس کی عمر تیس سال کی ہو چکی ہو کہ ایک دن اپنے گھر کے سامنے کی سڑک پر پہونچ کر اُس کا دل یکایک ایک مسرت کے احساس سے لرز اُٹھے —— کمل اور بھرپور مسرت —— جیسے ابھی ابھی اس نے سورج کا ایک ٹکڑا اگل لیا ہو اور وہ اس کے سینے میں جل رہا ہو۔ رگ رگ میں شعلوں کی پھوار برسا رہا ہو ....

کیا کسی طرح اس نامعلوم مسرت کا اظہار کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس کے اظہار کے لئے شراب کے نشے میں چور ہونا ضروری ہے؟ آخر یہ جسم دیا ہی کیوں گیا؟ کیا اسی لئے کہ ہماری سارنگی کے خانے کی طرح ہر احساس اس میں چھپا کر رکھا جائے؟

"نہیں۔ یہ سارنگی کی مثال ٹھیک نہیں رہی" برتھا نے سوچا: "میرا یہ مطلب نہیں تھا" اور برتھا سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ اس کی انگلیاں بیگ میں کنجی تلاش کر رہی تھیں، جیسے وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی بھول گئی تھی: "میرا یہ مطلب نہیں تھا، کیونکہ ——" میری نے دروازہ کھولا اور برتھا ہال میں داخل ہوئی۔

"کیا نرس واپس آگئی؟"

"جی ہاں"

"اور پھل آگئے؟"

"جی ہاں۔ سب چیزیں آگئی ہیں"

"پھل کھانے کے کمرے میں لے آؤ۔ میں اوپر جانے سے پہلے میز پر پھل سجاتی جاؤں" کھانے کے کمرے میں اندھیرا تھا، اور سردی بھی۔ پھر بھی برتھا نے کوٹ اتار کر پھینک دیا۔ اُس کے بازوؤں نے ٹھنڈی ہوا کی لذت محسوس کی۔ اس کے سینے میں اب بھی چنگاریوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ یہ شِشتہ اس سے سہی نہ جاتی تھی۔ وہ سانس لیتے بھی ڈرتی تھی کہ کہیں یہ آگ اور تیزی سے نہ بھڑک اٹھے۔ پھر بھی وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی —— وہ آئینے کی طرف دیکھتے ڈرتی تھی۔ پھر بھی اس نے آئینے کی طرف دیکھا۔ آئینے میں اسے ایک عورت نظر آئی، جو مسکرائے جا رہی تھی۔ جس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کچھ سننے کے انداز میں اٹھی ہوئی تھیں۔ کسی چیز کی منتظر تھیں —— کسی زبردست واقعے کی ——!

میری کشتی میں پھل لئے ہوئے آگئی۔ ساتھ ہی ایک شیشے کا پیالہ اور ایک نیلے رنگ کی بہت خوشنما پلیٹ بھی لائی۔ جس پر ایسی عجیب سی چمک تھی، جیسے ابھی ابھی دودھ میں ڈبوئی گئی ہو۔

"کمرے میں روشنی کر دوں بی بی؟"

"نہیں۔ مجھے اچھی طرح نظر آ رہا ہے"

کشتی میں چند سنترے تھے، اور کچھ سیب۔ تھوڑی سی زرد ناشپاتیاں، ریشم کی طرح ملائم۔ کچھ سفید انگور اور ارغوانی رنگ کے انگوروں کا ایک خوشہ۔ یہ اس نے کھانے کے کمرے کے نئے قالین کی مناسبت سے خریدے تھے۔ بڑی بے معنی سی بات معلوم ہوتی تھی۔ اسے دوکان پر کھڑے ہو کر خیال آیا تھا "کیوں نہ کچھ ارغوانی رنگ کے انگور بھی لے لوں۔ تاکہ قالین میز سے گلے ملتا ہوا معلوم ہو" اور اس وقت یہ خیال بڑا بامعنی معلوم ہوا تھا۔

اس نے ان تازے تازے پھلوں کے دو مینار بنا سئے، اور دُور سے کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔ سچ مچ ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ ان ارغوانی انگوروں نے ——— سیاہ میز شام کی دھندلی روشنی میں گھلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، اور نیلی پلیٹ اور شیشے کی پیالی ہوا میں تیر رہی تھی——!
اس موڈ میں برتھا کو یہ منظر بڑا اچھا لگا——— وہ ایک دم سے ہنسنے لگی۔

"نہیں، نہیں، نہیں، میں خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی ہوں"——
اس نے اپنا بیگ اٹھایا، اور دوڑتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر نرسری میں پہونچ گئی۔

نرس بی بی کو غسل کرا چکی تھی اور اب اسے کھانا کھلا رہی تھی۔ بچی سفید فراک اور نیلا گرم کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے سیاہ بال ایک گچھے کی طرح گندھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی ماں کو آتے دیکھا تو اچھل پڑی۔

"نہیں بی بی، پہلے کھانا کھا لو۔ اچھے بچوں کی طرح" نرس نے کہا اور اپنے ہونٹ اس انداز سے دبائے جس کا مطلب تھا کہ برتھا غلط وقت پر نرسری میں آئی ہے۔

"اس نے کوئی شرارت تو نہیں کی؟"

"جی نہیں، یہ ساری دوپہر بڑی پیاری بچی بنی رہی" نرس نے آہستہ سے کہا "ہم پارک میں ٹہلنے گئے۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور بی بی کو گاڑی میں سے اُتار دیا۔ ایک کالا کتا آیا اور میرے گھٹنے پر اپنا سر رکھ دیا اور بی بی اس کے کان کھینچتی رہی۔ آپ دیکھتیں تو وہ منظر"

برتھا کہنا چاہتی تھی کہ کالے کتے کے کان کھینچنا بڑا خطرناک کھیل تھا۔ مگر اس کی ہمت نہ پڑی۔ وہ خاموش کھڑی ان دونوں کو دیکھتی رہی۔ بی بی نے پھر برتھا کی طرف دیکھا اور کچھ اس طرح ہنسی کہ برتھا بے اختیار چیخ پڑی۔

"نرس، لاؤ میں اسے کھانا کھلاؤں۔ جب تک تم اس کے نہانے کا سامان ہٹا دو"

"بہت اچھا۔ مگر کھانا کھاتے وقت اسے کھیل میں مت لگائیے گا، جیسے آپ ہمیشہ کرتی ہیں۔ بعد میں مجھے بڑی مصیبت ہوتی ہے"

کیسی فضول بات تھی یہ۔ بچے کی ماں بننے سے فائدہ ہی کیا جب بچہ سارنگی کی طرح ایک غلاف میں ——— نہیں۔ دوسری عورت کے بازوؤں میں رکھا جائے؟

"نہیں۔ تم جاؤ۔ میں اسے کھانا ضرور کھلاؤں گی"
نرس تولیہ اٹھا کر بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

"اب تو میرے پاس ہے میری جان" برتھا نے بی بی کو گود میں بٹھا لیا بی نے خوب مزے لے کر کھانا کھایا۔ کبھی تو چمچے کو منہ میں لیا دباتی کہ چھوڑتی ہی نہ تھی اور کبھی چمچہ منہ کے قریب آنے سے پہلے ہی اُس کو ہوا میں اچھال دیتی۔

بی کھانا ختم کر چکی تو برتھا آتشدان کی طرف گھوم گئی۔

"تم بہت پیاری ہو بی ——— بہت ہی پیاری" اس نے بچی کے گرم گرم چہرے پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ وہ واقعی بی بی پر جان دیتی تھی۔ ایک نامعلوم مسرّت پھر اس کی رگ رگ میں دوڑنے لگی، اور پھر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا اظہار کس طرح کرے۔

"آپ کے نام ٹیلی فون آیا ہے" نرس کمرے میں داخل ہوئی اور فاتحانہ انداز سے اپنی بی کو گود میں لے لیا۔

برتھا بھاگی ہوئی نیچے آئی۔ فون پر ہیری کی آواز آئی "تم ہو برتھا؟ اچھا دیکھو میں ذرا دیر سے گھر آؤں گا۔ کوئی ٹیکسی پکڑ کر جلد سے جلد پہونچنے کی کوشش کروں گا۔ پھر بھی احتیاطاً کھانا دس منٹ دیر سے شروع کرنا۔ ٹھیک ہے؟"

"بالکل ٹھیک ——— ہیری!"

"کہو ——— ؟"

وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں۔ صرف ایک لمحے کے لئے ہیری کی قربت محسوس کرنا چاہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ پاگلوں کی طرح چیخ نہیں سکتی تھی "آج کا دن کتنا مقدّس تھا، اور کتنا خوبصورت"

"کیا بات ہے برتھا؟" ہیری کی آواز آئی۔

"کچھ نہیں ہیری" برتھا نے رسیور رکھ دیا۔ وہ سوچنے لگی۔ "کس قدر بے وقوف ہے یہ دنیا، اور کس قدر حماقت آمیز ہے یہ تہذیب ——— یہ کلچر"

رات کے کھانے پر کچھ مہمان آنے والے تھے۔ نارمن نائٹ جو ایک تھیٹر کھولنے کی اسکیم بنا رہا تھا، مسز نارمن نائٹ جو گھر سجانے

میں بڑی مشتاق تھیں۔ ایک نوجوان ایڈی وارن جس کی نظموں کا ایک مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا تھا اور جس کو آج کل ہر شخص اپنے یہاں مدعو کر رہا تھا، اور ایک مس پرل فلٹن جس کو برتھا نے کہیں سے ڈھونڈ نکالا تھا پرل فلٹن کی سرگرمیوں کا برتھا کو کوئی علم نہیں تھا۔ ان کی ملاقات ایک کلب میں ہوئی تھی اور برتھا کو وہ بہت پسند آئی تھی کیوں کہ اُس کو وہ سب خوبصورت عورتیں پسند آتی تھیں جن میں کوئی نہ کوئی انوکھی بات ہو۔

سب سے زیادہ پُراسرار چیز یہ تھی کہ حالانکہ وہ کئی دفعہ ایک دوسرے سے مل چکی تھیں اور برابر باتیں بھی کرتی رہتی تھیں، لیکن برتھا ابھی تک اس کو سمجھ نہ سکی تھی۔ ایک حد تک پرل بہت بے تکلف تھی۔ لیکن صرف ایک حد تک ——— اور اس حد کے آگے وہ کبھی نہ بڑھتی۔

اس حد سے آگے بھی کوئی چیز تھی؟

"نہیں"۔ ہیری ہمیشہ یہی جواب دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ پرل بھی تمام سفید فام عورتوں کی طرح بے حس اور کند ذہن ہے، اور شاید کسی دماغی کمزوری کا شکار بھی ہے۔ لیکن برتھا اس سے متفق نہیں تھی۔ کم از کم ابھی تک تو نہیں تھی۔

"اس کی مسکراہٹ اور اس کی گردن کی خم کے پیچھے ضرور کوئی بات ہے اور مجھے یہی معلوم کرنا ہے کہ وہ کیا بات ہے۔"

"غالباً صحت معدہ!"

ہیری اس قسم کے جوابوں سے ہمیشہ برتھا کو چھیڑا کرتا تھا: "یہ جگر کی خرابی کی نشانی ہے۔ برتھا" یا "یقیناً کوئی گردے کی شکایت" برتھا کو یہ چھیڑ خانی اچھی لگتی تھی اور ہیری چھیڑتے وقت اس کو اور بھی اچھا معلوم ہوتا تھا۔

وہ ڈرائنگ روم میں چلی گئی اور آتش دان میں آگ روشن کی۔ پھر ایک ایک کر کے سارے کشن کرسیوں اور صوفوں پر جما دئے۔ کمرے میں جان سی پڑ گئی۔ ڈرائنگ روم کے دریچے ایک بالکونی پر کھلتے تھے جہاں سے چمن نظر آتا تھا۔ چمن کے آخری سرے پر دیوار کے پاس ایک ناشپاتی کا ہرا بھرا درخت تھا۔ نیلے آسمان کے سائے تلے خاموش کھڑا تھا۔ اتنی دور سے بھی برتھا یہ دیکھ سکتی تھی کہ اس درخت پر ایک بھی مرجھائی کلی یا خشک پتہ نہیں ہے۔ درخت بالکل مکمل تھا اور بالکل خاموش ——— باغ میں سُرخ اور زرد پھولوں کے تختے شفق کو چھوتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ایک سفید بلی لان میں رینگ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک سیاہ بلی ——— اس کا سایہ۔ ان بلیوں کو دیکھ کر برتھا کے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

کمرہ نرگس کے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا ——— کتنی تیز خوشبو ——— برتھا کوچ پر لیٹ گئی اور انگلیوں سے آنکھوں کے پپوٹے دبانے لگی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹوں پر ناشپاتی کا درخت تھرتھرا رہا تھا۔ یہ شاداب درخت اسے اپنی زندگی کا نشان معلوم ہوتا تھا۔

سچ مچ اس کی زندگی بڑی شاداب تھی۔ اس کے پاس کس چیز کی کمی تھی۔ وہ نوجوان تھی۔ وہ اور ہیری ایک دوسرے سے بہت خوش تھے، بڑی اچھی زندگی گذار رہے تھے۔ ان کے گھر میں ایک خوبصورت بچی کے قہقہے گونجتے رہتے تھے۔ روپے کی فراوانی تھی۔ یہ آرام دہ مکان اور باغ تھا۔ دوستوں کا ایک حلقہ تھا ——— ہم مذاق دوست۔ جدید خیالات کے لوگ۔ ادیب اور مصوّر، شاعر اور سماجی کاموں میں دلچسپی لینے والے نوجوان۔ سب سے بڑھ کر ان کے پاس کتابوں کی دولت تھی، موسیقی کی دولت تھی۔ اچھے اچھے لباس۔ اب کی گرمیوں میں وہ دنیا کی سیر کو جانے والے تھے ——— ان کا باورچی بہترین آملیٹ بناتا تھا۔

برتھا اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس پر نشہ سا چڑھا ہوا تھا ——— شاید موسم بہار کا اثر۔

ہاں یہ بہار کا موسم تھا۔ وہ اتنی تھکی ہوئی تھی کہ کپڑے بدلنے کے لئے اوپر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

سفید لباس۔ زمرد کا ہار۔ سبز جوتے اور موزے۔ یہ اسکیم اس نے بہت پہلے سے بنالی تھی۔ اس کا ریشمی لباس ہال میں سرسرایا اور اس نے آگے بڑھ کر مسز نارمن نائٹ کا استقبال کیا جو اپنا نارنجی رنگ کا کوٹ اُتار رہی تھیں جس کے حاشیوں پر سیاہ بندروں کا جلوس تھا۔

"کیوں، آخر کیوں! متوسط طبقہ اتنا غبی اور اتنا ٹھس کیوں ہے۔ مزاح سے یکسر خالی۔ بالکل اتفاق ہی ہے کہ میں یہاں صحیح سلامت پہونچ گئی۔ نارمن میرا محافظ تھا۔ میرے بندروں نے بس کے مسافروں کو اتنا

بوکھلا دیا کہ وہ سب کے سب مجھے کھانے کو چڑھ دوڑے ـــــ ذرا بھی لطف اندوز نہیں ہوئے ـــــ اگر وہ ہنستے تو میں خوش ہوتی۔ بس وہ حیرت سے تکتے رہے اور مجھے بور کرتے رہے۔"

"لیکن سب سے دلچسپ چیز یہ تھی" نارمن نے کچھوے کی کھال کی فریم والی ایک شیشے کی عینک آنکھ پر جماتے ہوئے کہا: "بتا دوں فیز؟" (وہ دونوں گھر میں اور بے تکلف دوستوں کے سامنے ایک دوسرے کو فیز اور نگ کہہ کر پکارتے تھے)۔ "سب سے دلچسپ بات وہ تھی جب فیز کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اس نے مڑ کر اپنے قریب والی عورت سے کہا "کیا آپ نے کبھی کوئی بت۔ رہنیں دیکھا ہے؟"

مسز نارمن کی آواز بھی قہقہوں کی گونج میں شامل ہوگئی: "ہاں بھئی۔ یہ تو انتہا تھی۔" اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ مسز نارمن اپنا کوٹ اتارنے کے بعد۔ بالکل ایک ذہین بت۔ رمعلوم ہورہی تھیں۔ دمکیلے کے چھلکے کے رنگ کا ریشمی لباس پہنے تھیں اور عنبریں آویزے کانوں میں جھول رہے تھے۔

"خوب واقعہ رہا۔" نگ نے ہال میں آتی کی گاڑی کے پاس رکتے ہوئے کہا۔ گھنٹی بجی۔ ایڈی وارن داخل ہوا۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح زرد اور افسردہ تھا۔

"ٹیکسی والے نے بڑا پریشان کیا۔ آندھی کی طرح ٹیکسی چلا رہا تھا، اور جتنا میں چیختا اتنی ہی اور تیز کرتا جاتا۔ بڑی ڈراؤنی شکل تھی اس کی۔ چاندنی رات میں یہ عجیب سی صورت، چپٹی سی ٹوپی پہنے ہوئے ....."

وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا سفید ریشمی مفلر اتارنے لگا۔ برتھا نے دیکھا کہ اس کے موزے بھی سفید تھے، بہت خوش نما۔

"تو یہ کیسا خوفناک تجربہ!" وہ چیخی

"بہت خوفناک" ایڈی نے اس کے پیچھے پیچھے روم میں جاتے ہوئے کہا: "ایسا لگتا تھا میں قیامت تک اس ٹیکسی ڈرائیور کے پیچھے بیٹھا رہوں گا۔"

وہ نارمن نائٹ سے واقف تھا۔ اس کے لئے ایک ڈرامہ بھی لکھنے والا تھا۔ اگر تھیٹر کی اسکیم کامیاب ہوگئی۔

"ایڈی۔ ڈرامہ کہاں تک پہونچا؟" نائٹ نے عینک آنکھ پر سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ مسز نارمن نائٹ چیخیں۔ "اہا۔ کتنے خوبصورت موزے!"

"آپ کو پسند آئے؟" وہ اپنے پیروں کی طرف دیکھنے لگا۔ "چاند نکلنے کے بعد سے یہ اور بھی زیادہ سفید معلوم ہوتے ہیں۔" اس نے اپنا اداس چہرہ برتھا کی طرف پھیرا: "چاند نکلا ہوا ہے نا؟"

"ہاں۔ ہاں" برتھا زور زور سے چلانا چاہتی تھی: "اکثر نکلتا ہے ـــــ اکثر......"

ایڈی کی شخصیت بہت دلکش تھی۔ فیز کی بھی جو آتش دان کے پاس جھکی ہوئی تھی۔ نگ کی بھی جو سگریٹ پی رہا تھا اور کہہ رہا تھا: "دولہا نے اتنی دیر کیوں لگادی؟"

"لو وہ آگیا۔"

دھڑ سے دروازہ کھلا اور بند ہوا۔ ہیری نے آواز دی: "ہیلو، ہیلو۔ پانچ منٹ میں نیچے آیا۔" اور وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ برتھا مسکرانے لگی۔ وہ ہر کام عین وقت پر کرتا تھا۔ پانچ منٹ ادھر یا ادھر سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ پانچ منٹ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ پھر وہ بڑے سکون اور اہمیت کے احساس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا۔

ہیری کتنا زندہ دل تھا۔ برتھا کو ہیری کی زندہ دلی بہت پسند تھی۔ اسے لڑنے کا کتنا شوق تھا ـــــ وقت بے وقت اپنی قوت آزمانے کا ـــــ حالانکہ جب کبھی وہ بغیر لڑائی کے لڑائی پیدا کرتا تو دوسروں کی نظروں میں کیسا مضحکہ خیز دکھائی دیتا تھا۔ برتھا باتیں کرتی رہی اور ہنستی رہی، اور یہ بالکل بھول گئی کہ ابھی پرل فالٹن نہیں آئی ہے۔ ہیری کمرے میں داخل ہوا تو اسے پرل فالٹن کا خیال آیا۔

"کہیں پرل بھول نہ گئی ہو۔"

"خیال تو ایسا ہی ہے۔"

"لو ـــ ایک ٹیکسی آئی ہے۔" برتھا مسکرائی۔ برتھا کوئی نئی دوست بناتی تو ہمیشہ اسی طرح مسکراتی تھی، خاص کر جب وہ دوست پراسرار بھی ہو۔ "وہ ٹیکسیوں میں رہتی ہے۔"

"ٹیکسیوں میں رہے گی تو پھول کر کُپا ہوجائے گی۔" ہیری نے کھانے کے لئے گھنٹی بجاتے ہوئے کہا: "سفید رنگت والی عورتوں کے لئے ٹیکسی

بڑی خطرناک چیز ہے "

"یہ مت کہو ہیری" برتھا اس کی طرف منہ اٹھا کر ہنسنے لگی ۔

سب اطمینان سے باتیں کرتے رہے اور انتظار کرتے رہے ۔ یہاں تک کہ پرل اندر داخل ہوئی ۔ روپہلا لباس ۔ بالوں میں روپہلا ربن ۔ سر ایک طرف جھکا ہوا ۔

"مجھے دیر تو نہیں ہوئی ؟"

"بالکل نہیں" برتھا نے کہا ۔ "آؤ" اور اس کا بازو تھام لیا ۔ سب لوگ کھانے کے کمرے کی طرف چلے ۔ اس ٹھنڈے بازو کے لمس میں کیا چیز تھی جس نے برتھا کے سینے میں مسرت کی آگ اور تیز کر دی ؟

پرل نے اس کی طرف نہیں دیکھا ۔ وہ کسی کی طرف بھی نہیں دیکھتی تھی ۔ اس کی بوجھل پلکیں آنکھوں پر جھکی رہیں ۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلتی اور غائب ہو جاتی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ دیکھنے کے لئے نہیں محض سننے کے لئے زندہ ہے ۔ لیکن یکایک برتھا کو احساس ہوا جیسے ابھی ان دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا ہے ۔ پرل سفید پلیٹ میں تیرتے ہوئے سرخ شوربے میں چمچہ ہلا رہی تھی ۔ برتھا کو یقین تھا کہ اس وقت اس کے بھی احساسات بالکل وہی تھے جو برتھا کے تھے ۔

اور دوسرے لوگ ؟ فیزا اور مگ ۔ ایڈی اور ہیری ۔ چمچے اٹھاتے اور رکھتے ، رومالوں سے بار بار اپنے ہونٹ چھوتے ۔ کانٹوں اور گلاسوں سے کھیلتے ، باتیں کئے جا رہے تھے ۔

"میں اس سے الفا شو میں ملی تھی ۔ اس کی شخصیت جادو کا سا اثر کرتی ہے ۔ اس نے نہ صرف اپنے بال کاٹ لئے ہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اپنی ٹانگوں اور بازوؤں اور گردن اور ناک پر سے تھوڑا تھوڑا سا گوشت بھی کاٹ لیا ہے ۔"

"وہ مائیکل اوٹ پر بہت مہربان ہے نا ؟"

"وہی مائیکل اوٹ جس نے "مصنوعی دانتوں کا رومان" لکھا ہے ؟"

"وہ میرے لئے ایک ڈرامہ لکھنا چاہتا ہے ۔ ایک ایکٹ ۔ ایک کردار ۔ خودکشی کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے ۔ سارے اسباب بتاتا ہے کہ کیوں اسے خودکشی کرنا چاہیئے اور کیوں نہیں ۔ اور ٹھیک اسی لمحے جب وہ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اپنا فیصلہ کرتا ہے ــــــــ پردہ ! ــــــــ خیال تو برا نہیں ہے ؟"

"اس ڈرامے کا نام کیا ہوگا ــــــــ معدہ کی خرابی ؟"

"مجھے یاد پڑتا ہے ، میں نے اس قسم کا پلاٹ ایک فرانسیسی ڈرامے میں دیکھا تھا ، انگلستان میں لوگ اس سے واقف نہیں ہیں ۔"

یہ سب بڑے اچھے لوگ تھے ۔ برتھا کو ان کی صحبت بہت پسند تھی ۔ وہ ان کے سامنے لذیذ کھانے اور شراب پیش کرتی ۔ وہ ان کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ سب کتنے اچھے تھے ۔ کیسا سجا سجایا اجتماع تھا ۔ ان سب کو دیکھ کر اسے چیخوف کے ایک ڈرامے کا خیال آ جاتا تھا !

ہیری مزے لے لے کر کھانا کھا رہا تھا ۔ اس کی عادت تھی کہ وہ کھانے کی میز پر زیادہ تر کھانے ہی کی باتیں کرتا تھا ۔ "مچھلی کے سفید گوشت" کے لئے اپنی حرص کا اظہار کرتا ۔ سبز رنگ کے پھولوں کا ذکر کرتا ــــــــ سبز اور ٹھنڈے جیسے مصری رقاصاؤں کی آنکھیں ــــــــ

جب اس نے برتھا کی طرف مڑ کر کہا "برتھا ، بڑی لذیذ مٹھائی بنوائی ہے" تو برتھا خوشی کے مارے تقریباً رو پڑی ۔ آج اسے ساری دنیا اتنی حسین کیوں دکھائی دے رہی تھی ۔ مسرت کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا ۔

اس کے دماغ کے کسی کونے میں ناشپاتی کا درخت کھڑا تھا ــــــــ مکمل اور ساکن ۔ ابھی وہ روپہلا ہو جائے گا ۔ ایڈی کے چاندی روشنی میں ، پرل کے لباس کی طرح ــــــــ پرل کے ہاتھ میں ایک نارنگی تھی ۔ اس کی نازک انگلیاں اتنی زرد تھیں کہ ان میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹتی معلوم ہو رہی تھیں ۔

ایک بات برتھا کی سمجھ میں نہ آتی تھی ۔ اس نے پرل کے احساسات کا اتنا صحیح اندازہ کیسے لگا لیا تھا ــــــــ ہاں اسے یقین تھا کہ اس کا اندازہ بالکل صحیح ہے "میرا خیال ہے دو عورتوں میں اتنی یگانگی شاذ و نادر ہی ہوتی ہے ۔ مردوں میں تو کبھی نہیں ۔ میں جب ڈرائنگ روم میں کافی بناؤں گی تب شاید وہ مجھے کوئی اشارہ دے گی ۔"

اس سب کا مطلب کیا تھا ، برتھا خود بھی نہیں جانتی تھی اور اس کے بعد کیا ہوگا ؟ ــــــــ برتھا کو کچھ نہیں معلوم تھا ۔ وہ اس کے آگے کچھ سوچ ہی نہ سکتی تھی ۔

وہ یہ سب سوچتی رہی اور باتیں کرتی رہی اور ہنستی رہی: "آج اگر میں جی بھر کر نہ ہنسی تو مر جاؤں گی" اس نے فیز کی طرف نظر اٹھائی تو اس کا چہرہ آتش دان کے قریب جھکا ہوا اتنا مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا کہ برتھا نے ہنسی روکنے کے لئے اپنی ہتھیلیوں میں ناخن گڑو دیئے۔

کھانا ختم ہوا: "آیئے میری کافی کی نئی مشین دیکھئے" برتھا نے کہا

"ہم ہر پندرھویں دن ایک نئی کافی کی مشین لیتے ہیں" ہیری نے کہا۔ فیز نے برتھا کا بازو پکڑ لیا اور ڈرائنگ روم کی طرف چلی۔ پرل سر جھکائے اُن کے پیچھے چلنے لگی۔

ڈرائنگ روم میں آگ کی سُرخ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ فیز نے کہا، "ابھی کمرے میں بتیاں روشن مت کرنا۔ آگ کی روشنی کتنی حسین ہے" وہ آتشدان کے قریب بیٹھ گئی۔ اسے ہمیشہ سردی لگتی رہتی تھی "سیاہ بیت۔ روں اور سرخ کوٹ اتارنے کے بعد تو سردی ضرور ہی لگے گی" برتھا نے سوچا۔

اسی وقت پرل نے اشارہ دیا۔

"آپ کے یہاں باغ ہے؟" مدھم سوئی ہوئی آواز نے پوچھا اس قدر نازک تھا یہ لمحہ۔ برتھا اٹھی۔ پردے ہٹا کر لمبے لمبے دریچے کھول دیئے۔

"دیکھو" اس نے گہری سانس لی۔

دونوں عورتیں پاس پاس کھڑی تھیں۔ دونوں کی نظریں پھولوں سے لدے ناشپاتی کے درخت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ درخت بالکل خاموش تھا۔ پھر بھی چراغ کی لَو کی طرح لرزتا چمکتا، بڑھتا اور ہوا میں کانپتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا، جیسے ابھی چاند کے نرم حاشیے کو چھو لے گا۔

دونوں کتنی دیر تک وہاں کھڑی رہیں؟ —— جیسے دونوں آسمانی روشنی کے ایک دائرے میں کھڑی ہوں —— ایک دوسرے کو مکمل طور پر سمجھتی ہوئی، اور سوچتی ہوئی کہ وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہیں۔ اس دنیا میں ان کا کیا کام —— خوشیوں کے خزانے لئے ہوئے، جو ان کے سینوں میں جل رہے تھے، اور رو پہلے پھولوں کی شکل میں ان کے بالوں سے جھڑ رہے تھے!

ہمیشہ کے لئے؟ —— صرف ایک لمحے کے لئے؟ ——

کیا یہ پرل کی آواز تھی؟ —— "ہاں بالکل یہی!" یا محض برتھا کا خواب تھا؟

کمرے میں روشنیاں جل اُٹھیں۔ فیز نے کافی بنائی اور ہیری نے کہا۔ "مسٹر نائٹ، مجھ سے میری بچّی کے متعلق کچھ نہ پوچھئے۔ میں اسے کبھی نہیں دیکھتا۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی جب تک اس کی شادی کے پیغام نہ آنے لگیں" مگ نے ذرا دیر کے لئے اپنی آنکھ سے عینک ہٹائی۔ ایڈی وارن نے کافی پینے کے بعد فوراً اسی کے ساتھ پیالہ رکھ دیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ نوجوانوں کے لئے ایک عمدہ سا کھیل پیش کروں۔ لندن ذہین ڈرامہ نویسوں سے بھرا پڑا ہے۔ میں ان سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں "یہ ہے تھیئٹر —— بڑھو آگے"

"تمھیں معلوم ہے میں جیکب ناتھن کے لئے ایک کمرہ سجانے والی ہوں! میری اسکیم ہے کہ کرسیوں کی پشت فرائی پان کی شکل کی ہو اور پردوں پر آلو کے قتلوں کی شکلیں کڑھی ہوئی ہوں"

"ہمارے نوجوانوں کے ساتھ بڑی مشکل یہ ہے کہ ان کی ذہنیت ابھی تک بڑی رومان پسند ہے"

"ایک خوفناک سی نظم ایک لڑکی کے بارے میں جس کو جنگل میں ایک ننگا فقیر ملا تھا۔ ۔ ۔ ۔"

پرل سب سے نیچی کرسی پر بیٹھ گئی، اور ہیری نے سب کو سگریٹ پیش کئے۔ وہ چاندی کا سگریٹ کیس ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا "مصری؟ ترکی؟ ورجینین؟ —— سب گڈ مڈ ہیں" اور برتھا کو خیال آیا کہ وہ نہ صرف پرل کی موجودگی سے اُکتا چکا ہے بلکہ اس کو سخت ناپسند بھی کرتا ہے، اور جس انداز سے پرل نے کہا "جی نہیں شکریہ۔ میں سگریٹ نہیں پیوں گی" برتھا سمجھ گئی کہ پرل نے اپنی توہین کو محسوس کر لیا ہے۔

"نہیں نہیں ہیری۔ اسے اتنا بُرا مت سمجھو۔ تم نے اس کے بارے میں بالکل غلط رائے قایم کر لی ہے۔ وہ بہت غیر معمولی عورت ہے اور پھر تمھاری رائے میری رائے سے اتنی مختلف کیسے ہو سکتی ہے؟ میں آج رات کو تمھیں سمجھانے کی کوشش کروں گی کہ آج ہم دونوں میں قربت کا احساس کتنا شدید ہو گیا ہے" آخری الفاظ کے ساتھ کوئی عجیب سی چیز برتھا کے دماغ میں کود پڑی۔ اور اس عجیب سی چیز نے مسکرا کر اس کے کان میں کہا: "تھوڑی دیر میں یہ سب لوگ چلے جائیں گے —— صرف

تم اور ہیری رہ جاؤ گے ——گھر میں خاموشی چھا جائے گی ——"

وہ کرسی سے اُچھل پڑی اور پیانو کی طرف دوڑی۔

"کوئی پیانو کیوں نہیں بجاتا" وہ چیخی" آخر کوئی پیانو کیوں نہیں بجاتا؟"

برتھا اور اس کا شوہر آپس میں بڑے گہرے دوست تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہیری بہت سی باتوں میں اس سے مختلف ہے۔ پھر بھی وہ بے تکلف دوستوں کی طرح اپنی ہر بات ایک دوسرے سے کہہ دیتے تھے۔ وہ ایک ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ یہ نئے زمانے میں پیدا ہونے کی سب سے بڑی نعمت تھی۔ ان کی یہ قربت بڑی قیمتی چیز تھی۔

کیا اس کی بے پناہ مسرت کا یہی سبب تھا؟ مگر پھر؟......

" برتھا" مسز نارمن نائٹ نے کہا" تم جانتی ہو ہم وقت اور بس کے غلام ہیں ——آج کی شام بڑی اچھی گذری"

" میں آپ کے ساتھ ہال تک چل رہی ہوں" برتھا نے کہا" آپکے ساتھ کتنا اچھا وقت گذرا لیکن آپ کی آخری بس نہیں نکلنی چاہیئے"

" نائٹ، جانے سے پہلے ایک گلاس وسکی پیتے جاؤ" ہیری نے پکار کر کہا

" بس ہیری، اب نہیں شکریہ"

" خدا حافظ۔ خدا حافظ" برتھا برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑی کہتی رہی۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں واپس آئی تو باقی لوگ بھی جانے کے لئے اُٹھ رہے تھے۔

" آپ آدھے راستے میری ٹیکسی میں چل سکتے ہیں"

" بہت بہت شکریہ۔ مجھ میں ٹیکسی کا ایک اور خوفناک تجربہ برداشت کرنے کا دم نہیں ہے"

" آپ سڑک کے آخری سرے پر اُتر جائیے گا۔ وہاں سے صرف چند قدم کا فاصلہ ہے۔

" بس ٹھیک ہے"

پرل ہال کی طرف چلی اور برتھا اس کے پیچھے جانے ہی والی تھی کہ ہیری اُسے دھکا دے کر آگے نکل گیا۔

" لائیے میں آپ کو کوٹ پہنا دوں"

برتھا سمجھ رہی تھی کہ وہ اپنی بدتمیزی کی تلافی کر رہا تھا۔ کس قدر لڑکپن تھا اس میں اور کتنی سادگی۔ وہ ایڈی کے ساتھ آتشدان کے پاس بیٹھی رہ گئی۔

" آپ نے بل کی نئی نظم دیکھی ہے؟" ایڈی نے آہستہ سے پوچھا" بہت عمدہ نظم ہے۔ آخری مجموعے میں ہے۔ آپ کے پاس کوئی نسخہ ہے؟ میں وہ نظم آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔ دیکھئے پہلا مصرع کتنا خوبصورت ہے۔ ؏

آخر ہمیشہ ٹماٹر کا شوربہ ہی کیوں؟

برتھا ایک میز کی طرف بڑھی، اور ایڈی خاموشی سے اس کے پیچھے چلا۔ اس نے ایک چھوٹی سی کتاب اٹھا کر ایڈی کو دے دی۔ دونوں بالکل خاموش تھے۔

ایڈی کتاب پڑھنے لگا اور برتھا نے سر اُٹھا کر ہال کی طرف دیکھا۔ ہیری کے ہاتھ میں پرل کا کوٹ تھا اور پرل اس کی طرف پیٹھ کئے کھڑی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ یکایک ہیری نے کوٹ پھینک دیا اور پرل کا چہرہ اپنی طرف گھما لیا۔ پرل کے چہرے پر سوئی سوئی مسکراہٹ لہرائی۔ ہیری نے دھیرے سے کہا" کل" اور پرل نے جواب دیا" اچھا"

" یہ رہی وہ نظم" ایڈی کہہ رہا تھا" آخر ہمیشہ ٹماٹر کا شوربہ ہی کیوں؟ ——کیا حقیقت پسندی ہے"

" اگر آپ کہیں" ہیری کی آواز ہال میں گونجی" تو میں آپ کے لئے گاڑی منگوا دوں"

" جی نہیں شکریہ۔ اس تکلیف کی کوئی ضرورت نہیں" پرل نے جواب دیا۔ پھر وہ برتھا کے پاس آئی، اور اپنی ٹھنڈی انگلیاں برتھا کے ہاتھ میں دے دیں۔

" خدا حافظ"

" خدا حافظ" برتھا نے کہا

پرل کچھ دیر تک برتھا کا ہاتھ تھامے رہی۔

" تمہارا خوبصورت ناشپاتی کا درخت" اُس نے آہستہ سے کہا۔

پھر وہ چلی گئی، اور اس کے پیچھے ایڈی۔ جیسے سفید بلی کے پیچھے سیاہ بلی۔

" آؤ بھئی اب دوکان بڑھا دیں" ہیری نے اطمینان کا سانس لے کر برتھا سے کہا لیکن برتھا کے کانوں میں پرل کے الفاظ سرسرا رہے تھے۔

" تمہارا خوبصورت ناشپاتی کا درخت—— ناشپاتی کا درخت—— ناشپاتی کا درخت" برتھا دوڑ کر کھڑکی کے پاس گئی۔

" اب کیا ہونے والا ہے؟ ——اب کیا ہوگا؟"

لیکن ناشپاتی کا درخت اتنا ہی خوبصورت تھا، اتنا ہی شاداب، اور اتنا ہی خاموش——

شیخ فرید

ولی برہان پور میں

(ایک استفسار)

دارالسرور برہان پور اپنی تاریخی عظمت اور قدامت کے لحاظ سے ایک ممتاز تاریخی حیثیت کا مالک ہے۔ اُس کے آثارِ قدیمہ میں سلاطینِ فاروقیہ اور شاہانِ مغلیہ کی عام معاشرتی زندگی اور قابلِ رشک تہذیب و تمدن کی تاریخ مضمر ہے۔ فاروقیوں کے الم انگیز زوال کے بعد اس کی آنکھوں نے مغلیہ دور کی عظمت و جبروت کے مناظر بھی دیکھے، اور اُن کے شیرازۂ سلطنت کے بکھرے ہوئے اوراق کا بھی مشاہدہ کیا۔

عہدِ قدیم میں اِس شہر کی علمی و ادبی اہمیت مسلّم تھی۔ یہی وہ گہوارۂ علم و فضل ہے جس نے دُور دراز کے علما و فضلا کو اپنے دامنِ تربیت میں جگہ دی، اور اُن کی ترقیِ جاہ و منصب کا زینہ بنا رہا۔ مغلیہ دور میں عبدالرحیم خان خاناں کا عہدِ صوبگی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ اس معارف پرور اور علم دوست صوبے دار کے عہد میں ایران، گیلان اور شیراز کے شعرا، ذی کمال اور مشہورِ زمانہ اہلِ فن کشاں کشاں برہان پور آتے رہے، اور علم و ہنر میں اس شہر نے اس قدر ترقی کی کہ "سوادِ برہان پور" رشکِ بہشت بن گیا۔

دکن اسکول نے اردو شاعری کی نشو و نما اور ارتقا میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں محتاجِ بیان نہیں۔ دارالعیار برہان پور کا اُن میں خاص حصّہ ہے۔ شعرا کے تذکروں اور تاریخی کتب میں اس کے کافی شواہد موجود ہیں۔ دہلی، اورنگ آباد اور احمد آباد سے دکن کی ولی — برہان پور — کا خاص علمی، ادبی، سیاسی اور معاشرتی تعلق رہا ہے۔

اُردو کا مایۂ ناز شاعر — ولی — ایک مدّت تک یہاں سکونت پذیر رہا۔ اِس قیام کا مفصّل ذکر کسی تذکرے میں نہیں۔ گلشنِ گفتار میں صفحہ ۸ پر صرف اس قدر مرقوم ہے۔

"نیز در بلدۂ دارالسرور مدّتے سکونت داشت"

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اُردو کے اِس عظیم المرتبت شاعر کے تفصیلی حالاتِ زندگی کے متعلق ہمارے تذکرے خاموش ہیں۔ اُن میں جو کچھ بیان درج ہے اُس میں کافی تضاد پایا جاتا ہے۔ اُس کے نام، وطن، تعلیم و تربیت اور سیر و سیاحت کے متعلق مختلف بیانات پائے جاتے ہیں۔ اِن اختلافات سے ہمیں بحث نہیں[1]۔

گلشنِ گفتار کے علاوہ کسی اور تذکرے میں 'ولی' کے برہان پور آنے کا ذکر نہیں ہے۔ 'کلیّاتِ ولی' کے فاضل مُرتّب احسن مارہروی نے بھی ولی کے سفر و قیام کے متعلق مستند شہادتوں کی عدم موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ ولی کے دیوان میں داخلی طور پر کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ ولی نے برہان پور میں قیام کیا؟

لہٰذا برہان پور میں ولی کے قیام کے متعلق مستند شہادتوں کی عدم موجودگی میں حقیقتِ حال سے چہرے کی نقاب کشائی ایک مشکل مرحلہ بن گئی ہے۔ 'سلکِ گہر'[2] کے فاضل مقدمہ نویس اور قابل مورّخ کوثر چاندپوری صاحب نے لکھا ہے، کہ

"اُردو زبان کے اوّلین شاعر ولی دکنی[3] سعد اللہ گلشن کے مرید اور شاگرد تھے، اور اس نسبت سے عرصے تک اُن کا قیام برہان پور میں رہا۔"

---

[1] استاد محترم ڈاکٹر ظہیر الدین صاحب مدنی نے (ولی گجراتی) میں اور قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی نے ولی ایک تصحیح و استدراک (منصف علی گڑھ) میں مستند معلومات پیش کی ہیں۔

[2] سلکِ گہر۔ شعرائے برہان پور کا تذکرہ۔ مؤلّفہ جاوید انصاری برہان پوری۔

[3] ولی گجراتی ہیں۔ ولی کے گجراتی الاصل ہونے کے متعلق مستند و مدلّل شواہد موجود ہیں۔

صاحب "جامِ جہاں نما" کو ولی کے قیامِ برہان پور کا سبب سعد اللہ گلشن کی مریدی اور شاگردی کے آئینے میں نظر آیا۔ راقم السطور اُن کی رائے سے بصد ادب اختلاف کی جرأت کرتا ہے۔

ولی کے قیام برہان پور کے متعلق ذیل کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ ولی برہان پور کب اور کیوں آئے؟

۲۔ ولی کا قیام برہان پور میں کتنے عرصے تک رہا؟

۳۔ کیا ولی نے شاہ گلشن کی وجہ سے یہاں قیام کیا؟

۴۔ شاہ گلشن سے ولی کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟

اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے قاضی اختر صاحب جوناگڈھی نے اپنے کرم نامے میں تحریر فرمایا ہے۔

"ولی کے خاندان کے بزرگ ولی سے تقریباً سو سال پہلے احمد آباد سے برہان پور اور بیجاپور جا کر وہاں سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ حضرت شاہ وجیہ الدین کے برادرِ حقیقی برہان پور میں مقیم تھے اور انھوں نے وہیں وفات پائی۔

خود حضرت شاہ وجیہ الدین کے فرزندوں میں سے بعض نے آپ کی عینِ حیات میں سلاطینِ فاروقی کے عہد میں برہان پور اور بعض نے خاندیش میں سکونت اختیار کی تھی۔

خود ولی کے رشتہ دار چچا زاد بھائیوں کا خاندیش اور برہان پور میں بود و باش رکھنا پایا جاتا ہے۔ بلکہ بعض کی شادیاں بھی سلاطینِ فاروقی کے خاندان میں ہوئیں۔

ولی کے استاد سعد اللہ گلشن بھی گجراتی الاصل تھے۔ اُن کے اجداد میں سے کوئی بزرگ[1] سلاطینِ گجرات کے عہد میں وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔

شاہ صاحب کا آبائی وطن گجرات تھا۔ اس لئے وہ بھی احمد آباد میں رہا کرتے تھے۔ برہان پور میں بھی احمد آباد میں رہا کرتے تھے — برہان پور میں بھی اُن کا قیام رہا ہے" (ریاض الشعرا قلمی ص۲۰)

غالباً احمد آباد اور برہان پور کے زمانۂ قیام میں ولی کے اُن سے تعلقات قائم ہوئے ہوں گے"

تحریرِ بالا کی روشنی میں ولی کے قیامِ برہان پور کے زمانے کا تعین مشکل ہے۔ وہاں وہ کب آئے اور کتنے عرصے تک رہے؟ یہ بتانا مشکل ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ ولی کا قیام برہان پور میں زیادہ تر اپنے اعزّا کی وجہ سے تھا۔

غالباً برہان پور میں ولی کی ملاقات ناصر علی سرہندی سے ہوئی تھی، اور وہیں ولی نے اُس کے متعلق یہ شعر لکھا تھا۔

اُچھل کر گر پڑے جوں مصرعِ برق
اگر مطلع لکھوں ناصر علی کوں

اور معز فخر اللہ کرنے اس کا یہ جواب دیا تھا۔

باعجاز سخن گر آز چلے وہ
ولی ہرگز نہ پہونچے گا علی کوں

لیکن مولانا آزاد صاحب کا بیان ہے کہ یہ شعر عزیز دکنی کا ہے، اور اس کے دیوان میں موجود ہے۔ غالباً اُس نے ناصر علی کی طرف سے یہ جواب دیا جو ناصر علی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

ولی کے جواب میں فضل خان سرخوش نے ایک رباعی لکھی، جو ناصر علی کی تعریف میں ہے۔ ایک مصرعہ ولی کے شعر کا جواب ہے۔

در ملکِ سخن بود جہانگیر علی
در مشربِ دل ولی علی پیر علی
با شعر علی نمی رسد شعرِ ولی
زاں ساکہ غلط نمی رسد تیرِ علی

عزیز دکنی کا شعر رباعی کے مصرعۂ سوم کا ترجمہ ہے۔

شاہ گلشن سے ولی کی پہلی ملاقات کے زمانہ اور مقام کے متعلق بھی تمام تذکرے خاموش ہیں۔ سعد اللہ گلشن ولی سے پہلے دہلی آ چکے تھے، اور اُن کا فضلا میں شمار ہونے لگا تھا۔ دہلی آنے سے قبل وہ بائیس سال تک احمد آباد۔ اورنگ آباد اور برہان پور کی سیاحت کرتے رہے۔ قرینِ قیاس ہے کہ احمد آباد میں سعد اللہ گلشن سے ولی کی ضرور ملاقات ہوئی ہوگی۔

---

[1] شاہ گلشن کے جد بزرگ داد اسلام خان، گجرات میں وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔ (نور المعرفت ص۲)

احمد آباد کے ایک بزرگ زادے سیّد ابوالمعالی سے ولی کی دوستی غیر معمولی محبت اور شیفتگی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اُن کے ساتھ ولی نے ۴۴ جلوس عالمگیری (۱۱۱۲ھ) میں دہلی کا سفر کیا، اور یہاں سعد اللہ گلشن سے اُن کی ملاقات ہوئی، اور یہیں آپ نے ولی کو ساد اور سلیس شعر لکھنے کی ہدایت کی۔

قایم چاندپوری اور میر صاحب کا بیان ہے کہ شاہ صاحب ہی نے ولی کو ریختہ گوئی کی ترغیب دی۔

" ایں ہمہ مضامینِ فارسی کہ بیکار افتادہ اند، در ریختۂ خود بکار ببر۔ از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت " (نکات الشعراء)

میر حسن، علی ابراہیم اور قدرت اللہ خاں نے اپنے تذکروں میں لکھا ہے کہ ان سے استفادہ کیا۔ فائق نے رسالہ نور المعرفت صفحہ ۴۰ کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ شاہ صاحب کے شاگرد تھے۔

بقول صاحبِ آبِ حیات، ولی نے دیوان کی ترتیب فارسی کے طور پر یقیناً اُن کے اشارے سے کی۔

ایک جگہ مصحفی نے اپنے تذکرے میں شاہ حاتم کی زبانی یہ بیان کیا ہے کہ

" روزے پیشِ فقیر نقل می کرد کہ در سنِ دوئم فردوس آرامگاہ دیوانِ ولی در شاہ جہاں آباد آمدہ و اشعار بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ "

بعض لوگوں نے غلط فہمی سے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ ولی نے دوبارہ محمد شاہ کے عہد میں دہلی کا سفر کیا، اور وہ اپنے خیال کی تائید میں یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

اس گدا کا دل لیا دلّی نے چھین
جا کہے کوئی محمد شاہ سوں

گلشنِ گفتار و چمنستانِ شعراء میں یہ شعر 'مضمون' نامی شاعر کا ہے۔

لہٰذا دہلی میں شاہ گلشن اور ولی کی ملاقات کے زمانے کا تعین ہو جاتا ہے۔ مگر یہ بتانا مشکل ہے کہ ولی کی ملاقات احمد آباد اور برہان پور میں شاہ گلشن سے کب ہوئی؟

قاضی اختر صاحب کا خیال ہے کہ ناصر علی کے قیام برہان پور کا ذکر ریاض الشعراء میں ہے، اور ممکن ہے کہ اُس زمانے میں شاہ صاحب اور ولی بھی وہاں قیام پذیر ہوں گے۔

نوٹ :- راقم السطور کو اپنی بے بضاعتی، علمی تہی مائگی اور مضمون کے تشنۂ بحث ہونے کا احساس ہے۔ یہ حقیر کوشش ایک استفسار ہے۔ امید ہے کہ ولی دوست اور ولی پرست حضرات اس مسئلے پر روشنی ڈالیں گے۔

بھاکڑا ننگل ہائیڈرو الیکٹرک پروجیکٹ

اس پروجیکٹ کا فوری اور مستقل مقصد پنجاب، پیپسو، راجستھان، دہلی اور ہماچل پردیش میں بجلی کی ضروریات پورا کرنا ہے۔

گنگووال کا بجلی گھر چالو ہونے سے چوبیس ہزار کلوواٹ بجلی پیدا ہوا ہوگی اور اگلے برس تک جب کہ پاور ہاؤس بھی چالو ہو جائے گا۔ پیداوار ستر ہزار کلوواٹ ہو جائے گی۔ بجلی کی سپلائی کے لئے مستقل لائنیں تیار کر دی گئی ہیں۔ جوں جوں بجلی کی کھپت بڑھے گی پیداوار ابھی بڑھتی چلی جائے گی۔ ننگل بند پر ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ بجلی کی پیداوار کو ایک لاکھ بیس ہزار کلوواٹ تک بڑھایا جا سکے گا۔ لیکن جب بھاکڑا ننگل بجلی گھر مکمل ہو جائے گا تو دو نئے بجلی گھر اس بند پر بنائے جائیں گے جن سے مجموعی طور پر ایک لاکھ چھیاسی ہزار کلوواٹ بجلی پیدا ہوگی۔

حکومت کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ پنجاب اور نواحی علاقوں کے دور دراز گوشوں تک بجلی مہیا کر دی جائے۔ پنج سالہ منصوبے کی مدت کے دوران میں بجلی کی پیداوار میں ہر سال اضافہ ہوتا چلا جائے گا، اور دوسرے پنج سالہ منصوبے کے عرصے کے ختم ہونے تک یعنی ۶۲ - ۱۹۶۳ء میں ان علاقوں میں صنعتی کاموں پر بجلی کی کھپت دو لاکھ اسی ہزار کلوواٹ تک پہنچ جائے گی۔ (تصاویر ۲۵ تا ۲۸ صفحات پر ملاحظہ فرمائیں)

بھارت اور ایران کا باہمی رشتہ

بھارت اور ایران کا باہمی تعلق زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے۔ مسلّمہ طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں ملکوں کے تعلقات بھارت کی تاریخ میں آریوں کے عہد سے قبل کے زمانے سے چلے آتے ہیں۔ گذشتہ کچھ برسوں میں آثارِ قدیمہ کی کھوج کرنے والی کئی مہموں نے جو دریافتیں کی ہیں، ان کے نتیجے کے طور پر "بھارتی ایرانی" الفاظ کو نئے اور مخصوص معنی حاصل ہو گئے ہیں۔ ایرانی مؤرخوں نے اپنے ملک کی قدیم تاریخ کی کھوج کے دوران میں یہ دریافت کیا ہے کہ ان کی تہذیب کے ہیئت سے خد و خال ایک طرف وادیٔ سندھ کی تہذیب سے اور دوسری طرف عراقی سمیریا تہذیب سے قریبی رشتہ رکھتے ہیں۔

رگ وید سے قبل کے زمانے سے لے کر دونوں ملکوں کے عوام کے مابین مسلسل اور غیر متناہی تعلق چلا آیا ہے۔ آریوں کے بعد یونانی بھی ایران کے راستے بھارت میں آئے۔ بدھ مت کے زمانۂ عروج میں بھارت میں وادیٔ گنگا کے میدانوں سے ہر طبقے کے لوگوں کی اتر پچھم اور اتر پورب کے ملکوں کی جانب نمایاں نقل و حرکت جاری رہی۔ ایران کے راستے بھارتی ریشم کی تجارت نے پچھمی ملکوں میں جو فروغ حاصل کیا اس سے نہ صرف تجارتی بلکہ آرٹ اور کلچر کے تعلقات بھی زیادہ گہرے ہو گئے۔ اس کے بعد مغلوں کے زمانے میں دونوں ملکوں کے لوگوں میں قریبی رشتہ قایم ہو گیا بلکہ بھارتی تاریخ کے برطانوی دور میں بھی سیاسی اور دیگر وجوہ کے زیرِ اثر ایران کے ساتھ باہمی دلچسپی بنی رہی۔

باہمی اثرات

بھارت اور ایران میں علم و ادب کی جو دستاویزات اور تصانیف اور آرٹ کی جو مختلف شکلیں پائی گئی ہیں، وہ اس بارے میں کافی روشنی بہم پہنچاتی ہیں کہ دونوں ملکوں کے علما، دستکاروں اور عام لوگوں نے ایک دوسرے پر بہت گہرے اثرات ڈالے۔ ایک بھارتی تاریخ داں کے لئے اور خاص کر جسے مغل عہد کی تاریخ سے دلچسپی ہو، یہ لازمی ہے کہ اسے فارسی زبان میں دسترس حاصل ہو۔ اسی طرح ایرانی مؤرخوں کے لئے اپنے ملک کی دورِ قدیم کی تاریخ کو سمجھنے کی غرض سے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ سنسکرت اور پراکرت جانتے ہوں۔ بھارت کے لوگوں کو یہ جان کر فخر و مسرت حاصل ہوگی کہ تہران یونیورسٹی میں لسانیات کے ماہرین کا ایک گروپ پروفیسر پور داؤد کی زیرِ رہنمائی ویدوں اور اوستا کے متن کے بارے میں کھوج کا کام کر رہا ہے۔ اس کام میں وہ سنسکرت کے مشہور عالم ڈاکٹر کنہان راجا کے تعاون اور رہنمائی سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔

پارسیوں کا رشتہ

پارسی لوگ دراصل ایران سے ہندوستان میں آئے تھے۔ بعد میں اُنھوں نے یہاں جائے پناہ حاصل کر کے سکونت اختیار کر لی۔ دونوں ملکوں کی تاریخ اور تہذیب کے مابین پارسی ایک نہایت اور مفید کڑی کا کام دیتے ہیں۔ نہ صرف اِکّا دُکّا الفاظ اور جملے بلکہ ہندوؤں کے ویدوں اور پارسیوں کی "اوستا" کے پورے کے پورے بند اس امر کی واضح شہادت دیتے ہیں کہ سن عیسوی کے آغاز سے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس قبل کے قدیم زمانے سے بھی پہلے جب ہندو اور ایرانی ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور دونوں نے اپنی اپنی علیحدہ حیثیت اختیار کر لی تھی، دونوں کے آبا و اجداد کے مابین گہرے تعلقات موجود تھے۔ فارسی الفاظ اور جملوں کے ماخذ و مخارج اور اُن کی اہمیت کی تشریح کرنے کی غرض سے فرہنگ اور لغت مرتب کرنے کے لئے ایران میں قابلِ قدر کام ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں بھارت

اور ایران کی قدیم سنسکرت کتابوں کا معائنہ کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ بعض الفاظ وغیرہ جو عربی اور اسلامی معدنوں سے ماخوذ ہیں، اُن کے موجودہ مفہوم پر نظرثانی کی جائے۔ اس کام کی تکمیل دونوں ملکوں کے کلچر کو بہتر طریق پر سمجھنے میں زبردست معاون ہوگی۔

اُردو زبان

اُردو زبان صاف طور پر فارسی اور ہندی زبانوں کے ملاپ کی یاد دلاتی ہے۔ اس کے ماخذ اور ترقی کا مطالعہ نہ صرف فارسی اور ہندی الفاظ بلکہ دونوں ملکوں کے عوام کے فکر و تخیل کے باہمی ارتباط کا مظہر ہے۔ اس کے علاوہ یہ مطالعہ بھارتی لوگوں کے لئے فردوسی، سعدی، حافظ اور رومی جیسے ایرانی شعرا کے بلند پایہ کلام کو سمجھنے کے لئے ایک نہایت مفید ذریعہ بنتا ہے۔

بھارت اور ایران پر البیرونی کا احسان

دونوں ملکوں کے مورخ ابوریحان البیرونی کے بیحد ممنون ہیں، اس کی تصانیف "قدیم اقوام کا تاریخی شجرہ" اور "بھارت" دونوں ہی بھارتی، اسلامی اور یونانی علوم اور کلچروں سے متعلق بیش قیمت معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ البیرونی نے تحصیلِ علم کی خاطر کئی مقامات کی سیاحت کی تھی، اپنے سفر کے دوران میں وہ علاوہ دیگر مقامات کے بنارس اور کشمیر بھی گیا تھا، جہاں اسے اہم سنسکرت کتب کے مطالعے کرنے کا بہت کافی موقعہ حاصل ہوا۔ چونکہ وہ علم نجوم میں دلچسپی رکھتا تھا اور سلطان محمود کے دربار میں جیوتشی کی خدمات بھی سرانجام دیتا رہا۔ اس لئے البیرونی نے "برہم سدھانتا" اور اسی قسم کی دیگر نہایت مشکل اور پیچیدہ سنسکرت کتب کا گہرا مطالعہ کیا، اور ان میں دسترس حاصل کی۔

دربارِ اکبری

اکبر کے عہد میں مہابھارت اور رامائن جیسی رزمیہ کتب کے علاوہ علم ریاضی سے متعلق بھاسکر آچاریہ کے رسالے "لیلاوتی" جیسی سنسکرت کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ چودھویں صدی میں فارسی تصنیف "طوطی نامہ" نے "شک سپتتی" (طوطے کی ستر کہانیاں) اور "کتھا سرت ساگر" (کہانیوں کا سمندر) جیسی سنسکرت تصانیف سے دنیا کو روشناس کرایا۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جو اس حقیقت کی مظہر ہوں گی کہ بھارت اور ایران کے درمیان وسیع علمی اور ادبی تعلقات برابر قایم رہے۔ یہ تعلقات صرف شعر و سخن اور ادبی کتب ہی تک محدود نہ رہے بلکہ ان کا دائرہ فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر تک پھیلا ہوا ہے۔

ایرانی اخبار نویسوں کے تاثرات

کچھ عرصہ پہلے ایرانی اخبار نویسوں کا ایک وفد بھارت آیا تھا۔ اس وفد کے لیڈر نے اس حقیقت پر اظہارِ مسرت کیا تھا کہ بھارت کے لوگ فارسی کے مطالعے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ "ہمارا ادب بھارتی کلچر کے ساتھ گھل مل گیا ہے، اور اس کی مثالیں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ لائبریریوں، یونیورسٹیوں، محلات، مسجدوں، مندروں اور عمارتوں میں ہمیں فارسی علم و ادب اور آرٹ کا حسن جلوہ نما نظر آتا ہے۔"

تجدیدِ تعلقات

حصولِ آزادی کے بعد بھارت کے لوگوں میں قدرتی طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی رہی ہے کہ ایران کے ساتھ ثقافتی تعلقات کی تجدید کی جائے اور ان کو بڑھایا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے فارسی ادب کے بارے میں مذاکرات کی محفلیں منعقد کی گئیں جن میں بھارتی اور ایرانی دونوں شامل ہوئے۔ بہت عرصہ نہیں گذرا جب بھارت نے فردوسی اور البیرونی دونوں کی برسی منائی تھی۔ دونوں ملکوں کی تہذیب و ثقافت کے علم کی توسیع اور استواری کے لئے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز (ثقافتی تعلقات کی بھارتی کونسل) قایم کی گئی ہے۔ بھارت نے دسویں صدی عیسوی کے عظیم المرتبت فارسی سائنسدان بوعلی سینا کی برسی منانے میں بھی سرگرمی سے شمولیت کی۔

گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی رفتارِ ترقی

حکومت ہند کی طرف سے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے کہ گھریلو دستکاریوں اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی اور فروغ حاصل ہو۔ چنانچہ زیر نظر سال میں حکومت ہند کی طرف سے اس مقصد کے لئے دس کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی تھی جس میں سے اب تک آٹھ کروڑ روپیہ صرف ہو چکا ہے۔ جب کہ ۵۰-۱۹۴۹ء سے ۵۳-۱۹۵۲ء تک چار سالوں میں صرف ۵۰ لاکھ روپیہ بطور گرانٹ و قرضہ صرف کیا گیا تھا۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں اس مد میں ۵ کروڑ ۶۶ لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا۔

ہمارے ملک میں سرمایے کی کمی ہے اور بہت سے افراد ایسے ہیں جنھیں سارا سال کام نہیں ملتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ پیداوار اور روزگار میں اضافے کے لئے گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی پر توجہ کی جائے۔ یہ مقصد اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ پیداوار کی تکنیک اور انتظامیہ امور کے علاوہ بجلی کا استعمال اور قرضہ جات کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ اگر یہ صنعتیں امداد باہمی کے اصولوں پر منظم کی جائیں تو جدید ترین سامان خریدنے اور چالو سرمایہ فراہم کرنے کے متعلق عوام کو بہت سی سہولتیں میسر آ سکتی ہیں۔

مرکزی حکومت کی طرف سے مالی امداد ریاستی حکومتوں کی معرفت دی جاتی ہے۔ البتہ ان کے امداد و رہنمائی کے لئے حکومت ہند کی طرف سے خاص خاص صنعتوں کے بورڈ قائم کئے گئے ہیں جن میں سے آل انڈیا کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز بورڈ۔ آل انڈیا ہینڈ لوم بورڈ۔ سنٹرل سلک بورڈ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لئے ٹیکنالوجی کے ریجنل انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کئے جا رہے ہیں

امداد میں اضافہ

یہ امداد زیادہ پرانی دیہاتی صنعتوں مثلاً کھادی وغیرہ کو دی جاتی ہے جدید ساز و سامان کے استعمال کو مقبول بنانے کے لئے

کھادی کی فروخت پر تین آنہ فی روپیہ کے حساب سے سرکاری امداد دی جاتی ہے۔ جدید ساز و سامان کے استعمال کو مقبول بنانے کے لئے آل انڈیا ویلیج انڈسٹریز بورڈ کی طرف سے مراکز قائم کئے جا رہے ہیں۔ ۱۹۵۳ء سے اب تک کھادی کی صنعت کو تقریباً ۵ کروڑ روپے کی مالی امداد دی جا چکی ہے جبکہ دوسری دیہاتی صنعتوں کو صرف نوّے لاکھ روپے کی امداد دی گئی۔

گھریلو صنعتوں میں سے دستی کرگھوں کی صنعت ہماری سب سے بڑی صنعت ہے اور حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ اس صنعت کو امداد باہمی کے اصولوں پر منظم کیا جائے چنانچہ گزشتہ دو سالوں میں حصص اور چالو سرمایے کے طور پر ایسے اداروں کو ڈھائی کروڑ روپے سے زیادہ کے قرضہ جات دئے گئے ہیں یہ ادارے اس بات کی ذمہ داری لیتے ہیں کہ وہ جولاہوں کو نہ صرف مناسب نرخوں پر دھاگا تقسیم کریں گے بلکہ پیداوار کی فروخت کے انتظامات بھی کریں گے۔ جولاہوں کو دھاگا تقسیم کرنے کے لئے گنٹاکل میں دو کارخانے قائم کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اڑیسہ اور مدراس میں بھی دو یونٹوں کے قیام کی منظوری دی گئی ہے نیز رنگ سازی اور جدید ترین مشینوں کے حصول کے سلسلے میں بھی امداد دی جاتی ہے۔ پیداوار کی فروخت کے لئے ڈپو اور سفری دوکانیں کھولی گئی ہیں۔ مزید برآں برآمدی تجارت کو فروغ دینے کے پیش نظر ایکسپورٹ مارکیٹنگ آرگنائزیشن قائم کی گئی ہے۔ چنانچہ عدن، کولمبو اور رنگون میں ایمپوریم قائم کئے گئے ہیں۔

کھادی کی صنعت کے علاوہ لوہار کے کام۔ اوزار سازی۔ بائیسکلوں کے پرزے، بڑھئی کے کام، لکڑی اور چمڑے کے کام۔ ظروف سازی وغیرہ کی صنعتوں کی ترقی پر بھی پوری پوری توجہ کی جا رہی ہے۔ اور اس مقصد کے لئے تربیتی مرکز قائم کئے گئے ہیں

صنعتوں کے متعلق امداد باہمی کے اداروں کا قیام۔

گھریلو صنعتوں کی ترقی کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ امداد باہمی کے اصول

پر ایسے کارخانے قائم کئے جا رہے ہیں جن کے کارکن نہ صرف اس ادارے کے ممبر ہوتے ہیں بلکہ پروجیکٹوں میں حصہ بھی لیتے ہیں۔ ہینڈ لوم صنعت کے ایسے دو ادارے حال ہی میں مدراس کے لئے منظور کئے گئے ہیں اور توقع ہے کہ دوسری صنعتوں کے بھی ایسے ادارے قائم کئے جائیں گے۔ فورڈ فاؤنڈیشن ٹیم کی سفارشات کے مطابق فرید آباد، بمبئی، کلکتہ اور مدراس کے مقامات پر ٹیکنالوجی کے چار ریجنل انسٹی ٹیوٹ قائم کئے گئے ہیں جہاں چھوٹے صنعت کاروں کو کاروبار، مالیات، پیداوار کی فروخت وغیرہ سے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر ہر ایک انسٹی ٹیوٹ میں ایک مارکیٹنگ افسر اور ایک الیکٹریکل انجینیر مقرر کیا جائے گا۔ ان انسٹی ٹیوٹوں کے افسران مذکور آپس میں رابطہ قائم رکھیں گے۔ اس کے علاوہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ایک کارپوریشن بھی قائم کی جائے گی جو بڑی صنعتوں اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے درمیان توازن قائم رکھے گی۔ اس کے علاوہ قرضہ جات کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ اور غیر ممالک میں دستکاریوں اور ہاتھ سے بنی ہوئی دوسری اشیا کی فروخت کے لئے نیویارک میں ایک تجارتی مرکز قائم کیا جائے گا۔

سمندر میں روشنی کے میناروں کی تعمیر

ہندوستان ایک عظیم ملک ہے اور اس کا ساحل چار ہزار چار سو چالیس میل لمبا ہے۔ حصول آزادی سے پہلے بھی ساحلی جہاز رانی کوئی کم نہ تھی لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد تجارت میں ترقی کی وجہ سے اس میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ سمندر میں جا بجا خطرناک چٹانیں پوشیدہ ہیں اس لئے جہازوں کی راہنمائی کے لئے لازمی طور پر روشنی کے مینار نصب کرنے پڑتے ہیں اور جہازوں کو خطرے سے بر وقت آگاہ کرنے کے لئے اس وقت ایک ہزار کے قریب عملہ جن میں انجینیر ٹیکنیکل ماہرین اور دیگر افراد شامل ہیں۔ یہ اہم فرائض انجام دے رہا ہے۔ اس طویل ساحل کے ساتھ ایک سو بیاسٹھ روشنی کے میناروں کے علاوہ متعدد قسم کے پیراک پیپے اور نو روشنی کے جہاز بھی ملاحوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔

اس خطرناک مگر اہم کام کی نگرانی کے لئے مرکزی حکومت کی طرف سے سنٹرل لائٹ ہاؤس کا محکمہ قائم ہے مگر بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ یہ محکمہ نہ صرف خود مکتفی ہے بلکہ اپنی آمدنی میں سے بہت سا روپیہ سرمایہ پروجیکٹوں اور ترقیاتی اسکیموں پر صرف کرتا ہے۔ یکم اپریل ۱۹۵۴ء کو اس محکمہ کے ریزرو فنڈ میں چھیالیس لاکھ روپیہ جمع تھا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس محکمہ کی طرف سے جہازوں میں تین آنے فی ٹن کے حساب سے محصول وصول کیا جاتا ہے آجکل ان روشنی کے میناروں کو جدید ترین ساز و سامان مثلاً صوتی سگنل، ریڈیو بیکن اور ان گی وغیرہ فراہم کیا جا رہا ہے میں ایک باضابطہ اور جامع پروگرام مرتب کیا گیا ہے اور اس کی تکمیل پر ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ صرف کیا جائے گا۔ دوسرے پانچ سالہ پلان میں روشنی کے میناروں کے لئے پانچ کروڑ روپے کی رقم منظور کی گئی ہے۔

اس وقت تک کوٹل نقاشم چینکا، جزیرہ راس اور دسکا ٹپ نام کے قریب ڈالفن نوز کے مقامات پر مینار پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔ بیس میناروں کو جدید ترین سامان فراہم کیا گیا ہے اور بارہ زیر تعمیر ہیں۔ ان کے علاوہ دور دراز مینار۔ دن تک رسد و سامان پہنچانے اور خطرے میں گھرے ہوئے لوگوں کو بچانے کے لئے دو لائف بوٹ بھی فراہم کی گئی ہیں جن کی تعداد میں جلد اضافہ ہونے والا ہے۔ بندرگاہوں میں راڈر کنٹرول کے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ بندرگاہ اوکھا کے قریب سمندر کے اندر ایک چٹان پر مینار تعمیر کرنے کی تجویز زیر غور ہے۔

میناروں میں زندگی بسر کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ عملے کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تنہائی میں زندگی گزارنا کوئی آسان کام نہیں لیکن حکومت ہند کی طرف سے ان کے لئے تفریح کا سامان مہیا کیا جا رہا ہے۔ ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے مالی امداد اور وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔

رفتارِ زمانہ

بھارت کے پردھان منتری کا ممالکِ غیر کا دورہ

بھارت کے پردھان منتری شری جواہرلال نہرو سالِ رواں میں برطانیہ، فرانس، مصر، رُوس، انڈونیشیا اور ایران کا دورہ کریں گے۔ اس امر کا امکان ہے کہ شری نہرو ماہ جون میں روس جائیں گے چونکہ ایران نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ شری نہرو ماسکو جاتے وقت یا وہاں سے واپس آتے وقت چند دن تہران میں ضرور قیام کریں — تہران ایران اور روس کے درمیان راستے میں پڑتا ہے۔ تہران میں قیام کے دوران میں شری نہرو کو ایران کے سیاسی لیڈروں سے براہِ راست بات چیت کا موقع ملے گا۔ برطانیہ میں کامن ویلتھ ممالک کی کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد پردھان منتری کا مصر جانے کا بھی پروگرام ہے۔ دراصل دیکھا جائے تو اس وقت دُنیا بھر کی نگاہیں شری نہرو پر مرکوز ہیں، اور دُنیا محسوس کرتی ہے کہ اس وقت اگر کوئی فرد امن کے راستے پر گامزن رہ کر تباہی اور بربادی کو روکنے میں اپنی تمام تر کوششیں صرف کر رہا ہے تو وہ بھارت کے پردھان منتری ہی ہیں۔

بعض بنک اور بیمہ کمپنیوں کو قومی ملکیت بنانے کی سفارش

بھارت کے وزیر خزانہ شری چنتامن دیش مُکھ نے مدراس میں اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ امپیریل بنک کو قومیانے کے متعلق بات چیت ہو رہی ہے۔ ریزرو بنک نے اس امر کی سفارش بھی کی ہے کہ جن بنکوں میں مختلف پردیشوں کے حصہ جات ہیں اُنھیں قومی بنا دیا جائے، علاوہ ازیں بعض بیمہ کمپنیوں کو بھی قومی بنانے کی تجویز پر غور کیا جا رہا ہے۔

وزیر خزانہ کشمیر کا ایک جواب

ریاست جموں وکشمیر کے وزیر خزانہ شری گردھاری لال ڈوگرہ نے معترضین کو جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ بھارت کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کا الحاق نامکمل ہے۔ جب ریاست کی آئین ساز اسمبلی نے اس حقیقت پر اپنی منظوری کی نہ ٹوٹنے والی مُہر ثبت کر دی ہے، اور بھارت سرکار اور جنتا نے اُسے عملی جامہ پہنا دیا ہے تو اس کو نامکمل کہنے والے صریحاً غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں، اب تو پوزیشن یہ ہے کہ بھارت کے آئین کا ریاست پر اطلاق ہو گیا ہے۔ ریاست کی سب سے بڑی عدالت بھارت کی سپریم کورٹ ہے، اور معاہدہ دہلی پورے طور سے عمل میں آ گیا ہے۔ اس لئے اب یہ کہنا سو فی صدی درست ہے کہ ریاست جموں وکشمیر ہند یونین کا ایک جزو ہے۔

صدرِ یوگوسلاویہ مارشل ٹیٹو کا بیان

یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو نے رنگون کے ایک اخبار نیوٹائمز آف برما کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ پُرامن پڑوسیوں جیسی زندگی بسر کرنے کا اصول بین الاقوامی جھگڑوں کو حل کرنے کا ایک جدید طریقہ ہے، اور یہی طریقہ ہے جو مسلح طاقت کے استعمال کو روک سکتا ہے۔

آپ سے سوال کیا گیا کہ کیا امریکہ اور روس میں پُرامن سمجھوتے کا امکان ہے؟ جواب میں مارشل موصوف نے کہا کہ کوئی وجہ نہیں کہ پُرامن پڑوسیوں کی طرح رہن سہن کا اصول امریکہ اور روس کے مابین نہ اپنایا جا سکے۔ آپ نے کہا کہ شری نہرو اور میں نے پُرامن پڑوسیوں جیسی زندگی بسر کرنے کے متعلق جو اصول وضع کیا ہے وہ تمام ممالک پر حاوی ہوتا ہے۔

بھارت کے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے برابر مراعات

بھارت سرکار کے نو آبادکاری کے وزیر شری مہر چند کھنہ نے کلکتے میں پارلیمنٹ کے ممبروں کی کانفرنس میں اعلان کیا کہ نو آبادکاری کے سلسلے میں اُن مسلمانوں کو بھی وہی مراعات دی جائیں گی جو غیر مسلموں کو حاصل ہیں، جو ملک کی تقسیم کے وقت اپنے گھر بار چھوڑ گئے تھے لیکن بھارت سے باہر نہیں گئے۔ شری کھنہ نے بتایا کہ قریباً اڑھائی ہزار

گئیں کو بے دخل کیا گیا ہے جنھوں نے مسلمانوں کی جائدادوں پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ یہ جائدادیں مسلمانوں کو واپس کر دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی مسلمانوں کو دوکانوں کی تعمیر کے لئے قرضے بھی دئے گئے ہیں۔

تحریک بھودان کی کامیابی

آچاریہ ونوبا بھاوے کی بھودان تحریک کی کامیابی اس امر سے ظاہر ہے کہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۵۴ء تک ان کو ۲۷۸۰۷۸ ۲۹ ۵۳۹ ایکڑ بھومی دان میں مل چکی ہے۔ اس میں سے ۱۰۹۹۰۰ ایکڑ زمین کاشتکاروں میں تقسیم کی جا چکی ہے۔ بھودان کی تحریک تبدریج ہر دلعزیز ہوتی جا رہی ہے اور سارا ملک اس کی حمایت پر ہے

بھارت کی متعدد نامور ہستیوں کا سانحۂ ارتحال

ماہ جنوری ۱۹۵۵ء اس لحاظ سے نہایت منحوس رہا کہ ملک کے بہترین سائنسدان، سیاست داں، ادیب اور حکیم ہمیشہ کے لئے ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے۔ ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر بھارت کے بہترین سیاست دان تھے اور اس وقت ملک کے طول و عرض میں سائنسی اداروں کا جو جال بچھا ہوا ہے وہ زیادہ تر سورگیہ ڈاکٹر بھٹناگر کی انتھک کوششوں کا مرہون منت ہے۔ کرنل رگھبیر سنگھ پیپسو کے وزیر اعظم تھے اور ریاست کے پیچیدہ سیاسی مسائل کی گتھی سلجھانے میں وہ بہت کامیاب ثابت ہوئے تھے۔ سر سعد اللہ آسام کے سابق وزیر اعظم تھے اُن کا شمار دیش کے بڑے سیاست دانوں میں ہوتا تھا اور ۱۹۴۷ء کے بعد اُنھوں نے بھارت کی بہترین خدمات انجام دیں۔ شاردا ایکٹ کے مصنف دیجوز شری ہربلاس شاردا بڑے دُور بین سیاست دان اور ریفارمر تھے۔ حال ہی میں آپ کا اجمیر میں انتقال ہو گیا۔ پنڈت کشن پرشاد کول سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ممبر اور انجمن ترقی اردو اتر پردیش کے صدر تھے۔ اردو کے تئیں اُن کی خدمات کبھی بھلائی نہیں جا سکتیں حکیم مخمور لکھنوی ایک فاضل طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ سرزمین بھارت اور پاکستان کے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی وفات حسرت آیات افسانوں میں دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے ایک صدمۂ جانکاہ ہے۔ ہر خاص و عام اُن کے افسانے چٹخارے لے لے کر پڑھتا تھا۔ طنز اور جنسیات میں جو ملکہ منٹو صاحب کو حاصل تھا اس کا مقابلہ بہت کم افسانہ نگار کر سکتے ہیں۔ شری پریم ناتھ پردیسی کشمیر کے مشہور افسانہ نگار تھے اور بحیثیت افسانہ نگار اُنھوں نے ایک بہت بلند مقام حاصل کر لیا تھا۔ ان تمام حضرات کے جُدا ہونے سے ملک میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جسے آسانی سے پُر نہیں کیا جا سکتا۔

ترکی اور عراق کے مجوزہ معاہدے سے حکومت حجاز کی ناراضگی

سعودی عرب نے ترکی اور عراق کے مجوزہ دفاعی معاہدے کی نہایت پُر زور الفاظ میں مذمت کی ہے سرکاری طور پر معلوم ہوا ہے کہ شاہ سعود نے عرب کے صدر دفتر کو مطلع کیا ہے کہ وہ اس معاہدے کی مذمت کرتے ہیں اور اسے عرب ممالک کے لئے بہت مضر تصور کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر عرب ممالک بھی اس معاہدے کی شدید مخالفت کر رہے ہیں۔

بین الاقوامی نگران کمیشن کی کارکردگی پر پنڈت نہرو کا اظہار پسندیدگی

مدراس میں کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے شری نہرو نے بتایا کہ ایشیا اور افریقہ کے ممالک کی کانفرنس ۱۳ر سے لے کر ۲۴ر اپریل تک کے درمیانی عرصے میں انڈونیشیا کے شہر بن ڈنگ میں منعقد ہوگی۔ پردھان منتری نے ہند چین کے متعلق بین الاقوامی نگران کمیشن کی کارکردگی پر بھی پسندیدگی کا اظہار کیا جو ان کی رائے کے مطابق جنیوا کانفرنس کے فیصلوں کے مطابق بہترین خدمات انجام دے رہا ہے۔

کشمیر کے بکروال قبیلے کا حکومت کشمیر پر اعتماد

جموں و کشمیر کے بکروال قبیلے کے تین لاکھ نمایندوں نے رام نگر میں منعقدہ اپنے ایک اجلاس میں بخشی غلام محمد کی حکومت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اجلاس میں ایک ریزولیوشن پاس کیا گیا جس میں اعلان کیا گیا کہ نیشنل کانفرنس ہی ایک ایسی جماعت ہے جو کشمیر کی صحیح نمایندگی کر سکتی ہے۔

نہرو، محمد علی ملاقات

اس امر کا قریب قریب فیصلہ ہو گیا ہے کہ نہرو، محمد علی ملاقات مارچ کے آخری ہفتے میں ہوگی۔ اس سلسلے میں پاکستان نے تجویز کی ہے کہ ہر دو حکومتوں کی سٹیرنگ کمیٹی کی میٹنگ پہلے بلائی جائے جو یہ فیصلہ کرے کہ کن کن معاملات کو وزرائے اعظم کی میٹنگ میں زیر بحث لایا جائے۔ اس ملاقات میں ہند پاک متنازعہ مسائل کے طے ہونے کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔





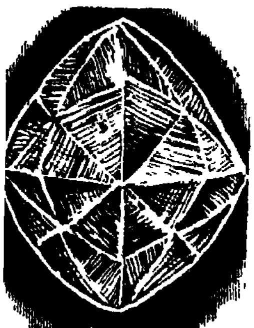


بچوں کا آج کل



جیتا جاگتا ہیرا

حامد اللہ افسر



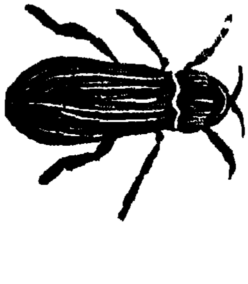
جگ مگ جگ مگ کرتا نکلا   میرے چمن کا تارا رے
پھولوں کا دم بھرتا نکلا   ٹھنڈا اک انگارا رے



(۲)

منّا سا اک دِیا جلایا   چاروں اور اُجیارا رے
جھپ سے پھر وہ دیا بجھایا   چھا گیا پھر اندھیارا رے





(۳)

جگنو آیا جھم جھم کرتا   کتنا پیارا پیارا رے
جیتا جاگتا ہیرا میرا   دُنیا بھر سے نیارا رے

اشرف یوسف

سندری کا کارخانہ

پیارے بچو! آؤ آج تمھیں ایک عجیب و غریب کہانی سنائیں۔ یہ کہانی تمھیں ایک نئی جگہ کی سیر کرائے گی۔ یہ ایک چھوٹے سے قصبے سندری پورہ کی کہانی ہے جو آج ساری دُنیا میں اپنے کارناموں کی وجہ سے مشہور ہے۔ آج اس کی گود میں ایشیا کا ایک سب سے بڑا کارخانہ سانس لے رہا ہے۔

صوبہ بہار کو تو تم جانتے ہی ہو اس میں دھنباد نام کا ایک شہر ہے اس شہر سے سولہ میل کی دُوری پر سندری کا کارخانہ دس مربع میل تک پھیلا ہُوا ہے۔

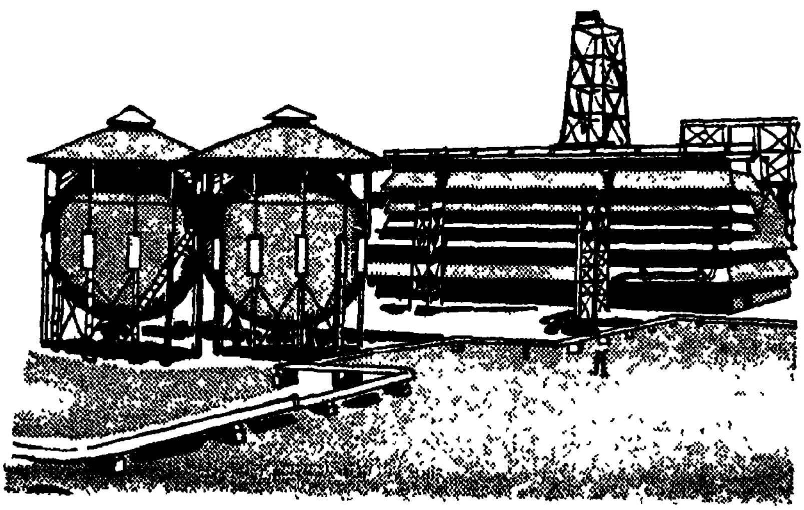
اس کارخانے کے لئے حکومت ہند نے ستّرہ کروڑ روپے لگانے کا پلان بنایا تھا۔ مگر یہ کارخانہ چند دشواریوں کی وجہ سے تیئیس ۲۳ کروڑ روپے میں مکمل ہو سکا۔ تم اسی رقم سے اندازہ لگاؤ کہ یہ کتنا بڑا کارخانہ ہوگا۔

اس کارخانے کا افتتاح ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اگست ۱۹۵۱ء میں کیا تھا۔ ان کے ہمراہ مولانا ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی (مرحوم) بھی تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے وزراء اور جرمن، آسٹریلیا، امریکہ اور چین کے مہمان دوست بھی تھے۔

اگست ۱۹۵۱ء سے اس کا کھاد تیار ہو کر ملک کے ہر حصّہ میں جانے لگا۔

تمھیں معلوم ہے کہ یہ کیوں، کیسے اور کن چیزوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ لو سنو!

کھاد کو تیار کرنے میں Coke, Coal اور Gypsum کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئلہ تو تم سب جانتے ہی ہو۔ اس کا استعمال تو تمھارے گھروں میں بھی ہوتا ہے۔ Gypsum یہ ایک قسم کی مٹی ہوتی ہے۔ سندری سے



جھریا صرف دس میل کی دوری پر واقع ہے۔ اور سندری کے آس پاس دوسری بھی بہت سی کانیں ہیں اس لئے سندری کے لئے کوئلہ اور کوک بآسانی مہیا ہو جاتا ہے۔

تیسرا Gypsum, Raw ہے۔ یہ راجپوتانہ سے آتا ہے۔ یہ ایک قسم کی مٹی ہے جس کا رنگ ہلکا سرمئی ہوتا ہے۔ راجپوتانے میں اس کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے ہوتے ہیں اس کی کھپت اس کارخانے میں تقریباً دو ہزار ٹن روزانہ ہوا کرتی ہے۔ اسے پہلے مشینوں کے ذریعے سے سفوف بنا دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے امونیم ایک ہزار ٹن روزانہ پیدا کیا جاتا ہے۔ جو سیمنٹ کے تیار کرنے میں مدد دیتا ہے۔



تمہیں اگر کبھی اس کارخانے میں جانے کا اتفاق ہو تو وہاں بہت سے شعبے پاؤ گے جہاں مختلف قسم کے اوزاروں کے ذریعے سے کام ہوتا ہے۔ کہیں تمہیں یہ کھاد پانی کی طرح بہتا ہوا ایک حصے سے دوسرے حصے تک نظر آئے گا۔ آگے چل کر یہ مشین کے ذریعے سے سکھا دیا جاتا ہے اور یہ سوکھ کر دانے دار چینی کی طرح ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ سارا کھاد ایک جگہ جا کر خزانے میں جمع ہو جاتا ہے اور پھر وہاں سے خود بخود تھیلے میں بھر جاتا ہے۔ جوں ہی وہ بھر جاتا ہے ایک مشین اوپر سے آتی ہے اس کے ذریعے سے اس کا منھ سل جاتا ہے اس کے بعد اس کا وزن ہوتا ہے۔ صرف دو آدمیوں اور مشین کے سہارے مال گاڑیوں میں بند ہو کر دوسری جگہوں کو بھیجا جاتا ہے۔

ایک دن میں تقریباً بیس ہزار سے تیس ہزار تک تھیلے تیار کئے جاتے ہیں۔

اس کارخانے کی پیداوار سات سو ٹن کھاد روزانہ ہے۔ اس کی پیداوار کو دو انجمن ہائے امداد باہمی کے ذریعے سے فروخت کیا جاتا ہے گذشتہ سال اس کھاد کی قیمت ۳۸۰ روپے فی ٹن تھی۔ چونکہ اس کی پیداوار بہت تیزی سے بڑھائی جا رہی ہے اس لئے اس کی قیمت ۲۸۰ روپے فی ٹن ہو گئی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ مستقبل میں اس کی قیمت اور بھی کم کی جا سکے گی تاکہ ہمارے کسان اسے آسانی سے خرید کر اپنے کھیتوں کی پیداوار بڑھا سکیں۔

اس کارخانے میں پانچ ہزار تین سو مزدور کام کرتے ہیں اور تین غیر ممالک کے ماہرین بھی کام کر رہے ہیں جن میں دو جرمن اور ایک آسٹریلین ہے۔

امریکہ کے کچھ ماہرین کو ہند آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ تاکہ اس کارخانے کا کام اور بھی وسیع کیا جا سکے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ سندری کے کارخانے سے تیار شدہ کھاد ہمارے غلے کی پیداوار میں دس لاکھ ٹن کا اضافہ کر سکے گا جس کی قیمت کم از کم چالیس کروڑ روپے ہوگی۔ اس طرح ہمیں باہر سے غلہ منگوانے کی ضرورت نہ ہوگی۔

سجّاد قادری

دشمن سے دوستی کا پھل

(۱)



ایک جنگل میں کہیں اک چاہ تھا — اِس میں رہتا مینڈکوں کا شاہ تھا
اس کے نوکر اور اس کے تھے امیر — فوج تھی، لشکر تھا، اس کے تھے وزیر
اک رہٹ کے ڈول میں یہ بیٹھ کر — روز آجاتا زمین کی سطح پر
گھوم پھر کر کچھ نہ کچھ کھاتا ہُوا — راجدھانی کو پھر اپنی لوٹتا
ایک دن یہ سیر میں مصروف تھا — راہ میں اک ناگ راجہ مل گیا
پیڑ اک بڑ کا تھا جنگل میں کھڑا — اس کی کھوکر میں وہ رہتا تھا سدا
رفتہ رفتہ دوستی ان میں ہُوئی — خوب گاڑھی دونوں میں چھننے لگی
یعنی وہ اک جان دو قالب ہوئے — الغرض مطلوب اور طالب ہوئے
ایک دن وہ جبکہ نکلا چاہ سے — ناگ نے پُوچھا یہ مینڈک شاہ سے
اے نصیبِ دشمناں کیا ہوگیا — آپ کا چہرہ ہے کچھ اُترا ہُوا
گول گول آنکھیں ہیں اندر کو دھنسی — ہونٹ پر ہیں پپڑیاں سی کچھ جمی
آپ کا چہرہ بہت غمگیں ہے — ہو نہ ہو کچھ واقعہ سنگین ہے
سُن کے یہ سب بولے شاہِ مینڈکاں — پوچھتے کیا ہو ارے مجھ سے میاں
آگ وہ اس وقت ہے دل میں لگی — بجھ سکے گی جو نہ شاید اب کبھی
تم تو ہو اس بات سے واقف بڑے — ہم رعیت کو سمجھتے کتنا چاہتے
کتنی ہم اس پر عنایت کرتے تھے — ہر طرح اس کی حفاظت کرتے تھے
پر کہیں کیا آج کتنی ہے خلش — باغیانہ ہوگئی اس کی روش
کچھ دنوں سے بک رہی ہے بے شعور — اس کے دل میں آگیا شاید فتور



(۲)

ناگ راجہ نے سُنی جب شاہ کی ۔۔۔ ہاتھ رکھ کر سینے پر اک آہ کی

شدّتِ غم سے گیا چہرہ سکڑ ۔۔۔ ناگ راجہ بن گئے جیسے ربڑ

سر اُٹھا کر گفتگو کی اس طرح ۔۔۔ غم میں کوئی بولتا ہے جس طرح

ہے بغاوت شومئی تقدیر سے ۔۔۔ روکئے اس کو کسی تدبیر سے

(۳)

اس بغاوت کو دبانے کے لئے ۔۔۔ دیر تک دونوں رہے کچھ سوچتے

آخر اک صورت سمجھ میں آگئی ۔۔۔ جو بہت سی گتھیاں سلجھا گئی

منھ بنا کر ناگ سے شہ نے کہا ۔۔۔ اس زمینِ خشک پر کیا ہے دھرا

ساتھ میرے چاہ کے اندر چلو ۔۔۔ ایک مینڈک ناشتے کو روز لو

رفتہ رفتہ ایک دن وہ آئے گا ۔۔۔ آپ ہو جائے گا ان کا خاتمہ

ناگ کی سُن کے یہ باچھیں کھل گئیں ۔۔۔ سب مرادیں دل کی جیسے مل گئیں

جُھک کے بولا مینڈکوں کے شاہ سے ۔۔۔ حکم سے باہر نہیں ہیں آپ کے

(۴)

الغرض سورج لگا جب ڈوبنے ۔۔۔ ڈول سے دونوں کنوئیں میں آگئے

کچھ کنوئیں کے پانی سے اوپر ذرا ۔۔۔ پہلے سے اک چھوٹا سا سوراخ تھا

اس کے اندر ناگ کا گھر بن گیا ۔۔۔ اور مزے سے اس میں وہ رہنے لگا

اس طرح جب کہ گئے کچھ دن گذر ۔۔۔ مینڈکوں کی تب لگا لینے خبر

روز اک مینڈک کا کرتا ناشتہ ۔۔۔ پھر خوشی سے جھومتا اور ناچتا

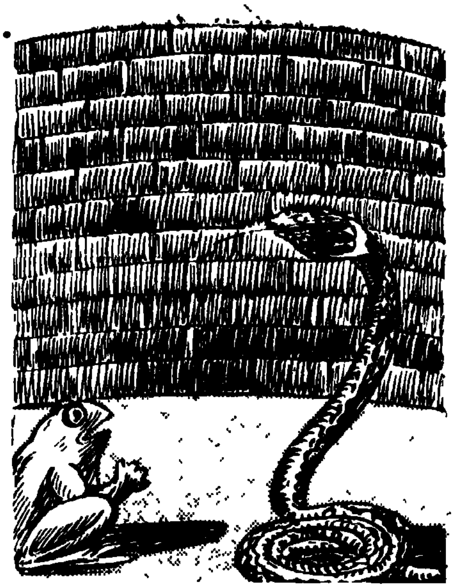
مینڈکوں کا جب صفایا ہو گیا ۔۔۔ اور رہا نہ کچھ برائے ناشتہ

بیٹوں پوتوں کو لیا پھر شاہ کے ۔۔۔ دھیرے دھیرے ختم وہ بھی ہو گئے

ایک دن ایسا بھی آخر آگیا ۔۔۔ تھا نہ کوئی شاہ و بیگم کے سوا

اب پریشانی ہوئی ان کو بڑی ۔۔۔ باری اگلی صبح کو بیگم کی تھی

رات بھر یہ مشورے کرتے رہے ۔۔۔ راستہ لیکن نہ کوئی پا سکے





شاہ سے پھر رو کے بیگم نے کہا — آپ خود لائے ہیں گھر میں یہ بلا
ناگ کنبہ پرجا کو چٹ کر چکا — تاج کو اور تخت کو چٹ کر چکا
اب ہماری موت کے سامان ہیں — ہم بھی تھوڑی دیر کے مہمان ہیں

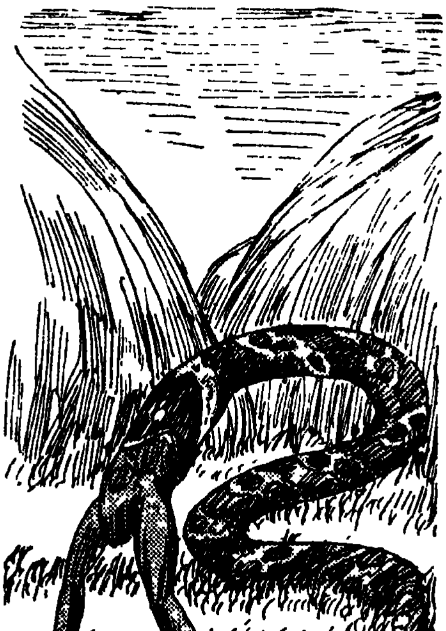
(۵)

بولے شہ بیگم سے گھبراؤ نہیں — تم خدائے پاک پر رکھو یقیں
میں بہر قیمت بچانے کی تمہیں — جان سے دل سے کروں گا کوششیں
صبح ہوتے ہوتے آخر ناگ سے — بچنے کی تدبیر سوچی شاہ نے
ناگ راجہ کی وہ خدمت میں گیا — ہاتھ رکھ کر سینے پر اس سے کہا
آج ہم باہر ٹہلنے جائیں گے — دھرتی پر پرجا سے مل کر آئیں گے
ساتھ بیگم بھی ہمارے جائیں گی — مینڈکوں کو وہ وہاں سمجھائیں گی
تاکہ اندر چاہ کے یہ آ سکیں — ناشتے میں آپ ان کو کھا سکیں
ناگ یہ سن کر کے کچھ ایسا ہنسا — جیسے سب اس کی سمجھ میں آ گیا
بولا تنہا جاؤ شاہِ مینڈکاں — چھوڑ جاؤ اپنی بیگم کو یہاں
مینڈکوں کے شاہ اس پر ہنس دئے — بولے یہ تو آپ بھی ہیں جانتے
کتنا بیگم کو ہے پرجا چاہتی — وہ فدا کرتی ہے ان پر جان بھی
اک اشارہ وہ اگر فرمائیں گی — کام اک جادو کا بس کر جائیں گی
کھنچ کے مینڈک سب یہاں آ جائیں گے — عمر بھر پھر آپ ان کو کھائیں گے

(۶)

شاہ سے جب ناگ یہ سب سن چکا — ڈال کے ماتھے پہ بل کہنے لگا
مینڈکوں سے دھوکے تم نے کھائے ہیں — دکھ انھوں نے اس قدر پہنچائے ہیں
اٹھ گیا ہے آپ پر سے بھی یقیں — جا نہیں سکتے ہو دیکھو اب کہیں
کہہ کے یہ جا پکڑا اس نے شہ کو جھٹ — اور اسی دم کر گیا بس اس کو چٹ
اور بیگم کو ہڑپ پھر کر گیا
دوستی کا پھل یہ دشمن سے ملا





محمود پرویز کاکوی

وُہ باپ تھا

جاڑے کی ایک رات تھی۔ سردی کافی پڑ رہی تھی میں اپنے لحاف میں سویرے ہی سے دبک گیا تھا۔ مگر نیند نہیں آ رہی تھی۔ طبیعت گھبرائی گھبرائی سی تھی۔ آخر کچھ سوچ کر اُٹھا اور سیدھا نانا جان کے کمرے میں جا پہنچا۔ نانا جان لحاف اوڑھے حقہ پی رہے تھے۔ میں جھٹ پلنگ پر چڑھ کر ان کے لحاف میں گھس گیا۔ نانا جان بہت نیک اور بزرگ انسان تھے۔ وُہ مجھے بہت مانتے تھے۔

"نانا جان! آج کوئی کہانی سنائیے!" میں نے ان کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے۔" یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگے۔ پھر بولے۔

"لو سنو! آج تمہیں ایک سچا واقعہ سناتا ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ میں جوان تھا۔ اور ان دنوں نوکری کی غرض سے پٹنے میں میرا قیام تھا۔ تم تو جانتے ہی ہو شہر میں بہت سے دوست بن جاتے ہیں۔ میرے بھی بے شمار دوست تھے مگر احمد سے میری دوستی گہری تھی اور میں کبھی کبھی اس کے گھر بھی چلا جاتا تھا۔

احمد ایک تاجر تھا۔ اور بڑی شان و شوکت سے رہا کرتا تھا۔ بہترین کار، عمدہ فرنیچر، نوکر چاکر! اکیلا دم تھا۔ شادی اب تک نہیں کی تھی۔



اس لئے بڑی آزادی اور بے فکری سے زندگی گزارتا تھا۔

میں جب بھی اس کے گھر جاتا اس کے ایک بوڑھے نوکر پر میری نظر پڑتی جو سائبان میں دروازے کے قریب چھوٹی سی تپائی پر اداس بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے حسرت و یاس ٹپکتی تھی۔ بال بڑے بڑے اور سفید تھے۔ داڑھی گھنی اور دراز تھی۔ کپڑے بالکل میلے اور پُرانے تھے۔ یہ کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ اس کو اس حال میں دیکھ کر مجھے بڑا ترس آتا تھا۔

میں نے بارہا دیکھا کہ احمد اس بوڑھے کو بُری طرح جھڑکتا، بات بات پر ڈانٹتا اور پیٹتا۔ بےچارہ بوڑھا چپ چاپ اس کے ظلم سہتا۔ مجھ سے یہ دیکھا نہ جاتا۔ مگر کچھ کہنے کی ہمّت نہ ہوتی۔ لیکن دل میں سوچتا:۔

" دیکھو تو بھلا۔ اتنا بوڑھا انسان اور اس پہ اتنا ظلم۔ صرف اس لئے کہ چائے میں دو منٹ کی دیر کیوں ہوئی۔ پاس کیوں کھڑا ہے۔ کھانے کو کیوں گھورتا ہے۔"

" محمود!" ناناجان غم ناک آواز میں بولے۔ "جب مجھ سے یہ باتیں برداشت نہ ہوسکیں تو میں نے اس کے یہاں آنا جانا بند کر دیا۔



ایک روز شام کے وقت احمد اپنی بہترین کار پہ آیا۔ اور بڑی شکایتیں کرنے لگا کہ کیوں نہیں آتے؟ میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے اس کی بات کو ٹال دیا۔ چلتے وقت احمد بولا۔

" بھئی! کل رات تو ضرور آنا۔ پارٹی ہے۔ میں نے کئی دوستوں کو مدعو کیا ہے دیکھنا۔ بھولئے نہیں۔ اس کے اصرار پر دعوت قبول کرنا پڑی۔

دوسرے روز شام کے وقت احمد کے گھر پہنچا۔ وہاں دوستوں کی کافی چہل پہل تھی۔ بہت اچھا انتظام تھا۔ آج تمام ملازم صاف ستھرا لباس پہنے تھے۔ مگر وہ بوڑھا تو اُسی لباس میں تھا۔ پھٹا۔ پرانا۔ میلا کچیلا۔ کھانے کا وقت ہوا۔ عمدہ عمدہ کھانے دستر خوان پہ چنے جانے لگے۔ احمد نوکروں کو ہدایت دے رہا تھا اور نوکر اس کے اشارے پر کام کر رہے تھے۔

" چھن!" ایک آواز آئی۔ بےچارے بوڑھے کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا تھا۔ "تڑاخ!" ایک اور آواز بڑے زور کی آئی۔ احمد نے اس بوڑھے کے ایک تھپڑ رسید کیا تھا۔ بوڑھا بےچارہ ذلیل ہوکر باہر چلا گیا۔

یہ منظر دیکھ کر میرے دل پہ چوٹ لگی اور میں بےقرار ہوکر باہر نکل آیا۔ بوڑھا سائبان میں بیٹھا رو رہا تھا۔ اُسے روتے دیکھ کر میرے بھی آنسو نکل آئے میں نے اُس سے تمام حال دریافت کیا۔ بوڑھے نے ہچکیاں لیتے ہوئے اپنی درد بھری داستان سنائی۔ میری چیخ نکل گئی۔ اور میں بےتحاشا وہاں سے اپنے گھر بھاگا اور رات بھر بستر پہ پڑا روتا رہا۔

" محمود جانتے ہو وہ کون تھا۔ ناناجان نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

" نہیں تو ناناجان آپ ہی بتائیے۔"

" وہ..... احمد کا باپ تھا۔" ناناجان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

" باپ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

" ہاں! احمد کا بوڑھا اور غریب باپ!"

لطیفے

سوم ناتھ ساہو

اُستاد۔ اُس آدمی کو کیا کہیں گے جو ہر وقت بولتا ہے چاہے کوئی سُنے یا نہ سے۔

جاوید۔ اس آدمی کو ماسٹر جی کہیں گے۔

سریندر۔ کسی چیز کا نام کیوں رکھا جاتا ہے؟

ویریندر۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے یہ تو کوئی پاگل بھی بتا دے گا۔

سریندر۔ اسی لئے میں نے آپ ہی سے پوچھا۔

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر: — جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: — بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۳ — نمبر ۹

سالانہ چندہ: — ہندوستان میں: چھ رُپے / پاکستان میں: چھ رُپے (پاک)

غیر ممالک سے: — نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ: — ہندوستان میں: آٹھ آنے / پاکستان میں: آٹھ آنے (پاک)

اپریل ۱۹۵۵ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ترتیب

سرورق:۔ پنڈت نہرو ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ یومِ جمہوریت کے موقعے پر دہلی میں

يحيىٰ اعظمی

مستقبل کا ہندوستان

منصوبہ تعمیر و ترقّی کے بعد

اُجڑی ہوئی خاکِ وطن بننے کو ہے پھر گلستاں — دشت و بیاباں و دمن ہونے کو ہیں پھر گل فشاں
ہر گاؤں ہر دیہات پھر بننے کو ہے رشکِ جناں — ہونے کو ہے باغِ ارم ہر قریۂ ہندوستاں
ہوں گی یہاں پھر کوثر و تسنیم کی نہریں رواں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

اُگلے گی گنجِ سیم و زر پھر ہر طرف خاکِ وطن — پھر لہلہائے گا ہجومِ رنگ و بُو سے یہ چمن
جوئے روانِ زندگی ہر سمت ہوگی موج زن — امرت کی نہریں ہر طرف دوڑائیں گے گنگ و جمن
کھیتوں کو مل جائے گا پیغامِ حیاتِ جاوداں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

ہر سبزۂ پامال بن جائے گا فردوسِ نظر — آبِ رواں سے لہلہا اُٹھے گا ہر اک دشت و در
برگ و ثمر کے بار سے جھک جائے گا ہر نخلِ تر — نشو و نمو کے کیف سے جھومے گی ہر شاخِ شجر
گائیں گی رنگیں زمزمے موجِ رواں جوئے رواں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

دہقاں کا ہر اک غم کدہ بن جائے عشرت کدہ — مزدور کا ہر جھونپڑا ہو جائے گا راحت کدہ
پھر غیرتِ کاشانہ بن جائے گا ہر حسرت کدہ — ہوگا ہجومِ نور سے معمور ہر ظلمت کدہ
ہر کلبۂ دہقاں میں موجِ برق ہوگی ضو فشاں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

چھائیں گی ہر چہرے پہ جامِ عیش کی سرمستیاں — خرم نظر آئیں گی پھر پامالِ عسرت ہستیاں
صدیوں کے بعد اُبھریں گی پھر جمہور کی یہ بستیاں — پھر سرفراز اوجِ ہوں گی مدتوں کی پستیاں
روندی ہوئی یہ خاک ہو جائے گی اک دن آسماں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

ہر گا فروزاں آفتابِ نَو دمیدِ زندگی — ہر ذرۂ افسردہ پھر ہوگا شہیدِ زندگی
پائے گی پھر جمہور کی دُنیا نویدِ زندگی — پھر ہر لبِ مزدور پہ ہوگا نشیدِ زندگی
عیش و طرب کے زمزمے گائے گی دہقاں کی زباں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

پیڑوں کے سایے کے تلے کھل جائیں گے حکمت کدے   ہر خار و خس کے جھونپڑے بن جائیں گے صنعت کدے
غربت کدے جمہور کے ہو جائیں گے دولت کدے   مزدور کے بے مایہ گھر بن جائیں گے نعمت کدے
ہوں گی رواں ہر سمت شہد اور دودھ کی نہریں یہاں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

پھوٹیں گے چشمے زندگانی کے منارِ برق سے   پانی کے دھارے ہر طرف دوڑیں گے تارِ برق سے
دشت و دمن رشکِ چمن ہوں گے بہارِ برق سے   پھر جمع ہوں گے ہر طرف خرمن شرارِ برق سے
ہر سبزہ و گُل میں حیات افروز ہوں گی بجلیاں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

اُبلیں گے پانی اور بجلی کے خزانے سُو بہ سُو   ہو جائیں گے برقی چراغوں سے منوّر کُو بہ کُو
سوکھی زمیں بن جائے گی مے خانۂ نشو و نمو   بھر جائیں گے پھر بادۂ گُل رنگ سے جام و سبو
پھر جگمگا اُٹھے گا اک دن یہ شبستانِ جہاں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

پھولوں کی رگ رگ میں چمک اُٹھے گی برقِ رنگ و بُو   پودوں کی نس نس میں تڑپ اُٹھے گا ریحانِ نمو
لہرائے گی سبزوں کی اک دُنیا کنارِ آب جُو   ہو جائے گی سُوکھی ہوئی کھیتی نہال و سرخرو
سب نونہالانِ چمن ہو جائیں گے اک دن جواں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

چمکیں گے تعمیر و ترقّی کے مظاہر ہر طرف   ہوں گے فروغِ زیست کے آثار ظاہر ہر طرف
مستِ طرب کر دیں گے قدرت کے نوادر ہر طرف   کھینچیں گے دل فطرت کے جاں پرور مناظر ہر طرف
ڈھک جائے گی فرشِ زمرّد سے بساطِ خاکداں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

خاکِ وطن کا کوکبِ تقدیر ہے پھر اَوج پر   قصرِ ترقّی کی نئی تعمیر ہے پیشِ نظر
مٹ جائیں گے ماضی کے پارینہ نشاں پھر سر بسر   ہوگا بساطِ دہر پر اک نقشِ تازہ جلوہ گر
ہر گانوں میں تعمیر ہوگا اک نیا ہندوستاں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

مانع نہ کوہ و دشت ہیں حائل نہ سنگِ راہ ہے   گرمِ سفر ہے قافلہ راہِ طلب میں پے بہ پے
پیہم رواں، پیہم دواں، ہر اک جواں، ہر ایک شے   منزل جو ہے پیشِ نظر اک روز ہو جائے گی طے
بڑھتا ہی جاتا ہے سوئے منزل وطن کا کارواں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

نورالحسن ہاشمی

جانِ عالم واجد علی شاہ کے خطوط ۔ بنام شیدا بیگم

اپریل ۱۹۵۴ء کے رسالہ "آج کل" میں نصیرالدین ہاشمی صاحب کا ایک مضمون بعنوان "جانِ عالم واجد علی شاہ اور اُن کے بیگمات کے غیر مطبوعہ خطوط" شائع ہوا تھا جس میں موصوف نے "مخزنِ اسرارِ سلطانی" نامی ایک قلمی کتاب کا ذکر کیا تھا جس میں ۷۵ خطوط بیگمات کے لکھے ہوئے اور ۴۰ خطوط واجد علی شاہ کے لکھے موجود ہیں۔ نصیرالدین صاحب ہاشمی کو غلط فہمی ہوئی کہ یہ کتاب طبع نہیں ہوئی۔ حالانکہ متذکرہ بالا نسخے میں خود تاریخ طبع یوں درج ہے۔

سالِ طبعش اندریں مصراع گفتم اے ادیب
نیکو و زیبا خطوطِ بیگماتِ لکھنؤ (۱۳۲۰ھ)

یہ مطبوعہ کتاب پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی کے کتب خانے میں موجود ہے۔

اسی کتاب میں منجملہ دیگر بیگمات کے ایک بیگم کا نام شیدا بیگم ہے — "مخزنِ اسرارِ سلطانی" میں اِن بیگم کے ۳۳ خطوط بنام واجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے ۱۲ خطوط بنام شیدا بیگم موجود ہیں۔ لیکن ابھی حال میں ایک قلمی نسخہ یہاں لکھنؤ میں میری نظر سے گزرا جس میں صرف واجد علی شاہ کے وہ خطوط ہیں جو اُنھوں نے مٹیا برج کلکتہ سے شیدا بیگم کو ۱۲۷۲ھ و ۱۲۷۳ھ میں لکھے تھے۔ ہر سال کے خطوط ترتیب وار نمبر دے کر درج کئے گئے ہیں۔ کل خطوں کی تعداد ۳۸ ہے۔ لیکن یہ نسخہ ناقص الطرفین ہے۔ شروع کا ایک صفحہ اور آخر کے نہیں معلوم کتنے صفحے غائب ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آخر میں کتنے خطوط اور ہوں گے۔ ان ۳۸ خطوں میں سے بھی ۴ ناقص ہیں اور ۴ غائب۔ اس لئے کہ اس کے بیچ کے بعض صفحے بھی غائب ہیں۔ اس طرح مکمل خطوں کی تعداد ۳۰ رہ جاتی ہے۔

یہ نسخہ ۷۵ فل اسکیپ سائز کے صفحات پر مشتمل ہے اور زرنگاری کی اپنی آپ مثال ہے۔ میں نے ابھی تک کسی کتاب کا قلمی نسخہ اس قدر زرنگار نہیں دیکھا۔ تفصیل اِس اجمال کی یوں ہے کہ اس نسخے کے ہر صفحے پر تین طرف جدول میں کوئی ڈھائی انچ کی چوڑی بیلیں آبِ زر سے بنائی گئی ہیں ہر چوتھے صفحے پر بیل کا ڈیزائن بدل دیا گیا ہے۔ اور یہ بیلیں کسی اُستاد فنکار کی بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ یہ سب بہت خوبصورت اور بہت متناسب ہیں۔ نقوش میں کہیں پھول پتیاں ہیں، کہیں وحوش و طیور اور بگھیاں اور کہیں محلات اور لکھنؤ کی مشہور عمارتوں کی عکاسی۔ متن صرف ۷ سطروں کا ہے۔ اور بین السطور میں بھی سونے کا پانی بھرا گیا ہے۔ اجزا کی سلائی کی جانب بھی کسی نہ کسی وضع کی پتلی بیل آبِ زر سے بنائی گئی ہے۔ غالباً یہ نسخہ خود شیدا بیگم کی ملکیت ہوگا۔ کیونکہ اس قدر مطلا اور مذہب نسخہ اور کون تیار کروا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ نسخہ اچھی طرح محفوظ نہیں کیا گیا اور نہ اس کی جلد ہی بندھوائی گئی ہے۔ اس لئے مجھے ڈر ہے کہ اگر کسی واقعی قدر دان کے ہاتھ نہ لگ گیا تو چند سال کے عرصے میں بالکل خراب ہو جائے گا۔

ذیل میں اس نسخے سے تین خطوط نمونتہً پیش کئے جاتے ہیں۔ پہلا خط منظوم ہے۔ دوسرے خط سے معلوم ہوگا کہ شیدا بیگم کے والد کا نام حسین علی خاں تھا اور یہ بھی کہ واجد علی شاہ کی طرف سے اُن کی والدہ بھائی اور ایک بیٹے لندن گئے تھے۔ تاکہ وہاں کے ممبرانِ پارلیمنٹ اور با اثر لوگوں سے مل کر واجد علی شاہ کی اپیل کو منظور کرائیں۔ اور اس طرح اُنھیں بادشاہت پھر مل جائے۔

اس کے متعلق تفصیل "گزشتہ لکھنؤ" مصنفہ عبدالحلیم شرر سے بخوبی معلوم ہو سکتی ہے۔ تیسرا خط محض انشاپردازی کا نمونہ ہے اور ہجر و فراق کی داستان کا حامل۔

ا۔ محبت نامۂ ہفتم

نواب شیدا بیگم صاحبہ کو جانِ عالم کی طرف سے معلوم ہو۔ نظم

جو گزری ہے مجھ پر کروں کیا بیاں — بہت رو دگی سن کے اس کا بیاں
ستم کون سا مجھ پہ گزرا نہیں — بیاں اُس کا کرنا اب اچھا نہیں
بھلا کس سے کہتا میں یہ واردات — کہاں میں کہاں ہجر، ہے طرفہ بات
ہمارا تو اب کچھ نہیں دسترس — فقط غم زدوں کا ہے آنکھوں پہ بس
پڑے عشق میں دُکھ اٹھاتے ہیں ہم — شب و روز آنسو بہاتے ہیں ہم
مصیبت میں اک اک گھڑی سہتے ہیں — رُخِ زرد پر اشکِ خوں بہتے ہیں
عجب سینے میں عشق کا جوش ہے — تمھارے سوا سب فراموش ہے
نہ کھانے نہ پینے کے مجھ کو حواس — قسم لو جو بدلا ہو میں نے لباس
مگر اپنے خالق پہ ہوں میں نثار — کہ ہیں نا اُمید اُس سے اُمیدوار
اُسی کا ہمیشہ رکھا آسرا — اُسی نے سُنی میری آخر دُعا
کہ خط تیرا آپہنچا طالب کے پاس — و یا رُوح آپہونچی قالب کے پاس
ہے اِس دم کی کیا نیک اک اک گھڑی — کہ اک اک گھڑی میں خوشی ہے بڑی
بس اب بحرِ غم سے نکالو مجھے — تم اپنے گلے سے لگالو مجھے
نہیں اور باتوں کا جویا مزاج — گلے ملنے کی ہے فقط احتیاج
مری جان کو اب نہیں دھیان ہے — ہم آغوش ہونے کا ارمان ہے
جو ایذا ابھی ہے ٹھکانے لگے — مزا روح دونوں کی پانے لگے
محبت کا سب حال آئینہ ہے — لبوں پر لب اور سینے پر سینہ ہے
مگر اے فلک تیرا خانہ خراب — دکھاتا ہے تو ہر زماں انقلاب
مگر چرخ کا کیا گلہ کیجئے — نصیبا بُرا ہو تو کیا کیجئے
یہ اور ایک تازہ مصیبت ہوئی — کہ معشوق عاشق میں فرقت ہوئی
بلا لو مجھے اب تم اے جانِ جاں — سنبھالو مجھے اب تم اے جانِ جاں
کِدھر ڈھونڈوں گا اور کِدھر جاؤں گا — بس اب تیری فرقت میں مر جاؤں گا
نہ جیتے ہوئے بھی پکارا مجھے — غرض جیتے جی تو نے مارا مجھے
نظر میں نہ کیوں کر ہو عالم سیاہ — نہاں تم ہو آنکھوں سے اے رشکِ ماہ
دلِ شاہ کا بھی بُرا حال ہے — کہ درد و الم سے وہ پامال ہے
یہ جب والیِ شہر کو غم رہے — بپا شہر میں کیوں نہ ماتم رہے
مگر چرخ ہے درپئے انتقام — کہ کیوں دو ہوئے تھے وہاں شاد کام
فلک کا بہت تنگ ہے حوصلہ — کہ دو کو بٹھاتا نہیں ایک جا
پھرا ہوں میں اُلفت کے میدان میں — بگولا بنا ہوں بیابان میں
غرض تیرا اختر ہے صحرا نورد — ہر اک آنکھ ہے سُرخ چہرہ ہے زرد
درختوں کو حسرت سے تکتا ہوں میں — تو دیوانہ وار اُن سے بکتا ہوں میں

تمھیں میرے ہو جاؤ حامی ذرا
مرے سرو کا تم بتاؤ پتا

راقم بے وطن، اسیرِ محن جانِ عالم
۱۲۔ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ

۲۔ محبت نامۂ نہم

پیاری شیدا بیگم جنیاں کو معلوم ہو، دو رقعے تمھارے بھیجے ہوئے، ایک میں طلب نسخۂ شفا ہم سے اور دوسرے میں ایک غزل اور احوال غلام حسین علی خاں درج تھا، کنز الدولہ بہادر کی معرفت چوتھی تاریخ ماہ حال کی ہمیں پہنچے۔ جانِ من جو دوائیاں تم نے لکھی ہیں وہ تو اب عنقا صفت ہوگئی ہیں۔ ہاں "حنظلِ غم" ہر جا موجود ہے، اور غزل کی تعریف میں کیا لکھوں، زبان ادائے وصف میں اُس کے قاصر ہے اور تو کیا نذر کروں جان حاضر ہے۔ مگر اے ماہ خوبی، غلام حسین علی خان کون ہیں جنھوں نے خواب دیکھا ہے۔ اگر تمھارے باپ ہیں وہ فقط حسین علی خاں ہیں۔ لفظ "غلام" شاید آوارہ لکھا ہو۔ بہر حال اُس کی تصریح کر کے لکھنا، اور اب ہم بڑے صدمات اور آلام میں گرفتار ہیں۔ خارش اور پھنسی، اور داد و قل اور دانتوں کا نہایت زور ہے، تمام بدن سُرخ بانات رہتا ہے، ایک ایک دانے سے پیپ لہو بہتا ہے۔

لندن میں یہ حال ہے، بھائی صاحب یہ چاہتے ہیں مجھے سلطنت ہو، صاحبزادے یہ چاہتے ہیں کہ مجھے ہو، چچا بھتیجے میں قرار واقعی جوتا اُچھل رہا ہے۔ ہم یہاں علیل پڑے ہیں، ہمیں کوئی نہیں پوچھتا۔ خدانخواستہ اگر وہاں یہی حال ہوا تو کمپنی مجھے جیتا نہ چھوڑے گی۔ خدا جانے کیا گت اور نوبت میری ہوگی۔ اب تو یہ دعی قرار واقعی دشمن ہو چکے ہیں[۲]۔ مگر اے گلِ خوبی افسو

---

[۱] ڈنبل سے واجد علی شاہ کا وہ مقدمہ جو واپسی سلطنت کی بابت لندن میں چل رہا تھا جب تقریباً طے ہو چکا اور شاہ کے مصاحبوں کو اس کا علم ہوا (بقیہ نوٹ صفحہ ۶)

رشکِ مہ کو حوالے کرو۔ کوئی میری فریاد نہیں سنتا۔ مجھ سے لڑکا کلیجے کا ٹکڑا نہیں دیا جاتا۔ باقی اور حال اگر سنو گی سوائے ملال کیا ہاتھ آئے گا۔ اب ہمیں زندوں میں نہ سمجھنا، ہم مُردوں میں ہیں۔ برس چھ مہینے کے اور مہمان ہیں۔ اُمید ہے کہ جب تک جیتا ہوں رقعہ بھیجا کرنا۔ فقط

مرقوم چہارم ربیع الاول ۱۲۷۲ھ راقم بسمل جانِ عالم عاشقِ شیدا

۳۔ محبت نامہ بستم

حُورتمثال، پری جمال، قمر طلعت، آفتاب صورت، تابِ گیسوئے خُوبی، مُشکِ نافۂ محبوبی، آہوئے ختنِ دلبری، غزالِ چینِ سروری، دلدار وفاشعار، شیریں گفتار، کبک رفتار، نازک بدن، یاسمن تن، لیلیٰ ناز، عذرا انداز، نواب شیدا بیگم صاحبہ کو جانِ عالم تصوّر میں گلے لگا کر پیار کر کر یہ کہتا ہے اور گُل تقریر اس طرح مہکتا ہے۔ غرہ جمادی الاولیٰ کو چکیدہ خامۂ کرشمہ نگار یعنی نامۂ عنبر بار تمھارا منشی صفدر کی معرفت پہونچا۔ غم دُور ہوا، عاشقِ دُور افتادہ بہت مسرور ہوا۔

من از ترانۂ ایں تازہ نغمہ بشگفتم

چو لب ز خندہ و جام از شراب و گل ز بہار

حال مندرجہ اوس کا کُھلا۔ خیریت و عافیت سن کر غنچۂ خاطر نسیمِ مسرت سے کھلا۔ طبیبوں کے مقرر کرنے میں تم کو اختیار ہے۔ ملازموں سے جو مزاج داں ہو اور تمھارا اس نے اکثر علاج کیا ہو اُس کو علاج کے واسطے محمد محبوب علی خاں ناظر سے کہہ کر بُلوا بھیجو، کوئی عذر نہیں کرے گا جیسے کہو گی بجان و دل قبول کرے گا۔ اپنے والد کو جو ممانعت کی بہت اچھا کیا[1]، خدا سے دعا مانگیں کہ ہم جلد مظفر و منصور وہاں آ دیں جس طرح سے جی چاہتا ہے اُس طرح سے دیکھیں۔ برخوردار نواب نگین آرا بیگم[2] کو ہماری طرف سے دعا پہنچے۔ زیادہ شوقِ وصل لکھنے میں بہت طول ہے۔

رقم زدہ غرہ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۳ھ راقم جانِ عالم

اور ہم نے سنا کہ تمھارے مکان سکونت میں آسیب کا خدشہ ہے اور وہ مکان اچھا نہیں ہے۔ لہٰذا تم اور کسی مکان کو تجویز کر کے لکھ بھیجو۔ تا وہاں جانے کا حکم ہو اور ہمارا تردد اور خفقان جاتا رہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵) تو انھوں نے اس خیال سے کہ اب ہماری قدر و منزلت نہ ہوگی، واجد علی شاہ کو اُکسایا کہ وہ اپنا مقدمہ واپس لے لیں، اور ان کو طرح طرح کے وہم دلائے، اور آخر مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ تفصیل کے لیے "گزشتہ لکھنؤ" از عبدالحلیم شرر ملاحظہ فرمایئے۔ (ن)

[1] پہلے خطوط میں درج ہے کہ شیدا بیگم کے والد واجد علی شاہ کو دیکھنے کلکتے جانے کا قصد رکھتے تھے۔ واجد علی شاہ نے آنے کو منع کیا، اسی کی طرف اشارہ ہے۔

[2] واجد علی شاہ کی نوزائیدہ بیٹی، شیدا بیگم کے بطن سے۔

یومِ جمہوریت کا مشاعرہ

۲۵ جنوری ۱۹۵۵ء کی شب کو جشنِ جمہوریت کے سلسلے میں جو مشاعرہ لال قلعے میں منعقد ہوا تھا، اس میں جگن ناتھ آزاد۔ جوش ملیح آبادی۔ روش صدیقی۔ ساغر نظامی۔ عرش ملسیانی۔ فراق گورکھپوری۔ سکندر علی وجد نے اپنا کلام سنایا۔ اس مشاعرے کے لئے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے درج ذیل پیغام بھیجا تھا: "مجھے یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ یومِ جمہوریت کی تقریب کے سلسلے میں لال قلعے میں ایک مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ ہم اس بات کو نہیں بھول سکتے کہ جنگِ آزادی میں مختلف زبانوں کے شعراء نے اپنے اپنے طریقوں سے ملک کو بیدار کرنے میں قوم کی بڑی خدمت کی تھی، اور اب جب ہم آزاد ہو گئے ہیں اور ملک کی بہتری اور ترقی کے لئے کوشش کر رہے ہیں ہمیں یہ لازم ہے کہ ہم شعرا کو برابر موقع دیتے رہیں کہ وہ علم اور فن سے ملک کی خدمت کرتے رہیں۔ سخن میں جو قوت ہے وہ تلوار میں نہیں، اور ہم تو سخن کے پجاری ہیں، نہ کہ تلوار کے۔ لہٰذا آزاد ہندوستان کو اس بات کا فخر ہونا چاہیئے کہ آج بھی اس ملک میں رائج مختلف زبانوں کے شعراء میں اپنے فرائض ادا کرنے اور صحیح سچے راستے پر لے جانے کی لگن ہے۔ اس موقعے پر میں سب کو مبارک باد دیتا ہوں، اور اس تقریب کی کامیابی کے لئے دُعا کرتا ہوں۔"

نیازمند — راجندر پرشاد

ہما ہرنالوی

پنجابی کا ایک ممتاز شاعر

میرے ادبی ذوق کی یہ محرومی بجز لاعلمی کے اور کس چیز پر مبنی رہی ہوگی کہ میں پنجابی نژاد ہونے کے باوجود ایک عرصے تک دورِ حاضرہ کی پنجابی شاعری سے لطف اندوز نہ ہو سکا - اور کبھی اس کے تیرِ کشش کا نشانہ نہ بن سکا - کچھ ایسا ہی اتفاق ہوتا رہا کہ مختلف کتابوں یا رسالوں کے توسّل سے جتنی بھی چیزیں میری نگاہوں سے گزرا کیں - وہ نہ تو حُسنِ ظاہری کی مظہر تھیں - اور نہ حسنِ باطن کی آئینہ دار - یہی کیفیت ان منظومات کی بھی تھی - جنھیں میں پنجابی مشاعروں میں وقتاً فوقتاً سُنتا رہا - ان اتفاقات کا تو اثر آخر یہ رنگ لایا - کہ میری طبیعت پنجابی شاعری سے قطعاً بیزار اور نفور ہو گئی -

مگر آج سے کچھ برس پہلے میرے ایک عزیز دوست نے پنجابی نظموں کا ایک مختصر سا مجموعہ کہیں سے لا کر میری تحویل میں دیا - اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا - کہ اس کتاب کو پڑھ کر آپ پنجابی شاعری کے متعلق اپنی رائے بدل دینے پر مجبور ہو جائیں گے - اُن کا یہ دعوے میرے لئے کچھ کم اشتیاق انگیز نہ تھا - چناں چہ جب وہ تشریف لے گئے - تو میں نے کتاب مذکور کو جستہ جستہ دیکھنا شروع کیا - سب سے پہلے جو نظم میرے سامنے آئی - اس کا عنوان تھا "رب" - خدا گواہ ہے کہ محض اس نظم کے مطالعہ نے مجھے اتنا محظوظ اور اتنا متاثر کیا - کہ میری تمام سابقہ محرومیوں کی تلافی ہو گئی - اور میں یہ اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکا - کہ اگر کسی شاعری کو حقیقی معنوں میں شاعری کہا جا سکتا ہے - تو وہ یہی شاعری ہے باقی نظموں کو دیکھا - تو ان میں بھی صوری و معنوی خوبیوں کا وہی اجتماع نظر آیا پھر تو اس کتاب نے مجھے ایسا گرویدہ بنایا - کہ نامۂ دوست کی طرح ہر وقت میری آنکھوں کے مقابل رہنے لگی - اس موقع پر یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے - کہ تقسیم پنجاب کے دنوں میں راول پنڈی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہتے وقت میں نے اپنے ذاتی کتب خانے میں سے جو دس بارہ کتابیں ہم راہ لے جانے کے لئے منتخب کی تھیں - اُن میں یہ صحیفۂ رنگیں بھی شامل تھا - اور اس کی موجودگی آج تک میرے لئے غیر معمولی دل چسپی کا سامان بنی ہوئی ہے - یہ گراں مایہ کتاب ۱۹۴۲ء میں "ساوے پتّر" یعنی برگ ہائے سبز کے نام سے منظرِ عام پہ آئی تھی - اسے تصنیف کرنے کی سعادت پروفیسر موہن سنگھ ماہر ایم - اے کو حاصل ہے - ان کے اس مجموعے کو جو نظموں کی تعداد کے لحاظ سے بہت مختصر مگر معنویت کے اعتبار سے بہت جامع حیثیت رکھتا ہے - اس ہلکے پھلکے طبلۂ عطار سے تشبیہ دی جا سکتی ہے - جس میں ہزاروں پھولوں کی روح کشید کر کے بند کر دی گئی ہو - پروفیسر صاحب نے دَورِ موجودہ کے عام ترقی پسند شاعروں کی طرح زندگی کے کسی ایک ہی پہلو کو موضوعِ سخن بنا کر "ادب برائے زندگی" کے نہایت بلند اور نہایت وسیع نظریے کی توہین نہیں کی - بل کہ بزمِ کائنات کی ہر چیز کو زندگی کا ایک پہلو سمجھ کر اسے بہت قریب سے دیکھا ہے - اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے - اس سے ہم کلام ہوئے ہیں - اور پھر اس رازدارانہ گفت و شنید کو بڑے رنگین اور دل نشیں پیرایے میں نظم کر دیا ہے - ان کے کلام میں کیا المیہ کیا طربیہ اور کیا رزمیہ تینوں قسم کی شاعری کے بہترین نمونے دست یاب ہوتے ہیں - اُن کی طبعِ رسا نے جس چیز کو بھی عنوانِ بیان بنایا ہے - اس کے ظاہر و باطن کی ایک مکمل تصویر کھینچ کے رکھ دی ہے - اور پھر اس تصویر میں جدّت اور تنوع کی ایسی عجیب و غریب رنگ آمیزی کی ہے - کہ دل سے بے اختیار واہ نکلتی ہے

دلِ شاعر کے ساز میں یہ انوکھی خصوصیت دیکھی گئی ہے - کہ جب تک وہ شکستہ نہیں ہو جاتا - اس کے نغموں میں کوئی کیف کوئی اثر یا کوئی سوز و گداز پیدا نہیں ہوتا - کسی بھی حقیقی شاعر کے واقعاتِ زندگی پر نظر ڈالی جائے - تو ان میں سے ایک نہ ایک ایسا الم انگیز اور حسرت ناک واقعہ ضرور ملے گا - جس نے اس کے دل و دماغ کو انتہائی شدّت کے ساتھ متاثر کیا ہو - یہی غیر فانی تاثر وہ آگ ہے - جس کی تیز آنچ اس کے ایک ایک شعر

ہیں - ایک ایک مصرعے میں اور ایک ایک لفظ میں سرایت کر جاتی ہے۔ پروفیسر صاحب بھی چوں کہ ایک وہبی شاعر ہیں - اس لئے قدرتی طور پر انھیں بھی اپنی زندگی میں ایک عظیم صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے - یہ صدمہ اُن کی رفیقۂ حیات کی ناگہانی موت کا صدمہ تھا - اور اس کا جتنا اثر اُن کی طبیعت پر ہوا ہے - اُتنا ہی ان کی شاعری پر بھی ہوا ہے - اُنھوں نے خود بھی اپنی ایک نظم میں یہ اعتراف کیا ہے - کہ دراصل اسی صدمے نے مجھے شاعر بنایا ہے -

پروفیسر صاحب کی شاعری کے متعلق میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے - اُن کی صداقت کے ثبوت میں صاحبِ موصوف کی بعض نظموں کا اقتباس آزاد اُردو ترجمے کی شکل میں یہاں درج کیا جاتا ہے - سب سے پہلے وہ نظم ملاحظہ فرمائیے - جو "رب" کے عنوان سے فکر کی گئی ہے - اور جسے پڑھ کر میں ہمیشہ کے لئے پروفیسر صاحب کی سحر بیانی کا مدّاح بن گیا تھا -

خدا کو جاننے کے لئے بے شمار تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں - مگر وہ پھر بھی ایک رازِ سربستہ بنا رہتا ہے - دیکھئے اس خیال کو کس خوبی سے پیش کیا گیا ہے -

"تیری تلاش میں پرواز کرتے کرتے طائرِ عقل کے تمام بال و پر گر گئے - تیرا سُراغ لیتے لیتے خیال عاجز آگیا - لاکھوں اُنگلیوں نے تیری زُلفوں کے پیچ کھولنے کی کوشش کی - مگر کسی کو کامیابی نصیب نہ ہوئی - روتے روتے ناقوسوں کی آواز بیٹھ گئی - گھڑیال اپنا سینہ پیٹ پیٹ کر بے حال ہو گئے - تیرا افسانہ کہتے کہتے قلم کی زبان پھٹ گئی - مگر تیری ہستی کا معمّہ پھر بھی حل نہ ہو سکا" -

معاذ اللہ! کیا شاعرانہ اندازِ بیان ہے - ناقوسوں کا رونا - گھڑیالوں کا سینہ پیٹنا - قلم کی زبان کا پھٹ جانا - یہ تمام ٹکڑے نہ صرف زورِ تخیّل ہی کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں - بل کہ حقیقت کی پُوری پُوری ترجمانی بھی کرتے ہیں -

"کسی نے تیری جُدائی میں کانوں کو چھید ڈالا - کسی نے اپنے بال بڑھا لئے - کسی نے دروازے بند کر کے چلّہ کشی کی - کسی نے شارعِ عام پر بیٹھے بیٹھے راتیں گزاریں - کسی نے اپنے آپ کو کنوئیں میں اُلٹا لٹکایا - کسی کو دُھونی رمانے کی دُھن سوار ہوئی - غرضے کہ تیرے عاشقوں نے تیرا ایک جلوہ دیکھنے کے لئے کیا کیا مصیبتیں نہ جھیلیں - مگر تُو نے کبھی اپنے رُخِ روشن سے زُلفیں نہ ہٹائیں - لاکھوں تشنہ کاموں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی مگر تُو نے کسی کو شرابِ وصل کا ایک جُرعہ عطا نہ فرمایا - ہزاروں ہستیاں بیابانوں کی خاک چھانتے چھانتے خاک میں مل گئیں - مگر تیرے نافے کا نشان پا کسی کو نظر نہ آیا" -

"کسی نے قرآن کی تلاوت کی - کسی نے کتابِ دل کی ورق گردانی کی - کسی نے اپنی آنکھوں کے سمندر خالی کر ڈالے - کسی نے زُلفوں کی شبِ تار میں رُخساروں کی نورانی شمعیں لے کر تجھے ڈھونڈھا" -

"تیرے غم میں رونے والوں کی آنکھیں آنسو بن بن کر بہہ گئیں - مگر تیرے دل پر ذرا بھی اثر نہ ہوا - اور تو نے کبھی کسی سے ہنس کر بات نہ کی - وہ گریہ بھی کتنا پُر لطف اور حسرت ناک گریہ ہے - جس میں کوئی آنسو پونچھنے والا نہ ہو"۔

خدا کی ذات اپنی غیر معمولی لطافت کی وجہ سے حواسِ خمسہ کی رسائی سے یکسر بعید ہے - اس حقیقت کو دنیا کے تمام مذاہب نے تسلیم کیا ہے - یہی وہ پُراسرار بُعد ہے - جسے خدا کی بے نیازی سے تعبیر کیا جاتا ہے - خدا کے تجسّس میں وقف رہنے والے اس بُعد کی بنا پر برسوں کی جد و جہد کے باوجود حصولِ مدّعا میں سراسر ناکام رہتے ہیں - اور اُن کے شوق و اضطراب کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتا - جب تک اُنھیں کسی عارفِ کامل کی رہنمائی نصیب نہیں ہوتی - اس درمیانی وقت میں اُن کے دلوں پر جو جو عالم گزرتے ہیں - اشعارِ مندرجۂ بالا میں اُنھیں کی تفصیل بیان کی گئی ہے - ان اشعار کو پڑھ کر پہلے اُن عاشقانِ الٰہی کے ذوقِ تجسّس اور صبر و استقلال کا اندازہ کیجئے جنھوں نے اپنی تمام زندگی طاعت و ریاضت کی ایسی دشوار ترین منزلیں طے کرنے میں صرف کر دی ہو - اور پھر اُن کی اس دلی کیفیت کا تصوّر باندھئے - جس کا رُوح فرسا تصوّر اُنھیں اپنی یاس و ناکامی کا یقین ہو جانے پر ہوا ہو - اس مقام پر حضرت مومن دہلوی کا ایک لاجواب مطلع جس میں یہ ساری تفصیل چھپی ہوئی ہے - بے اختیار یاد آتا ہے - ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں   واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

سستی اور پنّوں کا غیر فانی عشق سرزمینِ پنجاب کا ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے - اشعارِ زیرِ بحث میں سسیوں اور ناقے کا تلمیحی استعارہ اس واقعے کی یاد تازہ کرتا ہے - اہلِ نظر اس پُر لطف اور پُر جدّت استعارے

کی داد ضرور دیں گے ۔ شدّتِ گریہ کے بیان میں اظہارِ خیال کا یہ طریقہ بھی کچھ کم قابلِ تحسین نہیں کہ رونے والوں نے اپنی آنکھوں کے سمندر خالی کر ڈالے ۔ یا ان کی آنکھیں آنسو بن بن کر بہہ گئیں ۔ اور پھر ایسے گریہ میں بھی اگر کوئی اشک شوئی کرنے والا نصیب نہ ہو ۔ تو اس کی بے لُطفی اور حسرت ناکی میں کیا شک ہو سکتا ہے ۔ علاوہ ازیں زلفوں کی شبِ تار میں رخسار کی نورانی شمعیں لے کر محوِ تلاش ہونے کا مضمون بھی نہایت رنگین و دل آویز اور وجدانی کیفیت کا حامل ہے ۔

"ہم تیری جُدائی کی آگ میں جل کر خاک ہو گئے ۔ مگر اتنی قربت کے باوجود تجھے اس آگ کی آنچ تک محسوس نہ ہوئی" ۔

خُدا کی ذات کو رگِ جاں سے بھی قریب تر مانا گیا ہے ۔ مگر اس قربت کا راز فاش نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو اس کی موجودگی کا وہم و گمان تک نہیں ہو سکتا ۔ رنجِ فرقت کی یہ انوکھی صورت واقعی عذابِ جہنّم سے کم نہیں ۔ کہ مطلوب رگِ جاں سے قریب تر ہوتے ہوئے بھی نظر نہ آ سکے ۔ اور اسے اس آگ کی آنچ تک محسوس نہ ہو سکے ۔ جو اس کے طالبوں کو جلا کر خاک کر ڈالے ۔

"کسی نے کاسۂ سر کا جام بنا کر تجھے پیش کیا ۔ مگر تو نے اُسے اپنے ہونٹوں سے نہ لگایا ۔ کسی نے اپنے دل کا رنگین پلنگ بچھایا ۔ مگر تیری بے پروائی نے اُسے قبول نہ فرمایا" ۔

"تجھے سجدے کرتے کرتے جبینوں پر داغ پڑ گئے ۔ مگر پھر بھی تیری رحمتیں نازل نہ ہوئیں ۔ تیری رنجشوں نے ہمیں تباہ کر دیا ۔ تیری بے نیازی نے ہمیں مار ڈالا ۔ ہماری جان لے کر بھی تو نے اپنے رُخِ زیبا سے پردا نہ اُٹھایا ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔ کہ تو اس سے بھی زیادہ اور کون سی رونمائی چاہتا ہے" ۔

پیشِ نظر اقتباس کے ابتدائی حصّے کو اگرچہ شاعرانہ مبالغہ آرائی پر محمول کیا جا سکتا ہے ۔ مگر بہ نظرِ غائر دیکھنے سے معلوم ہوگا ۔ کہ اس مبالغہ آرائی کے پردے میں شاعر نے حقیقت نگاری اور عکاسیِ جذبات کا وہ کرشمہ دکھایا ہے کہ طبیعت داد دینے کو بے قرار ہو اُٹھتی ہے ۔ شروع کے تینوں ٹکڑوں سے جس بے پایاں خلوص و ارادت اور جس بے پناہ عجز و شکستگی کا اظہار ہو رہا ہے ۔ وہ محتاجِ تشریح نہیں ۔ رونمائی کے سلسلے میں انواع و اقسام کے اشعار آپ نے پڑھے ہوں گے ۔ مگر یہ اچھوتا مضمون کہیں بھی نظر نہ آیا ہوگا ۔ کہ ہماری جان لے کر بھی تو نے اپنے رُخِ زیبا سے پردا نہ اُٹھایا ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تو اس سے بھی زیادہ اور کون سی رُونمائی چاہتا ہے" خط کشیدہ الفاظ نے اس مضمون میں ایک عجیب نکتہ پیدا کر دیا ہے ۔ اور وہ نکتہ یہ ہے کہ جان دے دینے کے بعد پھر کوئی ایسی چیز باقی رہتی ہی نہیں ۔ جسے رونمائی کے طور پر پیش کیا جائے ۔

"اگر تو اپنے چہرے سے زُلفیں ہٹا دے تو سارا عالم حیرت زدہ ہو کر تیری طرف دیکھتا رہ جائے ۔ بھائی[1] کے ہاتھوں میں ناقوس پکڑا ہوا رہ جائے ۔ مؤذن کے گلے میں اذان رُکی ہوئی رہ جائے ۔ برہمن کا قشقہ کھلا ہوا رہ جائے ۔ صوفی کا جامِ وحدت بھرا ہوا رہ جائے ۔ فلسفی کے ہاتھ سے قلم گر جائے ۔ منکرِ ٹکٹکی باندھ کر تیری صورت دیکھنے لگے" ۔

"اگر تو ایک بار صرف ایک بار ہمہ تن عیاں ہو کر اپنا دیدار دکھا دے ۔ تو ہمارے ہر روز کے اختلافات معدوم ہو جائیں ۔ ہمارے دل یکساں طور پر تیری محبّت سے معمور ہو جائیں ۔ اور دیر و حرم کا امتیاز ہمیشہ کے لئے اُٹھ جائے" ۔

یہ اس نظم کے آخری اشعار ہیں ۔ ان اشعار میں خدا کے ناگہانی ظہور (انکشاف) سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو جس محاکاتی انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ اُسے دیکھتے ہوئے شاعر کی قادر الکلامی کا ایک نمایاں ثبوت ملتا ہے ۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی کتنی پُر صداقت ہے کہ خدا کے متعلق انسان کی ناواقفیت اور لاعلمی ہی جملہ مذہبی اختلافات کی بنیادی وجہ ہے ۔

مضمون کی طوالت کا خوف مجھے باقی نظموں کا تبصرہ سپردِ قلم کرنے سے روکتا ہے ۔ لہٰذا یہ کام ناظرینِ کرام کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتے ہوئے چند خاص خاص نظموں کا ترجمہ ہی درج کر دینے پر اکتفا کرتا ہوں ۔

انار کلی

"تو انار کی ایک ایسی پاکیزہ کلی تھی ۔ کہ تجھ سے محبّت کرنے کا حق بھونرے کے سوا اور کسی کو حاصل نہ تھا ۔ تو نے بلا وجہ ان معصوموں کا یہ حق چھین کر بے مروّت انسان کو دے دیا ۔ تیرے دل کی پاک مسجد میں مردِ جیسے شیطان کا کیا کام تھا ۔ تجھے تو جنگلوں ہی میں رہنا مناسب تھا ۔ تیری طبیعت شاہی

---

[1] سکھوں کے گوردوارے کا منتظم اور محافظ

محلات پر کیوں مائل ہوئی۔ تو نے عرش مقام ہو کر ایک مرد کی خاکِ پا بننا کیوں گوارا کیا
سلیم ایک تو مرد تھا۔ دوسرے بادشاہ اور تیسرے اکبر کا بیٹا۔ ایسے مغرور و سرکش آدمی کو تیری زُلف کی زنجیر کیوں کر جکڑ سکتی تھی۔ مردوں کی بے وفائی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ اسی طرح دھوکا دیتے آئے ہیں۔ جب تک حُسن کا چراغ جلتا رہتا ہے۔ یہ پروانوں کی طرح اسے سجدے کرتے رہتے ہیں۔ مگر جونہی وہ گُل ہوتا ہے۔ یہ کسی اور چراغ کی تلاش میں مصروف ہو جاتے ہیں"۔

"جب دریاؤں میں طغیانی آتی ہے۔ اور وہ چھلکنے لگتے ہیں۔ تو اُس وقت بڑے بڑے نامی تیراک بھی غرقاب ہو جاتے ہیں۔ حیرت ہے کہ تیری محبّت کے وسیع اور عمیق چناب (پنجاب کا ایک دریا) میں سلیم کا دل کیوں کر نہ ڈُوب سکا"۔

"ظالم دنیا نے محبّت کے دل فگاروں کو دیوار میں چنواتے وقت اینٹوں اور پتھروں کو ایسا ملا ملا کر لگایا کہ تڑپنے کے لئے بھی کوئی جگہ نہ چھوڑی"۔

اگر تو نے اپنے گلے میں پھُولوں کا ہار پہنا۔ تو نزاکت کی وجہ سے تیری کمر بل کھا گئی۔ اگر تو نے اپنے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائی۔ تو اس کے بوجھ سے تیرے لئے حرکت کرنا دشوار ہو گیا۔ موتیوں کی مالا کا بوجھ اُٹھا لینا تو ایک طرف رہا۔ تجھ سے کسی کی بات بھی نہ اُٹھ سکتی تھی۔ خدا جانے تو نے سنگ و خشت کا یہ بارِ گراں کیوں کر برداشت کر لیا"۔

"حج کرنے والوں کو مکّہ اور مدینہ کی زیارت مبارک ہو۔ اور شاعر کو تیرے مزار کی زیارت مبارک ہو"۔

"تیرے دل کو تو بڑے بڑے اولیا بھی نہ پرکھ سکے۔ تیری قدر و قیمت تو بڑے بڑے اوتار اور پیغمبر بھی نہ جان سکے۔ پھر اگر جہاں گیر تیری محبّت کی گہرائی سے بے خبر رہا تو اس بے چارے کا کیا قصور"؟

"اچانک انار کلی کی قبر میں سے مجھے یہ آواز آئی۔ کہ اے شاعر! خدا کے لئے میری آنکھوں کے سامنے کھڑا ہو کر میرے سلیم کی مذمّت نہ کر

ماں

"ماں جیسا گھنی چھاؤں والا درخت مجھے کہیں نظر نہیں آتا۔ خدا نے جنّت بنانے کے لئے شاید اسی درخت کی چھاؤں مستعار لی تھی۔ دنیا میں اور جتنے بھی درخت ہیں۔ وہ صرف اسی وقت خشک ہوتے ہیں۔ جب ان کی جڑیں سُوکھ جاتی ہیں۔ مگر اس درخت میں عجیب بات دیکھی گئی ہے کہ جب اس کے پھول (یعنی بچّے) مرجھانے لگتے ہیں۔ تو ان کے ساتھ اس کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے"۔

بچّہ

"جب زن و شوہر کے درمیان کوئی رنجش پیدا ہو جاتی ہے۔ تو بچّہ ثالث بن کر اُن میں صُلح کرا دیتا ہے۔ جب وہ دونوں کثرت کار کی وجہ سے فسردہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ تو اس کا ایک بوسہ ان کے لئے شگفتگی اور تازگی کا پیام لاتا ہے۔ بچّے جیسا کوئی میوہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ کہ یہ جتنا زیادہ خام ہوتا ہے۔ اتنا ہی زیادہ شیریں ہوتا ہے۔

خموشی

"بلبل نے پھُول سے پُوچھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کہ تو کیوں کر گلے کا ہار بنا۔ اور میں کیوں کر پنجرے میں قید ہوئی۔
پھُول نے جواب دیا۔ تیری صرف ایک زبان ہے۔ اور تو اُسے بھی قابو میں نہ رکھ سکی۔ اور میں نے سو زبانیں رکھتے ہوئے بھی اپنے دل کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا"۔

اندھی لڑکی

"یا رب! تو نے یہ کیا ستم ڈھایا۔ کہ اتنا خُوب صُورت مندر بنا کر اس میں ایک چراغ تک روشن نہیں کیا"۔
تو نے حُسن کا اتنا خوش نما باغ لگایا۔ اور اسے چمپا اور گلاب۔ لالہ اور شبّو وغیرہ پھُولوں سے مزیّن کیا۔ مگر وہ باغ بھی کس کام کا۔ جس میں نرگس کے پھُول نہ ہوں"۔
اندھی لڑکی اور موہن۔ تیری بنائی ہوئی یہ دونوں تصویریں بڑی دل کش اور جاذب نظر ہیں۔ ان میں سے ایک تو حسن کی تصویر ہے۔ اور دوسری شاعری کی تصویر۔ بہت مدّت پہلے تو نے ان دونوں کو بنانا شروع کیا تھا۔ مگر یہ آج تک مکمّل نہیں ہو سکیں۔ یا رب! تو میری ان دونوں آنکھوں کو نکال کر اس اندھی لڑکی کو دے دے۔ تاکہ ان تصویروں میں سے ایک تصویر تو پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

خُودی

"چھوٹے چھوٹے حسین تارے سُورج کے پگھلے ہوئے سونے میں

تحلیل ہو کر اپنا نام و نشان کیوں مٹا دیتے ہیں۔
آسمان سے اتری ہوئی گوہر نما شبنم پھول کے دامن میں کیوں روپوش ہو جاتی ہے۔ موجیں مارتی ہوئی آب جو سمندر سے واصل ہو کر کیوں نیست و نابود ہو جاتی ہے۔
مجھے تو اگر خدا بھی کہے کہ آ۔ اور میری لامحدود وسعتوں میں سما جا۔ تو میں صاف انکار کر دوں۔ اور کبھی اپنی جگہ سے نہ ہلوں۔
خدا کی ذات میں فنا ہو کر پھر میں بزم کائنات کے رنگا رنگ جلووں سے کیوں کر لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔
وہ انسان بھی کیا ہے۔ جس میں خودی کا جوہر نہ ہو۔ اور جو دنیا میں اپنی جداگانہ شخصیت کو برقرار نہ رکھ سکتا ہو"۔

بھارت میں کلیدی صنعتوں کی شاندار ترقی

ہندوستان کیبل فیکٹری۔ یہ فیکٹری وادی دامودر کے صنعتی علاقے میں چترنجن کے نزدیک قائم کی گئی ہے جس کی افتتاحی رسم اس سال کے دوران میں ادا کی گئی۔ اس فیکٹری میں ہر سال ۵۰۰ میل لمبے ٹیلیفون کے تار تیار کئے جائیں گے۔ اور اس لحاظ سے ٹیلیفون اور تار کا شعبہ خود مکتفی ہو جائے گا۔ اس فیکٹری پر ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ فیکٹری کے قیام کے بعد ماہ نومبر تک ۳۰ میل بے سدھاتی تار تیار کئے گئے۔

ہندوستان شپ یارڈ۔ ہندوستان شپ یارڈ میں "جل" قسم کے آٹھ ہزار ٹن وزنی دو بحری جہاز اور سات ہزار ٹن وزنی ایک ڈیزل جہاز تیار کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک اور جہاز عنقریب سمندر میں اتارا جائے گا۔ ترقیاتی پروگرام کی تکمیل سرگرمی سے ہو رہی ہے۔ پہلے پانچ سالہ پلان کی مدت میں اس پر تقریباً دو کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔ پیشتر ازیں اس ادارے کو ایک ۲۵ ٹن کا سفری کرین فراہم کیا گیا اور اب ۱۲۵ ٹن کا ایک اور کرین نصب کیا گیا ہے۔ اس ادارے کے پاس کام اتنا ہے کہ دو سال تک وہ اپنا کام پوری صلاحیت کے مطابق چالو رکھ سکے گا۔
وساکھا پٹنم میں جہازوں کو ٹھہرانے کی غرض سے خشک گودی تعمیر کی جا رہی ہے اور اس مقصد کے لئے حکومت کی طرف سے کم شرح سود پر ایک کروڑ روپے کا قرضہ دیا جائے گا۔ خشک گودی کی تکمیل کے بعد وہاں جہازوں کی مرمت کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔

مشینی اوزار سازی کی فیکٹری واقع جلا ہالی۔ یہ فیکٹری بنگلور کے نزدیک قائم کی گئی ہے اور اس میں مشینی اوزاروں کی تیاری کا کام شروع ہو گیا ہے۔ خرادوں کے پرزے تیار کئے جا رہے ہیں اور فروری ۱۹۵۵ء تک انھیں جوڑ کر خراد تیار کئے جا سکیں گے۔ اس کے علاوہ مشینوں کے دوسری قسم کے اوزار عنقریب تیار ہونے لگیں گے۔

صنعتِ فولاد۔ رؤڑ کلا (اڑیسہ) میں ہندوستان سٹیل لمیٹڈ کے تحت فولاد تیار کرنے کی فیکٹری زیر تعمیر ہے اور وہ ابتدائی مرحلوں سے گزر چکی ہے اس فیکٹری کے نزدیک خام لوہے کی کانوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور زمین کے متعلق سروے جاری ہے۔ موسمیات کی ایک عارضی لیبارٹری بھی قائم کی جا رہی ہے۔ نیز جرمن کمپائین کروپ ڈیماگ کے ماتحت مغربی جرمنی میں تربیت کی غرض سے ہندوستانی ٹیکنیکل ماہرین کا انتخاب عمل میں آچکا ہے توقع ہے کہ اس سال کے آخر تک مشینیں نصب کرنے کے متعلق عملی کام شروع ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور فیکٹری کے قیام کی تجویز زیر غور ہے چنانچہ اس سلسلے میں تفصیلات طے کرنے کی غرض سے روسی ماہرین کا ایک وفد ہندوستان پہنچ چکا ہے اور حالات کا جائزہ لے رہا ہے۔

پنسلین اور ڈی ڈی ٹی۔ نئے کارخانوں کے سلسلے میں صحت عامہ ایسے اہم مسئلے کو نظر انداز نہیں کیا گیا اس ماہ کے دوران میں ڈی ڈی ٹی کی ایک فیکٹری دہلی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی اور توقع ہے کہ اسی سال ماہ مارچ میں ڈی ڈی ٹی تیار ہونے لگے گی۔ بچوں کے بین الاقوامی ایرجنسی فنڈ کی مالی و ٹیکنیکل امداد سے پمپری میں پنسلین سازی کی فیکٹری قائم کی جا رہی ہے۔ جس میں پنسلین کی تیاری کا کام عنقریب شروع ہو جائے گا۔

افسانۂ خویش

مدہوش ہیں ہم لوگ نہ ہشیار ہیں ہم لوگ
حیرت زدۂ جلوہ گہِ یار ہیں ہم لوگ

ہنس بول لیا کوئی، تو ہیں بندۂ بے دام
آزاد ہیں ہم لوگ، گرفتار ہیں ہم لوگ

تیرا ہی تغافل ہو کہ بیدادِ زمانہ
صد شکر کہ اے دوست سزاوار ہیں ہم لوگ

صدیوں سے ہیں آشفتۂ گیسوئے نگاراں
اسرار شناسِ رَسَن و دار ہیں ہم لوگ

ہنگامہ گری محفلِ خوباں کی ہے ہم سے
شام و سحرِ کاکل و رُخسار ہیں ہم لوگ

ہے جیب یہ جبیں وقت کہ ہم کوہ گراں ہیں
سمجھا تھا کہ گرتی ہوئی دیوار ہیں ہم لوگ

اب تک وہی سودا ہے ہمیں جنسِ وفا کا
بازار میں اپنے ہی خریدار ہیں ہم لوگ

اُس انجمنِ ناز میں کیا کام ہمارا
تہمت زدۂ شوخیٔ گفتار ہیں ہم لوگ

اب شیخ و برہمن سے رَوش! دل نہیں مِلتا
کیا کیجیے، کافر ہیں نہ دیندار ہیں ہم لوگ

کشمیری لال ذاکر

چراغ کی لَو

پچھلے چار سالوں میں یہ جھگڑا کئی بار ہوا تھا جس روز مہندر ناتھ کی بیوی مری تھی اُس کے ٹھیک ایک ماہ بعد ہی یہ خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی۔ مہندر ناتھ کی ماں، اُس کا بھائی پُورن اور بہن جاگرتی ایک طرف تھے اور اُن کے سماج کی سب روایات اور رواج اور تجربے ہتھیار بند سینا کی طرح اُن کے ساتھ تھے، اور اُدھر مہندر ناتھ اکیلا۔ اکیلا ہی نہیں تنہا بھی، ہاتھ میں صرف ایک چراغ لئے، اپنے وشواس کا دیپک۔ دیوانہ کہیں کا، بھلا چراغ بھی کوئی ہتھیار ہے جس سے جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ اس سے تو ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کا اندھیرا بھی نہیں کٹ سکتا دشمنوں کی ڈھالیں کیا کٹیں گی۔ فوج کی رہنمائی مہندر ناتھ کی ماں کر رہی تھی۔ وہ ایک قدم اُٹھاتی تو پُورن اور جاگرتی ساری سینا کو کُوچ کا حکم دے دیتے اور جب سینا پورے طمطراق سے آگے بڑھتی تو اُس کی دُھول سارے میدان پر چھا جاتی اور مہندر ناتھ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چراغ کی روشنی ایک دم مدھم ہو جاتی جیسے دُھول کے ذرّوں نے اُس کی روشنی کو چُوس کر اُسے بے جان کر دیا ہو۔ لیکن پھر تھوڑی دیر میں دُھول چھٹ جاتی۔ گرد کے چھوٹے چھوٹے بادل زمین کے سینے سے لگ جاتے۔ فضا صاف ہو جاتی اور مہندر ناتھ کا چراغ ایک بار پھر اپنی پوری تابانی سے چمک اُٹھتا۔

اس خانہ جنگی کو چار سال ہو گئے تھے۔ فوجیں ڈیرہ ڈالے پڑی تھیں۔ فوج کے رہنما ہر دم چوکس رہتے تھے۔ جانے کب مہندر ناتھ غافل ہو اور اُس پر دھاوا بول دیا جائے۔ لیکن وہ کم بخت غافل ہوتا ہی نہ تھا۔ رسنا مری تھی تو اُسے ایک بچّی دے گئی تھی۔ وہی بچّی اُس کی زندگی بن گئی تھی۔ اُس نے بچّی کا نام سرتی رکھا تھا۔ جب وہ اُسے سرتی کہہ کر پکارتا اور اُس کے پتلے پتلے گورے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی تو وہ اُس معصوم مسکراہٹ کی لہروں میں کھوئے ہوئے یادوں کے گہرے ساگروں میں اُتر جاتا اور رسنا کے ساتھ گذرے ہوئے دن سیپ میں پڑے موتیوں کی طرح چمکنے لگتے۔ سیپیاں کھل جاتیں اور اَن گنت موتی بکھر جاتے، وہ ان موتیوں کو سمیٹنے لگتا، اور جب اُس کی جھولی بھر جاتی تو ایک زوردار لہر آتی اور اُس کے تمام موتی اپنے ساتھ بہا لے جاتی، اور اُسے اُٹھا کر کنارے پر پٹک دیتی اور پھر وہ کنارے کی ریت سے اُٹھتا اور دیکھتا سرتی اُس کی باہوں کا سہارا لئے اونگھ رہی ہے اور اُس کے ہونٹوں کے گلاب اپنی خوشبو میں منہ چھپائے سو گئے ہیں۔

رسنا سے جب اُس کی شادی ہوئی تھی تو وہ اُس کے متعلق کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ اُس نے اُس کی تصویر تک بھی نہ دیکھی تھی۔ ماں نے بیاہ کی بات پکّی کر لی اور اُس نے انکار نہ کیا۔ لیکن جب شادی ہو گئی تو اُس نے جانا کہ ماں کا چناؤ غلط نہیں تھا۔ رسنا بہت اچھی لڑکی تھی۔ اُس نے آتے ہی یہ محسوس کر لیا کہ مہندر ناتھ کے جیون میں بے انتہا انتشار تھا۔ کہیں کوئی ترتیب یا سلیقہ نہ تھا۔ سب کچھ بکھرا ہوا، اور جب رسنا نے ایک آدھ چیز کو اُٹھا کر سلیقے سے رکھنا چاہا تو مہندر ناتھ بوکھلا اُٹھا، جیسے وہ بے ترتیبی اور انتشار اُس کی زندگی کا ایک حصّہ بن گیا تھا اور اُس میں اُسے کوئی بھی تبدیلی گوارا نہ تھی۔ رسنا نے اُس کی جھلاہٹ کو محسوس کر لیا۔ اُس نے جہاں چیزیں پڑی تھیں وہیں پڑی رہنے دیں۔ صرف دُور سے دیکھتی رہی اور اپنے ذہن میں اُن کی جگہ کا تعین کرتی رہی۔ اُس نے یہ جان لیا کہ مہندر ناتھ کی زندگی کو اگر بدلنا ہے تو وہ صرف اس طرح سے کہ اُسے پتہ نہ لگے کہ اس کے اردگرد کچھ ہو رہا ہے۔ اُسے محسوس نہ ہونے دیا جائے کہ اُس کی بکھری ہوئی قوتوں کو کوئی اکٹھا کر رہا ہے۔ رسنا نے ایسا ہی کیا۔ اُس نے اُسے اپنے رُوپ کی گھنی چھاؤں میں تھپک کر سُلا دیا، اور

خود ماحول کو سنوارنے میں لگ گئی۔ وہ سویا رہا اور رسنا جاگتی رہی۔ وہ اپنے ایک ہاتھ سے جہندر ناتھ کے بالوں کو سہلاتی رہی، اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے جیون کو نکھارتی رہی اور ایک صبح جب وہ ایک گہری اور پُرسکون نیند سے جاگا تو اُس کے من میں بے پناہ شانتی اور اُس کے ذہن میں بے حد طمانیت تھی، اور جب اُس نے بھرپور نظر اپنے ماحول پر ڈالی تو رسنا کا دل دھڑک اُٹھا وہ اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور اُس کے چہرے کی کیفیت کا اندازہ کر رہی تھی۔ رسنا کے ماتھے پر پسینے کے قطرے اُبھرنے لگے اور جسم کانپنے لگا۔

"تمہارا جسم کیوں کانپ رہا ہے رسنا!" اُس نے پوچھا

"ٹھنڈ لگ رہی ہے!" رسنا نے اپنے دل کی دھڑکن کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے جھوٹ بولا

"اور یہ پسینہ!"

"یہ میری محنت کی شبنم ہے" رسنا نے اپنے پلّو سے ماتھا پونچھتے ہوئے کہا۔

اور جہندر ناتھ نے اپنے کندھے پر رکھے ہوئے اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور مسکراتے ہوئے کہا

"یوں لگتا ہے جیسے جیون کا سارا انتشار ایک دم مٹ گیا ہے"

"کیسا لگ رہا ہے آپ کو؟"

"بڑا پیارا، بڑا سندر، بڑا خوبصورت" جہندر ناتھ نے یہ کہتے ہوئے رسنا کے ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کیا، اور پھر اُس کے گالوں پر اپنی اُنگلیاں پھیرنے لگا جیسے کوئی شخص آنکھیں بند کر کے کسی مجسّمے کے خد و خال پرکھ رہا ہو، اور رسنا کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جان توڑ محنت کے بعد وہ ایک دم تازہ ہو گئی تھی۔

رفتہ رفتہ جہندر ناتھ اس نئے جیون کا عادی ہو گیا۔ ایک بندھی ہوئی رفتار، ایک ٹھہرا ہوا بہاؤ، گرہستی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں جن میں خلوص اور پیار تھا جس میں ماں کی ممتا تھی۔ بھائی کا احساس تھا، بہن کی محبّت تھی، اور رسنا کی لگن کی مٹھاس۔ سب کچھ بہت اچھا تھا جیون جس سے جہندر ناتھ کبھی مطمئن نہ تھا ایک دم پُرکشش بن گیا تھا، اور اُسے یوں لگنے لگا تھا جیسے جیون میں کہیں کوئی خامی نہ تھی۔ کہیں کوئی کمزور پہلو نہ تھا، کہیں کوئی کچّا پن نہ تھا۔ جیون ایک دم مکمل، شکتی شالی اور سندر تھا۔

اور پھر ایک شام رسنا اُن سب سے روٹھ کر یوں چلی گئی جیسے اس گھر سے اُسے کبھی کوئی لگاؤ ہی نہ تھا۔ جیسے اُس نے جہندر ناتھ کو کبھی پیار نہ کیا تھا۔ جیسے ماں، پُورن اور جاگرتی کو وہ کبھی جانتی ہی نہ تھی۔ دو سال کا طویل وقفہ سمٹ کر ایک نقطہ بن گیا۔ زندگی کی ندی صحرا میں آ کر یوں ایک دم سُوکھ گئی تھی جیسے اس کا کبھی کہیں وجود ہی نہ تھا۔ برسات کی ایک شام کو جب چھاجوں پانی برس رہا تھا رسنا اُن سب کو چھوڑ کر کہیں چلی گئی، اور اپنے پیچھے سمرتی کو چھوڑ گئی۔

رسنا

برسات کی ایک شام

اور سمرتی!

جہندر ناتھ کی زندگی کا محور مسلسل بارشوں سے کمزور پڑ چکی چٹان کی طرح لڑھک گیا۔ ماں، پُورن اور جاگرتی نے تھوڑے ہی سمے میں گھر کی ٹوٹی ہوئی دیواریں دوبارہ بنا لیں، کواڑ مرمّت کرائے اور صحن کے گڑھے بھر ڈالے۔ ڈیوڑھی کے ساتھ لگی ہوئی چنبیلی کی بیل نے دوبارہ پھول دینے شروع کر دئے اور سب بھول گئے کہ کبھی رسنا ان پھولوں کو اپنے بالوں میں لگایا کرتی تھی۔ ایک جہندر ناتھ تھا جسے یہ کبھی نہ بھولتا تھا۔ جب بھی چنبیلی کی بیل میں کوئی پھول کھلتا اُسے فوراً رسنا کے لمبے لمبے کالے بال یاد آ جاتے اور اُس کا ہاتھ آپ سے آپ چنبیلی کی ڈالیوں تک پہونچ جاتا، اور پھر پھول کو لئے کچھ لمحوں تک وہ جانے کیا سوچتا رہتا، اور اسی لمحہ سمرتی کسی کمرے سے نکل کر آنگن میں آ جاتی۔ اور جہندر ناتھ کے چہرے پر آسودگی اُبھرنے لگتی، وہ سمرتی کو بازوؤں میں اُٹھا کر چوم لیتا اور پھر اُسے اندر لے جاتا اور اُس کے بالوں میں کنگھی کرتا، اُن میں سُرخ سُرخ ربن باندھتا اور پھر چنبیلی کا سفید پھول اُس کے بالوں میں لگا دیتا، اور پھر اُسے بازوؤں میں اُٹھائے سارے گھر میں گھومتا۔

"سمرتی اچھی لگتی ہے نا، جاگرتی؟"

"ہاں بھیّا"

"اچھی لگتی ہے نا پُورن؟"

"ہاں"

"ماں، اچھی لگتی ہے نا سمرتی"؟

"ہاں، پر تو شادی کیوں نہیں کر لیتا اب؟" ماں کہتی

"سمرتی کے بال اور خوبصورت ہو جائیں گے۔"

"چمیلی کا پھول اور زیادہ مہک دے گا۔"

"تمھارا جیون سُکھی ہو جائے گا۔"

اور جاگرتی، پورن اور ماں تینوں اُس پر برس پڑتے۔ ایسے ہی سمے میں وہ اپنے آپ کو کمزور پانے لگتا تھا اور اُس کے سامنے کھڑی فوجیں پوری طاقت سے اُس پر حملہ کر دیتی تھیں۔ یہی وہ لمحہ ہوتا تھا جس سے وہ ڈرتا تھا اور ایسا لمحہ کبھی نہ کبھی آ ہی جاتا تھا۔

اس لمحے وہ سوچنے لگتا۔ جاگرتی کا اگلے چھ مہینوں میں بیاہ ہو جائے گا، اور وہ اپنے گھر چلی جائے گی۔ پورن اپنا گھر بسا کر الگ ہو جائے گا۔ رہ جائیں گے وہ اور اُس کی ماں اور سمرتی۔ ماں بوڑھی ہو گئی ہے، اب بے چاری سے گھر نہیں سنبھالا جا سکتا۔ سمرتی کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ وہ کہاں تک کر سکتا ہے۔ ایک بالوں میں کنگھی کر دینے اور فراک بدل دینے سے تو تمام ذمہ داریاں ختم نہیں ہو جاتیں۔ ایک معصوم بچّے کو تو ماں کا بھرپور پیار اور وشواس چاہیئے۔ ایک جوان عورت کی محبت جس میں حرارت اور زندگی ہے۔ اُس کی ماں کے پاس محبت اور پیار کی کمی نہیں۔ لیکن اس پیار میں اب تھکن آ گئی ہے، اُس میں وہ حرارت نہیں، زندگی دینے والی وہ قوت نہیں، اور پھر اُس کے نظریے نصف صدی پیچھے کے نظریے ہیں، جو اگلی صدی میں جینے والی نسل کے کام نہ آ سکیں گے۔ سمرتی اگلی نسل کی نمائندہ ہے اور ماں گذری ہوئی صدی کی امانت دار۔ دونوں کا یہ بنیادی اختلاف نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن پھر بھی وہ اِن سب باتوں کو نظر انداز کئے ہی جا رہا تھا۔

جب کہیں کسی رشتے کی بات چلتی وہ ایک دم بھنّا اُٹھتا، اور گھنٹہ بھر کی چخ چخ اور گرماگرمی کے بعد معاملہ ختم ہو جاتا، اور پھر ایک دن جاگرتی کا بیاہ ہو گیا اور وہ چلی گئی اور جاتے سمے اُس نے سمرتی کو بے حد پیار کیا، اب وہ اُسے چھوڑ جو رہی تھی، اور پھر پورن تبدیل ہو کر کانپور چلا گیا اور جانے سے پہلے سمرتی کو دن بھر بازار کی سیر کراتا رہا اور اُس کے لئے کھلونے خریدتا رہا۔ جیسے اپنے کسی ضروری فرض کی آخری کڑیاں جوڑ رہا ہو۔

اور جب جاگرتی اور پورن چلے گئے تو گھر ایک دم سُونا اور ویران ہو گیا۔ اُسے پہلی بار اس شدت سے احساس ہوا کہ رسنا واقعی اُسے سدا کے لئے چھوڑ گئی تھی۔ اُس کی بچی بے ماں کے تھی اور خود وہ ایک ساتھی کے پیار اور خلوص سے محروم ہو گیا تھا۔

پورن اور جاگرتی کے جانے سے وہ فوجیں بھی کمزور پڑ گئیں جو اُس پر اکثر حملہ کر دیا کرتی تھیں۔ اب ماں نے بھی اُن کی رہنمائی کرنا چھوڑ دی تھی۔ اُس نے اب یہ سمجھ لیا تھا کہ مہندر ناتھ اُس کے کہنے سے بیاہ نہ کرے گا۔ یوں روز روز کی جھک جھک سے کیا لابھ۔ مہندر ناتھ کالج میں پروفیسر تھا۔ صبح سویرے کالج چلے جاتا اور شام کو واپس آتا کالج کھلے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے کام زیادہ تھا۔ جانے کی پابندی تو تھی لیکن واپس آنے کا کوئی وقت نہ تھا۔ وہ شام کو گھر لوٹتا تو سمرتی اُس کی راہ دیکھ رہی ہوتی۔ مہندر کو دیکھ کر اُس کے اُداس چہرے پر ایک دم رونق آ جاتی۔ مہندر ناتھ اُسے گود میں اُٹھا کر خوب پیار کرتا اور پھر چائے پی چکنے کے بعد اُسے باہر گھمانے لے جاتا۔ اُس سے جو کچھ بن پڑتا وہ کرتا۔ لیکن پھر بھی اُسے محسوس ہوتا کہ سمرتی کو کسی چیز کی ضرورت تھی، جو وہ اُسے نہیں دے سکتا تھا۔ جاگرتی کے ہوتے وہ اتنی کھوئی کھوئی سی نہ رہتی تھی۔ اب جانے اُسے کیا ہو گیا تھا تو کیا صرف جاگرتی کے جانے سے ایسا ہوا تھا۔ یا ایک جوان عورت کے پیار سے محروم ہو جانے کا نتیجہ تھا۔ کچھ تھا جسے وہ سمجھ نہ پا رہا تھا۔

آج کالج کا پہلا کانووکیشن تھا اور دیش کے ایک بہت بڑے نیتا سندیں تقسیم کرنے آ رہے تھے۔ آج وہ دن بھر کالج میں مصروف رہا۔ شام کو تھوڑی دیر کے لئے گیا۔ وہ بھی اس خیال سے کہ سمرتی کو دیکھ آئے۔ بے چاری اُداس رہے گی۔ گھر گیا تو سمرتی نے بھی اُس کے ساتھ کالج چلنے کی ضد کی۔ موسم اچھا نہیں تھا اور بارش کے آثار تھے۔ وہ اُسے ساتھ لے جانا چاہتا تو نہ تھا، لیکن سمرتی نے جب رونا شروع کر دیا تو اُسے لے ہی جانا پڑا۔

کالج کے کھلے میدان میں جلسے کا انتظام تھا۔ شامیانے لگے تھے۔ اسٹیج تیار تھی اور مہمانوں کے لئے کرسیاں لگی تھیں۔ اُس نے سمرتی کو پہلی قطاروں میں ایک کرسی پر بٹھا دیا، اور پاس ہی بیٹھے ہوئے

اپنے ایک دوست سے اُس کا دھیان رکھنے کو کہہ دیا اور خود پرنسپل کے ساتھ پروگرام مرتب کرنے میں مصروف ہوگیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ بارش ہونے لگ گئی۔ اُس نے اسٹیج پر کھڑے کھڑے ہی دیکھا کہ مسٹر اور مسز کپور پنڈال میں داخل ہوئے تھے۔ مسٹر کپور یہاں کے ایک مجسٹریٹ تھے اور اُسے اچھی طرح جانتے تھے۔ کرسیاں تقریباً بھر چکی تھیں۔ مسز کپور نے سمرتی کو اُٹھا کر اپنی گود میں لے لیا اور خود وہاں بیٹھ گئی، اور اُس کے ساتھ والی کُرسی ایک صاحب نے مسٹر کپور کے لئے خالی کر دی۔

بارش ایک دم زور پکڑ گئی اور اس زور کی بارش میں ہی صاحب صدر جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ اب اسٹیج پر زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ پرنسپل نے اسٹیج کو خود ہی سنبھالا اور مہندر ناتھ کسی خالی کرسی کی تلاش میں قطار کے آخری سرے پر قنات کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ بارش کا زور اور بھی بڑھ گیا تھا اور شامیانوں میں سے پانی ٹپکنے لگا تھا۔ میدان میں پانی بھر گیا تھا، اور لوگوں کے پاؤں گیلے ہونے لگے تھے۔ مہندر ناتھ کے آس پاس بھی بوچھاڑ پڑ رہی تھی۔ وہ وہیں کھڑا مسز کپور کو دیکھ رہا تھا جس نے سمرتی کو اپنی گود میں بٹھا رکھا تھا۔

مسز کپور خاصی خوبصورت عورت تھی۔ اُس کے تین بچے تھے۔ لیکن جسم کی بناوٹ میں ذرہ بھر فرق نہ پڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا وہ جسم کو استعمال کرنے سے زیادہ اُسے سنبھالنے کی قائل تھی۔ مسٹر اور مسز کپور کی کرسیوں کے اوپر اب تک پانی نہ ٹپکا تھا۔ ورنہ ان کے اِرد گرد بیٹھے لوگ خاصے پریشان ہو رہے تھے۔ مہندر ناتھ غور سے دیکھ رہا تھا مسز کپور کو۔ اُس نے دائیں بازو کے حلقے سے سمرتی کو سنبھالا ہوا تھا۔ اسی سمے شامیانے سے بوندیں ٹپکنے لگیں اور ساری بوندیں سمرتی کے سر پر گرنے لگیں۔ مہندر ناتھ کو خیال آیا کہ وہ آگے بڑھ کر سمرتی کو مسز کپور سے لے لے اور اُسے خود محفوظ کر لے۔ پھر جانے وہ کیوں رُک گیا۔ اسٹیج پر پروگرام شروع تھا۔ کالج کی ایک لڑکی ملہار گا رہی تھی اور آسمان سے خوب پانی برس رہا تھا۔ سمرتی نے ایک بار حیران نظروں سے شامیانے کی طرف دیکھا جہاں سے پانی گر رہا تھا اور پھر اُس کی آنکھیں مسز کپور کے چہرے کی طرف اُٹھیں جیسے پوچھ رہی ہوں کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ مسز کپور نے سمرتی کو اپنی دائیں ران سے سرکا کر بائیں ران پر بٹھا لیا۔ اب شامیانے سے ٹپکتا ہوا پانی سمرتی پر نہیں مسز کپور پر گر رہا تھا۔ مہندر ناتھ نے دیکھا اُس نے بائیں بازو سے سمرتی کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ بارش اسی تیزی سے ہو رہی تھی۔

پروگرام چل رہا تھا۔

بارش ہو رہی تھی۔

اور مسز کپور بنا یہ جانے کہ سمرتی کون تھی، اُسے بارش سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں خود بُری طرح بھیگ گئی تھی۔

سمرتی مسز کپور کے سینے سے لگے لگے ہی سو گئی تھی۔ اُسے مسز کپور کے بھیگے ہوئے کپڑوں اور اس کی اجنبیت کا قطعی خیال نہ تھا۔ وہ ماں سے محروم تھی، لیکن ممتا کی چاہ اُس کے معصوم سینے میں اُسی شدت سے تھی۔

مہندر ناتھ نے دیکھا مسٹر کپور اپنی بیوی سے کچھ کہہ رہے تھے۔ شاید پُوچھ رہے تھے کہ وہ لڑکی کون تھی جسے وہ اس طرح اپنی گود میں بٹھائے ہوئے تھی۔ معلوم ہوتا تھا مسز کپور نے اپنے خاوند کی بات کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ مسٹر کپور نے گردن گھما کر آس پاس کی کرسیوں پر بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھا، یہ جتانے کے لئے کہ اُس لڑکی کے والدین میں سے کوئی ہو تو اُسے لے لے۔ مسز کپور نے شاید اسے بُرا سمجھا اور اپنے خاوند کو غصیلی نظروں سے دیکھ کر سمرتی کو تھپکنے لگی۔

نئے گریجویٹ لڑکے اور لڑکیوں کو سندیں تقسیم ہو چکیں تو مہندر ناتھ کا دوست جس کے ذمے وہ اپنی بچی کو لگا کر آیا تھا اُٹھ کر اُس کے پاس آیا۔ اب بارش بہت ہلکی ہو چکی تھی، پر شامیانوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔

"اب تو اپنی بچّی کو سنبھالو، بے چاری مسز کپور کے کندھے بھی دُکھنے لگے ہوں گے" مہندر ناتھ کے دوست نے کہا، اور جب وہ کرسیوں کی اُس قطار کی طرف بڑھنے لگا تو پردھان نے اپنی تقریر شروع کر دی، وہ پھر رُک گیا۔

سمرتی مزے سے سو رہی تھی۔

تقریر ختم ہوئی تو وہ مسز کپور کے پاس گیا۔

"آپ کو بہت تکلیف ہوئی مسز کپور، شکریہ"

"تو یہ بچّی آپ کی ہے؟" مسز کپور نے پوچھا، اور مسٹر کپور بھی مسکرائے۔

"ہیلو، کیا حال ہیں مہندر جی؟"

"عنایت ہے"

" [illegible] وہ بچی ہے جس کی خاطر آپ شادی نہیں کر رہے ؟" مسز کپور نے پوچھا۔

"آخر کیوں ؟"

"میرا وشواس ہے کہ کوئی بھی عورت کسی غیر کے بچے سے پیار نہیں کر سکتی۔

"کیوں نہیں۔ ہر نارمل عورت ہر بچے سے پیار کر سکتی ہے، پیار کرنا اُس کی فطرت ہے" مسز کپور نے کہا

"اب کے خدا کے لئے شادی ہیندر صاحب " مسز کپور مسکرائے۔

ہیندر ناتھ نے سمرتی کو مسز کپور کے بازوؤں سے لیا تو اُس کی معصوم بھینچی ہوئی اُنگلیوں میں مسز کپور کی ساڑھی کے پلّو کا کچھ حصّہ پکڑا ہوا تھا۔ ہیندر ناتھ نے چھڑانا چاہا تو مسز کپور نے ٹوک دیا۔

" ایسے نہیں" مسز کپور نے بڑی آہستہ سے دھیرے دھیرے اُن پتلی پتلی اُنگلیوں میں سے اپنے گیلے پلّو کو کھسکا لیا اور پھر دھیرے سے مسکراتی ہوئی مسز کپور کے ساتھ پنڈال سے باہر نکل گئی۔

ہیندر ناتھ وہیں الگ شامیانے کے ایک بانس کے ساتھ کھڑا ہو گیا لوگ پنڈال سے باہر نکل رہے تھے۔ بارش رُک گئی تھی۔ پردھان اسٹیج سے اُتر کر اپنی کار کی طرف چلا گیا تھا۔ ہیندر ناتھ ابھی تک وہیں کھڑا تھا اور مسز کپور کی بات کے متعلق سوچ رہا تھا" ہر نارمل عورت ہر بچے کو پیار کر سکتی ہے۔ پر کیا ہر عورت نارمل ہو سکتی ہے ؟ اور کیا وہ اپنے طبقے کے غیر صحت مند ماحول میں کبھی کسی نارمل عورت کو ڈھونڈ سکے گا ؟ سمرتی اس کے کندھے سے لگی سو رہی تھی، اور وہ غیر ارادی طور پر اُس کی پیٹھ سہلائے جا رہا تھا۔

اُس کا چہرہ یوں بجھ گیا تھا جیسے جلتے ہوئے چراغ پر کسی نے پانی اُنڈیل دیا ہو۔

پدولن سنگھ شہزؔ

غزل

حُرمتِ اہلِ خرابات کہاں تک پہنچی
چشمِ ساقی کی کرامات کہاں تک پہنچی

ایک چلّو سے شروعات کہاں تک پہنچی
بخششِ پیرِ خرابات کہاں تک پہنچی

تختۂ دار کہیں، برقِ سرِ طور کہیں
شدّتِ شوقِ ملاقات کہاں تک پہنچی

دامنِ صبحِ قیامت سے بندھا ہے دامن
کیا کہوں ہجر کی یہ رات کہاں تک پہنچی

حالِ آغازِ مراسم تو نہاں ہے اب تک
خبرِ ترکِ ملاقات کہاں تک پہنچی

رازِ سربستہ تھی جب تک تھی تمنّا دل میں
آ گئی لب پہ تو یہ بات کہاں تک پہنچی

عرش بھی عالمِ حیرت نظر آیا ہم کو
تیری دُنیائے طلسمات کہاں تک پہنچی

کٹ گئی اہلِ طرب کی شبِ عشرت پل میں
غم کے ماروں کی ہنر رات کہاں تک پہنچی

غلام احمد فرقت

اور جب ہم بی اے پاس ہوئے

آپ چاہے مانیں یا نہ مانیں، اور اس حقیقت کو تسلیم کریں یا
ریں مگر موجودہ دورِ جمہوریت کا یہ ایک اٹل اور متفقہ فیصلہ ہے
علم و ادب کے تمام مدارج طے کر لینے کے بعد بھی سب سے بڑا جاہل
وہ ہے جو گریجویٹ نہیں، اور اپنی جملہ جہالتوں کے باوجود سب سے
ا عالمِ وقت وہ ہے جسے کسی یونیورسٹی سے بی۔ اے کی سند حاصل ہے۔
ت یہ ہے کہ اب سے چالیس پچاس برس قبل بی۔ اے کی ڈگری ایک
بسا کارآمد تعویذ اور ایک ایسی جادو کی پڑیا ثابت ہو چکی ہے کہ آپنے
دھر اس کو استعمال کیا اُدھر کھل جا سم سم کی آواز کے ساتھ ملازمت
ے دروازے کھل گئے اور آپ نے مٹھیاں بھر بھر کر اپنے دامن فلاں
رشوتوں اور مقررہ تنخواہوں سے پُر کرنا شروع کر دیا بی۔ اے کی
ڈگری معیارِ علم، معیارِ قابلیت اور معیارِ ذہانت تصور کی جاتی تھی۔
ں ڈگری گھر والوں اور بزرگوں سے ہر معاملے میں مشورہ طلب کرواتی
ں اور اِسی پر سوسائٹی میں عزت اور ذلت کا دارومدار رہتا۔ والدین
ہ صاحبزادے کے ہاتھ میں بی۔ اے کی ڈگری دیکھی اور سمجھ گئے کہ
احبزادے اپنی جملہ جہالتوں کے باوجود قابل ہو گئے۔ اِس کے
عد اگر خاندان میں کوئی کٹھن سے کٹھن مسئلہ پیش ہوا تو سب نے آنکھ
د کرکے مشورہ دیا کہ شفاء الملک حکیم بی۔ اے پاس صاحب سے رجوع
یے۔ اِس معاملے میں صحیح مشورہ وہی دے سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ بی۔ اے
س ہیں۔ چنانچہ اُن کو بُلا کر سب سے پہلے اُن کی بی۔ اے پاس رائے
ریافت کی جاتی تھی، وہ باوجود گھریلو اور شادی بیاہ کے معاملے میں
تجربہ کار اور ناواقف ہونے کے معاملے کو آنکھیں بند کرکے اِس طرح
نتے کہ گویا سمجھ بھی رہے ہیں۔ پھر دو ایک مرتبہ متفکرانہ انداز میں سر کھجاتے
ور شادی کے معاملے کو بجائے عقل سے بتانے کے علمِ ریاضی سے حل کرکے

کہ اگر لڑکی فلاں فلاں خاندان اور فلاں فلاں امتحان پاس ہے اور
اِن اِن صلاحیتوں کی حامل ہے تو اُس کو فلاں فلاں لڑکے کے گلے
منڈھا جائے تو اِس سے اُس کی آئندہ زندگی خوش حالی اور فارغ البالی
سے بسر ہوگی، اور اُس سے ایک ایسا مرکب بن جائے گا جو ہر کانٹے کا مفتر ہوگا۔
چنانچہ ان کی اِس رائے کو ایک فلسفی، ایک مفکر اور ایک نجومی کی رائے
سمجھ کر قبول کر لیا جاتا، اور ہر شخص واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازیں
بلند کرتا۔ رفتارِ زمانہ نے اِس چیز کو ایک رسم کی شکل دے دی، اور اب
اِس دورِ جہالت میں بھی وہ جُوں کی تُوں سینہ بسینہ چلی آ رہی ہے اور
آج کل بھی بی۔ اے پاس صاحبزادے کی دستار بندی اُسی پُرانی وضع
پر ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بی۔ اے پاس لڑکیاں اور لڑکے اپنے
آپ کو افلاطونِ وقت اور سقراطِ دوراں سمجھتے ہیں اور بی۔ اے پاس
کرنے کے بعد اُن کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ایسے پندرہ سال قبل جب ہم نے بی۔ اے پاس کیا تو
اُس وقت بی۔ اے کی ڈگری ایک بھاری بھرکم چیز سمجھی جاتی تھی۔ بی۔ اے
پاس کی شہرت کسی طرح اُس زمانے میں ملیح آباد کے آموں کی شہرت سے
کم نہ تھی۔ اِسی لئے اُس وقت سے پہلے کے بعض گریجویٹ اب تک اپنے
نام کے آگے بی۔ اے لکھنا فخر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب ہمارے بی۔ اے کا
نتیجہ شائع ہوا اور ہمارا نام اخبارات میں آیا تو دل چاہا کہ اس اخبار
کا ایک بش شرٹ بنوا لیں اور درزی کو ہدایت کر دیں کہ دیکھ اخبار میں
جس جگہ ہمارا نام چھپا ہے وہ ہمارے سینے کے بیچوں بیچ آئے تاکہ
چلتے پھرتے لوگوں کو اندازہ ہو کہ یہ انسان کم اور بی۔ اے زیادہ
ہے۔ گھر میں ہفتوں جب کوئی ہمارا اکہرا نام لے کر ہم کو پکارتا اور بی۔ اے
کا لفظ چھوڑ دیتا تو ہم اُس شخص کی آبرو کے درپے ہو جاتے۔ دل چاہتا

کہ کس طرح ہم اُس کا منہ کھسوٹ لیں۔ اُس کی بوٹیاں نوچ ڈالیں، اُس کی ابیان کھینچ لیں، اور اُس کو یقین دلادیں کہ اِس زمین و آسمان کے نیچے اور اِس چمکتے اور جگمگاتے سورج کی روشنی میں جس کی چمک سے چمگادڑوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، اُس اخبار کو پڑھے جس میں ہمارا بی۔ اے کا نتیجہ شائع ہوا ہے، اور آئندہ سے بغیر بی، اے کے ہم کو پکارنا ایک بہت بڑا اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور سماجی جرم ہے اور آخر اب کون سی چیز مانع ہے جو وہ ہم کو یہ کہہ کر مخاطب نہیں کرتا کہ جناب بی، اے صاحب سلام عرض کرتا ہوں۔ مجرا قبول ہو تسلیمات بجا لاتا ہوں۔

غرض امتحان کا نتیجہ کیا شائع ہوا، مراد آباد میں مردہ زندہ ہو گیا، ہم نے سب سے پہلے بازار جا کر ایک نہایت نازک اندام قسم کی چھڑی خریدی، اور روزانہ شام کو چھڑی لے کر ایک خاص مفکرانہ اور بی، اے پاس انداز میں چھڑی گھماتے بھرے مجمعوں میں چیرتے پھاڑتے ایک خاص شانِ استغنا کے ساتھ نکلنے لگے۔ اِس اُمید پر کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ دوست یا ملاقاتی ہم کو بی، اے کہہ کر پکارے، اور ہم بڑے رعب سے اُس کی آواز پر لبیک کہہ کر دنیا پر واضح کر دیں کہ اگر کسی بی، اے کو اس طرح کھلی حالت میں دیکھنا ہو تو دیکھ لو، ورنہ اِس دیدارت کو ترس جاؤ گے۔ بی، اے پاس آواز کی بھنک اور چمک دمک سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاؤ گے۔

برسوں لگی ہوئی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب ہم سا کوئی بی، اے اس ارض پر ہوئے ہے

شروع شروع میں دل چاہا کہ اگر ہمارے بی، اے پاس کے پوسٹر یا ہینڈ بل شہر کے ہر در و دیوار پر چسپاں ہو جاتے تو اچھا تھا، اور اگر یہ نہیں تو اخبارات اور رسائل میں ہمارا فوٹو ہی شائع ہو جاتا کہ آپ سے ملئے جنھوں نے امسال بی، اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ آپ بی، اے ہیں اور بہت ہی بی، اے ہیں۔ غرض دو ڈھائی مہینے ہم پر یہی کیفیت طاری رہی۔ اس کے بعد مختلف جگہوں کے لئے ہم نے درخواستیں دینے پر غور کرنا شروع کیا۔ تنہائی میں کاغذ پر اپنے نام کے ساتھ بی، اے لکھ کر اور کاغذ کو نوٹ کی طرح گھما کر پورٹ بیچم اور اتر دکھن کر کے دیکھتے رہے اور سوچتے رہے کہ جب ہم کو یہ چیز اتنی بھلی لگتی ہے تو نہ جانے دوسروں کا اِس کو پڑھ کر کیا حال ہوتا ہوگا۔

خاص پائے تخت لندن سے نکلنے والے انگریزی اخبارات میر وائمس کے کالموں کو پڑھ کر بڑی بڑی جگہوں کو اپنی بی، اے کی ڈگری پر منطبق کر کے دیکھتے رہے کہ کس پر ہماری بی، اے کی ڈگری پوری اُترتا ہے۔ مگر اس مقابلے میں بیشتر جگہیں ہم کو سباک اور ہلکی محسوس ہوئیں کوئی واحد جگہ ہم کو اپنی ڈگری کی متحمل نہیں دکھائی پڑی۔ اِس کے بعد کسی اردو اخبار میں ایڈیٹر یا جوائنٹ ایڈیٹر ہونے کے خیال نے ہمارے دل کو گدگدانا شروع کیا۔ اخبار کا خیال اِس وجہ سے آیا کہ اس میں ہمارے نام کے ساتھ بی، اے شائع ہوتا رہے گا، اور کبھی ہم اور کبھی ہماری بی، اے کی ڈگری یکے بعد دیگرے ضربیں لگاتی ہوئی پبلک کے دل دماغ پر مسلط ہوتی رہے گی، اور دنیا ہمارے بارے میں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوگی کہ یہ آدمی کم اور بی، اے زیادہ ہے۔ مگر تین چار سال اِسی اُدھیڑ بُن میں گذر گئے، اور ہم بی، اے کی ڈگری اپنے کھوّے پلنگ پر لئے پڑے رہے۔ اب ہم نے سوچا کہ چلو اِس بی، اے کی ایٹمک انرجی کو کسی اُردو اخبار پر جا کر آزمایا جائے۔

سب سے پہلے ہم نے اپنا وزیٹنگ کارڈ چھپوایا، اور پریس کے کمپوزیٹر کو ہدایت کر دی کہ دیکھو ہمارے نام سے زیادہ جلی حروف میں بی، اے کا لفظ رہے گا، ورنہ ہم ایک پیسے کے دوال نہ ہوں گے۔

ان وزیٹنگ کارڈوں کا ایک پورا پیکیٹ جیب میں ڈال کر ہم ایک اُردو روزنامے کے دفتر پہنچے، اور ایڈیٹر صاحب کو بہ آواز بلند گڈ مارننگ کہہ کر ہم نے اونچے انداز میں اپنا تعارفی کارڈ پیش کیا اور بغور دیکھتے رہے کہ ہماری بی، اے کی کرنٹ اُن کے کتنی زور سے لگتی ہے۔ مگر ہم کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اُن پر کوئی اثر ہی نہ ہوا۔ دل نے کہا کہ یا تو یہ لکڑی پر بیٹھنے کا اثر ہے یا وہ ہمارے کارڈ میں بی، اے کا لفظ پڑھنے سے قاصر رہے۔ انھوں نے قدرے معذرتی انداز میں ہم سے یہ ضرور کہا کہ تشریف رکھئے، یہ فقرہ ختم کر لوں تو آپ سے بات کر دوں۔ اس کا مفہوم ہم یہ سمجھے کہ یہ تشریف رکھنے کا لفظ اُنھوں نے ہم سے مرعوب ہو کر کہا ہے، اور نصف حصّہ کارڈ یعنی صرف ہمارے نام ہی سے جب یہ شخص اتنا زیادہ مرعوب ہے تو "مع بی، اے کے" اگر وہ پورا کارڈ

پڑھ لیتے تو نہ جانے اُن پر کیا اثر ہوتا۔ غالباً سہما سہما کر اُنھوں نے متحمل ہونے کی کوشش میں یہ سب کچھ کہا۔ انسان جب گرم چائے پیتا ہے تو بھی بہت پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ پھر ہماری صلاحیتیں کسی طرح آتش نمرود سے کم نہیں۔ بہرصورت ہم نے اُن کے اس فقرے کو اُن کے نحیف الجثہ ہونے پر محمول کیا اور بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے ہم سے ہمارا صحافتی تجربہ پوچھا جس میں ذرا ہم رعب کھا گئے۔ مگر ایسا رعب نہیں جس سے ہماری بی، اے کی ڈگری پر خدانخواستہ آنچ آتی ہو۔ ہم اُن کے ہر سوال کے جواب میں اپنے بی، اے پاس ہونے پر زور دیتے رہے۔ آخر میں اُنھوں نے ہم سے کہا کہ ہم کو ایک مترجم کی ضرورت ہے، آپ دو ایک روز کام کر کے دیکھئے، پھر معاوضے کے بارے میں آپ سے گفتگو ہو جائے گی۔ دل نے اندر سے کہا کہ دیکھو ہم نہ کہتے تھے کہ آدمی بی، اے پاس ہو تو ایڈیٹر صاحب پر رعب پڑتا ہے۔ غالباً دفتر تنخواہ کا بیک وقت متحمل ہوتے اور اس کا یقین کرتے ڈرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کس اُردو اخبار میں دم ہے جو ایک بی، اے پاس ہاتھی ایکا ایکی باندھ سکے گا۔ یہ سوچ کر ہم نے دفتر کے اوقات دریافت کئے اور گھر واپس آ گئے۔

دوسرے روز نوک پلک سے درست، پان اور سگرٹ کی ڈبیا جیب میں ڈال کر ہم منٹ منٹ پر سگرٹیں سلگاتے اور کش پر کش لگاتے مقررہ وقت پر دفتر پہنچے۔ اس دفتر کا ادارۂ تحریر تین افراد پر مشتمل تھا۔ ایک ایڈیٹر صاحب خود، دوسرے ایک ریشائیل بزرگ جو شاہ صاحب کہلاتے تھے۔ یہ شاہ صاحب حضرت نوح کے ہم عصر محض مڈل تک انگریزی پڑھے تھے۔ تیسرے صاحب ادھیڑ عمر اور ہائی اسکول تھے۔ صرف ایڈیٹر صاحب جو عمر میں پچاس پچپن کے لگ بھگ ہوں گے۔ بی، اے تھے۔ گویا ہمارا مد مقابل اگر کوئی اس دفتر میں تھا تو وہ ایڈیٹر صاحب تھے، اور وہ بھی کیا عمر سے ڈھلے اور ادھر اُدھر سے نکلے۔ چونکہ ہم یونیورسٹی سے تازہ وارد تھے اس لئے اردو زبان میں انگریزی بولتے تھے۔ برخلاف انگریزی لب و لہجہ میں طلب کرتے۔ کاتب اور محلے کے دوسرے لوگ ہم کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے اور ہم اپنی جگہ پر یہ سمجھتے کہ غالباً ہم دوسرے بی، اے ہیں جو آج اُن کو اس دفتر میں اس طرح کھلی حالت میں دکھائی

پڑے ہیں۔ ورنہ عام طور پر بی، اے برسوں گھر سے کب نکلتے ہیں۔ پہلے دن ایڈیٹر صاحب نے انگریزی اخبار میں سے تین غیر ملکی خبروں پر نشان بنا کر دیا اور کہا کہ آپ ان کا ترجمہ کیجئے۔ ہم نے قلم برداشتہ ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ مگر ہمارے ترجمے کو عام ترجموں پر یہ فضیلت حاصل تھی کہ ہمارے بیاں زیادہ الفاظ انگریزی کے تھے جن کو ہم نے اُردو رسم الخط میں لکھ چھوڑا تھا، بقیہ اُردو کے الفاظ بھی وہ تھے جو عام طور پر اُردو اخبارات میں استعمال نہیں ہوتے، چونکہ اخبار میں ترجمہ کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا، اور زیادہ تر انگریزی ہی کی کتابیں زیر مطالعہ رہی تھیں، اس لئے ہم اُس ترجمے کو یہ سمجھے کہ اب ہمارے ترجموں سے اُردو صحافت میں بی، اے پاس ترقی پسند ترجموں کے ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ بہرصورت ہم نے بغیر جھجک محسوس کئے تینوں خبروں کے ترجمے ایڈیٹر صاحب کے حوالے کر دیئے۔ ایڈیٹر صاحب ایڈیٹوریل لکھنے میں مصروف تھے۔ جب وہ اپنا کام ختم کر چکے تو اُنھوں نے ہمارے پہلے پرچے پر نگاہ کی۔ ہم آنکھیں بچا بچا کر اُن کی طرف دیکھتے جاتے تھے کہ دیکھیں ہماری ڈگری کا کس کس عنوان سے اُن پر رعب پڑ رہا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اُن کی آنکھیں جوں جوں ہمارے ترجمے کو پڑھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں وہ زیادہ سے زیادہ کھلتی اور پھیلتی جاتی تھیں، اور ساتھ ہی ساتھ اُن کے لبوں کی سنجیدگی مسکراہٹ سے ہم کنار ہوتی جاتی تھی ہم سمجھے کہ خبر ختم ہونے کے بعد وہ پر زور الفاظ میں ہماری قابلیت کا اعتراف کریں گے اور کہیں گے کہ آپ تو مادر زاد مترجم ہیں۔ مچھلی کے بچوں کو تیرنا کون سکھائے۔ مگر انھوں نے سُرخ روشنائی والا قلم اُٹھا کر ہمارے ترجمے پر خط تنسیخ کھینچ دیا اور بقیہ دو خبروں کو بغیر پڑھے ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ آپ دو ایک روز اردو اخبار پڑھ کر انگریزی کے مترادف الفاظ لکھنے کی مشق کیجئے۔ اس کے بعد صحافت کے پیشے سے ہمارا دل کھٹا ہو گیا کیونکہ ہم یہ چاہتے تھے کہ ہرا لگے نہ پھٹکری مگر رنگ چوکھا آئے۔ لہٰذا اب ہم غور کرنے لگے کہ ہماری بی، اے کی ڈگری کہاں کہاں بغیر کسی زحمت کے پوری پوری فٹ ہو سکتی ہے۔ سوچتے سوچتے یہ سمجھ میں آیا کہ ملازمت کا خیال ترک کر کے پہلے شادی کر ڈالو۔ شادی بیاہ میں ہماری بی، اے کی ڈگری ہمارے حسب منشا براہ راست فٹ بیٹھے گی۔ یہ خیال آتے ہی ہم اُچھل پڑے۔ ہم نے کہا کہ بس اب طے کر لیا کہ پہلے شادی کریں گے۔ اولاد کم پیدا

کریں گے اور روپیہ دیا وہ۔ مگر پھر سوال یہ پیدا ہوا کہ بی۔ اے پاس ہیں۔ اس لئے اگر ملازمت کی صورت انگلستان میں نکلی تو یوں تو بہر صورت مزے رہیں گے۔ مگر اُس صورت میں بیوی بچوں کا الاؤنس بھی ملتا ہے۔ لہٰذا دوسرا خیال ترک کیا یعنی یہ کہ اولاد پیدا کرنے میں احتیاط سے کام لیں گے۔ بلکہ چاہیئے یہ کہ شادی کرتے ہی پہلے کھٹاکھٹ بچے پیدا کر ڈالیں۔ اس کے بعد غیر ملکی ملازمتوں کے لئے درخواستیں دیں۔ اسی غور و فکر میں ہم کو نیند آ گئی، اور ہم نے خواب میں دیکھا کہ جیسے ہماری شادی ہو گئی ہے اور بچوں کا ایک کیو ہمارے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ ہمارے آگے ہماری بیوی ہے، اور بچے پیدا کرتے کرتے وہ لُوکا تنکا ہو کر رہ گئی ہے اور ہم پھٹے حالوں اُس کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔ ہمارے ہر بچے کے منہ میں ایک چونگا ہے جس سے بی۔ اے۔ بی۔ اے کی آوازیں نکل رہی ہیں۔ ہم کو اور ہمارے بچوں کو کئی روز سے کھانا نہیں ملا ہے۔ سب سے شیر خوار بچہ جس کو کئی روز سے دودھ نصیب نہیں ہوا ہے رو رہا ہے اور اس کو بہلانے کے لئے ہم نے اپنی بی۔ اے کی ڈگری کی ایک بتّی بنا کر اُسے دے دی ہے۔ جسے گڑ بڑا کر اُس نے چُوسنا شروع کر دیا ہے۔ اس سے اُس کا رونا بند ہو گیا ہے —— بیوی ہم سے پوچھ رہی ہیں کہ کیا کوئی چیز مل گئی ہے جو بچے نے رونا بند کر دیا ہے۔ ہم نے کہا بولو مت، وہ ہماری ڈگری چوس رہا ہے۔ اس پر وہ جھپٹ کر جو بتّی اُس کے منہ سے نکالنے لگیں اور ہم نے اُن کا زور سے ہاتھ جھٹکنے کی کوشش کی تو ہماری آنکھ کھُل گئی —— ہم نے کہا لَا حَولَ وَلَا قُوّت، کتنا بھیانک خواب تھا۔

پارچہ بافوں کو سرکاری امداد

مرکزی وزارتِ تجارت و صنعت نے کرگھے کی کوآپریٹیو سوسائٹیوں کی بستیوں کی حوصلہ افزائی کی غرض سے حکومت کی جانب سے مالی امداد دینے کی ایک اسکیم منظور کی ہے۔

رہائشی[1] مکانات مہیا کرنے والی بستیوں میں رہائش کے لئے پارچہ بافوں کو فرداً فرداً ایسے مکانات مہیا کئے جائیں گے جن کو وہ کرگھے لگا کر ورکشاپ کے طور پر بھی استعمال کریں گے بستی میں رنگائی، تکمیلی اصلاح اور تھان بندی وغیرہ کے لئے ایک مشترکہ مرکزی کارخانہ ہوگا۔ جسے متعلقہ سوسائٹی چلائے گی اور یہ کارخانہ اسی کی ملکیت ہوگا۔ علاوہ ازیں سوسائٹی تھوک خریداری۔ پارچہ بافوں کو سوت کی فراہمی اور تیار شدہ مال کی فروخت کا انتظام بھی کرے گی۔ آج کل بھی اسی نوعیت کی ایک ہاؤسنگ کالونی مینگا نوروا قعہ ریاست اندھرا میں موجود ہے۔

حکومتِ ہند تقریب قریب فراہمی مکانات کی مالی امداد کی مرکزی اسکیم کی مانند ان بستیوں کو بھی کرگھے کے ٹیکس کی وصول شدہ رقم میں سے مالی امداد دے گی۔ لیکن ان بستیوں کی امداد کی اوسط زیادہ رہے گی۔ کیونکہ پارچہ باف کو جو مکان فراہم کیا جائے گا وہ اس کو ورکشاپ کا بھی کام دے گا۔ چنانچہ ہر مکان کے لئے امداد کی رقم اصل لاگت ہوگی۔ مگر زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار روپیہ دی جائے گی۔ لاگت کا ۲۵ فی صدی حصّہ قطعی مالی امداد کے طور پر اور ۵۰ فی صدی حصہ طویل المدت قرض کے طور پر دیا جائے گا جس پر شرح سود حسبِ معمول ہوگی اور ۲۵ سال کے اندر اندر قرض کی رقم ادا کرنی پڑے گی۔

مرکزی کارخانوں کے غیر متواتر اخراجات کے سوا باقی مشینوں اور متعلقہ ساز و سامان کے لئے نصف رقم بطور قرض اور نصف رقم بطور مالی امداد دی جائے گی، اور ان کارخانوں کے غیر متواتر اخراجات کی رقم مالی امداد کی صورت میں دی جائے گی۔

---

[1] ہر چند یہ لفظ غلط ہے۔ لیکن رائج ہو چکا ہے۔ (ادارہ)

کیلاش ماہر

گاندھی جی کا معاشی فلسفہ

اس دور میں جبکہ ہر نظریے کو اقتصادی نقطہ نظر سے پرکھا جاتا ہے گاندھی جی کا معاشی فلسفہ بھی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ معاشی تخیل (Economic Thought) کے تمام مفکرین جو کہ آدم سمتھ (۱۷۹۰ء) سے لے کر کارل مارکس کے تنقیدی نظریوں تک یعنی ۱۸۹۵ - ۱۸۶۵) اور ان کے علاوہ معاشیات کے موجودہ مفکرین کے اصولوں کو مطالعہ کرنے سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ صنعتی برتری کی دوڑ میں کسی قوم کا معاشی معیار اس وقت تک بلند نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسانی قدروں کو صحیح اہمیت نہیں دی جائیگی۔ بڑھتی ہوئی بے اطمینانی کو روکنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ معاشی مقاصد کو (Economic Motives) اس طرح ڈھالا جائے کہ ان سے زیادہ سے زیادہ سماجی بھلائی و بہبود ہو سکے گاندھی جی کا معاشی فلسفہ انسانی قدروں کو جائز اہمیت دینے کے حق میں ہے۔ دوسرے الفاظ میں گاندھی بتدریج انسانی برابری (Comparative Human Equality) کے پرچار کرتے تھے۔

یوں تو کہنے کو گاندھی جی کوئی معاشی مفکر نہیں تھے لیکن اس کے باوجود ان کے خیالات نے مغربی فلسفے کو ایک نئے انداز سے موڑ دیا اور یہ صحیح طور سے واضح کر دیا کہ پچھڑی ہوئی اقوام کا رہن سہن اور معیار زندگی کس طرح بلند کیا جا سکتا ہے۔ منصوبہ بندی کا فلسفہ مغرب کی دین ہے لیکن یہ محض ایک تخیلی معیار پسندانہ نظریہ Super-Idealistic Notion ہے اگر ہم اسے ہندوستانی مزاج کے موافق اپنی ضروریات کے سانچے میں نہ ڈھال سکیں۔ گاندھی جی کا نظریہ خیالی دنیاوی تجربات کی بنا پر رکھی ہوئی وہ کسوٹی ہے جس کے ذریعے ہم اپنی روزانہ زندگی کی ضرورت (Every Day Wants) کو بہ آسانی مطمئن کر سکیں۔ گاندھی جی کے معاشی فلسفے کو سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر کو سمجھنا بھی نہایت ضروری ہے اگر ہم تاریخی حالات کا جائزہ لیں تو اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے سب سے پہلے یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہندوستان تقریباً تین سو سال تک بیرونی حکومت کے زیر اثر رہا جس کے اثرات سیاسی۔ سماجی، اقتصادی۔ مذہبی غرضیکہ ہمارے ہر شعبۂ زندگی میں اس طرح اثر پذیر ہوئے کہ آج بھی ہم بہت سے مہلک امراض میں مبتلا ہیں۔ آزادی کے بعد اپنے ہی ذرائع پر کھڑے ہونے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ ہماری گھریلو صنعتیں اس دور میں مشینوں کی بھرمار اور بیرونی سرکار کی پالیسی کے زیر اثر تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ زمین اور زراعت پر آبادی کا دباؤ Pressure of Population برابر بڑھتا جا رہا تھا بلکہ صنعتی و حرفتی میدان میں بے روزگاری بھی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ ان سب باتوں کے علاوہ جن شعبوں میں کوئی ترقی ہوئی تھی وہ ایک خصوص مقصد کے تحت کی گئی تھی۔ صنعتی ترقی اور تعلیمی منصوبہ بندی (Educational Planning) حکومت کی بنیادیں مستحکم کرنے کا ایک ذریعہ سمجھی گئی تھیں ... یہ تھا وہ پس منظر جس کی بنیادوں پر گاندھی جی کے معاشی فلسفے کا جنم ہوا۔ مندرجہ بالا مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے گاندھی جی نے جتنی بھی تحریکیں چلائیں جیسے سودیشی تحریک ڈانڈی مارچ یا نمک کا ستیاگرہ۔ یا عدم تعاون Non Co-operative Movement. تحریک ان کا ایک خاص مقصد تھا جس کی وجہ سے قوم آنے والے انقلاب کے لئے تیار ہو گئی اور اس کی مردہ رگوں میں از سر نو شعوری بیداری پیدا ہو گئی۔

گاندھی جی اور اقتصادی مقاصد

آدم سمتھ کے نزدیک کسی ملک کی اقتصادی دولت اس ملک کی زمین۔ مکانات اور روزانہ ضروریات کی اشیا نہیں تھی بلکہ قومی دولت کا انحصار محنت کشوں اور زمین کی پیداوار پر تھا۔ مگر گاندھی جی کا اقتصادی معیار (Economic Ideal) اس سے بھی بلند تھا گاندھی جی نے کہا تھا کہ علم معاشیات کا مقصد زندگی کی ضروریات کو اکٹھا کرنے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ وہ علم ہے جس کے ذریعے عوام کو اقتصادی سکون اور اطمینان حاصل ہو سکے۔ سکون اور اطمینان زندگی کی ضروریات (Wants) کے بڑھنے سے نہیں بلکہ ان کی کمی سے حاصل ہو سکتا

ہے۔ ان کے نزدیک جسمانی تشفی سے کہیں اہم اور ضروری روحانی تشفی تھی۔ اگر روح اور دماغی عناصر اپنی ضروری خوراک نہیں پاتے تو انسان چاہے کتنا ہی بڑا سرمایہ دار کیوں نہ ہو اطمینان کی زندگی نہیں بسر کرسکتا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر مہتہ کا خیال اس سلسلے میں گاندھی جی سے مطابقت رکھتا ہے۔ ضروریات کی تشفی اس وقت ہوسکتی ہے جب آدمی اس معیار پر پہنچ جائے جہاں اس کی کوئی ضرورت نہ رہے (State of Wantlessness) یا کم سے کم ضرورتوں کا احساس ہو کیسی ضرورت کو پورا کرنے سے وقتی تشفی تو ضرور ہوجاتی ہے مگر ہمیشہ کے لئے اس ضرورت سے نجات نہیں ملتی۔ یہی گاندھی جی کے فلسفے کا خاص مقصد ہے کہ ہر انسان اپنی اقتصادی زندگی کا منصوبہ اس انداز سے بنائے جس میں اسے اپنے ذرائع اور طاقت کے مطابق (Resources and Power) زیادہ سے زیادہ تشفی اور اطمینان حاصل ہوسکے۔

گاندھی جی اور اقتصادی جمہوریت

میں نے اپنے ایک مضمون گھریلو دھندوں کی اقتصادیات میں لکھا تھا کہ سیاسی جمہوریت کا تصور اس وقت تک نامکمل ہے جب تک اس کی بنیاد اقتصادی جمہوریت پر نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں جب تک جمہوری طریقے سے اشیاء (Goods) کی پیداوار نہیں کی جائیگی۔ اور گاندھی جی کا بھی یہی خیال تھا پیداوار میں مرکزیت Centralisation in production) کے برعکس گاندھی جی نے چھوٹی چھوٹی اکائیوں (Units کو جو اہمیت دی تھی اس کی پشت پناہ ایک اقتصادی فلسفہ ہے یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی نے "گرام" یا گاؤں کو اپنی تمام سیاسی سماجی اور معاشی تحریکوں کا مرکز بنایا تھا "گرام راجیہ" اور "پنچایت راجیہ" اسی سلسلے میں دو مختلف نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پنچائتوں کو اہمیت دینے کا خاص سبب تعاون کے فلسفے (Theory of Co-operation) سے وابستہ ہے۔ صحیح معنوں میں کسی جمہوریت کو اقتصادی کامیابی اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ ہر اکائی خود مختار نہ ہو اور آرتھک بندھنوں سے آزاد نہ ہو۔ گاندھی جی نے اپنے اخبار ہریجن مورخہ ۴۲ء ۲۶ میں تحریر کیا تھا ....

گاؤں کے سوراج سے میرا مطلب اس جمہوریت سے ہے جو اپنی ضروریات کے لئے اپنے پڑوسیوں کا محتاج نہ ہو اور اپنے دیگر معاملات میں پوری طرح آزاد ہو .... اس طرح ہر گاؤں میں جمہوریت کا پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ اپنے کھانے کے لئے اناج اور کپڑوں کے لئے روئی خود پیدا کرے .... اس کے پاس اپنے مویشیوں کی خوراک ہو اور اپنے بچوں کے لئے کھیل کا میدان .... وغیرہ وغیرہ"

گاندھی جی اور مشین کا نظریہ

اس مسئلے پر علما میں کافی اختلاف رائے ہے اگر بغور مطالعہ کیا جا[ئے] تو یہ بات صاف ظاہر ہے کہ گاندھی جی مشین کے مخالف نہیں تھے بلکہ ان کو مشینی تمدن (Mechanical Civilization) سے نفرت تھی۔ مشین جسمانی اور دماغی سکون حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ معاشیات کے ماہر [Sis]mondi کی طرح سے شاید گاندھی جی کا بھی یہی نظریہ تھا کہ مشینیں اور ایجادات بذات خو[د] نقصان دہ نہیں ہیں بلکہ ان کے ذریعے سے جو اقتصادی نظام پیدا ہوتا ہے اس سے مزدوروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ مشینیں تمدن کے لئے مضر ہیں اس کے لئے جہاں ذرائع کی کمی ہے اور جہاں آبادی پیداوار سے زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہو یہ ضروری ہے کہ عوام کی ضروریات بنا بھاری مشینوں کی امداد کے پوری نہیں کی جاسکتیں۔ تاہم گاندھی جی نے مشین کو اتنی اہمیت نہیں دی کہ اس کے استعمال سے انسان بھی ایک پرزے کی مانند بن جاتا ہے اور اس کی انفرادیت ختم ہوجاتی ہے جس حد تک ملک میں پیداوار (Production) اور صرف (Consumtion) متواتر ایک نسبت سے ترقی کرتے جاتے ہیں گاندھی جی کو مشینری کے استعمال سے گریز نہیں تھا۔ مگر جب مشینوں کو سماج کی دولت کو کھسوٹنے اور اپنا ادھیکار جمانے کے لئے استعمال کیا جانے لگا اور اس کے ساتھ انسان کی شخصیت محض ایک پرزے کی مانند رہ گئی تو گاندھی جی نے جائز طریقے سے مشین کی مخالفت کی ہے۔ مزدوروں کے استحصال (Exploitation) اور عام بیکاری کی بہت کچھ ذمہ داری مشینوں پر ہے۔

انفرادی جائیداد اور گاندھی جی کا نظریہ

سرودے کے فلسفے سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ گاندھی جی ایک ایسے سماج کا تصور کیا تھا جو کہ سماجی سیاسی اور اقتصادی بندھنوں سے آزاد ہو۔ ہندوستان کے لئے سب سے پہلے اور نہایت اہم کام سیاسی آزادی کا تھا ملک کو بیرونی طاقتوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے بعد سماجی اور اقتصادی غلامی سے نجات پانے کا سوال اٹھتا ہے۔ لیکن گاندھی جی اپنے کام کو تکمیل تک پہنچا سکے اور صحیح معنی میں ان کی شہادت قبل از وقت ہوئی۔ بات بہت دور نکل گئی۔ معاف

مفکّر (Proudhon) نے جائیداد (Property) کی اس لئے مخالفت کی تھی کہ اس دولت کے ذریعے اس کے مالک کو اس منافع کا حق مل جاتا ہے جس کا وہ صحیح معنوں میں جائز حقدار نہیں ہے مگر گاندھی جی نے انفرادی جائیداد Private Property) کو ایک وقف کی صورت میں دیکھا تھا اور دولت کے مالکوں کو ایک طرح سے ان کے اخلاقی فرائض کی طرف سے چیتاونی دی تھی تاکہ وہ ان غریبوں اور مظلوموں کے حقوق سے غافل نہ ہو جائیں جن کی پرورش ان کا سماجی اور اخلاقی فرض ہے اس خیال کو سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے Trustee Ship کے اصولوں کی ایجاد کی تھی۔ کوئی بھی دولت، ذرائع یا جائیداد اس لئے ہے کہ اس سے غریبوں کی امداد کی جا سکے جن کی ضرورتیں سماجی اعتبار سے زیادہ اہم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی نے جائیداد کو سرمایہ داروں اور زمینداروں کے ہاتھ میں ایک پاک وقف Sacred Trust کی حیثیت دی تھی۔ اور سرمایہ دار طبقے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی موجودہ انفرادیت برقرار رکھنے کے لئے اپنی تمام ذمہ داریوں سے باخبر رہیں تاکہ سماج میں ان کا وقار یونہی بنا رہے۔ اگر اس کے برعکس ہوتا ہے تو دیوار پر لکھی ہوئی وقت کی سرخیاں اپنا رنگ ضرور لائیں گی۔

آج کے دور میں دنیا نے یہ بخوبی سمجھ لیا ہے کہ دنیاوی طاقت کے مقابلے میں روحانی طاقت زیادہ عظیم ہے روحانی طاقت نے ہمیشہ تواریخی حیثیت سے بھی صداقت کا ساتھ دیا ہے وہ نظریہ جو گاندھی جی نے اب سے تیس سال پہلے عوام کے سامنے رکھا تھا آج اپنی عظمت کے ساتھ ہماری آنکھوں کے روبرو آ رہا ہے۔ دنیا کی طاقتوں کے درمیان غریب عوام کے کیا فرائض ہیں جن کی بنیاد پر وہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھ سکتے ہیں یہ سب آج بھی گاندھی جی کے اصولوں سے ظاہر ہے۔ کہ مشرق اور مغرب کے دو متضاد نظریوں میں ہندوستان کی اہمیت اور برتری کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم آج بھی اُس غیر جانب داری اور صداقت پر قائم ہیں جو ہمیں گاندھی جی سے ورثے میں ملی تھی۔

اعداد و شمار

۱۔ ہندوستان میں ۱۹۵۳-۵۴ء میں روئی کی ۴ کروڑ ۹۰ لاکھ گانٹھیں استعمال ہوئیں

۲۔ ہندوستان میں رنگ اور وارنش کی سالانہ ضرورت تینتیس ہزار ٹن ہے۔ اور یہ سب کی سب یہیں پیدا کی جاتی ہے۔

۳۔ ہندوستان میں گورنمنٹ کے استعمال کے لئے وباؤں کو دور کرنے والی دوائیوں کی سالانہ ضرورت کا اندازہ ۸۴۰، ٹن ہے جس میں ۵۰۰، ٹن کیڑے مار دوائیاں شامل ہیں۔

۴۔ ہندوستان میں کروم کے ذخائر کا اندازہ ۲۰ لاکھ ٹن ہے۔

۵۔ ۱۹۵۳-۵۴ء میں ۱۷،۹۸۰ ہنڈرڈ ویٹ بناسپتی گھی جس کی قیمت کا اندازہ ۲۱،۱۰،۰۰۰ روپے لگایا جاتا ہے۔ ہندوستان سے باہر بھیجا گیا۔

۶۔ ہندوستان میں مچھلی کے نرخ کا اوسط فی کس صرف ۳ر۹۸ پاؤنڈ ہے جبکہ اس کے مقابلے میں جاپان میں ۴۳ر۳۸ پاؤنڈ، برما میں ۷۰ پاؤنڈ، اور لنکا میں ۱۶ پاؤنڈ فی کس ہے۔





جلوس میں نیشنل کیڈٹ کور کی لڑکیاں

انڈین ایئرفورس راشٹرپتی کو سلامی دے رہی ہے

دہلی میں جشن جمہوریت

ہندوستانی فوج سلامی د

جلوس میں بحری فوج







پانڈي چري كي جهانكي - كشتي اور روشني كا مينار

اترپرديش كي جهانكي - گهريلو دستكاريان





مدراس كى جهانكي - چولا راجاؤں كے زمانے ميں شاعره اوائ

پنجاب كا گدا ناچ



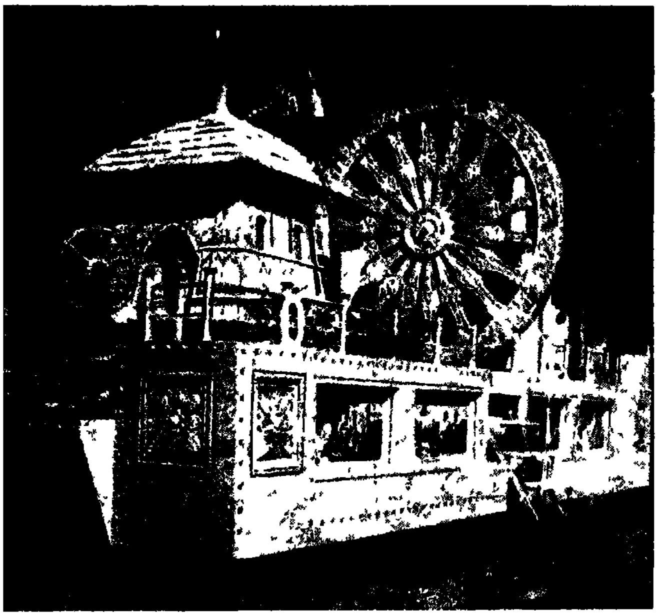
پردهان منتري شري نهرو لوک ناچ





کشمیر کی جھانکی - ایک شکارا اور کشمیری گھریلو صنعتیں

بمبئی کی جھانکی - دیہی کی چھوٹی بڑی صنعتوں





وتو - موہی رام جیمن

ادب میں امن کا وفد

پیپسو کا لوک ناچ



حصہ لینے والی خواتین کے ساتھ







اوپر - نیشنل اسٹیڈیم میں جنوبی ہند
کا پدال کولاٹم ناچ

اوپر دائیں - پنجاب کا منظر - بھاکڑا ننگل



پانڈی چری کا لوک ناچ

کشمیری روف ناچ



علی منظور

نظر کُشا

ہندی زیرک عرب کے معقول پسند سمجھائیں حکیموں کے مقاماتِ بلند
رنجا میں دکھاؤں اِن سرفرازوں کو اپنوں کی مخالفت کرے دانشمند

دیکھا نہیں وہم و علم کا دوراہا روشن علم الیقیں کو رکھنا چاہا
میں فلسفہ دُشمن! آپ مجھ سے بدظن منظور سکونِ دل ہے عالی جاہا

نظّارے کی حد ہے آسماں، کہتا ہے نظّارے کی حد ہی کو دُھواں کہتا ہے
آئینے میں عکس دیکھتا ہے جس کا لاشَے اُسے یہ فلسفہ داں کہتا ہے

ہے فلسفہ ڈاروں کا اتنا معصوم آتی ہے ہنسی سمجھ کے اس کا مفہوم
اب دایرۂ شعر و سخن چھوڑے کون معلوم حدِ فلسفہ دانی معلوم

لاشَے ہے تجھی کبھی دُھواں کیا کہنا ہے حدِّ نظر یہ آسماں کیا کہنا
پانی میں نظر سایۂ حدِّ نظر آئے اے "ہیچمدانِ فلسفہ داں" کیا کہنا

ناداں! عُرفائے دیدہ ور سے چشمک ضدِّ عین الیقیں ترا "اندھا شک"!
جی چاہے تو ربط پاکبازوں سے بڑھا اے فلسفہ داں فلسفہ بازی کب تک

تمکین کاظمی

وامق و عذرا

افسانۂ وامق و عذرا بھی اُن قصّوں میں سے ہے جن کی اصلیت کے متعلق اختلاف ہے، بعض ان قصوں کو "منیژہ و بیژن" "ویس و رامین" کی طرح قدیم ایرانی افسانہ سمجھتے ہیں، اُن کی دلیل یہ ہے کہ دولت شاہ سمرقندی نے اس قصّہ کی ایک منظوم کتاب کا تذکرہ کیا ہے جو انوشیرواں کے نام پر لکھی گئی تھی اور اس کا ایک نسخہ عبد اللہ بن طاہر کے زمانے (۲۳۰ - ۲۱۳) میں جو فرماں روائے خراسان تھا موجود تھا۔

بعض اربابِ ادب کا خیال ہے کہ اس قصّے کی اصل "عروہ و عفرا" "لیلیٰ و مجنوں" اور اسی قسم کے دوسرے افسانوں کی طرح عربی ہے جنھیں سہیل بن ہارون سے نسبت دی جاتی ہے جو عہد مامون الرشید کے مشاہیر سے تھا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہ قصّے ہیں جو قرنِ دوم ہجری میں تصنیف ہوئے۔ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں قصص "ثعلہ و عفرا" "نمر و ثعلب" "وامق و عذرا" کو سہل بن ہارون کی تصانیف میں شمار کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وامق و عذرا نامے سب سے پہلے سہل ہی نے عربی میں قصّہ لکھا ہے جس سے فارسی میں ترجمہ ہوا ہے۔

بعضوں کا بیان ہے کہ افسانۂ وامق و عذرا وغیرہ قصّے یوسف زلیخا سلامان و ابسال وغیرہ کی طرح باہر سے لئے گئے ہیں اور ان کی اصل یونانی ہے چنانچہ مولفِ مجمل التواریخ والقصص نے لکھا ہے کہ "عہد داراب دارا ب میں قصہ وامق و عذرا یونانی زبان میں موجود تھا"

حمد اللہ مستوفی نے بھی تاریخ گزیدہ میں ان عاشق و معشوق کو معاصرین سکندر اعظم ظاہر کیا ہے، ان اسماء و اعلام سے جو عنصری کے منظومہ نسخے میں پائے جاتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قصّے کی اصل یونانی ہی تھی جس کا ترجمہ مشرقی زبانوں میں ہوا۔

ابو القاسم عنصری نے سلطان محمود غزنوی کے حکم سے تین قدیم قصّے "شاد بہر و عین الحیواۃ" "خنگ بت و سرخ بت" اور "وامق و عذرا" بحر متقارب و خفیف میں نظم کئے اور حسب روایتِ عوفی یہ تینوں بدایع و حکم کا خزانہ تھے جن میں معانی دقیق اور امثالِ رقیق تھے مگر افسوس ہے کہ ان میں سے کوئی مثنوی بھی آج نہیں ملتی البتہ بعض رسائل اور منشات میں اُن کے چند شعر نقل ہوئے ہیں،

قصۂ وامق و عذرا دوسرے تمام قصّوں سے زیادہ شہرت پا چکا ہے اور بیشتر شعراء و ادبا نے تتبع و تقلید نقل وغیرہ کی ہے چنانچہ قصب جر شقالی نے اس قصّے کی شہرت کے متعلق یہ حکایت نظم کی ہے۔

حدیثِ وامق و عذرا است مشہور[1]	بود در ہر زباں ایں قصہ مشہور
ملے اور چو دانائے نخستیں	کہ کلکش کرد عالم شکر آگیں
تہ آتش از ثریا تا ثری بود	گہر پیرائے معنی عنصری بود
ولی آں جامہ کا شاد آراست	نیامد بر قدِ موزوں او راست
نیابی زاں ہمہ شعر خجستہ	در اوراق کہن جز جستہ جستہ
نہ از دستِ کسی دارد نشانی	نہ در دستِ زمانہ داستانی
ہما نا بودہ یک دفتر در آں حال	کہ دستِ روزگارش کردہ پامال

ابو ریحان بیرونی وہ شخص ہیں جنھوں نے (۴۴۰ - ۳۶۲) وامق و عذرا نام سے عربی میں ترجمہ کیا ہے غالباً انھوں نے عنصری کی مثنوی یا کراریس پہلوی کا قصہ پیشِ نظر رکھا ہے

دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ فصیحی جرجانی نے جو امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس کے دربار سے متوسل تھا قصّۂ وامق و عذرا کو نظم کیا ہے یہ نظم بڑی اچھی ہے میں نے اس کے

---

[1] قافیہ غلط ہے۔

چند ورق دیکھے ہیں ایک شعر مجھے یاد رہ گیا' اس میں نصیحی نے اپنا حال خاندان کا حال ملک تاپوس کی حکومت کا ذکر کیا ہے جو شعر مجھے یاد رہ گیا وہ یہ ہے ؎

چو فرخ وجودے کہ از مہتشش — بپیرد بپاسٹے دل نعمتس

"ٹامس ولیم بیل نے "فرہنگِ مشاہیرِ شرق" میں لکھا ہے کہ امیر فرخاری نے جو شعرائے عہد امیر کیکاؤس بن گیخسرو (۶۱۰ - ۶۰۹) سے تھا قصۂ وامق و عذرا کو نظم کیا ہے"

چونکہ ہماری نظر سے نہ تو نصیحی کا منظومہ گزرا نہ فرخاری کا اور نہ عنصری کا اس لئے ہم ان تینوں مثنویوں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے مگر یہ تحقیق ہو چکا ہے کہ وامق عذرا کے قصوں میں سے عنصری کا قصہ آخر قرنِ دہم تک شہر ہرات اور مملکت ترکی میں موجود تھا کیونکہ حافظ ادہمی (ادبہ ہرات کا ایک قصبہ تھا) نے اصل فارسی نسخہ اور لامعی عثمانی نے اس کا ترکی ترجمہ دیکھا ہے کیونکہ فرہنگ تحفۃ الاحباب میں اس مثنوی کے بہت زیادہ شعر بطریقِ مثال نقل کئے ہیں اور اس ترکی منثور ترجمہ کو بھی ترکی زبان میں نظم کیا گیا ہے۔

مرزا سنگلاخ مشہدی نے تذکرۂ خطاطین میں ذکر کیا ہے کہ میں نے چند ورق عنصری کے منظوم وامق و عذرا کے علاء الدین گلستانہ کے قلم کے لکھے ہوئے دیکھے ہیں۔ نویں اور دسویں صدی ہجری کے چار لغت نویس لطف اللہ حلیمی' حسین وفائی' محمد قاسم سروری' اور ابراہیم شعوری نے اس مثنوی کے بہت سے شعر اپنی فرہنگوں میں نقل کئے ہیں' ہم نے زیادہ تر شعر عنصری ہی کے اکٹھا کئے ہیں جن میں اسمائے بلاد و اشخاص پائے جاتے ہیں مثلاً"

جزیرہ یکے بد بیونان زمین — کرونیس بُد نام و شہر گزین

کرونیس اس جزیرے کا نام ہے جہاں کا رہنے والا وامق تھا۔

کہ مکذیطس آں بپایگہ داشتے — بشاہی در و تخت گہ داشتے

وامق کے باپ کا نام مکذیطس تھا۔

یکے دوستش بود ترفان نام — بسے آزمودہ بنا کام کام

ترفان وامق کا دوست تھا جس کو ساتھ لے کر وامق نے فرار کیا تھا

بفرمود تا آسنتان بکاہ — بیامد بنزدیک رخشندہ ماہ

آسنتان نام تھا وامق کے خسر کا جو وامق کے ہاتھ سے مارا گیا۔

ابا دیزگاں ماند وامق بجنگ — نہ روئے گریز و نہ رائے درنگ

بہاں راہ از ان دزد جرندہ نام — یکے مہترے بود پانوشش نام

پانوش نامی ایک چوروں کا سردار تھا جو وامق و عذرا کے زمانے میں دریائی راستہ روک کر لوٹ مار کرتا تھا۔

بافرنجہ افراطشش نامدار — یکے پادشاہے بدی ہوشیار

افرنجہ شہر کا نام تھا جو دریا کے کنارے واقع تھا جہاں کی رہنے والی عذرا کی ماں تھی جس کا نام نطیش تھا اور افراطش اس کا شوہر تھا جو عذرا کی لڑائی میں مارا گیا۔

پدر دادہ بودش گہہ کودکی — بآذارطوس آں حکیم ملکی

بمرگ خداوند آذارطوس — تبہ کرد مرخویشتن را فسوس

آذارطوس نام اس شخص کا تھا جس کو عذرا کی ماں دی گئی تھی۔

فلاطوس برگشت و آمد ز راہ — بر حجرۂ وامق نیک خواہ

فلاطوس نام ایک حکیم تھا جو عذرا کا استاد تھا'

بدا زکینہ عذرا چو شیر نژند — بزد دست و چشم ادانوش کند

ادانوش اس شخص کا نام تھا جو ایلچی بن کر اندروس کی طرف سے عذرا کے پاس آیا تھا اور عذرا نے غصے میں آکر اس کی آنکھیں اپنی انگلیوں سے نکال لی تھیں۔

نہ من اندروستم بکین و بمہر — نہ ہارو و نہ نیز عذرا بچہر

اندروس ایک شخص تھا جو ہارو کا عاشق تھا اور جزیرے میں رہتا تھا اور راتوں کو جزیرے کا راستہ اندروس کو معلوم کرانے کے لئے ہارو آگ جلایا کرتی تھی تاکہ آگ دیکھ کر اندروس اس کی سمت تیرتا ہوا پہنچ سکے مگر ایک رات ہوا اتنی تیز چلی کہ آگ بجھ گئی اور اندروس سمت معلوم نہ کر سکا اور دریا میں ڈوب مرا۔

فگندش بیک زخم گردن زگفت — چو افگندہ شد دست عذرا گرفت

نرنجید عذرا چو مرداں جنگ — نہ پیچید بر بادکے تنگ تنگ

یکے تیز پائی و دانوشش نام — گزشتہ بر او بر بسی گام وعام

دانوش نام اس شخص کا تھا جس نے عذرا کو فروخت کیا تھا

دل دمخینوس بشد ناشکیب — کہ در کار عذرا چہ سازد فریب

دمخینوس ایک سوداگر تھا جو عذرا کو منقلوس کے پاس چرا کر بھگا لے گیا تھا

بشد از پس رنج ہائے دراز — بیک جا جزیرہ رسیدند باز

کجا نام او بود طرطانیوس — ورا پادشا نام او ترکیوس

طرطانیوس جزیرے کا نام ہے جہاں عذرا پہنچی تھی اور وہاں سے چھوٹ گئی تھی۔

زد دریا بخشکی بروں آمدند   زبر بر سوی زیفنوں آمدند

زیفنوں شہر تھا جہاں عذرا کو لے جا کر اسے قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر وہ بچ کر بھاگ نکلی۔

نویں صدی ہجری کے آخر سے دسویں صدی ہجری کے وسط تک چار عثمانی شاعروں نے جو صاحب خمسہ تھے اپنی اپنی مثنویوں کے نام وامق وعذرا رکھا ہے۔ غریبی شاعر نے اپنے ترکی تذکرے میں جو شاہ طہماسپ اول کے نام پر ۹۵۵ھ میں لکھا گیا ہے لکھا ہے کہ قاضی سنان بن سلیمان امرا سلطان بایزید ثانی (۹۱۸ - ۸۸۶) اور حمزوی شاعر جو صوفی زادگان بورسہ سے تھا ہر ایک نے پانچ پانچ مثنویاں کہی ہیں جن میں سے ایک وامق وعذرا ہے۔

کشف الظنون اور دوسرے تذکروں میں ہے کہ محمود بن عثمان لامعی جو شعرائے دور سلطان سلیمان ثانی (۹۲۶ - ۹۷۴) سے تھا اور معیدی نے جو اہل قافلہ سے تھا پانچ پانچ مثنویاں لکھی ہیں جن میں سے ایک وامق وعذرا ہے

محمود بن عثمان لامعی تخلص بورسہ کے رہنے والے تھے جنھوں نے مولانا عبد الرحمن جامی کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے اور جامی روم کے نام سے مشہور ہیں نے ۹۳۸ھ میں انتقال کیا ان کی پانچ مثنویاں ۱۔ گوئے وچوگان ۲۔ فرہاد نامہ ۳۔ ابسال وسلامان ۴۔ ویس ورامین ۵۔ وامق وعذرا ہیں، ان کی یہ وامق وعذرا ترجمہ ہے عنصری کی وامق وعذرا کا چنانچہ لامعی نے مقدمہ میں لکھا ہے۔

سابقاً بو قصہ خوش منظری   نظم ایدمپ ایاز مش اگر کیم عنصری

رومہ دو شمس آخر اول جوری لباس   ترکی ویلدن حلا سبین قیلمش پلاس

نہ معارفدن تباہی لالہ زار   نہ قوافی ایا غی موزہ دار

خاکسار وچشمی کوہ دباشی کل   خوار وزار دپائے لنگ ودستی شل

اشبو بوردن ایدک یوز بین سلوک   خاک پاک شاہ ایرمش لنگ ولوک

ترجمہ۔ مجھ سے پہلے ایک شخص نے افسانۂ وامق وعذرائے عنصری کو بغیر رعایت قافیہ وزن و ردیف ترکی زبان میں ترجمہ کیا تھا، میں نے سلطان کے حکم سے اس ترجمہ کو نظم کیا ہے۔

لامعی نے اس مثنوی میں عذرا کے "قاموس شباب" کی تعریف اس طرح کی ہے

اول ایکے لیتھادہ قیلدی برنظر   ھا قدمی جان چشمی دواول ایکے گہر

دیدی یا بب بوایکی سمیں حباب   عالمک عینیین بخول ایلر پر آب

بکر ایکے ماہی در خورشید   ہرنہ تشبیہ ایلسم لیز اوبجہ ذرہ

مقیاس الشباب کی اتنی صاف، ستھری، پاکیزہ، سیمین، خورشید قرچشمہ، آب شیریں، نہال استادہ اور غنچۂ ناشگفتہ جیسی تشبیہیں دیکھنے میں نہیں آتی تھیں۔

نویں صدی ہجری کے آخر تک وامق وعذرا کا افسانہ بالکل اسی طرح رہا جس طرح کہ یونانی مجھے آیا تھا مگر نویں صدی ہجری کے ختم ہوتے ہی جتنی بھی مثنویاں اس نام سے لکھی جانے لگیں وہ بدلتی گئیں اور بعد کو اصل قصے سے بہت دور جا پڑیں اور ہر افسانہ دوسرے افسانے سے جدا ہوتا گیا۔

نویں صدی ہجری ہی کے آخر میں ایک شاعر قتیلی نے سلطان یعقوب کے عہد (۸۹۶ - ۸۸۴) میں ایک قصہ وامق وعذرا کے نام سے منظوم کیا ہے جس کے تقریباً چھ ہزار شعر ہیں اس مثنوی کا پہلا شعر ہے۔

اے نام تو در دہر زبانی   وے زندہ بنام تو جہانی

اس قصے میں وامق کو ایک امیر عرب یمن کا بیٹا بتایا گیا ہے اور عذرا کو بھی ایک حکمران حجاز کی لڑکی بتایا گیا ہے جس کا سلسلۂ نسب سلاطین کیان سے ملتا ہے۔

کمال الدین حسین متخلص بہ ضمیری (متوفی ۹۷۳ھ) نے جو شعرائے عہد شاہ طہماسپ سے تھا چھ مثنویاں ۱۔ ناز ونیاز ۲۔ بہار وخزاں ۳۔ لیلیٰ ومجنوں ۴۔ وامق وعذرا ۵۔ جنتہ الاخبار ۶۔ اسکندر نامہ نظم کی ہیں مگر ان سے سوائے مثنوی ناز ونیاز کے اور کوئی مثنوی نظر نہیں آتی۔

امیر ابو القاسم قاضی خلف قاضی مسعود متخلص بہ اسیری نے جو سادات طہران سے تھے خمسہ نظامی کے جواب میں ایک خمسہ کہا ہے جس میں مثنوی وامق وعذرا بھی ہے اور اس مثنوی کا وامق ماآن شاہ ساسانی کا بیٹا ہے جو سرحد خطہ کا حاکم تھا اس مثنوی کا بہترین حصہ وہ ہے جو ان چار قصروں کی تعریف میں کہا گیا ہے جو وامق کے لئے بنائے گئے تھے اس کے چند شعر جو دریا کی تعریف میں ہیں نقل کئے جاتے ہیں۔

سحرگہ بر لب دریا رسیدند   بجائے خرم وزیبا رسیدند

گو دریا خروشاں اژدہائے   زدہ حلقہ نہ سر پیدا نہ پائے

خروش دلعرہ اور رفتہ تا اوج   چو چین اژدہا ظاہر براو موج

بلب آوردہ کف چو اشتر مست   شدہ کوہا نش از امواج پیوست

ز آئیں بر طرف طبعی روان بود   ہزار انش زبان از ماہیان بود

لب وے چوں لب خوبان دلجو   ز سبزہ کردہ لب ظاہر خط او

چو وامق را نظر بر لجہ افتاد   بر آورد از دلی پر درد آواز

کہ اے بحر از چہ نیسان بیقراری   بگو تلخی و شوری از کہ داری

یہ مثنوی اسیری نے ۹۹۵ھ میں نظم کی ہے' طہران سے اسیری نے سفر حج کیا اور حج سے فارغ ہو کر عبدالرحیم خان خاناں کی ملاقات کی غرض سے دہلی آئے اور عرصے تک دہلی میں رہے ہیں اور قیام دہلی کے زمانے میں بھی ایک مثنوی کہی ہے جس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں ۔

مرا یک چند لب قفل سخن بود   خموشی پاسبان گنج من بود

زبس زد شوق معنی بر دلم جوش   نمکدان سخن شد حلقۂ گوش

جوان بودم زلیخائے سخن را   گرفتم یوسف خورشید تن را

خانخاناں کی تعریف یوں کی ہے ۔

جہاں جز خندہ در رویش ندیدہ   جبینش چیں در ابرویش ندیدہ

نہ چین است اینکہ در پیشانی اوست   زلال چشمۂ خورشید در جوست

ز ہر خورشید ایامی کہ ایام   نگیرد جز بکامت دامن شام

زہے خوبی کہ در دفع گزندت   گل آرد بلبل و سوزد لپسندت

معاذاللہ ز تیغ جاں گزایت   کہ زد سرہاست غلطاں زیر پایت

چہ ابر ست آنکہ برقش آفتابست   چہ برقست آنکہ خورشیدش سحابست

از آن ابر است رد و فتح گلگوں   کہ می خندد درون گریۂ خوں

اگرچہ مرگ دشمن را برا قست   ولیکن دوست را آب حیاتست

خانخاناں کے لطف و کرم نے اسیری کو ایسا جکڑ لیا تھا کہ وہ ہندوستان ہی میں بمقام چنیاپور فوت ہو گئے اور ۱۰۱۲ھ میں وہیں دفن ہوئے

شیخ یعقوب کشمیری صرفی (متوفی ۱۰۰۳ھ) نے بھی ایک خمسہ کہا ہے جس میں پہلی مثنوی وامق و عذرا ہے اس کا ایک شعر آپ بھی سن لیجئے ۔

خداوندا حجاب از پیش بکشائے   بمشتاقاں جمال خویش بنمائے

یہ مثنوی ۱۸۸۹ء میں لکھنؤ میں طبع ہو چکی ہے

گیارھویں صدی ہجری میں شعیب جوشقانی نے جو شاہ عباس کبیر کے عہد کے شاعر تھے ایک مثنوی وامق و عذرا شاہ عباس ہی کے نام پر کہی ہے جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے ۔

الٰہی مخزن اسرار بکشائے   فروغ مطلع انوار بنمائے

اشعار کی تعداد اور سنہ تالیف یوں ظاہر کیا ہے ۔

قلم این نامۂ نیکو سرانجام   کہ نیم شہر شعبان یافت انجام

نہد چوں تاج دولت بر سر آں   شود تاریخ نیم شہر شعبان (۱۰۲۸)

دگر خواہی شمار نقد این گنج   ہزار آمد سہ بار دی صد و پنج (۳۳۰۵)

پئے این نو رسیدہ نام لایق   نمودم وامق و عذرا موافق

قصہ اس طرح شروع کیا ہے

خبر گوئے حدیث باستانی   چنیں آرد قلم در رند خوانی

کہ بود از نسل دولت بخت او کوس   فلاطوں دانشے نامش فلاطوس

چو شد نخل امید او برومند   خداوادش یکے فرزانہ فرزند

فزوں تر حسنش از چندی و چونی   چو ماہ نو جمالش در فزونی

چو شیریں ساختند از زند کامش   پدر وامق مقرر کرد نامش

بود در حد مشرق پادشاہے   سکندر دولتے دارا سپاہے

نسب از تخمۂ افراسیابش   نہاں در سایہ چتر آفتابش

سعادت یار و دولت رام دارد   قضا قدرت قدرخاں نام دارد

بود او را یکے پاکیزہ دختر   ندارد غیر ازو فرزند دیگر

بخوبی چہرہ اش ماہ تمام است   بپاکی چوں گل و عذراش نام است

ظہیر اصفہانی معاصر شاہ سلیمان صفوی (۱۰۷۷ - ۱۱۰۵) نے بھی مثنوی وامق و عذرا کہی ہے چونکہ انھیں نجوم' رمل' موسیقی وغیرہ پر بھی کافی عبور تھا اس لئے ان فنون کی اصطلاحات بھی اس میں آگئے ہیں نمونہ ملاحظہ ہو ۔

نہاں میخواہد وامق زاں پری چہر   ز تقویم رخ او گردش مہر

بخواند از بر دانش سطر احکام   در آں تقویم شمسی فتنۂ عام

بجست از خواب محنت با صد اندہ   فروغ مہر تاباں دید بر کرہ

بر وے ریگ خود را دید چوں نسل   چو اشکال طریق (--) افتادہ برل

بقبض و بست شکل بست و پنجم   دو چشمش در پے یاں چوں دو انجم

چو دید از اجتماع آں خانہ خارج   با ستقل ماندہ زآں اعلیٰ مدارج

چو حمرہ چاک میزد بر گریباں   کلاہ از سر فگندہ ہچو لحیاں

نشد ممکن صعودش نزد برجیس ... بخاک غم فرو شد ہم چو انکیس

مرزا محمد صادق متخلص بہ نامی نے جو کریم خاں زند کے وقائع نگار تھے ایک خمسہ کہا ہے جس میں حسب ذیل مثنویاں ہیں ۱۔ درج گہر ۲۔ خسرو شیریں ۳۔ لیلیٰ مجنوں ۴۔ وامق و عذرا ۵۔ شاہنشاہ نامہ نادری۔ اس وامق و عذرا کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

اے بنامت نامۂ نامی بنام ... وے بنامت افتتاح ہر کلام

اے ز عشقت جملہ خوباں بیقرار ... وامق تو ہمچو عذرا صد ہزار

اس قصے کا وامق شاہ یمن کا بیٹا ہوتا ہے اور عذرا ایک خیمہ نشین کی دختر۔ اس کا نتیجہ المناک ہے آخر میں یہ دونوں جل کر مر جاتے ہیں۔

چوں بہم پیوستند ماہم آں دو یار ... نیک بگرفتند ہم را در کنار

آتش دل شعلہ ناگہ بر فروخت ... پیکر زیبائے آں ہر دو بسوخت

حاجی محمد حسین شیرازی معاصر شاہ فتح علی شاہ قاچار نے بھی چھ مثنویاں کہی ہیں، جن میں ایک وامق و عذرا بھی ہے، یہ مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے۔

مے بنامت افتتاح نامہ ہا ... وے بیادت گرمیٔ ہنگامہ ہا

مرزا ابراہیم بیگ کرمانی نے بھی ایک وامق و عذرا کہی ہے اس کے تین شعر یہ ہیں۔

سحر گہ چوں سرشک از چشم عاشق ... ز دریا بر کنار افتاد وامق

بر آمد چوں بہاراں دُرِّ یکتا ... زمیں بالید گفتی بر ثریا

چکاں آب از دو زلف آں شکر لب ... چو در شب دانہ ہائے تاب کوکب

اس مثنوی کا ایک نفیس ترین نسخہ کتاب خانہ برلن میں موجود تھا۔ واللہ اعلم اب بھی ہے یا جنگ میں ضائع ہو گیا۔ مؤلف تذکرۂ روز روشن نے لکھا ہے کہ "ملا محمد علی قسمتی نے بھی ایک مثنوی وامق و عذرا کہی ہے مگر میری نظر سے نہیں گزری" مرزا محمد ملک الکتاب شیرازی نے مشہور مثنوی سوز و گداز نوعی خبوشانی میں چند شعر اضافہ اور بیشتر شعر حذف کر کے وامق و عذرا کے نام سے بمبئی سے شائع کی ہے جو عام طور پر ملتی ہے۔

سوشلسٹ نظام

حال ہی میں ہم نے ملک میں سوشلسٹ نظام قائم کرنے کی پالیسی اختیار کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ہمارے آئین کے بنیادی ہدایت نامہ میں سوشلسٹ نظام کا لب لباب موجود ہے۔ لیکن اس نئے اعلان سے ہمارے مقاصد کی عملی تکمیل کے لئے زیادہ سرگرمی اور ایک نئے جہان کا دور شروع ہوتا ہے۔ اب ہمیں اپنی اقتصادی زندگی اور معاشی سرگرمیوں کے ہر ایک میدان میں اس پالیسی کے اثرات اور لوازم کی تفاصیل طے کرنی ہوں گی۔ حکومت کو تمام اقتصادی اور سماجی نابرابری مٹا دینی ہوگی۔ جن لوگوں کو ماضی میں سماج میں اپنی مناسب جگہ حاصل کرنے کے مواقع حاصل نہیں بنتے انھیں موزوں مواقع مہیا کرنے ہوں گے۔ ہمیں فوری ترقی کے لئے ایسے حالات پیدا کرنے کے قابل ہو جانا چاہئے کہ جن میں سارا ملک مجموعی طور پر عزم راسخ سے یہ کوشش کرے کہ وہ آج ہر چیز کی کم کھپت کریں گے تاکہ مستقبل میں ان کی بہتات ہو جائے۔ آبادی کی اکثریت کی زندگیوں پر سوشلسٹ سماج بننے سے کیا اثر پڑے گا اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں آیندہ ترقی اور خوشحالی لانے کی خاطر آج قربانی کرنی اور سختی جھیلنی ہوگی۔ ملک کے نظم و نسق اور ترقیاتی کاموں میں لوگوں کی معاونت بڑھتی جانی چاہئے کیونکہ صرف ان کی امداد اور اعانت سے ہی ہماری فوری اور راشد ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ملک کے مادی ذرائع اور جن شکتی کا بہترین استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(شری گلزاری لال نندہ کی ایک تقریر کا اقتباس)

عبداللطیف اعظمی

انڈونیشیا کی سیاست کا رُخ

ابھی حال میں (۲۲ ستمبر ۱۹۵۴ء) انڈونیشیا کے وزیر اعظم ڈاکٹر علی شاسترمیجویو چند اہم مسائل پر ہمارے ہر دلعزیز وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے تبادلہ خیال کرنے کی غرض سے دہلی تشریف لائے تھے۔ ایشیا کے جن ممالک سے ہندوستان کے بہت گہرے تعلقات ہیں اور جن سے موت اور زیست جیسے نازک اور اہم مواقع پر بھی رفاقت کی امید ہے، ان میں سے ایک انڈونیشیا بھی ہے۔ انڈونیشیا کی ۹۵ فیصدی آبادی مسلمان ہے لیکن اس کے باوجود انڈونیشیا پاکستان کے تمام پروپیگنڈے کے باوجود اس سے زیادہ ہندوستان کے قریب ہے۔ اس کے دو اہم اسباب ہیں۔ ایک تو ہندوستان اور انڈونیشیا کے درمیان قدیم زمانے سے دوستی چلی آرہی ہے۔ چنانچہ انڈونیشیا کی تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور زبان پر قدیم ہندوستان کے گہرے اثرات اب تک موجود ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ہندوستان اور انڈونیشیا کی خارجہ پالیسی میں گہرا اتحاد ہے۔ دونوں ملکوں کے رہنما اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ دونوں ملکوں کا اور ایشیا کا فائدہ ایک ساتھ چلنے میں ہے۔ الگ الگ چلنے میں سب کا نقصان ہے۔ ہندوستان اور انڈونیشیا دونوں نے ابھی حال میں آزادی حاصل کی ہے۔ دونوں کے اندرونی اور بیرونی مسائل قریب قریب ایک ہیں دونوں جگہ کی حکومتیں رجعت پسندوں سے نبرد آزما ہیں۔ یہاں کی حکومت بعض تنگ نظر عوام اور وہاں کی حکومت مذہب کے اندھوں سے۔ کمیونسٹوں کی ریشہ دوانیاں یہاں بھی ہیں اور وہاں بھی اور سب سے اہم یہ کہ دونوں ملکوں کو اپنی آزادی کو مستحکم کرنے اور اس کو برقرار رکھنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اس لئے دونوں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور دوست رہنا چاہتے ہیں۔

جہاں ان دونوں ملکوں کی بہت سی باتوں میں یکسانیت ہے۔ وہاں بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں۔ جن میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اور اس کے قدرتی وسائل بہت وسیع ہیں۔ ہمیں پنڈت جواہر لال نہرو جیسی شخصیت حاصل ہے۔ جو ایک طرف اپنے وطن میں انتہائی ہر دلعزیز اور مقبول ہیں جس کی وجہ سے اندرونی یکجہتی کو تقویت پہنچتی ہے۔ دوسری طرف بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ جس کی وجہ سے دنیا کے سیاست دان ہندوستان کی رائے کو آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں ایک ایسی سیاسی جماعت کی حکومت ہے، جس کو پارلیمنٹ میں بھاری اکثریت حاصل ہے۔ اس کے مقابلے میں انڈونیشیا میں کوئی ایسی سیاسی جماعت نہیں ہے، جو تنہا حکومت کر سکے۔ ۱۹۵۱ء میں انڈونیشی حکومت نے وہاں کی سیاسی پارٹیوں کے بارے میں ایک کتابچہ شائع کیا تھا۔ اس کے رو سے ۲۷ سے زیادہ وہاں با اثر پارٹیاں ہیں۔ ممکن ہے کہ آئندہ عام الیکشن تک ان میں سے بہت سی ختم ہو جائیں لیکن وہاں کی سیاسی پارٹیوں کی کثرت اور ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر علی شاسترمیجویو کی کابینہ میں گیارہ پارٹیاں شریک ہیں اور ان پارٹیوں میں حسب ذیل تفصیل کے مطابق عہدے تقسیم کئے گئے ہیں۔

(۱) انڈونیشی نیشلسٹ پارٹی کو چار عہدے۔ وزیر اعظم، امور خارجہ، معاشی امور، فائننس

(۲) عظیم انڈونیشی پارٹی کو تین عہدے۔ نائب وزیر اعظم، امور داخلہ، رسل و رسائل

(۳) مسلم پارٹیوں کو دو عہدے۔ پبلک ورکس، ہیلتھ (صحت)

(۴) نہضتہ العلماء کو تین عہدے۔ دوم نائب وزیر اعظم، امور مذہبی اراضی کی جدید تنظیم۔

(۵) انڈونیشی عوامی ایسوسی ایشن کو ایک عہدہ۔ اطلاعات

(۶) انڈونیشی کسانوں کی جماعت کو ایک عہدہ۔ زراعت

(۷) ترقی پسند پارٹی کو ایک عہدہ۔ دفاع

(۸) قومی عوامی پارٹی کو ایک عہدہ۔ انصاف

(۹) عظیم انڈونیشیا کی پارٹی کو ایک عہدہ - سماجی کام

(۱۰) لیبر پارٹی کو ایک عہدہ - لیبر

(۱۱) انڈیپنڈنٹ کو ایک عہدہ - تعلیم

لیکن بڑی خوبی اور تعجب کی بات یہ ہے کہ پارٹیوں کی اس کثرت اور اختلافات کے باوجود کابینہ بڑی یکجہتی کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ موجودہ کابینہ ۳۰ جولائی ۱۹۵۳ء کو مرتب ہوئی تھی۔ اس وقت سے اب تک اس حکومت کے خلاف بارہا عدم اعتماد کی تجویز پارلیمنٹ میں پیش ہوئی اور ہمیشہ بھاری اکثریت سے مسترد ہو گئی۔

ان تمام پارٹیوں میں صرف دو پارٹیاں سب سے اہم ہیں ایک مسجومی پارٹی یعنی مسلم پارٹی، دوسری ڈاکٹر سوکارنو کی نیشنلسٹ پارٹی (پی۔ این۔ آئی یعنی پارٹائی نیشنل اندونیشیا) مسجومی پارٹی کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ یہ ملک کی سب سے بڑی پارٹی ہے۔ یہ سوشلسٹ خیالات کے ساتھ ساتھ نجی صنعتوں اور ملک میں بیرونی سرمایہ لگانے کی حامی ہے۔ ایک طرف انڈونیشیا کی خارجہ پالیسی اور روس اور امریکہ کی موجودہ سرد جنگ میں غیر جانبدار رہنے کی بھی حامی ہے۔ دوسری طرف اس کے بعض لیڈر مثلاً سابق وزیر اعظم سوکی مین مغربی ممالک کے بہت گہرے دوست ہیں۔ مسجومی پارٹی کا اثر اس لحاظ سے اور بڑھ جاتا ہے کہ اس کا سوشلسٹ پارٹی سے اتحاد ہے۔ سوشلسٹ پارٹی اگرچہ ممبروں کے لحاظ سے بہت چھوٹی ہے۔ مگر اثر کے لحاظ سے بہت اہم ہے اور اس کے لیڈر ستان شہریار جو وزیر اعظم بھی رہ چکے ہیں اور ہندوستان بھی آچکے ہیں۔ بڑی شہرت کے مالک ہیں۔

ڈاکٹر سوکارنو کی نیشنلسٹ پارٹی انڈونیشیا کی آزادی سے قبل قریب قریب اتنی ہی مقبول تھی، جتنی ہمارے یہاں کی کانگریس پارٹی۔ چنانچہ ڈاکٹر سوکارنو کی پوزیشن قریب قریب وہی ہے جو ہمارے یہاں پنڈت جواہر لال نہرو کی ہے۔ اور جو سن یات سین کو چین میں حاصل تھی۔ لیکن پچھلے دو تین سال سے نیشنلسٹ پارٹی کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کافی گھٹ گئی ہے۔ چنانچہ اس کی تلافی اور عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اسے کیمونسٹ پارٹی (پی۔ کے۔ آئی یعنی پارٹائی کیمونسٹ انڈونیشیا) کا سہارا لینا پڑا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر علی شاستر و میجو یو کی موجودہ کابینہ میں کوئی کیمونسٹ نہیں ہے، لیکن ان کی نیشنلسٹ پارٹی اور کیمونسٹ پارٹی کا اتحاد کوئی دو سال سے ہے۔ اس کے علاوہ بعض دوسری چھوٹی چھوٹی پارٹیوں سے بھی اسے اتحاد کرنا پڑا ہے، اور ان کے نمائندے کابینہ میں بھی شامل ہیں۔ مثلاً قدامت پرست پارٹی (پی۔ آئی۔ آر) جس کا حکومت کے ملازمین پر بہت گہرا اثر ہے، اور دو مسلم جماعتیں ایک پی، ایس، آئی، آئی دوسری نہضتہ العلماء۔ ان جماعتوں کے اتحاد سے نیشنلسٹ پارٹی اس وقت حکومت چلا رہی ہے، لیکن آنے والے عام انتخابات میں جو پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء میں ہونے والے ہیں اس کی مسجومی پارٹی سے ٹکر ہو گی اور یہ انتخابات فیصلہ کریں گے کہ ملک کی اصلی اور با اثر جماعت کونسی ہے۔

مسجومی اور نیشنلسٹ پارٹی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر خالص اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ اسلامی حکومت کے قیام کی دار السلام بھی کوشاں ہے، مگر اس نے تشدد اور فوج کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہا اس لئے وہ خلاف قانون ہے اور اس کے برسر اقتدار آنے کا امکان قریب قریب بالکل نہیں ہے، لیکن مسجومی پارٹی انتخابات اور عوام کی حمایت سے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس نے عوام کے دلوں میں کافی جگہ حاصل کر لی ہے۔ اس کے برعکس نیشنلسٹ پارٹی اسلامی حکومت کی سخت مخالف ہے اور سیکولرزم کی قائل ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ڈاکٹر سوکارنو اور ان کے دوسرے ساتھی مذہب یا اسلام کے مخالف ہیں۔ بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ انھوں نے انڈونیشی حکومت کے لئے جو پانچ بنیادی اصول مقرر کئے ہیں، وہ تمام تر اسلامی اصول اور تعلیمات سے ماخوذ ہیں وہ پانچ اصول حسب ذیل ہیں۔

۱۔ خدا کو ماننا اور ہر شہری کی مذہبی آزادی کو تسلیم کرنا۔

۲۔ انسان دوستی

۳۔ قومیت — یعنی تمام انڈونیشیا کے قومی اتحاد کو تسلیم کرنا اور اس کو مستحکم کرنا۔

۴۔ جمہوریت — نمائندہ حکومت کے اصول کو ماننا

۵۔ سماجی انصاف — یعنی سماجی، معاشی اور سیاسی مساوات کو ماننا اور ہر شہری کے لئے اس کے مواقع بہم پہنچانا۔

نیشنلسٹ پارٹی کے ان پانچوں اصولوں کو پوری قوم نے تسلیم کر لیا ہے اور انھیں کی روشنی میں حکومت کا عارضی دستور مرتب کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سوکارنو اور ان کے ساتھیوں کی خدمات اور مقبولیت کی بنا پر یہ توقع کرنا کچھ بیجا اور غلط نہ ہوگا کہ عام انتخابات میں کوئی ایسی جماعت برسر اقتدار نہ آسکے گی۔

جو ان اصولوں کی کھلم کھلا مخالف ہو۔ چنانچہ مسجومی پارٹی کو مقبولیت حاصل ہے یہ محض مذہبی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ ایک تو اس لئے ہے کہ وہ معتدل خیالات کی حامل ہے، دوسرے نیشنلسٹ پارٹی کا کمیونسٹ پارٹی سے اتحاد ہے اور وہاں کمیونسٹ پارٹی کے طور طریق اتنے ہی برے سمجھے جاتے ہیں جتنے ہندوستان میں۔ اگرچہ اس کا نام مسجومی یعنی مسلم پارٹی ہے۔ لیکن اس کا دروازہ تمام قوموں کے لئے کھلا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کے ممبروں میں کرسچین اور کیتھولک پارٹی کے ممبر بھی کافی تعداد میں شامل ہیں۔

تھوڑے بہت فرق کے ساتھ جو مسائل حکومت ہند کے سامنے ہیں، وہی مسائل انڈونیشی حکومت کے سامنے ہیں۔ مثلاً زرعی پیداوار کو بڑھانا، صنعت کو ترقی دینا، جہالت کو دور کرنا اور نظام تعلیم کی اصلاح اور بین الاقوامی سیاست میں دھڑے بندی سے الگ رہنا اور ایشیا کے مفاد کی حمایت اور تائید کرنا۔

انڈونیشیا کی بنیادی غذا چاول ہے۔ لیکن وہاں اتنا چاول پیدا نہیں ہوتا، جو وہاں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے کافی ہو۔ چنانچہ امسال ڈیڑھ لاکھ ٹن چاول دوسرے ملکوں سے خریدا جائے گا۔ مگر اس بات کی برابر کوشش جاری ہے کہ چاول کے بارے میں انڈونیشیا خود کفیل ہو۔ چنانچہ جنوری ۵۵ء کے شروع میں وزیر زراعت نے اعلان بھی کیا ہے امسال ہمارا ملک چاول کے بارے میں خود کفیل ہو جائے گا اور کسی اور ملک سے چاول منگوانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہاں کی زرعی پیداوار کے بڑھانے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ بڑے بڑے فارم اور زرخیز علاقے کافی تعداد میں غیر ملکیوں کے قبضے میں ہیں۔ تازہ تخمینے کے مطابق کل زمین کا صرف ۶۹ فیصدی علاقہ مقامی باشندوں کے قبضے میں ہے، جس میں سے ۶۱ فیصدی پر چھوٹے چھوٹے کسان قابض ہیں۔ ۱۱ء۸ فیصدی پر بڑے بڑے فارم ہیں۔

انڈونیشیا کی برآمدی اشیاء میں ربڑ، ٹن اور پٹرولیم (معدنی تیل) کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ خاص طور پر ربڑ پر انڈونیشیا کی معیشت کی بنیاد ہے۔ مگر اس کی قیمت کا اتار چڑھاؤ اتنی تیزی سے ہوتا ہے کہ ملک کی معیشت اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ دوسرے اب تک انڈونیشیا کی ان چیزوں کا مارکٹ محدود تھا، مگر نئے حالات نے نئی نئی راہیں پیدا کر دی ہیں۔ چنانچہ ابھی حال میں انڈونیشیا اور چین کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ ہوا ہے۔ جس کی رو سے انڈونیشیا چین کو ربڑ، ٹن اور کھوپرا سپلائی کرے گا۔

بڑی بڑی صنعتوں کا قیام، بیرونی امداد کے بغیر مشکل ہے۔ اور بیرونی امداد حاصل کرنے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ وہاں امن و امان ابھی تک پوری طرح سے قائم نہیں ہو سکا ہے۔ وہاں آئے دن ایسے خاصے پیمانے پر فوجی حملے ہوتے رہتے ہیں۔ اس حملے میں ایسے افراد بھی شامل ہیں، جو پہلے انقلابی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ موجودہ سیاسی پالیسی سے اتفاق نہ رکھنے کی بنا پر تشدد کی راہ انھوں نے اختیار کر لی ہے۔ ان کے حملوں کے اصل نشانہ تو غیر ملکی ہوتے ہیں لیکن حملے کے وقت جو کہ اندھا دھند ہوتا ہے ملکی اور غیر ملکی سرمایے میں فرق کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ دوسرے ڈاکوؤں کی وہاں بڑی کثرت ہے، ان سے جانی اور مالی دونوں نقصان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اگرچہ حکومت نے ان دونوں قسم کے گروہوں پر کافی قابو حاصل کر لیا ہے۔ مگر جو ملک تین ہزار جزیروں پر مشتمل ہو اور وہ جزیرے ایک بہت وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے ہوں اور جہاں کی فوج بھی کافی اصلاح طلب ہو، وہاں مکمل امن و امان قائم کرنے کے لئے آزادی کے پچھلے پانچ سال کافی نہیں ہیں۔ ان پانچ سالوں میں اب تک جتنا کچھ ہوا ہے، وہی بہت ہے۔ مختصر یہ کہ بڑی صنعتیں تو نہیں۔ مگر چھوٹی چھوٹی صنعتیں بہت تیزی سے قائم ہو رہی ہیں اور ہندوستان کی طرح دیہاتوں کی ترقی اور دیہی صنعتوں کی ترقی کی طرف کافی توجہ ہے۔

جہالت دور کرنے کے سلسلے میں بہت کافی کام ہوا ہے۔ آزادی سے قبل وہاں ۹۰ فیصدی جہالت تھی اور اب اندازہ یہ ہے کہ گھٹ کر ۶۰ فیصدی رہ گئی ہے۔ ایک طرف حکومت خواندگی کو بڑھانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کر رہی ہے۔ دوسری طرف اعلیٰ تعلیم اور ٹکنیکل تعلیم کے لئے کثرت سے تعلیم گاہیں کھول رہی ہے۔ ان کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا ہے۔ سوشل ایجوکیشن کا کام بھی کافی تیزی سے ہو رہا ہے۔ اس کام کے لئے شروع میں جامعہ کے ہر دلعزیز کارکن شفیق الرحمان صاحب مرحوم گئے تھے۔ جو وہاں سے واپس آنے کے بعد دہلی اسٹیٹ کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے تھے۔ آج کل بھی یہ کام ہندوستان کے ایک صاحب انجام دے رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان نے اپنی آزادی کے چند سالوں میں جس قدر تعمیری کام کئے ہیں، وہ دوسری جگہ کس قدر عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

غرض انڈونیشیا ترقی کی راہ پر مستقل مزاجی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اندرونی اور بیرونی سیاست میں وسیع النظری اور ترقی پسندی کا ہمیشہ ثبوت دیا ہے۔ ایشیا کی عزت اور آبرو کو اونچا کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہا ۔ ہندوستان نے اس کی آزادی میں اخلاقی مدد دی ہے ۔ جس کا اس نے بار بار شکریہ ادا کیا ہے اور آج بھی وہ ہندوستان کی رہنمائی کو تسلیم کرتا ہے اسی طرح ہندوستان نے انڈونیشیا کی رفاقت اور دوستی پر بھروسہ اور اعتماد کیا ہے اور اسے سو فیصدی یقین ہے کہ اس کا اعتماد غلط ثابت نہیں ہوگا ۔

ریلوے مسافروں کا کرایہ ——— نئی اور پرانی شرح

درجہ	موجودہ شرح	فاصلہ	مجوزہ نئی شرح
ایرکنڈیشنڈ	۳۰ پائی فی میل	ایک سے تین سو میل	۳۴ پائی فی میل
		تین سو ایک میل اور اس سے اوپر	۳۲ پائی فی میل
دوئم	۱۶ پائی فی میل	ایک سے ایک سو پچاس میل	۱۸ پائی فی میل
		۱۵۱ میل سے ۳۰۰ میل	۱۶ پائی فی میل
		۳۰۱ میل اور اُس سے اوپر	۱۵ پائی فی میل
درمیانہ	ڈاک یا ایکسپریس ۱۰½ پائی فی میل	ایک سے ۱۵۰ میل ←	ڈاک یا ایکسپریس ۱۱ پائی فی میل
			عام گاڑی ۹½ پائی فی میل
	عام گاڑی ۹ پائی فی میل	۱۵۱ میل سے ۳۰۰ میل ←	ڈاک یا ایکسپریس ۱۰½ پائی فی میل
			عام گاڑی ۹ پائی فی میل
		۳۰۱ میل اور اس سے اُوپر ←	ڈاک یا ایکسپریس ۹½ پائی فی میل
			عام گاڑی ۸½ پائی فی میل
سوئم*	ڈاک یا ایکسپریس ۶ پائی فی میل	ایک سے ۱۵۰ میل ←	ڈاک گاڑی یا ایکسپریس ۶½ پائی فی میل
			عام گاڑی ۵½ پائی فی میل
	عام گاڑی ۵ پائی فی میل	۱۵۱ میل سے ۳۰۰ میل ←	ڈاک یا ایکسپریس ۶ پائی فی میل
			عام گاڑی ۵ پائی فی میل
		۳۰۱ میل اور اس سے اُوپر ←	ڈاک یا ایکسپریس ۵ پائی فی میل
			عام گاڑی ۴½ پائی فی میل

* اس اعلان کے بعد یہ اعلان بھی ہو چکا ہے کہ ایک میل سے پچاس میل تک تیسرے درجے کے کرایے میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر تاراچند

بھارت اور ایران کا تجارتی اور بحری عہد نامہ

یہ معاہدہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے دُنیا کے مختلف ملکوں اور خاص کر ہمارے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ ہمارے پُرامن اور دوستانہ تعلّقات کے سلسلے کو وسعت دینے کے لئے ایک اور کڑی مہیّا ہو گئی ہے اس عہد نامے سے ہمارے دونوں ملکوں کے ان گہرے تعلّقات کو تجدید حاصل ہوئی ہے جو انتہائی قدیم زمانے سے چلے آتے تھے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ تاریخِ عالم میں بھارت اور ایران کی مانند دو مُلکوں کے لوگوں کے اس قدر قریبی تعلقات کی مثالیں خال خال ہی ملیں گی۔ ابتدائے تاریخ سے آج تک دونوں ملک تجارتی اور ثقافتی داد و ستد کے گہرے رشتے سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ چلے آتے ہیں۔

پوربی ایران (بلوچستان، سیستان اور مکران) اتری ایران (دامغان) پچھمی ایران (سوسیانہ۔ فارس) اور بھارت میں سندھ، ستلج اور سرسوتی کی وادیوں میں آثارِ قدیمہ کی تلاش میں جو کھدائی کا کام ہوا ہے، اس سے انتہائی قدیم زمانے کی ایسی یادگاریں برآمد ہوئی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان ملکوں کے مابین کافی وسیع پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ نقش و نگار والے برتن، آویزے، مہریں، سیپ کے کام والی اشیا، ہاتھی دانت کی چیزیں اور بھارتی مناظر پیش کرنے والی پرستش و عبادت کی اشیا ایران میں مذکورہ بالا مقامات پر بکھری ہوئی پائی گئی ہیں۔ چاول، سوتی کپڑا اور روزمرہ کی ضروریات کا مال بھی ایران میں درآمد ہوتا تھا اور اس کے بدلے میں یہاں سے نیلم، فیروزے اور عقیق جیسے جواہرات، تانبہ اور کانسی جیسی دھاتیں اور دھاتوں کے بارے میں علمی واقفیت ایران سے باہر جاتی تھی۔ اجناس میں سے جَو اور گندم اور پھلوں میں آلو، خوبانی اور شاید انگور کی کاشت کا علم بھی ایران سے ہی بھارت گیا تھا۔

ثقافتی تعلّقات

کئی صدیوں تک باہمی تبادلے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اندریں اثنا بھارت اور ایران نے زمانے کے کئی انقلابات دیکھے۔ ایران اور بھارت میں عالمگیر مذاہب نے جنم لیا اور عالمگیر سلطنتیں قائم ہوئیں۔ مختلف ملکوں اور لوگوں کے وسیع سیاسی نظاموں کے ماتحت پُرامن طور پر اکٹھے رہنے سے تجارت اور سفر و سیاحت کو توسیع دینے کے لئے موافق اقتصادی اور مجلسی حالات پیدا ہوئے۔ بہت سی قوموں کے بحری سیاحوں نے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی جانب سفر کئے۔ جہازوں کے ذریعے بھارت سے سونا، سوتی اور ریشمی کپڑے، گرم مصالحے، صندل وغیرہ کی خوشبودار لکڑی، ساگوان، روزمرہ استعمال اور آرائش و آسائش کی اشیا بحری جہازوں کے ذریعے ایران جاتی تھیں جو وہاں سے دھاتیں، خلیج فارس کے موتی اور ہیرے جواہرات بھارت لے آتے تھے۔ ان سب سے زیادہ بیش قیمت ایک اور تبادلہ بھی ان دونوں ملکوں کے مابین ہوتا رہا یعنی علوم و فنونِ لطیفہ، سائنس، فلسفہ اور مذہبی خیالات کا تبادلہ۔ اسلام کے پھیلاؤ سے ایران اور بھارت کے تعلّقات اور بھی زیادہ قریبی ہو گئے اور سمندری راستوں کے علاوہ قافلوں کے ذریعے ہرات، کابل اور مشہد کے راستے نیشاپور، ہمدان اور تبریز وغیرہ ایرانی شہروں بلکہ ان سے بھی پرے کے علاقوں کے ساتھ بھارت کا تجارتی تعلق قائم ہو گیا۔ ان قافلوں کے ہمراہ علما، حکما، منجم، سنگیت کار، شاعر، مصنّف، مصوّر، معمار اور روزمرہ استعمال کی اشیا کو حسن و خوبی عطا کرنے والے دستکار لوگ بھی ایک سے دوسرے ملک کو آنے جانے لگے ان لوگوں کی بدولت علوم و فنون، دھارمک اور اخلاقی خیالات، قصّے کہانیاں اور شعر و ادب ملکی حدود سے بے نیاز ہو گئے۔

زمانے نے کروٹ بدلی اور ایشیا کا ستارہ پچھمی سورج کے طلوع ہونے پر ماند پڑ گیا ۔ انیسویں صدی میں ایران اور بھارت کے لوگوں کے ثقافتی تعلقات کی رو مدھم پڑ گئی ۔ لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے ایشیا کے لوگوں میں پھر بیداری کا ایک نیا جذبہ پیدا ہوا اور آج وہ ترقی و خوشحالی کے ایک نئے دور کی دہلیز پر کھڑے ہیں ۔

یکساں قسم کے مسائل

بھارت اور ایران کو یکساں قسم کے مسائل درپیش ہیں ۔ افلاس، بیماری اور جہالت ہم دونوں کے مشترکہ دشمن ہیں ۔ ہمیں ان کا مقابلہ کرنا ہے ۔ ہماری مجلسی خرابیاں بھی ایک جیسی ہیں ۔ ہماری ضروریات اور مقاصد بھی مشترکہ ہیں ۔ خوش قسمتی سے قدرت نے ایران کو زرعی اور معدنی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے ۔ اس نے آگے بڑھنے، اپنی صنعتوں کو فروغ دینے اپنی زراعت کو جدید ترین معیار پر لانے اور اپنے شہریوں کا معیار زندگی بلند کرنے کا مصمم عزم کر رکھا ہے ۔ بھارت کو ایسے ہی مواقع میسر ہیں اور وہ بھی ایسی جد و جہد میں ہمہ تن مصروف ہے ۔ اس لئے ہمیں دونوں ملکوں کی بہبود، خوش حالی اور دولت کو فروغ دینے کے لئے نہ صرف اپنے قدیم تعلقات کو از سر نو بحال کرنا چاہئے بلکہ ان سے بھی زیادہ گہرے اور مضبوط تعلقات کو استوار کرنا چاہئے ۔ میری صدق دلی سے یہ تمنا ہے کہ یہ عہد نامہ اس مقصد کو پورا کرنے والا ثابت ہو

کاویری کے پانی کے استعمال کی تدبیریں

بھارت میں وادئ کاویری سب سے زیادہ گنجان آباد علاقوں میں شمار ہوتی ہے ۔ اس لئے آبادی کی ضروریات کے تقاضے سے مجبور ہو کر کاویری کے زیادہ سے زیادہ پانی کو استعمال میں لانے کی بہت سی تدبیریں کی گئیں ۔ ملک بھر میں کاویری ہی ایسا دریا ہے جس کے پانی کا سب سے زیادہ حصہ استعمال میں لایا جا رہا ہے ۔ کاویری کا ساٹھ فیصدی تک پانی استعمال کر لینے کے باوجود اس وادی کی تشنگی نہیں بجھ سکی اور آبپاشی کے لئے مزید پانی حاصل کرنے کی نئی تدبیریں اختیار کرنے کے بارے میں ملک کے انجینیروں کی اختراعی قابلیت ختم نہیں ہوئی ۔ پہلے پہل آسان اور کم خرچ تدبیروں سے اور بعد میں زیادہ محنت طلب بھاری اخراجات والی اسکیموں کے ذریعے سے کاویری کے پانی کو استعمال میں لایا گیا ۔ کرشن راج ساگر اور میٹور بند تعمیر کر کے بہت لمبی نہریں نکالی گئیں ۔ لاکھوں ایکڑ زمین کی آبپاشی کے ساتھ ساتھ سینکڑوں مربع میل علاقے میں بجلی مہیا کر کے اس وادی کی دولت پیدا کرنے کی صلاحیت کو بڑھایا گیا ۔

کاویری کے معاونوں پر انجینیروں کی نگاہ ۔ بجلی پیدا کرنے اور آبپاشی کے لئے کاویری کا پانی استعمال کر لینے پر بھی جب علاقے کی ضروریات پوری نہ ہو سکیں تو انجینیروں کی نگاہ کاویری کے معاونوں پر پڑی ۔ دریائے بھوانی جو کاویری کا سب سے بڑا معاون ہے اس پر دو بند تعمیر کرنے کی اسکیمیں آج سے ایک سو برس سے بھی زیادہ پہلے یعنی ۱۸۳۴ء میں سوچی گئی تھیں ۔ جن کا مقصد یہ تھا کہ طغیانی کے دنوں میں زائد پانی کو خشک موسم کے طویل عرصے میں زمینوں کی آبپاشی کے لئے جمع کرنے کا انتظام کیا جائے لیکن کئی بار تحقیقات وغیرہ ہو چکنے کے بعد اقتصادی تقاضوں کے پیش نظر ان سکیموں پر عمل درآمد نہیں کیا گیا ۔ لیکن جب بھارت میں قومی حکومت قائم ہوئی تو ستمبر ۱۹۴۷ء میں ان میں سے ایک یعنی "لوئر بھوانی پروجیکٹ" کو عملی شکل دینے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ زیادہ سے زیادہ علاقے کو سیراب کر کے زیر کاشت لایا جائے اور ملک میں خوراک اور کپڑے کی شدید قلت کو دور کرنے کے لئے موثر اقدام کیا جائے ۔

لوئر بھوانی پروجیکٹ دریائے بھوانی دکنی بھارت کے "غلہ خیز خطہ" ضلع تنجور میں آبپاشی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے ۔ یہ دریا مغربی گھاٹ کے پوربی ڈھلانوں میں ضلع مالابار کی خاموش وادی کے جنگلات سے نکلتا ہے ۔ بیس میل تک دکن پورب کی جانب بہتا ہوا ایک پہاڑی کے کونے پر چکر کھا کر اتر پورب کا رخ کر لیتا ہے اور کوہ نیلگری کے دکنی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ کمر بند کی طرح لپٹا ہوا چلا جاتا ہے ۔ کوہ نیلگری کے اتری پوربی ڈھلانوں سے بارشوں کا جتنا پانی نیچے اترتا ہے وہ مویار ندی میں جا گرتا ہے یہ ندی لوئر بھوانی بند کے محل وقوع سے اوپر دریائے بھوانی میں جا ملتی ہے ۔ دکن پچھم اور اتر پوربی دونوں موسمی بارشوں کا پانی اسی دریا میں آ ملتا ہے ۔

ڈرامے

پنجابی ڈرامے کا ارتقاء

سرزمینِ پنجاب میں ڈرامے کی نشو و نما بڑی حد تک عوامی روایات کی مرہونِ منت ہے۔ یوں تو سنسکرت ڈراموں کے ترجمے بھی ہوئے لیکن ان کا اثر قطعی عبوری رہا۔ بھائی ویر سنگھ نے سکھ مت کے دھارمک مقاصد اور بنیادی خیالات کو ڈرامے کے روپ میں پیش کیا۔ لیکن یہ ڈرامے اسٹیج کرنے کی بہ نسبت پڑھنے کے لیے لکھے گئے تھے۔

بہرکیف پنجاب میں لوک ڈرامے کی روایات کے بیج ہمیشہ پائے جاتے رہے۔ گویّوں کا ایک گروہ جسے "ڈھاڈی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، گاؤں گاؤں گھوم کر رزمیہ نظموں کے سورماؤں، سکھ گوروؤں اور عوامی کہانیوں کے ہیروؤں کے بارے میں گیت سنایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ خانہ بدوش بھانڈ اور میراثی بھی تھے جو نہ صرف افسانے سنایا کرتے بلکہ کہانیوں کو ڈراموں کے رنگ میں ایکٹنگ کے ذریعے پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے تاریخی قصے عموماً فی البدیہہ ہوا کرتے۔

جدید ڈرامے کی داغ بیل پروفیسر آئی سی نندہ کے ہاتھوں پڑی جنھوں نے ۱۹۱۳ء میں پہلا ڈرامہ لکھا۔ یہ ڈرامہ ایک نئی نویلی دلھن اور ہمارے سماج میں اس کی قسمت کے اردگرد گھومتا ہے۔ اس کے بعد بھی موصوف نے کئی ڈرامے لکھے۔ یہ تمام کے تمام سماجی موضوعات سے بحث کرتے ہیں۔ پروفیسر نندہ نے ایک ایکٹ کے ڈرامے اور طویل ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ان موضوعات پر ڈراموں کی پرانی روایات کی دیوار ڈھا دی جن میں جابجا گیت ہوتے ہیں۔ پنجاب میں یہ چیز اردو کی خصوصیت تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ان گنت تصانیف کے ذریعے ڈرامے کے روپ کو مقبول بنایا۔ خصوصاً کالجوں میں ان کی مقبولیت بہت بڑھ گئی۔ نندہ کے بعد ہرچرن سنگھ، موہن سنگھ، روشن لال آہوجہ، امریک سنگھ گوردیال سنگھ پھول، بلبیر سنگھ، جی ایس کھوسلہ، اور بلونت گارگی نے ڈرامہ نویسی میں شہرت حاصل کی۔

گارگی پنجابی ڈرامہ نویسوں میں ایسی حیثیت کے مالک ہیں جن سے دوسرے ہم عصر ڈرامہ نگاروں نے خوشہ چینی کی ہے۔ گارگی نے ایکانکی ڈرامے بڑی تعداد میں لکھے ہیں۔ آدھ درجن سے زیادہ طویل ڈرامے بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ انھوں نے مغربی طرز اور ڈھنگ کو تو اپنا لیا ہے لیکن موضوع کے لحاظ سے وہ پنجاب کی سرزمین کا عکس پیش کرتے ہیں جن میں دیہی روایات کی خوبصورتی اور قوت کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں ان کے ڈرامے "کیسرو" اور "کنک دی بلّی" پنجاب کے دیہی علاقوں کا خوبصورت مرقع پیش کرتے ہیں۔ ان کا ڈرامہ "لوہا کٹ" گاؤں کے لوہار کے ہتھوڑوں کی صدا سے گونجتا ہے۔

پنجابی ڈرامے میں سماجی حقیقت پسندی کی روایات کے ساتھ ساتھ ایک ایکٹ کی غنائی تمثیل نگاری کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں شیلا بھاٹیہ کا نام سب سے اہم ہے۔ ان کے گیتوں میں تغزل بھی ہوتا ہے اور غنائیت بھی۔ چنانچہ انھوں نے غنائی تمثیل نگاری کے ذریعے ڈرامے کے ڈھانچے میں دھرتی کی محبت اور گیت کا پریم بھر دیا ہے۔ اور پنجاب کی جنتا میں یہ خصوصیات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔

ہندی ڈرامے کی روایت

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ہندی ادب میں جدید دور کی ابتدا ڈرامے سے ہوئی جدید ہندی ادب کے پیشرو بھارتیندو ہرِیش چندر (۱۸۵۰ء - ۱۸۸۵ء) اور ان کے معاصرین نے جو ادبی تخلیق کی وہ زیادہ تر ڈرامے کی شکل میں ہے۔ ان سے پہلے بھی ہندی میں چند ایک ڈرامے لکھے گئے۔ راجا لکشمن سنگھ کا لکھا ہوا ڈرامہ "شکنتلا" ۱۸۶۲ء میں شائع کیا گیا اور اب بھی اسے کالیداس کے اس غیر فانی ڈرامے کا بہترین ہندی ترجمہ خیال کیا جاتا ہے۔ سیتل پرشاد ترپاٹھی

نے 'جانکی منگل' نامی ایک اور ڈرامہ سپرد قلم کیا جو ۱۸۶۸ء میں اسٹیج کیا گیا اور اس میں سب سے اہم پارٹ بھارتیندو ہریش چندر نے ادا کیا۔

بھارتیندو ہریش چندر کی تصانیف میں ان کی طبع زاد تحریروں کے علاوہ سنسکرت، بنگالی اور انگریزی کی کتابوں کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ انھوں نے پہلا ہندی ڈرامہ 'ودیا سندر' بنگالی سے ترجمہ کیا تھا اور یہ ۱۸۶۸ء میں شائع کیا گیا۔ ان کا ڈرامہ 'درلبھ بندھو' شیکسپیئر کے ڈرامہ 'مرچنٹ آف وینس' کا کامیاب ترجمہ ہے۔ انھوں نے تقریباً بیس ڈرامے لکھے اور ان کے موضوعات انھوں نے دیومالا، تاریخ، جدید زندگی اور ذاتی تجربوں سے حاصل کئے۔ 'بھارت دردشا' میں انھوں نے طنزیہ و پرسوز انداز میں ملک کی سیاسی گراوٹ کا نقشہ کھینچا ہے۔

بھارتیندو نے اپنے ڈراموں میں بھارتی ڈرامہ کی کلاسکی اور مغربی ڈراموں کی روایات کا امتزاج پیش کیا ہے۔ ڈرامے اسٹیج کرنے میں بھی انھوں نے رہنمائی کی اور اسٹیج پر قدرتی مناظر پیش کرنے اور جدید اسٹیج کے دیگر ضروری سامان کے استعمال کو رواج دیا۔ وہ ایک کامیاب ایکٹر بھی تھے اس لئے ان کے تمام ڈرامے اسٹیج پر پیش کئے جانے کے قابل ہیں۔ ادب کے میدان میں بھارتیندو کے پیروؤں نے بنارس، کانپور اور کلکتہ کے مقامات پر شوقیہ ڈرامے کھیلنے والے نو آموز فنکاروں کی ڈرامائی سوسائیٹیاں قائم کیں۔ ان سوسائٹیوں نے بھارتیندو اور ان کے ہمعصروں کے لکھے ہوئے ڈراموں کو اسٹیج کیا۔ ڈرامہ نویسی میں بھارتیندو کی پیروی کرنے والے دیگر مصنفوں نے ہندی میں کئی ڈرامے لکھے جن میں رادھا کشن داس کا ڈرامہ مہارانا پرتاپ اسٹیج پر کافی کامیاب رہا۔

بھارتیندو کے زمانے کی سرگرمیوں کے بعد ہندی ڈرامے کی رفتار ترقی مدھم پڑ گئی اور جے شنکر پرشاد کے میدان میں آنے تک صرف چند ایک طبع زاد ڈرامے لکھے گئے البتہ اس دوران دوسری زبانوں کے کئی ڈراموں کا ہندی میں ترجمہ کیا گیا۔ ڈی۔ ایل رائے کے بنگالی ڈراموں کا ہندی میں ترجمہ کیا گیا اور یہ ڈرامے بہت مقبول ثابت ہوئے۔ جی پی سری واستو نے مولیئر کے ڈراموں کا ترجمہ کیا اور یہ بھی بہت کامیاب ثابت ہوئے۔

جے شنکر پرساد نے زیادہ تر تاریخی ڈرامے لکھے ہیں اور ان کے ڈراموں کے موضوعات بھارت کی تاریخ کے سنہری زمانہ عہد گپتا اور عہد موریا سے متعلق ہیں۔ انھوں نے بالخصوص سماج کے اس طبقہ کے لئے ہی ڈرامے لکھے جو ثقافتی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ تاہم جے شنکر کی تصانیف نے ہندی میں ڈرامے کی روایات کی بنیادیں صحیح معنوں میں رکھ دیں۔ لکشمی نرائن مصر نے اپنے ڈراموں میں زندگی کے مختلف مسائل کو چھیڑا ہے۔ ان کے ڈراموں میں برنارڈ شا اور ابسن کی تصانیف کا اثر موجود ہے۔ سیٹھ گووند داس نے بھی چند ایک سماجی و تاریخی ڈرامے لکھے ہیں لیکن ہندی ادب میں سماجی ڈراموں کی بنیادیں درحقیقت ایک ایکٹ کے ڈراموں کے منظر عام پر آنے سے رکھی گئی ہیں۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے کھیلنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ اس لئے یہ بہت مقبول ثابت ہوئے اور ہندی کے تقریباً سبھی جدید مصنفوں نے ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھنے پر قلم آزمایا ہے۔ بھگوتی چرن ورما، رام کمار ورما، اپیندر ناتھ اشک اور جگدیش چندر ماتھر بعض ایسے مصنفین ہیں جنھوں نے ہندی میں ایک ایکٹ کے بہترین ڈرامے لکھے ہیں اور یہ ڈرامے شوقیہ ڈرامہ کھیلنے والے فنکاروں کی ڈرامائی کلبوں میں بہت مقبول ثابت ہوئے ہیں۔

ریڈیو نے بھی ہندی ڈرامہ کی ترقی میں اپنا پارٹ ادا کیا ہے اور ہونہار ہندی مصنفین ڈرامے لکھنے کی طرف شوق سے متوجہ ہوئے ہیں۔

بنگال میں ڈرامائی روایت

ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح بنگال کی قدیم ڈرامائی روایت پر بھی سنسکرت روایت اثر انداز ہوئی جس طرح آسام میں "پری جات ہرن" اور "ودیا ولاپ" جیسی تصانیف دریافت ہوئی تھیں۔ اسی طرح ہندوستان کے دوسرے مختلف حصوں میں بھی بنگال کی قدیم ڈرامائی کتابوں کے نشانات پائے گئے۔ البتہ عہد مغلیہ میں ڈرامہ رو بہ تنزل رہا اور اس کی تجدید صرف چیتنیہ کے زمانے میں ہوئی۔ ایک دھارمک ڈرامہ میں جو چیتنیہ اور اس کے ساتھیوں نے پیش کیا تھا خود چیتنیہ نے رکمین کا پارٹ ادا کیا ان کے ایک دوست راما نند رائے نے "جگن ناتھ ولبھ" اور ان کے ایک چیلے روپ گوسوامی نے "ودھا دا مادھو" اور "للت مادھو ناٹک" کے ڈرامے لکھے

چونکہ ڈراما امراء کی براہ راست سرپرستی سے محروم ہو گیا اس لئے ڈرامائی روایت کو زندہ رکھنے والے صرف جاترا۔ کرشن کیرتن۔ کوی اور پنچالی تھے۔ کرشن جاترا کلیا داس کے نام سے مشہور تھے لیکن اس میں سری

کرشن کی زندگی کے متعلق دوسری کہانیاں بھی درج تھیں۔ بنگالی کرشن کیرتن کا اثر دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گیا اور آج تک بھی اس کے اثرات منی پور میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن بعد میں جاتروں کو زوال آ گیا اور عوام کی قبولیت سے محروم ہو گئے۔ بنگال میں موجودہ تھیٹر کی بنیاد کلکتہ میں انگریزی آبادکاروں نے رکھی اور وہاں تھیٹر قائم کئے۔ ۱۷۹۵ء میں ایک روسی لیبی ڈوف نے اپنے ساتھی گولک ناتھ داس کی امداد سے ایک بنگالی تھیٹر قائم کیا۔ لیکن بنگالی کا پہلا حقیقی تھیٹر نوین چندر بوس نے ۱۸۳۳ء میں اپنے شام بازار والے مکان میں قائم کیا تھا۔

بنگالی ڈرامے نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی اور سیاسی ماحول کی وجہ سے اس کے ذریعے حب الوطنی کے جذبات و خیالات کی اشاعت ہوئی۔ اس سلسلے میں تھیٹر حکومت کی سختی کی زد میں آ گیا۔ ۱۸۷۶ء میں "سرندر ونودینی" کا ڈرامہ پیش کرنے والوں پر مقدمہ چلایا گیا اور اسی سال ڈراموں کے سلسلے کو دبانے کے لئے "ڈراماٹک پرفارمینس ایکٹ" بنایا گیا۔

لیکن اس سے بھی تھیٹر کو کوئی ضعف نہ پہنچا بلکہ فروغ حاصل ہوا کیونکہ گریش چندر گھوس اور ڈی ایل رائے جیسے ڈرامہ نویسوں نے اس کے لئے زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ ڈی۔ ایل رائے کے تاریخی ڈراموں کا ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا اور وہ عوام میں مقبول ہوئے۔ تاریخی ڈرامے بتدریج ایسے ڈراموں میں تبدیل ہو گئے جن میں سماجی حقیقت پسندی کا عنصر نمایاں ہوتا۔ ابسن اور شا دیو جیسی ڈیل اور ہیرانڈلو نے دائرہ نظر کو اور بھی وسعت بخشی۔ گزشتہ بیس برس کے دوران سچین سین گپتا۔ بدیایک بھٹا چاریہ اور من متھا رائے نے عوام میں ہر دلعزیز رہے۔ بعض مشہور ناول نویسوں مثلاً تارا شنکر باندوپادیا نے اپنے ناولوں کو اسٹیج پر پیش کرنے کے لئے تھیٹر کی ضروریات کے مطابق تبدیل کر لیا۔ اسی طرح سرت چندرا کے ناولوں کو بھی ایسی زبان میں ڈھال لیا گیا ہے۔

بنگال میں تھیٹر کی ترقی وارتقا میں ٹیگور کے خاندان نے بہت اہم پارٹ ادا کیا ہے۔ شہزادہ دوارکا ناتھ ٹیگور جورنگی تھیٹر کے سرپرست رہے۔ ان کے فرزند دوندر ناتھ ٹیگور کے گھر کا جوراسنکو نامی تھیٹر نوعمر ڈرامہ نویسوں کا ایک مقبول عام مرکز بن گیا۔ خود رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنے ڈراموں کے ذریعے ڈرامائی تکنیک اور احساسات کو پاکیزگی بخشی۔ ان کے ڈرامہ رقص اور علامتی ناٹک کو اعلیٰ پایہ کی نظم اور سنگیت کی وجہ سے امتیاز کا رتبہ حاصل رہا۔

کیرالا میں ڈرامے کی روایت

ڈرامے کا جو مطلب آج کل سمجھا جاتا ہے ایسا ڈرامہ کیرالا میں موجودہ صدی میں ہی ظہور میں آیا اس کا سبب یہ ہے کہ کیرالا ناٹیا ناٹک ڈرامائی روایات کے متعلق عوام کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ اس روایت کی ابتدا کلسر کیہ ڈراموں کے ساتھ ہوئی جن میں میلوں کے موقع پر مندروں میں قومی داستانیں رزمیہ نظموں کی صورت میں پیش کی جاتی تھیں۔ ان نظموں میں مقامی واقعات اور اہم عصروں کے حالات نہایت خوبی سے بیان کئے جاتے ہیں۔ اور شروع سے ہی ان میں حقیقت پسندی کی جھلک پائی جاتی تھی۔ کنچن نمبیار نے اس روایت کو برقرار رکھا۔ انھوں نے ساٹھ سے بھی زیادہ ٹھلال لکھے ہیں۔ ٹھلال ایک طویل نظم ہوتی ہے جو ماہرین رقص ناچ کے ساتھ گاتے اور اس کے مطابق سوانگ بھرتے ہیں۔ ٹھلال روایات کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے ساتھ صرف ایک اداکار کے ذریعے تمثیل کا فن کمال کو پہنچ گیا۔ ٹھلالوں میں ہم عصروں کی زندگی بیان کی جاتی اور نمبیار مختلف طبقوں کے لوگوں پر کڑی نکتہ چینی کرتے۔ جن میں پجاریوں کا ذکر ہوتا جو ویدوں کے خزانہ علم پر اپنا پیدائشی حق جتلاتے اور اس میں بلیک مارکیٹ کے مرتکب ہوتے تھے۔ امرا کے زوال کو جو نفس پرستی اور خود نمائی کا شکار ہو رہے تھے ان ٹھلالوں میں دلکش پیرایہ میں بیان کیا جاتا۔ نیز زیادہ قیمتیں وصول کرنے والے تاجروں کی داستانیں اور ایسے سرکاری افسروں کی کہانیاں بیان کی جاتی تھیں جو اپنے آقاؤں اور عوام الناس دونوں کو دھوکا دیتے تھے۔

کتھا کلی کرالا کے ناٹیا ناٹک کی نہایت ترقی یافتہ تصویر ہے۔ فی الحقیقت یوروپین اوپرا کی مانند کتھا کلی بھی نظم۔ ڈرامہ۔ سنگیت اور تھیٹر کے دیگر فنی آرٹ مثلاً میک اپ اور لباس وغیرہ کا مجموعہ ہے۔ البتہ ٹھلال کی طرح اس میں صرف ایک فرد ہی سوانگ نہیں بھرتا۔ اس میں اتنے ہی ایکٹر کام کرتے ہیں جتنے کہ ڈرامے میں کیریکٹر ہوتے ہیں۔ چونکہ پلاٹوں کا ایک نمایاں اور عام پہلو نہ بھی تھا کہ مخالف کیریکٹروں میں تصادم ہو۔ اس لئے اوپرا میں عمل کا عنصر بہت زیادہ ہوتا تھا۔

ڈرامے کی موجودہ روایت' کلاسیکل روایت کے تماشاؤں اور ڈراموں

کے ترجموں کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی ۔ کالیداس کی تصانیف کے متعلق "شکنتلا" کے چار اور "مالاولیا گنمترا" "وکرم اور روسیا" کے تین تین ترجمے موجود ہیں ۔ ہرش کی تصانیف "رتناولی" "ناندم" اور "پریادرشیکا" کے دو دو آزادانہ ترجمے کئے گئے ۔ نیز شدرکا کے ڈرامہ "مری چک تیکا" مراری کے ڈرامہ "اناگھر گھوا" اور جے دیو کے ڈرامہ "برس رگھوا" کا بھی ترجمہ کیا گیا ۔ لیکن سنسکرت سے کئے گئے ان ترجموں میں پرانی روایت کے سنگیت اور ناچ موجود نہ تھے ۔ اس لئے سنگیت ڈرامہ کی ایک الگ روایت کو فروغ حاصل ہوا ۔ شکنتلا کا بھی اسی طریقے پر ترجمہ کیا گیا ۔ اور ایسی مقبول عام دیگر تخلیقی روایتوں میں چکرپانی وزیر کی تصانیف "پرتیپ چندر چرتیا" اور اچھوت مینن کی تصانیف "سنگیت نائی شادھا" شامل ہیں ۔

جب سی ۔ وی رمن پلے نے مزاحیہ ڈراموں اور پراہنساؤں کا سلسلہ شروع کیا تو لوگوں کے مذاق میں ایک نیا انقلاب پیدا ہوا ۔ ان سے تیز و ترش سماجی حقیقت پسندی نمبیار کے ٹھلاوں کا طنز و ہجو اور چمک دمک کا سماں بندھ گیا ۔ اور اسی وجہ سے اُسے بہت جلد مقبولیت حاصل ہوئی ۔ ان میں سنگیت کو چھوڑ کر نثر کو ذریعۂ بیان بنایا گیا جو پائیدار ثابت ہوا ۔

اس زمانے کے ڈراموں نے اس روایت کو طویل زندگی دی لیکن ایک گہرا اختلاف بھی پایا جاتا ہے ۔ سماج کے متعلق گہری واقفیت ہونے کے سبب رامن پلے کے ڈراموں کی آب و تاب اور بھی بڑھ گئی ہے ۔ بنلہ سنجی بھی اسی طرح پُرلطف ہے لیکن اب اس کا راز براہ راست غیر سماجی عناصر اور ان کے کردار پر ہے ۔ اس نئی روایت میں زور بھی ہے کیونکہ اس میں گہری ذمہ داری کا احساس پایا جاتا ہے ۔ اس نئی تخلیق میں آرٹ سماجی دنیا کو دلی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی راہ نکالتا ہے ۔

چھوٹی چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی ترقی

حکومتِ ہند نے چھوٹے پیمانے اور گھریلو صنعتوں کی ترقی کے سلسلے میں مزید مالی امداد اور قرضے منظور کئے ہیں ۔

آل انڈیا کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز بورڈ کو ۸۹ ہزار روپے کی امداد اور ۶۰ ہزار روپے قرض دیا گیا ہے ۔ اس رقم سے ہاتھ سے اعلیٰ قسم کا کاغذ بنانے والے پیداواری مرکزوں کے لئے سازو سامان خریدا جائے گا ۔ بورڈ کو کھادی کے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں دس ہزار روپیہ اور بھی دیا گیا ہے ۔

کھجور کے گڑ کی صنعت کی ترقی کے لئے مغربی بنگال کو ۶۵۷۵۰ روپے کی، اندھرا کو ۵۰۰۵۰ روپے کی، اتر پردیش کو ۳۵۹۵۰ روپے کی اور اجمیر کو ۱۷۴۶۰ روپے کی مالی امداد دی گئی ہے ۔ آہن گری کی صنعت کی ترقی کے سلسلے میں مغربی بنگال کو ۲۳۸۵۰ روپے کی امداد اور ۱۸ ہزار روپے قرض دیا گیا ہے ۔ اڑیسہ کو آہن گری اور ویلڈنگ کا کارخانہ قائم کرنے کی غرض سے ۸۵۸۵ روپے کی امداد دی گئی ۔ بار وا میں ناریل کے ریشے کی صنعت کے اسکول کی پختہ عمارت تعمیر کرنے کے لئے اندھرا کو ۲۹۵۰۰ روپے کی امداد دی گئی ۔

حکومت نے ۱۹۵۴-۵۵ء کے لئے صنعت میں فن کاری کی انڈین انسٹی ٹیوٹ کے لئے بھی امداد منظور کی ہے ۔ یہ امداد اس رقم کے برابر ہوگی جو ریاستی حکومتوں کے سوا یہ انسٹی ٹیوٹ صنعتی اداروں اور دیگر وسائل سے جمع کرے ۔ لیکن اس امداد کی رقم ۲۵۷۰۰ روپے سے زیادہ نہ ہوگی ۔
حکومت نے پانڈیچری اور کاریکل میں ہاتھ سے بنے ہوئے کپڑے کی فروخت بڑھانے کے سلسلے میں دس ہزار روپے کی امداد منظور کی ہے ۔

پنج سالہ پلان

نمبر ۶

آب رسانی

س - کاشت کار کے کھیتوں کے لئے پانی ایک بہت بڑی ضرورت ہے۔ آب رسانی کے سلسلے میں پلان میں اس کے لئے کیا انتظام کیا گیا ہے ۔

ج - توقع کی جاتی ہے کہ ۱۹۵۱ء میں جس قدر زمین کے لئے پانی مہیا کیا گیا تھا۔ موجودہ پلان اس سے ۱۹۰۷ ملین زیادہ ایکڑ زمین کے لئے آب رسانی کا انتظام کرے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ۴۰۸ ملین ٹن مزید اناج یا اس کے برابر دوسری فصلیں پیدا ہوں گی۔

س - دریائی وادیوں کے پراجیکٹوں سے جو اس وقت زیر تعمیر ہیں پلان کی مدت کے دوران میں اور اس کے بعد مکمل ہو جانے پر کن کن فائدوں کی توقع ہے؟

ج - دریائی وادیوں کے بڑے بڑے پراجیکٹوں سے جو اس وقت زیر تعمیر ہیں توقع ہے کہ وہ پلان کے آخری سال تک ۸۰۵ ملین ایکڑ مزید رقبے کو سیراب کریں گے اور ۰۸، ۱ ملین کلو واٹ مزید بجلی پیدا کریں گے۔ ان پراجیکٹوں کی تکمیل اور ان کے پوری طرح چل نکلنے کے بعد مزید ۹۶۱ ملین ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا اور مزید ۴۰۱ ملین کلو واٹس بجلی پیدا ہوگی

س - وہ کون سے بڑے بڑے آب رسانی اور بجلی کے پراجیکٹ ہیں جو زیر تعمیر ہیں اور پنج سالہ پلان میں شامل کرلئے گئے ہیں؟

ج - وہ مندرجہ ذیل ہیں :-

بھاکڑا ننگل پراجیکٹ (پنجاب، راجستھان، پیپسو)
دامودر ویلی پراجیکٹ (پچھمی بنگال اور بہار)
ہیراکڈ ڈیم پراجیکٹ (اڑیسہ)
تنگ بھدرا پراجیکٹ (مدراس اور حیدرآباد)
لوئر بھوانی پراجیکٹ (مدراس)
میورا کھشی (پچھمی بنگال)
لوئر تاپتی ویلی پراجیکٹ (بمبئی)
مچ کنڈ ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ (اڑیسہ اور مدراس)
سارداپاور ہاؤس (یو۔پی)

س - وہ کون سے بڑے ۵ پراجیکٹ ہیں جنھیں پلان میں آخری دو سالوں میں شامل کرنے کے لئے چنا گیا ہے۔

ج - چمبل پراجیکٹ (سٹیج ۱) (مدھیہ بھارت اور راجستھان)
کوسی پراجیکٹ (سٹیج ۱) (بہار اور نیپال)
کوئنا پراجیکٹ (سٹیج ۱) (بمبئی)
ریہاند پراجیکٹ (یو۔پی)
کرشنا پراجیکٹ (مدراس اور حیدرآباد)

س - چھوٹے چھوٹے آبپاشی کے کاموں کا کیا نتیجہ نکلے گا؟

ج - توقع یہ کی جاتی ہے کہ آبپاشی کے چھوٹے کام ۲ر۱۱ ملین ایکڑ مزید زمین کو زیر آب رسانی لائیں گے اور ۲ر۴ ملین ٹن اناج ان سے پیدا ہوگا۔

س - پلان میں آب رسانی کے جو چھوٹے اور بڑے پراجیکٹ شامل کئے گئے ہیں وہ ایک دوسرے پر دار و مدار رکھتے ہیں یا اُن کا آپس میں مقابلہ ہے؟

ج - آبپاشی کی بڑی اور چھوٹی اسکیموں میں کوئی کشمکش نہیں ہے۔ ہر علاقے کو اسی قسم کی اسکیم کے تحت لایا جائے گا جو اس کے لئے موزوں ترین ہے۔ اس لئے بڑی اور چھوٹی اسکیمیں ایک دوسرے پر دار و مدار رکھتی ہیں۔

س - ایسے کون سے طریقے ہیں جن سے عوام ان پراجیکٹوں کی کامیابی میں اپنا حصہ ادا کر سکتے ہیں؟

ج - عوام مندرجہ ذیل طریقوں سے اپنا حصہ ادا کر سکتے ہیں۔

(۱) آبپاشی کے بڑے پراجیکٹوں میں روپیہ لگانے کے لئے خاص طور پر جو

قرض لیا جائے۔ اس میں اپنا دھیہ دے کر۔

(۲) بہبود کی فیس اور پانی کے بڑھے ہوئے نرخ ادا کر کے۔

(۳) نہریں کھودنے اور سڑکیں بنانے کی قسم کے کاموں کے لئے دیہاتی کوآپریٹو سوسائیٹیاں بنا کر۔

(۴) آب رسانی کے سرکاری پانی کا بکفایت استعمال کر کے اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا کر۔

(۵) آبپاشی کے نجی ذرائع کو ایک مناسب اچھی حالت میں رکھنے سے۔

س - ہندوستان کے قریباً ۵۶۰۰۰۰ دیہات میں سے صرف ۳۰۰۰۰ میں بجلی مہیا کی گئی ہے۔ دیہات تک بجلی پہونچانے کے متعلق پلان میں کیا کہا گیا ہے؟

ج - پلان میں یہ کہا گیا ہے کہ دیہات میں بجلی پہنچانے کے کام کو بہت بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ کیونکہ اس سے صرف زراعت کے طریقوں ہی میں ترقی نہیں ہوسکتی اور صرف گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی حالت ہی بہتر نہیں بنائی جاتی بلکہ دیہاتی علاقوں میں زندگی کو دلکش بھی بنایا جا سکتا ہے۔ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ دیہاتوں میں بجلی مہیا کرنے اور بجلی کا سامان خریدنے کے لئے حکومت کی طرف سے کسانوں اور دیہاتی کوآپریٹو سوسائٹیوں کو قرضے دئے جائیں۔

ریلوے بجٹ

مرکزی وزیر ریلوے مسٹر لال بہادر شاستری نے لوک سبھا کے اجلاس میں سال ۵۶-۱۹۵۵ء کے لئے ریلوے بجٹ پیش کیا۔ اُنھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ دوسرے، درمیانی اور تیسرے درجے کے مسافروں کے کرایے کی نئی شرحیں سفر کے فاصلے کے لحاظ سے مقرر کی گئی ہیں۔ مسافت کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۳۰۱ میل یا اس سے زائد سفر کے لئے کرایہ گھٹ جائے گا۔ ۱۵۰ میل تک کے سفر کے لئے کرایے میں قدرے اضافہ ہوگا۔ لیکن ۱۵۱ میل سے ۳۰۰ میل کے کرایے میں کوئی ردو بدل نہ ہوگا۔ ایرکنڈیشنڈ کلاس کا کرایہ بھی بڑھ جائے گا۔ ان تبدیلیوں کے باعث مسافروں سے وصول کئے جانے والے کرایے کی کل آمدنی میں کوئی خاص اضافہ ہونے کی توقع نہیں ہے۔ اُنھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ جنگ کے بعد پہلی مرتبہ چھٹیوں کے دنوں میں ریل کے رعایتی واپسی ٹکٹ جاری کرنے کا طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ آئیندہ دسہرے اور دیوالی کے تیوہار پر ایسے ٹکٹ جاری ہوں گے۔ وزیر ریلوے نے مزید اعلان کیا کہ پلیٹ فارم ٹکٹوں کی قیمت یکم اپریل سے دو آنے کے بجائے ایک آنہ فی ٹکٹ کر دی جائے گی۔

ریلوے بجٹ ایک نظر میں

کروڑ روپوں میں

	حقیقی	بجٹ	نظرثانی شدہ تخمینہ	بجٹ
	۵۴-۱۹۵۳ء	۵۵-۱۹۵۴ء	۵۵-۱۹۵۴ء	۵۶-۱۹۵۵ء
کل تجارتی آمدنی	۲۷۴٫۷۹	۲۷۳٫۲۵	۲۸۲٫۸۰	۲۹۲٫۵۰
کاروباری اخراجات	۲۰۱٫۷۵	۱۹۴٫۵۳	۲۰۲٫۹۵	۲۰۶٫۸۰
کل متفرق اخراجات	۵٫۶۲	۸٫۰۸	۸٫۳۲	۷٫۴۹
ٹوٹ پھوٹ کے ریزرو فنڈ کے لئے رقم	۳۰٫۰۰	۳۰٫۰۰	۳۰٫۰۰	۳۵٫۰۰
میزان اخراجات	۲۳۷٫۳۷	۲۳۲٫۶۱	۲۴۱٫۲۷	۲۴۹٫۲۹
ریلوے کا کل منافع	۳۶٫۹۲	۴۰٫۶۴	۴۱٫۵۳	۴۳٫۲۱
عام محاصل کو منافع	۳۴٫۳۶	۳۵٫۵۰	۳۴٫۹۹	۳۶٫۰۷
خالص بچت	۲٫۵۶	۵٫۱۴	۶٫۵۷	۷٫۱۴

بھیلگری کرشنا شرما

گُل کدہ

مّلما کا مہابھارت ——— (کنڑا)

یہ زندگی کتنی دلچسپ اور عجیب ہے۔ اگر ہم ایک عام انسان کی زندگی کے رازوں کو غور سے دیکھیں تو رنج و مسرت، غم و آسودگی کی کتنی تصویریں ہمیں نظر آئیں گی۔ اگر چشم ظاہر ان کو دیکھ سکتی تو ارتقائے انسانی اس قدر سست رفتار نہ ہوتا۔ ان احساسات کو چشم ظاہر سے پوشیدہ رکھنے میں نہ جانے اس کائنات کے خالق کا کیا مقصد ہے۔

ہمارے گھر کی ماما کا نام ملّما ہے۔ وہ پندرہ بیس برس سے اس گھر میں رہتی ہے۔ اپنی جھونپڑی میں کام ختم کر کے اور اپنے بچّے کے کھانے کا انتظام کر کے وہ ہمارے گھر پر صبح سات بجے کے قریب پہنچ جایا کرتی ہے۔

نئے شادی شدہ جوڑوں کی طرح رُکمنی اور میں بہت خوش خوش رہا کرتے تھے۔ ملّما ہماری اس مسرّت آمیز زندگی سے خود بھی خوش ہوتی اور کبھی کبھی ہمارے قہقہوں میں بھی شامل ہو جاتی۔ لیکن بعض اوقات یہ معلوم ہوتا کہ وہ کسی گہری تشویش میں مبتلا ہے۔ وہ ہماری ہنسی مذاق سے بظاہر لطف اندوز ہوتی لیکن ایک آہ بھر کر رہ جاتی۔ کئی دفعہ اُس نے رُکمنی سے کہا "ہماری کاشی بھی آپ جیسی ہی تھی"۔

میری غیر حاضری میں وہ رُکمنی سے گھریلو معاملات کے متعلق گفتگو کیا کرتی۔ میں نے دیکھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ملّما کے لئے رُکمنی کی محبت، ہمدردی اور مہربانیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

پچھلے اتوار دفتر کا کوئی کام میں گھر پر نہیں لایا تھا۔ شرارت جو سُوجھی میں نے رُکمنی کو اس طرح سے بُلایا جیسے مجھے اس سے نہایت ضروری کام ہے۔ وہ کچن سے بھاگی بھاگی اشتیاق و تشویش کا مجسمہ بن کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ لیکن جب اُسے علم ہوا کہ یہ محض ایک مذاق تھا، وہ واپس چلی گئی۔ جاتے جاتے اُس نے ملّما کی گود میں بچّے کو محبت آمیز نظروں سے دیکھا، اور اُسے ایک ہلکی سی تھپکی دی۔

ملّما نے نہایت ادب و احترام سے مجھ سے کہا۔

"جس طرح میں آپ کو خوش و خرم دیکھتی ہوں مجھے اپنی کاشی اور شیولنگ یاد آ جاتے ہیں"۔

میں نے بار بار کاشی کا نام سنا تھا۔ آخر کار میں نے ملّما سے کہا: "یہ کاشی آخر کون"؟

"سرکار یہ شیولنگ کی بیوی کا نام ہے"۔

"اچھا تو یہ شیولنگ کون ہے"؟

"تو کیا آپ میرے بیٹے شیولنگ کو نہیں جانتے"؟

"اچھا تو تمہارے بیٹے کا نام شیولنگ ہے۔ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے"؟

ملّما اس سوال سے بہت سٹپٹائی۔ اس نے حسرت آمیز لہجے میں کہا: "اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ بڑی مسرّت آمیز زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد ایک ایسا سیلاب آیا کہ سب کچھ سمیٹ کر لے گیا۔ ہم لوگوں کا جینا بھی کیا جینا ہے۔ ہم محض اس لئے زندہ ہیں کہ ہمیں موت نہیں آتی"۔

ملّما کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے غم کو دیکھ کر میں خود رنجیدہ خاطر ہو گیا تھا۔ اُسے تسلّی دیتے ہوئے میں نے پوچھا: "تمہاری بہو ہے کہاں"؟

"سرکار وہ اب کہاں۔ وہ تو ایک سال ہوا مر چکی"۔

"ایشور رحم کرے۔ وہ کس طرح چل بسی"؟

"میں یہ کیا بیان کروں میری سرکار۔ میری کاشی تو لاکھوں میں ایک تھی"۔

"ملّما کیا کوئی جھگڑا ہو گیا تھا، ساس بہو میں"؟

"ایشور نہ کرے۔ وہ میرے بھائی کی لڑکی تھی۔ ہمارے ہی گھر میں پلی اور پروان چڑھی۔ میں اپنی اور اپنے بھائی کی لڑکی میں کب تمیز کر سکتی تھی۔ کاشی جیسی دیوی کو ذرا بھی تنگ کرنے والی ساس چڑیل سے کم نہیں ہو سکتی"۔

"تو کیا میاں بیوی میں کچھ ناچاقی ہوئی تھی"؟

"نہیں۔ کون اس طرح سوچ بھی سکتا ہے۔ کیا کوئی اس بات کا یقین کرے گا۔ اگر میں کہوں کہ آپ اور بی بی جی کی آپس میں نہیں بنتی۔ میرا بیٹا شیولنگ تو روز ذرا ذرا وقفے سے روتا ہے اور کہتا ہے کہ کاشی کے بغیر اس کی زندگی غیر دلچسپ ہو گئی ہے"۔

تما جوں جوں کاشی کی تعریف کر رہی تھی اور اسی کی خوبیاں گِن رہی تھی میرے دل میں کاشی کی موت کا سبب معلوم کرنے کا اشتیاق بڑھ رہا تھا۔

"تو پھر تمھاری بہو پر کیا گزری؟"

"وہ تو پانڈوؤں کے بن باس کی کہانی ہے۔ آپ یہ کہانی سن کر کبیدہ خاطر ہوں گے؟"

میں نے تصور میں تما کی طرح ایک عمر رسیدہ عورت کا خیال کیا۔ یہ خیال غالباً پانڈوؤں کی ماتا کنتی کا تھا۔ میں نے ایک کرسی کھینچی اور تما کے سامنے رکھ دی اور پھر اُسی سے محوِ گفتگو ہو گیا۔

"تما، کاشی کی کہانی سننے کے لئے اب میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا ہے۔ تم اسے جلدی بیان کرو؟"

"سرکار مجھے معاف فرمائیے، یہ دیوتاؤں یا مہاتماؤں کی کہانی نہیں لیکن جب کوئی اس کہانی کو ہمدردی اور صبر سے سنتا ہے تو مجھے ایک گونہ تسلی ہوتی ہے"

میرا شونلنگ اور کاشی خوش خوش زندگی گزار رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ شونلنگ کھیتوں سے جب دیر کر کے آتا کاشی میرے مجبور کرنے کے باوجود اس کے بغیر کھانے کو ہاتھ نہ لگاتی۔ یہی حال شونلنگ کا تھا۔ اگر کاشی نہ ہوتی تو وہ کھانے کی طرف آنکھ نہ اُٹھاتا۔ مجھے بعض اوقات اس بات سے تکلیف بھی ہوتی لیکن میں اندر ہی اندر ان کی محبت کو دیکھ کر خوش ہوتی۔ ان دونوں کو یکجا دیکھ کر میں مسرت سے پھولی نہ سماتی۔

کاشی غیر معمولی طور پر خوبصورت تھی۔ وہ آرٹ کے بہترین مجسمے سے بھی زیادہ جاذبِ نظر تھی۔ جب وہ گہرے سبز رنگ کی ساری اور زیوٹیوں والی چولی پہنتی تو اُسے بے اختیار چومنے کو جی چاہتا۔ اس کی مسکراہٹ سے اس کا چہرہ ایک شگفتہ پھول کی طرح کھِل اُٹھتا۔

ہم کبھی اتنے امیر نہ ہوئے کہ کافی زمین اور جائداد کے مالک ہوتے۔ زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ ہماری ملکیت تھا۔ بیلوں کی ایک جوڑی سے ہم آپ ایسوں کی زمین کاشت کرتے۔ شونلنگ اس زندگی سے مطمئن تھا لیکن ایشور کی مرضی کچھ اور تھی۔ تھوڑی مدت ہی میں یہ خاندان تباہ حال و برباد ہو گیا۔ اس وقت وہ اپنے رنج اور غم کو ضبط نہ کر سکی۔ لیکن میں پورے طور پر متوجہ تھا۔

" ہماری زمین سے ملحقہ فارم رُدراپا کی ملکیت ہے، جو گاؤں کے پٹیل کا داماد ہے۔ رُدراپا کے متعلق گاؤں میں بہت سی باتیں اُڑتی تھیں لیکن چونکہ وہ ایک بڑا آدمی تھا گاؤں کے لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ کاشی کاشت میں ہماری مدد کرتی۔ یا تو وہ بیلوں کے لئے چارہ لاتی یا کھیتی کی رکھوالی کرتی۔ ہماری عورتیں آپ کی بیگمات عورتوں کی طرح گھر میں خالی ہاتھ نہیں بیٹھ سکتیں۔ ہمارے کھیت دُور دُور فاصلے پر تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کسی نہ کسی کھیت کی رکھوالی کرتا لیکن میں کاشی کو اپنے ذاتی کھیت کی رکھوالی کے لئے بھیجتی کیونکہ وہ گاؤں سے نسبتاً قریب تھا۔

کاشی مجھے بارہا کہتی کہ میں خود اپنے کھیت پر جایا کروں اور وہ کسی دوسرے کھیت پر جایا کرے۔ میں سمجھتی کہ وہ میری عمر کا خیال کر کے یہ تجویز پیش کرتی ہے۔ میں اس کی درخواست کو ٹھکرا دیتی۔ جس سے وہ رنجیدہ بھی ہوتی۔ وہ بغیر کوئی عذر کئے اپنے کھیت کو چلی جاتی لیکن ایک دن اس نے مجھے اور شونلنگ سے کہا۔

ہمارا پڑوسی رُدراپا مجھ سے کچھ بیہودہ باتیں کرتا ہے۔ مجھے کسی دوسرے کھیت کی طرف بھیج دیجئے۔ اس وقت مجھے اس کی پہلی درخواستوں کی وجہ معلوم ہوئی۔ میں نے اور شونلنگ نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی کھیت پر بھی نہ جایا کرے اور گھر پر رہے۔ یہ پچھلی فصل کٹائی کے زمانے کا ذکر ہے۔

وقت کے ساتھ ہم کتنی باتیں بھول جاتے ہیں۔ ہم بھی رُدراپا کے متعلق سب کچھ بھول گئے۔ کاشی ایک بچے کی ماں بننے کی امید سے بہت خوش خوش نظر آتی۔

پچھلی فصل بڑی حوصلہ افزا تھی۔ شونلنگ بیلوں کے ساتھ کھیت پر تھا۔ میں ملیریا میں مبتلا بستر پر تھی پھر بھی میں سب کے لئے کھانا پکاتی۔ کاشی پرندوں کے اُڑانے کے لئے صبح کے وقت ہی اپنے کھیت پر جاتی اور دوپہر تک واپس آتی۔ کئی بار اُسے خود کھانا نصیب نہ ہوتا۔ وہ شونلنگ کے لئے کھیتوں پر کھانا لے جاتی۔ بچہ پیدا ہونے کے دن قریب آئے تو بیچاری کو نہ آرام ملا اور نہ وقت پر کھانا۔ ہم غریب آدمی نوکر رکھنے کی خواہش کے باوجود نوکر نہیں رکھ سکتے۔ کاشی اسی طرح کام کرتی چلی گئی اور شکایت کا ایک لفظ بھی زبان پر نہ لائی۔ ایک رات اس نے مجھ سے کہا۔

ماتاجی وہ رُدراپا پھر میرے پیچھے پڑا ہوا ہے مجھے تو خوف معلوم ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے میں کل سے باہر کھیت پر نہ جاؤں۔ میں کاشی کے ان الفاظ سے حیرت زدہ ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔

"کاشی کل تو تمھیں جانا ہوگا تاکہ شونلنگ کو اطلاع ہو جائے۔ اس کے بعد تم مت جانا۔ شونلنگ چاہے تو کسی کو نوکر رکھ لے۔"

اگلی صبح وہ پَو پھٹتے ہی اٹھی اور بادلِ ناخواستہ کھیت کی طرف

روانہ ہوگئی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ گھر پر رہے مگر میں مجبور تھی۔ میں مریضہ تھی اور جانوروں اور پرندوں سے کھیتی کو بچانا ضروری تھا۔ اگر کھڑی کھیتی جانور کھا جائیں تو ہم سال بھر کیا کھائیں گے۔ یہ افلاس ہے جو یہ سب کچھ کرنے پر ہمیں مجبور کرتا ہے۔

کاشی حسب سابق دوپہر تک واپس آگئی۔ جب وہ گھاس کا گٹھا سر سے اتار رہی تھی میں نے اُس کے چہرے پر نمایاں تبدیلی دیکھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ بغیر کچھ کہے وہ اندر گئی اور شولنگ کے لئے کچھ کھانا باندھا۔ میرے پوچھنے کے باوجود وہ ایک ظاہری ہنسی کے ساتھ بھوکی پیاسی پھر گھر سے نکل پڑی۔ میں نے دیکھا کہ کاشی کے حواس بجا نہیں تھے۔ وہ شولنگ کے لئے دال سبزی لے جانا بھی بھول گئی تھی۔ جب میں نے اس سے کہا تو اس نے بے پروائی سے سبزی لپیٹ کر رکھ لی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ شولنگ سے کہہ دے کہ وہ کل سے کھیت پر نہیں آئے گی۔ لیکن وہ میری بات سُنے بغیر چلی گئی۔ میں بستر پہ لیٹی اپنی مجبوری کا ماتم کرتی رہی۔

شام ہوگئی تھی۔ میں کاشی کا انتظار کر رہی تھی۔ معاً شولنگ مکان میں داخل ہوا۔ میں اس کی اس غیر متوقع آمد سے متعجب ہوگئی لیکن اس نے غصے کے عالم میں کہا۔

کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں آج کھانا ہی نہ کھاؤں میں سخت حیرت زدہ ہوگئی۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کاشی ایک مدّت ہوئی تمھارا کھانا لے کے گئی ہے۔ کیا وہ کھیت پر نہیں پہنچی۔ شولنگ بھی حیرت زدہ ہوگیا۔

تو پھر وہ گئی کہاں۔ میں تو انتظار کرتا رہا لیکن وہ نظر نہیں آئی۔

یہ بات ایک ناگہانی مصیبت معلوم ہوتی۔ میں دم بخود اور خاموش تھی۔ آبدیدہ ہو کر میں نے کہا" کاشی یہاں سے معمول کے مطابق گئی ہے۔ کاشی میری کاشی"۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کھیت پر نہ پہنچی"۔ شولنگ یہ کہہ کے غائب ہوگیا۔

میں بے حس و حرکت اس انتظار میں بیٹھی رہی کہ کاشی اب آئی کہ اب آئی۔ مجھے نہیں معلوم میں نے کب دیا بجھا دیا۔

سارا گاؤں خواب راحت میں تھا لیکن میرے لڑکے اور بہو دونوں کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ذرا بھی آہٹ ہوتی تو میں سمجھتی کہ کوئی نہ کوئی ان میں سے آپہنچا ہے۔ میرے رنج کی انتہا نہ رہی۔ میں زار و قطار رونے لگی۔ میں بالکل بے حس و حرکت سی ہوگئی تھی۔ ایسا ہی عالم مجھ پر اس وقت گزرا تھا جب میرے خاوند کی موت واقع ہوئی تھی۔

آدھی رات کے وقت دو تین آدمی شولنگ کو اپنے ساتھ لائے۔ وہ بے اختیار رو اٹھا اور کہنے لگا" ماں تو نے کاشی کو کہاں بھیج دیا ہے"۔ میں خاموش تھی۔ میں نے ان ہمراہیوں سے کاشی کا پتہ پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ انھوں نے گاؤں کا کونہ کونہ چھان مارا ہے مگر اس کا کوئی نشان نہیں ملتا یہ صدمہ میرے لئے جانکاہ تھا۔ مجھے غش آگیا۔

اگلی صبح سب کاشی کی تلاش میں گئے۔ وہ شولنگ کو اس بہانے سے چھوڑ گئے کہ وہ میری دیکھ بھال کرے۔ سارا گاؤں ہماری مدد کے لئے آیا۔ ہم کسی کو کیا نباہتے۔ شولنگ تو ایک بُت کی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ چند گھنٹوں کے بعد میں نے کسی کو سڑک پہ زور سے کہتے ہوئے سُنا۔

شولنگ کی بیوی کاشی ہمارے باغ کے کنوئیں میں کود پڑی۔

شولنگ یہ سُن کر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا۔

میری کاشی اور کنوئیں میں کود پڑی۔

وہ تیر کی طرح گھر سے نکلا اور بہت سے آدمی اس کے پیچھے ہو لئے۔

مجھے نہیں معلوم مجھ میں طاقت کہاں سے آگئی۔ میں بھی کنوئیں تک آپہنچی۔

کتنا بھیانک نظارہ تھا۔ کاشی کا سر اپنی گود میں لئے شولنگ دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ بڑا دردناک منظر تھا۔ میں بھی بچے کی طرح رو اُٹھی۔ لیکن کاشی کسی طرح واپس نہ آسکی۔ وہ مر چکی تھی اور اس کا نازک جسم پانی سے پھول چکا تھا

اس کی آخری رسوم پنچ نامہ تو ادا کرنا ایک فرض تھا اور ادا کر دیا گیا۔ پٹیل آیا۔ شنو بھوگ اور پنچ بھی آئے۔ گاؤں کے چپڑاسی تو دہیں تھے۔ وہ تو اسی طرح جمع ہوئے تھے جیسے شادی پر آئے ہیں۔ وہ خوش گپیوں میں مصروف تھے اور مزے سے پان تمباکو اُڑا رہے تھے۔ بُڈھا پاپا کا خسر گاؤں کا پٹیل آیا اور پگڑی پہنتا ہوا اپاپا سوداگر سے کہنے لگا۔" آج کل بہوؤں کا یہی حشر ہوتا ہے یہ بے فائدہ اپنی جان گنواتی ہیں۔ گھر کے دوسرے افراد ان کی زندگی میں تو انھیں تنگ کرتے ہیں اور ان کی موت پر شور اور واویلا مچاتے ہیں۔ یہ دنیا بہت نرالی ہے"

(مارچ آف انڈیا)

ع۔م

نئی کتابیں اور رسالے

رُباعیاتِ محرُوم

منشی تلوک چند محروم دنیائے ادب میں تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کی رباعیات کا مجموعہ پہلے ۱۹۴۷ء میں چھپا تھا۔ اب دوبارہ زیورِ طبع سے آراستہ ہُوا ہے۔ کتاب نہایت حسین و جمیل چھپی ہے۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۵۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔ قیمت فی جلد تین روپے بارہ آنے۔ طبع ثانی کا دیباچہ علّامہ دتاتریہ کیفی نے لکھا ہے۔ ابوسعید ابوالخیر، خیام، اور سرمد فارسی کے مشہورِ زمانہ رُباعی گو شاعر ہیں۔ اُردو میں اکبر، حالی، جوش، رواں اور محروم نے اس صنف میں دادِ سخن دی ہے — فلسفہ، اخلاق، مذہب، انسان دوستی اور ظاہرپرستی محروم صاحب کے طبعی موضوعات ہیں لیکن فکر و نظر اور شعر و شاعری کے دوسرے تمام لوازم بھی آپ کی رباعیات میں پورے طور پر موجود ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ گراں قدر مجموعہ اہلِ ملک سے پوری داد حاصل کرے گا اور ملک کی یونی ورسٹیاں جہاں اُردو پڑھائی جاتی ہے، اسے اپنے نصاب میں شامل کرنے کی سعادت حاصل کریں گی۔ ملنے کا پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی نئی دہلی۔

شاید کہ بہار آئی

سیّد علی عبّاس حسینیؔ کا یہ ناول کتابی دنیا لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ قیمت تین روپے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ ضخامت ۲۱۲ صفحے۔ کتابت طباعت اوسط۔

علی عبّاس حسینیؔ بہت پرانے اور مشّاق افسانہ و ناول نگار ہیں۔ آپ کا نامِ نامی ہی آپ کی تصنیف کے معیاری اور عمدہ ہونے کی ضمانت ہے۔

ملکِ ادب کے شہزادے

مصنّف ڈاکٹر اعجاز حسین الہ آباد یونی ورسٹی۔ ملنے کا پتہ۔ کارواں پبلشرز الہ آباد۔ قیمت ۳/-۔ اس کتاب میں چالیس شعراء کے مختصر نفسیاتی خاکے درج ہیں۔

اذان اور دوسرے افسانے

مصنّف جیلانی بی اے۔ پبلشر مکتبۂ چراغِ راہ ۹ دنیا بلڈنگ آرام باغ روڈ۔ کراچی ۱؎۔ قیمت تین روپے۔ ضخامت ۲۰۴ صفحے۔

ماں

میکسم گورکی کے مشہور ناول کا ترجمہ بلا ترمیم و اختصار۔ ضخامت ۴۰۷ صفحے کتابت طباعت عمدہ۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ شاہراہ دہلی

چین کی بہترین کہانیاں

مترجم ظ۔ انصاری۔ قیمت دو روپے۔ ضخامت ۱۸۸ صفحے۔ کتابت طباعت عمدہ۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ شاہراہ دہلی۔

تانے بانے

از خزاں ہوشیارپوری۔ قیمت دو روپے۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۲۰ صفحے پر ایک ناکام محبت کے خطوط کا مجموعہ۔ کتابت طباعت اوسط۔ جلد گولی۔ ملنے کا پتہ:۔ میر پبلشنگ ہاؤس دہلی

میری نظمیں

بلراج کومل کی نظموں کا مجموعہ۔ کتاب نہایت حسین و جمیل شائع ہوئی ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت نہایت عمدہ۔ ۲۲×۱۸/۸ سائز کے ۱۳۶ صفحات پر مشتمل ہے، مجلد اور جلد پوش سے مزیّن ہے۔ قیمت ڈھائی رُپے ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ فن کار دہلی۔

بلراج کومل بڑے ذہین نوجوان ہیں۔ ان کی نظموں میں موضوعاتی تنوع بھی ہے اور غمِ جاں، غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے اچھے نمونے بھی۔ آپ ایک پڑھے لکھے نوجوان ہیں اور سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ اس دَور میں یہ بات بڑی غنیمت ہے۔

رسالے

دستور۔ یہ ماہنامہ مکتبۂ دستور نمبر ۱۔ کھنہ سٹریٹ برانڈرتھ روڈ لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ آٹھ رُپے۔ رسالہ حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن دونوں کا حامل ہے۔ سرورق بڑا دیدہ زیب ہے۔ لکھنے والوں میں بہت سے اچھا لکھنے والے ملیں گے۔ نغمۂ روح، جہاں نما، تمثیل کدہ، سرودِ زندگی، گیت سنگیت، بحث و انتقاد کے تحت غزلیں، مقالات تمثیل، نظمیں، گیت اور تنقیدی مضامین بڑے سلیقے سے جمع کئے ہیں۔

المجید۔ مجیدیہ اسلامیہ کالج میگزین الہ آباد کا سالانہ نمبر۔ ایک تعلیمی ادارے کے لئے سال بھر کے بعد بھی ایسا رسالہ شائع کر دینا قابلِ مبارک باد ہے۔

رفتارِ زمانہ

روس کے وزیر خارجہ کا بھارت کو خراجِ تحسین

روس کے وزیر خارجہ موسیو مالوٹوف نے ماسکو کی سپریم کورٹ میں بین الاقوامی صورتِ حالات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے دنیا میں امن قائم کرنے کی کوششوں کے لئے بھارت کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا، اور اسے امن کو پائدار بنانے والوں کا ایک اہم ساتھی قرار دیا۔ آپ نے کہا کہ نوآبادیاتی ہندوستان کا وجود مٹ گیا ہے، اور اب اس کی جگہ آزاد بھارت نے لے لی ہے۔ آپ نے اُمید ظاہر کی کہ سیلون اور پاکستان بھی حقیقی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

کل ہند مسلم تعلیمی کانفرنس کی تجاویز

کل ہند مسلم تعلیمی کانفرنس مدراس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین نے تجویز پیش کی کہ چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کے لئے حکومت کی طرف سے مفت اور لازمی تعلیم کا بندوبست ہونا چاہئیے۔ آپ نے بھارت کے مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ فرقہ وارانہ ذہنیت کو خیرباد کہہ کر سارے دیش کی بھلائی کے لئے کام کریں اور غیر ملکی ذہنیت کو ختم کردیں۔ گورنر مدراس مسٹر شری پرکاش نے اس موقعے پر افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ تھیوری انتہائی احمقانہ ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کی قومیت بھی مختلف ہوتی ہے۔

پہلے پنج سالہ پلان کی قبل از وقت تکمیل کے بعد دوسرا شاندار پلان

بھارت کے وزیر داخلہ شری گوبند ولبھ پنت نے بریلی میں ایک تقریر کے دوران میں اس امر کا اظہار کیا کہ دوسرے پنج سالہ پلان کا مقصد افلاس، بے روزگاری اور جنتا کی مایوسی اور بے اطمینانی کو ختم کرنا ہے۔ پہلا پنج سالہ پلان اپنے وقت سے پیشتر ہی مکمل ہوگیا ہے، اور وقت مقرّرہ سے کافی عرصہ پہلے ہی اس کا نصب العین پورا ہوچکا ہے۔ یہ ساری کامیابی عوام کے شاندار عزائم اور جد و جہد کا ہی نتیجہ ہے، اور مجھے اُمید ہے کہ اگر جنتا کی کوششوں اور جوش کو صحیح ڈھنگ سے استعمال کیا جائے تو بھارت یقیناً ویلفیر سٹیٹ کے قیام کی طرف تیزی سے قدم بڑھا سکے گا۔

دنیا کی سب سے بڑی فوج بنانے کے لئے چین کا قانون

چین کی گورنمنٹ نے جبری بھرتی کا ایک نیا قانون پاس کیا ہے جس کے تحت لگ بھگ آٹھ کروڑ چینیوں کو فوجی خدمات کے لئے طلب کیا جاسکتا ہے۔ اٹھارہ سال سے چالیس سال تک کے لوگ تین سال سے پانچ سال تک کے لئے طلب کئے جائیں گے اور اس طرح چین کے پاس ایک زبردست جدید طرز کی فوج طیّار ہو جائے گی۔

وزیر اعظم مصر کرنل ناصر کا بیان

لندن میں کامن ویلتھ کے ممالک کی کانفرنس ختم ہونے کے بعد بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے قاہرہ میں مصر کے وزیر اعظم کرنل ناصر سے گفت و شنید کی۔ بات چیت کے خاتمے پر دونوں وزرائے اعظم نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا ہے جس کے مطابق بڑے عالم گیر مسائل پر بھارت اور مصر میں مکمل اتفاقِ رائے ہے۔ دونوں کی یہ رائے ہے کہ ایشیائی اور وسط مشرق کے ممالک کو پاور بلاکوں سے مکمل طور پر الگ رہنا چاہئیے، اور کسی دفاعی معاہدے میں شامل نہ ہونا چاہئیے۔ کیونکہ دفاعی معاہدے امن کو تقویت پہنچانے کی بجائے اُسے نقصان دینے کا موجب بنتے ہیں۔ قاہرہ کے ہوائی اڈّے پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کرنل ناصر نے بتایا کہ ہم مصر میں بیٹھے ہوئے بھارت کی اقتصادی، مجلسی اور صنعتی ترقی کا نہایت دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ہمیں بھی بھارت کی تقلید میں اس طرح کے قدم اُٹھانے ہوں گے۔ شری نہرو کا ذکر کرتے ہوئے مصر کے وزیر اعظم نے کہا کہ میں نے پچھلے سال ہی شری نہرو سے ملاقات کی تھی۔ لیکن میں ایک عرصے سے اُن کی تحریروں اور تقریروں کو پڑھ رہا ہوں اور ہر ملاقات کے بعد میرے دل میں شری نہرو کا احترام بڑھ رہا ہے۔ میں ہندوستانی عوام کو

بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم نہایت دلچسپی سے آپ کی ترقی کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ آپ کی طرح ہم بھی غیر ملکی غلبے کے خلاف ہیں۔ ترکی اور عراق کے معاہدے کے سلسلے میں مصر کی مخالفت کی وضاحت کرتے ہوئے کرنل ناصر نے کہا کہ مصر بھی بھارت کی طرح دفاعی معاہدوں کے سخت خلاف ہے۔ کیونکہ اس طرح کے معاہدوں سے کمیونسٹ بھی اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں گے جس کے باعث وسط مشرق جنگ کا اکھاڑہ بن جائے گا۔

بخشی حکومت کے متعلق بھارت کے ڈیفینس منسٹر کا بیان

بھارت کے ڈیفینس منسٹر شری مہابیر تیاگی نے جموں میں اخبار نویسوں کو بتایا کہ بخشی غلام محمد کی قیادت میں ریاست جموں و کشمیر نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ میں نے یہاں اکثر محسوس کیا ہے کہ بخشی گورنمنٹ کو ریاست کے عوام کا پورا اعتماد حاصل ہے۔ شری تیاگی نے اس الزام کو بھی غلط قرار دیا کہ بخشی غلام محمد کی حکومت میں کمیونسٹوں کا غلبہ ہے۔ دراصل اس طرح کے الزام وہ لوگ لگا رہے ہیں جو کشمیر گورنمنٹ کو کسی نہ کسی طریقے سے بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے اُمید ظاہر کی کہ بخشی گورنمنٹ کو وادیٔ کشمیر میں اس سے بھی زیادہ مقبولیت حاصل ہوگی۔ شری تیاگی نے یہ بھی اعلان کیا کہ ۱۹۴۹ء کے بعد کشمیر کی فوج سے جو اشخاص ریٹائر ہوئے ہیں اُن کی پنشنوں میں اضافہ کیا جائے گا۔

دہلی میں مرزا غالب کی ۸۶ ویں برسی

۵ ہزار کی لاگت سے اردو کے زندہ جاوید شاعر مرزا غالب کی یادگار طیار کی گئی ہے۔ اسی مقام پر مرزا غالب کی ۸۶ ویں برسی کافی جوش و خروش کے ساتھ منائی گئی۔ جوش ملیح آبادی، امن لکھنوی اور پنڈت ہری چند اختر نے اس موقع پر مرزا غالب کی خدمت میں عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ اُردو کے سرمایۂ ادب میں غالب کا کتنا بڑا حصہ ہے اور اردو نظم و نثر میں غالب کا کتنا بلند مقام ہے۔ یہ تقریب غالب سوسائٹی کے زیر اہتمام منائی گئی۔ یہ سوسائٹی عنقریب ہی ایک غالب ہال تعمیر کرنے کا بھی ارادہ رکھتی ہے۔

فارموسا کے مسئلے پر پردھان منتری کا بیان

یورپ سے واپسی پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے کہا کہ اگرچہ فارموسا کے سوال پر کشیدگی بہت زیادہ ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس مسئلے پر جنگ شروع ہونے کا امکان نہیں۔ کامن ویلتھ پردھان منتریوں کی کانفرنس میں ہم نے اس سوال کے ہر پہلو پر غور کیا ہے۔ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے ہم فارموسا پر کمیونسٹ چین کا حق تسلیم کرتے ہیں، اور میرا خیال ہے کہ بات چیت اس حقیقت کی روشنی میں ہی ہونی چاہیئے۔

بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر کی تقریر

ریاست جموں اور کشمیر کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے جموں میں ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ جموں اور کشمیر کی جغرافیائی پوزیشن اور اس میں مسلم اکثریت کا ہونا ہی اس کے بھارت سے الحاق کا سب سے بڑا جواز ہے۔ آپ نے کہا کہ بھارت میں چار کروڑ مسلمان نہایت پُر امن اور باعزت زندگی بسر کر رہے ہیں، اور سب مذاہب کے ساتھ بھارت میں یکساں سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے عوام بھارت کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بخشی صاحب نے اس موقع پر فرقہ پرستوں کو کڑی چیتاونی دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے فرقہ پرستی کی دیوی پر پہلے بہت سی قربانیاں دی ہیں۔ اب ہم مزید خون خرابہ کبھی نہیں ہونے دیں گے، اور ہم نے اس امر کا تہیہ کر لیا ہے کہ تمام فرقہ پرستوں کو سختی کے ساتھ دبا دیں گے چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ آخر میں بخشی صاحب نے فرمایا کہ کشمیر کے عوام ایمانداری سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کا مفاد بھارت کے ساتھ رہنے ہی میں ہے، اور ریاست صرف سیکولر بھارت کے ساتھ رہ کر ہی ترقی کر سکتی ہے۔

زرعی پیداوار کی ترقی کے لئے ایک شاندار منصوبہ

کھاد تیار کرنے کا جو نیا کارخانہ بھاکڑا ننگل میں لگایا جا رہا ہے اس میں ہر سال دو لاکھ ٹن امونیم نائٹریٹ تیار ہوا کرے گا۔ یہ ساڑھے تین لاکھ ٹن امونیم سلفیٹ کے برابر ہوگا۔ اس سلسلے میں یہ امر یاد رہے کہ سندری کے کارخانے میں ساڑھے تین لاکھ ٹن امونیم سلفیٹ تیار ہوتا ہے۔ اس طرح اس نئے کارخانے کی پروڈکشن بھی سندری کے کارخانے کے برابر ہی ہوگی۔ معلوم ہوا ہے کہ بھاکڑا ننگل میں لگائے جانے والے کھاد کے اس نئے کارخانے پر ۲۰ کروڑ روپیہ کی لاگت آئے گی۔ اور اس کارخانے کو بجلی مہیا کرنے کی غرض سے فوراً نئے چار جنریٹر لگائے جائیں گے۔ یہ جنریٹر ڈیڑھ لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا کر سکیں گے۔ اس کارخانے کو جلد از جلد مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔



مُعلّم بھٹکلی

نیک اِرادے

محبّت کا سبق دیں گے جہاں کو ہر اک اِنساں سے اُلفت ہم کریں گے

وہ نُورِ علم پھیلائیں گے ہر سُو کہ ہر شیشے کو جامِ جم کریں گے

کٹھن ہے راستہ منزل کا لیکن نہ ہم رفتار اپنی کم کریں گے

سبق ناکامیوں سے ہم نے سیکھا ہمیشہ کوششِ پیہم کریں گے

وطن کی شان سے ہے شان اپنی وطن کی فِکر ہم ہردم کریں گے

سبھی روتے ہیں اپنی بے بسی پر مگر ہم دُوسروں کا غم کریں گے

غرض اپنے طریقِ کار سے ہم
اُجاگر عظمتِ آدم کریں گے

نیّر ادیب

ونوبا بھاوے



بچو! تم نے دیش کے مشہور لیڈر ونوبا بھاوے کا نام تو ضرور سُنا ہوگا۔ آج ہم تمھیں ان کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔

ان کا پورا نام ونائیک نرہری بھاوے ہے۔ آپ ۱۱ر ستمبر ۱۸۹۵ء میں کونکن کے گاؤں گوگودہ میں ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے پتا کا نام نرہری پنت تھا۔ دراصل آپ کے باپ دادا رتناگری کے رہنے والے تھے لیکن بعد میں وہ گونگودہ گاؤں میں آن بسے۔ وہ ریاست بڑودہ میں ایک محکمے کے ہیڈ کلرک تھے۔ زندگی میں اُن کی دلچسپی زیادہ تر رنگنے اور چھاپنے کے کام میں تھی۔ چونکہ ونوبا اپنے تینوں بھائیوں سے بڑے تھے اس لئے آپ کے والد کی یہی مرضی تھی کہ ونوبا بھی رنگنے اور چھاپنے کا کام کریں۔ لیکن ونوبا کے وچار کچھ اور ہی تھے۔ ۱۹۰۷ء میں ونوبا بڑودہ کے ہائی اسکول میں داخل کیے گئے۔ ۱۹۱۳ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے کالج میں داخل ہوئے۔ لیکن وہاں ونوبا کو ایسی تعلیم نہ مل سکی جیسی کہ وہ چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ کالج چھوڑ کر بنارس چلے گئے جہاں انھوں نے سنسکرت ادب کا مطالعہ کیا۔ وید، اپنشد اور برہما سوتر وغیرہ مذہبی کتابیں پڑھیں اور بنارس ہی میں اپنے گورو (مہاتما گاندھی) کے پہلی بار درشن کیے۔ اُن سے ملاقات کرنے کے بعد ونوبا جی پر باپو کا ایسا اثر پڑا کہ وہ اُن کے سابرمتی آشرم میں داخل ہو گئے۔ یہاں ونوبا بہت مدت تک بُننے اور چرخہ کاتنے کا کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۰ء میں خاص تربیت کے بعد ونوبا آشرم کے لوگوں کے ساتھ گاؤں گاؤں جانے لگے تاکہ گاندھی جی کی تعلیم کو پھیلائیں۔ ۱۹۴۰ء میں آپ ستیاگرہ کرنے کے سلسلے میں گرفتار کر لیے گئے اور پھر لگاتار تین بار جیل گئے۔ ونوبا کی والدہ رکھومائی ایک بہت ہی خداپرست عورت تھیں۔ انھوں نے ونوبا کو اچھے اچھے بھجن سکھا کر اُن کے دل میں ادب کا شوق پیدا کیا اور ساتھ ہی اُن کو بڑے بڑے مہاپرشوں کا بھگت بنا دیا۔ ایک بار جب آپ کی والدہ بیمار ہوئیں تو آپ اُن کو دیکھنے اپنے گھر گئے۔ لیکن آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کو بہت بڑا صدمہ پہنچا۔ جب آخری رسوم ادا کرنے کے لئے آپ کی ارتھی کو شمشان گھاٹ لے جانے لگے تو ونوبا نے کہا۔ کہ وہ اس شرط پر اپنی والدہ کی ارتھی کے ساتھ جائیں گے اگر اُن کی تمام آخری رسوم اُن کے ہی ہاتھ سے ادا ہوں۔ وہ کسی پنڈت کے ہاتھ سے رسوم ادا نہیں کروانا چاہتے تھے۔ آپ کے والد اس بات سے بہت ناراض ہوئے۔ اور ونوبا سے بولے کہ انھیں رسم و رواج کا احترام کرنا چاہیے۔ اور خاندان و برادری کے لوگوں کی رائے کو رد نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن ونوبا اپنی بات پہ اڑے رہے اور ارتھی کے ساتھ

نہ گئے اور گھر ہی پر اُپنشد کے شلوک پڑھتے رہے۔

ہندوستان آزاد ہونے کے بعد ونوبا وردھا اور نپار میں کھادی اور ابتدائی تعلیم کا کام کرتے رہے۔ لیکن جب ۳۰۔ جنوری ۱۹۴۸ء کو ان کے گرو مہاتما گاندھی کو شہید کر دیا گیا تو ونوبا کو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ایک مضبوط ارادے کے ساتھ باپوجی کے کام کو پورا کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ اور آج وہ باپوجی کے اصولوں پر چل کر دیش کی سیوا کر رہے ہیں اور سارے ملک کا پیدل دَورہ کر کے اپنی چلائی ہوئی تحریک بھودان (زمین کا دان) اور شرم دان (محنت کا دان) کو گاؤں گاؤں پھیلا رہے ہیں۔ بھودان کا مطلب یہ ہے کہ اُن خوش حال زمینداروں سے جن کے پاس کافی سے زیادہ زمین ہے، فالتو زمین لے کر اُن غریب کسانوں کو بانٹی جائے جن کے پاس کاشتکاری کے لئے بالکل زمین نہیں۔ چنانچہ وہ زمین کا دان مانگنے کے لئے گاؤں گاؤں پیدل جاتے ہیں اور بڑے بڑے زمینداروں سے زمین کا دان لے کر غریب کسانوں کو بانٹ دیتے ہیں۔ آپ نے اب تک جن علاقوں کا پیدل سفر کیا ہے۔ وہ مدھیہ پردیش، مدھیہ بھارت، اُتر پردیش اور دہلی کے علاقے ہیں۔ اس وقت تک آپ ایک لاکھ ایکڑ کے قریب زمین حاصل کر چکے ہیں۔

بچو! دیکھنے میں ونوبا بڑے دُبلے پتلے جسم کے مالک ہیں چنانچہ ایک بار باپوجی نے ان سے پوچھا تھا کہ آپ اتنے دُبلے پتلے ہو کر اس قدر محنت کرتے ہیں؟ ونوبا نے اُسی وقت جواب دیا۔ کہ میں ایک مضبوط ارادے کے ساتھ کام کرتا ہوں۔

ونوبا بہت سی کتابوں کے مصنّف ہیں۔ آپ نے گیتا کا ترجمہ مرہٹی زبان میں "گیتی" کے نام سے کیا۔ یہ کتاب بہت بڑی تعداد میں بکی۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۵ء تک آپ دو ہفت روزہ مرہٹی رسالے بھی شائع کرتے رہے۔

ونوبا تقریباً تیرہ زبانیں جانتے ہیں۔ عربی فارسی کے علاوہ فرانسیسی اور دوسری یورپین زبانیں بھی جانتے ہیں۔ آپ کا دلچسپ مضمون حساب ہے۔ پچھلے دنوں ایک گاؤں میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ میں گاؤں کے ہر ایک بچّے کو صاف ستھرا دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ تمام بچّے خوب پڑھیں لکھیں اور آزاد بھارت کی سیوا میں پورے جوش و خروش سے حصّہ لیں۔

بچّو! خدا سے دعا مانگو کہ ہم پر ایسے اچھّے اور نیک لیڈر کا سایہ ہمیشہ قائم رہے۔

ذرا مُسکرائیے!

لیڈی ڈاکٹر

لیڈی ڈاکٹر:۔ آج کل کی عورتیں بچّوں کی ٹھیک طرح نگرانی نہیں کرتیں۔ بچّوں کے مُنہ میں جو بھی چیز ڈالی جائے وہ صاف ہونی چاہیئے جراثیم سے مبرا

ایک عورت:۔ مگر یہ کس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ بچّے کے دانت نکلنے والے ہیں۔

لیڈی ڈاکٹر:۔ اس کے مُنہ میں اُنگلی ڈالنے سے پتہ لگ جاتا ہے۔

دوسری:۔ مگر اُنگلی پہلے اُبال لینی چاہیئے۔

احمق

بڑی بہن (خفا ہو کر) تم تو بڑی احمق ہو۔ میری کنگھی کُتّے کے بالوں میں پھیر رہی ہو۔

بہن! بے فکر رہو۔ کتّے کے بالوں میں کرنے سے پہلے میں نے کنگھی کو خوب صاف کر لیا تھا۔

ل۔م شاہد

محنت کا پھل

اصغر اس دنیا میں اکیلا تھا۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ کچھ مدّت تو وہ اپنے چچا کے گھر میں رہا لیکن مڈل پاس کرنے کے بعد اُس نے چچا کا گھر چھوڑ دیا کیونکہ وہ چچا کا ظلم برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ کافی ذہین اور خوبصورت تھا۔ وہ کچھ روز تک مارا مارا پھرتا رہا۔ ایک دن اسے محلہ اکبر پورہ میں ایک دھوبی ملا۔

"کیا کہیں مجھے نوکری مل سکے گی؟" اصغر نے کہا۔

"تم نوکری کرنا چاہتے ہو؟" دھوبی نے پوچھا۔

"ہاں میں ایک مدّت سے نوکری کی تلاش میں ہوں۔"

"میں اپنے وکیل صاحب کا پتہ تمہیں دیتا ہوں اُن کے پاس جاؤ نوکری مل جائے گی۔"

دھوبی سے وکیل کا پتہ پوچھ کر وہ اُن کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ اسے کافی بھوک لگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وکیل صاحب کچہری جانے کے لئے باہر نکلے۔ وہ اصغر کو دیکھ کر رُک گئے۔ بولے۔ "تم کون ہو؟ کیا کام ہے؟"

"میں..... میں ایک غریب لڑکا ہوں، آپ کے پاس نوکری کے لئے آیا ہوں۔ آپ کے دھوبی نے مجھے آپ کا پتہ دیا ہے"۔ اصغر نے نہایت معصوم اور اُداس لہجے میں کہا۔ وکیل صاحب کو اس پر ترس آگیا۔



بولے۔ "میرا پرانا نوکر شرفو بیمار ہے اس کی جگہ میں تمہیں رکھ لیتا ہوں جب شرفو اچھا ہو جائے گا تو تمہیں یہ کام چھوڑ دینا پڑیگا کیا تمہیں منظور ہے"

"جی ہاں۔ مجھے منظور ہے۔"

وکیل صاحب اصغر کو اندر لے گئے اور بیگم صاحبہ سے لیے "آج سے یہ لڑکا شرفو کی جگہ کام کرے گا۔ جب شرفو اچھا ہو جائے گا تو یہ کام چھوڑ دے گا۔ میں کچہری جا رہا ہوں۔ تم اسے تمام کاموں کے بارے میں سمجھا دو۔"

یہ کہہ کر وکیل صاحب چلے گئے۔

"کیا نام ہے تمہارا۔؟" بیگم صاحبہ نے پوچھا

مجھے اصغر کہتے ہیں —!

"تمہارے ماں باپ کہاں رہتے ہیں؟"

"میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے بیگم صاحبہ — میں اکیلا ہوں"

اس کے بعد بیگم نے گھر کے کاموں کے بارے میں اسے سب باتیں سمجھا دیں۔

اصغر صبح چار بجے اُٹھ کر سب سے پہلے وکیل صاحب کو پلنگ پر چائے دیتا۔ نل سے پانی لاتا — برتن دھوتا۔ کمروں کی صفائی کرتا۔ وکیل صاحب کے صاحبزادے انور کے کمرے میں منتشر کتابوں کو میز پر سجاتا۔ بازار جاتا۔ گویا تمام دن وہ ایک مشین کی طرح کام کرتا تھا۔

ایک دن رات کے دس بجے اصغر انور کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت انور کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس وقت اصغر کو دیکھ کر انور کو حیرت ہوئی۔

"کیا بات ہے اصغر، اس وقت تم یہاں کیسے، اور یہ تمہارے ہاتھوں میں کیا ہے؟

"یہ کتابیں ہیں۔ آج اُردو، انگریزی اور حساب کی کتابیں خرید لایا ہوں۔ تنخواہ ملی ہے نا۔"

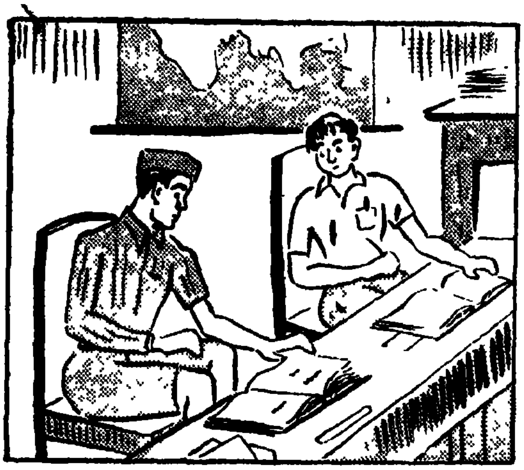
"لیکن کتابیں کس لئے خرید کر لائے ہو؟"

"اپنے لئے۔ چھوٹے سرکار۔ میں مڈل پاس ہوں۔ مجھے آگے پڑھنے کی تمنّا ہے۔ اور اس سلسلے میں آپ سے مدد چاہتا ہوں" اصغر بولا

"یہ سُن کر بڑی خوشی ہوئی کہ تم مڈل پاس ہو۔ اور تم آگے بھی پڑھنا چاہتے ہو۔ میں ضرور تمہاری مدد کروں گا۔ کل سے تم روزانہ اسی وقت آجایا کرو۔ میں پڑھا دیا کروں گا۔"

دوسرے دن سے وہ روزانہ انور سے پڑھنے لگا۔

کچھ دنوں کے بعد اُس کی فیس جمع کر دی گئی۔ وہ امتحان میں بیٹھا۔



قریباً پندرہ دن کے بعد میٹرک کا نتیجہ اخباروں میں آگیا۔

"تم پاس ہو گئے اصغر — دیکھو اخبار میں تمہارا نام آیا ہے۔" انور نے اخبار دکھاتے ہوئے کہا۔

"سچ —!"

"تو کیا جھوٹ کہتا ہوں۔ یہ دیکھو — ہے نا تمہارا نام!"

"آج مجھے بہت بڑی خوشی ہوئی ہے سرکار۔"

"اب بھئی مٹھائی کھلاؤ۔"

"ضرور سرکار۔" کہہ کر اصغر کمرے سے فوراً نکل گیا اور بازار سے مٹھائی خرید لایا۔

"ارے تم تو سچ مچ مٹھائی لے آئے۔ میں نے تو مذاقاً کہا تھا۔" انور بولا۔

"آپ نے میری مدد کی ہے۔ آپ امیر ہوتے ہوئے بھی ایک غریب کے بہت کام آئے ہیں۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔"

"نہیں اصغر یہ سب تمہاری محنت کا نتیجہ ہے۔ بغیر محنت کے کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی۔"

اس کے بعد اُسے ایک سرکاری دفتر میں نوکری مل گئی۔ آج اُسے ایک سو بیس روپے ملتے ہیں۔ آج وہ بہت خوش ہے۔ یہ سب کچھ اس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ بغیر محنت اور مستقل مزاجی کے انسان ترقّی نہیں کر سکتا۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ اس دنیا میں کسی کو ناامید نہیں ہونا چاہیئے۔

جگت سنگھ

سمندر کا پانی کھاری کیسے ہوا؟

اگلے وقتوں کی بات ہے ایک گاؤں میں دو بھائی رہتے تھے۔ بڑے بھائی کے پاس بہت سا دھن تھا مگر چھوٹا کنگال تھا۔ ایک دن جب لوگ نئے سال کی خوشیاں منانے کی تیاریاں کر رہے تھے چھوٹے بھائی کے ہاں کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ وہ بڑے بھائی کے پاس ایک سیر چاول اُدھار لینے کے لئے گیا مگر اُس نے صاف انکار کر دیا۔ جب وہ واپس غمگین صورت بنائے آ رہا تھا ایک بوڑھا راستے میں ملا جس کے سر پر لکڑیوں کا ایک بھاری گٹھا تھا۔ بوڑھے نے اُس سے پوچھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تم کسی مصیبت میں مبتلا ہو۔



چھوٹے بھائی نے اپنی دکھ بھری داستان اُسے سنائی۔ جب بوڑھا اُس کی کہانی سن چکا تو اُسے حوصلہ دیتے ہوئے کہنے لگا کہ اگر تم لکڑیوں کا یہ گٹھا میرے گھر تک چھوڑ آؤ تو میں تمھیں ایک ایسی لاجواب چیز دوں گا جس کی مدد سے تم مالا مال ہو جاؤ گے۔

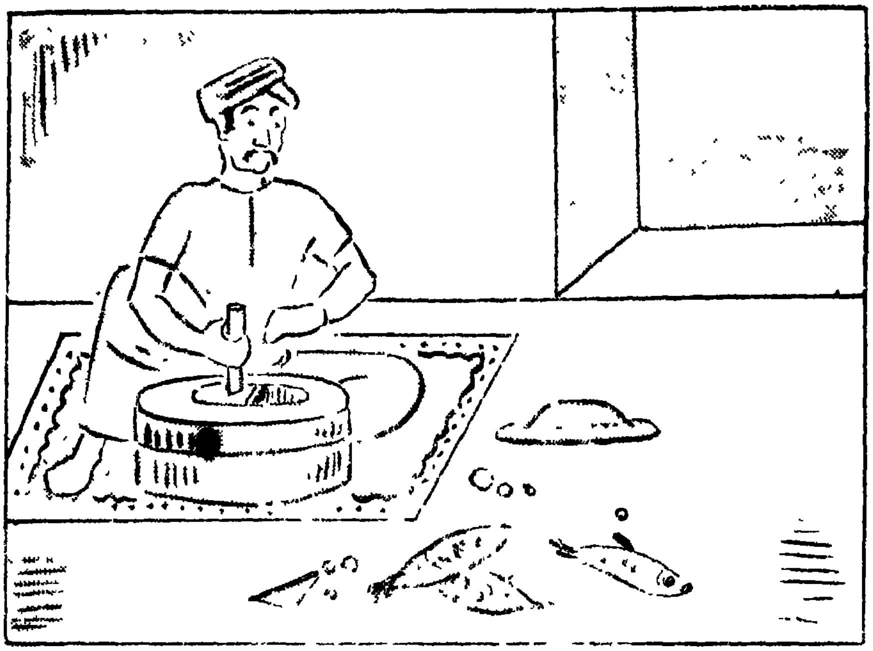
چھوٹے بھائی نے فوراً لکڑیوں کا گٹھا اُٹھایا اور بوڑھے کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

گھر پہنچ کر بوڑھے نے اُسے ایک مال پوا دیا اور کہا تم اسے لے کر اس مندر کے پیچھے والے جنگل میں چلے جاؤ۔ وہاں تمھیں ایک غار سی دکھائی دے گی اُس میں بہت سے ٹھِنگنے رہتے ہیں۔ مال پوے اُن کا من بھاتا کھاجا ہے۔ وہ کسی بھی قیمت پر اُسے حاصل کرنا چاہیں گے۔ اُس وقت دھن دولت کی مانگ ہرگز نہ کرنا بلکہ پتھر کی ایک چکّی مانگ لینا۔ بعد میں تمھیں اس چکّی کی کرامات معلوم ہو جائے گی۔

چھوٹا بھائی بوڑھے سے ہدایات لے کر فوراً اُس جنگل میں پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ مندر سے کچھ ہی فاصلے پر ایک غار سے بہت ہی ٹھِگنے نکلتے ہیں اور اور پھر اُسی میں واپس چلے جاتے ہیں۔ اُس وقت وہ بونے ایک بڑے درخت کے ٹھنے کو کھینچ کر اس غار کے اندر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے مگر یہ کام اُن کے لئے کسی قدر کٹھن تھا۔

چنانچہ چھوٹا بھائی اُن کے قریب جا کر کہنے لگا۔ لاؤ اس ٹھنے کو میں پہنچا دیتا ہوں۔ جب وہ غار کے قریب پہنچا تو اُس کے کانوں میں ایک باریک سی آواز سنائی دی۔ "مجھے بچاؤ میں مر جاؤں گا۔" یہ سن کر چھوٹے بھائی نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اُس کے پاؤں کے نیچے ایک بونا پِس چلا تھا۔ فوراً اُس نے اس چھوٹے سے بونے کو جھٹ پٹ اُٹھا لیا۔ اصل میں وہ اُن ٹھِنگنوں کا راج کمار تھا۔

بونے راج کمار کی نگاہ چھوٹے بھائی کے مال پوے پر پڑی۔ وہ بولا۔ مہربانی کر کے یہ مال پوا مجھے دے دو۔ اس کے عوض میں



آپ کو بہت سے جواہرات اور ہیرے دوں گا۔ مگر چھوٹے بھائی کو بوڑھے کی بات یاد آ گئی۔ اس نے مال پوئے کے عوض راج کمار سے پتھر کی ایک چکّی کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ بونوں کے راجہ نے راج کمار کی خوشی کی خاطر چکّی کا دینا منظور کر لیا۔ جب چھوٹا بھائی چکّی لے کر واپس آنے لگا تو بونوں کے راجہ نے اس سے کہا۔ دیکھو ہمارے راجیہ کی سب سے بیش قیمت چیز یہ چکّی ہے۔ اس کا استعمال خوب سوچ سمجھ کر کرنا۔ اور سنو۔ اس چکّی کو دائیں جانب پھیرنے سے تم جس چیز کو طلب کروگے ملے گی اور جب تک تم پھر اسے بائیں جانب نہیں پھیروگے وہ چیز نکلتی ہی رہے گی۔

اب چھوٹا بھائی پتھّر کی چکّی لے کر گھر آ گیا۔ اس کی بیوی بھوکی پیاسی بیٹھی اپنے خاوند کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے خاوند کے ہاتھ میں پتھّر کی چکّی دیکھ کر بڑی مایوسی کا اظہار کیا۔ لیکن اس کے شوہر نے آتے ہی کہا کہ جلدی سے اندر جا کر ایک کپڑا بچھا دو۔

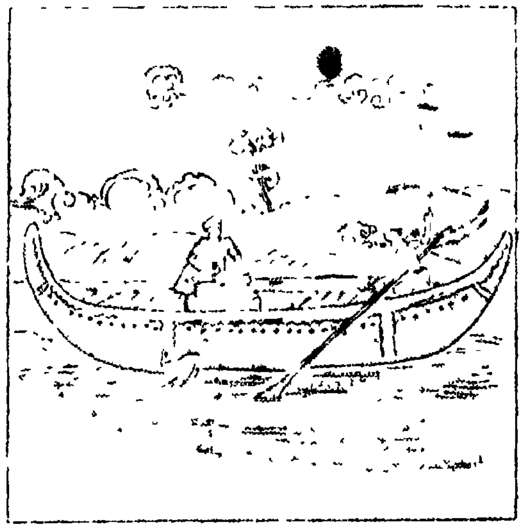
چنانچہ کمرے کے اندر ایک کپڑے کے اوپر اس چکّی کو رکھ دیا گیا اور فوراً اُسے دائیں طرف گھمانا شروع کر دیا اور کہا کہ " چاول نکالو" کہنے کی دیر تھی کہ چاولوں کا ڈھیر لگ گیا۔ پھر اُس نے مچھلی کی مانگ کی۔ اس کے بعد اُس نے ضرورت کی تمام چیزیں حاصل کر لیں۔

چھوٹے بھائی نے سوچا کہ اب میں امیر ہو گیا ہوں۔ اب مجھے ایک عالیشان مکان میں رہنا چاہیئے۔ پس اُس نے چکّی کو دائیں جانب گھما کر نہ صرف ایک محل تیار کروا لیا بلکہ اُس میں ہر قسم کی آسائش و آرائش کا سامان بھی فراہم کرا لیا۔ اب وہ پوری شان و شوکت سے رہنے لگا اس نے اپنے پڑوسیوں اور دوستوں کو ایک پُر تکلّف دعوت دی اور نئے سال کا تیوہار نہایت خوش و خُرّم ہو کر منایا۔

چھوٹے بھائی کے یہاں اتنی شان و شوکت اور رونق دیکھی تو اس کا بڑا بھائی سوچنے لگا کہ یہ چند دنوں کے اندر اندر اتنا بڑا آدمی اور لکھ پتی کس طرح بن گیا۔ اس میں ضرور کوئی راز ہے۔ وہ چوری چھپے اس کے گھر داخل ہو کر ایک دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کا بھائی ایک چکّی کو گھما کر مٹھائی کے ٹوکرے بھر رہا ہے اور مہمانوں کی خاطر تواضع کر رہا ہے۔ اتنا دیکھ کر وہ باہر نکل گیا۔ اور اُس چکّی کے حاصل کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

اُسی رات جب سب لوگ سو گئے تو بڑا بھائی چوروں کی طرح چھوٹے بھائی کے گھر میں داخل ہوا اور چکّی لے کر فوراً نو دو گیارہ ہو گیا۔ اُس چکّی کو لے کر وہ سمندر کے کنارے ایک کشتی میں جا بیٹھا یہ سوچ کر کہ میں کسی ٹاپو میں جا کر اس چکّی کے ذریعے سے لکھ پتی

بن جاؤں گا طرح وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ گھر سے روانہ ہوتے وقت اُس نے ضرورت کی سب چیزیں اپنے ساتھ لے لی تھیں مگر نمک لانا بھول گیا تھا۔ چنانچہ کشتی میں بیٹھ کر اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ نمک حاصل کرنے کے لئے اس نے چکّی کو گھمانا شروع کر دیا اور 'نمک نکال' 'نمک نکال' کی رٹ لگا دی۔



اتنا کہنے کی دیر تھی کہ چکّی نے نمک نکالنا شروع کر دیا۔ چونکہ بڑے بھائی کو چکّی کے روکنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا اس لئے نمک کی کثرت اور اُس کے وزنی ہونے کے باعث بڑا بھائی چکّی سمیت ہی سمندر میں ڈوب گیا۔

عام لوگوں کا خیال ہے کہ اس وقت سے وہ چکّی برابر گھوم رہی ہے اور نمک نکلتا جا رہا ہے۔ اسی لئے سمندر کا پانی کھارا ہو رہا ہے۔

مالک :۔ (نوکر سے) دوکاندار نے چینی کیسے دی؟

نوکر :۔ ترازو میں تول کر

سوم ناتھ ساؤھو

لطیفے

سُریندر :۔ پتاجی! ہمارے ماسٹر جی بڑے جھوٹے ہیں

پتاجی :۔ کیا جھوٹ بولا اُنھوں نے؟

سُریندر کل کہتے تھے ۹۔ اور ۹۔ اٹھارہ ہوتے ہیں اور آج کہتے ہیں کہ ۱۶۔ اور ۲۔ اٹھارہ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر :۔ دیکھو تو کون ہے؟

کمپونڈر :۔ کوئی مریض ہوگا۔

ڈاکٹر :۔ نیا ہے یا پُرانا۔ دیکھ کر آؤ۔

کمپونڈر :۔ پُرانا تو کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ نیا ہی ہوگا۔

باپ :۔ بیٹا! شریر لڑکوں سے ہمیشہ الگ ہی رہنا چاہیئے۔

بیٹا :۔ ابا جان! اس لئے تو میں نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔

اُستاد :۔ تم نے جمنا دیکھی ہے؟

شاگرد :۔ جی ہاں! کل شام کو اماں نے اس سے آلو خریدے تھے۔

محمود :۔ میں رات کو خوفناک خواب دیکھا کرتا ہوں۔

پرویز :۔ مت دیکھا کرو۔

محمود :۔ کوئی طریقہ؟

پرویز :۔ آنکھیں بند کر لیا کرو۔

ترتیب

بچوں کا آج کل

سرورق:- مٹی کا ایک کھلونا "بہشتی"

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل
دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۳ ——— نمبر ۱۰

سالانہ چندہ:- { ہندوستان میں:- چھ روپے / پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- { ہندوستان میں:- آٹھ آنے / پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

مئی ۱۹۵۵ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

آلِ احمد سرور

مزارِ غالب پر

زندہ قوموں کے لئے شعر و ادب نعمت ہے — اِن کو رکھتا ہے جواں گر تو یہی آبِ حیات

اس کے خوابوں میں ہے جادو تو خیالوں میں جمال — اس کی مستی میں معارف ہیں نشے میں ہے نجات

بزمِ تہذیب چراغاں ہے اسی کے دم سے — لالہ کاری سے اسی کی ہے بہاروں کو ثبات

اس کے اک معجزۂ فکر و نظر کے آگے — سرنگوں اہلِ سیاست کے سبھی لات و منات

ناامیدی میں جلاتا ہے اُمیدوں کے دیئے — زہر کے جام کو دیتا ہے یہی کیفِ نبات

اس کے قدموں میں مچلتا ہے طلسمِ مہ و سال — اس کے ہاتھوں میں سراپردۂ اسرارِ حیات

جاوداں اس کی ہر اک نیم نگاہی کا شہید — بے اماں تیغ ہے یہ دلبرِ شیریں حرکات

اس کے ہر رمز میں فطرت کے صحیفوں کا نچوڑ — دفترِ علم پہ بھاری ہیں اسی کے آیات

یہ وہ شعلہ ہے جو مدّھم نہ ہُوا پر نہ ہُوا — یہ وہ سورج ہے کہ جس پر کبھی آتی نہیں رات

جشنِ امروز ہُوا جاتا ہے پانی پانی — آئینہ خانے میں اس کے ہے وہ ماضی کی برات

مرجعِ اہلِ بصیرت ہے مزارِ غالب
ہم بھی لے آئے ہیں کچھ جذب و جنوں کی سوغات

ضیاء الحسن فاروقی

مولانا اسلم جیراجپوری

مولانا محمد اسلم جیراجپوری کے نام سے پہلے پہل میں اس وقت آشنا ہوا جب میں نے ان کی "تاریخ الامّت" دیکھی۔ طالب علمی کے ابتدائی دَور میں جب میں تاریخِ اسلام کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میرے ایک کرم فرما نے "تاریخ الامّت" کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے پوچھا۔ "کیا تم نے وہ کتاب دیکھی" میں نے کہا "جی ہاں۔" کہنے لگے "مصنف کو بھی دیکھا ہے۔" میں نے تعجب سے پوچھا "کیا وہ زندہ ہیں؟" اس تعجب میں اپنی لاعلمی بھی شامل تھی اور وہ تاثر بھی پوشیدہ تھا جو تاریخ الامّت کے پڑھنے کے بعد دل و دماغ پر طاری تھا۔

اب اسے حسنِ اتفاق کہوں یا استمدادِ زمانہ کا احسان کہ میں جامعہ کالج میں اُن کے ایک ادنیٰ ساتھی کی حیثیت سے درس دیتا ہوں۔ پہلے دن جب میں کالج پہونچا تو ایک "مردِ بزرگ" کی طرف اشارہ کر کے ایک صاحب نے فرمایا "یہ مولانا اسلم جیراجپوری ہیں۔" میں نے بڑھ کر سلام اور مصافحہ کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ خوش ہوئے اور فرمایا۔ "اچھا ہوا، آپ یہاں آگئے۔" بس۔ اس دن سے لے کر آج تک کہ ایک سال سے زیادہ کی مدت گزری میں ان کو بہت قریب سے چلتے ہوئے، بیٹھتے ہوئے، نماز کے لئے مسجد جاتے ہوئے، پڑھاتے ہوئے، پڑھتے ہوئے، حقّہ پیتے ہوئے، دوسروں کو حقّہ پیش کرتے ہوئے — غرض مختلف انداز میں بڑے غور سے دیکھتا رہا ہوں۔

مولانا محمد اسلم جیراجپوری ۱۸۸۲ء میں اپنے وطن موضع جیراجپور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد مولانا سلامت اللہ مرحوم حج کو گئے ہوئے تھے۔ جب وہ خانۂ کعبہ کی زیارت سے واپس آئے تو اُن کو نوّاب صدیق حسن خاں مرحوم نے بُلا کر مدرسۂ وقفیہ (بھوپال) کا صدر مدرس کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ مدرسۂ سلیمانیہ کے نائب مہتمم اور پھر اس کے اور ریاست بھوپال کے صیغۂ تعلیمات کے مہتمم ہوگئے۔ نوّاب صاحب علم و فضل کے قدردان تھے، عربی و فارسی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی عربی کی تصانیف کی شہرت ممالکِ اسلامیہ تک پہونچی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے لوگ وہاں کھنچ کر پہونچتے تھے۔ عراق، شام اور نجد وغیرہ کے علماء و طلبہ بھی کبھی کبھی وہاں آتے رہتے تھے۔ مولانا سلامت اللہ صاحب مرحوم چونکہ سلیقۂ گفتگو میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھے اور عربی نہایت صاف اور بے تکلف بولتے تھے۔ اس لئے عرب مہمانوں سے گفتگو کے لئے بیشتر وہی بلائے جاتے تھے۔

اس زمانے میں بھوپال علماء و فضلاء کا مرکز بنا ہوا تھا۔ عربی زبان و ادب، حدیث و قرآن اور منقولات و معقولات کا ایک سے ایک جیّد عالم وہاں موجود تھا۔ قاضی عبدالحق صاحب سرحدی، شیخ حسین عرب اور مولوی بشیر احمد صاحب سہسوانی جیسے علماء جہاں جمع ہوں، اس شہر کا "عیارستانِ بازارِ علم" میں کیا درجہ ہوگا۔ اسے جاننے والے خوب جانتے ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنے وقت کا امام تھا۔ اس قسم کے لوگ اب اس زمانے کی مٹی سے نہیں ڈھالے جا سکتے۔ ان کا ذکر میں نے اس لئے ضروری سمجھا کہ بھوپال کے اس علمی ماحول میں مولانا اسلم کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ مولانا کا کہنا ہے کہ انھوں نے ان سب فضلاءِ روزگار کو دیکھا ہے۔

مولانا اسلم چھ سال کے تھے کہ ان کے والد انھیں بھوپال لے گئے اور ابھی ان کی عمر کا نواں سال ہی تھا کہ انھوں نے قرآن شریف حفظ کر لیا۔ اب اس کے بعد فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:-

> "حفظِ قرآن کی بدولت محنت کی عادت پڑ گئی تھی اور حافظہ قوی ہوگیا تھا، جو کچھ پڑھتا تھا چند بار دہرانے سے ازبر ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گلستاں اور بوستاں دونوں کتابیں پوری پوری یاد کر ڈالیں۔ ...... قواعد کی مشق لکھا کر کرائی گئی۔ چنانچہ اس نوشتہ کو "قواعدِ اسلمیہ" کے نام سے میں نے اسی زمانے میں سرکاری مطبع میں طبع کرا دیا تھا۔ ایک جزو کا مختصر رسالہ سلیس فارسی زبان میں ہے۔"

فارسی کا کل مرحلہ چار سال میں ختم ہوگیا اسی کے ساتھ ساتھ ریاضی بھی۔ پھر ایک ماسٹر صاحب سے انگریزی پڑھی۔ اس کے بعد عربی کا سلسلہ شروع ہوا۔ صرف و نحو، فقہ و اصولِ فقہ، منطق و فلسفہ، ادب، حدیث اور قرآن کی پوری تعلیم مولانا نے مولوی فتح اللہ صاحب اور اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ درحاصل یہی دو اُستاد تھے جن کے قدموں میں بیٹھ کر مولانا نے علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ مولوی فتح اللہ صاحب ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے اور صرف و نحو اور فقہ و اصول کے اچھے اُستاد مانے جاتے تھے ہمارے یہاں یہ بات اصول کی حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کسی عالم نے کسی عربی مدرسے سے سندِ فضیلت نہیں حاصل کی ہے تو اسے عالم نہیں مانتے اور اس کے علم کو ناقص جانتے ہیں۔

بہتوں پر آج تک یہ اعتراض کیا جاتا ہے اور مولویوں کا ایک بڑا طبقہ مذہب کے معاملے میں اُن کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ مولانا مودودی کے متعلق بھی اسی قسم کی باتیں کہی جاتی ہیں۔—— اور مولانا اسلم تو ساری عمر اسی چیرہ دستی کا شکار رہے ہیں۔ اب ان کور مذاقوں کو کون سمجھائے کہ مدرسہ و خانقاہ کے باہر بھی علم ہے اور اپنی تمام پہنائیوں کے ساتھ دعوتِ اصلاح و اجتہاد دیتا رہتا ہے۔

۲۱ سال کی عمر میں مولانا اسلم اپنی تعلیم و تربیت کے دَور سے گزر چکے تھے سنہ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور پیسہ اخبار (لاہور) میں مترجم کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ لیکن دوسرے سال ہی والد کی بیماری نے انھیں جو پال بُلا لیا۔ چند روز کے بعد ان کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ پھر مولانا لاہور نہیں گئے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں وہ علی گڑھ پہونچے اور وہاں کالجیٹ اسکول میں عربی و فارسی کا درس دینے لگے۔ چند سال کے بعد کالج کی لٹن لائبریری میں مشرقی کتابوں کا شعبہ ان کے سپرد ہوا۔ وہاں انھوں نے کتابوں کی فہرست مرتب کی جو اپنی جگہ پر خود ایک بڑی علمی خدمت ہے۔ پھر وہ کالج میں آ گئے، اور عربی و فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ سنہ ۱۹۲۰ء تک کالج سے وابستہ رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہماری قومی زندگی کا دھارا بہت تیز بہنے لگا تھا اور ایک عمومی حرکت نے ملک و قوم کے سامنے شاندار مستقبل کی راہیں کھول دی تھیں تحریکِ خلافت، نان کوآپریشن اندولن اور جامعہ ملیہ کے قیام سے کون ناواقف ہے درحقیقت ہماری قومی زندگی "لذّتِ کام و دہن" کی آزمائش سے گذر چکی تھی۔ اس کی رگ و پے میں اب ایک دوسرے غم کا زہر اُتر چکا تھا۔ اب ہم اس منزل پر تھے جہاں دار و رسن کی آزمائش تھی۔ مولانا اسلم نے اس منزل پر وطن اور ملّت کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جب وہ وقت آیا تو انھوں نے علی گڑھ کالج کو خیرباد کہہ دیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ یہ گویا مادی سکون و اطمینان کو تیاگ کر بے سر و سامانی کو اوڑھنا بچھونا بنانا تھا۔ مولانا نے اسبابِ عیش سے محروم ہو جانا اور قوم کی آبرو کا محافظ بننا پسند کیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک جامعہ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور باوجود پیرانہ سالی کے شاہانہ وقار کے ساتھ تعلیم و تعلّم کا کام کر رہے ہیں کہ بوریائے علم کے سامنے تخت و تاج بھی سر جھکاتے ہیں۔

مولانا عالمِ دین ہیں، حافظِ قرآن ہیں، کتابِ الٰہی کے اسرار و رموز پر نظر رکھتے ہیں، مؤرخ ہیں، شاعر ہیں اور اعلیٰ درجہ کے ادیب و انشاپرداز ہیں۔ اس مضمون میں میں مؤرخ اور ادیب و انشاپرداز کی حیثیت سے ان کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں کہ یہی میرا میدان ہے۔

مولانا اسلم تاریخِ اسلام کے اچھے عالم ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی دو مشہور تصنیف تعلیمی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ تاریخ الامّت (آٹھ جلدوں میں) اور تاریخِ نجد۔ فاتحِ مصر عمرو ابن العاص کی سیرت اور حافظ و جامی کے حالاتِ زندگی اور ان کی شاعری پر تبصرہ کر کے مولانا نے سیرت نگاری اور بیوگرافی کے میدان کو بھی نہیں چھوڑا۔ ان کتابوں کے مآخذ عربی و فارسی کی مستند کتابیں ہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولانا نے قدیم کتبِ تاریخ سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ کوئی جُرم نہیں۔ تاریخ مستند ماخذوں کے سہارے ہی پڑھی اور مرتب کی جاتی ہے۔ میں چونکہ عربی نہیں جانتا اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ تاریخ الامّت کے لکھنے کے سلسلے میں مولانا نے الخضری کی کتاب سے کس طرح استفادہ کیا ہے۔

میں مولانا کو مؤرخ اس لئے مانتا ہوں کہ تاریخِ اسلام کو انھوں نے کھنگالا ہے، واقعات کے اسباب و علل اور اُن کے نتائج کو تنقیدی نظر سے جانچا ہے، زمانے کی اسپرٹ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی آئینے میں سلطنتوں کے عروج و زوال کی تصویریں دیکھی ہیں۔

آپ ان سے گفتگو کیجئے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی نگاہ کتنی دور تک پہونچتی ہے البتہ تاریخ الامّت میں ایک چیز کی کمی مجھے نظر آئی اور وہ یہ کہ معاشی حالات کا جو اثر معاشرتی نظام پر پڑتا ہے اور بہت شدید پڑتا ہے

اسے مولانا نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے مولانا سے گفتگو کی، وہ تہذیب و تمدن کی تاریخ میں معاشی عناصر کو اہمیت دیتے ہیں، پھر نہ معلوم کیوں تاریخ اسلام پر انھوں نے اس نقطۂ نظر سے تنقید نہیں کی۔

مولانا اسلم نے شاعری بھی کی ہے اور فارسی اور اُردو میں اچھے شعر کہے ہیں مگر یہ شغل زیادہ دنوں تک نہیں چلا۔ اسے موانعِ کارِ دیں سے سمجھ کر ترک کر دیا۔ مولانا کے اشہبِ قلم کی جولانی اور بحرِ تخیل کی طغیانی دیکھنا ہو تو ان کے ادبی و تنقیدی مضامین پڑھئے۔ ان کی تحریروں میں آپ بے باکی بھی پائیں گے اور توازن بھی۔ وہ آج کل کے بعض خود ساختہ نقّادوں کی طرح تنقید برائے تنقید نہیں کرتے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی مثنوی اسرار خودی جب پہلی بار شائع ہوئی تو تصوّف کی بحث میں حکیم افلاطون یونانی اور خواجہ حافظ شیرازی کے متعلق علّامہ کے خیالات پر بعض لوگوں نے احتجاج کیا۔ جب بڑی ہاہا ہی ہوئی اور مخالفین و موافقین کی طرف سے بے معنی تحریروں کا ایک طومار بندھ گیا تو مولانا نے قلم اُٹھایا اور اپنے خاص انداز میں ایک متوازن رائے پیش کر دی۔ اس سلسلے میں "تصوّف اور اسلام" پر بحث کرتے ہوئے مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس کا شمار انشاپردازی کے بہترین نمونوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:-

"..... جب تاتاریوں کے حملے شروع ہوئے اور چنگیز اور ہلاکو نے ایک قیامت صغریٰ برپا کر دی تو اُن کی ہولناک خونریزیوں سے اُمّت کے فاتحانہ جذبات مٹ گئے، دنیا کی طرف سے ان کے دل سرد ہو گئے۔ طبیعتوں کا جوش اور ولولہ جاتا رہا۔ حوصلے پست اور ہمتیں سست ہو گئیں۔ زوال و فنا کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ میلانِ خاطر زہد و ترک کی دُنیا کی طرف بڑھ گیا اور سرمایۂ توکّل و قناعت کو لے کر گوشۂ عافیت میں بیٹھنا پسند آیا۔ عالمِ فانی کے جاہ و جلال کی وقعت نگاہوں میں نہ رہی بوریائے فقر سریرِ سلطنت سے زیادہ عزیز ہو گیا .... ذوقِ عمل طبائع سے یہاں تک مسلوب ہو گیا کہ "شیوۂ قلندری" کے مقابلہ میں "رہ و رسمِ پارسائی دور دراز" نظر آنے لگی۔ عالمِ ذوق میں حلقۂ یاراں میں "خلوت در انجمن" ہونے لگی اور سجادہ ہی پر "سفر در وطن" کی کڑی منزلیں طے کی جانے لگیں .... یہ اثرات اگر صرف ایک ہی جماعت تک محدود ہوتے تو نقصان نہ ہوتا، لیکن شاعری کے ساز پر یہ تار کچھ اس انداز سے چھیڑا گیا کہ تمام ملک اس صدا سے گونج اُٹھا اور ادبیاتِ اسلامیہ میں ایک قسم کے جمود اور رہبانیت کا اثر ساری ہو گیا۔"

مولانا کی انشاپردازی سے متعلق ان کے مضامین سے اس قسم کے بہت سے زوردار اور رنگا رنگ ٹکڑے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کسی صاحب کو اگر مطالعہ کا شوق ہو تو وہ "نوادرات" پڑھیں۔ مولانا کے مضامین کا یہ گراں بہا مجموعہ ادارۂ طلوع اسلام (کراچی) نے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا ہے۔

مذہب، سیاست، معاشرت، غرض زندگی کے کسی شعبے میں مولانا کی طبیعت کورانہ تقلید اور جمود و تعطّل فکر و نظر کو برداشت نہیں کر سکتی۔ مذہب کے معاملے میں مولانا آرتھوڈاکس مکتبِ خیال سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ قرآن کو اسلام سمجھتے ہیں اور حدیث کو حجت نہیں گردانتے۔ مُلّائیت اور کلیسائی نظام کے سخت مخالف، جمہوریت کے شیدائی اور استبداد کے دُشمن ہیں اور کہتے ہیں کہ "شوکت اسلام کے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ جمہوریت جو اسلام لے کر آیا تھا اور جس نے ہر مسلمان کو آزاد اور خودمختار بنا دیا تھا، مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتی رہی۔"

مولانا کی شخصیت کی انفرادیت مُسلّم ہے، اس کے ثبوت میں یہی ایک بات کافی ہے کہ مولانا نے جس ماحول میں پرورش پائی اور ابتدائی تعلیم و تربیت نے جس منصب کے لئے انھیں تیار کیا تھا اگر وہ چاہتے تو اس سے فائدہ اُٹھاتے اور دنیا کماتے، ہزاروں ایسے مل جاتے جو ہاتھ چومتے اور ایک نگاہِ کرم کے منتظر رہتے۔ نفسِ انسانی بڑا مُفسد ہے۔ اچھے اچھوں کے قدم میں لغزش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن مولانا نے اپنا کام سمجھ لیا تھا اور اپنی راہ متعین کر لی تھی۔ علم و تدبّر کو انھوں نے اپنا پیشوا بنایا اور قبائے مشیخت اور جُبّۂ پیشوائیت کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس راہ میں انھیں دشوار گزار مراحل سے گزرنا بھی پڑا، لیکن وہ ان سب سے آسان گزر گئے اور اس کی پروا نہیں کی کہ مذہبی دُنیا انھیں کیا کہتی ہے۔

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جُدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

نصیر الدین ہاشمی

ملک محمد جائسی کی ایک نایاب تصنیف

مرحوم نوّاب سالار جنگ ثالث حیدرآباد کے ایک مشہور امیر تھے جن کے خاندان کے کئی افراد سلطنت آصفیہ کے وزیر اعظم کی حیثیت سے مامور تھے۔ خود سالار جنگ ثالث نے بھی تین سال تک اس خدمت کو انجام دیا ہے۔ موصوف نے شادی نہیں کی تھی اس لئے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان کی وفات پر حکومت نے ان کے جمع کردہ نوادر کو سالار جنگ میوزیم کے نام سے عوام کے استفادے کے لئے عام کر دیا ہے۔ عجائب خانے میں بے شمار نوادر ہیں جو ایک سو سے زیادہ کمروں میں جوڑے گئے ہیں۔ مگر ہنوز نصف سے زیادہ حصّہ جگہ کی قلّت کے باعث محفوظ رکھا گیا ہے۔

عجائب خانے سے قطع نظر نوّاب صاحب کو قلمی کتابوں کا بھی شوق تھا۔ کئی ہزار کتابیں جمع کی تھیں۔ انگریزی کے علاوہ صرف عربی، فارسی اور اردو کتابوں کی تعداد تقریباً پچاس ہزار ہے۔ ان میں تقریباً دس ہزار قلمی کتابیں ہیں۔ اس کے منجملہ ایک ہزار اردو مخطوطات ہیں جن کی تفصیلی وضاحتی فہرست میں مرتب کر رہا ہوں۔ اس موقع پر ایک قلمی کتاب کا تعارف کرایا جاتا ہے جو بہت زیادہ نایاب کہی جا سکتی ہے۔

یہ کتاب ملک محمد جائسی کی تصنیف "چترریکھا" ہے۔ ملک محمد جائسی وہ علم دوست اور ادب نواز شخص تھا جس نے حکومت کی زبان فارسی ہونے اور علماء فضلا کے تصانیف فارسی میں ہوتے رہنے کے باوجود "ہندی" کی طرف توجہ کی تھی اور اپنی بیش بہا تصانیف سے آج تک مشہور و معروف ہے۔

ملک محمد جائسی اودھ کا رہنے والا باکمال شاعر تھا، وہ فارسی کا بڑا عالم اور سنسکرت پر پورا عبور رکھتا تھا۔ اس کی کتاب "پدماوت" کا ترجمہ انگریزی اور بنگالی زبان میں بھی ہو چکا ہے۔ اس طرح ملک محمد کو جاننے والے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ہیں۔ امیر خسرو بھاشا کے نامور ادیب اور شاعر تسلیم کئے گئے ہیں۔ ان کے بعد ملک محمد ظہیر الدین بابر کے عہد میں سنہ ۱۴۹۵ء میں پیدا ہوئے ان کی پیدائش جائس میں ہوئی۔ یہ مقام ریلوے اسٹیشن جائس (رائے بریلی اور پرتاب گڈھ کے درمیان واقع ہے) سے تقریباً دو میل پر آباد ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اب تک ان کا مکان شکستہ حالت میں بوسیدہ موجود ہے۔

ملک کا خطاب ان کو حکومتِ مغلیہ کی جانب سے ملا تھا۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ مگر اولاد معنوی (تصانیف) موجود ہیں۔ وہ فقیر منش اور صوفی بزرگ تھے۔ صلح کل ان کی پالیسی تھی۔ ان کے مرشد کا نام شیخ مبارک تھا۔ ان کے بعد شاہ محی الدین سے بھی فیض پانے کا ثبوت ملتا ہے۔ قصبہ امیٹھی کو انھوں نے اپنا مستقر بنایا تھا اور "پدماوت" اسی مقام پر ختم ہوئی۔ وہ ایک سنجیدہ مزاج شاعر، تنہائی پسند اور خوددار شاعر تھے۔ کسی بادشاہ کا تقرّب پسند نہیں کیا۔ صوفی ہونے کے باعث ہر مذہب اور ملّت کے اشخاص سے بلا تعصّب ملتے تھے۔ ان کے اخلاقِ حسنہ نے سب کو گرویدہ کر لیا تھا۔

۱۵۴۲ عیسوی میں ملک محمدؒ کا انتقال ہوا۔ رام نگر متصل گڑھ امیٹھی ان کا مزار ہے۔ بقول بعض ہندی رزمیہ نظم میں ان کو اولیت کا سہرا باندھا جاتا ہے۔

انجمنِ ترقّی اردو نے ایک کتاب میں ان کے حالات شائع کئے ہیں جن کو کلب مصطفیٰ صاحب نے قلمبند کیا ہے۔ اس کتاب میں ان کی حسب ذیل تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۱) اکھراوت (۲) پدماوت (۳) سکھدوت (۴) چمپاوت۔
(۵) اتراوت (۶) مٹکاوت (۷) چترآوت (۸) کہرا نامہ
(۹) موراتی نامہ (۱۰) مہر نامہ (۱۱) پوستی نامہ (۱۲) ہیرا نامہ
(۱۳) ہولی نامہ (۱۴) آخری کلام

ان میں سے پدماوت کی تفصیلی وضاحت کلب مصطفیٰ صاحب نے کی ہے

اور اس کے بعد الکرادت پوس نامہ اور آخسری کلام کا مختصر حال لکھا ہے ان کے علاوہ ایک بارہ ماسہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

آج ہم ملک محمد جائسی کی ایک نئی تصنیف چتر ریکھا کا تعارف کراتے ہیں۔ اس کا قلمی نسخہ نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں ہے نمبر (۱۹۲) سائز (۸×۴) برغ صفحہ (۲۷) سطر (۱۵) خط نستعلیق ہے اور کتابت سنہ ۱۱۳۳ھ میں ہوئی ہے۔

آغاز

آدی ایک بر تو سوراجا — جا کر سیئے جگت پہ ساجا
چودہ بھوی پور کی ساجو — ہنس اٹھارہ بھوجی راجو
ساجی چاند سورج اوتارا — ساجی بن کنھ سمد بچارا

اس کتاب میں اولاً حمد ہے اس کے بعد نعت پھر خلفائے راشدین کی مدح کی گئی ہے اس کے بعد اپنے مرشد کا تذکرہ کیا ہے۔

خلفائے راشدین کی مدح اس طرح کی ہے۔

چار میت تنھ سنگ تر ہے — چار و کنھ دونوں جگ اپنے
ابا بکر صدیق بکھانے — سب بات سب پنچھی ملنے
عمر عدل سو کنھو دیٹا — سو دنیا د مراد ایٹیا
عثمان لکھ سو پوران سناوا — چین جین ساتھ تنھ پاوا
علی سنگ کھانڈی رن کا جے — ذوالفقار دلدل جن جاجے
چار رہوں چہوں کہند صبنوں کے — دولت اہے یو استھرا ہے

اپنے مرشد اور اپنے پیر بھائیوں کا تذکرہ اس طرح کیا ہے

سید اشرف پیرا پیارا — ہوں مرید سبھوں تو پاوا
جہانگیر چشتی د سہ را جے — ممند مانیہ بوہٹ کناں جے
حاجی احمد حاجی پیرو — ایتھ بانھہ جن سمند کنھرد
شیخ جمال جلال د نیارا — ود د سو کنی بہت بنو سارا
اس مخدوم بوسٹ لینو حرم کرم جلی — کریا شیخ مبارک کھولے شیخ جمال
مجھ دین کر و شیخ برہان — کا پیہے مگر نھو کا استھان

شاعر کے تخلص کے بعض شعر یہ ہیں

ملک محمد پنتھے کہہ ہی پانیہ اود اسں — بھو سوہ ملکے کبھوں نیک اد یاس

محمد ملک پہم ۵۵ پھورا — ناؤں بڈھسرا دوسں محتورا

محمد سا پرڈین انیہ لکھ انرپ بنہاں — بدن جیس جگ بیوورن سوک جنس بنیاں

اس نظم میں ایک داستان نظم کی گئی ہے جس کے ہیرو روپ ریکھا اور چتر ریکھا ہیں۔ یہ ہندو مذہب اور فلسفے پر مشتمل ہے۔ اسے ایک المیہ داستان کہنا چاہیئے حاصل مطلب "سیوا" کرنے کو انسان کی معراج بتلایا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ

سیوا پیو کی تو نا ہوی — سیوا بن لونان کچھ ہوی
سیوا بن جا کر من لاگو — دن دن یا دھی اوبک سڑاد
سیوا بیسہ دشت من بھاؤ — مونہہ تجے بلو تہہ را او
سیوا کہنہ نسائی رد سو — سیوا کرت نلا کی دوسو
سیوا او آپس منہہ دیمنی د ساجدہ ساتھ — رہنہ بھی جو کرت کہا بر کتے یا چنیں نچھا تھ

اس نظم کا اختتام ان اشعار پر ہوا ہے۔

لکھا سو پر منہہ رہی بو کہہ جائی کری
لیکھنا را یا پر اسکی کل ماہی ہوی
کوئک پو تھی بڈہ دری پنڈت بانکوئی
اسکی اچھر بچ کا بدھی سو پنڈت ہوی

کتاب کے خاتمے پر کاتب وغیرہ کی صراحت بھی موجود ہے جو یہ ہے

"تمام شد پوتھی چتر ریکھا من تصنیف ملک محمد جائسی در عہد محمد شاہ بادشاہ غازی بتاریخ دوازدہم شہر رجب سنہ ۲ جلوس موافق سنہ ۱۱۲۷ فصلی مطابق سنہ ۱۱۳۳ھ بروز منگل بوقت دو پہر از خط کمترین دیار ..... جھنا گریا تمام رسید۔"

اس کے علاوہ ایک اور عبارت حسب ذیل درج ہے۔

"بتاریخ بست و پنجم شہر ربیع الاول سنہ ۲ جلوس محمد شاہ بادشاہ غازی در جونہ گنج لاپزدہ جگنال ولد نورل کا بنہ ساکن متصل حویلی نور رتن"۔

ایک مہر سید محمد علی خاں بہادر کی ثبت ہے جو نواب سالار جنگ کے خاندان میں شامل تھے۔

یہ کتاب بڑی نایاب ہے کسی اور نسخے کا پتہ نہیں چلتا اور اب تک شائع بھی نہیں ہوئی ہے۔ امید ہے کہ ارباب ادب اس کی اشاعت کی جانب توجہ کریں گے۔

رضی الدین احمد

جعفر زٹلی کی شاعری کا پس منظر

ہندی اور فارسی شاعری میں کچھ اس طرح کا فرق ہمیں نظر آتا ہے جس طرح دربار اور عوام میں پہلے دوری دکھائی دیتی تھی چنانچہ دربار سے متعلق اکثر فارسی شعراء اور امراء سے متعلق عام شعراء کے ہاں ہمیں ایک طرح کی لذت پرستی، عیش پسندی، آدمی سے دوری، انفرادیت، کھوکھلی مذہبیت، اندھی عقیدت، اور بے جان صنعت گری اور بے لطف شاعری کے نمونے کثرت سے ملتے ہیں۔ عوام سے ہمدردی رکھنے والے شعراء، ہندی شعراء اور ہندوستانی مزاج کے شعراء کے ہاں ہمیں ایک دبا دبا سا اجتماعی شعور آدمی سے تعلق فرد اور جماعت کے ربط کا اشارہ مذہبیت کی وہ روح جو خدمت اور ایثار پر اکساتی ہے عقیدت کا وہ جذبہ جو نا امید اور بے عمل نہیں بناتا کم کم سہی مگر محسوس ضرور ہوتا ہے مغل حکومت کے غروب آفتاب پر جس طرح تخت و تاج کے لئے دو بھائی ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے اور یہ دونوں دو مختلف بلکہ متضاد مدرسہ فکر کے ترجمان تھے اس طرح ان دو زبانوں کی باہمی سابقت میں بھی ہمیں دو مختلف تہذیبوں کا تصادم نظر آتا ہے۔ ایک طرف اورنگ زیب تھا، دوسری طرف دارا شکوہ۔ ایک طرف فارسی زبان کا دباؤ تھا، دوسری طرف ہندوستانی زبان کی کشش، ایک طرف امراء اور قلعہ تھا، دوسری طرف گاؤں اور کسان، ایک طرف روائتی مذہبیت تھی جس نے امراء کی پشت پناہی پر کمر باندھی تھی، دوسری طرف حقیقی آدمیت تھی جو عوام کی طرف دار تھی۔ ایک طرف سیاست اور شاعری کے مقررہ ضابطے تھے جن کی بے چون و چرا پابندی لازمی تھی، دوسری طرف زندگی کے تقاضے اور شاعری کے نت نئے محرکات تھے جن میں آزادی اور اجتہاد کا جذبہ کار فرما تھا۔ ایک طرف وہ پست ذہنیت تھی جس نے قانون اور رواج کا سہارا لے کر نا دیک اندیشیوں کو جنم دیا تھا اور پھر خود مجبور ہو چلی تھی کہ ان سے چھٹکارے کے لئے جسمانی لذتوں کا سامان فراہم کرے اور عیش کی دلدل میں پھنس جائے۔ دوسری طرف وہ مادی صداقت تھی جس نے سماجی حالات کے جبر سے نئی امیدوں کے چراغ روشن کئے تھے کہ ان کی روشنی میں جسمانی لذتوں کی ہوس کاری ناممکن اور سماجی خوشحالی کا تصور ناگزیر ہوا۔ اور معشیت کی راہ کھل گئی۔

ایک طرف وہ عورتیں تھیں جن کے پاس لباس رنگین آوازیں حسین تہذیب کے تیور اور سونے کے زیور تھے ان کے کوٹھوں پر سبحان اللہ کی صدائیں اور واہ اللہ کی ادائیں تھیں، روپوں کی جھنکار اور بوسوں کی چہکار تھی ان کی وہ عظمت تھی کہ شریفوں کی بہو بیٹیاں اخلاق انھیں سے سیکھتی تھیں۔ دوسری طرف وہ لڑکیاں اور عورتیں تھیں جو صبح سے شام تک اپنے خاندان والوں کے ساتھ کھیتی باڑی اور کام دھندے میں ان کا ہاتھ بٹاتیں۔ ان کے جسم محنت اور مشقت کے پسینے سے شرابور، ہاتھ پیر افلاس اور ناداری سے کمزور، آوازیں جہالت سے دبی ہوئی اور آنکھیں جوانی سے جھکی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس بناؤ سنگار نہ تھا کردار تھا، تہذیب نہ تھی تندرستی تھی شرافت نہ تھی عفت تھی۔

ایک طرف کم ظرفی سے تلوار اور سکہ چلتا تھا دوسری طرف کم بختی سے ایمان اور ادھار پر دونوں کو دھکے دئے جاتے تھے۔

ایک طرف شہر اور فصیلیں تھیں دوسری طرف گاؤں اور پنچائتیں ایک طرف وہی لوگ جو نمازیں پڑھتے عیاشی بھی کرتے رندی کا احترام اور شراب کا اہتمام کرتے۔ دوسری طرف جو لوگ محنت کرتے وہی بھوکوں مرتے اور جو سب کے لئے اگاتے اور پیدا کرتے وہی سب سے زیادہ محروم رہتے۔

غرض زندگی میں سخت تضاد تھا جس نے ہر طرف کسی نہ کسی صورت میں اپنا اظہار کیا۔ اس تضاد کی ایک شکل ذہنی اور تہذیبی تھی دوسری مادی اور سیاسی۔ چنانچہ اس کا اظہار دارا اور اورنگ زیب کی جنگ میں ہوا۔

ہندو مسلم فلسفہ کی آمیزش، افکار اور عقائد میں تطبیق اور عوام اور دربار میں تعلق کی جو کوشش اکبر نے شروع کی تھی، اور اس کا مختلف شکلوں میں عملی اظہار ہوا تھا دارا کے ہاں اس نے ایک سنجیدہ علمی صورت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ دارا نے اپنی پہلی تصنیف "سفینۃ الاولیا" ۲۵ برس کی عمر میں ۱۰۴۹ھ میں لکھی پھر تین سال بعد دوسری تصنیف "سکینۃ الاولیا" ۱۰۵۲ھ میں لکھی دارا نے شاعری بھی کی اور اپنا تخلص قادری رکھا رسالہ حق نما ۱۶۵۴ء میں تصنیف کیا۔

دارا نے مطالعے اور فکر کے بعد اصلاحی تصوف اور طریقت کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کا مطالعہ بھی دقت نظر سے کیا۔ اس نے بھگوت گیتا کا ترجمہ کر کے اصلاحی تصوف اور ویدانت فلسفہ کو ایک کر دکھایا۔ وحدت الوجودی مسلک اور ہندو ویدانت کا اتحاد اس کے رسالہ مجمع البحرین ۱۰۶۵ھ میں ہے جو مذہب کے تقابلی مطالعے کا منصفانہ نتیجہ ہے دارا کی اس کوشش میں اس کے منشی چندر بھان نے بھی خاص شہرت حاصل کی۔ ایک رسالہ "مکالمہ دارا شکوہ" مرتب کیا (۱۰۶۶ھ) "جوگ بششٹ" کا آسان فارسی میں ترجمہ کیا۔ بنارس کے پنڈتوں کی امداد سے دارا نے اپنشدوں کے کئی ابواب کا فارسی میں ترجمہ کیا غرض دارا اپنی ذہنی صحت اور فکری صلاحیت سے مسلمان صوفیوں اور ہندو جوگیوں کا رہنما بن گیا اس طرح ہندو ویدانتی مثنوی مولانا روم کی طرف متوجہ ہوئے دارا کے مرشد سرمد اور "دبستان مذہب" کا مصنف اور کئی آزاد خیال علما جمع ہو گئے اور اس طرح اس تحریک نے ایک علمی انداز اختیار کر لیا اس طرح ہندوؤں میں ایک جماعت میر منشی چندر بھان کے ساتھ ہو گئی اور چندر بھان نے شاعری شروع کر دی فارسی میں ایک خیال کے مطابق یہ فارسی کا پہلا صاحب دیوان ہندو شاعر تھا اس زمانے کا ایک اور آزاد منش ہندو شاعر بھوپت رائے بے غم بیراگی تھا۔ خوش گو کا شاگرد تھا اور دارا کے صوفیانہ ماحول سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کی مشہور مثنوی کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی یہ رائے لائق توجہ ہے کہ

"مثنوی بے غم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ویدانت اور اسلامی تصوف کو تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے ان ہر دو روحانی سلسلوں کے اتصالی مقامات کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے مثلاً "تصور" "استغراق" "بے ثباتی عالم" کا ایک وہم اور افسانہ ہونا اور وحدت الوجود وغیرہ مسائل' اسلامی اور ہندو تصوف میں مشترک ہیں" ہندو اسلامی فلسفہ کی تطبیق کی اسی کوشش نے اگر ایک طرف سنسکرت کے ترجمے فارسی میں کرائے تو دوسری طرف "مجمع البحرین" کا ترجمہ "سمودرسنگم" کے نام سے سنسکرت میں ہوا۔ دارا کی یہ کوشش ایک لحاظ سے اکبر سے زیادہ عالمانہ اور محققانہ ہے۔ اور اس کے اثرات بھی زیادہ گہرے اور دُور رس ہیں۔

اورنگ زیب کٹر وحدت الشہودی تھا تو دارا سخت وحدت الوجودی گویا اس طرح دونوں کے اختلافات دو مستقل مسلک بننے کی وجہ سے بڑھے تھے اور تخت و تاج کی وراثت سے بڑھ کر یہ دو مختلف رجحانات کا ٹکراؤ تھا۔ اورنگ زیب اپنی سیاست اور تدبر سے کامیاب ہوا۔ اور دوسرے بھائیوں کو دارا کے مقابلے میں جمع کر کے اس نے پھر تقسیم کر دیا اور کامیاب ہوا دارا شکوہ اپنی افتاد طبع کی بناء پر نہ صرف سیاسی اور مذہبی نقطہ نظر سے اورنگ زیب سے مختلف تھا بلکہ ادب اور زندگی کے نقطہ نظر میں بھی دونوں کا ایک مسلک نہ تھا۔ اورنگ زیب نے عربی سے دلچسپی لی اور اس کی کتابت کی تو دارا شکوہ نے سنسکرت سیکھی اور پھر" اپانی شاد" کو "سرالاسرار" بنا دیا۔ ہندو مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے دھاروں کو ملانے کی جو کوشش اکبر نے مذہب اور سیاست کے میدان میں کی دارا نے اسے علمی اور تحقیقی کام کے ذریعے سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اس نے ایسے مدرسے چاہے قائم نہ کئے ہوں جیسے اکبر نے اپنے عہد میں کئے تھے اور جن کے ذکر میں علامہ ابو الفضل "آئین اکبری" میں رقم طراز ہیں کہ "اخلاق' ہندسہ' زراعت' ہیئت' طبیعات اور مذہب' تاریخ ہندو مسلمان ایک مکتب میں ساتھ پڑھتے اور یوں قومی اختلاف مٹتے رہتے تھے" لیکن اس نے اجتہادی شان سے تحقیقی کام کر کے اس طرف اہل علم کو متوجہ کیا کہ دراصل اشتراک کے ماخذ کہاں ہیں اور کیا کیا ہیں۔ اس نے جلد نتائج کا ڈھیر لگانے کی جگہ ان اسباب کا کھوج لگایا جن سے یہ نتائج اخذ کئے جائیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح اورنگ زیب سیاسی اقتدار میں کامیاب ہوا دارا نے علمی تفوق اور اجتہادی شان پیدا کر کے ہندوستان کی مذہبی تاریخ اور مشترکہ قومی عناصر کی بازیابی میں اپنے لئے ایک ایسی جگہ بنا لی جسے تخت و تاج کے ساتھ نہ جیتا جا سکتا ہے نہ موت اور زوال کے ساتھ کھویا جا سکتا ہے۔ دارا نے علمی اور تحقیقی کام کر کے جو نتائج اخذ کئے ان کا اگرچہ براہ راست نہیں مگر بالواسطہ بہت

بڑا اثر اردو شعر و ادب پر پڑا۔ اور اردو ہندی کی خلیج جس نے دو الگ کنارے بنائے تھے ایک سنگم پہ آنے لگی۔

اورنگ زیب نے جس روائتی اخلاق اور فقہی دینداری کی نہایت مخلصانہ پرجوش مگر اندھا دھند طریقے سے تبلیغ اور کوشش کیں اس پر بھی اصل اخلاق اور سچی مذہبیت پیدا کرنے میں اُسے آخر ناکامی ہوئی۔ اس کی ایک نہایت عبرتناک اور افسوسناک مثال اس زمانے کے اہل علم اور فضلا تھے جو علم سے زیادہ دولت کو عزیز رکھتے تھے۔

اورنگ زیب کے نہایت معتمد اور خاص مشیر قاضی القضاۃ گجرات کے قاضی عبدالوہاب تھے مؤرخین کا بیان ہے کہ قاضی صاحب نے وفات کے بعد (۱۰۸۶ھ) میں ایک لاکھ اشرفیاں اور پانچ لاکھ روپے علاوہ جواہرات اور اثاث البیت کے چھوڑا۔

غرض اس پست اخلاقی سطح کا اعتراف خود اورنگ زیب نے صاف لفظوں میں کیا ہے اورنگ زیب کی اس خشک مزاجی اور ظاہری مذہب پرستی نے شعر و شاعری میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ چنانچہ پشتو کا مشہور شاعر خوشحال خاں خٹک افغان بغاوت کا رہنما تھا۔ خوشحال کی طرح پشتو کے ایک اور شاعر حمید نے بھی مغلوں کے خلاف اپنے جذبات بڑی شدت سے ظاہر کئے اس طرح پشتو ہی کے مشہور شاعر خواجہ محمد نے بھی اورنگ زیب کو "انصاف کا دشمن کہا۔

اورنگ زیب نے شعر و ادب پر جو پہرے بٹھلائے تھے ان سے خود ان کی خشک مذہبیت اور کھوکھلی اسمیت جل اٹھی۔ ابھی تک اردو شعر و شاعری طنزیہ اور مزاحیہ شاعری سے محروم تھی فارسی شاعری کی نقل اور ہندی شاعری کے اندرونی اثر نے اردو شاعری کی جو شکل بنائی تھی وہ ابھی تک سنجیدہ افکار اور سوچی سمجھی حقیقتوں کا بار پوری طرح نہ اُٹھا پائی تھی کہ ہمیں ایکا ایکی ایک بالکل نئی اور نرالی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز بڑی بھرپور ہے بڑی تیز طرار اور نہایت ٹھنڈے مار ہے طنز و ادب کی تلوار بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ ذرا سی چُوک سے خود وار کرنے والا آپ گھائل ہو جاتا ہے۔ مگر اس نئی آواز کی کاٹ بڑی تیز اور تڑپا دینے والی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اورنگ زیب سے جو زبان بندی کی تھی اب اس کے ٹانکے ٹوٹ گئے ہیں۔ اور خود مغل دربار ہی کے در و دیوار سے اس طرح یہ آواز ٹکرا رہی تھی گویا مغل حکمران کی زبان بندی کے خلاف خود اس کے بوڑھے ہاتھ پیر بولنے اور گواہی دینے لگے ہیں۔

اس زوال آمادہ نظام میں جب ہر چیز اپنی جگہ سے ہلتی اور گرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ پُرانے عقیدوں سے چمٹے چمٹے رہنا اور شخصیتوں کے مزار پر عقیدت کے دو پھول چڑھا دینا کسے دوبھر ہوتا۔ فارسی شعراء رو پیٹ کر چُپ ہوئے تو میر جعفر کے جگر کا زخم زبانوں کا شور سینوں میں آگ لگانے کو اُٹھا۔

ایک طرف فارسی زبان سلطنت کا سایہ اُٹھ جانے کے سبب سوگ منانے پر آمادہ تھی دوسری طرف اردو ابھی بچپن کی معصومیت اور تتلاہٹ سے آگے قدم رکھتے ٹھٹک رہی تھی۔

ادب کی پرانی عمارت کے کنگرے ہل رہے تھے دیواریں ڈھتی جاتی تھیں سہارے اور بنیادیں کھوکھلی ہو چلی تھیں کہ یہ شور ساری تباہی اور غارتگری پر چھا گیا۔ جتنے شہر آشوب مرثیے اور نوحے لکھے گئے تھے ان کی سیاہی ماند پڑ گئی۔ یہ آواز اسی مثل کی مصداق تھی کہ "جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے"۔

میر جعفر زٹلی کی یہ آواز مغلوں کے عہد کے لئے ایک صُور بن کر رہ گئی۔

یہ آواز بظاہر بڑی غیر سنجیدہ، غیر مہذب، کھُردری مگر پاٹ دار آواز تھی۔ جو حلق ہی سے نہیں سینہ سے نکلتی محسوس ہوتی تھی اس میں منہ بھر کر ٹھٹھا کرنے کی کیفیت تھی ناک پر انگلی رکھ کر آنکھیں دکھانے کی بات نہ تھی۔

اس آواز کے بعد ایک طرح سے پُرانی دنیا کی کوکھ سے ایک نئی دنیا نے جنم لیا۔ مہذب، شستہ، سنجیدہ اور ہلکی پھلکی شعر و شاعری کی جگہ بری ناخوشگوار نہایت بھدّی سخت ناموزوں مگر بھاری بھرکم اور اصلیت سے میل کھاتی شاعری نے لے لی۔

یہ ایک طرح سے اردو شاعری کا ایک موڑ تھا۔ وہ سب اساتذہ جو فارسی کے اثر سے مسحور تھے اب مبہوت ہو چلے تھے۔ دکن کے فقیروں اور دہقانی کسانوں نے اورنگ زیب کی کمر اور مغلوں کے تاج کو ٹیڑھا کر دیا تھا۔ فارسی کے شعراء اب بے دم تھے اور اردو کے اساتذہ دم بخود۔ اس موت کے سے سناٹے میں زندگی کی چاپ ہمیں نظیر اور میر جعفر زٹلی کے ہاں سُنائی دیتی ہے یعنی شعر و شاعری میں ایک نئے طرز کی ابتدا اور نئی زندگی کا سماں بندھ جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے "ادب میں طرز ادا کی تبدیلی اگر وہ خلوص پر مبنی ہے دراصل وضع نفس اور فلسفہ حیات کی

تبدیلی کا آئینہ ہوا کرتی ہے چنانچہ اردو اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کا حقیقت نگاری کی طرف رجحان دراصل عکس تھا ایک ذہنی انقلاب کا جس نے ہندوستانیوں کی توجہ کا مرکز موضوع کی بجائے معروض کو تصور کی بجائے شاہد کو بنا دیا تھا یعنی اسے عہدِ وسطیٰ سے عہدِ جدید میں پہنچا دیا تھا"۔

مغل شہزادے اپنی وراثتی فضیلت کی بنا پر ایک دوسرے پر تلواریں سونت رہے تھے بھائی بھائی پر فتح پانے کے درپے تھا۔ حیدرآباد کی تباہی اس برادرانہ جنگ کا انعام تھا۔

گولکنڈہ فتح ہوا تو جعفر نے سلطان پر بڑا بھرپور طنز کیا۔

نخستیں کلاں ترکہ برکھنڈ کر — ہمہ کاروبارِ پدر بھنڈ کر

باپ کے کاروبار کو بیٹوں نے جب اس طرح چلایا تو ہر طرف لوٹ مار نوچ کھسوٹ اور بھاگ دوڑ شروع ہو گئی ایک بستی لٹی تو آخر میر جعفر بھی چپ نہ رہ سکے ؎

چناں لوٹ شد بستی ملک نگر — نہ خندہ ما صفا ماند نہ ماکدر

جہاں ہوئے ایسے کلچھن کپوت — لگے خلق کے منہ کو کالک بھبھوت

دوسرے بھائی اعظم پر بھی طنز کیا ہے۔ ؎

دگر شاہ اعظم ہمہ کند در — بہ رسوائی انداخت کارِ پدر

بہ خوش دامن خویش ساختہ — یہ للو پتو کار در باختہ

اعظم معظم کی خانہ جنگی پر اس طرح ماتم کرتے ہیں ؎

کہاں اب پائیے ایسا شہنشہ — مکمل اکمل و کامل دل آگاہ

رگڑا کے الجھ واں دل رووتا ہے — نہ بیٹھی نیند کوئی سووتا ہے

دوا دو ہر طرف بھاگم بھگی ہے — بچہ در گود سر کھٹیا دھری ہے

ازاں سو اعظم وزیں سو معظم — زمیں کے واسطے لڑتے ہیں باہم

سا جعفر زباں کو مختصر کر — ز دورِ مختلف دل میں حذر کر

آخر ان چٹکیوں سے ان کی طبیعت کا غبار اور دل کا بخار کم نہیں ہوا تو پھر ایک لمبا چوڑا شہر آشوب تحریر کیا۔ جس میں سامنے کی سی باتیں سیدھے سادے انداز میں کہہ دیں اور چپ ہو رہے۔

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے — ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے

نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری — محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے

نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹ میں کھوئی — اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے

خوشامد سب کریں زر کی چہ میگانہ چہ ز ویگر کی — بھلا دی بات سب ہر کی عجب یہ دور آیا ہے

یہ انداز ایسا سیدھا سادہ غمگین اور سنجیدہ تھا کہ ان کی بات بقول نواب نصیر حسین خاں خیال ہونٹوں نکلی اور کوٹھوں چڑھی۔

جب میر صاحب اعظم و معظم سے ناخوش تھے تو بھلا فرخ سیر سے کیسے خوش رہ سکتے۔ فرخ سیر نے اپنے سکے پر یہ شعر کندہ کرایا ؎

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر — بادشاہ بحر و بر فرخ سیر

میر جعفر چوٹ کئے بغیر نہ رہ سکے۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر — بادشاہ پشہ کش فرخ سیر

میرو ناسی کا خیال ہے کہ میر جعفر نے ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) کے بعد وفات پائی۔ جعفر نے خود جو ماحول دیکھا تھا اب اس کا ٹھاٹھ باٹھ خواب و خیال ہو گیا تھا اسے یاد کرتے ہیں تو کس دردمندی سے کہتے ہیں۔

اب یا ماکر دل پیا پڑھن بھوں بلبلیاں — غنڈوں میں نہ مل بیٹھ پکڑ بھایا بجھ ہے سو

وہ ذوق ہر دم کا کہاں وہ عطر بیگم کا کہاں — در خاک شد آں کر و فر نہ جعفر اب کیسے بنے

حکومت کا خزانہ فوجی مہمات پر ختم ہو چکا ہے۔ فوج کی تنخواہیں ادا کرنے کے لئے سلطنت کو امرا سے روپیہ قرض بھی نہیں مل سکتا، امرا اپنی جگہ خوف زدہ اور غم دیدہ ہیں عوام سخت پریشان اور فوجی بغاوت پر آمادہ ہیں دربار کے لئے یہ عقدہ اب لاینحل ہو چلا ہے۔ میر جعفر اس بے کاری کا حال بیان کرتے ہیں تو زمانے کی سماجی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔

بشنو بیاں نوکری جب گانٹھ ہوئی کھوکری — تب بھول جاوے چوکڑی یہ نوکری کا خبط ہے

مردم پشیماں یک دگر گشتہ سپاہی دربدر — خود وہ بسے خون و جگر یہ نوکری کا خبط ہے

دھنیا جولا یا طاق ہے کنجڑا قصائی چاک ہے — دیکھ بس فرم ساق ہے یہ نوکری کا خبط ہے

ہر صبح ڈھونڈیں چاکری کوئی نہ پوچھے بات تھا — سب قوم ڈھونڈیں لاکڑی یہ نوکری کا خبط ہے

ذی ہیں مجرے میں کٹے دو میں غشی نے لئے — دن میں جھگڑے میں کٹے یہ نوکری کا خبط ہے

چوکی لکھیں اور حاضری کھانے نہ پاویں باجری — تس پر جلادیں تاج ری یہ نوکری کا خبط ہے

کیسے رہیں ایماں سے عاجز ہمیشہ ناں سے — بیزار ہیں مہماں سے یہ نوکری کا خبط ہے

جعفر خدا کو یاد کر غمگین دل کو شاد کر — یہ گفتگو برباد کر یہ نوکری کا خبط ہے

فوج کی حالت کا ہو بہو نقشہ ذیل کے بندوں میں بیان کر دیا ہے جو حقیقت حال پر مشتمل ہے۔

جب توڑ کو سب اٹھ چلے سوار بیٹھے لیا کچے — ٹٹو بچارا نہ ہلے یہ نوکری کا خبط ہے

اُمراء ہیں سب بے خبر اعدی بے چاری بے قدر   اسوار باجی سے بتر یہ نوکری کا خبط ہے
صاحب عجب بے وا ہے محنت ہمہ برباد ہے   اے دوستاں فریاد ہے یہ نوکری کا خبط ہے
ہم نام کو اسوار ہیں روزگار سے بیکار ہیں   یارو ہمیشہ خوار ہیں یہ نوکری کا خبط ہے
نوکر خدائی خاں کے محتاج آدمی نان کے   تعین ہے ایمان کی یہ نوکری کا خبط ہے
دم خیر ہو گھوڑا رہا یہ دکھ بے چارا سہہ گیا   پیشاب کر کے سو رہا یہ نوکری کا خبط ہے
دیکھو مہاجن کا جیا جن سود کا لالچ کیا   بے قرض پوتا ہے دیا یہ نوکری کا خبط ہے
دربار دیکھا خان کا بیڑا نہ پایا پان کا   توکا نہ پایا نان کا یہ نوکری کا خبط ہے
رات دن بھوکے مریں اس حال سے کیسے مریں   تم ہی کہو ہم کیا کریں تنکر کس (کش) کا دق ہے

اپنی نئی تصنیف پر خود تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

مسلمان ہند دسہاگن چہ راندڑ   عزیزش بدارند چوں کھیر و کھانڈ
اگرچہ ہمہ کوڑا و کرکٹ است   بہندی روندی زبان لت پت است
دلیکن کسی نے بھلی یہ کہی جیسے پیو چاہے سہاگن وہی   بتاریخ اثنا عشر فی سنہ مطلع مدجو پر شد این ثلی نامہ جیلہ

زندگی کی یہ زندہ بدبختیاں تھیں جن پہ جعفر زٹلی نے ڈھول ڈالنے کی جگہ ان کو ذرا پاس سے جا کر دیکھا۔ اس عہد کا بہروپیاپن ظاہری دینداری اور نہایت پست دنیاداری جب جعفر کے سامنے عریاں ہوئی تو اس نے اس سے آنکھیں چرانے کی جگہ اس پر خوب قہقہے لگائے اور اس کے قہقہے مغلوں کے در و دیوار سے ٹکرا کر اور بھی پر شور اور پُر رعب ہو گئے۔

میر جعفر کی یہ شاعری اور سماجی حالات کا یہ عکس اس لئے اور بھی اہم ہے کہ یہ اپنی تردید آپ کرتا ہے۔ یعنی میر جعفر درباری نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔ عوام کے بارے میں ان کا رویہ مضحکہ خیز بلکہ ایک حد تک رسوا کن ہے۔ مگر اس زوال آمادہ نظام کی ابتری کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ خود اس کے ہاتھ پیر اس کے خلاف گواہی دینے لگیں۔ میر جعفر کو اورنگ زیب سے جو اسی عہد کو جوں کا توں باقی رکھنے میں اپنی جان کھپا رہا تھا بے حد عقیدت تھی چنانچہ اورنگ زیب کے انتقال پر جو مرثیہ لکھا اس میں اپنی دلی عقیدت کا نہایت سنجیدگی اور افسوس کے ساتھ اعتراف اور اظہار کیا ہے۔ چند اشعار جن سے یہ عقیدت ٹپکی پڑتی ہے درج ذیل ہیں۔

دریغا عدل و دین بے رونیم است   عروس سلطنت بے ر دسقیم است
کمین اکمل و کامل دل آگاہ   کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ

صدائے توپ و بندوق است ہر سو   بسر اسباب و صندوق است ہر سو

کہیں کہیں اپنے انداز سے کچھ اس طرح کے شعر بھی کہہ دیتے ہیں۔

بہر سو مار مار و دھاڑ دھاڑ است   اوچل چال و تبر خنجر کٹار است
ازاں سو اعظم و زیں سو معظم   جھڑا جھڑ و دھڑا دھڑ ہر دو باہم

بہادر شاہ غازی کے "طنز نامے" میں فرماتے ہیں ؎

بھلائی بھیک کی بوٹی ملک مارے شہر لوٹے   جپی تس دن بہت مالا کبھی بڈھا کبھی بالا
بھلائے بھیک کے ٹکڑے سپاہی ہو بہت اکڑے   جلیں جنگل میں جوں لکڑی اگن دوزخ جلایا ہے
مچا ہند دلی میں دیکھو اس زر دہلی میں   دغل دیو میں داغول عجیب یہ نام پایا ہے

ایک قطعہ میں اعلیٰ خاندانیت نے ان سے کیا کہلوایا ہے۔

کس بہ مفلس نمی دہد دختر   پسر خاندان عالی را
جعفرا دیدہ کہ سگ ہرگز   نہ کشد استخوان خالی را

اپنے عہد کی یہ تاویل انھوں نے کس طرح پیش کی ہے ؎

اینٹیں پرانی ہو گئیں مائی نمائی گھس چلی   کیا دوش ہے معمار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے
آٹی اینڈ ڈھول گھنڈائیں میں رہا کپڑا بجھٹا   چلنا بڑے بازار کا کہ جعفر اب کیا کیجئے

دارد خبر از لذت چپ چاپ عبادت   آنکس کہ شکم سیر بہت کوہ نباشد
زرداری ایک پیسہ دی دار مولا   درحضرت حق اجر یہ پہلو نباشد

اورنگ زیب کی یہ شان جعفر ہی بیان کر سکتا ہے ؎

زہے دھاک اورنگ زیب شاہ دلی   کہ در ملک دکھن پڑی کھلبلی
درین پیر سالی و ضعف بدن   نچیائی دھما چوکڑی در دکن

یہ تھا مغل شہنشاہ کا وہ ماں اور ہوا خواہ جس نے تعریف میں تضحیک اور تضحیک میں حقیقت بیان کرنے کی کوشش کی اور جیسے تیسے آخر تک اپنی تصورات سے چمٹا رہا مگر ان کی گراوٹ کو بھی دیکھا اور آپ ہی آپ ہنسا کیا۔ اس کی ہنسی صرف ایک بھرپور طنز ہے اور بس۔ اس نے ہمدردی کی ہمت نہیں کی۔ حقیقت کو مکمل طور پر نہیں لیا۔ اور اس کے متعلقات کو صحیح طور سے نہیں سمجھا لیکن اس کی یہ خصوصیت نہایت اہم ہے کہ اس نے اپنی تردید آپ کی ہے۔ اور اپنے عہد کے تضاد کو شدت تاثر سے بیان کر دیا ہے۔

غزل

(نوابؔ محمد اسمٰعیل علی خاں تاجؔ آف ٹونک)

ہیں پھر تصوّرِ رُخِ جاناں کئے ہوئے
ہر داغِ دل کو مہرِ درخشاں کئے ہوئے

پھر دل ہے عزمِ دشت و بیاباں کئے ہوئے
اقلیمِ ننگ و نام کو ویراں کئے ہوئے

پھر کھینچتا ہے دامنِ دل دستِ آرزو
خود کو نگاہِ عقل سے پنہاں کئے ہوئے

پھر شامِ غم میں صبحِ تمنّا ہے جلوہ گر
ہر نقشِ زندگی کو نمایاں کئے ہوئے

پھر آ رہا ہے اک بُتِ سفّاک کا خیال
تاراجِ کشورِ دل و ایماں کئے ہوئے

در پردۂ نیاز ہے پھر اک نگاہِ ناز
شمشیرِ التفات کو عریاں کئے ہوئے

عرصہ گزر گیا ہے نگاہِ جنوں نواز
دل کو خرد سے دست و گریباں کئے ہوئے

پھر اک خیالِ عارض و گیسو ہے رات دن
مجموعۂ حواس پریشاں کئے ہوئے

پھر بڑھ رہے ہیں عشق و محبّت کے حوصلے
سعیٔ خرد کو سر بہ گریباں کئے ہوئے

پھر دشتِ شوق و دامنِ جاناں کی شوخیاں
ہیں شرطِ ضبطِ عشق کو ویراں کئے ہوئے

پھر ہے شبِ فراق بلاؤں کا اک ہجوم
جیسے ہو کوئی بال پریشاں کئے ہوئے

ہے بزمِ دل میں حُسنِ گراں مایہ آج کل
نظّارۂ جمال کو ارزاں کئے ہوئے

ہیں آبروئے صبر کی آنکھیں جُھکی ہوئی
ہے وضعِ احتیاط پشیماں کئے ہوئے

پھر کوچۂ حبیب میں جاتے ہیں بار بار
برپا اک اضطراب کا طوفاں کئے ہوئے

اے شورشِ جنوں تری غیرت کو کیا ہُوا
ہر گُل ہے چاک چاک گریباں کئے ہوئے

پھر دل پہ یاس و غم کی گھٹاؤں کا زور ہے
آنکھیں ہیں پھر تہیّۂ طوفاں کئے ہوئے

ہیں تاجؔ پھر کسی کے تصوّر میں اِن دنوں
ہر لمحہ وقفِ شوقِ فراواں کئے ہوئے

پرکاش پنڈت

تکلف میں ہے تکلیف تو پھر....!

کردار

۱۔ میاں	
۲۔ بیوی	
۳۔ تلسی	ملازم
۴۔ پران ناتھ	میاں کا دوست
۵۔ کرشن آنند	"
۶ جگل کشور	"
۷ دیا ترائن	"

پردہ اٹھنے پر میاں بیوی صوفے میں دھنسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اردگرد خالی کرسیاں پڑی ہیں اور درمیان میں چھوٹی میز۔

میاں۔ ہاں تو سنیما کے بعد کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا۔ کھانے میں چکن کری۔ قورمہ۔ بریانی۔ مچھلی کے کباب اور...... اور....

بیوی۔ اور نان اور سلاد اور میٹھے میں پڈنگ ــــ لیکن دیکھئے جناب! اگر آج آپ نے کچھ گڑبڑ کی تو ہمارا آپ کا کنٹریکٹ کینسل۔ چاہے آپ کا کوئی کیسا ہی دوست کیوں نہ مل جائے...... جی، میں نے کہا یہ کیسے کیسے دوست ہیں آپ کے؟ نہ عقل نہ تمیز۔ ابھی کل مسٹر شرمانے....

میاں۔ چھوڑو ڈارلنگ! کل کی بات چھوڑو۔ آج بس آج کی بات کرو۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کھانے کے بعد آج ہم لمبی سیر کو نکل چلیں۔ انڈیا گیٹ بلکہ اس سے بھی پرے۔ پرانے قلعے تک۔ آج کتنے دن ہو گئے ہیں ہم اکٹھے گھومنے نہیں گئے۔

بیوی۔ آپ کو اپنے دوستوں سے فرصت ملے جب نا۔

میاں۔ دوست! تو ڈارلنگ! تم سمجھتی ہو یہ جو ایرے غیرے نتھو خیرے آئے دن ہمارے یہاں ٹپکتے رہتے ہیں، یہ سب میرے دوست ہیں؟

بیوی۔ میں تو یہی سمجھتی ہوں۔

میاں۔ تم غلط سمجھتی ہو ڈارلنگ! یہ تو بس ظاہرداری سمجھو جو میں انھیں دھتکار نہیں دیتا، ورنہ میری طبیعت تم جانتی ہو، کسی کی الٹی سیدھی بات مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ کوئی کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو، ڈانٹ کے رکھ دیتا ہوں۔

بیوی۔ جی، میں نے کہا، گھومنے کا پروگرام آج رہنے دیجئے۔ سنیما اور کھانے کے بعد خاصی دیر ہو جائے گی۔ تلسی خواہ مخواہ کڑھے گا اور بے بی کی عادت تو آپ جانتے ہیں۔ جونہی دس بجے اور اس کی نیند ٹوٹی۔ مجھے نہ دیکھا تو سارا گھر سر پر اٹھا لے گا۔

میاں۔ میں سمجھتا ہوں آج بے بی کو بھی ساتھ لے چلیں۔ رنگین فلم ہے۔ خوش ہو گا۔

بیوی۔ اور جو اندھیرے میں چیخا تو.....

میاں۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ کہو گی تو اٹھ کر باہر لے جاؤں گا۔ لیکن میں چاہتا ہوں، آج لمبی سیر کو چلیں۔ رات بھی چاندنی ہے اور ادھر کئی روز سے...... لو اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ.......

(اسٹیج کے دائیں طرف کا دروازہ باہر سے کھٹکتا ہے۔)

میاں۔ (اونچی آواز سے) تلسی ــــ ہے تلسی ــــ دیکھو، باہر کون ہے۔

(اسٹیج کے بائیں طرف کے دروازے سے ملازم داخل ہوتا ہے)

تلسی۔ جی۔

میاں۔ (آہستہ سے) جو بھی ہو، کہہ دینا کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں، سمجھے!

تلسی ۔ جی

(تلسی دروازہ تھوڑا سا کھولتا ہے)

تلسی ۔ فرمایئے۔

نو وارد ۔ (تیکھی آواز میں) آپ فرمایئے ؟

تلسی ۔ جی صاحب تو.......

نو وارد ۔ صاحب کی ایسی تیسی ۔ تم راستے سے ہٹ جاؤ ——— آدمی ہو یا چھت کی دیوار۔

(اندر داخل ہوتا ہے)

کیوں جناب یہ کیا بدتمیزی ہے کہ کوئی دس میل پیدل چل کر حضور کے درشن کرنے آئے اور آگے سے جواب ملے (منہ بنا کر) فرمایئے ۔

میاں ۔ او، ہیلو پران ۔ آؤ، آؤ، کہاں سے آ رہے ہو ؟

نو وارد یعنی پران ۔ جہنم سے ——— نمستے بھابی ۔

(ہاتھ جوڑتا ہے اور کرسی سرکا کر قریب ہو بیٹھتا ہے)

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ حضور کل پک نک میں کیوں تشریف نہیں لائے ؟

میاں ۔ ارے کیا بتاؤں بھائی ۔ بس یونہی ——— کچھ دیر ہوگئی، اور میں نے سوچا.......

پران ۔ حضور نے سوچا کہ مس روزی تو جا نہیں رہیں، آپ کیا وہاں جھک مارنے جائیں گے ——— بھابی ! میں تمہیں بتائے دیتا ہوں ۔ ان بزرگ کو کہ جنہیں تمہارے خاوند ہونے کا شرف حاصل ہے بڑی مضبوط نکیل کی ضرورت ہے ۔

میاں ۔ ارے یار مذاق چھوڑو ۔ یہ بتاؤ کہ اس وقت کہاں سے آ رہے ہو !

پران ۔ کہاں سے آ رہا ہوں ؟ کمال ہے ! تو کیا جناب سمجھتے ہیں، کہ میں آپ کی طرح کسی کلب، کسی بار، کسی بال روم یا ریس کورس سے آ رہا ہوں ۔ یہ سب کھیل تماشے آپ ہی کو مبارک ہوں ۔ شریف آدمی ہوں، شریفوں کی طرح سیدھا دفتر سے آ رہا ہوں ۔

میاں ۔ ارے میں تو اس لئے پوچھ رہا تھا کہ...... خیر، کچھ چائے وائے پیوگے ؟

بیوی ۔ جی ہاں، چائے پیجئے گا ؟

پران ۔ بھابی ! چائے میں بعد میں پیوں گا ۔ پہلے آنحضرت کی خبر لے لوں ۔ تم نہیں جانتیں بھابی کہ اوپر سے یہ جتنا بھولا نظر آتا ہے اندر سے اتنا ہی گولا ہے.......

بیوی ۔ (اونچی آواز میں) تلسی !

تلسی ۔ (دور سے) جی بی بی جی ۔

بیوی ۔ سنو، ذرا چائے کے لئے پانی رکھ دو ۔

تلسی ۔ جی بی بی جی ۔

پران ۔ اور بھابی چائے کے ساتھ کیا کھلایئے گا ؟

بیوی ۔ جو آپ کہیں ۔

پران ۔ یوں تو کوئی خاص ضرورت نہیں ۔ میرا مطلب ہے، بازار سے کچھ منگوانے کی خاص ضرورت نہیں ۔ گھر میں جو کچھ بھی ہو.....

بیوی ۔ جی گھر میں تو......

پران ۔ نہ ہو تو کچھ پکوڑے ہی تل دیجئے ۔ بہت عمدہ تلتی ہیں آپ پالک کے پکوڑے ۔

بیوی ۔ جی ۔

میاں ۔ ارے پران ۔ بات دراصل یہ ہے کہ آج ہم لوگ ذرا..

پران ۔ میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا جی ۔ آخر تم نے ہماری بھابی کو سمجھ کیا رکھا ہے ۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ وہ بے چاری تو دن بھر گھر میں پڑی تمہیں بھگوان کی طرح پوجتی رہے، اور تم ——— تم بھابی ! جاؤ بناؤ پکوڑے ۔ میں ذرا اس سے دو ہاتھ کر لوں ۔

(بیوی اٹھ کر بائیں دروازے سے باہر چلی جاتی ہے)

میاں ۔ ارے بھیا ! میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج ہم لوگ ذرا....

پران ۔ ہم لوگ سے تمہارا مطلب ہے تم اور میں ؟ نہیں جناب یہ خاکسار تو بھر پایا، بیری تمہاری دوستی ہو چکی ۔ آخر یہ کہاں کی تک ہے کہ ہم تو تمہاری خاطر پکنکوں کا انتظام کرتے پھریں، اور تم......

میاں ۔ بھئی کام ہی سے فرصت نہیں ملی ۔ کیا کہوں ۔ میں تو خود چاہتا تھا کہ...... لیکن سنو آج ہم لوگ ذرا...... میرا مطلب ہے میں اور تمہاری بھابی......

(دایاں دروازہ باہر سے کھٹکھٹایا جاتا ہے)

میاں - (اونچی آواز سے) تلسی ——— ارے او تلسی ——— ذرا دیکھنا باہر کون صاحب آئے ہیں۔

تلسی - (دُور سے) جی صاحب!

پران - سنو، اس سے کہہ دو کہ اب اُن سے نہ کہہ دے کہ (منہ بگاڑ کر) فرمائیے؟

(اس سے پہلے کہ تلسی بڑھ کر دروازہ کھولے تو وارد خود ہی دروازہ کھول کر اندر آ جاتا ہے)

کرشن آنند - تلسی کو آواز دینے کی ضرورت نہیں، دروازہ کھلا ہے۔ میں نے تو صرف اس لئے نہیں کھولا کہ کہیں تم ہماری بھابی سے ....

میاں - او ہیلو، کرشن آنند۔ آؤ، بیٹھو۔

کرشن آنند - گھر والے نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں۔ میں نے سوچا جب تک نہیں آتے ذرا تمہارے ہاں ہی وقت کٹی کر لوں ——— (پران کی طرف دیکھ کر) آپ کی تعریف؟ (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

میاں - اوہ! آپ ہیں میرے عزیز دوست مسٹر پران ناتھ۔ آج کل فنانس منسٹری میں ہیں۔ پہلے ٹاٹا نگر میں تھے، اور آپ ہیں کرشن آنند میرے عزیز دوست۔ حال ہی میں ہمارے پڑوس میں آئے ہیں۔

پران اور کرشن آنند (ایک ساتھ) ویری گلیڈ ٹو میٹ یو...

میاں - سُنا تھا تم بمبئی جانے والے ہو۔

کرشن - ہاں ارادہ تو ہے لیکن اس وقت ...... معاف کیجئے گا پران صاحب ان سے ذرا ہماری بے تکلفی ہے ...... کچھ چائے وائے ملے گی یا نہیں؟

میاں - ضرور، ضرور چائے بن رہی ہے۔ کچھ ساتھ لوگے؟

کرشن - کوئی ایسی چیز کھلاؤ کہ پیٹ میں پہنچ کر معلوم بھی ہو کہ کچھ پہنچا ہے۔ گھر والے نہ جانے کب آتے ہیں۔

میاں - پالک کے پکوڑے؟

کرشن - ارے نہیں، پالک کے پکوڑوں سے کیا ہوگا۔ اس وقت مجھے کچھ ٹھوس قسم کی غذا کی ضرورت ہے۔ بھابی کہاں ہے؟ ذرا بھابی کو بلاؤ۔ (اونچی آواز میں) بھابی!

بیوی - (دُور سے) جی، جی ابھی آئی۔

(بائیں دروازے سے اندر داخل ہوتی ہے)

کرشن آنند - نمستے بھابی ——— کیا حال چال ہیں؟

بیوی - جی اچھی ہوں - آپ سنائیے۔

کرشن - بس مزے ہیں۔ آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ ——— چائے کے ساتھ کیا کھلائیں گی؟

بیوی - جو آپ کہیں؛

کرشن - ارے بھابی کہنا کیا ہے، بس دو چار انڈوں کا آملیٹ، کچھ ٹوسٹ۔ ہو سکے تو سینڈ وچ۔ پالک کے پکوڑے تو پران ناتھ جی کے لئے بن رہے ہوں گے۔

میاں - ارے نہیں ہم سب کھائیں گے۔

کرشن - تو بھابی پالک کے ساتھ ساتھ ذرا بینگن اور گوبھی بھی تل لینا۔

بیوی - جی بینگن اور گوبھی تو ....

میاں - بات یہ ہے بھائی کرشن کہ آج ہم لوگ ذرا ......

کرشن - نہ ہو تو دو پراٹھے ہی بنا دو ...... گھر میں آلو تو ضرور ہوں گے۔ آلو کے پراٹھے کھائے مدّت ہو چکی ہے۔ لیکن ان میں پیاز مت ڈالنا ——— پیاز سے میرا جی بہت جلتا ہے بھابی۔

بیوی - جی

میاں - بات یہ ہے کرشن کہ آج ہم لوگ ذرا ......

بیوی - (طنز سے) جی اب رہنے دیجئے اپنی صفائی۔ میں سب جانتی ہوں۔

کرشن - اوہو ——— تو آج پھر آپ لوگوں میں کھٹ پٹ ہو گئی ہے۔ معاف کیجئے پران ناتھ صاحب، میری ذرا اس گھر میں بے تکلفی ہے۔ میں تم سے دس بار کہہ چکا ہوں، کمبخت کہ ہماری بھابی کو تنگ نہ کیا کرو۔ لاکھوں میں ایک ہے ہماری بھابی۔ وقت بے وقت جو بھی آ جائے گھر کے آدمیوں کا سا سلوک کرتی ہے۔ ذرا ہمارے گھر کی طرف دیکھو، کوئی دوست پانی مانگ لے تو مجال ہے کہ ایک ہفتے سے پہلے نصیب ہو جائے ——— بھگوان ہر کسی کو ایسی بیوی دے ——— لیکن یہ تو ناشکرا ہے ناشکرا ——— تم جاؤ بھابی میں کرتا ہوں اس کی حجامت۔ آخر اس نے

سمجھ کیا رکھا ہے۔

بیوی۔ جی۔

(دائیں دروازے سے باہر چلی جاتی ہے)

میاں۔ کچھ مجھے بھی کہنے دوگے یا اپنی ہی ہانکے چلے جاؤگے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ آج ہم لوگ ذرا.......

کرشن۔ آج ہی نہیں، یہ تمہارا ہر روز کا دستور ہے۔ جب بھی آؤ بھابی بے چاری......

میاں۔ ارے نہیں جھگڑا وگڑا کچھ نہیں ہوا۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگ ذرا........

(بائیں ہاتھ کا دروازہ کھٹکتا ہے)

میاں۔ (اونچی آواز میں) تلسی۔ ارے او تلسی.....

(کوئی جواب نہیں دیتا)

کہاں جاکر مرگیا ہے۔ معاف کیجئے میں ذرا.......

اُٹھ کر دروازہ کھولتا ہے)

گلزاری لال۔ کیا دیا نرائن آچکا ہے؟

میاں۔ نہیں تو۔

گلزاری۔ بڑا اُلّو کا پٹھا ہے — مجھے خواہ مخواہ پریشان کیا۔ خیر، ذرا مجھے سات روپے دینا ٹیکسی والے کو دفع کر دوں پھر باتیں ہوں گی۔

میاں۔ (پریشان ہوکر) سات روپے.....تلسی..... ابے او تلسی.....

گلزاری۔ بڑا اُلّو کا چرخہ نکلا ہے۔ کہہ رہا تھا ٹھیک چھ بجے یہاں پہنچ جاؤں گا۔

میاں۔ (پھر زور سے) ارے او تلسی...... کہاں جاکر مرگئے ہو!

بیوی۔ (دور سے) تلسی ذرا بازار تک گیا ہے۔

میاں۔ اوہ! اچھا! رُکو میں ابھی لاتا ہوں۔

(نو وارد دروازے پر کھڑا رہتا ہے اور میاں دائیں دروازے میں سے گزر کر اسٹیج کے اُس حصّے میں جاتا ہے جہاں اب تک اندھیرا تھا، اس کے جاتے ہی اُدھر روشنی ہوجاتی ہے اور بیوی کڑاہی میں پکوڑے تلتی نظر آتی ہے۔)

میاں۔ (سرگوشیانہ انداز میں) ڈارلنگ! مجھے ذرا سات روپے تو دینا!

بیوی۔ (خاموش ہے)

میاں۔ (سرگوشی میں) میں نے کہا ڈارلنگ! مجھے ذرا سات روپے......

بیوی۔ (کھیج کر) میرے پاس جو خزانے دبے پڑے ہیں نا۔

میاں۔ اوہو۔ ذرا آہستہ بولو ڈارلنگ۔ وہ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔

بیوی۔ کیوں آہستہ بولوں۔ مجھے کسی موئے کا ڈر نہیں۔ کسی کی دبیل نہیں ہوں میں۔

میاں۔ پھر وہی۔ میں کہتا ہوں ڈارلنگ! تم سمجھتی کیوں نہیں۔

بیوی۔ جی بہت سمجھ چکی ہیں۔ میں بھی کہوں آج یہ سینما اور رکھانے کے چونچلے کیوں ہو رہے ہیں۔ یہ معلوم نہ تھا کہ گدھے کی طرح کام لینا ہے۔ پوری رات باورچی خانے میں سر مارنا ہے۔

میاں۔ ارے بھئی تم بالکل نہیں سمجھتیں۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ.... خیر لاؤ، ابھی مجھے سات روپے تو دو۔ گلزاری لال باہر کھڑا ہے۔ اس مصیبت کو تو ٹالوں۔

بیوی۔ کیوں اسے کیوں ٹالئے گا۔ بلا کر گود میں بٹھائیے۔ پکوڑے اور پراٹھے ٹھنسوائیے.....

میاں۔ نہیں ڈارلنگ نہیں۔ لاؤ مجھے جلدی سے سات روپے دے دو، ورنہ.........

بیوی۔ ورنہ کیا؟ پرس میں جو کچھ رکھا ہے اُٹھا کے بانٹ دیجئے بھک مردوں میں۔ ہم پر ایک آنہ خرچ کرنا ہو تو جان نکل جاتی ہے! اسے تو وہاں مارو جہاں پانی نہ ملے، اور یار دوست چاہے پورا گھر لوٹ لے جائیں......

(دیوار گیر پر پڑے ہوئے پرس میں سے دس کا نوٹ نکال کر اور دروازے میں سے گزر کر اسٹیج کے مین حصّے

میں آتا ہے۔ اس کے آتے ہی پہلے حصے کی روشنی آہستہ آہستہ
گل ہو جاتی ہے۔ پھر بائیں دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔)

میاں ۔ (دس کا نوٹ دیتے ہوئے) لو بھئی گلزاری لال یہ دس
کا نوٹ ہے ٹیکسی والے سے باقی ......

گلزاری لال ۔ یہ اور بھی اچھا کیا تم نے کہ دس کا نوٹ لے آئے،
میری جیب میں اس وقت صرف ایک اکنی تھی، اور مجھے ابھی ......
اچھا پیارے میں چلا ......

میاں ۔ وہ نرائن آئے تو اسے کیا کہوں؟

گلزاری ۔ اس سے کہنا تم بڑے جھوٹے، دغاباز، بدمعاش ہو۔
وقت دیتے ہو اور وقت پر پہنچتے نہیں۔ ملوگے تو طبیعت صاف کر دوں گا۔
اچھا بائی بائی ......

(میاں لوٹ کر صوفے پر بیٹھ جاتا ہے)

پران ۔ کیوں بھئی کتنی دیر ہے ابھی؟

کرشن ۔ میرے پیٹ میں تو چوہے ناچ رہے ہیں۔

پران ۔ ذرا جلدی کر دو بھائی۔ مجھے گھر پہنچنا ہے۔ کافی دیر ہو چکی ہے۔

کرشن ۔ اور میرے گھر والے بھی شاید آ چکے ہوں۔

میاں ۔ بس ہو رہا ہے۔ ابھی دو منٹ میں ...... میں جا کر
دیکھتا ہوں ...

(اٹھ کر پھر اسی کمرے میں جاتا ہے اور اس طرح اس کے
پہنچنے پر ادھر کی بتی روشن ہو جاتی ہے)

میاں ۔ ڈارلنگ! کتنی دیر ہے؟

بیوی ۔ (خاموش ہے)

میاں ۔ میں پوچھتا ہوں ڈارلنگ چائے میں کتنی دیر ہے،
وہ لوگ ......

بیوی ۔ جہنم میں جائیں وہ لوگ اور میں آپ کو کیا کہوں۔

(تلسی داخل ہوتا ہے)

میاں ۔ دیکھو تلسی۔ بی بی جی کا پارہ بہت گرم ہو رہا ہے۔ تم جلدی سے
چائے لاؤ۔

تلسی ۔ جی۔

(واپس مین اسٹیج پر آ جاتا ہے اور ادھر کی روشنی آہستہ
گل ہو جاتی ہے)

میاں ۔ بس ابھی دو منٹ میں آتی ہے۔

کرشن ۔ بھئی جو بن گیا تھا وہی لے آتے۔

پران ۔ پالک کے پکوڑے تو بن ہی چکے ہوں گے۔

میاں ۔ اے، ہاں، نہیں۔ وہ تلسی ابھی ......

پران ۔ کیسے نمک حرام نوکر رکھتے ہو جی۔ میرا نوکر ہوتا تو کھڑے
کھڑے کان سے پکڑ کر نکال دیتا۔ کرشن آنند صاحب! آپ ہی بتائیے ایسے
بدتمیز نوکروں سے لنگور پالنا زیادہ اچھا نہیں، جو مالک کے گھر پر موجود ہونے
پر بھی اس کے دوستوں سے دروازے پر ہی پوچھنا شروع کر دیں کہ "منہ
لگائڈرکس" فرمائیے!

میاں ۔ نہیں، پران یہ بات نہیں، بات اصل میں یہ تھی کہ ......

(تلسی چائے لے کر داخل ہوتا ہے)

لو وہ آگئی چائے (زور سے) ڈارلنگ! تم بھی آؤ نا۔

پران ۔ ہاں بھابی آؤ نا تم بھی ......

کرشن ۔ بھابی بھابی۔

(تلسی میز پر سامان رکھ کر چلا جاتا ہے۔ بیوی آ کر صوفے
پر بیٹھ جاتی ہے۔ سب لوگ کھانا شروع کرتے ہیں اور بیوی
چائے بنانے لگتی ہے۔ اسٹیج کی روشنیاں آہستہ آہستہ
مدھم ہو کر بجھ جاتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ روشن ہو جاتی
ہیں۔ اب سب پلیٹیں صاف ہیں اور پران اور کرشن اٹھ رہے
کھڑے ہیں۔)

کرشن ۔ بھئی واہ مزا آگیا۔ پراٹھوں کا جواب نہیں۔

پران ۔ اور پکوڑے؟

کرشن ۔ پکوڑے تو بہت ہی لاجواب تھے۔ مجھے تو معلوم ہی نہ
تھا کہ بھابی اتنے لذیذ پکوڑے بناتی ہیں۔ آج معلوم ہوا۔ بھابی کل پھر
کھلائیے گا!

بیوی ۔ ضرور۔

پران ۔ اچھا بھابی چائے کا بہت بہت شکریہ۔

بیوی ۔ اس میں شکریے کی کیا بات ہے ۔

کرشن ۔ میں تمھیں بتاؤں بھابی ۔ ہم لوگوں کی تو خیر دوسری بات ہے ۔ تم ذرا اس کے دوستوں سے تنک کر بات کیا کرو ۔ کوئی آئے، کوئی جائے ۔ مرے یا جئے، تم مزے سے بیٹھی رہا کرو ۔ پھر دیکھنا کہ بچہ جی کے ہوش ٹھکانے آتے ہیں یا نہیں ۔ جب باہر بے عزّتی ہوگی تو گھر پر عسرت کریں گے ۔

پران ۔ اچھا بھئی دینا ناتھ، اچھا بھابی بائی بائی ۔

کرشن ۔ ٹاٹا ۔

(دونوں بائیں دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں ۔ تلسی آکر برتن اٹھالے جاتا ہے ۔)

میاں ۔ (گہرا سانس لے کر اور صوفے میں دھنستے ہوئے) تم ہی بتاؤ ڈارلنگ اس میں میرا کیا قصور ہے ؟

بیوی ۔ (غصّے سے) میں کسی کی ڈارلنگ وارلنگ نہیں ۔ مجھے کوئی ڈارلنگ نہ کہے ۔

میاں ۔ نہ تم ہی بتاؤ ڈارلنگ میرا اس میں کیا قصور ہے، اگر لوگ اونٹوں کی طرح منھ اٹھائے گھر میں گھس آئیں ۔

بیوی ۔ (خاموش ہے)

میاں ۔ ہم تو اس طرح کسی کے یہاں نہیں جاتے ۔ آدمی کو وقت بے وقت دیکھنا چاہیئے ۔ نہ جانے اگلا کس حال میں ہو ۔ کہیں آنے جانے کا پروگرام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بیوی ۔ جی بس ہو چکا آنا جانا ۔ میں سب سمجھتی ہوں ۔ اگر کوئی گھر کو گھر سمجھے تو کس کی مجال ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میاں ۔ تو کیا تم سمجھتی ہو کہ میں ہی انھیں تار دے دے کر بلاتا ہوں کہ آؤ اور کودو میری چھاتی پر ؟

بیوی ۔ اور نہیں تو کیا میں بلاتی ہوں کہ آؤ نہلا دوں تمھیں گھی میں ۔ ہم پر ایک دھیلا خرچ کرنا پڑ جائے تو دیکھئے کیا آفت آتی ہے ۔ ۔ ۔ اور ٹھیک ہی تو ہے ۔ آپ کو مجھ سے کوئی واسطہ ہو جب نا ۔ جن مردوں کو پرائی عورتوں کے چسکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میاں ۔ پرائی عورتوں کے چسکے ۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو ڈارلنگ تم بھی اس الّو کے پٹھے پران کی باتوں میں آگئیں ۔ اس کی تو عادت ہی ہے ۔

بیوی ۔ جی ہاں، پران کی عادت ہے، دینا ناتھ کی بھی عادت ہے ۔ جو کوئی سچی بات کہہ دے بس اسی کی عادت ہے ۔

میاں ۔ بھئی ڈارلنگ ! اب چھوڑو بھی یہ قصّہ ۔ کمبختوں نے سارا پروگرام اپ سٹ کر دیا ۔۔۔ اب آئے میرے یہاں کوئی ۔ باہر ہی سے سڑک کا راستہ نہ دکھایا تو میرا نام بھی دینا ناتھ نہیں ۔

بیوی ۔ واہ، یہ خوب کہی آپ نے ۔ آپ کا کیا ہے ۔ آپ کوئی اور نام رکھ لیں گے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میاں ۔ اور راہ گیروں کو اٹھا اٹھا کر گھر بھر لوں گا کہ آؤ میری بیوی بڑے اچھے پکوڑے تلتی ہے اور پراٹھے بنانے میں تو اس کا جواب ہی نہیں ۔ ہمیں تو نہ کبھی تل کے کھلائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بیوی ۔ آپ کو گھر کی کوئی چیز پسند ہو جب نا ۔ جن مردوں کو باہر کی چیزوں کے چسکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میاں ۔ پھر وہی چسکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھئی تمھیں میری قسم ہے ڈارلنگ ! مجھے زیادہ پریشان نہ کرو ۔ میں پہلے سے ہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو کہو چلتی ہو اب ؟

بیوی ۔ کہاں ؟ اپنے ماں باپ کے گھر ! پہنچا دیجیے ۔

میاں ۔ اوہو ـــــ ارے نہیں بھئی سنیما دیکھنے ۔

بیوی ۔ نو بجے سنیما دیکھنے ! ابھی میرا دماغ خراب نہیں ہوا، کہ بچے والی ہو کر رات کے نو بجے سنیما دیکھتی پھروں ۔

میاں ۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ ڈارلنگ سنیما نہ سہی، ذرا ٹہل آئیں گے ۔

بیوی ۔ اس وقت !

میاں ۔ یہی تو وقت ہے ڈارلنگ ! جب ہم آسانی سے فرار ہو سکتے ہیں ۔ ورنہ کوئی تعجب نہیں کہ ابھی کسی کی محبت کی رگ پھڑک اٹھے ۔ اور وہ اٹھ بھاگے مجھ سے گلے ملنے ۔ میری حالت پر رحم کھاؤ ڈارلنگ اور چلو جلدی سے نکل چلو یہاں سے ۔

بیوی ۔ اور بے بی ؟

میاں ۔ بے بی کو بھی ساتھ لے چلو اور چاہو تو تلسی کو بھی ۔ ۔ ۔ تلسی بے بی کو سنبھال لے گا ۔

بیوی - اور کھانا پکانے کے لئے مجھے بارہ بجے پھر باورچی خانے میں ڈھکیل دیجئے گا۔

میاں - بھئی سنیما نہ سہی، کھانا تو باہر کھائیں گے ہی ۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ سب بعد کو ہوتا رہے گا۔ تم جلدی سے کپڑے بدل لو اور (زور سے) تلسی! ابے او تلسی۔

تلسی - (دور سے) جی ساب!

میاں - ادھر آؤ۔

(تلسی داخل ہوتا ہے)

تلسی - جی۔

میاں - دیکھو، باہر کے دروازے کو باہر سے تالا لگا دو، اور پچھواڑے کی دیوار پھاند کر پھر آؤ میرے پاس۔

تلسی - (تعجب سے) جی!

میاں - جی وی کچھ نہیں۔ جو کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔ اب بچنے کی صرف یہی صورت ہے، اور سنو! آکر تم بھی تیار ہو جاؤ۔ گھومنے چلیں گے۔

تلسی - جی ابھی آیا۔

(دائیں دروازے کی طرف بڑھتا ہے، اور دروازہ باہر سے بند کر دیتا ہے۔ اس اثنا میں بیوی الماری سے سیاہ رنگ کی ساڑھی نکالتی ہے)

میاں - یہ سیاہ ساڑھی نہیں ڈارلنگ! اس وقت تو وہ سفید ساڑھی پہنو۔ چاندنی رات میں وہ سفید ساڑھی تم پر کتنی کھلتی ہے۔

بیوی - جی وہ تو بہت دور ہے۔ یہی ٹھیک ہے۔ یہاں کون سا کسی کو دکھانا ہے۔

میاں - نہیں ڈارلنگ! اس وقت تو آدھی ساڑھی پہنو اور اور جوڑے میں چنبیلی کا پھول ۔۔۔۔۔

بیوی - اب رہنے بھی دیجئے یہ چاپلوسی کی باتیں۔

(تلسی بائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے اور بیوی بائیں دروازے سے باہر جاتی ہے۔)

تلسی - جی لگا دیا ساب۔

میاں - گڈ۔ اچھی طرح دیکھ لیا تھا نا! کبھی کبھی اندر کے بجائے باہر سے لگے ہوئے تالے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔

تلسی - جی خوب اچھی طرح دیکھ لیا۔

میاں - اچھا جاؤ۔ جوتے ووتے پہن لو اور پھر اسی طرح دیوار پھاند کر اور چاروں طرف دیکھ کر دروازہ کھولنا۔

تلسی - جی۔

(تلسی بائیں دروازے سے باہر جاتا ہے اور بیوی سفید ساڑھی میں ملبوس اندر داخل ہوتی ہے۔)

میاں - آہا، یہ ہوئی نا بات۔ ڈارلنگ! تمھیں تو کسی راجہ نواب کی بیوی ہونا چاہیئے تھا۔ یہ رنگ روپ، یہ لباس ۔۔۔۔۔ کیا بتاؤں ڈارلنگ! جب تم میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی ہو اور لوگوں کی نظریں تمھاری طرف اٹھتی ہیں تو جانتی ہو کیا ہوتا ہے ۔۔۔۔۔؟

بیوی - مجھے کیا معلوم کیا ہوتا ہے ۔۔۔۔۔؟

میاں - میری چھاتی گز بھر کی ہو جاتی ہے۔ فخر سے میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے اور ۔۔۔۔۔

بیوی - کسی کو بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔

میاں - نہیں ڈارلنگ! میں بنا نہیں رہا۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ ۔۔۔۔ (زور سے) تلسی، ابے او تلسی۔

تلسی - (دور سے) جی ساب۔

میاں - جاؤ، کھولو دروازہ ـــــ لیکن ذرا احتیاط سے۔ چاروں طرف دیکھ کر۔ راستہ بالکل صاف ہو جب کھولنا۔

تلسی - جی۔

میاں - ہاں تو ڈارلنگ! میں تم سے کہہ رہا تھا ۔۔۔۔۔

(بے طرح گھبرایا ہوا تلسی داخل ہوتا ہے)

تلسی - ساب غضب ہو گیا۔

میاں - (گھبرا کر) کیا ہوا ـــــ کیا ہوا تلسی ـــــ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟

تلسی - جی وہ۔

میاں - ارے وہ کیا ـــــ کچھ کہو گے بھی۔

تلسی - جی کوئی دیوار پھاند رہا ہے ۔

بیوی - (خوف سے) ایں !

میاں - کیا کہا دیوار پھاند رہا ہے ۔ کون سی دیوار پھاند رہا ہے ؟

تلسی - جی ہماری ۔

میاں - ہماری دیوار پھاند رہا ہے ، کون پھاند رہا ہے ؟

(بائیں دروازے سے دیا نرائن داخل ہوتا ہے)

دیا نرائن - میں پھاند رہا ہوں تمھارا باپ - یہ بچنے کا اچھا طریقہ نکالا تم نے - باہر سے دروازہ بند کرکے تم سمجھتے ہو بچ جاؤگے ۔

میاں - اوہ نہیں بھائی ۔ معاف کرنا ۔ ہم تو ڈر ہی گئے تھے کہ نہ جانے کون ۔۔۔۔۔۔

دیا نرائن - جی ہاں اب آپ کو ہم سے ڈر ہی تو آئے گا ۔

میاں - نہیں یہ بات نہیں دیا نرائن - بات یہ تھی کہ ۔۔۔۔۔

دیا نرائن - میں بات وات کچھ نہیں جانتا - پہلے میری بات کا جواب دو کہ باہر سے دروازہ بند کرکے تم ۔۔۔۔۔۔

میاں - ہم لوگ ذرا باہر جا رہے تھے ۔

دیا نرائن - دروازہ باہر سے بند ہے اور تم باہر جا رہے تھے کیوں مجھے بے وقوف بناتے ہو دینا ناتھ - یہ ہتھکنڈے کسی اور کو دکھانا ۔ دیا نرائن کچی گولیاں نہیں کھیلا کہ اُسے اس آسانی سے چکمہ دئے جاؤگے ۔ پچاس بار تم نے کہا تھا تو آج آیا ہوں اور اس ارادے سے آیا ہوں کہ آج رات یہیں رہوں گا ۔

میاں - رات یہیں رہوگے ؟ لیکن ہم لوگ تو ۔۔۔۔۔

دیا نرائن - تم لوگ جاؤ جہنم میں ——— معاف کرنا بھابی ——— اس سے میں نپٹتا رہوں گا ، تم ذرا جلدی سے مجھے کھانے کو کچھ لادو ۔ آج تو شام کی چائے بھی نصیب نہیں ہوئی ۔

میاں - لیکن ۔۔۔۔۔

دیا نرائن - تم چپ رہو جی ۔ تمھاری لیکن ویکن میں ابھی نکال دیتا ہوں آخر تم نے مجھے سمجھا کیا ہے ۔ تم سمجھتے ہو کہ اگر تم ہماری بھابی کو دھوکہ دے سکتے ہو تو ساری دنیا کو دھوکہ دے سکتے ہو ——— بھابی ، ذرا تلسی کے ہاتھ ایک کرتہ پاجامہ بھجوا دو اور دیکھو میرے لئے الگ بستر بچھانے کی ضرورت نہیں - میں اس چغد کے ساتھ سو جاؤں گا ——— کیوں بے چغد کیا سمجھا ہے تو نے مجھے ——— مار مار کے گھونسوں کے میں تمھارا بھرکس نکال دوں گا - تمھاری ہڈی پسلی ایک کر دوں گا ۔

میاں - (مری ہوئی آواز میں) ڈارلنگ !

بیوی - (طنزاً) جی ۔

میاں - ڈارلنگ ۔

بیوی - جی ۔

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

معلومات اور اعداد و شمار

— ملوں میں کپڑے کی پیداوار میں جو ۱۹۵۳ء میں ہی پنج سالہ پلان کے تحت کپڑے کی انتہائی مقررہ مقدار سے بھی بڑھ چکی تھی ۱۹۵۴ء میں تقریباً ۲ کروڑ گز کا مزید اضافہ ہوگیا ۔

— اپریل تا دسمبر ۱۹۵۴ء میں کسٹم کے محصول اور مصنوعات کے مرکزی محصول سے ڈیڑھ ارب ایک کروڑ چوالیس لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی جبکہ گزشتہ سال یہ رقم ایک ارب اٹھاسی کروڑ چھیاسی لاکھ روپے تھی ۔

— ۱۹۵۴ء میں ہندوستان میں ۲۲۳۰۵۹ بجلی کے پنکھے تیار ہوئے ۔ ۱۹۵۳ء میں ۱۹۹۴۶۸ پنکھے تیار کئے گئے تھے ۔

— ۱۹۵۳ء میں سیمنٹ کی پیداوار ۳۷۸۰۳۲۴ ٹن تھی جو ۱۹۵۴ء میں ۴۳۵۷۰۴۵ ٹن ہو گئی ہے ۔

— ۱۹۵۴ء کے دوران میں ریلوں پر ۱۳۶ مزید ٹرینیں چلائی گئیں اور ۱۱۷ ٹرینوں کی آمد و رفت میں توسیع کی گئی ۔

امیر محمد خاں

شہنشاہِ موسیقی اُستاد رجب علی خاں صاحب

فنونِ لطیفہ میں فنِ موسیقی اور شاعری کا مرتبہ اس لئے بلند ہے کہ اس کا تعلق وجدانیات سے ہے۔ مذہب بھی اگرچہ وجدانی اور اخلاقی تحریک ہے لیکن تاثیر اور کشش پیدا کرنے کے لئے اُسے بھی کبھی شاعری، کبھی سنگتراشی اور کبھی موسیقی کا سہارا لینا پڑتا ہے، اور ہندوستان میں تو تمام فنونِ لطیفہ وھرم کے اجزا ہی بن گئے۔ بدھ مت نے مصوری اور سنگ تراشی کو اپنایا تو اسلام کے شیعہ فرقے کے سوز نے حسینائی راگ کو جنم دیا، اور قرأت تو ویسے عام تھی ہی — صوفیوں، سنتوں اور رندوں نے اپنے دربارِ عام میں موسیقی کو عوام سے قریب کرکے اُسے عزت بخشی۔ ریاضت کے ساتھ اگر عبادت میں یہ تفریحی اور وجدانی پہلو نہ ہوتا تو صوفیوں اور سنتوں کے اعصاب پر بُرا اثر پڑتا۔ فنِ موسیقی تہذیبِ نفس کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

شمالی ہند کا ہندوستانی سنگیت اگر سنتوں اور صوفیوں کا مرہونِ منت ہے تو شاہوں اور راجوں مہاراجوں اور امرا کے ذوقِ جمال اور اُن کی قدردانی نے بھی اس کو سنورنے نکھرنے کا موقع دیا ہے۔ یہ طرزِ موسیقی ہند مُسلم تہذیب کا قیمتی ورثہ ہے جو استادوں اور شاگردوں کے ذریعے سے منتقل ہوتا رہا ہے، اور کئی گھرانوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ ہر گھرانے نے اپنی ریاضت سے کمالاتِ فن کی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔

بچپن کے 'راجا' اور 'بچپڑا' اور آج کے استاد رجب علی خاں صاحب فن کے اعتبار سے کرانہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد مرحوم منگلو خاں گوالیار اور بعد میں ریواں کے استاد بڑے محمد خاں صاحب اور اُن کے بیٹے اُستاد مبارک علی خاں کے شاگرد رہے۔ استاد رجب علی خاں صاحب نے ابتدا میں اپنے والد مرحوم سے تعلیم حاصل کی اور بعد میں اپنے زمانے کے بے مثال بین کار استاد بندے علی خاں صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ استاد بندے علی خاں کی تعلیم کا فیضان ہے کہ رجب علی صاحب بین اور جل ترنگ بجانے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، حالانکہ بین کاری کی تعلیم اُنھیں صرف چار سال تک میسر آ سکی۔

ناطق موسیقی میں وہ خیال گائکی کے پیرو ہیں اور اُن کی فنی خوبیوں میں مینڈ گھسیٹ، الاپ اور سوت شامل ہیں۔ جب گاتے ہیں تو چہرے کو بگڑنے نہیں دیتے، اور گیت کے لفظوں کو سُروں کے جال میں مقید نہیں ہونے دیتے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ راگ میں جو رس ہے اُسی کے مطابق موسیقار کو جذبات کے اظہار پر بھی قدرت ہونی چاہیئے۔ تانیں لگانا تو اُن کے فن کا شیوہ ہے۔ ان کی تانیں بڑی شیریں اور دل نشیں ہوتی ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ جس تان میں سُر نہیں وہ تان نہیں۔ یہی تان بازی اُن کے فن کو کوہلاپور کے اُستاد اللہ دیا خاں صاحب مرحوم کی لے کاری سے ممیز کرتی ہے، ورنہ عام طور پر یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ رجب علی خاں صاحب، اللہ دیا خاں صاحب کے مقلد ہیں۔ دونوں کے فن میں مماثلت بتائے جانے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کوہلاپور دربار میں دونوں فنکاروں کو دس بارہ سال تک ایک ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔

خاں صاحب موصوف فطرتاً بڑے تیکھے مزاج کے انسان ہیں۔ تان بازی اِسی گرم مزاجی اور بے چین طبیعت کی وجہ جواز ہو سکتی ہے۔ اُن کی لے میں بھی تیز رفتاری بہت ہے۔ جیوریا تے ہیں کہ اُن کے ہمسر استاد اللہ دیا خاں صاحب مرحوم سے ۲۵ سال تک اَبولا رہا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ ایک بار کہیں اللہ دیا خاں صاحب نے منگلو خاں صاحب کو سارنگیا بتا دیا تھا، بس پھر کیا تھا رجب علی خاں صاحب زندگی بھر کے لئے کبیدہ خاطر ہو گئے۔ ۲۵ سال کے بعد جب استاد اللہ دیا خاں صاحب کو ایک بار اندور آنے کا اتفاق ہوا تو اُنھوں نے خاں صاحب موصوف کے پاس دیواس خبر بھیجی کہ وہ ملاقات کے آرزومند ہیں۔ کیونکہ دونوں کافی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ لیکن رجب علی خاں صاحب نے اندور آنا گوارا نہ کیا، اور جواب

بجوا دیا کہ اتنی طویل مدت کی آوارگی میں تھوڑی دیر کی ملاقات سے خلل پڑ جائے گا۔ اس لئے بہشت ہی میں دونوں کی ابدی ملاقات ہوگی۔ ظاہر ہے استاد اللہ دیا خاں صاحب کو بہت مایوسی ہوئی ہوگی، لیکن حقیقی فن کار ذاتیات سے بالاتر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب اللہ دیا خاں صاحب کا آخری وقت آیا تو انھوں نے اپنے بیٹے منجی خاں کو نصیحت کی "بیٹا! تم ہندوستان کے اور موسیقی کاروں کو چاہے سنو یا نہ سنو، لیکن رجب علی کو ایک بار ضرور سنو۔ گانے والوں میں ایک ہیرا ہے" استاد اللہ دیا خاں صاحب بھی شہنشاہِ موسیقی تھے، اور اپنے زمانے کے بے مثال نے کار تھے۔ رجب علی خاں کے فن کے بارے میں اُن کی یہ رائے بہت بڑا خراجِ تحسین ہے۔

—— ویسے خاں صاحب بھی استاد اللہ دیا خاں صاحب کے ہمیشہ مداح رہے ہیں، اور اُنھیں باکمال فن کار تسلیم کرنے سے کبھی احتراز نہیں کرتے۔

طبیعت میں بے باکی اور استغنا بھی بہت ہے جو صوفیا کا خاصہ تھا۔

ایک بار اپنے محسن مہاراجہ صاحب کولھاپور کا رقعہ لے کر ... پہنچے۔ دستور کے مطابق نواب صاحب مرحوم کے اُستاد ... خاں کے توسط ہی سے شرف باریابی حاصل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ رجب علی خاں صاحب جب ... خاں صاحب کے یہاں پہنچے تو فرشی سلام کرنے کی بجائے اُنھوں نے معمولی سے آداب وکورنش پر اکتفا کی اور بلا تکلف اُس نفیس کرسی پر جا بیٹھے جو اُن کے لئے متعین نہیں تھی۔ دوسری جسارت یہ کی کہ حقہ کے کش بھی لگائے۔ اُستاد ... خاں صاحب کی ساختی طبع نازک پر یہ اکھڑ پن بار گزرا، اور برہمی کا اظہار دورانِ تعارف میں یوں کیا "آپ اُنھیں مغلو خاں صاحب کے فرزند سعید ہیں جو بھونڈا بین بجاتے تھے" اِس اہانت آمیز طنز کو بھلا اُستاد رجب علی خاں صاحب کیوں کر برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ فوراً جواب دیا" ....
بجانے والوں سے تو وہ کافی اچھا بجا لیتے تھے" ... خاں صاحب خفا تو بہت ہوئے لیکن وہ کر ہی کیا سکتے تھے، کولھاپور رئیس کا رقعہ جو تھا۔ نواب صاحب کے حضور میں باریابی ہوئی، اور انھوں نے بہ نفس نفیس گانا سنا کر رجب علی خاں صاحب سے رائے طلب کی۔ خاں صاحب نے حقیقت عرض کی "رئیسوں میں حضور کی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا" نواب صاحب نے پھر دریافت کیا "یہ بتاؤ گانے والوں میں ہم کیسا گاتے ہیں؟" خاں صاحب نے مصلحت اندیشی کو بالائے طاق رکھ کر بلا جھجک عرض کیا: "حضور! گویّوں کے تو بچے بھی آپ سے اچھا گا لیتے ہیں" اِس پر نواب صاحب نے برافروختہ ہو کر کہا: "اگر تم کولھاپور رئیس کا رقعہ نہ لائے ہوتے تو ابھی گولی کا نشانہ بنا دیئے جاتے" اور قہراً و جبراً ۵۰۰ روپے دلوا کر خاں صاحب کو رخصت کر دیا۔ تنک مزاجی کی ایک دوسری مثال یہ ہے کہ اندور رئیس کی طرف سے چونکہ خاں صاحب کو دو ہزار کا سالانہ وظیفہ ملتا تھا، اس لئے ایک سال خلاف معمول جب یہ رقم پوری نہیں ملی تو جتنی رقم خاں صاحب کو ملی تھی وہ سب وہیں اندور میں غریبوں کو بانٹ دی، اور اپنے وطن دیواس چلے گئے۔ مہاراجا تکوجی راؤ کو جب اِس کا علم ہوا تو خاں صاحب کو بلوا کر پوری رقم دلوائی۔

خاں صاحب طبیعت کے بڑے فیاض اور لا اُبالی واقع ہوئے ہیں۔ دولت سے اُنھیں بیر ہے۔ ۱۹۲۷ء میں کولھاپور رئیس کے جشن تاج پوشی سے قبل خاں صاحب کو عمدہ لباس وغیرہ ضروریات کے لئے پانچ ہزار دیئے گئے تھے، لیکن اتنی بڑی رقم اُنھوں نے نہ معلوم کن کن مدوں پر خرچ کر دی، اور جشن میں شرکت کے لئے اپنے احباب سے روپے لے کر لباس بنوایا۔ کولھاپور رئیس نے دو ہزار کی مزید رقم خاں صاحب کو عطا کی۔ اس تقریب میں خاں صاحب کے دو شاگردانِ سعید مسٹر کرشن راؤ مزومدار اور امانت خاں مرحوم بھی شریک ہوئے تھے اور ہر دو فن کاروں کو ایک ایک ہزار ایک کے عطیوں سے نوازا گیا تھا۔ مسٹر مزومدار ان دِنوں اسسٹنٹ سول انجینئر کی حیثیت سے دھار (مدھیہ بھارت) میں مقیم ہیں اور ابھی چند ماہ قبل اِنھیں کے اصرار پر خاں صاحب موصوف دھار تشریف لائے تھے اور جلسۂ تہنیت میں خاں صاحب نے تین گھنٹے مسلسل اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسّی بیاسّی سال کی عمر ہونے کے باوجود بھی خاں صاحب جوانوں کا سا دم خم رکھتے ہیں۔ اُن کی تانوں میں برق و رعد کی سی تڑپ اور گرج ہے۔ کولھاپور رئیس اگر انھیں "دکن کا شیر" کہتے تھے تو وہ حق بجانب تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کولھاپور دربار نے خاں صاحب کو بہت نوازا ہے اور ان کے فن کی سرپرستی اور قدردانی کے سلسلے میں ۵۳ ہزار روپے خرچ کئے ہیں۔

خاں صاحب بڑے ملنسار اور ظریف الطبع ہیں۔ اُن کا چلن سادہ ہے اور رہن سہن پرانے درباریوں جیسا۔ اپنے دوسرے محسن مہاراجا دیواس

کا عطا کیا ہوا وکنی عمامہ انھیں بہت عزیز ہے۔ خاص خاص تقریبوں میں حتیٰ کہ دلی کے جمہوری دربار موسیقی میں بھی یہی عمامہ اُن کے سر کی زینت بنا ہوا تھا۔ اردو کے علاوہ مرہٹی بولنے کا بھی خان صاحب کو خوب ملکہ ہے۔

خان صاحب کا خیال ہے کہ ہندوستان میں موسیقی کی ریاضت آج کم ہوتی جا رہی ہے، اور فن کی سچی تعلیم استادہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ طویل ریاضت اور مسلسل مشق ہی فن میں پختگی کی ضامن ہے۔ کلاس روم کے طرز کی تعلیم کے وہ حامی نہیں ہیں۔ اس قسم کی تعلیم سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید تو ہوسکتے ہیں لیکن فن میں کوئی فضل و کمال حاصل نہیں کرسکتے اسی لئے فن کا معیار گرتا جارہا ہے۔ اور پرانے زمانے کا سا اعلیٰ معیار عنقا ہوگیا ہے۔ خان صاحب استادوں کی انفرادیت اور فن کی کیفیت کے قائل ہیں۔

گھریلو صنعتوں کی ترقی

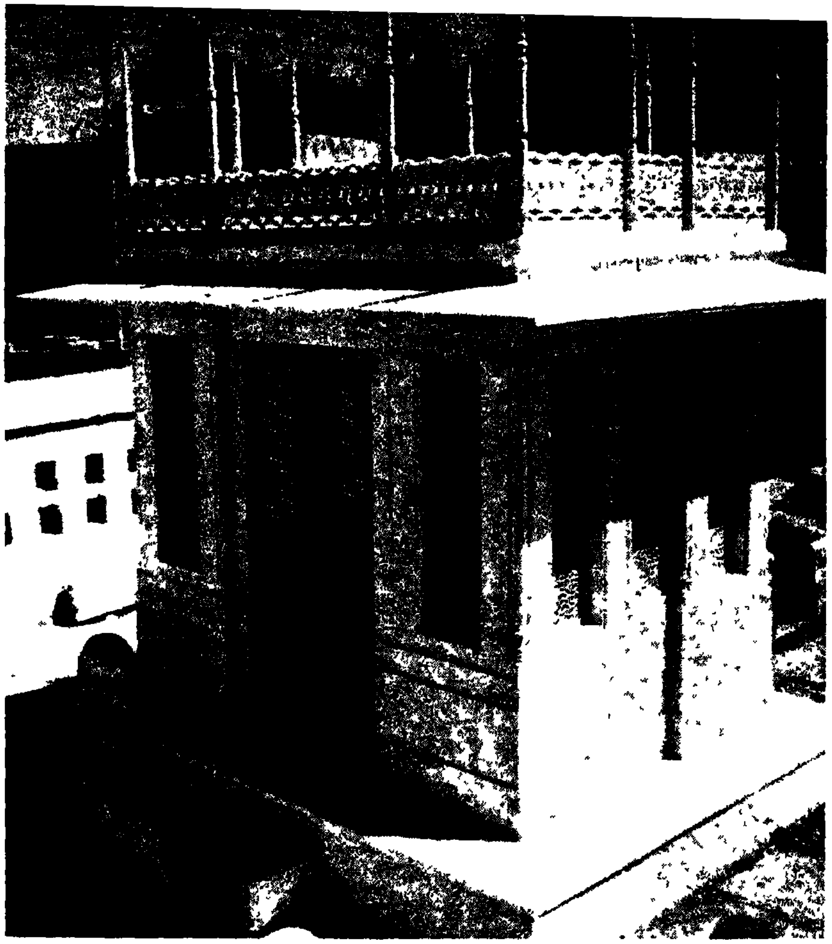
مرکزی حکومت کی طرف سے مزید امداد

حکومت ہند نے دستی کرگھے، گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی ترقی کے سلسلے میں مزید قرضے اور مالی امداد دی ہے۔ چنانچہ اُتر پردیش کو کرگھے کی صنعت کی ترقی کے لئے ۲۰۹۱۳۲ روپیہ کی امداد دی گئی ہے۔ میسور کو ۲ لاکھ روپیہ قرض اور ۴۵ ہزار روپے کی مالی امداد دی گئی ہے۔ قرض کی رقم میں سے پارچہ بافوں کی کوآپریٹیو سوسائٹیوں کو سرمایہ کاری کے لئے قرضے دئے جائیں گے اور مالی امداد سے کرگھے کی پیداوار فروخت کرنے کی غرض سے سرکارا، منگلور اور ہبلی میں تین الریاستی ڈپو کھولے جائیں گے۔

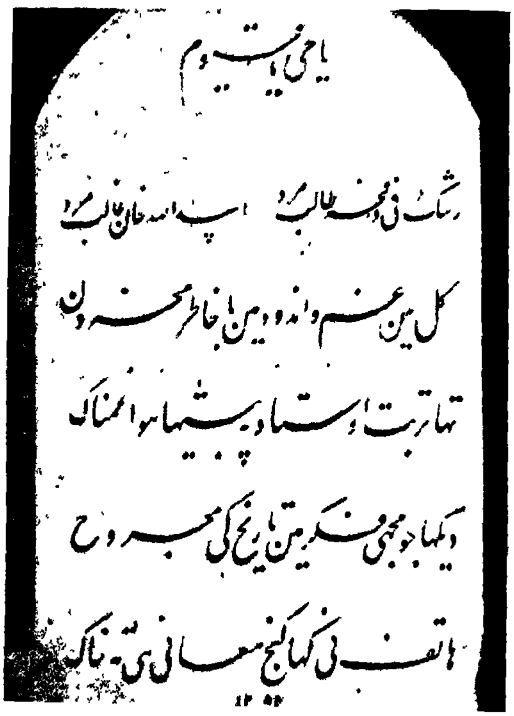
مدھیہ بھارت کو جاؤرا میں صنعتی تربیت کا مرکز قایم کرنے کی غرض سے ایک لاکھ ۲۴ ہزار روپے کی مالی امداد دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں چھوٹی چھوٹی مختلف صنعتوں کی ترقی کے سلسلے میں ۱۱۳۷۹۰ روپیہ کی امداد اور ۶۰ ہزار روپیہ قرض دیا گیا ہے، ان رقوم میں سے ۷۶۸۲۵ روپے کی مالی امداد اور ۳۰ ہزار روپیہ بطور قرض دیواس، نرسنگھ گڑھ اور اندور میں چمڑے کی دباغت کے موجودہ کارخانوں کی توسیع و ترقی میں صرف کیا جائے گا۔ اور بھنڈ میں ایک نئی ٹینری قایم کی جائے گی۔ رائے گڑھ میں بڑھئی کے کام کے مرکز کو ۲۵۹۶۵ روپے کی امداد اور ایک ہزار روپیہ قرض دیا گیا ہے۔ مالی امداد اور قرض کی باقی ماندہ رقوم کو جفت سازوں کی کوآپریٹیو سوسائٹیوں کی ترقی کی مد میں بطور امداد اور قرض دینے کے لئے استعمال کیا جائے گا۔

اڑیسہ کو ڈیڑھ ہزار روپیہ کی امداد آہن گری، ٹین گری اور ڈھلائی کی شاپ کی سرمایہ کاری کے لئے دیا گیا ہے۔

کھجور کے گڑ کی صنعت کی ترقی کے لئے آل انڈیا کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز بورڈ کو ایک لاکھ روپیہ قرض دیا گیا ہے۔ کھادی کے کارکنوں کو اوزاروں وغیرہ کی قیمت پر کٹوتی دینے کی غرض سے بورڈ کو پچاس ہزار روپے کی اور بھی امداد دی گئی ہے۔

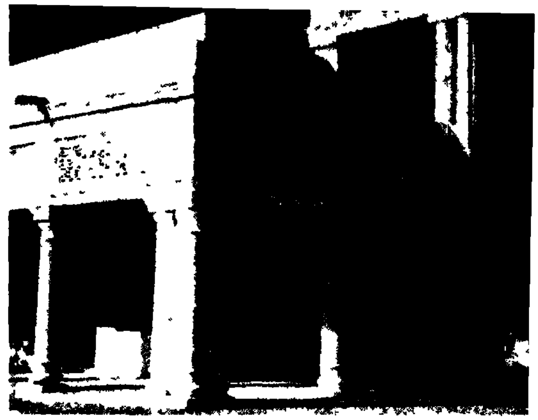


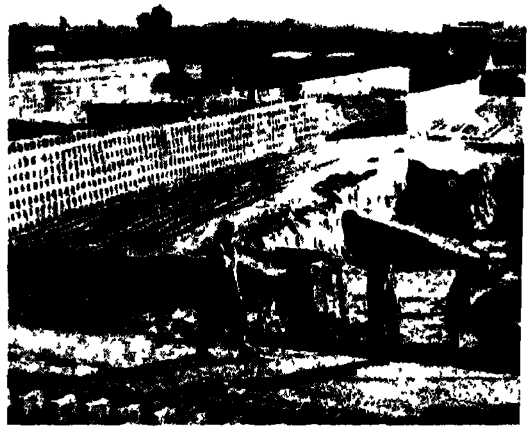
مرزا غالب کے مزار پر سنگ مر
کی چھتری حال ہی میں غال
سوسائٹی کی طرف سے تیار ہوا
ہے -



مزار غالب کا کتبہ
مہدی مجروح کا قطعہ تاریخ اس پر کندہ ہے







موضع کھوگا (دھلي) میں

ھلي کے ایک گاؤں میں خود دیہاتیوں کا تعمیر کردہ
ایک کمیونٹي سنٹر
اینٹوں کے بھٹے تعمیرات کي ترقي کا نشان ہیں

دھلي کے دیہات میں ٹڈي دل کو مارنے کے اقدامات

یوں کو امراض سے بچانے کے سادھن کئے جا رہے ہیں







کنواں



دیہاتی عورتیں نقاشی میں ماہر ہوتی ہیں
تصویر میں ایک عورت اپنے گھر کی دیوار کو سجا رہی ہے

دیہاتی ایک نالے کی مٹی نکال رہے ہیں



دیہات کی وضع کو سدھارنے میں عورتیں بھی اپنا حصہ ادا کر رہی





مشہور ماہر موسیقی استاد رجب علی خان راشٹرپتی سے
فن موسیقی کا انعام حاصل کر رہے ہیں

آج کل میں لکھنے والے

ممتاز حسین



رام لعل ورما
ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز دہلی سٹیٹ



نشور واحدی



خلیل الرحمٰن اعظمی

بہ ہنگامِ وصل

آج پھر کیٹس کی اک حسین نظم کی دُھن میں مُجھ کو وہی گیت گانا پڑا
لو کہ ہنگامِ وصل آج آ ہی گیا، اپنا گھر آج مُجھ کو بسانا پڑا
یہ اُداسی، یہ افسردگی، یہ تھکن، تھے خزاں کے کئی اور بھی مرحلے
سوچتا ہوں کہ ان سب کو رُخصت کروں، آرہے ہیں بہاروں کے اب قافلے
لے مری زندگی کے جواں ولولو! آؤ اب مجھ سے کچھ عہد و پیماں کرو
اب بھی جو وادیاں ہیں مری منتظر، اُن میں چلنے کا بھی کوئی ساماں کرو
یہ تو سچ ہے کہ چلتے ہوئے راہ میں، کوئی چشمہ، کوئی کُنج، سایہ کوئی
اپنی جانب بُلاتا ہے رہگیر کو، چھیڑتا ہے کوئی نیند کی راگنی
کچھ سکوں، کچھ نشہ پا کے انسان سے چھوٹ جاتا ہے یہ وقت کا سلسلہ
موت رہتی ہے اس وقت کی منتظر، ہے فنا کا اسی سمت سے راستہ
لیکن ایسے بھی ہوتے ہیں کچھ راہرو، ساتھ جن کے ہو کوئی متاعِ گراں
ایک نوخیز و نورستہ جنسِ ہُنر، یا ادھورا سا اک خوابِ عشقِ بُتاں
ایسی چنگاریاں جو تہِ خاک بھی گرم رکھتی ہیں ہر نبضِ احساس کو
یہ بھری نیند سونے نہ دیں گی کبھی جیسے کھٹکا لگا کوئی رہزن کا ہو
میں بھی کچھ دیر سویا تو پھر کیا ہُوا، ایسا لگتا ہے کچھ تازہ دم ہو گیا
گردِ سب راستے کی جو تھی ڈھل گئی، سر پہ اک بوجھ سا تھا جو ہلکا ہُوا
اب نئے موڑ پر آ کے ذہنِ رسا کہہ رہا ہے کہ چلنا ہے جس دیس کو
آ گئی ہیں اُسی دیس کی اب حدیں، اب اُسی آستانے پہ سجدہ کرو
اس زمیں کے لئے ہے یہ جنسِ گراں، یہ متاعِ ہُنر اور یہ طبعِ رواں
میرے پیارے یہی ہے تمھارا نگر، پا سکوگے یہیں لمحۂ جاوداں

رام لال ورما

گاؤں

ہندوستان دیہات میں بستا ہے۔ کیونکہ اس کی تقریباً ۸۵ فیصدی آبادی دیہاتیوں پر مشتمل ہے۔ اور کم و بیش ۷۰ فیصدی کا انحصار کھیتی باڑی پر ہے۔

ہندوستان میں تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ گاؤں ہیں۔ دیہات کی اس قدر بھاری تعداد کے مقابلے میں شہروں اور قصبوں کی تعداد محض حقیر معلوم ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ کسی بھی پہلو سے لیجئے۔ مجلسی، تمدنی یا اقتصادی۔ ہمارے دیس کی ترقی کا انحصار اولاً اور لازماً دیہات کی ترقی پر ہے۔ راشٹرپتا مہاتما گاندھی نے ہندوستانی زندگی کی اس بنیادی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔

"میں تو یہ کہوں گا۔ کہ اگر دیہات کا خاتمہ ہو گیا۔ تو ہندوستان کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ ہندوستان پھر ہندوستان نہیں رہے گا۔ گاؤں کی بحالی کا امکان صرف اس صورت میں ہے۔ جب اس کی لوٹ کھسوٹ اور اس سے ناجائز نفع حاصل کرنے کی کوشش بند کر دی جائے۔ اس لئے ہمیں اپنی توجہ اس بات پر مرکوز کر دینی چاہیئے کہ دیہات اپنی ضروریات کے لئے خود کفیل ہو سکیں"۔

انگریزوں کی عملداری میں

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی کسان ایسی مخلوق ہے۔ جس سے نہایت ہی ناجائز فوائد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ وہ دن رات ایک لادو جانور کی طرح محنت و مشقت کرتا ہے۔ اس کو موسم کی تندی و تیزی کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ مگر اس کے باوجود اسے اس کی محنت کا اس قدر کم پھل ملتا ہے کہ اس کا اور اس کے خاندان کا بمشکل گزارہ ہوتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ انگریزوں کی عملداری میں ہوتا رہا ہے۔ انگریزی راجیہ سے پہلے ہندوستانی دیہات اپنی ضروریات کے آپ کفیل ہوتے تھے۔ چونکہ غیر ملکی حکومت کو غیر ملکی نظم و نسق اور سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام راس آتے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر غیر ملکی حاکموں نے ہندوستانی دیہات کی خود کفیل معاشیات کو تباہ کر کے اسے دوسروں کا دست نگر بنا دیا۔ جن دیہاتی دستکاریوں سے کھیتی کرنے والوں کو مزید آمدنی ہوتی تھی۔ ان کو جان بوجھ کر تباہ کر دیا گیا۔ صرف اسی پر اکتفا نہ کر کے زراعت کو بھی کئی طریقوں سے کمزور ہونے دیا گیا۔ مثال کے طور پر آبپاشی کے وسائل کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ بہت سے جنگلات کو محفوظ رقبہ قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ وہ جنگلات کی دولت سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ ہوئی۔ کہ زمینداروں اور تعلقہ داروں کا ایک درمیانی طبقہ پیدا کر دیا گیا۔ جو پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں اپنے طرزِ عمل سے اپنے آپ کو برٹش گورنمنٹ کے بگڑے بیٹے ثابت کرنے لگے۔ کبھی کبھار مفادِ عامہ کی ایک آدھ مثال کو چھوڑ کر یہ زمیندار اور تعلقہ دار ایک طرف تو غیر ملکی حکومت کو مستحکم کرنے کا باعث بنے اور دوسری طرف انھوں نے کسانوں کا خون چوسنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصے تک تو دیہاتیوں نے اپنی اس زبوں حالی کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کر قناعت کی۔ لیکن جوں جوں سیاسی بیداری میں اضافہ ہوا۔ شائستہ شہریوں کی طرح اپنی حالت پر مضطرب اور بے چین ہو اٹھے۔ دیہاتی دستکاریوں کی تباہی کے بعد زمین پر دباؤ بڑھ گیا۔ اور اس کے حصے بخرے ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہ غیر اقتصادی اکائیوں کی شکل اختیار کرتے گئے۔ جن پر قابض کنبوں کا گزارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ چونکہ کسانوں کے زرعی حقوق محفوظ نہیں تھے اس سے بھی غریب اور ہراساں کسانوں کی مصیبتوں میں اضافہ ہوا۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ ملک میں اکثر قحط پڑنے لگے۔ جن کا نتیجہ موت اور مصیبت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

ان مصائب و آلام کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ کسانوں میں زمینداروں اور غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کے جذبات ابھرنے لگے اور استحصال کی بغاوت

فسادات نیل اور موپلہ غدر وغیرہ مثالیں دیکھنے میں آئیں ۔ یہ تمام واقعات بیسویں صدی کے شروع میں ہوئے ۔ گو اس وقت کے جابر حکمرانوں نے ان تمام بغاوتوں کو نہایت سختی سے دبا دیا ۔ مگر دیہاتیوں کو یہ تلخ حقیقت زیادہ واضح شکل میں نظر آنے لگی ۔ کہ ان کی حالت کس قدر خراب وخستہ ہے اور کہ اس حالت کو تبدیل کرنا کس قدر اشد ضروری ہے ۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس نے بھی جس نے بعد میں ملک کی تحریک آزادی میں رہنمائی کی ۔ شروع شروع میں اپنی اقتصادی سرگرمیاں زمینداروں کے حقوق کی حفاظت تک ہی محدود رکھیں ۔ چنانچہ اس نے مطالبہ کیا ۔ کہ استمراری علاقوں میں بھی زمینداروں کو دوامی پٹے داری کے حقوق حاصل ہونے چاہئیں ۔ یہ صرف بیسویں صدی کے دوسرے دس برسوں کی بات ہے کہ جب کانگریس نے اپنے آپ کو کسانوں کے حقوق کی پاسبانی کے کام سے وابستہ کیا ۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء کے شروع میں ایک کسان سبھا قائم کی گئی ۔ جو اپنی قسم کی پہلی جماعت تھی ۔ اس سبھا کے زیر اہتمام ایک میمورنڈم طیار کیا گیا ۔ جو ہزاروں کسانوں کے دستخطوں سے اس وقت کے وزیر ہند مسٹر ایڈون سموئیل مانٹیگو کو جو ان دنوں ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے پیش کیا جانا تھا ۔ مگر مسٹر مانٹیگو نے کسانوں کے وفد سے ملنے سے انکار کر دیا یہ تھی ابتدا کسانوں کے لئے اپنے آپ کو ملک کی تحریک آزادی کے ساتھ وابستہ کرنے کی ۔

تاریخی پس منظر

غیر ملکی حملہ آور اس دیش میں آئے ۔ اور چلے گئے ۔ بڑی سلطنتیں معرض وجود میں آئیں ۔ اور ختم ہو گئیں ۔ راجدھانیاں بنیں ۔ شان وشوکت حاصل کی اور پھر کھنڈروں میں بدل گئیں ۔ مگر ہندوستان کے دیہات میں زندگی کے دھارے پر ان تبدیلیوں کا کوئی اثر نہ ہوا ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے دیہات کا اپنا مجلسی اور اقتصادی نظام تھا یہ جمہوری بھی تھا اور مرکز سے بے تعلق بھی ۔ اس نظام کی بنیاد تھی دیہاتی پنچایت ۔ حکومت خود اختیاری کا یہ ادارہ ہندوستان میں صدیوں سے چلا آتا ہے ۔ شری آر ۔ بی دت نے اپنی کتاب "ہندوستان اقتصادی تاریخ" میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے دیہاتی پنچایتوں کا رواج ہوا ۔ اور دنیا کے تمام ممالک کی نسبت سب سے زیادہ دیر اس ملک میں چلا[1] ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں دیہات کو ویدک زمانہ سے ہی نظم ونسق کی بنیادی اکائی سمجھا جاتا رہا ہے ۔

مہابھارت ۔ منوسمرتی ۔ کوٹلیہ کے دو نوشاستر اور والمیکی رامائن میں بھی ہندوستان کے خود کفیل دیہاتی مجلسی واقتصادی نظام کا ذکر آتا ہے غیر ملکی سفیروں وسیاحوں مثلاً میگا ستھنز (یونان) اور ہیون سانگ وفاہین (چین) نے بھی اس بات کی شہادت دی ہے کہ ہندوستان کے دیہات اس وقت کے مروج اقتصادی وعصبی نظام کے تحت بہت خوشحال تھے ۔ اس نظام کی بنیاد دیہاتی پنچائتیں یا دیہاتی جمہوریے تھے ۔ دسویں صدی کی ایک پرانی پستک شنکر آچاریہ کی نیتی سار میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ترکوں اور افغانوں کی آمد سے پہلے اس ملک کی نیتی کیا تھی ۔ اس کتاب میں درج ہے ۔ کہ "دیہاتی پنچایتوں کو انتظامیہ اور عدالتی اختیارات حاصل تھے ۔ اور سرکاری افسر پنچایت کے ممبروں کا بہت ہی احترام کرتے تھے یہی پنچایتیں زمین تقسیم کرتی تھیں ۔ اور یہی لوگوں سے لگان وصول کرکے گاؤں کی طرف سے سرکاری حصہ ادا کرتی تھیں ۔ کئی گاؤں کو ملا کر ان کی ایک اور ملھیہ پنچایت ہوا کرتی تھی ۔ جو ماتحت پنچایتوں کے کام کی نگرانی کرتی تھی ۔ اور ضرورت پڑنے پر ان کے معاملات میں مداخلت کرکے انھیں سدھار دیتی تھی ۔

سر چارلس مٹکاف نے جو ان دنوں ہندوستان کے قائمقام گورنر جنرل تھے ۔ ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ (۱۸۳۲ء) میں لکھا ہے دیہاتی پنچایتیں چھوٹے چھوٹے جمہوریے ہیں ۔ جن کو وہ تمام اختیارات حاصل ہیں ۔ جن کی انھیں اپنے دائرۂ اختیارات میں ضرورت ہے ۔ وہ قریباً ہر قسم کے خارجی اثر ورسوخ سے مبرا ہیں ۔ ان کی زندگی دیرپا ہے ۔ جہاں اور کئی ادارے ختم ہو جاتے ہیں یہ قائم ہیں سلطنتیں یکے بعد دیگرے ختم ہو جاتی ہیں ۔ انقلاب کے بعد انقلاب آتے ہیں ۔ مگر دیہاتی زندگی ایک ہی دھارے پر بہے چلی جاتی ہے . . . . اس لئے میں چاہتا ہوں ۔ کہ دیہات کے دستور وآئین کو کبھی نہ چھیڑا جائے ۔ اور مجھے ہر اس چیز سے ڈر لگتا ہے جو اس دستور وآئین کو توڑنے کا رجحان رکھتی ہے ۔

---

[1] کانگریس کی دیہاتی پنچایت کمیٹی ۱۹۵۴ء کی رپورٹ صفحہ ۹

لیکن برطانوی نظم ونسق کے آجانے کے بعد دیہاتی پنچایتوں کا یہ نظام درہم برہم ہوگیا۔ زرعی سسٹم کی جگہ رعیت واری سسٹم رائج کر دیا گیا۔ دیہاتی پنچایتوں کے انتظامیہ اور عدالتی اختیارات چھین کر سرکاری افسروں کے ہاتھ میں دے دئے گئے۔

آزادی کے حصول کے بعد اب دیہاتی پنچایتوں کے نظام کو پرانی بنیادوں پر بحال کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اور یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ دیہات کو کم سے کم علاقائی طور پر اقتصادی اعتبار سے خودکفیل بنا دیا جائے۔

مجلسی و اقتصادی زندگی

رقبے اور آبادی کے لحاظ سے ہندوستانی دیہات میں وہی فرق ہے جو قصبوں اور شہروں میں ہے۔ دیہات کا رقبہ ½ مربع میل سے تین یا چار مربع میل تک ہوتا ہے۔ اور آبادی ۲۰۰ یا اس سے بھی کم سے لے کر ۲۰۰۰ یا اس سے بھی زیادہ تک ہوتی ہے۔ دیہات میں لوگوں کا سب سے بڑا پیشہ کھیتی باڑی ہوتا ہے۔ دیہاتیوں کی اکثریت کھیتی کرنے والے مزدوروں پر مشتمل ہوتی ہے جن کی اپنی کوئی زمین نہیں ہوتی۔ یہ لوگ کھیتوں میں اُجرت پر کام کر کے اپنی روزی کماتے ہیں۔ کچھ اور چھوٹے موٹے کاروبار بھی ہوتے ہیں۔ جو دیہاتی کرتے ہیں۔ مثلاً

بڑھئی کا کام
لوہار کا کام
جولاہے کا کام
چرخہ کاتنا
جوتے بنانا اور چمڑے کا دیگر کام
کمہار کا کام .... اور ٹوکریاں بننا وغیرہ

ہندوستان کا دیہاتی دیگر زراعتی ملکوں کے دیہاتیوں کی طرح روایتی طور قدامت پسند ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اُسے جدید قسم کے سائنسی ایجادوں اور ترقیوں سے جلدی روشناسی نہیں ہوتی۔ یہ باتیں انسان کو قسمت یا تقدیر پر رضا کر رہنے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنانے میں مدد دیتی ہیں

دیہاتی علاقوں میں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب ماسوائے دہلی سوراشٹر یا بمبئی جیسی ریاستوں کے جہاں شہری آبادی زیادہ ہے۔ شہروں کی نسبت بہت کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے ہندوستان کے لئے پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب اس قدر کم یعنی ۱۶٫۶ فیصدی ہے۔

ذات پات کا سسٹم جو وقت کی ضرورتوں اور حالات کے کارن مسخ ہو کر ہماری مجلسی زندگی کے لئے مضرت رساں ثابت ہوا ہے۔ شہروں کی نسبت دیہات میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود پرانے زمانے میں ہمارے سماج کے ساتھ ساتھ جس کی بنیاد دیہاتی پنچایتوں پر تھی ذات پات اور مشترکہ خاندان کا نظام اچھی طرح چل رہے تھے جیسا کہ ہمیں نیتی سار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے سرکاری تقرر کرتے وقت کام۔ کیرکٹر اور قابلیت کا خیال رکھا جاتا تھا۔ ذات پات اور خاندان کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ غیر ملکی حکمرانوں کے وقت میں ہمارا مجلسی نظام ٹوٹ گیا۔ ذات پات کے سسٹم کی تمام خوبیاں ختم ہوئیں۔ اور یہ لوگوں کے لئے خاص طور پر دیہاتی لوگوں کے لئے ایک امٹ مصیبت یا بدعت بن گیا۔ مگر حصول آزادی کی جد وجہد کے دوران میں اور سیاسی آزادی ملنے کے بعد دیہاتی آبادی زیادہ فراخ دل اور ترقی پسند بن گئی ہے ہمارے دستور میں چھوت چھات کو قطعی طور پر خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے۔ اور ذات پات عقیدے یا مذہب کو کسی عہدے پوزیشن یا حق حاصل کرنے کا معیار قرار نہیں دیا گیا۔

زرعی اصلاحات

دیہات کی جو زیادہ تر کھیتی باڑی پر دارومدار رکھتے ہیں۔ ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ دو باتیں یعنی زرعی حقوق کا غیر محفوظ ہونا اور گورنمنٹ اور کسان کے درمیان ایک درمیانی طبقے یعنی زمینداروں کی موجودگی ہے۔ ہندوستان میں زمین کی پٹے داری کے تین بڑے طریقے رائج ہیں۔ "پہلا زمینداری" جس کے تحت ایک یا ایک سے زیادہ اشخاص مشترکہ طور پر ایک بڑی بھاری جاگیر کے مالک ہوتے ہیں اور وہی مالیہ اراضی کے ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ سسٹم زیادہ تر مغربی بنگال بہار اور آسام کے کچھ حصوں اڑیسہ، مدراس اور اتر پردیش میں رائج ہے۔ محال داری یا مشترکہ دیہات کے ماتحت زمین کی ملکیت گاؤں والوں کی ہوتی ہے۔ اور گاؤں والے مشترکہ طور سے یا انفرادی طور پر مالیہ اراضی کے ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ مدھیہ پردیش، پنجاب اور اتر پردیش کے کچھ حصوں میں رائج ہے۔ رعیت داری کے طریقے کے تحت زمین کے انفرادی مالک مالیہ اراضی ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ بمبئی اور مدراس میں رواج ہے*۔

* انڈیا ۱۹۵۳ء صفحہ ۲۶۲

حصول آزادی کے بعد ایسے قوانین وضع کئے گئے ہیں جن کا مقصد کسانوں کے حقوق کو مستحکم اور محفوظ کرنا اور درمیانی طبقے یعنی زمینداروں کو ختم کرنا ہے قریباً تمام ریاستوں میں خاتمہ زمینداری کے قوانین پاس کئے جا چکے ہیں۔ اور درمیانی طبقے کے خاتمے کا اصل کام یا تو مکمل کیا جا چکا ہے یا کیا جا رہا ہے* کچھ ریاستوں میں مزارعان کے حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے قدم اٹھائے جا چکے ہیں۔ اور باقی ریاستوں میں ایسا کیا جا رہا ہے۔

پانچ سالہ پلان میں بھی زرعی اصلاحات اور دیہات کی تعمیر نو کی ایک جامع پالیسی وضع کی گئی ہے۔ اس پلان میں مندرجہ ذیل بڑے بڑے امور کی سفارش کی گئی ہے۔

(۱) خاتمہ زمینداری کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا۔ اور ایک ایسی مضبوط ایڈمنسٹریٹو مشینری قائم کرنا۔ جو زمینداری کی جگہ لے سکے۔

(۲) آئندہ کوئی کسان اپنے پاس کس قدر زیادہ سے زیادہ زمین رکھ سکتا ہے۔ اس کا تعین کرنا۔

(۳) لگان کی کمی اور زرعی حقوق کا تحفظ

(۴) ایک کسان ذاتی طور پر کس قدر زیادہ سے زیادہ زمین جوت سکتا ہے۔ اس کا تعین کرنا۔

(۵) مزارعان کو زمین کے حقوق ملکیت دلانے کے لئے قدم اٹھانا

(۶) چک بندی کے پروگرام کو تیز کرنا نیز یہ تعین کرنا کہ کسی کسان کے پاس کم سے کم کس قدر زمین ہونی چاہیئے تاکہ تقسیم در تقسیم کو روکا جا سکے۔

(۷) زمینوں کے انتظام کے متعلق قانون بنانا۔ تاکہ فالتو زمین کو سرکاری قبضے میں لا کر ان لوگوں کو کاشت کے لئے دی جائے جو کھیتی باڑی کرنا چاہتے ہیں اور جن کے پاس کوئی زمین نہیں۔

(۸) کھیتی باڑی کے لئے کواپریٹو سوسائیٹیوں کی ترقی اور حوصلہ افزائی

(۹) دیہات کے نظم و نسق کو بھی کواپریٹو لائنوں پر چلانا۔ اور زمین کے انتظام گاؤں کے نظم و نسق کے لئے گاؤں پنچایتوں کو اختیارات دینا۔

(۱۰) مرکز میں زرعی اصلاحات کے لئے ایک آرگنائزیشن کا قیام

مجلسی و اقتصادی حالات جو اکثر تاریخی واقعات سے پیدا ہوتے ہیں۔ نہ صرف مختلف ریاستوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی ریاست کے مختلف حصوں میں بھی ان میں فرق ہوتا ہے۔ اس لئے تمام ریاستوں میں ایک ہی قسم کے زرعی اصلاحات کے قوانین بنانا ناممکن ہے۔ لیکن بنیادی طور پر زرعی اصلاحات کی ہر جگہ کوشش کی جا رہی ہے۔

* ہندوستان میں زرعی اصلاحات جنوری ۱۹۵۴ء صفحہ ۴۳۳

چک بندی

مختلف ریاستوں میں کسی ایک آدمی کے پاس کم سے کم زمین کس قدر ہے اس کا پیمانہ مختلف ہے۔ مگر اوسط قریباً ۵ ایکڑ ہے۔ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق بمبئی میں ۱۰۷ ایکڑ اور مدراس میں ۴۱۴ ایکڑ فی کس ہے مدراس کے معین دیہات، بہار اور مغربی بنگال کے بعض حصوں میں ایگریکلچرل لیبر انکوائری کی رپورٹ کے مطابق جو سنہ ۱۹۴۹ء میں کی گئی۔ اکثر لوگوں کے پاس ۲ ایکڑ سے کم زمین ہے۔ اس قدر کم زمین کا ہونا اور بعد میں اس کے بھی حصے بخرے ہو جانے سے اس قدر کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی۔ کہ جس پر کوئی کنبہ اچھی طرح گزر بسر کر سکے۔ اس سے کھیتی باڑی کا خرچہ بھی زیادہ پڑتا ہے۔ اور کسان اور اس کے مویشیوں کو پورا کام اور روزی بھی نہیں مل سکتی*

سنہ ۱۹۱۲ء سے چک بندی کے طریقوں کو آزمایا جا رہا ہے۔ یہ طریقہ رضاکارانہ طور پر چک بندی کرانے کے بھی تھے اور جبراً بھی۔ حصول آزادی کے بعد جس طرح زرعی اصلاحات کو تیزی سے عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ اسی طرح کئی ریاستوں میں چک بندی کے کام کو بھی تیز کر دیا گیا ہے۔

یہ کام سرکاری طور سے اور کواپریٹو سوسائٹیوں کی معرفت دو طرح سے ہو رہا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کچھ عرصے زرعی زمین کے متعلق پالیسی کا رجحان یہ رہا ہے کہ ایسے قوانین بنائے جائیں۔ جن سے زمین کے چھوٹے چھوٹے اور غیر اقتصادی ٹکڑے نہ ہونے پائیں۔

کمیونٹی پراجیکٹس

ملک کے مختلف علاقوں میں بہت سی دریائی گھاٹی سکیموں کو پانچ سالہ منصوبے کے تحت عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ اس سے بلا شبہ ہماری اقتصادی ترقی کو بڑی بھاری تقویت ملے گی۔ ان سکیموں کی تکمیل سے جہاں شہروں اور قصبوں کو فائدہ پہنچے گا۔ وہاں آبپاشی کے لئے مزید پانی ملے گا۔ اور دیہات میں گھریلو

* انڈیا ۱۹۵۰ء صفحہ ۲۴۷

دستکاریوں اور گھریلو استعمال کے لئے مزید بجلی دستیاب ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ سیلابوں کی روک تھام ہو جائے گی۔ اور قحط پڑنے بند ہو جائیں گے۔ نئے پراجیکٹس کے تحت کھیتی باڑی کے بہتر آلات۔ بیج اور کیمیائی کھاد وغیرہ کے بآسانی دستیاب ہونے سے بھی زرعی پیداوار میں نسبتاً اضافہ ہو جائے گا۔

اگرچہ بڑے بڑے پراجیکٹس کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے میں کافی مدت لگے گی۔ مگر ۵۵ کمیونٹی پراجیکٹس سکیموں کے جو ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اچھے نتائج نکلنے شروع ہو گئے ہیں۔ ہر ایک پراجیکٹ تین سو دیہات پر مشتمل ہوتا ہے جس کا رقبہ کوئی ساڑھے چار سو ایکڑ سے پانچ سو مربع میل تک ہوتا ہے۔ ہر ایک بلاک میں آبادی اوسطاً ۲ لاکھ اور رقبہ زیر کاشت قریباً ڈیڑھ لاکھ ایکڑ ہے۔

کمیونٹی پراجیکٹ سکیموں کا مشترکہ بنیادی مقاصد حاصل کرنا ہے یعنی دیہات میں آمد و رفت کے وسائل کو بہتر بنانا۔ اچھے مکان مہیا کرنا۔ پرائمری تعلیم کا بندوبست کرنا۔ صحت عامہ کے لئے بہتر سہولتوں کا بہم پہنچانا۔ صفائی کا انتظام بہتر بنانا۔ کھیل کود اور تفریح کے اسباب مہیا کرنا۔ چھوٹی چھوٹی صنعتوں اور دیسی دستکاریوں کی حوصلہ افزائی اور نئے نئے روزگار مہیا کر کے دیہاتیوں کی اقتصادی بدحالی کو دور کرنا۔ کمیونٹی پراجیکٹس سکیموں کو نیشنل ایکسٹنشن سکیموں کے ذریعے تقویت پہنچائی گئی ہے۔ یہ سکیم ہندوستان بھر میں ۱۸۰ بلاکوں میں زیر عمل لائی گئی ہے۔ ان دونوں سکیموں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دیہات کی پیداوار بڑھانے اس پیداوار کو جمع کرنے اور پھر تقسیم کرنے کے سلسلے میں مزید سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

وقت آنے پر دونوں اسکیمیں ملک بھر میں نافذ کی جائیں گی جس سے دیہات زیادہ خوشحال اور پرکشش ہو جائیں گے۔ اس شاندار تبدیلی کا مظاہرہ بعض علاقوں میں جن میں دہلی بھی شامل ہے۔ ابھی سے ہو رہا ہے۔ کم سے کم بعض دیہات میں پکی گلیوں، سرکلر سڑکوں، ہوا دار مکانوں۔ ان میں غسل خانوں، دودھیوں کے انتظام اور کچن میں چمنیوں وغیرہ کے لگ جانے سے حالت ہی بدل گئی ہے۔ ان دیہات میں مکانوں کی دیواروں پر اب سیمنٹ پلستر نظر آتا ہے۔ اور پکی سکول بلڈنگیں ہیں۔ کمیونٹی سنٹر بھی بن گئے ہیں اور گاؤں کے باہر کھاد کے گڑھے کھودنے کے علاوہ درخت لگانے کے لئے زمین بھی مخصوص کر دی گئی ہے۔

اس ضمن میں یہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے کہ کمیونٹی پراجیکٹس کے تحت ہر قسم کی تعمیری سرگرمیوں کی بنیاد "اپنی مدد آپ" کا اصول ہے۔ اور رضاکارانہ طور پر نقدی یا کام کی مدد دینی پڑتی ہے۔ اس طرح دیہات میں اب ایک نئی بیداری پیدا ہو رہی ہے جس سے حب الوطنی کا نیا جوش، اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہ دونوں باتیں تمام تعمیری کوششوں کی بنیاد ہیں۔

دیہاتی دستکاریاں

زمانۂ سلف و زمانۂ وسطیٰ میں ہمارا ملک اپنی خود کفیل دیہاتی زندگی کے لئے مشہور رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے۔ انگریزوں کی عملداری میں ان دیہاتی دستکاریوں کو تباہ کر دیا گیا۔ اگرچہ آج کل ہم تہذیب کے اس دور سے گزر رہے ہیں جسے عام طور پر صنعتی تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن ملک میں افراط اور خوشحالی لانے کے منصوبے بنانے والوں کا خیال ہے کہ یہ مقصد صرف اس حالت میں حاصل ہو سکتا ہے جب دیہات کو خود کفیل بنایا جائے۔ اب کھیتی باڑی پہلے کی طرح سب سے بڑی دیہاتی صنعت ہے۔ یہ انفرادی طور پر اور کنبوں کو بھی سب سے زیادہ کام مہیا کرنے کا باعث ہے۔ سرکاری ملازمتوں کو چھوڑ کر باقی جس قدر لوگ پیداوار بڑھانے کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی بھاری اکثریت یعنی ۸۷ فی صدی کھیتی باڑی پر انحصار رکھتی ہے۔ کھیتی باڑی کے جدید طریقوں سے جو پانچ سالہ پلان کے تحت اختیار کئے جانے ہیں پیداوار میں اضافہ ہوگا اور دیش کی دولت بڑھے گی۔ مگر اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا۔ کہ اس وقت جس قدر لوگ کھیتی باڑی سے روزی کماتے ہیں ان کی تعداد کم ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی اقتصادی ترقی کے لئے پنج سالہ منصوبے میں جو پروگرام وضع کیا گیا ہے اس میں دیہاتی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کو ایک اہم مقام دیا گیا ہے۔

کھادی کو دیہاتی دستکاریوں میں سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے باقی مصنوعات یہ ہیں۔

(۱) پام گڑ
(۲) تیل نکالنے کی دیہاتی گھانیاں
(۳) ہاتھ سے دھان چھڑنے کی دستکاری
(۴) گڑ اور کھانڈ سازی
(۵) شہد کی مکھیاں پالنا
(۶) آٹے کی چکیاں
(۷) ان تیلوں سے جو کھانے کے کام نہیں آتے صابن بنانا

(۸) دستی کاغذ

(۹) دیا سلائی کی گھریلو صنعت

(۱۰) کاتنے اور بننے کی صنعت

ان دیہاتی صنعتوں اور اس قسم کی دیگر صنعتوں کی ترقی کے لئے ایک منضبط اور منظم کوشش کرنے کے لئے حکومت ہند نے ایک آل انڈیا کھادی و دیہی انڈسٹریز بورڈ بنایا ہے - یہ بورڈ ۱۴ر جنوری ۱۹۵۳ء سے کام کر رہا ہے - بہت سی ریاستوں میں بھی اس قسم کے بورڈ بن گئے ہیں - جن میں سے زیادہ تر مشاورتی نوعیت کے ہیں اور کچھ ایک سٹیچوری بھی ہیں - حکومت ہند نے ایک سٹیچوری کمیشن بنانے کے لئے بھی قدم اٹھایا ہے - جو دیہاتی صنعتوں کی ترقی کی کوششوں کو تقویت پہنچائے گا -

آل انڈیا ہینڈی کرافٹ بورڈ کے نام سے ایک اور بورڈ بھی بنایا گیا ہے جو ان دستکاریوں کو تقویت پہنچائے گا - جن کا دیہاتی صنعتوں سے گہرا سمبندھ ہے - دیہاتی دستکار جو کسی وقت اپنی کاریگری کے لئے دنیا بھر میں مشہور تھا - مگر اب جس کی کوئی حیثیت نہیں رہی - ایک مرتبہ پھر اپنی کھوئی ہوئی شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا -

اس سلسلے میں یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا - کہ دیہاتی صنعتوں کی ترقی کے پشت پر تین بنیادی مقاصد ہیں -

(۱) روزگار مہیا کرنا

(۲) استحصال یا دیہات کی لوٹ کھسوٹ کو ختم کرنا - اور

(۳) کوآپریٹو بنیادوں پر صنعتوں کو ترقی دینا - اس طرح سے ایک ایسی سوسائٹی قائم کرنا ہے جس کی بنیاد مجلسی و اقتصادی مساوات پر ہو اور ایسی سوسائٹی جسے کوآپریٹو کامن ویلتھ کا نام دیا جا سکے -

مجلسی فلاح

جو لوگ ہندوستان کو خوش اور خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں - اب اُن کی نظریں دیہات پر مرکوز ہو گئی ہیں - حکومت ہند نے مجلسی فلاح و بہبود کے لئے ایک اور بورڈ سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کے نام سے ۱۹۵۳ء میں بنایا جس کے اغراض و مقاصد میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی ہیں -

(۱) دیہات سے ناخواندگی کو دور کرنا

(۲) دیہات میں مجلسی حالات کو سدھارنا -

(۳) دیہاتیوں کو دستکاریوں کی تربیت دینا -

(۴) دیہات کی صحت و صفائی کو بہتر بنانا -

(۵) زچہ اور بچہ کی بہبود کا انتظام کرنا -

سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ تو زیادہ تر رہنمائی کرنے کے لئے ہے - ریاستوں میں اسی قسم کے جو بورڈ بنائے گئے ہیں - اصل کام وہی کرتے ہیں - ان ریاستی بورڈوں نے کمیونٹی پراجیکٹس اور نیشنل ایکسٹنشن بلاکوں کی طرح اپنے کام کو آسانی سے چلانے کے لئے بلاک بنا رکھے ہیں -

دہلی سٹیٹ کے سوشل ویلفیر بورڈ نے اپنی پہلی ویلفیر سکیم کا آغاز ۱۵ر اگست ۱۹۵۳ء کو یوم آزادی پر اوکھلا گاؤں سے کیا - اس بورڈ کا بڑا مقصد دیہات کی مجلسی و اقتصادی زندگی کو بہتر بنانا ہے -

ہندوستان میں دیہاتی زندگی کا نقشہ کچھ دیگر مجلسی و اقتصادی سرگرمیوں اور تحریکوں سے بھی بدلا جا رہا ہے - ان میں سے سرودے اور بھودان کی تحریکیں سب سے زیادہ اہم ہیں - سرودے سماج کا جو گاندھی جی کے فلسفہ زندگی کے مطابق بنائی گئی ہے مقصد ایک ایسے سماج کا نرمان ہے جس میں اونچ نیچ اور حاکم و محکوم کی تمیز نہ ہو - جس میں تشدد کی کوئی جگہ نہ ہو - اور کوئی شخص کسی دوسرے سے ناجائز فائدہ حاصل نہ کر سکے - ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے سماج کو جس میں کوئی ضروری اور باضابطہ حکومت نہ ہو - اور ہر ایک شخص اپنا حاکم آپ ہو - انارکی کا نام دیں - لیکن درحقیقت یہ جمہوریت کی انتہائی شکل ہے - ہرچند اس قسم کے تصوری دنیا کا قیام ناممکن نظر آتا ہو - لیکن اس قسم کے اعلےٰ و ارفع خیالات بذات خود نیکی کی ایک بڑی بھاری طاقت ہیں - اس لئے سرودے کا آدرش لوگوں کی روش اور سرگرمیوں پر اپنا اثر ڈالے نہیں رہ سکتا -

اس سلسلے میں ایک نہایت ہی قابل عمل اور مستحکم کوشش بھودان کی تحریک ہے - اس تحریک کا مقصد ان لوگوں سے زمین کا دان حاصل کرنا ہے جن کے پاس فالتو زمین ہے اور پھر یہ زمین ان لوگوں میں تقسیم کرنا جن کے پاس کوئی زمین نہیں - مگر جو زمین جوت کر یا دوسرے کھیتی باڑی کر کے گزر اوقات کرنا چاہتے ہیں - اس تحریک کا مقصد جو آچاریہ ونوبا بھاوے نے شروع کی ہے - ۵ کروڑ ایکڑ زمین حاصل کرنا ہے - اس میں سے ۳۴ لاکھ ایکڑ زمین تو اس وقت تک حاصل بھی کی جا چکی ہے - زمین حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسے

تقسیم بھی کیا جا رہا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کو محض رضاکارانہ طور پر۔ اور پُرامن طریقے سے کاشتکارانہ نظام میں تبدیل کرنے کی یہ ایک بڑی بھاری کوشش ہے۔

دیہاتی پنچایتیں

دیہاتی زندگی کے شیرازے کو مضبوط بنیادوں پر بحال کرنے کی طرف سے سب سے زیادہ اہم اور ضروری تبدیلی دیہات میں پنچایتوں کی بحالی ہے۔ انگریزی راج میں پنچایت سسٹم کمزور ہو کر ختم ہو گیا تھا۔ مختلف ریاستوں میں قانون پاس کئے جا چکے ہیں یا کئے جا رہے ہیں جن کا منشا پنچایتوں کو نئے سرے سے منظم کرنا اور نئی ضروریات کے مطابق سانچے میں ڈھالنا ہے۔ پنچایت سسٹم میں عام طور پر ایک منتخب گاؤں سبھا ہوتی ہے۔ ایک نمائندہ مضبوط ایگزیکٹو یعنی گاؤں پنچایت اور ایک جوڈیشل ادارہ یعنی گاؤں عدالت ہوتی ہے۔ توقع کی جاتی ہے۔ کہ پنچایتی نظام کے رائج ہونے کے بعد ایک وقت ایسا آئے گا۔ جب دیہات میں مکمل اور مضبوط پنچایت راج قائم ہو جائیگا۔ ہندوستان کی دیہاتی زندگی سے جاگیردارانہ نظام تو ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے۔ اب کسی دیہاتی کو زمیندار کے ڈکٹیٹرانہ احکام کے سامنے جھکنا نہیں پڑتا۔ اسے اب نوشتہ تقدیر کے سامنے بھی سر تسلیم خم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے تو اب اپنا صحیح مقام حاصل کرنا ہے۔ اسے نہ صرف اپنی تقدیر آپ بنانی ہے۔ بلکہ قوم و ملک کی تقدیر بنانے میں بھی ہاتھ بٹانا ہے۔

ہندوستان اور پولینڈ کے مابین تجارتی معاہدہ کی تجدید

ہندوستان اور پولینڈ کی حکومتوں کے نمائندوں کے مابین موجودہ تجارتی معاہدہ کی تجدید کے متعلق مکتوبات کا تبادلہ ہوا۔ ان مکتوبات پر حکومت ہند کی طرف سے وزارت تجارت و صنعت کے سیکریٹری شری ایچ۔ وی۔ آر۔ آئینگر اور پولینڈ کی حکومت کی طرف سے ہندوستان میں مقیم پولینڈ کے سفیر خاص و مدار المہام ہز ایکسی لنسی مسٹر جرزی گروڈز ینسکی نے دستخط کئے۔

ابتدا میں اس تجارتی معاہدہ پر ۶ رجنوری ۱۹۵۱ء کو دستخط کئے گئے تھے اور اس کی وقتاً فوقتاً توسیع کی جاتی رہی ہے۔ معاہدہ کی اس نئی تجدید پر عمل درآمد یکم جنوری ۱۹۵۵ء سے تصور کیا جائیگا اور یہ سال رواں کے اختتام تک جاری رہے گا۔

اس نئے معاہدے کے ساتھ درآمدی اور برآمدی اشیاء کے متعلق جو شیڈول شامل کئے گئے ہیں وہ بالکل وہی ہیں جو ۱۹۵۴ء میں زیر عمل تھے

ہندوستان سے جو اہم اشیاء پولینڈ کو برآمد کی جا سکتی ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

لوہا۔ خام مینگنیز۔ ابرق۔ چائے۔ قہوہ۔ تمباکو۔ کاجو۔ گرم مصالحہ۔ کمایا ہوا چمڑا اور کھالیں۔ کھیلوں کا سامان۔ دستکاری اور گھریلو صنعتوں کی پیداوار۔ ہندوستانی فلمیں (ایکسپوزڈ)

پولینڈ سے ہندوستان کو جو اشیاء برآمد ہو سکتی ہیں ان میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں۔

مختلف اقسام کی انجینئرنگ مشینری۔ مشینی اوزار۔ ٹریکٹر۔ زرعی مشینری اور اوزار۔ کیمیاوی اشیاء اور ادویہ سرجیکل اور آپٹیکل (آنکھوں سے متعلق) اوزار۔ فوٹوگرافی کے اوزار اور سامان۔ خوردبین۔ پولینڈ کی فلمیں (ایکسپوزڈ)

محمد عبداللہ الہ آبادی

طیور اور نقلِ وطن

یعنی

مہاجر چڑیاں

طائر کو "اڑنے والا پرندہ" کہا جا سکتا ہے اور درحقیقت یہ تعریف نہایت جامع ہے۔ طیور کی زندگی میں "ہجرت" ایک بہت دلچسپ جزوِ حیات ہے۔ یہ ایک تحریک ہے جس میں وسعت، تنظیم اور تواتر قابلِ دید ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ موسمی تبدیلیوں کا اثر بالکل نمایاں ہے۔ انسانی عقل ایک زمانے سے اس پر دنگ ہے۔ قدیم زمانے میں تو بعض قبیلے اپنے کیلنڈر اسی سے بناتے تھے۔ ہم کو اس "نقلِ مکان" کی حقیقت پر غور کرنا ہے۔ لیکن اس کے قبل یہ جان لینا ضروری ہے کہ ارسطو کے زمانے میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ چڑیاں مثلاً گوریا، بلبل وغیرہ، جاڑے موسم میں مینڈکوں کی طرح معتدل خطّے میں بے حس و حرکت پڑی رہتی تھیں۔ اسی وجہ سے یہ چڑیاں سال کے کسی حصّے میں نظر آتی تھیں اور کسی حصّے میں غائب ہو جاتی تھیں۔

نقلِ وطن ایک کامل مبادلہ ہے۔ ایک نشیمن سے دوسرے نشیمن میں۔ لیکن یہ بات پرندوں، مچھلیوں، کیڑوں اور کچھ دیگر حیوانات ہی تک محدود ہے۔ وہ دراصل سال کے مختلف حصّوں میں مختلف جگہوں پر آباد ہو جاتے ہیں۔ پرندوں کا نقلِ وطن ایک موسمی تحریک ہے۔ جو اصولاً ان کے تولیدی مقامات سے جو کہ عموماً سرد خطّوں میں ہوتے ہیں سنئے مقامات تک محدود ہے۔ یہ نئے مقامات بھی اُن کے لئے پرانے ہیں، اور بالعموم گرم خطّوں میں ہوتے ہیں۔ اس لئے ہجرتِ طیور ایک ماحول کی تبدیلی ہے جس سے چڑیاں مختلف سمتوں میں جاتی رہتی ہیں، اور جس کا مقصد ہر زمانے میں معتدل زندگی بسر کرنا ہے۔ ٹڈیوں کا دل بھی کبھی کبھی نکل پڑتا ہے۔ لیکن یہ نقلِ وطن نہیں ہے، بلکہ کثرتِ تعداد کا نتیجہ ہے۔ اس نقلِ مکان کی عادت کو علاوہ اور جانداروں کے ہم پرندوں میں اپنے کمال پر پاتے ہیں۔

چڑیوں کے بدن کی حرارت یکساں رہتی ہے۔ موسمی تبدیلیوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ساتھ ہی ساتھ اڑنے میں کوئی اور جاندار اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اصلِ ہجرت چڑیوں میں بہت بسیط ہے۔ سردی اور گرمی کا اثر اور جانداروں کے مقابلے میں پرندوں پہ کم ہوتا ہے۔ لیکن شدتِ سردی میں غذا کا حاصل کرنا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ ہجرت کی بنا پر چڑیاں ہر موسم میں نہایت ہی موزوں مقامات پر پہنچ جاتی ہیں۔ سب سے لمبا سفر ایک پرند (استرنا مکرورا) کرتی ہے۔ یہ ہر سال قطبین کا چکر کرتی ہے اور تقریباً گیارہ ہزار میل ایک طرف کی راہ ہے۔

یہ ہوائی باشندے طرح طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں بعض چڑیاں جیسے گوریا ہر موسم میں وطن ہی میں رہتی ہیں بعض چڑیا مثلاً بلبل گرم موسم میں ہجرت کرتی ہیں۔ بعض چڑیاں جاڑے کے زمانے میں وطن سے ہجرت کر جاتی ہیں بعض چڑیاں نہ کسی جگہ پر نشیمن بناتی ہیں، نہ کسی جگہ قرینے سے نقلِ مکان کرتی ہیں، بلکہ یوں ہی گھوما پھرا کرتی ہیں۔ کچھ چڑیاں اس طرح کی بھی ہیں کہ اُن کے بعض افراد ہجرت کرتے ہیں اور بعض کہیں نہیں جاتے۔

نقلِ وطن کا وجدان دو وجہوں سے ہے۔ بیرونی ماحول تبدیلی کا اثر جیسے موسم کی تبدیلی کے ساتھ دن رات کے وقتوں میں ردوبدل، یا کوئی اندرونی تحریک ہو جو تولیدی اعضا کی صحت کے لئے ضروری ہو۔ ایسا متعلق چڑیوں میں اکثر دیکھا گیا ہے۔ اس عادت کی بنا پر بہت سی چراگاہوں اور تولیدی مقامات کا انکشاف ہوتا ہے جہاں پر چڑیوں کو غذا مل سکے اور اطمینان سے انڈے دے سکیں۔ چڑیوں کا مقررہ مقامات پر متواتر موسم کی تبدیلی کے ساتھ جانا، ان کی یادداشت اور ذہانت کا پتہ دیتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس عادت کی ابتدا کسی خطرے سے حفاظت یا کسی فائدے کے حصول کی بنا پر ہوئی ہو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حرارت کی تبدیلی اس

عمل کی اصل محرک ہے نسل بڑھانے کے فطری تقاضے کی وجہ سے چڑیاں دوبارہ اپنے وطن لوٹ جاتی ہیں۔ اس طرح سے بعض بچے کار عمر رفتہ اور غیر ضروری چڑیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ ہجرتِ وطن کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے۔

یہ چڑیاں اپنی راہ میں مختلف بلندیوں پر اُڑتی ہیں۔ تین سو سے دو ہزار میٹر تک کی عموماً پرواز ہوتی ہے۔ بعض طیور مثلاً بگلے شب کو پرواز کرتے ہیں جس کی وجہ سے ایک ہزار میٹر سے زیادہ نہیں اُڑ پاتے۔ تیز ہوا یا آندھی کا اس سفر میں بہت اثر پڑتا ہے۔ اگر ہوا کا رُخ موافق ہو تو تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑنے والا پرند چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا سکتا ہے۔ ورنہ اگر مخالف ہوا ہو تو بیس ہی میل کی رفتار رہ سکتی ہے۔

صحیح راہ کا پتہ لگا لینا چڑیوں میں یا تو موروثی امر ہے یا پہاڑوں، وادیوں، ندیوں اور جزیروں وغیرہ سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگر ہم اُن خطرات کا اندازہ کریں جو دورانِ سفر میں درپیش ہو سکتے ہیں تو وہ اُن فوائد کے مقابلے میں جو نقلِ وطن سے حاصل ہوتے ہیں کچھ نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی اکثر ایسی ہی تھکی ہوئی چڑیاں شکاریوں کے جال میں پھنستی ہیں۔ بقولِ آتش

صیاد اسیرِ دامِ رگِ گُل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اُسے آب و دانہ کیا

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مخالف آندھی کی وجہ سے مہاجر چڑیاں بہت نیچے آجاتی ہیں، اور غذا کی کمی و تھکن کی بنا پر منزلِ مقصود تک نہیں جا پاتیں۔ راہ بھی بھول جاتی ہیں، اور بعض دفعہ کسی سمندر کو نہ عبور کر پانے سے اس میں غرق بھی ہو جاتی ہیں۔ رہنما روشنی میناروں سے بھی بہت نقصان پہنچا ہے مثلاً راہ کا بھول جانا، اِدھر اُدھر بھٹک جانا وغیرہ۔ ان خطرات کے باوجود نقلِ وطن میں بہت فوائد ہیں۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ

عزت اُسے ملی جو وطن سے نکل گیا
وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا

جاڑے کی شدت سے چڑیاں محفوظ ہو جاتی ہیں، اور معتدل موسم میں زندگی بسر کرتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جاڑے میں اکثر ابر کی وجہ سے آفتاب کم نکلتا ہے اور چڑیوں کو غذا حاصل کرنے میں جو تکلیف ہوتی، وہ اس سے اس طرح بچ جاتی ہیں۔ شدید سردی سے پانی جم جاتا ہے یا برف باری ہوتی ہے، اُن سب سے چڑیاں محفوظ ہیں۔ اس سفر سے چڑیاں مختلف مقامات پر منتشر ہو جاتی ہیں۔ اس طرح رہائش کی تنگی نہیں ہوتی۔ نئی منزل مقصود پر غذا کی فراوانی میسر ہوتی ہے۔ حضرتِ انسان بھی اس عمل سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اس سے موسمی تبدیلیوں کا نقشہ وغیرہ بنا لیتے ہیں۔ ایسی بہت سی مہاجر چڑیاں چھوڑ دی جاتی ہیں اور اُن کے جسم میں ایک ہلکی مشین باندھ دیتے ہیں، اور جہاں جہاں چڑیاں جاتی ہیں وہاں وہاں کا پتہ نشان خود بخود درج ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے معلوم ہو جاتا ہے کہ پرند سال میں کہاں کہاں گیا۔

معلومات اور اعداد و شمار

۱۔ ۱۹۵۴ء میں ۱۲۰۷۰۲۹۵۰ ریڈیو سیٹ تیار کئے گئے اور ۱۹۵۳ء میں ریڈیو سیٹوں کی پیداوار ۲۲۳۱۲۱۵۶۱ تھی۔ ان اعداد سے ۴۲۴ فیصدی اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔

۲۔ آسام میں دریائے برہم پتر کی وادی میں ناہور کاٹیا میں خام تیل کے روزانہ پانچ سو پیپے تیار کئے جاتے ہیں۔

۳۔ آخر جنوری ۱۹۵۵ء تک ۴۱ ہزار بے گھر لوگوں کو ۹ کروڑ روپیہ بطور معاوضہ دیا گیا

۴۔ گذشتہ سال کے مقابلے میں ۱۹۵۴ء میں ۴۷ ہزار بائیسیکلز زیادہ تیار ہوئیں اور مجموعی پیداوار ۳۸۳۱۳ رہی۔

۵۔ ۱۹۵۳ء میں ہندوستانی انشورنس کمپنیوں نے ہندوستان میں زندگی بیمہ کا جو نیا کاروبار کیا اس میں پالیسیوں کی تعداد ۵۳۵۰۰۰ رہی اور بیمہ کی رقم ۱۔ ارب ۷۳۔ کروڑ ۶۴۔ لاکھ روپے تھی۔

کلیم سہسرامی

انڈونیشیائی شاعری میں آزادی کا تصوّر

جزائر شرق الہند جو عام طور پر ڈچ ایسٹ انڈیز کے نام سے مشہور تھا اسی کو اب جمہوریۂ انڈونیشیا کہتے ہیں یہ تقریباً تین ہزار جزیروں پر مشتمل ہے۔ جہاں تک غیر ملکی سامراج کے تسلّط کا تعلق ہے ہندوستان اور انڈونیشیا کی تاریخ میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے باشندوں کی طرح انڈونیشیا کے باشندوں کو بھی ایک مدّت تک غلامی اور بیچارگی کی زندگی گزارنی پڑی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہندوستان پر انگریز حکمراں رہے اور انڈونیشیا پر ولندیزی اپنا تسلّط جمائے رہے۔

صحت مند ادب اپنی سوسائٹی کا عکاس، اپنے ماحول کا ترجمان اور اپنے ملک کی سیاسی و معاشرتی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس لئے اس بات کا پتہ لگانے کے لئے کہ انڈونیشیائی شاعری میں آزادی کا تصوّر کس راہ سے آیا ہمیں وہاں کی سیاسی و سماجی زندگی کا جائزہ لینا ہوگا۔

جہاں تک تاریخ رہنمائی کرتی ہے ہمیں معلوم ہے کہ انڈونیشیا پر ولندیزیوں کا تسلّط تقریباً ساڑھے تین سو سال تک رہا۔ ولندیزی وہاں ۱۵۹۶ء میں آئے اور ۱۹۴۵ء تک وہ تمام مظالم روا رکھے جو استعمار پسند طاقتوں کا طرۂ امتیاز رہے ہیں۔ لیکن وہاں کے عوام نچلے نہ بیٹھے اور برابر اپنی آزادی کے لئے برسرِ پیکار اور غلامی کا طوق اپنی گردن سے نکال پھینکنے کی کوشش کرتے رہے۔ صرف انیسویں صدی میں تینتیس ۳۳ مرتبہ انڈونیشی عوام نے ولندیزیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا لیکن ناکام رہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں قوم پرست تحریک شروع ہوئی اور ڈاکٹر سوئیکارنو کی قیادت میں انڈونیشی عوام نے ولندیزیوں کے خلاف عدم تعاون کی پالیسی اختیار کی۔ یہ پہلی منظم کوشش تھی جس نے ولندیزیوں کی استعمار پسند طاقت کے دانت کھٹے کر دئے۔ اور انھوں نے یہ محسوس کر لیا کہ اب ان کے قدم وہاں سے اکھڑ رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ انڈونیشی عوام میں آزادی کی جد و جہد نہ صرف زور پکڑتی گئی بلکہ ان کی تنظیم مضبوط بھی ہوتی گئی، چنانچہ ۱۹۲۸ء میں یوتھ کانگریس نے نہایت منظم طور پر "ایک قوم — ایک زبان" کا نعرہ بلند کیا۔ ان کی رگوں میں قومی جذبات موج زن تھے اور ان کے دلوں میں آزادی کی تڑپ تھی۔ یہ قوم پرست ادبی تحریک صرف انڈونیشیا تک محدود نہ تھی بلکہ یہ ایشیائی باشندوں کی ادبی انقلابی تحریک کی ایک شاخ تھی اور اس کا تعلق براہِ راست ایشیائی باشندوں کی اس تحریک سے تھا جو نوآبادیاتی طاقتوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے شروع ہوئی تھی۔

ڈاکٹر تقدیر علی شاہ بنا نے ۱۹۳۳ء میں ایک ماہنامہ "پوجنگا بارو" (نوجوان اہلِ قلم) نکالا اور اس سے متعلق نوجوان اور ترقی پسند اہلِ قلم کی ایک جماعت بنائی، ان میں قومی جذبہ اور ذہنی آزادی کی تڑپ پیدا کی اور بیداری کی روح پھونکی۔ تقدیر علی کی کوششوں سے ان نئے لکھنے والوں میں رفتہ رفتہ سماجی شعور بھی پیدا ہوتا گیا اور جدید ادب کی قدروں کی اہمیت بھی ان پر واضح ہوتی گئی۔ انھوں نے روایت پرستی اور رجعت پسندی کے خلاف منظّم طور پر صدائے احتجاج بلند کی اور پرانی ڈگر سے ہٹ کر اپنے ماحول اور زمانے کے مطابق نئی شاہ راہ پر چلنا شروع کیا، چنانچہ ڈاکٹر تقدیر علی شاہ نے اپنے ایک بیان میں اس امر کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ "ہمیں یورپ، امریکہ اور جاپان کی پیش کی ہوئی مثالوں اور طریقوں پر عمل کرنا چاہیئے، جس کے ذریعے سے انھیں عصرِ حاضر میں عظمت و رفعت حاصل ہوئی، ہمیں پیچھے کی طرف مُڑ کر نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ آگے کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے۔" انڈونیشیا کے ہر دل عزیز شاعر سمارو جو نے "آزادی کا گیت" میں اپنے ملک کو آزاد کرانے کا جو نعرہ بلند کیا ہے اس میں انڈونیشی عوام کے احساس کی شدّت اور قومی جذبے کی تڑپ نمایاں طور پر جھلک رہی ہے۔ ملاحظہ ہو "آزادی کا گیت":

ہم انڈونیشیا کے آزاد باشندے ہیں
ہم اپنے وطن کی آزاد سرزمین پر کھڑے ہیں۔

ہم بندوقوں کی گرج ہیں
آزادی کا استقبال کرتے ہیں
وہ دیکھو، ہمارے بہادر سپاہی لڑ رہے ہیں
وہ منزل کی سمت بڑھتے چلے جا رہے ہیں
ان کے جسم کٹ رہے ہیں
ان کا خون بہہ رہا ہے
وہ اپنی داستان سنہرے حرفوں میں لکھ رہے ہیں
ہمارے دلوں میں
ہمارے بازوؤں میں
یقینی فتح ہے
ہم وطن کو مضبوط اور بلند بنائیں گے۔

انڈونیشیا کی سیاسی تاریخ شاہد ہے کہ جوں جوں غیر ملکی تسلط کی گرفت مضبوط ہوتی گئی ویسے ویسے انڈونیشی فن کاروں کے لب و لہجہ میں شدتِ احساس، اسلوبِ فکر میں توانائی، خیالات میں بیداری، اور شعور میں پختگی پیدا ہوتی گئی۔ یہاں کے فن کاروں کو اپنی زبان سے والہانہ محبت ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۴۲ء میں جاپانی حملے کے بعد انڈونیشی زبان کے خلاف جو کچھ کیا گیا اس کے ردِ عمل کے طور پر وہاں — "اپنی زبان بولو، انڈونیشی زبان بولو۔" کی تحریک شروع ہوئی۔ وقت کے تقاضے نے جاپانیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ انڈونیشی عوام کے مطالبات کو پورا کریں۔ لہٰذا جاپانیوں کے ایما سے ڈاکٹر سوئیکارنو، ڈاکٹر حطا، شرف الدین اور چند دوسرے مشہور اہلِ قلم پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ اس کمیشن نے انڈونیشی زبان میں نئی اصطلاحات کا اضافہ کیا۔ یہاں تک کہ ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء میں اعلانِ آزادی کے بعد انڈونیشی زبان ہی وہاں کی سرکاری زبان قرار پائی۔ یہ زبان عربی اور رومن دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ البتہ سترھویں صدی عیسوی میں اسلامی تسلط کے بعد یہاں عربی زبان مستعمل ہونے لگی، اس لئے کہ یہاں، تقریباً ۹۰ فیصدی آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اقتدار کی منتقلی کے ساتھ انڈونیشیا کی تاریخ میں سیاسی و معاشرتی تبدیلیوں کا نیا باب شروع ہوا۔

انور انڈونیشیا کا مشہور انقلابی شاعر ہے۔ اس نے ۱۹۴۶ء میں اپنے دوستوں اور دوسرے فن کاروں کی ایک جماعت بنائی اور اس کا نام "جینگگ" یعنی "دائرہ" رکھا۔ اس ادارے کی طرف سے فروری ۱۹۵۰ء میں جو منشور شائع ہوا اُس سے ان کے ادبی رجحان اور مقصد کی وضاحت بوجوہِ احسن ہوتی ہے۔ منشور سے اس بات کی بھی تشریح ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک انقلاب، وطنیت اور کلچر کا کیا مفہوم ہے۔ ملاحظہ ہو منشور:-

"ہم دنیا کے کلچر کے جائز طور پر وارث ہیں اور اس کلچر کو ہم اپنے طرزِ زندگی کے مطابق ترقی دیں گے۔ ہماری وطنیت، رنگ و نسل کے امتیاز کا نام نہیں ہے۔ ہمارا مقصد پرانے کلچر کی تخلیقات کے خاکوں میں رنگ بھرنا اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہونا نہیں ہے، بلکہ نئے کلچرل زندگی کی طرف قدم بڑھانا ہے، جس کی بنیاد استوار ہے۔ انقلاب سے ہمارا مقصد زندگی کی ان قدروں کا تعین اور ارتقاء ہے جنھیں مجہول سمجھ کر پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ ہم فن کاروں کے فن اور عوامی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے ہیں —"

اسی انقلابی شاعر انور نے اپنی ایک نظم میں آزادی کا تصور اس طرح پیش کیا ہے:-

جب میرا وقت آئے گا
میں چاہتا ہوں کہ کوئی فریاد نہ کرے
یہاں تک کہ تم بھی نہ چیخو
اس کی ضرورت نہیں کہ تم میرے لئے آنسو بہاؤ
میں نہ صرف ایک جنگلی جانور ہوں
جو اپنی قیام گاہ سے نکال دیا گیا ہے
بندوقوں کی گولیوں کا زخم کاری مجھ پر لگے، وہ
اس کے باوجود میں گرجتا ہوا آگے بڑھوں گا
زہر اور زخم میرا پیچھا کریں گے
اور میں آگے بڑھتا رہوں گا
یہاں تک کہ ساری مصیبتیں ختم ہو جائیں گی
مزید کوئی چیز میری راہ میں حائل نہ ہوگی
اور میں ہزار سال تک زندہ رہوں گا۔

انڈونیشیا کا دوسرا مشہور شاعر عبدالرواثی ہے جو عام طور پر یوگی کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ولندیزی فوجوں کے جارحانہ اقدام کے دوران میں اس نے دو نہایت انقلاب آفریں نظمیں لکھیں۔ جن میں سے ایک کا عنوان "مرثیہ" اور دوسری کا "دو عالم کے درمیان" ہے۔ اس کی نظموں میں قومی استقلال اور آزادی کی جدوجہد میں پیامِ امید کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ —— "ہم آج کی رات زندگی کی بازی لگا دیں گے جس سے آزادی کی صبح نمودار ہوگی۔"

انڈونیشیا کے ایک اور شاعر سمارجو نے "لہرائے جا پرچم انڈونیشیا" کے عنوان سے ایک کامیاب نظم کہی ہے۔ جس سے اس مضمون کے مقصد کی مزید وضاحت ہوتی ہے:-

اے سُرخ و سپید پرچم
لہرائے جا، لہرائے جا
تو جنگِ آزادی میں
ایک مضبوط قومی نشان تھا
لہرائے جا، لہرائے جا
اپنے چمکتے ہوئے اور باعزّت رنگوں کو
لہرائے جا، لہرائے جا
ساری دُنیا کے عوام کو
ہماری آزادی کے گیت
سُنائے جا سُنائے جا
لہرائے جا، لہرائے جا
اُن سے کہہ دے جو غلامی کو سہارا دیتے ہیں
ہم اب آزاد ہیں اور آزاد رہیں گے
ان سے کہہ دے جو امن و آزادی کے متوالے ہیں
ہم ان کے دوست ہیں
اے سُرخ و سپید پرچم
تو ہمارے قومی اتحاد کا شاہد ہے
جب وہ جدوجہد کر رہے تھے
جب وہ کامیابی کی طرف گامزن تھے
تو ہمارے بیٹوں کی قربانیوں کا شاہد ہے
جن کی بہادری بے مثال ہے
اپنے اجداد کا ملک حاصل کرنا
ہمارے لئے ابدی نعمت ہے
اے سرخ و سپید پرچم
لہرائے جا، لہرائے جا
"ظلم اور خون کے دریا ہمیں نہیں دبا سکتے"
اے پرچم، ہم نے اپنے خون سے تجھے
یہ سُرخ رنگ بخشا ہے
ہماری پاک محبت سے تجھے
یہ سپید رنگ ملا ہے
اے پرچم تو لافانی ہے
اگرچہ ہمارے جسم مردہ ہو کر فنا ہو جائیں گے
لہرائے جا، لہرائے جا
اے پرچم، اس وقت تو لہرائے جا
نہیں، تو ہمیشہ لہرائے جا
یہ سُرخ و سپید رنگ
ہمیشہ باقی رہیں
ان میں داغ نہ لگے
تو ہمیشہ نصب رہنا
لہرائے جا، لہرائے جا
تو صدیوں تک چمکتا رہے
تو ہماری قوم کے
پیدائشی حق،
انسانیت، تہذیب، تاریخ
اور تاج کا علمبردار ہے
اے پرچم انڈونیشیا
لہرائے جا، لہرائے جا

انڈونیشی شاعری مغربی ادب سے بھی متاثر ہوئی ہے۔ اور یہیں سے اس میں ترقی پسند عناصر داخل ہوئے ہیں۔ چناں چہ جہاں مواد میں تبدیلی ہوئی روایتی خیالات کی جگہ ترقی پسند خیالات نے لے لی، وہاں قدیم ہئیت میں بھی تغیر ہوا۔ اب انڈونیشی شاعری میں سانیٹ بھی لکھی جاتی ہے۔ اور آزاد نظم بھی، اس میں سادگی بھی پائی جاتی ہے اور صفائی بھی۔ فن کاروں کے لب و لہجہ میں آزادی کے شدید احساسات کروٹ لے رہے ہیں۔ ان کے فن میں خلوص بھی جھلک رہا ہے اور وطن کی محبت کا اظہار جذبہ بھی۔ ان کے ہاں صداقت بھی ہے اور مقصدیت بھی اور شاندار مستقبل کی جھلک بھی!

انڈونیشی شاعری کو ابھی اور ترقی کرنا ہے اور یہ انڈونیشیا کے شاعروں کا فرض ہے کہ اسے دوسرے ممالک کی شاعری کے مقابلے میں لا کر کھڑا کر دیں۔

جہاں تک پیشِ نظر مواد کا تعلق ہے ہمیں انڈونیشیائی شاعری کا مستقبل امید افزا نظر آتا ہے۔ آخر میں "انڈونیشیا کا قومی ترانہ" بھی سن لیجیے۔

انڈونیشیا ہمارا وطن ہے
یہ ہماری پیاری ماں ہے جس سے ہم محبت کرتے ہیں
ہم یہاں زندہ ہیں، ہم یہاں کے باشندے ہیں
اور اپنی محبت بھری آنکھوں سے اس کو تکتے ہیں
انڈونیشیا ہماری قومیت ہے
ہاں! ہماری جان اور آبرو ہے
آؤ ہم کا پیارا گیت گائیں
انڈونیشیا کے قومی ترانے کا حلقہ بنائیں
شاندار انڈونیشیا، شاندار انڈونیشیا
اے ہماری قوم! ہمارے وطن اور ہمارے سب کچھ
ہم تیری عزت اور عظمت کے گیت گاتے ہیں
ہم تیری خوبصورتی کو یاد کرتے ہیں۔
تیری آزادی اور بڑائی کے لئے گاتے ہیں
کورس۔ انڈونیشیا، انڈونیشیا، شاندار ملک، شاندار ملک
اے ہماری جان! اے ہمارے وطن انڈونیشیا!!
شاندار انڈونیشیا "رایہ"[1]

---
[1] رایہ (قومی ترانہ)

باسط بھوپالی

غزل

شمعیں جلتی جائیں گی آنسو ڈھلتے جائیں گے
راہیں ملتی جائیں گی راہی چلتے جائیں گے

خون کی بوندیں دل بن جائیں یا ہوں نمایاں اشکوں میں
اصل وحقیقت ایک رہے گی نام بدلتے جائیں گے

سوزِ خزاں سے تابندہ ہے اپنی گلستاں اپنی بہار
نخلِ تمنا جتنے جلیں گے اور پھلتے جائیں گے

اے دیدۂ حیرت پھر تیرا انجام تماشا کیا ہوگا
جب ذوقِ نظر کی تابش سے آئینے پگھلتے جائیں گے

ناہمواریٔ رہ کے ضامن ہیں ہموار نظر ہموار قدم
چلنے کا سلیقہ ہے جن کو ہر حال میں چلتے جائیں گے

کتنی صبحیں مٹ جائیں گی کتنی شامیں لٹ جائیں گی
جاگنے والے جاگ کے جب تک آنکھیں ملتے جائیں گے

لازم ہیں نظامِ نو کے لئے نقاش نئے فن کار نئے
تصویر یقیناً بدلے گی جب ہاتھ بدلتے جائیں گے

اپنی یک رنگی اے باسط رنگ پہ آتی جائے گی
رنگ بدلنے والے جتنا رنگ بدلتے جائیں گے

شری پادہ جوشی

جدید مراٹھی ادب

جو لوگ ہندوستان کی بہت سی زبانوں سے واقف ہیں اُن کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں بنگالی کے بعد مراٹھی ہی ایسی زبان ہے جو زمانے کے ساتھ برابر ترقی کرتی آ رہی ہے، اور جس کے ہر شعبے نے نئے نئے طریقے اور رجحانات اختیار کئے ہیں۔ بلکہ چند باتوں میں مثلاً ناٹک اور مزاح میں مراٹھی زبان بنگالی سے بھی آگے بڑھ گئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس بیان میں کچھ مبالغہ ہو۔ مگر ایک بات صاف واضح ہے کہ آج کی مراٹھی زبان اپنی ترقی کے لئے ہر طرف سے جدوجہد کر رہی ہے، زبان کی طاقت اگر اسی سے آزمائی جائے کہ اس میں ہر قسم کے مضمون کو ظاہر کیا جا سکتا ہے یا نہیں، تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مراٹھی زبان ہندوستان کی اُن طاقتور زبانوں میں سے ہے جو ہر قسم کے خیال اور جذبہ کو ظاہر کرنے کی صلاحیت اپنے میں رکھتی ہیں۔ اب ہم یہاں یہ دیکھیں کہ جدید مراٹھی ادب کے رجحانات اور خصوصیات کیا ہیں، اُس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ادب کے ہر شعبے کو الگ الگ لے کر اُن کی جانکاری حاصل کریں۔

ناول اور مختصر افسانے

مراٹھی میں سب سے زیادہ پیداوار اور کھپت ناولوں اور مختصر افسانوں کی ہے۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح مراٹھی نے بھی نئے ڈھنگ کا ناول اور افسانہ انگریزی زبان سے لیا ہے۔ جُوں جُوں انگریزی ناول اور افسانے کی ترقی ہوتی گئی مراٹھی میں بھی اُس کا عکس نظر آتا رہا۔ مراٹھی کے سب سے پہلے اور بڑے ناول نگار ہری نارائن آپٹے ہیں۔ جنھوں نے متوسط طبقے کے شہری عوام کی صحیح تصویریں اپنے ناولوں میں کھینچیں۔ اور اُس زمانے کے یعنی پچاس سال پہلے کے سماجی سوالوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کچھ اچھے تاریخی ناول بھی لکھے ہیں۔ اُن کے سماجی ناولوں میں "می" (میں)، "پن لکشیات کون گھیتو" (لیکن کون دھیان دیتا ہے) وغیرہ بہت ہی زوردار اور مقبولِ عام و خاص ہیں۔ اُن کے ناول بے حد طویل اور ضخیم ہوتے ہیں مگر دلچسپ ایسے کہ ایک بار پڑھنا شروع کریں تو ختم ہونے تک کتاب کو رکھ دینے کو جی نہیں چاہتا۔ آج بھی اُن کے ناول بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

ہری نارائن آپٹے کے بعد ناتھ اور وِشنو سیتا رام گُرجر نے ناول اور افسانے لکھے اور شری گُرجر آج تک لکھتے آ رہے ہیں۔ مگر وہ اپنی کوئی خاصیت پیدا نہ کر سکے۔ دس برس پہلے تک مراٹھی ناول نگاروں میں پروفیسر نارائن سیتا رام پھڑکے، وشنو سکھا رام کھانڈیکر اور رگھوناتھ ترمبک ماڈکھولکر بہت ہی مقبول تھے۔ یہ تینوں آج بھی ناول اور افسانے لکھتے ہیں۔ مگر وہ اب پُرانے ادیبوں میں گنے جاتے ہیں۔ اِن تینوں نے سماجی اور نفسیاتی مضمون پر ناول لکھے ہیں۔ لیکن اُن کا دائرہ متوسط طبقے تک ہی محدود ہے۔ اس واسطے اُن میں تکرار بہت پائی جاتی ہے۔ پھر بھی شری کھانڈیکر کے لکھنے میں گہرائی اور اور زندگی کے ساتھ وفاداری سب سے زیادہ ہے۔ اس لئے اُن کے ناولوں اور مختصر افسانوں کے ترجمے ہندی، گجراتی، کنڑ، تامل، تیلگو وغیرہ زبانوں میں بہت مقبول ہوئے۔ رومانی ناول نگاری میں پھڑکے اپنا ثانی نہیں رکھتے اور مسلسل پچیس سال تک درجنوں ناول لکھتے رہنے پر بھی آج بھی ان کے ناول پڑھنے والوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ پھڑکے اور کھانڈیکر ناول و مختصر افسانوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے مختصر مضمون لکھنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اس قسم کے مضمون مراٹھی میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اور بڑے چاؤ سے پڑھے جاتے ہیں۔ ہندی، اُردو، گجراتی زبانوں میں اس طرح کے مضمون بہت کم ملتے ہیں۔ ان کا مراٹھی نام "لگھو نبندھ" ہے۔ ماڈکھولکر صاحب نے زیادہ تر ناول ہی لکھے ہیں، اور آج کل ناگپور کے "ترون بھارت" نامی اخبار کے ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے وہ کلاسیکی ادب شاید ہی لکھ سکتے ہیں۔ اس زمانے میں اور بھی کئی افسانہ نگار ہو گئے جن میں یشونت گوپال جوشی، دِگھے، بوکیل، وامن چورگھڑے، لکشمن راؤ سرودیسائی، بواکر وغیرہ مشہور ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک کا

اپنا اپنا الگ طریقہ ہے اور اپنا اپنا رنگ ہے۔ یہ لوگ آج بھی لکھتے رہتے ہیں۔

اس طرح سنہ ۱۹۳۹ء تک مراٹھی ناول اور افسانے خوب ترقی کرتے رہے، مگر تب سے ۱۹۴۳ء تک یعنی تقریباً پانچ سال تک مراٹھی افسانہ نگاری میں ایک قسم کا جمود آ گیا اور پرانے ادیب ہی جو کچھ سوجھا لکھتے رہے۔ اس زمانے میں مراٹھی پڑھنے والوں کو ایسے محسوس ہوا کہ اب مراٹھی افسانہ نگاری کا چراغ گُل ہو جائے گا۔ مگر ۱۹۴۳ء سے مراٹھی میں نیا افسانہ اور ناول آنے لگا اور خوب آیا۔ اس کی خاصیت یہ رہی کہ وہ زندگی کے ساتھ زیادہ وفادار بن گیا۔ صرف متوسط طبقے تک محدود نہ رہ کر سماج کے ہر شعبے میں پہنچ گیا۔ سطحی باتوں میں پھنسنے کی بجائے زیادہ گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا اور پلاٹ کے بندھنوں سے آزاد ہو گیا۔ لیکن اگر اردو افسانے سے مقابلہ کیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ مراٹھی افسانہ اُردو افسانے سے پیچھے ہے۔ یعنی دس سال پہلے اُردو میں کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو نے جو نئی راہیں نکالیں، جو تجربات کئے وہی آج مراٹھی میں ہو رہے ہیں۔ اُس کی اچھائیوں کے ساتھ بُرائیاں بھی ہمارے یہاں آ رہی ہیں اور نفسانی جذبات کو اُبھارنے والے فحش ادب کے گُن گائے جا رہے ہیں۔ مگر چونکہ ہمارے مراٹھی افسانہ نگار اُردو سے ناواقف ہیں، اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے کچھ نئی ایجادیں کر لی ہیں۔ آج کل مراٹھی میں پلاٹ کی بہ نسبت تحلیل نفسی اور شعوری نفس کی بہ نسبت لاشعوری نفس کی حالت کو ظاہر کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس نئے طریقے کے بانیوں میں اِدَنْدگوکھلے، گنگادھر گاڈگیل، پ۔ ب بھاوے اور وینکٹیش ماڈگولکر کے نام مشہور ہیں۔ اُن میں سے وینکٹیش ماڈگولکر نے مراٹھی میں ایک نیا اور زوردار طرز ایجاد کیا ہے۔ اُن کے افسانوں کو افسانہ کہنے کے بجائے قلمی تصویریں کہنا ہی ٹھیک ہوگا۔ اُن کے افسانوں کے دو مجموعے "ماندیشی ملسے" اور "گاوا کڑچیا گوشٹی" مراٹھی میں بہت مقبول ہوئے ہیں جن میں اُنھوں نے سماج کے غریب اور پچھڑے ہوئے لوگوں کی لفظی تصویریں کھینچی ہیں اور اُن کے ذریعے اونچے طبقے کے ظلم و ناانصافی کی طرف ناظرین کا دھیان کھینچا ہے۔ مگر وہ اس طرح کہ پڑھنے والوں کو اُس میں کسی قسم کے پرچار کی قطعی بو نہیں آتی۔

ان چار لیکھکوں کے علاوہ د۔ ب۔ موکاشی۔ ماٹوس۔ سدانند دیگھے۔ گ۔ و۔ ماڈگولکر۔ د۔ ب۔ جوشی۔ کملا پھڑکے۔ کسماوتی دیش پانڈے۔ شانتا شیلکے۔ مہادیو شاستری جوشی۔ شانتا رام وغیرہ افسانہ نگار بھی مشہور ہیں۔

آج کے مراٹھی ناول نے دوسری زبانوں کے ناول سے کچھ زیادہ ترقی کی ہے۔ سماج کے ہر طبقے کے سکھ دُکھ اور سوالوں کو ناولوں کے ذریعے پیش کرنے میں آج کا مراٹھی ناول نگار اچھا خاصا کامیاب ہوا ہے۔ وبھاوری شرودکر کے "بلی" پولکر کے "سُنیتا" پودکر کے "بھاوین" اور پینڈسے کے "ایلگار" ناولوں نے مراٹھی ناول کو بہت اونچے درجے پر لا بٹھایا ہے۔ ان سب سے الگ طریقہ مرحوم سانے گوروجی کا ہے۔ مراٹھی میں سب سے زیادہ ناول اور افسانے ہی نہیں بلکہ دوسری قسم کی کتابیں بھی وہی پڑھی جاتی ہیں جو سانے گوروجی نے لکھی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ انھوں نے کوئی نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ اُن کے لکھنے میں دل کی باتیں ہوتی ہیں جو پڑھنے والوں کے دلوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ مراٹھی میں اُردو کی طرح ترقی پسند ادیبوں کا کوئی الگ گروہ نہیں ہے۔ اور کمیونسٹ ڈھنگ سے سوچنے اور لکھنے والے ادیب بہت ہی کم ہیں۔

نظم

اب ہم مراٹھی نظم کی طرف آتے ہیں۔ یہ امر یاد رکھنے کے لائق ہے کہ مراٹھی میں سب سے کم بکنے اور پڑھا جانے والا ادب نظم ہے۔ یہاں شاعر کو وہ بلند رتبہ حاصل نہیں جو ہندی اور اُردو زبانوں کے شاعروں کو حاصل ہے۔ مراٹھی کے کئی رسالوں میں آپ کو ایک بھی نظم نہیں ملے گی۔ روزانہ و ہفتہ وار اخباروں میں تو نظمیں شاید ہی شائع ہوتی ہیں۔ بہت کم ماہنامے ایسے ہیں جن میں نظمیں چھپتی ہیں۔ اور بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو نظمیں پڑھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مراٹھی کی نظم پچھڑی ہوئی ہے یا ادنی درجے کی ہے۔ برخلاف اس کے وہ بڑی تیزی سے ترقی کرتی جا رہی ہے لیکن مراٹھی لوگوں میں نظموں کی بہ نسبت گیتوں میں دلچسپی زیادہ ہے۔ ایسے گیت جن میں معنی کچھ بھی نہیں ہوتے۔ اگر ہوں بھی تو بالکل معمولی جذبات پائے جاتے ہیں اور صرف الفاظ ہی الفاظ ہوتے ہیں۔ ایسے گیت لکھنے والوں کو ادیبوں میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ مگر ان کو شہرت اور پیسہ کافی مل جاتا ہے۔ لیکن جنھیں ہم ادبی نظمیں کہہ سکتے ہیں۔ اُس کی طرف عام لوگوں کا دھیان بہت کم جاتا ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ پرانے زمانے کے گیانیشور۔ تکارام۔ رامداس۔ ایکناتھ وغیرہ سنتوں کی مذہبی شاعری

عوام میں آج بھی بہت مقبول ہے، اور لوگ بڑی شردھا سے اُسے پڑھتے ہیں۔

نئی مراٹھی نظم کیشوسُت (۱۸۶۶ء) سے شروع ہوتی ہے، جنھوں نے مذہبی اور نصیحتی ڈھنگ کی کویتا لکھنا چھوڑ کر انگریزی نظم کی پیروی کر کے مراٹھی میں نئی راہیں کھولیں۔ چھوٹے چھوٹے معمولی واقعات کو لے کر اُنھوں نے آسان زبان میں بڑی جاندار نظمیں لکھیں اور مراٹھی میں نظم معرّا کو رواج دیا۔ ۱۹۲۰ء تک کیشوسُت کا اسکول چلتا رہا۔ اُس کے بعد بھا سکر راؤ تامبے کا زمانہ شروع ہو گیا جس میں زبان کی صفائی اور ترنّم کی طرف خاص توجہ دی گئی اور نظم میں گیتوں کی بھرمار ہونے لگی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب گانے کے خیال سے ہی نظم لکھی جانے لگی اور گاناہی شاعری کی جان بن گیا۔ آج بھی گانے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ مگر اعلیٰ مذاق کے ادیبوں میں اونچے درجے کی کویتا پسند کی جاتی ہے۔ شری تامبے کے پیروؤں میں بورکر، یشونت، مادھو جیولین گرلش، بی، انیل وغیرہ مشہور ہیں۔

۱۹۴۵ء سے جدید نظم کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اس نظم نے پچھلے زمانے کے رومانیت کے خلاف بغاوت شروع کر دی ہے اور ریلیزم کا جھنڈا اکھڑا کر کے اشاریت کا چرچا گرم کیا ہے۔ اس کے خلاف لوگوں کی سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ بہت مشکل ہے۔ اُس میں نامہذّب الفاظ اور خیالوں کی بھرمار رہتی ہے، اور انگریزی لفظوں کا بیہودہ استعمال کیا جاتا ہے، اس نئی نظم کے بانی شری مرڈھیکر ہیں۔ اور اُن کے پیروؤں میں بھاوے، وِندا کرندیکر، مکتی بودھ وغیرہ شاعر ہیں۔ ابھی چند روز پہلے شری مرڈھیکر کی نظموں کی وجہ سے بمبئی سرکار کی طرف سے اُن پر فحش نظمیں لکھنے کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔ مگر وہ اُس سے بری ہو گئے۔ اس سے پتہ چلے گا کہ جدید نظم کا رُخ کس طرف ہے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ ان نئے شاعروں کے علاوہ پُرانے کہے جانے والے شاعر بھی مراٹھی میں موجود ہیں۔ اور اُن کی شاعری عام لوگوں میں بہت پسند کی جاتی ہے۔ انھیں ہم رومانی شاعر کہہ سکتے ہیں۔ اس رومانیت کے علم برداروں میں بورکر، کُسما گرج، انیل، دیکھے، یشونت، ماڈگولکر، وسنت باپٹ، منگیش پاڈگاؤں کر وغیرہ شاعر اور اِندرا سنجیبنا، پدما، شانتا شیلکے وغیرہ شاعرہ ہیں۔

ڈرامہ

کہا جاتا ہے کہ مراٹھی میں فن ڈرامہ کی جتنی ترقی ہوئی ہے اُتنی دوسری کسی بھی ہندوستانی زبان میں نہیں ہوئی ہے۔ مراٹھی کے کچھ ڈرامے تو اتنے اعلیٰ درجے کے ہیں کہ وہ آسانی سے دنیا کے بہترین ڈراموں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ بنگال میں اسٹیج کی کافی ترقی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں، مگر ادبی حیثیت سے مراٹھی ڈرامہ بنگالی ڈرامے سے کئی گنا آگے بڑھا ہوا ہے۔ چند مراٹھی ناٹک اتنے زوردار اور جاندار ہیں کہ لگاتار پچھلے چالیس سالوں سے وہ اسٹیج پر کھیلے جا رہے ہیں، اور آج بھی اُن میں لوگوں کی دلچسپی کم نہیں ہوئی ہے۔ سینما کے اس زمانے میں بھی ہزاروں لاکھوں لوگ یہ ڈرامے دیکھتے ہیں اور اُن کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ ان ڈراموں میں کرلوسکر کا 'سوبھدرا'۔ دیول کا 'شاردا'۔ کھاڈیلکر کا 'مانا پمان'۔ گڈکری کا 'ایک ہی پیالہ'۔ وریرکر کا 'ستّے چے غلام' اترے کا 'ساشٹانگ نمسکار'۔ ن۔ ج۔ کیلکر کا 'توتیا چے بنڈ'۔ اور رانگنیکر کا 'کلودھو'۔ ایسے ہیں جنھیں سیکڑوں بار دیکھنے پر بھی لوگ سیر نہیں ہوتے۔ آج بھی ڈانگے کر، ماما وریرکر، خسرو داڈکر، اننت کانیکر، ناگیش جوشی، نانا جوگ وغیرہ کے ناٹک بڑے اونچے درجے کے ہوتے ہیں جس میں کسی نہ کسی موجودہ سوال کو لے کر اُس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہوتی ہے۔

مزاح

مراٹھی کا مزاحیہ ادب بھی کافی ترقی یافتہ ہے۔ پُرانے زمانے کے مزاح لکھنے والوں میں گڈکری۔ کوہٹکر، اترے۔ چ۔ و۔ جوشی۔ شام راؤ اوک وغیرہ مشہور ہیں، اور آج کل کے لکھنے والوں میں پ۔ ل۔ دیش پانڈے۔ وتّو باندیکر۔ د۔ م۔ د۔ پٹوردھن۔ کیپٹن لمئے وغیرہ نام بہت مقبولِ عام و خاص ہیں۔ اصل میں ادب کے دیگر شعبوں کی بہ نسبت مزاح لکھنا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ اچھا اور اعلیٰ مزاح بہت کم پڑھنے کو ملتا ہے۔ پھر بھی جب ہم دوسری زبانوں کے مزاحیہ ادب کے ساتھ مراٹھی مزاح کا مقابلہ کرتے ہیں تو مراٹھی کا مزاحیہ ادب بہت اونچے درجے کا معلوم ہوتا ہے۔ مراٹھی میں واقعات کے ساتھ ہی

لفظوں سے تعلق رکھنے والا مزاح بھی کثرت سے ملتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ مراٹھی زبان کی باریکیوں اور خوبیوں سے واقف نہ ہوں اُس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے اور اسی لئے دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

ترجمہ

مراٹھی بولنے والوں میں دوسرے ملکوں و زبانوں سے نئی نئی معلومات حاصل کرنے کا شوق بہت ہے۔ چنانچہ یہاں اچھے اچھے ترجموں کی مانگ ہمیشہ رہتی ہے، اور یہ ترجمے بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان سے مثلاً انگریزی، فرانسیسی، جرمن، پرتگالی، روسی، بنگالی، ہندی، اُردو زبان کے آج کے درجۂ اوّل کے افسانہ نگار کرشن چندر، اور راماننّد ساگر کے ناول 'شکست'، 'اَن داتا' اور 'اور انسان مر گیا' کے مراٹھی ترجمے بہت مقبول ہو گئے ہیں۔ منشی پریم چند اور مہاشہ سدرشن کے افسانوں کو بھی مراٹھی ناظرین بہت پسند کرتے ہیں۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے مزاحیہ مضامین و افسانے اور سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس وغیرہ کی کہانیاں بھی مراٹھی میں شوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ اقبال، چکبست، جوش ملیح آبادی وغیرہ جدید شاعروں کی شاعری کو اتنی ہی دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے جتنی دلچسپی سے میر، غالب، اکبر اور نظیر اکبرآبادی کو (یعنی اُن کی شاعری کے مراٹھی ترجمے کو) پڑھا جاتا ہے۔ بنگال کے ناول نگار شرت چندر چٹوپادھیائے کی تقریباً سبھی تصنیفیں مراٹھی میں آ چکی ہیں۔ رویندر ناتھ ٹاگور، تارا شنکر بندوپادھیائے اور نذرالاسلام کے ناولوں افسانوں اور نظموں سے مراٹھی بولنے والے اچھی طرح واقف ہوتے جا رہے ہیں۔ اچھے ترجمے کرنے والوں میں مایا دیو کرا اور د۔ گ۔ دیش پانڈے (بنگالی سے) ب۔ پ۔ بودکر اور سانو سکر (پرتگالی سے) شری پاد جوشی اور د۔ ب۔ جوشی (اُردو سے)۔ و۔ و۔ ہڑپ اور مادھو منوہر (انگریزی سے) سوا مند دیگے اور یروناتھ تھتے (ہندی سے) کے نام کافی مشہور ہیں۔

متفرق

ان کے علاوہ سوانح عمریاں، آپ بیتیاں، تنقیدیں، مکاتیب، تحقیق وغیرہ شعبوں میں بھی مراٹھی نے کافی ترقی کی ہے۔ خاص کر مراٹھی میں جتنا اور جیسا سیاسی ادب پیدا ہوتا ہے اُتنا دوسری کسی ہندوستانی زبان میں کم ہوتا ہوگا۔ گاندھی وادی، سماج وادی، کمیونسٹ، فرقہ پرست سبھی طرح کے لکھنے والے مراٹھی میں موجود ہیں۔ اُن میں آچاریہ ونوبھاوے، جاوڈیکر، بھاگوت، مانے گروجی، گاڈگیل، ساورکر وغیرہ کے نام مشہور ہیں۔ اگر اُردو سے مقابلہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ مراٹھی زبان نے نظم، مکاتیب، تذکرے اور تنقید میں اتنی ترقی نہیں کی ہے جتنی اُردو نے کی ہے، اور ان باتوں میں مراٹھی زبان اُردو سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ ناٹک (ڈرامہ) ناول اور مزاح کے بارے میں مراٹھی زبان اُردو کو بہت کچھ سکھا بھی سکتی ہے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ اب تک ہم نے ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے کی قطعی کوشش نہیں کی ہے، اور اگر کسی نے کی بھی ہو تو وہ انگریزی کے ذریعے کی ہوگی۔ چنانچہ ہم زبان اور اُس کے بولنے والوں کی اصل روح تک پہنچ نہیں پائے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ یہ دونوں زبانیں ایک دوسری کے زیادہ نزدیک آ کر اپنے گنجینۂ ادب کو مالا مال کریں گی۔

شکر کی پیداوار اور ذخائر

وزارتِ خوراک و زراعت کا ایک پریس نوٹ مظہر ہے کہ اس فصل میں ۱۵ر فروری ۱۹۵۵ء تک دانہ دار کھانڈ کی پیداوار ۸ لاکھ ۱۹ ہزار ٹن ہوئی اور ۲ لاکھ ۷۶ ہزار ٹن غیر ملکوں سے درآمد کی گئی۔

گذشتہ سال ان مدّات کے اعداد و شمار علی الترتیب ۷ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن اور ایک لاکھ ۳۹ ہزار ٹن تھے۔

اسی عرصے کے دوران میں ایک لاکھ ۸۹ ہزار ٹن کھانڈ کارخانوں سے باہر بھیجی گئی جب کہ گذشتہ سال اسی موسم میں ۳ لاکھ ۸۴ ہزار ٹن کھانڈ کارخانوں سے باہر بھیجی گئی تھی — ۱۵ر فروری کو کارخانوں میں کھانڈ کا اسٹاک ۷ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن تھا جب کہ پچھلے برس اسی تاریخ کو کارخانوں میں کھانڈ کا اسٹاک ۵ لاکھ ۳۲ ہزار ٹن تھا۔

پنج سالہ پلان

نمبر ۲

گزشتہ سے پیوستہ

صنعت

س۔ اس کا کیا سبب ہے کہ صنعت کے مقابلے میں زراعت پر بہت زیادہ خرچ کیا جائے گا۔ کیا ترجیحات کی اسکیم میں صنعت کو اپنا موزوں مقام دیا گیا ہے؟

ج۔ ان کافی ذرائع کے علاوہ جو حفاظتی صنعتوں پر صرف کئے جا رہے ہیں پلان کی مدّت کے دوران میں صنعت پر حکومت کا بالواسطہ صرف ۹۴ کروڑ روپے ہے۔ اگر اس میں ہم چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا معدنی توسیع و ترقی کا اور بنیادی صنعتوں اور نقل و حمل کے لئے ۵۰ کروڑ روپے کی مزید مجموعی رقم کا بھی اضافہ کر دیں تو بھی یہ روپیہ ۱۵۰ کروڑ روپے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کا اگر گورنمنٹ کے مجموعی مجوزہ اخراجات سے جو ۲۰۶۹ کروڑ روپے ہے مقابلہ کریں تو یہ بہت کم نظر آتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ صنعت کے میدان کا زیادہ تر حصّہ نجی کوششوں کے دائرے میں رکھا گیا ہے۔ اور اس لئے صنعتی توسیع و ترقی کا بہت سا حصّہ گورنمنٹ کے مجوزہ اخراجات کے دائرے میں شامل نہیں ہوتا۔ گورنمنٹ کے پاس اتنے وسائل بھی نہیں ہیں کہ زراعت اور صنعت دونوں ساتھ ساتھ بھاری پیمانے پر روپیہ صرف کر سکے۔ چنانچہ ترجیح زراعت ہی دی گئی ہے۔ کیونکہ لوگوں کے لئے اناج کی مناسب فراہمی اور صنعتوں کے لئے پاس اور جوٹ ایسے کچے مال کی فراہمی دوسرے حلقوں میں توسیع و ترقی کے لئے بنیادی شرط ہے۔ اس کے لئے کاشتکاروں کی ایک بڑی اکثریت کے پاس مالی ذرائع ہی نہیں ہیں جس سے وہ زرعی پیداوار کو بڑھا سکیں۔ اس لئے ٹھوس بنیادوں پر حکومت کی امداد ضروری ہے۔ جبکہ صنعتی ماہرین اپنے ہی ذرائع سے کافی ترقی کر سکیں گے۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ نجی حلقے میں صنعت کے لئے پرائیویٹ ہستیوں سے کل ۶۱۲ کروڑ روپیہ مل سکے گا۔ اس میں حکومت کی طرف سے بلاواسطہ اور بالواسطہ طور پر لگایا ہوا ۱۵۰ کروڑ روپیہ بھی شامل کر لیں تو میزان ۷۶۳ کروڑ روپے تک جا پہنچتا ہے۔ یہ کوئی معمولی رقم نہیں ہے اور پلان کی مدّت کے دوران میں توسیع اور ترقی کے لئے جتنے ذرائع کے حاصل ہونے کی توقع ہے اس کا ۲۵ فیصدی ہے۔

اس کے علاوہ یہ ذکر بھی کر دیا جائے کہ بجلی کی توسیع و ترقی پر جو بھاری خرچ کیا جا رہا ہے اس کا بھی ایک حصّہ صنعتی توسیع و ترقی ہی کے لئے ہے۔

س۔ صنعتی توسیع و ترقی کے لئے کتنا روپیہ فراہم کیا گیا۔ یہ روپیہ سرکاری اور نجی حلقے میں کس طرح تقسیم کیا گیا ہے؟

ج۔ پلان کی مدّت کے دوران میں جس کے بڑے پیمانے کی صنعتی توسیع و ترقی پر صرف کرنے کی توقع ہے ۷۰ کروڑ روپیہ ہے۔ اس میں وہ روپیہ شامل نہیں جو حفاظتی صنعتوں پر خرچ ہوگا اور وہ بھی شامل نہیں جو اس ۵۰ کروڑ روپے کی مجموعی رقم میں سے لیا جائے گا جو بنیادی صنعتوں اور ضمنی نقل و حمل کے لئے رکھا گیا ہے۔ اس روپے میں سے ۹۴ کروڑ روپے جو گورنمنٹ سرکاری حلقے کی پراجیکٹوں پر خرچ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اور باقی روپیہ ان ذرائع پر صرف ہوگا جو نجی کوششوں کے حلقے میں صنعتی توسیع و ترقی کے لئے درکار ہیں۔

س۔ صنعتی پیداوار اور مزید گنجائش کے نشانے کیا ہیں؟

ج۔ پلان کا مقصد یہ ہے کہ مزید گنجائش زیادہ تر بھاری مشینری اور روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کے صنعت کے میدان میں پیدا کی جائے۔ جہاں تک روزمرہ کی استعمال کی اشیا کی صنعتوں کا تعلق ہے موجودہ گنجائش اتنی ہے کہ اگر اسے پوری طرح استعمال کیا جائے تو اس سے موجودہ سطح کے استعمال

کی ضروریات بھی پوری ہو سکتی ہیں اور دوسرے ملکوں کو برآمد کرنے کے لئے فالتو مال بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کی صنعتوں میں وسعت اضافی طور پر کم اہمیت رکھتی ہے۔

جہاں تک چند بڑی صنعتوں کا تعلق ہے مزید گنجائش اور پیداوار کے نشانے مندرجہ ذیل ہیں۔

	یونٹ	۱۹۵۵-۵۶ء تک مزید گنجائش	۱۹۵۵-۵۶ء تک مزید پیداوار
۱۔ لوہا اور فولاد			
(ا) بھٹی میں تپا ہوا لوہا	۰۰۰ ٹن	۱۷۵۷	۱۲۶۱
(ب) طیار شدہ فولاد	”	۶۳۵	۳۹۴
۲۔ سیمنٹ	۰۰۰ ٹن	۲۰۲۶	۲۱۰۸
۳۔ پٹ سن کی بنائی ہوئی اشیاء	”	..	۳۰۸
۴۔ امونیم سلفیٹ	”	۴۰۲٫۶	۴۰۳٫۷
۵۔ الومنیم	ٹن	۱۶۰۰۰	۸۳۰۰
۶۔ کاسٹک سوڈا	”	۱۸۴۰۰	۲۱۶۲۵
۷۔ سلفیورک ایسڈ	۰۰۰ ٹن	۷۰	۱۰۱
۸۔ کھانڈ	”	۱۰	۳۸۰
۹۔ سوتی کپڑا			
(ا) تکلیاں	تعداد	۳۵۰۰۰۰	—
(ب) سوت	ملین پونڈ	۵۳	۴۶۱
(ج) مشین کا کپڑا	ملین گز	۳۵	۹۸۲
(د) کھڈی کا کپڑا	”	..	۸۹۰
۱۔ بائیسکلیں	۰۰۰ ٹن	۴۱۰	۴۲۹
۱۔ مٹی کا تیل			
(ا) مٹی کے تیل کی طرح اشیاء	ملین گیلن	..	۴۰۳
(ب) مال	۰۰۰ ٹن	..	۳۷٫۵
۱۔ نیوز پرنٹ	۰۰۰ ٹن	۳۰	۲۷٫۰

س ۔ مختلف صنعتی پراجیکٹوں کی تکمیل کے فیصلے کے علاوہ جو اس وقت مرکزی اور ریاستی گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہے، پلان میں شامل شدہ صنعتی ترجیحات کی ترتیب کیا ہے؟

ج ۔ متعدد پراجیکٹوں کی تکمیل کے علاوہ جو اس وقت مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے زیر عمل ہیں اور بعض حفاظتی صنعتوں کے قیام کے علاوہ صنعتی میدان میں ترجیحات مندرجہ ذیل تجویز کی گئی ہیں۔

(۱) پروڈیوسر گڈس کی صنعتیں مثلاً پٹ سن، پلائی ووڈ اور روزمرہ کے استعمال کی اشیاء مثلاً سوتی کپڑا، صابن، کھانڈ، بناسپتی، پینٹ اور وارنشوں کی موجودہ گنجائش کا زیادہ سے زیادہ استعمال۔

(۲) پروڈیوسر اور بھاری صنعتوں مثلاً لوہا، فولاد، المونیم، سیمنٹ، کھاد، بھاری کیمیکل اور مشینی اوزاروں وغیرہ کی گنجائش میں وسعت۔

(۳) نئے کارخانوں کا قیام جو جہاں تک ذرائع اجازت دیں گے موجودہ خلا کو پر کر کے اور خامیوں کو دور کر کے یعنی کھڑیا مٹی سے گندھک پیدا کر کے اور مصنوعی ریشم کے لئے کیمیکل گودا پیدا کر کے صنعتی ڈھانچے کو تقویت دیں گے۔

س ۔ سرکاری حلقے میں بڑے بڑے صنعتی پراجیکٹ کون کون سے ہیں اور ان پر کتنا خرچ آئے گا؟

ج ۔ سرکاری حلقے میں صنعتی پراجیکٹ جن میں سے ہر ایک پر ایک ایک کروڑ روپے سے زیادہ خرچ آ رہا ہے۔ مندرجہ ذیل ہیں۔

زیر تکمیل پراجیکٹ	یکم اپریل ۱۹۵۱ء تک لاگت (روپے کروڑوں میں)	۱۹۵۱-۵۶ء کے دوران میں لاگت (روپے کروڑوں میں)
۱۔ سندری فرٹیلائزر فیکٹری	۱۸٫۴	۹٫۰
۲۔ چترنجن کا ریلوے انجنوں کا کارخانہ	۱۰٫۲	۴٫۷
۳۔ انڈین ٹیلیفون انڈسٹریز	۱٫۲	۱٫۳
۴۔ میسور آئرن اینڈ سٹیل ورکس کی توسیع	۲٫۲	۲٫۸
۵۔ یو۔پی گورنمنٹ سیمنٹ فیکٹری	۱٫۵	۲٫۳
۶۔ نیپا ملز مدھیہ پردیش	۲٫۲۵	۲٫۰
۷۔ سرسلک لمیٹڈ	۳٫۸۱	۲٫۰
۸۔ مشین ٹول پروٹوٹائپ فیکٹری	ابھی معین نہیں	ابھی معین نہیں
نئے پراجیکٹ	**۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء تک لاگت**	**مجموعی لاگت**
۹۔ لوہا اور فولاد	۳۰٫۰	۸۰٫۰

	۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء تک لاگت	مجموعی لاگت
۱۰- مشینی اوزاروں کی فیکٹری	۹٫۷۸	۹٫۷۸
۱۱- ہندوستان شپ یارڈ لمیٹڈ	۱۴٫۰۸	۱۸٫۱۵
۱۲- آل سٹیل انٹیگرل کوچ فیکٹری	۴٫۰۰	۴٫۰۰
۱۳- پنسلین فیکٹری	۲٫۱۱	۲٫۱۱
۱۴- ہندوستان کیبلز لمیٹڈ	۱٫۳۰	۱٫۳۰
۱۵- منڈی سالٹ ورکس	۱٫۰۰	۱٫۰۰
۱۶- نیشنل انسٹرومنٹس فیکٹری	۱٫۸۶	۱٫۸۶
۱۷- ریڈار اور وائرلیس پراجیکٹ (ڈیفنس)	میسر نہیں	۷٫۰
۱۸- بجلی کا بھاری پلانٹ پراجیکٹ	۷٫۰۰	۲۸٫۰

(اس پر روپیہ پلان میں فراہم کی ہوئی
پچاس کروڑ کی رقم میں سے لگایا جائیگا)

س - کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان پراجیکٹوں کا انتخاب کسی حد تک ہی سہی موجودہ صنعتی ڈھانچے کے عدم توازن کو ٹھیک کرتا ہے؟

ج - جی ہاں! اس کی اہمیت اس سلسلے میں ضرور ہے - اگرچہ انتخاب کرتے وقت صرف اسی پہلو ہی کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا ہو - عدم توازن مکمل طور پر نجی اور سرکاری حلقے کی توسیع و ترقی ہی سے ٹھیک ہو سکتا ہے -

س - کون کون سی بڑی صنعتیں نجی کوششوں میں شامل کی گئی ہیں؟

ج - صرف ان صنعتوں کے علاوہ جو اپریل ۱۹۴۸ء کے انڈسٹریل پالیسی ریزولیوشن کے تحت صرف حکومت ہی کی توسیع و ترقی کے لئے وقف کر دی گئی ہیں - مثلاً اسلحہ اور بارود کی طیاری ایٹمی قوت کی پیداوار اور اس کا کنٹرول اور ریلوے ٹرانسپورٹ کے انتظام اور ملکیت کے علاوہ باقی تمام صنعتی میدان نجی کوششوں کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے - اگرچہ بعض اور صنعتوں مثلاً کوئلہ، لوہا اور فولاد، ہوائی جہازوں کی طیاری، سمندری جہازوں کی طیاری، ٹیلی فون، تار اور تار برقی کے آلات اور معدنی تیلوں کی طیاری میں حکومت ان کی توسیع و ترقی کے لئے ذمہ دار ہوگی - تاہم اس میدان میں پرائیویٹ کوششوں کے داخل ہونے کی گنجائش رکھی گئی ہے اور یہ گنجائش تعاون کی اس حد تک ہے جس حد تک حکومت ضروری خیال کرے - مثال کے طور پر مرکزی حکومت نے حال ہی میں نجی صنعت کاروں کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ معدنی تیلوں کی صنعت کو توسیع و ترقی دیں اور لوہے اور فولاد کی پیداوار کو بڑھائیں - اگرچہ ان دونوں میدانوں میں توسیع و ترقی کا کام حکومت کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے - بعض ایسے پراجیکٹوں کی حالت میں بھی جن کی توسیع و ترقی کا کام حکومت نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے - پرائیویٹ سرمائے کو حکومت کی طرف سے شرکت کی دعوت دی گئی ہے - اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈیفنس کی صنعتوں کو چھوڑ کر باقی صنعتی میدان مرکزی ضابطے اور کنٹرول کے تحت جیسا کہ ۱۹۵۱ء کے انڈسٹریز (ڈیولپمنٹ اینڈ ریگولیشن) ایکٹ میں موجود ہے، پرائیویٹ کوششوں کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے -

س - کیا نجی حلقے کو اس قدر آزادی دی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عوام کے سہارے دولت مند بنالے؟

ج - نہیں - اگرچہ صنعت کے میدان کا کافی حصہ نجی کوششوں کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے تاہم اس طرزِ عمل پر کچھ پابندیاں ہیں - انڈسٹریز (ڈیولپمنٹ اینڈ ریگولیشن) ایکٹ کی دفعہ ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ کے تحت مرکزی حکومت کو یہ اختیارات حاصل ہیں کہ وہ صنعتی کوششوں کے کام کاج میں باز پُرس کر سکے اور بعض حالات میں اس مقصد کے پیشِ نظر کہ نجی کوشش کا طریقۂ کار پنج سالہ پلان کے سماجی مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ رہے اور اس کی بنیاد قومی مفاد پر رہے - پرائیویٹ کوششوں کو اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے - اس کے علاوہ انڈین کمپنی ایکٹ میں بعض ترمیمیں بھی تجویز کی جا رہی ہیں تاکہ صنعتی نظام زیادہ سے زیادہ ایک ایسی خدمت کے معیاروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے - جو صنعتی توسیع و ترقی کے کام میں اپنا مناسب حصہ ادا کر رہی ہے -

س - کیا پلان اس بات کی بھی سفارش کرتا ہے کہ پرائیویٹ کوشش کو بڑے پیمانے کی صنعتی توسیع کے کام ہاتھ میں لینے کی تحریک کی جائے -

ج - ایسی صنعتوں کا قیام جن میں بڑے پیمانے پر روپیہ لگایا جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ روپیہ کروڑوں تک پہنچ جاتا ہے قدرتی طور پر حکومت سے امداد لینے کا تقاضا کرتا ہے - اگر یہ امداد نہ ملے تو ہو سکتا ہے کہ روپیہ لگانے والے کے دل میں ان کوششوں میں حصہ لینے کے لئے ضروری اعتماد ہی پیدا نہ ہو سکے - پلان میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اس امر کو یقینی بنانے کے لئے سرمایہ سب سے اونچی ترجیح کے مصرف کے لئے استعمال ہوتا ہے خاص محرکات کا ایک طریقہ ضروری ہو سکتا ہے - مثلاً رعایتی نرخوں پر بجلی کی فراہمی، کچے مال اور بھاری سامان پر درآمد کے ٹیکس میں چھوٹ یا تحفظ کی یقین دہانی جیسا کہ پلان میں بیان کیا گیا ہے یہ محرکات "ہر انفرادی حالت

کی ضروریات کے مطابق منصفانہ طریقے پر استعمال کئے جائیں ۔

س ۔گزشتہ چند برسوں میں غیرملکی سرمائے کی آمد بہت کم کیوں رہی ہے اور کیا اب مقابلتاً تیز بہاؤ کے لئے حالات پیدا کر دئے گئے ہیں ؟

ج ۔کسی ملک کا سیاسی اور اقتصادی استحکام ٹیکس لگانے کی سطحیں اور پرائیویٹ کوششوں کے طرزِ عمل کے متعلق پالیسی ان چند عناصر میں سے ہیں جو کسی ملک میں غیرملکی سرمائے کی درآمد کی رفتار مقرر کرتے ہیں ۔گزشتہ چند برس میں ہندوستان میں غیرملکی سرمائے کی اضافی طور پر کم درآمد ہوئی ہے اس کی وجہ کسی حد تک ملک کی تقسیم اور آزادی سے پیدا ہونے والے سیاسی اور اقتصادی مستقبل کے متعلق غیرملکیوں میں محسوس کی جانے والی بے یقینی بھی ہو سکتی ہے ۔اب حال ہی میں اسکو (انڈین آئرن اینڈ سٹیل کمپنی) کے لوہے اور فولاد کی پیداوار میں وسعت اور دامودر ویلی کارپوریشن کی بجلی کی توسیع و ترقی کی امداد کے لئے قرضے کے بارے میں جو کامیاب گفت و شنید ہوئی ہے اور مٹی کا تیل پیدا کرنے والی دنیا کے تین بڑے کارخانوں میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ ملک میں مٹی کا تیل صاف کرنے کی صنعت میں غیرملکی سرمایہ لگایا جائے ۔تو یہ گویا اس امر کی جانب ایک اشارہ ہے کہ غیرملکی سرمایہ دار کو اس ملک کے مستقبل کے متعلق اعتماد پیدا ہوتا جا رہا ہے کمیشن کی یہ سفارش کہ پلان کی مدت کے دوران میں موجودہ صنعتوں کو توسیع دینے کے کام کو کم ترجیح دی جائے اور حکومت کی طرف سے اس سفارش کو منظور کر لینا ایک اور سبب ہے جس کے باعث غیرملکی سرمائے کی درآمد کے لئے فضا سازگار ہو گئی ہے ۔

ونا سپتی تیلوں کی معیار بندی

انڈین اسٹینڈرڈ انسٹی ٹیوشن کی طرف سے حال ہی میں ارنڈی ۔گری ۔بنولہ ۔مونگ پھلی ۔سرسوں اور تل کے تیلوں کی معیار بندی کی تصریحات شائع کی گئی ہیں ۔

بھارت میں مونگ پھلی ۔گری اور تل کے تیل ایک کثیر مقدار میں خام اور صاف شدہ حالت میں کھانے اور ونا سپتی تیلوں سے نکلنے والی اشیا کی تیاری میں استعمال کئے جاتے ہیں ۔اس کے علاوہ گری کا تیل مارجرین ۔سنگار کی اشیا اور صابن سازی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور گھی میں آمیزش پرکھنے کی غرض سے تل کا تیل ونا سپتی کو رنگ دینے کے کام آتا ہے ۔ان تیلوں سے بہت سی ادویہ بھی تیار کی جاتی ہیں ۔

بھارت میں سرسوں کے تیل کو خاص طور پر کھانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔اس لئے اس تیل کی دو حصوں میں درجہ بندی کرتے وقت اس میں چربی اور آرگیموں کی مقدار کو مدنظر رکھا گیا ہے ۔کیونکہ آرگیموں کو آمیزش کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے ۔البتہ سرسوں کا ادنیٰ قسم کا تیل اس معیار میں شامل نہیں کیا گیا ۔

بھارت میں بنولوں کا خام یا غیرصاف شدہ تیل کھانے کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا ۔بلکہ اسے صاف کر کے سلاد اور ونا سپتی تیلوں کی تیاری کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔دھلے ہوئے بنولوں کا تیل صابن سازی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے ۔اس لئے اس تیل کی معیار بندی کرتے وقت تیل کے مختلف گریڈوں کا خیال رکھا گیا ہے اور خام بنولوں کا تیل اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے ۔

بھارت سے ارنڈی کا تیل ایک کثیر مقدار میں برآمد کیا جاتا ہے اور توقع ہے کہ سمندر پار ممالک اور بھارت کے صارفین کے لئے یہ معیار اس کی اچھائی کا ضامن ہوگا ۔

رفتارِ زمانہ

فرقہ واریت ملک کی سب سے بڑی کمزوری ہے

ناگ پور میں بھارت سیوک سماج کے ایک بڑے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے کہا کہ اگر ہمیں بھارت میں سوشلسٹ طرز کا سماج قائم کرنا ہے تو ہم کو فرقہ واریت، ذات پات اور صوبائی تعصب کو اپنے ذہنوں سے نکال دینا ہوگا۔ شری نہرو نے اس امر پر زور دیتے ہوئے کہا کہ فرقہ واریت اور ذات پات ماضی میں بھی بھارت کی کمزوری کا باعث رہی ہیں، اور انھیں اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے ہمیں پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لئے اگر ہم ان کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے تو ہماری آزادی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اندرونی کمزوریوں کو دور کرنا ہم سب کا فرض اولین ہے۔ بھارت سیوک سماج کا ذکر کرتے ہوئے پردھان منتری نے کہا کہ بھارت سیوک سماج نے دیش کے تعمیری کام میں بہت بڑا حصہ ادا کیا ہے اور جنتا میں تعمیری کاموں کے لئے ایک جذبۂ جوش پیدا کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس لئے ہم سب کو اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہنا چاہیئے۔

بھارت اور کمبوڈیا کے مابین دوستانہ تعلقات

نئی دہلی میں بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو اور کمبوڈیا کے شاہزادہ نورودوم میں باہمی تبادلۂ خیالات کے بعد ایک مشترکہ اعلان جاری ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بھارت اور کمبوڈیا کی سرکاروں کا اس امر پر مکمل اتفاق ہے کہ ہند چین کے متعلق جنیوا میں جو سمجھوتے ہوئے ہیں اُن پر پوری طرح عمل ہونا چاہیئے اور کمبوڈیا کی آزادی کی برقراری، اس کے استحکام اور وہاں کے عوام کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش ہونی چاہیئے۔ علاوہ ازیں بھارت سرکار نے کمبوڈیا سے آمدہ ایک وفد کو اس امر کا یقین دلایا ہے کہ وہ کمبوڈیا کو ہر وہ امداد دینے کے لئے تیار ہے جو اُس کے بس میں ہو۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ بھارت اور کمبوڈیا کے مابین سفارتی تعلقات جلد از جلد قائم کر دئے جائیں۔

نیپال کے نئے مہاراجہ کی تخت نشینی، اور جنتا سے اپیل

نیپال کے چوبیس سالہ ولی عہد مہندر بیر بکرم شاہ دیو ۲۰ مارچ کو چار بجکر گیارہ منٹ پر نیپال کے تخت پر بیٹھ گئے اور اُن کے سر پہ ہیروں سے جڑا ہوا تاج رکھ دیا گیا۔ راج گدی پر بیٹھتے ہی اپنے پہلے شاہی فرمان میں مہاراجہ نیپال نے نیپال کے لوگوں سے اپیل کی کہ اسٹیٹ کی از سرِ نو تعمیر میں تعاون کرنے کے لئے آپس میں متحد ہو جائیں۔ اس موقع پر کمانڈر ان چیف نے اپنی تقریر میں سورگیہ مہاراجہ نیپال کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور نئے مہاراجہ کی وفاداری کا حلف لیتے ہوئے جنتا سے اپیل کی کہ وہ اپنے نئے تاجدار کو وفادارانہ تعاون پیش کریں۔

جاپان بھارت کے نقشِ قدم پر

جاپان کے وزیر اعظم مسٹر ایچیرو ہٹویاما نے اعلان کیا کہ جاپان بھارت کے اصول "جیو اور جینے دو" پر جہاں تک ہو سکے عمل کرنے کی کوشش کرے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہم عالمی کشیدگی کو کم کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اگر پانچ اصولوں پر عمل درآمد کے عالمی امن کو حاصل کیا جا سکے تو نہایت بہتر ہے۔ ہم پنچ شیلا کے اصول پر غور کر رہے ہیں۔ جاپانی وزیر اعظم نے یہ بھی کہا کہ موجودہ وقت میں عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ امن طاقت کے ذریعے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جاپان کے لوگ دوستی اور باہمی رواداری کے ذریعے سے مستقل امن کے خواہش مند ہیں۔

عرب اور غیر عرب ممالک کے فوجی معاہدے سے مصر کا اختلاف

مصر کے نیشنل گائیڈینس کے وزیر میجر سلیم نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ مصر عرب اور غیر عرب دیشوں کے درمیان فوجی گٹھ جوڑ کی برابر مخالفت کرتا رہے گا۔ آپ نے کہا کہ مصر عرب ممالک کے بارے میں اپنی کوئی تبدیلی نہیں کرے گا اور یہ پالیسی عرب ممالک کی یکجہتی اور غیر ممالک کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ نہ کرنے پر مبنی ہے۔

بھارت میں غلّے کی افراط

بھارت کے وزیرِ خوراک شری اجیت پرشاد جین نے لوک سبھا میں اعلان کیا کہ بھارت کے طول و عرض میں گیہوں کی علاقائی نقل و حرکت پر جو بھی پابندیاں تھیں فی الفور ختم کر دی گئی ہیں اور اب بمبئی اور کلکتے کے شہروں میں بھی آٹا پیسنے والے کارخانوں کو عام اجازت ہو گئی ہے کہ وہ کھلی مارکیٹ سے دیسی گندم خرید سکیں۔ وزیرِ خوراک نے ہاؤس کو یہ بھی بتایا کہ امسال راجستھان، پنجاب، پیپسو اور اُتر پردیش کی فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ سیٹھ گووند داس کے سوال پر شری جین نے کہا کہ جہاں گیہوں کا بھاؤ دس روپے فی من سے بھی کم ہے وہاں حکومت خود دس روپے فی من کے بھاؤ گندم خریدنے کے سوال پر غور کر رہی ہے۔

سندھ چیف کورٹ کے خلاف اپیل منظور

پاکستان فیڈرل کورٹ کے فل بنچ نے مولوی تمیز الدین خاں کے دائر کردہ کیس میں سندھ چیف کورٹ کے فیصلے کے خلاف حکومت پاکستان کی اپیل منظور کر لی ہے۔ سندھ چیف کورٹ نے مولوی تمیز الدین صدر پاکستان آئین ساز اسمبلی کی درخواست پر آئین ساز اسمبلی کو توڑنے کے متعلق گورنر جنرل پاکستان کے حکم کو ناجائز قرار دیا تھا۔ پاکستان بھر میں فیڈرل کورٹ کے اس فیصلے پر اطمینان کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کا روشن مستقبل

ریاست جموں و کشمیر کے وزیرِ خزانہ شری گردھاری لال ڈوگرہ نے سال ۵۶-۱۹۵۵ء کا جو بجٹ پیش کیا ہے اُس کی تمام حلقوں میں تعریف کی جا رہی ہے۔ بجٹ کا سب سے قابلِ تعریف پہلو یہ ہے اُس میں ریاست کے لوگوں پر کوئی نیا ٹیکس عائد نہیں کیا گیا۔ بجٹ کے مطابق اس برس ریاست کی کل آمدنی ۵ کروڑ ۸۲ لاکھ ۶۲ ہزار ہوگی جو سالِ رواں کی ترمیم شدہ آمدنی سے بقدر ۲۰ لاکھ ۸۹ ہزار زیادہ ہے۔ خرچ کا اندازہ ۵ کروڑ ۵۰ لاکھ ۲۲ ہزار ہے۔ بچت کو پنج سالہ پلان پر خرچ کیا جائے گا۔

بھارت اور امریکہ کے درمیان دوستی ضروری ہے

بھارت میں امریکہ کے نامزد سفیر مسٹر جان کوپر نے بھارت روانہ ہونے سے پیشتر کہا کہ وہ بھارت اور امریکہ کے تعلقات کو مزید بہتر بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ پریذیڈنٹ آئزن ہاور اور وزیرِ خارجہ دونوں کی یہ رائے ہے کہ دنیا کے ممالک میں بھارت کی اہمیت بہت اہم ہے۔ امریکہ اور بھارت دونوں جمہوری ممالک ہیں اس لئے دنیا کی شانتی کے لئے ہر دو ممالک کے درمیان اچھے تعلقات قائم رہنے نہایت ضروری ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر کا بھارت سے مکمل الحاق

کل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکرٹری بخشی عبدالرشید نے اس بات کو پھر دہرایا ہے کہ کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق ہر لحاظ سے مکمل ہے اور ریاست کی نمائندہ جماعت آئین ساز اسمبلی نے کشمیری عوام کے جذبات کی صحیح طور پر ترجمانی کرتے ہوئے اس فیصلے پر مہرِ تصدیق ثبت کر کے اپنا راستہ ہمیشہ کے لئے صاف کر دیا ہے۔ موجودہ حکومت کے ترقی پرورانہ اقدامات کی تعریف کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ تھوڑی سی مدت میں ہی ہماری نئی حکومت نے ریاستی عوام کی معاشی اور اقتصادی حالت کو سدھارنے کے لئے جو قدم اُٹھائے ہیں جنتا اُن سے پوری طرح مطمئن ہے اور انتہائی جوش و خروش سے گورنمنٹ کے تعمیری کاموں میں ہاتھ بٹا رہی ہے۔

امریکہ میں اُردو کی تعلیم کا انتظام

امریکہ میں ایشیائی زبانوں کو سیکھنے میں عوام کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں کے اس شوق کے پیشِ نظر سینٹ باربرا کالج واشنگٹن اور کیلی فورنیا یونیورسٹی میں امسال موسمِ گرما سے اُردو کی تعلیم کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں امریکہ میں بھارت کی تاریخ، سیاست اور تہذیب و تمدن کے مطالعے کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے۔

جرمنی کی جدید اسلحہ بندی کے لئے فرانس کا اتفاق

جرمنی کی ازسرِ نو اسلحہ بندی کے سوال پر ایک عرصے سے کھینچا تانی چلی آ رہی تھی۔ امریکہ اور برطانیہ نے کئی مرتبہ اسے اس مسئلے پر رضامند کرنے کی کوشش کی لیکن فرانس اسے اپنے لئے زندگی اور موت کا سوال سمجھتا تھا۔ کئی وزارتیں بنیں اور بگڑیں مگر یہ اُلجھن حل نہ ہوئی۔ اس دفعہ بھی کچھ کہنا مشکل تھا کہ فرانس کی سینیٹ میں اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ لیکن روس کے وزیرِ اعظم بلگانن کی طرف سے چار بڑی طاقتوں کی کانفرنس میں شامل ہونے پر اظہارِ رضامندی اور فرانس کے وزیرِ اعظم کی زبردست اور پُرازدلائل تقریر نے پانسہ پلٹ دیا اور سینیٹ نے بھاری کثرتِ رائے سے جرمنی کی ازسرِ نو اسلحہ بندی کے حق میں فتویٰ دے دیا۔ اس سلسلے میں امریکہ اور برطانیہ نے فرانس کو یقین دلا دیا تھا کہ جونہی فرانس جرمنی کی اسلحہ بندی کے حق میں فیصلہ دے گا تینوں بڑی طاقتیں اصولی طور پر روس کے ساتھ گفت و شنید کرنا منظور کر لیں گی۔ فرانس کو یہ بھی یقین دلا دیا گیا تھا کہ اُس کی شمولیت کے بغیر کسی طرح کی بات چیت شروع نہ ہوگی۔

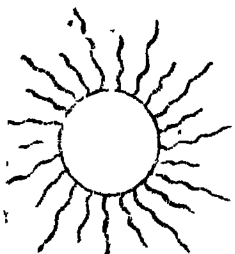


بچوں کا آج کل



گرمی

اظہار ملیح آبادی







لو پھر گرمی کی رُت آئی — سُورج نے اگنی برسائی
دھرتی کے مُنہ پر ہے پسینہ — ایک برس ہے ایک مہینہ
دریا پیاسے ندیاں پیاسی — پربت کے مُکھڑے پہ اُداسی
ہانپ رہے ہیں کھیت اور میلا — اُجڑے رستے سُونی گلیاں
گائیں، بھینسیں، بیل اور خچر — سب کو جینا ہو گیا دوبھر
اُتر گئے پیڑوں سے جھولے — پنچھی باغ کا رستہ بھُولے
ہریالی نے ناتہ توڑا — باغ نے پہنا پیلا جوڑا
سوکھی شاخیں ڈول رہی ہیں — پیلے پتّے رول رہی ہیں
ملّاحوں نے پاؤں پسارے — سوکھ گئے ندیوں کے کنارے
پربت سے وہ آندھی اُٹھ کر — تان رہی ہے لُو کی چادر
گرمی کا اب پَو بارہ ہے — ہر ذرّہ اک انگارہ ہے
دل پر ایسی سُستی چھائے — بیٹھے بیٹھے نیند آ جائے
گرمی تو آتی ہی رہے گی — آ آ کر جاتی ہی رہے گی

ہم کیوں اپنا وقت گنوائیں
آؤ اب اسکول کو جائیں

شیریں امام

کسان کی عقل مندی



ایک دفعہ کسی تہوار کے موقع پر کچھ کسان بیٹھے آپس میں بات چیت کر رہے تھے - اتنے میں گاؤں کا ایک دوکاندار بھی وہاں آپہنچا اور لگا ڈینگیں ہانکنے -

میں یہ ہوں اور میں وہ ہوں اور میں تو جاگیردار کے مہمان خانے میں ہو آیا ہوں -

اس کی یہ بات سُن کر ایک سب سے غریب کسان نے اس پر طعن کیا بڑا کمال کیا کہ جاگیردار کے مہمان خانے میں ہو آئے ! میں اگر چاہوں تو جاگیردار کے ہاں دعوت اُڑا سکتا ہوں -

دُکان دار کو یہ بات بُری لگی اور اس نے تاؤ میں آکر کہا -

ارے تم ! اور جاگیردار کے دستر خوان پر کھانا کھاؤ ! میں یہ کبھی نہیں یقین کر سکتا -

غرض کہ بڑی دیر تک تکرار ہوتی رہی - آخر غریب آدمی نے کہا - میں شرط لگاتا ہوں کہ جاگیردار کے ساتھ کھانا کھا کر دکھلا دونگا - تم اپنی کالی اور کبھتی گھوڑی بازی پر لگادو - اگر میں شرط ہار گیا تو تمھارے ہاں تین برس نوکری کروں گا اور ایک کوڑی بھی نہ لونگا

دکان دار کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا -

مجھے یہ شرط منظور ہے - میں تمھیں دو گھوڑیوں کے علاوہ ایک بچھڑا بھی دونگا - میں سب لوگوں کے سامنے قول دیتا ہوں - یہ سب گواہ ہیں -

چنانچہ شرط لگ گئی اور گواہ بھی ہو گئے -

غریب کسان اب جاگیردار کے ہاں گیا اور بولا

"حضور - میری ٹوپی کے برابر کچے سونے کے ڈلے کی کیا قیمت ہوگی ؟

جاگیردار نے کوئی جواب نہیں دیا - اس نے تالی بجا کر نوکر کو بُلایا -

"جلدی جا کر کچھ کھانے پینے کو لے آؤ - آج ہم اس دہقان کے ساتھ کھانا کھائیں گے" - پھر وہ اس سے مخاطب ہوا -

"بیٹھ جاؤ' بیٹھ جاؤ - تکلّف کی کوئی ضرورت نہیں - جی بھر کے کھاؤ"

غرض اس طرح کسان کی بڑی آؤ بھگت اور خاطر مدارات ہوئی.

جاگیردار سونے کا ڈلا حاصل کرنے کے لالچ میں مرا جا رہا تھا -

اچھا تو میرے دوست اب جلدی کرو - کہاں ہے وہ کچے سونے کا ڈلا - جلدی نکالو - تمھیں کچھ روپے مل جائیں گے -

" لیکن میرے پاس تو سونا ہے نہیں ! میں نے تو صرف اتنا پوچھا تھا کہ میری ٹوپی کے برابر کچّے سونے کے ڈلے کی کیا قیمت ہوگی ؟

جاگیردار کی آنکھ غصّے سے سُرخ ہو گئی - اس نے جھڑک کر کہا -

"نکل جا یہاں سے بے وقوف کہیں کا -

غریب کسان ہنسنے لگا - واقعی میں بڑا بے وقوف ہوں کہ ابھی آپ نے مجھے اپنا عزیز ترین مہمان بنا کر دعوت کھلائی اور اب اس دعوت کے بدلے دکاندار مجھے دو گھوڑیاں اور ایک بچھڑا دے گا"

اور کسان بڑا خوش خوش واپس چلا گیا -

اطہر پرویز

سانچ کو آنچ نہیں



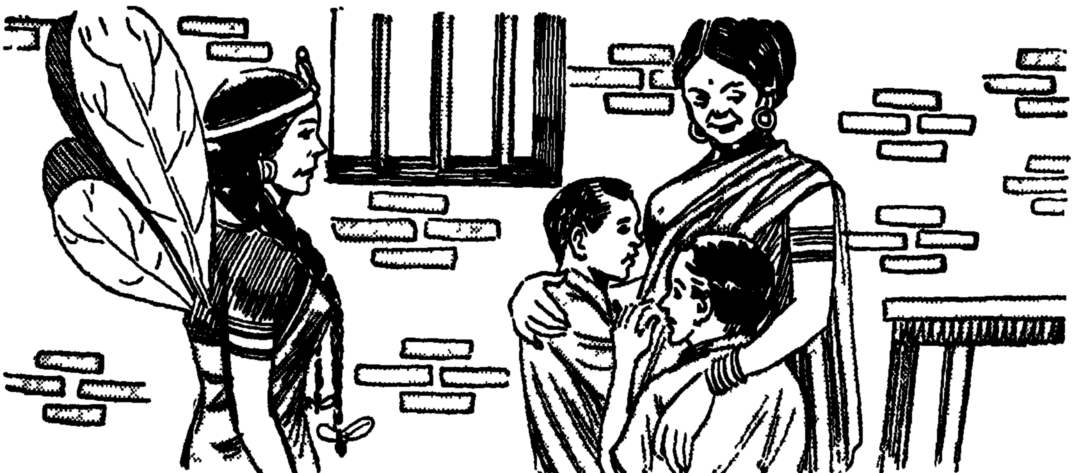
ایک لکڑہارا اور اس کی بیوی جنگل میں رہتے تھے۔ ان کے ایک چھوٹی لڑکی تھی جو بہت خوبصورت تھی۔ لیکن لکڑہارا بہت غریب تھا۔ بڑی مشکل سے گزر بسر کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے کئی کئی روز فاقے کرنے پڑتے تھے۔ ایک دن جب وہ بہت پریشان تھا تو ایک پری اس کے پاس آئی اور بولی۔ دیکھو تم بہت غریب ہو اگر تم چاہو تو لڑکی مجھے دے دو۔ میں اس کی پرورش اپنے بچے کی طرح کروں گی اور اس کے بدلے میں تم کو ایک ہزار اشرفیاں دوں گی —" لکڑہارا طیار ہوگیا اور اس نے ایک ہزار اشرفیاں لے کر وہ لڑکی پری کے حوالے کردی۔ پری اسے پرستان میں لے گئی۔ اس نے اس لڑکی کا نام رخسانہ رکھا۔ پرستان کیا تھا جنّت کا نمونہ تھا۔ عیش و آرام کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ رخسانہ کو اس پرستان میں رہتے رہتے پندرہ برس گزر گئے۔ اب رخسانہ بڑی ہوگئی اور پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت۔ ایک دن پری کہیں جانے لگی تو اس نے اپنے مکان کے تمام کمروں کی کنجیاں رخسانہ کے حوالے کردیں اور کہا کہ اس مکان کے ہر کمرے کو کھول سکتی ہو لیکن بس آخری کمرہ ہرگز نہ کھولنا۔

پری کے جانے کے بعد اس نے ایک ایک کمرے کو کھول کر دیکھا لیکن آخری کمرے تک جاکر وہ رک گئی۔ اور کئی روز تک اس کے اس کمرے کو اسی طرح رہنے۔ لیکن ایک دن اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس کمرے کو کھول کر دیکھوں پری کو کیا پتہ چلے گا کہ میں نے اسے کھولا ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اس نے ہمت کرکے اسے کھول ڈالا۔ لیکن جیسے ہی کھولا اس میں سے آگ کی لپٹیں نکلیں ایک لپٹ تو اس کی انگلی میں بھی لگی۔ اس نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔ اور دروازہ بند کرکے تالا لگا دیا لیکن اس نے اپنی انگلی میں جلنے کے بجائے ایک سونے کا چھلّا دیکھا۔ اب رخسانہ جتنا اس کو اتارنے کی کوشش کرتی اتنا ہی وہ اور کستا۔ ایک دن بعد پری بھی آگئی۔ اس نے آتے ہی رخسانہ سے پوچھا "بیٹی تم نے آخری کمرہ تو نہیں کھولا؟"

رخسانہ نے کہا "نہیں"

پری نے دوبارہ پوچھا اور پھر بھی اس نے یہی جواب دیا یہاں تک کہ تیسری بار پوچھنے کے بعد بھی اس نے یہی جواب دیا۔ اس وقت پری کی نظر رخسانہ کی انگلی پر پڑی اور اس نے کہا "رخسانہ تم نے کمرہ ضرور کھولا۔ یہ سونے کا چھلّا اس کی پہچان ہے۔ اب بھی سچ سچ بتادو۔ لیکن رخسانہ بھلا کب ماننے والی تھی۔ اس نے پھر بھی یہی کہا "میں نے نہیں کھولا"۔

اب تو پری کو بہت غصہ آیا۔ اور اس نے سارے کپڑے چھین لئے اور اسے جنگل بیابان میں چھوڑ دیا۔ رخسانہ نے اپنے بالوں سے اپنے جسم کو لپیٹ لیا۔ اتفاقاً اسی روز وہاں ایک بادشاہ شکار کے لئے اس جنگل میں آیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت لڑکی اپنے بالوں میں لپٹی ہوئی بیٹھی ہے۔ اس نے کبھی ایسی لڑکی نہ دیکھی تھی۔ وہ اسے اپنے محل میں لے آیا اور اس سے شادی کر لی۔
ایک سال کے بعد اس کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اگلے دن وہی پری آئی۔ اور اس نے رخسانہ سے وہی سوال کیا۔ "رخسانہ سچ بتا دو۔ تم نے وہ کمرہ کھولا"۔



رخسانہ نے پھر وہی جواب دیا۔ جو اس سے پہلے کئی بار دے چکی تھی۔ پری ناراض ہو کر بچے کو اٹھا کر لے گئی۔ اگلے روز سارے شہر میں کہرام مچ گیا لیکن یہ کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ بچہ کہاں گیا۔

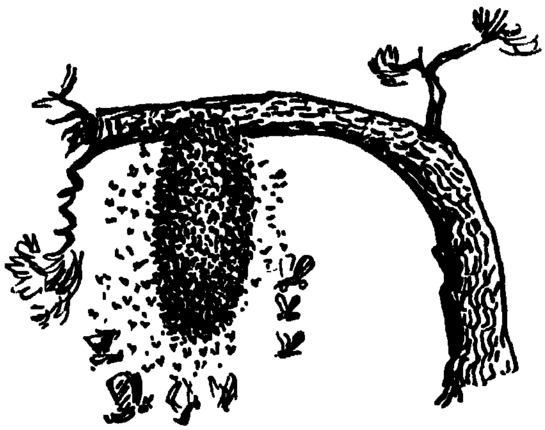
ایک سال بعد پھر ملکہ رخسانہ کے ایک اور لڑکا پیدا ہوا اور اس بار پھر رات کو وہی پری آئی اور اس نے وہی سوال کیا۔ رخسانہ نے اپنی عادت کے مطابق وہی جواب دیا۔ پری اس بچے کو بھی غصے میں آ کر اٹھا لے گئی۔ اب تو یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ملکہ آدم خور ہے لیکن بادشاہ پھر بھی اس سے محبت کرتا تھا۔ اس پہ کوئی اثر نہ پڑا۔

تیسرے سال رخسانہ کے پھر ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس بار پھر وہ پری آئی۔ اس نے کمرے کے بارے میں وہی سوال کیا۔ رخسانہ نے جھنجھلا کر کہا۔ میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ یہ جواب سن کر پری اس لڑکی کو بھی اٹھا کر لے گئی۔

اگلے روز یہ خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اب تو بادشاہ کو بھی یقین ہو گیا کہ یہ عورت ضرور آدم خور ہے اور اس نے حکم دے دیا کہ رخسانہ کو زندہ جلا دیا جائے چنانچہ لکڑی کے ایک ڈھیر پہ رخسانہ کو بٹھا دیا گیا۔ اور نیچے آگ لگا دی۔ لیکن جیسے ہی آگ لگی' اس نے سوچا کہ واقعی میں نے غلطی کی۔ کاش وہ پری مجھے اب مل جاتی تو میں اس سے سچ سچ کہہ دیتی کہ میں نے دروازہ کھولا تھا۔ اور جیسے ہی اس نے یہ سوچا' چاروں طرف بادل آ گئے اور خوب زوروں سے بارش ہوئی اور اسی میں پری آ موجود ہوئی۔ اس کے پیچھے دونوں بچے تھے اور گود میں لڑکی۔ پری نے خوش ہو کر وہ بچے اس کے حوالے کر دئے۔ اور سچ بولنے پر اُسے پیار کیا۔ اور رخسانہ اپنے بچوں کو پا کر بے حد خوش ہوئی۔

رتن سنگھ شاہی

شہد کی مکھیاں



پیارے بچو! اس مضمون میں تمہیں شہد کے فوائد اور شہد کی مکھیوں کا مکمل حال بتایا جائے گا۔ یہ تو تم سب کو معلوم ہی ہوگا کہ شہد کی مکھی جہاں ایک چھوٹی سی مخلوق ہے وہاں اس میں زہریلا مادہ بھی ہے۔ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بڑے بڑے درختوں خصوصاً پیپل اور بڑ کے درختوں پر شہد کی مکھیوں کے بڑے بڑے چھتے لگے ہوتے ہیں۔ جن پر مکھیاں بیٹھی ہوتی ہیں۔ تم میں سے بعض بچے مکھیوں کے ان چھتوں پر کنکر پھینکتے ہیں جس سے مکھیاں بھنبھنا کر اڑتی ہیں۔ اور کنکر مارنے والوں اور قریب سے گزرنے والوں کو ڈنک مارتی ہیں اور زہر اندر داخل کر دیتی ہیں پھر وہ جگہ سوج جاتی ہے اور انسان کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے مکھیوں کے چھتوں پر کنکر وغیرہ بالکل نہیں مارنے چاہئیں۔ کیوں کہ یہ مکھیاں اس قدر ہوشیار ہوتی ہیں کہ کنکر مارنے والے کے پیچھے بھاگتی ہیں، اور جب تک اسے ڈنک نہیں مارلیتیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اس لئے تم میں سے جو بچے مکھیوں کو چھیڑتے ہوں وہ آئندہ ہرگز ایسا نہ کریں۔ شہد کی ان مکھیوں میں شرارت کا مادّہ ہرگز نہیں ہوتا، اور اپنے آپ وہ کسی کو کچھ نہیں کہتیں۔ مگر جب انہیں چھیڑا اور تنگ کیا جاتا ہے تو وہ اس قدر کینہ ور ہو جاتی ہیں کہ اپنے زہر آلودہ ڈنکوں سے مل کر حملے کرتی ہیں اور ایذا پہنچانے والوں کو پہچان کر بدلہ لیتی ہیں۔ شہد کی مکھی ایک کیڑا ہے جو عام مکھی سے بہت بڑی ہوتی ہے۔ اس کے چھ ٹانگیں ہوتی ہیں۔ چار پچھلے حصّے میں اور دو اگلے حصّے میں۔ اس کے دو ڈنک بھی ہوتے ہیں۔ اس کا رنگ سنہری ہوتا ہے، اور چاروں طرف جسم پر کہیں کہیں سیاہ داغ ہوتے ہیں۔ شہد کی مکھیاں دنیا کے بہت سے حصّوں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ تین قسموں میں منقسم ہوتی ہیں۔ ملکہ۔ نر اور کام کرنے والی مکھیاں۔ ملکہ بڑی اور دیکھنے میں خوب صورت ہوتی ہے۔ اس کا حکم مانا جاتا ہے۔ اور شہد کی مکھیوں کا گروہ اس قدر سرگرمی سے اس کی پیروی کرتا ہے، گویا کہ وہ کوئی بڑا سردار ہے۔ نر زیادہ فربہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں کوئی کام نہیں کرتے، اور تمام دن ایک پھول سے دوسرے پھول پر اڑ کر تفریح کرتے رہتے ہیں۔ کام کرنے والی مکھیاں سب سے چھوٹی ہوتی ہیں، اور یہ ہی مکھیاں شہد بناتی ہیں۔ وہ پھولوں

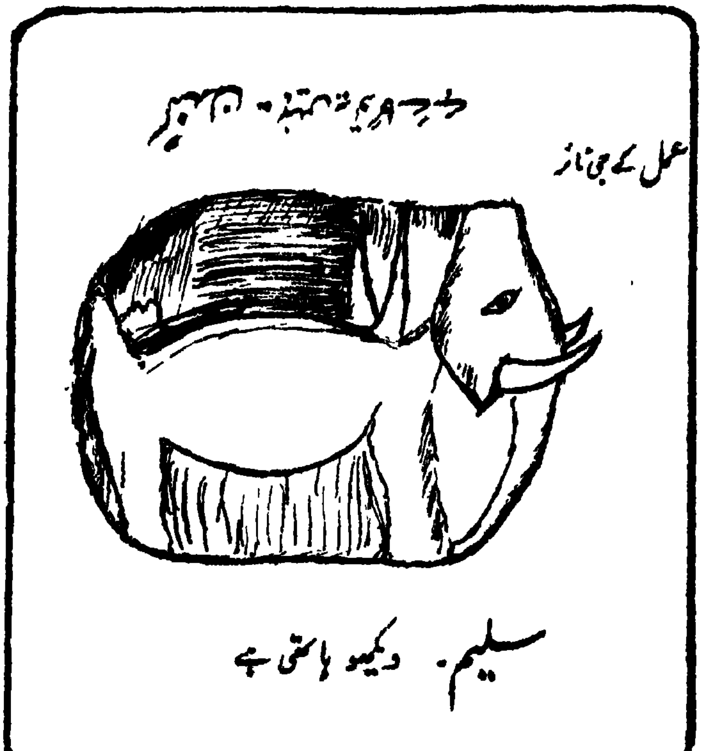
نے اندر کی مٹھاس چوس لیتی ہیں۔ رس شہد کی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں چلا جاتا ہے اور وہاں جا کر شہد بن جاتا ہے۔ چھتے پر پہنچ کر وہ اُسے شہد کی تھیلیوں سے باہر نکالتی ہیں۔ اور موسم سرما کے استعمال کے لئے جب تمام پھول مُرجھا جاتے ہیں اُسے کوٹھریوں میں بھر دیتی ہیں۔ ان کا چھتہ نہایت ہی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ اس میں چھ چھ کونوں والی سینکڑوں کوٹھریاں ہوتی ہیں۔ ملکہ مکھی انڈے دیتی ہے جن کو وہ کوٹھری کے سب سے آخری کونے میں رکھتی ہے۔ اور پھر اس کی بہت حفاظت کرتی ہے۔ کیوں کہ یہی اُن کا سرمایہ ہوتا ہے جو انھیں اپنی زندگی کی طرح عزیز ہوتا ہے۔ مکھیوں کے ان چھتوں سے شہد نکالنا بڑی ہوشیاری اور ہنر کا کام ہوتا ہے۔ اور شہد نکالنے والے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ان چھتوں سے شہد نکالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہد بہت قیمتی بکتا ہے۔

شہد انسانی صحت کے لئے بہت ہی مفید ہے۔ یہ کئی طرح کی بیماریوں اور مختلف اقسام کی اعصابی کمزوریوں کو دُور کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ شہد چونکہ گاڑھا ہوتا ہے۔ اس لئے بہت جلد فائدہ کرتا ہے۔ شہد کے اتنا مفید ہونے کے سبب شہد کی پیداوار بڑھانے کے لئے بہت بڑے پیمانے پر تجربات کئے جا رہے ہیں۔



جیمز ڈیومنٹ

اینٹا ردی بلجیم کا باشندہ جس کی ڈاڑھی بارہ فٹ لمبی ہے



سلیم۔ دیکھو ہاتھی ہے

سلیم مبشر علی

سونے کا لیموں

تین دوست روزگار سے تنگ آکر سفر کو چلے۔ اُن کے نام شارق، حسن اور موہن تھے۔ اُنھوں نے بہت کوشش کی کہ کہیں نوکری یا مزدوری مل جائے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسے مقام پر پہونچے جہاں ایک شہزادی حکومت کرتی تھی، شہزادی کا نام شاہینہ تھا۔ تینوں دوستوں نے ایک سرائے میں قیام کیا۔

جب دن ہوا تو انھوں نے آس پاس کے لوگوں سے روزگار کے بارے میں پوچھا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہاں روزگار کافی تھا مگر جس دن سے شہزادی کا لیموں چوری ہو گیا ہے، اُس نے سلطنت کے کاموں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی ہے۔ اب وہ نہ کوئی عمارت بنواتی ہے اور نہ کوئی باغ لگواتی ہے۔ تجارت اور صنعت وحرفت سب کام بند پڑے ہیں شہزادی بغیر سونے کے لیموں کے بہت اُداس رہتی ہے اور نہ معلوم کب تک یہ سلسلہ چلے گا۔

شارق۔ بھئی! اس سونے کے لیموں میں آخر کیا بات تھی جو شہزادی اس قدر اداس ہے!

حسن۔ سونے کا لیموں نہ ہوا بکاؤلی کا پھول ہو گیا۔

موہن۔ معلوم ہوتا ہے کہ شہزادی کو کسی نے تحفے کے طور پر دیا تھا۔

سرائے کا ایک شخص۔ بھئی! یہ لیموں ایک شہزادے نے اُس کو دیا تھا، اور اگر یہ غائب نہ ہوتا تو شاید شہزادی اُس شہزادے کے ساتھ شادی کرتی۔



دوسرا شخص۔ مگر اب تو شہزادی اور سارے درباری اس قیمتی لیموں کے چوری ہو جانے کی وجہ سے ماتمی لباس پہنے ہوئے ہیں۔

تیسرا شخص۔ اور یہ کسی کو نہیں معلوم کہ لیموں خود شہزادی کے وزیر نے چرایا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں بغل میں لڑکا شہر میں ڈھنڈورا۔

پہلا شخص۔ لیکن بھائی کس کی ہمت ہے جو کہہ دے۔ ورنہ لیموں کا ملنا کچھ دشوار نہیں۔

تینوں دوست اس بات پر غور کرنے لگے، اور دوسرے دن شہزادی کے دربار میں پہونچے۔ شہزادی نے اُن سے پوچھا "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

شارق ۔ ہم علمِ جوتش کی مدد سے بہت سی باتیں بتا دیتے ہیں جو اور لوگوں کو معلوم نہیں ہیں ۔

حسن ۔ ہم چوری کرنے والوں کا پتہ چلاتے ہیں ۔

موہن ۔ ہم صرف اشاروں میں راز کی بات بتا دیتے ہیں ۔

شہزادی شاہینہ ۔ اچھا بتائیے ہمارا سنہری لیموں جس کے اندر جواہرات بھرے تھے کس نے چُرایا ہے ۔ اگر آپ لوگوں نے صحیح بتلا دیا تو بہت سا انعام دیا جائے گا ۔

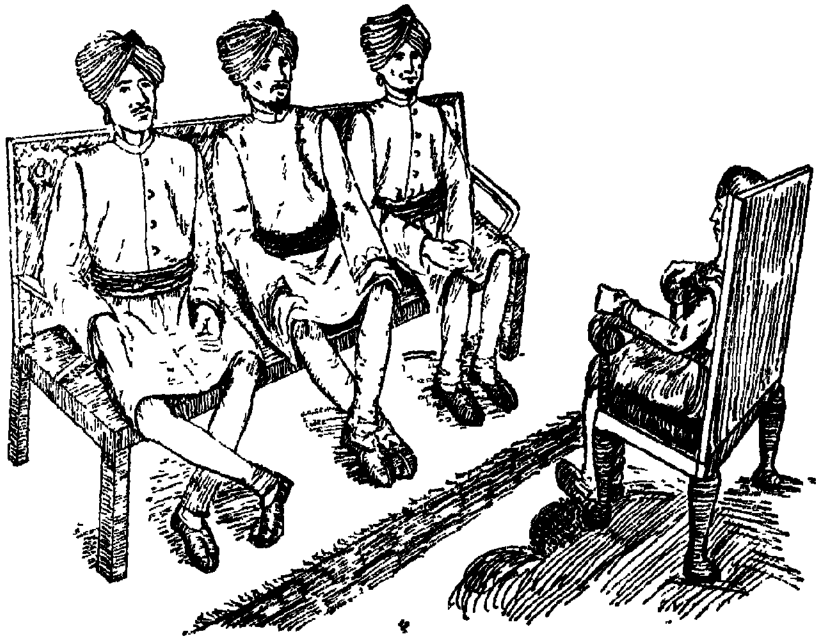
تینوں دوستوں نے کہا کہ ہم کل بتلائیں گے ۔ آپ سب درباریوں کو حکم دے دیں کہ وہ دربار میں حاضر ہوں اور وقتِ مقررہ پر وزیر بھی موجود ہوں ، اور کچھ عام لوگوں کو بھی آپ دُور سے دیکھنے کی اجازت دے دیں تو اچھا ہے ، شہزادی شاہینہ تیار ہو گئی ، اور دوسرے دن کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی ۔ دوسرے دن تینوں دوست آگئے ، اور بھرے دربار میں اس طرح چلا کر کہنے لگے ۔

شارق ۔ گول گنبد گوں

حسن ۔ رنگ زرد گوں

موہن ۔ نام لیموں

اور فوراً موہن نے وزیر کا ہاتھ پکڑ لیا ، اور کہا کہ ہمارا جوتش یہ بتاتا ہے کہ لیموں آپ کے پاس ہے ، اُس کو جلد واپس کیجئے ۔ وزیر نے شہزادی کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا ، اور خطا کی معافی چاہی شہزادی نے وزیر کی خطا معاف کر دی ، اور اپنا سنہری لیموں واپس لے لیا ۔ تینوں دوستوں کو بہت سا روپیہ انعام میں دیا ۔ اور مناسب جگہوں پر ملازم رکھ لیا ۔



لطیفہ

والد ۔ تمہاری تعلیم کا اب کیا حال ہے ؟

لڑکا ۔ ماسٹر کے کہنے کے مطابق ترقی کر رہا ہوں ۔

والد ۔ شاباش ! جماعت میں تمہارا کیا نمبر ہے ؟

لڑکا ۔ آٹھویں نمبر سے اب سولھویں نمبر پر آگیا ہوں ۔


it's SUMMER
لو گرمیاں آگئیں!
گرمیوں کے موسم میں عموماً آپ کا جی کسی کام پر نہیں لگتا اور آپ بے حد پیاس اور تھکاوٹ محسوس کرتے ہیں۔
"روح افزا" کا ایک گلاس آپ کو از سرِ نو تازہ دم اور بشاش بنا سکتا ہے۔ یہ پیاس کو بجھاتا ہے۔ تھکاوٹ کو دور کرتا ہے۔ اور جسم میں تازگی اور فرحت پیدا کرتا ہے۔ یہ تازہ پھلوں کے رس، جڑی بوٹیوں اور پھولوں کے عرق سے تیار ہوتا ہے۔ اور وٹامن بی سے بھرپور ہوتا ہے۔ ہر روح افزا کا گلاس آپ کے جسم کو ۱۵۰ کلوریز طاقت بخشتا ہے۔
روح افزا
فرحت بخش اور تسکین دہ
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی۔
کتابچہ مشروبِ مشرق اپنے شہر کے اسٹاکسٹوں سے مفت طلب فرمائیں۔

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوشؔ ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرشؔ ملسیانی

جلد ۱۳ —— نمبر ۱۱

سالانہ چندہ:- —— ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- —— ہندوستان میں آٹھ آنے
پاکستان میں آٹھ آنے (پاک)

جون ۱۹۵۵ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱- دہلی

ترتیب

بچّوں کا آج کل

سرورق:- مشہور سائنس دان آئنسٹائن جو وفات پاگئے۔

عبدالمجید حیرت

غزل

آج کے ہیں پابند نہ کل کے ۔۔۔ پیکر ہیں جو لوگ عمل کے
دوسروں پر پتھر تو نہ پھینکیں ۔۔۔ رہنے والے شیش محل کے
کیا معلوم کہ برسیں گے بھی ۔۔۔ آتو رہے ہیں دل بادل کے
ایسے بھی ظالم ہوتے ہیں ۔۔۔ رکھ دیتے ہیں پھول مسل کے
شمع پہ کوئی آنچ نہ آئی ۔۔۔ خاک ہوا پروانہ جل کے
بنتی ہے اِنسان کی سیرت ۔۔۔ غم کے سانچے میں ڈھل کے
راہِ عمل میں کانٹے بھی ہیں ۔۔۔ چلیئے گا سرکار سنبھل کے
ہوگئے دو ہی دن میں دیکھا ۔۔۔ کیا سے کیا حالات بدل کے
کچھ جھگڑے ایسے ہیں جن کا ۔۔۔ فیصلہ ہوگا آگے چل کے

کیا معلوم کہاں تک پہنچے
مُنہ سے حیرتؔ بات نکل کے

منظور الحسن برکاتی

غالب کی ایک نادر فیصلہ کن تحریر

ما طفل کم سواد و سبق قصہ ہائے دوست
صد بار خواندہ و دگر از سر گرفتہ ایم

اُنیسویں صدی کے باکمال شعراء میں مرزا غالب ہی کی ایسی خوش نصیب شخصیت ہے جس کی زندگی کے ہر ہر گوشہ کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اُن کے معتقد و پرستار اس کے کلام، اس کے خطوط اور مضامین حتیٰ کہ زبان و قلم سے نکلے ہوئے گم شدہ الفاظ و حروف بھی محفوظ و مدون کرنے میں سرگرم ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ غالب نے اردو ادب کو جو عظیم الشان اور بلند خیالات عطا کئے ہیں۔ وہ اسی کے متقاضی ہیں کہ ان کے تمام ادبی شہ پاروں کو زمانہ کی دست برد سے محفوظ اور غیر فانی بنا دیا جائے۔

غالب کے فکر کی وسعت اور خیال کی بلندی کے مقام تک اُردو ادب کے آسمان میں ابھی تک کوئی پہنچا نہیں ہے بین الاقوامی زبانوں کی دنیا میں دوسرے شعراء کے مقابلے میں غالب کا مقام کیا ہے؟ یہ مضمون ابھی تشنۂ تبصرہ ہے۔ غالب کے تعلقات اور اُس کے احول کی تحقیق و تجسس میں ابھی تک شیفتگانِ غالب لگے ہوئے ہیں اور جوئندہ یابندہ کے مصداق ہندوستان کے طول و عرض میں گم شدہ اوراق دستیاب بھی ہو رہے ہیں۔ زیر نظر مضمون غالب کے بعض قصائد کی ترسیل سے متعلق ہے۔

ایک مدت سے یہ مسئلہ موضوعِ بحث بنا ہُوا ہے کہ مرزا غالب نے نواب وزیر الدولہ محمد وزیر خاں والی ٹونک کی مدح میں جو قصائد لکھے ہیں، ان کی تاریخ ارسال کیا ہے

محققین غالب، مولانا غلام رسول مہر، اور مولانا امتیاز علی عرشی بھی اس بارے میں متفق نہیں ہیں

مولانا مہر، قصیدوں کی تاریخ ارسال ۱۲۷۸ھ بتاتے ہیں۔

" نواب وزیر الدولہ بہادر والی ٹونک کی مدح میں دو قصیدے ہیں۔ پہلا قصیدہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں بھیجا گیا تھا اس وقت غالب کی عمر چونسٹھ، پینسٹھ برس کی تھی۔"

غالب از مہر صفحہ ۲۲۱

عرشی صاحب نے علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں " غالب کی سخن گوئی" پر جو بیر حاصل مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ اس مقالے میں " دواوین فارسی" کے تاریخی تعین کے ذیل میں کتب خانہ رام پور کے ایک قلمی نسخے کا تذکرہ فرمایا ہے اور اس کی تاریخِ کتابت پر بحث کرتے ہوئے غالب کے ان قصیدوں کا بھی ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

" کتاب خانہ رام پور کا یہ قلمی نسخہ ۱۲۶۱ھ کے مطبوعہ نسخے کی نقل ہے۔ یا یہ دونوں نسخے ایک ہی مسودہ سے منقول ہیں۔ اور تقریظ کے سنین ۱۲۵۳ھ میں ۱۲۶۳ھ والے نولکشوری نسخے کی طرح ردّ و بدل نہیں کیا گیا ہے۔

اس کتاب کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مرزا صاحب کی غزل

اے ذوقِ نواسنجی بازم بخروش آور

جو ۴ اکتوبر ۱۸۵۵ء کی رات میں لکھی گئی تھی۔ اس نسخہ میں موجود نہیں ہے۔

اس فیصلہ پر صرف یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ رام پور کے اُس قلمی نسخہ کے صفحہ ۱۸۵ پر نواب وزیر الدولہ وزیر محمد خاں

بہادر والیٔ ٹونک کی مدح کا قصیدہ درج ہے جو مولانا عرشی کے خیال میں ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء کو ٹونک بھیجا گیا تھا، پھر یہ نسخۂ ۱۲۶۱ھ کے مخطوطہ سے کیا علاقہ رکھ سکتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ وزیر الدولہ والا قصیدہ صرف اسی نسخہ میں نہیں، کلیات فارسی کے اس نسخہ میں بھی موجود ہے جو نواب فخر الدین خاں مرحوم کا نوشتہ ہے اور ۳۰ مارچ ۱۸۶۱ء کو رام پور پہنچ گیا تھا۔

۱۲۷۷ھ تقریباً ۱۴ جولائی ۱۸۶۱ء کو شروع ہوا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ ۳۰ مارچ ۱۸۶۱ء کو رمضان ۱۲۷۷ھ ہوگا۔ اگر یہ قصیدہ ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء میں ٹونک جاتا تو اس نسخہ میں اس کا ہونا ممکن نہ تھا، اسی طرح ٹونک کا دوسرا قصیدہ بھی اسی ثانی الذکر نسخہ میں موجود ہے۔ لہٰذا اس کو بھی ۱۲۷۷ھ سے قبل کا ہونا چاہیئے!"

علی گڑھ میگزین ۴۹-۱۹۴۸ء صفحہ ۱۱

بہر حال ہر دو محققین تاریخ ارسال قصائد کے بارے میں "مضطرب" ہیں اور یہ "تاریخی اضطراب" حل نہ ہو سکا۔

میں ایک مدّت سے کتب خانۂ وزیری و دفتر منشی خانہ ریاست ٹونک کے کاغذات و فائل "ادبی شہ پاروں" کی تلاش میں کھنگال رہا تھا کہ مرزا غالب کی ایک رسید بطرز عرضداشت نظر پڑی، اپنی کاوش کے اس انجام پر خدا کا شکر ادا کیا۔

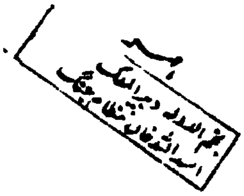
عرضداشت کی نقل حسب ذیل ہے (اس مضمون کے ساتھ اس کا عکس بھی شائع کیا جا رہا ہے)

عرضداشت بندۂ درگاہ اسد اللہ

بحضور مکرمت ظہور بندگان والا و دیان حضرت نواب صاحب قبلہ و کعبہ دو جہان
قلزم فیض و محیط احسان دام اقبالہٗ

معروض برایں کہ روزے چند ازیں پیش عرضداشتی با قصیدہ کہ در تہنیت

عید سعید ذی الحجہ فرو ریختۂ کلک نیاز صریر بود، بتوسط خاں صاحب الطاف نشاں میر تفضل حسین خاں ارسال یافتہ، امروز کہ چہاردہم صفر ۱۲۶۶ھ است خانصاحب مشفق طالع یار خاں منشور کرامتے کہ متضمن بشارت خطاب خدائگان بوصول داشت بمن سپردند، و مبلغ چہار صد و پنجاہ و سہ روپیہ سکۂ انگریزی کہ حد یک قلمرو روائے دارد نیز حوالت کردند، سپاس یاد آوری و شکر دہش پرودری بجائے آوردم، یا رب ولی نعمت را عمر و دولت و جاہ و مکنت فراوان، و رفقا امیر المومنین مشرف نامۂ اقبال خداداد و را زیب عنوان باد



غالب کی اس تحریر نے "عید اضحیٰ" والے قصیدے کی تاریخ کا تو فیصلہ کر دیا کہ یہ قصیدہ ذی الحجہ ۱۲۶۵ھ میں ارسال کیا گیا تھا، اور اس سال عید اضحیٰ موسم سرما کے آغاز ہی میں آئی تھی۔ جیسا کہ خود غالب نے قصیدے کی تشبیب میں کہا ہے۔

عید اضحیٰ بہ سر آغاز زمستان آمد — وقت آراستن حجرہ و ایوان آمد
گرمی از آب بدر رفت و حرارت ز ہوا — محمل مہر جہاں تاب بہ میزان آمد
روزی کاہید شب راست و افزایش زد — موسم دیر غنودن بہ شبستان آمد
آذر افروختند خز و اطلس و سنجاب بدوزند — مہر مرمی رہ رنگ سرآبان آمد
ہند در فصل خزان نیز بہارے دارد — گو نا گوں سبزہ حلی بند خیابان آمد
دی درہمیں کہ دو اقلیم دگر ریخ ہند د — اندریں ملک گل و سبزہ فراوان آمد
نخل نارنج نہ بینی کہ ہم از میوہ و شاخ — گوئے در چوگاں بکف آورد بہ میدان آمد

ایسی صورت میں عرشی صاحب کا یہ فیصلہ کرنا کہ "کتب خانہ رام پور کا قلمی نسخہ ۱۲۶۱ھ کے نسخہ کی نقل ہے"۔ محل نظر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب غالب کی تحریر کے بموجب یہ قصیدہ ۱۲۶۵ھ میں لکھا گیا، تو پھر یہ ۱۲۶۱ھ والے نسخے میں کیسے شامل ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہی کہ رام پور کا وہ قلمی نسخہ ۱۲۶۵ھ کے بعد کا مرتب کردہ ہے۔

البتہ نواب فخر الدین خاں مرحوم کے نوشتہ کلیات میں اس قصیدے

کا ہونا باعثِ تعجب نہیں، کیونکہ بقول عرشی صاحب یہ نسخہ ۱۸۶۱ء میں رام پور پہنچا تھا اور ۱۸۶۱ء کا مطابق سن ہجری ۱۲۷۸ھ ہے۔ ۱۲۷۸ھ میں اس قصیدے کو لکھے ہوئے دس سال گزر چکے تھے اور غالب کو صلہ بھی چار سو ترپن روپیہ مل گیا تھا۔

"تاریخ ٹونک" میں ہے کہ ٹونک میں ۱۸۶۳ء تک مادھو پوری سکہ رائج تھا جس کے مقابلے میں کلدار روپیہ (سکۂ انگریزی) ایک آنہ، سوا آنہ زائد ہوتا تھا۔ چار سو ترپن کا مطلب یہ ہے کہ مرزا غالب کو نواب وزیر الدولہ کے دربار سے پانچ سو روپیہ سکہ مادھو پوری صلہ مرحمت ہُوا۔ عرضداشت میں "دریں قلمرو رواجے دارد" کا فقرہ اس چیز کو بتاتا ہے کہ انگریزی اور ٹونک کے سکہ کا فرق مرزا غالب کو بھی معلوم تھا۔

بادیُ النظر میں پانچسو روپے کا صلہ بہت تھوڑا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ٹونک کی آمدنی اور روساۓ ٹونک کی بالعموم عادتِ داد و دہش کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ پانسو روپے کا صلہ اُس وقت کے لحاظ سے ایک بلند صلہ تھا۔

ساتھ ہی اس کو بھی نظر میں رکھنا چاہیئے کہ نواب وزیر الدولہ سید احمد شہید؂ کی مجاہدانہ تحریک کو اور سید صاحب کے ساتھیوں کو ہمیشہ خفیہ طور پر ہزاروں روپے سے مالی امداد دیتے رہے۔ اور سید صاحب کی شہادت کے بعد آپ نے پورے قافلہ کو ٹونک میں لا بسایا اور سینکڑوں آدمیوں کی کفالت کی۔

ان حالات کے پیشِ نظر ایک مجاہدانہ نظر رکھنے والے رئیس کے دربار سے ایک قصیدے کے صلے میں دور بیٹھے ہوئے آدمی کو پانچسو روپیہ صلہ مل جانا ہی بہت کچھ ہے۔ اس کے علاوہ روپیہ کی قیمت اُس زمانے میں بہت بڑی تھی۔ ٹونک کی فوج کے ملازم کو چار، پانچ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ اہل کاروں میں دس روپیہ تنخواہ رکھنے والا آدمی دولت مندوں میں شمار کیا جاتا تھا، اس لئے بھی ہمارا فیصلہ ہے کہ غالب کو گراں قدر صلہ ملا۔

متذکرۂ بالا عرضداشت میں مرزا غالب نے میر تفضل حسین خاں اور طالع یار خاں کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ دونوں غالب کے حلقۂ احباب میں داخل تھے اور ریاست ٹونک سے بھی وابستہ تھے۔

طالع یار خاں کا ٹونک کے "استادانِ فنِ سپہ گری" میں شمار تھا نواب وزیر الدولہ بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ ٹونک میں "استاد" کے لقب سے مشہور تھے۔ غدر کے زمانے میں ان کے دو بیٹے جو ٹونک سے دہلی رخصت پر گئے ہوئے تھے، پھانسی پر چڑھا دئے گئے، مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں، نواب انور الدولہ سعد الدین خاں کے نام ہے ان کے قتل پر ان الفاظ میں اظہار کیا ہے۔

"طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت آئے تھے غدر کے سبب جا نہ سکے یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی طالع یار خاں ٹونک میں زندہ ہیں پر جیتے سے نہ مردہ سے بدتر ہوں گے۔"

عود مطبوعہ نولکشوری صفحہ ۵۰

میر تفضل حسین خاں: غالباً یہ وہی میر تفضل حسین خاں ہیں، جو مضطر خیرآبادی کے دادا تھے۔ اور اُس زمانے میں ریاست ٹونک کے سفیر تھے اور سفارت ریاست کے سلسلے میں دہلی میں بھی آمد و رفت اور قیام رہتا تھا اردوئے معلیٰ کے بعض خطوط میں مرزا غالب نے مرزا تفضل حسین کا ذکر کیا ہے اور ایک خط خاص ان ہی کے نام ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ وہ یہی میر تفضل حسین خاں ہوں، غالب ان کو بھی مرزا تفتہ کی طرح کمالِ اتحاد و یگانگی کی بنا پر "مرزا" کے لقب سے یاد کرتے ہوں۔ بہر حال یہ نام تحقیق طلب ہے۔

تاریخ ٹونک میں ہے کہ "میر تفضل حسین کا انتقال ۱۲۷۰ھ میں ہوا، ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے حافظ احمد حسین سفارت پر مامور ہوئے، حافظ احمد حسین سید افتخار حسین مضطر کے والد تھے۔

اب رہ گیا غالب کا دوسرا قصیدہ "عرفی کی زمین والا" جس کا مطلع ہے

اے ذاتِ تو جامع صفتِ عدل و کرم را
در بر شرفِ ذاتِ تو اجماع امم را

مولانا مہر اس کی تاریخِ ارسال بھی ۱۲۶۷ھ ہی بتاتے ہیں۔ اور عرشی صاحب ۱۲۶۷ھ سے پہلے کی تاریخ قرار دیتے ہیں۔ تاریخ ٹونک میں بھی اصغر علی آبرو نے ۱۲۶۸ھ میں غالب کے ایک قصیدے کا ٹونک آنا ظاہر کیا ہے اور یہ کہ جب اس کے صلے میں تاخیر ہوئی تو تقاضے کا ایک قطعہ اور لکھ بھیجا۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

گفتم بخرد بخلوت آنفس | کاۓ شمع و چراغ ہفت ایواں
آیا نہ چہ او بود کہ نواب | ننوشت جواب نامہ ام ہاں

آں گونہ عوضیشے نگروانی — ورویشیں نوشتہ سوئے سلطاں
آں گونہ قصیدۂ کہ گوئی — از صفر دمیدہ سنبلستاں
ایں ہر دو رسید نیست پیدا — زاں سو اثرے بہ ہیچ عنواں
رنجیدہ گر نہ مدح نواب — اے کاش نہ گشتے شناخواں
ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم — از گفتۂ خویشتن پشیماں
غمم بجواب گفت غالب — زنہار مخور فریب شیطاں
نواب بعسکر ارمغاں است — تا نامہ فرستدت بساماں
وانہا کہ بخاطرش گزاشتہ است — زوداں ہمہ جمع کرد نتواں
نزد و است کہ جمع نیز گردد — ویر است کہ دادہ است فرماں

مولانا مہر لکھتے ہیں

"تاریخ ٹونک سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدہ کے صلہ میں تاخیر ہو گئی تو غالب نے ایک قطعہ بھیجا، جسے خواجہ حالی مرحوم نے "یادگار" میں "بحر رمل" کی مثال کے طور پر نقل فرمایا ہے (یادگار غالب صفحہ ۵۳) اور جو غالب کی کلیات میں شامل نہ ہو سکا، لیکن "سبد چیں" میں چھپ گیا تھا۔ میری رائے میں یہ قطعہ محض حسن طلب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد غالب کو صلہ بھیجا گیا لیکن اس کی مقدار و نوعیت معلوم نہ ہو سکی۔"

غالب از مہر صفحہ ۲۲۲

صلہ کے بارے میں صاحبزادہ یار محمد خاں بہادر شوکت بھوپالی کی تحقیق ہے کہ "جناب ممدوح نے ایک قصیدہ جو دیوان فارسی میں مرقوم ہے وزیر الدولہ امیر الملک نواب وزیر محمد خاں صاحب بہادر رئیس ٹونک کی مدح میں لکھ کر ممدوح کے پاس بھیجا، نواب صاحب موصوف نے ارسال صلہ میں تساہلاً یا سہواً دیر کی، مرزا صاحب نے ایک خط بھیجا۔ (یہ مذکورہ بالا قطعہ کی طرف اشارہ ہے) نواب صاحب نے بعد ملاحظہ ہزار روپیہ بطریق مائزہ روانہ کیا"

الشاعر زرچم صفحہ ۵۹
مطبوعہ نظامی کانپور ۱۳۱۹ھ

جو قصیدے کی ارسال کی ان تاریخوں (۱۲۷۷ھ بقول مولانا مہر یا ۱۲۷۸ھ مولانا عرشی کی تحقیق کے مطابق) پر ایک اعتراض تو یہ ہو سکتا ہے کہ مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو سرور مارہروی کو لکھا تھا اس قصیدے کا تذکرہ کیا ہے۔ کہ "میں نے کسی زمانہ میں اسی زمین میں ایک قصیدہ لکھ کر وزیر الدولہ والی ٹونک کو بھیجا تھا۔ اس میں کے دو شعر آپ کو لکھتا ہوں۔"

تا نرسد نخوداشتی از جود بگیتی — جز پردگیاں حرم معنی دیم را
دقتیست کہ ایں قوم بہر کوچہ دہاناں — پرسند زہم منشاء ہر سوائی نم را

عود مطبوعہ نولکشوری صفحہ ۹۰

اس خط کے بارے میں جمیل الدین صاحب عالی کی تحقیق ہے کہ یہ ۸ نومبر ۱۸۵۵ء سے کچھ پہلے لکھا گیا ہے اور ۱۸۵۵ء کا مطابق ہجری سن ۱۲۷۲ھ ہوتا ہے اور ۱۲۷۲ھ کے خط میں "کسی زمانہ میں بھیجا جانا" لکھنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس وقت اس قصیدے کو بھیجے ہوئے کافی مدت گزر چکی تھی۔

دوسرا اعتراض یہ کہ پھر یہ قصیدہ ۱۲۶۱ھ والے مخطوطہ میں کیسے شامل ہوا اور چونکہ عرشی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ دوسرا قصیدہ بھی ۱۲۶۱ھ والے مخطوطہ میں موجود ہے تو پھر اس کی تاریخ ارسال عید الضحیٰ والے قصیدے سے پہلے کی تسلیم کرنا پڑے گی۔ اور اس قیاس کی اس بات سے بھی تائید ہوتی ہے کہ کلیات فارسی میں عید الضحیٰ والا قصیدہ پنجاہ و ہفتم اور عرفی کی زمین والا قصیدہ پنجاہ و ششم کے زیر عنوان مندرج ہے۔

ان تمام تصریحات کے پیش نظر مولانا مہر کا قصیدے کی تاریخ ارسال ۱۲۷۷ھ قرار دینا محل نظر ہو جاتا ہے۔ بہرحال تحقیق ابھی تک کہ نہیں پہنچی ہے "اس کو بھی کوشش کریں گی۔

ان قصیدوں کے علاوہ مرزا غالب اور نواب وزیر الدولہ میں مراسلت رہی ہے اور غالب نے دامن وزیری سے وابستگی کو آخر دم تک باقی رکھا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب مرزا کی کوئی کتاب شائع ہوتی، تو وہ اس کو اپنے دوسرے قدردان، امراء، رؤساء اور حکام وقت کی طرح نواب وزیر الدولہ کو بھی ہدیتہ بھیجتے۔ چنانچہ جب ۱۸۵۸ء میں "مہر نیمروز" مطبع سے شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ نواب وزیر الدولہ کو بھی منت بھیجا اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد "دستنبو" طبع ہوئی تو یہ قطعہ لکھ کر اس کو بھی روانہ کیا

۱۔ یہ خط بو متعلقہ "مہر نیمروز" کا ایک نادر نسخہ" شائع کردہ رسالہ نوائے ادب بمبئی بابت جولائی و اکتوبر ۱۹۵۲ء

قطعہ

نذر نواب وزیر الدولہ — آں کہ از کرم و دانش و داد

ہم بدیں حیلہ مگر یاد آید — غالب خستہ کہ رفتست زیاد

"دستنبو پر ایک یادِ غالب" کے عنوان سے فروری ۱۹۵۳ء کے آج کل میں قطعہ کے عکس کے ساتھ ایک مضمون ہدیۂ ناظرین کر چکا ہوں۔

نواب وزیر الدولہ کے انتقال کے بعد جب ۱۲۸۱ھ میں نواب محمد علی خان مسند نشین ریاست ہوئے۔ تو مرزا غالب نے روایت قدیم کے مطابق ان کی مدح میں بھی ایک مثنوی بھیجی۔ جس میں اپنی قدیم نیازمندی کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں

ز غالب کہ از روزگارست دلا

برین عتبہ سائید جبین نیاز

انجمن اقوام متحدہ

۱۴ اگست ۱۹۴۱ء کو دو رہنماؤں پریزیڈنٹ روزویلٹ اور مسٹر چرچل نے ایک مشترکہ تاریخی اعلان جاری کیا جو منشور اٹلانٹک کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اعلان دونوں ملکوں (امریکہ اور برطانیہ) کے درمیان کسی باقاعدہ معاہدے کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس میں دونوں ملکوں کی قومی پالیسی کے بعض مشترکہ اصولوں کا اعلان کیا گیا تھا جن کی بنیادوں پر وہ ایک بہتر دنیا کی تعمیر کی توقعات رکھتے ہیں۔

مذکورہ منشور کے آٹھ نکات میں سے دو براہ راست ایک عالمگیر تنظیم کو وجود میں لانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۴۱ء کو روس اور مقبوضہ یورپ کی دس حکومتوں نے بھی اس اعلان پر دستخط کر دئے۔ تین ماہ بعد ایک اور اعلان جاری کیا گیا جو اب اقوام متحدہ کے اعلان کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۴۲ء کے نو روز کو امریکہ، برطانیہ، روس اور چین کے نمائندوں نے اس پر دستخط کئے اور اس سے اگلے روز دیگر ۲۲ اقوام کے نمائندوں نے اس اعلان پر دستخط کر دئے لیکن اس امر کا فیصلہ کرنا ابھی باقی تھا کہ عالمگیر تنظیم کی بنیادیں کن اصولوں پر رکھی جائیں۔

برطانیہ، امریکہ اور روس کے وزرائے خارجہ کا اجلاس اکتوبر ۱۹۴۳ء میں منعقد ہوا۔ جس میں عالمگیر تنظیم کی بنیادوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی اس غور و خوض کے نتیجے کے طور پر برطانیہ، امریکہ، روس اور چین کے نمائندوں نے ایک نئے اعلان پر دستخط کئے۔ اس اعلان میں بین الاقوامی امن و تحفظ کی بقا کے لئے جلد از جلد ایک ایسی عالمگیر تنظیم کو وجود میں لانے کی ضرورت کو تسلیم کیا گیا جس کی بنیادیں تمام امن پسند ممالک کی خود مختارانہ مساوات پر رکھی جائیں اور جس کی رکنیت کے دروازے چھوٹے بڑے تمام ممالک کے لئے کھلے ہوں۔ دو ماہ بعد روزویلٹ، اسٹالن اور چرچل کے درمیان پہلی بار تہران میں ملاقات ہوئی اور انھوں نے ، نیز کی جاری اکثریت کے لئے قابل قبول امن کے قیام اور دنیا کو آیندہ کئی نسلوں تک جنگ کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں اپنی اور تمام اقوام متحدہ کی ذمہ داریوں کو پورے طور پر محسوس کرتے ہوئے اس امر کا اعتماد ظاہر کیا کہ ان کی مفاہمت بقائے امن کی ضامن ثابت ہوگی۔ یہ تھا عالمگیر تنظیم کا بنیادی اصول۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس تنظیم کی شکل و صورت کیا ہو؟ اس مقصد کے لئے امریکہ، برطانیہ، روس اور چین کے نمائندوں کی ایک کانفرنس ڈمبارٹن اوکس کے مقام پر منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کی تجاویز کو تمام اقوام متحدہ کی حکومتوں اور تمام ملکوں کے لوگوں کے سامنے مطالعہ کے لئے پیش کیا گیا۔ اس کانفرنس نے یہ تجویز پیش کی کہ عالمگیر انجمن کا نام انجمن اقوام متحدہ رکھا جائے اور یہ چار بڑی تنظیموں پر مشتمل ہو۔ ایک جنرل اسمبلی جس میں تمام رکن ممالک کے نمائندے شامل ہوں۔ گیارہ ممبروں کی سیکورٹی کونسل قائم کی جائے جس میں پانچ ملکوں کے نمائندے مستقل ہوں اور کونسل کے باقی ماندہ نمائندوں کا انتخاب جنرل اسمبلی کے ارکان میں دو دو سال کے لئے کیا جائے۔ اس کے علاوہ دو دیگر اداروں، اقتصادی و سماجی کونسل اور بین الاقوامی کورٹ آف جسٹس کے قیام کی سفارش کی گئی۔ اور اس طرح چار سال کی مسلسل غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ایک نئی تنظیم وجود میں آئی جو بنی نوع انسان کے لئے امید کا نیا پیغام لئے ہوئے تھی۔

ناصر کرنولی

دکن کا رباعی گو شاعر

دکن کی سرزمین دنیائے ادب میں ایک امتیازی مقام کی حامل ہے۔ اس سرزمین نے شمس الدین ولی کو جو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا اور جس کو محمد حسین آزاد نے شاعری کا باوا آدم تسلیم کیا ہے، جنم دیا۔ اس کے بعد بھی باکمال شعرا کو پیدا کرنے میں برابر فیاضی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ آج بھی ہم اس کے شعرا میں ایک ایسی شخصیت سے آپ کا تعارف کرانے میں فخر محسوس کرتے ہیں جسے اس سرزمین نے اپنے آغوش میں پرورش کیا ہے۔ یہ حضرت امجد حیدرآبادی ہیں۔ ان کا کلام نہ صرف لطف زبان کی حیثیت سے واجب التعظیم ہے بلکہ خوبی مضمون، روانی اور سلاست کے اعتبار سے بھی قابل صد آفرین و تحسین ہے یہ قلمی کاوش میرے لئے وجہ مسرت ہے کہ میں اس شخص کے کارہائے نمایاں قلمبند کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جس کا رتبہ شاعری میں امتیازی شان رکھتا ہے جس کی شاعری اس کی وضع زندگی کا آئینہ ہے، جس کے بلند مذاق سخن اور خصوصاً حکیمانہ، اخلاقی اور سب سے بڑھ کر متصوفانہ رباعیات نے اردو ادب کو چار چاند لگا دئے ہیں اور امجد نے نہ صرف واحد رباعی نگار شاعر کی حیثیت سے اپنا مقام معین کیا ہے بلکہ دنیا کے لازوال شعرا کے زمرے میں جگہ نکال لی ہے۔

حضرت امجد ۱۸۹۸ء بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ یقیناً یہ ان کی دعا اور تربیت کا اثر ہے کہ تصوّف میں امجد نے ایسا بلند مذاق پایا کہ موجودہ دور کے باکمال رباعی گو شعرا میں ان کا شمار ہونے لگا۔ آپ بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے کسی اہم امر کی تکمیل کے لئے امجد کو فطرتاً شاعر پیدا کیا اور اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو میرا یقین حق بجانب ہوتا کہ سرمد کی روح اس دکنی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر چمن رباعیات کی آبیاری کر رہی ہے۔ ذیل کا شعر ان کا اولین ہے جو قصر شاعری کا سنگ بنیاد کہلانے کا مستحق ہے ؎

ہیں غم گرچہ دشمن ہو گیا ہے آسماں اپنا مگر یارب نہ ہو نا مہرباں وہ مہرباں اپنا

امجد کے والد محترم کا انتقال عہد طفلی میں ہو گیا۔ تاہم ان کی روایات اور زندگی کے حالات امجد کے معلم و رہنما رہے۔ ابتدائی تعلیم اسلامی مدارس میں حاصل کی۔ آخر کش مولانا نادر الدین اور نواب مسند الملک آقا سید علی شوشتری ایسے عربی اور فارسی کے باذوق علما و امجد کی تعلیم کے لئے مل گئے یوں سمجھئے کہ پیاسے اور سمندر کی یکجائی ہو گئی اور انھیں کی صحبتوں میں ان کا ادبی مذاق اپنے نقطہ عروج پر پہنچا اور ان کی بصیرت کو اوج ثریا کا مقام عطا ہوا۔

رباعیات کے ساتھ ساتھ امجد کی نظمیں اور غزلیں بھی جذبات کا اعلیٰ نمونہ اور ان کی حیات کا قابل قدر سرمایہ ہیں خصوصاً جوش رحمت دنیا و انسان، دعائے یتیم، قیامت صغرا، تصویر غم اپنی طرز میں لاجواب اور بے مثل ہونے کی حیثیت سے قابل صد آفرین و داد ہیں۔ یوں بھی شاعر کا دل مصوّری کا آلہ ہوتا ہے جس میں ہر وہ چیز منعکس ہو جاتی ہے جو اس کے سامنے آجاتی ہے چنانچہ امجد کی حسب ذیل نظم کے چند اشعار جو موسیٰ ندی کی اس طغیانی کے قیامت خیز حادثے کا نتیجہ ہیں۔ جس میں امجد کی والدہ محترمہ، بیوی اور عزیز بچی ان کی آنکھوں کے سامنے موت کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ اس خونچکاں حادثہ نے امجد کے دل پر ایک گہرا نقش چھوڑا جس کو امجد نے اپنی نظم "قیامت صغریٰ" میں موثر پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

مادر کہیں اور میں کہیں با دیدۂ پُرنم ۔۔۔ بی بی کہیں اور بیٹی کہیں توڑتی تھی دم
سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے ۔۔۔ وہ غم تھا کہ دن کو نظر آنے لگے تارے
کس جا سے ہیں ڈوبی ہوئی نعشوں کو نکالوں ۔۔۔ بیٹی کا پتہ کیا ہے کہاں بی بی کو پاؤں
دوں کس کو کفن کس کا میں تابوت بناؤں ۔۔۔ ہے قبر کہاں پھول کہاں جا کے چڑھاؤں

ہے ہے ہدف رنج دمحن کر گئیں اماں   افسوس کہ بے گور دکفن مر گئیں اماں

اردو کے ساتھ ساتھ امجد کو فارسی و عربی میں بھی کافی دسترس حاصل ہے۔ متصوفانہ شاعری میں دردؔ کے بعد اگر کوئی شاعر فارسی کے علاوہ ایک رباعی نگار صوفی شاعر سرمدؔ کا مدمقابل ہو سکتا ہے تو وہ امجد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسفی، اخلاقی اور مذہبی نکات کے بیان کرنے کے لئے کوئی موزوں چیز سوائے رباعی کے نہیں ہے۔ جس حسن اور خوبی کے ساتھ شاعر اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتا ہے وہ رباعی کا ہی حصہ ہے مگر علم دوست ادب نواز حضرات اور صاحب فن اس امر سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں کہ رباعی میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کوئی آسان امر نہیں ہے بلکہ فن شعر میں نہایت مشکل اور دشوار ترین امر ہے کیونکہ چار مصرعوں میں مضمون کا ادا کرنا اور پھر چوتھا مصرعہ ایسا برجستہ اور ایسا پر زور ہونا ضروری ہے جو تینوں مصرعوں کا نچوڑ ہو۔ سنگ لاخ زمین سے جوئے شیر لانا ہے۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ امجد دنیائے سخن میں اقلیم رباعیات کے شہنشاہ ہیں۔ پروفیسر وحیدالدین سلیم کا یہ خیال صحیح ہے کہ امجد کی ٹکر کا کوئی رباعی کہنے والا شاعر نہیں ہے۔ ڈاکٹر سر اقبال لکھتے ہیں کہ ہر رباعی قابل داد ہے اور ان کے پڑھنے سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ گرامی نے اپنی ایک رباعی میں امجد کا پایہ نہایت عمدگی سے معین کیا ہے۔

امجد بہ رباعی است فرد امجد   کلک امجد کلید گنج سرمد
گفتم کہ بود جواب سرمد امروز   روح سرمد بگفت "امجد امجد"

ذیل کی دو رباعیاں نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ پہلی رباعی میں آیتہ ان اعرضنا الا مانۃ الخ کی تفسیر کی ہے۔ لیکن اس انوکھے انداز میں کہ اس میں انفرادی شان پیدا ہو گئی ہے۔

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے   کیا ذکر صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی   سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

دوسری رباعی میں عاشقانہ انداز کی جھلک ہے۔

جی اس کا بھی بھر آیا رولا کر مجھ کو   ٹھنڈا نہ رہا خود بھی جلا کر مجھ کو
وہ مل گیا خاک میں ملا کر مجھ کو   کیا فتح ہوئی شکست کھا کر مجھ کو

بقول عظمت اللہ خاں امجد کی رباعیاں زندگی کے اعلیٰ ترین رُخ کی تفسیر ہیں اور بلحاظ ادب اظہار خیال کا بہترین نمونہ ہیں۔ پروفیسر مناظر حسین گیلانی لکھتے ہیں کہ امجد کا شمار ہندوستان کے ان شعرا میں ہے جن کو زمانہ صدیوں کے بعد پیدا کرتا ہے۔

حضرت امجد کی شاعری حسن و عشق، گل و بلبل کے جھوٹے تذکروں اور بے سروپا خیالی کرشموں سے خالی ہے جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

نہ ذکر بلبل و گل ہے نہ داستان بہار   نہ وصف سنبل و ریحاں نہ مدح باد شمال
نہ کوئی لطف زبان ہے نہ خوبی مضمون   نہ حسن و عشق کا قصہ نہ شاعرانہ خیال

امجد کی تصانیف اور رباعیات کے مجموعے ان کے زور قلم کے رہین منت ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی دُرِ شاہوار کہلانے کے مستحق ہیں اور شعریت کے لحاظ سے بھی بلند پایہ ہونے کی حیثیت سے اپنی مثال آپ ہیں اور ان کا شمار علمی خزانہ کے درخشاں گوہروں میں ہے۔

میری آنکھیں اب تک اس مشاعرہ کے منظر کو ڈھونڈتی ہیں جو ۱۹۵۱ء ماہ جنوری کی ۲۹ شب بمقام عثمانیہ کالج کرنول میں مولانا الحاج ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا اور جس میں حضرت امجد کی تشریف آوری نے عثمانیہ کالج کی رونق افزائی کے ساتھ بانیان مشاعرہ (طلبہ) کو سرفراز فرمایا تھا۔ مجھ ناچیز کو بھی مقدمات اور گفتگو کا شرف حاصل ہوا۔ جب ناخدائے سخن امجد حیدر آبادی سحر انگیز رباعیات سُنا رہے تھے تو عوام پر خاموشی طاری تھی۔ عوام کا بڑھتا ہوا شوق اور مولانا صاحب کے اصرار نے امجد کو اور چند رباعیات سنانے پر مجبور کر دیا۔ میں بھی ہمہ تن گوش ہو گیا۔ صاحب موصوف کے پڑھنے کا انداز بھی عجب مستانہ تھا۔ ان کے کلام میں جابجا بجلی سی کوندتی نظر آتی تھی۔ شب کے تین بج چکے تھے مگر امجد صاحب سنا رہے تھے اور عوام سر دُھن رہے تھے۔ مجھے بار بار خیال آرہا تھا کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" کا مصرعہ امجد پہ کہاں تک صادق آتا ہے۔ میرے دماغ نے مولانا موصوف کی چند رباعیات محفوظ کر لی تھیں جو حسب ذیل ہیں۔

تن کی ہستی کو چھو نہ کر دوں تو سہی   میدان ہوا کو ہو نہ کر دوں تو سہی
ملتا نہیں تو مجھ سے اگر، خیر نہ مل   میں بھی اس میں کو تو نہ کر دوں تو سہی

مت سُن پردے کی بات بہرا ہو جا   مت کہہ اسرار غیب گونگا ہو جا
وہ روئے لطیف اور یہ ناپاک نظر   امجد کیا دیکھتا ہے اندھا ہو جا

کس متن کی تفسیر ہوں معلوم نہیں ۔۔۔ کس ہاتھ کی تحریر ہوں معلوم نہیں
میں ہوں کہ میرے پردے میں ہے اور کوئی ۔۔۔ صورت ہوں کہ تصویر ہوں معلوم نہیں

بے فائدہ کیا ہے جب رسائی اچھی ۔۔۔ طاعت میں نہیں ہے خود نمائی اچھی
اک سجدہ میں خاک کر دیا ہستی کو ۔۔۔ حضرت تم سے تو دیا سلائی اچھی

صنعت تیری ہر خار دکھا دیتا ہے ۔۔۔ ہر غنچۂ گل تیری صدا دیتا ہے
براصل ۔ اصل معرفت ہے یا رب ۔۔۔ پتہ پتہ تیرا پتہ دیتا ہے

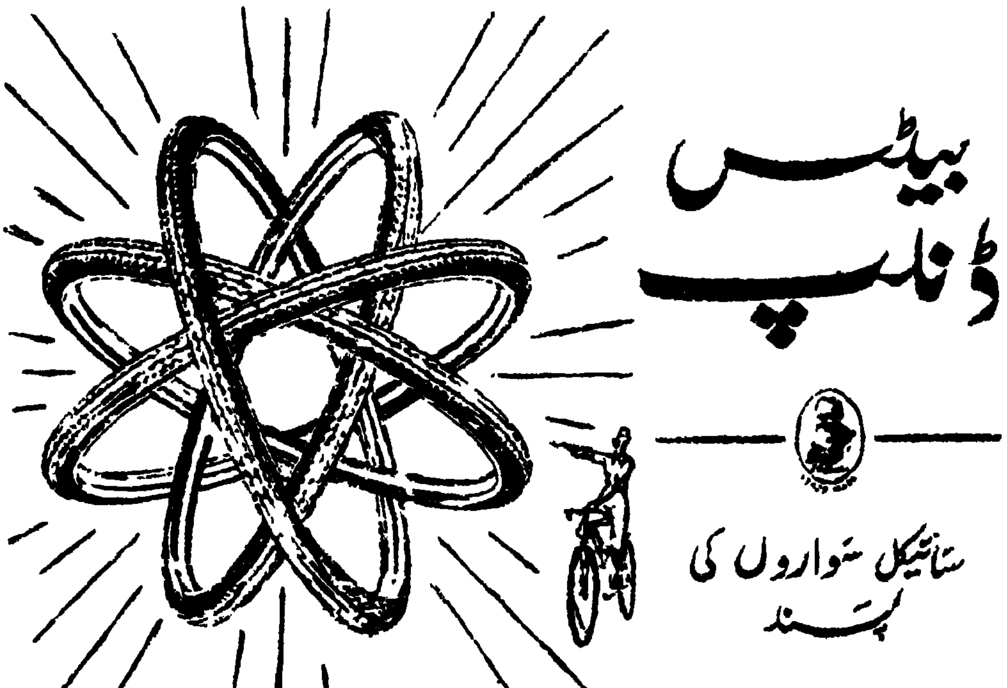
جنوبی ہند کے سرسید عالی جناب ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب زاد فیضہم کی نسبت جو رباعی امجد صاحب نے فرمائی تھی ناظرین کی دلچسپی کے لئے اُسے بھی یہاں پیش کیا جاتا ہے

؎ کیسا کالج بنا دیا تم نے ۔۔۔ سرسید کو جگا دیا تم نے
اے عبدالحق خدا تمہیں جزا دے ۔۔۔ اچھا حق العباد ادا کیا تم نے

دوسرے دن امجد صاحب چلے گئے ۔ اور میں جب انھیں الوداع کہہ کر کالج کی فضا میں لوٹ آیا تو یہاں کی ٹھنڈی ٹھنڈی خنک ہوائیں مترنم آواز میں پوچھنے لگیں ؎

اے دلِ ناصر یہ کیا ہے ماجرا
نقش بن کر رہ گئی امجد کی یاد

؎ یہ رباعی فاضل مضمون نگار کو صحیح طور پر یاد نہیں رہی ۔ (ادارہ)



روشؔ صدیقی

بنامِ خوش نظراں

عشق دشوار نہیں خوش نظری مشکل ہے
سہل ہے کوہ کنی شیشہ گری مشکل ہے

کچھ مرا حسنِ طلب بھی تو ہے شاملِ دست
ورنہ اس حسن سے بیدادگری مشکل ہے

مسندِ لالہ و ریحاں ہو کہ ہو تختۂ دار
ہم نشیں چارۂ آشفتہ سری مشکل ہے

نکہتِ زلفِ پریشاں نے کیا دیوانہ
ہوش میں آئے نسیمِ سحری مشکل ہے

کاش مل جائے ترا گوشۂ داماں، ورنہ
ختم ہو سلسلۂ جامہ دری، مشکل ہے

یہ حقیقت کوئی اربابِ خبر سے پوچھے
کس قدر مرحلۂ بے خبری مشکل ہے

کم نگاہی بہت آساں ہے مگر یاد رہے
نکتہ چیں! مرتبۂ دیدہ وری مشکل ہے

طے نہ جب تک ہو روشؔ! منزلِ بیداریٔ دل
حرفِ تاثیرِ فغانِ سحری مشکل ہے

دعاؔ ڈبائیوی

دُنیائے ہیچ

چار دن کا لطفِ دم بھر کی خوشی کچھ بھی نہیں
زندگی سب کچھ ہے پھر بھی زندگی کچھ بھی نہیں

ایک مجبورِ سراپا کی خوشی کیا رنج کیا
آدمی کی کیا حقیقت، آدمی کچھ بھی نہیں

جل جلا کر شمع نے پوری تو کر لی زندگی
دل جلا میں ہوں کہ میری زندگی کچھ بھی نہیں

میں وہ بد قسمت ہوں مے خانے میں جب رکھا قدم
کچھ دیا ساقی نے تیرے نام کی کچھ بھی نہیں

ہے غنیمت زندگی میں ایک لمحے کا سکوں
بعد مرنے کے سکونِ دائمی کچھ بھی نہیں

چار دن کی زندگی سب کچھ ہے انساں کے لئے
دیکھنے کو چار دن کی زندگی کچھ بھی نہیں

حسن والوں کا زمانے سے نیا دستور ہے
برہمی ہے اور دیرینہ برہمی کچھ بھی نہیں

کر دیا مُردہ مجھے صدماتِ پیہم نے دعاؔ
اب مرے حق میں خوشی دنیا خوشی کچھ بھی نہیں

شفیقہ انجم

جسم کی پکار

ہر سال ماگھ کے مہینے میں پورنماشی کی رات کو میرے گاؤں میں ایک میلہ لگتا ہے۔ گاؤں چھوٹا سا ہے جس کے پچھمی طرف ایک چھوٹی سی ندی بہتی ہے۔ ندی کے دونوں کناروں پر ریت کے چھوٹے چھوٹے سے ٹیلے بن گئے ہیں۔ دن کے وقت دھوپ میں ریت کے ذرّوں کی چمک آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن چاندنی رات میں اس کا نظارہ بڑا ہی دل کش ہوتا ہے۔ سال کے بہت کم دن ایسے ہوتے ہیں جب اس ندی میں زوروں کا مدوجزر ہوتا ہے۔ ورنہ عموماً یہ ایک ہی چال سے بہتی رہتی ہے۔ بعض اوقات تو یہ اتنی خاموش اور ساکت ہو جاتی ہے جیسے دھوپ میں پڑا ہوا کوئی مُردہ سانپ۔ سطح آب پر طرح طرح کے سُرخ، نارنجی، زرد اور کاسنی رنگ کے پھول کھل جاتے ہیں۔ ان کے نام کیا ہیں یہ کوئی بھی نہیں جانتا۔

ماگھ کے پورے چاند کی رات میں میرے گاؤں کا یہ میلہ سال کا سب سے بڑا تہوار ہے۔ اس کے بارے میں کوئی بھی صحیح صحیح نہیں بتلا سکتا کہ یہ سب سے پہلی بار کب لگا تھا۔ بڑے بوڑھے جن کی بھویں تک سفید ہو گئی ہیں۔ کہا کرتے ہیں کہ وہ بھی اس میلے کو اسی شان سے لگتے ہوئے دیکھتے رہے ہیں۔ دا جو دادا تو بڑا مزہ لے لے کر کہتے ہیں کہ جب وہ بچے تھے تو میلے سے تل کے لڈو خرید کر کھایا کرتے تھے۔

گاؤں اور اس کے آس پاس بہت سے چھوٹے بڑے شو مندر ہیں جن کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہزاروں برس پہلے بھگوان وشوا کرم نے ماگھ کے پورے چاند کی رات میں زمین پر آ کر خود اپنے ہاتھوں سے ان مندروں کی تعمیر کی تھی جن میں سے اکثر اب خستہ اور برباد ہو چکے ہیں۔ ان میں کبھی بھی کوئی آدمی نہیں جاتا۔ آدمیوں کے نہ جانے کی وجہ یہ نہیں کہ وہ بھگوان سے خوف کھاتے ہیں بلکہ صرف اس وجہ سے کہ اُن میں طرح طرح کے جھاڑ اور جنگل اُگ آئے ہیں۔ جو اب مستقل طور پر زہریلے اور خطرناک جانوروں کے اڈّے ہیں۔ پوجا تو صرف دو ہی مندروں میں ہوتی ہے جس کے اخراجات کے لئے شہر کا ایک امیر آدمی میرے گاؤں کے ہری ہر پانڈے کو پندرہ روپے مہینہ بھیجا کرتا ہے۔ جو مندر کا پجاری ہے۔ سوائے خاص خاص موقعوں کے ان دونوں مندروں میں بھی دیا بتی نہیں جلتی۔ بیچارے یاتری اور پوجا پاٹھ کرنے والے اکثر اندھیرے میں ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ لوگ عموماً، شاروں ہی اشاروں میں اپنا کام کر کے چل دیتے ہیں۔

ماگھ کا مہینہ ختم ہو رہا تھا لیکن سردی جانے کا نام ہی نہیں لیتی تھی حالانکہ اب سے پہلے اس مہینے کے گذرتے گذرتے ہی دم توڑ دیا کرتی تھی ——

میلے کے کچھ دن پہلے گاؤں کے لوگوں کی حالت عجیب ہو جاتی۔ پورے گاؤں میں افراتفری سی پھیل جاتی۔ بعض دفعہ تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی مریض حالتِ اختلاج میں ہو۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہونے کو ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ اُن کے ذہنوں پر دھواں سا چھا جاتا۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ہر سال میلے کے بعد کسی نہ کسی اہم واقعے کا ہونا ضروری ہے۔ اس دفعہ نہ جانے کیا ہو؟

گاؤں کی پوربی طرف میدان میں چھوٹے چھوٹے خیمے اور ترپال تانگے جا چکے تھے۔ میلے میں دوکانداری کرنے والے لوگ بھی آہستہ آہستہ آنے لگے تھے اس لئے کہ اگر پہلے ہی سے وہ اپنے لئے کسی مناسب جگہ کا انتخاب نہیں کر لیتے اُن کے لئے دوکانداری بیکار تھی۔ تجارت کے لئے موقع محل کے جانچ پڑتال کی بھی بہت اہمیت ہے۔ ندی کے کنارے دونوں طرف بہت ساری چھوٹی بڑی اور نئی پُرانی کشتیاں ٹھہر چکی تھیں جو مختلف دور دراز جگہوں سے آئی تھیں۔ حالانکہ میلہ صرف ایک دن لگتا تھا لیکن اس کے لئے انتظامات بہت قبل ہی سے ہوتے تھے۔ اسی طرح اس کے ختم ہو جانے کے بعد بھی دوکانوں کے اُٹھتے اُٹھتے ایک زمانہ لگ جاتا۔

میلے میں اِدھر اُدھر سے ہزاروں طرح کے لوگ اکٹھے ہو جاتے تھے۔ اس لئے اس زمانے میں ہمارے گاؤں کے لوگ اپنی چیزوں اور مکان کی رکھوالی

میں ذرا زیادہ ہوشیاری سے کام لیتے۔ رات کو دروازہ بند کر لینے کے بعد دوبارہ تمام مکان کو دیکھ لیتے۔ حد تو یہ ہے کہ جھوٹے برتنوں کو بھی لوگ باہر سائبان میں چھوڑنے کے قائل نہ تھے۔ بہت دنوں کی بات ہے کہ میلے کے ختم ہو جانے کے بعد میرے گاؤں سے دو نوجوان لڑکیاں غائب ہو گئی تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میلے کو غنیمت جان کر وہ اپنے چاہنے والوں کے ساتھ کہیں بھاگ گئی تھیں۔ جو کچھ بھی ہوا ہو۔ بھاگ گئی ہوں یا بھگا کر لے جائی گئی ہوں۔ لیکن اس وقت سے اتنی بات ضرور ہوئی کہ لوگ اپنی اپنی جوان بیویوں اور بیٹیوں کو نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دیتے تھے۔ عورتوں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ نہانے یا کپڑے دھونے کے لئے بھی ندی کے کنارے نہ جائیں۔ یوں بھی ندی کے دونوں کناروں پہ اتنی طرح طرح کی کشتیاں اکٹھی ہو جاتیں کہ مشکل ہی سے کوئی ایسی جگہ بچ جاتی جہاں نہایا اور کپڑا دھویا جا سکے۔ حالانکہ یہ بہت تکلیف دہ بات تھی خاص کر ان عورتوں کے لئے جن کے مکان کے پاس تالاب نہیں تھا۔ اسی لئے گاؤں کے چند سمجھ دار لوگوں نے بانس کی ایک ٹٹی بنا کر ندی کے کنارے کو کچھ دور تک گھیر دیا تھا کہ اس طرح عورتوں کے لئے بےکھٹکے پردہ کا انتظام ہو جائے۔

میلے کے میدان میں پوربی کنارے پہ بہت سی دوکانیں کھل گئی تھیں کہیں ہوٹل تھے تو کہیں چائے کی دوکانیں۔ چاٹ پکوڑی والے الگ شور مچا رہے تھے۔ کپڑے اور لکڑی کے کھلونوں کی دوکانوں کا کیا کہنا۔ ان کے علاوہ بھی تین چار بڑے بڑے شامیانے نصب تھے جو گاؤں کے لوگوں کو جوق در جوق اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ سب سے بڑا شامیانہ بیچ میدان میں تھا جس میں ہر سال ناٹک ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس سال وہ لوگ ایک ڈرامہ پیش کرنے والے تھے۔ یہ تھیٹریکل کمپنی شہر سے آئی تھی۔ اس سال "سیتا کا بن باس" اور "بھگت سورداس" قسم کا کوئی مذہبی کھیل نہیں ہو رہا تھا بلکہ سرت چندر چیٹرجی کا ایک مشہور ڈرامہ پیش کیا جانے والا تھا۔ تھیٹر جس میں ہر طرح کا ساز و سامان ہو، خوبصورت بتیاں، رنگ برنگ پردے اور شاندار اسٹیج، بھلا وہ لوگوں کو اپنی طرف کیوں نہ کھینچتا — رنگیلے نوجوان جو خوب بیڑی پیتے، سر میں سرسوں کا تیل ڈال کر بالوں کو اچھی طرح سنوارتے اور عموماً ندی کے کنارے بانسری بجایا کرتے تھے، اُن کے لئے تو جیسے بہار آ گئی تھی۔ انہیں میں سے ایک نوجوان یہ خبر لایا کہ اس سال داڑھی مونچھ والے مرد اور لونڈے عورتوں کا پارٹ نہیں کریں گے بلکہ تھیٹر والے تو سچ مچ کی لونڈیا لے آئے ہیں۔ وہ اتنی سندر ہیں، اتنی سندر جیسے پریوں کی رانی۔ اور اُن کا رنگ بالکل میم صاحب کی طرح سفید سفید ہے۔ ایک افواہ یہ بھی پھیلی وہ لڑکیاں اتنی حسین ہیں کہ صرف اُن کے حسن کے سہارے تھیٹر والے جیرہ کا دورہ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ اور گاناکوانتا اچھا جانتی ہیں کہ جو بھی سن لے اس کے ہوش و حواس ٹھکانے نہ رہیں —— وہ لڑکیاں نہیں بلکہ جادو کی گڑیاں ہیں۔

بہت سے بڑے بوڑھے جو صرف مندر کے پاس چبوترے پہ بیٹھ کر حقہ پیا کرتے یا تاش اور شطرنج کی بازی لگاتے تھے وہ بھی اس میں دلچسپی لئے بغیر نہ رہ سکے۔ اب ان کا کھیل بند ہو چکا تھا۔ وہ دن بھر آپس میں بحثیں کیا کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ دنیا بہت تیزی سے تباہی کی طرف جا رہی ہے، جبھی تو ہر روز کوئی نہ کوئی نیا کھیل نکل آتا ہے۔ اُن لوگوں نے فیصلہ کیا کہ گاؤں کا کوئی آدمی بھی تھیٹر جانے نہ پائے۔ بلکہ کچھ لوگ ہر گھر میں جا کر دو مردوں کو بھی اس فیصلے کی اطلاع دے دیں۔ اگر وہ چاہیں تو اس نوٹنکی کا تماشہ دیکھ سکتے ہیں جس کا ٹکٹ صرف ایک آنہ ہے۔ تھیٹر والوں نے تو چار آنے اور آٹھ آنے کے ٹکٹ رکھ کر گاؤں کو لوٹ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

لیکن ان باتوں کے باوجود ان کا جی ان دنوں پر قابو رکھنا محال تھا۔ انہوں نے سوچا کہ میلے میں تو نہ صرف سارے جگہ جگہ کے لوگ ہوتے ہیں کہ اگر ہم خود کو اچھی طرح چھپا لیں اور بیچ بیچ کر اندھیرے میں چلیں تو ممکن ہے کہ گاؤں کے لوگ ہمیں نہ پہچان سکیں اور اس طرح ہمیں بھی تھیٹر دیکھنے کا موقع مل جائے جس کی اتنی شہرت ہے۔

میدان میں دکنی طرف ایک ہی قطار میں تین خیمے نصب تھے۔ ان میں سے ایک میں بائیں طرف فوٹوگرافر کی دوکان تھی جہاں صرف آٹھ آنے میں بیس منٹ میں فوٹو کھینچ کر تیار کر دی جاتی تھی۔ لوگ وہاں ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ طرح طرح کی تصویریں کھینچی جا رہی تھیں۔ گاؤں والوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا اور شاید آخری بھی کہ وہ اپنی تصویریں کھنچوا رہے تھے۔ وہاں شاید ہی ایسے ایک دو خوش قسمت انسان ہوں گے جنہوں نے اپنی پوری زندگی میں دو بار تصویریں کھنچوائی ہوں۔

اس کے بعد والا دوسرا خیمہ بھی بڑا دلچسپ تھا جس کے دروازے کے سامنے لکڑی کے خالی بکسوں کو اکٹھا کر کے ایک اسٹیج سا بنا لیا گیا تھا۔ اُداس

پر ایک شخص کھڑا چلّا رہا تھا :-

" آیئے آیئے دو آنے میں
صرف دو آنے میں ..... ایک تماشہ
بالکل عجیب تماشہ ....
کمر سے اُوپر ایک جوان لڑکی اور کمر سے نیچے صرف تین برس کی بچّی
خوبصورت لڑکی، حسین لڑکی، بالکل عجیب لڑکی
صرف دو آنے میں ——"

آواز لگانے والے نے اپنی ہیئت بھی عجیب بنا رکھی تھی جسے دیکھ کر بے ساختہ ہنسی آ جائے۔ اس نے پھٹی ہوئی سیاہ پتلون کے اوپر ایک سلکی جمپر پہن رکھی تھی۔ ایک گال پر سفیدی پوت رکھی تھی اور دوسرے پر سیاہی۔ اُس نے اپنی ٹوپی کو بھی چونے سے سفید کر لیا تھا۔ اس کی اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر راہگیر خواہ مخواہ ٹھٹک جاتے۔ وہ کبھی گاتا، کبھی عجیب عجیب نقلیں اُتارتا، کبھی درجنوں گز لمبا کاغذ اپنے منہ سے کھینچ کر باہر نکالتا اور اپنے کرتبوں سے جب لوگوں کو اکٹھا کر لیتا تو پھر پیتل کی گھنٹیاں لے کر بجانا شروع کر دیتا اور چلّاتا :-

" خوبصورت لڑکی، حسین لڑکی، بالکل عجیب لڑکی
صرف دو آنے میں ——
کمر سے اوپر جوان عورت اور کمر سے نیچے صرف تین برس کی بچّی
بالکل نیا تماشہ، عجیب تماشہ!
صرف دو آنے میں ——!

خیمے کے دروازے پر کپڑے کے پردے پر ایک لڑکی کی تصویر بھی پینٹ کی ہوئی لٹک رہی تھی جو بڑی وحشت ناک دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کی کمر کے اوپر کا حصّہ تو واقعی بالکل جوان عورت کا سا تھا لیکن نچلا حصّہ بچّوں جیسا۔ اس قسم کا حیرت انگیز تماشہ اب سے قبل میرے گاؤں میں کبھی نہیں آیا تھا اس لئے اس خیمے کے سامنے سب سے زیادہ بھیڑ تھی۔ جب بھی کوئی آدمی اندر سے تماشہ دیکھ کر لوٹتا تو لوگ اُسے چاروں طرف سے گھیر لیتے اور طرح طرح کے سوالات کرتے۔

ایک بہت ہی باتونی آدمی جو تھوڑی بہت انگریزی بھی جانتا تھا اور ایک دو شہر سے بھی ہو آیا تھا۔ جب باہر آیا تو اس نے عجیب انداز سے کہا — "ونڈرفل! ونڈرفل! کیا قابل دید چیز ہے؟ عقل حیران رہ جاتی ہے۔" پھر ایک نوجوان لڑکا خیمے سے نکلا اور اس نے اس باتونی آدمی سے پوچھا۔ "کیا آپ نے تماشہ دیکھ لیا؟"

"کیوں نہیں میں تو پہلا شخص ہوں دیکھنے والا۔"

"میرا مطلب ہے آپ نے ہر چیز دیکھا —؟"

"ہر چیز سے کیا مطلب —؟"

"ہر چیز کا مطلب ہر چیز ——" پھر اس لڑکے نے اپنا منہ اس کے کان کے پاس لے جا کر کہا۔ "اگر کوئی چار آنے ادا کرے تو وہ اس لڑکی کے کپڑے بھی اتروا کر دیکھ سکتا ہے۔"

"ماں کسم —! سچ؟"

ماں کسم —! اگر کوئی آٹھ آنے ادا کرے تب تو وہ اُس لڑکی کو چھُو کر بھی دیکھ سکتا ہے۔ پھر اُس لڑکے نے اپنا منہ اُس آدمی کے کان کے پاس لے جا کر کہا۔ "میری تو آج پوری اٹھنی خرچ ہو گئی۔ تمہیں کیسے دیکھیں گا؟"

اس سے ملا ہوا ایک اور خیمہ تھا جس کے سرے پر موٹے حروف میں "پیراڈائز ریستوران" کا بورڈ لٹک رہا تھا۔ اندر معمولی قسم کی چار پانچ لکڑیوں کی میزیں اور لوہے کی کرسیاں پڑی تھیں جن پر دیہاتی بیٹھے ہوئے نوجوان اور چند سن رسیدہ لوگ بیٹھے گرم گرم چائے طشتریوں میں ڈھال کر پھونکیں مار مار کر پینے میں مشغول تھے۔ اندر کی فضا تیل میں تلی ہوئی چیزوں کی بو سے بس رہی تھی۔ ساتھ ہی ایک اور جھونپڑا تھا جس کے سامنے ایک آدمی لانبا کرتا پہنے کپڑے کے تھیلے کو لکڑی کے ایک صندوق پر رکھے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہ اور بھورے رنگ کی گھنی گھنی داڑھی تھی اور مونچھوں نے تو پورے طور پر اس کے منہ کو ڈھک لیا تھا۔ لوگ اس کو بھی چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ سنا جاتا تھا کہ وہ ہر مرض کا علاج کرتا ہے۔ اس کے پاس ایسی عجیب و غریب دوائیاں ہیں کہ وہ انہیں سے ہر قسم کی خرابیاں اور پرانی سے پرانی بیماریوں کا علاج کر کے صرف چند گھنٹوں میں اچھا کر دیتا ہے۔ بیشتر اوقات وہ خاموش ہی رہتا البتہ کبھی کبھی زور کی آواز لگا دیتا تھا اس کی ہیئت کذائی، بھاری بھرکم آواز اور داڑھی مونچھیں کچھ ایسی ہیبت ناک تھیں کہ لوگوں کو اس کی باتوں کا یقین کرنا ہی پڑتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جنگلی جڑی بوٹیوں کا ماہر ہے اور کچھ دوائیں اُس نے انگلینڈ سے بھی منگوائی ہیں۔

بھیڑ سے نکل کر ایک آدمی کانپتا ہوا ڈاکٹر کے پاس آیا۔ اس نے ایک بوسیدہ سا جاپانی کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ اور سر ایک لانبے کپڑے

سے بندھا ہوا تھا اور چہرے سے شدید قسم کے کرب اور اضطراب کا احساس نمایاں تھا۔ اُس نے اپنی کانپتی ہوئی آواز میں جو کچھ بھی کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ چار دن ہوئے اس کی ڈاڑھ میں درد شروع ہوا۔ جو بڑھتا ہوا آج اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ گال پھول کر کُپّا ہو چکا ہے اور بات کرنی مشکل ہے۔ درد میں اتنی شدت ہے کہ جیسے سر پھٹا جا رہا ہے۔ پچھلے چار دن اور چار راتوں سے نہ تو اس نے ایک دانہ کھایا ہے اور نہ ہی اس کی آنکھ ہی لگی ہے۔ اس نے اپنا علاج گاؤں کے وَیدیہ سے بھی کرایا لیکن درد گھٹنے کے عوض اور بڑھتا ہی چلا گیا۔

ڈاکٹر نے اپنے بیگ سے ایک "ٹارچ" نکالا۔ پھر سنجیدگی سے بولا۔ "ذرا مُنہ تو کھولو۔"

بڑی مشکل سے اس بے چارے نے اپنا منہ کھولا۔ ڈاکٹر نے بڑے غور سے اس کا معائنہ کیا اور بولا "علاج ہو جائے گا۔ لیکن دوا کی قیمت دو روپے ہوگی۔"

"دو روپے —!" بڑے تعجب اور بڑے کرب سے اس آدمی نے کہا "میں دو روپے کہاں سے لاؤں، ڈاکٹر صاحب! وَیدجی نے صرف دو پیسے میں دوا دے دی تھی۔"

"تب تم اپنے وَیدجی کے پاس کیوں نہیں جاتے؟" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "تمھاری حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ خدانخواستہ ایک دو دن یہی حالت رہی تو پھر تمھارا بچنا مشکل ہو جائے گا۔ میں تم سے چالبازی نہیں کر رہا ہوں، اور نہ ہی تم سے روپیہ ٹھگتا ہوں۔ میں تم کو دوا دیتا ہوں۔ اگر دس منٹ میں فائدہ نہ ہو تو پیسے مت دینا۔"

دوسرے لوگوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی

دس منٹ میں درد رفع ہو جانے کے خیال نے اس آدمی کو بے چین کر دیا۔ پھولے ہوئے گال کو بڑی مشکل سے حرکت دیتا ہوا بولا۔ "لیکن دو روپے میں کہاں سے لاؤں؟ اگر میں تم کو ہی دو روپے دے دوں تو کھاؤں گا کیا میری بیوی بھی ہے اور چار پانچ بچے بھی ہیں اور پھر......"

ڈاکٹر بیچ میں بول پڑا "دیکھو! اپنی تکالیف کا ذکر کر کے میرا وقت برباد نہ کرو۔ نہ کسی نے آج تک مجھ پر رحم کیا ہے اور نہ میں کسی پر رحم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سب بالکل فضول باتیں ہیں۔ دوا کی تجارت کرتا ہوں، پیسے ہوں تو دوا لو ورنہ چلتے بنو!"

مریض نے کسی وجہ سے اپنا خیال بدل دیا، اور آگے آیا۔ "اچھا تو دوا دے دیجئے۔ لیکن ہاں، جب تک درد کم نہیں ہو جاتا۔ میں ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔"

"ٹھیک ہے —— اگر درد کم نہ ہو تو مت دینا۔ اتنے سارے لوگ موجود ہیں۔ گواہ رہیں گے۔"

ڈاکٹر نے اپنے بیگ سے تھوڑی سی سوکھی ہوئی پتیاں نکالیں اور انھیں اپنی ہتھیلی پر مسل مسل کر بالکل سفوف بنا دیا۔ پھر ایک چھوٹے سے گلاس میں تھوڑا سا پانی لے کر ایک بوتل سے چند قطرے عرق کے ٹپکائے اور گلاس کو ہلا مارا۔ پھر مریض کو پلا دیا۔ دوا پلانے کے بعد اس نے مریض کو منہ پھاڑنے کے لئے کہا اور اس کے سوجے ہوئے مسوڑھے پر سفوف مل دی اور بولا تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔ پہلے تمھارے منہ سے بھاپ ٹپکے گا پھر درد جاتا رہے گا۔

آس پاس جتنے لوگ بھی بیٹھے تھے بڑے تعجب سے دونوں کی حرکتوں کو دیکھ رہے تھے۔ دس منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ وہ آدمی اُٹھ کھڑا ہوا ——!

"کیوں جی درد اچھا نہیں ہوا" ڈاکٹر نے بڑے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

"درد تو سچ مچ غائب ہو گیا۔ تمھاری دوا ہے یا جادو کی پڑیا۔" مریض نے جواب دیا۔ جتنے لوگ وہاں موجود تھے اس عجیب و غریب معاملے سے بڑے متعجب اور حیران ہوئے۔ پھر مختلف قسم کے لوگوں نے مختلف قسم کی خیال آرائیاں شروع کیں۔ لیکن ڈاکٹر بولا —— "دیکھو جی! جانے سے قبل میرا پیسہ ادا کرتے جاؤ۔"

مریض نے فرسٹ روپیہ نکالا اور چاہتا تھا کہ کچھ بولے۔ لیکن اس کی نظر ڈاکٹر کے چہرے پر پڑ گئی پھر تو وہ بغیر کچھ کہے سُنے ہی روپیہ دے کر چلتا بنا۔ آخر رفتہ رفتہ یہ افواہ گرم ہوئی کہ میلے میں ایک ایسا ڈاکٹر آیا ہے جو ہر قسم کا علاج چند منٹوں میں کرتا ہے۔ اس کے پاس طلسمی طاقت ہے۔ اس نے نہ جانے کتنے مُردوں کو جلا دیا ہے پھر تو ڈاکٹر کے پاس ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا جن میں سے اُن لوگوں کی تعداد زیادہ تھی جو اپنے رشتہ داروں کے لئے دوائیاں خرید رہے تھے۔ ڈاکٹر نے سارے لوگوں کو یقین دلایا کہ تینوں دنوں کے اندر دوا ضرور کارگر ہوگی۔ بے کار نہیں جا سکتی۔ لیکن ڈاکٹر پیسوں کے معاملے میں اتنا سخت تھا کہ وہ کسی کو ایک پائی بھی چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔

اچانک ایک بوڑھی عورت روتی پیٹتی ڈاکٹر کے پاس آئی اور اس کے

قدموں پر گر پڑی - اس نے روتے ہوئے بتایا کہ اس کا اکلوتا لڑکا پچیس دنوں سے بخار میں مبتلا ہے - بخار ہے کہ ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا - بلکہ کل سے تو اس کی سانس بھی رک رک کر آنے لگی ہے اور بے ہوش ہے - وہ اپنے لڑکے کے لئے دوا کی طلب گار تھی

بہت ہی سنجیدہ چہرہ بناتے ہوئے ڈاکٹر بولا " پانچ روپے - "

" پانچ روپے ؟ " بوڑھی عورت پھر سسکیاں بھرنے لگی - " پانچ روپے ؟ " رحم کرو بابو مجھ غریب بیوہ عورت پر رحم کرو - میرا اس دنیا میں کوئی نہیں - میرے اکلوتے بچے کو بچا لو رحم کرو، ڈاکٹر بابو، رحم !! "

ڈاکٹر نے پھر وہی جواب دیا - جواب جو سے پہلے ایک آدمی کو دے چکا تھا -
" میں نے کسی پر آج تک رحم نہیں کیا ہے اور نہ کسی نے مجھ پر ہی رحم کیا - میں کسی پر رحم نہیں کرتا، میں دوا بیچتا ہوں - "

بوڑھی عورت اس کے قدموں پر گر پڑی - " پھر کیا ہوگا ڈاکٹر بابو، کیا میرے بچے کو مر جانے دوگے ؟ نہیں نہیں، اسے بچا لو، تم ہی اسے بچا سکتے ہو، بابو ! رحم کرو، رحم - "

ڈاکٹر نے پھنکارتے ہوئے کہا - " میں کچھ نہیں کر سکتا - تم ہی بتلاؤ اگر میں اسی طرح رحم کرتا رہوں تو میرا کام کیسے چلے گا - میں کسی پر رحم نہیں کھاتا - تم پانچ روپے ادا کرو تو دوا لو اور نہ اپنا راستہ پکڑو - "

رات کافی ہو چکی تھی اور بیشتر دوکانوں کی بتیاں گل ہو چکی تھیں مگر تھیٹر کی بڑی بڑی بتیاں روشن تھیں اور میلے کے تمام لوگ اسی کے گرد جمع تھے - تھیٹر اپنے عروج پر تھا - جوان اور بوڑھے، مرد اور عورتیں سب کے سب وہاں جمع تھے - ناٹک کمپنی والوں نے ابھی اپنا کھیل شروع کیا ہی تھا کہ یہ خبر پھیل گئی کہ ایسا تھیٹر تو میلے میں کبھی آیا ہی نہ تھا اور نہ ایسی چیز کبھی دیکھنے اور سننے میں آئی - نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں لوگ ناٹک سے نکل نکل کر تھیٹر کے خیمے کی طرف لپکے - بڑی پینے والے نوجوان، ادھیڑ عمر کے لوگ جو دن بھر جوئے پر بیٹھے تاش یا شطرنج کھیلا کرتے اور حقہ پیا کرتے اور وہ عورتیں جو چھوئی موئی کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھی جاتی تھیں، سب ہی دوڑ پڑے - تھیٹر کے اندر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی - کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو خود کو چادروں اور کمبلوں سے اچھی طرح لپیٹے ہوئے تھے خیمے کے اردگرد منڈلا رہے تھے انھیں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا - البتہ مکالموں کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے سن پاتے اور کبھی کبھی گانوں کی آواز سنائی دے جاتی تھی جس سے ان کی تشفی ہو جاتی تھی اور وہ لوگ اسی سے مسرور ہو رہے تھے -

میلے میں شاید ڈاکٹر ہی ایسا شخص تھا جو تھیٹر نہیں گیا تھا - وہ اپنے جھونپڑے میں بیٹھا پاسنگ شو کے کش لگا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ سگریٹ ختم ہو جانے کے بعد سو جائے کہ اچانک رونے کی آواز سنائی دی - آواز کسی لڑکی کی تھی جو پاس ہی کے خیمے سے آ رہی تھی -

" اُف ! لعنت ہے اس زندگی پر، اس وقت آدھی رات کو بھی چین نہیں - میں تو تنگ آ گیا ہوں اس سے، تھوڑی دیر تک وہ یونہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا - تاریکی اب اُسے بھیانک دکھائی دے رہی تھی - حالانکہ باہر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی - اس نے زور کا ایک کش لیا اور سگریٹ پھینک دیا - تھیٹر سے ایک لڑکی کے گانے کی ٹوٹی پھوٹی آواز یہاں پہنچ رہی تھی لیکن دوسری آواز زیادہ صاف اور نمایاں سنائی دے رہی تھی جسے ڈاکٹر سننا نہیں چاہتا تھا - گھٹی گھٹی سسکیوں کی آواز تاریکیوں کو چیر رہی تھی - ڈاکٹر سے نہیں رہا گیا - وہ باہر نکل آیا - پہلے تو اُسے پتہ ہی نہیں چلا کہ سسکیوں کی آواز کہاں سے آ رہی ہے - دو چار قدم بڑھنے کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ چائے خانے کے بازو والے خیمے سے سسکیاں پھوٹ رہی ہیں ڈاکٹر اور آگے بڑھا - یہاں تک کہ اب وہ اُس خیمے کے دروازے کے سامنے تھا، جس میں دن بھر آج ایک عجیب و غریب لڑکی کا تماشہ دکھلایا جا رہا تھا -

سسکیاں پھر شروع ہو گئیں - آواز کسی لڑکی کی تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُسے ہچکی بندھ گئی ہے -

" کون ہے اندر —؟ کیا ہوا ہے ؟ " ڈاکٹر نے پوچھا -

کوئی جواب نہ آیا —— سسکیاں بند ہو گئیں - تھوڑی دیر کے بعد پھر جاری ہو گئیں -

" اُف کیا مصیبت ہے ! کون ہے اندر ؟ " ڈاکٹر نے پھر پوچھا -

ہچکیوں کی آواز پھر بند ہو گئی - دھیمی سی کسی لڑکی کی آواز سنائی دی - " میں ہوں یہاں "

" کون ہو تم — ؟ "

" میں — میں کوئی نہیں " - ہچکی پھر شروع ہو گئی -

" ہے بھگوان — ! " " کوئی نہیں - " کیا تم لڑکی نہیں ہو، تمھاری آواز سے تو یہی پتہ چلتا ہے - "

کوئی جواب نہیں ---

"کون ہے اندر ---" ڈاکٹر نے کسی انجان کو پھر خیمے میں مخاطب کیا۔

"کوئی نہیں۔" اندر سے جواب آیا۔ سب لوگ تھیئٹر گئے ہوئے ہیں۔"

"صرف تم یہاں ہو۔ ؟"

"ہاں --- صرف میں ہوں !"

ڈاکٹر نے اپنی جیب سے ٹارچ نکالی اور خیمے کے پردے کو اُٹھا کر اندر داخل ہو گیا ٹارچ کی روشنی میں اُسے خیمے کے اندر مختلف چیزوں کے درمیان لکڑی کا ایک صندوق دکھائی دیا۔

"کہاں ہو تم ؟" ڈاکٹر نے پوچھا

"اس بکس کے اندر۔" ڈاکٹر کو سخت تعجب ہوا۔ اُس نے آگے بڑھ کر صندوق کے ڈھکنے کو اُٹھا دیا۔ دیکھا کہ بکس کے اندر ایک کپڑا بچھا ہوا ہے اور وہ لڑکی اسی پر لیٹی ہوئی ہے۔ ایک پُرانا اور خستہ کمبل اس کے جسم پر پڑا ہوا ہے اس کے سر پر خوبصورت گھنگھریالے بالوں کا گچھا تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان ہی ہوگی لیکن اتنا چھوٹا بکس ایک جوان لڑکی کے لئے کافی ہو گیا ہے۔ معاملہ ذرا پیچیدہ تھا۔

"آخر تم ہو کون --- ؟" ڈاکٹر نے اپنا سوال پھر دُہرایا۔ اس بکس میں کیوں پڑی ہو اور رہ کیوں رہی ہو ؟"

"تم مجھے جانتے ہی نہیں --- ؟ بڑے تعجب کی بات ہے، تم نے مجھے دیکھا بھی نہیں جبکہ میلے کے ہر شخص نے مجھے دیکھا ہے۔ دو آنے میں مجھے صرف دیکھا جا سکتا ہے۔ چار آنے میں مجھے ننگا کیا جا سکتا ہے اور آٹھ آنے میں تو جیسے چاہو اور جس طرح چاہو۔ مجھے چھو سکتے ہو، صرف ایک بار --- لیکن اس معاملے میں تم بڑے خوش قسمت ہو کر تمھیں پیسہ خرچ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اب تم بغیر خرچ کئے ہی دیکھ سکتے ہو، سارے تماشے۔ ! وہاں کیوں کھڑے ہو، مجھے دیکھو، میری طرف دیکھو، نگاہوں کی پیاس بجھاؤ، کھینچ لو کمبل، دیکھو اور خوب دیکھو ! چھوؤ اور اچھی طرح چھوؤ۔ میں عجیب لڑکی ہوں، بالکل عجیب، ایک تماشہ ! کمر سے اوپر سولہ سال کی ایک دوشیزہ اور کمر سے نیچے ایک دودھ پیتی بچی۔ . . ."

ڈاکٹر ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آج زندگی میں پہلی بار وہ خود کو گونگا محسوس کر رہا تھا۔ کہنے کے لئے اُس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔

"کیوں، تمہیں انتظار کس بات کا ہے ؟ تم میں اتنی جرأت نہیں کہ اس کمبل کو اُتار پھینکو۔ اچھی بات ہے۔ تمھارے لئے یہ کام میں خود ہی کئے دیتی ہوں۔"

اچانک لڑکی نے کمبل کو جھٹک کر پھینک دیا۔ ڈاکٹر کو سخت دھچکا سا لگا۔ سامنے ایک نوجوان لڑکی کا ننگا جسم تھا۔ اوپر کا حصہ واقعی سولہ سالہ دوشیزہ جیسا تھا۔ البتہ کمر سے نیچے کا حصہ ڈھائی تین سال کے بچوں جیسا تھا۔

ڈاکٹر نے ٹارچ بجھا دیا۔ اور کمبل بڑھاتے ہوئے بولا۔ "چھپا لو چھپا لو اپنا بدن !"

"کیوں --- ؟" تاریکی میں لڑکی کی متحیر آواز گونجی، کیا تم خوفزدہ ہو گئے مجھ کو تو اتنے سارے لوگ دیکھتے ہیں لیکن کوئی بھی نہیں ڈرتا۔"

"چھپا لو --- چھپا لیا تم نے اپنا بدن ؟" ڈاکٹر بولا۔

"ہاں چھپا لیا --- اب روشنی کر دو !" لڑکی بولی

ڈاکٹر نے ٹارچ جلایا۔ لڑکی نے اسی بوسیدہ اور خستہ کمبل سے اپنا جسم چھپا لیا تھا۔ اُس نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اب تم ہی بتاؤ، میں کون ہوں ؟ کیا میں انسان ہوں۔ تم نے تو میرا پورا جسم دیکھ لیا ہے"

"تم۔ تم --- ایسی کیسے ہو گئیں، کیا تم ایسی ہی پیدا ہوئی تھیں ؟"

"نہیں۔ جب ہم لوگ پیدا ہو گئے . . . . . ."

"ڈاکٹر نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی۔ "ہم لوگ --- ہم لوگ کا کیا مطلب ؟"

"اوہ ! ہم دونوں --- میں اور میری بہن، ہم دونوں ایک ساتھ ہی پیدا ہوئیں۔ پیدائش کے کچھ دن بعد جب ہم دونوں بیٹھنے کے قابل ہو گئیں تب ہمیں ہانڈیوں میں بٹھا دیا گیا۔ چنانچہ جسم کے اوپری حصّے کی نشو و نما تو فطری طور پر ہوئی لیکن نچلا حصّہ جو ہانڈی کے اندر قید تھا ویسا ہی رہا۔ آخر چودہ سال بعد جب ہانڈی خود بخود ٹوٹ گئی تو ہم دونوں کو نجات ملی۔ چودہ سال بعد --- آیا سمجھ میں۔"

"تم چودہ سال تک ہانڈی میں رہیں ؟" ڈاکٹر کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ حیرت اور تعجب کے ملے جلے آثار اس کے چہرے پر نمایاں ہو گئے۔ "نا ممکن ہے، تم اس میں رہ کیسے سکیں ؟"

"اوہ ! میں سمجھی۔ ایک گول سوراخ ہانڈی کے پیندے میں کر دیا گیا تھا کیوں، اب آ گئی سمجھ میں بات ! ہمارا شمار جانوروں میں تھا لیکن جب میں

باڑی سے باہر آگئی تو پھر نہ جانوروں میں رہی نہ انسانوں میں۔ اسی لیے تو ہزاروں آدمی مجھے دیکھنے آتے ہیں۔ سیکڑوں آدمی تمھاری طرح دم بخود رہ جاتے ہیں اور میرا باپ کافی آمدنی کرتا ہے۔"

"کیا بولتی ہو تم —— ڈاکٹر بولا۔ تمھارا باپ؟ —— کون ہے تمھارا باپ؟؟"

"کیوں —— اس میں تعجب کی کون سی بات ہے! میرا باپ ہی تو ہے جو لوگوں کو تماشہ دکھلاتا ہے۔ جو لوگوں سے یہ سرگوشیاں کرتا ہے۔ کہ "اگر چار آنے دو گے تو ہر چیز کھول کر دیکھ سکتے ہو اور آٹھ آنے میں ایک بار چھو بھی سکتے ہو۔"

لڑکی نے بڑی رقت آمیز انداز میں یہ باتیں بتائیں۔ تھوڑی دیر چپ رہی پھر رونے لگی۔ "تین سال ہوئے کہ میری بہن یکایک مر گئی اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔ حیرت ہے کہ مجھے موت کیوں نہیں آتی۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں کب مروں گی؟" ڈاکٹر سے جواب سننے بغیر ہی وہ پھر کہنے لگی۔ "میرا دماغ میرے جسم کے اوپری حصے ہی کی طرح بالغ ہے جیسا کہ ایک اٹھارہ سالہ دوشیزہ کا ہونا چاہیئے لیکن نہ میں انسان ہوں اور نہ جانور۔ میرے تصورات اور میری خواہشات کی کیا قیمت؟ میری خوبصورتی اور شرم و حیا کا کوئی مصرف بھی ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ تم صرف چار آنے میں میرے جسم کو ننگا کر کے دیکھ سکتے ہو، آٹھ آنے میں میرے نازک اور خوبصورت جسم کو چھو سکتے ہو، اس کی نرمی اور گرمی محسوس کر سکتے ہو۔ اگر میں اعتراض کروں تو میرے لئے زد و کوب اور فاقہ کشی ہے، میں کہیں بھاگ بھی تو نہیں سکتی۔"

لڑکی پھر رونے لگی اور سسکیاں بھرنے لگی۔ پھر اچانک رک کر بولی لیکن تم کون ہو؟ تم نے تو اپنے بارے میں کچھ بتلایا ہی نہیں؟ تعجب تو مجھے اس بات پر ہے کہ تم نے مجھے اب تک دیکھا ہی نہیں تھا اور پھر تم ٹھیرے بھی ہو گئے۔ آخر تم کس قسم کے انسان ہو؟"

"میں ڈاکٹر ہوں —!"

ڈاکٹر —! لڑکی بے ساختہ ہنس پڑی۔ "تم کس قسم کی بیماری کا علاج کرتے ہو۔ کیا تم مجھے اچھا کر سکتے ہو؟"

"بے شک — میں تمھیں تندرست کر دوں گا —" ایسا محسوس ہوا کہ ڈاکٹر کچھ سوچ رہا ہو۔ "تم ایک شیشی دوا میں بالکل درست ہو سکتی ہو۔"

"میں بالکل اچھی ہو جاؤں گی؟ — تندرست؟؟" چاند کی روشنی میں لڑکی کی آنکھیں چمک اٹھیں — "میں اچھی ہو جاؤں گی؟ — چلنے کے قابل ہو جاؤں گی —؟؟ ایک انسان بن جاؤں گی؟؟"

"ہاں" ڈاکٹر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تب مجھ پر رحم کرو ڈاکٹر — کوئی دوا دو جلد — رحم —" لڑکی گڑگڑانے اور منت کرنے لگی۔

رحم — رحم — رحم جیسے ڈاکٹر کو موت سونگھ گئی۔ اس نے اپنی پچھلی شخصیت سے مشورہ کیا۔ میں جب رحم کا نام سنتا ہوں تب میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ میں نے آج تک کسی پر رحم نہیں کیا ہے اور نہ کسی نے مجھ پر — میں کیوں تم پر مہربانی کروں — کیوں — کیوں — کیوں — اس کا سر چکرانے لگا۔

ڈاکٹر اب اپنے جھونپڑے میں واپس آ گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے بنچ پر بیٹھا رہا۔

پورن ماشی کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ دودھ کی سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ تھیٹر سے گانے کی جستہ جستہ آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی اور اسی میں ملی جلی لڑکی کی سسکیاں بھی۔ وہ ہچکیوں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ڈاکٹر سحر زدہ سا پندرہ منٹ تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اٹھا اور ایک بوتل اٹھا لایا تھیلے سے ایک سفید سفوف کی پڑیا نکالی اور پھر دونوں کو ایک گلاس میں تھوڑے سے پانی میں ملا کر ہلانا شروع کیا۔ پھر ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں گلاس کے ساتھ لڑکی کے خیمے کی طرف بڑھا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ دروازے پر ٹھٹھکا پھر اندر داخل ہو گیا۔

روشنی دیکھ کر لڑکی خاموش ہو گئی اور بولی — "کون ہے؟"

"میں ہوں ڈاکٹر —— دوا لے آیا ہوں!" وہ بکس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

اب کچھ مت بولو۔ اور یہ دوا پی لو۔ تمھیں نیند آ جائے گی، پُرسکون نیند —— اور جب اٹھو گی تو دیکھو گی کہ تم بالکل تندرست ہو —— انسان بن گئی ہو!"

لڑکی نے اپنا منھ کھول دیا۔ ڈاکٹر نے دوا انڈیل دی۔

"میں اچھی ہو جاؤں گی نا، کیوں —" لڑکی نے پوچھا جیسے یقین نہیں آ رہا ہو۔

ڈاکٹر باہر نکل آیا اور اس نے گلاس کو زمین پر پٹک کر چکنا چور کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر اپنے خیمے کے باہر دکھائی دیا۔ ایک تھیلا اس کے کاندھے سے لٹک رہا تھا اور ایک گٹھڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کسی طرف نہیں دیکھا۔ جس راستے سے آیا تھا خاموشی سے اسی پر چل پڑا ؛

محمد امین

چاند کا سفر

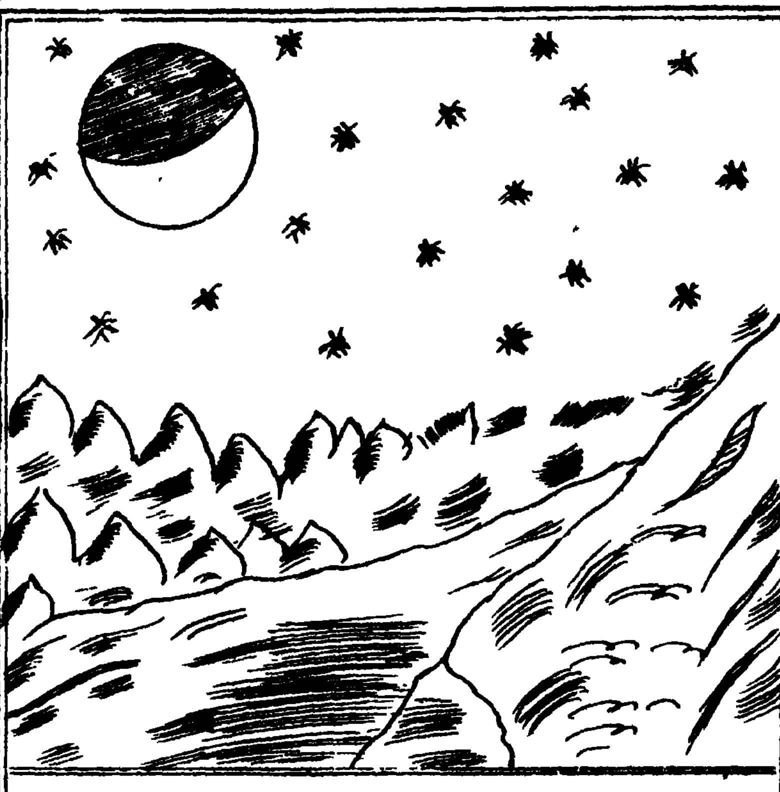
زمین پر آبادی بڑھ رہی ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کو بسانے کے لئے روز روز ہمارے سیارے یعنی زمین پر جگہ محدود ہوتی جا رہی ہے۔ امریکہ، روس اور برطانیہ کے سائنس داں تجربے اور تحقیقات کر کے چاند پر جلد سے جلد پہنچنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔

بمبئی، کلکتہ، رنگون، پیکنگ، ماسکو، لندن، نیویارک تک سفر کرنے کی خبر تو سنتے رہتے ہیں، لیکن چاند کا سفر بالکل ہی انوکھا خیال ہے۔ بھلا چاند تک بھی کوئی سفر کر سکتا ہے۔ وہ تو زمین سے لاکھوں میل دُور ہے۔ یعنی ۲،۴۰،۰۰۰ میل۔ بھلا اتنی دُور کا سفر وہ بھی آکاش میں۔ نہ معلوم کس قدر سنسنی خیز ہوگا۔

جنھیں ہوائی جہاز میں اُڑنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ کس قدر لطف آتا ہے، اگر ایک ایسا ہوائی جہاز بنایا جائے جو ایٹم کی طاقت سے اُڑے۔ پھر ہواؤں سے ہو کر ہم بہت تیز سفر کر سکیں گے، ایسے جہاز میں بیٹھ کر اُڑتے اُڑتے جب ہم اوپر ایک ہزار میل پہنچ جائیں تو وہاں کی دنیا ہی عجیب دنیا ہوگی۔ وہ ایسی جگہ ہے جہاں چاند اور زمین دونوں کی قوتِ کشش بالکل برابر ہے۔ وہاں پر ہم ایک مصنوعی چاند بنائیں گے جو چاند کے چاروں طرف گردش کرے گا، اور ہم بھی اس پر قیام کر کے چاند کے ارد گرد چکر کاٹیں گے۔ چاند پر پہنچنے کے لئے یہی ہمارا پہلا اسٹیشن ہوگا۔

اس سلسلے میں اب تک ہمارے سائنس دانوں نے ایک ایسا راکٹ بنا لیا ہے جو ۲۵۰ میل کی بلندی پر ۵۱۵۰ میل فی گھنٹہ یعنی ۱½ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے اُڑ چکا ہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک دوسرا راکٹ بنائیں جس کی رفتار پانچ گنی زیادہ ہو یعنی فی سیکنڈ ۷ میل جس دن ہم نے اس رفتار کا ہوائی جہاز بنا لیا اُڑان کے وقت یہ جہاز بآسانی زمین کی قوتِ کشش سے نکل جائے گا۔ اور پانچ دن کے اندر اندر چاند پر پہنچ جائے گا۔



چاند پر پہنچ کر اگر ہم اپنی زمین کو دیکھیں تو اس کی سطح کچھ اس طرح کی دکھائی دے گی

بعض لوگوں کو خطرہ ہے کہ ہزاروں میل کی اڑان کے دوران میں وزن گھٹنے اور ہمارے اعضا پر جو اس کے اثرات ہوں گے وہ بہت تکلیف دہ ہوں گے، اور اس اذیت

کو جھیلنا ناممکن ہوگا۔ لیکن تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ ۱۳ میل کی اونچائی پر راکٹ میں اڑان کرنے کے بعد بندر اور چوہے صحیح سلامت، زندہ بلاکسی قسم کے نقصان کے واپس آگئے ہیں۔ وزن گھٹنے کا جو بھی تجربہ ہوا یہ جانور بآسانی اسے برداشت کرگئے۔ اسی بناء پر ڈاکٹروں کو یقین ہے کہ انسان بھی اسے جھیل جائے گا۔

بہت بلندی تک اُڑنے میں سب سے زیادہ تکلیف اسی بات سے ہوگی اور ماہرین کا خیال ہے کہ اسے برداشت کرنے کی طاقت انسان میں موجود ہے۔ ایورسٹ کی چوٹی کی فتح کے بعد تو اب لوگوں کے حوصلے اور بڑھے ہوئے ہیں۔ پھر تو فی سیکنڈ ½۶ میل کی رفتار سے اڑنے والا ایک راکٹ چاہیئے۔ اسی کا انتظار ہے، اور جس دن یہ راکٹ بنا سمجھو انسان چاند پر پہنچا۔

راکٹ کے متعلق کئی ایک ملکوں میں تجربے اور تحقیقات جاری ہیں۔ برطانیہ میں سو کارخانے اور چار ریسرچ اسٹیشن اڑن طشتریاں بنانے میں منہمک ہیں۔ امریکہ دفاع کے سلسلے میں راکٹ پر سیکڑوں ملین ڈالر خرچ کررہا ہے۔

فوجی تیاری اور دفاع کے سلسلے میں راکٹ کے بارے میں جو ریسرچ ہورہا ہے وہ سب صیغۂ راز میں ہے۔ لیکن چاند کے سفر کی تیاری کے سلسلے میں ہمیں ان سے خاصی مدد ملے گی، اور غیر معمولی بلندی تک کائنات کے وسیع خلا میں اڑانے کے لئے کام بہت تیزی سے آگے بڑھ جائے گا۔ ایسے ہی جیسے کہ پچھلی جنگ عظیم کے دوران میں معمولی قسم کے ہوائی جہازوں کے تجربے خوب خوب کئے گئے۔ آخر میں کامٹ نام کا جہاز نکلا، جسے ہوائی بلندی سے بہت اوپر اُڑایا گیا، اور خاصی ترقی ہوئی۔ اب کامٹ نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ برٹش کمپنی بی، او، اے، سی نے روزانہ لمبا سفر کرنے والے راستوں پر اس کی باقاعدہ سروس شروع کردی ہے۔ چنانچہ ½ ۵ گھنٹے میں وہ لندن سے اُڑکر نیویارک پہنچ جاتا ہے۔ گویا دوپہر کا کھانا لندن کھا کر اگر آپ اڑان کیجئے تو رات کا کھانا اطمینان سے آپ نیویارک میں کھا سکیں گے۔ اسی کامٹ سے ہم اگر سفر کریں تو بمبئی سے لندن ہم ½ ۲ گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے دیکھا آپ نے کتنی تیزی سے اُڑان کی سائنس ترقی کررہی ہے۔ (کامٹ کے حادثے کی وجہ سے ان دنوں برٹش کمپنی نے یہ سروس بند کردی ہے۔ لیکن اس نے اعلان کیا ہے کہ جلد ہی وہ اسے پھر شروع کردے گی)

ایک امریکن پائلٹ (ہوا باز) نے ابھی حال میں ۹۰,۰۰۰ فٹ کی بلندی تک اڑان کی تھی اور اس کا یہ سفر خاصا کامیاب تھا۔ اس سے پہلے کا رکارڈ ۷۹,۰۰۰ فٹ کا تھا، گویا بلند سے بلند مقامات تک پہنچنے کی جد و جہد مسلسل ہورہی ہے۔

امریکہ کے انجینیر ہوائی جہاز کا ایک ایسا انجن بنانے والے ہیں جو ۴۰ میل کی بلندی پر ۲۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑے گا۔

ذیورچ (سوئٹزرلینڈ) کی کانفرنس کے موقعے پر سائنس دانوں نے یہ بات واضح کردی ہے کہ چاند تک پہنچنے کے لئے کئی منزلیں طے کی جاچکی ہیں اور ہم میں سے بہتوں کی زندگی میں چاند کی سطح پر انسان ضرور پہنچ جائے گا۔

آئندہ دس سال کے اندر اندر ایک راکٹ ہوائی جہاز کو خلا میں ضرور اُڑا دیا جائے گا، جو بلا انسان کی مدد کے اپنے آپ اڑے گا۔ اس کی رفتار ایک گھنٹے میں ۱۸,۰۰۰ میل ہوگی۔ یہ راکٹ اوپر جاکر زمین کا پورا ایک چکر کاٹے گا، گویا ۲۰۰ میل کی بلندی پر ایک مصنوعی چاند ہوگا۔ اس راکٹ میں ایسے آلے فٹ ہوں گے جو موسم کے حالات، اور اس کی تبدیلیوں کا ریکارڈ رکھ کر زمین تک لے آئیں گے۔ ایسی مشین بنانے میں صرف ۵۰ بمبار ہوائی جہاز کی لاگت کے برابر روپے خرچ ہوں گے۔

۱۵ سال کے اندر اندر بغیر انسان کی مدد کے اپنے آپ اڑنے والا راکٹ چاند پر پہنچ جائے گا، اور اس طرح وہ خلا، چاند کی سیزی اور سطح کا فوٹو اتار کر زمین تک لے آئے گا۔

۲۵ سال میں انسان خلا کے اندر ایک ایسا اسٹیشن بھی قائم کرنے میں قطعی طور سے کامیاب ہو جائے گا جو ہر وقت زمین کے ارد گرد گھومتا رہے گا اور چاند تک پہنچنے کے سلسلے میں اس اسٹیشن پر انسان قیام کرسکے گا۔ اس اسٹیشن سے چاند تک پہنچنا خاصا آسان ہوگا۔ ہم ۷,۰۰۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے اُڑنے والے راکٹ میں بھی بیٹھ کر چاند تک پہنچ جائیں گے اور چاند کی سطح پر قیام کئے بغیر پھر اسی اسٹیشن پر واپس آجائیں گے۔

چاند پر جیسا کہ ہم جانتے ہیں ہوا نہیں ہے۔ اس لئے اس کی سطح پر قدم رکھنے میں بہت دشواریاں حائل ہوں گی۔ لیکن زیوریچ کی کانفرنس میں شرکت کرنے والے سائنس دانوں کا پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ دعویٰ ہے کہ موجودہ صدی ختم ہونے سے بہت پہلے یہ دشواری حل ہو جائے گی۔ انہیں سائنس دانوں کا پورے وثوق کے ساتھ یہ بھی دعویٰ ہے کہ بیسویں صدی ختم ہونے سے پہلے سیر و تفریح کے لئے کائنات کی وسیع خلا میں سفر کرنا ایک معمولی بات ہوگی۔ اور امریکہ و برطانیہ اور روس کے شوقین بچے چاند پر پہنچ کر پکنک منانے کے منصوبے بنا رہے ہوں گے۔

الغرض سائنس داں تُلے ہوئے ہیں کہ جتنی جلد ممکن ہو ہم کائنات کی وسیع خلا میں اونچائی سے اونچائی تک نہ صرف اپنی مرضی کے مطابق اُڑنے لگیں بلکہ جتنی جلد ممکن ہو ہم چاند پر بھی پہنچ جائیں اور وہاں پہنچ کر ایک نئی دنیا بسانے کی کوشش کریں۔

بعض سائنس داں یہ سمجھتے ہیں کہ چاند کے اندر ایسی دھات بھی ہے جسے حاصل کرنے کے بعد انسان اپنے آپ کو لافانی بنا سکتا ہے یعنی انسان ہمیشہ اپنے آپ کو زندہ رکھ سکے گا۔ کیسی نایاب اور اچھوتی بات ہے، اسی لئے اور چوٹی کے سائنس داں چاند کی مہم کو سر کرنے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں۔

انسان فطرتاً کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ ہر وہ چیز جو دشوار گذار یا ناممکن معلوم ہوتی ہے اسے سر کرنے کے جتن کرتا ہے۔ ایک نہیں ہزاروں تدبیریں اس کے ذہن میں آتی ہیں۔ کبھی وہ شکست تسلیم نہیں کرتا، اور کائنات کا راز ڈھونڈنے میں اپنی فہم و فراست سے حیرت انگیز ترکیبیں اور جدتیں اختیار کرتا ہے، اور کامیابی کا سہرا حاصل کرکے اپنے آپ کو برتر و بالا ثابت کرتا ہے۔

اپنی جگہ پر یہ بات بالکل واضح ہے کہ موجودہ دور قدرتی عناصر کے غلبے کا دور نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو انسان کی فتوحات کا دور ہے — ہر میدان میں وہ قدرت پر فوقیت حاصل کرتا جا رہا ہے — ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء کو دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ فتح ہوگئی۔ اس کے بعد اب دنیا کے سائنس دانوں کے سامنے چاند کے سفر کا مسئلہ درپیش ہے۔ بس سب کو اب اسی کی دُھن سوار ہے۔ امریکہ میں بعض لوگ تو اتنی جلدی کر رہے ہیں کہ چاند پر سب سے پہلے پہنچنے کے لئے اپنی اپنی سیٹ محفوظ کرا رہے ہیں۔ تاکہ وہاں پہنچ کر اپنی اپنی نو آبادیاں قائم کرنے میں انھیں سب سے زیادہ آسانی ہو۔

روڑکیلا میں فولاد کا کارخانہ

روڑکیلا میں جرمن فرم کے تعاون سے فولاد تیار کرنے کے کارخانے کے قیام کے سلسلے میں کام جاری ہے۔ ہندوستان اسٹیل لمیٹڈ کے منیجنگ ڈائرکٹر شری ایس۔ این موزمدار نے حال ہی میں اُس جگہ کا معائنہ کیا، جہاں یہ کارخانہ قائم کیا جا رہا ہے۔ تقریباً دس ہزار مرد اور عورتیں پہلے ہی اس جگہ کام کر رہے ہیں جہاں ایک نیا قصبہ وجود میں آ رہا ہے۔ ان میں سے تقریباً چھ ہزار اشخاص ایسے ہیں جو منصوبہ مذکورہ پر عمل درآمد کے سلسلے میں زمین قبضے میں لئے جانے سے بے گھر ہو جائیں گے۔ اسکیم کے نتیجے کے طور پر تقریباً ۲۲۵۰ کنبے بے گھر ہوں گے، اور ان میں سے کام کاج کے اہل اشخاص کی اکثریت پہلے ہی روزگار سے لگ چکی ہے۔ مدیں اثنا حکومت اڑیسہ نے اس زمرے کے تمام اشخاص کی بحالی کے لئے علاقے کا انتخاب کر لیا ہے۔ لیکن یہ بحالی عارضی نوعیت کی ہوگی۔ کیونکہ توقع ہے کہ اس سلسلے میں بے گھر ہونے والے اشخاص کی اکثریت کو بالآخر ہندوستان اسٹیل لمیٹڈ کے ماتحت ہی مستقل روزگار مل جائے گا۔

خام لوہے کے ذخیروں تک پہنچنے کے لئے سڑکیں تعمیر کی گئی ہیں اور توقع ہے کہ زمین میں سوراخ کرنے کا کام موسم برسات سے پہلے ختم ہو جائے گا۔

عرش ملسیانی

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

تاریخِ ادبِ اُردو انگریزی، اردو اور ہندی میں شائع ہو چکی ہے۔ تشنہ لبانِ علم اس سے استفادہ کر چکے ہیں۔ اب اس کا ترجمہ فرانسیسی، جرمن، رُوسی، چینی اور فارسی زبانوں میں ہو رہا ہے۔ اس شہرۂ آفاق کتاب کے مصنف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے نامِ نامی سے کون واقف نہیں۔ اردو ادب کی گراں بہا خدمات جو آپ نے ادا کی ہیں، ان کے پیشِ نظر حال ہی میں آپ کو اُردو کے نمائندے کی حیثیت سے ساہتیہ اکیڈیمی کا ممبر منتخب کیا گیا ہے۔ اس انتخاب کا پس منظر آپ کے وہ ادبی کارنامے ہیں جن کی ایک مختصر تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

۱۹۰۴ء میں آپ نے الہ آباد یونی ورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ آپ یونی ورسٹی میں سب سے اوّل رہے۔ اسی حیثیت سے آپ نے اسی سال ایل، ایل، بی کا امتحان پاس کیا یعنی فرسٹ ڈویژن اور یونی ورسٹی بھر میں سب سے اوّل۔ ۱۹۳۰ء میں آگرہ یونی ورسٹی نے آپ کی علمی خدمات کے صلے میں آپ کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری پیش کی۔

آپ کی تصانیف کی فہرست ذیل میں درج ہے۔

۱۔ تاریخِ ادبِ اردو (انگریزی) جس کا پیش لفظ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو مرحوم کے قلم سے ہے۔

۲۔ اردو اور فارسی کے یورپین اور اینگلو یورپین شعراء (انگریزی) جس کا پیش لفظ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو مرحوم کے قلم سے ہے۔

۳۔ تاریخِ ادبِ اردو (اُردو) ۵۰۰ صفحات سے زیادہ پر مشتمل۔

۴۔ تاریخِ ادبِ اُردو (ہندی) دو جلدوں میں۔ مطبوعہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد

۵۔ یورپین اور اینگلو یورپین شعرائے اردو کی تاریخ (زیرِ طبع)

جو کتابوں کی تصنیف و تالیف میں آپ اس وقت مصروف ہیں۔

۱۔ سمبالزم اور لٹریچر (انگریزی) ۶۰۰ صفحات پر مشتمل

۲۔ جدید اُردو ادب دو جلدوں میں

۳۔ اردو اور فارسی شعراء کا ہندی میں کلام

۴۔ اردو شعراء کا البم مقدمے کے ساتھ

۵۔ مثنویاتِ میر بخطِ میر مقدمے کے ساتھ

۶۔ پی، ای، این سیریز کے لئے اُردو لٹریچر پر کتاب

۷۔ اُردو کے نامور ادیب (انگریزی میں اسی قسم کے ایک سلسلۂ کتب کے انداز میں) اس سلسلے میں میر، غالب، انیس وغیرہ باکمالوں پر کتب تصنیف کی جا رہی ہیں۔

آپ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور، مسز سروجنی نائیڈو اور دوسرے اہم پایہ کے ساتھ انگریزی زبان کی پی، ای، این سوسائٹی (انجمنِ اہلِ قلم) کے رکن رہے ہیں اور ہیں۔

ہندوستانی پی، ای، این سوسائٹی کے جنم داتا ممبروں میں سے ہیں۔ اس کی سکریٹری محترمہ صوفیہ وادیا ہیں۔

آپ ہندوستانی اکیڈیمی کے قائم کرنے والوں مثلاً رائے راجیشور بلی، ڈاکٹر تارا چند، حافظ ہدایت حسین اور منشی دیا نرائن نگم کے ساتھیوں میں سے ہیں۔

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر کے انتقال کے بعد اب آپ کا انتخاب ساہتیہ اکیڈیمی میں اُردو کے نمائندے کی حیثیت سے ہوا ہے۔

۱۹۴۵ء میں آل انڈیا رائٹرز کانفرنس کا جو اجلاس بنارس میں منعقد ہوا تھا، آپ نے اُس کی صدارت فرمائی تھی۔

ہندوستان بھر میں بے شمار مشاعروں اور ادبی کانفرنسوں کی آپ صدارت فرماتے رہے ہیں۔

آپ ورلڈ ادری اینٹلکٹ کانفرنس برسلز (۱۹۵۱ء) کی سب کمیٹی کے چیئرمین تھے۔

آپ ہندوستان بھر کی یونی ورسٹیوں میں اُردو کے اعلےٰ امتحانوں کے ممتحن ہیں اور رہے ہیں۔

آپ کے ادبی نوادر میں مثنویاتِ میر بخطِ میر اور اُردو شاعروں کا البم ایسے قیمتی نوادر ہیں، جو اشاعت پذیر ہونے کے بعد اُردو کے سرمایہ میں ایک حسین ترین اضافہ سمجھے جائیں گے۔ میر کی تین مثنویاں، مثنوی جنگ نامہ، مثنوی در بیانِ ہولی اور مثنوی دیگر، خود میر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ ابھی تک میر کا نمونہ خط منظرِ عام پر نہیں آیا۔ میر سے اہلِ ادب کو جو شیفتگی ہے اس کے پیشِ نظر یہ مثنویاں ان کے لئے ایک ایسی نعمت ثابت ہوں گی جس سے وہ اپنی نظر کی تشنگی بجھائیں گے۔ لکھنؤ سکول آف آرٹس اینڈ کرافٹس کے ڈاکٹر ہالدار نے اس بات پر مہرِ توثیق لگائی ہے کہ روشنائی، کاغذ اور اندازِ تحریر سے یہ مثنویاں ۱۲۱۳ ہجری کے لگ بھگ لکھی گئیں۔

شعراء کے البم میں مندرجہ ذیل شعراء کی رنگین تصاویر شامل ہیں۔

۱۔ میر
۲۔ قتیل فرید آبادی
۳۔ جسونت سنگھ پروانہ
۴۔ مرزا فدوی لاہوری
۵۔ مرزا مظہر جان جاناں
۶۔ مصحفی
۷۔ جعفر علی خاں حسرت
۸۔ ضیا دہلوی
۹۔ رائے ٹیکا رام تسلی
۱۰۔ کرپا دیال سکینہ مضطر

اس البم میں قتیل کے اُردو اشعار بھی تحریر ہیں۔ قتیل کے اردو اشعار کے باب میں علم تو تھا لیکن نایاب تھے۔

"ہمیں امید ہے کہ ساہتیہ اکیڈمی یا حکومتِ ہند کی مدد سے یہ نوادر بطلد منظرِ عام پر آ جائیں گے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا اکیڈمی کی رکنیت کے لئے عالیہ انتخاب نہایت ہی موزوں ہے۔

یوں بھی آپ سے مل کر ایک گونہ مسرّت حاصل ہوتی ہے۔ شعر و ادب کے آپ دلدادہ ہیں۔ جب بھی راقم سے ملاقات ہوتی ہے کوئی نہ کوئی نیا رسالہ، اخبار یا کتاب آپ کی بغل میں ہوتی ہے۔ راقم کے پاس کوئی ایسی ہی چیز، انھیں نظر آئے تو وہ چھوڑتے نہیں۔ کتابوں کے باب میں، تصنیف و تالیف میں زندگی گزارنے والے کچھ ایسے ہی "سخت گیر" ہوا کرتے ہیں۔ پیرانہ سالی میں بھی ابھی ماشاءاللہ وہ عزمِ جواں ہی نہیں بلکہ دل بھی جوان رکھتے ہیں۔ چہرے کی بشاشت، ہنستی ہوئی پیشانی اور شعر و ادب کا والہانہ عشق مل جل کر اُن کی شخصیت میں ایک ایسی جاذبیت بھر دیتے ہیں کہ جسے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے، بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اعداد و شمار

— آخر فروری ۱۹۵۵ء تک "بحالیات کے متعلق مالی امداد کی تنظیم" نے بے گھر لوگوں کو ۳۹ کروڑ ۵۹ لاکھ ۱۰ ہزار روپے کے قرضے دئے۔

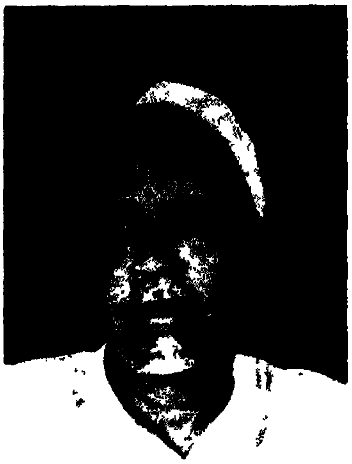
— ہندوستانی ریلوں کی طرف سے ۱۴۵ اسکول قائم ہیں۔ ان میں سے ۴۹ پرائمری، ۷۲ مڈل اور ۲۴ ہائی اور ہائیر سیکنڈری اسکول ہیں۔

— آخر ۱۹۵۴ء تک اجتماعی ترقّی اور زرعی توسیع کی قومی اسکیموں میں عوام نے نقدی، محنت و مشقت یا دیگر صورتوں میں ۷ کروڑ ۸۴ لاکھ روپیہ کی امداد دی اور حکومت نے اس سلسلے میں ۱۳ کروڑ ۸۴ لاکھ روپیہ صرف کیا۔

— آخر دسمبر ۱۹۵۴ء تک ہندوستان کے اجتماعی ترقّی کے پروگرام کے تحت ۱۸۸۶ میل کچی اور ۱۱۴۵ میل پکی سڑکیں تعمیر کی گئیں۔

— ۱۹۵۴ء میں ہندوستان نے امریکہ کو ۳ کروڑ ۲۱ لاکھ ۶۰ ہزار پونڈ چائے برآمد کی۔

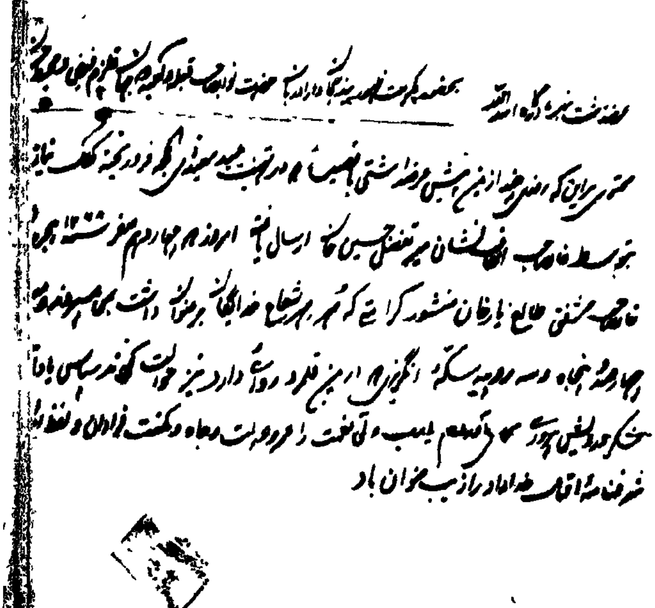
— ہندوستان کے سمندروں میں ایک لاکھ دس ہزار مربع میل سے بھی زیادہ رقبے پر ماہی گیری ہو سکتی ہے۔



امجد حیدرآبادی
آپ کی شاعری پر ناصر کرنولی کا
مقالہ اسی شمارے میں ملاحظہ
فرمائیے



ڈاکٹر رام بابو سکسینہ
، اردو کے نمائندے کی حیثیت سے ساھتیہ اکیڈیمی
کے ممبر منتخب ہوئے ہیں



غالب کی ایک عرضداشت نواب وزیر الدولہ
والئی ٹونک کی خدمت میں - متعلقہ مقالہ
اسی شمارے میں ملاحظہ فرمائیے -

بہ شکریہ سید منظور الحسن برکاتی



سامعین

«فسانہ ہیں ہم لوگ»

۱۰ اپریل ۱۹۵۵ کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے
جو مشاعرہ نشر ہوا اس سے متعلق تصویریں



صادي حائر



جگر بریلوی

نجم آفندی





حیرت بدایونی





محوی صدیقی لکھنوی

نوح ناروی



زار دہلوی





دل شاه جهان پوري



تلوڪ چند محروم

جوش مليح آبادي



ناطق گلاؤٺوي



فسانہ ہائے ہیں ہم لوگ

مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی کے اہتمام سے ایک مشاعرہ نئی دہلی ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہوا تھا۔ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں سب سے جواں سال شاعر کی عمر ۶۱ سال کی تھی۔ مشاعرے کے بعد دو بزرگ شعرا کی فلم بھی بنائی گئی اور ان کا کلام ریکارڈ بھی کیا گیا۔ بدقسمتی سے علامہ وتاثر یہ کیفی، حضرت امجد حیدرآبادی، مرزا یگانہ چنگیزی، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور جناب لبرار سردی مدعو کرنے کے باوجود بوجہ تشریف نہ لا سکے اردو کے بزرگ شعرا کی عزت افزائی اور ان کی صورتوں اور آوازوں کو محفوظ کرنے کی جدت کے لئے ادارہ آل انڈیا ریڈیو شیدائیانِ اردو سے شکریے کا مستحق ہے۔ جن شعرا نے مشاعرے میں حصہ لیا ان کا تعارف اور کلام ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔ تصویریں ۲۵، ۲۶ اور ۲۷ صفحوں پر ہیں (ادارہ)

سید وحیدالدین بیخود دہلوی

عمر ۹۸ سال۔ فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی کے جانشین کہے جاتے ہیں۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ وسیع رہا ہے۔

نزع میں سامنے اک صورت زیبا آئی ۔۔۔ موت آنکھوں سے اٹھاتی ہوئی پردا آئی

کوئی انساں بھی دیکھا کوئی عاشق بھی ملا ۔۔۔ یوں تو آنے کو تری بزم میں دنیا آئی

جان قرباں ہو اس آنکھ پہ حسرت یہ ہے ۔۔۔ دیکھ کر جو ترے جلوے کا تماشا آئی

وہ ترا عشق تھا جس نے مجھے بیمار کیا ۔۔۔ وہ تری یاد تھی جو بن کے مسیحا آئی

بات کرنے کی قسم کس لئے کھالی بیخود

تو نے کیا سوچا ہے یہ جی میں ترے کیا آئی

مرزا تجمل حسین نجم آفندی

وطن آگرہ۔ عمر ۶۱ سال۔ ۲۲ کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کے خاندان میں چار پشتوں سے شاعری کا سلسلہ جاری ہے۔ مدتوں غازی آباد اور لکھنؤ میں قیام رہا۔ ایک عرصے سے حیدرآباد دکن میں رہتے ہیں۔

اس قدر شدتِ احساس میں ڈوبا ہوں میں ۔۔۔ آہ کرتا ہے جو دشمن بھی تڑپتا ہوں میں

بھلا برا دیدۂ ہستی میں کہ اچھا ہوں میں ۔۔۔ آج تک خالق ہستی کو گوارا ہوں میں

میکدے میں مرے ساتھی بھی ہمدرد بھی تھے ۔۔۔ جب سے مسجد میں ٹھکانا ہے اکیلا ہوں میں

مجھ سا مظلوم زمانے میں نہ ہوگا کوئی ۔۔۔ کارفرمائے محبت تری تنہا ہوں میں

عرصۂ حشر ہوئی جاتی ہے دنیا یارب ۔۔۔ کوئی اتنا نہیں کہتا کہ شناسا ہوں میں

اللہ اللہ یہ ہے میری برائی کا وقار ۔۔۔ اچھے اچھوں کی نگاہوں میں کھٹکتا ہوں میں

حل کئے میں نے ہزاروں ہی مسائل لیکن ۔۔۔ سر پہ موت آگئی جب زیست کو سمجھا ہوں میں

خود پرستی کا گنہگار سمجھنے والے ۔۔۔ یہ نہ سمجھے کہ گنہگار خود اپنا ہوں میں

ہمت افزا ہو کوئی یہ مرا ماحول نہیں ۔۔۔ آپ ہی اپنے ارادوں کا سہارا ہوں میں

میری بگڑی ہوئی رفتار پہ نظریں ہیں بہت ۔۔۔ ہوش اڑتے ہیں ذرا بھی جو سنبھلتا ہوں میں

یہ نہ بھولے سے بھی سمجھا کوئی قسمت کا دھنی ۔۔۔ اتفاقات کی دنیا کا نمونا ہوں میں

ابھی دیکھے ہے کہاں ولولۂ صبر و سکوں ۔۔۔ کثرت غم نے یہ سمجھا ہے کہ تنہا ہوں میں

زاہد خشک سمجھتے ہیں گنہگار مجھے ۔۔۔ اور گنہگار سمجھتے ہیں فرشتا ہوں میں

مجھ پہ اللہ کے بندوں ہی نے توڑے ہیں ستم ۔۔۔ میں یہ کہتا رہا اللہ کا بندا ہوں میں

یہ بھی اک حادثہ اردو کی محبت کا ہے نجم

کنج عزلت سے جو باہر نکل آیا ہوں میں

جناب حیرت بدایونی

وطن بدایوں۔ عمر تقریباً ۹۲ سال۔ عربی فارسی کے ماہر۔ ۱۵ سال کی عمر سے اردو فارسی میں شعر فرماتے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اپنے والد مولوی محمد حسن سے فن شاعری میں استفادہ کیا جو نواب مرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے

رکھتے ہو خیال اور ہی دیتے ہو بیاں اور ۔۔۔ کیا بات ہے واللہ کہ دل اور زباں اور

ہم بھی تو ہیں مریخ و مہر و مہر سے آگے
مانا کہ ستاروں سے بھی آگے ہیں جہاں اور

ساقی تپشِ شوق کہیں سرد نہ پڑ جائے
ہاں آتشِ سیال کا اک رطل گراں اور

طوفانوں کی یلغار مسلسل سے نہ معلوم
کتنے ورق اُلٹے ابھی تاریخِ جہاں اور

طوفان سے اگر جان چُرائی دل و جاں نے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

اب ہے کفِ محنت میں کلیدِ درِ دولت
کچھ دیر کی ہے کشمکشِ سُود و زیاں اور

ہم ماضیٔ بے روح کا ماتم نہیں کرتے
بلوائیے باہر سے کوئی مرثیہ خواں اور

ہے پیرِ خرابات کا ہونا ہی اگر فرض
ہم خود ہی بنا لیں گے کوئی پیرِ مُغاں اور

ہم پیر ہیں اور پختگیٔ عمر ہیں حیرت
ہو جاتے ہیں انسان کے افکار جواں اور

جناب محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی

عمر تقریباً ۶۵ سال ۔ وطن لکھنؤ ۔ عربی فارسی اور اردو کے عالم ۔ ایک درجن کتابوں کے مصنف ۔ منشی احمد علی شوق قدوائی کے شاگرد ۔ مدرسہ الہیات کانپور، جامعہ عربی کالج اور اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مدراس یونیورسٹی میں اردو فارسی و عربی کے استاد رہ چکے ہیں ۔

مری دیوانگی جا کر اسیروں میں پکار آئی
قفس کو توڑ ڈالو تم تو ہم سمجھیں بہار آئی

یہ اپنی کاوشِ نظر آتے نہیں دام و قفس ہم کو
نشیمن ہی پر آئی اور بجلی بار بار آئی

ابھی رگ رگ سے خونِ گرم کے جاری ہیں فوارے
قفس میں دل اگر سن لے گلستاں میں بہار آئی

امانت کو نہیں پرواہ مگر یہ کیا قیامت ہے
غرض ہے کہ محبت بھی نہ یا رب سازگار آئی

مصوّر کی نظر شاعر کا دل بنتے ہیں بچپن میں
جوانی بن کے قدرت کا انوکھا شاہکار آئی

نہیں کہتا کوئی ہاں پوچھنا پھرتا ہوں محشر میں
بتاؤ تو محبت بھی کسی کو سازگار آئی

ہمیں روکا مگر اس کو نہ روکا ناصحو تم نے
کسی کی یاد آئی اور ظالم بار بار آئی

وہ آئے پھول کچھ آنکھوں سے کچھ دامن سے برسائے
یہ تو تربت میں ہم ہیں اور تربت پر بہار آئی

خطا دل کی نہ آنکھوں کی نظر آئے جو ہو محوی
نگاہوں میں میری رگ رگ سے کھنچ کر جان نذر آئی

بابو شیام موہن لال جگر بریلوی

تاریخِ پیدائش ۱۸۹۰ء ۔ عمر ۶۶ سال ۔ والد کا نام ۔ حضرت دل بریلوی ۱۹۱۰ء سے شعر فرماتے ہیں اور لسان الہند مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کے شاگرد ہیں ۔ سترہ کتابوں کے مصنف و مؤلف ہیں جن میں سے دو کتابیں یادِ رفتگاں اور "پیامِ ساوتری" شائع ہو چکی ہیں ۔ پیامِ ساوتری مثنوی ہے اور اتر پردیش سرکار نے اس کتاب پر پانچ سو روپے انعام دینے کا اعلان کیا ہے ۔

دل اکیلا رہ کے اُجڑ گیا ہمیں میہماں کی تلاش ہے
گل و لالہ کی ہمیں ہے ہوس ہمیں باغباں کی تلاش ہے

کوئی اور ہوں گے جو ڈھونڈتے ہوں کہیں عہدِ رفتہ ہی پیار بھی
ہمیں ہے بہار کی آرزو ہمیں گلستاں کی تلاش ہے

مجھے دیکھئے وہ صنم کدہ یہ جہاں ہے یا کوئی غمکدہ
جو پلٹ دے گردشِ آسماں ہمیں اس جواں کی تلاش ہے

سرِ راہ چھوڑ کے چل دیا نہ پھر اس طرف کبھی رخ کیا
ہمیں خیر جس نے سمجھ لیا اسی کارواں کی تلاش ہے

پر و بال پہلے درست کر تو تپش بھی دل کی مدد کرے
تجھے عندلیبِ شکستہ پر، عبث آشیاں کی تلاش ہے

نہ ہمیں خدا کی ہے جستجو نہ ہمیں نجات کی آرزو
ہیں قتیلِ شیوۂ دلبری ہمیں دلستاں کی تلاش ہے

ہے عجب جگر کا غمِ نہاں ہے عجیب حسن میں ماجرا
کبھی دلستاں سے ہے بے غرض کبھی دلستاں کی تلاش ہے

منشی تلوک چند محروم

وطن عیسیٰ خیل ضلع میانوالی ۔ تاریخِ پیدائش یکم جولائی ۱۸۸۵ء ۔ عمر پونے اڑسٹھ سال ۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۵۵ء تک مختلف درسگاہوں میں ماسٹر ہیڈ ماسٹر اور لیکچرار رہے ۔ آج کل کیمپ کالج دہلی میں لیکچرار ہیں ۔ تصنیفات ۔ کلامِ محروم حصّہ اوّل، حصّہ دوئم، حصہ سوئم ۔ گنجِ معانی، رباعیاتِ محروم اور بہار طفلی وغیرہ

بارہا حیرت کے عالم میں جہاں گم ہو گیا
اس پہ حیرت کیا جو کوئی بے نشاں گم ہو گیا

جذب ہو کر رہ گئیں دل میں ہزاروں حسرتیں
جس طرح دامن میں ہر اشکِ رواں گم ہو گیا

فکرِ جاں کیا کیجئے جب موت سر پر آ گئی
ذکرِ دل سے کیا غرض جب دلستاں گم ہو گیا

کشتیٔ اُمید اپنی دور ساحل سے رہی
جب چلی بادِ موافق بادباں گم ہو گیا

کس بہارِ ناز کے جلوؤں سے ہو کر بدحواس
ڈھونڈتی پھرتی ہے بلبل آشیاں گم ہو گیا

عشق سے سو بار پیمانِ وفا باندھا گیا
نغمۂ فانی بن کے زیبِ داستاں گم ہو گیا

چشمِ حیرت بن گیا ہر مقصدِ زیست کا
طائرِ جاں ہو کے آخر پرفشاں گم ہو گیا

کیا کرے کوئی حیاتِ جاوداں کی آرزو
خضر مانندِ حیاتِ جاوداں گم ہو گیا

بیدلی میں کٹ گئی محروم ساری زندگی
کیا کہیں دل کس طرح کب؟ اور کہاں گم ہو گیا

مولانا ناطق گلاوٹھوی

مرزا داغ دہلوی کے شاگرد۔ تاریخ پیدائش نومبر ۱۸۸۶ء۔ عمر تقریباً ۶۸ سال ۶ ماہ۔ وطن قدیم گلاوٹھی ضلع بلند شہر۔ ۴۰ سال سے ناگپور میں رہتے ہیں۔ ۳۰ سال تک بلدیہ ناگپور کے ممبر رہے۔ مرکزی اسمبلی کے بھی ممبر رہ چکے ہیں۔ عربی اور فارسی کے عالم۔ غیر مطبوعہ تصانیف:۔ دیوان ناطق شرح دیوان غالب، نطق ناطق، شہاب ثاقب اور نظموں کا مجموعہ۔

تو آخر سازِ ہستی کیوں طرب آہنگ محفل تھا — نشانِ آئینِ کیفِ بیدلی یارب اگر دل تھا
تماشا اضطرابِ زندگی تھا مرنے والوں کا — وجودِ بزمِ عالم اک نظامِ رقصِ بسمل تھا
مری وارفتگی وجہ بنائے بزمِ ہستی تھی — مرا رنگِ پریدہ باعثِ نیرنگ محفل تھا
مقامِ ہو سویدائے مجردِ عالمِ حیرت — مری گم گشتگی سے اب یہ نقشہ ہے جہاں دل تھا
نہ سمجھا زیست کو کچھ جس نے رازِ زندگی سمجھا — یہ دیکھا ہے کہ جب انساں کہیں تن آیا تو غافل تھا
کہاں ذوقِ ترقی آسانی میں آسانی میسر تھی — تلاشِ راحتِ منزل میں دل گم کردہ منزل تھا
نہ تھا جس اہلِ معنی ہم اسے کس طرح سمجھاتے — جہاں پہلے ہی بیٹھا تھی وہاں محمل ہی محمل تھا
ہمیں کمبخت احساسِ خودی اس در پہ لے بیٹھا — ہم اٹھ جاتے تو وہ پردہ بھی اٹھ جاتا جو حائل تھا

ہوس پر اعتبارِ نیک و بد دنیا میں تھا ناطق
حق و باطل کے جھگڑوں میں کہیں حق تھا نہ باطل تھا

سید کلب احمد مانی جائسی

وطن:۔ ملک محمد جائسی کا وطن جائس۔ تاریخ پیدائش دسمبر ۱۸۸۸ء
تصنیفات:۔ نقوشِ مانی، نگارستانِ مانی یہ دو دیوان چھپ چکے ہیں۔ ۵۰۰ قصیدوں کا مجموعہ غیر مطبوعہ ہے۔

نہ رہی کاوشِ کشش تیغِ ادا میرے بعد — جذب کھو بیٹھا ہے قاتل کا صلا میرے بعد
کیوں نہ بے رنگ ہو صحرائے بلا میرے بعد — کون کانٹوں پہ چلا برہنہ پا میرے بعد
تا بہ محرابِ خمِ تیغ دسجودے کہ رسد — دل بکف بھی کوئی حاضر نہ ہوا میرے بعد
میری رودادِ وفا سے ہوئی ترتیبِ نصاب — کھل گیا مدرسۂ صبر و رضا میرے بعد
کشتنی ہم تھا سو مقتل میں تہِ تیغ ہوا — اب رہو منتظرِ اہلِ وفا میرے بعد
مکتبِ عشق تھا استادِ ازل تھا میں تھا — درسِ الفت کا زمانے کو ملا میرے بعد
صبح آخر مری کا صبحِ شبِ ہجراں تھی مگر — شمع و پروانہ میں بھی ربط نہ تھا میرے بعد

خلشِ پرسشِ محشر تھی میری بے گنہی — نظر آیا مرے قاتل کو خلا میرے بعد

تو نے مانی دلِ غالب سے یہ غم دور کیا
کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی

نواب مرزا داغ دہلوی کے شاگرد۔ تاریخ پیدائش یکم فروری ۱۸۸۳ء
عمر تقریباً ۷۲ سال۔ ۱۹۰۷ء میں پیشۂ مدرسی اختیار کیا اور نکودر ہائی اسکول میں فارسی کے مدرس اول رہے
اردو اور فارسی کے استاد ہیں

تصنیفات:۔

دستور الفواعد (فارسی صرف و نحو) شرح دیوان غالب، وغیرہ
دو مستقل دیوان بادۂ سرجوش اور جنون و ہوش کے نام سے ہیں۔

ڈر ہے کہ پھر مرا دلِ مضطر حزیں نہ ہو — اس ہاں سے بھی مراد تمہاری نہیں نہ ہو
قائل ہوں اس ادا کا جو ہو بانیٔ خلوص — وہ نازہی نہیں جو نیاز آفریں نہ ہو
کیوں انتظارِ حشر ہو کل کی بات پر — کیوں فیصلہ ہمارا تمہارا یہیں نہ ہو
ظالم نے سنگِ در کو بھی اٹھوا دیا ہے آج — اس وہم میں کہ یہ بھی کسی کی جبیں نہ ہو
کوئی چمن میں کوئی بیاباں میں جا رہا — وہ کیا کرے کہ جس کا ٹھکانا کہیں نہ ہو
رہنا پڑا ہے حیرتِ لب ہی تمام عمر — اتنا بھی کوئی دردِ نہاں کا امیں نہ ہو
نکلے ہیں اپنے گھر سے ہم اس کی تلاش میں — جس پہ نشاں کا نقشِ قدم بھی کہیں نہ ہو
وعدہ تمہارا اور یہ قسمیں بجا سہی — لیکن وہ کیا کرے جسے اب بھی یقیں نہ ہو

اے جوش کہہ رہا ہے کلامِ جنابِ داغ
وہ شاعری نہیں جو حیات آفریں نہ ہو

حضرت نوح ناروی

تاریخ پیدائش ۱۸ ستمبر ۱۸۷۹ء۔

بھوانی پور ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور اردو کے استاد میر نجف علی کی صحبت میں شاعری سے شوق پیدا ہوا۔ شروع میں میر صاحب کو کلام دکھایا۔ حضرت امیر مینائی اور حضرت جلال لکھنوی سے بھی مشورہ لیا۔ آخر نواب مرزا داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں حیدرآباد دکن گئے اور ایک مدت تک استاد داغ کے ساتھ رہے۔
آپ کے تین مبسوط دیوان ہیں۔ سفینۂ نوح، طوفانِ نوح اور اعجازِ نوح

یہ تینوں چھپ چکے ہیں۔ چوتھا دیوان ملفوظاتِ ذوح غیر مطبوعہ ہے۔

دنیا کا یہ طریقہ عقبیٰ کا وہ قرینا — جینے کے بعد مرنا مرنے کے بعد جینا
اے ناخدا توقع اب کیا نہ ڈوبنے کی — دریا میں ہے تلاطم منجدھار میں سفینہ
تھا سوزِ دل کا درماں موقوف آنسوؤں پر — کم ہو گئی تپِ غم نکلا جو کچھ پسینا
میں خوب جانتا ہوں اُن کی کرشمہ سازی — ظاہر میں صاف دل ہیں پہ دل میں کینا
اُف اُف تری ادائیں اُف اُف تری نگاہیں — ان سب نے مل ملا کر مل ابلِ دل کا چھینا
اتنا مجھے بتا دے میرے لئے مجسم — بارہ میں ایک بھی کیا اچھا نہیں مہینا
اُس سنگ دل پہ نازاں دل کا بڑا غضب ہے — ٹکرا گیا یکا یک پتھر سے آبگینا
پھر موسمِ گُل آیا ایسے میں کیوں نہ آئے — مینا کے ساتھ ساغر ساغر کے ساتھ مینا
شامل تھی بحرِ غم میں قسمت کی نارسائی — ساحل کے پاس آکر ڈوبا مرا سفینا
میں اپنی زندگی سے ہاتھ اپنے دھو رہا ہوں — ماتھے پہ آچلا ہے اب موت کا پسینا۔

یہ موت کی تمنا پوری ہو یا الٰہی
کعبے کو دیکھ کر وہ دیکھے کبھی مدینا

حضرتِ دل شاہجہاں پوری۔

تاریخ پیدائش ۱۸۸۵ء۔ عمر تقریباً ۷۰ سال۔ وطن شاہجہاں پور۔ حضرت امیر مینائی لکھنوی کے شاگرد۔

تصانیف۔ نغمۂ دل۔ ترانۂ دل اور مکمل دیوان۔ دو ناول بھی ہیں، دردِ دل اور دل سوز۔

جو عہد کیا وہ توڑ دیا، ہم عظمتِ پیماں بھول گئے
ان دیر و حرم کے جھگڑوں میں ہمدردیٔ انساں بھول گئے
داماں و گریباں چاک کئے پھر سوچ کے خود ہر چاک سیا
کچھ تو ہی بتا اے خودداری کیوں چاک رگِ جاں بھول گئے
اس گلشنِ عالم میں اکثر ایسی بھی بہاریں دیکھی ہیں
رعنائیٔ گل نظروں میں رہی آرائشِ داماں بھول گئے
آنسو سرِ مژگاں جب دیکھے شرمندہ وفائے عشق ہوئی
ہم جور و جفا کے سب شکوے اے چشمِ پشیماں بھول گئے
تسکینِ جنوں ہر کا نشا تھا معراجِ جنوں ہر شو کر سکی
پابندیٔ زنداں میں وحشی جذباتِ بیاباں بھول گئے

کیا جان لیا پہچان لیا کیا دیکھ لیا کیا سوچ لیا
ہم اپنے وطن کا ہر منظر اے گردشِ دوراں بھول گئے
اعجازِ مسیحائی کہئے اس طرزِ قدر اندازی کو
جب نازِ تبسم یاد آیا ہم کاوشِ پنہاں بھول گئے
منظورِ نظر جو کلیاں تھیں وہ توڑ کے رکھ لیں دامن میں
محویتِ رنگ و بُو میں ہم آدابِ گلستاں بھول گئے
رُخ طور کی جانب تھا اپنا مقصودِ طلب تھے دیر و حرم
سمجھے نہ کبھی دل کی وسعت ہم منزلِ جاناں بھول گئے
کیا ذکرِ شبابِ رفتہ کا اب تو یہی سمجھو تم اے دل!
اک خواب پریشاں دیکھا تھا وہ خوابِ پریشاں بھول گئے

پنڈت تربھون ناتھ زار زتشی دہلوی

تاریخ پیدائش اکتوبر ۱۸۷۳ء عمر ۸۲ سال۔ دس سال کی عمر میں مرزا داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ اندرپرستھ گرلز کالج دہلی میں اردو، فارسی کے لیکچرار ہیں۔

نہ بت خانہ نشیمن ہے، نہ کعبہ آشیاں میرا
تعین سے ہے بالاتر طلسمِ ہفت خواں میرا
صدا ناقوس کی ہے دیر میں، شورِ فغاں میرا
حرم کا نعرۂ تکبیر، غوغائے اذاں میرا
جہاں جلتے ہیں، پرِ جبریل کے تابِ تجلی سے
اسی نوری فضا میں ہے، قیامِ جاوداں میرا!
جہاں مجذوب و سالک بار پانے سے ترستے ہیں
ٹھکانا ہوشِ مدہوشی میں ہوتا ہے وہاں میرا
فنا فی العشق ہو کر تجھ سے ہوں شیر و شکر ایسا
کہ مجھ پر شک ترا ہوتا ہے اور تجھ پر گماں میرا
جو ہو لیں جی سے میرے یا بنا لیں مجھ کو خود اپنا
انھیں مر مٹنے والوں پر ہے لطفِ بیکراں میرا
ہوئے جب زار جلوے عالمِ رویا میں باطل کے
ہوا خوابِ پریشاں این چنیں ہو آں چنیں میرا

جدید بنگالی ادب

قرونِ وسطیٰ کا آخری ادیب اور "منگل کاویہ" کا مصنف بھرت چندر جدید ادب کا پیش رو تھا جس نے آسمانی دنیا سے اتر کر انسانی حیات اور جذبات کے موتی بکھیرنے شروع کئے۔ اس سے پہلے ادیب عام طور پر عالمِ بالا کے خیالات میں ہی غوطے لگاتے اور گوہر افشانی کرتے تھے۔ اگرچہ بھرت چندر مذہبی مت میں اعتقاد رکھتے تھے۔ لیکن "ودیا" اور "سندر" کے افسانۂ عشق میں مادی اور نفسانی خیالات غالب ہیں۔ بھرت چندر ہی کیا اٹھارہویں صدی کے ادیبوں کا رجحان ہی رومان کی طرف تھا اور وہ لسانی خوبیوں اور لطافت میں ہی مست نظر آتے تھے۔ "کابی والاس" پر بھرت چندر کا نمایاں اور صریح اثر تھا، جنھوں نے برائے نام رادھا کرشن کے عشق پر نظمیں کہیں لیکن فی الحقیقت وہ سادہ اور پاک عشق کی داستانیں تھیں۔ بھرت چندر کی زندگی میں ہی جنگِ پلاسی کے بعد ملک کے سیاسی، اقتصادی، اور سماجی نظام کا نقشہ بدل گیا، اور ایسٹ انڈیا کمپنی پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ملک کا نظم ونسق چلانے کے لئے انھیں اپنے افسروں کو مقامی زبانوں اور قوانین میں تربیت دینا پڑے گی۔ چنانچہ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قایم کیا گیا، اور اس کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر گلکرائسٹ مقرر ہوئے۔ آپ ہندی کے عالم تھے اور آپ نے ایک جہاز میں سرجن کے عہدے سے استعفیٰ دے کر کالج کے قیام کے لئے راستہ صاف کیا تھا۔ اس کالج میں ہندوستان کی مختلف زبانوں مثلاً بنگالی، ہندی، ہندوستانی، پنجابی، اڑیہ وغیرہ کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ انگریزی کے عالموں نے ہندوستانی پنڈتوں اور منشیوں کی مدد سے کتب تیار کیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مشہور و معروف زبان داں ڈاکٹر کاری بائبل کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنے کے لئے ہندوستان تشریف لائے۔ آپ بنگالی زبان کی گرامر ڈکشنری اور کئی ایک دیگر کتابوں کے مصنف ہیں۔

اس اثنا میں فلسفیانہ مضامین پر مختلف رسالوں کے ذریعے رام موہن رائے میدانِ ادب میں اتر پڑے، اور آپ درحقیقت جدید ہندوستان کے معمار کہلانے کے مستحق ہیں۔ آپ توہمات اور قدیم رسم و رواج سے بالاتر ہو کر سچائی اور عالمگیر مذہب کا پرچار کرنے لگے۔ اور فلسفیانہ تحقیقات کے نتائج پر انھوں نے نثر میں اظہارِ خیالات شروع کیا۔ آپ نے ہی انگریز مشنریوں سے بحث مباحثے کا سلسلہ جاری کیا، اور اس مہم کو کامیابی سے چلانے کے لئے مختلف رسالوں کی اشاعت شروع کی۔

صحافت کا سلسلہ انیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوا لیکن صحافیوں کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ ان کے پرچار سے کہیں نظم و نسق میں خلل واقع نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ مشنری صحافیوں نے سیرام پور میں ڈیرہ جمایا جو اس وقت تک ڈنمارک کے زیرِ تحفظ تھا۔ یہاں سے انھوں نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد "ڈگ درشن" اور "سماچار درپن" نامی رسالے اور اخبار جاری کئے۔ اس کے بعد بنگالی صحافت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

اس کے بعد ایشور گپتا کا زمانہ آیا، جو اپنی مزاحیہ تحریروں اور لسانی کرتبوں کی بدولت عوام پر چھا گئے، اور بنگال میں ادبی انجمنوں کے قیام کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ آپ انگریزی نظموں کا ترجمہ بنگالی میں اسی طرز پر کرنا پسند کرتے، اور اس کی حوصلہ افزائی کے لئے انھیں نہ صرف اپنے اخبار میں شائع کرتے ہیں بلکہ انعامات بھی تقسیم کرتے۔ اس کے کچھ عرصے بعد مہارشی دیویندر ناتھ ٹیگور نے تتوابودھنی سبھا قائم کی اور تتوابودھنی پتریکا کے نام سے اخبار بھی جاری کیا۔ اس اخبار سے اکشے کمار اور ایشور چندر ودیا ساگر ایسے عالم وابستہ تھے جن کی تحریروں سے نثر کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اکشے کمار یورپی سائنس اور عقلیت کو ہندوستانی لباس پہنانے میں مصروف تھے اور ودیا ساگر مختلف کتابوں

کے ترجمے کے ذریعے بنگالی زبان کو نئی زینت بخشتے رہے۔ آپ نے ہندی سے "تیل پنچ وناستی"، شیکسپیر سے "بھرانتی بلاش" اور سنسکرت سے "شکنتلا" اور "ستار نیاس" کا بنگالی میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ ان کا بہت سا وقت سماجی اصلاح اور تعلیم لے لیتی تھی۔ لیکن باوجود اتنی معروفیت کے انھوں نے اپنی سوانح عمری لکھنے کی کوشش کی جس سے ان کی تخلیقی قوت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یورپی طرز کی تقلید

مختصر کتب اور کتابچوں کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کے سلسلے میں ورنیکولر لٹریچر سوسائٹی نے قابل قدر کام کیا لیکن تخلیقی اسپرٹ حقیقی طور پر مائیکل مدھو سودھن دت کی تصانیف میں ملتی ہے جنھوں نے بنگالی میں بے قافیہ نظم کہنی شروع کی۔ انھوں نے میگھ ناتھ کی موت پر یورپی طرز پر ایک رزمیہ نظم لکھی جو عوام میں بے حد مقبول ہوئی۔ نیز رسمی قواعد وضوابط سے بلند ہو کر انھوں نے ڈرامے بھی لکھے۔ آپ پہلے بنگالی تھے جنھوں نے بنگالی زبان میں "سانیٹ" طرز کی نظم کہنی شروع کی۔ ان کی تصانیف عجیب وغریب اور نہایت بلند پایہ ہیں۔ ان میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ درقدرتی طور پر ان میں راجپوتوں کی شجاعت، بہادری، حب الوطنی اور شہادت کے قصے کہانیاں درج ہیں۔ آپ نے رام نرائن ایسے ہیئتی رؤوں کے خلاف سرکشی بھی اختیار کی اور ان کے ایک ہم عصر دینا بندھو نے نیل کے باغات کے مالکوں کے خلاف ایک مہم کا آغاز کیا لیکن اسٹیج کے لئے مدھو سودھن کی طرز تحریر ہی اختیار کی گئی۔ مدھو سودھن کی موت کے بعد نئے ڈراموں کے فقدان کی وجہ سے تھیٹر والوں کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا لیکن گریش چندر گھوش نے اس خلا کو پر کردیا۔ قدرتی طور پر ان کے ڈرامے کئی قسم کے ہیں اور اس دریا کو کوزے میں بند کرنا دشوار ہے لیکن پرانے "جاتروں" اور نئے ڈراموں میں جو نمایاں فرق پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں گیت کم ہیں لیکن اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ارکسٹرا، سینری اور اسٹیج کی نمائش پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ دوجندر لال رائے کے تاریخی ڈراموں میں حب الوطنی کے جذبات کو اہم مقام حاصل ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ بنکم چندر چٹرجی میدان میں آرہے تھے۔ آپ اپنے ناول "درگیش نندنی" کے ذریعے ادبی دنیا میں ایک نئی روح پھونکنے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے تاریخی اور سماجی سالات پر ناول لکھنے کے علاوہ فلسفے پر بھی خامہ فرسائی کی ہے جن میں "انند مٹھ"، "دیوی چودھرانی" اور "سیتارام" قابل ذکر ہیں۔ سماجی اور سیاسی ریفارمروں کا تمسخر اڑاتے وقت وہ بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ فی الحقیقت وہ خود ریفارمر تھے، لیکن ایک انقلابی نوعیت کے۔ وہ بے غرض خدمات کو بلند درجہ دیتے جس کے دوسرے مصنف بھی تقلید کرنے لگے۔ اس طرح وہ عوام کے دلوں پر چھاگئے۔ آپ ہندی کلچر کے گرویدہ تھے۔ چنانچہ آپ نے خیالات کی اشاعت کے لئے "انوشیلانہ" نامی کتاب تصنیف کی جس میں سری کرشن کو کلچر کے مجسمے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

رابندرناتھ ٹیگور

رابندرناتھ ٹیگور بنگالی ادب کے سرتاج تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آپ نے نہایت ہی دلکش پیرائے میں کئی قصے کہانیاں لکھی ہیں جن میں آنسوؤں اور قہقہوں نیز سوز وگداز مزاحیہ عناصر کی ملی جلی تصویر پیش کی گئی ہے۔ نثر میں ان کا طرز تحریر بے مثال ہے۔ اگرچہ اوائل عمر میں آپ بہاری لال کے زیر اثر تھے، لیکن آپ نے اپنی غیر معمولی ذہانت کی بدولت ایک انوکھے طرز تحریر کی بنیاد رکھی۔ "کمل کنتر دفتر" کی تقلید کرتے ہوئے آپ نے صرف ظاہری صورت ہی قبول کی۔ آپ کے ناولوں میں انسانی خیالات وجذبات کو ترجیح دی گئی ہے۔ آپ نے نظم بھی نثر کی طرز پر کہنی شروع کی۔ آپ نثر کے استاد مانے جاتے ہیں۔ آپ ذہین اور محنتی تھے، اور حب الوطنی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ادبی دنیا میں آپ کی شخصیت اور عظمت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔

سرت چندر چٹرجی پسماندہ لوگوں کے وقار کو بلند کرنے میں بہت ممد ومعاون ثابت ہوئے۔ انھوں نے اپنے وقت کی سماجی قدروں پر نکتہ چینی کرکے رہنماؤں کو بنیادی سماجی مسائل پر غور وخوض کرنے کے لئے مجبور کردیا۔ ان کے علاوہ کئی ایک اور مصنفوں نے بھی بنگالی ادب کی زینت کو دوبالا کرنے کی کوشش کی۔ "پاتھر پنچالی" کے مصنف بی بھوتی بھوشن نے اپنی کہانی کی بدولت ادبی دنیا میں دائمی مقام حاصل کرلیا ہے۔ آج کل بھی دوسری ہندوستانی زبانوں کی طرح بنگالی زبان روبہ ترقی ہے اور قابل اشخاص کی کوئی کمی نہیں۔ آج بھی کئی ایک مصنف ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ اب جب کہ سیاسی آزادی ایک حقیقت بن چکی ہے بنگالی ادب کے مستقبل پر ہمیں زیادہ اعتماد کرنا چاہئے۔ توقع کرنی چاہیئے کہ بنگالی ادب دوسرے ادب کے ساتھ مل کر قومی ترقی میں برابر کا شریک ہوگا، اور یہی طریقہ صحت مند صحیح اور درست ہے۔

(آل انڈیا ریڈیو کے شکریہ کے ساتھ)

گُل کدہ

(ہندوستانی زبانوں کا ادب)

خریداری

مراٹھی

ا۔ وا۔ ورٹی
ترجمہ جوہر چاندوڑی

"او، ہو، ہو، ہو! آیئے ڈاکٹر صاحب اور محترمہ ڈاکٹرنی صاحبہ" بابو بھائی نے کہا۔

اگر بذاتِ خود اُمُھو با اور رگوما بائی میاں بیوی، "تکارام تاجر" کے گھر تشریف لاتے تو اُنھیں جتنی مسرت ہوتی، اتنی ہی مجھے اور میری بیوی شکنتلا دیوی کو اپنی دکان کے زینے پر چڑھتے ہوئے دیکھ کر بابو بھائی کو ہوئی، یہ اُن کے شگفتہ چہرے سے روشن ہو رہا تھا۔

"آیئے، آیئے، کہئے حضور کیا حکم ہے!" سامنا ہوتے ہی بابو بھائی نے ہم سے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

ان کی صد درجہ آؤ بھگت سے میں ذرا پشیمان سا ہو گیا۔ کیوں کہ میں بالکل معمولی سودا خرید کرنے والا تھا۔ ہماری خریداری کے مقابلے میں ہمارا استقبال بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ مگر میں نے اُن کی آؤ بھگت اور خوشامدانہ باتوں پر ذرا توجہ نہ کی۔ یہ تعجب کی بات نہیں۔ عام طور پر ہر چھوٹے بڑے دکاندار کا تاجرانہ دستور یہی ہے کہ ہر گاہک کی آمد پر خوش آمدید کہتا ہے اور اُن کی شایانِ شایاں آؤ بھگت کرتا ہے۔

مجھے صرف تین رومال خریدنا تھے۔ آج میری جیب میں ایک رومال بھی نہ تھا۔ اگر زکام کی شکایت ہو اور رومال پاس نہ ہو تو بُری گت ہوتی ہے۔ اس کا کم و بیش سبھی کو تجربہ ہے۔ مجھے جب بھی زکام ہوتا ہے تین رومال خریدنا لازمی ہو جاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دوسرے زکام تک تینوں رومال میں سے ایک بھی میرے پاس نہیں رہتا۔ عام طور پر مجھے ہر موسم کے ابتدائی دنوں میں زکام کی شکایت ہو جاتی تھی۔ اس لئے سال بھر میں تین بار تین تین رومال خریدنے کی ضرورت نوبت آتی تھی۔

لیکن اب تک جب بھی زکام ہوا، رومال خریدنے کے لئے باہر نکلا تو مرچنٹ کی دکان پر اکیلا ہی جاتا تھا اور پاؤ پاؤ درجن رومال خرید کر لاتا رہا۔ آج بھی اکیلا ہی جانے کے ارادے سے گھر سے باہر قدم رکھا تھا کہ شکنتلا نے پوچھا۔

"کہاں جانا ہے؟"

"بابو بھائی بزاز کی دکان پر پاؤ درجن رومال خریدنے کے لئے جانے کا ارادہ ہے۔"

"ٹھہریئے، میں بھی آتی ہوں،" شکنتلا نے کہا۔

"تم نہ آؤ، صرف پاؤ درجن رومال ہی تو خریدنا ہیں، تمھارے آنے کی کیا ضرورت ہے!"

"شکنتلا ساتھ آئے گی تو فضول گھنٹہ دو گھنٹے لگیں گے،" یہ سوچ کر اسی وقت میں نے انکاری جواب دے دیا۔

"پاؤ درجن رومال خریدنے میں تو کیا ہرج ہے؟" ہاتھ منہ دھونے کے ارادے سے تولیہ کندھے پر ڈالتے ہوئے شکنتلا نے کہا۔

"آپ اکیلے بازار جا کر بالکل معمولی درجے کے رومال خرید لاتے ہیں۔ اُن کا نہ رنگ اچھا ہوتا ہے نہ ڈیزائن دل فریب، بابو بھائی آپ سے دام بھی زیادہ لیتے ہیں۔"

اب شکنتلا کے آنے نہ آنے کے سوال کا فیصلہ ہی ہو گیا۔ پھر شکنتلا دلربایانہ قدم اٹھاتی ہوئی غسل خانے میں چلی گئی۔ شکنتلا کی بات معقول تھی۔ میں کبھی کسی چیز کی خرید کے وقت بھاؤ تاؤ نہیں کرتا۔ دکان دار جو بل پیش کرتا ہے رقم ادا کر دیتا ہوں۔ آج تک جو سودا سلف لایا تھا شکنتلا نے قیمت کے لحاظ سے پسند نہ کیا۔ اسی خیال کو پیشِ نظر رکھ کر میں نے کہا۔

نہ ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے کہا۔

"ہم رومال خریدنے آئے ہیں نا؟"

"اس سے تو ذرا ہلکا رنگ ہی خوب زیب دیتا ہے" شکنتلا نے کہا، مگر یہ جواب دیتے وقت وہ بابو بھائی سے مخاطب تھی، مجھ سے نہیں۔

میں اسی طرح چپ سادھے کھڑا رہا۔ رام داس ایک ایک ساڑی کاؤنٹر پر ڈال رہا تھا اور بابو بھائی ہر ساڑی کی خوبیاں بیان کئے جا رہے تھے۔ شکنتلا ہر ساڑی کی بُرائیاں بیان کئے جا رہی تھی۔ ناگپوری، اِنگلی پونچی، نیلگوں، ہلکی آسمانی، بناوٹ، رنگ، ڈیزائن، زریں کنارے اور دامن، کریم کلر، کھمبایتی وغیرہ وغیرہ۔ الغرض مجھے کئی قسم کے رنگوں، کئی شہروں اور میلوں کے نام یکے بعد دیگرے سنائی دے رہے تھے، اور کاؤنٹر پر ساڑیوں کا انبار لگ گیا تھا۔ میں نے شکنتلا کی طرف دیکھا۔ وہ سودا کرنے میں کھوئی ہوئی تھی۔ اردگرد کی دنیا کی اسے مطلق خبر نہ تھی۔ وہ ایک سکون بخش بلند پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی تھی —— میں اپنے رومالوں کی یاد دلا کر اس کی لطف آمیز باتوں میں رکاوٹ پیدا کر کے اپنی حماقت کا ثبوت دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے چپ کھڑا رہا۔ قریباً ہم دونوں دو گھنٹے کے بعد پلٹ کر آئے۔ ایک بنارسی شال، ایک کھمبایتی اور کوئمبتوری ساڑی اور ایک جارجٹ کا کپڑا جمپر کے لئے۔ اس کے علاوہ گجا نا میل کی دو ساڑیاں۔ اتنے کپڑوں کی گٹھڑی قلی نے لا کر میز پر رکھی۔ ہم دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

آج ہی یہ بنارسی شال خریدی ہے۔ بہت خوب ہوا۔ ورنہ کل تحصیلدار صاحبہ خرید لیتیں۔ مگر وہ موٹی تازی بھاری بدن کی عورت ہے۔ اس کو زیب ہی نہ دیتی۔ کیوں کہ جارجٹ کی یہ ساڑی تو قریباً آدھی قیمت ہی میں ملی ہے۔

شکنتلا نے جب دکان سے باہر قدم رکھ کر گھر آنے تک، اور گھر میں بھی اپنی خریداری کی خوبیاں بیان کئے جا رہی تھی۔ میں پسینے میں بہہ رہا تھا، سخت دھوپ تھی۔ بابو بھائی کے بل کے ہندسے کی گرمی نے تو میرے ہوش ہی اُڑا دیئے۔ مگر اپنے بدن اور چہرے کا پسینہ صاف کرنے کے لئے رومال کہاں تھا؟ رومال کے لئے جیب کی طرف ہاتھ بڑھتے ہی پایا تھا کہ زکام کی وجہ سے ایک چھینک آئی اور میں نے گھبرا کر گٹھڑی کھول کر ایک بنارسی ساڑی کے دامن سے اپنی ناک صاف کی۔

"ایں، یہ کیا گندگی؟" شکنتلا نے کہا: "قیمتی ساڑی سے کہیں ناک صاف کی جاتی ہے"؟

"ہاں" میں نے کہا "میں سمجھا کہ یہ رومال ہی ہے! کیوں کہ ہم دونوں رومال خریدنے کے لئے ہی بابو بھائی کی دکان پر گئے تھے"۔

"ارے ہاں" اپنے دیدے پھاڑ کر شکنتلا نے حیرت سے کہا۔

"کیا آپ نے رومال نہیں خریدے؟ واقعی آپ بھی بہت بے خیال آدمی ہیں۔ آپ کو ذرا بھی اس کا علم نہیں۔ دکان پر جا کر کپڑا کیسے خریدا جا سکتا ہے۔ بہت ہی اچھا ہوا کہ مجھ جیسی چالاک بیوی آپ کو ملی۔ ورنہ سنسار ہی سنسار —— ؟"

اور بھی ہیں

ہندی

بال کرشن راؤ: —

ایک تیری ہی جبیں سنسان راہیں اور بھی ہیں
کل صبح کی انتظاری میں نگاہیں اور بھی ہیں
اور بھی ہیں اوٹ جن پر وید نا مسکان بنتی
نیند تیری ہی نہیں جو سپن کی پہچان بنتی
پُوجتا پتھر اکیلے ایک تجھ کو ہی نہ پڑتا
"واہ" بننے کے لئے مجبور آہیں اور بھی ہیں
ایک ننھا گھونسلا اُڑتا نہ آندھی میں اکیلا
گر پڑی بجلی اگر تو ایک ٹہنی نے نہ جھیلا
سوچ تو کیا باڑھ آتی ہے اکیلے کو ڈُبانے؟
ایک تنکا کھوجتی اُٹھائے باہیں اور بھی ہیں
تو اکیلا ہی نہیں ہے جو اکیلا چل رہا ہے
راستے پر اور بھی ہیں پاؤں جن کا جل رہا ہے
کیوں انھیں ہی مانتا ساتھی نظر کے سامنے جو!
ایک ہی آگے رہے گی پرشنشائیں اور بھی ہیں

---

[1] بغیر سہارے کے   [2] اطراف

ڈال ڈال کے پات

گرامی ——— عبدالمجید سالک

مولانا گرامی جالندھر کے رہنے والے تھے۔ ککے زئی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ انھیں مبدء فیاض سے فارسی شاعری میں وہ کمال حاصل ہوا کہ عرفی و نظیری کی یاد تازہ ہو گئی۔ میر محبوب علی خاں نظام دکن کی نظر انتخاب نے ان کو اپنے دربار کے لئے منتخب کر لیا۔ چنانچہ آپ شاعر دربار اور استادِ نظام کی حیثیت سے حیدرآباد دکن چلے گئے۔ پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ حیدرآبادی شیروانی اور آڑا پاجامہ پہنتے سر پر بڑی سی رنگین دستار باندھتے۔ بھری بھری داڑھی۔ موٹے موٹے خدوخال چمکتی آنکھیں۔ بے حد ہنس مکھ اور شگفتہ مزاج۔ ڈاکٹر اقبال سے خصوصی دوستانہ تعلقات تھے۔ کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب اپنے فارسی کلام میں ان سے مشورہ بھی لیا کرتے تھے' اور ایک دن ڈاکٹر صاحب نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں گرامی کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا تھا کہ اگر عرفی و نظیری کے بعد فارسی زبان کا کوئی شاعر ہے تو وہ گرامی ہے۔ آج گرامی کو سن لو۔ کل فخر کرو گے کہ تم نے گرامی کو سنا ہے —— اور مولانا گرامی کے دل میں بھی ڈاکٹر صاحب کی قدر و قیمت کم نہ تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبریے کرد و پیمبر نتواں گفت

گرامی کی طبیعت میں ایک خصوصیت ایسی تھی جو میں نے عمر بھر کسی شخص میں نہیں پائی۔ یعنی شعر میں ایسا انہماک تھا۔ کہ باقی تمام امور سے انقطاع کلی ہو گیا تھا۔ اگر جالندھر سے چل کر لاہور پہنچنا ہے تو کوئی ٹرین میں بٹھا دے۔ اور کوئی لاہور پہنچ کر اتارے ورنہ انھیں بالکل احساس نہ ہوگا کہ کہاں اترنا ہے۔ وہ شعروں میں مستغرق پشاور پہنچ جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کہا کرتے تھے کہ گرامی شعر میں تلمیذ روح الامین ہے۔ اور باقی تمام معاملات میں چغد ہے۔ جب کبھی حیدرآباد سے رخصت لے کر آتے تو ڈاکٹر صاحب علی بخش کو جالندھر بھیج دیتے۔ کہ جا کر مولانا گرامی کو لاہور لے آئے۔ علی بخش کسی نہ کسی طرح انھیں لے آتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ علی بخش گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب کی طرف سے سلام و پیام دے کر کہنے لگا مولانا آپ کل صبح میرے ساتھ چلئے کہنے لگے ہاں ہاں ضرور چلیں گے۔ کیوں نہ چلیں گے۔ ڈاکتر (ڈاکٹر کی ٹ کو ہمیشہ ت میں بدل دیا کرتے تھے) ہمارا دوست ہے اپنے دوست کے ہاں کیوں نہ چلیں گے۔ دوسرا دن آیا صبح ہی بستر بندھوایا جانے کی تیاریاں ہونے لگیں پھر خدا جانے جی میں کیا آیا' بستر کھلوا دیا' ارادہ ملتوی کر دیا۔ اب علی بخش جز بز ہو رہا ہے۔ اس کو سمجھا رہے ہیں۔ کل چلیں گے تم فکر نہ کرو۔ تیسرا دن آیا بستر پھر بندھ گیا۔ تانگہ منگا لیا گیا' تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اندر گئے باہر آئے۔ اندر گئے بیگم سے باتیں کیں۔ کچھ ضروری چیزیں لے کر ٹرنک میں ٹھونس دیں۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد باہر نکلے۔ گرمی کا موسم تھا۔ تانگے کی نشست تپ گئی تھی۔ علی بخش اگلی نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ مولانا پچھلی نشست پر بیٹھے ہی تھے۔ کہ بے چین ہو کر اٹھے۔ ارے تانگہ بہت گرم ہے' یہ کہا اور نیچے اتر گئے۔ علی بخش سے بولے تم چلے جاؤ ڈاکتر سے کہہ دینا۔ تانگہ گرم ہو گیا تھا اب سردیوں میں آئیں گے۔

غرض مولانا کو جالندھر سے لانا بھی ایک شدید مرحلہ تھا۔ جسے علی بخش ہی طے کر سکتا تھا۔ دوسرے کے بس کا روگ نہ تھا۔ جب ایک دفعہ مولانا ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ تو پھر یہاں سے ہلنے کا نام نہیں لیتے ڈیڑھ ڈیڑھ مہینہ پڑے رہتے۔ ساری رخصت یہیں بسر ہو گئی۔ بیگم گرامی (اقبال بیگم ترک تخلص اردو کی شاعرہ تھیں) پیغام پر پیغام بھیج رہی ہیں۔ لیکن یہاں کچھ اثر ہی نہیں۔

ایک دن جالندھر کے دو تین آدمی ڈاکٹر کے مکان پر مولانا سے ملنے آ گئے۔ بیگم نے ان کو سمجھا کے بھیجا تھا۔ کہ بلطائف الحیل مولانا کو وہاں سے جالندھر واپس آنے پر آمادہ کرنا۔ مولانا نے ان سے پوچھا۔ کیوں بھائی ہمارے گھر میں تو خیریت ہے؟ انھوں نے سوکھا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ حضرت خیریت

تو ہے مگر بیگم صاحبہ کو اسہال ہو رہے ہیں۔ یہ سُن کر مولانا سخت مضطرب ہوئے ان کا خیال تھا۔ کہ جس شخص کو اسہال ہونے لگیں۔ وہ مشکل ہی سے بچتا ہے وہ آدمی چلے گئے لیکن مولانا کو رٹ سی لگ گئی بیگم کو اسہال آ رہے ہیں میں بھی عجیب آدمی ہوں یہاں آکر بیٹھ رہا کہیں کوئی نیکی باری ہو گئی تو کیا کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب عدالت سے واپس آئے تو ان کے سر پر سوار ہو گئے۔ میں فوراً جالندھر جاؤں گا۔ اقبال بیگم کو اسہال ہو رہے ہیں۔ جلدی سے انتظام کرو۔ اب میں ہرگز نہیں ٹھہر سکتا۔ ڈاکٹر صاحب کو مولانا کی کمزوری معلوم تھی انھوں نے نہایت سکون سے سُوٹ اتار کپڑے تبدیل کئے اور اس دوران میں ایک رباعی کے تین مصرعے کہہ لئے۔ تھوڑی دیر بعد کہا مولانا! خدا فضل کرے لیکن اسہال کوئی خطرناک مرض نہیں ہے۔ یوں آپ جس وقت چاہیں گے میں آپ کو جالندھر بھجوا دوں گا۔ لیکن ایک رباعی ذہن میں اڑ گئی ہے۔ تین مصرعے ہو سکے ہیں چوتھا نہیں ہوتا۔ اور آپ جانتے ہیں چوتھا مصرع جان رباعی کہلاتا ہے اس کے بعد وہ تینوں مصرعے سنا دیئے اور کہا کہ ذرا فکر کیجیے شاید چوتھا مصرع ہو جائے۔

اب مولانا اس چوتھے مصرعے کی فکر میں مستغرق ہو گئے۔ اور بیگم کا خیال دھواں بن کر اُڑ گیا۔ بیٹھے ہوئے گنگنا رہے ہیں۔ کھڑے ہوئے گنگنا رہے ہیں۔ حُقہ پی رہے ہیں اور گنگنا رہے ہیں۔ ایک آدھ مصرع کہہ کر ڈاکٹر صاحب کو سُنایا جو ڈاکٹر صاحب کو پسند نہ آیا۔ پھر دوبارہ فکر ہوئی لیکن کوئی مصرع ٹھیک نہ بیٹھا۔ ڈاکٹر صاحب اوپر کے کمرے میں جا کر سو گئے۔ اب مولانا اس مصرعے کی بھول بھلیاں میں چکر کاٹ رہے ہیں رات کے تین بجے نہایت چست و برجستہ مصرع ہو گیا۔ مولانا نے علی بخش کو جگا کر کہا۔ علی بخش جاؤ۔ ڈاکٹر کو بلا لاؤ اس نے کہا۔ حضرت کوئی تکلیف یا ضرورت ہو تو مجھے حکم دیجیے۔ ڈانٹ کر کہا۔ نہیں تجھ سے کام نہیں۔ ڈاکٹر سے کام ہے۔ وہ بے چارا اُوپر گیا' دروازہ کھٹکھٹایا۔ ڈاکٹر صاحب جاگ اٹھے۔ علی بخش نے کہا۔ مولوی صاحب آپ کو بُلا رہے ہیں۔ پوچھا خیر تو ہے بیمار تو نہیں ہو گئے، عرض کیا بظاہر تو بھلے چنگے ہیں۔ خیر ڈاکٹر صاحب سردی میں دُھسہ اوڑھ کر نیچے اُترے۔ حضرت خیر تو ہے؟ مولانا نے فرمایا جی سنو مصرع ہو گیا' ڈاکٹر صاحب نے مصرع سُن کر داد دی اور اجازت لی۔ ابھی کہاں جاتے ہو اب تو صبح ہونے والی ہے۔ اس کے ساتھ ہی علی بخش سے کہا میاں اس وقت تو چائے کو جی چاہتا ہے۔ علی بخش نے جھٹ سٹوو جلایا چائے پکائی۔ جب چائے تیار ہو گئی تو مولانا کیا فرماتے ہیں آہا اس وقت اگر سنگترے ہوتے تو مزا آ جاتا۔ ڈاکٹر صاحب نے علی بخش سے کہا۔ جاؤ لوہاری دروازے کے کسی دوکاندار کو جگا کر سنگترے لے آؤ۔ بے چارہ علی بخش سوں سوں کرتا ہوا لوہاری دروازے گیا۔ دوکاندار کو جگا کر سنگترے لایا۔ مولانا نے بڑے مزے لے لے کر کھائے چائے پی اور پھر ڈاکٹر صاحب سے کہنے لگے اب تم جاؤ اور سو رہو۔ حالانکہ اس وقت سورج نکل رہا تھا۔

ایک دن کھانے پر بیٹھے۔ تو کہا۔ علی بخش آج کل گوبھی نہیں ملتی؟ عرض کیا۔ حضرت بہت ملتی ہے۔ حکم دیا کہ شام کو گوبھی ضرور پکوانا شام کے وقت جب گوبھی پک کر سامنے آئی تو پوچھنے لگے یہ کیا ہے؟ کہا گیا گوبھی بگڑ کر کہنے لگے۔ صبح گوبھی' شام گوبھی' دن گوبھی' رات گوبھی۔ بڈھے آدمی کو بادی سے مار ڈالو گے کیا؟ علی بخش نے کہا۔ آپ ہی نے حکم دیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا' تم چپ رہو۔ صبح گوبھی کی فرمائش کرنے کے بعد مولوی صاحب اب تک اپنے تصور میں خدا جانے کتنی دفعہ گوبھی کھا چکے ہیں۔ تم بھی سچے ہو اور یہ بھی سچے ہیں۔

مولانا گرامی کی ذات دلچسپیوں کی پوٹ تھی۔ بعض اوقات سردیوں کے موسم میں رات کے وقت انھیں محسوس ہوتا کہ سر کے نیچے تکیہ کافی اونچا نہیں ہے نیچے سے توشک نکال کر لپیٹتے۔ اور سرہانے رکھ لیتے۔ پھر بھی طبیعت مطمئن نہ ہوتی تو لحاف کو گاؤ تکیہ بنا کر رکھ لیتے۔ اور پھر صبح کے وقت شکایت کرتے کہ ساری رات جاڑے میں مر گیا۔ تم لوگ کافی بستر کیوں نہیں دیتے۔ علی بخش کہتا' مولوی صاحب بستر تو دیا تھا۔ لیکن آپ نے کوہ ہمالیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا اس پر اسے بُرا بھلا کہنے لگتے۔

ایک دفعہ میں نے نواب سراج الدین احمد سائل دہلوی کے متعلق کہ ان کے لنگوٹیے یار تھے' دریافت کیا کہ ان کی شاعری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جواب دیا خامی میں پختہ ہو گیا ہے' میاں''۔ میں اس جامع و مانع رائے کو سُن کر پھڑک گیا۔ مولانا کا ایک نوکر تھا۔ غلام محمد بہت نمازی اور پرہیزگار مکان کے پاس ہی مسجد تھی غلام محمد نماز مسجد میں جا کر پڑھتا تھا۔ ایک دفعہ مولانا نے آواز دی۔ غلام محمد کسی نے بتایا کہ ظہر کی نماز پڑھنے گیا ہے۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ پھر آواز دی۔ غلام محمد! پھر کسی نے بتایا کہ عصر کی نماز پڑھنے گیا

ہے۔ بہت بگڑے کہنے لگے "جب دیکھو نماز پڑھنے گیا ہے۔ جب پوچھو نماز پڑھنے گیا ہے۔ نابکار قرب مسجد کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے یہ ناجائز فائدہ بھی خوب رہا۔

مولانا کا نکاح ثانی۔

مولانا گرامی کے ہاں عمر بھر اولاد نہیں ہوئی۔ ایک دفعہ بعض عزیزوں نے کہا کہ آپ کی اس بیگم سے اولاد نہ ہوگی۔ آپ دوسرا نکاح کیجئے پہلے تو انکار کرتے رہے۔ آخر راضی ہوگئے اور ایک عورت سے نکاح کر دیا لیکن ابھی رخصتی عمل میں نہ آئی تھی۔ اقبال بیگم کو بے حد صدمہ ہوا۔ وہ لاہور آکر ڈاکٹر صاحب سے ملیں۔ اور کہا آپ اپنے دوست کو سمجھائیے۔ اس بڈھوتی کے زمانے میں اسے نکاح کی کیا سوجھی۔ بیگم بے چاری بہت روتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے علی بخش کو بھیج کر مولانا کو بلوایا۔ دریافت حال کیا اور کہا کہ آپ نے بُرا کیا۔ اگر اقبال بیگم کے خلاف آپ کو شکایت ہوتی تو ایک بات بھی تھی۔ خواہ مخواہ بلا قصور اس پر سوت لا بٹھائی یہ کہاں کی انسانیت ہے؟ لیکن مولانا ہیں کہ پیچھے پڑا ہے ہی نہیں دھرنے دیتے نکاح میں کیا برج ہے؟ نکاح سنت رسول ہے۔ امت کے بڑے بڑے لوگوں نے تین تین، چار چار نکاح کئے ہیں، میرے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ میرے بعد میرا نام کون لے گا۔

ڈاکٹر صاحب اس بے زبان کی تر زبانی سے بہت پریشان ہوئے۔ لیکن آخر شاعر کو زیر کرنے کے لئے جذبات کے حربے سے کام لیا، اور کہا کہ اولاد ہی سے نام نہیں رہتا۔ آپ کا کلام قیامت تک زندہ رہے گا۔ اور لوگ آپ کو یاد رکھیں گے۔ لیکن جب روز قیامت آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار لگے گا اور ساری امت حضور کے قدموں میں جمع ہوگی۔ اور اقبال بیگم حضور کا دامن تھام کر فریاد کرے گی۔ کہ اے دوجہاں کے آقا میرا انصاف کر۔ عمر بھر میں نے اس بڈھے کی خدمت کی۔ لیکن اس نے بے قصور و بے گناہ مجھ پر سوکن لا بٹھائی اور میری زندگی کو تلخ کر دیا۔ اس وقت بڈھا گرامی کیا جواب دے گا؟ اے بوالہوس۔ کیا تو نے جواب سوچ لیا ہے؟ پس پھر کیا تھا۔ مولانا گرامی زار زار رونے لگے۔ یا رسول اللہ میں بھول گیا میرے آقا مجھ سے خطا ہوگئی خدا کے لئے مجھے معاف کر ..... ڈاکٹر! بتاؤ اب میں کیا کروں"۔ ڈاکٹر صاحب نے مولانا کو تسلی دی۔ اور کہا کہ فوراً واپس جاکر اس عورت کو طلاق دے دو تاکہ حضور کے عتاب سے بچ جاؤ۔

مولانا نے جاکر اس عورت کو طلاق دے دی۔ اور آدھا مہر ادا کر دیا۔

مولانا بدحواس آدمی تو تھے ہی۔ ایک دن میر محبوب علی خاں نظام دکن کا دربار لگا ہوا تھا، حسب دستور تمام ارکان دربار اپنے اپنے منصب پر کھڑے تھے۔ مولانا بھی اپنے مقام پر استادہ تھے۔ لیکن ازار بند لٹک رہا تھا۔ حضور نظام کی نگاہ پڑ گئی انھوں نے پیش کار حضوری سے کہا گرامی کو تو دیکھو ازار بند لٹک رہا ہے۔ اور کچھ ہوش نہیں۔ پیش کار پریشان ہوا کہ کہیں عتاب نہ ہو جائے، جھٹ بات بنائی اور کہا حضور والا گرامی پریشان رہتا ہے یہاں جو منصب ملتا ہے وہ نوکر چاکر گھوڑا گاڑی میں خرچ ہو جاتا ہے۔ وطن میں اس کی ہمشیرہ کی شادی درپیش ہے (حالانکہ کوئی ہمشیرہ نہ تھی) یہ پنجاب کے لوگ لڑکیوں کو جہیز میں سونے کے ٹھوس زیور دیتے ہیں۔ اس لئے بے چارا فکرمند رہتا ہے۔ میر محبوب علی خاں میں پرانے بادشاہوں کی سی فیاضی تھی۔ حکم دیا کہ گرامی کو پانچ سیر سونا دے دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی گرامی کو پانچ سیر سونا ملا۔ تو ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پیش کار سے پوچھا اس نے سارا قصہ سنایا۔

شام کے وقت مولانا اپنے مکان پر یاردوں میں کہتے رہے تھے ابھی تو ازار بند لٹک ہی رہا تھا کہ پانچ سیر سونا ملا اگر کہیں کھل جاتا تو دس سیر ملتا۔ ایک دن کا ذکر ہے، حضور نظام نے سر دربار مولانا گرامی کو حکم دیا کہ اپنا کلام سناؤ۔ مولانا نے سات اشعار سنا کر تسلیمات پیش کیں (دستور دربار یہی تھا کہ سات شعر سنا کر تسلیم کرو اور ہٹ جاؤ۔ اگر حضور مزید فرمائش کریں تو اور سناؤ ورنہ نہیں) نظام نے کہا اور سناؤ، مولانا نے سات اشعار اور سنائے اور تسلیم کی۔ پھر حکم ہوا اور سناؤ، اس پر مولانا نے ایک لمبا قصیدہ پڑھ کر ختم کیا اور تسلیم کی، حضور نظام نے پھر بھی یہی فرمایا کہ اور سناؤ۔ اس پر مولانا نے بے ساختہ پنجابی میں کہا "ہن چھڈ یار میں تھک گیاں۔ نظام خدا جانے کچھ سمجھے یا نہیں لیکن مولانا کا پیچھا چھوڑ دیا۔

یہ خود فراموشی کی نہایت دلچسپ مثال ہے، شعر سناتے سناتے آپ کو یاد ہی نہ رہا کہ کس کے سامنے شعر پڑھ رہا ہوں، اور جب تھک جانے کے بعد مزید فرمائش ہوئی تو یوں جواب دیا، گویا کوئی بے تکلف پنجابی دوست سامنے بیٹھا ہے۔ مولانا کے لطائف میں سے یہ چند تھے جو میں نے عرض کئے ہیں۔ ورنہ ان کی ذات سے تو دن بھر لطائف صادر ہوتے تھے۔ مثلاً صبح دس بجے علی بخش نے آکر کہا۔ مولوی صاحب کھانا کھا لیجئے فرمایا، واہ علی بخش تم بھی عجیب

آدمی ہو۔ ارے ابھی تو ناشتہ کیا ہے اور ابھی کھانا کھالوں؟ کوئی ساڑھے دس بجے پھر علی بخش نے کہا۔ مولوی صاحب کھانا لاؤں؟ فرمایا "پھر تم نے وہی رٹ لگائی ارے میاں ابھی تو ناشتہ کیا ہے"۔ علی بخش جاکر اپنی کوٹھڑی میں بیٹھ گیا۔

ابھی پندرہ منٹ نہ گزرے تھے کہ مولانا خود برآمدے میں نکل آئے۔ اور چلانا شروع کیا "علی بخش۔ علی بخش" وہ بھاگا ہوا آیا "حکم مولوی صاحب" کہنے لگے۔ بڑے بے درد لوگ ہو تم۔ دوپہر ہونے کو آئی۔ بھوک سے جان نکلی جاتی ہے اور کھانا نہیں دیتے، جلدی سے کھانا لاؤ۔

ان تمام بدحواسیوں کے باوجود محبت اور خلوص کے پتلے تھے۔ ڈاکٹر اقبال سے تو خیر پرانی راہ و رسم تھی، لیکن مجھ سے اور حفیظ جالندھری سے بھی بے حد محبت کرتے تھے۔ مرتے وقت بھی ہم تینوں ہی کو یاد کر رہے تھے۔

(نمک دان)

آئن سٹائن ——————— قومی آواز

یہ حقیقت ہے کہ سات آٹھ نسلیں جب گزر جائیں گی، سائنس اور ترقی کر جائے گی، ایٹمی طاقت سے نئی نئی ایجادیں ہو جائیں گی تب جاکر لوگوں کو معلوم ہوگا آئن سٹائن کتنا بڑا دماغ تھا اور اس نے انسانوں کو کیا کچھ دیا ہے۔

آئن سٹائن نے کائنات کو سمجھنے کے لئے ایک نئی عینک دی ہے۔ ایسی عینک جس نے ہم کو ایٹمی طاقت تک پہنچا دیا اور جو آگے چل کر نہ جانے کائنات کے اور کیا کیا سربستہ رازوں کا انکشاف کرے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بڑے دماغ کی عظمت سے انسان آج نہیں اس وقت واقف ہوگا جب سو دو سو برس کے بعد ایٹمی طاقت پر پورا قبضہ ہو جائے گا اور دوسرے سیاروں سے بات چیت اور آمد و رفت کے راستے کھل جائیں گے۔ کیوں کہ ان سب ترقیوں کا دار و مدار آئن سٹائن ہی کا نظریہ ہوگا جو بنیاد بن چکا ہے فزکس کی ترقیوں کا۔

پچاس برس ہوئے جب آئن سٹائن نے نظریہ اضافیت دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ اسے سن کر سائنسداں ششدر رہ گئے۔ مگر آئن سٹائن کا استدلال اتنا زبردست تھا کہ اسے مسترد نہ کر سکے۔ پھر تھوڑے ہی زمانے میں سائنس کی دنیا میں وہ ایک مسلّم حقیقت بن گیا۔ لیکن عام پڑھے لکھے لوگوں نے ۲۰-۲۵ برس تک اس کو ایک معمہ ہی سمجھا۔ حد یہ ہے کہ اس کی وضاحت کے لئے جو کتابیں لکھی گئیں انھوں نے اس کو اور زیادہ معمہ بنا دیا۔ مثلاً آئن سٹائن نے کہا تھا کہ کائنات کے کسی واقعہ کی پیمائش کے لئے ہم کو صرف طول و عرض اور عمق ہی کی ضرورت نہیں، بلکہ زمانے کے تعین کی بھی ضرورت ہے۔ اور اس کو اسی طرح استعمال کرنا چاہئے جیسے طول و عرض اور عمق کو جو کہ تین کے بعد کہے جاتے ہیں۔ یعنی زمانہ کو ایک چوتھا بعد سمجھنا چاہئے۔ اس سے لوگوں نے سمجھا کہ زمانہ بھی فاصلے کی طرح ایک چیز ہے اور اگر اس میں سفر کریں تو عجیب و غریب تبدیلیاں پیدا ہو سکتی ہیں حالانکہ اس بات کو پیش نظر رکھ کر ایسے افسانے اور ناولیں لکھی گئیں جن میں دکھلایا گیا کہ ایک انسان بعد رابع میں جاکر کچھ سے کچھ بن جاتا ہے۔ ان باتوں سے آئن سٹائن کا نظریہ بالکل ہی معمہ بن گیا۔

جس طرح نیوٹن کا نظریہ کشش ہے، کہ اگر اس کو عام سوجھ بوجھ سے سمجھا گیا ہو تو وہ بہت آسان ہو جاتا ہے لیکن علمی نظر سے دیکھو تو بہت محنت سے پڑھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت بھی ہے۔ نیوٹن نے اپنے باغ میں دیکھا کہ سیب اوپر سے نیچے گر رہا ہے اور اس پر نظریہ کشش بنا دیا۔ لوگ جب یہ سنتے ہیں تو اس کو کوئی بہت بڑی بات سمجھ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان کو یہ بھی یاد دلا دو کہ دنیا گول ہے، اور ساری دنیا میں پھل اوپر سے نیچے ہی کی طرف گرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ پھل چاروں طرف سے سمٹ کر زمین کی طرف آجاتے ہیں تو ہر شخص محسوس کرے گا کہ نیوٹن کا کشش سے کیا مطلب تھا۔ اسی طرح اگر آئن سٹائن کا نظریہ دیکھا جائے تو وہ آسان ہو جاتا ہے۔

اضافیت کہتے ہیں جب کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے مقابل میں متعین کیا جائے۔ مثلاً ٹھنڈا گرم۔ اس چیز کو ہم انسان اپنے جسم کی گرمی سے متعین کرتے ہیں۔ اگر کوئی چیز اس سے زیادہ گرم ہوتی تو ہم کہتے ہیں کہ گرم ہے اور اگر کم گرم ہوتی تو کہتے ہیں ٹھنڈی ہے۔ لیکن اگر مچھلی سے پوچھا جائے تو وہ بہت سی ان چیزوں کو جسے ہم ٹھنڈا کہتے ہیں گرم کہے گی۔ اور اگر ریگستانوں کے جانوروں سے پوچھا جائے تو وہ بالکل ہی دوسرا معیار قائم کریں گے۔ جانوروں کو چھوڑیئے اگر انسانوں میں سائبیریا اور صحرائے اعظم افریقہ اور خط استوا کے باشندے اکھٹا کر لئے جائیں اور ان سے پوچھا جائے کہ ٹھنڈک کا معیار کیا ہے تو وہ سب مختلف باتیں کہیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گرمی اور سردی اضافی چیزیں ہیں۔

یہی حال کائنات کی تبدیلیوں کا ہے۔ ہم اپنی دنیا سے ایک ستارے کو ٹوٹتا ہوا دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابھی ابھی ایک ستارہ ٹوٹا۔ لیکن اگر ہم کسی ہئیت داں سے پوچھیں تو وہ کہے گا کہ اس ستارے کو ٹوٹے ہوئے ۵۰ لاکھ برس ہو گئے۔ لیکن چونکہ وہ دنیا سے بہت فاصلے پر تھا اس لئے روشنی کی وہ کرنیں

جو اس تباہی کی تصویر کو لے کر چلی تھیں باوجود لاکھوں میل فی سکنڈ کی رفتار سے چلنے کے آج یہاں پہنچی ہیں۔ یہ خبر سن کر ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ہاں پچاس لاکھ سال ہوئے اس ستارے کو ٹوٹے ہوئے۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ یہ ۵۰ لاکھ تو ہوئے ہم دنیا والوں کی نظر سے لیکن کائنات میں جو اور اربوں کھربوں دنیائیں ہیں ان کی نظر سے کتنا زمانہ ہوا؟ دوسری دنیاؤں میں سے کچھ تو اس سیارے سے قریب ہوں گی اور کچھ کھربوں میل دور۔ کچھ اتنی دور کہ وہاں اس ستارے کے ٹوٹنے کا نظارہ پچاس لاکھ سال کے بعد کیا جائے گا۔

پھر سوال یہ بھی ہے کہ پیمائش کا پیمانہ جو ہم نے بنایا ہے یعنی سال، وہ کیا چیز ہے؟ زمین ایک مقررہ وقت میں سورج کے گرد چکر کر لیتی ہے۔ لیکن خود نظام شمسی کے اور سیارے اتنے وقت میں سفر نہیں طے کرتے ہیں۔ بلکہ کچھ کم اور کچھ زیادہ وقت میں سفر کرتے ہیں۔ دوسری طرف ان کے دن اور رات بھی مختلف ہیں کیوں کہ جتنے عرصہ میں دنیا اپنے گرد ایک چکر کر لیتی ہے۔ سب سیارے اتنی دیر میں چکر نہیں کرتے۔ کچھ زیادہ وقت لیتے ہیں اور کچھ کم۔ ہمارے نظام شمسی کے علاوہ کروڑوں نظام شمسی اور بھی ہیں اور ان سب کے ماہ و سال بے حد مختلف ہیں۔

مذکورہ پچاس لاکھ سال کے تعین میں اس سے بھی زیادہ جو چیز الجھن پیدا کرتی ہے وہ ہے کرہ زمین کے انسانوں کا مزاج۔ ہم انسانوں کے حواس ایک خاص رفتار سے کام کرتے ہیں۔ مثلاً آنکھ اسی وقت دیکھتی ہے جب چیز ایک خاص وقت تک آنکھ کے سامنے رہے۔ اگر وہ اس سے پہلے ہٹائی جائے تو آنکھ کو اس کا آنا جانا نظر نہ آئے گا۔ اس تجربے اور نظریے پر چلتے پھرتے سینما کی ایجاد ہوئی ہے اس میں ایک تصویر اتنی دیر ٹھہرتی ہے جتنی دیر میں آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے اور پھر اس کی جگہ دوسری تصویر اتنے کم وقت میں آ جاتی ہے کہ آنکھ اس آنے جانے کو نہیں دیکھ سکتی ہے۔

لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جاندار اور کائنات کی ہر دنیا کے باشندوں کا مزاج اسی رفتار سے حرکت کرتا ہے۔ اس دنیا کے جانداروں کا تجربہ کیا گیا تو ان کے مزاجوں میں بہت فرق پایا گیا ہے۔ مثلاً بعض مکھیاں آواز کی رفتار سے اڑ لیتی ہیں۔ اگر دوسری دنیا کے باشندوں سے ہمارا سابقہ پڑے تو ان کے مزاجوں کی رفتار میں ہم کو زمین آسمان کا فرق ملے گا۔

اس فرق کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے لئے جو ایک آن یا سیکنڈ کا ساٹھواں حصہ ہے وہ بعض جانداروں اور دوسری دنیا کے انسانوں کے لیے ایک منٹ ہو سکتا ہے ہمارے لئے جو ۵ منٹ ہیں ان کے لئے ایک گھنٹہ ہو سکتے ہیں۔ یعنی ۵ منٹ کے عرصے میں وہ اتنا کام کر سکتے ہیں یا اتنی تفریح کر سکتے ہیں جتنا ہم ایک گھنٹے میں ظاہر ہے کہ ایسے جانداروں اور ایسے انسانوں کے ماہ و سال ہمارے سال مختلف ہوں گے۔ اور وہ لوگ پچاس لاکھ برس پہلے ٹوٹنے والے ستارے کو زمانے کے جس گز سے ناپیں گے وہ بالکل ہی دوسرا ہوگا۔

یہ ہوا زمانے کا حال۔ ایسا ہی کچھ حال فاصلے کا ہے فاصلے کو حرکت سے ناپا جاتا ہے۔ اور حرکت کو اگر سمجھا جا سکتا ہے تو سکون کے مقابل میں۔ اسٹیشن سے جب ریل چلتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ چلی۔ ہماری دنیا میں سکون بھی ہے اور حرکت بھی۔ اسٹیشن اپنی جگہ پر رہتا ہے، لیکن ریل چلی جاتی ہے۔ اسی طرح جب ہم چاہتے ہیں چلتے ہیں جب چاہتے ہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اپنی دنیا کی حالت دیکھ کر ہم کائنات کے ستاروں کی حرکت اور سکون کے بارے میں فیصلے کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت بالکل دوسری ہے۔ کائنات میں کوئی بھی چیز ساکن نہیں ہے۔ دنیا سورج کے گرد گھومتی ہے اور سورج خود متحرک ہے تمام ستارے کسی نہ کسی طرف حرکت کرتے ہیں۔ اور اگر اپنی دنیا کی حرکت کو ذہن میں رکھئے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کرہ زمین کی بھی ہر چیز متحرک ہے۔ یعنی اس کائنات میں سکون ناپید ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم حرکت جس چیز کو کہتے ہیں وہ اضافی شے ہے

جب زمانہ اور حرکت اضافی چیزیں ہو گئیں تو کائنات کی ناپ جوکھ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اضافیت کے قانون نہ معلوم ہو جائیں آئنسٹائن نے اس قانون کو دریافت کیا۔

آئنسٹائن نے مذکورہ نظریہ کو ریاضی اور فزکس یعنی طبیعات کی نظر سے دیکھا اور ثابت کیا۔ اس نظریے سے جب اس نے روشنی کی لہروں کو دیکھا تو وہ بالکل دوسری چیز نظر آئی۔ اور اس کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ روشنی کی رفتار کا کائنات کی پیمائش پر بھی اثر پڑتا ہے۔

اضافیت ہی کے نظریہ کی پیداوار ایٹمی طاقت اور ایٹم بم ہے۔ اور نہیں سمجھا سکتا۔ آگے چل کر اور کیا کیا حیرت انگیز ایجادیں ہوں۔ حق تو یہ ہے کہ آئنسٹائن کی عجیب و غریب علمی شخصیت نے ریاضی اور طبیعات اور فلسفے پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہے کہ وہ اس دور کی علمی دنیا کے لئے ایک یکتا نشان ہو گیا جس کا نام رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔

شہرِ نجوم میں —— عبدالحمید عدم

بادِ صبا ابھی مرا پیغام لے کے جا
بیدار ہو رہی ہے حسین شام لے کے جا
بیٹھی ہیں میکدے میں نگاروں کی ٹولیاں
پھولوں کی شاہدوں کی ستاروں کی ٹولیاں
اور حسبِ قاعدہ غمِ دوراں علیل ہے
خنیشہ طلوعِ صبحِ طرب کی دلیل ہے
سب پوچھتے ہیں مجھ سے کہ منٹو کہاں ہے آج
غائب کدھر وہ ساحرِ آتش بیاں ہے آج
کہنا صبا یہ میرے سعادت سرشت کو
آواز دے رہے ہیں مغنی بہشت کو
ضامن ہیں ہم اگر تو چلا آئے گا یہاں
ماحول رس میں ڈوبا ہوا پائے گا یہاں
یاں مغبچے ہیں رند ہیں اور قہر پارہ ہیں
لیکن تمام تیرے لئے بے قرار ہیں
وہ اس لئے کہ ایک سلیم آدمی ہے تو
گوہر کی آب اور صدف کی نمی ہے تو
اے یار غیر کوئی نہیں اس ہجوم میں
جاری ہیں تذکرے ترے شہرِ نجوم میں
میں ہوں ضمیر جعفری ہے اور سراج[1] ہے
ان تین دوستوں کو تری احتیاج ہے
منٹو! تو دن کے وقت جہاں بھی مقیم ہو
رحمت خدا کی تیری رفیق و ندیم ہو
شب کو مگر تجھے مرے دیرینہ ہم سبو
آنا پڑے گا اپنے رفیقوں کے روبرو
گریہ کناں ہیں تیرے فسانے ترے بغیر
بے رنگ ہو رہے ہیں زمانے ترے بغیر
ماتم کہانیوں کا یہ دیکھا نہ جائے گا
رونق کو ڈھونڈنے یہاں اُڑ کے آئے گا

[1] سراج الدین ظفر

(ماہِ نو مارچ ۱۹۵۵ء)

آج کل دہلی

ذاکر صاحب —— ڈاکٹر عابد حسین

...... ہم نے دیکھا کہ ذاکر صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں مگر ان میں مرکزی اور بنیادی حیثیت انسان دوستی کو حاصل ہے۔ انسان دوست شخصیت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک مرشد و معلم کی دوسرے مصلح و مجاہد کی۔ مرشد و معلم کی توجہ کا موضوع انسان بحیثیت فرد کے ہے۔ وہ ارشاد و ہدایت تعلیم و تربیت کے ذریعے افراد کے اندر ان قدروں کو پیدا کرتا ہے۔ جو اسے انسانیت کے بلند منصب کے سزاوار بنائیں۔ مصلح و مجاہد کا کام انسانی جماعت یا سماج کا سدھار کرنا ہے۔ یعنی ان خرابیوں سے جو سماج میں پیدا ہو گئی ہیں لڑنا اور ان کو دور کرنا تاکہ انسانیت کی دبی ہوئی روندی ہوئی قدریں ابھر آئیں چمک اٹھیں۔ دونوں قسم کے انسان دوستوں کی زندگی کا قانون محبت ہے۔ لیکن ایک کے ہاں محبت جمالی شان دکھاتی ہے دوسرے کے ہاں جلالی۔ کبھی کبھی یہ دونوں شانیں ایک ہی شخصیت میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ پیمبر یا مجدد کی شخصیت بن جاتی ہے۔

ذاکر صاحب کی انسان دوستی اب تک مرشد و معلم کی شان رکھتی ہے وہ انسان کو فرد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اس کی روح سے محبت رکھتے ہیں۔ اور اسے تعلیم و ہدایت کے ذریعے سنوارنا چاہتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں اچھے مسلمان پیدا کرو اچھی اسلامی جماعت پیدا ہو جائے گی۔ اچھے ہندوستانی بناؤ اچھا ہندوستان بن جائے گا لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ معلم کا مدرسہ ہو یا مرشد کی خانقاہ دونوں کا اثر فرد کی تعلیم و ہدایت میں محدود ہے۔ دوسرے اجتماعی ادارے خاندان طبقہ قوم مذہب رسم و رواج اگر الگ الگ نہیں تو مل کر انسانی شخصیت کی تشکیل میں کہیں زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر ان اجتماعی سانچوں میں سے اکثر خراب ہو گئے ہیں اگر آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو تو معلم اور مرشد کی ساری سعی رائیگاں جاتی ہے جب تک کوئی مصلح اور مجاہد اجتماعی سانچوں کو نہ سدھارے یا ان کو توڑ کر نئے سانچے نہ بنائے اور جو ایک ہی شخص میں معلم اور مرشد کے ساتھ مصلح اور مجاہد یعنی مجموعی طور پر مجدد کی شان پیدا ہو جائے تو پھر کیا کہنا۔

شاید ذاکر صاحب جیسے صوفی منش کو یہ توڑ پھوڑ قانونِ وحدت اور آشتی محبت کے خلاف نظر آئے لیکن اس مشکل کو اس مردِ عارف نے حل کر دیا ہے جس نے کہا ہے

نقشِ حق را ہم ز امرِ حق شکن   بر زجاجِ دوست سنگِ دوست زن

اور اس مردِ عمل نے ثابت کر دیا کہ پرانے سانچے خواہ سنگِ خارا کے بنے ہوئے ہوں بے تیشہ و گرز محض "تمسک بالحق صرف" ستیہ گرہ سے توڑے جا سکتے ہیں۔
(نقوش)

پنج سالہ پلان

گزشتہ سے پیوستہ

نمبر ۸
گھریلو صنعتیں

س۔ گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے کیا کیا جا رہا ہے۔

ج۔ گھریلو صنعتوں کی بڑی مشکلات جن اسباب سے پیدا ہوتی ہیں وہ ہیں بڑے پیمانے کے کارخانوں کا مقابلہ روپے کی کمی خام مال کی فراہمی اور طیار شدہ مال فروخت کرنے کے لئے تنظیم کی کمی اور گھریلو صنعتوں کے معیار کو بلند کرنے کے لئے حسن تنظیم کوشش کی ضرورت ہے اس کی کمی۔ پلان نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ گھریلو صنعتوں کی ملک کی اقتصادیات میں ایک بہت بڑی اہمیت ہے اور اس میں اتنی گنجائش ہونا چاہئے کہ دیہی حلقوں سے فالتو محنت کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ نیز ان کاریگروں کو بھی زیادہ سے زیادہ کام دینا چاہئے جو اس وقت ان میں کام کر رہے ہیں۔ گھریلو صنعتوں کی پوزیشن کو مضبوط بنانے، ان میں توسیع و ترقی پیدا کرنے کے لئے مندرجہ اقدامات کی تجویز کی گئی ہے

(۱) گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لئے تحقیقی اداروں کا قیام۔

(۲) کچے مال کی خرید اور طیار شدہ مال کی فروخت کے لئے گھریلو صنعت کاروں کی کوآپریٹو سوسائٹیوں میں تنظیم

(۳) بعض لائنوں میں پیداوار کے حلقوں کا تحفظ۔ تاکہ بڑے پیمانے کے یونٹوں کے ساتھ مقابلہ نہ کرنا پڑے۔

(۴) بڑے پیمانے کی صنعت پر ایک ٹیکس کا اطلاق تاکہ اس کے ساتھ مطابقت رکھنے والی گھریلو صنعت کو فائدہ پہنچ سکے۔ اور

(۵) جہاں ممکن ہو گورنمنٹ محکموں کی طرف سے گھریلو صنعتوں کی پیداوار کے لئے ترجیح کی منظوری۔

گورنمنٹ نے پہلے ہی تین بورڈ یعنی آل انڈیا کھادی اور دیہاتی صنعتی بورڈ آل انڈیا دستکاری بورڈ اور کھڈی بورڈ قائم کر رکھے ہیں۔ ان بورڈوں کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے دائرے میں گھریلو صنعتوں کے لئے پروگرام مرتب کریں

نمبر ۹
ٹرانسپورٹ اور رسل و رسائل

س۔ ٹرانسپورٹ اور رسل و رسائل کے پروگرام میں مجموعی اخراجات کا نصف سے بھی کچھ زیادہ ریلوے کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ اسے کس طرح سے حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے۔

ج۔ ریلوے کے نظام میں قابلیت کے بہت اونچے معیار کا قیام اور بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق اس کی توسیع زراعت اور صنعت دونوں کی توسیع و ترقی کے لئے ضروری ہے۔ زیادہ تر جنگ کی وجہ سے کئی ایسی پرانی چیزیں جمع ہو گئی ہیں جنہیں تبدیل کرنا ضروری ہے۔ اس وقت ان چیزوں کو تبدیل کرنا اور ساتھ ہی ساتھ بڑھتے ہوئے ٹریفک کے لئے انتظام کرنا اس بھاری خرچ کے بغیر ممکن نہیں جو پلان میں درج کیا گیا ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پلان میں ریلوے پروگرام کے لئے جو ۲۵۰ کروڑ روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے وہ اس ۳۰ کروڑ روپے کے علاوہ جو ہر سال سامان تبدیل کرنے کے لئے رکھا رہے، اصل حقیقی ضروریات سے کم ہے اور بنیادی صنعتوں اور ٹرانسپورٹ کے لئے جو ۵۰ کروڑ روپے کی مجموعی رقم کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس میں سے کچھ روپیہ ریلوے پر خرچ کرنا پڑے گا۔

س۔ چترنجن لوکوموٹو اور ٹاٹا انجینئرنگ اینڈ لوکوموٹو کمپنی سے کس حد تک یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ نئے انجنوں کے سلسلے میں ضروریات کو پورا کر سکیں گے؟

ج۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں ۱۰۵۰ انجن ایسے تھے جنہیں تبدیل کرنا ضروری تھا اور پلان کی مدت کے دوران میں توقع یہ ہے کہ ۲۴۰ مزید انجنوں کی تبدیلی کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس مدت میں توقع ہے کہ چترنجن لوکوموٹو ورکس اور ٹاٹا انجینئرنگ اینڈ لوکوموٹو کمپنی بالترتیب ۱۰۰ اور ۵۰ انجن سالانہ طیار کر رہے ہوں گے۔ اگر پرانے انجنوں کی تبدیلی بقایا میں نہ گنی جائے تو نارمل ضروریات کے مطابق ۱۹۰ انجن ہر سال تبدیل کرنے پڑیں گے۔

س ۔ تیسرے درجے کے مسافروں کو سہولیات بہم پہنچانے کے لئے ایک زبردست مطالبہ کیا جا رہا ہے ۔ کیا پلان نے اسے بھی پیش نظر رکھا ہے ؟

ج ۔ جی ہاں ۔ مسافروں کو سہولیات بہم پہنچانے کے لئے پلان میں ۱۵ کروڑ روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے ۔ اس روپے کا خاصہ حصہ تیسرے درجے کے مسافروں کی سہولتوں میں اضافہ کرنے کے لئے خرچ کیا جائے گا ۔

س ۔ کیا صنعتی توسیع و ترقی کے نتیجے کے طور پر مال اور مسافروں کے ٹریفک کی توسیع کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے ؟

ج ۔ صنعتی توسیع و ترقی کے نتیجے کے طور پر ٹریفک میں اضافے کے پیش نظر ریلوے پروگرام میں کچھ گنجائش رکھی گئی ہے ۔ اس بات کی اس سلسلے میں ایک خاص مثال ایک نئے صنعتی پراجیکٹ سندری فرٹیلائزر فیکٹری نے پیش کی ہے ۔ جس کے لئے ریل گاڑیاں ہر روز ایک ہزار ٹن کھڑیا مٹی بیکانیر کی پتھر کی کانوں سے لے کر جاتی ہیں ۔ اس کا مطلب ہے کہ پوری ریل گاڑی کا مال ۔ ٹریفک میں توسیع صرف ریلوے کے ڈبوں کی تعداد میں اضافہ کرنے ہی سے عمل میں نہیں آسکتی بلکہ اس کے لئے کئی طرح سے ریل کی پٹڑیوں کی حالت کو بھی بہتر بنانا پڑتا ہے ۔ پرانی گاڑیوں کی تبدیلی کا بقایا کام اتنا زیادہ ہے کہ اگر اس تبدیلی کو پروگرام کے مطابق چلانا ہے تو ریل کے ڈبوں میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں کیا جاسکتا ۔ لیکن یہ تجویز کیا گیا ہے کہ بنیادی صنعتوں اور ٹرانسپورٹ کے لئے ۵۰ کروڑ روپے کی ایک مجموعی رقم رکھی گئی ہے ۔ اس میں سے ریلوے کے لئے گنجائش نکالی جائے تاکہ بڑھتی ہوئی صنعتی ضروریات کو پورا کیا جاسکے ۔

س ۔ جہاں تک جہازرانی کا تعلق ہے ۔ گورنمنٹ کی پالیسی کے دو مقاصد یہ ہیں ۔ (۱) ساحلی تجارت ہندوستانی جہازوں کے لئے وقف کر دی جائے ۔ (۲) ہندوستانی جہاز زیادہ سے زیادہ غیر ملکی تجارت میں حصہ لیتے ہیں ۔ پلان میں اس پالیسی پر عمل درآمد کرنے کے لئے کیا تجویز کیا گیا ہے ؟

ج ۔ جہاں تک ساحلی تجارت کو ہندوستانی جہازوں کے لئے وقف کر دینے کا تعلق ہے پالیسی پر کامیابی سے عمل درآمد کرنے کی خاطر ساحلی تجارت کے جہازوں کا وزن ۲ لاکھ ٹن سے تقریباً ۳ لاکھ ٹن بڑھانا پڑے گا جو ہندوستانی جہازران کمپنیاں ساحلی تجارت کا کام کر رہی ہیں انھیں ۶۵۰۰۰ جی ۔ آر ۔ ٹی کے حد تک وزن بڑھانے کے لئے پلان میں گنجائش رکھی گئی ہے ان کی مالی امداد کی جائے ۔ اس کے علاوہ وشاکھاپٹم شپ یارڈ میں جو جہاز بنائے جا رہے ہیں ان میں سے ساحلی بیڑے کی طاقت کو بڑھانے اور پرانے جہازوں کو تبدیل کرنے کے لئے حاصل کئے جائیں گے ۔ ہندوستان شپ یارڈ لمیٹڈ کے لئے جو حصہ مقرر کیا گیا ہے اس کے اندر پنج سالہ پلان میں جہازی کمپنیوں کو آسان شرائط پر قرض دینے کی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ یارڈ میں جو جہاز بنیں انھیں خریدنے میں کمپنیوں کو آسانی رہے

جہاں تک سمندر پار کی تجارت میں ہندوستانی جہازوں کی مؤثر شرکت کا تعلق ہے پلان میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ جہازی کمپنیوں کو ۱۱۰۰۰۰ جی ۔ آر ۔ ٹی کی خرید کے لئے قرض کے طور پر روپیہ دیا جائے ۔ ان مزید جہازوں سے ہندوستانی جہازران کمپنیاں اس قابل ہوسکیں گی کہ وہ زیادہ مؤثر طریقے سے سمندر پار کی تجارت میں حصہ لے سکیں ۔

س ۔ ہندوستان میں بندرگاہوں کی توسیع و ترقی کے ساتھ تقسیم ملک کا کیا تعلق ہے ؟

ج ۔ کراچی کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد جو راجستھان ، مشرقی پنجاب اور ملحقہ علاقوں کے لئے برآمد کی بندرگاہ کا کام دیتی تھی ۔ بمبئی کی بندرگاہ پر مزید بوجھ آپڑا ۔ اور کراچی کی بندرگاہ نے جو ٹریفک سنبھالا تھا اس کا کچھ حصہ بمبئی کی جانب منتقل کرنا پڑا ۔ کاندلا کو اب ایک بڑی بندرگاہ کے طور پر توسیع و ترقی دی جا رہی ہے تاکہ جو ٹریفک پہلے کراچی کے ذریعے سے ہوتا تھا وہ سارے کا سارا ایک قدرتی برآمد کی بندرگاہ کے طور پر سنبھال لے ۔ ۱۹۵۶ء تک یہ بندرگاہ تقریباً ۸۵۰۰۰۰ ٹن سالانہ سنبھالنے کے قابل ہو جائے گی ۔

س ۔ ہندوستان میں تیل صاف کرنے کے کارخانے قائم کئے جا رہے ہیں اس سلسلے میں بندرگاہوں کی آسانیوں میں بہتری کی صورت کا پلان نے کس حد تک خیال رکھا ہے ؟

ج ۔ نئے کارخانوں میں سے دو کے لئے جزیرہ ٹرامبے (بمبئی) میں بندرگاہ اور ٹرانسپورٹ کی آسانیاں بہم پہنچانے کے لئے ۲ کروڑ روپے کا انتظام کیا گیا ہے تیسرے کارخانے کے لئے جو وشاکھاپٹنم میں کھولا جائے گا (جس کے لئے حال ہی میں معاہدے پر دستخط کئے گئے ہیں) ابھی تک کوئی خاص انتظام نہیں کیا گیا ہے لیکن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں بندرگاہ کی جو خصوصی سہولیات کی ضرورت ہوگی وہ اس ۵۰ کروڑ کی مجموعی رقم میں سے پوری کی جائے گی جو بنیادی صنعتوں اور ٹرانسپورٹ کے لئے رکھی گئی ہے ۔

س ۔ توسیع و ترقی کی وہ کونسی مدیں ہیں جو پلان کے زیر تحت بڑی بڑی

بندرگاہوں پر زیرِ عمل لائی جائیں گی؟

ج - کلکتہ میں بڑی مدیں یہ ہیں - گارڈن ریچ جیٹی کا دوبارہ قیام - کوئلے کی دو گودیوں اور ایک کچے لوہے کی میکینیکل گودی کی تعمیر - ویگنوں، ریلوے انجنوں، بھاری مشینوں اور دریاؤں کی وادیوں کے پراجیکٹوں کے لئے درآمد شدہ سامان کو اٹھانے کے لئے ایک بھاری لفٹ کریں -

بمبئی میں زیادہ اہم مدیں یہ ہیں - پرنسز اور وکٹوریہ ڈاکس کی تجدید - ان ڈاکس کے ٹرنزٹ شیڈوں کی از سرِ نو تعمیر اور الیگزینڈرا ڈاکس پر بجلی کے کرینوں کا نصب کرنا -

مدراس کی بندرگاہ کے لئے جو پروگرام ہے اس میں ۲٫۹۷ کروڑ روپے کی لاگت کی ایک ڈاکس کی اور مٹی کے تیل کے لئے ہر موسم میں کام کرنے والی دو گودیاں شامل ہیں -

کوچین کے پروگرام میں عام جہازوں کے لئے نئی گودیوں کی تعمیر کا انتظام کیا گیا ہے -

س - پلان میں یہ تجویز کیوں کیا گیا ہے کہ سول ہوائی کمپنیوں کو ملا کر ایک یونٹ میں تبدیل کر دیا جائے - کیا موجودہ کمپنیوں کو معاوضہ دیا جائے گا؟

ج - تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ موجودہ حالات میں کام کی زیادتی اور ٹریفک کے باعث موجودہ ہوائی آمد و رفت کی کمپنیاں اقتصادی بنیادوں پر کام نہیں کر سکتیں اور چونکہ ایئر ٹرانسپورٹ انکوائری کمیٹی کی سفارشات کے مطابق ہوائی آمد و رفت کی کمپنیوں کی رضاکارانہ از سرِ نو تنظیم عمل میں نہیں آ سکی - اس لئے کمیشن نے یہ سفارش کی ہے کہ موجودہ کمپنیوں کو ایک واحد کارپوریشن کی صورت میں ملا دیا جائے - کیونکہ اس اقدام سے ہوائی جہازوں کی تعداد ضرورت کے مطابق کم ہو جائے گی اور اخراجات میں کمی واقع ہو جائے گی -

نئی کارپوریشن ان ہوائی کمپنیوں کو ان کے سامان کے بدلے میں مناسب روپیہ ادا کرے گی - اگر یہ کمپنیاں چاہیں گی تو اپنے سامان کے بدلے میں انہیں اس نئی کارپوریشن کے حصے خریدنے کی اجازت دے دی جائے گی -

س - خاص حد تک دیہاتی پس ماندگی کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیہات میں سڑکیں قریباً نہ ہونے کے برابر ہیں - کیا پلان میں مشترکہ کوششوں کی بنا پر سڑکیں بنانے کے لئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے؟

ج - رضاکارانہ کوششوں سے سڑکوں کی تعمیر کو کمیونٹی ڈیولپمنٹ پراجیکٹوں میں ایک اہم جگہ دی گئی ہے اور سردست یہ تخمینہ کیا گیا ہے کہ پلان کی مدت کے دوران میں ان پراجیکٹوں کے علاقوں میں ۱۶ ہزار سے ۱۷ ہزار میل سی سڑکیں بنا دی جائیں گی - اور جگہ جگہ پر بھی امید ہے کہ سڑکوں کی تعمیر کے لئے رضاکارانہ کوششیں میدان میں آئیں گی - اور پلان میں "لوکل ورکس" کے لئے ۱۵ کروڑ روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ گورنمنٹ کی طرف سے روپیہ کی صورت میں گرانٹ دے کر ان کوششوں میں جان ڈالی جائے -

س - دیہاتی سڑکوں کے علاوہ قومی شاہراہوں اور سرکاری سڑکوں کی توسیع و ترقی کے لئے کیا پروگرام وضع کیا گیا ہے؟

ج - جہاں تک قومی شاہراہوں کا تعلق ہے - پنج سالہ پلان میں ۲۴۰ میل نئی سڑکوں اور ۱۸ بڑے پلوں کی جن پر کام پہلے ہی شروع ہو چکا ہے - اور ۴۵۰ میل نئی سڑکوں اور ۴۳ بڑے پلوں کی گنجائش رکھی گئی ہے - اس کے علاوہ ۲۲۰۰ میل قومی شاہراہوں کی حالت بہتر بنانے کا کام ہاتھ میں لیا جائے گا جس کا دو تہائی امید ہے پلان کی مدت کے دوران میں مکمل ہو جائے گا -

جہاں تک سرکاری سڑکوں کا تعلق ہے پلان میں یہ انتظام کیا گیا ہے کہ ۱۹۵۵-۵۶ء تک پارٹ اے ریاستوں میں پختہ سڑکیں ۷۱۰۰۰ میل سے تقریباً ۱۲۴۵۳ میل تک اور پارٹ بی ریاستوں میں ۷۸۸۰ میل سے ۸۱۲۹ میل تک بڑھا دی جائیں - پارٹ سی ریاستوں میں بھی نئی سڑکوں کی خاصی معقول تعمیر ہو گی تاکہ ان علاقوں تک بھی راستے کھل جائیں جہاں اس وقت تک رسائی نہیں ہو رہی ہے -

نئی کتابیں اور رسالے

بزمِ مملوکیہ

مصنف سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے ۔ ملنے کا پتہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۔ ضخامت بڑی تقطیع کے ۳۵۰ صفحے ۔ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ قیمت فی جلد پانچ روپیے آٹھ آنے ۔

اس کتاب میں خاندانِ غلاماں کے سلاطین ۔ امرا اور شہزادوں کی عرفان دوستی، علم نوازی اور معارف پروری کے حالات اور ان کے دربار سے متوسل علما و فضلا اور ادبا و شعرا کے کمالات پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے ۔ قطب الدین ایبک، ناصر الدین قباچہ، شمس الدین التمش، رکن الدین فیروز شاہ، رضیہ، معز الدین بہرام شاہ، علاء الدین مسعود شاہ، ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن کے عہد کے حالات شرح و بسط کے ساتھ درج ہیں تاریخی اور ادبی اعتبار سے یہ کتاب ایک نادر اضافہ ہے ۔ اس موضوع پر اتنی جامع کتاب کسی دوسری زبان میں بھی موجود نہیں ۔ فاضل مرتب کی جانفشانی اور محنت ہر لحاظ سے قابل قدر ہے ۔

اس کتاب کے ذریعے بعض فارسی شعراء کا تعارف اردو میں پہلی دفعہ کیا گیا ہے ۔ امیر خسرو سے متعلق بعض نئی معلومات بھی ہیں ۔

ذکرِ غالب ۔

مالک رام صاحب کی اس نادر تصنیف کا تیسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی نے شائع کیا ہے ۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ (انڈکس) شامل ہونے سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے ۔ $\frac{20\times30}{16}$ سائز کے ۲۸۴ صفحوں پر مشتمل یہ کتاب بڑے سلیقے سے چھپی ہے ۔ کتابت، طباعت، جلد اور جلد پوش عمدہ ۔ قیمت فی جلد تین روپے ۔

غالب کی سیرت پر اس سے قبل دو اچھی کتابیں شائع ہوئی تھیں، غالب نامہ از محمد اکرام اور غالب از غلام رسول مہر ۔ یہ کتاب جا بجا علمی، ثقافتی اور دلچسپ واقعات پر روشنی ڈالتی ہے ۔ یہ ضخامت کمتر ہونے کے باوجود یہ قیمت بہتر ہی نہیں بہترین ہے ۔ سیرتِ غالب ہی نہیں اس عہد کی ثقافتی اور علمی تاریخ بھی ہے

گئودان

منشی پریم چند کا یہ مشہور ناول بھی مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر دہلی نے شائع کیا ہے ۔ قیمت ۶ روپیے ۔ اردو میں پریم چند کے اس ناول کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے ۔ یہ ناول تنقید و تبصرہ کا محتاج نہیں ۔ بہت کچھ اس کے باب میں لکھا جا چکا ہے ۔ کتاب حسین و جمیل ہے اور قریب قریب چھ سو صفحوں پر مشتمل ہے ۔

کفِ گل فروش

پبلشر ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، قیمت تین روپیے ۔ گل فروش فرقت کاکوروی ہیں ۔ یوں تو آپ صحافی بھی رہے ہیں، مدرس بھی اور ایک مزاح نگار بھی لیکن اب معلوم ہوا کہ گل فروشی بھی آپ کرتے ہیں ۔ سید علی عباس حسینی کے دیباچے کو اگر شامل کر لیں تو ستر دلچسپ مضامین اس کتاب میں شامل ہیں ۔ ان میں سے دو تین آج کل میں بھی شائع ہو چکے ہیں ۔ فرقت صاحب کی مزاح نگاری میں ہر چند افسانویت کی چاشنی ہے لیکن یہ بجائے خود ایک واقعہ بن چکی ہے دلّی اور لکھنؤ کے بھانڈوں اور بانکوں کا ذکر آپ نے کیا تو ان میں سے ہر ایک پکار اٹھا کہ ع

باما ہر چہ کرد آں آشنا کرد

"ترقی پسند خواتین کا مشاعرہ" اور "میں پیروڈیز کیوں کر لکھتا ہوں" دلچسپ مضامین ہیں ۔ فرقت ٹھیٹھ زبان لکھنے پر بڑی قدرت رکھتے ہیں ۔ چونکہ پڑھے لکھے ہیں اس لئے محض ٹھیٹھ زبان ہی نہیں لکھتے ۔ خدا انھیں اور لکھنے کی توفیق دے لیکن اتنی نہیں کہ ان کے اپنے ہی پکار اٹھیں ۔ ع من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم

حیاتِ ز ۔ خ ۔ ش

ہندوستان کی مایہ ناز شاعرہ زاہدہ خاتون شروانیہ کے سوانح حیات محترمہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ نے تالیف کئے ہیں ۔ قیمت تین روپے ملنے کا پتہ ۔ مہتمم مطبوعات، مسعود منزل، حمایت نگر حیدر آباد دکن ۔ بڑی تقطیع ۔ ضخامت ۲۲۶ صفحات، کتابت، طباعت عمدہ

انیسہ ہارون بیگم شروانیہ نے اپنی حقیقی ماموں زاد بہن کی یہ سوانح عمری لکھ کر اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ مرحومہ ز۔خ۔ش نے صرف ستائیس سال کی عمر پائی لیکن علم و فضل اور شعر و سخن میں وہ مہارت حاصل کی جو سالخوردگی کے بعد بھی کم ملتی ہے۔ قوم و ملک کی فلاح اور رسم و روایت کی اصلاح میں آپ کے قلم نے جولانیاں دکھائیں۔ نواب سر مزمل اللہ خاں کی یہ نامور صاحبزادی شروانی خاندان کی روایات علمی کی علم بردار تھی۔ یہاں کلام کا زیادہ اقتباس پیش نہیں کیا جا سکتا۔ صرف ایک فارسی قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ قصیدہ نعتیہ ہے اور قاآنی کے تتبع میں۔

بہ چرخ و ارض و برّ و بحر غیر ذکر اللہ ہمہ
ہمہ ملعون، ہمہ مفتون، ہمہ افسوں ہمہ جادو
لبان عاجز، دہان قاصر، زبان الکن، بیاں کوتہ
ز وصف رب، ز مدح شہ، ز حمد این، ز لعت او
ز عشق تو، ز حب تو، ز غیر تو، ز جود تو
سرم جوشاں، لبم ساکت، دلم خالی، کلم مملو
کنار و بستر و بالیں و دامانم ز اشک غم
یکی قلزم، یکے عماں، یکی جیحوں، یکی آمو
قرار و راحت و آرام و آسائش نمی بینم
نہ بر بستر نہ بر بالش نہ ایں پہلو نہ آں پہلو

انیسیات

انیسہ ہارون شروانیہ کا مجموعۂ کلام۔ قیمت ۱۲/۔ ملنے کا پتہ مہتمم مطبوعات مسعود منزل حمایت نگر، حیدر آباد دکن

شروانی خاندان علم و فضل کا علم بردار رہا ہے۔ اسی خاندان کی ایک نیک خاتون اس کتاب کی مصنف ہیں۔ آپ علم دوست بھی ہیں اور علم پرور بھی۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہے۔ شعر میں پاکیزگی اور صفائی بیان بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بیشتر نظمیں ارادت و خلوص کی آئینہ دار ہیں۔

حیدر آباد میں ہندو مسلم تعلقات

۷۰ صفحات پر مشتمل کتابچہ از نرینور ام۔ اے۔ مصنف نے بڑے خلوص سے مسئلہ ہندو مسلم اتحاد کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔ ملنے کا پتہ۔ آریہ پرتی ندھی سبھا سلطان بازار حیدر آباد دکن

ہماری بُت پرستیاں

مصنف نواب ہوش یار جنگ بہادر حیدر آباد دکن۔ قیمت ایک روپیہ ضخامت ۸۴ صفحات رسالہ نگار بابت اپریل ۱۹۳۷ء میں عزاداری کے باب میں ان کے خیالات پر مشتمل ایک مقالہ جناب ہوش بلگرامی کے قلم سے شائع ہوا تھا۔ اس پر سید اختر علی تلہری اور سید اولاد حیدر فوق بلگرامی نے ان مقالوں میں گراں قدر نقد و تبصرہ فرمایا تھا۔ ہوش صاحب نے پھر مزید مطالعے کے بعد جواب الجواب لکھا۔ اب یہ سب مضامین اس کتابچے میں شائع کر دئے گئے ہیں۔ ہوش صاحب کے اپنے ہی ایک فقرے میں ان کا نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ "مروجہ طریقۂ عزاداری یا تو ہمارے تھکے ہوئے دماغوں کی پیداوار ہے یا ملکی ماحول کا نتیجہ ہے۔ ہوش صاحب ہمارے ملک کے نہایت ذہین طباع اور دیانت دار ادیبوں میں سے ہیں۔ آپ کی یہ تصنیف اس قابل ہے کہ اس کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے۔

آشا دیپ بجھے نا

ست پرکاش سنگر کے ایک درجن افسانوں کا مجموعہ۔ تعارف اپنے دلچسپ انداز میں کنہیا لال کپور نے لکھا ہے۔ سنگر ہمارے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ اردو، ہندی اور انگریزی میں بیک وقت اور بغیر جھجک کے لکھتے ہیں۔ اتنا لکھتے ہیں کہ لکھنے سے باز نہیں آتے۔ ہندی میں چھ ناول چھپ چکے ہیں۔ اردو میں ایک ناول زیر طبع ہے۔ کپور نے تعارف میں جو چاہے لکھا ہو لیکن آخر میں اپنے دل کی بات کہہ دی ہے۔

مجھے یقین ہے اگرچہ وہ چھوٹی آنکھوں کا مالک ہونے کی وجہ سے فلم ایکٹر نہ بن سکا۔ تاہم سعی اور تجربے کی کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد وہ ہماری زبان کا ایک قابل رشک اور لائق قدر افسانہ نگار ثابت ہوگا۔

ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ کردار بھوپال قیمت دو روپے

اب اور تب

ہنسراج رہبر کی گیارہ کہانیوں کا مجموعہ۔ ناشر نیا دور پبلشرز اردو بازار دہلی۔ قیمت دو روپے ۴ آنے۔ ضخامت ۱۷۶ صفحات

رہبر دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ذہانت اور خلوص دو جوہر ہے کہ آپ کبھی کبھی 'منہ پھٹ' کی حدوں تک پہنچ جاتے ہیں لیکن افسانہ نگاری میں عمر کے ساتھ ساتھ اب آپ سنجیدگی اور متانت اختیار کر رہے

ہیں۔ آپ کے افسانے کردار نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہوا کرتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ زندگی کے بنیادی مسائل کرداروں کو خود ابھارتے ہیں۔ ممتاز حسین کے قول کے مطابق "انھیں سماجی قوتوں کی کشمکش اور اس کے ارتقا کا بخوبی علم ہے اور وہ اپنے اس علم کو بڑے سلیقے سے استعمال کرتے ہیں"۔ ہماری صرف یہی دعا ہے کہ وہ اس "سلیقے" سے شدت کو ٹھیر اور اعتدال کا خیال رکھا کریں۔

ایک شعلہ ایک وجود

جی ایس عالم کے افسانوں کا مجموعہ' پبلشرز قادری کتب خانہ نور منزل محمد علی روڈ بمبئی ۲۔ عالم صاحب متعدد ناولوں اور افسانوی مجموعوں کے مصنف ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعے میں گیارہ افسانے شامل ہیں۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

ساہتیہ اکیڈمی

کی سالانہ رپورٹ بابت ۵۵-۱۹۵۴ء انگریزی میں شائع ہوئی ہے اس میں افتتاح سے لے کر اب تک اکیڈمی کی سرگرمیوں کا ذکر ہے شعبوں میں ممبروں کے نام بحیثیت نمایندگی دئے گئے ہیں۔ مختلف زبانوں میں تصنیفات کی فہرست' کا لیداس کی تصنیفات کی نقد و تبصرے کے ساتھ اشاعت' سنسکرت ادب کا مجموعہ چار جلدوں میں۔ ہندوستانی زبانوں میں نظموں کے مجموعے وغیرہ مرتب اور شائع کرنے کا کام شروع ہو گیا ہے۔ اکیڈمی بہت قابل قدر کام کر رہی ہے۔

اچھی نظمیں بچوں کے لئے

مصنف جناب اختر شتاق' قیمت پانچ آنے۔ ملنے کا پتہ ادارہ فروغ اردو امین آباد پارک لکھنؤ۔

کیمیائے عشرت

سولہ صفحے پر مشتمل حفظانِ صحت کے باب میں ایک پمفلٹ از جناب ایم صدیقی طبیب حاذق۔ بیدر۔ دکن

رخسارِ سحر۔ ناول از انصر کریم قدوائی - ۱۱۲ صفحات قیمت عہ/

قیامت صغریٰ۔ ناول از خان محبوب طرزی - ۲۸۸ صفحات قیمت تین روپے

ناشر ادارہ فروغ اردو امین آباد پارک لکھنؤ

کھیت میں لہو

ناولٹ از تاجور سامری - ۱۱۲ صفحات قیمت ایک روپیہ بارہ آنے مکتبہ رنگین ۱۰۹۷ گنج میر خاں عقب ڈیلائٹ سینما دہلی

رسالے

نقوش۔ شخصیات نمبر

سات سو صفحے پر مشتمل یہ خاص نمبر اپنی نظیر آپ ہے۔ اب تک نقوش کے جتنے نمبر شائع ہوئے ہیں۔ یہ نمبر ان سب پر فوقیت لے گیا ہے۔ اڈیٹر کا التزام کہ شخصیت نگار حتے الامکان خود شخصیت کا ہم نشین یا عقیدت مند ہو اور بھی قابل تعریف ہے۔ اسی بہانے ڈاکٹر سید عابد حسین' غلام رسول مہر' رشید احمد صدیقی ایسے "نایاب" نثر نگاروں کے تازہ نگارشات منظر عام پر آگئے۔ نایاب اس لئے کہ ان مشکفین کے دروازے کتنے ہی کھٹکھٹا دو۔ کم اللہ دے سناٹا آواز نہیں آتی۔ طفیل صاحب خوش نصیب ہیں کہ ان اکابر سے بھی آپ کو مضامین مل گئے اور ملے بھی اتنے اچھے کہ پڑھنے والا جھوم جائے۔ ڈاکٹر عابد حسین اردو کے بہت ہی سنجیدہ' پرمغز اور متوازن ادیب ہیں۔ ذاکر صاحب پر آپ کا مقالہ آپ کے انھیں خصوصیات کا آئینہ دار ہے۔ ادیبوں کی اڑتالیس تصویروں کا ایک قابل قدر البم رسالے کے شروع میں شامل ہے اردو ادب میں اس موضوع پر ابھی تک اتنی جامع کتاب یا اتنا جامع رسالہ شائع نہیں ہوا۔ شخصیتوں پر ۸۲ مضامین کے علاوہ چار ایسے مضمون بھی ہیں جن میں لاہور' دہلی' لکھنؤ اور حیدرآباد کی متعدد شخصیتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اتنے بڑے کام میں اگر کوئی معمولی کمی رہ جائے تو اسے ناگزیر سمجھنا چاہئے۔ یگانہ چنگیزی' اثر لکھنوی' آنند نرائن ملا' ہری چند اختر اور کتنے ہی اچھے ادیب اور شاعر رہ گئے۔ لیکن اس کے باوجود یہ شمارہ بہت جامع ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ناشر کی ہر ممکن قدر افزائی کی جائے گی۔ قیمت چھ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ ادارہ فروغ اردو - ۱۱- مال روڈ لاہور

اخبار انسان۔ پورنیہ نمبر

پورنیہ بہار کا ایک ادب خیز خطہ ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت' حیثیت اور ثقافتی زندگی سے متعلق بہت سے دلچسپ اور کارآمد مضمون ہیں شامل ہیں۔ ضخامت ۱۲۸ صفحے قیمت ۲ روپے چار آنے۔ مرتب' نیر دانی صاحب اس کی اشاعت کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

رفتارِ زمانہ

بنڈونگ کانفرنس سے واپسی پر پردھان منتری کا بیان

بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو مصر کے وزیر اعظم کرنل ناصر اور افغانستان کے وزیر خارجہ سردار نعیم خاں کی معیت میں بنڈونگ میں منعقد شدہ ایشیا اور افریقی ممالک کی کانفرنس میں شمولیت کے بعد واپس بھارت تشریف لے آئے ہیں۔ کلکتہ میں ایک پریس کانفرنس کے دوران میں پردھان منتری نے کہا کہ بنڈونگ کانفرنس اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے نظیر تھی اور اس سے دنیا بھر میں قیام امن کے مقصد کو تقویت حاصل ہوگی۔ آپ نے کہا کہ دنیا کی تاریخ میں اس امر کی مثال نہیں ملتی کہ اتنے ملکوں کے نمایندے ایک جگہ اکٹھے ہوئے ہوں۔ اور انھوں نے مل کر قیام امن کے لئے راہ نکالنے کی کوشش کی ہو۔ کانفرنس کے بعد تمام ممالک کی طرف سے مشترکہ اعلان کا جاری ہونا اس کانفرنس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ شری نہرو نے فارموسا کے متعلق چاؤ این لائی کی پیش کش کو منصفانہ قرار دیا۔ آپ نے کہا کہ مختلف ممالک کا ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنا اور خطرہ محسوس کرنا ساری بدامنی کی جڑ ہے۔ شری نہرو کے بعد کرنل ناصر اور سردار نعیم خاں نے بھی نمائندگان پریس کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور بتایا کہ اس کانفرنس کے انعقاد سے ہم نے دنیا میں امن کے قیام کے لئے ایک مزید قدم آگے بڑھایا ہے۔

چترنجن کی فیکٹری میں دوسوویں انجن کی تیاری پر تقریب

راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے چترنجن لوکوموٹو فیکٹری سے دوسو ریلوے انجن تیار ہو جانے پر دوسوویں انجن کو اپنے ہاتھوں سے چلایا۔ اس تقریب کے موقعے پر ہزاروں ورکر اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ پچھلے چار برسوں میں اس فیکٹری نے جو قابل قدر ترقی کی ہے اس کے لئے راشٹرپتی نے تمام مزدوروں کو مبارک باد پیش کی۔ آپ نے کہا کہ بھارتی مزدور اپنی ذہانت میں دنیا کے کسی ملک کے مزدور سے پیچھے نہیں، اور موقعہ آنے پر وہ مشکل سے مشکل کام کو نہایت آسانی سے انجام دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے بھاشن میں اس امید کا اظہار کیا کہ اگر ترقی کی یہی رفتار قایم رہی تو ہم نہ صرف ریلوے سے متعلق اپنی ضرورتوں کے لئے خود کفیل ہو جائیں گے بلکہ دیگر ممالک کو ریلوے انجن برآمد کرنے کی بھی پوزیشن میں ہو جائیں گے۔

بھارت میں مسلمانوں کو دی گئی مراعات کی مختصر رپورٹ

بھارت کے وزیر بحالیات شری مہر چند کھنہ نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس کے دوران میں اس امر پر روشنی ڈالی کہ بھارت سرکار نے بھارتی مسلمانوں میں اور خصوصاً فسادات سے نقصانات اٹھانے والے مسلمانوں میں اعتماد پیدا کرنے اور اُن کے تحفظ کے لئے کیا اقدامات کئے ہیں۔ آپ نے بتایا کہ پنجاب اور راجستھان سے بھاگنے والے ہزاروں میوؤں کو بھارت میں از سر نو بسا کر ان کی زمینیں اور مکانات واپس دلا دئے گئے ہیں۔ نہرو لیاقت پیکٹ کے مطابق پچیس ہزار پاکستان گئے ہوئے مسلمانوں کو واپس لے لیا گیا ہے، اور ان کی جائدادیں واگذار کر دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ بھارت سرکار نے اس درجے کے مزید پانچ ہزار مسلمان واپس لینے منظور کر لئے ہیں۔ شری مہر چند کھنہ نے مزید کہا کہ مشرقی بنگال سے نہرو لیاقت معاہدے کے مطابق اڑھائی لاکھ مسلمان مغربی بنگال واپس آ گئے ہیں اور چند سو کو چھوڑ کر سب کی جائدادیں بحال کر دی گئی ہیں۔ کل ملا کر مغربی بنگال میں ڈیڑھ لاکھ ایکڑ زمین اور چوبیس ہزار مکانات واپس کئے گئے ہیں۔ تری پورہ سے بھاگے ہوئے نو ہزار مسلم خاندانوں میں سے آٹھ ہزار اپنے آبائی وطن میں آکر پھر سے آباد ہو گئے ہیں۔ آسام کے چونتیس ہزار پانچسو مہاجرین دوبارہ آکر بس گئے ہیں۔ اس طرح مغربی بنگال، آسام اور تری پورہ سے بھاگے ہوئے سات لاکھ مسلمانوں میں سے پانچ لاکھ بھارت میں آباد ہو گئے ہیں۔ بھارت سرکار نے مہاجرین کو اسی لاکھ روپیہ قرضوں اور امداد کی شکل میں دیا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں شری کھنہ نے نمائندگان پریس کو یقین دلایا کہ بھارت سے پاکستان

جانے والے مسلمانوں کی ناجائز ہجرت کی روک تھام کے لئے بھارت سرکار حکومت پاکستان سے پورا تعاون کرے گی۔ آپ نے سفر کی سہولیات بہم پہنچانے کا بھی وعدہ کیا اور تفصیل سے بیان کیا کہ بھارت اور پاکستان کے مابین لوگوں کی آمد و رفت کو جاری کرنے کے لئے کون کون سی ٹرینیں چلائی جا رہی ہیں۔

کرنل ناصر اور سردار نعیم خان کا اظہار تشکر

دہلی میں لاکھوں اشخاص کے پرخلوص سواگت کا جواب دیتے ہوئے مصر کے وزیر اعظم کرنل ناصر نے بھارت کی پرانی تہذیب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ بھارتیوں اور مصریوں کی دوستی بہت پرانی ہے۔ مصر کے لوگوں نے ہمیشہ گاندھی جی کے بتائے ہوئے اصولوں اور فلاسفی کی تعریف کی ہے۔ آپ نے کہا کہ بھارت ہمیشہ پس ماندہ ممالک کی آزادی کا حامی اور ہر وقت اُن کی امداد کے لئے پیش پیش رہا ہے۔ اس موقعہ پر افغانستان کے نائب وزیر اعظم سردار نعیم خان نے بھی بھارت کے لوگوں کو افغانوں کی طرف سے ہدیۂ تہنیت پیش کیا۔ آپ نے کہا کہ ہم بھارت سے اپنی دوستی پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ افغان بھارت کی خوش حالی کے خواہاں ہیں۔ آپ نے اپنی تقریر جے ہند کہہ کر ختم کی۔

بھارت اور پاکستانی پبلک کے دوستانہ مظاہرے پر راجہ غضنفر علی کی تقریر

پاکستان کے ہائی کمشنر راجہ غضنفر علی خان نے لاہور میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ امرتسر اور جالندھر میں پاکستانیوں کا جو شاندار استقبال ہوا ہے وہ ہر دو ممالک کے مابین بڑھتے ہوئے دوستانہ اور برادرانہ شفقت کے جذبات کا ایک اور روشن ثبوت ہے اور یہ اس امر کی علامت ہے کہ اب دونوں قومیں کی جنتا پُر امن پڑوسیوں کی طرح رہنے کی خواہاں ہے۔

روس کا برطانیہ اور فرانس کے ساتھ دوستانہ معاہدہ ختم

روس نے دوسری بڑی جنگ کے دوران میں برطانیہ اور فرانس کے ساتھ قائم شدہ دوستانہ معاہدے کو ختم کر دیا ہے۔ اس معاہدے کو ختم کرنے کی وجہ فرانس اور برطانیہ کی طرف سے معاہدہ پیرس کی تصدیق ہے جس کے ذریعے جرمنی کو از سر نو مسلح کیا جائے گا۔ حکومت روس کا خیال ہے کہ پیرس کے معاہدے کی تصدیق کے بعد بیس سالہ دوستی کے معاہدے کی حیثیت قائم نہیں رہ سکتی۔ فرانس کے دفتر خارجہ کے ترجمان نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ روس نے مشترکہ امداد اور دوستی کے معاہدے کو توڑا ہے۔ حالانکہ اس معاہدے سے دونوں ملکوں کو کافی فائدہ پہنچ سکتا تھا۔

شری شام لال صراف کی تقریر

پٹھان کوٹ کے ایک عظیم الشان جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ریاست جموں اور کشمیر کے توسیع اور ترقی کے وزیر شری شام لال صراف نے اعلان کیا کہ کشمیر بھارت کا ایک اٹوٹ انگ ہے اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں بھارت سے الگ نہیں کر سکتی۔ آپ نے کہا کہ بخشی غلام محمد کی زیر رہنمائی ریاست ہر لحاظ سے ترقی کر رہی ہے اور ہر شخص بچشم خود کشمیر کی اس ترقی کو دیکھ سکتا ہے۔ وزیر ترقیات نے عوام کو متنبہ کیا کہ وہ فرقہ پرستوں کے ہتھکنڈوں سے بچیں جو دیش کی ترقی کی راہ میں روڑا اٹکا رہے ہیں۔ آخر میں آپ نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ دیش کی ترقی کے لئے امن کے دیوتا شری جواہر لال نہرو کے ہاتھ مضبوط کریں۔

چھوت چھات کے خلاف بل منظور

بھارت کی لوک سبھا نے چھوت چھات کو روکنے کے متعلق ایک قانون پاس کیا ہے جس کے مطابق کسی سے چھوت کرنے والا شخص ضابطہ فوجداری کے تحت سزا کا مستوجب ہوگا۔ اس قانون کے پاس ہونے پر لوک سبھا میں تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا گیا اور اُسے سماجک سُدھار کے باب میں ایک اہم قدم قرار دیا گیا۔

کلکتہ سے آسام تک ریل گاڑیوں کی آمد و رفت

پانچ سال کے بعد ۲۹۔ اپریل سے کلکتہ سے ایک گاڑی براہ پاکستان آسام روانہ ہوگئی۔ اس گاڑی میں ۶۰ ڈبے ہیں اور ۱۳۰۰ ٹن چینی، چاول اور کھاد اس سے بھیجی گئی ہے ـــ اس گاڑی کے چلنے سے مشرقی پاکستان سے ہو کر مال گاڑیوں کی آمد و رفت شروع ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں مسافر گاڑیاں چلانے کے لئے بھی انتظامات کئے جا رہے ہیں۔

گندم کے نرخ کی روک تھام کے لئے اقدام

بھارت سرکار نے گندم کے بھاؤ کو غیر اقتصادی سطح تک گرنے سے روکنے کی غرض سے صوبائی حکومتوں کو تیرہ کروڑ روپیہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاکہ جن صوبوں میں گندم کی بہتات سے نرخوں کے گرنے کا خدشہ ہو وہاں کی حکومتیں نرخوں کو مناسب سطح پر رکھنے کے لئے خود گندم خرید سکیں۔



امرت لال عشرت

ہمارا پپّو

کیا کروں میں بیان پپّو کا — آج ہے کُل جہان پپّو کا
گھر سے اسکول اور اس کے بعد — نہیں ملتا نشان پپّو کا
کھانے پینے کا کچھ حساب نہیں — پیٹ ہے مرتبان پپّو کا
آنکھ پُستک پہ اور رہتا ہے — بندروں میں دھیان پپّو کا
ماسٹر کو سلام ہوتا ہے — آ گیا امتحان پپّو کا
ٹافی والوں کا دھیان پپّو کو — ٹافی والوں میں دھیان پپّو کا
کان پکڑے ہیں ماسٹر جی نے — کون پکڑے گا کان پپّو کا

وقت کالج کا ہو گیا عشرت
ختم کر اب بیان پپّو کا





رعنا ثریا کاکوروی



گھوڑے کی خریداری

اب سے کئی سو برس کی بات ہے جب ملک عرب میں ایک بادشاہ تھا۔ اُس کا نام ابنِ مسبوق تھا۔ ابنِ مسبوق کو گھوڑوں کا بڑا شوق تھا۔ اُس کے اصطبل میں ہر ملک اور ہر نسل کے بڑے خوبصورت خوبصورت گھوڑے تھے۔ تازی، ترکی، عرب اور نہ جانے کتنے۔ اُن میں ایک گھوڑا جو سب سے زیادہ تندرست، خوب صورت اور خوش رنگ تھا اُس کو نزلہ ہوگیا۔ بادشاہ نے اُس کے نزلے کا بہت علاج کرایا، مگر گھوڑا اچھا نہ ہوا۔ اُس کو منٹ منٹ پر چھینکیں آنے لگیں، ناک سے نزلہ اس طرح بہتا جیسے بمبے کی ٹونٹی سے پانی — کسی وقت رُکتا ہی نہ تھا۔ بادشاہ کے طبیبِ خاص نے گھوڑے کے نتھنوں میں ڈھاٹیں لگوادیں۔ یہ ڈھاٹیں سوختنے کی بنی ہوئی تھیں جس سے گھوڑے کا نزلہ اُن ڈھاٹوں میں جذب ہو جاتا۔ مگر جب نتھنوں سے نزلے کو نکلنے کا موقع نہ ملا تو اُس نے آنکھوں کا رُخ اختیار کیا، اور اُس کی آنکھوں سے اس قدر نزلہ بہا کہ گھوڑا اندھا ہوگیا۔ اُس کی آنکھوں کے دیدے بہہ گئے۔ اُس کی پلکیں جھڑ گئیں، اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا۔ اُس زمانے میں آنکھوں کے ڈاکٹر تو تھے نہیں جو کسی دوسرے گھوڑے یا انسان کی آنکھیں اُس کے لگا دیتے، جیسا کہ آج کل امریکہ میں آپریشن چلا ہے جس میں دوسرے کی آنکھ کی پتلی نکال کر ڈاکٹر لوگ اندھوں کے لگا دیتے ہیں، اور اُن کی آنکھوں میں روشنی آجاتی ہے۔ اندھے ہونے پر گھوڑے نے دانا اور گھاس چھوڑ دی۔ وہ دُبلا ہوتا چلا گیا۔ اُس نے ہنہنانا بھی بند کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ مرگیا۔ بادشاہ کو گھوڑے کے مرنے کا بڑا صدمہ ہوا۔ اُس کے مرنے کے بعد سے بادشاہ ہر وقت نڈھال نڈھال رہنے لگا۔

بادشاہ کے درباریوں نے جب بادشاہ کا یہ حال دیکھا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ اُنھوں نے بادشاہ کا غم دُور کرنے کے لئے ویسے ہی گھوڑے کی تلاش شروع کر دی۔ دوسری طرف بادشاہ نے اعلان کیا کہ اگر سلطنت کا کوئی شخص مرحوم گھوڑے کی طرح کا گھوڑا لاوے گا یا صرف اُس گھوڑے جیسے گھوڑے کا پتہ ہی بتا دے گا بادشاہ اُس کو پانچ ہزار سونے کی اشرفیاں نقد انعام دے گا۔ درباریوں نے یہ سن کر اور زیادہ دوڑ دُھوپ شروع کر دی۔

آخر ایک دن بادشاہ کے درباریوں میں سے ایک رباہی نے آکر بادشاہ سے عرض کی کہ ظلِ اللہ! مبارک ہو، بالکل مرحوم گھوڑے جیسا گھوڑا مِل گیا، اور میں اُسے ابھی دیکھے چلا آرہا ہوں۔

گھوڑا بہت کچھ رنگ رُوپ اور صورت شکل میں بالکل مرے ہوئے گھوڑے جیسا ہے۔ اس پر بادشاہ نے درباری سے جرح شروع کی۔

بادشاہ۔ (درباری سے) ہاں تو وہ گھوڑا کس وضع قطع کا ہے؟

درباری۔ ظلِ اللہ۔ بڑے اشراف والدین کا بیٹا ہے۔ حضور کی جان و مال کی سلامتی رہے۔ مرحوم گھوڑے کا بالکل ہم شکل ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے حضور کا مرحوم گھوڑا پھر سے پیدا ہو گیا ہے۔

بادشاہ۔ (خوش ہو کر) اور چلنے میں کیسا ہے؟

درباری۔ صبا رفتار۔ اگر ہوا بھی اُس کا پیچھا کرے تو اُس کی گرد کو نہ پہنچے۔

بادشاہ۔ شاباش۔ اور اُس کے ہاتھ پیر اور جسمانی ساخت کیسی ہے؟

درباری۔ ہاتھ پاؤں میں رستم اور سہراب اُس کے سامنے مات ——— یہ بڑا کلا ——— اِتنے بڑے بڑے نتھنے ——— یہ سر۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں۔ پیٹھ اتنی چوڑی کہ اچھا بھلا تخت بچھا لیجیے ——— دُلکی، پویا، سرپٹ میں کیا کوئی گھوڑا اُس کے مقابلے کی تاب لائے گا۔ اب تک جتنے گھوڑے اُس کے مقابلے میں آئے خون تھوک کر واپس گئے۔ ہزاروں گھوڑوں کو تیز رفتاری میں نیچا دکھا چکا ہے، اور کتنوں کو اب بھی ہرانے پر آمادہ ہے۔ ہنہنا ہنہنا کر اب بھی دعوتِ مقابلہ دے سکتا ہے۔

بادشاہ۔ وہ کس ملک کا ہے؟

درباری۔ سرکار! خاص النّاس عربی النسل نجیب الطرفین، رنگ رُوپ میں مخمل جیسی کھال، ٹاپیں ایسی چوڑی کہ اگر ہاتھی پر بھرپور پڑ جائیں تو ہاتھی جان نکال دے۔ ہنہناہٹ میں وہ گرج تڑپ کہ بادل اُس کے سامنے پانی بھریں۔ رانیں اتنی موٹی اور سڈول کہ بڑے سے بڑا پہلوان رشک کرے۔ دانت ایسے گویا منہ میں موتی جڑے ہوئے۔ گردن کے بال ایسے کہ ایک ایک بال سے دشمن کے جگر کے ٹکڑوں سر قلم ہوں۔

بادشاہ۔ (خوش ہو کر) اچھا! دیکھو تم نے اُس کی جو کچھ تعریف کی ہے اُس میں ذرّہ برابر فرق نہ ہونا چاہیئے۔ خوب سوچ سمجھ لو، ورنہ پھر تمھاری خیر نہیں۔

درباری۔ حضور، چاند میں داغ نکل سکتے ہیں، مگر گھوڑے کو حضور بالکل بے داغ پائیں گے۔

بادشاہ۔ پھر سوچ لو۔ اگر گھوڑے میں کوئی خرابی نکلی تو اُس کا خمیازہ تمھیں کو بھگتنا ہوگا۔

درباری۔ اللہ کی ذات سے مجھے پُوری اُمید ہے کہ حضور کے حسبِ منشا ہوگا۔

بادشاہ۔ ایک بار پھر سوچ سمجھ لو کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ ایک بادشاہ کے روبرو کہہ رہے ہو۔ اگر اس میں بال برابر بھی فرق ہوا تو اس کی سزا سزائے موت ہوگی۔

درباری۔ ظلِ اللہ! یوں بے عیب ذات تو خدا کی ہے۔ بظاہر مجھے تو کوئی عیب یا بُرائی نظر نہیں آئی۔ اب چاہے حضور اِسے عیب کہہ لیں یا تھوڑی بہت خرابی ——— گھوڑا موٹا ہے، عربی نسل کا ہے۔ صبا رفتار اور خوبصورت ہے، البتہ ذرا مرا ہوا ہے۔

یہ سُن کر بادشاہ اور درباری بہت ہنسے، اور بادشاہ نے اُس کی بے وقوفی پر اُس کو معاف کر دیا۔

ن۔ ن۔ بجمی

گڑیاں گڈے

آؤ بچو! آج سنائیں تم کو ایک کہانی — کتنی سندر رات بنی ہے چندا کی مہارانی نے مہارانی
اک دوجے کی جان تھے نینا اور ونیو دو بچے — دونوں پریم کے پتلے بچو، من کے دونوں سچے
اک دوجے کا مان ہمیشہ دل سے کرتے آئے — ایسے رہتے جیسے ہوں وہ ایک ہی ماں کے جائے
صبح سویرے ونیو اُٹھ کر نینا کے گھر آتا — اُسے دیکھ کر نینا کا ننھا سا من کھِل جاتا
دونوں یہ معصوم فرشتے اک سنسار بناتے — گڑیاں گڈے نکال کے اپنے، اپنا کھیل رچاتے
گھاس پھوس کی ایک عمارت یہ معمار بناتے — بھانت بھانت کے تنکوں سے پھر اُس کو خوب سجاتے
دیکھو ونیو میری گڑیا کتنی بی بی رانی — سارے جگ کی گڑیوں سے یہ گڑیا بڑی سیانی
کہہ تو ونیو تیرے گڈے کا ہار بنا کے لاؤں — باندھ بوندھ کے سہرا اس کو دولھا خوب بناؤں
اسی طرح وہ خوش ہو ہو کر اپنا سماں بتاتے — دن میں سو سو بار گڈے کو دولھا روز بناتے
ایسا ہوتا اکثر جب ونیو کی ممی آتی — مار مار کے نینا کی وہ دُرگت خوب بناتی
توڑ تاڑ کے غصے میں سب اُن کا تانا بانا — کہتی ونیو اِس ڈائن کے گھر اب پھر تم جانا
ہڈی پسلی توڑ کے پہلے تیری جان نکالوں — اِس کمبخت سے ٹھہر ذرا میں تجھ کو کھیل کھلا لوں
ایسے ہی پھر نینا کو وہ جھاڑ جھپٹ گنواتی — سو سو بے سُر کی صلواتیں اُسے سناتی جاتی
دھکے دے کر کہتی اُس کو دور ہو رانڈ کی جائی — میرے گھر میں "سو مونگنی" تو کیا لینے آئی
روتی دھوتی نینا جا کے ماں کو حال سناتی — ماں بیٹی کو گلے لگا کر خشک آنسو برساتی
تھپک تھپک کے پیار سے اپنی نینا کو سمجھاتی — دھن والوں کی آنکھ میں بٹیا، دُنیا نہیں سماتی
مت جایا کر ونیو کے گھر اُس کا کھیل ہٹانے — دھن والوں کے دل ہیں پتھر تو کیا بیٹی جانے
بچوں میں یہ بھید بھاؤ نا کہو تو کیسے آئے — ایک ساتھ جو کھیلیں کودیں کیسے بنیں پرائے؟







ننیا وینو دونوں بچے پھر بھی آتے جاتے
گڑیاں گڈے نکال کے اپنے بت وہ کھیل رچاتے

دیکھو ننیا میں نے اب کے گڈے کا ہار بنایا
موتی، لعل، جواہر، ہیروں سے ہے خوب سجایا

تو چاہے تو گڑیا سے میں شادی اس کی کر دوں
دنیا بھر کی دولت سے میں اس کا دامن بھر دوں

ننیا بولی پیارے وینو پہلے کرو سگائی
تم مجھ کو، میں تجھ کو، دوں گی دل سے آج دوھائی



نینا آؤ ہم بھی اپنی آج سگائی کر لیں
اک دوجے کو سچ مچ ہم بھی آج ہی دونوں بر لیں

پیارے وینو ماں کہتی ہے تم دھنوان بڑے ہو
جگ والوں کی نظروں میں بھی تم انسان بڑے ہو

نردھن کا اس جگ میں وینو، کوئی مان نہیں ہے
نردھن تو اک ڈھانچہ ہے جس میں جان نہیں ہے

ہم نردھن ہیں اپنی گڑیا کیسے تم کو لا دیں
جگ والوں کی نظروں میں ہم کیسے دھول اڑا دیں

دھن والوں کو میں کیا سمجھوں نینا مری پیاری
گڑیا کی شادی کی جا کر جلد کرو تیاری

میں بھی جا کے کچھ نہ کچھ پربندھ کروں گا رانی
ٹھیک تو ہے اس کاج کو نینا آج کی رات سہانی



اب میں جا کے سب سجنوں کو آج یہ دعوت دوں گا
باجے گاجے، بینڈ، تماشے کا پربندھ کروں گا

اتنے میں وینو کے ڈیڈی کی آواز جو آئی
وینو سہم گیا یہ سن کر نینا بھی گھبرائی

مارے ڈر کے دونوں بچے جان بچانے دوڑے
اپنے گہرے پیار کی دونوں آن بچانے دوڑے

قسمت نے رستے میں لیکن ان کو آن دبوچا
ظالم ڈیڈی نے پھر دل میں جانے کیا کیا سوچا

مکے، ٹھڈے، گھونسے، تھپڑ یوں ان پر برسائے
جیسے جگ جگ کے ہوں بیری آج ہی قابو آئے

سن کر ایسا شور شرابا جنا کھنا سب آیا
کسی نے جا کر نینا کی بی بی کو حال سنایا



دوڑی دوڑی آئی دکھیا رک رک کر پھر بولی
ہے بھگوان مری بٹیا کی کیسی درگت ہو لی

دیکھ کے اپنی ماں کو نینا چمٹ گئی تھرا کے
کسی نے بھی اس بدقسمت کی بات نہ پوچھی آ کے

آدھی رات کو نینا کے گھر ہوا ذرا سا کھٹکا
چونک اٹھی ننھی سی نینا دیا کسی نے جھٹکا

وینو چپکے چپکے بولا نینا جلدی آؤ
گڑیا اور گڈے کا آدھی رات میں بیاہ رچاؤ

ٹھیک رہے گی کاج کی خاطر آج کی رات سہانی
کتنی سندر رات بنی ہے چندا کی مہرانی

سوم ناتھ سادھو

پتھّر کی مُورتی

بھارت دیہات میں بسا ہوا ہے۔ اِن دیہات میں ایسے لاتعداد واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کا علم ہمیں تا قیامت نہیں لگ سکتا۔ نہ معلوم اِس واقعے کا علم لوگوں کو کیسے ہوا۔

کسی چھوٹے سے گاؤں میں ایک گوالا رہتا تھا۔ وہ جنگل میں روزانہ گائیں چرانے کے لیے جایا کرتا، اور راستے میں جو راہ پر بنی ہوئی پتھر کی ایک مورتی کے پاس دم لینے کے لئے بیٹھتا تھا، ایک دن پتھّر کی مورتی میں بولنے کی قوّت پیدا ہوگئی۔ مورتی نے گوالے سے کہا "مانگ کیا مانگتا ہے۔ میں تمھاری ہر خواہش پوری کروں گی۔" پہلے تو گوالے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن جب اُس نے اصرار کیا تو گوالے نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "مجھے جانوروں کی بولی سمجھ میں آنی چاہیئے۔" پتھّر کی مورتی نے حیران ہوکر پوچھا "دھن دولت کیوں نہیں مانگتے"؟ "نہیں مجھے اس کی ضرورت نہیں" گوالے نے کہا۔ تب پتھّر کی مورتی نے جانوروں کی بولی سمجھنے کا راز اُسے بتا دیا۔ ساتھ ہی اُسے تاکید کردی کہ اگر یہ راز کسی اور کو بتاؤ گے تو پتھّر بن جاؤ گے۔

جنگل میں گائیں چراتے ہوئے ایک دن گوالے نے سُنا کہ ایک گائے درخت کے نیچے کھڑی بچھڑے سے کہہ رہی ہے کہ یہاں زمین کے اندر کچھ برتن سونے چاندی اور روپوں سے بھرے ہوئے دفن ہیں۔ شام ہوئی تو گوالے نے اُس زمین کی کھدائی شروع کردی۔ زمین کے اندر سونا چاندی روپوں کے برتن دیکھ کر اُس کی باچھیں کھل گئیں۔



اس نے اوپر سے مٹّی ڈال کر ساری دولت کو وہیں چھپا دیا۔

شام کو جب وہ گھر واپس لوٹا تو گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیوی نے وجہ پوچھی۔ گوالے نے بتانے سے انکار کر دیا، لیکن عورت کب پیچھا چھوڑنے والی تھی۔ کافی دیر کے بعد گوالے نے کہا "آج ہماری ریاست کے مہاراجہ شکار کھیلنے کے لئے جنگل میں آئے تھے۔ شکار کھیلتے کھیلتے وہ بہت دُور چلے گئے۔ شام کے وقت میں نے ایک لاش کو دریا میں بہتے دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ لاش مہاراجہ کی ہے اور اُنھیں کسی نے قتل کر دیا ہے۔ چونکہ جنگل میں صرف میں اکیلا تھا۔ اس لئے میں نے تمھارے بغیر کسی سے نہیں کہا۔ نہیں تو پولس شک کی بنا پر مجھے گرفتار کرلے گی، اور میں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جاؤں گا۔

گوالے کی بیوی نے ساری کہانی غور سے سُنی اور بہت پریشان ہوئی۔ دوسرے دن صبح جب وہ کنوئیں پر پانی لینے کے لئے اپنی سہیلی کے ساتھ گئی تو اُس نے ساری کہانی اُسے سنا دی۔ اُس کی سہیلی نے یہ کہانی حرف بہ حرف گھر آکر اپنے خاوند کو سنا دی۔ اس کا خاوند راج محل کا خاص چوکیدار تھا۔ اُس نے فوراً جا کر راجہ کو سارا قصّہ سُنا دیا۔ راجہ یہ من گھڑت افسانہ سُن کر آگ بگولا ہوگیا۔ گوالے

کو فوراً بلایا گیا اور سارا قصہ بیان کرنے کا حکم دے دیا۔ گوالے نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی "مہاراج مجھے یقین ہی تھا کہ میری بیوی زیادہ دیر راز کی بات چھپا کر نہ رکھ سکے گی۔ اس لئے میں نے اُسے راز کی بات نہ بتانے کی غرض سے من گھڑت واقعہ بتا دیا تھا۔ راجہ نے گوالے کو برسرِ اجلاس پھانسی کی سزا کا حکم دیا۔ جان بخشی کرانے کے لئے گوالے نے اُس خزانے کا پتہ بتا دیا جو جنگل میں زمین کے اندر چھپا رکھا تھا۔

راجہ نے گوالے سے پوچھا: "تم نے اس خزانے کا پتہ کیسے لگایا؟"

گوالے نے نہایت انکسار کے ساتھ عرض کی "مجھے اس سوال کا جواب دینے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اگر میں یہ راز بیان کروں گا تو میں پتھر بن جاؤں گا۔" لیکن راجہ کہاں ماننے والا تھا۔ مجبوراً گوالے کو ساری داستان بیان کرنا پڑی۔ جوں جوں وہ واقعہ بیان کرتا گیا، وہ پتھر بنتا گیا۔ جب وہ سینے تک پتھر بن گیا تو اُس نے مہاراجہ سے التجا کی اب مزید واقعہ سنانے کے لئے مجبور نہ کیا جائے تاکہ گردن سے اوپر کا حصہ پتھر نہ بن جائے۔ لیکن راجہ نہ مانا اور گوالا کہانی کے اختتام پر سارے کا سارا پتھر بن گیا۔



راجہ اُسی وقت ہاتھی گھوڑے لے کر جنگل کو چلا گیا، اور وہاں سے سونا چاندی نکال لایا۔

راج محل میں اس سارے قصے سے سنسنی پھیل گئی۔ مہارانی کے کان میں بھی بھنک پڑی۔ شام کو رانی نے راجہ سے سارا قصہ بیان کرنے کے لئے کہا۔ راجہ نے ٹال مٹول کرنے کی کوشش کی لیکن رانی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا، اور زہر کھانے کی دھمکیاں دیں۔ آخر راجہ نے تنگ آ کر کہا: "ایک آدمی کے گھر میں نیولا تھا۔ ایک دن سانپ نے اُس آدمی کے بچے کو کاٹ لیا۔ سانپ چونکہ زہریلا تھا، اس لئے بچہ فوراً مر گیا۔ نیولے نے سانپ کو مارا اور خود جنگل میں جنگلی بوٹی تلاش کرنے کے لئے دوڑا۔ باپ جب واپس لوٹا اور بیٹے کو مرا ہوا دیکھا تو وہ بہت رویا۔ اتنے میں نیولا جنگل سے واپس آ گیا۔ آدمی کو نیولے پر شک گذرا۔ اُس نے نیولے کو اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ نیولا مر گیا۔ اُس کے منہ سے جنگلی بوٹی زمین پر گر پڑی۔ لڑکے کے باپ نے جنگلی بوٹی کو دیکھتے ہی مرے ہوئے سانپ کو بھی دیکھا۔ اس آدمی نے فوراً جنگلی بوٹی مردہ بیٹے کے منہ میں رکھ دی اور وہ زندہ ہو گیا۔ لیکن نیولے کے مر جانے پر وہ بہت پچھتایا لیکن بے کار۔ ایسے ہی تم بھی پچھتاؤ گے، جب میں پتھر بن جاؤں گا۔"

لیکن رانی بڑی ضدی تھی وہ ایک نہ مانی، اور زہر کھانے کی پھر دھمکی دی۔ رانی کا دل بہلانے کے لئے راجہ اُسے راج محل کے باغیچے میں لے گیا۔

باغ کے عین وسط میں ایک خوبصورت چشمہ تھا۔ اس چشمے کے کنارے پر ایک بکری اور ایک بکرا باتیں کر رہے تھے۔ راجہ اُن کی باتیں غور سے سننے لگا۔ چشمے کا پانی گہرا تھا۔ اس میں گھاس اُگ آئی تھی۔ بکری چشمے کا گھاس چرنا چاہتی تھی۔ لیکن گہرائی کی وجہ سے اُس میں ڈوب جانے کا خطرہ تھا۔ بکری نے اپنے خاوند (بکرے) کو چشمے سے گھاس نکالنے کے لئے کہا۔ بکرے نے ناراض ہو کر کہا "خود کیوں نہیں نکالتی ہو؟" "اس میں ڈوب جانے کا خطرہ ہے"۔ بکری نے جواب دیا۔ بکرا اپنی بیوی بکری کی عیاری سمجھ گیا: "اگر میں مر وں گا تو تم دوسری شادی کرو گی۔ لیکن میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں" بکرے نے ناراض ہو کر کہا۔ —— جب راجہ نے بکری اور بکرے کی ساری گفتگو سنی تو اُس نے رانی سے کہا: "اگر تم ایک چھوڑ ہزار بار بھی زہر کھاؤ گی میں کبھی تمہیں یہ راز نہیں بتاؤں گا۔ اور اگر تم نے مزید تنگ کرنا شروع کیا تو میں دوسری شادی کر لوں گا۔ یہ کہہ کر راجہ محل میں چلا گیا، اور رانی اس کے پیچھے چلی گئی۔ آج تک رانی نے راجہ کو وہ کہانی سنانے کے لئے مجبور نہیں کیا۔

یوگ راج تھانی

دوستی کا رُوپ

کسی شہر میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ اُس کے بہت سے دوست تھے، اور اُسے اُن پر بہت فخر تھا۔ لڑکے کا نام گیان تھا۔ گیان کے والد نے اُسے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی کہ زیادہ دوست اچھے نہیں رہتے اور زیادہ دوست بنانے میں کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن گیان نے اپنے والد کی نصیحت پر قطعاً دھیان نہ دیا، اور اِس کا جواب اُس نے یہ دیا کہ میرے بہت سے دوست ہیں جو میری تمام مشکلات کو حل کر سکتے ہیں۔

ایک دن اُس کے والد نے گیان کو سمجھانے کے لئے ایک ترکیب نکالی۔ اُنھوں نے گیان سے کہا۔ بیٹا! مجھے پانچ سو روپوں کی ضرورت ہے۔ اگر کہیں سے ہو سکے تو پانچ سو روپوں کا انتظام کر دو!" یہ تمام روپے میں ایک مہینے میں واپس کر دوں گا۔"

گیان نے ہنس کر جواب دیا۔" اباجان! یہ بھی کوئی کام ہے؟ آپ کوئی مشکل کام بتلایئے۔ پانچ سو روپے تو میں آدھ گھنٹے میں حاضر کر سکتا ہوں۔ اتنا کہہ کر وہ ایک دوست کے ہاں گیا اور اُس سے کہنے لگا" مجھے پانچ سو روپوں کی ضرورت ہے، کہیں سے انتظام کر دیں تو میں آپ کا شکر گذار ہوں گا!" اُس کے دوست نے کہا" اگر آپ تھوڑی دیر پہلے آتے تو میں آپ کو ایک ہزار روپے دے دیتا۔ ابھی ابھی میرا ایک رشتہ دار آیا تھا میں نے اُسے دے دیئے ہیں۔ اِس وقت تو گھر میں ایک پائی بھی نہیں۔"

یہاں سے ناکام ہو کر وہ دوسرے دوست کے پاس گیا، اور اُس سے بھی یہی سوال دُہرایا۔ اُس نے بھی کہا کہ" ہمارے گھر میں تو اس وقت روپے ختم ہو چکے ہیں۔ پھر کبھی آنے کی زحمت کیجئے۔"

ایک ایک کر کے گیان اپنے تمام دوستوں کے پاس گیا، اور سب نے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اُسے ٹال دیا۔ سارا دن گھومتے گھومتے اُسے رات ہو گئی، اور وہ مغموم صورت بنائے خالی ہاتھ گھر کی جانب لوٹا۔ اُس کے والد اُس کے انتظار میں تھے۔ اُنھیں دیکھتے ہی کہنے لگا:

" والدِ محترم! معاف کیجئے۔ میں روپوں کا انتظام کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔" اُس کے والد صاحب نے کہا، میرا بھی ایک دوست ہے، چلو اُس کے یہاں بھی جا کر دیکھ لیں۔ ممکن ہے کام بن جائے۔ اِس وقت باپ اپنے بیٹے گیان کو ساتھ لے کر اپنے ایک دوست شیام کے یہاں پہنچا۔ اُس وقت رات کے دس بجے تھے۔ دروازے کو دستک دی۔ تھوڑی ہی دیر میں باپ اور بیٹا دونوں کیا دیکھتے ہیں کہ شیام ایک ہاتھ میں گٹھڑی اور دوسرے میں تلوار لئے گھر سے باہر نکلا۔ پیچھے اُن کی بیوی ہاتھ میں تھالی لئے چلی آ رہی تھی۔ شیام نے آتے ہی کہا۔ دوست! اِس وقت اتنی رات گئے یہاں تشریف لانے کا سبب؟ اگر آپ کو کسی نے تنگ کیا ہو، یا کسی سے لڑائی ہو گئی ہے تو یہ میری تلوار حاضر ہے۔ میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں، اور اپنی قربانی دے کر بھی تمھاری حفاظت کروں گا۔ اگر تمھیں روپوں کی ضرورت ہو تو یہ رہا میرے گھر کا سارا اثاثہ۔ اس کے علاوہ میرے پاس اور کچھ نہیں۔ جو میں دوست کے قدموں پر نچھاور کر سکوں۔ اگر تم پر خدا نخواستہ کوئی مصیبت نہیں آ پڑی یا تمھیں روپوں کی ضرورت نہیں تو ٹھہریئے۔ میری دھرم پتنی تمھیں تلک لگائے گی۔ کیوں کہ تم بہت دنوں کے بعد مجھ سے ملنے آئے ہو۔

اب باپ نے بیٹے سے کہا۔ بیٹا! دوست ایک ہی اچھا ہوتا ہے، اگر تمھارے دوست تمھیں ایک ایک روپیہ بھی دیتے تو تم پانچ سو روپے اکٹھے کر سکتے تھے۔ لیکن تمھارے پانچ سو دوستوں نے جو کام نہیں کیا وہ میرے ایک ہی دوست نے کر دکھایا۔

اس واقعے کو دیکھ کر گیان بہت شرمندہ ہوا، اور اُس نے اپنے باپ سے معافی مانگی۔

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۳ —— نمبر ۱۲

سالانہ چندہ:—— ہندوستان میں:- چھ روپے | پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)،

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ —— ہندوستان میں:- آٹھ آنے | پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

جولائی ۱۹۵۵ء

ترتیب

بچوں کا آج کل

سرورق:- سوشیل سرکار کی ایک تخلیق

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

جوش ملیح آبادی

خورشیدِ فکر

کیا سر پہ رہے فکر کا خورشید مبیں اور
کچھ اور چڑھے دھوپ کہ ڈھل جائے؛ نہیں اور

تشکیک کے منبر سے یہ آواز سنا دو
تبلیغ نہ فرمائیں اب اربابِ یقیں اور

ادیانِ کہن سال کو شاید نہیں معلوم
تمدن کی منزل میں ہے اک مصحفِ دیں اور

وہ رشتۂ تصدیق تھا، یہ گیسوئے تحقیق
وہ جبل متیں اور تھا، یہ جبلِ متیں اور

وہ کشتۂ الہام، یہ غارتگرِ الہام
مفتی کی "چناں" اور، محقق کی "چنیں" اور

یہ رعشۂ ادراک، وہ تمکینِ تفکر
مجذوب کی "ہاں" اور مفکر کی "نہیں" اور

ہاں نقشِ سلیماں کی ضرورت نہیں باقی
درکار ہے اب خاتمِ عالم کو نگیں اور

جا، اور کسی وادیٔ نادیدہ میں کھو جا
اس دور کا پیغام ہے جبریلِ امیں اور

جتنا بھی جھلستا ہے سرِ وادیٔ تحقیق
ہوتا ہے خرد مند کا اندیشہ حسیں اور

زہّاد کی قسمت میں نہیں خاطرِ مسرور
ہوتے ہیں مسرت سے یہ بدبخت حزیں اور

بے طرح دلِ عرشِ بریں کانپ رہا ہے
اک کروٹ اسی ناز سے اے فرشِ مبیں اور

ہاں اب بھی ہم آہنگ نہیں ہستی و مستی
اک عشوۂ ترکانہ مرے زہرہ جبیں اور

ہاں سرحدِ ادراک کے جھلکے وہ منارے
پر نہیں ابھی اے تند عناں برسرِ زیں اور

جھکنے ہی پہ ہے گردنِ گردونِ سرافراز
ہاں جذبِ دروں اے کششِ سطحِ زمیں اور

جتنیاں ہیں نہاں خانۂ اسرار کے پردے
اک نعرۂ مستانہ خرابات نشیں اور

ناقابلِ برداشت ہے یہ خواب کی دنیا
لے چل مجھے اے دیدۂ بیدار کہیں اور

یہ ساجدِ ذرّات، وہ مسجودِ کواکب
مومن کی جبیں اور، مفکر کی جبیں اور

جس درجہ بھی الفاظ سے جاتی ہے نظر دور
ہوتا ہے دلِ جوش معانی سے قریں اور

صالحہ عابد حسین

وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

غالب پر اب تک اتنا لکھا جا چکا ہے اگر سب کو جمع کیا جائے تو خاصی ایک چھوٹی موٹی لائبریری بن جائے۔ لیکن حالی جو کچھ اُن کے کلام پر لکھ گئے اُس سے آگے بہت کم کوئی جا سکا ہے۔ اُن کی شخصیت کی دلکشی، اُن کے کلام کا حُسن و ندرت، اور معانی کی گہرائی و باریکی جس طرح حالی نے دکھائی وہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں۔ حالی نے اپنے مرثیہ میں غالب کی ذاتی صفات اور حُسنِ کلام کو بھی بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے ؎

لاکھ مضمون اس کا ایک ٹھٹھول — سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا — قلم اُس کا تھا اور دُوس کی دوات
تہنیت اک نشاط کی تصویر — تعزیت اک ملال کی صورت
اس کی توجیہہ سے بدلتی تھی — شکلِ امکاں محال کی صورت
اُس کی تاویل سے پلٹتی تھی — رنگِ ہجراں وصال کی صورت
ختم تھی اک زباں پہ شیرینی — ڈھونڈتے کیا ہو سیبِ رواں میں
حصر تھی اک بیاں پہ رنگینی — کیا دھرا ہے عقیق و مرجاں میں
لبِ جادو بیاں ہوا خاموش — گر شِ گل ملے پھر کیوں گلستاں میں

تو یہ محض برائے گفتن نہ تھا۔ حقیقت میں غالب کے کلام کے جس پہلو کو لیجئے وہ اپنا ایک جداگانہ رنگ اور نرالی دلکشی رکھتا ہے۔ عشق و محبت، تصوف و رندی، ہجر و وصال، طنز و ظرافت، بدگمانی و شکایت، خودداری و انکسار، ہر موضوع کو انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کر کے اُسے زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ زاہد، محتسب، شیخ، پیرِ مغاں، رقیب، قاصد، رازداں، پاسباں، محبوب وغیرہ وغیرہ سب کی ایسی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے کہ ادب میں اُن کی ایک مخصوص جگہ پیدا ہو گئی ہے۔

میں اس وقت صرف ایک موضوع میں رشک کو لے کر اس میں اُن کی خصوصیت دکھانا چاہتی ہوں۔

رشک کا موضوع ایسا ہے کہ ہر شاعر اس پر طبع آزمائی کرتا ہے۔ لیکن غالب کا رشک نہ صرف اپنے ہم عصر شاعروں بلکہ ساری اردو شاعری میں ایک ممتاز اور بلند درجہ رکھتا ہے۔ اس رشک میں ہمیں غالب کی سیرت کی جھلک بھی نظر آسکتی ہے اور ان کے کلام کی اہم خصوصیات بھی۔ اس میں ندرت ہے، بلند پروازی ہے، نازک خیالی ہے۔ ظرافت ہے طنز ہے عشق کی انتہا ہے۔ اور حُسن کا بلند ترین معیار ہے۔ انتہا درجے کا غلو ہے۔ اور ساتھ ہی سادگی و پُرکاری ہے، اور غالب کا ایک مخصوص کلنڈرا پن۔ اس میں ہم انسانی سیرت اور نفسیات کی باریکیاں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس رشک میں بھی ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ غالب انسان کو بہرحال انسان سمجھتے تھے، چاہے وہ رقیب ہی کیوں نہ ہو، اور اُس سے بھی اُنھیں ہمدردی پیدا ہو سکتی تھی۔ سب سے بڑی اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ غالب کے رشک میں ہمیں نفرت کا زہر، حسد کا پس نظر نہیں آتا۔

عشق اور رشک کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بغیر عشق کے رشک پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہی عشق اور رشک کا بیان عاشق کی سیرت اور عشق کی نوعیت کو ظاہر کرتا ہے۔ عاشقِ صادق اور ریاکار بوالہوس کے عشق میں جو فرق ہوتا ہے وہی اُن کے رشک میں بھی نظر آتا ہے۔ اس لئے غالب کے رشک کے ذکر میں اگر کہیں کہیں اُن کے عشق کا بیان بھی آجائے تو اُسے بے موقع نہیں سمجھنا چاہیئے۔

غالب کے رشک میں ابتذال اور بازاری پن نہیں ہے۔ وہ ایسی گھٹیا، اوچھی باتیں نہیں کہتے جو صاحبِ ذوق پر گراں گزریں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن کے سارے کلام میں عشق بہت بلندی پر نظر آتا ہے نہیں ان کے عشق اور رشک میں بھی ایک خصوصیت بہت معمولی درجے کے عشق و رقابت پر مشتمل ہے۔ اور اس کے نفسِ مضمون اور دوسرے عام شاعروں

میں کوئی خاص فرق نہیں، لیکن چونکہ انھیں خوب سے خوب تر کی تلاش تھی، اس لئے اُن کے عشق کے درجے بلند ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ حسنِ مطلق کے پجاری بن گئے۔

ان کے عشق اور رشک کو ہم تین درجوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ پہلا درجہ معمولی رواجی عشق کا ہے جس میں اُن کا محبوب عام سا جور و جفا پیشہ معشوق نظر آتا ہے۔ جو عاشق کو جلانے، رقیب کو اُبھارنے اور اپنے کو نمایاں کرنے کے سب گُروں میں ماہر ہے۔ یہاں عاشق بھی اُس کے وصال کا تمنائی، ہجر کا شاکی۔ اس کے جور و جفا سے پریشان اور رقیب سے نالاں نظر آتا ہے لیکن دوسرا درجہ اس سے بلند ہے۔ اب لاگ کم ہونے لگتا ہے اور محبوب کی جفا ہی محبت کی معراج نظر آتی ہے۔ اب رشک پیدا ہوتا ہے تو اس لئے کہ اس کے ظلم کا شکار صرف عاشق صادق ہی کو ہونا چاہیئے۔ تیسرا درجہ وہ ہے جہاں غالب کا عشق پوری بلندی پر نظر آتا ہے۔ اب شاعر حُسن کو محض حُسن کی خاطر چاہتا ہے۔ یہ حُسن حسنِ مطلق سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہاں آکر عشق پرستش بن گیا ہے اور اس کا رشک بھی اب دوسروں سے نہیں اپنے سے ہے۔ اس جگہ ہمیں شاعر کے دل میں محبوب کے احترام کا وہ جذبہ نظر آتا ہے جس سے یہ راز فاش ہونے لگتا ہے کہ وہ محبوب کے تقدّس کو اپنے دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ دراصل یہاں آکر اُن کے عشق کے ڈانڈے عشقِ حقیقی سے ملنے لگتے ہیں۔

پہلے درجے میں اگرچہ غالب کا عشق عام رواجی انداز کا ہے۔ مگر جیسا کہ ہم نے پہلے کہا اس میں بازاری پن نہیں ہے۔ لیکن محبت کی شدت رشک کی بے پناہی اور محبوب کے شکووں سے بھرا پڑا ہے۔ اُس وقت اُس کے عشق کا نظریہ ہے کہ ؎

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا خطاب　　کیا پوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں

اور محبت کی معراج یہ کہ ؎

نیند اس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

محبوب سے قربت نصیب نہ ہو تو اُس کا دلِ حسرت نصیب پکار اُٹھتا ہے ؎

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال　　کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

اور یہ سمجھتا ہے کہ اس منزل کے لئے ؎

شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیئے

اس درجے میں رشک کے مضمون کو انھوں نے سو سو طرح باندھا ہے اور ہر موقعے پر ایسا دل کش اور حسین انداز سے کہ پڑھنے والا جھوم جھوم جاتا ہے۔

عاشق کو اپنے محبوب سے انتہا درجے کی محبت ہے، اور جب محبت ہے تو بھلا رشک کیسے نہ ہوگا! اُسے یہ بھی گوارا نہیں کہ وہ اُس کے سوا کسی اور کی طرف نظر بھر کر بھی دیکھے ؎

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز　　میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

محبوب اگر غیر کی شکایت بھی کرے تو عاشق کو ناگوار ہوتا ہے ؎

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ　　ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

اُسے شکوہ ہے کہ بیمارِ عشق جو محبوب کے ظلم کا نشانہ بننے کا تمنائی ہو رقیب کی بیداد کا ہدف بنا ہوا ہے ؎

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے　　کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمار دوست

غالب کا رقیب بعض وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا پرانا دوست بھی ہے، شاید کبھی رازداں بھی تھا ؎

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

ہیں یہ بھی بڑے حضرت! یہ ہنس ہنس کر عاشق کو جلاتے اور ستاتے ہیں۔ نئے ڈھنگ سوچا کرتے ہیں، جو اپنا پُورا اثر دکھاتے ہیں۔

ذرا رقیب کے اس بیان میں غالب کا طرزِ ادا دیکھئے۔ کہیں بھی عداوت نفرت اور غصّے کا لگاؤ موجود نہیں۔ ہاں شکوہ ضرور ہے ؎

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اُس کے ہجر میں　　بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست
تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک　　مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست
چُپکے چُپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر　　ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

یہاں تک کہ عاشق، جو غیر کے احسان سے اتنا ہی بیزار ہے جتنا محبوب کی جفا کا تمنائی، گھبرا کر کہہ اُٹھتا ہے کہ خدایا ؎

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے　　یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

لیکن مشکل یہ ہے کہ محبوب آخر محبوب ہے۔ یہ بھی تو نہیں کہہ سکتے کہ ہر گز ذکر میرے سامنے نہ کرو ؎

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

مگر عاشق رشک سے عہدہ برآ ہو بھی کیسے سکتا ہے؛ قدم قدم پر تو اس کے سامان موجود ہیں ؂

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

غالب کا محبوب بھی اپنی ایک ممتاز شان رکھتا ہے۔ وہ روایتی محبوب کی طرح ظلم و جور میں وحشت و بربریت کے مظاہرے نہیں کرتا۔ کبھی کبھار قتل و قتل کی کوشش کرتا بھی ہے تو عاشق اس کا انداز ہی دیکھ کر گرفتہ ہو جاتا ہے۔ اُسے محبوب کو گھائل کرنے اور ستم توڑنے کے اس سے کہیں زیادہ لطیف اور کارگر نسخے معلوم ہیں۔ اُسے غالب نے خود ہی بہترین نام "ستم ظریف" دے دیا ہے جس میں اس کی سیرت کی ساری باتیں آگئی ہیں۔ وہ مسکرا کر، ہنس کر عاشق کی بات اُسی پر اُلٹ کر، اس کے طعنوں کو خوشی سے برداشت کر کے، اُسے اپنے ظلم کا شکار بناتا اور پھر اس کی بے بسی اور رقابت کو دیکھ کر لطف اُٹھاتا ہے ؂

غیر سے رات کیا بنی، یہ جو کہا تو دیکھئے سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

ایک اور موقعے پر ؂

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو محبوب کی یہی ستم ظریفی سب سے زیادہ پیاری ہے۔ تبھی تو وہ سب کچھ سہتا ہے دیکھتا ہے اور بیزار نہیں ہوتا۔ ترکِ تعلق نہیں کرتا ؂

جانا پڑا رقیب کے گھر پر ہزار بار اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

یہ بھی دیکھتا ہے رقیب موقع بے موقع محبوب کے ہاں براجمان رہتا ہے، جب کہ خود اُس کے حصے میں فراق کی لذت کے سوا اور کچھ نہیں لیکن وہ صرف یہ سمجھ کر دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے ؂

رہے ہے یوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہئے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کہئے

اور عاشق بیٹھا اس دعا پر اکتفا کرتا ہے ؂

رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ خدا کرے کہ یوں

محبوب سے کبھی ملاقات ہوئی، اور عاشق نے اُس سے شکوہ کیا کہ یہ کیا ستم ہے۔ غیر کی صحبت میں اب تمھیں اپنی رسوائی کا بھی خیال نہیں رہا، تو اُس نے ایسا دنداں شکن جواب دیا کہ اُنھیں سوائے طنز کے نشتر چلانے کے اور کچھ نہ بنا ؂

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی؟
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو؟

محبوب جب کبھی عاشق کو ناراض یا دل برداشتہ پاتا ہے تو جھٹ بہانہ بنا دیتا ہے کہ واہ اتنے ہی میں رو دئے۔ ہم تو تمھیں آزما رہے تھے۔ ذرا عاشق کا مجوبانہ انداز میں روٹھنا دیکھئے ؂

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو؟

کبھی محبوب کو سمجھانے کے انداز میں بتاتا ہے کہ چلو مان لیا کہ رقیب کو بھی تم سے لگاؤ ہے۔ مگر ہم تو تمھیں اپنی جان کے برابر چاہتے ہیں ؂

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

کبھی کبھی اپنے جذبۂ رشک کو محض ہجو سے تسکین دے لیتے ہیں۔ شاید با ذوق محبوب کو کنایتاً یہی سمجھانا مقصود ہے کہ یہ بدذوقی تیری شان کے خلاف ہے ؂

نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

اور رقیب ہی پر کیا منحصر ہے، اُنھیں رشک ہے کس سے نہیں! قاصد کے ساتھ محبوب کو پیام بھیجا، مگر دل نہیں مانتا ؂

گزرا اسدؔ مسرت پیغام یار سے قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

یہ گمان پیدا ہوا کہ محبوب قاصد پر ناراض ہو کر اُسے قتل کرنے والا ہے تو دُور ہی سے چلائے ؂

قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے اس کی خطا نہیں ہے، یہ میرا قصور تھا

اس شعر میں "اپنے ہاتھ سے" کا ٹکڑا قابلِ توجہ ہے۔ یہ قاصد کی جان بچانے کا جذبہ نہیں، بلکہ محبوب کے ہاتھ سے مارے جانے کی دولت خود حاصل کرنے کی سعی ہے۔ ساری پیش بندیوں کے باوجود پھر بھی قاصد ان کے محبوب کو، جو لاثانی حُسن کا مالک ہے، دل دے بیٹھتا ہے۔ کوئی اور عاشق ہوتا تو دل بھر کر ایسے قاصد کو کوستا، جو امانت میں خیانت

رتا اور پیام بر سے رقیب بن بیٹھا ہے۔ لیکن ہمارا شاعر اس کو بشریت کا تقاضا ور انسانی کمزوری سمجھ کر معاف کر بیٹھتا ہے۔ ساتھ ہی ایک چھپا ہوا تفاخر ہی موجود ہے کہ اس کے محبوب کی محبت سے بچ ہی کون سکتا ہے ؎

یا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے کیا کہیے　　ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے

انتہائی رشک کے باوجود اس کے دل میں رقیب سے دشمنی کے جذبات نہیں پیدا ہوتے ؎

ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا　　کہ مرے عدو کو یا رب ملے میری زندگانی

ذرا سی تلخی اس شعر میں ضرور ملتی ہے ؎

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا　　نالہ کرتا تھا و لے طالبِ تاثیر بھی تھا

لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تلخی ہے یا اندازِ بیان کی شوخی اور کھلنڈرا پن۔ رشک کی شدت میں بعض وقت عاشق عجیب عجیب حرکتیں کر جاتا ہے، ان شعروں میں غلو کے ساتھ ساتھ ظرافت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے ؎

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں　　ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

ایک اور شعر میں کہتے ہیں ؎

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر قتل، بعد دفن　　میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

بعض جگہ رشک کے مضمون میں بلند پروازی، نازک خیالی اور لطیف مبالغہ کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ کیا کیا نئے نئے نکتے سوجھے ہیں ؎

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو ہنوز　　دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پاؤں

ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کی ایک تار　　مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

محبوب کو زنار پہنے دیکھا تو اس سے رشک ہونے لگا ؎

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک　　آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے

اور یہاں تو کمال ہی کر دیا ہے ؎

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام　　رُخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

لیکن رشک کی انتہا اس وقت نظر آتی ہے جب غالب محبوب کے معاملے میں معبود پر بھی بھروسہ نہیں کرتے ؎

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالبؔ　　وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

لیکن غالب اسی عامِ عشق ہی پر بس نہیں کرتے۔ ہمیں اُن کے کلام میں ایک اور درجہ نظر آتا ہے جب اُن کا عشق زیادہ پاکیزہ، خواہشاتِ نفسانی سے پاک، لاگ اور لگاؤ سے برتر ہو گیا ہے۔ اب اُن کو یہ احساس پیدا ہو چکا ہے ؎

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو　　ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

یوں سمجھئے کہ بقول حالی اب ان پر یہ حقیقت روشن ہو رہی ہے ؎

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق!　　رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

عشق کے ساتھ رشک بھی اب بلند درجے پر نظر آتا ہے۔ محبت جسم سے روح کی طرف منتقل ہوتی جا رہی ہے۔ قرب و وصال کی خواہش ختم ہو چکی ہے اور روحانی اتصال کی تمنا پیدا ہو رہی ہے، اب وہ محبوب سے بھی یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے عشق کی پاکیزگی اور بلندی کو سمجھے۔ وہ اب اپنے کو مہر و وفا کا نہیں جور و ستم کا حق دار سمجھتا ہے اور اپنے اس حق میں کسی کو شریک دیکھنا نہیں چاہتا۔ اب اس کی زبان سے یہ نہیں نکلتا ؎

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن

بلکہ وہ یہ کہتے ہیں ؎

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب　　دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

محبوب کی بے رُخی اور بے وفائی بھی اس کے دل میں رنج و مایوسی پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ اب عاشق یہ نہیں کہتا ؎

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

بلکہ اب تو وہ اس مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں ترکِ وفا کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا ؎

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں　　نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

اور اس کا شعار یہ ہو چکا ہے ؎

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　بے نیازی تری عادت ہی سہی

کبھی کبھی دیدارِ دوست کی تمنا بہت بے قرار کرتی ہے تو دل کو سمجھاتا ہے ؎

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر　　کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

وہ رقیب سے اب بھی رشک کرتا ہے۔ مگر وہ رشک اس لئے نہیں کہ محبوب رقیب سے کیوں ملتا ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ عاشقِ صادق اور بوالہوس میں امتیاز کیوں نہیں کرتا؛ اس لئے کہ وہ حسن کا نظارہ کرنا صرف اہلِ نظر کا حق سمجھتا ہے ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

رقیب کی سمجھ میں عاشق کا یہ عشق نہیں آتا، اور وہ کسی نہ کسی بہانے اس پر طنز کرنے لگتا ہے۔ عاشق محبوب کے ہاتھ سے لگے زخم سلواتا ہے تو وہ اس پر چارہ جوئی کا طعن کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بچارا لذتِ زخمِ سوزن سے واقف ہی نہیں۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن   غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

لذتِ درد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے ؎

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں   کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

اسی لئے وہ محبوب کے ستم کا شائق اور تمنائی ہے، اور اس میں ذرا سی کمی اس کے لئے حسرت و درد کا موجب بن جاتی ہے ؎

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ   ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

دوسری جگہ اس کو اور بھی درد سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا کلیجہ تھام لیتا ہے ؎

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ   اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

محبت کے یہ زخم عاشق کو اس قدر بھائے ہیں کہ ان کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے ؎

عشرتِ پارہ دل، زخمِ تمنا کھانا   لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

جس درد کی دوا ہو سکے وہ عاشق اپنی شان کے مطابق نہیں سمجھتا ؎

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی   یا رب اسے لکھ دیجیو قسمت میں عدو کی

وہ اب عشق ہی کو عشق کا حاصل بھی سمجھتا ہے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا   درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

لیکن غالب اس منزل کو بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے، اور یہاں اس کا عشق تقدس اور پاکیزگی کی اونچی چوٹی پر نظر آنے لگتا ہے۔

وصال کی تمنا، لاگ اور لگاؤ، انانیت اور ملکیت کا احساس، ظلم و ستم کی خواہش، رقیب کی خلش سب مٹ چکی ہے۔ اب وہ حسن کو محض حسن کی خاطر چاہتا ہے۔ اس حسن میں اسے حسنِ مطلق کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا یہ محبوب اور اس کا نگاہ کو خیرہ کرنے والا حسن، مادی حسن نہیں بلکہ وہ صرف شاعر کے تخیل اور تصور میں جلوہ گر ہے۔ اب اگر اسے کسی ذات سے رشک ہے تو وہ خود اپنی ذات ہے ؎

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے   مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

محبوب کے حسن کی جھلک نظر بھی آ جائے اور اس پر نگاہ ڈال بھی لے تو اسے کڑھن پیدا ہوتی ہے کہ وہ اس کی تاب لایا کیسے۔ گویا اب اس کا نصب العین یہ ہے کہ اگر اسے حسن کا نظارہ نصیب ہو بھی جائے تو طور کی طرح اسے بھی جل کر خاک سیاہ ہو جانا چاہیئے تھا ؎

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر   جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

عشق نے اب صاف پرستش کا رنگ اختیار کر لیا ہے جس میں محبوب کے تقدس کا احساس بڑھ رہا ہے ؎

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن   وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

اب محبوب کی تمنا کرنا اسے گھٹیا سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اور آخر کار اس پر یہ راز عیاں ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں وہ اس حسنِ جہاں سوز کا نظارہ کر ہی نہیں سکتا ؎

ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں   کرے ہے ہر بنِ مو کام چشمِ بینا کا

لیکن ہر بنِ مو کے چشمِ بینا بن جانے پر بھی وہ جلوۂ حسن کی تاب نہیں لا سکتا۔ خود عاشق کی نظر پردہ بن کر حائل ہو جاتی ہے ؎

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن   غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

شاعر اب عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی منزل پر پہنچ چکا ہے۔ جہاں رشک احساسِ خودی سے وابستہ ہے۔ اور حسنِ مطلق کی پرستش خودی کو مٹا کر ہی ہوتی ہے۔ جہاں پہنچ کر شاعر کی معراج یہ ہے کہ ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

"آج کل" کا اگست ۱۹۵۵ء کا شمارہ "کشمیر نمبر" ہوگا

ڈاکٹر گیان چند

داستانوں کی تکنیک

ابھی انسانی تہذیب کا لڑکپن ہی تھا کہ فن داستان گوئی کا جنم ہو گیا مصر میں افسانوں کے جو قدیم ترین نمونے ملتے ہیں ان میں داستانوں کے عناصر موجود ہیں۔ مختلف زبانوں میں پانچ چھ ہزار سال تک داستانیں لکھی جاتی رہیں۔ مغرب میں انھیں رومانس کے نام سے پکارا گیا۔ عہدِ قدیم کا افسانوی ادب دو بڑے حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک جانوروں کی حکایات دوسرے رومان۔ رومان یا داستان میں انسان کو وہ سب کچھ مل جاتا تھا جو اسے اپنی بے رس زندگی میں نہ ملتا تھا۔ ان کا خمیر جنگ، عشق اور مذہب سے تیار ہوتا تھا۔

داستانوں کا فن شعوری نہ تھا۔ کوئی باقاعدہ اصول وضع نہ تھے۔ تنقید نے ان کی تراش خراش نہ کی تھی۔ پھر بھی ان کے مشاہدے سے اس میں کچھ ایسی خصوصیات نظر آتی ہیں جو انھیں ناول سے علیحدہ کرتی ہیں۔ چند یہ ہیں۔

مافوق الفطرت عناصر کا وجود۔ قصہ میں ارتقا کی بجائے محض طول دینا۔ بہت سی بے ترتیب مہمات۔ کردار نگاری میں مثالیت۔

داستانوں کے پلاٹ میں زیادہ تنوع نہیں ہوتا۔ تمام قصے کچھ ان خطوط پر چلتے ہیں۔ ہیرو کسی مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ راہ میں بہت سے حوادث کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے اور آخر کار کامراں ہوتا ہے۔ اس مقصد کی مختلف نوعیتیں ہو سکتی ہیں۔ سب سے زیادہ فرسودہ موضوع کسی دیدہ یا نادیدہ محبوب کی تلاش ہے جس کا غائبانہ تعارف کسی طوطے یا تصویر کی معرفت ہوتا ہے یا شاید اس کی پہلی جھلک خواب میں نظر آتی ہے بعض صورتوں میں محبوب کے ملنے پر داستان ختم کر دی جاتی ہے اور بعض میں یہ عارضی وصل بحرِ حوادث میں محض ایک جزیرہ ثابت ہوتا ہے اور ساحلِ عافیت تک پہنچنے کے لئے اور بہت سے تھپیڑوں طلاطم صد کام نہنگ کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ داستانوں کا دوسرا موضوع حمایتِ دین ہے۔ ہیرو محض صدق و ایمان کی خاطر باطل کی طاقتوں سے ٹکر لیتا ہے۔ اس خیر و شر کے جہاد میں ہیرو کی فتح ہوتی ہے جو خیر کا نمائندہ ہے۔ اس طرح داستانوں کا انجام ہمیشہ طربیہ ہوتا ہے۔ ہندوستانی ذہنیت کو ہمیشہ نشاطیہ انجام مرغوب رہا ہے۔ قدیم سنسکرت ڈرامے ہمیشہ طربیہ ہوتے تھے اس کے برخلاف یونان میں محض حزنیہ کو بلند آرٹ سمجھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری داستانیں ہنسی خوشی پر ختم ہوتی ہیں اور پھر فلک زدہ مصنف گڑگڑا کر دعا مانگتا ہے کہ الٰہی جس طرح ان سب کے دن پھرے ہم سب کے بھی دن پھریں۔ اردو کی مشہور داستانیں محض انھیں دو موضوعات تک محدود ہیں۔

خواجہ امان نے بوستانِ خیال کے دیباچے میں اچھی داستان کے لئے چند شرطیں ضروری قرار دی ہیں۔ ان میں سے پہلی تو یہ ہے۔ اول مطلب مطوّل و خوش نما جس کی تمہید و بندش میں توارد مضمون اور تکرار بیان نہ ہو۔ مدت دراز تک اختتام کے سامعین مشتاق رہیں۔ داستان گوئی کی اصطلاح میں اسے داستان روکنا کہتے ہیں۔ مشاق استاد کا کمال اس بات میں تھا کہ وہ کیسے نازک موقع پر کتنے دلچسپ طریقے سے قصے کے عمل میں ٹھہراؤ لے آتا ہے اور اس کے باوجود داستان گو کا طولانی بیان سننے والوں پر بارِ خاطر نہیں ہوتا۔ سننے والے انجام کا بے چینی سے انتظار کرتے۔ یہ فن زبانی داستانوں میں استعمال ہوتا تھا۔ تحریری داستانوں میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ لیکن موخر الذکر داستانوں کے واقعات کو بھی خواہ مخواہ طول دے کر انجام کو کچھ دیر کے لئے ٹالا جاتا ہے۔ اس سے مقصود کشش و پیچ پیدا کرنا ہے۔ آج کا افسانہ نگار قصّہ کو پھیلانا چاہتا ہے تو پلاٹ کو پیچیدہ کر دیتا ہے۔ پرانے فن کار اتحادِ عمل اور اتحادِ اثر کو قربان کرکے

ڈھیلا مخلوط پلاٹ تخلیق کرتے تھے۔ اس کے لئے ضمنی کہانیوں اور قصہ در قصہ سے کام لیا جاتا تھا۔ یہ ترکیب قدیم سنسکرت افسانوں کی دین ہے۔ ضمنی کہانی مکمل آزاد کہانی ہوتی ہے جو کسی کمزور رشتے کے سہارے اصل پلاٹ میں ٹانک دی جاتی ہے۔ قصہ در قصہ بنیادی پلاٹ کے ان فردعات کا نام ہے جو اصل قصہ سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ جن کا ہیرو مرکزی قصے ہی کا کوئی کردار ہوتا ہے۔

طول پیدا کرنے کی ایک اور غیر فن کارانہ ترکیب مہم کے بعد مہم اور حادثے کے بعد حادثے کا بیان ہے۔ قصے کے سب مسائل سلجھ جاتے ہیں۔ خاتمے کا نقطہ نظر آنے لگتا ہے کہ پھر کوئی زبردستی کا شاخسانہ نکال کر ایک اور مہم ایک اور مصیبت لا کھڑی کی جاتی ہے۔ طلسم کے بعد طلسم رَن کے بعد رَن۔ ایک جزو دوسرے جزو سے منطقی طور پر ماخوذ نہیں ہوتا بلکہ مصنف کی مطلق العنانی کی فریاد کرتا ہے۔

داستانوں کا ایک اور حربہ غیبی امداد اور اتفاقات کا سہارا ہے جو ہر آڑے وقت میں کام آتا ہے۔ فنی نقطہ نظر سے یہ بڑا عیب ہے۔ اپنی اڑان کے زور میں داستان گو ہیرو کو سخت ترین مشکل میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن اس سے نکلنے کا حل اس کی فہم سے باہر ہے ایسے وقت میں کوئی خواجہ سبز پوش۔ کوئی گیسو دراز بزرگ غیب سے آجاتے ہیں اور مشکل کشائی کرتے ہیں۔ کچھ اسی نوع کی اتفاقات کی کارفرمائی ہے۔ باغ و بہار میں خواجہ سگ پرست کو سولی دی جانے کو ہے۔ اتفاق سے اسی وقت بادشاہ کے دردِ قولنج اٹھتا ہے۔ ہر طرف ہرکارے دوڑا دئے جاتے ہیں اور تمام مجرموں کو رہا کر دیا جاتا ہے۔ اسی طفیل میں خواجہ بھی آزاد ہو جاتا ہے۔ اس اتفاقی مدد سے نہ صرف یہ فائدہ ہوتا تھا کہ ہیرو اور خود مصنف ایک مشکل سے خلاصی پا کر باہر نکل پاتے تھے بلکہ سامعین کے ایمان کو بھی تقویت پہنچتی تھی۔

داستانوں کے اہم کردار طبقۂ بالا میں سے ہوتے ہیں۔ نچلے طبقے کے انھیں افراد کا ذکر آتا ہے جو امرا کے متوسلین اور لوازم کے طور پر ہوتے ہیں۔ قدیم اردو ادب اہل ثروت کی سرپرستی ہی میں پروردہ ہے۔ مطبع کی ایجاد سے پہلے قلمی کتابیں اہل زر ہی خرید سکتے تھے اور وہی ان کے مصنفوں کو نواز سکتے تھے۔ مصنف بھی وابستگانِ دربار میں سے ہوتے تھے۔ اردو کی تمام داستانیں شاہوں اور نوابوں کے لئے لکھی گئیں۔ ان داستانوں کا جو کچھ موضوع تھا ان کے ہیرو شہزادے ہی ہو سکتے تھے۔ عشق، جنگ، مہمات یہ عام زندگی کی چیزیں نہیں۔ عوام کو کاروبار دل میں مشغول دکھایا جاتا کہ فکرِ شکم میں اس کے لئے ان سرپھروں کی ضرورت تھی جو محبوب نادیدہ کی تلاش میں گھر بار چھوڑ کر نکل سکیں۔ داستانوں میں رنگینی پیدا کرنے کے لئے بادشاہوں کا بیان ہی موزوں تھا۔ ان کی حشمت نظروں کو خیرہ کرنے والی ہوتی تھی۔ جواہرات کے محل اور اطلس کے پردوں کا ذکر انھیں کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ رومان کا شغل بیشتر رؤسا کا مشغلہ ہے۔ مثالی حسن شہزادیوں میں بہ آسانی مل جاتا ہے۔ داستانوں میں اکثر پریوں کا ذکر ہوتا ہے۔ ان کا حریف ہونے کے لئے کم سے کم انسانوں کا شہزادہ تو چاہئے

قدما کے یہاں کردار نگاری فن کارانہ نہیں۔ کردار اکثر مثالی مکمل اور پختہ ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی ارتقا اور تبدیلی نہیں ہوتی۔ عام طور پر ان میں کوئی تیز اور گہرا رنگ بھرا ہوتا ہے۔ ایک داستان کے کرداروں کو دوسری داستان کے کرداروں سے شناخت نہیں کیا جا سکتا۔ عام طور سے دو طرح کے کردار ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن میں ساری خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔ دوسرے وہ جن میں محض عیب ہی عیب ہیں۔

داستانوں کے ہیرو کی ایک جھلک دیکھئے۔ یہ کچھ شرط سی ہے کہ اہم بالشان قصہ کے لئے کسی ذی مرتبہ ہستی کو انتخاب کیا جائے جس کا درجہ زیادہ سے زیادہ شاہ وجات تک اور ادنیٰ سے ادنیٰ کسی نواب یا وزیر تک پہنچتا ہو۔ ہیرو میں چند انتہائی صفات ہوتی ہیں۔ وہ حسن میں یوسف ثانی عشق میں مجنوں۔ شجاعت میں رستم اور عقل میں ارسطوئے زماں ہوتا ہے۔ وہ مذہب اور ایمان کا رکن رکین ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے حریف اکثر شیطان کافر اور خبیث ہوتے ہیں۔ داستانوں کی ہیروئین بھی چند مخصوص انتہائی خوبیوں کی مالک ہوتی ہیں۔ وہ بے پناہ حسن کے ساتھ ساتھ وفا کی پتلی بھی ہوتی ہیں۔ عاشق کے لئے یہاں تک ایثار کر سکتی ہیں کہ والدین کو چھوڑ کر اس کے ساتھ فرار ہو جاتی ہیں۔

یوں تو داستانوں میں گوناگوں جذبات کا بیان ہوتا ہے لیکن سب سے شدید جذبہ عشق ہے۔ قصے عشق کے بیان ہی کے لئے لکھے گئے ہیں۔ پورا قصہ نقطۂ عشق کی تفسیر ہوتا ہے۔ عشق کی کسوٹی پر ہیرو اور ہیروئین

کا کردار کہا جاتا ہے۔ عشق داستان کے بدن میں لہو کی جگہ ہے۔ تمام حادثے تمام مہم۔ تمام بلائیں تلاش محبوب ہی میں درپیش آتی ہیں۔ یہاں ہیرو کو اپنی شجاعت۔ ایثار۔ ثابت قدمی۔ راستی وغیرہ کی نمود کا موقع ملتا ہے۔ عشق کی ابتدا بھی ایک مخصوص طریقے پر ہوتی ہے۔ داستانوں میں ہمیشہ عشق بہ اوّل نظر کا بیان ہوتا ہے۔ محبوب کو دیکھ کر فریقین کو غش آنا لازمی ہے۔ جہاں ابتدا ہی عشق سے ہو وہاں آگے آگے کیا کچھ نہ آئے گا۔ بعض اوقات دیدار کی ضرورت بھی نہیں ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کیں دولت از گفتار خیزد

بقول شاعر۔ بہار دانش اور فسانہ عجائب کی طرح محض طوطے کی زبانی کسی حسین کا سراپا سن کر بھی عشق ہو سکتا ہے۔ کسی خانہ بدوش مصور کا شاہکار دیکھ کر بھی عشق ہو سکتا ہے اور خاص صورتوں میں ان واسطوں کی ضرورت بھی نہیں۔ دل کی بازی لگانے والے خواب میں کوئی صورت دیکھ کر بھی دیوانہ ہو جاتے ہیں۔

ہیرو کے سدِّ راہ جو حریف ہوتے ہیں۔ ان کے کردار میں بھی مثالیت ہوتی ہے۔ وہ بہت ذلیل۔ مکروہ لیکن طاقتور ہوتے ہیں۔ یہ اکثر بت پرست اور ساحر بھی ہوتے ہیں۔ دیو۔ بلا۔ اژدہے وغیرہ کی طرح نیم انسانی بھی ہو سکتے ہیں۔

داستانیں ادب برائے ادب کے اصول پر لکھی گئیں۔ ان کا اوّل مقصد تفریح تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ادب کی غایت کے بارے میں سارے نظریاتی مباحثہ کے بعد اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ افسانے کی اول غایت تفریح و دلچسپی ہے۔ اس معیار پر داستانیں موجودہ ناولوں سے کہیں زیادہ کامیاب تھیں۔ داستان وقت گزاری کا ایک مشغلہ تھی۔ یہ ایک خواب آور دوا تھی جو حضور کو رات کے وقت پیش کی جاتی۔ ظاہر ہے کہ ایسی تخلیق کسی اصلاحی مقصد کو پیش نظر نہیں رکھ سکتی تھی۔

داستانوں میں شعوری طور پر کسی افادیت کو مدِّ نظر نہ رکھا جاتا تھا لیکن پھر بھی ان کے فلسفے کو محض تفریح تک محدود کرنا تنگی نظر ہے۔ ان کی تاثیر کا ایک پہلو اخلاقی بھی ہے۔ ان کے مطالعے سے ہمارے اندر غیر شعوری طور پر انسانی ہمدردی کا جذبہ بھی بیدار ہوتا ہے۔ ہم خود کو ہیرو کی جماعت کا ایک فرد سمجھنے لگتے ہیں۔ تمام قصے میں اس کی اور اس کے ہوا خواہوں کی بہبود چاہتے ہیں اور اس کے حریفوں کا استیصال۔ دراصل ہیرو اور حریف محض علامات ہیں۔ ہم ان کے پردے میں خیر اور ایمان کی حمایت کرتے ہیں اور شر سے حقارت۔

انسانی ہمدردی کے علاوہ ان افسانوں میں ایثار کی بھی ترغیب ہے۔ قصوں کے ہیرو شہزادے ہوتے ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو تمام عمر عیش و نشاط میں کاٹ دیں لیکن وہ بیٹھے بٹھائے بلائیں مول لیتے ہیں۔ ان مصائب میں سے بہت سے دوسروں کے لئے اٹھائے جاتے ہیں مثلاً حاتم طائی یا داستانِ امیر حمزہ میں۔

داستانیں ایک بے عمل آرام طلب سوسائٹی کی پیداوار ہیں لیکن خود عمل اور زندگی سے بھرپور ہیں۔ ان میں ہر جگہ رفتار۔ تیز رفتار۔ تغیر اور انقلاب ہے۔ ٹھہراؤ کہیں نہیں۔ یہ ہیرو کی حمایت کے اس سفر کی سرگزشت ہیں جس کی ہر منزل ہفت خوان کی منزل ہے۔

داستانیں فضا پیدا کرنے میں بڑی کامیاب ہیں۔ ابتدا ہی سے گویا کوئی ملکہ بہار ایک گلدستہ سحر مار کر قاری کو نظر بند کر دیتی ہے۔ وہ اس دنیا سے نکل کر ایک خیالی مگر رنگین دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور یہ فضا ابتدائے افسانہ سے انتہا تک چھائی رہتی ہے۔ فضا پیدا کرنے میں شہروں اور آدمیوں کے نام بھی بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ شہروں اور ملکوں میں یا تو یمن، ختن، چین، ترکستان، مصر وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے یا حسن آباد۔ سراندیپ، زیرباد، سنگل دیپ۔ شرقستان۔ کوچک باختر جیسے رومانی نام ہیں۔ پہلی قسم کے شہروں کی وجہ یہ ہے کہ اردو ادب میں اسلامی ممالک کا ذکر عام ہے لیکن دوسری قسم کے نام ایک اور پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ داستان گویوں کو آغاز کے بعد ہی ایسے واقعات کا بیان کرنا ہوتا ہے جو غیر تاریخی اور خلاف عادت ہیں ان میں ایک فرضی بادشاہ کی جعلی تاریخ بیان کرنا ہوتی ہے۔ اس لئے کچھ فرضی رومانی نام انتخاب کرتے ہیں۔ اگر وہ کہیں کہ دلّی میں ایک بادشاہ تھا زین الملوک، اس کا لڑکا جب دلی سے نکل کر میرٹھ جا رہا تھا تو اسے راستے میں ایک دیو ملا تو یہ سب ہمیں نہایت واہیات معلوم ہوگا۔ لیکن جب وہ کہتے تھے کہ شرقستان میں ایک بادشاہ زین الملوک تھا تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اسی لئے داستان گویوں نے ان خطوں کو نظر انداز کر دیا جن کی تاریخ اور جغرافیہ سے ہم واقف ہیں۔

حقیقی شہروں یا انسانوں کے نام سے رومانی ماحول پیدا نہیں ہو سکتا لیکن ختن کہنے سے ہمیں خشک ختن یا آہوئے ختن والا شہر۔ بدخشاں کہنے سے لعل بدخشاں والا بدخشاں ذہن میں آجاتا ہے۔ اسی طرح اشخاص قصہ کا نام اگر شوکت علی یا شبیر حسین لکھ دیا جائے تو سارے قصے میں پھسپھاہٹ آجائے۔ لیکن تاج الملوک، جان عالم، بکاولی، مہر انگیز بہار، گلشن افروز وغیرہ کی بات ہی کچھ اور ہے

اس کے باوجود داستانوں کے ماحول کو پرستان یا باختر یا بخارا اختن تک محدود سمجھنا غلطی ہے۔ ان میں ہم عصر زندگی کے مرقعے بھی خوب ہیں۔ یہاں حیات کے بعض شعبوں کی تابدار تصاویر ملتی ہیں۔ ان میں اگر ایک قصے میں پرلیں کے ملک کا بیان ہے تو دوسرے اوراق میں اٹھارویں انیسویں صدی کے دلی و لکھنؤ کی شاہی معاشرت بھی ملتی ہے۔ داستان امیر حمزہ کا مثنوی ترجمہ تو لکھنؤ کی تہذیب کی ایک قاموس ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ امیر حمزہ سے شاعری اور عیاری نکال لیجئے۔ باقی جو رہے گا وہ لکھنؤ کی تہذیب ہے۔ شاہی ساز و سامان۔ آرائش، سواری، کھانے، لباس وغیرہ کا بیان وہی ہے جو محمد شاہ رنگیلے یا آصف الدولہ کے یہاں تھے شاہی رسوم۔ تواضع۔ کرداروں کی بول چال۔ طور طریق۔ تملق۔ جگت ہر چیز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس علاقے، کس عہد کا بیان ہے۔ ہر شے کی تفصیلات اور اصطلاحیں اس حد تک ہیں کہ محض ان کی ایک لغت تیار ہو سکتی ہے جن میں سے بعض کا سمجھنے والا بھی آج کوئی نہیں۔ داستانوں کے نام اور ان کے لیکن ماحول ہم عصر سوسائٹی کے طبقۂ بالا ہی کا ہے۔

اگر زبان اور اسلوب بیان کے لحاظ سے دیکھا جائے تو دو دھارے راستے ہیں۔ ایک سادہ با محاورہ اسلوب ہے۔ دوسرا رنگین مسجع مقرس و معرب۔ پہلے طرز کی نمائندہ مثال باغ و بہار ہے دوسرے کی فسانۂ عجائب۔ کچھ داستانیں ایک رنگ میں ہیں کچھ دوسرے میں۔ بعض میں دونوں دھاروں کی آمیزش ہے۔ رنگینی ہر داستان میں ہوتی ہے۔ داستان اور رنگینی مترادف ہیں۔ خوبصورت الفاظ کا طلسم۔ محاورں کی شعبدہ بازی۔ برجستہ و چست فقرے۔ تشبیہ و استعارہ کی دل کش تبلیوں کا تار و پود ان سب عناصر سے داستان کے ڈھانچے کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ تمام داستانوں کا اسلوب بغایت دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے۔ اس میں ادبیت ضرور ہوتی ہے۔ داستانوں نے ہمیں انشا پردازانہ نثر کا بہت بڑا ذخیرہ دیا۔

عصر حاضر کا نثار ایسے الفاظ کا استعمال کرتا ہے کہ ایک فقرے میں جہان معنی پوشیدہ ہو جائے لیکن قدیم انشا میں الفاظ کی افراط ہوتی ہے۔ وہاں ایک تشبیہ کے بعد دوسری تشبیہ۔ ایک استعارے کے بعد دوسرا استعارہ۔ ایک فقرے کے بعد دوسرا فقرہ درج کیا جاتا ہے بات بات پر شعر کا استعمال عام تھا۔ داستان گویوں کی نثر بھی ایک قسم کی شعر ہوتی تھی۔ ان کے طوطے بھی ایسی مقفّی و با محاورہ زبان میں وعظ کرتے تھے کہ آج پڑھے لکھے حیوانِ ناطق بھی ایسے رنگین جملے نہیں بول سکتے۔ قدما اپنے اسلوب پر خواہ وہ مصنوعی ہی کیوں نہ ہو پوری طرح قدرت رکھتے تھے۔ قدما کے پاس فرصت تھی اس لئے انھوں نے ہر جگہ طول۔ رنگینی۔ لمبے لمبے بیانات۔ پیچیدہ تشبیہ و استعارات سے کام لیا۔ وہ موجودہ دور کے مصنفوں کی طرح عجلت میں کچھ کام نہ کرتے تھے اسی لئے ان کے یہاں کسی طرح کی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس خزینے میں جو جنس ہے وہ بھرپور اور خاطر خواہ ہے۔

اجتماعی ترقی کا پروگرام

دو سال کی غیر حاضری کے بعد مجھے بھارت واپس آنے کا موقعہ ملا، اور میرے لئے یہ واپسی اشتیاق اور قیمتی تجربے کا پہلو لئے ہوئے تھی۔ ۱۹۵۲ء کے آغاز میں جو اسکیمیں محض کاغذات پر ہی وجود رکھتی تھیں انھیں اب سنجیدگی سے عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ کثیر المقاصد بند تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ اور کھیتی باڑی کے بہتر طریقوں کے ذریعے اناج کی پیداوار میں اضافہ کیا جا رہا ہے صنعت روبہ ترقی ہے۔ اس ہمہ گیر ترقی کا سب سے زیادہ اطمینان بخش پہلو دیہات کی ترقی سے متعلق ہے۔ اجتماعی ترقی کے منصوبوں کی تنظیم کے کارکنوں کی اہلیت سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ جو دیہی کارکن دو سال پیشتر تربیت حاصل کر رہے تھے، وہ اب بھارت کے دیہات کو جہالت، بیماری اور ضروریات زندگی کی قلت سے نجات دلانے کی جد و جہد میں نمایاں حصّہ لے رہے ہیں۔ (چیسٹر باؤلز)

گوپی ناتھ امن

دِلّی اسٹیٹ کے تین سال

جب ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا تو صوبۂ دہلی کی کوئی الگ وزارت نہ تھی بلکہ مرکز کے نمایندے کی حیثیت سے چیف کمشنر کے ہاتھ میں یہاں کے انتظام کی باگ ڈور تھی جب ۱۹۵۰ء میں آزاد ملک کا نیا آئین بنا تب بھی یہی صُورت تھی آخر ایک مدّت کی کشمکش کے بعد ۱۹۵۱ء میں یہ فیصلہ ہوا کہ دِلّی وزارتی صوبہ بنے اور اس کی حیثیت سی کلاس کی ہو یوں تو اس کوشش میں بہت لوگ لگے تھے لیکن سب سے زیادہ انہماک مرکزی ایوان میں اور اس کے باہر لالہ دیش بندھو گپتا کا تھا۔ افسوس کہ جب جنوری ۱۹۵۲ء میں اس نوساختہ صوبائی اسمبلی کے انتخابات ہوئے، اس سے دو مہینے قبل ایک ہوائی حادثہ میں لالہ جی رحلت فرما چکے تھے۔ جنوری ۱۹۵۲ء میں انتخابات ہوئے اور مارچ ۱۹۵۲ء میں نئی وزارت بن گئی۔ جو وزارتی ردّ و بدل ہوتے رہے ان سے غرض نہیں دیکھنا یہ ہے۔ کہ اس تین سال کی مدّت میں اس وزارت کے دَور میں کیا کام ہوا۔

ظاہر ہے کہ تین سال کی مُدّت وزارتی کام کا جائزہ لینے کے لئے بہت کافی نہیں ہے لیکن ایک سرسری جائزہ تو لیا ہی جا سکتا ہے۔ یوں تو چھوٹے بڑے کوئی چوبیس پچیس محکمے ہیں لیکن اُن میں سے خاص خاص یہ ہیں۔

۱۔ محکمہ ترقیات۔ جس میں کھیتی باڑی' کیمونٹی پراجیکٹ' مرغیوں اور مچھلیوں کا محکمہ' کھاد کا محکمہ' کواپریٹو سوسائیٹیاں اور مویشیوں کی داشت پرداخت شامل ہے۔ مالگذاری کا محکمہ اس سے الگ ہے۔

۲۔ محکمہ انتظامات عامہ۔ اگرچہ قانونی طور پر پولیس ریزرو محکمہ ہے جس کا براہِ راست چیف کمشنر کا تعلق ہے لیکن جناب شنکر پرشاد نے جو اس وزارت کے بنتے وقت چیف کمشنر صوبہ دہلی تھے اپنی پہلی ہی تقریر میں کہہ دیا تھا کہ وہ ان مخصوص اختیارات کو بھی عملاً جمہوری نظام سے وابستہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اسمبلی پولیس کے محکمہ کے بارے میں سوالات ہوتے ہیں اور چیف منسٹر (وزیر اعلیٰ) اُن کا جواب دیتا ہے۔

۳۔ مالی محکمہ۔ اس کو ہر محکمہ کی جان سمجھنا چاہئے کیونکہ ہر کام میں بہت بڑی ضرورت روپے کی ہوتی ہے۔ ٹیکس کا محکمہ اسی سے وابستہ ہے۔

۴۔ صنعت و حرفت کا محکمہ۔ جس سے کارخانوں کے مالکوں کا بھی تعلق ہے اور مزدوروں کا بھی۔ دلی میں کاروبار بڑھ جانے کی وجہ سے اس محکمہ کا کام بھی بڑھ گیا ہے۔

۵۔ تعلیم۔ سالانہ خرچ کے لحاظ سے دلی میں یہ سب سے بڑا محکمہ ہے۔

۶۔ (الف) صحت (ب) صفائی۔ بجٹ کی رو سے تو یہ دونوں محکمے ایک دوسرے سے الگ ہیں مگر عملاً ایک ساتھ ہی ہیں اور ایک ہی وزیر کے ماتحت رہتے ہیں۔

۷۔ آبادکاری۔ آبادی کے تناسب سے کسی اور صوبے میں پرنارتھیوں کی تعداد دِلّی کے مقابلے میں نہیں لہٰذا دلّی میں اس محکمہ کی بھی بڑی اہمیت ہے۔

۸۔ راشن اور سول سپلائی۔ راشن کا محکمہ تو ایک سال پہلے ٹوٹ چکا ابھی سول سپلائی کا محکمہ قائم ہے۔

۹۔ محکمہ اطلاعات عامہ۔ یہ محکمہ وزارت بننے کے بعد وجود میں آیا۔

۱۰۔ لوکل سیلف گورنمنٹ۔ اس کا تعلق میونسپلٹیوں ڈسٹرکٹ بورڈ اور دوسرے لوکل باڈیز سے ہے۔

۱۱۔ محکمہ قانون۔ فوجداری کی عدالتیں تو ریزرو صیغہ ہونے کی وجہ سے براہِ راست چیف کمشنر سے تعلق رکھتی ہیں لیکن دیوانی اور مال کی عدالتوں سے وزارت کا تعلق ہے۔ پھر بھی مجسٹریٹوں کے متعلق اسمبلی میں سوال جواب ہوتے ہیں اور عملاً چیف کمشنر کا تعلق اس محکمہ سے بھی ہے۔

محکمہ ترقیات۔ اس محکمہ کی کامیابی بہت کچھ گاؤں والوں کی دلچسپی لینے

پر منحصر ہے۔ ۲ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو پنڈت جواہر لال نہرو نے علی پور میں کمیونٹی پراجیکٹ کا افتتاح کیا تھا اس کے بعد یہ کام مختلف گاؤں میں پھیلا - اس محکمہ کی خاطر دہلی کے دیہات کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے -

(۱) علی پور
(۲) نجف گڑھ
(۳) شاہدرہ
(۴) مہرولی

علی پور کے حلقہ میں کام چونکہ سب سے پہلے شروع ہوا تھا. اس لئے اور علاقوں سے زیادہ بھی ہوا خاص طور پر نریل پور گاؤں میں تو اتنا شاندار کام ہوا اور کمیونٹی سنٹر ایسا بنا ہے کہ نہ صرف ہندوستان کے مختلف صوبوں کے نمایندوں نے بلکہ ہندوستان کے باہر سے آنے والے معزز مہمانوں نے بھی اس کی تعریف کی - اسی سے ملتا جُلتا گھوگا گاؤں ہے جس کی اس ڈھائی سال کے عرصے میں کایا پلٹ ہو گئی ہے ۔ بھرولہ کو صفائی کے معاملے میں سب سے اول انعام ملا - بُراڑی کو اس سال سڑک کی تعمیر کے لئے دوسرے ہر گاؤں کی رقم سے بڑی ۲۷ ہزار روپے کی رقم ملی ہے - لوانہ میں تمام گلیاں پارسال پختہ ہو گئیں

نجف گڑھ حلقہ میں بنجھاولہ کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ گاؤں سمجھنا چاہیئے کیونکہ خود نجف گڑھ تو گاؤں نہیں قصبہ ہے لیکن ضمناً یہ ذکر کر دینا مناسب ہے کہ نجف گڑھ میں ایسے ڈاکٹروں اور نرسوں کو تعلیم دی جاتی ہے جو گاؤں میں کام کرنا چاہیں -

شاہدرہ کے حلقہ میں مدن پور میں طالب علم لڑکوں اور لڑکیوں نے گاؤں والوں کی مدد سے جو سڑک بنائی ہے اس کے لئے زمین ناہموار ہونے کی وجہ سے انھیں بہت کام کرنا پڑا - سیلم پور میں بھی سڑکیں بنانے اور صفائی وغیرہ کا کام بہت اچھا ہوا ہے -

مہرولی کے علاقہ میں ادھ چنی گاؤں میں بڑا اچھا کمیونٹی سنٹر بنایا گیا ہے - علاقہ درخت کٹ جانے کی وجہ سے بنجر ہوتا جا رہا تھا - اب یہاں درخت لگانے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے - بہتر قسم کے سانڈ فراہم کئے گئے ہیں - پارسال ببب گڑھ میں جو مویشیوں کی نمائش ہوئی تھی اس میں دہلی کے محکمہ مویشیاں کو کئی سندیں ملیں -

محکمہ انتظامات عامہ - پولیس کی تعداد میں دو ہزار کا اضافہ کیا گیا ہے - کیونکہ ایک بڑے شہر میں بالخصوص جب وہ راجدھانی ہو نظم و نسق بہت اہمیت رکھتا ہے - خوش حالی کے لئے سب سے پہلی شرط حفاظت ہے پولیس کے محکمہ میں ردّ و بدل بھی کی گئی ہے جس کا نتیجہ اچھا نکلا - ٹریفک پولیس میں بھی اضافہ کیا گیا ہے - مجسٹریٹوں میں بھی اضافہ ہوا ہے - یہ محکمہ اصطلاحی طور پر وزارت کے ہاتھ میں نہیں ہے - مگر چیف کمشنر نے عملاً وزارت کو اختیارات دے رکھے ہیں -

مالی محکمہ - یہ ایک غلط خیال ہے کہ وزارت بننے کے بعد سیلز ٹیکس لگا - یہ ٹیکس وزارت کے وجود میں آنے سے پہلے ہی لگ چکا تھا جن چیزوں پر سیلز ٹیکس لیا جاتا ہے ان کی مستثنیات کی تعداد اور وسیع کر دی گئی ہے - کھادی پر تو سیلز ٹیکس معاف ہے ہی - اب کرگھہ پر بُنے ہوئے کپڑے پر بھی معافی کا فیصلہ کر لیا گیا ہے - سوتی ہیں کم سے کم مقدمے چلا کر زیادہ سے زیادہ سیلز ٹیکس وصول کرنے کی پالیسی کامیاب ثابت ہوئی ہے یہاں یہ ذکر کر دینا بھی مناسب ہے کہ دہلی کے آس پاس کے صوبوں میں بھی سیلز ٹیکس لگا ہوا ہے -

سیلز ٹیکس کے مقابلے ہی میں دوسری آمدنی جو ایک کروڑ روپے سالانہ سے اوپر کی رقم کی ہے اکسائز یعنی نشوں پر ٹیکس ہے - سب سے زیادہ ٹیکس جس نشے پر وصول ہوتا ہے وہ شراب ہے - اب حکومت نے نشہ بندی کے لئے سرکاری اکثریت پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی ہے جس نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے - نشہ بندی کے ساتھ یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ کہیں ناجائز کشید نہ بڑھ جائے - بہرحال شراب بندی ہندوستان کے نئے آئین میں شامل ہے -

صنعت و حرفت کا محکمہ - وزارت کے قائم ہونے کے زمانے میں دلی میں رجسٹر شدہ فیکٹریوں کی تعداد چار سو ترانیے تھی اب اس تعداد میں دو سو کا اضافہ ہو گیا ہے - ۱۹۵۳ء میں کھادی گرام ادیوگ سہکاری سمتی قائم ہوئی اس کوآپریٹو سوسائٹی کا کام کھادی اور دیہاتی صنعتوں کو فروغ دینا ہے - اس سوسائٹی کو ستر ہزار روپے صوبائی حکومت کی طرف سے مل چکا ہے - سینکڑوں بیواؤں اور غریب عورتوں کو اس سمتی کی طرف سے کتائی کی اُجرت ملتی ہے اور اب رنگائی اور بنائی کا بھی کام سکھایا جا رہا ہے - علی پور کے سنٹر میں دستکاری کی تعلیم دی جاتی ہے کرگھے کے

بُنے ہوئے کپڑے کی نمائش پار سال پرانی دلّی میں ہوئی تھی اور امسال نئی دلّی میں ہوئی۔

وزارت کے قیام سے پہلے ایک لیبر افسر تھا جو مزدوروں کی حالت سُدھارنے کے کام پر متعین تھا۔ اسی افسر کے سپرد کارخانوں کے مالکوں اور مزدوروں کے جھگڑے نپٹانے کا کام بھی تھا۔ ۱۹۵۲ء میں مالکان کارخانہ اور مزدوروں کے باہمی قضیئے طے کرنے کے لئے ایک الگ افسر مقرر کر دیا گیا جو معاملے اس افسر کے ذریعے باہمی طور پر طے نہیں ہوتے وہ ٹریبونل کے سپرد کر دئے جاتے ہیں۔

مزدوروں کے لئے ایک ویلفیر سنٹر ۱۹۵۳ء میں شہر دہلی میں کھولا گیا تھا۔ دوسرا سنٹر ۱۹۵۴ء میں کھولا گیا۔ ان سنٹروں میں جہاں ایک طرف مزدوروں کی دلچسپی کا سامان ہوتا ہے وہیں دوسری طرف ان کی تربیت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ جہاں ایک طرف "تاش" "کیرم" "شطرنج" کے کھیل فراہم کئے گئے ہیں وہیں اخبار اور کتابیں بھی ہیں "وقتاً فوقتاً" تفریحی جلسے بھی کئے جاتے ہیں۔

مزدوروں کے متعلق صوبائی حکومت نے چند قانون بھی بنا دئے ہیں جن کی رو سے یہ طے کر دیا گیا ہے کہ کم سے کم انھیں کتنی اُجرت ملنی چاہیئے اور زیادہ سے زیادہ ان سے کتنا کام لیا جا سکتا ہے اس کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ مزدوروں کی صحت کا سرکاری طور پر بیمہ ہو۔ کم تولنے اور ناپنے والوں کی دیکھ بھال کا کام بھی اسی محکمے کے سپرد ہے۔ دلی میں مزدور خاندانوں کی آبادی تقریباً چھ لاکھ یعنی کل آبادی کا تقریباً ایک تہائی ہے اس لئے یہاں مزدوروں کا معاملہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔

ورک سنٹر۔ دہلی میں بے کاری کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے چونکہ یہ عام شہرت ہے کہ دہلی میں اور جگہوں کے مقابلے میں تنخواہیں اچھی ملتی ہیں اس لئے نہ صرف اور علاقوں کے بے کار بلکہ وہ لوگ بھی جو برسرِ روزگار ہیں دہلی کا رُخ کرتے ہیں لیکن جیسا مولانا حالی نے پچھلی صدی میں کہا تھا۔

ایک دن وہ زمانہ آئے گا
بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا

آج وہی زمانہ آ گیا بے پڑھے لکھے لوگوں کا ذکر ہی کیا پڑھے لکھے بے کاروں کا مسئلہ بھی دشوار صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس لئے حکومت دہلی نے ورک سنٹر کھولنے کا فیصلہ کیا ہے جس کی اسکیم مکمل ہو چکی ہے جس میں کھلونوں سے لے کر ضروری اشیاءِ زندگی تک کی چیزیں شامل ہیں۔

تعلیم - شمالی ہندوستان میں کوئی اور صوبہ ایسا نہیں ہے جہاں آدھے سے زیادہ آدمی پڑھے لکھے ہوں یہ فخر صرف دہلی کو حاصل ہے اس لئے تعلیم کی طرف یہاں توجہ بھی زیادہ ہے اور لوگ اپنے بچّوں کو زیادہ سے زیادہ اور اچھی سے اچھی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ ایک راجدھانی کی شان بھی یہی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کے بیشتر صوبوں میں دہلی کتنی ہی آگے ہو مگر یورپ کے ملکوں کو دیکھتے ہوئے ابھی یہاں تعلیم کا اوسط کم ہے۔ دہلی میں تعلیم کا صیغہ اس طرح پر تقسیم ہے کہ ابتدائی تعلیم تو میونسپلٹی کے سپرد ہے اور ثانوی تعلیم حکومت دہلی کے ہاتھ میں ہے اور یونیورسٹی کی یعنی اعلےٰ تعلیم مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ میونسپلٹی نے ابتدائی تعلیم لازمی کر رکھی ہے جو اسکول گاؤں میں ہیں وہ چاہے ابتدائی تعلیم کے بھی ہوں انھیں حکومت دہلی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

تعلیم یافتہ بے روزگاری کے دُور کرنے کے لئے مہاتما گاندھی نے ۱۹۳۷ء میں ملک کو بنیادی (بیسک) تعلیم کا خیال دیا تھا دہلی میں جب جمہوری حکومت قائم ہوئی تو بنیادی تعلیم پانے والے طلباء کی تعداد ساڑھے پچیس ہزار تھی اب یہ تیس ہزار سے زاید ہے اور موجودہ پلان کے مطابق آئندہ سال تک یہ تعداد چالیس ہزار ہو جائے گی۔ جہاں جہاں یہ اسکول کامیابی سے چل رہے ہیں وہاں بچوں کی بنائی ہوئی چیزوں کی نمائش بھی ہوتی ہے اگر ان کی فروخت کے لئے کوئی مرکزی ادارہ قائم ہو جائے تو مہاتما گاندھی کے اس خواب کی تعبیر مکمل ہو جائے گی کہ بنیادی تعلیم خود کفیل ہونی چاہیئے۔ دیہات میں چونکہ ابتدائی تعلیم صوبائی حکومت کے ہاتھ میں ہے لہٰذا وہاں ابتدائی سکولوں کو مجموعی طور پر بیسک بنا دیا گیا ہے اب جونیر بیسک سکولوں کو سینیر بیسک سکول بنایا جا رہا ہے۔ ہائی سکول میں حکومت دہلی نے گیارہ کا اور اضافہ کر دیا ہے۔ بالغوں کو تعلیم دینے کا سلسلہ بھی جاری ہے اور اسے ترقی بھی دی جا رہی ہے۔ یہ کام کچھ تو میونسپلٹی کے ماتحت ہوتا ہے اور کچھ صوبائی حکومت کے ماتحت تقریباً ۳۵ ہزار بالغوں کو پڑھنے لکھنے کے قابل بنایا جا چکا ہے۔ بالغوں کو تعلیم دینے کا کام بچوں کو تعلیم دینے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ بچپن میں سیکھنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی

ہے ۔ جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے ۔ دماغ کی رگیں موٹی ہوتی جاتی ہیں اور عام طور پر کچھ لوگوں کو یہ خیال ہوجاتا ہے کہ اب پڑھنے کی عمر نہیں رہی ۔ اس کے باوجود یہ محکمہ ۲۷۷ سکولوں میں تعلیم بالغاں دے رہا ہے ۔ "ہمارا گاؤں" اور "ہمارا شہر" نام کے دو رسالے بالغوں کی تعلیم کے لئے جاری ہو گئے ہیں ۔

دہلی میں تعلیم کے مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر سال دس ہزار طلبار کی جگہیں خالی ہوتی ہیں اور پچیس ہزار طالب علم داخلے کے لئے آتے ہیں ۔

صحت و صفائی ۔ ولنگڈن ہسپتال تو خیر مرکزی حکومت نے اپنے چارج میں لے لیا ہے ۔ اب دہلی سٹیٹ گورنمنٹ کا سب سے بڑا ہسپتال اروِن ہسپتال ہے اس ہسپتال میں دو سو سے زیادہ مریضوں کے لئے بستر فراہم کئے گئے ہیں اسی طرح دو سو بستروں کا اضافہ تپ دق کے ہسپتال میں کیا گیا ہے ۔ ہارڈ ہندراؤ ہسپتال کو بھی وسعت دی گئی ہے ۔ اسی سال شاہدرہ میں دماغی مریضوں اور کوڑھیوں کے لئے الگ ہسپتالوں کا انتظام کیا جا رہا ہے ہیلتھ سنٹروں کی بھی داغ بیل ڈالی گئی ہے ۔ وکٹوریہ زنانہ ہسپتال کی بہتری پر خاص توجہ کی گئی ہے ۔

آبادکاری ۔ ۱۹۴۷ء میں اور اس کے بعد کوئی ساڑھے پانچ لاکھ مرد عورت اب پاکستان کہلانے والے علاقے سے اُجڑ کر دہلی میں آ گئے ہیں ان میں سے آدھے سے زیادہ تو دہلی میں عوامی حکومت بننے سے پہلے آباد کئے جا چکے تھے جو رہ گئے تھے ان میں سے ابھی پچاس ہزار کی آبادکاری باقی ہے ۔ دہلی سٹیٹ گورنمنٹ کے اہتمام میں ان کو کام پر لگانے کے لئے ایک علیحدہ محکمہ سوشل ویلفیر (بہبود عامہ) کے نام سے کھولا گیا عورتوں کی آبادکاری کا مسئلہ زیادہ اہم تھا ۔ اس کا اہتمام دہلی وزارت کے قائم ہونے کے تین مہینے بعد ہی کیا گیا ۔ محض بس جانا ہی کافی نہ تھا اس لئے کہ بسنے سے زیادہ روزی کمانے کا مسئلہ اہم ہے ۔ اس سلسلے میں ایک طرف تو غریب اور محتاج عورتوں اور بچوں کے آشرم کھولے گئے دوسرے نئی آبادیوں میں صنعت و حرفت سکھانے کا اہتمام کیا گیا ۔ جو لوگ اپنے طور پر کام دھندا شروع کرنا چاہتے تھے ان کے لئے قرض فراہم کیا گیا اور مستحق طلبار کو وظیفے وغیرہ دئے گئے ۔ جو لوگ بڑھاپے یا کمزوریٔ صحت کی وجہ سے کام دھندا نہ کر سکتے تھے ان میں سے بہتوں کے لئے گزارے کا انتظام کیا گیا ۔

کستوربا نکیتن عورتوں کو خود کفیل بنانے کا سب سے شاندار ادارہ ہے جس میں ۱۳۰۰ سے زیادہ عورتیں اور بچے رہتے سیکھتے اور اپنی گھریلو دستکاری کے ذریعے آمدنی کرتے ہیں اب اس آشرم میں جتنی عورتیں ہیں سب کو خواندہ بنا دیا گیا ہے اور ان میں سے کچھ نے ہندی کے سرکاری امتحانوں میں کامیابی بھی حاصل کی ہے مگر اس سے زیادہ مفید وہ تعلیم ہے جو انھوں نے گرام سیوکا یا آیہ یا دائی کی حیثیت سے حاصل کی ہے ان میں سے جو عورتیں آشرم سے نکل کر اپنا کام کرنا چاہتی ہیں انھیں موقعہ دیا جاتا ہے ۔ کچھ یتیم بچوں کو کچھ خاندانوں نے (جن کے متعلق چھان بین کر لی گئی) پرورش کے لئے لے لیا ۔ کچھ لڑکیوں کی شادی ہو گئی ۔ اس سب انتظام میں فی کس صرف ۲۳ روپے ماہانہ خرچ کا اوسط آتا ہے ۔ دو سو بچوں کو دہلی کے باہر تعلیم کے لئے بھیجا گیا ۔ مستحق بیوہ عورتوں کو سلائی کی مشینیں بھی دی جاتی ہیں امداد کا یہ طریقہ بہت کامیاب ثابت ہوا ہے ۔ پیڑت تپ دق کے مریضوں کو مالی امداد دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے ۔

دہلی نئی دہلی' شاہدرہ' مہرولی میں بھی عورتوں کے لئے کام سکھانے کے سنٹر ہیں جہاں کام کی اُجرت بھی دی جاتی ہے ۔ مردوں کے لئے کام سکھانے کے سنٹر کنگس وے' مالوی نگر' تلک نگر' لاجپت نگر اور کالکاجی میں قائم ہیں جہاں صرف ۲۰ روپے فی کس ماہانہ خرچ ہوتا ہے اور یہ خرچ سرکار کی طرف سے ہوتا ہے ۔

دوسرے محکمے ۔ سول سپلائی کا محکمہ تو اب ختم ہی ہونے والا ہے راشن کا محکمہ ختم ہو چکا ہے ۔ میونسپلٹیوں یا لوکل سلف گورنمنٹ کے سلسلے میں حکومت کے اختیارات بالکل ادھورے ہیں ۔ محکمہ اطلاعات معرض ارتقا میں ہے عدالتوں میں کام بہت بڑھ گیا ہے ۔ ججوں اور اسٹاف میں اضافہ بھی ہوا ہے مگر اور اضافے کی ضرورت ہے ۔

دو غزلیں

اشفاق علی خاں

یہ نظر کا کھیل کب تک تو سکون دے نظر کو
ترا حوصلہ اگر ہو تو اب آزما جگر کو

ہے عبث ابھی دعا میں ترا ڈھونڈنا اثر کو
ابھی ربط تیرے دل سے نہیں تیری چشمِ تر کو

یہ طلسمِ روز و شب ہو کہ فسونِ رنج و راحت
کوئی دے سکا نہ دھوکا مرے فکرِ معتبر کو

یہ جہان سر نہ ہوگا ترے اشک و آہِ غم سے
یہ طلسم ڈھونڈتا ہے کسی مردِ باخبر کو

تجھے آمدِ سحر سے کیا ناامید جس نے
اسی شب میں دیکھتا ہوں میں سپیدۂ سحر کو

یہی راز کامرانی میں اسی سے کامراں ہوں
کبھی مرحلہ نہ مانا مرے دل نے رہگزر کو

مجھے پائمال کرتے ہیں جو آج اپنی ضد سے
وہ رکھیں گے کل گرامی مری خاک پے سپہر کو

ابرؔ احسنی گنوری

ضد ہے ناصح کی نہ سوزِ غم کو رسوا کیجئے
ہر نفس دینے لگے شعلے تو پھر کیا کیجئے

یہ دوئی کیسی؟ دوئی کا چاک پردا کیجئے
اُن کے جلوے اپنی صورت سے ہویدا کیجئے

درد ہو تو درد کا بے شک مداوا کیجئے
زندگی خود درد بن جائے تو پھر کیا کیجئے

میری رودادِ تباہی ہے مُسلّم دہر میں
آپ افسانہ سمجھتے ہیں تو سمجھا کیجئے

ان کے جلووں کی یہیں سے راہ نکلے گی کوئی
کچھ دنوں اپنی تجلّی کا تماشا کیجئے

آپ کو پاتا ہے ہر پردے پہ اب جذبِ نظر
اور کہئے لن ترانی اور پردا کیجئے

ہوش جب تک دیں سہارا، ساتھ جب تک دے نگاہ
دید کے قابل ہے حُسنِ دوست دیکھا کیجئے

اے اسیرو یوں تو جلتے اور ہو جاتے ہیں تنگ
لے کے دام اُڑ جائیے لیکن نہ تڑپا کیجئے

دوست کے جلووں کو نظارے کی خود ہو جستجو
ابرؔ اتنا تو مذاقِ عیش اونچا کیجئے

غلش جعفری

مکتب

"تنگ و تاریک گلی سے گزرنے کے بعد ایک بڑا سا صحن ہے جس میں ایک طرف کبھی نیم کا بڑا سا درخت تھا۔ اس کی جگہ اب ایک سوکھا ہوا ٹھنٹھ رہ گیا ہے۔ سنتے ہیں ایک دفعہ استاد کو روپوں کی سخت ضرورت محسوس ہوئی، اور جب کہیں سے کچھ نہ مل سکا تو انھوں نے یہ نیم کا درخت بیچ ڈالا اور اس طرح یہ صحن نیم کی گھنی چھاؤں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔ صحن سے لگا ہوا جو وسیع دالان ہے وہاں مدرسہ لگتا ہے۔ پورے دالان کے لئے ٹاٹ کے ٹکڑوں کو جوڑ کر فرش بنایا گیا ہے اور بعض جگہ یہ جوڑ اس قدر بھدے اور بدنما ہیں کہ ان جگہوں پر ٹاٹ ابھرا ابھرا معلوم ہوتا ہے، اور ان حصوں پر کوئی بچہ نہیں بیٹھتا۔ سامنے کی دیوار پر "مدرسہ اسلامیہ" کی تختی لگی ہوئی ہے جس کے ٹیڑھے ترچھے نقوش تبلاتے ہیں کہ کسی اناڑی پینٹر کی لکھی ہوئی ہے۔ دالان کے ایک کونے میں تپائی پر ایک بڑا پرانا مٹکا رکھا ہوا ہے جس پر ایک ٹین کا ڈھکن اور اس پر ایک ٹین ہی کا میلا زنگ آلود گلاس رکھا رہتا ہے، جب کسی بچے کو پیاس لگتی ہے، اور مدرسے کے دو گھنٹوں میں ہر بچے کو کم از کم ایک بار ضرور پیاس محسوس ہوتی ہے۔ وہ گلاس کو مٹکے میں ڈبا کر بھرتا ہے۔ ایک ہی سانس میں جس قدر پانی پیا جا سکتا ہے، پی لیتا ہے۔ بچا ہوا پانی صحن میں پھینک دیتا ہے اور گلاس کو پھر ٹین کے ڈھکن پر رکھ کر آستین سے اپنا منہ پونچھتا ہوا اپنی جگہ پر جا بیٹھتا ہے۔ دالان کے سامنے والی دیوار کے برابر یعنی عین "مدرسہ اسلامیہ" کی تختی کے نیچے اُستاد کا گدا بچھا رہتا ہے جس پر ایک چوکور تکیہ پڑا رہتا ہے۔ اُستاد جب آموختہ سنتے ہیں تو وہ چوکور تکیے کو دیوار سے لگا لیتے ہیں اور ذرا کمر سیدھی کرنے کو تکیے سے ٹک جاتے ہیں۔ آموختہ سننے کے بعد وہ باری باری ہر بچے کو نیا سبق دیتے ہیں، اور کچھ کم دو گھنٹوں ہی میں مدرسہ برخاست ہو جاتا ہے۔

پہلے پہل جب مدرسہ شروع ہوا تو بچوں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ جو بچے ذرا سیانے تھے وہ اُستاد کے گھر کا کام کر دیا کرتے تھے۔ اس کام میں بازار سے سودا سلف لانے سے لے کر میونسپلٹی کے نل سے پانی بھرنے تک سب کام شامل تھے۔ کچھ دنوں تک یونہیں سلسلہ چلتا رہا۔ پھر استاد نے مدرسے کو ترقی دینے کے لئے محلّے محلّے گھوم پھر کے اسلامی تعلیمات کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اس پرچار کا خاطر خواہ نہ سہی کچھ اثر ضرور ہوا۔ چند لوگوں نے مدرسے کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اپنے بچوں کا مستقبل سنوارنے اور انھیں دین دنیا دونوں کے قابل بنانے کی غرض سے۔ مدرسے میں داخل کروا دیا گیا۔ مدرسے کی فوری ضرورت کا سامان خریدنے کے لئے استاد نے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم بھی شروع کی۔ اور انھیں مایوسی نہیں ہوئی۔

انور جب پہلے دن مدرسے میں آیا تو وہ ایک اجنبی کی طرح تھا۔ مدرسے کی ساری فضا پر کچھ ایسا غیر مانوس سا تقدس چھایا ہوا تھا کہ وہ گھبرا گھبرا کر کبھی اُستاد کو دیکھتا جو پتلی فریم کی عینک لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے لمبے لمبے گھنگھریالے بالوں میں کھوپرے کا بہت سا تیل چمک رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں سرمے کی مہین لکیریں اُس طرف سے اِس طرف تک کھنچی ہوئی تھیں۔ اور کبھی ان بچوں کو دیکھتا جو ایک ہی طرح سے ہل ہل کر اپنا سبق یاد کر رہے تھے، یہ فضا اُس کے اپنے اسکول سے بالکل مختلف تھی جہاں لڑکے پڑھا کرتے تھے، باتیں کیا کرتے تھے۔ ماسٹروں کی مار بھی کھاتے۔ سب کھڑے ہو کر ترانہ گاتے۔ ہنستے بولتے اور کھیلتے تھے۔ یہاں اُستاد چوکور تکیے سے ٹکے اونگھا کرتے تھے، اور لڑکے طوطوں کی طرح سبق رٹا کرتے تھے۔ یہ استاد بھی اس کے اسکول کے ماسٹر سے کتنے مختلف تھے۔ ان دونوں میں اتنا ہی تضاد، اتنا ہی فرق تھا، جتنا ایک اسکول ماسٹر اور کھچڑی داڑھی والے استاد میں ہو سکتا ہے۔ استاد کی آواز میں بھی وہ ترنم نہیں تھا۔ وہ لچک نہیں تھی جو اس کے ماسٹر کی آواز میں تھی۔ استاد اس طرح حلق کے اندرونی حصّے سے آواز نکالتے جیسے

کوئی گہرے کنویں یا اندھے غار سے بول رہا ہو۔ یہاں کوئی لڑکا کسی دوسرے سے بات نہیں کرتا تھا۔ ہنسنا تو دور کوئی یونہی مسکراتا بھی نہیں تھا۔ کوئی شرارت نہیں کرتا تھا۔ جیسے یہ سب بچے نہیں تھے۔ بڑے سنجیدہ قسم کے بزرگ تھے۔ جو بچوں کے بھیس میں اس مدرسے میں جمع ہو گئے تھے۔

انور پہلے ہی دن مدرسہ اسلامیہ کی فضا اور ماحول سے اس قدر اکتا گیا کہ اس نے گھر واپس جاتے ہی اپنی بہن کے سامنے آئندہ مدرسے نہ جانے کا اعلان کر دیا۔ اس کی بہن نے یہ سمجھ کر کہ بچے شروع شروع میں مدرسے جانے سے گھبراتے ہیں، اس کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ لیکن دوسری صبح جب مدرسے کا وقت قریب آ گیا اور انور واقعی مدرسے جانے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہا تھا تو اس کی بہن نے پہلے اسے سمجھایا۔ پھر ڈانٹا اور پھر ٹھکائی کی۔ اس کے جواب میں انور نے غیر ضروری شور مچایا۔ احتجاج کیا لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پرانی عینک اور مٹی ڈاڑھی والا استاد آسانی سے انور کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اسے مجبوراً مار کھا کر، قاعدہ بغل میں دبا کر، باقاعدہ ٹوپی اوڑھ کر مدرسے جانا پڑا۔ وہ مشکل سے دس برس کا تھا اور دینی تعلیم کی اہمیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ مولوی بن کر بھی کوئی بڑا آدمی بن سکتا ہے! اسے تو استاد کی شکل بڑی ڈراؤنی معلوم ہوتی اور سر ہلا ہلا کر سبق یاد کرنے والے بچوں کو دیکھ کر اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ سب گڈے ہیں جن میں استاد نے چابی بھر دی ہے، اور وہ سب ایک ہی طرح سے حرکت کرتے ہیں۔

کئی دنوں تک وہ روزانہ بہن سے پٹ کر مدرسے جاتا رہا۔ پھر سبق نہ یاد کرنے پر استاد نے بھی اس کی ٹھکائی شروع کر دی۔ شروع شروع میں استاد ذرا آہستہ مارتے، لیکن جب اُس نے مستقل سبق یاد نہ کرنے کی عادت بنالی تو استاد کی بید بھی زیادہ بے رحم اور بے درد ہوتی گئی۔ شاید سارے بچوں میں وہی ایک ایسا تھا جو بلاناغہ پٹتا تھا۔ پٹنے کو تو یوں زیر زبر کی غلطی پر بڑے بڑے لڑکے بھی پٹ جایا کرتے تھے، لیکن استاد انور پر ذرا زیادہ ہی مہربان تھے۔ کیونکہ اُس نے ابھی تک پہلا قاعدہ بھی ختم نہیں کیا تھا۔ گھر اور مدرسے کی دوہری مار سے بچنے کے لئے انور نے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اب وہ بلاناغہ صبح سات بجے بغیر کہے سنے قاعدہ بغل میں دباتا اور مدرسے چلا جاتا۔ اس طرح کچھ دنوں تک وہ بہن کی مار سے بچ گیا۔

ان ہی دنوں دو نئے لڑکے مدرسے میں داخل ہوئے۔ کچھ پرانے لڑکے مدرسہ چھوڑ کر چلے گئے۔ مدرسہ چھوڑ کر جانے والے لڑکوں کے باپوں، ماؤں اور بہنوں کو ان کے مدرسہ چھوڑ دینے پر رنج ضرور ہوا۔ لیکن وہ آخر کر بھی کیا سکتے تھے۔ مدرسے میں تو یہ لڑکے بڑے "اشراف" بنتے، سبق بھی یاد کرتے۔ لیکن مدرسے کے باہر کچھ ایسے ویسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے لگے۔ اور اُن کے باپوں، ماؤں اور بہنوں نے انھیں کام دھندے سے لگا دینے ہی میں بہتری سمجھی۔ اسی لئے تو استاد نے اس روز اپنی پرانی عینک اتار کر اپنے تمام چھوٹے بڑے شاگردوں سے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا تھا: "خدا جانے آج کل کے بچوں کو کیا ہو گیا ہے۔ نہ ماں باپ کا حکم مانتے ہیں نہ استاد کو استاد سمجھتے ہیں۔ کلام پاک کی تعلیم حاصل کرنے کی بجائے "میں آوارہ ہوں" سیکھتے ہیں اور پھر بڑے ہو کر تو پورے کافر ہو جاتے ہیں۔ اے خدا رحم کر اُس قوم پر جس میں ایسے شیطان بچے پیدا ہو رہے ہیں"

جو دو نئے لڑکے اسکول میں داخل ہوئے تھے وہ بھی پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُنھیں بھی انور کی طرح مجبوراً مدرسے آنا پڑتا تھا۔ انور کی ان دونوں سے بہت جلد دوستی ہو گئی۔ یہ دوستی مدرسے کے باہر گلی میں ہوئی تھی۔ مدرسے کا وقت ختم ہو جانے کے بعد یہ تینوں گلی میں ٹھہر جاتے۔ اور جب دوسرے سارے لڑکے اپنے اپنے قاعدے سنبھالے رخصت ہو جاتے تو یہ تینوں گلی کے کونے پر بیٹھ جاتے اور کنکروں کا کھیل شروع کر دیتے۔ اتفاق سے کبھی استاد اس طرف آ نکلتے تو یہ تینوں اپنے اپنے قاعدے سنبھال کر اس طرح بھاگ کھڑے ہوتے جیسے گائے کسی قصائی کو دیکھ کر چوکڑیاں بھرنے لگتی ہے۔

کچھ دنوں بعد یہ تینوں مدرسے سے غائب ہو گئے۔ کئی دنوں تک نہ تو استاد ہی کو، نہ ہی انور کی بہن اور ان دو لڑکوں کے باپ ہی کو پتہ چل سکا کہ ان تینوں نے مدرسے سے غائب رہنے کی منظم سازش کی ہے کیونکہ یہ تینوں روزانہ اپنے اپنے قاعدے لے کر گھر سے نکلا کرتے تھے۔

مدرسے سے غائب رہنے کا پلان دراصل انور نے بنایا تھا۔ مدرسے سے غائب رہ کر ندی کنارے جانے کا پلان بھی انور نے بنایا تھا۔ ندی کے علاوہ کوئی دوسری ایسی محفوظ جگہ نہیں تھی جہاں یہ تینوں مدرسے کے

وقت میں آزادی سے کھیل کود سکتے۔ ندی مدرسے سے کافی دور تھی۔ لیکن یہ دُوری ان کے لئے کشش انگیز تھی۔ یہاں پانی میں تیرتی ہوئی بھینسیں تھیں۔ نہاتے ہوئے لوگ تھے۔ اُچھل کود کرنے والے بچے تھے۔ خشک ریت پر دُور تک پھیلے ہوئے ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ تھے۔ اور ساحل کی نرم نرم بالو تھی جس میں پیر دھنستے ہی چلے جاتے ہیں اور بالو آہستہ آہستہ تلوؤں کے نیچے چرچراتی ہے اور ایک عجیب طرح کی گد گدی میٹھی میٹھی نرم نرم سی گدگدی محسوس ہوتی ہے۔ اور سفید سفید چکنے چکنے سنگریزے تھے۔ اتنے بہت سے جو ان تینوں کی جیبوں میں نہیں سما سکتے۔ اور پھر یہاں بہن اور باپ کی جھڑکیاں نہیں تھیں اور استاد کی بے رحم چھڑی نہیں تھی۔ ندی کے ساحل پر بالو سے کھیلتے ہوئے ان تینوں کو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ نیلے آسمان میں اُڑنے والے بگلوں کی طرح آزاد ہیں۔

لیکن یہ آزادی بہت دنوں نہیں رہی۔ ایک دن یہ تینوں ندی کے کنارے بالو سے کھیلتے ہوئے پکڑے گئے۔ پکڑنے والا ان دو لڑکوں کا باپ تھا۔ اُس نے بغیر کچھ کہے سُنے وہیں اپنے دونوں لڑکوں کی ٹھکائی شروع کر دی۔ اپنے دوستوں کا یہ بُرا حشر دیکھ کر انور نے بالو کے ٹیلے پر سے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس نے پیچھے مڑ کر ایک بار اپنے دوستوں کو دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ انور کے مدرسے سے مستقل غائب رہنے کی خبر اس کی بہن تک بھی پہنچ چکی تھی۔ انور یہ بھی جان چکا تھا کہ یہ سب کارروائی استاد نے کی ہے۔ اسی لئے وہ گھر جانے سے ڈر رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ یونہیں سڑکوں اور گلیوں کی خاک چھانتا رہا۔ کئی دفعہ اس نے "آوارہ ہوں" گانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن جیسے آواز اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ اس کے ننھے سے ذہن میں کئی دفعہ گھر کا نقشہ اُبھرا۔ لیکن اس تصویر میں سب سے بھیانک شکل اس کی بہن کی ہوتی جو دروازے میں نیم کی مضبوط چھڑی لئے بالکل شکاریوں کی طرح اس کی تاک لگائے کھڑی تھی۔ جب یہ تصویر اُس کے ذہن میں اُبھرتی اس کے سارے بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ جاتی۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ ایسا گناہ جس کی سزا دو چار تھپڑ نہیں ہیں۔ دو چار تھپڑ نہیں تھے بلکہ کوئی بہت شدید سزا۔ شاید وہ اس سزا کی تاب نہ لا سکے اور مر جائے۔ مرنے کا خیال ذہن میں آتے ہی اُس کے سارے بدن میں پھر وہی شدید کپکپی دوڑ گئی۔ وہ چلتے چلتے لڑکھڑا گیا اور گلی کے کونے پر رکھے ہوئے بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ پتھر کافی گرم تھا، لیکن اس وقت انور موسم کی کسی کیفیت سے متاثر نہیں تھا۔ اُس کے ذہن میں ایک ہی سوال اُبھر رہا تھا۔ آخر وہ جائے کہاں — ندی کے ساحل پر جہاں نرم نرم بالو تھی، اتھلے پانی میں بیٹھی ہوئی بہت سی بھینسیں تھیں۔ نیلے آسمان میں اُڑنے والے سفید سفید بگلوں کے غول تھے۔ بہت سے چکنے چکنے سفید سنگ ریزے تھے — لیکن سورج سر پر آ گیا تھا۔ دُھوپ کی تیزی شدید ہوتی جا رہی تھی، اور ندی کے ساحل پر روٹی نہیں تھی — روٹی جو اس وقت اُس کے لئے سب سے اہم تھی — بہن کی بے رحم چھڑی سے بھی زیادہ اہم۔

گھر زیادہ دور نہیں تھا، جب اُس نے دروازے میں قدم رکھا تو اس کا منہ خود بخود لٹک گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے بے شمار قطرے ڈھلک آئے۔ اس نے اپنی کپڑے کی ٹوپی کو اُلٹ کر پسینہ صاف کیا اور ڈھیلے ڈھالے قدم اُٹھاتا ہوا زینہ چڑھ گیا۔ اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سُرخ ہو رہا تھا۔ سامنے کمرے میں اس کی بہن بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھی۔ اس نے وہیں فرش پر اپنا قاعدہ اور ٹوپی پٹک دی۔ چپلیں پہلے ہی خود بخود اُس کے پیروں سے نکل گئی تھیں اور دہلیز پر منہ پھاڑے پڑی ہوئی تھیں۔ ان پر گلیوں کی دھول کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ وہ فرش پر اس طرح دھپ سے بیٹھ گیا جیسے کسی نے اوپر سے کوئی گٹھڑی پٹک دی ہو۔

"آپا کھانا دو"۔ اس نے چلّانے کے سے انداز میں کہا۔

آپا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری بار، تیسری بار، چوتھی بار بھی آپا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر وہ مستقل کھانے کی رٹ لگانے لگا۔ جیسے آموختہ یاد کر رہا ہو۔ اس کی آواز خود بخود کمزور ہوتی گئی۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے سسکیاں بھرنا شروع کیں۔ لیکن آپا پتھر کی مورت بنی اسی طرح بیٹھی رہی۔ وہ نڈھال ہو کر وہیں فرش پر گر پڑا۔ اس کے جسم میں اب اتنی بھی قوت نہیں تھی کہ وہ زبانی ہی کھانے کا مطالبہ کر سکتا۔ لیکن دبی دبی سسکیوں کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اس کے گالوں پر بہے ہوئے آنسوؤں کے قطرے اب بھی بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی بہن زیادہ دیر تک ان سسکیوں کو برداشت نہ کر سکی۔ پتھر آہستہ آہستہ پگھلنے لگا۔ اور پھر خود اس کی آنکھوں سے تھوڑے سے

قطرے ٹپک پڑے۔

اس نے انور کا شانہ ہلا کر اسے جگایا۔ وہ سہم کر اُٹھ بیٹھا۔ آپا باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہ ڈر رہا تھا کہ آپا کوئی مضبوط لکڑی ڈھونڈ کر لائے گی۔ لیکن اس دفعہ کی آپا پہلے سے بالکل مختلف تھی —— اُس کے ہاتھ میں کھانے کی تھالی تھی۔ انور کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بہت دنوں بعد گھر آیا ہو۔

دوسرے دن صبح وہ بغیر کچھ کہے سُنے مدرسے چلا گیا۔ استاد کے سامنے گُڈّے اسی طرح گردن ہلا ہلا کر سبق یاد کر رہے تھے۔ وہ سب سے پیچھے اپنی رحل سجا کر بیٹھ گیا۔ اُستاد نے اپنی پتلی کمانیوں والی عینک اُتار کر گدّے پر رکھ دی۔ وہیں سے بیٹھے بیٹھے اُنھوں نے انور کو اپنے قریب بُلایا۔

"میرے مدرسے میں تم جیسے لڑکوں کے لئے جگہ نہیں ہے!" اُستاد نے چلّانے کے سے انداز میں کہا۔

سب گُڈّے ساکن ہو گئے۔ انور کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے دیکھا اُستاد کی بڑی بڑی سیاہ، سُرمہ لگی ہوئی آنکھیں اُسے گھور رہی تھیں۔ اور اُن کی دراز زُلفوں سے بہا ہوا تیل پیشانی پر چمک رہا تھا۔ اُستاد شاید جلال میں آ گئے تھے۔

"تم آوارہ ہو! تم میرے مدرسے میں نہیں پڑھ سکتے۔ تم میرے بچوں کو خراب کر دو گے۔ فوراً مدرسے کے باہر ہو جاؤ، اور پھر کبھی اِدھر کا رُخ نہ کرنا —— سمجھے!" اُستاد پھر گرجے۔

انور نے اپنی کپڑے کی ٹوپی درست کی۔ اپنا قاعدہ اُٹھایا، اور دھیرے دھیرے مدرسے کے صحن سے گزر کر گلی میں آ گیا۔ پھر اُس نے زور سے اپنی ٹوپی کو ہوا میں اُچھالا اور اپنے گلے کی ساری قوت سے چلّایا۔

"میں آوارہ ہوں!"

"لاحول ولا قوۃ" پیچھے سے اُستاد کی تیز، بھونڈی اور کرخت آواز سُنائی دی۔

بھارتی پارلیمنٹ

بھارتی پارلیمنٹ مشرق کی آئین ساز مجالس ہی میں ممتاز حیثیت نہیں رکھتی بلکہ دنیا بھر کی بہترین آئین ساز مجلسوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے دو ایوان ہیں اوپر کے ایوان کا نام راجیہ سبھا ہے اور نچلے ایوان کو لوک سبھا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ پارلیمنٹ میں ملک بھر کے برگزیدہ اصحاب موجود ہیں جن کی معاملہ فہمی، دانش مندی اور سلیقہ دانی قابلِ تعریف ہے۔ ملکی معاملات پر نہایت ہی فراخدلی اور بے تعصبی سے غور کیا جاتا ہے۔ کسی قسم کا مذہبی، جماعتی یا سیاسی تعصب کارفرما نہیں ہوتا ہے۔ دونوں ایوانوں میں ممبروں کی تعداد ذیل کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوگی جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

پارٹی	لوک سبھا	راجیہ سبھا
کانگریس	۳۶۵	۱۶۲
پرجا سوشلسٹ	۲۷	۸
کمیونسٹ	۱۷	۵
پیپلز ڈیموکریٹک فرنٹ	۷	۲
گن تنتر پریشد	۵	۰
تامل ناڈ	۴	۰
ہندو مہاسبھا	۴	۰
اکالی	۳	۱
دیگر	۲۲	۲۵ (دیگر اور آزاد ممبر)
آزاد ممبر	۴۱	
نامزد		۱۶ (اس میں کشمیر کے ۴ نامزد ممبر بھی شامل ہیں)
خالی		
	۴۹۹	۲۱۹

خواتین ممبروں کی تعداد صوبجاتی اعتبار سے ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوگی۔

خواتین ممبروں کی تعداد

صوبہ	لوک سبھا	راجیہ سبھا
آسام	۱	۱
بہار	۲	۳
بمبئی	۳	۲
مدھیہ پردیش	۲	۱
مدراس	۲	۱
پنجاب	۱	۰
یو۔پی	۴	۳
مغربی بنگال	۲	۱
ٹراونکور کوچین	۱	۰
دہلی	۱	۰
ہماچل پردیش	۱	۰
اڑیسہ	۰	۱
راجستھان	۰	۱
نامزد	۰	۱
	۲۰	۱۵

صوبجاتی اعتبار سے ممبروں کی کل تعداد

	لوک سبھا	راجیہ سبھا
آندھرا	۲۸	۱۲
آسام	۱۳	۶
بہار	۵۵	۲۱

	لوک سبھا	راجیہ سبھا
بمبئی	۴۵	۱۷
مدھیہ پردیش	۲۹	۱۲
مدراس	۴۶	۱۸
اڑیسہ	۲۰	۹
پنجاب	۱۸	۸
اتر پردیش	۸۶	۳۱
مغربی بنگال	۳۴	۱۴
حیدرآباد	۲۵	۱۱
جموں و کشمیر	۶	۴
مدھیہ بھارت	۱۱	۶
میسور	۱۲	۶
پیپسو	۵	۳
راجستھان	۲۰	۹
سوراشٹر	۶	۴
ٹراونکور کوچین	۱۲	۶
اجمیر	۲	۱
بھوپال	۲	۱
بلاس پور	۱	۰
کورگ	۱	۰
دہلی	۴	۱
ہماچل پردیش	۳	۱
کچھ	۲	۱
منی پور	۲	
تری پورہ	۲	۱
وندھیا پردیش	۶	۴
انڈمان نکوبار	۱	۰
اینگلو انڈین	۲	۰
نامزد	۰	۱۲
	۴۴۹	۲۱۹

آخری اجلاس (بجٹ سیشن ۱۹۵۵ء) پارلیمنٹ کا نواں اجلاس تھا۔ پہلا اجلاس ۱۲ مئی ۱۹۵۲ء کو منعقد ہوا تھا۔ تین سال کی مدت میں چند مشہور ممبروں کا انتقال بھی ہوگیا۔ ان میں ایس۔ این۔ بی گوہین، شیاما پرشاد مکرجی، لکشمی کانت مترا، آتما سنگھ نامدھاری، ہری ہرناتھ شاستری، گوپالا سوامی آئنگر، رفیع احمد قدوائی اور ہیرا سنگھ چنارہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

• مندرجہ ذیل قابلِ ذکر قانون اس زمانے میں پاس ہوئے۔

۱- پارٹ بی ریاستوں کا قانونِ شادی ۱۹۵۳

۲- قانونِ انسدادِ رشوت ۱۹۵۲

۳- ملازموں کا پراویڈنٹ فنڈ ایکٹ ۱۹۵۲

۴- جرائم پیشہ قوموں کا انسدادی قانون ۱۹۵۲

۵- صدر اور نائب صدر جمہوریہ کے انتخاب کا قانون ۱۹۵۲

۶- توہینِ عدالت کا قانون ۱۹۵۲

۷- مائنز ایکٹ (کانوں سے متعلق) ۱۹۵۲

۸- سینماٹوگراف ایکٹ ۱۹۵۲

۹- کمیشن آف انکوائری ایکٹ ۱۹۵۲

۱۰- کھادی اور کرگھے کی توسیع کا قانون ۱۹۵۳

۱۱- سینماٹوگراف ایکٹ (ترمیمی) ۱۹۵۳

۱۲- صنعتوں کی توسیع و ترقی کا قانون ۱۹۵۳

۱۳- آندھرا اسٹیٹ ایکٹ ۱۹۵۳

۱۴- اسٹیٹ ڈیوٹی ایکٹ (جائیدادوں پر ٹیکس) ۱۹۵۳

۱۵- صنعتی جھگڑوں سے متعلق قانون ۱۹۵۳

ہمارے ملک کا آئین نہایت قابل اور لائق قانون دانوں کی نگرانی میں تیار ہوا تھا۔ ان میں پیش پیش ہمارے صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد تھے۔ آپ ایک نہایت سنجیدہ، مرنجاں مرنج اور صلح کل انسان ہیں۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں آپ اگلی صف کے لڑنے والوں میں سے تھے۔

حصولِ آزادی سے پہلے انگریزی دورِ حکومت میں قانون سازی کا کام مرکزی اسمبلی کے سپرد تھا۔ اس اسمبلی میں پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالویہ، مسٹر محمد علی جناح، مولانا شوکت علی ایسے قومی اور ملکی رہنما مختلف زمانوں میں ملکی خدمت کا حق ادا کرتے رہے۔ سرکاری بنچوں پر

مشہور ہوم ممبروں مالکم ہیلی، مڈمین، جیمز گریلار، ہنری گریک اور میکسویل کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اسمبلی کے پہلے پہل صدر سر فریڈیرک وائٹ تھے۔ لیکن اس کے بعد ایک لمبی مدت تک شری وی جے پٹیل نے کرسیٔ صدارت کو رونق بخشی۔ آپ کا عہدِ صدر کے وقار اور عظمت کا دَور تھا۔ صدر کی کرسی کی عزّت کو برقرار رکھنے کے لئے آپ کو کئی بار سرکاری اکابر سے ٹکر لینا پڑی لیکن آپ نے اپنے فرض کی ادائی کو مقدم سمجھا۔ آپ کے بعد سر ابراہیم رحمت اللہ اور سر عبدالرحیم اسمبلی کے صدر بنے۔ لارڈ ویول کے زمانے میں صدارت کے لئے زبردست مقابلہ شری گنیش واسودیو ماوُلنکر اور شری کاوس جی جہانگیر میں ہوا مقدم الذکر بہت ہی کم ووٹوں کی اکثریت سے صدر منتخب ہوئے۔ آپ بمبئی اسمبلی میں صدر کی حیثیت سے کام کر چکے تھے اور ہر طرح سے شری وی۔ جے پٹیل کی روایات کو تازہ کرنے کے اہل تھے۔

آزاد بھارت میں انتخابات کے بعد آپ لوک سبھا کے اسپیکر منتخب ہوئے اور اب تک ان فرائض کو خوش اسلوبی سے ادا کر رہے ہیں۔ آپ نے ملک کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ قید و بند کی مصیبتیں بھی برداشت کیں اور گاندھی جی کے فلسفے کی پیروی اور تبلیغ بھی کی۔ ۱۹۲۱ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے ۳۶ ویں اجلاس کے آپ جنرل سیکرٹری تھے۔ یہ اجلاس احمد آباد میں منعقد ہوا تھا اور تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈپٹی اسپیکر شری اننتا سینم آئنگر مدراس کے چتّور ضلع کے رہنے والے ہیں۔ وہاں کی بار ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ تھے۔ آپ ہریجن سیوک سنگھ کے صدر بھی رہے ہیں اور ملکی و قومی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ اسپیکر کی غیر حاضری میں لوک سبھا کا کام نہایت ضبط اور نظم سے چلاتے ہیں۔

سرکاری بنچوں پر پنڈت جواہر لال نہرو پردھان منتری اور مولانا آزاد وزیرِ تعلیم کے نام خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ ہندوستان کو آزاد کرانے والے آزمودہ کار رہنماؤں میں آپ کا شمار ہے پنڈت نہرو حتّی الامکان غیر حاضر نہیں ہوتے اور ایوان میں زیادہ سے زیادہ بیٹھنے والے ممبروں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ پارلیمنٹ کی روحِ رواں ہیں۔ جب آپ کسی تاثر کے تحت یا کسی متنازعہ موضوع پر تقریر فرماتے ہیں تو مخالف بنچوں سے بھی داد و تحسین کی آواز آتی ہے۔ بعض اہم مسائل پر اپنے ساتھیوں سے اختلافِ رائے کا اظہار اس دلیری اور صاف بیانی سے کرتے ہیں کہ مخالفت باقی ہی نہیں رہتی

ملک کی ترقی اور عوام کی بہبود آپ کے پیشِ نظر ہے۔ خلوصِ نیّت سب کو رام کر لیتی ہے۔ آپ کی ودیشی پالیسی نے ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ملکوں کو ہندوستان کا گرویدہ بنا لیا ہے۔ مغربی ممالک بھی آپ کی میانہ روی اور دیانت پر مبنی سیاست کے قائل ہیں۔

مولانا آزاد کانگریسی حلقوں میں خاص احترام کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کے تدبّر اور توازن کے دوست دشمن سبھی قائل ہیں۔ لوک سبھا میں جب کبھی مخالفت کی آندھی آتی ہے آپ نے مخالفین کا نہایت استقلال اور سلامت روی سے مقابلہ ہی نہیں کیا بلکہ ایسے مدلّل اور حق پر مبنی جواب دئے ہیں کہ ہر طرف سے خراجِ تحسین ملا ہے۔ ملکی معاملات میں بھی آپ کی رائے صائب ہوتی ہے۔ حکومت کے نازک معاملات اور مسائل میں آپ کے مشورے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایک متبحر عالم، ایک سنجیدہ سیاست داں، ایک مدبّر رکن کا بینہ غرض ہر لحاظ سے آپ کی ہستی ملک کے لئے ایک نعمت ہے۔

جیسا کہ اعداد و شمار سے ظاہر ہے، پارلیمنٹ میں ہر نقطۂ خیال کے لوگ جمع ہیں۔ ان سب کو اظہارِ خیال کی آزادی ہے۔ دائیں اور بائیں بازو کی اصطلاح میں اگر سرکاری اور مخالف پارٹیوں کا جائزہ لیا جائے تو مخالف پارٹی میں ایک سو سے زیادہ ممبر ہوں گے۔ یہ ممبر کمیونسٹ، سوشلسٹ، ہندو سبھائی والیانِ ریاست، جاگیردار، سرمایہ دار، جن سنگھ، اکالی اور دیگر نقطۂ ہائے خیال کے نمائندہ ہیں مخالف پارٹی میں اچھے اچھے مقرر ہیں۔ شری گوپالن کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر ہیں۔ سرکاری بنچوں کی مخالفت کا ایک بڑا بار آپ پر ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کی ڈپٹی لیڈر محترمہ رینو چکرورتی بھی نہایت فصیح تقریر فرماتی ہیں۔ ہندو سبھا کی طرف سے وی۔ جی دیش پانڈے کو جب موقع ملتا ہے، آگ کی طرح برستے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ صرف محدود نقطۂ خیال کے آدمی ہیں۔ شری این۔ سی چیٹرجی جو سپریم کورٹ کے ایک کامیاب وکیل ہیں جب کبھی گورنمنٹ پر اپنے اعتراضوں اور طعنوں کی بارش کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے وہ وہی دلیلیں پیش کر رہے ہیں جو اُن کے حق میں ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن اپنی سنجیدہ تقریروں اور صاف گوئی کے لئے مشہور ہیں۔ آپ نے ملک و قوم کی گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اُردو میں نہایت شستہ اور سلجھی ہوئی تقریر فرماتے ہیں۔ مسٹر سعادت علی خاں حیدر آباد کے نوجوا

ممبر ہیں۔ وزارت خارجہ میں پارلیمنٹری سکریٹری ہیں۔ حال ہی میں متعدد بار سوالات کا جواب دینے میں آپ نے غیر معمولی فراست اور حاضر جوابی کا ثبوت دیا ہے۔

شریمتی سچیتا کرپلانی پرجا سوشلسٹ پارٹی کے نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی انقلابی لڑائی لڑ رہی ہیں۔ ان کی آواز میں گھن گرج تو نہیں لیکن ایک تاثر اور لوچ ضرور ہے۔

شاعری، موسیقی، لفظی شعبدہ بازی اور لطیفہ گوئی میں ہر بیدر ناتھ چٹوپادھیائے کا جواب نہیں۔ کبھی کبھی آپ ہاؤس کو زعفران زار بنا دیتے ہیں۔

پُرانے بزرگوں میں شری پرشوتم داس ٹنڈن اور پنڈت ٹھاکر دت بھارگو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ قدامت سے دلدادگی کے باوجود ٹنڈن جی میں بے انتہا خلوص اور دیانت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ موقع ہو تو آپ اپنے ضمیر کا حکم مانتے ہوئے پارٹی وہپ کے خلاف بھی ووٹ دینے کی جرأت رکھتے ہیں۔

وزیروں میں وزیر خزانہ شری دیش مکھ، شری لال بہادر شاستری اور شری گلزاری لال نندہ بڑے محنتی اور سنجیدہ مزاج وزیر ہیں۔ شری بی، وی کیسکر سوالات کرنے والوں کو مدلل جواب دینے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سردار سورن سنگھ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ان کا انتخاب کرنے میں پردھان منتری حق بجانب تھے۔

شریمتی وجے لکشمی پنڈت لندن میں ہائی کمشنر مقرر ہونے سے پہلے اس ہاؤس میں اپنی خوش بیانی کے جوہر دکھاتی رہی ہیں۔ ہاؤس میں اُن کی غیر حاضری سے ایک خلا پیدا ہوگیا ہے۔

رفیع احمد قدوائی مرحوم کا ہنس مکھ چہرہ سب کو یاد آتا ہے۔ ہر چند وہ کوئی فصیح مقرر نہیں تھے لیکن اُن کی موجودگی ایک ایسی دولت تھی جسے کھو کر آج لوک سبھا کو افلاس کا احساس ہو رہا ہے۔

شری کیلاش ناتھ کاٹجو عزمِ مستقل کے مالک اور یقینِ محکم رکھنے والے لوگوں میں سے ہیں۔ حال ہی میں آپ ہوم ممبر سے ڈیفنس ممبر مقرر ہوئے ہیں۔ اور یو۔ پی کے ہر دلعزیز وزیر اعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنت ہوم ممبر کی حیثیت سے مرکز میں آئے ہیں۔ پنڈت پنت ایک زمانے میں مرکزی اسمبلی میں پنڈت موتی لال نہرو کے نائب کی حیثیت سے کام کرتے اور اپنی خوش بیانی کی داد پاتے رہے ہیں۔ آپ ایک تجربہ کار منتظم اور معاملہ فہم انسان ہیں۔ حال ہی میں ایک دو ریاستوں کے جھگڑوں کو نپٹانے میں آپ نے بڑی معاملہ فہمی کا ثبوت دیا ہے۔

راجیہ سبھا کی صدارت دیش کے وائس پریزیڈنٹ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے سپرد ہے۔ آپ ایک مشہور عالم اور فلسفی ہیں۔ آپ ایک فصیح مقرر ہیں۔ اس سے قبل علم کے ساتھ ساتھ سیاست کی معراج پر بھی پہنچ چکے ہیں۔ انتخاب سے پہلے آپ ماسکو میں بھارت کے سفیر تھے۔ اپنے عہدِ سفارت میں آپ نے روس اور ہندوستان کے تعلقات کو قریب تر لانے کے سلسلے میں ملک کی گراں قدر خدمات انجام دی تھیں۔ راجیہ سبھا میں مشہور ادیب، اہلِ علم و فن، سیاست و صنعت وغیرہ کے بارہ نامزد ممبر بھی ہیں۔ اس طرح ملک کے قابل ترین فرزندوں کی خدمات راجیہ سبھا کو حاصل ہیں۔ عام طور پر اوپر کے ایوانوں میں سرگرمی اور زندگی کے آثار کم ہوتے ہیں۔ لیکن بھارتی راجیہ سبھا ہر مسئلے پر غور و خوض کرنے میں لوک سبھا سے کم سرگرمی نہیں دکھلاتی۔

ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کی آئندہ ترقی اور بہبود کے منصوبے منظور کرنے والے یہ ایوان ہائے قانون سازی بہترین تدبر کا ثبوت دیتے رہیں گے اور ایسی روایات چھوڑیں گے جو آئندہ نسلوں کے لئے صحیح ہدایت ثابت ہوں۔

معلومات اور اعداد و شمار

۱۔ ۱۹۵۳ء میں ہندوستان سے سوویٹ یونین کو ۶۳ لاکھ روپے کا مال برآمد کیا گیا۔ ۱۹۵۴ء میں ۲ کروڑ ۵۲ لاکھ روپے کا مال برآمد کیا گیا۔

۲۔ ۱۹۵۳ء میں سوویٹ یونین سے ۴۴ لاکھ روپے کا مال ہندوستان آیا اور ۱۹۵۴ء میں ایک کروڑ ۱۳ لاکھ روپیہ کا مال ہندوستان آیا۔

۳۔ ۱۹۵۴ء میں ہندوستان نے ۱۲ کروڑ ۱۵ لاکھ ۹۰ ہزار گز سوتی کپڑا بیرونِ ملک بھیجا ہے۔

۴۔ ستمبر ۱۹۵۴ء تک اجتماعی پروجیکٹ، اجتماعی ترقی اور دیہی توسیع کی قومی سروس کی اسکیموں کے تحت تعلیم بالغاں کے ۱۲۶۸۱ مرکز قائم کئے گئے

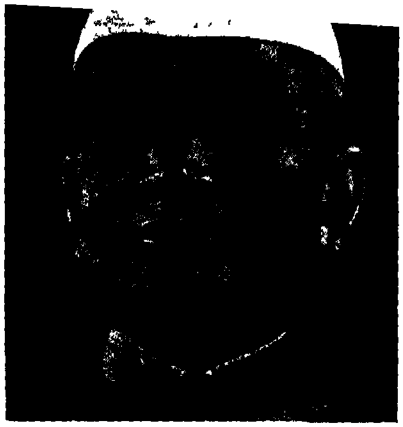


سعادت حسن منٹو اپنی بچیوں کے ساتھ

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود



سي-ڈي ديشمکھ



کیلاش ناتھ کاٹجو



جي - وي ماولنکر



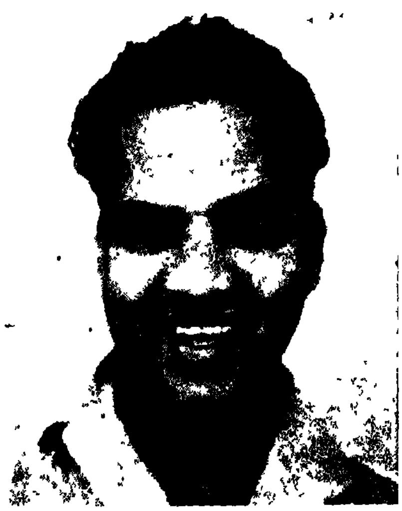
ديوان چند شرما



حفظ الرحمن

بھا

اس موضوع پر پرو
دلچسپ مضمون
صاحب مضمون
اعداد و شمار دے









ابولکلام آزاد



رادھا کرشنن



جواہر لال نہرو



سعادت علی خان



بیگم اعزاز رسول

نٹ

ممبر پارلیمنٹ کا
ملاحظہ فرمائیے
متعلق دلچسپ
ت بڑھا دی ہے









"ادھیکار" میں اوشا کرن



دلیپ کمار اور مینا کماری فلم "آزاد" میں

"گرم کوٹ" میں نروپا رائے



متعلقہ مضمون ۲۹ تا ۳۲ صفحے پر ملاحظہ فرمائیں

پریم لتا دیپ

نئے ہندوستانی فلم

پچھلے چندماہ میں پردۂ سیمیں پر جو ہندی فلم پیش کئے گئے ہیں اُن میں سے کچھ کا تذکرہ یہاں کیا جارہا ہے۔ تنقید کے لئے فلموں کا انتخاب کسی خاص اعتبار سے نہیں کیا گیا بلکہ کچھ ایک فلم بطور نمونہ چھانٹ لئے گئے ہیں

کسی ادبی یا سماجی شاہکار کی کامیابی کا راز اس بات پر منحصر ہے کہ اس میں عوام کے لئے کوئی پیغام ہو، وطن کی ترقی کے لئے کوئی سجھاؤ ہو یا پھر ایسے مسئلوں کا حل پیش کیا گیا ہو۔ کسی فلم کا مقصد صرف دل بہلاؤ بھی ہو سکتا ہے لیکن دل بستگی فراہم کرتے ہوئے بھی ترقی کی جانب اشارے کئے جاسکتے ہیں ورنہ کوئی بھی تخلیق مفید ثابت نہ ہوگی۔

ادھیکار

موہن سہگل کی زیرِ ہدایت تیار کئے گئے فلم ادھیکار میں عورت اور مرد کے مساوی حقوق جیسے اہم مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہدایت کار موہن سہگل نے اس سے پہلے فلم اولاد پیش کیا تھا۔ اُس میں اس نے اپنی اور پرائی اولاد میں عام طور پر جو فرق سمجھا جاتا ہے اُسے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا تھا۔

ادھیکار کی کہانی مؤثر ہوتے ہوئے بھی کہیں کہیں کھٹکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ واقعات کہانی کو لمبا کرنے کی غرض سے یونہیں جوڑ دئے گئے ہیں ان میں بناوٹ جھلکتی ہے۔ مثال کے طور پر ہیروئن کا مایوس ہوکر کنبھ کے میلے میں چلے جانا اور وہاں ہیرو کی لڑکی سے ملنا، بچی کا وہاں کھو جانا، ہیروئن کو بچی کے ساتھ یکایک محبت ہو جانا وغیرہ وغیرہ

اس کا مطلب یہ نہیں کہ کہانی معیار سے گرگئی ہے یا اپنے مقصد کو پورا نہیں کرتی یا پھر کہانی دل چسپ نہیں۔ شروع سے لے کر آخر تک کہانی میں تازگی اور کشش ہے۔ ایک کنجوس آدمی کو لے کر مزاح کا پہلو اُجاگر کیا گیا ہے وہ اپنی زندگی کو کس سانچے میں ڈھال لیتا ہے اسے قابلِ تعریف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ملدن تو ہر کردار کی اداکاری سراہنے کے قابل ہے لیکن یشودھرا کاٹجو اور راد ھاکرشن کی اداکاری سامعین پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ پگلی بہن کے کردار میں یشودھرا کاٹجو کی اداکاری بڑی نیچرل ہے اور راد ھاکرشن نے کنجوس کا پارٹ کامیابی سے نبھایا ہے۔ ہمیشہ کی طرح اوشا کرن نے اس میں بھی قابلِ داد اداکاری کی ہے کشور کے پارٹ کو بھی چار چاند لگ جاتے اگر وہ زیادہ ہاتھ پاؤں نہ مارتا۔ اس سے اُس کے پارٹ میں چھچھوراپن آگیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹی بچی کے پارٹ کو بھی نہیں بھول سکتے جس کے لئے کیمرہ غیر ضروری دکھائی دیتا ہے۔ اس فلم میں نیل کنٹھ تیواڑی ایم دھون، دیپک اور راجہ مہدی علی خاں کے لکھے ہوئے گیت کافی اچھے ہیں اور موسیقی کی ترتیب بھی خوب ہے۔ گیتوں میں روماں کے علاوہ پیغام ہے۔ طنز ہے اور مقصد بھی ہے۔ دُھنیں دل کش ہونے کی وجہ سے کافی مقبول ہوتی ہیں۔

ان کے علاوہ فوٹو گرافی سیٹنگز اور کاسٹیوم پر بھی کافی محنت کی گئی ہے۔

نوکری

بیکاری کا مسئلہ ہمارے ملک کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ ڈائرکٹر بمل رائے نے اپنے فلم میں اس اُلجھن کو سُلجھانے کی کوشش کی ہے، لیکن سوال پھر بھی سوال ہی رہا، جواب نہیں مل سکا۔ آغاز سے انجام تک سامعین اس امید میں بیٹھے رہتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں تو اس مسئلے کا حل ملے گا ہی۔ مگر نہیں، حل کی جگہ نا اُمیدی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ آخر میں عوام سے اپیل کی جاتی ہے کہ فلم کے ہیرو کی مانند کئی بے کار نوجوان ہیں جن کی مدد کرنا عوام کا فرض ہے۔ کیوں؟ یہ مصنّف یا ڈائرکٹر نہیں بتا سکے۔ فلم کا مرکزی خیال خوب تھا مگر کہانی کا چناؤ ٹھیک نہیں ہوا۔ ہدایت کاری بھی اتنی کامیاب نہیں جتنی کہ عام طور پر بمل رائے کے فلموں میں ہوتی ہے۔

مصنّف سبھودھر بوس کی کہانی نوکری میں کئی خامیاں ہیں۔ ایک

تعلیم یافتہ نوجوان کا اپنے تقسیم نامے کو بڑی لاپروائی سے گھر کے میٹر بکس میں
چھوڑ دینا جہاں کہ اُسے معلوم ہے لوگ اُس کے حق میں نہیں ہیں بالکل غیر قدرتی
ہے، ایک بے کار نوجوان کا نٹوں کی طرح محبت میں اُچھلنا کودنا، شاعر کو ایک
احمق کی شکل میں پیش کرنا، لڑکی کا بھاگ کر اپنے محبوب کے پاس چلے جانا۔ کئی
والوں کا بہت دنوں تک اُس کا پتہ نہ لگانا وغیرہ کتنی ہی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔ کہانی
کمزور اور غیر قدرتی سی نظر آتی ہے۔

لیکن پھر بھی ہمیں فلم کی خوبیاں نہیں بھولنی چاہئیں۔
کہانی کا آغاز بڑے مؤثر انداز میں ہوا ہے۔ بے کار نوجوان غریب ماں
باپ اور مریض بہن کو چھوڑ کر نوکری کی تلاش میں نکلتا ہے۔ انھیں پڑھتی جاتی ہیں
مشکلات راستہ روکتی ہیں پھر بھی نوجوان امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا
اور در بدر بھٹکتا ہے۔ دوسری طرف بورڈنگ کے نوکر کے دل میں اس نوجوان کے
لئے ہمدردی، نوکری مل جانے کے بعد یک لخت برخاستگی کی وجہ سے مایوسی، لیکن پھر
مل جانے پر مسرت وغیرہ کئی خوبصورت اور قدرتی باتیں بھی ہیں۔ جن کے باعث
کبھی کبھی فلم میں تازگی اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ مزاح بھی اچھا ہے لیکن
اُس کا غیر قدرتی ہونا کھٹکتا ہے۔ بے کار پڑوسیوں کا لکڑی کی دیوار سے گردنیں
نکال کر گانا بے حد مضحکہ خیز ہے کیونکہ جو ماحول پیدا کیا گیا ہے وہ سراسر بناوٹی اور
غیر قدرتی ہے۔ اصل میں دو بیگھہ زمین اور پرنیتا جیسے کامیاب فلموں کی ہدایت کاری
کے بعد بمل رائے سے ایسی گھٹیا قسم کی باتوں کی امید نہیں کی جاتی۔
کشور کمار ایک اچھا اداکار ہے لیکن اُس کی ضرورت سے زیادہ اُچھل کود
اُسے، ناک بھوں چڑھانے اور ایسی ہی دوسری حرکتوں سے مرکزی کردار میں ہلکا پن
پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اداکاری میں توازن ضروری ہے۔ نوکر کے کردار میں
کنہیا لال کی اداکاری اچھی ہے۔ کرشن کانت شاعر کے کردار میں، کچھ بے وقوف
بنے ہیں۔ ہیروئن شیلا رمانی کی اداکاری میں کوئی بات قابلِ ذکر نہیں ملتی۔
اس کی اداکاری بالکل گھٹیا قسم کی ہے۔
شیلیندر کے لکھے ہوئے گیت بُرے نہیں، موسیقی میں کوئی جان نہیں۔

فوٹوگرافی وغیرہ بھی درمیانہ درجے کی ہے۔

اگرتی

بھارت کے بچّوں کو اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ اُن کے لئے الگ فلم نہیں
تھے۔ پھر اُن کی تفریح کا سامان کیسے ہو۔ یہ شکایت بہت حد تک بجا ہے۔ اس

کمی کو دھیان میں رکھتے ہوئے جاگرتی فلم بنایا گیا ہے۔ اس فلم میں تفریح کا سامان
ہے۔ بچوّں کی تعلیم کا خیال رکھا گیا ہے۔ مزاح کے ساتھ ساتھ حوصلہ افزا باتیں
بھی شامل ہیں۔ اداکار سبھی بچے ہیں اور سب نے اپنا اپنا کردار خوبی سے نبھایا
ہے۔ بچوّں کے دل بہلاؤ کے لئے فلموں میں کھیل کود ہے، ناٹک ہے اور ایک دوسرے
سے بڑھ کر کام کرنے کی خواہش کو ترقی دینے کے لئے مقابلہ بھی رکھا گیا ہے۔ عامیانہ
معیار سے اونچا اُٹھ کر ترقی کی طرف آگے بڑھنے والے بچوّں کو انعام وغیرہ دے کر
ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے مناظر بھی پیش کئے گئے ہیں۔ دیش اور باپو کے لئے ایثار
اور محبت کے جذبے کو بھی خوب اُبھارا گیا ہے۔ فلم کی کہانی اگرچہ کالج کی چار دیواری
کے اردگرد ہی گھومتی ہے۔ پھر بھی واقعات مختلف ہونے سے فلم دلچسپ بن
گیا ہے۔
یوں تو کہانی بُری نہیں لیکن اُس میں ایک خاص کمی ہے۔ اجے ایک آوارہ
لڑکا ہے۔ اُسے راہِ راست پر لانے کے کئی طریقے سجھائے گئے ہیں۔ بدقسمتی سے
ایسے طریقے تلاش کرنے میں ناکام رہنے کی وجہ سے کہانی کے مصنّف نے فراری
ذہنیت سے کام لیا ہے۔ اور اجے کے جگری دوست کو موت کے حوالے کر دیا ہے۔
اس واقعہ کا اجے جیسے بچے کے دل پر گہرا اثر پڑتا ہے اور زندگی کے بارے میں
اس کا نظریہ ہی بدل جاتا ہے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ کوئی سجھاؤ پیش نہ
کر سکنے کی وجہ سے کہانی کے مصنّف نے اس خاص واقعے کی پناہ لی ہے۔ اور یہی
اُس کی ناکامی کی دلیل ہے۔ اگر بچوّں کی شرارتوں کا ذکر بھی مناسب انداز سے
فلم میں آجاتا تو فلم اور بھی مؤثر ہو جاتا۔ اسکول کا ماحول پیش کرنے میں بھی
کہیں کہیں غیر قدرتی باتیں آگئی ہیں۔
کہانی میں اجے ایک آوارہ لڑکا دکھایا گیا ہے۔ گھر میں اُس کی تعلیم تربیت
مناسب ڈھنگ سے نہ ہو سکنے کی وجہ سے اُسے بورڈنگ ہاؤس میں بھرتی
کرا دیا جاتا ہے لیکن یہاں آکر اُسے چہل اور شرارت کرنے کے لئے اور بھی وسیع
میدان مل جاتا ہے۔
بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ پُرانی وضع کے دقیانوسی قسم کے آدمی ہیں۔ جن
سے چڑ کر بچے شرارتوں کا تانتا باندھ دیتے ہیں۔ آخر ان کی جگہ دوسرے اُستاد
کو انچارج بنا دیا جاتا ہے جو عالم، فاضل، عقل مند، رحم دل اور ترقی پسند ہیں۔
وہ مار پیٹ میں یقین نہیں رکھتے۔ وہ محبت، پیار اور نفسیاتی ڈھنگ سے
بچوّں کے دلوں پر قابو پانا جانتے ہیں۔ اُن کے آنے کے بعد سکول کا ماحول ہی

بدل جاتا ہے۔ اسکول میں نئی زندگی اور تازگی آ جاتی ہے۔

ایک رحم دل اُستاد کے کردار میں ابھی بھٹاچاریہ کا اور بے آسرا لڑکے کے کردار میں رتن کمار کا ایکٹنگ بہت اچھا تھا۔ فلم کا ہیرو بالک راجکمار گپت زیادہ تربیت یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے شاید اپنے کردار کو اچھی طرح سے نبھا نہ سکا۔ سپرنٹنڈنٹ کو بہت موٹا ظاہر کرکے اچھا خاصا کارٹون بنا دیا گیا ہے۔ کہیں کہیں ان کی حرکتیں بھدی بھی لگتی ہیں۔ بانز سینا (بچوں کی بینڈ فوج) میں ایک چھوٹا سا بچہ اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اس کے بلینے کافی چیٹ پٹے ہیں۔ باقی کردار بھی اچھے ہیں۔

فلم کے گیت دل کش ہیں۔ اس کا سہرا کوی پردیپ کے سر ہے۔ ویسے فلم اچھا ہے اور امید ہے کہ اس موضوع پر اور بھی فلم تیار کئے جائیں گے۔

گرم کوٹ

موجودہ سماجی ڈھانچے میں سب سے زیادہ مصیبت زدہ طبقہ نچلا درمیانی طبقہ ہے۔ چھوٹے درجے کے کلرک، منشی وغیرہ۔ سماج میں اپنا وقار، اپنی عزت اور شہرت کو برقرار رکھنے کے لئے انھیں کئی ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جن میں ان کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ اُتنا اثاثہ پاس نہ ہونے سے یہ لوگ ہمیشہ مصیبتیں جھیلتے رہتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم، گھر کے کپڑے، برتن وغیرہ سبھی اشیاء کی ضرورت رہتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے لکھے اور پیش کردہ فلم گرم کوٹ میں اس طبقے کی عکاسی کامیابی سے ہوئی ہے۔ لیکن سو روپے کا نوٹ کھو جانے پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بات کا بتنگڑ بنا دیا گیا ہو۔ پھٹے کوٹ کی جیب سے سو روپے کے نوٹ کا استر کے اندر چلے جانا تو ممکن ہے لیکن سو روپے کا نوٹ ڈاک کا ٹکٹ تو ہے نہیں کہ استر کے اندر پہنچ جائے تو اس کا پتہ ہی نہ چلے۔ خاص طور پر جبکہ وہ کوٹ روز پہنا جاتا ہو اور گھر بھر کو معلوم ہو کہ نوٹ جس جگہ بیٹھا ہوا ہے۔

یہ مانا کہ کم تنخواہ پانے والے کلرک کے گھر میں دودھ کی ندیاں نہیں بہتیں، لیکن اُس کی زندگی میں اتنی مشکلات بھی نہیں کہ اس چھوٹے سے واقعہ سے اس کے گھر میں مردنی چھائی رہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی عام کلرک کی زندگی کا نہیں بلکہ کسی بد قسمت بے کار کی زندگی کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے۔ پھر بھی کہانی کے پلاٹ میں کشش ہے۔ دُنیا سے دیا اور دھرم اٹھ نہیں گئے۔ انسانیت ابھی تک باقی ہے۔ یہ بات پٹھان کے کردار میں واضح کی گئی ہے۔ پٹھان کا جسم گو لحیم شحیم ہے لیکن اس کا دل جذبے سے بھرپور ہے۔ دفتر کے ساتھیوں کا آپس کا میل جول، محبت اور ہمدردی قابلِ تعریف ہے۔ فلم میں ایک اور بھی خاصیت ہے۔ پنجابی کلرک کے گھر کا ماحول بہت ہی خوبصورتی سے دکھایا گیا ہے۔ پنجابی لباس کے علاوہ مونڈھے، ٹوکریاں، برتن رکھنے کا چھجہ، گملے میں لگا ہوا تلسی کا پودا، کھیس، ڈھیلی چارپائیاں، دھاری دار پاجامے، کانوں کی بالیاں، ٹوپیاں، شال اوڑھنے کا ڈھنگ سبھی باتیں خالص پنجابی معلوم ہوتی ہیں۔

اگر درمیانے طبقے کے حالات کو ذرا اور وضاحت اور صفائی کے ساتھ پیش کیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ فلم میں کئی ایک مناظر خوب ہیں۔ بیوی کی اپنے شوہر سے محبت اور ہمدردی، ضرورت پڑنے پر کڑی محنت میں دن اور رات ایک کر دینا، لیکن اپنے والدین کے بارے میں کہی گئی کڑوی بات برداشت نہ کر سکنا، اس قسم کے واقعات نہایت خوبی سے دئے گئے ہیں۔ سارے فلم میں مایوسی کے ساتھ ساتھ مزاح کا رنگ بھی خوب نکھرا ہے۔

نروپا رائے، بلراج ساہنی، جینت اور رشید خاں کی خوبصورت اداکاری کے علاوہ دیگر سب اداکاروں نے بھی بہت عمدہ پارٹ ادا کئے ہیں۔ صرف بچوں کے پارٹ کی ہدایت کاری کمزور رہی ہے۔

پنجابی کلرک کی بیوی کے کردار میں نروپا رائے کا ایکٹنگ بڑا قدرتی ہے۔ اور اس لئے خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ بلراج ساہنی نے چاروں طرف سے مار کھائے ہوئے انسان کا کردار بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اوور ایکٹنگ کے باوجود بلراج کا ایکٹنگ کافی نیچرل ہے۔ اس کے کچھ کلوزاپ بڑے اچھے دئے گئے ہیں۔ رشید خاں کی اُچھل کود بھی کافی اچھی لگتی ہے۔

گرم کوٹ ہدایت کار امر کمار کا پہلا فلم ہے۔ یہ دھیان رکھتے ہوئے ان کی تعریف کرنے کو خود بخود جی چاہتا ہے۔ ان کی کوشش کافی حد تک کامیاب رہی ہے۔ کمی ہدایت کاری میں نہیں کہانی میں ہے۔ موسیقی اور فوٹو گرافی کامیاب نہیں۔ سیٹنگز، سکرین پلے اور مکالمے خوبصورت ہیں۔

بلکل

نیو تھیٹرز کا فلم بکُل فلمی دُنیا میں اپنی کوئی خاص جگہ نہیں بنا سکا۔ ایک زمانہ تھا جبکہ نیو تھیٹرز کے نام ہی سے تماشائی کھینچے چلے آتے تھے۔ اُس زمانے اور آج کے زمانے کے فلمی معیار میں بڑا فرق ہے۔

معمولی کہانی، ویسی ہی اداکاری اور ہندی لفظوں کے غلط تلفظ کی وجہ

سے فلم کی اہمیت جاتی رہی ہے۔ آج کے عوام اصل میں ایسے فلم چاہتے ہیں جن کا کوئی مقصد ہو۔ ہلکے اور غیر معیاری فلموں کا اب زمانہ نہیں۔ کہانی میں جان ہو، تازگی ہو، حقیقت بیانی ہو، کسی مسئلے کا حل پیش کیا گیا ہو۔ یہ سب کچھ نہ ہو لیکن اگر کہانی میں واقعات کا تال میل ہو اور ایسے اچھے انداز میں پیش کیا جائے تو بھی کسی حد تک بات بن جاتی ہے۔ لیکن جہاں کہانی کو جھٹکے لگیں وہاں کامیابی کہاں؟ ۔ بظاہر دیکھنے سے یوں لگتا ہے جیسے ایک ہی فلم میں دو کہانیاں چل رہی ہیں۔ اس میں ایسے دو کنبوں کی کہانی ہے جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ اصل میں کہانی میں اتنا دم نہیں کہ تماشائی کی دل چسپی کو قائم رکھ سکے۔ اداکاری، مکالمے، موسیقی، فوٹوگرافی وغیرہ بھی بالکل عامیانہ ہیں۔

اداکاری کے لحاظ سے اوم پرکاش، ہری موہن بوس، اور ببو اور شوبھا کا کام اچھا ہے۔ باقی اداکار بھی بُرے نہیں۔ فلم بالکل معمولی قسم کا ہے۔

آزاد

ایس، ایم نائیڈو کی زیر ہدایت تیار کردہ فلم آزاد کے بارے میں سامعین میں دو طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ فلم ادنیٰ درجے کا ہے۔ اور بعض کی رائے اس کے بالکل برعکس ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ فلم کسی مقصد کو پورا نہیں کرتا۔ اور صرف نچلے طبقے کے شوق ہی کو پورا کرتا ہے۔ باتیں دونوں ٹھیک ہیں۔ اس فلم میں دلبستگی کا ہر طرح کا سامان موجود ہے۔ رقص ہیں، موسیقی ہے، انسانوں اور جانوروں کی کشتیاں ہیں، ڈاکہ زنی کے واقعات، لوگوں کی بھگدڑ، پولیس کے کرتب ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہنسی دل لگی کی باتیں بھی ہیں۔ بدمعاشوں کی شکست دکھائی گئی ہے تو آزاد طبع نوجوان آزاد کی جیت بھی ہے۔ مطلب یہ کہ عوام کی پسندیدگی کا سبھی سامان مہیّا کیا گیا ہے۔ پھر بھی ایسے تماشائی جو ترقی پسند ہیں ان کی تسلی نہیں ہوتی۔ ان کا خیال ہے یہ بھی درست۔ ملک میں جو بھی فنی تخلیق ہو اُس کا کوئی خاص مقصد ہونا چاہیئے جب تک ملک کی کسی طرح کی بھی ترقی کسی فنی شاہکار کا مقصد نہ ہو وہ بے کار ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند عوام اس فلم سے بیزار ہو گئے ہیں۔

آزاد فلم کی کہانی واقعاتی ہے لیکن حقیقت سے دور ہمیں تخیل کی جانب دھکیلتی ہے۔ خان صاحب کے بھیس میں آزاد شہر کی چہل پہل کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اپنی ذاتی زندگی میں چالاک چور کی طرح اُچھل کود مچاتا پھرتا ہے۔ والدین کے نزدیک ہوتے ہوئے بھی اُن سے دور رہتا ہے اور اُن کے پاس بطور امانت رکھی گئی ایک یتیم لڑکی سے محبت کرنے لگتا ہے۔ راز افشا ہو جانے پر اُسی لڑکی سے آزاد کی شادی ہو جاتی ہے۔ پولیس اگر چھان بین میں مصروف رہتی ہے پولیس کی کارروائیاں بڑی دل چسپ ہیں۔

کہانی میں کوئی خصوصیت نہیں۔ تجسّس بھی ہے لیکن معمولی۔ مزاح کا رنگ بھی ہے۔ لیکن بعض اوقات ضرورت سے زیادہ۔

دلیپ کمار کا ایکٹنگ ہمیشہ کی طرح قابلِ تعریف ہے۔ اُس نے اردو، انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں کا استعمال خوب کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اُس کی اداکاری ہر لحاظ سے نہایت پُرکشش ہے۔ راج مہرہ اور اوم پرکاش کی اداکاری بھی خاص ہے۔ مینا کماری نے دکنی عورتوں کی اچھی نقل پیش کی ہے۔ اس کی اداکاری بھی بُری نہیں۔ رانی اور شبھا کشی کا رقص تو حقیقت میں توجّہ کا مرکز ہے۔ باقی اداکاروں کے پارٹ میں کھٹکنے والی کوئی خاص بات نہیں۔

دھنیں اور گیت دونوں دل کش ہیں۔ اداکاروں کے لباس وغیرہ کہانی کے پلاٹ کے مطابق ہیں۔ فوٹوگرافی بھی خوبصورت ہے لیکن سیٹنگز اتنے اچھے نہیں ❊

گھریلو صنعتوں کی ترقّی کے لئے مزید مالی امداد

بھارت سرکار نے کھادی اور دیگر گھریلو صنعتوں کی ترقّی کے لئے مزید عطیے و قرضے منظور کئے ہیں۔ کھادی اور گھریلو صنعتوں سے متعلقہ کل بھارت بورڈ کو دو لاکھ روپے کا عطیہ اور ایک لاکھ روپے کا قرضہ دیا گیا ہے۔ کھادی سے متعلقہ تین تربیتی مراکز قائم کرنے کے لئے بورڈ کو ایک لاکھ اسی ہزار روپے کی رقم دی گئی ہے۔ یہ مراکز راجستھان میں نشو داس پور کے مقام پر، مدھیہ بھارت میں مالا کے مقام پر اور سوراشٹر میں راجکوٹ کے مقام پر اور سوراشٹر میں راجکوٹ کے مقام پر قائم کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بورڈ کی طرف سے گھریلو صنعتوں کی تحقیق سے متعلق ایک ادارہ قائم کیا جائے گا اور اس مقصد کے لئے بورڈ کو واردھا میں سرکسیوا سنگھ سے عمارت ٹھیکہ پر حاصل کرنے کی منظوری دی گئی ہے۔ اس ٹھیکہ کی میعاد شروع میں ۱۵ سال ہوگی۔

شفیق الحسن ہاشمی

بیچ مشرق کے تیل کی اہمیت

مثل مشہور ہے پڑھے فارسی بیچے تیل۔ تیل بیچنے والے لوگوں کا حال تو معلوم نہیں البتہ یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ جو ملک آج کل تیل بیچ رہے ہیں معاشی لحاظ سے وہی سب سے زیادہ مزے میں ہیں کیونکہ اسی تیل کی بدولت کروڑوں روپے ان کو گھر بیٹھے مل رہے ہیں اور وہ دل کھول کر اس روپے سے آرام اُٹھا رہے ہیں ورنہ جن ملکوں کے پاس تیل نہیں ہے وہ دنیا بھر کے جتن کرتے ہیں، زراعت کی ترقی کے لئے کوششیں کرتے ہیں، صنعتیں قائم کرتے ہیں، بڑے بڑے کارخانے کھولتے ہیں پھر بھی ان کو اتنی آمدنی نہیں ہوتی جتنی کہ تیل بیچنے والے ملکوں کو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں تیل کی بے حد اہمیت ہے بلکہ اس زمانے کو اگر تیل کا زمانہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو۔ یہ سیّال مادہ ہماری زندگی کا ایسا لازمی جزو بن گیا ہے جس کے بغیر ہمارا جینا دوبھر ہے۔ تیل سے جو مختلف چیزیں پیدا کی جاتی ہیں وہ ہماری بہت سی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں بلکہ پورے صنعتی نظام کا دارومدار اسی پر ہے اور تجارت میں پٹرولیم (اپنی مختلف شکلوں میں) جتنی اہمیت رکھتا ہے وہ کسی اور چیز کو حاصل نہیں ہے۔ خاص طور پر آنے جانے کے ذرائع کے لئے یہ بہت ضروری ہے۔ بری، سمندری اور ہوائی سفر سب کے لئے پٹرول کی ضرورت ہے موٹر کار، ٹرک، ٹریکٹر، ڈیزل کار، سمندری جہاز اور ہوائی جہاز سب پٹرولیم سے نکلے ہوئے مادوں سے چلتے ہیں۔ یہ تو امن کے زمانے کی ضرورتیں ہوئیں۔ جنگ (جس کے ہونے کے امکانات ابھی پورے طور پر ختم نہیں ہوئے ہیں) کی صورت میں تو اس کی اہمیت اور بڑھ جائے گی۔ موجودہ زمانے کی ایٹم اور ہیڈروجن بموں سے لڑی جانے والی جنگ بھی پٹرول کی محتاج ہے کیونکہ وہ ہوائی جہاز جو بموں کو پھینکنے کے واسطے جائیں گے وہ خود پٹرول سے اڑتے ہیں۔ ٹینک، جیپ، فوجی گاڑیاں، لڑائی کے سمندری جہاز۔ ڈبکی کشتیاں اور نت نئے ڈھنگ کے لڑاکا ہوائی جہاز سب کے سب پٹرول کے بغیر بیکار ہیں۔ موجودہ زمانے کی جنگ جو ایک میکانکی جنگ ہے پٹرول کے بغیر لڑی ہی نہیں جا سکتی جیتنا تو بہت بعد کی بات ہے۔ تیل ایک طاقت ہے جو امن کے زمانے میں بڑی بڑی صنعتوں اور آنے جانے کے وسائل کے لئے ضروری ہے اور جنگ کی صورت میں فوجوں اور فوجی ساز و سامان کی منتقلی کا اسی پر دارومدار ہے۔ یہ امن کی گاڑی کو چلاتا ہے اور جنگ کو حرکت دیتا ہے۔

تیل کے سلسلے میں ایک اور بات جو اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ اس دولت سے قدرت نے چند ملکوں کو نوازا ہے اور اس معاملے میں بیچ مشرق کے ملک بہت خوش قسمت ہیں کیونکہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ساری دنیا میں تیل کے جتنے بھی ذخیرے ہیں ان کا آدھے سے زیادہ ذخیرہ بیچ مشرق میں پایا جاتا ہے خیال ہے کہ یہاں کوئی ۶۲ ارب بیرل (ایک بیرل = ۳۵ برطانوی یا ۴۲ امریکی گیلن اور ایک منری ٹن = ۴ر۶ سے ہے کر ۵ر۷ بیرل) تیل پایا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ممالک متحدہ امریکہ میں ۲۹ ارب بیرل، کینیڈا میں دو ارب بیرل اور لاطینی امریکہ میں ۲۰ ارب بیرل سے زیادہ نہیں ہے یورپ تیل نکالنے والے ملکوں میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور اُلٹا یہ کہ اس کا تیل کا خرچ بہت بڑھا ہوا ہے۔ سوویت یونین اور یورپ کے دوسرے کمیونسٹ ملکوں کو چھوڑ کر باقی یورپ جو تیل پیدا کرتا ہے وہ اس کے صرف ۲۰ فی صد خرچ کو پورا کرتا ہے۔ یہی حال ممالک متحدہ امریکہ کا بھی ہے۔ اگرچہ یہ دنیا میں سب سے زیادہ تیل پیدا کرنے والا یہی ملک ہے چنانچہ ساری دنیا میں جتنا تیل نکلتا ہے اس کا آدھے سے زیادہ ممالک متحدہ میں نکالا جاتا ہے جو یورپ بیچ مشرق کے تیل کا اڑھائی گنا ہوتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تیل کا خرچ بھی ممالک متحدہ میں ہی ہے۔ چنانچہ پوری دنیا کے تیل کا ۲/۳ حصہ اسی ملک میں خرچ ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس رفتار سے ممالک

متحدہ میں تیل نکالا جا رہا ہے اس لحاظ سے وہاں کے ذخیرے پندرہ بیس سال میں ختم ہو جائیں گے اور اس کے بعد امریکہ کے لئے یہ سوال پیدا ہوگا (جو کہ نہایت ہی اہم سوال ہے) کہ اس کی ضرورتوں کے لئے کہاں سے تیل حاصل کیا جائے اور ظاہر ہے کہ اس کی ضرورتیں صرف ایک جگہ سے پوری ہو سکتی ہیں اور وہ ہے ——— بیچ مشرق

بیچ مشرق سے تیل کی اہمیت ایک اور لحاظ سے بھی ہے اور وہ یہ کہ یہاں تیل نکالنے کے لئے اتنا روپیہ نہیں بہانا پڑتا جس کی بعض دوسرے علاقوں میں ضرورت پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر جنوبی امریکہ کے ملک کولمبیا میں تیل کی دریافت کے سلسلے میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۶ء تک تقریباً ۳۰ کروڑ روپیہ خرچ کیا گیا اور تیل کا ایک قطرہ بھی نہیں نکلا۔ اسی براعظم کے دوسرے ملک وینزویلا میں جو آج کل کافی تیل پیدا کر رہا ہے پندرہ سال تک ۲۲ کروڑ روپیہ خرچ ہوا اس کے بعد کہیں تیل دریافت ہوا۔ انڈونیشیا میں حال ہی میں تیل نکلا ہے اور وہ بھی ۱۵ کروڑ روپے کے خرچے کے بعد۔ اس کے خلاف بیچ مشرق میں تیل نکالنے کے لئے اتنی بڑی رقموں کے خرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ یہاں اوسطاً ایک بیرل پٹرول نکالنے کے لئے آٹھ آنے خرچ ہوتے ہیں جبکہ وینزویلا میں ایک روپیہ اور ممالک متحدہ امریکہ میں تین روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہاں کے تیل کا ہر کنواں دل کھول کر تیل اگلتا ہے۔ حساب لگایا گیا ہے کہ ممالک متحدہ امریکہ کا ایک نواں روزانہ ۱۱ بیرل تیل نکالتا ہے، وینزویلا کا ۲۳۰ بیرل اور بیچ مشرق ا ۴۰۰۰ بیرل۔ تیسری سہولت جو یہاں کے تیل منگانے میں ہے وہ فاصلے بچت ہے نہ صرف ایشیائی ملکوں کے لئے بلکہ یورپی ملکوں کے واسطے بھی۔ ثال کے طور پر اگر کوئی جہاز ٹریپولی (لبنان کی ایک بندرگاہ) سے مارسیلز رانس کی جنوبی بندرگاہ) جانا چاہے تو اس کو ۱۸۰۰ میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے ا کے مقابلے میں اگر وہ مارسیلز سے نئی دنیا کی سب سے قریبی بندرگاہ تک جانا ہے تو اس کو ۴۸۰۰ میل کا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ خود برطانیہ کے لئے بھی بیچ رق سے تیل منگانے میں فاصلے کی بچت ہوتی ہے۔ چنانچہ ساؤتھ ہیمپٹن سے م یا لبنان کا فاصلہ ۳۵۰۰ میل سے زیادہ نہیں ہے اس کے مقابلے میں اس رگاہ سے وینزویلا تک پہنچنے کے لئے ۴۶۰۰ میل اور ٹیکساس سے ۵۶۰۰ طے کرنے پڑتے ہیں۔ خلیج فارس سے جو تیل نکالا جاتا ہے اس کو برطانیہ پہنچانے میں فاصلے کی بچت نہیں ہوتی لیکن چونکہ اس علاقے میں زمین سستی ہے اور ملازموں کو تنخواہیں زیادہ دینی نہیں پڑتیں اس لئے یہاں کا تیل مغربی کرّے کے تیل کے مقابلے میں سستا پڑتا ہے۔ اگرچہ ۱۹۴۸ء کے بعد سے بیچ مشرق کے تیل کی قیمت بھی بڑھ گئی ہے جس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ یہاں کی حکومتوں کو زیادہ معاوضہ دینا پڑ رہا ہے پھر بھی یہاں کا تیل مغربی دنیا کے تیل سے سستا ہی ہوتا ہے۔ یورپ والوں کے لئے ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ ان کو بیچ مشرق کا تیل ڈالر کے بجائے اسٹرلنگ ادا کر کے مل جاتا ہے اور اس طرح وہ اپنے ڈالر (جن کی پہلے سے ان کے پاس کمی ہے) بچا سکتے ہیں۔

اس علاقے سے مغربی کمپنیاں جو تیل نکالتی ہیں اس کا معاوضہ وہاں کے بادشاہوں یا حکومتوں کو دیتی ہیں لیکن اس رقم کا ایک بڑا حصہ بالواسطہ طور پر مغربی ممالک کے کارخانوں کے مالکوں اور صناعوں کی جیبوں میں چلا جاتا ہے۔ چونکہ یہاں کے ممالک ابھی تک صنعتی، زرعی اور تعلیمی لحاظ سے بہت زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہیں اس لئے اپنی ضرورتوں کا بہت سامان وہ امریکہ یا یورپ سے ہی منگاتے ہیں۔ اسی طرح وہ روپیہ جو تیل کی وجہ سے ان کو ملتا ہے اس کا ایک اہم حصہ مغربی ملکوں کو ہی مل جاتا ہے۔ ہر قسم کی مشینری، موٹریں، ہوائی جہاز، زرعی اور صنعتی سامان، اچھے قسم کا کپڑا اور استعمال کی دوسری چیزیں ان ملکوں میں سب یورپ یا امریکہ سے آتی ہیں۔ اس طرح یہ مغربی ملکوں کے لئے ابھی تک بہت اچھی مارکٹ بنے ہوئے ہیں۔

یورپ کے مختلف شہروں میں تیل صاف کرنے کے جو بڑے بڑے کارخانے قائم کئے گئے ہیں ان میں زیادہ تر بیچ مشرق سے تیل آتا ہے۔ یہ کارخانے یورپ والوں کے لئے کافی فائدہ مند ثابت ہوئے ہیں۔ سستے داموں تیل حاصل کر کے وہ اس کو صاف کرتے ہیں اور پھر کافی منافع سے اس کو بیچتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کارخانوں کی وجہ سے لاکھوں لوگوں کو روزگار بھی ملتا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۴ء تک انگلستان، ویلز اور اسکاٹ لینڈ کے مختلف شہروں اور ڈنکرک، ہیمبرگ، اینٹورپ، وینس اور ملان میں ان کارخانوں کے قیام سے چھوٹا سا "صنعتی انقلاب" آگیا ہے۔ چنانچہ انگلستان میں ساؤتھ ہیمپٹن کے پاس جو کارخانہ کھلا ہے صرف اسی میں روزانہ ۱۳۰۰۰۰ بیرل پٹرول صاف کیا جاتا ہے۔ برطانیہ میں جو تیل صاف ہوتا ہے اس کا تقریباً ۹۰ فی صد بیچ مشرق سے آتا ہے (جس میں صرف کویت کا ۵۹ فی صد تیل ہوتا ہے) اس طرح مغربی یورپ کے ملکوں کی معیشت بیچ مشرق کے تیل سے گہری حد تک وابستہ ہو گئی ہے اور

ان ملکوں کی اب یہ بھی کوشش ہے کہ پٹرول صاف کرنے کے کارخانے بیچ مشرق کے آزاد ملکوں میں زیادہ تعداد میں نہ کھولے جائیں ورنہ یورپ کے کارخانے بیکار ہو جائیں گے۔ چونکہ یہاں کے ملک زیادہ طاقتور اور صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ نہیں ہیں اس لئے یہ بیچارے مغربی ملکوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں۔

مغربی ملکوں کا شمالی اٹلانٹک معاہدہ یہاں کے تیل کی اہمیت کو اور بڑھا دیتا ہے خاص طور پر اگر جنگ چھڑ جائے تو معاہدہ میں شریک ممالک بغیر یہاں کے تیل کے لڑائی نہیں لڑسکتے۔ یہاں کے تیل کے بغیر مغربی یورپ اور خاص طور پر مغربی جرمنی کو مسلح کرنا تقریباً ناممکن ہے اسی لئے امریکہ اور مغربی یورپ کے ممالک بیچ مشرق پر اپنا تسلّط باقی رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں اگرچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کوئلہ سے بھی کافی کام لیا جا سکتا ہے لیکن ایک تو یہ کہ خود یورپ میں اب کوئلہ اتنی مقدار میں نہیں ہے جو ان کی ضرورتوں کو پورا کر سکے دوسرے جنگ میں جب تک پٹرول نہ ہوگا گاڑی آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔ ماہروں کی رائے ہے کہ ۱۹۵۰ء کے بعد سے یورپ بیچ مشرق کے تیل کا اتنا محتاج ہو گیا ہے کہ اگر اس کو یہ تیل نہ مل سکے تو وہ ایک حد تک بالکل بے بس ہو جائے گا۔ یہ نہ صرف یورپ کے لئے ایک مصیبت ہوگی بلکہ خود ممالک متحدہ پر اس کا بہت بُرا اثر پڑے گا کیونکہ ممالک متحدہ کے بچاؤ کی پالیسی میں مغربی یورپ کی شاید اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ انسان کی زندگی میں سیدھے ہاتھ کی۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یورپ کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ بیچ مشرق کے تیل پر تکیہ کئے بغیر گزارہ کر سکے۔ سب سے پہلے تو انسان کا خیال جوہری توانائی کی طرف جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے ذریعے کارخانوں، ہوائی جہازوں، موٹروں اور دوسری مشینوں کو چلایا جا سکتا ہے لیکن اس کے لئے کافی عرصہ لگے گا کیونکہ ابھی تک اس توانائی کو امن کے کاموں کے بجائے بموں کی تیاری میں زیادہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ حال میں جو تجربے کئے گئے ہیں ان سے پتہ چلا ہے کہ تیل کی جگہ قدرتی گیس اور سلیٹ کی طرح کے ایک نرم پتھر سے بھی کام لیا جا سکتا ہے اور یہ دونوں چیزیں ممالک متحدہ امریکہ میں کثیر مقدار میں اور یورپ میں تھوڑی مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے ذخیرے پوری مغربی دنیا کی ضرورتوں کو تقریباً ایک ہزار سال تک پورا کر سکتے ہیں۔ ان چیزوں سے وہی کام لیا جا سکتا ہے جو آج کل تیل سے لیا جا رہا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے بھی ابھی کافی عرصہ لگے گا کیونکہ اس وقت ان کی تیاری میں جتنا روپیہ، محنت اور وقت صرف ہوتا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ عام استعمال کے لئے اس کو پیدا کرنا منافع بخش نہیں ہے۔ اور اسی لئے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ابھی کافی دنوں تک دنیا کو پٹرولیم پر ہی بھروسہ کرنا ہوگا اور چونکہ پٹرولیم سب سے زیادہ بیچ مشرق سے نکل سکتا ہے اس لئے مغربی ملکوں کے نزدیک بیچ مشرق کی بے حد اہمیت ہے۔

یہاں ابھی تک بہت سارا علاقہ ایسا پڑا ہے جس کی کھوج نہیں کی گئی۔ اگر چھان بین جاری رہے تو توقع ہے کہ یہاں سے اور زیادہ تیل نکل سکتا ہے۔ یہ تیل زیادہ تر خلیج فارس اور دجلہ فرات کے دریاؤں کے آس پاس کی زمین کے نیچے ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ پورے کا پورا سمندر تھا جو بعد میں دریاؤں کی ریت کی وجہ سے خشکی بن گیا۔ اس علاقے میں وہ تمام خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جو تیل رکھنے والی زمین میں ہوتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہاں تیل نکالنے میں بعض دشواریاں بھی پیش آتی ہیں۔ سب سے بڑی مشکل تو یہ ہے کہ یہ تمام علاقہ زیادہ تر ریگستانی ہے جہاں گرمی کا موسم بہت سخت ہوتا ہے اور خاص طور پر مغربی ملکوں کے رہنے والوں کے لئے (جو کہ تیل کے چشمے دریافت کرتے اور تیل نکالتے ہیں) یہ بالکل موزوں نہیں ہے۔ پھر فاصلے بھی اتنے زیادہ ہیں اور آنے جانے کے راستے بھی اتنے خراب ہیں کہ پہلے انھیں چیزوں کو درست کرنے کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے بعض جگہوں پر پینے کا پانی بھی نہیں ہے اور تیل اور پانی دونوں کے کنوؤں کی تلاش کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح تیل نکالنے والی کمپنیوں کو تیل نکالنے کے علاوہ سڑکیں، ہوائی اڈے اور اپنے عہدے داروں اور دوسرے ملازموں کے لئے مکانات بھی بنانے پڑتے ہیں لیکن اس تیل کی بدولت یہ ضرور ہوا ہے کہ ان جگہوں پر جہاں آج سے کچھ سال پہلے اونٹوں کے قافلے چلا کرتے تھے۔ آج کل بیوک، کیڈی لک، کرائیسلر اور اولڈس موبائیل کی خوب صورت موٹریں دوڑتی نظر آتی ہیں۔

دشواریوں کے ساتھ ساتھ اس علاقے میں تیل نکالنے کے لئے کچھ ایسی بھی سہولتیں ہیں جو دوسری جگہوں پر نہیں ملتیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جن جن زمینوں میں تیل نکلا ہے وہ بڑی حد تک بے کار پڑی تھیں اور ان

سلئے ان پر لوگوں کا قبضہ نہیں تھا بلکہ یہ حکومت کی ملک تھیں۔ اس طرح کمپنیوں کو مختلف اشخاص سے زمین حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ نہیں کرنی پڑی بلکہ انھوں نے براہ راست بادشاہ یا حکومت سے اجازت لے کر وہاں کا ٹھیکہ لینا شروع کیا اور تیل نکالنے لگیں۔ دوسرے یہ کہ اس علاقے میں تیل نکالنے کے لئے اتنا وقت، محنت اور روپیہ صرف نہیں کرنا پڑا جو دوسری جگہوں پر ہوا اور بہت سی زمینوں کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید وہ انتظار میں تھیں کہ کوئی تیل نکالنے والا آئے اور وہ تیل اگلنا شروع کر دیں۔ پھر اکثر تیل کے کنوئیں کم گہرائی پر نکل آئے اور اس طرح اخراجات کی بہت زیادہ بچت ہو گئی۔ تیل نکالنے کے سلسلے میں جو ہزاروں آدمیوں کی ضرورت پڑی اس کے لئے انھوں نے یہ کیا کہ جو اونچے عہدے تھے ان پر یورپینوں اور امریکنوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دے کر مقرر کیا اور معمولی ملازمتوں پر ان کو وہیں کے یا دوسرے ایشیائی ملکوں کے لوگ مل گئے جن کو اتنی تنخواہیں نہیں دینی پڑیں جتنی کہ امریکہ یا یورپ میں دینی پڑتی ہیں۔ یہاں کے تیل کی ارزانی کا یہ بھی ایک سبب ہے۔

تیل نے ایک طرح سے یہاں کے ملکوں کے تعلقات کو اور زیادہ مضبوط بنایا ہے کیونکہ یہاں کے بعض ملک جن میں تیل پایا جاتا ہے ان کے پاس ایسی سہولتیں نہیں ہیں یا ان کا جغرافیائی محل وقوع ایسا نہیں ہے کہ وہاں تیل صاف کرنے کے کارخانے بھی قائم کئے جا سکیں اس لئے قریب کے ملکوں میں یہ کارخانے قائم کئے گئے ہیں اس طرح یہ ملک ایک دوسرے سے بہت زیادہ وابستہ ہو گئے ہیں۔ اس کی مثال عراق اور شام سے مل سکتی ہے۔ عراق میں تیل نکالا جاتا ہے اور چونکہ شام کی بحیرہ روم پر ایک آدھ بندرگاہیں ہیں اس لئے یہاں پر تیل صاف کرنے کے کارخانے کھولے گئے ہیں اور پائپ لائنوں کے ذریعے عراق سے شام تک تیل بہتا ہے اس طرح ان دونوں ملکوں کی معیشتوں پر ایک دوسرے کا گہرا اثر پڑنے لگا ہے۔

مشرق میں تیل نکالنے کی طرف سب سے پہلے انگریزوں نے توجہ کی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انیسویں صدی کے خاتمے سے پہلے ہی یہاں کا ایک بڑا حصہ ان کے "دائرہ اثر" میں آ گیا تھا چنانچہ ۱۸۷۲ء میں لارڈ رائٹر نے شاہ ایران سے تیل کو تلاش کرنے کی اجازت لی۔ ۱۹۰۱ء آسٹریلیا کے ایک سرمایہ دار نے اس کام کو اور زیادہ وسیع پیمانے پر شروع کیا لیکن اس کو ایران کے پانچ شمالی صوبوں میں کھوج لگانے کی اجازت نہیں مل سکی کیونکہ اس کے لئے روس نے پہلے ہی سے اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا۔ آسٹریلوی باشندے سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کے تحت یہ طے ہوا تھا کہ اگر تیل نکلا تو منافع کا ۱۶ فی صد شاہ کو دیا جائے گا اور باقی وہ خود رکھے گا۔ سالوں کی کوششوں کے بعد شوستر کے قریب ایک فوارہ نکلا اور مشرق وسطیٰ میں تیل کا گویا یہ سب سے پہلا فوارہ تھا جس کے بعد سے اور زیادہ کمپنیوں نے اس طرف توجہ دینی شروع کی۔ ۱۹۰۹ء میں اینگلو پرشین تیل کمپنی (جو بعد میں اینگلو ایرانین تیل کمپنی کہلائی) نے بڑے پیمانے پر تیل نکالنے کا کام شروع کر دیا۔

۱۹۱۳ء میں ونسٹن چرچل (جو اس زمانے میں وزیر بحریہ تھے) نے ایک اہم تصفیہ کیا کہ برطانوی سمندری بیڑے میں کوئلے کی جگہ تیل کا استعمال کیا جائے۔ اس طرح برطانوی حکومت کو بھی تیل کی ضرورت پڑ گئی چنانچہ اس کے ایک سال بعد اینگلو پرشین تیل کمپنی میں برطانوی حکومت نے کافی حصے خرید لئے۔ پہلی سنساری جنگ کے بعد کمپنی اور ایرانی حکومت میں جھگڑے پیدا ہو گئے جو ۱۹۳۳ء کے ایک معاہدے کے ذریعے ختم ہوئے اور اس کے تحت ایرانی حکومت نے اپنے منافع کی مقدار کچھ بڑھوالی۔ اس کے بعد سے ایران کے تیل کی مقدار بھی بڑھتی رہی چنانچہ ۱۹۱۹ء میں کوئی ۵۸ لاکھ بیرل تیل نکلا تھا ۱۹۳۴ء میں یہ بڑھ کر ۵۸،۵۰۰۰۰ بیرل ہو گیا۔ دوسری سنساری جنگ جب شروع ہوئی ہے اس سال کے تیل کی مقدار ۷۸،۲۰۰۰۰ بیرل تھی۔ ۱۹۵۰ء میں اس میں اور اضافہ ہوا اور اس سال ۲۴۲،۴۵۰۰۰ بیرل تیل نکالا گیا اس سال پوری دنیا میں جتنا تیل نکلا تھا یہ اس کا ۱/۱۵ حصہ تھا۔ ۱۹۱۲ء میں آبادان کے جزیرے پر تیل صاف کرنے کے کارخانے قائم کئے جانے لگے تاکہ یہاں سے صاف کیا ہوا تیل ہندوستان اور دور مشرق بھیجا جا سکے۔ ۱۹۵۰ء میں آبادان دنیا کا سب سے بڑا تیل صاف کرنے کا مرکز بن گیا۔ یہاں کے کارخانے چار سو ایکڑ پر پھیلے ہوئے ہیں اور ہر سال دو ارب بیرل تیل صاف کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کمپنی کے اپنے جہاز بھی تھے جو یہاں سے ساری دنیا کو تیل پہنچاتے تھے۔ دوسری سنساری جنگ کی ابتدا کے وقت کمپنی کے پاس ۹۳ جہاز تھے اور ۱۹۵۱ء میں کمپنی کا ارادہ تھا کہ اس تعداد کو بڑھا کر دو سو کر دیا جائے۔

ایران کے حصے میں کافی تیل آیا ہے۔ اس کے پاس کوئی ۱۳ ارب

بیرل اچھے قسم کا تیل ہے جس کو آبادان میں صاف کرکے بڑی اچھی قیمت پر بیچا جاسکتا ہے۔ دسمبر ۱۹۵۰ء میں عرب امریکی تیل کمپنی (جس کو عام طور پر 'آرام کو' کہا جاتا ہے) نے سعودی عرب کے بادشاہ سے یہ معاہدہ کیا کہ ان کے ملک میں جتنا بھی تیل یہ کمپنی نکالے گی اس کا آدھا منافع خود لے گی اور آدھا بادشاہ کو دے گی۔ اس معاہدے کو دیکھ کر ایرانی حکومت کو بھی خیال ہوا کہ ملک کے لئے اور زیادہ معاوضے کا مطالبہ کرنا چاہئے لیکن کمپنی نے اس کو منظور نہیں کیا۔ ادھر ملک میں بھی یہ خیال بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا کہ یہ باہر کی کمپنیاں ملک کو لوٹ رہی ہیں اور ملک کی دولت سے باہر والے مزے اڑا رہے ہیں اس لئے ۱۵ مارچ ۱۹۵۱ء کو ایران کی مجلس نے ایک آواز ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ تیل کی صنعت کو قومی ملکیت بنا دینا چاہیئے۔ اینگلو ایرانین کمپنی کے تو ہوش اڑ گئے۔ اس نے اس کی پوری کوشش کی کہ ڈاکٹر مصدق اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ برطانوی حکومت کے بھی اس کمپنی میں بہت سے حصے تھے اس لئے اس کو بھی اس مسئلے سے گہری دلچسپی تھی۔ اس نے ایرانی حکومت سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو اس نے ایران سے اپنے تعلقات توڑ لئے اور یہ اعلان کیا کہ اگر کوئی جہاز ایرانی تیل کو کسی ملک میں لے جائے گا تو اس کو سمندر میں ہی ضبط کر لیا جائے گا ایران کے تیل کے چشموں سے تیل نکالنے کا کام بڑی حد تک بند ہو گیا اور اسی طرح تقریباً ۔۔۔۔ ، بیرل تیل جو ہر روز ایران سے نکلتا تھا دنیا کو ملنا بند ہو گیا اور واقعی یہ تمام ملکوں کے لئے ایک اہم مسئلہ بن جاتا اور انگلستان کو گھٹنے ٹیک دینے پڑتے اگر اس کا اور امریکہ کا بیچ مشرق کے دوسرے ملکوں کے تیل پر قبضہ نہ ہوتا چنانچہ ایرانی تیل کی کمی کو کویت' سعودی عرب اور عراق کے تیل کی مقدار کو بڑھا کر پورا کیا گیا۔ ڈاکٹر مصدق کا ایک زمانہ تک عوام نے ساتھ دیا لیکن جب کسی معاہدہ کی امید باقی نہ رہی اور ادھر تیل کے بہت سے چشموں کے سوکھ جانے کی وجہ سے ملک کی کروڑوں روپے کی آمدنی بند ہو گئی تو تیل کا تو میانہ خود ایران کے لئے ایک مصیبت بن گیا ڈاکٹر مصدق کو گرفتار کر لیا گیا اور کرنل زاہدی ملک کے وزیر اعظم مقرر کئے گئے نئی حکومت نے کئی مہینوں کی لگاتار کوششوں کے بعد پھر سے ایک بین قومی کمپنی سے معاہدہ کیا۔ اس نے تیل نکالنے کا کام شروع کر دیا ہے اس طرح تین سال کے بعد ایرانی تیل سے ایران اور باہر والے پھر فائدہ اٹھانے لگے ہیں۔

عراق میں تیل نکالنے کی کوشش اسی زمانہ سے شروع ہو گئی تھی جب یہ ترکوں کی عثمانی سلطنت کا ایک حصہ تھا چنانچہ ۱۹۰۴ء میں عثمانی حکومت نے جرمنوں کو اس کی جانچ پڑتال کرنے کا اجازت نامہ دیا لیکن یہ لوگ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں ایک ترک پٹرول کمپنی قائم ہوئی جس میں زیادہ برطانوی اور جرمن سرمایہ تھا۔ پہلی سنساری جنگ کے بعد عراق کا علاقہ ترکوں سے چھن گیا اور اس پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ ترک پٹرولیم کمپنی میں جرمنوں کی جگہ فرانسیسیوں اور بعد میں چل کر امریکیوں کو شریک کر لیا گیا اور اس کا نام ۱۹۲۹ء میں عراق پٹرولیم کمپنی رکھا گیا۔

عراق میں کئی مقاموں پر تیل نکالا جاتا ہے جن میں کرکوک' این الزبیح' حادثہ' خانقین اور زبیر اہمیت رکھتے ہیں۔ کرکوک' این الزبیح' حادثہ اور خانقین کا تیل شام کی بندرگاہ بنیاس کو ۳۰ انچ قطر والی پائپ لائنوں اور لبنان کی بندرگاہ ٹریپولی کو ۱۶ انچ قطر والی پائپ لائن سے بھیجا جاتا ہے۔ زبیر (جو بصرہ کے قریب ہے) کا تیل بصرہ کی بندرگاہ سے خلیج فارس کے راستے باہر جاتا ہے عراق کے تیل کی صنعت کافی بڑے پیمانے پر کام کر رہی ہے اور اس پر اب تک ایک ارب پچاس کروڑ روپے کے قریب سرمایہ لگایا گیا ہے۔ ایران کا تیل بند ہو جانے کی وجہ سے یہاں کی کمپنیوں نے زیادہ تیل نکالنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء میں یہاں سے ۴ کروڑ ۱۱ لاکھ بیرل تیل نکالا گیا اور پچھلے دو سالوں میں تو اس کی مقدار اور بڑھ گئی۔ جتنا منافع ہوتا ہے پٹرولیم کمپنی اور عراقی حکومت اس میں سے آدھا آدھا بانٹ لیتی ہیں لیکن جیسا کہ اکثر عراقیوں کا خیال ہے کہ معلوم نہیں ہم کو آدھا منافع ملتا بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ حساب کتاب تو سب کمپنی کے پاس رہتا ہے جس کا پتہ دوسروں کو نہیں چلتا۔ عراقی حکومت نے بغداد کے قریب ایک بہت بڑا تیل صاف کرنے کا کارخانہ قائم کرنے کا تصفیہ کیا ہے جس پر تقریباً دس کروڑ روپیہ خرچ ہوگا اور یہ کارخانہ ہر سال دس لاکھ ٹن تیل صاف کرسکے گا جو عراق کی تمام ضرورتوں کے لئے کافی ہے۔ عراق کے تیل سے حکومت کو جو منافع ہوتا ہے اس کی مقدار ہر سال بڑھتی جاتی ہے چنانچہ فلسطین کی جنگ سے پہلے اس کو ہر سال تقریباً ۴½ کروڑ روپے ملتے تھے اور ۱۹۵۴ء میں اس کو اندازاً ۷۰ کروڑ روپے ملے۔ عراق کی حکومت نے یہ عقلمندی کا کام کیا ہے

کو تیل سے ملنے والا سارا روپیہ وہ خرچ نہیں کر دیتی کیونکہ ظاہر ہے تیل کی آمدنی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے چنانچہ حکومت اس روپے کا صرف ۳۰ فی صد ہر سال ملک کے بجٹ کو دیتی ہے اور باقی ۷۰ فی صد ایسی ترقی کی اسکیموں پر خرچ کرتی ہے جن سے ملک کی زراعت اور صنعت پھل پھول سکے اور جو مستقل آمدنی کا ذریعہ بن سکیں۔

بحرین کے جزیرے جو عرب کے جزیرہ نما سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر خلیج فارس میں واقع ہیں تیل کا تیسرا مخزن ہیں۔ اگرچہ ان جزیروں کے قریب کے سمندر سے موتی بھی نکالے جاتے ہیں لیکن ان کی اتنی قیمت اور اہمیت نہیں ہے جتنی کہ یہاں کے سیال سونے کی۔ یہاں کا ایک عرب حاکم ہے لیکن ۱۸۶۱ء سے انگریزوں کا اس پر اثر ہے۔ ادھر ایران بھی ان جزیروں کی حاکمیت کا دعویدار ہے اور اس کا کہنا ہے کہ یہ جزیرے ایران کا ہی ایک حصہ ہیں جو اسے واپس مل جانے چاہئیں۔ بحرین میں تیل کا پتہ چلانے کی اجازت سب سے پہلے ۱۹۲۵ء میں کچھ انگریزوں نے حاصل کی اس کے بعد ایک بحرین تیل کمپنی قائم کی گئی لیکن اب اس میں زیادہ تر امریکی سرمایہ لگا ہوا ہے۔ بحرین میں سب سے پہلے جون ۱۹۳۲ء میں تیل دریافت ہوا۔ اس دریافت کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ اس کے بعد کمپنیوں کو معلوم ہوا کہ خلیج فارس کے قریب اور دوسرے مقاموں پر بھی تیل کثیر مقدار میں موجود ہے چنانچہ اس کے بعد ہی سعودی عرب اور کویت سے تیل نکالنے کی کوششیں شروع ہوئیں جو بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔ بحرین میں تیل صاف کرنے کا بھی کارخانہ قائم کیا گیا ہے جہاں بحرین سے نکلا ہوا تمام تیل صاف کیا جاتا ہے۔

۱۹۳۳ء میں کیلی فورنیا کی اسٹینڈرڈ تیل کمپنی نے شاہ ابن سعود سے ان کے ملک میں تیل کا پتہ چلانے کی اجازت حاصل کی اور اس طرح کمپنی کو ۴۱۰۰۰۰ مربع میل کے علاقے پر تیل نکالنے کی اجازت مل گئی۔ اس کے بعد اس کام میں ٹیکساس کمپنی بھی شریک ہوگئی اور ۱۹۴۴ء میں اس کا نام عرب امریکی تیل کمپنی (آرام کو) پڑا۔ سعودی عرب میں تیل نکالنے کی کوششیں شروع میں بالکل بیکار ثابت ہوئیں لیکن کمپنی والے اس کام میں برابر ڈٹے رہے اور انھوں نے ۱۹۳۶ء میں سب سے پہلا کنواں دریافت کر لیا۔ اس کے بعد اور زیادہ چھان بین کی گئی اور پتہ چلا کہ سعودی عرب کا مشرقی علاقہ تیل سے لبالب بھرا ہوا ہے چنانچہ ۱۹۵۳ء میں سعودی عرب نے ۳۰ کروڑ ۸۰ لاکھ بیرل سے زیادہ تیل پیدا کیا۔ تیل کے نکلنے سے پہلے سعودی عرب کی سالانہ آمدنی صرف ۷۰ لاکھ روپے تھی اور اس میں سے بھی زیادہ تر روپیہ حاجیوں سے ٹیکس کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا اب شاہ سعود کو تیل سے ایک سال میں ۸۴ کروڑ روپیہ ملتا ہے۔

لیکن قدرت نے چھپّر پھاڑ کر جس ملک کو دولت دی ہے وہ کویت ہے جس کا رقبہ صرف ۱۹۵۰ مربع میل اور آبادی صرف دو لاکھ پانچ ہزار ہے جس پر ایک عرب شیخ کی حکومت ہے۔ تیل نکالنے کی اجازت شیخ نے سب سے پہلے ایک انگریز کمپنی کو دی لیکن بعد میں ایک امریکی کمپنی بھی اس میں شریک ہوگئی اور دسمبر ۱۹۳۴ء میں کویت تیل کمپنی قائم کی گئی جس میں انگریزوں اور امریکیوں کے آدھے آدھے حصے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں شیخ کویت کو تیل سے تقریباً ۴ کروڑ روپے منافع ملا۔ ۱۹۵۲ء میں ۷۰ کروڑ روپے اور ۱۹۵۳ء میں یہ بڑھ کر ۸۰ کروڑ روپے ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ جس جگہ گھاس بھی نہ اگتی ہو اور جہاں کے لوگ انتہائی پست حالت میں اپنی زندگی گزار رہے ہوں وہاں اتنی دولت آجائے تو اس کا صرف کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے چنانچہ شیخ صاحب پریشان ہیں کہ اس دولت کو کہاں خرچ کریں۔ پھر ان کو یہ بھی خیال ہے کہ یہ دولت ہمیشہ ملنے والی نہیں ہے اس لئے کسی ایسے کام میں اس کو لگایا جائے کہ جب تیل کی آمدنی بند ہو جائے تب بھی وہ اور ان کی رعایا عیش و عشرت سے زندگی گزار سکے۔ اس روپے سے کویت کے رہنے والوں کی ترقی کی اسکیمیں بنائی گئی ہیں اور مدرسے، دوا خانے اور مکانات بن رہے ہیں۔ بہرحال تمام روپیہ شیخ اور ان کے خاندان پر خرچ نہیں ہو رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اگر آنکھ بند کر کے اور دل کھول کر بھی خرچ کرنا چاہیں تب بھی بے حد دولت ان کے پاس بچ رہتی ہے۔

ان ملکوں کے علاوہ بیچ مشرق کے بعض اور ملکوں سے بھی تیل نکالا جاتا ہے یعنی قطار، مصر اور ترکی۔ مصر سے ۱۹۵۳ء میں ۱۶۶۰۰۰۰ بیرل تیل نکالا گیا جو اس کی تیل کی ضرورتوں سے کچھ ہی کم تھا۔ ترکی میں تو اس کی پیداوار بہت کم ہے چنانچہ ۱۹۵۳ء میں یہاں سے کل ۱۴۸۰۰۰ بیرل تیل نکل سکا۔ اسی لئے ترکی کی حکومت نے تیل کی صنعت کو جو پہلے

قومی ملکیت تھی اب پھر سے خانگی ملکیت میں دے دیا ہے تاکہ باہر کی کمپنیاں اور زیادہ تیل کی چھان بین کر سکیں۔ اسرائیل میں تیل نکالنے کی بہت زیادہ کوششیں کی جا رہی ہیں لیکن ابھی تک کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ حیفہ میں تیل صاف کرنے کا بہت بڑا کارخانہ ہے جس میں فلسطین کی تقسیم سے پہلے عراق کا تیل صاف ہوا کرتا تھا لیکن اسرائیل بننے کے بعد سے عراق نے یہاں تیل بھیجنا بند کر دیا ہے مجبوراً ان کو وینزویلا سے تیل منگا کر اس کو صاف کرنا پڑتا ہے۔

نیچے کے جدول سے پتہ چلتا ہے کہ بیچ مشرق اور دنیا کے دوسرے خطوں سے ہر سال کتنا تیل نکالا جاتا ہے۔ اگرچہ اس وقت ممالک متحدہ امریکہ ہی سب سے زیادہ تیل نکالتا ہے لیکن جلد ہی جب اس کا تیل ختم ہو جائے گا تو اس کو بیچ مشرق پر تکیہ کرنا ہوگا

(تیل کی مقدار بیرلوں میں ہے)

	۱۹۵۳ء	۱۹۵۲ء
شمالی امریکہ		
ممالک متحدہ امریکہ	۲۶۰۱۹۰۰۰۰۰	۲۵۱۳۴۰۰۰۰۰
کنیڈا	۸۲۰۰۰۰۰۰	۶۲۳۰۰۰۰۰
میکسیکو	۷۳۱۰۰۰۰۰	۷۸۴۰۰۰۰۰
جملہ	۲۷۵۷۰۰۰۰۰۰	۲۶۵۴۱۰۰۰۰۰
جنوبی امریکہ		
وینزویلا	۶۴۴۳۰۰۰۰۰	۶۶۲۱۰۰۰۰۰
کولمبیا	۴۰۳۰۰۰۰۰	۳۹۵۰۰۰۰۰
ارجنٹینا	۲۷۹۰۰۰۰۰	۲۴۸۰۰۰۰۰
ٹرینیڈاڈ	۲۲۶۰۰۰۰۰	۲۱۵۰۰۰۰۰
دوسرے ملک	۲۳۰۰۰۰۰۰	۲۲۸۰۰۰۰۰
جملہ	۷۶۰۷۰۰۰۰۰	۷۷۰۷۰۰۰۰۰

	۱۹۵۳ء	۱۹۵۲ء
یورپ		
آسٹریا	۲۱۹۰۰۰۰۰	۲۱۱۰۰۰۰۰
مغربی جرمنی	۱۵۶۰۰۰۰۰	۱۲۵۰۰۰۰۰
نیدرلینڈ	۵۷۰۰۰۰۰	۵۰۰۰۰۰۰
دوسرے ملک	۵۲۰۰۰۰۰	۴۷۰۰۰۰۰
جملہ	۴۷۶۰۰۰۰۰	۴۳۳۰۰۰۰۰
بیچ مشرق		
کویت	۳۱۴۶۰۰۰۰۰	۲۷۳۴۰۰۰۰۰
سعودی عرب	۳۰۸۳۰۰۰۰۰	۳۰۱۹۰۰۰۰۰
عراق	۲۱۰۲۰۰۰۰۰	۱۴۱۱۰۰۰۰۰
قطار	۳۱۱۰۰۰۰۰	۲۵۳۰۰۰۰۰
مصر	۱۶۶۰۰۰۰۰	۱۴۵۰۰۰۰۰
بحرین	۱۱۰۰۰۰۰۰	۱۱۰۰۰۰۰۰
ایران	۹۹۰۰۰۰۰	۷۸۰۰۰۰۰
دوسرے ملک	۱۵۰۰۰۰۰	۱۲۰۰۰۰۰
جملہ	۹۰۳۲۰۰۰۰۰	۷۷۸۲۰۰۰۰۰
ایشیا		
انڈونیشیا	۷۵۰۰۰۰۰۰	۶۲۴۰۰۰۰۰
برٹش بورنیو	۳۶۸۰۰۰۰۰	۳۸۳۰۰۰۰۰
دوسرے ملک	۱۱۰۰۰۰۰۰	۹۸۰۰۰۰۰
جملہ	۱۲۳۰۰۰۰۰۰	۱۱۰۷۰۰۰۰۰
سوویٹ یونین اور مشرقی یورپ	۴۲۹۹۰۰۰۰۰	۳۸۲۵۰۰۰۰۰
کل میزان	۵۰۲۰۸۰۰۰۰۰	۴۷۳۹۵۰۰۰۰۰

ماہ اگست ۱۹۵۵ء کا شمارہ "کشمیر نمبر" ہوگا

اس خاص نمبر کی قیمت صرف ۸۔ آنے ہوگی

شعر و سخن

غزل — ارشد کاکوی

یہ نگاہِ دہر یعنی یہ حسرتِ زندگی — جس نے بھی ٹھکرا دیا اس کو یہاں کی ٹھوکری
دل رہے ہیں دونوں قصاً درہم و برہم ہو گئے — اور کس لیے کہ کہتے ہیں قیامت کی گھڑی
آج میں نے اس کو اپنے شعر پڑھتے سن لیا — ایک دیرینہ تمنا آج پوری ہو گئی
ہم نے یہ دیکھا کہ جتنا نیک سمجھتے گئے — زندگی کی راہ اتنی پُر خطر ہوتی گئی

مجھ کو مت چھیڑو تم ارشد جاؤ اپنی راہ لو
اس گھڑی ایک ایک نفس گویا غزل ہے میری

غزل — عقیل عرشی

کیوں غمِ دل سے ہوں مجبور تمہیں کیا معلوم — کیا محبت کا ہے دستور تمہیں کیا معلوم
زندگی کوئی بسر کرتا ہے گمنامی کی! — تم جہاں میں رہو مشہور، تمہیں کیا معلوم
ایک میں ہی نہیں آفاتِ جہاں کا شاکی — سیکڑوں مجھ سے ہیں مجبور تمہیں کیا معلوم
نالہ ہائے دلِ پُر غم کی صدا رہتی ہے! — شورِ عالم سے بہت دور تمہیں کیا معلوم
کاوشِ دردِ محبت سے لہو روتے ہیں! — زخم ہائے دلِ رنجور، تمہیں کیا معلوم

باوجودِ غمِ دنیا وہ، تمھارا عرشی!
کیوں رہا کرتا ہے مسرور تمہیں کیا معلوم

غزل — جی، ایل، ادیب

ایک افسانہ زندگانی ہے — کچھ حقیقت ہے کچھ کہانی ہے
درد اور وہ بھی دو دلوں کا — یہی معیارِ زندگانی ہے
عہدِ پیری سے کیوں ہوں برگشتہ — بھیس بدلے ہوئے جوانی ہے
خونِ دل بھی اگر نہیں شامل — آنسو آنسو نہیں ہے پانی ہے
شاید ان کا پیام آئے گا — آج کی صبح کیا سہانی ہے
زندگی کا اگر سلیقہ ہو — ہر نفس عمرِ جاودانی ہے

نہیں لفظوں کا ہیر پھیر ادیب
شاعری دل کی ترجمانی ہے

غزل — مبین شارق

تم سمجھ سکتے ہو میرے دیدۂ پُرنم کی بات — راز ہے کلیوں کے سینے میں لبِ شبنم کی بات
گل نے خود آنکھوں سے دیکھا صبح کا انجام کار — وقت سے پہلے سمجھ میں آ گئی شبنم کی بات
کتنا رستہ اور باقی رہ گیا ہے راہبر — ہر نئی منزل پہ کیوں کرتا ہے پیچ و خم کی بات
رفتہ رفتہ اٹھ رہی ہے دل کی جانب چشمِ شوق — شاید اب بننے ہی والی ہے غمِ پیہم کی بات
ہجر کی بے کیف راتوں کا نظارہ الحذر — جیسے اک مدت سے کوئی کہہ رہا ہو غم کی بات

آنکھوں میں آنسو لیے بیٹھے ہیں شارق روبرو
وہ زبانِ حال سے فرما رہے ہیں غم کی بات

غزل — دیپک قمر وزیرپوری

عالمِ سوز و ساز ہے ایک جہانِ مدہوشی — لذتِ درد کے نشہ رہ رہ کے ہے میری زندگی
آہ! یہ دل کو کیا ہوا، ہائے یہ جان پہ کیا بنی — فکرِ نشاطِ روح کو اور اداس کر گئی
کیا ہو مآلِ عشق اب دیکھیے جی پہ کیا بنے — دیکھی ہے آج پہلی بار حُسن کی آنکھوں میں نمی
مژدۂ جاں فزا نہیں مجھ کو تبسمِ بہار — میں نے تمام عمر ہی روتے ہوئے گزار دی
اے غمِ دہر رحم کر آج تو مجھ کو بھول جا — میرے تصورات میں محوِ خرام ہے کوئی

دیدہ و دل کو کیا ہوا تجھ سے بچھڑ کے یہ نہ پوچھ
ایک جھڑی سی لگ گئی ایک چتا سی جل اٹھی

ماحول — اشرف قادری

اہلِ دل جراتِ اظہار تک آ پہنچے ہیں — بے گناہ وہ درِ آزار تک آ پہنچے ہیں
لطفِ آزارِ ستم کا یہ زمانہ نہ رہا — مسئلے گل کے بھی اب خار تک آ پہنچے ہیں
ایسی مجبوریِ ماحول الٰہی توبہ — شیخ جو دہر میں پیکار تک آ پہنچے ہیں
جانتا ہوں غمِ فردا نہ ستائے گا مجھے — آج ہی جب کہ وہ انکار تک آ پہنچے ہیں

دیکھیے جوشِ جنوں میں مرا اندازِ سخن:
دل کے نالے مرے اشعار تک آ پہنچے ہیں:

گُل کدہ

کشمیری غزل

غلام نبی خیال

اصل

۱ ۔ حُسن وَگوٗ ہیوت پرزہ ناوُن گاشداری ساقیا
جاٗدوِ ین وُیٗن آسٕے ژھٔن ژھٔن باز گارن ساقیا

۲ ۔ شوقہ والیٗن عاشقن کُنہ جایہ چھا آمُت قرار؟
یارہ تَسنٛز تیٖز ژَھلِٕے ڈیشتھ تُرٕ لارن ساقیا

۳ ۔ شوی چھو وادن زین کرٕکرٕ وُزملن منز تھک دِوان
زندگی یَس ہاوٕ اندرِم نولہ نارن ساقیا

۴ ۔ سادہ پاٹھیٗن ہوش رٔچھ رٔچھ کیت کٔمے ۂرد ہیوٗکٕ پکان
واۓ کیٗتیاہ مار تہلکھٕ کاڈ جارن ساقیا

۵ ۔ شورہ پتھرٕین سینہ پرا ژُھتہ باغ یِم سگو تھۍ تھوٗن
شوٗپہ ناش باش تِھنٛیٖ کامگارن ساقیا

۶ ۔ تَس تُگیا رٔچھ رٔچھ تھوٗن معصوم دِلَن ہنز نازکی
گِندنہ بایتھ چھٕو یِم کور محنتہ ہارن ساقیا

۷ ۔ وَنن خیالس کینٛہو دیوانہ کورزِ سمارنی
کُس چھو معلوم حُسن نِیو مت چھُس بالہ یارن ساقیا

ترجمہ

۱ ۔ اے ساقی! اب تو ہر اہلِ نظر نے زمانے کے سپید و سیاہ کو پرکھنا شروع کیا ہے۔ اور اسی لئے شعبدہ بازوں کے طلسمی دھاگے ٹوٹ ٹوٹ کر آ رہے ہیں۔

۲ ۔ اے ساقی! حقیقی عاشقوں کو سکون و آرام سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اُن کا معشوق جہاں بھی ہو برق رفتاری سے وہیں دوڑتے ہیں

۳ ۔ اے ساقی! وہی انسان آندھیوں کے دوش پر سوار ہو کر بجلیوں کو اپنا تابع بناتا ہے جس نے اپنے سوزِ عشق سے زندگی کو منوّر کر دیا ہو

۴ ۔ کتنے ہی ایسے ہیں جو ہوش و حواس قائم رکھ کر چُپ چاپ اپنی منزل کی جانب گامزن ہیں۔ لیکن اے ساقی! افسوس کہ بہتوں کو خود ان کی اپنی ہی زیرکی اور خواہ مخواہ کے انتظار نے مارا۔

۵ ۔ جو محنت کش، بنجر زمینوں کے پتھریلے سینوں کو چیر کر پانی حاصل کر کے اپنے باغوں کی سینچائی کریں۔ اے ساقی! ایسے محنت کشوں کو شاعر خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔

۶ ۔ اے ساقی! اُس شخص کو معصوم دلوں کے نازک ہونے کا کیا احساس ہے جس نے محض اپنی دل بہلائی کی خاطر موتی کی لڑیوں کو چکنا چُور کر دیا۔

۷ ۔ بہتوں نے خیال کے بارے میں کہا کہ زمانے نے اسے دیوانہ کر دیا مگر اے ساقی! کسے معلوم ہے کہ اس کے ہوش و حواس اس کے محبوب نے چھین لئے ہیں۔

بنگالی —— ایشور —— نذرالاسلام

بھائی تم کون ہو — ؟
جو پروردگار کی تلاش میں زمین اور آسمان کی خاک چھانتے پھر رہے ہو۔
تم کون ہو بھائی — ؟
جو جنگل جنگل پہاڑ پہاڑ بھٹکتے پھر رہے ہو
ہائے رشی، درویش !

دل کے ہیرے کو دل میں چھپا کر
تم دیس دیس اس کی تلاش کر رہے ہو
دنیا کی نظریں تم پر لگی ہوئی ہیں
— اور تم اپنی آنکھیں بند کئے بیٹھے ہو
اے عقل کے اندھے
آنکھیں کھولو — آئینے میں اپنی تصویر دیکھو
تم دیکھو گے کہ تمھاری ہر ادا میں اُس کا سایہ ہے

اے بہادر، مت گھبرا
پنڈتوں سے، مذہب کے ٹھیکے داروں سے
یہ لوگ خدا کے پرائیویٹ سیکرٹری تو نہیں ہیں۔

اس کا نور تو سب میں پوشیدہ ہے
وہ سب کے درمیان موجود ہے
میں پروردگار کو پہچانتا ہوں
جو مجھ سے چھپ کر مجھے دیکھا کرتا ہے

اگرچہ تاجر
سمندر کے کنارے ہیروں کا بیوپار کرتے ہیں
لیکن تم —
کبھی بھولے سے بھی
ہیرے نکالنے والوں کی بات ان سے نہ پوچھو

آج کل دہلی

— وہ تو صرف تاجر ہیں
ہیرے کو پہچان کر وہ خیال کرتے ہیں کہ
وہ ہیرے لانے والے کو بھی پہچانتے ہیں
— نہیں — !
اُنھوں نے کبھی غوطہ نہیں لگایا
وسیع گہرے سمندر میں —

ساتھی — !
تمام شاستروں کو گھول کر پی لینے کے عوض
تم حق کے اس گہرے سمندر میں غوطہ لگا دو

(مترجم) شانتی رنجن بھٹاچارجی

پنجابی —— دھنی رام چاترک امرتسری —— سندر سنگھ بابر

پیدائش :- اکتوبر ۱۸۷۶ء
وفات :- دسمبر ۱۹۵۴ء

جس مرنے سے جگ ڈرے - میرے من آنند
مرنے ہی سے پائیے پورن پرمانند

دھنی رام چاترک کی موت اتنی پر شکوہ تھی - کہ اس پر ہزاروں زندگیاں نچھاور کی جا سکتی ہیں - دسمبر کا مہینہ کرسمس کے لحاظ سے بڑا مبارک مہینہ ہے - عیش و نشاط کی محفلیں انھی دنوں گرم ہوتی ہیں - لیکن پنجابی ادب کے لئے سنہ ۱۹۵۴ء کا دسمبر بڑا منحوس تھا - ایک ہی مہینے میں "استاد چاترک" اور "استاد ہمدم" کو واصل بحق کیا اس نامراد نے -

لالہ دھنی رام جی ایک غریب مونگیا ہندو گھرانے میں اکتوبر سنہ ۱۸۷۶ء میں بمقام پسیاں والا ضلع سیالکوٹ پیدا ہوئے - بچپن کے سنہرے دن آپ نے انتہائی افلاس میں کاٹے - آپ بہت پست قامت تھے - گو پست ہمتی کا طعنہ آپ نے بیسیوں نیم استادی شاعروں اور معاصرین کو دیا ہے

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

آپ کے والد پسیاں والا سے "تنور شکم" کو بھرنے کے لئے "توپو کے" ضلع امرتسر آ گئے - یہاں آپ کی سسرال تھی - چاترک نے ننھیال ہی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی - معمولی ساہوکارے کا دھندا - دوکانداری کے ساتھ یہاں

جولائی سنہ ۱۹۵۵ء

کرنا شروع کر دیا - چاترک کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں کہ اس نے گزشتہ نصف صدی کے باکمال شاہی ساہتکار بھائی صاحب ویر سنگھ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا -

پہلے تو "وزیر ہند پریس" میں کتابت اور خوش نویسی کی - پھر سنگ سازی اور اس کے بعد ۱۸۹۹ء سے اب تک برابر جاری رہنے والے ہفت روزہ گورمکھی اخبار "خالصہ سماچار" کی ادارت کا بار دھنی رام کے نحیف و ناتواں کندھوں پر آپڑا - ایک روایت کے مطابق (بقول پروفیسر برنام سنگھ شان ایم - اے) آپ نے ڈاکٹر ویر سنگھ کے بھائی سردار وزیر سنگھ کے چھاپے خانے وزیر ہند پریس میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک تاریک کوٹھڑی میں کیا - یہ ۱۸۹۳ء کی بات ہے -

عین عالم شباب میں "بھرتری ہری" اور "نل دمینتی" کے قصے پنجابی نظم میں آپ نے چند ماہ کی صبر آزما محنت کے بعد قلم بند کئے - ۱۹۰۲ء میں آپ کی شاعری کا پہلا دور شروع ہوا - ۱۹۰۲ء میں آپ نے پیسہ والا کے قصہ گویوں کی اعانت سے اپنے روپین قصے "نل دمینتی" اور "بھرتری ہری" آب و تاب سے شائع کر دلئے - آپ کی زبان با محاورہ اور ٹکسالی ہے - "چندن واڑی" آپ کی پہلی معیاری اور انعامی کتاب ہے -

دوسرے دور کی "کیسر کیاری" آپ کا جاذب نظر مجموعہ کلام ہے - "نواں جہان" آپ کی ترقی پسندانہ طبیعت کی غمازی کرتا ہے - اور آپ کی نظموں اور ذہنی کاوشوں کا آخری پڑاؤ "صوفی خانہ" ہے ؎

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلا ہے پانی کا

پانی کے بلبلے سے چاترک جی - نے اپنا تخلص پہلے "بردھی" تجویز کیا تھا - یوں گویا ہوتا ہے ؎

خواجہ خضر دے باغ دے کومل پھُلا   پھول پھل بہندیا پھنگیاں بھردیا اوئے
سرتے ٹوپ ست رنگیاں ہین کہے تے   پارے وانگ جھل مل جھل مل کردیا اوئے

شاعر کہتا ہے - پانیوں کے دیوتا خواجہ خضر! بلبلہ بھی تیری امّت سے ہے - مگر میں اس بلبلے سے سوال کرتا ہوں کہ خواجہ خضر کے باغیچے کے نازک پھول! تو غرور اور تکبر سے اتنا اِٹھلا کیوں رہا ہے؟ تو ہرن کے بچوں (ہرنوٹوں) کی طرح کلیلیں کیوں لگا رہا ہے - تو نے قوس و قزح کے سات حسین رنگوں کا ایک بڑا ہیٹ تو نے زیب سر کر رکھا ہے - میری آنکھوں کی مجال نہیں کہ وہ اچھی طرح تجھے دیکھ سکیں - تو پارے کی طرح بے مایہ ہے - تہی دست ہے - تہی دامن ہے - تو آخر اتراتا کس لئے ہے - انسان کی طرح تو تو آخر فانی ہے -

چاترک کی زندہ دلی اور لطیفہ گوئی تو بس انہیں کا حصہ تھی - یہاں تک کہ موت کو ہدفِ مذاق بنانے سے آپ نہیں چوکے -

جد حکم حضور دوں آوے گا   اسی خوشی خوشی ترجاواں گے
آونّدی واری تجھ روئے ساں   پر ہسدے ہسدے جاواں گے

پنجابی پھلواڑی کا پپیہا (چاترک) کہتا ہے - جب اللہ کا فرمان میری روح کو قبض کرنے کے بارے میں نازل ہوگا - تو میں ہرگز اپنی جبیں پر شکن نہیں لاؤں گا - بلکہ مسرت و انبساط کے ساتھ فرمانِ خداوندی بجا لاؤں گا مصرع ثانی میں ارشاد ہوتا ہے -

جب اس "مرت لوک" یا خاکی زمین پر انسان کا جامہ پہن کر ہم بھیجے گئے تھے - تو اس وقت منہ بسورا تھا - عہدِ طفلی اور پیدائش کے وقت عالم ارواح سے بچھڑتے وقت نالہ و شیون بھی کیا تھا - لیکن اب مرتے وقت کمال اطمینان اور خوشی سے جان دیں گے - کبیر تو نیکوکار ہونے کی تلقین کرتے ہوئے صرف اتنا کہہ گئے ہیں - ؏

کبیرا ایسی کرنی کر چلو - تم ہسو جگ روئے

چاترک کا اصلی رنگ تو دراصل بین میں ہی نکھرتا تھا - ڈاکٹر گوپال سنگھ دردی اُسے بہترین رومانٹک خیال اور گیت کار ہونے کی سند دیتا ہے - محبوبہ اپنے پریتم کے انتظار میں تارے گنتی ہے - اس برہن کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے جذبات کو کس پُرسوز ڈھنگ سے چاترک نے ڈھالا ہے -

نی! میں نیند نکھتی نوں کی آکھاں
جھڑی ڈیر پچھ ہتھ دھو کے
ساری رات اُڈیکیا ڈھولن
بوہے وچ کھلو کے
اوہ آونیا پر میں شرما گئی - اکھیاں ڈھو لئے بوہے
ہسدا ہسدا لنگھ گیا ماہی
پلکاں اوہلے ہو کے

آپ کتنی وجد آور بلکہ شباب آور زبان میں فرماتے ہیں۔ ذرا تیور دیکھئے

او بدنصیب نیند۔ میں دکھیاری تجھ نصیبوں جلی کو کیا کہوں۔ پھانسی کے تختے پر بھی نیند آجاتی ہے۔ تجھے چاہئے تھا اے انکھڑیو! پریتم کے انتظار میں ساری رات انتظار میں گزار دیتیں۔ یہ نگوڑی نیند ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی۔ میرا دلبر جانی آیا بھی ضرور۔ خشمگیں اور نیم وا آنکھوں سے اُسے میں نے دیکھا۔ اور پھر خطاکار آنکھیں مُوند لیں ہے۔ نہ جانے ندامت سے بہرحال آنکھوں کے دروازے کھٹ سے بند ہو گئے۔ آنکھوں کے اسی دروازے سے فوراً دل کے تخت پر "ماہی" براجمان ہو گیا۔ وہ آتے وقت مسکراہٹوں کی پنکھڑیاں بکھیرتا جاتا تھا میں حیران ہوں۔ کہ شاید میرا دلبر پلکوں کو چوبی دروازہ سمجھ کر وہیں سے کہیں غائب ہو گیا۔ پلکوں کی اوٹ میں وہ کیوں عنقا ہو گیا۔

شکوہ سنج ہیں تو آپ فرد ہیں۔ "کیسر کیاری" اور "چندن واڑی" کی بیشتر کویتائیں جو رومانس کا راگ سموئے ہوئے ہیں۔ پنجابی روپ میں جواب نہیں رکھتیں۔ "ہیر پنجابن" کے پیکر کو دیکھئے۔ اسی آئینہ خانہ میں گجرات کی سوہنی ملاحظہ فرمائیے۔ حسینۂ پنجاب کا فوٹو کتنا دل پذیر ہے ؎

جوبن وچ جھلک جلالی ہے　　نیناں وچ مٹک نرالی ہے
ہکاں وچ ہمت حالی ہے　　چہرے تے گھنڈ گھنڈ لالی ہے
کیا چوڑے بیڑے پھبدے نیں　　جوبن متیاں مٹیاراں دے
جد پاؤن مدھانی چاٹی وچ　　تد شور اُٹھن گھمکاراں دے

آپ نے فارسی اردو کے کئی الفاظ لامحالہ استعمال کئے ہیں۔ فرماتے ہیں حسینانِ پنجاب کا جوبن، ان کی منور پیشانیاں اور ان کے کیلئے نین غضب ڈھا رہے ہیں۔ یہ جوان ہمت ہیں۔ ان کے چہروں پر شرم و حیا اور خودداری کے خون کی رنگینی ہویدا ہے۔ انھوں نے سہاگ کی نشانی ہاتھی دانت کے لال اور سفید "چوڑے" "بازوبند" آرائشِ حسن کے لئے پہن رکھے ہیں غرورِ حسن سے یہ اس قدر سندر یا سرشار ہیں کہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتیں۔

"موسم بہار" کو تو آپ نے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ اُسے "بسنت کور" کا نام دے کر کمال کر دکھایا ہے۔

پنچھیاں نے گائیاں ہنڈول تے بسنت راگ
رُتاں پچھوں رب نے مراداں نے دکھالیاں

کیسری دوپٹے نوں بسنت کور پہن جدوں
ڈورے بھرے نیناں وچوں سٹیاں گلالیاں

طائرانِ خوش الحان نے "بسنت" کے موسم میں وقت کی راگنی بسنت کو الاپا ہے۔ کہیں پرندے ہنڈول راگ میں گنگنا رہے ہیں۔ سبز اور سنہری لباس پہن کر "بسنت کماری" یا "بسنت کور" اپنے جوبن کی اعلیٰ ترین نمائش کر رہی ہے۔

خزاں دیدہ برگ و بار رخصت ہوئے۔ ہر جگہ ہریاول ہے اور مدت مدید کے بعد ایشور نے یہ دن دکھائے ہیں۔ سُرخ و سبز شگوفے آبیاری کرنے سے اور بہاریہ گیت گانے سے چٹک گئے ہیں۔ ایک حسینہ کی طرح "بسنت کور" کی شرابی آنکھوں سے غزالی نگاہوں کی تشبیہیں غضب ڈھا رہی ہیں۔ چاترک کی بسنت کور بھی بہت طناز سے کم نہیں۔

شاعر اپنے دلِ بے قرار کو تھپک تھپک کر سُلاتا ہے۔

عاشقِ نامراد زبانِ حال سے کہہ رہا ہے ؎

"نامرادا ٹھہر جا! پٹ پٹ کے ہوئے حال وہ
اوہدوں نہیں سی ورجیا۔ آباز آ۔ آباز آ۔ رہیوں نہ لگا پھاسیاں نہ پا
پلا بچا۔ نیڑے نہ جا
داتاں نے ایہہ دکھیاریاں
منزلاں نے بڑیاں بھا دیاں

اے ناکام عاشق کے سوگوار دل! اب محوِ فغاں کیوں ہے؟ سینہ کوبی کیوں کرتا ہے۔ جب پہلی بار اس پتھر دل معشوق سے آنکھیں چار ہوئی تھیں تو تمھیں سو بار سمجھایا نہیں تھا۔ کہ "بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلّاد بھی"۔ تمھیں دل لگانے سے باز رکھنے کے لئے سو بار نصیحت کی تھی "عشق پیچاں"! محبت ایک حسین جال ہے۔ کسی کی عنبریں زلفوں میں اٹکا ہوا دل ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا رہتا ہے۔

عشق کی وادی بڑی سنگلاخ ہے۔ بڑی پُرخار منزل ہے۔ قدم قدم پر مصائب منہ کھولے ہوئے ہیں۔ ہر گام پر لڑکھڑانے کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ سچ ہے ؎

رانجھن رانجھن کردی نیں۔ میں آپے رانجھن ہوئی
سدو نیں مینوں سدّو رانجھا۔ مینوں ہیر نہ آکھو کوئی

"رادھا سندیش" میں کتنا حسین شکوہ ہے

" اودھو! کاہن دی گل سُنا سانوں

کاہنوں چنگ چُواتیاں لائیاں نے

ہیں کا بھاگھٹ کے بہ گئے سال   مُڑکے سُتتیاں کلا جگائیاں نے

ےگیاں دی پٹڑی نہیں کاٹ کرنی   اہناں پیڑاں دیاں ہور دوائیاں تے

رادھا کرشن کے پیغامبر کو خوب طعنے دیتی ہے ۔ چاترک کی طنز ری اپنا جواب نہیں رکھتی ۔ رادھا سندیسہ لانے والے سے پوچھتی ہے کنہیا کی بابت کچھ منہ سے تو بولو بھی ۔ بھاگوں جلی برہن کو کیوں جلاتے ہو! ت کے زخم ہائے جگر بڑی مشکل سے رو بہ صحت ہوئے تھے ۔ اب تونے کاہن کا یسہ لاکر میرے ہرے زخموں پر نمک پاشی کیوں کی ہے ۔ ہم تو فراق کرشن میں ہ کر مسوس کر رہ گئے تھے ۔ لیکن تم نے اس پر نشتر زنی کر دی ۔

برہا کی اگنی کو درشنوں کی شیتل بوند سے بجھانے کے لئے رادھا یوں کہتی ہے ۔ کتنی جاذبیت ہے ۔ کتنا سوز ہے ۔ اور زبان کتنی منجھی ہوئی ہے ۔

"کاہنوں گونگلواں توں مٹی جھاڑدا ایں ۔ جے کر آگ نوں نہیں بجھان جوگا"

"پاپا تیل کیوں سڑیاں نوں ساڑدا ایں —"

چاترک بزبان رادھا کہلواتا ہے ۔ اب کرشن جی! یونہی نمائشی پیار دکھاتے ہیں ۔ تصنع پسندی سے کام لے رہے ہیں ۔ بھلا لگاوٹ بناوٹ سے کیسے ظاہر ہو ۔ وہ تو غالباً یونہی طفل تسلیاں دینے کے لئے تجھے بھیج دیتے ہیں ۔ اسے کہنا اگر وہ آتش عشق کو وصل سے بجھا نہیں سکتا ۔ تو الٹا جلتی پر تیل تو نہ چھڑکے ۔

مدھیہ بھارت کا ایک لوک گیت

" ساون کا مہینہ آگیا ہے ۔ بھائی اُٹھو اور گھوڑوں کو تیار کرو ۔ کیونکہ راکھی کا دن آپہنچا ہے ۔ بھائی بہن کے پیغام کو سن کر مل پڑنے کو تیار ہے ۔ لیکن برسات میں دریائے شپرا کی طغیانی اس کے راستے میں حایل ہے، اور وہ اپنے آپ کو مجبور پاکر یہ کہتا ہے ۔

دریائے شپرا میں طغیانی آگئی ہے ۔ اس لئے میں کیسے آسکتا ہوں ،

بہن اس کے جواب میں فوراً یہ کہتی ہے ۔

میرے بھائی ۔ اپنے کپڑے دریائے شپرا کو بطور نذرانہ پیش کر دو ۔ میں چکری اور لٹو بھیج رہی ہوں ۔ تم کھیلتے ہوئے آجاؤ ۔

مالوبھومی گہن گمبھیر ۔ پگ پگ روٹی تگ تگ نیر یعنی مالوے کی سرزمین وسیع اور ہری بھری ہے اور وہاں ہر قدم پر اناج اور ہر موڑ پہ پانی ملتا ہے ۔

سعودی عرب کے وزیر اعظم کا پیغام

سعودی عرب کے ولی عہد اور وزیر اعظم ہز رائل ہائی نس امیر فیصل السعود نے کراچی سے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد کو درج ذیل تار ارسال کیا ہے ۔

"آپ کے عظیم اور مہمان نوازملک میں جس گرمجوشی اور برادرانہ جذبہ سے ہمارا خیر مقدم کیا گیا ، وہ میرے لئے بہت قدر و قیمت کا حامل ہے ، اور روانگی پر اس کے لئے میں آپ کا اور آپ کی معرفت بھارت سرکار اور بھارت کے عوام کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ میں بھارت کے دورے کی نہایت حسین یادیں اپنے ساتھ لئے واپس سعودی عرب جا رہا ہوں ، اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور میل جول کے روایاتی تعلقات کبھی بھی اتنے مضبوط نہیں تھے جتنے کہ آج ہیں ۔ میں آپ کو بہترین تعظیم اور ذاتی احترام کا یقین دلاتا ہوں !!

ڈال ڈال کے پات

یونانیوں کا مذاق

مرزا بشارت اللہ بیگ

یونانیوں سے کون واقف نہیں، اب تک اُن کے ڈنکے بج رہے ہیں۔ حکیم یونانی شفا خانوں میں بیٹھے ہوئے اُن کا کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ مدرسوں کے بچے اقلیدس کی کتابیں ہاتھوں میں لئے اب تک ان کے مقالوں اور نادر دوں کو رٹ رہے ہیں اور بڑے بڑے لکھے پڑھے منطقی اور فلسفی اب تک ان کی لکھی ہوئی فلسفے اور حکمت کی کتابوں کو جھینگر کی طرح چاٹنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

جس طرح یونانیوں نے دنیا کو حکمت اور فلسفے کی تعلیم دی اسی طرح ظرافت اور خوش مذاقی بھی سکھائی۔ بڑے بڑے ظریف اور بڑے بڑے پھکڑ بھی وہاں موجود تھے، جو ہر سال میلوں، ٹھیلوں اور پوجا پاٹھ کے موقعوں اور ظرافت اور خوش مذاقی کے دیوتاؤں کے آگے اپنی بانگی دکھاتے تھے۔ گھنٹوں ضلع جگت نہ کہا کرتے بلکہ اس سے بھی دو چار قدم آگے بڑھ کر پھکڑ بازی پر اتر آتے تھے۔

ضلع جگت کا نام سن کر جگت بازوں کے شاید کان کھڑے ہوں گے کہ یہ کیا۔ کہاں ضلع جگت اور کہاں یونان! بھلا یونان کو ضلع جگت سے کیا نسبت بات دراصل یہ ہے کہ بعض خوش مذاق لوگوں کا خیال ہے کہ جگت جسے شاعری میں صنعت ایہام کہتے ہیں اس کے موجد یونانی ہیں۔ ڈرامہ نویسی میں یونانیوں کو کمال حاصل تھا۔

یوں تو یونان میں بیسیوں ڈرامہ نویس تھے جو ڈرامہ لکھتے تھے مگر ان میں سوفوقلیس نامی سب سے مشہور تھا۔ کہتے ہیں یہ صنعت ایہام کا موجد تھا۔ اس نے سات ڈرامے لکھے جن میں سے ایک ڈرامہ اوڈی پس ٹرینس ارسطو کو بہت پسند تھا۔ اس میں اس نے ہر جملے میں یہ صنعت استعمال کی ہے یعنی اس کے کردار گفتگو میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ وہ خود اس کے معنی کچھ اور سمجھتے ہیں اور سننے والے کچھ اور۔

اس کے بیٹے نے شاید آخری زمانے میں اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا تھا جس میں اس پر یہ الزام لگایا کہ یہ آپے میں نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا اگر میں سوفوقلیس ہوں تو اپنے آپے میں ہوں اور اگر اپنے آپے میں نہیں ہوں تو سوفوقلیس نہیں ہوں۔

یونانیوں کے چھوٹے چھوٹے قصے، حاضر جوابیاں اور لطیفے تو واقعی بے نظیر آپ ہیں۔ ان میں اعلیٰ ظرافت کے ساتھ ساتھ ایک ادبی رنگ بھی موجود ہے۔ چھوٹے قصوں میں ایسوپ کے قصے بہت مشہور ہیں۔ یہ اس قدر دلچسپ اور نتیجہ خیز ہیں کہ یونان کا ہر شخص انہیں یاد رکھتا اور بحث کرتے وقت ان کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا تھا۔ جسے یہ قصے یاد ہوتے وہ عالم و فاضل خیال کیا جاتا تھا اور جسے یاد نہیں ہوتے تھے وہ بے وقوف اور جاہل خیال کیا جاتا تھا۔

دو ایک قصے آپ بھی سن لیجئے جس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ایسوپ کے قصوں میں وہ کیا صفت تھی جس کی وجہ سے لوگ ان کو یاد رکھنا ازحد ضروری سمجھتے تھے۔

ایک چور کسی گھر میں رات کے وقت چوری کرنے کے لئے گیا۔ کتا اسے دیکھ کر بھونکنے لگا۔ چور نے کتے کا منہ بند کرنے کے لئے اپنی تھیلی میں سے روٹی کا ایک ٹکڑا نکال کر ڈالنا چاہا۔ کتے نے یہ دیکھ کر کہا کہ چل یہاں سے نکل! پہلے تو مجھے تجھ پر صرف شک تھا، اب تیری ان باتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ تو بڑا بے ایمان اور پکا چور ہے۔

ایک کو ٹھری بیچنے والے کا بہت بڑا گھر تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست دھوبی سے کہا کہ تم میرے گھر میں آکر رہو۔ دھوبی نے کہا۔ شکریہ! آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ مجھے آپ کے ساتھ رہنے میں کوئی عذر نہیں۔ مگر ذرا اس بات کا

ہے کہ ادھر میں کپڑے دھو کر سفید کروں گا اور ادھر آپ کوئلوں سے پھر انھیں کالا کر دیں گے۔

اس قسم کے ہزاروں قصے ہیں جو ایسوپ کی کہانیوں اور حکایاتِ لقمان کے نام سے اردو میں چھپ چکے ہیں۔ اب ذرا ان کی ظرافت کی جانب آئیے۔

دیوجانس کلبی تیسری صدی قبل مسیح دینوپ میں پیدا ہوا۔ آخیر عمر میں حکیم انطس ٹینس کے فلسفے سے متاثر ہو کر ریاضت اور نفس کشی میں مشغول ہوا۔ رات کو عبادت گاہوں کے دالانوں یا سڑک کے کنارے سوتا تھا اور آخر میں ایک بڑے مٹکے میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ حکیم عام طور پر لوگوں کو امورِ دنیا سے حقارت کی تعلیم دیا کرتا تھا۔

دیوجانس کلبی کی سکندر اعظم سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تو وہ اس کی تعظیم کے لئے نہیں اُٹھا۔ سکندر نے اس گستاخی کا سبب دریافت کیا۔ دیوجانس نے کہا کہ تو میرے غلام کا غلام ہے اور پھر مجھ سے تعظیم کی توقع رکھتا ہے۔ سکندر نے پوچھا۔ یہ کس طرح۔ جواب دیا کہ میں نے حرص کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ اس لئے وہ میری غلام ہے اور اسی حرص نے تجھ کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔

ایک مصوّر نے مصوّری کا پیشہ چھوڑ کر طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ دیوجانس نے سُنا تو کہا کہ تم نے بہت اچھا کیا۔ اس وجہ سے کہ اگر مصوّر کوئی خطا کرتا ہے تو وہ فوراً ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور اگر طبیب خطا کرتا ہے تو اس کو خاک چھپا لیتی ہے۔

ایک مرتبہ ایک نو آموز تیر انداز لوگوں کو تیر اندازی کے کمالات بتا رہا تھا۔ دیوجانس اُٹھ کر اس ہدف کے پاس جا بیٹھا جس پر تیر سر کئے جا رہے تھے۔ کسی نے دیوجانس سے اس خطرناک جگہ پر بیٹھنے کی وجہ دریافت کی تو جواب دیا۔ ایسے نازک موقع پر میرے لئے سب سے محفوظ جگہ یہی ہے۔

جب دیوجانس بیمار تھا تو لوگ اس کی عیادت کو آئے اور تسلّی کے طور پر کہنے لگے کہ گھبراؤ نہیں یہ مصیبت خدا کی طرف سے ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اگر واقعی یہ خدا کی طرف سے ہے تو مجھے اور بھی گھبرانا چاہیئے۔

افلاطون تیسری صدی قبل ایتھنز میں پیدا ہوا تھا۔ فن کشتی، شاعری اور علم موسیقی میں کامل تھا۔ افلاطون کو علم ہندسہ کا اس قدر شوق تھا کہ اس نے اپنے دروازے پر لکھ کر لگا دیا تھا کہ جو علم ہندسہ نہ جانتا ہو وہ اندر نہ آئے۔

ایک روز افلاطون نے چند معزز لوگوں کی دعوت کی۔ دیوجانس کو بھی بلایا۔ دیوجانس نے وہاں پہنچ کر اپنے ننگے پاؤں افلاطون کے بیش بہا قالینوں پر رگڑنے شروع کر دئے۔ افلاطون نے پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہو۔ جواب دیا کہ افلاطون کے غرور کو کچل رہا ہوں۔ افلاطون نے کہا مگر بڑے غرور کے ساتھ

ایک شخص نے اپنی کل اراضی جو ورثے میں پائی تھی عیاشی میں اڑا دی۔ افلاطون نے اس کا حال سُن کر کہا کہ زمین لوگوں کو کھا جاتی ہے مگر یہ شخص زمین کو بھی کھا گیا۔

ارسطو سے کسی نے پوچھا کہ عالم اور جاہل میں کیا فرق ہے۔ جواب دیا کہ جاہل عالم کو نہیں جانتا کیوں کہ وہ کبھی عالم نہیں رہا لیکن عالم جاہل کو جانتا ہے کیونکہ وہ جاہل رہ چکا ہے۔

افلاطون نے ارسطو سے شکایت کی کہ میں نے تمھاری بُرائی ایک معتبر شخص سے سُنی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ جو شخص غیبت کرتا ہے وہ معتبر نہیں ہو سکتا۔

سکندر اعظم ایک دن افسردہ خاطر تھا۔ ارسطو نے وجہ دریافت کی تو اس نے کہا کہ یہ جہان میری ہمت کے آگے ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ اس پر ارسطو نے کہا کہ دوسرے جہان کو بھی اس کے ساتھ ملا لو۔

ایک رئیس زادے نے سقراط کے سامنے اپنے خاندانی شرف پر فخر کیا اور طعن سے پوچھا کہ آپ کے بزرگوں میں بھی کوئی ایسا گزرا ہے۔ سقراط نے جواب دیا کہ آپ کے خاندان کا شرف گزر چکا ہے لیکن میرے خاندان کا شرف مجھ سے شروع ہوتا ہے۔

ایک پہلوان جب کشتی لڑتا تھا تو اکثر پچھڑ جاتا تھا۔ آخر کار اُس نے مجبور ہو کر پہلوانی چھوڑ دی اور طبابت شروع کر دی۔ سقراط نے جب یہ سُنا تو اس سے کہا کہ اب تم ضرور لوگوں کو پچھاڑا کروگے۔

لوگوں نے سقراط پر کئی سنگین جُرم لگائے۔ اس کے لئے حاکموں نے سزائے موت تجویز کی اور اس نے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ زہر کا پیالہ پیا۔ اُس وقت اُس کی بیوی بچے اور شاگرد رونے لگے۔ سقراط نے پوچھا کہ تم کیوں روتے ہو۔ سب نے کہا کہ ہم اس لئے رو رہے ہیں کہ آپ بے قصور مارے جا رہے ہیں۔ اس پر اُس نے جواب دیا کہ سبحان اللہ! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں کسی قصور پر مارا جاؤں۔

فیثا غورث یونان کا مشہور و معروف حکیم گزرا ہے۔ اس کا زمانہ پانچ سو سال قبل مسیح تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بغیر عدد اور نسبت کے کسی چیز کا تصوّر محال ہے اسی عددی تناسب کی وجہ سے فیثا غورث نے موسیقی کا توازن دریافت کیا۔ اس کا قول تھا کہ ستاروں کی حرکت ایک باقاعدہ نظام کے تحت ہے اور جب ستارے گردش کرتے ہیں تو اُن سے ایک موسیقی کی صدا پیدا ہوتی ہے۔

ایک روز فیثا غورث کے پاس ایک شخص نہایت ہی نفیس کپڑے پہن کر آیا۔ لیکن باتیں نہایت غلیظ اور بے محاورہ کیں۔ غورث نے کہا کہ یا تو تم گفتگو ایسی کرو جیسا تمھارا لباس ہے یا لباس ایسا پہنو جیسی تمھاری گفتگو ہے۔

غرض اس قسم کے لاکھوں قصّے ہیں۔ جو حاضر جوابی کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہیں۔ جہاں تک ظرافت کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ الگ چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان قصوں کے پیچھے ایک گہرا طنز بھی پوشیدہ ہے بشرطیکہ انسان اپنے قہقہوں کو روک کر دم بھر کے لئے سوچے کہ آیا اس سے ان کا کیا منشا تھا۔ مجھے بہر حال یہ دکھانا تھا کہ ظرافت اور خاص طور پر ضلع جگت کے موجد یونانی تھے اور لیس!

(قومی زبان)

سعادت حسن منٹو

خاطر غزنوی

منٹو ایک خیال
شوخ خطوط اُلجھی سی تو سیں تیکھے خد و خال
منٹو ایک خیال

منٹو ایک بہار
رنگیں خوشبو، لطیف رنگت نغموں کی مہکار
منٹو ایک بہار

منٹو ایک چراغ
چھپی ضو میں لو دیتے ہیں ہر دامن کے داغ
منٹو ایک چراغ

منٹو ایک کتاب
تلخ حقائق ترش فسانے شیریں شیریں باب
منٹو ایک کتاب

منٹو ایک سرود
دُختِ رز کی بات نہ کیجے — فرزندِ انگور
منٹو ایک سرود

منٹو ایک خمار
ٹوٹا جام بکھرتی مہکیں گیتوں کی جھنکار
منٹو ایک خمار

(دیگر ڈنڈی)

مُلکی ترقّی کی رفتار

بھاکڑا ننگل پروجیکٹ کی یاترا

حال ہی میں دہلی میں منعقدہ کسانوں کی کانوینشن میں شریک ہونے والے تین سو سے زیادہ کسان بھاکڑا ننگل پروجیکٹ کو دیکھنے گئے - جہاں انجینیروں اور محنت کشوں کی مساعی سے ایک نیا دور وجود میں آ رہا ہے ان کسانوں میں ٹراونکور کوچین، کشمیر، آسام، پیپسو اور بھارت کی دیگر مختلف ریاستوں کے کسان شامل تھے اور انھوں نے ایک اسپیشل گاڑی میں بھاکڑا ننگل تک سفر کیا - یہ کسان جو خود بھارت کے مختلف علاقوں میں کھیتی باڑی کرتے ہیں یہ بات دیکھنے کے خواہش مند تھے کہ دریاؤں کے پانی کو کس طرح ان کے فائدے کے لئے قابو میں لایا جاتا ہے - چنانچہ بھاکڑا ننگل پروجیکٹ کے دورے سے انھیں اس دیرینہ خواہش کو پورا کرنے کا موقع ملا - اس مقام پر جو کسانوں کے مفاد کے نقطۂ نظر سے ان کے لئے ایک متبرک مقام کی حیثیت رکھتا ہے - اُنھوں نے دیکھا کہ ان کی فلاح و بہبود کے عظیم منصوبہ کو کیونکر عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے -

دکھنی ہندوستان میں ورجینیا تمباکو کی پیداوار

حکومت ہند نے ریاست آندھرا کے ضلع گنتور میں دو سال کے لئے تمباکو کی توسیعی سروس کی اسکیم جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے - اس سروس پر تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار روپے خرچ ہوگا - ہندوستان میں گنتور ورجینیا تمباکو کی پیداوار کا سب سے بڑا مرکز ہے -

اسکیم کی غرض و غایت یہ ہے کہ تمباکو کے کاشتکاروں میں کاشت کرنے فصل کاٹنے اور تمباکو کو کمانے اور سکھانے کے سائنٹفک طریقوں کی نمائش کے ذریعے عملی واقفیت بہم پہنچائی جائے تاکہ ورجینیا تمباکو کی نوعیت میں اصلاح و ترقی ہو جائے - یہ اسکیم مرکزی وزارت خوراک و زراعت نے مرتب کی ہے اور ریاستی حکومتوں کے زرعی محکمہ جات کے ذریعے سے بروئے کار لائی جائے گی -

۱۹۵۳-۵۴ء میں ۵۷ کروڑ دس لاکھ پونڈ تمباکو کی پیداوار میں ورجینیا تمباکو کی پیداوار آٹھ کروڑ ۳۴ لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ تھی - اس زرعی پیداوار سے ۱۲ کروڑ روپے کا غیر ملکی زر تبادلہ حاصل ہو جاتا ہے اور مصنوعاتی محصولات کے ذریعے سرکاری خزانہ کو ۴۲ کروڑ روپیہ مل جاتا ہے -

ڈی ڈی ٹی کا ایک اور سرکاری کارخانہ

ریاست ٹراونکور کوچین میں الوائے کے مقام پر ڈی ڈی ٹی تیار کرنے کا دوسرا سرکاری کارخانہ قائم کیا جائے گا - اس کارخانے میں ہر سال ۴۰۰ ٹن ڈی ڈی ٹی تیار کی جا سکے گی - کارخانے کی تعمیر پر تقریباً ۵۰ لاکھ روپے صرف ہوں گے - اس کے علاوہ بھارت سرکار نے دہلی کے نزدیک قائم شدہ کارخانہ کی پیداواری صلاحیت میں سو فیصدی اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اس کارخانے میں پیداوار شروع ہو چکی ہے اور ۱۹۵۵ء کے آخر تک اس کی پیداواری صلاحیت سات سو ٹن سالانہ تک پہنچ جائے گی - توسیع کے بعد اس کی سالانہ پیداواری صلاحیت ۱۴۰۰ ٹن ہو جائے گی -

دوسرے کارخانہ کے قائم ہونے کے بعد بھارت میں ہر سال تقریباً تین ہزار ٹن ڈی ڈی ٹی تیار کی جا سکے گی - حکومت نے ملک بھر میں ملیریا پر قابو پانے کی جو مہم شروع کی ہے اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ڈی ڈی ٹی کا استعمال خصوصی اہمیت رکھتا ہے -

محالیات سے متعلقہ مالی تنظیم کا شعبہ

محالیات سے متعلقہ مالی تنظیم کے شعبہ (ری ہیبیلی ٹیشن فائننس ایڈمنسٹریشن) کی طرف سے گزشتہ ماہ اپریل میں مجموعی طور

پر ۹ لاکھ ۱۶ ہزار روپے کے قرضے کی ۱۴۸ درخواستیں منظور کی گئیں۔ ان میں سے ۱۰۳ درخواستیں کلکتہ سے، ۳۲ گوہاٹی سے، ۶ جے پور سے اور ۵ درخواستیں لکھنؤ سے روانہ کی گئی تھیں۔ کرنال اور دہلی سے ایک ایک درخواست موصول ہوئی۔

مارچ ۱۹۵۵ء کے آخر تک اس شعبہ کی طرف سے بے گھر لوگوں میں کل ۹ کروڑ ۴۳ لاکھ ۲۱ ہزار روپے بطور قرض تقسیم کئے جا چکے ہیں۔

انڈین ٹیلیفون انڈسٹریز کی شاندار رفتار ترقی

بنگلور سے ۶½ میل پورب کی طرف مدراس کو جانے والی سڑک پر دورا وانی نگر کے مقام پر انڈین ٹیلیفون انڈسٹریز نام کی فیکٹری قائم کی گئی ہے۔ جہاں ان دنوں ہر ہفتے ایک ہزار ٹیلیفون تیار کئے جا رہے ہیں۔ یہ تعداد ۵۶-۱۹۵۵ء کے لئے مقررہ نشانہ سے دوگنی ہے۔ اس کے علاوہ اس کارخانے میں آٹومیٹک ایکسچینج کی قریباً ۶۰۰ لائنیں بھی ہر ہفتے تیار کی جا رہی ہیں۔ یہ کارخانہ ۱۹۴۹ء میں قائم کیا گیا تھا۔ شروع میں یہ کلیتاً سرکاری ملکیت تھا لیکن جنوری ۱۹۵۰ء میں اسے پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی کی صورت دے دی گئی جس میں بھارت سرکار، حکومت میسور اور لورپول کی آٹومیٹک ٹیلیفون اینڈ الیکٹرک کمپنی حصے دار ہیں۔

سمندر میں مچھلیاں پکڑنے کا جاپانی طریقہ

بھارت سرکار کے 'اشوک' اور 'پرتاپ' نامی ٹرالر (دو مچھلیوں کے بڑے جال کو کھینچنے والی کشتیاں) نے ڈیڑھ گھنٹے کے دوران ایک ہی کھینچائی میں ۲/۱ ٹن مچھلیاں پکڑنے کا نیا ریکارڈ قائم کیا ہے گہرے پانی میں مچھلیاں پکڑنے کے جاپانی طریقہ 'بل ٹرالنگ' پر گزشتہ سال عمل شروع کیا گیا تھا اور اس سال بھی اس پر عمل جاری ہے۔ یہ طریقہ بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔

اس سال ماہ فروری میں مذکورہ ٹرالروں کے چوتھے سفر کے دوران میں کل ۴۵ ٹن مچھلیاں پکڑی گئی ہیں۔ اس سفر میں مچھلیاں پکڑنے کی فی گھنٹہ اوسط تقریباً ۲۰۵۸ پونڈ (ایک ٹن سے تھوڑی کم) رہی

مکئی کی پیداوار کا کل بھارت قطعی تخمینہ

مرکزی وزارت خوراک و زراعت کا ایک پریس نوٹ مظہر ہے کہ وزارت کے شعبۂ معاشیات و اعداد و شمار کو مکئی کی فصل کے کل بھارت قطعی کے بارے میں جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان کے مطابق سال رواں میں ۹۳۲۵۰۰۰ ایکڑ رقبۂ زمین پر یہ فصل کاشت کی گئی ہے اور اس کی ۲۹۴۴۰۰۰ ٹن ہوئی ہے۔ ۵۴-۱۹۵۳ء کے جزوی طور پر نظر ثانی شدہ تخمینہ کے مطابق اس فصل کے زیر کاشت رقبہ اور اس کی پیداوار کے اعداد علی الترتیب ۹۳۶۰۰۰۰ ایکڑ اور ۲۹۶۴۰۰۰ ٹن تھے۔ اس طرح ۵۴-۱۹۵۳ء کی نسبت مکئی کے زیر کاشت رقبہ میں ۳۵ ہزار ایکڑ یعنی ۴ر۰ فیصد پیداوار میں بیس ہزار ٹن یعنی ۷ر۰ فیصدی کمی واقع ہوئی ہے۔

اندور میں نیا ریڈیو اسٹیشن

بھارت میں پنج سالہ پلان کے ماتحت جو نئے ریڈیو اسٹیشن قائم کئے جا رہے ہیں ان میں ۲۲ مئی کو ایک اور اسٹیشن کا اضافہ ہوا۔ جب کہ مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات ڈاکٹر بی۔ وی۔ کیسکر نے اندور ریڈیو اسٹیشن کی رسم افتتاح ادا کی۔

اس سال کے دوران میں یہ تیسرا ریڈیو اسٹیشن قائم کیا گیا ہے۔ ۱۰ جنوری میں راجکوٹ کے مقام پر اور اپریل میں جے پور کے مقام پر نئے ریڈیو اسٹیشن کا افتتاح کیا گیا تھا۔ نشریات کی ترقی کے پنج سالہ پلان کے ماتحت ۲۰ کلوواٹ کے جو میڈیم ویو ٹرانسمیٹر نصب کئے جائیں گے یہ ان میں پہلا ٹرانسمیٹر ہے۔ اور اس سے وسیع علاقہ کے لوگوں کو نشر پائی پروگرام سننے کی سہولتیں میسر آئیں گی۔ مدراس، اجمیر، دہلی، اور دوسرے وارڈ میں اسی قوت کے میڈیم ویو ٹرانسمیٹر نصب کرنے کی تجاویز مرتب کی گئی ہیں۔

صنعتی مکانوں کی تعمیر کے لئے امدادی عطیے

حیدرآباد شہر میں ساڑھے آٹھ سو ایک کمرے والے مکان تعمیر کرنے کی غرض سے حکومت حیدرآباد کو چودہ لاکھ تراسی ہزار ڈھائی سو روپے قرضہ اور اتنی ہی رقم امداد کے طور پر دی گئی ہے۔ اس ریاست کی حکومت کو مزید تین لاکھ چھ سو روپے قرضہ اور اتنی ہی رقم امداد کے طور پر وارنگل میں ایک سو پچاس ایک کمرے والے مکان تعمیر کرنے کے لئے دی گئی ہے۔

نیشنل کیڈٹ کور کی توسیع

نیشنل کیڈٹ کور کے توسیعی پروگرام کے ماتحت چھ نئے سرکل قائم کئے گئے ہیں۔ اس قسم کے سرکلوں کی کل تعداد اب ۱۶ تک پہنچ گئی ہے۔

۵ ہزار نلدار کنوئیں لگانے کا پروگرام

زراعتی سیکریٹریوں کی کانفرنس میں دوسرے پنج سالہ پلان میں زرعی ترقی سے متعلق ۴۳ تجاویز میں سے ۲۰ اسکیموں پر غور و خوض کیا گیا۔

اس کانفرنس میں متعدد موضوعات پر غور و خوض کے علاوہ دوسرے پنج سالہ پلان کے ماتحت ۵ ہزار نلدار کنوئیں لگانے کی تجویز مرتب کی گئی ہے نلدار کنوؤں کی اس تعداد کو ریاست وار تقسیم کرنے کے سلسلے میں مرکزی وزارت خوراک و زراعت کے حکام نے بتایا کہ جیولاجیکل سروے کی بنا پر بعض ریاستیں نلدار کنوؤں کی تعمیر کے لئے غیر موزوں قرار دی گئی ہیں۔

زرعی توسیع و تربیت کی تجاویز کے ماتحت تقریباً ۳۰ ہزار دیہی سطح کے کارکنوں کو ۶۱-۱۹۶۰ء تک زرعی توسیع کے قومی بلاکوں میں کام کرنے کی غرض سے تربیت دینے کی ضرورت پڑے گی پہلے پنج سالہ پلان کے ماتحت ایسے کارکنوں کی تربیت کے لئے ۴۴ زرعی توسیع کی تربیت گاہیں قائم ہوئیں جن میں ۲۵ ہزار کارکنوں کو تربیت دینے کی صلاحیت ہے۔

دیہی صنعتوں کی ترقی

حکومت ہند نے چھوٹی اور دیہی صنعتوں کی ترقی کے لئے مزید مالی امداد اور قرضے منظور کئے ہیں۔ اس مرتبہ دیہی صنعتوں کے ضمن میں دیا سلائی کی گھریلو صنعت، ظروف سازی اور شہد کی مکھیاں پالنے کے کام کے لئے خاص طور پر رقوم رکھی گئی ہیں۔

آل انڈیا کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز بورڈ کو اس مالی سال کے اختتام تک کام میں لانے اور واپسی کی شرط پر ۱۵ لاکھ روپیہ دیا گیا ہے جو دیہی صنعتوں کی پیداواروں کو بورڈ کی طرف سے قائم کردہ فروخت کے مرکزوں دکانوں اور بھنڈاروں میں خرید و فروخت کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ اس رقم میں وہ ۵ لاکھ روپے کی رقم بھی شامل ہے جو پہلے منظور کی گئی تھی۔ اور جسے بورڈ نے ۳۱ مارچ ۱۹۵۵ء تک استعمال کیا تھا۔ پندرہ لاکھ روپے کی اس منظوری نے اپریل ۱۹۵۵ء کی پہلی ۷ لاکھ روپے کی منظوری کو منسوخ کر دیا ہے۔

پنج سالہ پلان

نمبر۱

گزشتہ سے پیوستہ

مکانات کی فراہمی

س - بھارت میں مکانات کی کمی کے بڑے بڑے اسباب کیا ہیں؟

ج - بھارت کی آبادی گزشتہ تیس سال سے بڑھ رہی ہے اور نفع بخش ملازمتوں اور زندگی کی سہولتوں کی تلاش میں دیہاتی آبادی مسلسل شہروں کو چلی آرہی ہے۔ اس صورت حال نے شہروں میں مکانوں کی کمی پیدا کردی ہے۔ اس کمی میں اضافہ سب سے پہلے جنگ کی وجہ سے ہوا جب کہ مکانات تعمیر کرنے کا کام بہت دھیما پڑ گیا اور پھر تقسیم کے بعد پاکستان سے بے گھر لوگوں کی آمد کی وجہ سے۔

س - مکانات کی کمی کو دور کرنے کے لئے مرکزی اور ریاستی حکومتیں کیا کر رہی ہیں؟

ج - مغربی اور مشرقی پاکستان سے آنے والے بے گھر لوگوں کے لئے حکومت نے متعدد شہر اور نو آبادیاں بسائی ہیں۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق مغربی پاکستان سے آئے ہوئے بے گھر لوگوں کے لئے ۱½ لاکھ سے زیادہ مکانات تعمیر کئے جا چکے ہیں۔

ریاستی حکومتوں مثلاً بمبئی اور اتر پردیش کی حکومتوں نے مقامی مسائل کو حل کرنے کے لئے خاص تنظیمیں قائم کی ہیں جنھوں نے متعدد مکانات بنائے ہیں مثلاً صنعتی کارکنوں اور کم آمدنی والے لوگوں کے لئے بمبئی اور کانپور میں مکانات بنائے گئے ہیں۔ ۱۹۵۲ میں پلاننگ کمیشن کی سفارشات کے مطابق بھارت سرکار ورکس اینڈ ہاؤسنگ منسٹری نے امدادی انڈسٹریل ہاؤسنگ کی ایک اسکیم کا افتتاح کیا۔

س - گورنمنٹ کی مکانات کی اسکیم کا حجم کیا ہے۔ اس سے کتنی تعداد میں لوگوں کے فائدہ اٹھانے کی توقع ہے۔

ج - پلاننگ کمیشن نے پلان کی مدت کے لئے صنعتی انڈسٹریل ہاؤسنگ پر صرف کرنے کے لئے مرکزی ذرائع میں سے ۲۸٫۵ کروڑ روپیہ وقف کر رکھا ہے اس فنڈ میں سے فیکٹری ورکرز کے مکانات بنانے کے لئے ریاستی حکومتوں ملازمت دینے والوں اور کارکنوں کی کواپریٹو سوسائٹیوں کو امداد اور قرضے دئے جا رہے ہیں۔ یہ توقع کی جاتی ہے کہ پلان کے پانچ کے دوران میں اس فنڈ کی مدد سے ۸۰ ہزار تک مکانات تعمیر کر لئے جائیں گے۔

س - امدادی انڈسٹریل ہاؤسنگ اسکیم کیا ہے؟

ج - چونکہ بالعموم نجی کارخانہ دار کم آمدنی والے گروہوں کے لئے اس کرایہ پر جو وہ آسانی سے دے سکتے ہیں۔ مکانات مہیا نہیں کر سکتے۔ حکومت کو وسیع پیمانے پر امداد اور قرضے دینا پڑتے ہیں۔ امدادی انڈسٹریل ہاؤسنگ اسکیم میں مرکزی گورنمنٹ کی طرف سے ریاستی حکومتوں کو دی ہوئی امداد اور قرضوں میں سے جو پھر اپنی طرف سے یہ امداد اور قرضے قانونی ہاؤسنگ بورڈوں کو دیں گے کارکنوں کے مکانات بنانے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ چھوٹے شہروں میں ان مکانوں کی زیادہ سے زیادہ قیمت ۲۷۰۰ روپے ہوگی اور بڑے شہروں میں ۴۵۰۰ روپے اس سکیم کے تحت امداد اور قرضے ملازمت دہندگان اور ہاؤسنگ کواپریٹو سوسائٹیوں کو بھی تعمیر کی مجموعی رقم کے ۲۵ فیصدی اور ۳۰ فیصدی تک بالترتیب دئے جا رہے ہیں۔ لیکن زیادہ سے زیادہ امداد اور قرضوں کے لئے ایک حد مقرر کر دی گئی ہے۔



ہندو مسلم ایک رہیں گے

شاہین غازی پوری



ہندو مسلم ایک رہیں گے کبھی نہ ہوگا دنگا
جمنا سے پریاگ میں مل کر کیسے بچھڑے گنگا
ایک ہی گھر کی شوبھا ہم سب دونوں راج دُلارے
دونوں ہیں بھارت ماتا کی آنکھوں کے دو تارے
ایک نگر کے باسی سارے ہم دھرتی کی آس
دو تارے ٹکرا جائیں تو دونوں کا ہو ناس
پریمی ساتھی! آؤ رکھیں ہندوستان کی لاج
پتواروں کو ہاتھ میں لے لیں پار ہے نیا آج
جب دھرتی پہ اُگ جاتا ہے آزادی کا پھول
تب اوروں کے محل سے بہتر اپنے دیس کی دھول
کلیاں چٹکیں سورج نکلا جاگ رے پنچھی جاگ
جس سے پھوٹیں گیت سہانے چھیڑ دے اب وہ راگ
ہندو مسلم ایک رہیں گے کبھی نہ ہوگا دنگا
جمنا سے پریاگ میں مل کر کیسے بچھڑے گنگا.

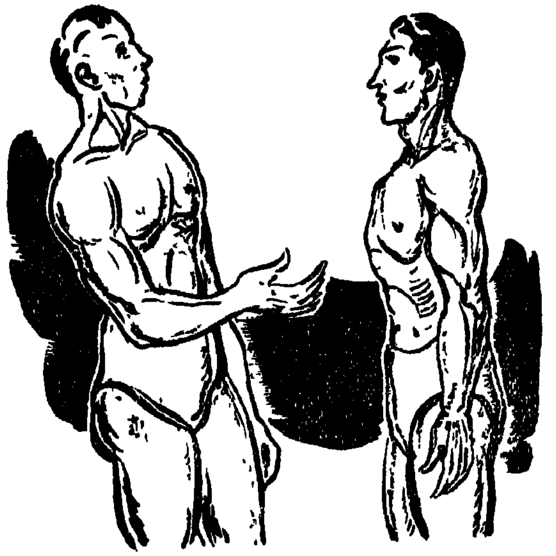
کاظم علی خاں

پھوپھا پھوپیا

پھوپھا پھوپیا پُورے پچاس برس کے پرکھے پہلوان تھے۔ پوپلی پھوپھی پھوپھا پھوپیا کو پچیس برس کے سن میں بیاہ کے پھندے میں پھانس لائیں تھیں، اور یہ پرانی پہلوانوں کے محلے "پل پل" میں پُورے پندرہ سال سے پیر پسارے پڑا تھا۔ پچیس برس پہلے پھوپھا پھوپیا اور پوپلی پھوپھی پُورے پُورے جوان تھے۔ تب تو پھوپھا پھوپیا کو پوپلی پھوپھی کا پل پل خیال رہتا تھا۔ پوپلی پھوپھی کے پان، پاندان کے لئے پھوپھا پھوپیا پانچوں وقت "پل پل" کے پہلوانوں کی پالی سے پائے ہوئے پیسے پھوپھی کو دیتے رہتے۔ مگر تھے پھوپھا بھی پرلے درجے کے پیٹو۔ روز بروز "پل پل" کے پہلوان پالیوں سے پائے ہوئے پیسوں سے پھوپھا پھوپیا کی دعوت کرتے پل پل کے پورے محلے میں پڑوسیوں کی زبان پر پھوپھا پھوپیا ٹکے پڑے تھے۔

پھوپھا پھوپیا سب پہلوانوں میں پرکھے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ پھوپھا کے آگے کوئی پہلوان نہ ٹھہرتا۔ پھوپھا بھی پھونک پھونک کر پیر اٹھاتے۔ پہروں کسرت کرتے رہتے۔ مگر پل پل میں یہ بات مشہور تھی کہ پھوپھا پھوپیا پرلے درجے کے پیٹو ہیں۔ پورے پورے پانچ پاؤ کی پوریاں۔ پاؤ بھر پیٹھے کے اچار کے ساتھ پھانک جانا پھوپھا کا پرانا اصول تھا، یہی وجہ تھی کہ سارے پڑوسی پھوپھا کو "پھوپھا پھوپیا پیٹو" کے نام سے پکارتے تھے۔

ایک بار پوپلی پھوپھی پھوپھا پھوپیا کے پاس اپنا پوپلا منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ پھوپھا نے کہا "پڑوسیوں کی پوپلی پھوپھی، منہ کیوں پھلائے ہو؟"



پھوپھی بولیں: "کیا کہوں پڑوسیوں کے پیٹو پھوپھا پیٹ کے لئے پل پل روتی ہوں۔ تم تو پڑوسیوں کے پھوپھا ہو، خلیفہ پہلوان ہو۔ مزے سے کھانے پہ کھانے اڑاتے ہو۔ پہلی سی چاہت کہاں کہ پان، پاندان کے لئے میرا پل پل خیال رکھتے تھے۔ اب تو پیٹ بھر روٹی کے لئے بڑی ترستی ہوں اور تم کو میرا پیسہ بھر خیال نہیں ہوتا۔

پھر کیا کہنا تھا، پھوپھا پھوپیا جھٹ پٹ پیر پٹک تیار ہو کر بولے، "پڑوسیوں کی پوپلی پھوپھی، مجھ پر پانچ وقت پیٹ بھر کھانا پینا حرام ہے اگر پیر پور پوناگڈھ جا کر پانچ سو پندرہ روپے کی نوکری نہ کروں تو میرا نام پھوپیا نہ رکھنا۔"

پیر پور پوناگڈھ پیل پل سے پُورے پُورے ایک دن کی راہ پر تھا، پھوپھا پھوپیا تھے تو پہلوان، لیکن پیدل چلنا پڑا تو پیر پھول گئے۔ چار و ناچار بیچارے پھوپھا پھوپیا کو پانچ روپے کا ایک پھڑکیلے رنگ کا پٹھان جوان ٹٹو لینا پڑا۔ ٹٹو کا نام پھوپھا نے "پٹے پہلوان" رکھا۔ پٹے پہلوان تھا تو تین پیر کا، مگر ایسا پھرتیلا کہ پھوپھا پہلوانی کی ساری پھرتی بھول گئے۔ پٹے پہلوان پر بیٹھے ہوئے پھوپھا پیر پور پوناگڈھ کے شہر پہونچے۔

شہر بھر میں سناٹا پھیلا تھا، جیسے کرفیو میں پھیلتا ہے، جیسے پورے شہر کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھوپھا نے دو رہ دار آواز میں پھنکار ماری۔

"پیرپور پونا گڈھ والوں کو سلام علیکم ——— تمھارے پھوپھا پھوپیا پیٹو پہلوان، پٹے پہلوان پر پیر پیارے بڑی شان سے تمھیں پکارتے ہیں!"

پھوپھا کو بڑی حیرت ہوئی، جب اُن کے پکارنے کا کوئی اثر نہ پڑا، پیرپور پونا گڈھ چپ چاپ رہا۔ پھوپھا کا دم گھبرایا، سانس پھولی۔ پٹے پہلوان پر بیٹھے پورے شہر کا پھیرا لگا دیا۔ گھر گھر پکارا۔ "ارے بھائی پپو پھوپھا پھوپیا پر نام کرتا ہے۔" "اری پارو ڈھاکی والی" مگر پرنام ندارد۔ پھوپھا کو یاد آیا جب وہ پچھلی بار پیرپور پونا گڈھ آئے تھے تو ان کے پپو، پنو پالا، پالو، پارو، پاشو، پاشا، پاشی، پاشے، پانا، پاپا نے پگ پگ پر پیر پانی کے بجائے دودھ سے دھلائے تھے۔ اب کیسا پانسہ پلٹا کہ پیرپور پونا گڈھ پر پالا پڑا ہوا ہے۔

پھوپھا پھوپیا ایک پرانی حویلی کے پاس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پھوپھا کے رونے کی آواز سن کر حویلی کا پھاٹک کھلا۔ ایک پیر کی عورت نکلی: "کیا ہے پھوپھا پھوپیا — کیا موت سر پر پھڑپھڑا رہی ہے"

"اری پھلجھڑی یہ تو بتا کہ پیرپور پونا گڈھ کو کیا ہوا"؟

"ہوا کیا، پھوپھا پھوپیا پیلم پور سے ایک شیر آگیا ہے۔ یہاں ہزاروں کو پھانک گیا۔ شہری ایسے بھاگے ہیں جیسے پپیگسایں بھاگتے ہیں۔"

"پیلم پور کا شیر" پھوپھا پھوپیا بولے۔ "ارے کوئی مذاق ہے پھوپھا پھوپیا کو سمجھا کیا ہے۔ پھوپھا پھوپیا عرف پیٹو پہلوان، پٹے پہلوان پر سوار ہاتھ میں پاپانے پرنگ پور کی پرانی تلوار، پیل پیل کے پہلوانوں کا پہلوان پیرپور پونا گڈھ آپہونچا، اب ڈر کاہے کا؟"

سینہ پھلا کر پھوپھا پھوپیا نے بات تو شیخی میں کہہ دی، پر وہ بیتی کہ جلدی سے حویلی میں پہونچ گئے۔ سوچنے کہ اگر شیر کی زد پر آگئے تو پوپلی پھوپھی کو بیوہ ہونا پڑے گا۔ پٹے پہلوان کو جھٹ پٹ باندھ پرانی حویلی کی ایک پیروالی بھٹیا رن پھلجھڑی سے بولے: "دیکھ ری پھلجھڑی میرے پٹے پہلوان کا خیال رکھنا، تو ایک پیر کی ہے وہ تین پیر کا۔"

اتنا کہہ کر پھوپھا پھوپیا ایک کونے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، دو روز سے پھانکنے کو ستو بھی نہ تھے۔ پھر پھوپھا پھوپیا کی سوگند ——— بے چارے کا حال پتلا تھا۔ پانی پی پی کے کب تک رہتے۔ پیٹ کی آگ نے پھوپھا کو ایسا پھونکا کہ رات بے چارے کی پلنگ سے پیٹھ نہ لگی، اس پر ستم یہ کہ تین پیر کے میاں پٹے پہلوان پھاند پھوند کر کہیں غائب ہوگئے۔ پھوپھا پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بے چارے پانچ روپے

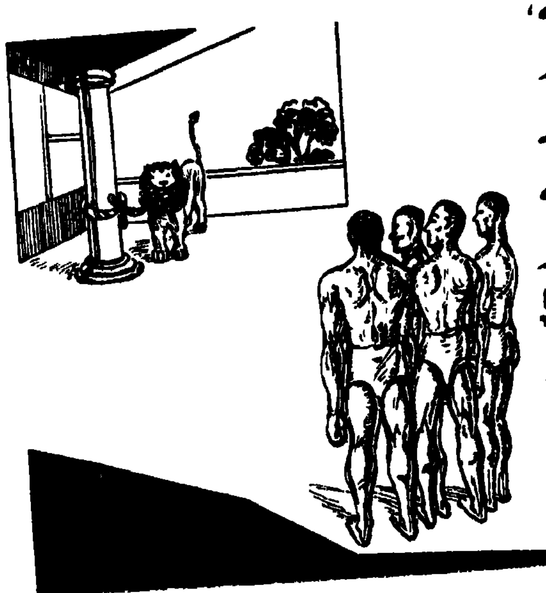


کے نقصان کے خیال سے نکل پڑے: "ہائے ہائے پانچ روپے" پھوپھا پھوپیا یوں ہی پھکڑ ہوگئے۔ پٹے پہلوان کے جانے سے اُن کے اور بھی ہوش ہوا ہوئے۔ پھوپھا پھوپیا آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر

بھاگ کھڑے ہوئے پہلوان ارے میاں پٹے پہلوان" پکارتے ہوئے سرائے سے نکل بھاگے۔ پھلجھڑی پکارتی رہی" پھوپھا پھوپیا پھوپھا پھو"، مگر پھوپھا نے ایک نہ سُنی۔ ایک جگہ پر پھوپھا کو پٹے پہلوان اندھیرے میں نظر پڑا۔ جلدی جلدی پھلانگیں مارتے جا پہنچے۔ دھوں دھوں کمر پر پندرہ بیس لاتیں جمائیں۔ اور پکڑ کان لاکے پھر اپنی جگہ پر باندھ دیا۔

سویرے پھوپھا پھوپیا کو پھلجھڑی نے جگایا: "پھوپھا پھوپیا اٹھو بادشاہ سلامت کا پروانہ آیا ہے"۔

"پروانہ" پھوپھا چونکے۔ اُٹھ پڑے۔ دیکھا پٹے پہلوان کی جگہ پیلم پور کا بھیانک شیر بندھا ہے، پھوپھا نے آنکھیں پھڑپھڑائیں۔ چٹکی بھری کہ جاگ رہا ہوں نا۔ کہیں خواب میں تو شیر نہیں آ پڑا ہے پر سچ مچ پٹے پہلوان کی جگہ پیلم پور کا مشہور شیر بندھا تھا جس کو پھوپھا پھوپیا ٹھونک پیٹ کر پٹے پہلوان سمجھ کر رات باندھ لائے تھے۔



باہر ہزاروں پہلوان کھڑے پھوپھا پھوپیا کی بہادری کی تعریف کر رہے تھے۔ پھوپھا نے پھلجھڑی سے مخاطب ہو کر کہا: "میں نہ کہتا تھا، پھلجھڑی، پھوپھا پھوپیا عرف پٹو پہلوان پٹے پہلوان پر سوار رہتے ہیں پاپائے پرنگ پور کی تلوار، پیل پیل کے پہلوانوں کا پہلوان، پیر پور پونا گڈھ آ پہونچا"۔

پہلوان پکار رہے تھے "پھوپھا پھوپیا زندہ باد، پھوپھا پھوپیا زندہ باد"۔

پھوپھا پھوپیا پیر پور پونا کے راجہ کے پاس کھڑے تھے۔ راجہ نے پوچھا:

"جناب پھوپھا پھوپیا عرف پٹو پہلوان پیل پیل کے پہلوانوں کے پہلوان پیلم پور کے شیر پکڑنے کے صلے میں پیر پور پونا گڈھ کے دربار میں پانچ سو پندرہ روپیہ ماہوار پر اگر ملازمت قبول کریں تو ہماری عزت افزائی ہو۔ کیونکہ انھوں نے پیر پور پونا گڈھ کو ایک ہلک درندے سے نجات دلائی ہے۔

"جہاں پناہ!" پھوپھا پھوپیا بولے" پانچ سو پندرہ روپے کی نوکری ہی کے لئے تو بندہ، یعنی پھوپھا پھوپیا عرف پٹو پہلوان، پیل پیل کے پہلوانوں کا پہلوان، پیل پیل کے پڑوسیوں کی پوپلی پھوپھی کا شوہر نامدار، پیر پور پونا گڈھ پہونچا۔ اس عنایت پر بندہ ممنون ہے۔ اب اجازت ہو تو پھوپھا پھوپیا پیل پیل پہنچ کر پوپلی پھوپھی کو پیر پور پونا گڈھ بلالے"۔

بادشاہ سے اجازت پاکر پھوپھا سیدھے پیل پیل پہونچ کر پوپلی پھوپھی کے پاس پہونچے۔ پوپلی پھوپھی یہ بات سن کر پھولی نہ سمائیں۔ پوپلے منھ سے پھک پھک کر کے بولیں۔

"پڑوسیوں کے پھوپھا پھوپیا"!

"ہاں پڑوسیوں کی پوپلی پھوپھی"!

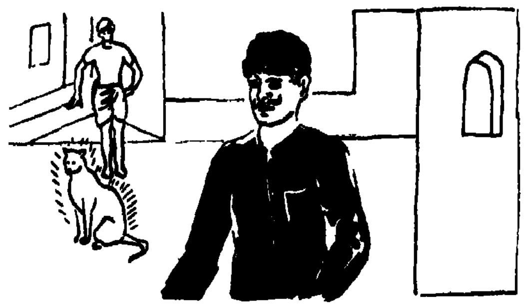
جیسے پھوپھا پھوپیا اور پوپلی پھوپھی کے دن پھرے، سب پڑھنے والوں کے دن پھریں۔

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

چند ضرب الامثال

بھیگی بلی بتانا

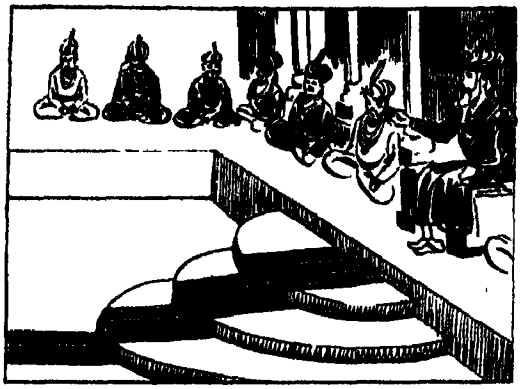
کام چور ملازم کے متعلق بولتے ہیں۔ یا ایسے موقعے پر اس کا استعمال کیا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی کام کے کرنے میں عذراتِ لنگ پیش کرے۔ اس مثل کی ابتدا اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ جاڑے کے موسم میں ایک شخص نے رات کے وقت اپنے نوکر سے کہا،



"باہر چل کر دیکھو، بارش ہو رہی ہے یا تھم گئی؟" اُس نے جواب دیا "حضور خوب ہو رہی ہے۔" آقا نے کہا "نمک حرام یہیں سے بیٹھے بیٹھے تُو نے کس طرح جان لیا کہ بارش ہو رہی ہے؟" نوکر نے کہا "حضور ابھی باہر سے بلی آئی تھی جو بھیگی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے میں نے خیال کیا کہ بارش ابھی ہو رہی ہے۔" اُس وقت سے یہ فقرہ ضرب المثل بن گیا۔

تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو

یعنی ابھی کیا ہے؟ آخری نتیجے کا صبر سے انتظار کرو۔ دیکھو کیا ظہور میں آتا ہے، کہتے ہیں کہ ایک شہزادے کا بچپنے میں ایک تیلی کے لڑکے سے دوستانہ ہو گیا۔ جب بادشاہ کے مرنے کے بعد شہزادہ باپ کے تخت پر بیٹھا تو اُس تیلی کو اپنا مصاحب بنا لیا۔ ایک ہمسایہ سلطنت نے جو شہزادے کی مملکت کی حالت کمزور اور خراب دیکھی



تو جھٹ اُس پر حملہ کر دیا۔ بادشاہ گھبرایا، اور اس نے امرا اور وزرا کو جمع کر کے پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیئے اور کس طرح دشمن کو شکست دینی چاہیئے۔ مجلس میں تیلی صاحب بھی موجود تھے۔ اُس سے جو بادشاہ نے صلاح پوچھی، تو آپ کیا جواب دیتے ہیں، کہ "جہاں پناہ! آپ نے ناحق افواہوں پر اعتبار کر کے اپنی جان عذاب میں ڈال رکھی ہے، بھلا حضور سے کوئی آنکھ ملا سکتا ہے۔ اور کسی کی کیا مجال ہے کہ یوں آپ کی سلطنت پر دھاوا بول دے، میرے خیال میں تو یہ سب خبریں جھوٹی ہیں اور آپ کے دشمنوں کی اُڑائی ہوئی ہیں، اور اگر حملہ ہوا۔ تو ابھی سے گھبرانے اور پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ تیل دیکھئے، تیل کی دھار دیکھئے۔" یعنی جب دشمن بالکل ہی پاس آ جائے گا، تو اُس وقت دیکھا جائے گا۔ جو تدبیر کرنی ہوگی، کریں گے۔ بادشاہ کا تو خبر نہیں کیا انجام ہوا۔ مگر اُس وقت سے یہ فقرہ ضرب المثل کے طور پر استعمال ہونے لگا۔

چراغ تلے اندھیرا

یہ مثل ایسے موقعے پر بولتے ہیں جہاں لائق ماں باپ کے ہاں

اولاد نالائق اُٹھے یا کسی شخص کے علم، کمال، ہنر یا طاقت سے غیر لوگ تو طاقت حاصل کرلیں، مگر اُس کے اپنے عزیز اور اقارب اس سے محروم رہیں۔ اِس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک مسافر کہیں سے چلا آرہا تھا۔ جب دارالسلطنت کے قریب پہونچا تو عین فصیلِ قلعہ کے نیچے اُسے پانچ چھ ڈاکو ملے اور بےچارے غریب مسافر کا سارا مال و متاع لُوٹ لیا۔ مسافر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا۔ "دُہائی ہے حضور کی۔ دارالخلافہ کے عین نیچے میں دن دہاڑے لُوٹ لیا گیا۔" بادشاہ نے کہا "بھئی! بات تو افسوس کی ہے، مگر ہم کیا کرسکتے ہیں؟ جو کچھ ہونا تھا ہو لیا۔ اب صبر کرو۔" مسافر کو اس جواب سے بڑی حیرت ہوئی۔ اُس نے کہا "حضور! یہ تو بڑا اندھیر ہے کہ حضور کے سامنے اور حضور کے شہر کے عین نیچے مسافر لُٹ جاتے ہیں اور اس کا کچھ تدارک نہیں ہوسکتا۔ اگر یہاں بھی امن نہیں تو پھر امن کہاں ملے گا؟" بادشاہ نے ہنس کر جواب دیا،



"میاں! تم نے دیکھا نہیں، چراغ جلا کر شمع دان پر رکھو تو اگرچہ وہ سارے گھر کو روشن کردے گا، مگر خود اس کے نیچے ہمیشہ اندھیرا رہے گا۔ بس یہی حال ہمارا بھی سمجھ لو۔" اُس وقت سے یہ مثل بولی جانے لگی۔

سُوت کی انٹی اور یُوسف کی خریداری

یہ مثل ایسے موقعے پر بولتے ہیں، جہاں کوئی معمولی حیثیت والا آدمی کسی عظیم الشان کام میں ہاتھ ڈالنا چاہے، تھوڑی بساط ہو اور بڑا حوصلہ رکھے، اس کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ جب



ایک قافلے والے حضرت یُوسف[ع] کو کنوئیں میں سے نکال کر بیچنے کے مصر لے گئے تو وہاں اُن کے حُسن و جمال اور لیاقت و قابلیت کا شہرہ ہوا۔ بڑے بڑے امیر اُن کی خریداری کے لئے آئے، اور لوگوں کا بڑا ہجوم ہوا۔ اِسی ہجوم میں ایک بہت غریب بڑھیا بھی موجود تھی جس کے لباس میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے، اور پھٹی ہوئی جوتی پاؤں میں پہنے ہوئے تھی۔ ہاتھ میں ایک سُوت کی انٹی تھی۔ کسی نے پوچھا، "بڑی بی! تم نے اِس ہجوم میں آنے کی کیوں تکلیف کی؟" بڑھیا کہنے لگی، "بیٹا! یہ سُوت کی انٹی لے کر آئی ہوں۔ اِس خیال سے کہ اگر مالک راضی ہوں تو یہ انٹی دے کر یوسف کو خرید لوں۔ میں نے سُنا ہے کہ وہ نہایت لائق اور بڑا خوب صورت غلام ہے۔" لوگ ہنسنے لگے لیکن بڑھیا بدستور سنجیدہ بنی ہوئی تھی۔ (قومی زبان)



ر عبدالعلی

عقل مند مُلازم

نے والے	اورنگ زیب ——	بادشاہ
	مُبارک خاں ——	ایک سپاہی
	اور دو مختلف ملازم	

پہلا منظر

بادشاہ اورنگ زیب اپنے آرام کمرے میں کسی اُلجھن میں گرفتار بیٹھا ہے۔ بار بار اپنی ہتھیلیوں پر اپنی پیشانی کو ٹیک کر سوچنے کے انداز میں بڑبڑاتا ہے۔

ازیب —— مجھے سخت حیرت ہے کہ آخر یہ بات سارے ملک میں کیسے
ہ میں دکن پر حملہ کرنے والا ہوں۔ یہ بات تو میرے سوا کسی کو بھی معلوم
ی نہیں تھی اور نہ ہی میں نے کسی سے اس کا ذکر کیا تھا، پھر آخر کون
کا بھیدی ہے جس نے میرے دل کا راز جان لیا، اور اس کی سارے
رت کردی —— (کچھ دیر خاموش رہتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے
ے کے انداز میں کہتا ہے) ٹھیک ہے! مبارک خاں اس شخص کا
ے گا جس کے منہ سے سب سے پہلے یہ بات سُنی گئی ہے۔ وہ بہت
ر اور جاسوس قسم کا سپاہی ہے۔

یہ کہہ کر وہ تالی بجاتا ہے، ایک ملازم اندر داخل ہوتا ہے اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

ب زیب —— سپاہی مبارک خاں کو پیغام پہونچاؤ کہ ہم اُسے طلب کرتے ہیں۔

ازم —— جو حکم ظلِ سبحانی۔

مُلازم چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد مُبارک خاں اندر آنے کی اجازت طلب کرتا ہے۔

اورنگ زیب —— آؤ مُبارک خاں۔

مُبارک خاں —— (جھک کر آداب کرتا ہے) خیر تو ہے ظلِ سبحانی اس وقت خادم کی کیا ضرورت پیش آئی۔

اورنگ زیب —— ہم ایک بڑی اُلجھن میں گرفتار ہیں۔

مُبارک خاں —— اُلجھن! کیسی اُلجھن ہے ظلِ سبحانی کے دشمنوں کو؟

اورنگ زیب —— یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ خبر سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے کہ ہم دکن پر حملہ کرنے والے ہیں۔

مُبارک خاں —— جی ہاں عالی مقام! اس خادم نے بھی سُنا ہے۔ مگر کیا یہ سچ ہے؟

اورنگ زیب —— ہاں ہے تو سچ یہ لیکن مجھے حیرت اس بات کی ہے کہ میرا یہ ارادہ لوگوں پر ظاہر کیوں کر ہوا۔ جب کہ اس کا علم میرے سوا کسی دوسرے کو نہیں تھا۔

مبارک خاں —— حیرت کا مقام ہے!

اورنگ زیب —— اسی لئے ہم اُس شخص کو اپنے رُو برو دیکھنا چاہتے ہیں جس کے منہ سے سب سے پہلے یہ بات سُنی گئی ہے، ہم یہ کام تمھارے

سپرد کرتے ہیں، اور یہیں ہیں کام یاب ہو جانے پر تمھیں ایک معقول انعام
سے سرفراز فرمانے کا وعدہ بھی کرتے ہیں۔

مُبارک خاں — (جُھک کر) ظلِ سبحانی کا اقبال بلند! خادم اس
ذرہ نوازی کا کس طرح شکریہ ادا کر سکتا ہے۔

اورنگ زیب — لیکن یہ کام بہت جلد ہو۔

مُبارک خاں — (جلدی سے) کل ہی لیجئے ظلِ سبحانی۔

(مبارک خاں آداب کر کے جانے کے لئے مُڑتا ہے)

پردہ

دوسرا منظر

دوسرا دن ہے، بادشاہ اورنگ زیب اپنے اُسی کمرے میں
اور اُسی اُلجھن میں گرفتار بیٹھا ہے۔ مبارک خاں اندر آنے
کی اجازت طلب کرتا ہے۔

اورنگ زیب — آؤ مبارک خاں۔

مُبارک خاں — آداب بجا لاتا ہوں

اورنگ زیب — کہو کیا خبر ہے!

مبارک خاں — خوش خبری ہی ہے
آپ کے رحم، خدا کے کرم اور دوستوں
کی دعاؤں سے کامیابی حاصل ہوئی
ہے۔ وہ شخص جس کے منہ سے سب سے پہلے
یہ بات سنی گئی تھی ظلِ سبحانی کا خاص ملازم ہے، جو صبح کے وقت عالی مقام
کو وضو کراتا ہے۔

اورنگ زیب — اُسے حاضر کیا جائے۔

مبارک خاں ملازم کو آواز دیتا ہے۔ ملازم ڈرتا سہمتا
داخل ہوتا ہے۔

رنگ زیب۔ (ملازم سے) کیا تو نے ہی یہ بات سارے جہاں میں
پھیلائی ہے کہ ہم دکن پر حملہ کرنے والے ہیں۔

ملازم — (کانپتے ہوئے) جی حضور مجھ سے ہی یہ غلطی ہوگئی

اورنگ زیب — لیکن یہ بات تجھے معلوم کیسے ہوئی، جب کہ
میرے سوا کسی دوسرے کو نہیں تھا۔

ملازم — میں جہاں پناہ کا ادنیٰ خادم ہوں۔ سچ سچ کہ
کہ ایک دن صبح کے میں آپ کو وضو کرا رہا تھا، تو آپ نے ایک
انداز سے دکن کی طرف دیکھا، اُس وقت آپ کی آنکھوں میں
چمک تھی، اور پھر آپ نے اپنی مُونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے
گردن کو بھی جنبش دی۔ حضور کی کوئی حرکت بے معنی نہیں ہوتی
سمجھ گیا کہ حضور دکن پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔



اورنگ زیب — (حیرت سے) تم کس قدر ذہین ادمی
ہو، ہم تمھاری اس بات سے بہت
خوش ہوئے۔ اس لئے تمھارا در
بلند کرتے ہیں — اور مبارک خاں
تمھیں بھی سپاہی سے سپہ سالار
بناتے ہیں۔ تم نے میری ایک بڑی
الجھن دور کر دی۔

مبارک خاں اور ملازم شکریہ کے
طور پر جُھک جاتے ہیں اور پھر
ایک ساتھ کہتے ہیں —

مُبارک خاں } جہاں پناہ کا اقبال بلند، جہاں پناہ زندہ باد
مُلازم } جہاں پناہ پائندہ باد۔

پردہ